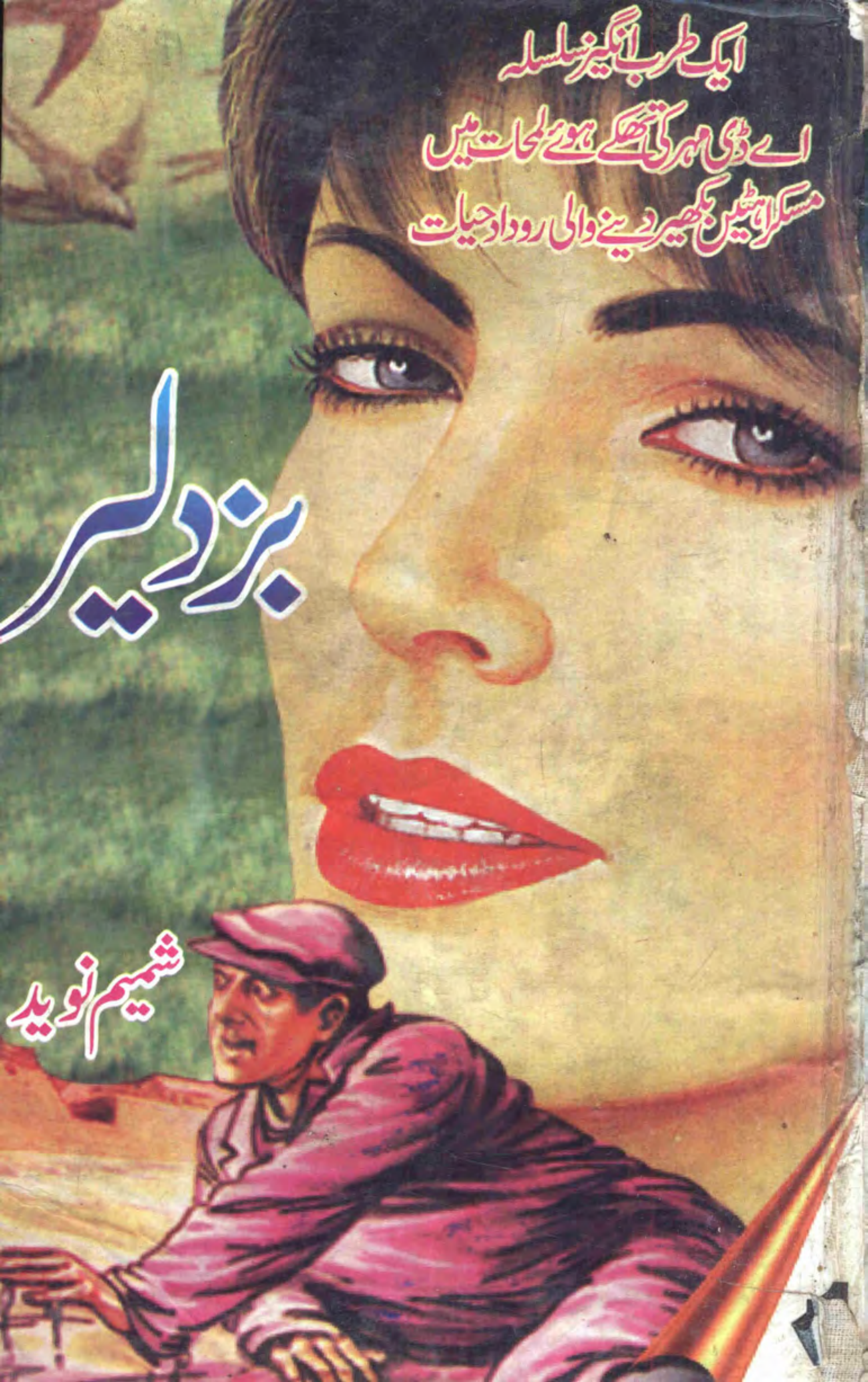

ایک طرب انگیز سلسلہ
اے ڈی مہر کی تھکے ہوئے لمحات میں
مسکراہٹیں بکھیر دینے والی روداد حیات
بزدلیر
شمیم نوید
۲

پیش لفظ

طنز و مزاح لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے کسی کو ہنسا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ ہم نے متعدد موضوعات پر بہت سے سلسلہ وار ناول لکھے۔ ان میں اے ڈی مہر کی یہ قہقہہ بردوش سرگذشت اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

یہ ناول جو پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے، اس ہم نے تقریباً دو سال میں تحریر کیا۔ اس دوران میں پڑھنے والے اس کے اسیر رہے۔ اس طرب انگیز خودنوشت کو قبولیت عام کی سند حاصل ہوئی۔ اس ناول میں ہمارے ایک دوست نے بڑا دل چسپ تبصرہ لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔ اس پر لطف تبصرے سے ہم آپ کو محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ موصوف نے لکھا تھا:

"آپ کے تھکے ہوئے لمحات میں اے ڈی مہر آپ کا بہترین ساتھی ہے۔ جدید سائنس نے اب تک تفکرات ختم کرنے کی کوئی دوا پیش نہیں کی، لیکن میں آپ کو نسخے میں 'بزدلیر' پیش کروں گا۔ یہ کھلکھلاتی، مسکراتی ہوئی تحریر ہر قسم کے وٹامنز سے بھرپور ہے اور آپ کی توانائی کی تعمیر کر سکتی ہے۔ اس کا ایک ڈوز آپ کے لیے کافی ہوگا۔ اگر آپ اسے تسلی بخش پائیں تو اپنے اس پاس کے لوگوں کے لئے یہ نسخہ تجویز کر کے 'ثواب دارین' حاصل کریں۔"

اس تبصرے بعد اور کیا لکھیں! اگر اس ناول کو پڑھ کر آپ کا وقت خوش گوار گزرے تو ہمارے حق میں دعائے خیر کیجئے گا۔

آپ کے خلوص و محبت کا طلب گار

شمیم نوید

کراچی

5

اے ڈی مہر



زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت میں ایک خوشگوار تغیر



مجھے یقین ہے کہ اگر درمیان میں چھڈا نہ ہوگیا تو میری اَمر کہانی آپ اُسی وقت پڑھ سکیں گے جب دانہ، خاک میں مل کر گل و گلزار بن چکا ہوگا، یعنی میری قبر پر ہری ہری گھاس اُگ چکی ہوگی۔ میں نے اپنی "کرکٹ الیون" کو بُلا کر ابھی سے وصیت کردی ہے کہ وہ مدیروں اور ناشروں کو اپنے بچوں کی ختنوں اور دیگر تقریبات میں مدعو کرتے رہا کریں تاکہ اُن سے تعلقات استوار رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔ ہاں یہ بتاتا چلوں کہ میں "کرکٹ الیون" اپنے گیارہ عدد بچوں کو کہتا ہوں جو میری شب و روز کی کاوشوں کا ثمر ہیں۔ میں نے یہ وصیت اِس لیے کی ہے کہ جب میں خدانخواستہ مرجاؤں تو انھیں میری اَمر کہانی شائع کرانے میں کوئی دِقت پیش نہ آئے۔ میری خواہش ہے کہ میری زندگی کا کچا چِٹھا میری موت کے کم از کم پانچ سال بعد سامنے آئے۔ میری اِس خواہش کے کئی اسباب ہیں جو رفتہ رفتہ خود آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔ یہاں میں صرف ایک بڑا سبب بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ وہ سبب ہے، مرنے کے بعد بھی مشہوری!

دنیا کے اکثر بڑے لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے کہ اُن کی سرگزشت موت کے بعد شائع ہو۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کی "فریڈیم آف انڈیا" جو اُن کی وفات کے پانچ سال بعد شائع ہوئی۔ میں بھی یہ حرکت کرکے خود کو بڑے لوگوں کی صف میں شمار کرانا چاہتا ہوں۔ کیا خبر کہ جب اردو انسائیکلوپیڈیا کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جائے تو اُس میں آئن اسٹائن کا نام ہو نہ ہو، میرا نامِ نامی ضرور ہو۔

یاد رہے کہ اردو انسائیکلوپیڈیا میں مشہور سائنسداں آئن اسٹائن کا نام شامل نہیں۔

میں اب عمر کی اُس منزل میں پہنچ چکا ہوں جہاں آدمی جھوٹ بولتے بولتے تھک جاتا ہے اور مجبوراً سچ بولنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ یہی مجبوری مجھ سے میرے سارے بھید لکھوا رہی ہے۔

پہلا بھید خود میرا نام ہے، یعنی اے ڈی مہر!

عموماً یوں ہوتا ہے کہ نام، ماں باپ رکھتے ہیں مگر میں نے اپنا نام خود رکھا ہے۔ ایسا نہیں کہ اُنھوں نے میرا نام ہی نہیں رکھا تھا اور بے نام کے ہی مجھے اس ناہنجار دنیا میں رُلنے ڈُلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا بلکہ جس وقت اُنھوں نے میرا نام رکھا تھا، اُس وقت اُنھیں قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اُن کا رکھا ہوا نام آؤٹ آف ڈیٹ ہوجائے گا۔ دراصل اُس زمانے میں نام رکھتے ہوئے اِتنی ہچر مچر نہیں کی جاتی تھی۔ اگر بچہ عید کے دن پیدا ہو تو عیدو نام رکھ دیا۔ شبِ برات کو تولد ہوا تو شبراتی ہوگیا۔ اگر کوئی تہوار مِس ہوگیا تو سات دنوں میں سے کوئی نہ کوئی نام سلیکٹ کرلیا، مثلاً پیرو، اتواری، منگلا اور جمعہ کی نسبت سے جمّا وغیرہ وغیرہ! بہرحال ماننا پڑے گا کہ ناموں میں بڑی سادگی ہوتی تھی اور فوراً زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ اِس طرح پیدائش کا دن یاد رکھنے میں بھی آسانی ہوتی تھی۔

جب میں نے سوٹ بوٹ پہننا سیکھ لیا اور مجھے ٹائی کی گرہ باندھنا بھی آگئی تو پہلی بار اپنی بدنصیبی کا احساس ہوا۔ یہ سوٹ، یہ بوٹ، یہ ٹائی اور نام اللہ دتا! اور پھر یوں ہوا کہ اُسی دن سے مجھ پر اپنا نام بدلنے کی دُھن سوار ہوگئی۔ ایک دن جی میں آئی کہ اخبار میں اشتہار دے دوں کہ مجھے اب اللہ دتا نہیں بلکہ ... پکارا جائے۔ میں نے طیش میں آکر اشتہار بھی لکھ لیا مگر نام کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی اور یہ جگہ اب تک خالی پڑی ہوئی ہے کیونکہ مجھے کافی سوچ بچار کے بعد بھی کوئی منفرد نام نہیں ملا، ایسا نام جو کسی اور کا نہ ہو۔ جو بھی نام میں سوچتا، اُس نام کا کوئی نہ کوئی نکل پڑتا۔ ایک دن لوہ ہوکر میں نے اشتہار پھاڑ دیا۔ اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ جو بزرگ سیدھے سیدھے نام رکھ دیتے تھے،

اس میں کیا رکھا تھا۔

بالآخر میں نے اللہ دتا پر ہی چھری چلانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے مختصر کرکے اے ڈی بنا دیا مگر صرف اے ڈی سے کام نہیں چل سکتا تھا اس لیے اپنے والد مہر دین کا مہر بھی اس میں شامل کر دیا اور پھر جو صاف کاغذ پر لکھ کر دیکھا تو بڑا ماڈرن نام نظر آیا، اے ڈی مہر۔

بعد میں اس نام کے مجھ پر بہت سے فوائد منکشف ہوئے۔ کچھ لوگ میرے والد کو میرا تخلص سمجھنے لگے اور یوں مجھے ادب میں بھی اپنی ٹانگ پھنسانے کا موقع مل گیا۔ میں نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں اس غلط فہمی کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے پرانے شاعروں کے دیوان ضرور خریدنے پڑے تھے۔ کام محنت طلب ضرور تھا مگر شہرت آسانی سے تو نہیں مل جاتی۔ مجھے احساس تھا کہ اگر میں نے کسی شاعر کی پوری کی پوری غزل مار دی تو جلد ہی پکڑا جاؤں گا اس لیے میں ذرا ہوشیاری سے کام دکھاتا تھا۔ ایک ہی ردیف قافیے اور ایک ہی بحر میں مختلف شاعروں کی غزلوں سے ایک ایک شعر بطور تبرک لے کر اپنا کام چلا لیتا تھا۔

اپنی کتھا کہانی سنانے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میں فطرتاً انتہائی بزدل آدمی ہوں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں، وہ یقیناً یہ پڑھ کر سخت حیران ہوں گے مگر حقیقت یہی ہے اور یہ میرا دوسرا بھید ہے۔ میں نے زندگی میں دانستہ کبھی کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ کارنامے خود میری تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے مجھ سے آ ٹکرائے اور میرے نام سے منسوب ہو گئے۔

حکومت کے اونچے ایوانوں سے لے کر عام آدمیوں تک میں انتہائی ذہین اور دلیر شخص مشہور ہوں حالانکہ ان دونوں صفات سے میرا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ بچپن ہی سے یہ دو لفظ میرے پیچھے پڑ گئے تھے، دلیری اور ذہانت!

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ اب تک یاد ہے جس نے پہلی بار مجھے دلیر اور ذہین ثابت کیا اور میری تصاویر اخبارات تک میں شائع ہوئیں۔ اُس وقت میری عمر بمشکل نو دس سال ہوگی۔

ہوا یہ کہ ایک رات سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے زور کا پیشاب لگ رہا تھا۔ کمرے میں لالٹین کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور میرے ابا کے خراٹے نشر ہو رہے تھے مگر اس کے باوجود مجھے کمرے سے نکل کر بیت الخلا تک جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ بستر ہی میں پیشاب کر دوں مگر جب امی کا بیلن یاد آیا تو روح لرز گئی۔ وہ اِس ناشائستہ حرکت پر میری بہت کٹائی لگاتی تھیں اور اس کارِ خیر میں ابا بھی اُن کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اور مجھے بستر میں ہرگز پیشاب نہیں کرنا چاہیے۔ میں اسی لیے اُس رات متوقع مار پیٹ سے خوفزدہ ہو کر اُٹھ بیٹھا اور کمرے سے نکل کر بیت الخلا کا رُخ کیا۔

ابھی میں پیشاب کرنے بیٹھا ہی تھا کہ میرے کانوں میں کھٹر پٹر کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور یہ آوازیں نچلی منزل سے آ رہی تھیں جہاں ہماری رشتے کی ایک خالہ رہتی تھیں۔ مارے خوف کے میں پیشاب کیے بغیر ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پاؤں بُری طرح کانپ رہے تھے۔

جیسے ہی میں بیت الخلا سے نکلا، ایک دم دھم کی سی آواز ہوئی۔ چور! میرے ذہن میں ایک لفظ گونجا اور میں حواس باختہ ہو گیا۔ میں نے ایک دم آنکھیں میچ کر ریس لگا دی مگر گھبراہٹ میں یہ بھول گیا کہ میرا رُخ کدھر ہے!

مجھے یاد ہے کہ میں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا تھا، اور پھر میرے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنے جسم کو خلا میں گرتے محسوس کیا تھا۔ اِس کے ساتھ ہلکا سا دھماکا ہوا تھا اور کوئی چیخ پڑا تھا۔

میں نے گرنے کے بعد خود کو کسی کی پشت پر سوار دیکھا تھا اور انتہائی خوفزدہ ہو کر اُس شخص کی گردن جکڑ لی تھی، پھر میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد کیا ہوا اور کیا نہیں، مجھے پتا نہیں چلا! میرے حواس تو اُس وقت بحال ہوئے جب میرے اردگرد گھر کے سارے افراد جمع ہو چکے تھے، میرے ابا، امی، رشتے کے خالو، خالہ اور میرے چھوٹے بڑے بھائی بہن!

اُس کے بعد پولیس آئی اور دو بیہوش چوروں کو اُٹھا لے گئی جن میں سے ایک کا سر پھوٹ گیا تھا۔ پولیس والوں کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اخباری نمائندے پہنچ گئے۔ میری کئی تصویریں اُسی حالت میں اُتاری گئیں۔ ڈر کے مارے میں نے اب تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ پاجامے ہی میں میرا پیشاب نکل گیا تھا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح ابا، اخبار خرید لائے اور میری امی کو مخاطب کرکے پُرمسرت آواز میں بولے "یہ دیکھ شکوران! تیرے بیٹے اللہ دتا کی تصویر اخبار میں چھپی ہے۔"

میں اُس وقت پاجامے پر اُٹھا اُٹھا رہا تھا، لپک کر ابا کے پاس پہنچ گیا تاکہ امی سے پہلے ہی اپنی تصویر دیکھ لوں۔ ابا، بآوازِ بلند وہ خبر پڑھ کر سنا رہے تھے جس کے ساتھ میری تصویر چھپی تھی۔

خبر کی سرخی تھی "ایک دس سالہ بچے کا کارنامہ جس نے دو خطرناک چوروں پر حملہ کرکے اُنھیں بیہوش کر دیا۔"

خبر کے مطابق میں نے یعنی دس سالہ اللہ دتا نے ایک چور کے سر پر تو اوپر سے اینٹ پھینک کر ماری جو زخمی ہو کے گر گیا اور دوسرے چور پر اوپری منزل سے چھلانگ لگا دی، پھر اُس کی گردن جکڑ کر اُسے بھی بیہوش ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ دونوں چور مسلح تھے اور اُن کے قبضے سے دو عدد پستول بھی برآمد کیے جا چکے تھے۔ پولیس

بہت دنوں سے اُن کی تلاش میں تھی کیونکہ وہ عادی مجرم تھے۔ وہ مکان میں نقب لگا کر داخل ہوئے تھے۔ عین اُس وقت جب وہ نیچے صحن میں سامان اکٹھا کرنے کے بعد فرار ہونے والے تھے، میں نے اُن کا سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا تھا۔ اُسی خبر میں یہ بھی لکھا تھا کہ محکمہ پولیس نے میری دلیری اور ذہانت کو سراہتے ہوئے مجھے مبلغ سو روپے نقد بطور انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

خبر سن کر امی نے میری بلائیں لیں اور ابا نے بھی چٹاچٹ دو عدد بوسے لے لیے۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اُسی وقت یہ راز ظاہر کر دیا کہ رات کو پاجامے میں میرا پیشاب نکل گیا تھا اور میں اب تک وہی گندا پاجامہ پہنے ہوئے ہوں۔

"خیر کوئی بات نہیں!" ابا نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا، "مگر اب تم یہ بات کسی کے سامنے کہنا مت!" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اُسی وقت ابا نے امی کو حکم دیا کہ مجھے فوراً دوسرا پاجامہ پہننے کو دیا جائے۔

امی نے اُس دن پہلی بار مجھے پاجامے میں پیشاب کرنے پر معاف کر دیا اور دُھلا دُھلایا پاجامہ دیتے ہوئے بولیں "بیٹا! غسل خانے میں جا کے پہلے نہا، پھر یہ پاجامہ پہن!"

میں پاجامہ لے کر غسل خانے کی طرف بڑھا۔ امی اور ابا سو روپے کو خرچ کرنے کے منصوبے بنانے لگے جو مجھے ملنے والے تھے۔ میں جب نہا کر باہر آیا تو اُس وقت تک منصوبہ سازی جاری تھی۔ امی کا اصرار تھا کہ میرے بہن بھائیوں کے کپڑے بنوا لیے جائیں اور ابا لحافوں میں نئی روئی بھروانے پر بضد تھے کیونکہ جاڑوں کے دن آنے والے تھے۔

نہ کسی نے مجھ سے پوچھا اور نہ میں نے ہی بتایا کہ اصل واقعہ کس طرح پیش آیا تھا! ہوا یوں کہ چھت پر منڈیر نہیں تھی۔ منڈیر کی جگہ دو دو تین تین اینٹیں تلے اوپر رکھ دی گئی تھیں۔ پکی منڈیر بنوانے میں بہت پیسے خرچ ہوتے اِس لیے تلے اوپر اینٹیں رکھ کر کام چلا لیا گیا تھا اور وہ اینٹیں بھی مانگے کی تھیں۔ جب پڑوس میں ایک مکان بن رہا تھا تو ابا نے پڑوسی سے کچھ اینٹیں بشرطِ واپسی اُدھار لے لی تھیں۔ ہم بھائی بہن ہی وہ اینٹیں اُٹھا اُٹھا کر لائے تھے۔ جو کریڈٹ مجھے ملا وہ درحقیقت اُنھی اینٹوں کو ملنا چاہیے تھا جن میں سے ایک نے چور کا سر پھاڑ دیا تھا۔

میں خوفزدہ ہو کر اپنی دانست میں کمرے کی طرف بھاگا تھا اور اُن اینٹوں سے ٹکرا گیا تھا، اور پھر نیچے جا پڑا تھا۔ اب اِسے میری خوش قسمتی ہی کہنا چاہیے کہ میں سیدھا چور کی پشت پر گرا۔ اُس وقت شاید وہ جھک کر سامان اُٹھا رہا ہوگا ورنہ میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانا کون سی ایسی بڑی بات تھی! وہ چور شاید اُس آفتِ ناگہانی کے لیے تیار نہ رہا ہوگا ورنہ جب میں نے اُس کی گردن جکڑ لی تھی تو وہ ہاتھ پاؤں ضرور مارتا اور یوں اتنا نڈھال نہ ہو جاتا۔ وہ تو خیر چور تھا اور چور کے پاؤں کتنے! اگر اُس کی جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو بدحواس ہو جاتا۔ اچانک پشت پر کسی کا کودنا، پھر گردن جکڑ لینا اور اُس کے بعد کسی گرم گرم چیز کا پشت پر بہنا، یہ تمام باتیں ایک شریف آدمی کو بھی بدحواس کر دینے کے لیے کافی ہیں، وہ تو پھر بھی چور تھا۔

اُسی دن جب میرے ابا اور امی میری ناز برداریاں کر رہے تھے، بڑے بھیا مجھے تنہا پا کر قریب آ گئے۔ انھوں نے میری گنجی ٹانٹ پر ایک زوردار چپت جماتے ہوئے کہا "کیوں بے اللہ دتے تو بڑا بدمعاش ہے۔ ابے مجھے ہی جگا دیا ہوتا۔ ایک آدھ اینٹ میں بھی مار دیتا۔ اخبار میں فوٹو تو چھپ جاتا!"

میں نے حسبِ معمول دانت نکال دیے اور اُن کی تلو تو کرنے لگا تاکہ میری گنجی چندیا پر وہ مزید طبع آزمائی نہ کریں۔

اُس دن کے بعد سے میں اپنے اسکول اور محلے میں ہیرو مشہور ہو گیا۔ ویسے اب میں اِس عمر کو پہنچنے کے بعد اُن اخباری نمائندوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے مجھے رات کی رات ہیرو بنا دیا تھا۔ مجھ سے جو کارنامہ منسوب کیا گیا، وہ یقیناً انھی میں سے کسی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ تھا ورنہ جس وقت وہ آئے تھے اور اُنھوں نے مجھ سے مختلف سوالات کیے تھے تو میں نے سوائے ہاں ہوں کرنے کے اُنھیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُنھوں نے پوری اسٹوری میری اِسی "ہاں ہوں" سے بنائی تھی۔

"اچھا تو بیٹے! تم نے ایک چور کے سر پر اینٹ پھینک ماری، کیوں؟"

"ہوں!"

"اور پھر تم نے دوسرے چور پر چھلانگ لگا دی؟"

"ہوں!"

"تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہ چور ہیں؟"

"ہاں!"

"تو بیٹے! تم نے چور کو بیہوش کرنے کے لیے اُس کی گردن جکڑ لی اور تمھیں ایسا کرتے ہوئے بالکل ڈر نہیں لگا؟"

"ہاں!"

"تم واقعی بڑے دلیر لڑکے ہو۔"

"ہوں!"

"تم اپنی تصویر کھنچواؤ گے؟"

"ہوں!"

اور پھر کھٹا کھٹ میری تصویریں کھینچی گئی تھیں۔

تو یہ تھا وہ واقعہ جس نے پہلی بار مجھے احساس دلایا کہ بزدل ہونے کے باوجود مجھ میں ہیرو بننے کے جراثیم موجود ہیں۔

[illegible] میں ہیرو بن جانا اور بات ہے اور سچ مچ کا ہیرو بننا

قطعی مختلف بات ایسا احساس مجھے کچھ دن بعد ہی ہو گیا اور میری اکڑی ہوئی گردن آہستہ آہستہ پھر اپنی جگہ واپس آگئی۔ بھلا ایک عدد چھوٹا سا کارنامہ کب تک میری کند ذہنی اور بزدلی پر پردہ ڈالے رہتا۔

اسکول کا نام سنتے ہی میری روح قبض ہونے لگتی تھی۔ پڑھنے میں میرا بالکل جی نہیں لگتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب میں چھٹی جماعت تک پہنچا تو ابا میرے مستقبل سے قطعی مایوس ہو چکے تھے۔ میں ایک جماعت سے کئی کئی سال کے لیے چمٹ جاتا تھا۔ ابا کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ جب دل چاہتا تھا مجھے دُھن ڈالتے تھے۔ میری دُھنائی اُس دن ضرور ہوتی تھی جس دن امی سے کسی بات پر ابا کی لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں اسکول سے یہ دعا کرتا ہوا لوٹتا تھا کہ خدا کرے گھر میں "جنگ بندی" ہو ورنہ امی پر تو ابا کا بس چلے گا نہیں، میرا بھرکس نکال دیں گے۔

وہ تو خیر گزری کہ چھٹی جماعت کے بعد میں نے کبھی فیل ہونے کا نام نہیں لیا ورنہ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا! میں اسے مولا کی دین ہی کہوں گا کہ جب میں چھٹی جماعت میں تھا تو مجھے اپنے اندر چھپی ہوئی ایک قوت کا اتفاق سے پتا چل گیا جس نے میری زندگی بدل دی۔

ہوا یہ کہ میں ایک دن وقفے کے دوران میں چاٹ کھا کر اسکول سے بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا کہ میری نظر اپنے ایک ہم جماعت پر پڑی۔ وہ اسکول کے لان میں بیٹھا ہوا زور زور سے ہل رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں اُسے حال تو نہیں آ گیا مگر وہاں دُور تک کوئی قوال نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تشویش ہوئی اور اُس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ آنکھیں اور کتاب دونوں بند کیے اب بھی زور زور سے ہل رہا تھا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بُڑبُڑا بھی رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ کر غور سے اس کی آواز سننے لگا، اور پھر مجھے پتا چلا کہ وہ اپنا سبق بُڑبُڑا رہا تھا مگر کیسے؟ کتاب تو بند تھی، پھر وہ کس طرح اپنا سبق پڑھ رہا تھا۔ یہ بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی۔

"سنو! یہ تم کتاب بند ہونے کے باوجود بھی سبق کیسے پڑھ رہے ہو؟" میں نے اُس کا کندھا ہلاتے ہوئے حیرت سے سوال کیا۔

وہ ہلتے ہلتے رُک گیا اور آنکھیں کھول کر بولا "رٹّا لگا رہا ہوں۔"

"رٹّا! یہ کیسے لگایا جاتا ہے؟" میں نے معلوم کیا۔

جواب میں اُس نے مجھے رٹّا لگانے کے "آداب" سمجھائے۔ میں بھی اُسی وقت اپنی کتاب لے کر اُس کے قریب بیٹھ گیا اور رٹّا لگانے لگا۔ اسکول سے بھاگنے کا پروگرام میں نے عارضی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔

میں نے دو تین دن ہی میں اپنے ہم جماعت کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اب اُس کا میرا کوئی مقابلہ نہیں رہا تھا۔ وہ آگے پیچھے دو فٹ ہلتا تو میں تین فٹ! وہ پانچ منٹ بُڑبُڑا کر سانس لینے کو رُکتا تو میں دس دس منٹ تک بغیر بریک لگائے بُڑبُڑائے جاتا۔ وہ ایک دن میں ایک صفحہ رٹتا تو میں دو!

میرے ابا بھی حیران تھے اور اسکول کے ماسٹر بھی کہ اچانک یہ مجھے کیا ہو گیا ہے! میں نے آخر کیا گھول کر پی لیا ہے جو فر فر سبق سنا دیتا ہوں۔ پہلے تو میں ایسا نہیں تھا۔ ایک آدھ ماسٹر نے بھی مجھے ٹٹولنا چاہا مگر میں راز کی بات زبان پر نہیں لایا۔ کتاب میں کیا لکھا ہے، مجھے اِس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو بس رٹّا لگانے سے مطلب تھا۔ جب صرف رٹّا لگانے سے کام چل رہا تھا تو مجھے کیا پڑی تھی کہ مزید مغز ماری کرتا اور کتاب کے مضمون کا مطلب سمجھنے میں سر کھپاتا!

سال بھر کی مشق ہی میں میرا دماغ اچھا خاصا ٹیپ ریکارڈر بن گیا۔ پھر تو یوں ہوا کہ میں زندگی کی لمبی سڑک پر بگٹٹ بھاگنے لگا۔ ساتویں، آٹھویں اور پھر نویں جماعت! میں چھلانگوں پر چھلانگیں لگاتا چلا گیا۔

میں جب نویں جماعت میں پہنچا تو مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میرے ماسٹروں کا رویّہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی۔ وہ مجھے کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ اِس بات کا یقین مجھے اُس دن پوری طرح ہو گیا جب بھری کلاس میں ایک طویل عرصے کے بعد مجھ پر ڈانٹ پڑی۔ وہ اردو کا پریڈ تھا۔

ماسٹر صاحب قبلہ کی نگاہ گھومتی ہوئی مجھ پر آ کر ٹھہر گئی۔

"اللہ دتا!" ماسٹر صاحب کی آواز سنائی دی۔

"یس سر!" میں نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر فرماں برداری کے ساتھ کہا۔

ماسٹر صاحب نے کتاب کھول کر ایک شعر پڑھا، پھر بولے۔

"اِس کا مطلب بتاؤ!"

میری سِٹّی گم ہو گئی کیونکہ ماسٹر صاحب نے ابھی تک اُس شعر کا مطلب نہیں بتایا تھا جو میں رٹ سکتا۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا "سر! ابھی آپ نے یہ غزل پڑھائی ہی کب ہے جس کے ایک شعر کا مطلب آپ پوچھ رہے ہیں!"

"پھر بھی اِس میں ایسا کوئی مشکل لفظ تو نہیں جس کے معنی تمھیں نہ آتے ہوں۔" ماسٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"مگر سر!..."

"مگر سر کے بچے!" وہ میری بات کاٹتے ہوئے دہاڑے "تم آٹھویں کلاس سے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو کر آئے ہو اور ایک شعر کا مطلب بیان نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ضرور نقل ماری ہوگی۔" یہ کہہ کر انھوں نے ایک اور لڑکے کو کھڑے ہونے کا

اشارہ کیا اور بولے "تمھاری کون سی ڈویژن آئی تھی؟"

"کوئی نہیں سر! میں پروموٹڈ ہوں۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"تم اِس شعر کا مطلب بتا سکتے ہو؟" ماسٹر صاحب نے اس سے پوچھا۔

"یس سر!" یہ کہہ کر اُس لڑکے نے شعر کا اُلٹا سیدھا جو مطلب سمجھ میں آیا تھا بیان کر دیا۔

"شرم کرو اللہ دتا!" ماسٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "یہ رعایتی پاس ہوا ہے مگر اس نے کسی حد تک شعر کا مطلب سمجھ لیا اور تم فرسٹ ڈویژن پاس ہو کر بھی کوئی مطلب بیان نہ کر سکے۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کیا کرتا، خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

پھر جب میں نے نویں جماعت کا امتحان دیا تو پتا چلا جیسے سارے ہی ماسٹر اِس موقع کی تاک میں بیٹھے تھے۔ پہلے دن انگریزی کا پرچہ تھا۔ جیسے ہی پرچے اور کاپیاں بٹیں، ماسٹر صاحب آ کر میرے سر پر سوار ہو گئے۔

"یس سر!" میں اُنھیں اپنی طرف متوجہ پا کر کہا۔

"کھڑے ہو جاؤ!" اُنھوں نے اپنی عینک ناک پر درست کرتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ کمرۂ امتحان میں بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکے میرا تماشا دیکھ رہے تھے اور مزید دو ماسٹر کمرے کے دروازے سے جھانک رہے تھے۔

"اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دو!" ماسٹر صاحب نے مجھے گھورتے ہوئے دوسرا حکم جاری کیا۔

میں نے ہاتھ بھی اُٹھا دیے۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟

معاً وہ قریب آئے اور میری قمیص کا دامن اُٹھا دیا، پھر بنیان! اُس کے بعد وہ میرا نیفا ٹٹولنے لگے، پھر قمیص کے دونوں کالروں پر طبع آزمائی کی، ٹوپی اور جوتے اُتروا دیے مگر لاحاصل! وہ غالباً جس چیز کی تلاش میں تھے اُنھیں نہیں مل رہی تھی۔ تھک ہار کر انھوں نے میری میز اور کرسی کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ اُن کے چہرے سے جھنجلاہٹ کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"کتاب کہاں چھپائی ہے؟" معاً وہ گرج اُٹھے۔

میں نے اُن کی گرج کے جواب میں ایک طویل سانس لیا، پھر بولا "سر! نہ وہ نیفے میں آ سکتی ہے اور نہ جوتوں میں، اِس لیے میں نے اُسے ایک اور محفوظ جگہ چھپایا ہے جہاں کوئی نہ دیکھ سکے۔"

"کہاں؟ بتاؤ؟" وہ پھٹ پڑے "ورنہ میں تمھیں ابھی یہاں سے نکال دوں گا۔"

"یہاں سر!" میں نے بڑے اطمینان سے انگلی اُٹھا کر اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"بدتمیز!" وہ گلا پھاڑ کر چیخے مگر اب چیخنے سے کیا ہو سکتا تھا، میں نے اُن سے اپنی بے عزتی کا انتقام لے لیا تھا۔

کمرۂ امتحان میں موجود لڑکے میرا جواب سننے کے بعد بہت زور سے ہنس پڑے تھے۔

"خاموش!" ماسٹر صاحب پھر دہاڑے "ورنہ سب کو نکال دوں گا۔"

سب کو تو وہ خیر کیا نکالتے، مجھے ہی نہ نکال سکے اور اُن کے پاس ایسا کرنے کا جواز بھی کیا تھا! غصے سے بَل کھاتے ہوئے اپنی کرسی پر جا بیٹھے، اور پھر اُس وقت تک نہ اُٹھے جب تک وقت ختم نہ ہو گیا۔ اُنھوں نے ایک اخبار لڑکوں کے اور اپنے درمیان حائل کر لیا تھا جس کا بظاہر وہ مطالعہ فرما رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے، کمرۂ امتحان میں مجھ سمیت بیٹھے ہوئے تمام لڑکے اس "راز" سے اچھی طرح واقف تھے کہ اُس اخبار میں چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن کے ذریعے موصوف مستقل تاک جھانک فرماتے رہے تھے۔ یہ حرکت وہ عموماً کلاس روم میں بھی فرمایا کرتے تھے۔ لڑکوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر وہ بیچارے اِسی غلط فہمی کا شکار رہنا چاہتے تھے کہ لڑکے اُن کے اِس "راز" سے واقف نہیں۔

اُس دن کے بعد بھی مجھ پر تقریباً "سوزِ پاپا" پڑا مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے! ماسٹر بیچاروں کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور وہ مجھے نقل کرتے ہوئے نہ پکڑ سکے۔

میں نویں جماعت میں بھی کسی کے روکے نہ رُک سکا، اور پھر جب میں نے میٹرک کیا تو فرسٹ ڈویژن کے ساتھ فرسٹ پوزیشن بھی آئی کیونکہ میں نے پورے سال جی بھر کے رٹّا لگایا تھا۔ ایک طویل

عرصے کے بعد پھر میری تعداد یں اخبارات میں شائع ہوئیں۔

اِس موقع پر میں نے اپنے ابّا سے پہلی بار وہ فریاد کر ہی دی جس کے لیے مدّت دراز سے منصوبے بنا رہا تھا۔

ابّا میری فریاد سن کر حسب توقع بھڑک اُٹھے اور بآوازِ بلند امّی سے بولے ”سن رہی ہو شگورن! کیا کہہ رہا ہے تمھارا لاڈلا۔ اب یہ انگریزی بال رکھنے کا انگریزی! کتاب ہے کہ اب اِس کے سر پر اُسترا نہ پھروایا جائے۔ بھلا باپ دادا اُسترا پھرواتے آئے ہیں اور یہ کل کا لونڈا اُسترا پھروانے سے منکر ہے!“

ابّا بہت دیر تک بکتے جھکتے رہے مگر اُنھیں آخرکار ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور یوں میری چاند منڈنا ختم ہوئی۔

بچپن سے اُسترا پھرتا آیا تھا اس لیے بڑے مضبوط اور دراز بالوں نے میرے سر پر بسیرا کیا۔ کچھ دن ہی میں مجھے خود اپنی شکل بھیا نا شکل ہوگئی کہ میں واقعی اللہ دتا ہوں یا کوئی اور۔ شیکسپیئر نے بھی شاید کسی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو کر کہا تھا کہ ہماری شخصیتیں حجاموں اور درزیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ یقیناً اُس کی چاند پر بھی بہت دن تک اُسترا پھرتا رہا ہوگا۔

میں بقول ابّا کے لکڑی کی طرح بڑھا۔ جب میں نے ایف اے پاس کیا تو بڑے بھیا اور ابّا کے کپڑے میرے جسم پر فٹ آنے لگے۔ مجھے تو خیر ٹھیک طرح علم نہیں مگر لوگوں کا کہنا یہی تھا کہ جوان ہو تو مجھ جیسا! لمبا قد، سرخ و سفید رنگ اور چہرہ مہرہ قطعی ایسا جو کسی ہیرو کا ہونا چاہیے۔ اگر مجھ میں کوئی کسر تھی تو صرف یہ کہ میرے بال گھونگھریالے نہیں تھے اور اُن کی کوئی آوارہ لٹ میری پیشانی پر نہیں جھولتی تھی مگر اس سے میری پُرکشش شخصیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کمی کو میں نے آدھی مانگ نکال کر پورا کر لیا تھا۔ یار دوست مجھے انگریز بچہ کہا کرتے تھے اور میں یہ سمجھے بغیر فخر سے گردن تان لیتا تھا کہ اِس طرح وہ مجھ پر کتنا بڑا الزام لگاتے تھے۔ ایسی تمام اسباب تھے کہ جب چچا بندو خاں اپنی حور شمائل لونڈیا کے لیے بَر کی تلاش میں ہمارے گھر پہنچے تو میں ہی اُن کی نظر میں جچا۔ چچا بندو خاں اپنی ذات برادری ہی کے تھے۔ کسی دُور کے رشتے سے وہ ابّا کے خالہ زاد یا ماموں زاد بھائی تھے اِسی لیے ہم پر لازم آیا تھا کہ اُنھیں چچا کہہ کر پکاریں۔

مجھے اِس بات کا علم یوں ہوا کہ میں نے چھپ کر ابّا اور اُن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔

”مگر بندو خاں یہ تو سوچو کہ اللہ دتّا چھوٹا ہے جب کہ اُس سے بڑے دو موجود ہیں۔“ میرے ابّا نے کہا تھا۔

”لیکن تم بھی تو یہ سوچو مہر دین کہ میری بٹیا بھی تو چھوٹی ہے۔ بڑوں سے اُس کا جوڑ نہیں بیٹھے گا ورنہ میں یہ بات زبان سے نہ نکالتا۔“ چچا بندو خاں نے جواز پیش کیا تھا۔

”خیر ایک بات اچھی طرح سن لو کہ میں بڑوں سے پہلے اُس کی شادی ہرگز نہیں کروں گا اگر تمھیں رشتہ کرنا ہے تو انتظار۔۔۔“

”بالکل!“ چچا بندو خاں ابّا کی بات کاٹتے ہوئے چھاتی ٹھوک کر بولے ”یہ تو میں بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”ابھی میری پوری بات تو سن لو!“ ابّا نے کہا۔

”کہو!“

”جب تک اللہ دتّا اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔۔۔ اُس وقت تک شادی نہیں ہوگی۔“ ابّا بولے حالانکہ اُس وقت میں اُن کے سینے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ساری باتیں سن رہا تھا۔

”تم نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ اُس نے ایف اے کر لیا ہے۔“

”ہاں!“ ابّا نے جواب دیا۔

”تو پھر اب آگے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ہاں ارادہ تو میرا ابھی نہیں،“ ابّا نے بتایا ”ایف اے بہت ہوتا ہے۔ ہمارے سارے خاندان میں کوئی ایف اے نہیں۔ میرا ارادہ اُسے کہیں نوکر کرانے کا ہے۔“

”پھر اُسے نوکر سمجھو!“ چچا بندو خاں جھٹ سے بولے۔

”کیا مطلب؟“ ابّا کی آواز میں حیرت تھی۔

”یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو!“ چچا بندو خاں نے کہا ”میں ایک آدھ دن بعد آ کے اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”کہاں؟“ ابّا نے پوچھا، پھر بولے ”کیا وہیں جہاں تم نوکر ہو؟“

”ہاں!“ چچا بندو خاں نے جواب دیا ”میں نے اپنے صاحب سے کبھی کسی کام کے لیے نہیں کہا اِس لیے مجھے اُمید ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔ پھر یہ کہ اللہ دتّا تعلیم یافتہ اور ذہین ہے۔ میرے صاحب ایسے لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔“

”تم آج تو بتا دو بندو خاں کہ کہاں ملازم ہو؟“ ابّا نے آہستہ سے کہا۔

”تمھیں بتایا تھا کہ سرکاری نوکر ہوں اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ چچا بندو خاں کا انداز ٹالنے والا تھا۔ اُن کی آواز سے نمایاں طور پر اِس بات کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میرا خیال تھا کہ تم اب غیریت نہیں برتو گے مگر خیر!“ ابّا کی آواز سُنائی دی۔

”اچھا بابا تم تو روٹھنے لگے۔“ چچا بندو خاں نے کہا ”دراصل میں مصلحتاً اِس بات کو چھپاتا رہا ہوں کہ میں کہاں ملازم ہوں مگر اب تم سے بتانا ہی پڑے گا۔“

”کہاں؟“ ابّا کی آواز سے پھر اشتیاق ظاہر ہونے لگا۔

”خفیہ میں!“ چچا بندو خاں نے آہستہ سے جواب دیا۔

”کیا کہا، خفیہ میں؟“ ابّا حیرت سے بولے۔

”ہاں میں خفیہ پولیس کے محکمے میں ہوں۔“ چچا بندو خاں نے راز کی بات بتا ہی دی، پھر بولے ”مگر تم یہ بات کسی کو بتاؤ گے نہیں!“

”تو کیا تم اللہ دتّا کو بھی خفیہ میں نوکر کراؤ گے؟“ ابّا کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

”کیوں کیا حرج ہے؟“

”یہ سوچ لو کہ ابھی وہ بچّہ ہے۔“ ابّا بولے۔

”سارے ماں باپ کی نظر میں اولاد ہمیشہ بچہ ہی رہتی ہے۔ اللہ دتّا تو پھر بھی مرد ہے، ہمارے محکمے میں تو عورتیں تک ملازم ہیں۔“ چچا بندو خاں نے ابّا کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اچھا!“ ابّا نے حیرت کا اظہار کیا۔

چچا بندو خاں مزید کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے، ہا علیہ پھول کیونکہ میرے ابّا نے رشتہ منظور کر لیا تھا۔ اُنھوں نے شرط یہ رکھی تھی کہ شادی اُس وقت ہوگی جب اُن کے دونوں بڑے بیٹے اِس کارِ خیر سے نمٹ جائیں۔ چپڑی اور دو دو والی بات تھی، رشتہ بھی مل رہا تھا اور نوکری بھی! پھر ابّا کس طرح انکار کرتے! گویا میری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں تھا۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ہی چچا بندو خاں آ دھمکے۔ ابّا نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے اُن کے ساتھ جانا ہے۔ جب وہ آئے تو میں اُنھیں بالکل تیار ملا۔

”ساتھ میں اپنے ایف اے کی سند بھی لے چلو بیٹے!“ چچا بندو خاں نے مجھ پر واری صدقے ہونے کے انداز میں کہا۔

”بلکہ ایسا کرو اللہ دتّا کہ مڈل اور میٹرک کی سند بھی لیتے چلو تاکہ وقتِ ضرورت دکھا سکو!“ ابّا نے رائے دی۔

”بالکل!“ چچا بندو خاں نے تائید میں کہا۔

ابّا کا مشورہ ٹھیک ہی تھا اور بعد میں ٹھیک ثابت ہوا۔

چچا بندو خاں کے پاس اپنی سائیکل تھی۔ وہ مجھے سائیکل پر بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ راستے میں اُن سے گفتگو کرتے ہوئے میں بہت محتاط رہا کیونکہ مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ میری ہونے والی جورو کے ابّا ہیں۔

چچا بندو خاں مجھے ساتھ لیے اپنے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑے انگریز صاحب کے چپراسی ہیں۔ چچا بندو خاں جس اسٹول پر بیٹھے تھے، اُسی کے برابر ایک اور اسٹول ڈال کر اُنھوں نے مجھے بٹھا دیا۔ صاحب اُس وقت تک تشریف نہیں لائے تھے۔

”صاحب کا نام کیا ہے؟“ میں نے یوں ہی چچا بندو خاں سے پوچھ لیا۔

”صاحب لوگوں کا نام نہیں لیا کرتے مگر تم پوچھتے ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ اُن کا نام تھامسن ہے مگر سب اُنھیں سر کہتے ہیں اور تم بھی یہی کہنا!“ چچا بندو خاں نے مجھے ہدایت کی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر ادھر نو بجے اُدھر صاحب بہادر تشریف لے آئے۔ چچا بندو خاں نے اسٹول سے کھڑے ہوتے وقت مجھے بھی کُہنی ماری۔ میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ صاحب کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا مگر گالوں کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ وہ تیز ہوا کے جھونکے کی طرح قریب سے گزر گئے اور میں اُن کا تفصیلی جائزہ نہ لے سکا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ اَدھیڑ عمر ہیں۔

کچھ دیر بعد ہی صاحب کے کمرے سے گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور چچا بندو خاں مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اندر چلے گئے۔

جب وہ لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں کوئی فائل تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ”میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گئے۔

چچا بندو خاں کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اب میں وہاں بیزاری سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے اِسی لیے چچا سے کہا ”مجھے صاحب کے پاس کب لے چلیں گے؟“

”میں نے ابھی صاحب سے بات کر لی ہے۔ اُنھوں نے وقت دے دیا ہے۔“ چچا نے بتایا۔

وہ مزید کچھ کہنے والے تھے کہ میں بول پڑا کیونکہ مجھے پہلے کسی صاحب بہادر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ”وقت دے دیا ہے؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں صاحب لوگ ہر کام وقت پر کرتے ہیں،“ چچا نے اِس طرح کہا جیسے یہ کوئی بڑا کارنامہ ہو، پھر بولے ”صاحب آج ہی دو بج کر سات منٹ پر تم سے ملیں گے۔“

میں نے چاہا کہ سیکنڈز کے بارے میں پوچھ لوں مگر خاموش رہا، پھر قدرے توقف سے پوچھا ”تو کیا اُس وقت تک مجھے یہیں بیٹھنا پڑے گا؟“

”ہاں اور کیا!“ چچا نے جواب دیا ”دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھا لینا!“

”ایسا نہ کروں کہ اِتنے میں گھر کا چکر لگا آؤں؟ ابّا کو بھی بتا دوں گا کہ صاحب نے وقت دے دیا ہے۔“

”نہیں!“ چچا انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے ”اگر تمھیں واپسی میں ایک منٹ بھی دیر ہو گئی تو پھر صاحب تم سے نہیں ملیں گے۔“

میں نے لاکھ کہا کہ ایک بجے تک ہی لوٹ آؤں گا مگر چچا رِسک لینے پر آمادہ نہ ہوئے اور مجھے وہیں بیٹھنا پڑا۔

ایک بجنے والا تھا کہ میری سماعت سے ”بھوں بھوں“ کی آواز

ٹکرائی۔ میں نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا کیونکہ وہ آواز اُدھر ہی سے آئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ایک میم صاحبہ اپنے کتّے یا کتیا کی زنجیر تھامے چلی آرہی تھیں کیونکہ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب میں اُس کی جنس کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

میں کتوں اور اُن کی ماداؤں سے بہت ڈرتا ہوں اِس لیے اُٹھ کر بھاگنے کا قصد کیا مگر چچا شاید میرا ارادہ بھانپ گئے۔ غالباً اُنھوں نے میرے چہرے کی اُڑی ہوئی ہوائیوں سے اندازہ لگایا ہوگا کہ میں ڈر رہا ہوں۔

"ڈرو مت! وہ کاٹتا نہیں ہے۔" چچا نے مجھے تسلی دی اور اِسی سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ کتا اور کتّے والی چچا کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

کچھ دیر بعد ہی میم صاحبہ قریب آگئیں۔ چچا اسٹول سے اُٹھے اور میں بھی! میم صاحبہ نے اپنی نیلی آنکھوں سے مجھے بغور دیکھا اور صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ وہ اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں جس کے سبب اُن کی پتلی پتلی اور چکنی پنڈلیاں مجھے صاف نظر آگئی تھیں جن پر سنہری رُواں تھا۔ میری تمام تر توجہ کیونکہ میم صاحبہ کی طرف تھی اِس لیے وہاں اُن کے کتّے کی موجودگی سے مجھے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

"وہ میم صاحبہ شاید صاحب کی بیٹی تھیں؟" میں نے میم صاحبہ اور صاحب کی عمروں کے فرق کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے چچا سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی۔

چچا نے ایسا مُنہ بنایا جیسے وہ میرا سوال نہ ہو، کڑوی گولی ہو جو اُنھیں مجبوراً نگلنی پڑی ہو۔ غالباً میم صاحبہ کے بارے میں میری تشویش یا اظہارِ خیال سے وہ خوش نہیں ہوئے تھے۔

"وہ صاحب کی بیٹی نہیں، بیوی ہیں۔" چچا نے چند لمحے بعد بتایا، پھر بولے "مگر بیٹے! تمھیں۔۔۔ تمھیں اِن باتوں میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔" اُس کے بعد اسٹول سے اُٹھتے ہوئے کہا "آؤ چلو! ایک بج گیا، کھانا کھاتے ہیں۔"

چچا اپنا ناشتے دان ساتھ لائے تھے جس میں کھانا موجود تھا۔ دُور اندیشی کے سبب وہ کچھ زیادہ ہی کھانا لے کر چلے تھے اِس لیے مزید کھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کھانا کھلا کر وہ چائے پلانے کے لیے مجھے کینٹین میں لے گئے، پھر ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ مجھ سمیت اسٹول پر آبیٹھے۔

"اب بس سات منٹ رہ گئے ہیں۔" اُنھوں نے اپنی ولسکٹ سے جیبی گھڑی نکال کر دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا "اب تم دیکھنا کہ ٹھیک دو بج کر چھ منٹ پر گھنٹی بجے گی اور صاحب مجھے بُلائیں گے۔"

"مگر دو بج کر سات منٹ پر تو وہ مجھ سے ملنے والے تھے؟" میں نے کہا۔

"وہ اِسی لیے تو مجھے بُلائیں گے کہ میں تمھیں ٹھیک وقت پر اندر بھیج دوں۔" چچا نے مسکرا کر "راز" کی بات بتائی۔

پھر وہی ہوا۔ گھنٹی بجتے ہی چچا نے مجھے جیبی گھڑی دِکھائی۔ دو بج کر چھ منٹ ہوئے تھے۔ میں نے دانت نکال کر گردن ہلائی۔ چچا لپک کر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

جب وہ دوبارہ کمرے سے نکلے تو اُن کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ بولے "حالانکہ صاحب کے پاس اُن کی میم صاحبہ موجود ہیں مگر اِس کے باوجود وہ تم سے ملنے پر تیار ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے جیبی گھڑی نکال لی اور سیکنڈ کی سوئی دیکھنے لگے۔ ابھی دو بج کر سات منٹ ہونے میں پندرہ سیکنڈ باقی تھے۔

جیسے ہی پانچ سیکنڈ رہ گئے، اُنھوں نے مجھے اسٹول سے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ پتا نہیں اندر کیا صورت پیش آئے۔

"جاؤ!" معاً چچا نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

میں کانپتے ہوئے قدموں سے اندر گیا اور میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ سامنے سپاٹ دیوار تھی اور دائیں جانب کچھ فاصلے پر دیوار کے نزدیک ایک بڑی سی میز پڑی تھی جس کے پیچھے صاحب بہادر ایک کرسی پر براجمان تھے۔ میز کے دائیں بائیں اور سامنے کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے دو کے سوا تمام کرسیاں خالی تھیں۔ ایک کرسی پر میم صاحبہ بیٹھی تھیں اور دوسری پر اُن کا کتا! میم صاحبہ اور اُن کا کتا میز کی دائیں جانب والی کرسیاں گھیرے ہوئے تھے۔ صاحب بہادر کو یقیناً یہ علم رہا ہوگا کہ میں کمرے میں داخل ہو چکا تھا مگر وہ میری جانب متوجہ ہونے کی بجائے ایک فائل کی ورق گردانی فرما رہے تھے۔ ہاں میم صاحبہ ضرور میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن اُن کا کتا، صاحب بہادر کی طرح مجھ سے بے اعتنائی برت رہا تھا۔

میں لرزتا کانپتا صاحب بہادر کی میز کے قریب پہنچ گیا تو اُنھوں نے اپنا چقندر چہرہ اُٹھایا اور بولے "تم بندو خان کا کون لگتا؟"

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں، ہونے والا داماد، مگر میں نے موجودہ رشتے کو ترجیح دی اور کہا "بھتیجا سر!" میں نے صاحب کی بات کا جواب دانستہ انگریزی میں دیا تھا تاکہ صاحب خوش ہو جائیں اور صاحب واقعی خوش بھی ہو گئے۔

پھر اُنھوں نے میرے سرٹیفکٹ دیکھ کر مزید حیرت اور خوشی کا اظہار کیا اور اپنی میم صاحبہ کو مخاطب کر کے میرے بارے میں بتایا کہ میں مڈل سے ایف اے تک فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن حاصل کرتا رہا ہوں۔

جب صاحب بہادر نے میم صاحبہ کو مخاطب کیا تھا تو مجھے میم صاحبہ کا نام

بھی معلوم ہو گیا تھا۔ اُن کا نام کیٹی تھا۔

میم صاحبہ نے میرا نام پوچھا۔

"اللہ دتا!" میں نے بتایا۔

"ویل ایلا ڈیٹا!" وہ خوش ہو کر بولیں، پھر صاحب بہادر سے سفارش کی کہ وہ مجھے ضرور ملازم رکھ لیں۔ اُس دن پہلی بار مجھے اپنا نام بُرا محسوس ہوا۔ صاحب نے مجھے تین دن بعد دوپہر تین بج کر تین منٹ کا وقت دیا اور بتایا کہ اِس دوران میں وہ میرے لیے کوئی فیصلہ کر لیں گے۔

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور اپنے سرٹیفکٹ واپس لے کر کمرے سے نکل آیا۔

"کیا ہوا بیٹے؟" باہر آتے ہی چچا بندو خاں نے بیتابی سے پوچھا۔

میں نے اُنھیں مختصراً وہ گفتگو بتادی جو اندر ہوئی تھی لیکن دانستہ میم صاحبہ کی سفارش کا ذکر نہیں کیا تاکہ چچا بدک نہ جائیں۔

رخصت ہونے سے قبل چچا بندو خاں نے میرے منع کرنے کے باوجود جیب میں اکنی ڈال دی تاکہ میں تانگے میں بیٹھ کر گھر جاؤں۔

چچا بندو خاں سے رخصت ہو کر میں نے ایک چھوٹی سی راہداری عبور کی، پھر اُس عمارت کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں ابھی اُس عمارت سے نکل کر چند قدم ہی چلا تھا کہ پیچھے سے ایک کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں سڑک کے کنارے ہی چل رہا تھا۔ ہارن سن کر اور کنارے ہو گیا تاکہ وہ کار گزر جائے مگر وہ کار گزرنے کی بجائے میرے بالکل قریب آ کر رُک گئی۔

"ایلا ڈیٹا؟" ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

کار میں میم صاحبہ تھیں۔ میں اُنھیں رک کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ اُن کا کتا کار کی پچھلی سیٹ پر تھا۔

اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا اُن سے اپنے رُکنے کا سبب دریافت کرتا، اُنھوں نے کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول دیا اور بولیں "کم آن!" پھر شاید وہ یہ بھول گئیں کہ میں ایف اے ہوں اور مجھے انگریزی بھی آتی ہے۔ اُنھوں نے مجھے اپنی جگہ پتھر بنا کھڑا ہوا دیکھ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا "آؤ! کار میں بیٹھ جاؤ، ایلا ڈیٹا! ام تم کو گھر بولے گا چھوڑنے گا۔"

"شکریہ خاتون! آپ کو ناحق زحمت ہوگی، میں چلا جاؤں گا۔" میں نے انگریزی بولی تاکہ اُنھیں احساس دلا سکوں کہ مجھے انگریزی بھی آتی ہے۔

اُن کی نیلی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اِس بار اُنھوں نے مجھے انگریزی ہی میں مخاطب کیا مگر میرے نام کا ستیاناس مارنے سے باز نہ آئیں "ایلا ڈیٹا! مجھے زحمت نہیں خوشی ہوگی۔ آؤ اب دیر نہ کرو!"

مجبوراً مجھے اُن کی بات ماننا پڑی اور میں کار میں بیٹھ گیا۔ اُسی وقت اُن کے کتّے نے مجھ سے رقابت محسوس کی اور پیچھے سے بھونکنے لگا۔ یہ سوچ کر میرے پسینے چھوٹ گئے کہ کہیں وہ پیچھے سے میری گردن نہ دبالے مگر میم صاحبہ کی ایک ہی ڈانٹ کھا کر وہ چُپ ہو گیا۔ کتے کو ڈانٹ کر میم صاحبہ نے کار اسٹارٹ کر دی۔

کار میں بیٹھتے ہی میں نے میم صاحبہ کے جسم سے اُٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو محسوس کر لی تھی۔ میم صاحبہ سچ مچ قابلِ دید شے تھیں۔ اگر اُن کی نیلی آنکھوں کا بیلنس ذرا سا آؤٹ نہ ہوتا تو وہ آنکھیں انتہائی خوبصورت کہی جا سکتی تھیں۔ اُن کے دونوں رخساروں پر اگر بڑے بڑے مُہاسے نہ ہوتے تو یقیناً وہ چکنے نظر آتے۔ اگر اُن کے ہونٹ تھوڑے بہت مُنہ سے باہر بھی دکھائی دیتے تو ہرگز اُنھیں دو پتلی پتلی لکیریں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اُن کی ناک اگر آگے سے طوطے کی چونچ جیسی نہ ہوتی تو ستواں ہی دکھائی دیتی۔ اگر اُن کے جسم پر مزید دس بیس سیر گوشت ہوتا تو یوں جگہ جگہ خلا نہ لگتا اور کوئی اُنھیں بانس سے تشبیہ نہ دے سکتا۔ اُن کی آواز میں اگر کسی گھسے ہوئے ریکارڈ کا سا تاثر نہ ہوتا تو لازماً سریلی کہلاتی۔ اُن کے جسم کو دیکھ کر ہر جگہ کسی شے کی کمی محسوس ہوتی تھی مگر اِن تمام "کمیوں" کے باوجود وہ بہرحال ایک عورت تھیں اور اِسی لیے میں اُن سے کچھ ڈرا ڈرا سا تھا۔

"ایلا ڈیٹا! اگر تم سوٹ پہن لو تو بالکل انگریز نظر آؤ!" اُنھوں نے کچھ دیر بعد مجھے مخاطب کیا۔ اب وہ انگریزی ہی میں بات کر رہی تھیں۔

میں اُن کی بات سن کر ریشہ خطمی ہو گیا اور کچھ جواب دینے کی بجائے دانت نکال کر سر ہلا دیا۔ وہ رستے بھر میرا مغز چاٹتی رہیں اور میرے انکار کو انکسار جان کر زبردستی چائے پلانے کے بہانے اپنے بنگلے لے پہنچیں۔ وہاں اُنھوں نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا اور "ابھی آئی" کہہ کر چلی گئیں۔

وہ لوٹ کر آئیں تو اُن کے جسم پر مختصر لباس تھا جس میں اُن کا کھپچی جیسا جسم مزید نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھتے ہی بولیں۔ "تمھارا ملک بہت گرم ہے۔" گویا مختصر لباس کا جواز پیش کر رہی ہوں، پھر کہا "ایلا ڈیٹا! چائے کی بجائے شربت ٹھیک رہے گا، گرمی بہت ہے۔"

میرا جواب سننے سے پہلے وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنے دستِ نازک سے دو گلاسوں میں شربت بنا کر لے آئیں۔

"پیو! ایلا ڈیٹا!" اُنھوں نے چہک کر اپنا گلاس اُٹھا لیا۔

مجھے اُس گلاس سے بدبو کا بھبکا سا نکلتا محسوس ہوا، پھر بھی اُن کی دلجوئی کے لیے گلاس اُٹھا کر ہلکی سی چسکی لی۔ میں نے ایسا کڑوا اور بدبودار شربت پہلے کبھی نہیں پیا تھا۔ مجھے اُبکائی آنے لگی اور میں نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اُسی وقت وہ بھی اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھ رہی تھیں۔

"پیونا ایلا ڈیٹا!" اُنھوں نے اصرار کیا۔ "یہ پینے کے بعد مزا دیتا ہے۔"

میں بڑی مشکل سے اُنھیں یقین دلا پایا کہ اگر ایک گھونٹ شربت بھی پی گیا تو مجھے قے ہو جائے گی۔ اُس کے بعد میم صاحبہ میرا گلاس بھی خود ہی چڑھا گئیں۔ گلاس خالی کر کے میز پر رکھتے ہی اُنھوں نے اتنی تیزی کے ساتھ میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈالیں کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے اظہارِ عشق کر چکی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ اُن کی نیلی آنکھوں میں ڈوبنے کی بجائے تیر جاؤں اور تیرتا ہی چلا جاؤں۔ میم صاحبہ کے جسم سے بڑی سنسنا دینے والی خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں مگر چند ہی لمحوں میں میری فطری بزدلی مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے وہ حسین چانس مِس کر دیا۔ کسی انگریز افسر کی بیوی سے عشق بازی، وہ بھی خفیہ پولیس کے ایک بڑے افسر کی بیوی سے! بیٹا اللہ دتا! وہ جوتے پڑیں گے کہ صورت پہچانے میں نہیں آئے گی۔ میں نے سوچا اور میرے پسینے چھوٹ گئے۔ خیریت اِسی میں ہے کہ بھاگ لو۔

پھر اِس سے پہلے کہ میم صاحبہ دُو چار اینچ اور آگے بڑھ کر میرے کلیجے سے لگ جاتیں، میں نے اُتنی ہی تیزی سے اُن کی بانہیں اپنی گردن سے نکالیں جتنی تیزی سے اُنھوں نے ڈالی تھیں۔ اب ہکا بکا ہونے کی باری اُن کی تھی۔ اُس کے بعد میں نے دروازے کی طرف ریس لگانے میں دیر نہیں کی۔

"ایلا ڈیٹا ڈارلنگ، ایلا ڈیٹا ڈارلنگ!" میم صاحبہ چیختی ہوئی میرے پیچھے بھاگیں۔

میں میم صاحبہ کی آواز سن کر اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ کمرے کے دروازے سے اندر والے صاحب بہادر مجھے دکھائی ہی نہ دیے۔ ٹکر اتنی شاندار تھی کہ صاحب بہادر بھی میرے ساتھ زمین چاٹ گئے مگر اُنھوں نے زیادہ دیر مجھے اپنے جسم پر استراحت نہ فرمانے دیا۔ وہ مجھے اپنے اوپر سے لڑھکا کر کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھ گئے۔

وہاں غیر متوقع طور پر صاحب بہادر کو دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ اگر میں صاحب بہادر کی آواز سن کر ڈر کے مارے اُچھل نہ پڑتا تو نہ جانے کتنی دیر زمین پر اُسی طرح پڑا رہتا لیکن وہ مجھ سے نہیں اپنی میم صاحبہ سے مخاطب ہوئے تھے۔

"کیتھی! مجھے پانچ بج کر پانچ منٹ پر لوٹنا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ تم ..." صاحب بہادر نے کچھ سوچ کر اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور میری طرف پلٹے۔

میں اِس دوران میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں دوبارہ کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتا تھا کیونکہ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ صاحب بہادر نے جب میری طرف اپنی نظر اُٹھائی تو مجھے یوں لگا کہ اب اُنھوں نے پھانسی کا حکم دیا مگر وہ کچھ نہیں بولے۔ اُنھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھاما اور کمرے سے نکل آئے۔ میم صاحبہ اُسی کمرے میں حق دق کھڑی رہ گئی تھیں۔

صاحب بہادر مجھے لے کر ایک اور کمرے میں پہنچے اور وہاں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں۔ اگر صاحب بہادر مزید کچھ دیر مجھے بیٹھنے کا اشارہ نہ کرتے تو میں اُن کا اشارہ ملے بغیر کرسی پر نہیں تو زمین پہ تو بیٹھ ہی جاتا۔

"ایلا ڈیٹا!" صاحب نے بھی میم صاحبہ کی تقلید میں میرے [illegible] کونڈا کیا۔

"یس ... یس ... سر!" میرے مُنہ سے بمشکل نکلا۔

"ہم تم سے خوش ہوئے کیونکہ تم پہلے امتحان میں کامیاب رہے۔" صاحب نے فرمایا۔

"امتحان سر؟" میں باآوازِ بلند بڑبڑایا۔

"ہاں امتحان!" صاحب پُرزور لہجے میں بولے۔ "ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ تمھارا کردار کیسا ہے! اور ہم یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ تم مضبوط کردار کے نوجوان ہو۔ ہم نے خود کیتھی سے کہا تھا کہ وہ تمھارا امتحان لے مگر تم اِس امتحان کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔"

"یس سر!" میں نے اتنی زور سے گردن ہلائی کہ جھٹکا لگتے لگتے بچا۔

"اب تم تین دن بعد تین بج کر تین منٹ پر آنے کی بجائے کل ہی دو بج کر دُو منٹ پر ہم سے دفتر میں ملو گے۔ ہم تمھیں نوکر رکھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ کیا تم ہمارے فیصلے سے خوش ہوئے ایلا ڈیٹا؟"

صاحب کی بات سن کر خوشی کے سبب میرے مُنہ سے آواز نہ نکل سکی اور میں نے زور سے گردن ہلا دی۔ صاحب کی نگاہ اُس وقت مجھ پر جمی ہوئی تھی۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" صاحب نے میری جاں بخشی کا حکم سنا دیا۔

میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور صاحب کو ایک زوردار سلام جھاڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

صاحب کے بنگلے سے نکل کر مجھے کافی دُور پیدل مارچ کرنا پڑا کیونکہ وہاں دُور دُور تک کوئی یکہ یا تانگا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری جیب میں چچا بندو خاں کی دی ہوئی اِکنی کے علاوہ بھی دُو پیسے اور موجود تھے اس لیے میں زیادہ فکرمند نہیں تھا۔ بالآخر مجھے ایک یکہ نظر آ ہی گیا جسے میں نے آواز دے کر روک لیا۔ اُس میں اور بھی سواریاں تھیں۔

"چتلی قبر چھوڑ دو گے؟" میں نے یکے والے سے پوچھا۔

"اندر نہیں جاؤں گا، بس جُمّا مسجد پہ چھوڑ دوں گا اور تین پیسے لوں گا۔" یکے والے نے جواب دیا۔

میں یکے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کی شرائط تسلیم کر لی تھیں کیونکہ جامع مسجد سے چتلی قبر کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

میں عمر کے اِس دَور میں اِتنا ہی بھولا شاہ تھا کہ صاحب بہا

کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے دال میں بہت سا کالا نظر آتا ہے۔ اگر صاحب بہادر اپنی میم صاحبہ کے ذریعے میرا امتحان لے رہے تھے تو پھر اُنھیں دیکھ کر میم صاحبہ کی رنگت کیوں گم ہو گئی تھی؟ اور پھر صاحب بہادر اُن پر ساون بھادوں کی طرح برس کیوں پڑے تھے۔

دوسرے دن میں صاحب بہادر سے ملنے وقت سے کچھ پہلے ہی چچا بندو خاں کے پاس پہنچ گیا اور وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"آج کیسے آ گئے؟ تمھیں تو صاحب نے تین دن بعد بلایا تھا؟"

چچا بندو خاں کا سوال سن کر میں چکرا گیا۔ کچھ دیر تو چپ رہا، پھر ہمت کر کے جھوٹ بولا۔ "صاحب نے مجھے آج ہی دو بج کر دو منٹ پر بلایا تھا۔"

"مگر کل تو تم نے تین دن بعد تین بج کر تین منٹ کہا تھا!"

اب میں اُنھیں کیسے بتاتا کہ چچا، میم صاحبہ کے صدقے میں وقت تبدیل ہو گیا ہے! یوں بھی صاحب بہادر نے تاکید کر دی تھی کہ میں اُس امتحان کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤں۔

"وہ ... وہ میں وقت بھول گیا ہوں گا چچا!" میں نے بہانہ کیا۔

"ایسی باتیں بھولتے نہیں بیٹے!" چچا نے نصیحت کی۔ "صاحب لوگوں کا وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔"

میں نے سعادت مندی سے گردن ہلا دی۔

ٹھیک دُو بج کر دُو منٹ پر میں صاحب کے سامنے مؤدب کھڑا ہوا تھا اور اُس دن صاحب کی نظر فائل پر نہیں مجھ پر تھی۔

"ایلا ڈیٹا! تم نے امتحان کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو نہیں؟" صاحب نے دریافت کیا۔

"نو سر!" میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"بنڈو کان کو بھی نہیں؟"

"نو سر!"

"ویل!" اُنھوں نے مطمئن انداز میں سر ہلا کر گھنٹی بجائی۔ چچا بندو خاں پلک جھپکتے غڑاپ سے اندر آ گئے۔ صاحب نے مخاطب کیا۔ "ٹیماڑی کو ہمارا شلام بولو!"

"یس سر!" چچا بندو خاں اُلٹے قدموں لوٹ گئے اور میں سوچنے لگا کہ یہ ٹیماڑی کیا شے ہے؟

وہ شے بڑی تندرست و توانا نکلی بلکہ نکلا کیونکہ اُس کے چہرے پر تلوار کٹ مونچھیں تھیں۔ صاحب نے مجھے اُس کے سپرد کر دیا۔ اُس کا نام ٹیماڑی نہیں تیواڑی تھا، یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ اُس کے آنے تک صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ باقاعدہ "خفیہ" کی ملازمت میں آنے سے پہلے کم اَز کم چھ مہینے میری تربیت ہو گی۔ چھ ماہ کی مدت کے لیے تیواڑی جی میرے گائڈ بنائے گئے تھے۔ تیواڑی جی، خفیہ کے ڈی آئی جی تھے۔

چھ مہینے کے دوران میں صاحب بہادر نے مجھے بلا کر ایک بار بس لگنے والے [illegible] دیا۔ البتہ چچا بندو خاں جھاڑی کے جھینگرے کی طرح میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ وہ زبردستی دوپہر کا کھانا مجھے اپنے ساتھ کھلاتے تھے بشرطیکہ میں اُن کے ہتھے چڑھ جاؤں۔

تیواڑی جی کو تربیت کے ابتدائی مرحلے ہی میں پتا چل گیا کہ میں انتہائی بزدل واقع ہوا ہوں۔ اگر میں اوپر سے سنا یا ہوا یعنی سفارشی ٹٹو نہ ہوتا تو وہ کب کا مجھے نو دو گیارہ کر چکے ہوتے۔ اپنی دانست میں اُنھوں نے مجھے پستول چلانا، کار چلانا، پھٹ پھٹ چلانا اور نہ جانے کیا کیا چلانا سکھوا دیا تھا۔ تربیت کے دوران میں جو چیز مجھے سب سے اچھی لگی وہ تھی بھیس بدلنا۔ میں نے ایک بار نقلی داڑھی مونچھیں لگا کر ایک بار چچا بندو خاں کو بھی چکر میں ڈال دیا تھا۔

تیواڑی جی اگر میری کسی بات سے خوش تھے تو صرف اِس بات سے کہ میں کبھی کوئی چیز بھولتا نہیں تھا۔ جو بات مجھے ایک بار سمجھا دیتے، دوبارہ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

چھ ماہ کا عرصہ ختم ہوا تو ایک بار پھر صاحب بہادر کے سامنے پیشی ہوئی۔ اِس بار میرے ساتھ تیواڑی جی بھی طلب کیے گئے تھے۔

"ایلا ڈیٹا کو اب کسی کیس پر لگاؤ!" صاحب نے حکم دیا، پھر خود ہی بولے۔ "پہلے اِسے کسی کے ساتھ لگا دو، بعد میں الگ کیس دینا۔"

"یس سر!" تیواڑی جی خم ہو کر بولے۔ "میں اللہ دتا کو انسپکٹر دلاور کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" صاحب نے رضامندی ظاہر کی اور ہاتھ سے میٹنگ برخاست کا سگنل دیا۔

اُسی دن مجھے پستول بھی مل گیا اور اُس میں ڈالنے والی گولیاں بھی کیونکہ اب میں باقاعدہ "خفیہ" میں نوکر ہو گیا تھا۔

اپنے افسر دلاور خاں مجھے ایک آنکھ نہ بھائے کیونکہ اُنھوں نے مجھے روزِ اوّل ہی رعب میں لینے کے لیے گفتگو کا آغاز کچھ اِس طرح کیا تھا۔ "اللہ دتا! میں حرام ہڈ پن بالکل پسند نہیں کرتا۔ مجھے پھرتیلے اور تیز ماتحت پسند ہیں۔"

"یس سر! میں حرام ہڈ پن نہیں کروں گا۔" میں نے اُنھیں یقین دلایا۔

بعد میں تجربے سے ثابت ہوا کہ خود موصوف زبردست حرام ہڈ تھے۔ خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے تھے اور اپنے ماتحتوں کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالتے تھے۔

دوسرے ہی دن صبح اُنھوں نے مجھے ایک شخص کا فوٹو دکھایا اور اُس کا نام پتا لکھوایا، پھر فرمایا۔ "تمھیں اِس شخص کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔"

"یس سر!" میں نے سر ہلایا۔

"تمھیں آج شام چار بجے اِس کی کوٹھی کے سامنے پہنچ جانا ہے اور رات دس بجے تک اُسے نظر میں رکھنا ہے۔" دلاور خاں نے

کی۔

"لیکن سر! اگر وہ نظر ہی نہ آیا تو میں کس پر نظر رکھوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"تو دوسری بات ہے۔" اُنھوں نے کہا۔ "رات دس بجے شہر تمھاری جگہ لے لے تو تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔"

"مگر سر! میں امّی سے تو کہہ کر ہی نہیں آیا کہ آج دیر سے گھر آؤں گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا سر کہ کل..."

"یہ سب بہانے بازیاں نہیں چلیں گی سمجھے!" دلاور خاں برس پڑے۔ "اپنی امّی سے کہہ دو کہ وہ اب تمھیں صبر کر لیں۔"

"جیتے جی؟" میں بڑبڑایا۔

"ہاں!" اُنھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا اور میں اُچھل پڑا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے دلاور خاں کا حکم ماننا ہی پڑا اور ٹھیک وقت پر اُس کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جس کا پتا اُنھوں نے لکھایا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے تو میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا، پھر کہیں وہ شخص نظر پڑا جس پر مجھے نظر رکھنی تھی۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر کوٹھی سے نکلا تھا۔ اب کیا ہو اللہ دتا پیارے! یہ صورت حرام تو کار میں بیٹھ کر رفو چکر ہوا جا رہا ہے؟ میں نے سوچا اور اُسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔ میں اِسی طرح اُسے اپنی نظر میں رکھ سکتا تھا۔ جیسے ہی اُس کی کار قریب آئی، میں نے اُسے ہاتھ اُٹھا کر روک لیا، پھر لپک کر قریب پہنچ گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں بھائی جان؟" میں نے انتہائی عاجزی سے پوچھا۔

"کیوں؟" اُس نے مجھے گھورا۔

"ذرا مجھے بھی جانا تھا۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر مجھے بھی..."

"کہاں جانا ہے تمھیں؟" اُس نے رعونت سے سوال کیا۔

"مجھے... وہ... جہاں آپ... میرا مطلب ہے کہ آپ کہاں تک جا رہے ہیں؟" میں نے اُس کا جواب دینے کی بجائے گڑبڑا کر خود سوال جڑ دیا۔

"دہلی دروازے!" اُس نے جواب دیا۔

"بس مجھے بھی وہیں تک جانا ہے۔" میں جلدی سے خوش ہو کر بولا۔

اُس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور میں جھٹ بیٹھ گیا۔

دہلی دروازے پہنچتے ہی اُس نے کار روک کر سڑک کے کنارے لگا دی اور میری طرف مُڑ کر بولا: "اترو!"

"وہ آپ... یعنی بھائی جان آپ نہیں اُتریں گے یہاں؟" میں نے اُسے کار میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"تمھیں اِس سے کیا مطلب؟" اُس نے آنکھیں نکالیں۔ "مجھے آگے جانا ہے۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ دہلی دروازے تک جا رہے ہیں۔" مجھے اُس کی چار سو بیسی پر غصّہ آنے لگا۔

"اَبے اُترتا ہے کار سے یا دھکا دوں؟" وہ ایک دم تھرا اور بے تحاشا گرجا اور میں ڈر گیا کہ کہیں ہاتھ نہ چھوڑ بیٹھے۔

"اُترتا ہوں بھائی جان، اُترتا ہوں۔" میں سہم کر بولا اور کار سے اُتر گیا۔

مجھے کار سے اُتارتے ہی وہ ہَوا ہو گیا اور میں ہاتھ مَلتا رہ گیا۔ نتیجے میں مجھے دوسرے دن دلاور خاں کی لتاڑ سننی پڑی۔

"تو کیا میں اُس کی کار کے پیچھے پیدل بھاگتا سر؟" میں نے اُن کی ڈانٹ کھا کر آہستہ سے کہا۔

"تم دفتر سے کوئی موٹر سائیکل نہیں لے جا سکتے تھے؟" وہ مجھے گھور کر بولے۔

"مگر سر آپ نے یہ کب بتایا تھا!" میں نے گردن جھکا کر جواب دیا۔

"خود تمھاری کھوپڑی میں اتنا گودا نہیں، بولو؟"

اُن کی دہاڑ سن کر میں گھبرا گیا اور نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا: "نہیں!"

"کیا؟" وہ دوبارہ دہاڑے تب مجھے ہوش آیا کہ میں نے کیا کہہ دیا ہے۔

"کچھ... نہیں... کچھ نہیں سر!"

"دفع ہو جاؤ!" اُنھوں نے ہاتھ اُٹھا کر حکم دیا اور میں دفع ہو گیا۔

دوسرے دن آرڈر ملا کہ میں اُنھیں ٹھیک رات کے گیارہ بجے پہاڑ گنج میں ملوں۔ اُنھوں نے جگہ کا تعین بھی خود فرما دیا تھا کہ مجھے کہاں اُن سے ملنا ہے! مجھے تعجب ہوا کہ یا الٰہی یہ رات کے گیارہ بجے پہاڑ گنج میں طلبی کا کیا مقصد ہے!

میں نے اِس سلسلے میں شرما کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ اُسے بھی ایسے ہی احکامات ملے ہیں۔ اُسی سے مجھے معلوم ہوا کہ اس رات کسی "ڈرامے" کا ڈراپ سین ہونے والا ہے اور جب ڈراپ سین ہوتا ہے تو اُس سین میں دلاور خاں ضرور شامل ہوتے ہیں۔

یہ جان کر میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ اُس رات کوئی مجرم رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا تھا اور اُسے پکڑنے والوں میں یہ غلام بھی شامل تھا۔

میں رات کو ساڑھے دس بجے ہی مقررہ جگہ پہنچ گیا۔ میرے وہاں پہنچنے کے کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہی شرما پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ محکمے کے دو آدمی اور تھے جنھیں میں صرف صورت سے جانتا تھا۔ ہم سب ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔

پھر ٹھیک گیارہ بجے ہم سب الرٹ ہو گئے۔ ایک پھٹ پھٹ

...... حالہ صاحب بہاد

کی پھٹ پھٹ سے سارا علاقہ گونج اُٹھا تھا۔ دلاور خاں ہم تک آ پہنچے تھے۔ اُنھوں نے ہم میں سے کسی کو پھٹ پھٹ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی کہ شور سن کر کہیں مجرم چوکنّے نہ ہو جائیں۔

اُنھوں نے پھٹ پھٹ پیڑ کے نیچے کھڑی کی، پھر ہماری طرف مخاطب ہوئے۔ "تم لوگوں کے پاس پستول موجود ہیں؟"

"یس سر!" سب نے کورس میں جواب دیا۔

"آؤ میرے پیچھے!" یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھے اور ہم سب دُم لگائے اُن کے پیچھے چل دیے۔

پورا پہاڑ گنج سنّاٹے میں ڈوبا ہوا تھا جیسا کہ عموماً ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے البتہ کتے ضرور آہ و بکا کر رہے تھے۔

دلاور خاں ہم سب کو لیے ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رُک گئے، پھر باآوازِ بلند سرگوشی کی۔ "اپنے اپنے پستول نکال لو!"

پستول نکالتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ گیا اور پستول زمین پر گر گیا۔

"یہ کیا بیہودگی ہے؟" دلاور خاں غرّائے۔ "مجرم اِس طرح ہوشیار ہو جائیں گے۔ اب بالکل کسی قسم کا شور نہ ہو۔"

میں نے جھک کر پستول اُٹھا لیا۔ دراصل یہ سوچ کر میری ہوا خراب ہو رہی تھی کہ اگر واقعی گولی چل گئی تو کیا ہوگا؟ میں تو اپنی امّی سے دودھ بخشوا کر بھی نہیں آیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی دلاور خاں آہستہ آہستہ عمارت کے دروازے کی طرف بڑھے اور ہم سب کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ دروازہ کھلتا چلا گیا اور دلاور خاں دروازے سے اندر چلے گئے۔ "کیا اُنھوں نے مجرموں کو اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا کہ وہ آنے والے ہیں، دروازہ کھلا رکھا جائے؟" میں نے سوچا۔

عمارت کی نچلی منزل خالی پڑی تھی۔ دلاور خاں نے حسبِ عادت باآوازِ بلند سرگوشی کی۔ "وہ یقیناً اوپر ہوں گے، چلو!"

ہم سب دلاور خاں کے پیچھے پیچھے اوپری منزل میں پہنچ گئے۔ وہاں بھی تین چار کمرے تھے جو خالی پڑے تھے۔

"سر! وہ کہیں چھت پر چڑھ کر نہ بیٹھ گئے ہوں۔" میں نے ہمّت کر کے کہا۔

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔" دلاور خاں نے اپنی موٹی گردن ہلائی، پھر بولے۔ "چلو چھت پر!"

ابھی ہم سب چھت پر پہنچے ہی تھے کہ نیچے کچھ کھڑبڑ سی سنائی دی۔

"وہ آ گئے، آ گئے!" دلاور خاں چیخ کر زینے کی طرف بھاگے۔

ہم سب دلاور خاں کے ساتھ بھاگتے ہوئے جیسے ہی زینے سے اُترے، حقیقتِ حال سامنے آ گئی۔ اُس عمارت میں آگ لگ گئی تھی اور آگ لگانے والے یقیناً وہی تھے جن کی دلاور خاں کو تلاش تھی۔ شاید پٹرول چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی کیونکہ آگ بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی...

زینے کا دروازہ دھڑا دھڑ جل رہا تھا جس کے ذریعے نیچے پہنچا جا سکتا تھا۔ فرار کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی دوسری منزل بھی آگ کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

"بھاگو، کسی طرح بھاگو!" دفعتاً دلاور خاں چیخے۔ "ورنہ ہم سب جل مریں گے۔"

پھر جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا مگر میرے سینگ کہیں بھی نہ سما پائے کیونکہ میں اُسی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔

دلاور خاں کو میں نے نیچے جانے والے زینے کی طرف بھاگتے دیکھا تھا۔ شرما نے اپنے دو ساتھیوں سمیت گیلری کا رُخ کیا تھا۔ شاید وہ سب گیلری سے چھلانگ لگانا چاہتے تھے لیکن میں نے گیلری سے کودتے ہوئے صرف دو افراد کو دیکھا، تیسرا شاید میری طرح بزدل تھا اور کسی دوسری راہ کی تلاش میں کدھر ہی دوڑ گیا تھا۔

جب شعلوں کی زبانیں میرا جسم چاٹنے کے لیے لپک لپک کر مجھ تک پہنچنے لگیں تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹا جا رہا تھا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ میں بھاگ کر چھت پر چڑھ گیا مگر کچھ دیر بعد ہی آگ میرا تعاقب کرتی ہوئی وہاں بھی پہنچ گئی۔

لو بیٹا اللہ دتا! پہلے ہی مرحلے میں مارے گئے۔ میں نے سوچا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور بظاہر بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ سر منڈاتے ہی تڑاتڑ اولے پڑ گئے تھے جنھوں نے میرے مغز کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ میرے دل میں شدّت سے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کوئی مجھے چھپا لے۔ میں چوہا بن کر کہیں چھپ جاؤں۔ جیسے ہی دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی میں نے چھت پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی منڈیریں تھیں جو ظاہر ہے کہ مجھے اپنی آغوش میں نہیں چھپا سکتی تھیں۔ اُنھی منڈیروں کے قریب ایک جانب کونے میں پختہ اینٹوں سے کوئی چیز بنی ہوئی تھی جس کے اوپر ٹین ڈھکا ہوا تھا۔ یہ شاید پانی کی ٹنکی ہے۔ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میرے قدم تیزی سے اس کی طرف اُٹھے۔ اس کی دیوار میرے قد کے برابر تھی مگر میرے ہاتھ اس ٹین تک ضرور پہنچ سکتے تھے جو اس پر ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے وہ ٹین اس کے اوپر سے کھینچ کر چھت پر ڈال دیا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے اوپر کس طرح پہنچوں۔ وہاں کوئی سیڑھی بھی نہیں تھی جس کے ذریعے چڑھ کر میں بآسانی اوپر پہنچ جاتا۔ چھت پر جو کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا، اس میں ٹوٹی ہوئی کرسیاں اور ٹوٹی ہوئی چارپائیاں تو تھیں مگر کوئی سیڑھی نہیں تھی اور اس کاٹھ کباڑ میں بھی آگ لگ گئی تھی۔

مزاکیا نہ کرتا! میں نے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی منڈیر پر جما دیے اور ہاتھوں پر اپنے جسم کا تمام بوجھ ڈال کر اٹھنے لگا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور ہولناک خیال آیا کہ اگر وہ واقعی پانی کی ٹنکی ہوئی اور اس میں لبالب پانی بھرا ہوا ملا تو کیا ہوگا؟ میں تو اس میں ڈوب جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے دونوں ہاتھ جواب دے گئے اور میں دھم سے چھت پر گر پڑا حالانکہ ایسے موقعوں پر کسی ہیرو سے نازیبا حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ وہ فوراً جہاں چڑھنا چاہتا ہے، چڑھ جاتا ہے خواہ وہ کسی عمارت کی تیسری منزل کی کھڑکی سے لٹک رہا ہو یا کسی پہاڑ کی خطرناک چٹان سے! ہر چند اس وقت میرے سامنے کوئی ایسی خطرناک سچویشن نہیں تھی مگر دل تھا کہ ہولا جا رہا تھا۔

معاً مجھے شعلوں کی لمبی زبانیں اپنے قریب آتی محسوس ہوئیں تو میں بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں دوبارہ کوشش کروں۔ اگر وہاں ہمت کی کمر باندھنے کے لیے کوئی رسّی ہوتی تو مجھے مزید آسانی ہوتی لیکن ایسا نہیں تھا اس لیے میں نے بغیر کمر باندھے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

دھیرے دھیرے میرے پاؤں چھت سے اٹھنے لگے۔ پھر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب میں ٹنکی کی دیوار پر پہنچ گیا۔ وہ پانی کی ٹنکی ہی ثابت ہوئی تھی مگر اس میں لبالب پانی بھرا ہوا نہیں تھا۔ ٹنکی تقریباً نصف خالی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل کچھ مطمئن ہوا۔ اگر میں ٹنکی میں کود ہی پڑتا تو زیادہ سے زیادہ میری کمر تک پانی آتا۔ میں نے اس چھوٹی سی ٹارچ کو جلا کر پانی کی ٹنکی کا جائزہ لیا تھا جو میرے پاس موجود تھی کیونکہ آگ لگنے کے سبب جو روشنی پھیلی ہوئی تھی، وہ ٹنکی کے اندر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

وہ دسمبر کا مہینہ تھا اور کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میری بتیسی میرے قابو میں نہیں تھی اور مختلف راگ الاپ رہی تھی۔ اگر میں اس سردی میں پانی کے اندر کود پڑتا تو یقیناً مجھے نزلہ زکام ہو جاتا۔ میں نے دیوار پر چڑھنے کے بعد پانی کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ ہرگز اس میں نہیں اتروں گا۔

ٹنکی کی دیوار اکہری اینٹ کی بنی ہوئی تھی اور میں اس پر کسی بندر کی طرح براجمان، اپنے کانپتے ہوئے جسم کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ اب تک میں نے پانی کی ٹنکی ہی میں جھانکا تھا اور مجھے دیوار پر چڑھے چند ہی لمحے گزرے تھے۔ مجھے اب تک یہ احساس نہیں تھا کہ اگر میرے جسم کا ذرا بھی توازن بگڑا تو میں

اس عمارت کی تیسری منزل سے بغیر کسی روک ٹوک کے سیدھا ملکِ عدم سدھار جاؤں گا لیکن میں زیادہ دیر اس بات سے بے خبر نہ رہ سکا۔ میری نگاہ جیسے ہی اپنی دائیں جانب گئی، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بہت نیچے مجھے روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور لوگ اوپر منہ اٹھائے میری طرف دیکھ دیکھ کر چیخ رہے تھے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے بہت زور کا چکر آیا اور خیال ہوا کہ بس گر ہی گیا لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو پھر میں اپنی امر کہانی کیسے لکھ پاتا! شاید اسی لیے میں اس عمارت کی تیسری منزل سے براہِ راست ملکِ عدم جانے کی بجائے پانی کی ٹنکی میں جا پڑا۔ خیریت یہ ہوئی کہ میرا سر ٹنکی کی دیوار سے نہیں لگا ورنہ چودہ یا اس سے کچھ زیادہ طبق روشن ہو جاتے۔

یہ احساس ہوتے ہی کہ میں پانی کی ٹنکی میں گرا ہوں، میرے اوسان کوچ کرتے کرتے واپس آ گئے۔ ناک، کان اور منہ میں اچھی طرح پانی بھرنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسی وقت مجھے اپنے دائیں پیر کے قریب کوئی چیز پڑی محسوس ہوئی جس سے کھڑا ہوتے وقت میرا پاؤں ٹکرایا تھا۔ میں نے پیر سے اس چیز کو پھر ٹٹولا۔ کہیں یہ کوئی پانی کا جانور تو نہیں؟ میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں نے سنا تھا کہ جس طرح خشکی کے جانور ہوتے ہیں پانی کے جانور بھی ہوتے ہیں۔ پھر یہ سوچ کر میری ڈھارس بندھی کہ اگر واقعی وہ کوئی خوفناک جانور ہوتا تو اب تک مجھ پر حملہ آور ہو جاتا اور میرا تیا پانچا کر دیتا۔ یہ پانی کا کوئی جانور نہیں، کچھ اور ہے۔ پھر یہ کیا ہے؟ میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا اور اتنا بڑھا کہ میں نے ہر خطرے کی پروا کیے بغیر اس چیز کو پانی سے نکال لیا۔

اس چیز کو میں نے پانی سے نکالا تو بھاری محسوس ہوئی۔ وہ جو کچھ بھی تھا، کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے کپڑے کی گانٹھیں مشکل ہی سے کھلی تھیں مگر میں کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ محسوس کر کے میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ کپڑے کے اندر بندھے ہوئے بھاری زیورات تھے جن میں جڑے ہوئے ہیرے نیم تاریکی میں جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں نے وہ زیورات کپڑے میں باندھ دیے اور سوچنے لگا کہ اگر میری امی اتنے سارے زیورات دیکھ لیں تو بیہوش ہی ہو جائیں۔ میں نے کپڑے کی وہ پوٹلی اس طرح سینے سے چمٹالی جس طرح بندریا اپنے بچے کو سینے سے چمٹا لیتی ہے۔ یقیناً یہ زیورات انہی ناہنجاروں کی ملکیت

جنھوں نے مجھے، میرے باس دلاور خاں اور اس کے بقیہ ماتحتوں کو ڈاج دے کر آگ میں زندہ جلا دینا چاہا تھا۔

مگر ان کمبختوں نے وہ قیمتی زیورات پانی میں کیوں ڈال دیے تھے، یہ بات بہر حال میری چھوٹی سی کھوپڑی میں نہیں سما رہی تھی۔

وہ زیورات پانے کی گرمی تھی یا کچھ اور کہ کمر تک پانی میں کھڑے رہنے کے باوجود بھی اب تک مجھے چھینکیں نہیں آئی تھیں۔ پہلی چھینک مجھے اس وقت ہی آئی جب میں نے قریب ہی شور سا سنا۔ وہ شور یقیناً نچلی منزل سے آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کسی نے چیخ کر کہا کہ وہ شخص نیچے سے عمارت کی چھت پر بھی دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اسی کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرنالہ بہہ نکلا ہو۔ میں کچھ بھی نہ سمجھا۔ پھر جب میں نے چھت پر قدموں کی دھمک سنی تو ایک دم چابی بھرے ہوئے کھلونے کی طرح چیخ اٹھا: ”میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں!“

”وہ.... وہ اُدھر!“ کوئی چیخا۔

”وہ شاید پانی کی ٹنکی ہے اور وہ شخص غالباً اسی میں ہے۔ آؤ!“ ایک دوسری آواز آئی۔

”ہاں ہاں میں یہیں ہوں، پانی کی ٹنکی میں!“ میں نے پھر چیخ کر آنے والوں کو متوجہ کیا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی مجھے پانی کی ٹنکی سے کھینچ کر نکال لیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ آگ بجھانے والے عملے کے آدمی تھے۔ ان کے جسموں پر موجود لباس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ انہی میں سے دو کے ہاتھوں میں ایک موٹا سا پائپ تھا جس سے پانی کی موٹی سی دھار نکل کر چھت کو سمندر بنانے کے درپے تھی۔ پھر انہی میں سے کسی کو یہ خیال آیا تھا کہ پانی بے سبب بہہ رہا ہے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا دیوار کی منڈیر تک گیا تھا اور چیخ کر پانی بند کرنے کے لیے کہا تھا۔

آگ پر پوری طرح قابو پایا جا چکا تھا مگر اب بھی دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنا پائپ وغیرہ لپیٹنے میں لگ گئے کیونکہ اب پانی آنا بند ہو گیا تھا۔ میں موقع دیکھ کر نیچے جانے والے زینے کی طرف بڑھا مگر میرے قدم پھر رک گئے۔ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہی نیچے اتروں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایک آدھ چنگاری اِدھر اُدھر دبی رہ گئی ہو جس سے میری جانِ ناتواں کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے۔

میں آگ بجھانے والے عملے کے ساتھ عمارت سے نیچے آیا تو باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ وہاں پولیس والے بھی پہنچ چکے تھے جو لوگوں کو آگے جانے سے روک رہے تھے۔ وہیں میں نے ایک جانب ایمبولینس کھڑی ہوئی دیکھی۔ ایمبولینس کے قریب ہی ایک جیپ موجود تھی۔ میں نے اس جیپ سے پشت لگائے تلوار کٹ مونچھوں والے ڈی آئی جی تیواڑی جی کو دیکھا جو حسبِ معمول سادہ لباس میں تھے۔

مجھے عمارت کے دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہی تیواڑی جی تھے جنھوں نے خفیہ میں باقاعدہ نوکر ہونے سے پہلے میری تربیت کے فرائض انجام دیے تھے۔ میں زیورات کی پوٹلی سنبھالے ان کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے ان کی اس وقت وہاں موجودگی پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔

جیسے ہی میں تیواڑی جی کے قریب پہنچا، انھوں نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک شخص سے مخاطب ہوئے: ”ایمبولینس اب واپس بھیج دو!“ پھر قدرے توقف سے ذرا تحکمانہ انداز میں بولے: ”ممکن ہے مجرم اس عمارت میں کوئی اہم چیز چھپا گئے ہوں جسے لینے وہ پھر آئیں اس لیے تم لوگوں کو عمارت کی نگرانی کرنی ہے!“

”ٹھیک ہے سر!“ جواب میں اس شخص نے کہا جس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شاید میں نے خفیہ کے دفتر میں دیکھا تھا۔

میں ابھی تک جیپ کے باہر ہی کھڑا تھا۔ اس شخص سے گفتگو کر کے تیواڑی جی میری طرف پلٹے: ”اللہ دتا! تم ابھی تک جیپ میں نہیں بیٹھے!“ اسی کے ساتھ ان کی نگاہ میرے پاس موجود کپڑے کی پوٹلی پر پڑی: ”یہ کیا ہے؟“

”یہ... یہ سر!... وہ زیور... زیورات...“ میں ان کے غیر متوقع سوال سے بوکھلا گیا جیسے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔

”کیا؟“ وہ اچھل پڑے: ”یہ تمھیں کہاں ملے؟“

”پ... پانی... پانی کی ٹنکی میں!“ میں نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”اچھا اب میں سمجھا۔“ تیواڑی جی ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ”تمھیں دلاور خاں نے بتا دیا ہوگا کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے مگر...“ کچھ کہتے کہتے وہ رک گئے، پھر بولے: ”تمھیں ابھی شاید اندازہ نہیں کہ تم نے کتنا زبردست کارنامہ انجام دیا ہے۔ بہرحال آؤ میرے ساتھ! میں تفصیل کے ساتھ تمام واقعات جاننا چاہتا ہوں کیونکہ تم اس عمارت سے نکلنے والے واحد شخص ہو جو بقید ہوش و حواس ہو۔“

”کیا بقیہ افراد اللہ کو پیارے ہو گئے سر؟“ میں نے غمگین لہجے میں پوچھا۔

”نہیں!“ انھوں نے جواب دیا۔ ”صرف راٹھور شدید زخمی ہے جس کے بچنے کی امید نہیں کیونکہ وہ بُری طرح جل گیا ہے۔ انسپکٹر دلاور، شرما اور محمود بھی زخمی اور بیہوش ہیں مگر ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔

میں گھوم کر ان کی برابر والی نشست پر آ بیٹھا اور میرے بیٹھتے ہی انھوں نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے

کہ ہر پہلو سے مجھے ہی داد ملے۔

"..... اور سر! جب عمارت میں ہر طرف شعلے ہی شعلے بھڑک اُٹھے تو دلاور خاں سمیت سب کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے۔ اگر وہ طوطے اپنے ساتھ نہ لاتے تو بھلا کیوں اُڑتے!" میں پُرجوش انداز میں واقعات بیان کر رہا تھا۔

"تم نے یہ کیا بکواس شروع کر دی!" تیواڑی جی نے مجھے ٹوکا۔ "یہ درمیان میں طوطے کہاں سے آکودے؟"

"یہ محاورہ ہے سر!" میں نے وضاحت کی "آپ اپنی آسانی کے لیے طوطوں کی بجائے یہاں چڑیاں بھی اُڑا سکتے ہیں لیکن چڑیا' طوطے کی نسبت چھوٹا جانور ہوتا ہے۔ اس چھوٹے جانور کے اُڑنے سے وہ تاثر اور رنگ پیدا نہیں ہوتا جو طوطوں سے...؟ کوئی سوال کر سکتے" میں بول اٹھا "سر! آپ..... آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"یہ بات میرے علم میں تھی کہ دلاور آج آپریشن کر رہا ہے اس لیے میں اس کی طرف سے چوکنا تھا۔ میں کبھی اپنے ماتحتوں کی طرف سے غافل نہیں رہتا اسی لیے مجھے فوراً اطلاع مل گئی کہ وہ کن حالات کا شکار ہو گیا ہے" تیواڑی جی نے بتایا۔

"آپریشن!" میں ان کی بات سن کر حیرت سے بولا "سر!... کیا وہ..... وہ ڈاکٹر بھی ہیں؟"

تیواڑی جی ہنس پڑے' پھر بولے "کبھی کبھی تم مجھے انتہائی بیوقوف معلوم ہوتے ہو اور کبھی کبھی انتہائی ذہین! تم اتنے دن سے میرے ساتھ ہو مگر میں تمھیں اب تک نہیں سمجھ سکا۔"

"یہی میرے ابا بھی کہتے ہیں۔ وہ بھی مجھے نہیں سمجھ پائے۔" میں خوش ہو کر بولا جیسے یہ بھی میرا کوئی کارنامہ ہو۔

تیواڑی جی میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولے "تمھارا بالکل صحیح سلامت اس عمارت سے نکل آنا اور وہ بھی زیورات برآمد کرنے کے بعد' اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ذہین اور بہادر ہو۔"

"اس میں کیا شک ہے" میں نے آہستہ سے کہا اور میرا سینہ پھول گیا مگر فوراً ہی احساس ہو گیا کہ مجھے خود اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہیے۔

"کیا؟" تیواڑی جی غالباً میری بات نہیں سن سکے تھے۔

"عزت افزائی ہے حضور کی ورنہ بندہ اسی قابل ہے... وہ میرا مطلب یہ کہ کس قابل ہے" میں جلدی سے بولا اور دانت نکال دیے۔

"مجھے تفصیل بتاؤ!" تیواڑی جی نے کہا۔

بڑ ہانکنے اور شیخی بگھارنے کا سنہری موقع ملتے ہی میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں نے نمک مرچ لگا کر وہ واقعہ اس طرح بیان کیا کہ احساس نہیں تھا کہ اگر میرے جسم کا ذرہ

"تم اصل واقعات بیان کرو گے یا طوطوں اور چڑیوں کی کہانیاں سناتے رہو گے!" تیواڑی جی نے ڈانٹ پلائی حالانکہ اس سرد موسم میں وہ مجھے چائے پلاتے تو زیادہ مناسب تھا۔

تیواڑی جی کی ڈانٹ پی کر میرے راہوارِ خیال کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا مگر اتنا بھی نہیں کہ بالکل جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ میں نے محاورے کی جان بخش دی اور بقیہ واقعات بیان کرنے لگا "یوں ہوا سر کہ جب دلاور خاں اور میرے ساتھی بوکھلا کر اِدھر اُدھر یکشت بھاگ کھڑے ہوئے تو میرے ذہن میں ایک اچھوتے خیال نے جنم لیا۔ میں حالات کی ستم ظریفی سے قطعی نہیں گھبرایا۔ میں نے سوچا کہ ایسے ہی موقعوں پر مردانگی اور ذہانت کا امتحان ہوتا ہے۔ جس خیال نے میرے ذہن میں جنم لیا تھا' وہ یہ تھا کہ عمارت کی چھت پر یقیناً پانی کی ٹنکی ہو گی اور اسی میں چھپ کر آگ سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں..."

"مگر تم نے اپنے اس اچھوتے خیال سے دلاور خاں کو آگاہ کیوں نہیں کیا؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

"سر! وہ میرے ذہن میں اس خیال کے جنم لینے سے پہلے ہی ریس لگا چکے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا آگے بیان کرو!" تیواڑی جی میرے جواب سے مطمئن ہو کر بولے۔

"بس پھر کیا تھا سر! میں یکشت چھت کی طرف جانے والے زینے کی طرف ہو لیا۔ پھر چھت پر پہنچ کر میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ وہاں میری توقع کے مطابق پانی کی ٹنکی موجود تھی مگر اس ٹنکی پر چڑھ کر اس میں غوطہ زن ہونا ہنسی کھیل نہیں تھا سر! اگر ٹنکی کی دیوار پر چڑھتے ہوئے مجھ سے ذرا سی بھی اندازے کی غلطی ہو جاتی تو میں ملکِ عدم کا ٹکٹ کٹا لیتا۔" یہ کہہ کر میں نے داد طلب انداز میں تیواڑی جی کی جانب دیکھا۔

وہ غالباً سمجھ گئے کہ اس موقع پر مجھے داد کی طلب محسوس ہو رہی ہے اسی لیے بولے "تم ٹھیک کہہ رہے ہو اللہ دتا! میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس وقت تم نے کتنی ہمت و بہادری کا ثبوت دیا ہو گا۔"

بیٹا! اگر مجھے سچ مچ پتا چل جاتا کہ میں کتنا خطرناک قدم اٹھا رہا ہوں تو ہرگز وہاں نہ چڑھتا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور پھر بولا "مجھے معلوم تھا سر کہ کتنا خطرناک قدم اٹھا رہا ہوں مگر میں نے اس کے باوجود ہمت کا دامن نہ چھوڑا اور ٹنکی کی دیوار پر چڑھ گیا۔ وہاں بیٹھے رہنا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ ٹنکی کی دیوار اُبھری اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور گر بھی سکتی تھی اس لیے میں نے نزلے زکام کی پروا کیے بغیر ٹنکی میں اترنے کا اہم فیصلہ کیا۔ یہی وہ لمحے تھے سر! جب

میرے ذہن میں ایک اور اچھوتے خیال نے جنم لیا۔ بتائیے وہ خیال کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے لگے ہاتھوں تیواڑی جی کی ذہانت جانچنے کی غرض سے کہا۔

"میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں اللہ دتا کہ اس وقت تمھارے دماغ میں کیا سمائی!" تیواڑی جی خوش مزاجی سے بولے۔ "تمھی بتاؤ تو پتا چلے۔"

"کیا آپ یقین کریں گے سر! میرے پاس دلاور خاں نے مجھے زیورات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا؟" میں سینہ پھلا کر بولا۔

"کیا واقعی؟" تیواڑی جی نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ حقیقت ہے سر! اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو جب وہ عالم ہوش میں تشریف لائیں تو ان سے پوچھ لیجیے گا۔" میں نے مزید ڈینگ ماری "یہ کارنامہ میں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر انجام دیا ہے۔"

"پھر تو واقعی تم نے کمال کیا اللہ دتا!" تیواڑی جی نے میری ذہانت کا اعتراف کیا۔

"میں نے سوچا کہ یقیناً میرے باس دلاور خاں وہاں مالِ مسروقہ برآمد کرنے پہنچے ہوں گے۔ مجرموں نے وہ مالِ مسروقہ لازماً کسی خفیہ جگہ چھپا رکھا ہو گا جہاں نظر نہ جا سکے۔ پھر جب میرے باس نے اچانک ان پر ہلّا بول دیا ہو گا تو وہ فرار ہوتے وقت مالِ مسروقہ نکال کر نہ لے جا سکے ہوں گے۔ یہ خیال آنا تھا کہ میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو مجرموں نے مالِ مسروقہ اسی پانی کی ٹنکی میں چھپایا ہو گا۔ پھر میں نے ٹنکی کا کونا کونا جھاڑ لینا شروع کر دیا۔"

"کیا لینا شروع کر دیا؟" تیواڑی جی نے دریافت کیا۔

"وہ میرا مطلب ہے کہ میں نے ٹنکی کے اندر مالِ مسروقہ کی تلاش شروع کر دی' اور اس وقت میرا دل لوٹن کبوتر ہو گیا جب میں نے مالِ مسروقہ برآمد کر لیا۔"

"کمال کر دیا تم نے اللہ دتا!" تیواڑی جی مجھ پر صدقے واری ہونے لگے۔ پھر انھیں اسی وقت نہ جانے کیسے یہ خیال آ گیا کہ میرے جسم پر گیلے کپڑے ہیں۔ وہ بولے "اللہ دتا! تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی؟"

اب تک اپنا کارنامہ بیان کرنے کے جوش میں میرا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ تیواڑی جی نے جو مجھے یہ دھیان دلایا تو مجھ پر معاً کپکپی طاری ہونے لگی۔

"ہاں... ہاں سر! لگ تو... رہی ہے سردی!" میں بولا اور اپنی بتیسی کو قابو میں کرنے لگا۔

"بس اب ہم جامع مسجد کے قریب پہنچنے والے ہیں۔" انھوں نے مجھے تسلی دی "میں نے تمھارا گھر نہیں دیکھا' راستہ بتا دینا کہ کدھر چلنا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ انھوں نے مجھے میرے گھر کے دروازے پر چھوڑا اور مجھ سے زیورات کی پوٹلی لے کر رفوچکر ہو گئے۔

اماں نے اس رات میرے دیر سے گھر آنے پر بڑا اُدھم مچایا اور میں بڑی مشکل سے انھیں یہ یقین دلا سکا کہ ڈیوٹی کر کے آ رہا ہوں۔ امی کے دل میں مسلسل ہول اُٹھ رہے تھے۔ جس وقت میں گھر پہنچا اس وقت بھی وہ بیت الخلا میں تھیں۔ بیت الخلا سے نکل کر وہ سیدھی بغیر ہاتھ دھوئے میری طرف لپکیں اور مجھے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔

"مجھے نہیں کرانی ایسی نوکری!" وہ اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے پونچھتی ہوئی بولیں "بھاڑ میں گئی ایسی نوکری جس میں نہ دن چین نہ رات چین!" پھر ابا پر برس پڑیں "تمھی نبد خاں کی باتوں میں آ گئے۔ میں ہوتی تو کبھی نہ مانتی۔"

"تو کیا لگی لگائی نوکری چھڑوا دوں۔ جیسے تیسے چار پیسے کا سہارا ہوا ہے تو اب تم اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہو۔" ابا نے پہلے لال اور اس کے بعد پیلے ہو کر کہا' یا شاید بیک وقت لال پیلے ہو کر کہا۔

"تو میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ منی نوکری چھڑوا دو۔" امی نرم پڑ کر بولیں۔ انھیں شاید ان پیسوں کا خیال آ گیا تھا جو ہر ماہ میں انھیں لا کر دیتا تھا۔ "میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں کہ ان سے کہہ دو کہ لڑکا رات کو کام پر نہیں جائے گا۔"

"لو اور سنو! وہ بھی کیا میرے سسرالیے ہیں جو میری بات مان لیں گے اور..." یہ کہتے ہوئے اچانک ابا کی نظر میرے گیلے کپڑوں پر پڑ گئی۔ اب تک امی اور ابا میں سے کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ وہ بولے "اللہ دتے! یہ تیرے کپڑے کیسے گیلے ہو رہے ہیں؟"

سچ بات میری زبان پر آتے آتے رہ گئی کیونکہ ٹریننگ کے دوران میں مجھے بتایا گیا تھا کہ دفتر کی کوئی بھی بات مجھے کسی کو نہیں بتانی' خواہ وہ میرے گھر والے ہی کیوں نہ ہوں۔

"وہ ابا!... باہر... وہاں جہاں میں گیا تھا' بارش ہو رہی تھی۔" میں نے گڑبڑا کر بات بنائی۔

"بارش! ابے یہ بے موسم بارش کہاں ہونے لگی؟" ابا بولے۔

"پہاڑ گنج میں!" میرے منہ سے نکل گیا۔

"پہاڑ گنج میں بارش! کیا بک رہا ہے؟"

"ارے اب تم اسے کپڑے بھی بدلنے دو گے کہ نہیں!" امی درمیان میں بول اٹھیں "کہیں سردی نہ لگ جائے۔ جا' جلدی سے کپڑے بدل کر لحاف میں دُبک جا!" امی نے مجھ سے کہا۔

میں نے وہاں سے پھوٹ لینے ہی میں عافیت جانی۔

دوسرے دن میں دفتر پہنچا ہی تھا کہ تیواڑی جی کے اردلی نے

آکر کہا: "صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔"
"اچھا تو ان سے بولو کہ میں بس ابھی پیشاب کر کے آیا۔"
"اچھا صاحب!" اردلی نے کہا اور تیزی کے ساتھ اس کمرے سے نکل گیا جہاں میرے علاوہ شرما بھی بیٹھتا تھا۔

مجھے واقعی پیشاب لگ رہا تھا اس لیے میں نے پہلے بیت الخلا کا رخ کیا اور پھر وہاں سے ڈی آئی جی تیواڑی جی کے دفتر پہنچ گیا۔
"آؤ آؤ، اللہ دتا!" کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے مجھ سے کہا، پھر اپنی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب میں کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ پھر بولے۔ "آج صبح ہی صبح میں نے تمھیں ایک خوشخبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔ تم بتاؤ کہ وہ خوشخبری کیا ہو سکتی ہے؟"
"خوشخبری!" میں حیرت سے بولا۔ "کہیں وہ خوشخبری یہ تو نہیں کہ میری کارکردگی سے خوش ہو کر آپ نے مجھے کچھ دن کی چھٹی دینے کا فیصلہ کیا ہے!"
"اب چھٹی بھول جاؤ۔" وہ ہنس کر بولے۔ "اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد رہا، سمجھے!"
"نہیں سمجھا سر!" میں نے اپنی کم مائیگی کا اعتراف کیا۔
"تو سمجھو کہ آج سے تمھیں ترقی دے کر انسپکٹر بنا دیا گیا ہے۔ میں نے آج دفتر آتے ہی آئی جی صاحب سے تمھارا کارنامہ بیان کیا تھا۔ وہ اسے سن کر بہت خوش ہوئے۔ انھی کے حکم پر اب یہ کیس تمھارے سپرد کیا جا رہا ہے۔ انسپکٹر دلاور سے یہ کیس واپس لے لیا گیا ہے۔"
"انسپکٹر اللہ دتا!" میں خوش ہو کر بڑبڑایا۔
"لو یہ اس کیس کی فائل ہے۔" تیواڑی جی نے ایک فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم آج اطمینان سے اس کا مطالعہ کرو اور کل سے اس کیس پر کام شروع کر دو۔ اسسٹنٹ انسپکٹر کمال تمھارا ماتحت ہو گا۔ میں ابھی احکامات جاری کر دوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو تمھیں مزید ماتحت بھی فراہم کر دیے جائیں۔ اب تو سمجھ گئے؟"
"مگر سر! یہ کون سا کیس ہے؟" میں نے فائل لے کر اپنی گود میں رکھتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔
"وہی جس پر پہلے دلاور کام کر رہا تھا مگر مجرم اب تک قانون کی گرفت سے باہر ہیں۔ تمھیں انھی مجرموں کو تلاش کرنا ہے جو اس عمارت کو آگ لگا کر فرار ہو گئے تھے۔"
"تو کیا ان کا پتا اس فائل میں موجود ہے سر؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔
تیواڑی جی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی خوش مزاجی رخصت ہونے والی ہے۔
"خیر... خیر سر!... کوئی... کوئی بات نہیں۔ اگر ان کا پتا فائل میں نہ بھی ہوا تو میں... میں... کیا کروں گا سر؟" میں اپنا جملہ ختم کرتے کرتے پھر ہکلا گیا۔
"میرا سر!" تیواڑی جی آخر بپھر ہی گئے۔
"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" میں بدحواسی میں کہہ گیا۔
"کیا ٹھیک رہے گا؟" تیواڑی جی نے مجھے گھور کر پوچھا۔
اب مجھے ہوش آیا کہ میں کیا کہہ گیا تھا۔ "کک... کچھ نہیں سر۔ کچھ بھی نہیں... میں ابھی ان کمبختوں کو آپ کے پاس پکڑ کر لاتا ہوں۔ بس ذرا فائل میں ان کا پتا ڈھونڈ لوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اپنی مصروفیت کے سبب ان کا پتا تلاش نہ کر پائے ہوں گے مگر میں... میں ضرور سر!..."
"شٹ اپ!" تیواڑی جی دہاڑے۔
میں سہم کر رہ گیا۔ مجھے ان کے غصے سے بڑا خوف آتا تھا۔ وہ بالکل میرے ابا کی طرح لال پیلے ہونے لگتے تھے۔ ایسے موقعوں پر میں ابا کے سامنے سے بھی نو دو گیارہ ہو جاتا تھا اور ان کے سلسلے میں بھی یہی نسخہ آزماتا تھا۔ تربیت کے دوران میں بھی بارہا میں یہ نسخہ آزما چکا تھا اس لیے اس وقت بھی اسی پر عمل کیا۔
"سر! میں جاؤں؟" میں نے سر جھکا کر کہا تاکہ ان کی خوفناک آنکھوں اور تلوار کٹ مونچھوں پر میری نگاہ نہ پڑے۔
"دفع ہو جاؤ!" وہ گرجے۔ "مگر سنو تم اس کیس کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کرتے رہو گے۔"
"یس سر!" میں نے جلدی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی میں مجھے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ان کی دی ہوئی فائل میری گود میں رکھی ہے۔ اٹھنے کے سبب فائل گر گئی۔ میں نے جلدی سے جھک کر فائل اٹھائی اور اتنی تیزی سے دروازے کی طرف لپکا جیسے موت تعاقب میں ہو۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کئی عدد لمبے لمبے سانس لیے اور فائل میز پر رکھ کر کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند لیں تاکہ گزرے ہوئے تلخ لمحات کو ذہن سے جھٹک سکوں۔ بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا بلا میرے گلے پڑ گئی تھی۔ نہ گزشتہ شب مجھ سے ایک عدد کارنامہ سرزد ہوتا نہ یہ مصیبت آتی۔ اگر ایک آدھ چنگاری میرے کپڑوں پر بھی آ گرتی تو کیا برا تھا، کم از کم کچھ دن تو امن چین سے اسپتال میں پڑا ہوا آتی جاتی نازک اندام نرسوں کو دیکھتا رہتا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
میں نے کچھ دیر کے بعد وہ فائل اٹھائی جس پر بڑے بڑے لفظوں میں "وشوا ناتھ کیس" لکھا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ بدبخت وشوا ناتھ کون ہے جو خواہ مخواہ میرے گلے پڑ گیا ہے۔ میں نے سوچا اور فائل کھولی۔
فائل میں اتنی دلچسپ، مربوط اور کہانی آمیز رپورٹ درج تھی

کہ میں اسے پڑھتا ہی چلا گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ دلاور خاں اگر خفیہ میں انسپکٹر نہ ہوتے تو بہترین افسانہ نگار ہوتے اور ان کا نام بھی میری طرح امر ہو جاتا۔
فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کیس کی ایک ایک تفصیل میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔
سیٹھ وشوا ناتھ دہلی کے امیر و کبیر لوگوں میں سے تھا۔ گزشتہ دنوں اس کی حویلی واقع قرول باغ میں چوری ہو گئی۔ چور سیٹھ وشوا ناتھ کی تجوری توڑ کر نہایت قیمتی زیورات چرا لے گئے تھے۔ پہلے پولیس نے زیورات برآمد کرنے اور چوروں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ناکامی کے بعد یہ کیس خفیہ کے سپرد کر دیا گیا تھا کیونکہ سیٹھ وشوا ناتھ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ پولیس اس کیس کا فائل بند کر کے چین کی بانسری بجانے لگتی۔ تفتیش کرنے کی صورت میں ایک مالدار شخص بھگوان داس سامنے آیا تھا جس پر سیٹھ وشوا ناتھ نے اپنے شبہے کا اظہار کیا تھا حالانکہ بھگوان داس خود ایک سرمایہ دار تھا مگر سیٹھ وشوا ناتھ نے یہ دلیل دی تھی کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کے لیے ایسا کرا سکتا ہے۔
دلاور خاں نے بھگوان داس کی نگرانی شروع کرا دی تھی اور ان نگرانی کرنے والوں میں خادم حسین بھی شامل تھا۔ فائل میں بھگوان داس کی ایک تصویر لگی ہوئی تھی جسے دیکھتے ہی میں چونک پڑا تھا۔ یہ وہی کمبخت تھا جس کا میں نے ایک بار اسی کی کار میں اسی کے ساتھ بیٹھ کر تعاقب کرنا چاہا تھا اور وہ مجھے دہلی دروازے اتار کر چمپت ہو گیا تھا۔
واہ بیٹا! اب پکڑے گئے۔ میں نے اس کی تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔
بھگوان داس کی نگرانی سے پتا چلا تھا کہ وہ کچھ مشتبہ افراد سے بھی ملتا جلتا ہے جن کی رہائش پہاڑ گنج میں ہے۔ وہ لوگ دہلی کے باشندے نہیں تھے اور دہلی میں اجنبی تھے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ انھی میں سے ایک کا تعاقب کر کے ان کی رہائش گاہ کے بارے میں پتا چلایا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد ان چاروں کی نگرانی بھی شروع کرا دی گئی تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں تفتیش کرنے پر ایک اور عجیب بات سامنے آئی تھی۔ وہ مکان جس میں ان چاروں کی رہائش تھی، انھیں کرائے پر دلانے والا شخص بھگوان داس تھا اور وہی اس مکان کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ یہ تمام باتیں اس وقت سامنے آئی تھیں جب مالک مکان سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ مالک مکان نے بڑی مشکل سے یہ بات قبول کی تھی کہ ان اجنبیوں کو کرائے پر مکان دلانے والا بھگوان داس ہی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بھگوان داس نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے دے۔ مالک مکان کی زبان بند رکھنے کے لیے بھگوان داس مکان کا دگنا کرایہ ادا کر رہا تھا مگر دلاور خاں نے اس کی زبان کھلوا ہی لی تھی۔
پھر دلاور خاں نے کیس کی کڑیاں جوڑنی شروع کر دی تھیں۔ سیٹھ وشوا ناتھ کے گھر سے قیمتی زیورات کا چوری ہونا اور سیٹھ کا ایک شخص بھگوان داس پر شک کا اظہار کرنا، اس کے بعد بھگوان داس کا چند مشتبہ افراد کی سرپرستی کرنا اور اپنا نام چھپانے کی کوشش کرنا، یہ تمام باتیں اس طرف نشاندہی کر رہی تھیں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔
دلاور خاں اس سلسلے میں بھگوان داس سے بھی ملے تھے جس نے ایک اور کہانی سنائی تھی۔ اس نے انکار نہیں کیا تھا کہ ان اجنبیوں کو مکان کرائے پر دلانے والا وہی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اجنبی اس کے ایک دوست کا خط لے کر بمبئی سے آئے تھے۔ اس خط میں بھگوان داس کے دوست نے ان اجنبیوں کی سفارش کی تھی کہ وہ ان کی رہائش کا بندوبست کرا دے۔ بھگوان داس کیونکہ اپنے دوست کی درخواست نہیں ٹھکرا سکتا تھا اس لیے اس نے انھیں کرائے پر مکان دلا دیا تھا۔ ان اجنبیوں کو اس نے اپنی حویلی میں اس لیے ٹھہرانا پسند نہیں کیا تھا کہ وہ اسے اچھے کردار کے افراد دکھائی نہیں دیے تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے مالک مکان کو بھی کسی پر اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی ہدایت دی تھی۔
بظاہر بھگوان داس کا بیان اطمینان بخش تھا لیکن اس کے باوجود دلاور خاں مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ کسی کو کرائے پر مکان دلا دینا بہرحال کوئی جرم نہیں تھا اس لیے بھگوان داس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ جب تفتیش کی گاڑی یہاں آ کے پنکچر ہو گئی اور ان چاروں اجنبیوں کی نگرانی سے بھی کوئی نئی بات سامنے نہ آ سکی تو دلاور خاں نے ان چاروں کو شبہے میں گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ ان کی بدقسمتی کہ وہ چاروں انھیں جُل دے کر نکل گئے تھے اور نتیجے کے طور پر بیچاروں کو اسپتال جانا پڑا تھا۔ ان حالات میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ چاروں اپنی نگرانی سے باخبر ہو گئے تھے اور وہ دلاور خاں کی اس حرکت سے بھنا گئے تھے ورنہ وہ مکان میں آگ کیوں لگاتے۔

ان چاروں کا پتا اس فائل میں موجود تھا یعنی پہاڑ گنج! مگر خود وہ لاپتا ہو گئے تھے۔ میں اس روز دفتر کا وقت ختم ہونے تک یہی سوچتا رہا کہ انھیں کہاں تلاش کیا جائے؟ وہ دہلی میں نئے نئے آئے تھے اس لیے میرا یہ سوچنا کچھ غلط نہیں تھا کہ وہ دہلی کے تاریخی مقامات کی سیر کر رہے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ لال قلعے میں گھوم رہے ہوں یا ہو سکتا ہے قطب کی لاٹ دیکھنے چلے گئے ہوں یا پھر "نظام الدین" چلے گئے ہوں اور رات ہونے پر وہیں پڑ رہے ہوں۔ انھوں نے ایسا کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اگر میں ان کی جگہ ہوتا

تو یقیناً ایسا ہی کرتا۔ بھلا کوئی دہلی آئے اور "جنتر منتر" نہ دیکھے، یہ کس طرح ممکن ہے۔ چاندنی چوک، عجائب گھر، ہمایوں کا مقبرہ، پُرانا قلعہ، غیاث الدین تغلق اور لودھی کے مقبرے، بھلا ایک جگہ ہے دہلی میں قابلِ دید! میں سوچنے لگا کہ چلو اس بہانے ان مقامات کی پھر سے سیر ہو جائے گی۔ مجرم کے مجرم ڈھونڈیں گے اور سیر کی سیر ہو جائے گی۔ میں یوں بھی بہت دن سے ان مقامات پر نہیں گیا تھا۔ قطب مینار پر چڑھ کر پیسا پھینکنا تو میرا محبوب مشغلہ تھا۔ اب بہت دن بعد یہ مشغلہ بھی پورا ہو جائے گا۔

میں ابھی یہ منصوبہ بندی کر ہی رہا تھا، مجرموں کی تلاش کا آغاز دہلی کی مشہور اور تاریخی جامع مسجد سے کروں یا لال قلعے سے کہ چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"فرمائیے!" میں نے اسے مخاطب کیا۔

"جی صاب!" وہ میرے اندازِ تخاطب سے گڑبڑا گیا۔

"ہاں صاب!" میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

"کوئی شریمتی جی آپ سے بھینٹ کرنے آئی ہیں۔" چپراسی نے اطلاع دی۔

"مجھ سے بھینٹ کرنے، یعنی ملاقات کرنے!" میں نے حیرت سے کہا۔ "شریمتی جی، یعنی خاتون! تمھارے چشمے کا نمبر پلس ہے یا مائنس؟"

"مائنس۔" چپراسی سٹپٹا کر بولا۔

"تمھیں اچھی طرح یقین ہے کہ وہ شریمتی جی ہی ہیں اور مجھ سے ملنے آئی ہیں؟"

"لگتی تو وہ شریمتی جی ہی ہیں، آگے بھگوان جانے اور انھوں نے آپ ہی کا نام بھی لیا تھا۔"

"کیا کہا تھا انھوں نے؟"

"انھوں نے کہا تھا... وہ کہا تھا کہ... کہ انھیں انسپکٹر اللہ دتا سے ملنا ہے۔"

"انسپکٹر اللہ دتا!" مجھے مزید حیرت ہوئی اور میں بڑبڑایا۔ "مگر انسپکٹر بنے تو مجھے ابھی صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں۔ ان شریمتی جی کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی؟"

"انھی سے پوچھ لیجیے صاحب! میں نے انھیں باہر بھینٹ کرنے والوں کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔" چپراسی نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

پُراسرار حسینہ! میں نے سوچا۔ میں تجھ سے ضرور ملوں گا اے پُراسرار حسینہ! اسی کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچا تھا کہ سامنے سے چچا بندو خاں آتے دکھائی دیے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ انھیں غچا دے کر نکل جاؤں مگر وہ بھلا کہاں مجھے "اڑن گھائی" بھرنے دیتے۔ دور ہی سے نام لے کر چنگھاڑنے لگے۔ اکثر چھٹی کے وقت وہ میری بو سونگھتے پھرتے تھے کہ کہیں مل جاؤں تو وہ مجھے "گپک" لیں۔ وہ مجھے اپنی کھٹارا سائیکل پر بٹھا کر پہلے چتلی قبر کی تی بھرتے پھر وہاں مجھے چھوڑ کر خود بارہ ہندو راؤ سدھارتے کیونکہ ان کی رہائش [illegible] ہی میں تھی۔ مجھے ان کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر گھر جانے سے تو خیر کوفت نہیں ہوتی تھی مگر راستے بھر وہ جس رفتار سے میرا مغز چاٹتے تھے، اس سے الجھن ضرور ہوتی تھی۔ وہ مجھے تمام راستے دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتے اور نصیحتوں کے پلندے کھول دیتے، پھر اشاروں کنایوں میں اپنی حور شمائل بیٹی، یعنی میری ہونے والی بیوی یا حور کی تعریفیں کرتے۔ "اللہ دتا بیٹے! رحمین تو بس اللہ میاں کی گائے ہے۔ پتا ہے آج صبح کیا ہوا...؟" پھر اس کے بعد وہ قصہ ہزار داستان شروع کر دیتے جس کی تان اس پر ٹوٹتی کہ ساری دنیا میں ان کی بیٹی سے زیادہ سیدھی اور بھولی لڑکی نہیں۔ میں اسی لیے دفتر کے وقت سے کچھ پہلے ہی کھسکنے کی کوشش کرتا تھا کہ کہیں ان کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں مگر اس وقت انھوں نے مجھے عین وقت پر تاڑ لیا تھا۔

"ارے تو کہاں رہتا ہے اللہ دتا! بیٹے تجھے دیکھنے کو میری آنکھیں ترستی رہتی ہیں۔" چچا بندو خاں میرے قریب آ کر بولے۔ "آج تو میں تجھے اپنی بائیسکل پر لے جاؤں گا۔"

"میں تو خود آپ سے ملنے کے لیے بے چین رہتا ہوں چچا! مگر کیا کروں، دفتر کے کاموں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اس وقت بھی دفتر کے کام ہی سے میں نے ایک خاتون کو پوچھ گچھ کے لیے بلایا ہے اور وہ باہر والے کمرے میں بیٹھی ہیں۔" میں نے ابتدا ہی میں چچا بندو خاں سے جان چھڑانے کے لیے داؤ آزمایا۔

"کیا کہا خاتون!... عورت!" چچا بندو خاں چونک پڑے۔ انھیں غالباً اپنے ہونے والے داماد سے کسی عورت کا یوں کھلے عام ملنا پسند نہیں آیا تھا۔

"ہاں چچا عورت!" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ بہت پُراسرار عورت ہے۔" میں چچا پر رعب جمانے کے لیے بولا۔ "بڑی مشکل سے قابو میں آئی ہے۔"

"اچھا تو پھر تو جا بیٹے!" چچا بندو خاں مردہ سی آواز میں بولے۔ "مگر سن! اس کے ساتھ اکیلے میں کہیں مت جانا۔ بعض عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں، وہ مرد پر جادو کر دیتی ہیں۔"

میں نے چچا بندو خاں کو یقین دلا دیا کہ اکیلے اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا تو وہ ٹلے اور میں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو ملاقاتیوں کے لیے مخصوص تھا۔

ملاقاتیوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چکاچوند

ہو گئیں۔ کچھ دیر کو میں پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ میں نے اتنا سارا حسن کسی ایک ہی لڑکی میں اسٹور نہیں دیکھا تھا۔ بڑی تیکھی قطعی قسم کی لڑکی تھی وہ! ایسی کہ نگاہ بار بار پھسل کر نیچے چلی جائے۔ وہ سفید ساڑھی میں بالکل بیلے کی کلی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نمستے!" اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور میرے کانوں میں شہد سا گھل گیا۔

"آداب جناب! معاف کیجیے گا جناب بلکہ شریمتی جی!" میں نے بمشکل کہا۔ "بیٹھیے، یعنی پدھاریے!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"دھنیہ واد!" وہ اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اس میں دھنیہ واد یعنی شکریے کی کوئی ضرورت، یعنی چلتا نہیں۔ اسے آپ اپنا ہی گھر... وہ چھما کیجیے، یعنی معاف کیجیے گا، اسے اپنا ہی دفتر سمجھیں۔" میں نے دانت نکال دیے۔

"کیوں انسپکٹر صاحب! اللہ دتا آپ ہی کا نام ہے؟" اس نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر پوچھا۔

"جی ہاں خادم یعنی سیوک ہی کو انسپکٹر اللہ دتا کہتے ہیں۔" یہ کہتے ہی مجھے خیال آیا کہ انسپکٹری تو اسی دن ملی تھی، پھر اسے کس طرح پتا چل گیا؟ ابھی تو یہ خوشخبری میں نے اپنی امی جان کو بھی نہیں سنائی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "مگر آپ کو میری انسپکٹری کی خبر کیسے ہو گئی؟"

وہ میری بات سن کر مسکرا دی اور اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کھلے تو موتیوں جیسے سفید اور چمکدار دانت نظر آنے لگے۔ ایک عدد مسکراہٹ کے بعد اس نے کہا۔ "دیکھ لیجیے! ہمیں کس طرح پتا چل گیا۔ آپ تو لوگوں کے بھیدوں کا پتا چلاتے ہیں اور ہم آپ لوگوں کے بھید جان لیتے ہیں۔"

"یقیناً یعنی اوش!" میں سر ہلا کر بولا۔ اس کے ماتھے پر بندیا دیکھ کر اور اس کی گفتگو سن کر میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کوئی ہندو لڑکی ہی ہو گی اسی لیے میں اس سے زیادہ سے زیادہ ہندی بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت چچا بندو خاں کا یہ جملہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ بعض عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں، وہ مرد پر جادو کر دیتی ہیں۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس سندر نار نے مجھ پر جادو کر دیا تھا جس کا نام بھی ابھی تک مجھے معلوم نہیں تھا۔

"آپ اس بات پر حیران ہوں گے کہ مجھے آپ کے انسپکٹر بن جانے کا کس طرح پتا چل گیا، کیوں؟" وہ ایک ادا سے بولی۔

"ہاں حیرت تو ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "مگر جادوگرنیوں کے لیے کوئی بات معلوم کر لینا کون سی بڑی بات ہے۔" میرے ذہن سے اب تک چچا بندو خاں کا جملہ چمٹا ہوا تھا اور شاید اسی لیے میں آخری فقرہ بے سوچے سمجھے کہہ گیا تھا۔

"جادوگرنی!" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ "کون جادوگرنی؟"

"کیا آپ جادوگرنی نہیں ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں تو! میں کیوں جادوگرنی ہوتی!"

"اگر آپ جادوگرنی نہ ہوتیں تو آپ کو میرے انسپکٹر بننے کا ہرگز علم نہ ہوتا۔"

"اگر آپ اسی کو جادو سمجھ رہے ہیں تو...." اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ ہنس پڑی، پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ "تو پھر... پھر میرے پتا جی ضرور جادوگر ہوں گے جنھوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔"

"آپ کے والد محترم، یعنی پتا جی کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی، بہت خوب!" میں بولا۔ "پھر تو واقعی یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ جادوگر ہیں۔"

"شریمان جی وہ ہرگز جادوگر نہیں ہیں۔" لڑکی بدستور ہنستے ہوئے بولی۔

"ویسے شریمتی جی! آپ اپنا اور اپنے پتا جی کا نام، نامی یعنی شبھ نام بتانے کی تکلیف، یعنی کشٹ کریں گی؟" میں نے کہا۔

"میرا نام سروج ہے اور پتا جی کا نام وشوا ناتھ!" لڑکی نے بتایا۔

"کیا کہا وشوا ناتھ! سیٹھ وشوا ناتھ کیس؟ ارے.... وہ معاف کیجیے گا، یعنی...."

"جی نہیں، سیٹھ وشوا ناتھ کیس نہیں، صرف سیٹھ وشوا ناتھ!" لڑکی میری بات کاٹ کر بولی۔

"ہاں میرا مطلب یہی تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بس ذرا زبان پھسل گئی تھی اور...."

"اور آپ کو وہ عبارت یاد آ گئی تھی جو یقیناً آپ کے دفتر میں موجود کسی فائل پر لکھی ہو گی۔" لڑکی نے پھر میری بات کاٹ کر فقرہ مکمل کر دیا۔

"تو گویا آپ سیٹھ وشوا ناتھ کی بیٹی، یعنی پتری ہیں۔"

"جی شریمان جی!" لڑکی نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن آپ کے پتا جی کو میرے انسپکٹر بن جانے کی خبر کیسے

ہوگئی ہے؟"

"یہ تو وہی بتا سکتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔" سورج نے کہا۔

"خیر یہ بات میں ان سے ملاقات ہونے پر پوچھ لوں گا۔ فی الحال تو آپ بتائیے کہ کیسے تکلیف کی یعنی کشٹ کیا؟"

"مجھے پتا جی نے ہی آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو بگھی میں بٹھا کر اپنے ساتھ حویلی تک لے چلوں۔" سورج نے مدعا بیان کیا۔

سورج تو خیر مجھے اپنے ساتھ صرف حویلی تک لے جانے کی بات کر رہی تھی لیکن اگر اس جیسی کوئی لڑکی جہنم میں بھی ساتھ چلنے کو کہے تو کسی شریف مرد کو انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ میں بھی خود کو شریف ہی سمجھتا ہوں اس لیے فوراً اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ مجھے یوں بھی آئندہ دن سے سیٹھ وشوا ناتھ کیس پہ کام کرنا تھا اس لیے سیٹھ وشوا ناتھ سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

دفتر کے صدر دروازے کے قریب ہی بگھی کھڑی ہوئی تھی جس میں دو مضبوط اور خوبصورت گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ سورج مجھے ساتھ لیے بگھی میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے کوچوان کو چلنے کو کہا۔

بگھی چل دی۔ میں بہت دن بعد بگھی میں بیٹھا تھا اس لیے مجھے اس کے اندر بیٹھ کر بہت لطف محسوس ہو رہا تھا کیونکہ عموماً یکہ یا تانگا ہی نصیب ہوتا تھا۔ بگھی والے جامع مسجد تک کے لیے پوری اکنی مانگتے تھے جبکہ میری امی جان مجھے صرف دونی روز دیتی تھیں۔ اگر میں اس طرح بگھی میں سواری کرنے لگتا تو پوری دونی کرائے ہی میں خرچ ہو جاتی۔

راستے بھر سورج مجھ سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ قنوج کا خالص عطر استعمال کرتی ہے، روحِ گلاب! خود وہ بھی مجھے کسی کلی کی طرح لگ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف روحِ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو ہی نہیں تھی بلکہ اس میں سورج کے کنوارے بدن کی خوشبو بھی شامل تھی۔ اسی خوشبو نے مجھے یہ

احساس نہ ہونے دیا کہ بگھی کب قرول باغ میں پہنچ کر ایک بڑی سی سرخ حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ میں تو اس وقت چونکا جب بگھی رک گئی۔

"چلیے اُتریے انسپکٹر صاحب!" سورج اپنی نشست سے اٹھتی ہوئی بولی۔

"آپ کی حویلی بڑی جلدی آگئی۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی اور اپنی ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی بگھی سے اتر گئی۔

کچھ دیر بعد ہی میں سورج کے ہمراہ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا جس کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور درمیان میں خوبصورت کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن کے درمیان ایک لمبی سی میز رکھی تھی۔ سورج نے ان کرسیوں میں سے ایک پہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ یہاں بیٹھیے! میں ابھی پتا جی کو بھیجتی ہوں۔" اس نے کہا اور اندر جانے والے ایک دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

"کیا آپ بھی پتا جی کے ساتھ ساتھ آئیں گی شریمتی سورج؟" میں نے جلدی سے بلند آواز میں پوچھا۔

"پتا جی کو آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں اس لیے میں ان کے ساتھ نہیں آؤں گی۔" سورج نے رک کر بغیر مڑے جواب دیا، پھر میری طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "جب آپ ان سے باتیں کر لیں گے تو میں آپ کو بگھی میں آپ کے گھر چھوڑ آؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف دوبارہ بڑھ گئی۔

میرے لیے یہ رشوت قابلِ قبول تھی اس لیے خاموش رہا اور وہ چلی گئی۔ دراصل میں ذہنی طور پر اس سراپا قیامت سے اتنی جلدی جدا ہونے پر تیار نہیں تھا اس لیے مجھے اس کا جانا کھل رہا تھا۔ میں تو بگھی میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ بگھی ہمیشہ اسی طرح "ٹمک ٹمک" چلتی رہے اور میں سورج کے ساتھ بیٹھا رہوں، اس کا شربتِ دیدار پیتا رہوں، پیتا رہوں اور پیتا ہی رہوں۔

میں سورج ہی کے خیالوں میں گم تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر چونک اٹھا۔ قدموں کی چاپ اندرونی دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے مڑ کر اُدھر دیکھا۔ ایک بھاری بھرکم شخص دروازے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے گرم شال اوڑھی ہوئی تھی اور جسم کے نچلے حصے پر دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اس شخص کا چہرہ گول اور سرخ تھا، سر پہ پگڑی اور ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔

سیٹھ وشوا ناتھ! میرے ذہن میں گونجا۔

وہ شخص آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا قریب آگیا اور بولا "آداب انسپکٹر صاحب!"

"آداب۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے سیٹھ وشوا ناتھ کہتے ہیں۔" اس شخص نے میرے سامنے ایک کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے لہجے سے ایک مخصوص تکبر کا اظہار ہو رہا تھا جو صرف سیٹھوں کے لہجے میں ہوتا ہے۔ "پہلے یہ کہیں کہ کیا پئیں گے؟ اگر شوق کرتے ہوں تو وہ بھی مل سکتا ہے۔" سیٹھ جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

میں "شوق" کا مطلب نہ سمجھا مگر لاعلمی چھپانے کی خاطر بولا۔ "شوق تو خیر مجھے بہت سے ہیں مگر اس وقت رہنے دیں۔"

"نہیں جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سیٹھ جی نے کہا اور ہانک لگائی۔ "موتی اے موتی!"

چند لمحے بعد ہی ایک ملبا تڑنگا "موتی" حاضر ہو گیا۔ "جی سیٹھ جی!"

"انگریزی لاؤ، انگریزی!" سیٹھ جی نے موتی سے کہا۔ "وہی جو کل منگائی تھی۔"

موتی حکم سننے کے بعد سر جھکا کر چلا گیا۔

"اب بقیہ باتیں چسکیاں لگاتے ہوئے کریں گے۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں اب تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس نے کیا منگوایا ہے اور مجھے کس کی چسکیاں لگوانا چاہتا ہے۔ میں نے خاموش رہنا بہتر جانا۔

کچھ دیر بعد ہی موتی ایک بوتل اور دو گلاس میز پر رکھ گیا۔

"شوق فرمائیے!" سیٹھ نے بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بہترین چیز ہے۔ شاید اس سے پہلے آپ نے نہ پی ہو۔"

اب مجھے معاملہ کچھ گڑبڑ نظر آنے لگا۔ نہ جانے اس بوتل میں کیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں اس بوتل میں بھی تو ویسا ہی کڑوا شربت نہیں جو ایک بار میم صاحب نے مجھے پلانا چاہا تھا؟ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔ "اس بوتل میں کیا شربت ہے سیٹھ جی؟"

"جی ہاں شربت ہی ہے۔" سیٹھ جی مسکراتے ہوئے بولے۔ "آپ آدمی دلچسپ لگتے ہیں۔ ویسے خود میں بھی اسے سوم رس ہی کہتا ہوں۔"

"یہ شربت کڑوا تو نہیں؟" میں نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا۔

"تھوڑی بہت تلخی تو خیر ہر شراب میں ہوتی ہے مگر اس میں بہت کم ہے۔ میں تو خود پی چکا ہوں۔ ہاں سنا ہے کہ انگریزوں نے عورتوں کے لیے ایک ایسی شراب بھی بنائی ہے جو میٹھی ہوتی ہے پر میں نے وہ کبھی نہیں چکھی اور..."

سیٹھ جی نہ جانے کیا کیا کہتے رہے مگر میرا ذہن صرف ایک لفظ سن کر ہی اپنی جگہ سے کھسک چکا تھا اور وہ لفظ تھا "شراب"! تو سیٹھ جی مجھے شراب پلا رہے ہیں! میں نے سوچا۔ اگر ابا کو خبر ہو گئی کہ میں نے شراب دیکھی بھی ہے تو مار مار کے بھرکس نکال دیں گے، توبہ توبہ!

"آپ کیا سوچنے لگے انسپکٹر صاحب؟" سیٹھ جی کو میرے گم صم ہونے کا احساس ہو گیا۔

"ارے جناب، یعنی شریمان جی! اسے جلدی سے پارسل کرائیے ورنہ..."

"کیا اسے ساتھ لے جائیں گے؟ دوسری بھی ہے، فکر نہ کریں۔ وہ آپ کے ساتھ کر دوں گا۔ شوق کیجیے!" سیٹھ میری بات کاٹ کر بولے۔

"میں اسے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں کہہ رہا سیٹھ جی!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے یہاں سے فوراً ہٹوا دیجیے۔ اگر میرے ابا کو پتا چل گیا تو چندیا پر ایک بال بھی نہیں چھوڑیں گے۔ یوں بھی یہ چیز حرام ہوتی ہے۔"

"حرام!" سیٹھ جی چونکے۔ "مگر آپ ہی نے تو کہا تھا کہ شوق کرتے ہیں۔"

اب میں "شوق" کا مطلب سمجھا اور میرا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں۔

"ارے جناب! میں تو آلو چھولوں کی بات کر رہا تھا۔ مجھے آلو چھولے کھانے کا بہت شوق ہے۔ اس کے علاوہ پکوڑے اور دہی بڑے بھی بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔ میں سمجھا آپ کو کسی طرح میرے شوق کا پتا چل گیا ہوگا جس طرح آپ کو میرے انسپکٹر بننے کا علم ہو گیا۔" میں نے بات بنائی۔

سیٹھ جی نے میری طرف عجیب سی نگاہ سے دیکھا اور ایک طویل سانس لیا، پھر موتی کو آواز دی جو کہیں قریب ہی ان کے احکامات سننے کے لیے موجود تھا۔

وہ آگیا تو سیٹھ جی اس سے مخاطب ہوئے۔ "بوتل اور گلاس لے جاؤ! اور ستو جلدی سے آلو چھولے، پکوڑے اور دہی بڑے لے آؤ!"

"اور ہاں مرچیں ذرا تیز ہوں۔" میں نے سیٹھ جی کے ملازم سے کہا۔

اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا، شاید میری بدذوقی پر! وہ بوتل اور گلاس لے کر چلا گیا تو سیٹھ جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "آج دوپہر آپ کے ڈی آئی جی تیواڑی جی آئے تھے۔ مجھے وہ سارے زیورات مل گئے جو میری تجوری سے چرا لیے گئے تھے۔ تیواڑی جی سے ہی مجھے پتا چلا کہ یہ کارنامہ آپ نے انجام دیا تھا اور اب آپ کو ترقی دے کر انسپکٹر بنا دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا کیس اب آپ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ مجھے ان سے آپ کی ذہانت اور بہادری کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے خیال ظاہر کیا تھا کہ اس شخص کو اپنی جیب سے انعام دینا چاہتا ہوں جس نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے مگر انھوں نے میری بات نہیں مانی۔ وہ لاکھوں کے زیورات تھے۔ آخر میں انعام کے طور پر آپ کو ہزار دو ہزار دے دیتا تو کوئی بڑی بات نہ ہوتی۔ وہ چلے گئے تو میں نے فیصلہ کیا کہ آپ

ٹُبلاکر خود اپنے ہاتھ سے انعام دوں گا۔ میں نے اسی لیے آپ کو اپنی بیٹی کے ذریعے بُلوایا تھا۔ وہ بھی مجھ سے آپ کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔ ہاں یہ بتادوں کہ انعام کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلے گا اور نہ آپ کسی سے کہیں۔" یہ کہہ کر سیٹھ جی نے شال سے ہاتھ نکالا۔

میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک نئی گڈی تھی۔ اتنے سارے نوٹ میں نے بیک وقت پہلی بار دیکھے تھے اس لیے میری آنکھیں پھیل گئیں۔

"یہ ایک ہزار ہیں۔" سیٹھ جی نے مجھے حیرت زدہ دیکھ کر کہا۔ "بقیہ ایک ہزار میں اس وقت انعام دوں گا جب آپ ان چوروں کو پکڑ لیں گے۔"

زیورات واپس مل جانے کے بعد سیٹھ جی کو ان چوروں سے کیا دلچسپی تھی، یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ ان کا یہ کہنا کہ بقیہ ایک ہزار روپے چوروں کی گرفتاری کے بعد ملیں گے اسی دلچسپی کا ثبوت تھا۔ چور پکڑے جائیں یا نہ پکڑے جائیں، میرے خیال میں اس سے اب سیٹھ جی کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ سوچ کر میں بولا۔ "چور تو خیر پکڑے ہی جائیں گے، اب نہیں تو کچھ دن بعد سہی۔"

"نہیں انسپکٹر! ان کا فوری پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔" سیٹھ جی زور دے کر بولے۔ میں چپ رہا تو وہ ایک طویل سانس لے کر پھر بولے۔ "دراصل ان کا پکڑا جانا اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ ان کے پاس زیورات سے بھی زیادہ قیمتی چیز موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے نوٹوں کی گڈی درمیانی میز پر رکھ دی۔

"مگر جہاں تک میرے علم میں ہے سیٹھ جی، آپ نے کسی اور چیز کی چوری کے بارے میں پولیس کو مطلع نہیں کیا ورنہ اس کا ذکر کیس کی فائل میں ضرور ہوتا۔" میں نے کہا۔

"ہاں پولیس رپورٹ میں مصلحتاً میں نے ایسی کوئی بات نہیں لکھوائی تھی کیونکہ اس سے کچھ لوگ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ویسے میں نے ذاتی طور پر انسپکٹر دلاور کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا۔"

"لیکن وہ چیز تھی کیا جو زیورات کے ساتھ ہی چرالی گئی تھی اور لاکھوں کے زیورات سے زیادہ قیمتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میری نظر میں وہ چیز زیورات سے زیادہ قیمتی تھی۔ بس اسے آپ اپنا اپنا اندازِ فکر کہہ سکتے ہیں۔" سیٹھ جی نے کہا۔ "وہ کچھ اہم کاغذات تھے جن کی تفصیلات سے میں نے انسپکٹر دلاور کو آگاہ کر دیا تھا کیونکہ کیس اب آپ کے سپرد ہو چکا ہے اس لیے ضروری ہے کہ میں متعلقہ باتوں سے آپ کو بھی آگاہ کر دوں گا۔" یہ کہہ کر سیٹھ جی نے کچھ توقف کیا پھر بولے۔ "دراصل وہ اہم کاغذات ایک اناتھ آشرم (یتیم خانے) کے تھے۔ میں اس اناتھ آشرم کا پردھان ہوں اس لیے وہ کاغذات میرے پاس رکھوا دیے گئے تھے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ نہری مسجد کے قریب پولیس چوکی ہے، اس کے بعد سکھوں کا گردوارہ ہے۔

گردوارے کی دوسری جانب وہ اناتھ آشرم ہے۔ سکھوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اناتھ آشرم جہاں قائم ہے، کبھی وہ جگہ بھی گردوارے کے احاطے میں شامل تھی جس پر ہندوؤں نے ناجائز قبضہ کر لیا ہے حالانکہ ان کا دعویٰ قطعی غلط ہے۔ وہ کاغذات جو میرے پاس تھے اسی بات کا ثبوت تھے لیکن اب وہ کاغذات غائب ہو چکے ہیں۔ اگر سکھوں کو یہ بات کسی طرح پتا چل گئی یا انھوں نے ضد میں آکر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیا تو ہم لوگ کسی طرح یہ بات ثابت نہ کر سکیں گے کہ سکھوں کا دعویٰ غلط ہے۔ سمجھ گئے آپ! اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کاغذات کتنے اہم ہیں! اور پولیس رپورٹ میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا!"

معاملہ واقعی اہم تھا اور اس لیے مزید کہ اس معاملے کو نمٹا کر ہی مجھے مزید ایک ہزار روپے بطور انعام مل سکتے تھے۔ میں نے اسی لیے سیٹھ جی کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ جب تک سیٹھ جی کا ملازم موتی، آلو چھولے اور دہی بڑے وغیرہ لے کر آیا، ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈی میری جیب میں پہنچ چکی تھی۔

جب میں تیزی سے آلو چھولے کی پلیٹ صاف کر رہا تھا تو سیٹھ جی نے اس سلسلے میں مزید وضاحت کی۔ "کیونکہ ان کاغذات کا ذکر پولیس رپورٹ میں نہیں کیا گیا اس لیے آپ انھیں چوروں سے حاصل کرنے کے بعد اس کا نہ کسی سے ذکر کریں گے اور نہ ہی ان کے بارے میں، کوئی تحریر کیس کی فائل میں لکھیں گے۔"

"ظاہر ہے، ظاہر ہے۔" میں نے شوں شوں کرتے کرتے درمیانی وقفے میں بمشکل کہا۔ سیٹھ جی کا ملازم چھولوں میں کچھ زیادہ ہی مرچیں ڈلوا لایا تھا۔

کچھ دیر بعد میں جب میں نے آلو چھولوں اور دہی بڑوں وغیرہ کی تمام پلیٹیں صاف کر دیں تو سیٹھ جی سے رخصت کی اجازت چاہی۔

"ٹھیک ہے، میں سروج کو بھیج دیتا ہوں۔ اس بہانے وہ آپ کا گھر بھی دیکھ آئے گی۔ دراصل آج بھی مجھے مجبوراً اسے آپ کے دفتر بھیجنا پڑا ورنہ یہ ایسے معاملات ہیں کہ ان میں دفتر وغیرہ کا بکھیڑا عقلمندی نہیں، خواہ مخواہ لوگ متوجہ ہو جاتے ہیں۔" سیٹھ جی بے تکلفی سے بولے۔ "ممکن ہے کل دفتر میں، آپ سے پوچھ گچھ ہو کہ میں نے آپ کو کیوں بُلایا تھا۔ آپ کو یہ بات گرہ میں باندھ لینی ہے کہ کسی کو اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دینی۔ سمجھ گئے آپ!"

"لیکن کسی کو کیا پتا چلے گا کہ میں آپ سے ملنے آیا تھا۔" میں بولا۔

سیٹھ جی میری بات سن کر ہنس پڑے، پھر کہا۔ "انسپکٹر صاحب!

وہ سی آئی ڈی آفس ہے۔ سمجھ گئے آپ!"

میں ان کی بات سن کر قدرے گھبرا سا گیا اور بولا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ اگر تیواڑی جی نے اس بارے میں پوچھا تو میں کیا جواب دوں گا!"

"کہہ دیجیے گا کہ میں بطور انعام آپ کو ایک ہزار روپے دینا چاہتا تھا مگر آپ نے نہیں لیے کیونکہ چوری کا مال برآمد کرنا اور چوروں کو پکڑنا تو آپ کا فرض ہے۔ جب تیواڑی جی مجھ سے اس بارے میں پوچھیں گے تو میں آپ کے بیان کی تصدیق کر دوں گا۔ مجھے امید ہے آپ کی بات سن کر اور مجھ سے اس کی تصدیق کر کے تیواڑی جی بہت خوش ہوں گے۔" سیٹھ جی نے مجھے یہ راستہ دکھا کر میری مشکل حل کر دی، پھر وہ اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سیٹھ وشوا ناتھ چلے گئے تو کچھ دیر بعد سروج آگئی۔ اس دوران میں اس نے ساڑی بدل لی تھی۔ اب وہ سرخ پھولوں والی ساڑی پہنے ہوئے تھی اور کسی مہکتے ہوئے گلاب کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھ پر نشہ سا چھانے لگا۔

گھر کی طرف میری واپسی بھی بگھی ہی میں ہوئی۔ اس بار سروج سامنے والی نشست پر بیٹھنے کی بجائے میرے برابر بیٹھی تھی۔ قنوج کا اصلی عطر اپنا کام دکھا رہا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے کرتے سروج نے بظاہر غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اسے سہلانے لگی۔

"کچھ دن سے پتا جی بہت ویاکل و ویاکل (پریشان پریشان) سے جان پڑتے ہیں جس کے کارن (سبب) میں بھی چنتا (فکر) میں پڑ گئی ہوں۔" سروج میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میرے سارے جسم میں جیسے بجلیاں سی دوڑ رہی تھیں۔

"میں ان کی فکر یعنی چنتا کا سبب جان گیا ہوں۔" میں سینہ پھلا کر بولا۔ "بہت جلد ان کی چنتا دور ہو جائے گی۔"

"سچ؟" سروج نے بے اختیار کہا اور پھر بظاہر غیر ارادی طور پر ہی میرا ہاتھ اپنے پھول سے رخسار پر رکھ لیا۔

"بالکل سچ!" میں جیسے خواب میں بولا۔

اس وقت مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی کہ سیٹھ وشوا ناتھ اور ان کی حور شمائل بیٹی سروج دونوں مل کر مجھے اُلّو بنا رہے تھے۔ میرے ذہن میں دور تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ سیٹھ جی نے مجھے پھانسنے کے لیے اپنی لونڈیا کو بطور چارا استعمال کیا تھا۔

دوسرے دن دفتر پہنچتے ہی ڈی آئی جی تیواڑی جی نے مجھے پھر بُلا لیا۔ مجھے یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ تیواڑی جی کو سیٹھ وشوا ناتھ سے میری ملاقات کا علم تھا۔ اس سلسلے میں ذہنی طور پر میں پہلے ہی تیار تھا۔ ان کے استفسار پر میں نے وہی بیان دہرا دیا جو سیٹھ وشوا ناتھ کے ذہن کی پیداوار تھا۔

اسی دن مجھے ایک عدد ماتحت مل گیا جس کا نام ایک روز قبل ہی معلوم ہو چکا تھا۔ مجھے علم نہیں کہ وہ ادھیڑ عمر شخص اپنے مختصر سے وجود میں کیا کیا کمالات چھپائے ہوئے تھا لیکن اتنی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود وہ ابھی تک کوئی بڑا عہدہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس غریب سے اب تک کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہوا۔ بہرحال میں نے فائل میں درج چوروں کا حلیہ اسے بتایا اور جنتر منتر کی طرف روانہ کر دیا۔ خود میرا خیال قطب مینار کی طرف جانے کا تھا۔

وہ تمام دن میں نے قطب مینار پر چڑھ کر پیسے پھینکتے ہوئے گزارا کیونکہ اب میری جیب میں کافی پیسے تھے۔ دن بھر میں نے خوب چاٹ اڑائی تھی، اتنی کہ کھانے تک کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شام ہوئی تو میں ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یقیناً میرے ماتحت کمال نے کوئی کمال کر دکھایا ہوگا اور ان چوروں میں سے ایک نہ ایک کو تو پکڑ لیا ہوگا مگر بعد میں پتا چلا کہ یہ میری خوش فہمی ہی تھی۔ کمال شاید کسی مسجد میں جا کر سو گیا ہوگا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے ڈانٹ بتائی تھی اور وہ سر جھکائے اس طرح ڈانٹ پی گیا تھا جیسے وہ ڈانٹ نہیں، شربتِ انناس رہی ہو۔

صبح میں دفتر جانے ہی والا تھا کہ سروج ٹپک پڑی۔ میرے ابّا نے اس وقت مجھے قہر آلود نگاہ سے دیکھا تھا جب میں سروج کے ہمراہ بگھی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تھا۔ سروج نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے پتا جی ایک اہم معاملے میں فوراً مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ملاقات کی وجہ سے وہ بے خبر تھی۔ میں ابّا کے خوف سے سروج کے قریب نہیں بلکہ سامنے بیٹھا تھا لیکن جب بگھی مٹیا محل سے گزر رہی تھی تو خود سروج میرے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔

حویلی پہنچ کر حسبِ معمول سروج مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی اور

چند لمحے بعد ہی سیٹھ وشوا ناتھ آ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر اتنی گھبراہٹ نظر آ رہی تھی جیسے کوئی خلافِ توقع حادثہ پیش آ گیا ہو۔

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے: "اسے پڑھیں انسپکٹر! یہ خط مجھے انہی چوروں کی طرف سے ملا ہے۔"

میں نے خط لے کر پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

سیٹھ! تم یقیناً ان کاغذات کی اہمیت سے واقف ہو گے۔ بھگوان داس سے ہمارا یہ سودا طے ہوا تھا کہ ان کاغذات کے بدلے ہم وہ قیمتی زیورات اپنے پاس رکھ لیں گے اور کاغذات اسے دے دیں گے۔ اس سے یہ بات بھی ہوئی تھی کہ وہ کاغذات وصول کرنے سے پہلے بھی کچھ رقم ہمیں دے گا مگر وہ اپنے سودے سے پھر گیا۔ اس نے ان کاغذات کے عوض ہمیں صرف زیورات پر ٹرخانا چاہا اسی لیے ہم نے اسے کاغذات نہیں دیے مگر اس کے باوجود ہمیں امید تھی کہ وہ مطلوبہ رقم دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ وہ ہمارے مطالبے سے کچھ کم رقم دینے پر آمادہ ہو گیا تھا مگر ابھی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ اس گھر پر چھاپا پڑ گیا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے حفاظت کی خاطر وہ زیورات ایک جگہ چھپا دیے تھے لیکن بعد میں وہ ہمیں وہاں نہیں ملے۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ زیورات پولیس کے ہتھے چڑھ کر یقیناً تم تک پہنچ گئے ہوں گے مگر تم جانتے ہو کہ ان زیورات سے زیادہ قیمتی چیز ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم اس سلسلے میں اب بھگوان داس سے کوئی سودا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ وہ اب ہماری مطلوبہ رقم ادا نہیں کر پائے گا۔ ہم نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم ہمیں وہ زیورات دینے پر آمادہ ہو جاؤ تو کاغذات تمھیں دیے جا سکتے ہیں ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ان کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔ ہم وہ کاغذات ایسے ہاتھوں تک پہنچا سکتے ہیں جو تمھارے ہاتھوں میں زیور پہنا سکیں۔ تمھارے تمام معمولات ہمارے علم میں ہیں۔ ہمیں خبر ہے کہ تم ہر روز صبح اپنی بگھی میں بیٹھ کر پوجا کی غرض سے صبح ہی صبح جمنا کے کنارے جاتے ہو۔ اگر تمھیں ہماری پیشکش منظور ہو تو کل صبح سورج کی طرف ہاتھ جوڑنے کے بعد اس کی مخالف سمت بھی تم ہاتھ جوڑ دو گے۔ ہم اس طرح سمجھ لیں گے کہ تم سودا کرنے پر آمادہ ہو۔ اس کے بعد ہم تم سے دوبارہ رابطہ قائم کر کے تمھیں بتائیں گے کہ زیورات کہاں پہنچانے ہیں۔ ہمیں خبر ہے کہ تم اس سلسلے میں پولیس یا خفیہ والوں سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکتے اس لیے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو یہ تمھارے حق میں نقصان دہ ہو گا۔

فقط

تمھارے خیر خواہ

خط پڑھ کر میں الجھن کا شکار ہو گیا۔ وہ کاغذات یقیناً سیٹھ وشوا ناتھ، ایک یتیم خانے کی ملکیت تھے۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ میں پہنچ جاتے تو سیٹھ کے لیے کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟ چوروں نے بھی خط میں یہی اشارہ کیا تھا۔ پھر یہ کہ سیٹھ وشوا ناتھ اس سلسلے میں پولیس یا خفیہ سے کوئی مدد کیوں نہیں لے سکتے تھے؟"

"آپ کیا سوچنے لگے انسپکٹر صاحب؟" مجھے سوچ میں گم دیکھ کر سیٹھ جی نے مخاطب کیا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ یقیناً صبح وہ چور بھی جمنا کے کنارے موجود رہیں گے تاکہ سیٹھ وشوا ناتھ کو سورج کی مخالف سمت ہاتھ جوڑتے دیکھ سکیں۔ اس وقت انھیں بآسانی گرفتار کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں صرف ایک قباحت تھی، کہیں وہ مجھے پہچانتے نہ ہوں۔ میں کچھ نہ بولا تو سیٹھ جی نے مجھے مخاطب کیا۔

"بس انھیں پھانسنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔" میں نے پُر جوش لہجے میں کہا: "اور وہ ترکیب میری سمجھ میں آ گئی ہے۔"

"کیا؟" سیٹھ جی نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"بس اب یوں سمجھ لیجیے کہ مجرم میری جیب میں ہیں۔" میں کہا۔ میں اتنا پُر جوش تھا کہ جو سوالات اس خط کو پڑھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے، وہ بھی ذہن سے نکل گئے۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا: "آپ کل صبح جمنا کے کنارے ضرور جائیں اور مجرموں نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر عمل کریں۔"

"یعنی سورج دیوتا کی مخالف سمت بھی ہاتھ جوڑ دوں؟" وہ بولے۔

"ہاں۔" میں نے زور سے گردن ہلائی۔

"یہ تو خود میں نے بھی سوچا تھا کہ ان کا مطالبہ مان لوں۔" انھوں نے طویل سانس لے کر کہا: "لیکن انھوں نے اگر اپنا وعدہ پورا یعنی کاغذات نہ دیے تو کیا ہو گا؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" میں پُر یقین لہجے میں بولا: "وہ اس سے پہلے ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔"

"آپ یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سیٹھ جی نے پُر فکر لہجے میں دریافت کیا۔

"بس ہے یقین!" میں نے کہا مگر سیٹھ جی مطمئن نہ ہوئے۔ پھر مجھے

ہی بتانا پڑا کہ کل صبح تک میں بھی جمنا کے کنارے موجود رہوں گا اور مجرموں کو پکڑ لوں گا۔

"مگر آپ انھیں پہچانیں گے کیسے؟" سیٹھ جی نے سوال کیا۔

میں ہنس پڑا اور بولا: "ارے آپ بھی کمال کرتے ہیں سیٹھ جی! ان لوگوں کے پورے حلیے میرے پاس موجود ہیں۔"

اس کے بعد سیٹھ جی شاید مطمئن ہو گئے اور مزید سوالات نہیں کیے۔ میں نے ان سے اس مقام کا محلِ وقوع معلوم کیا جہاں وہ پوجا کرتے تھے۔

"آپ اب غالباً دفتر جائیں گے۔" انھوں نے کہا۔

"ہاں۔" میں بولا۔

"میں مصلحتاً سُرج کو آپ کے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ آپ یہاں سے اکیلے ہی دفتر جائیں تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے کہ آپ اپنے گھر کی بجائے میری حویلی سے آ رہے ہیں۔"

واپسی میں مجھے سُرج کا قرب نہ ملنے پر افسوس تو ہوا مگر سیٹھ وشوا ناتھ نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ نتیجے کے طور پر مجھے وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر دفتر جانا پڑا مگر روانگی سے قبل میں نے سیٹھ جی سے کہہ کر ایک بار سُرج کا دیدار کر ہی لیا تھا۔ وہی مجھے صدر دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

دفتر پہنچنے تک میں اس مسئلے کا حل بھی ڈھونڈ چکا تھا کہ اگر مجرم مجھے پہچانتے ہوں تو ان کی نظروں سے بچا جا سکے۔

کمال کو ڈانٹ پلانے کے بعد میں نے اسے حکم دیا: "کل صبح تمھیں فجر کے وقت جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے ملنا ہے۔ میں دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے تمھیں کچھ سامان دوں گا۔ تم یہ سامان لے کر وہاں وقت پر موجود رہو گے۔"

"بہتر جناب!" کمال نے مردہ سی آواز میں کہا۔

دوسرے دن علی الصبح اٹھ کر میں گھر سے نکلا اور جامع مسجد پہنچ گیا۔ کمال وہاں سامان لیے موجود تھا اور میری ہدایت کے مطابق وہ موٹر سائیکل ہی پر آیا تھا جو دفتر کی تھی۔

میں اسے لیے ہوئے مقررہ مقام کی طرف روانہ ہو گیا جس کی تفصیلات سیٹھ وشوا ناتھ سے معلوم کر چکا تھا۔ موٹر سائیکل آبادی سے نکل کر جمنا کی طرف جانے لگی۔ میں نے رستے میں کمال کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

جمنا کے کنارے ایک ویران سے مقام پر موٹر سائیکل روک کر ہم نے بھیس بدلا۔ اب ہم دونوں سادھوؤں کے لباس میں تھے۔ وہ کپڑے جو ہم پہلے پہنے ہوئے تھے ان جھولیوں میں ڈال دیے جو ہمارے شانوں سے لٹک رہی تھیں۔ کمال کو دیکھ کر میں نے اپنی صورت کا قیاس کیا کیونکہ جلد بازی کے سبب میں سامان میں آئینہ رکھنا بھول ہی گیا تھا۔ کمال کے چہرے پر گھنی لمبی داڑھی اور بے ڈھنگی مونچھیں نظر آ رہی تھیں، سر پر لمبے لمبے بالوں والی وگ تھی اور ہاتھ میں کشکول!

موٹر سائیکل کو ہم نے ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپایا اور پھر پیدل اس سمت روانہ ہو گئے جہاں سیٹھ وشوا ناتھ کو ہونا چاہیے تھا۔

کچھ دور چل کر ہم نے اور بہت سے لوگوں کو جمنا کے کنارے دیکھا جو صبح کی پوجا کرنے آئے تھے۔ ان لوگوں میں سادھو بھی کافی تعداد میں تھے۔

"بم بھولے!" میں نے چلتے چلتے ایک دم سادھوؤں کے مخصوص انداز میں نعرہ مارا۔

کمال نے جواب میں نعرہ نہیں لگایا حالانکہ میں اسے اس کی ہدایت دے چکا تھا۔

میں نے اس کے کہنی ماری: "ابے نعرہ مار!"

"بم کھولے!" وہ چیخا۔

"ابے احمق بم کھولے نہیں بم بھولے! اس طرح تو تُو بھانڈا پھوڑ دے گا کمبخت!" میں نے اس کے پہلو میں ایک بار اور کہنی جمائی۔

"ہائے مر گیا۔" وہ کراہا۔

میں گھبرا گیا۔ کہنی شاید زور سے پڑ گئی تھی اور وہ جھک گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے رک کر پوچھا۔

"کہنی۔۔۔ ہائے۔۔۔" وہ پھر کراہا۔

"اچھا اب نہیں ماروں گا۔" میں نے اسے پچکارا اور بڑی مشکل سے آگے چلنے پر آمادہ کیا۔

پھر میں نے سیٹھ جی کو ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے جمنا کے کنارے جا رہے تھے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور ہر طرف صبح کا جھٹپٹا پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں سیٹھ جی کے پیچھے ہی ہو لیے۔

جہاں سیٹھ جی رکے، وہاں سے کچھ فاصلے پر میں نے آسن جما لیا اور میری ہدایت پر کمال مجھ سے کچھ دور پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

میں سیٹھ جی پر نگاہ جمائے مالا جپے جا رہا تھا۔ آخر سورج نکلا اور میں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو اس کی طرف ہاتھ جوڑتے دیکھا۔

اسی وقت میں نے اپنے قریب ایک اور سادھو کو دیکھا۔ وہ میرے چہرے کو بغور دیکھ کر کہہ رہا تھا: "تنک دورا گانجے کی پتی ہو گی مہاراج؟"

"گانجے کی پتی!" میں بڑبڑایا اور سوچا کہ یہ کمبخت نشئی باز سادھو اس وقت کہاں ٹپک پڑا۔

"مہاراج! آپ کی مونچھ کچھ ٹیڑھی ہو رہی ہے، ٹھیک کر دوں؟" سادھو میرے قریب ہی بیٹھتا ہوا بولا۔ اپنا لوہے کا لمبا سا چمٹا اس نے زمین پر رکھ دیا۔

"ہاں ٹھیک کردو۔" میں سیٹھ وشوا ناتھ کی طرف دیکھتا ہوا بے خیالی میں بولا۔ "دراصل میں آئینہ بھول..." اور اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اس لیے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

میں نے بس اتنا دیکھا تھا کہ اس سادھو نے زمین سے لوہے کا چمٹا اٹھا کر بہت زور سے میری چندیا پر جما دیا تھا اور میرے فرشتے کوچ کر گئے تھے۔ میری آنکھوں کے آگے دھند سی پھیلتی چلی گئی تھی اور پھر شاید میں دھم سے ریت پر گر گیا تھا۔





غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ جب میرے فرشتوں نے کوچ کیا تھا تو میں جمنا کنارے تھا لیکن جب انھوں نے دوبارہ میرے وجود میں "اینٹری" دی تو میں وہاں نہیں کہیں اور تھا۔ میں کہاں تھا، یہ جاننے کے لیے بہر حال مجھے آنکھیں کھولنا تھیں۔ آنکھیں کھولنے سے قبل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی تھپکیاں دے کر مجھے سلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میری آنکھیں کھلیں تو گویا کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ منظر میرے لیے ناقابلِ یقین سا تھا جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ جب آنکھیں کھولوں گا تو خود کو دشمنوں کے نرغے میں پاؤں گا اور ایک آدھ ریوالور کی نال میرے پہلو میں چبھ رہی ہوگی۔ میرے دشمن مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے اپنے اڈے کی طرف لے جا رہے ہوں گے جہاں سے بمشکل تمام فرار کا موقع نصیب ہو سکے گا کیونکہ ازل سے ایسا ہی ہر ہیرو کے ساتھ ہوتا آیا ہے مگر افسوس کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں دشمنوں کے نرغے میں نہیں تھا بلکہ ایک بگھی کی نشست پر لیٹا ہوا، آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ سامنے والی نشست پر کمال اس طرح گردن اکڑائے ہوئے بیٹھا نظر آ رہا تھا جیسے کسی آدم خور شیر کا شکار کر کے لوٹا ہو۔ اس کا حلیہ اس وقت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اب سادھو سنت کی بجائے شریف آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں میرا حلیہ وہی تھا، یعنی لہراتی ہوئی داڑھی اور سر پر جٹائیں۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت میرے سر میں بڑے زور کی ٹیس اٹھی۔ میرا ہاتھ فوراً اپنی چندیا سہلانے لگا جس پر ایک عدد چھوٹی سی چندیا اور نمودار ہو گئی تھی۔

"آپ کو ہوش... آ گیا سر!" کمال نے مجھے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"تو کیا میں تمھیں بیہوش نظر آ رہا ہوں؟ ہیں!" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"سر! آپ کی مونچھیں..."

"کیا ہوا میری مونچھوں کو؟"

"گرنے والی ہیں سر!" کمال جلدی سے بولا۔ "انھیں جھولی میں ڈال لیں۔"

"کیا بکواس ہے۔" میں نے افسرانہ انداز میں کہا اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرنا چاہا۔ گھنی مونچھیں میرے ہاتھ میں آ گئیں۔ اسی وقت میری نگاہ دونوں نشستوں کے درمیان جگہ پر پڑی جو خالی نہیں بھری ہوئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہاں وہی سادھو رسیوں سے جکڑا ہوا پڑا تھا جس نے میری چندیا پر طبع آزمائی کی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

"یہ... یہ وہی ہے سر جس نے آپ کے سر پر چمٹا مارا تھا۔" کمال نے مجھے اس طرف متوجہ دیکھ کر بتایا۔

"مگر تم نے اسے کس طرح گرفتار...!" میں مزید کہتے کہتے رک گیا۔ میں جو کچھ کہنے والا تھا، وہ افسرانہ شان کے خلاف تھا۔ میں نے اسی لیے ذرا توقف کے بعد کسی قدر بھاری اور افسرانہ لہجے میں کہا۔ "رپورٹ دو!"

"کس بات کی رپورٹ سر؟" کمال حیرت سے بولا۔

"کیا میں تم کو مکھیاں مارنے کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا؟" میں نے بگڑ کر کہا۔

"پتا نہیں سر!" کمال گڑبڑا کر بولا، پھر اسے شاید فوراً یہ احساس ہو گیا کہ وہ کچھ غلط بات کہہ گیا ہے اس لیے جلدی سے کہا۔ "دیکھیے نا سر! آپ نے مجھے کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا کہ کیا کرنا ہے۔"

"ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی، سمجھے!" میں سخت لہجے میں بولا۔ "میں نے اسی لیے ذرا ڈھیلا چھوڑا تھا کہ مجرم فوراً میری طرف متوجہ ہو جائیں اور میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ دیکھ لو کہ مجرم میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ٹھیک طرح مونچھیں چپکاتا اور انھیں یوں ڈھیلا نہ چھوڑ دیتا کہ وہ ٹیڑھی ہو جاتیں۔"

میری بات سن کر کمال کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہونے لگا، پھر وہ چند لمحے بعد بولا۔ "آپ نے کمال کر دیا سر! واقعی یہ تو میرے خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔"

"حالانکہ تمھارا نام کمال ہے مگر کمال ہم دکھاتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں اب بتاؤ کہ جب اس بدبخت نے میرے سر پر چمٹا مارا تو تم نے کیا کیا؟"

"میں کیونکہ قریب ہی موجود تھا اور اسے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا اس لیے جیسے ہی اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی، میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ سنبھل پاتا میں نے بھی اس کے سر پر چمٹا جما دیا۔" کمال اپنا کارنامہ بیان کرنے لگا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر سوال کیا۔

"یہ بھی آپ کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر دو باوردی پولیس والے موجود تھے۔ میں نے انھیں اشارے سے قریب بلایا تو وہ غصے میں بل کھاتے میرے پاس آ گئے۔ میں نے انھیں اپنا مخصوص نشان دکھا کر بتایا کہ میرا تعلق کس محکمے سے ہے۔ ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان میں سے ایک کے ذریعے میں نے یہ بگھی منگوائی۔ اس کے بعد مجرم کو رسیوں سے جکڑ دیا، پھر ان سپاہیوں کی مدد سے آپ دونوں کو بگھی میں ڈال کر سی آئی ڈی آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔" کمال نے پوری روداد سنا دی۔

"بہت خوب!" میں طویل سانس لے کر بولا۔ "تم نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔" میں نے دُون کی چھوڑی کیونکہ مجھے وہ ارنا بہر حال اپنے سر منڈھنا تھا اور کمال کو میری باتوں پر سو فیصد یقین آ گیا تھا۔ پھر معاً مجھے اس موٹر سائیکل کا خیال آیا جسے جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا اور جس کے ذریعے میں اور کمال جمنا کے کنارے تک پہنچے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں بولا۔ "وہ موٹر سائیکل کیا تم نے وہیں جھاڑیوں میں چھپا دی؟"

کمال میرے سوال پر گڑبڑا گیا۔ وہ غالباً اس ہنگامے میں موٹر سائیکل کے وجود کو قطعی فراموش کر بیٹھا تھا اسی لیے میرے سوال کرنے پر اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

"بولتے کیوں نہیں؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر ڈانٹا۔ "پتا ہے، وہ موٹر سائیکل سرکاری ملکیت ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا یا اسے کوئی وہاں سے ٹہلا لے گیا تو تمھاری تنخواہ سے بہت لمبے عرصے تک کٹوتی کی جاتی رہے گی۔"

"وہ سر... نہیں... اسے... اس کا خیال کرتا تو... تو مجرم... مجرم ہاتھ سے نکل جاتا۔" اس نے عذر پیش کیا۔

"بکواس، نری بکواس!" میں ہاتھ اٹھا کر افسرانہ شان سے بولا۔ "مجرم اس وقت تمھارے ہاتھ میں نہیں تھا جو نکل جاتا۔ وہ ریت پر بیہوش پڑا ہوا تھا۔"

"آپ... آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!" کمال نے کہا۔ "میں دفتر پہنچ کر دوبارہ وہاں جا کر موٹر سائیکل لے آؤں گا۔"

"ہاں بالکل!" میں زور دے کر بولا۔ اسی وقت میری نگاہ بندھے ہوئے سادھو پر پڑی جو کسمسانے لگا تھا۔

کمال بھی اس طرف متوجہ ہو گیا۔ "یہ شاید ہوش میں آ رہا ہے سر!"

"میرا خیال ہے کہ اس کمبخت نے بھی میری طرح میک اپ کیا ہوا ہے۔ اس کی داڑھی، مونچھیں اور سر پر موجود جٹائیں نقلی ہیں۔ کیا خیال ہے تمھارا؟" میں نے تائید طلب نگاہ سے کمال کو دیکھا۔

"بالکل، بالکل سر!" کمال نے تائید میں بہت زور سے سر ہلایا۔ "کمال ہے کہ اب تک مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا تھا۔"

"اس لیے کہ تم گھامڑ ہو۔" میں نے موقع غنیمت جان کر افسری جھاڑی۔

"یس سر!" کمال کے منہ سے حسبِ عادت نکل گیا مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ "نو سر!"

"کیا یس سر اور کیا نو سر؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ... یہ کہ میں گھامڑ نہیں... گھامڑ ہوں سر... سر گھامڑ!"

"ہاں تم گھامڑ ہو اسی لیے اتنی سامنے کی بات نظرانداز کر دی حالانکہ میں نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہی جان لیا تھا کہ یہ میک اپ میں ہے اور اس کی داڑھی مونچھیں نقلی ہیں۔ لو یہ دیکھو!" یہ کہہ کر میں جھکا اور اس سادھو کی داڑھی پکڑ کر کھینچی۔

"آہ!" معاً سادھو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"کمبخت نے خوب گوند لگا کر داڑھی چپکائی ہے۔" میں بڑبڑایا

داڑھی مونچھیں اصلی نہیں ہیں اور میں کوئی بہروپیا ہوں۔ اس نے سادھو سے کہا تھا کہ وہ میرے سر پر چمٹا مار کر مجھے بیہوش کر دے۔ جب سادھو میرے پاس پہنچا تھا تو اس نے واقعی میرے چہرے پر نقلی داڑھی مونچھیں دیکھی تھیں کیونکہ میری مونچھ کا ایک حصہ ٹیڑھا ہو رہا تھا۔ پھر سادھو نے وہی کیا تھا جو اس سے کہا گیا تھا۔

ہر چند کہ اس بدبخت نے مجھ پر بڑا ظلم کیا تھا مگر اسے مزید قید میں رکھنا بیکار تھا اس لیے مجبوراً میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مجرموں نے بڑی چالاکی سے مجھے ضرب پہنچائی تھی اور میری چندیا پر چمٹا بجوا کر صاف نکل گئے تھے۔

سادھو کو دفع کر کے میں کمال کے ہمراہ اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ اب میں نے سادھو کا بھیس ختم کر دیا تھا۔ دفتر میں آ کر بیٹھتے ہی مجھے پھر موٹر سائیکل یاد آگئی۔ میں نے کمال کو موٹر سائیکل لانے بھیج دیا اور سوچنے لگا کہ اب سیٹھ وشواناتھ سے میرا ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کی طرف سے مطالبہ پورا کیے جانے کے بارے میں رضامندی پا کر مجرم اس سے ایک بار ضرور رابطہ قائم کریں گے۔

مجھے اگر حیرت تھی تو صرف اس بات پر کہ مجرموں کو یہ بات کس طرح پتا چل گئی کہ میں سادھو کا بھیس بدل کر جمنا کے کنارے ان کی تلاش میں آ رہا ہوں۔ اگر وہ میری طرف سے لاعلم ہوتے تو اس کمبخت سادھو سے میری گھڑنتی کیوں کراتے۔ میں مجرموں کو پکڑنے جمنا کے کنارے جا رہا ہوں، اس راز سے صرف اور صرف کمال واقف تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ ہو نہ ہو میرا ماتحت کمال مجرموں سے ملا ہوا ہے۔ اسی نے مجرموں کو اس راز سے آگاہ کیا ہوگا۔

"اچھا تو بیٹا کمال! یہ تم تھے۔" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "تمھیں چٹنی نہ بنا دیا تو میرا نام بھی اللہ دتا نہیں، ہاں!"

تربیت کے دوران میں خاص طور پر یہ بات مجھے ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ شک و شبے سے کوئی بھی بالاتر نہیں ہوتا اور کبھی کبھی مجرم بالکل سامنے ہوتا ہے اور صرف اس لیے نہیں پکڑا جاتا کہ اس کی شخصیت کو شک و شبے سے بالاتر تصور کیا جاتا ہے۔ جب تک کمال نہ آگیا، میں اپنے ذہن میں منصوبہ بندی کرتا رہا کہ اس کی زبان کس طرح کھلوائی جائے مگر وہ خلافِ توقع کافی دیر میں آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"تمھیں اتنی دیر کیسے ہو گئی آنے میں؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

"کوئی سواری نہیں مل رہی تھی سر!" وہ رونی صورت بنا کر بولا۔

"کیا مطلب؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔ "تم موٹر سائیکل پر نہیں آئے؟"

اور اسی کے ساتھ دوبارہ اس کی داڑھی زور سے کھینچ لی۔

اس کے منہ سے پھر چیخ بلند ہوئی اور یہ چیخ پہلی سے بلند تھی۔ داڑھی تو خیر اپنی جگہ سے نہ ہلی مگر اس کا سر اٹھ گیا۔

"بھگوان کے لیے... میری داڑھی چھوڑ دے بالک!" سادھو گڑگڑایا۔

"ابے بالک تو خود ہوگا، میں کیوں بالک ہوتا۔" میں نے کہا اور اس کی داڑھی چھوڑ دی کیونکہ وہ واقعی اصلی داڑھی تھی۔ داڑھی چھوڑتے ہی مجھے مونچھوں کا خیال آیا اور سوچا کہ وہ ضرور نقلی ہوں گی۔ میں نے ان پر طبع آزمائی شروع کر دی مگر میری بدقسمتی کہ وہ بھی اصلی ثابت ہوئیں۔ میں نے جھنجلا کر اس کی لمبی لمبی جٹائیں اپنی مٹھی میں جکڑ لیں۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا اور منت سماجت کر رہا تھا مگر میں نے اپنے کانوں میں تیل ڈال لیا تھا، سچ مچ نہیں بلکہ بطور محاورہ۔ میں اس پر اس لیے اور بھی خار کھا رہا تھا کہ کمال سے میں نے دعویٰ کیا تھا، داڑھی مونچھیں نقلی ہیں۔

وہ سادھو اصلی ثابت ہو گیا تھا، یہ بات میرے لیے سخت الجھن کی تھی۔ اس سادھو کا حلیہ مطلوبہ مجرموں میں سے کسی سے بھی نہیں ملتا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ ان میں سے کسی نے اتنی جلدی داڑھی رکھ لی ہو۔ پھر یہ سادھو کون ہے؟ اس نے عین وقت پر رنگ میں بھنگ کیوں ملائی؟ میں سوچنے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں بگھی ہی میں تفتیش شروع کر دیتا، دفتر آ گیا اور یہ اطلاع مجھے کمال نے دی۔ میں بگھی سے اتر گیا۔

کمال نے سادھو کے پیر کھول دیے تاکہ وہ اپنے پیروں سے چل کر دفتر میں جا سکے۔ بگھی کو کرایہ ادا کر کے رخصت کر دیا گیا۔

دفتر کی عمارت میں حوالات نما کچھ کوٹھریاں بھی تھیں مگر یہ کوٹھریاں کوتوالیوں اور پولیس تھانوں سے ذرا کشادہ تھیں۔ سادھو کو میرے حکم پر وہیں لے جایا گیا۔ میں اور کمال اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ جب سادھو کو کوٹھری میں بند کیا جانے لگا تو وہ آہ و بکا کرنے لگا۔ "بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو! میں نے کوئی پاپ نہیں کیا۔"

"پاپ نہیں کیا تو اپنے باپ کے سر پر یوں ہی چمٹا جما دیا تھا؟" میں تاؤ میں آ کر غرایا۔

"بس بھول ہو گئی۔ ایک چلم گانجے کے کارن (سبب) مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" پھر سادھو نے بغیر تشدد کے سب کچھ بتا دیا۔

سادھو کا بیان تھا کہ جمنا کے کنارے اسے ایک شخص ملا تھا جس نے اسے کچھ گانجا دیا تھا اور مزید ایک چلم گانجا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس شخص کا حلیہ انھی چاروں مطلوبہ مجرموں میں سے ایک جیسا تھا۔ اس نے سادھو کے سپرد ایک کام کیا تھا جو سادھو کی نظر میں بہت آسان تھا۔ اس شخص نے دور سے مجھے دکھا کر سادھو کو بتایا تھا کہ میری

"نہیں سر!"

"کیوں؟"

"اس کے دونوں ٹائر کسی نے پنکچر کر دیے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے اسے وہاں سے اٹھوا کر ایک تانگے میں ڈالا اور ٹھیکے کو دے دیا۔ وہاں سے میں یکے میں بیٹھ کر یہاں آیا ہوں۔ [illegible] ٹھیک کر دے گا۔" کمال نے بتایا۔

"یہ بھی انھی بدبختوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے [illegible] سے کہا۔

"یس سر!" کمال نے حسب عادت تائید کی۔

"لیکن انھیں یہ سب کچھ پتا کیسے چلا؟" میں نے کمال کے [illegible] کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا پتا سر!" کمال نے جواب دیا۔

کیسا معصوم اور بے خبر بن رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں [illegible] پھر بولا: "میں نے اپنے منصوبے سے تمھارے سوا کسی کو آگاہ [illegible] کیا تھا پھر دشمنوں کو کس طرح منصوبے کا علم ہو گیا؟"

میرا سوال کمال کے لیے یقیناً غیر متوقع تھا اس لیے وہ بغلیں [illegible] لگا۔ اس کے چہرے سے واضح طور پر گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ غالباً سمجھ گیا تھا کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں۔

"بولو جواب دو!" میں نے ترش لہجے میں کہا۔

"میں... میں... کیا کہہ سکتا ہوں سر!... مگر مجھ سے جیسی قسم لے لیجیے جو میں نے کسی سے چوں بھی کی ہو۔" یہ کہتے [illegible] اس کی آواز بھرا گئی اور مجھے اس پر رحم آنے لگا مگر میں نے خود پر قابو پا لیا۔ تیواڑی جی کی تربیت کام آ رہی تھی۔ ایک [illegible] انھوں نے بتایا تھا کہ حالات چاہے جیسے ہوں، مجرم پر کبھی رحم [illegible] کھانا چاہیے اور اس وقت کمال میری نگاہ میں مجرم ہی تھا۔ کمال نے میری نگاہ میں خود اپنے لیے گڑھا کھود لیا تھا، یہ کہہ [illegible] کہ میں اس سے چاہے جیسی قسم لے لوں۔ اچھا بیٹا! تو بھی کیا [illegible] گا کہ کس سے پالا پڑا تھا۔ تجھ سے وہ قسم کھلواؤں گا کہ تیرے [illegible] بھی جھوٹ نہ بول سکیں۔

"تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں چاہے جیسی قسم لے لوں؟" میں نے [illegible] تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ اس نے اثبات میں [illegible] ہلایا تو میں بولا: "اچھا کھاؤ اپنی اماں کی قسم کہ تم نے کسی کو کچھ [illegible] بتایا۔"

میری نظر میں یہ بہت بڑی قسم تھی۔ کوئی شخص بھی اماں کی جھوٹی [illegible] نہیں کھا سکتا کیونکہ خود مجھے اپنی اماں سے بہت محبت تھی اور کسی [illegible] ان کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا تھا۔ مجھے اسی لیے یقین تھا [illegible] اپنی اماں کی قسم نہیں کھائے گا۔

"اماں کی قسم میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔" کمال نے قسم کھائی۔

قسم کھاتے ہی مجھے کمال کی بے گناہی کا یقین آگیا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی اماں کی جھوٹی قسم کھا جاتا۔ میں نے سوچا کہ اپنے غلط شبہے پر کمال سے معذرت کر لوں مگر مجھے فوراً ہی خیال آگیا کہ وہ میرا ماتحت ہے۔ یہ خیال آتے ہی میری گردن اکڑ گئی۔

"ٹھیک ہے، مجرموں کو کسی اور ذریعے سے پتا چلا ہوگا۔" میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"یس سر!" کمال بولا اور اس کے چہرے پر رونق آگئی۔

اسی وقت چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ابھی ابھی ایک نوجوان لڑکا آپ کے لیے یہ لفافہ دے گیا ہے صاحب!" چپراسی نے ایک نیلے رنگ کا لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے چپراسی سے لفافہ لے لیا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ چپراسی کمرے سے نکل گیا تو میں نے لفافہ کھولا جس میں ایک پرچہ رکھا ہوا تھا۔ میں وہ پرچہ پڑھنے لگا۔

پیارے جاسوس!

اگر تم چاہتے ہو کہ آئندہ تمھاری چندیا پر مزید چمٹے نہ پڑیں تو سیٹھ وشواناتھ کے معاملے میں اپنی ٹانگ نہ پھنساؤ۔ ہم تمھیں اچھی طرح پہچان گئے ہیں۔ تم انسپکٹر دلاور خاں کے ساتھ بھی تھے جب اس نے وہاں چھاپا مارا تھا جہاں ہماری پہلے رہائش تھی۔ تمھارے ستارے اچھے تھے کہ بچ گئے۔ امید ہے کہ تمھارے لیے آج کا سبق کافی ہوگا اور تم مزید جاسوسی فرمانے کی کوشش نہیں کروگے۔ سیٹھ وشواناتھ نے تم سے مدد مانگ کر خود اپنے لیے گڑھا کھودا ہے جس کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ اب اسے زیورات کے علاوہ بھی بطور سزا کچھ ہرجانہ بھرنا پڑے گا۔ امید کہ اگر اب تمھیں سیٹھ بلائے گا تو تم صاف منع کر دوگے۔

فقط تمھارا بھلا چاہنے والے

خط پڑھتے ہی میں چیخ پڑا حالانکہ میز پر چپراسی کو بلانے کے لیے گھنٹی موجود تھی۔ میں نے چپراسی ہی کو چیخ کر بلایا تھا۔

"جی صاحب!" چپراسی دوڑتا ہوا کمرے میں آ کر بولا۔ وہ میرے چیخنے سے گھبرا گیا تھا۔

"وہ... وہ لڑکا کہاں ہے جو یہ لفافہ دے گیا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو لفافہ دیتے ہی چلا گیا صاحب!" چپراسی نے بتایا۔

"دیکھو! اسے دیکھو باہر جا کر! اور ملے تو فوراً پکڑ لاؤ!" میں

نے حکم دیا۔

چپراسی میرا حکم پاکر فوراً دوڑ گیا۔ میں نے چپراسی کے پیچھے ہی کمال کو بھی دوڑا دیا تاکہ اس لڑکے کو پکڑنے میں وہ چپراسی کی مدد کرے۔

کچھ دیر بعد ہی چپراسی اور کمال دونوں منہ لٹکائے واپس آگئے۔ وہ لڑکا انھیں نہیں ملا تھا۔

"مجرم قدم قدم پر زک پہنچا رہا ہے اور... اور ہم اسے نہیں پکڑ پا رہے۔" میں نے خالص جاسوسانہ انداز میں سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی صاحب؟" چپراسی بولا کیونکہ اب وہی میرے سامنے کھڑا تھا اور کمال اپنی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔

"تم جاؤ! میں کمال سے مخاطب تھا۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے چپراسی کو جانے کے لیے کہا۔

"یس سر!" کمال بول اٹھا۔

"کیا خاک یس سر!" میں نے غصے سے کہا۔

"یس سر!" کمال نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔

"کیا یس سر، یس سر لگا رکھی ہے، چپ بیٹھو!" میں نے کمال کو ڈانٹ دیا۔

"یس سر!... او... وہ... وہ نو سر!" کمال گڑبڑا گیا۔

اسی وقت چپراسی ایک اور لفافہ لے کر آیا۔ میں نے لفافہ لیتے ہی ایک دم اسے حکم دیا "پکڑ لو اسے! وہ لڑکا ابھی بھاگا تو نہیں؟"

"صاحب! وہ لڑکا نہیں بوڑھا آدمی ہے۔" چپراسی نے بتایا۔ "اور وہ کہہ رہا ہے کہ جواب لے کر جائے گا۔ میں نے اسے بینچ پر بیٹھا دیا ہے۔"

میں نے ایک طویل سانس لیا اور سوچا کہ اگر یہ لفافہ بھی مجرموں کی طرف سے ہوا تو لفافہ لانے والے کی مینگ ضرور نکالوں گا۔ میں نے اسی لیے جلدی سے لفافہ چاک کیا تو پتا چلا کہ وہ خط مجرموں کی طرف سے نہیں بلکہ ان کا شکار ہونے والے یعنی سیٹھ وشوا ناتھ کی طرف سے تھا۔

انسپکٹر اللہ دتا جی! نمستے

میں نے ویسا ہی کیا جیسا آپ نے کہا۔ مجھے ابھی کچھ دیر ہوئی مجرموں کی طرف سے ایک اور خط ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خط آپ بھی پڑھ لیں اور مجھے بتائیں کہ اب میں کیا کروں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ مجرموں کو میرے اور آپ کے تعلقات کا پتا چلے، اس لیے میں نے اپنی بیٹی کو بھی اس بار آپ کے پاس نہیں بھیجا۔ خط لے کر میرا ایک ملازم آرہا ہے۔ آپ شام ہونے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لیں کیونکہ مجرموں نے مجھے آج رات ہی کا وقت دیا ہے۔ احتیاط کے طور پر آپ میری کوٹھی کے پچھلے دروازے سے آئیں تاکہ کوئی آپ کو کوٹھی میں آتے جاتے نہ دیکھے۔ میں آپ کے لیے پچھلے دروازے کو دن بھر کھلا رکھوں گا۔ اگر آپ نہ آئے تو میں بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔

سیٹھ وشوا ناتھ

خط پڑھ کر ایک بار پھر مجھے جوش آگیا۔ میں نے سوچا کہ مجرموں نے یقیناً سیٹھ سے مطالبہ کیا ہوگا اور وہ جگہ بھی بتائی ہوگی جہاں کو زیورات اور رقم پہنچانا ہے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے فوراً سیٹھ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ خط کے جواب میں میں نے لکھ دیا کہ دن شام سے پہلے سیٹھ سے مل لوں گا۔ سیٹھ کا ملازم جواب لے گیا تو میں نے مجرموں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بھیس بدلنا ضروری سمجھا۔ مجھے ذاتی طور پر نواب کا بھیس بہت پسند تھا اسی لیے وہی بھیس بھرا۔ میرے چہرے پر خوبصورت سی چھوٹی داڑھی میرے رخسار پر سجا تھا، جسم پر شیروانی اور پاجامہ، ہاتھ میں سُبک سی چھڑی۔

"اب میں نواب صاحب لگ رہا ہوں نا کمال؟" میں نے میک اپ کر کے اپنے ماتحت سے داد چاہی۔

"یس سر! بالکل نواب بلکہ مہا نواب سر!" کمال نے تائید کی۔

"اچھا تو پھر چپراسی کو بھیج کر ہمارے لیے بگھی منگوا دو۔ نواب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بگھی ڈھونڈتا پھرے۔" میں نے کہا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں بگھی میں بیٹھا ٹمک ٹمک کرتا باغ کی طرف جا رہا تھا۔

سیٹھ وشوا ناتھ کو غالباً توقع نہیں تھی کہ میں اس کے ملازم کے پیچھے پیچھے ہی دوڑا چلا آؤں گا اس لیے کوٹھی کا پچھلا دروازہ بند ہی ملا۔ میں نے بگھی والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا تھا اور دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا ایک موٹا سا آدمی تھا۔ میں اس سے بغیر کچھ کہے سنے دروازے میں داخل ہونے لگا۔

"ارے... ارے تو کہاں چلو آوت ہے رے؟" موٹا مجھے اندر آنے سے روکتے ہوئے بولا۔

میرا ایک پاؤں اندر تھا اور ایک باہر! اس موٹے شخص کی چاند گھٹی ہوئی تھی اور سر پر موٹی سی چوٹی تھی، میرے سینے پر ہاتھ رکھ دی تھی اور مجھے اندر آنے سے روک رہا تھا۔

"راستے سے ہٹ جا گستاخ!" میں نے خالص نوابی انداز میں کہا۔

"ارے تو ایسے نا ہیں مانے گو۔ موتی ہے موتی!... آؤ... آؤ!" موٹے نے مڑ کر صدا لگائی اور مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔ میں سمجھا تھا موتی اس کا کوئی ساتھی ہوگا۔

اندر پہنچتے ہی موتی مجھے نظر آگیا جو بھونکتا ہوا میری طرف آ رہا تھا کیونکہ وہ آدمی کی بجائے کتا تھا۔

میں نے کتے کے حملے سے بچنے کے لیے زقند بھری اور سیدھا عمارت کی طرف دوڑ لیا مگر وہ ظالم مجھے کہاں بخشنے والا تھا، لپک کر اس نے میرا پاجامہ پکڑ لیا۔

"بچاؤ، بچاؤ!" میں چیخ پڑا۔

موٹا دور کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔ وہ مجھے ستانے کے لیے زور سے بولا "اب ذرا بھاگ کے دکھا! میری بات منہ میں ہی نا آئی سسر کے!"

موتی بے تکلفی پر آمادہ ہونے لگا تو میں پھر بھاگ اٹھا کیونکہ اب اس نے میرا پاجامہ پھاڑ کر چھوڑ دیا تھا اور پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہو کر میرا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پھر بھونکتا ہوا میرے پیچھے جھپٹا۔ سامنے ایک پانی بھری کیاری تھی جس کی مینڈھ پر میرا پیر پھسل گیا اور میں دھڑام سے کیاری میں جا پڑا۔ اسی دوران میں موتی زقند بھر کے میری پشت پر آ رہا۔ میں ایک بار پھر "بچاؤ، بچاؤ" چیخنے لگا۔

میرے تمام کپڑے پانی اور کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ نوابی داڑھی اور نوابی مستا بھی اس مصیبت میں میرا ساتھ چھوڑ گئے اور کیچڑ میں جا پڑے۔

"ارے یہ کیا چیخ پکار ہو رہی ہے یہاں؟" ایک میٹھی سریلی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ یہ آواز سیٹھ کی حسین و جمیل بیٹی سروج کے سوا کس کی ہو سکتی تھی۔

"ہے بٹیا! یہ مسلمنا جبرجستی کوٹھی میں گھس آیو ہے۔" موٹے نے باآواز بلند بتایا۔

میں نے کیچڑ سے اپنا منہ اٹھایا اور زور سے سروج کا نام لے کر اسے پکارا۔ وہ سامنے ہی کچھ فاصلے پر برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ میری آواز سن کر چونکی، پھر برآمدے سے اتر کر کیاری کی طرف بڑھی۔

"ارے نارائن! موتی کو بلاؤ!" اس نے موٹے کو حکم دیا۔

"موتی... موتی... موتی!" موٹا چیخنے لگا۔

کتا میری پشت سے چھلانگ لگا کر موٹے کی طرف دوڑ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم... تم... کیا تم انسپکٹر اللہ دتا ہو؟" سروج غیر یقینی سے لہجے میں بولی۔

"ہاں میں وہی بدنصیب ہوں۔" میں مجرموں کی طرح بولا۔

"مگر... مگر تم ادھر سے کیوں آئے؟ کوٹھی کے سامنے والے دروازے سے کیوں نہیں آئے؟"

"اس لیے کہ تمھارے پتا جی نے یہی کہا تھا مگر مجھے کیا پتا تھا کہ انھوں نے مجھے یہاں یہ درگت بنوانے کے لیے بلوایا تھا۔" میں شکایت آمیز انداز میں بولا۔

"نہیں، نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔" وہ مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "کیاری سے باہر تو آؤ!"

میں چھپ چھپ کرتا کیاری سے باہر آگیا مگر اس سے پہلے میں نے نوابی مستا اور نوابی داڑھی کیاری سے اٹھا کر شیروانی کی جیب میں ڈال لیے تھے۔

"تم یہیں ٹھہرو! میں ابھی پتا جی کو بھیجتی ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"مگر میں جا رہا ہوں۔ میں اس حلیے میں ان سے نہیں ملنا چاہتا۔" میں بولا۔ "مجھے تم دروازے تک چھوڑ دو تاکہ تمھارا کتا دوبارہ میزبانی کے فرائض نہ ادا کرنے لگے۔"

"پتا جی نے بلایا تھا تو انھیں ضرور کوئی خاص کام ہوگا۔ تم رکو تو کپڑوں کا بندوبست بھی ہو جائے گا اور نہانے کا بھی!" سروج نے اصرار کیا۔

کوئی حسینہ اگر اس طرح روکنے پر اصرار کرے تو بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ میں نے رکنے کی حامی بھر لی اور وہ اتراتی ہوئی عمارت میں چلی گئی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ سیٹھ وشوا ناتھ کے ہمراہ سروج بھی آئے گی مگر وہ ظالم ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔ سیٹھ نے مجھ سے بہت معذرت کی اور میرے سامنے موٹے کو خوب ڈانٹ پلائی۔ دراصل اسے توقع نہیں تھی کہ میں فوراً دوڑا چلا آؤں گا۔

سیٹھ مجھے اسی حال میں کوٹھی کے اندر لے گیا۔ پہلے اس نے مجھے لباس دے کر غسل خانے میں گھسا دیا۔ میں نے نہا کر دھوتی باندھی اور کرتہ پہن کر باہر آگیا۔ سیٹھ نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ میرے کپڑے دھونے کے بعد فوراً سکھا کر ایک تھیلے میں رکھ دیے جائیں۔ میں نے شیروانی کی جیب سے نوابی داڑھی اور نوابی مستے کو نکال لیا تاکہ شیروانی کے ساتھ ہی وہ بھی نہ رگڑ دیے جائیں۔ میں نے سیٹھ کو بتایا کہ مجرموں کی نظروں سے بچنے کے لیے نواب کا بھیس بھر کے آیا تھا۔

"ٹھیک ہے اب یہاں سے آپ دھوتی کرتہ پہنے، جھولا ہاتھ میں لٹکائے جائیں گے تو کوئی بھی نہ پہچان پائے گا۔ میں بطور احتیاط آپ کے ماتھے پر تلک بھی لگا دوں گا۔" سیٹھ وشوا ناتھ میرے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

سیٹھ وشوا ناتھ مجھے ساتھ لیے نشست کے کمرے میں آ گیا جہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"پہلے یہ بتائیں کہ وہی بڑے چلیں گے یا آلو چھولے؟" سیٹھ نے

دانت نکال کر پوچھا۔

میں نے بھی جواباً دانت نکال دیے اور بولا ”دونوں“۔

سیٹھ نے اپنے ملازم کو بلا کر دہی بڑے اور آلو چھولے لانے کے لیے کہا۔ جب ملازم چلا گیا تو اس نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا ”آج صبح ہی مجھے مجرموں کی طرف سے یہ خط ملا ہے۔ اسے آپ بھی پڑھ لیں اور بتائیں کہ اب کیا کیا جائے؟“

میں نے لفافہ میز سے اٹھاتے ہوئے پوچھا ”یہ لفافہ آپ تک کیسے پہنچا؟“

”جیسے پہلے پہنچا تھا“ سیٹھ نے جواب دیا ”یہ لفافہ بھی ایک شخص میرے چوکیدار کو یہ کہہ کر دے گیا تھا کہ فوراً مجھ تک پہنچا دیا جائے۔“

میں نے سیٹھ کا جواب سن کر ایک طویل سانس لیا اور لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پرچہ پڑھنے لگا۔

سیٹھ!

انسپکٹر اللہ دتا کو تم تمھارے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کا مزا چکھا چکے ہیں۔ تمھاری ہر حرکت پر ہماری نظر ہے۔ اب اگر تم نے اس انسپکٹر کو درمیان میں لانے کی کوشش کی تو اس کی بھی خیر نہیں ہو گی اور تمھاری بھی! تم جانتے ہی ہو کہ ہم تمھارا کیا حشر کر سکتے ہیں۔ تم نے آج صبح جمنا کے کنارے پر ہمارے حکم کی تعمیل کا اظہار کیا ہے۔ پہلے ہمارا مطالبہ صرف زیورات تھا مگر اب یہ مطالبہ بڑھ گیا ہے کیونکہ تم نے ایک حماقت کی ہے۔ بطور جرمانہ اب تمھیں زیورات کے ساتھ ہی دس ہزار روپے کے نوٹ بھی تھیلے میں رکھنا ہوں گے۔ آج رات نو بجے زیورات اور نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا تمھیں جی بی روڈ کی ایک مشہور طوائف انوری بائی کے کوٹھے پر پہنچانا ہے۔ تم انوری سے کچھ بات نہیں کرو گے اور اسے تھیلا دے کر چلے آؤ گے۔ اگر تم نے اس بار کوئی چال بازی دکھائی یا مطالبہ پورا نہ کیا تو اپنی تباہی و بربادی کے خود ذمے دار ہو گے۔

فقط
تمھارے خیر خواہ

میں نے مجرموں کا خط پڑھ کر میز پر رکھ دیا پھر چند لمحے بعد بولا ”آپ کو انوری بائی تک تھیلا ضرور پہنچانا چاہیے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا“ سیٹھ دشوانا تھ جلدی سے بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اس تھیلے میں ایک خط بھی رکھ دوں کہ وہ لوگ میرے کاغذات جلد از جلد واپس کر دیں۔ خواہ مخواہ ان کے ساتھ جھگڑا مول لینے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان کا مطالبہ ماننے پر آمادہ ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں“ وہ ٹھنڈا سانس بھر کے بولا ”میرے خیال سے بات نہیں بڑھانا چاہیے۔“

”میں نے صرف تھیلا پہنچانے کا مشورہ دیا تھا‘ زیورات اور رقم نہیں!“ میں معنی خیز لہجے میں بولا کیونکہ میرے ذہن میں پھر ایک منصوبہ کلبلانے لگا تھا۔

”مگر خالی تھیلا... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا انسپکٹر صاحب!“ سیٹھ نے حیرت سے کہا۔

”تھیلا خالی نہیں ہو گا بلکہ اس میں چھوٹے بڑے کچھ پتھر ہوں گے تاکہ وزنی محسوس ہو“ میں نے اسے بتایا۔

”لیکن اس سے فائدہ کیا ہو گا؟“ سیٹھ کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہونے لگا۔

”انوری بائی سے وہ تھیلا لینے یقیناً ان مجرموں میں سے کوئی آئے گا پھر وہ تھیلا لے کر اپنے ساتھیوں تک پہنچے گا‘ سمجھے آپ! ہم اس کا تعاقب کر کے‘ اس کے بقیہ ساتھیوں تک بھی جا پہنچیں گے اور یوں مجرم گرفتار ہو جائیں گے“ میں نے سیٹھ کو مطمئن کرنے کی خاطر اپنا منصوبہ بیان کر دیا۔

”اگر اس بیچ کوئی گڑبڑ ہو گئی تو بُرا ہو گا“ سیٹھ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

”آپ مطمئن رہیں‘ اس بار مجرم بچ کر نہیں نکل پائیں گے۔“

”آپ کو اپنا وہ وعدہ تو یاد ہے انسپکٹر کہ مجرموں سے وہ اہم کاغذات حاصل کر کے مجھے دے دیں گے؟“ سیٹھ نے کہا۔

”ہاں‘ کیوں نہیں! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں“ میں نے جواب دیا‘ پھر بولا ”آپ سرمئی رنگ کے کپڑے کا تھیلا انوری بائی تک پہنچائیں گے تاکہ میں پہچان سکوں۔ تھیلے میں زیورات اور نوٹوں کی بجائے آپ پتھر اور ردی کاغذ رکھیں گے‘ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گیا“ سیٹھ مردہ سے لہجے میں بولا۔

اسی وقت سیٹھ کا ملازم دہی بڑے اور آلو چھولے لے آیا۔ میں نے دونوں پلیٹیں صاف کر دیں‘ پھر بولا ”اگر میرے کپڑے دھل گئے ہوں تو منگوا دیں اب میں چلوں گا۔“

کچھ دیر بعد میں اپنے کپڑے ایک بڑے سے تھیلے میں رکھ کر دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے سیٹھ کی کوٹھی سے نکل رہا تھا۔ سیٹھ نے احتیاطاً میرے ماتھے پر تلک بھی لگا دیا تھا۔ مجھے اس وقت آئینہ دیکھنے کی بڑی خواہش ہو رہی تھی۔ تانگے میں بیٹھ کر دفتر پہنچنے سے قبل میں نے اپنی یہ خواہش ایک نائی کی دکان میں گھس کر پوری کی۔ میں واقعی بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ ایک ہندو نوجوان کا بہروپ مجھ

پر بہت سج رہا تھا۔ کاش سروج مجھے اس روپ میں دیکھتی۔ میں نے آئینہ دیکھتے ہوئے سوچا تھا مگر وہ ظالم تو بس چھب دکھا کر روپوش ہو جاتی تھی۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے اپنے ماتحت کمال کو جی بی روڈ جا کر انوری بائی کا کوٹھا تلاش کرنے کا حکم دیا تاکہ رات کو بآسانی میں وہاں پہنچ سکوں۔

”لیکن... لیکن سر اگر مجھے اس بدنام جگہ کسی نے دیکھ لیا تو... تو بڑی بدنامی ہو گی“ کمال ہچکچاتے ہوئے بولا ”ابھی مجھے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں بھی کرنا ہیں۔“

”تمھیں صرف وہی شخص دیکھ پائے گا جو خود وہاں موجود ہو۔ میں تمھیں یہ نیک مشورہ دوں گا کہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں ایسے لوگوں سے کرنا جو جی بی روڈ جاتے ہوں“ میں نے مسئلے کا حل بتایا۔

”یس سر! مگر...“

”اب اگر مگر کچھ نہیں‘ دفع ہو جاؤ!“ میں ہاتھ اٹھا کر اپنے سابق باس دلاور خاں کے انداز میں دھاڑا۔

کمال کو آخر میرے حکم کی تعمیل کرنا ہی پڑی اور نہ صرف اس وقت بلکہ رات کو بھی اسے میرے ساتھ جی بی روڈ جانا پڑا۔

میں نے کمال کو آٹھ بجے ہی موٹر سائیکل لے کر اپنے گھر پہنچنے کی ہدایت کر دی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر آ گیا۔ اس بار میں نے بھیس بدلنا ضروری نہیں سمجھا۔

موٹر سائیکل‘ کمال ہی چلا رہا تھا۔ ہم اجمیری گیٹ سے گزرتے ہوئے قطب روڈ پر پہنچے‘ پھر کچھ دیر بعد جی بی روڈ پر نکل آئے۔ بازار کی رونق بہار پر تھی۔ میں نے کمال کو ہدایت کی ”موٹر سائیکل‘ انوری بائی کے کوٹھے سے کچھ دور ہی چھوڑ دینا ہے‘ سمجھے! بقیہ فاصلہ ہم پیدل چل کر عبور کریں گے۔“

”یس سر!“ کمال نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

کچھ مزید فاصلہ طے کر کے کمال نے ایک پنواڑی کی دُکان کے سامنے موٹر سائیکل روک دی۔ میں موٹر سائیکل سے اُتر گیا۔

”سر! اگر آپ پان کھائیں تو...“ کمال نے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں لے لو‘ میٹھا!“ میں نے کہا۔

پنواڑی کی دُکان پر خاصا ہجوم تھا۔ کمال نے پنواڑی کو پان بنانے کے لیے کہا۔ میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔

”نہ جانے لوگ لیڈیز پان کیوں کھاتے ہیں“ دُکان کے سامنے کھڑا ہوا ایک شخص بڑبڑایا اور کمال کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اسی کے ساتھ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے کوئی ناقابلِ یقین منظر دیکھ لیا ہو اور یہی حالت میری ہوئی تھی۔

مڑ کر دیکھنے والے شخص کو میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان ذات شریف کو میں چچا چھٹو کہتا تھا‘ اسی طرح جس طرح گلی محلے کے دوسرے بزرگوں کو چچا کہتا تھا۔ وہ ہماری ہی گلی میں تین مکان چھوڑ کر رہتے تھے۔ وہ کبوتر باز تھے اور استاد چھٹو کے نام سے مشہور تھے مگر کبوتر بازی کے علاوہ انھیں کچھ اور ”بازیوں“ کا بھی شوق تھا جس سے محلے کے سبھی چھوٹے بڑے واقف تھے۔ چچا چھٹو رنڈی باز اور شرابی بھی تھا۔ اس وقت بھی ان کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں وہاں سے ریس لگا جانے کے امکانات پر غور کرتا‘ چچا چھٹو کے چہرے پر حیرت کی بجائے اب غصے کے اثرات نمودار ہو گئے اور بولے ”ابے تُو اللہ دتے یہاں!“

”وہ... وہ میں ایک سرکاری...“ میں گڑبڑا کر اصل بات کہنے والا تھا کہ سنبھل گیا اور سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

”یہاں سے فوراً بھاگ جا!“ استاد چھٹو خاں میری بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولے ”اگر میں نے آئندہ تجھے اس بازار میں دیکھا تو ٹانگیں توڑ دوں گا‘ سمجھا!“

کمال حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی استاد چھٹو کو دیکھ رہا تھا اور مجھے اس وقت اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ اپنے ماتحت کے سامنے بے عزتی ہونے پر شرمندہ ہو سکتا۔ میں نے وہاں سے کھسک لینے ہی میں عافیت سمجھی۔ کمال میرے پیچھے پیچھے تھا۔ پیچھے سے استاد چھٹو خاں کے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”ٹانگ برابر لونڈا ہے اور چلا ہے رنڈی بازی کرنے!“ استاد چھٹو خاں کسی سے کہہ رہے تھے ”بھلا بتاؤ‘ کیا زمانہ آ لگا ہے۔ جب ہم اس کی عمر کے تھے تو اس بازار کا رستہ تک نہیں...“

استاد چھٹو خاں کی آواز پیچھے رہ گئی کیونکہ اب میں کمال کے ہمراہ کافی آگے نکل چکا تھا۔ اس کمبخت کمال کے کسی آشنا نے تو اسے اس بدنام بازار میں نہیں دیکھا تھا مگر میں ناحق پکڑا گیا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر مجھے خواہ مخواہ کمال پر غصہ آئے جا رہا تھا۔ دوسری طرف یہ سوچ کر میری ہوا خراب ہو رہی تھی کہ اگر استاد چھٹو خاں نے میرے ابا تک یہ خبر پہنچا دی تو کیا ہو گا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ میں اس بازار میں کیوں آیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں کمال پر برس پڑا ”عجب گاؤدی ہو تم! اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو!“

”یس سر!“ کمال عادت کے مطابق بولا اور میں مزید کھول اٹھا۔

”خاموش!“ میں دھاڑا ”واپس چلو!“

”یس سر! مگر... وہ... وہ آپ کے... انھوں نے دیکھ لیا تو وہ آپ کی ٹانگیں...“

”چپ!“ میں نے اسے پھر ڈانٹ دیا ”کسی اور طرف سے

"چلو!"

پھر گلیوں گلیوں لمبا چکر کاٹ کر ہم انوری بائی کے کوٹھے کے سامنے پہنچ ہی گئے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ کوٹھے پر چڑھوں گا مگر اب استاد چھنو خاں کے خوف سے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ کہیں لو پر دہی نہ بیٹھے ہوں۔ پھر یہ کہ میں پہلے کبھی کسی رنڈی کے کوٹھے پر نہیں چڑھا تھا اس لیے ہمت اور بھی جواب دے گئی۔

"ہم کوٹھے پر نہیں چڑھیں گے بلکہ نیچے ہی رہ کر آنے جانے والوں پر نظر رکھیں گے۔" میں نے کمال کو اپنے نئے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"یس سر!" کمال بولا۔ "مگر سر! کیا ہم اسی طرح زینے کے سامنے کھڑے رہیں گے؟"

"نہیں، ہم آس پاس منڈلاتے رہیں گے۔" میں نے خالص جاسوسی فقرہ کہا اور جی ہی جی میں خوش ہوا۔

میں کمال کے ہمراہ وہاں ٹہلتا یا منڈلاتا تو رہا مگر میرے اعصاب پر استاد چھنو خاں کا خوف مسلط رہا کہ کہیں وہ ادھر نہ آ نکلیں۔ خدا کا شکر کہ وہ ادھر نہیں آئے، پتا نہیں وہ کس کوٹھے پر رم گئے البتہ کچھ دیر بعد سیٹھ وشوا ناتھ کی بگھی وہاں آ کر رکی۔ اس نے بھی غالباً دن میں اپنے کسی ملازم کو بھیج کر انوری بائی کے کوٹھے کا پتا معلوم کرا لیا تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق یوں بھی ہو گئی کہ وہ بگھی میں تنہا نہیں تھا۔

سیٹھ وشوا ناتھ بگھی سے اترا تو میں نے حسب ہدایت اس کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا تھیلا دیکھا۔ وہ کوٹھے کا زینہ چڑھ گیا، پھر جب وہ کچھ دیر بعد واپس ہوا تو خالی ہاتھ تھا۔

اب مجھے بہت چوکنا رہنا تھا۔ سیٹھ وشوا ناتھ اپنی بگھی میں بیٹھ کر چل دیا۔ اب میں اس کوٹھے سے اترنے والے ہر شخص کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ میرے ذہن میں مجرموں کا پورا حلیہ تھا مگر ابھی تک مجھے اس حلیے کا کوئی شخص نظر نہیں آیا تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں چونک پڑا۔ کوٹھے سے ایک جوان العمر شخص سرخ تھیلا ہاتھ میں لٹکائے اتر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کچھ دیر پہلے اسے کوٹھے پر چڑھتے دیکھا تھا مگر اس کا حلیہ مجرموں کے حلیوں سے قطعی مختلف تھا۔ یہ مجرموں کا کوئی آلۂ کار بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ذہن میں آیا اور میں نے کمال کے پہلو میں آہستہ سے کہنی ماری۔ "چلو!"

میں اور کمال اس کے پیچھے ہو لیے۔ کچھ دور چل کر ہی وہ شخص ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ وہ جگہ وہاں سے بہت دور تھی جہاں ہم نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ اب کیا ہو؟ میرا ذہن چکرانے لگا، پھر مجھے ترکیب سوجھ ہی گئی۔

"میں دوسرے خالی تانگے میں بیٹھ کر اس کا تعاقب کرتا ہوں، تم موٹر سائیکل لے کر پیچھے آؤ!" میں نے کہا اور خالی تانگے کی طرف بڑھنے لگا۔

"مگر سر! میں... میں... جب تک موٹر سائیکل لے کر یہاں آؤں گا تانگا..."

کمال نے اور جانے کیا کہا مگر یہ وقت کچھ سننے سنانے کا نہیں تھا۔ مجرم ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ میں تیزی سے بڑھ کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ جس تانگے میں وہ شخص بیٹھا تھا وہ اب چل پڑا تھا۔

"کدھر بابو صاب؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"اس تانگے کے پیچھے چلو!" میں نے جلدی سے آگے جانے والے تانگے کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مگر بتائیں تو صاب کدھر چلنا ہے؟" تانگے والا پھر بولا۔

"جہاں وہ تانگا جائے وہیں!" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے" تانگے والے نے بڑبڑا کر باگیں سنبھال لیں۔ "جانے والے کو پتا نہیں کہ کہاں جائے گا۔"

آگے پیچھے دونوں تانگے چلتے رہے۔ مختلف شاہراہوں اور محلوں سے گزرتا ہوا وہ تانگا کشمیری گیٹ میں داخل ہوا اور وہ شخص تانگے سے اتر گیا۔ میں نے بھی جلدی سے اتر کر تانگے والے کو منہ مانگے پیسے ادا کیے اور اس شخص کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اب تک محسوس کیا تھا کہ اس شخص کے چہرے سے ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ کچھ دور چل کر وہ ایک گلی میں گھس گیا۔ میں نے بھی دیر نہیں کی۔ دو ایک گلیوں سے گزر کر وہ ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گیا۔ اب وہ مڑ مڑ کر بھی دیکھنے لگا تھا۔ میں بدستور اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ گلی میں اس کے اور میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ معاً وہ ایک دروازے کے سامنے رکا اور دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ شاید اس شخص کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اب کسی مجرم کا دیدار ہو گا۔ دروازہ کھلا تو کچھ اور ہی نظر آیا۔ دروازے میں نظر آنے والی لڑکی یا عورت کے طول و عرض سے سارا دروازہ بھر گیا تھا۔ اس شخص نے تھیلا لڑکی کے ہاتھ میں تھمایا اور فوراً ہی کچھ کہہ کر واپس چل دیا۔ وہ ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لمحے بھر کو میں ٹھٹک کے رہ گیا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر میری ایک لاپتا محبوبہ بہار سے ملتی جلتی تھی۔ اگر وہ ساڑھی کی بجائے قمیص شلوار پہنے ہوتی تو میں بے اختیار "بہار، بہار" پکارتا ہوا اس سے لپٹ جاتا مگر وہ بہار نہیں تھی۔

میں دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے مجھے اس کے خدوخال صاف نظر آ رہے تھے۔ یوں بھی وہ اپنے ہاتھ میں لالٹین

تھامے ہوئے تھی۔ میں اسے دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ نہ جانے کب وہ شخص رفوچکر ہو گیا جو سرخ تھیلا لے کر آیا تھا اور اس لڑکی کو دے گیا تھا۔ اس نے بڑی قاتلانہ نظر سے میری طرف دیکھا، پھر دروازہ بند کر لیا۔

اب میں گلی میں تنہا رہ گیا تھا اور میرا وہاں رکنا فضول تھا۔ اس لڑکی کا یقیناً مجرموں سے گہرا تعلق تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ان میں سے کسی کی محبوبہ رہی ہو۔ مجھے تیواڑی جی کی وہ بات یاد آئی جو انھوں نے تربیت کے دوران میں بتائی تھی۔ بہت سے مجرم عورتوں سے تعلقات رکھنے کے سبب بھی پکڑے جاتے ہیں۔ انھوں نے مثال میں کئی قصے بھی سنائے تھے۔ ان قصوں کے جتنے بھی ہیرو تھے، انھوں نے ایسی عورتوں یا لڑکیوں سے پہلے عشق لڑایا تھا، پھر اسی عشق کی آڑ میں مجرموں تک جا پہنچے تھے۔ اگر وہ ایسا کر سکتے تھے تو پھر میں کیوں نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا مگر اس وقت وہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے پھوٹ لینا ہی مناسب تھا سو میں نے ایسا ہی کیا۔

اس رات جب میں بستر پر لیٹا تو اس لڑکی سے عشق لڑانے کے امکانات پر غور کر رہا تھا جو یقیناً ان مجرموں سے کسی ایک کی محبوبہ تھی۔ میں اس کے ذریعے باآسانی مجرموں تک پہنچ سکتا تھا لیکن عشق لڑانا بہرحال میرے لیے ایک ٹیڑھی کھیر تھا حالانکہ مجھے اس کا تجربہ ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا، تلخ تجربہ!

میں جب اس پہاڑ جیسی لڑکی سے عشق لڑانے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو میری آنکھوں کے سامنے بار بار بہار کا چہرہ رقص کر رہا تھا۔ وہ بہار جس سے عشق لڑانے کے بعد میں نے ایک طویل عرصے کسی خزاں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں نیا نیا جوان ہوا تھا اور میری چاند پر استرا پھرنا بند ہوا تھا۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ بزدلی میرے لیے کتنی کارآمد شے رہی ہے۔ استرا پھرنا بند ہوا تو کچھ دن بعد ہی میری چاند پر گھنے بال اُگ گئے۔

چاند پر بال کیا آئے کہ اُن کا دیدار کرنے کے لیے محلے کی کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ انھی کھڑکیوں میں سے ایک کھڑکی بالکل سامنے والی تھی، ہمارے مکان کے سامنے والی کھڑکی! اُس کھڑکی والے مکان میں ایک شیخ جی رہتے تھے جن کی محلے ہی میں گوشت کی دُکان تھی مگر کھڑکی سے شیخ جی نہیں اُن کی بیٹی بہار جھانکا کرتی تھی۔

پتا نہیں اُس کمبخت کا نام بہار کس نے رکھ دیا تھا! مجھے تو وہ ہر طرف سے خزاں ہی خزاں نظر آتی تھی۔ مرگھلی سی چوہیا جیسی صورت، تھوتنی آگے کو نکلی ہوئی، گول طباق سا چہرہ، چیاں سی آنکھیں، منہ جیسے لیٹر بکس، پیشانی جیسے بے مرمت سڑک، ناک پکوڑا، ہاتھ ہتھوڑا اور رنگ وہ جس کے آگے چراغ نہ جلے۔ جب وہ کھڑکی میں کھڑی ہوتی تو ساری کھڑکی اُس کے طول و عرض سے بھر جاتی مگر پھر بھی اُس کے جسم کا بڑا حصہ آنکھوں سے چھپا رہتا۔

اگر کسی پر نئی نئی جوانی آئی ہو تو وہ ان تمام باتوں پر زیادہ غور نہیں کرتا۔ سو میں نے بھی ان باتوں کو اُس وقت درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ بہرحال تھی تو لڑکی ہی! لڑکی تو مٹی کی بنی ہوئی بھی جوانی میں بھلی لگتی ہے، وہ تو پھر گوشت پوست کی تھی۔ میں زیادہ دن اُس کی دلچسپی سے بے نیازی نہیں برت سکا۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی اور کھڑکی والی نے مجھ میں اس قدر دلچسپی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

نین لڑنے لگے اور اسی کے ساتھ شیخ جی کی بھیانک مونچھیں بھی میرے تصور میں ناچنے لگیں جن کا رنگ بھورا تھا۔ شاید شیخ جی اُن پر مہندی لگاتے تھے۔ ایک طرف شیخ جی کی مونچھیں اور دوسری جانب اُن آنکھوں کے تقاضے! دونوں کے درمیان میری حالت فٹ بال کی سی ہو گئی۔ میں خوف کھانے لگا کہ اگر کسی دن شیخ جی نے آنکھیں لڑاتے ہوئے دیکھ لیا تو پیٹ میں چھری اُتار دیں گے۔ میں نے انھیں بکرے کا پیٹ چیرتے کئی بار دیکھا تھا۔

پہلے میں شیخ جی سے بالکل نہیں ڈرتا تھا لیکن جب سے بہار کے ساتھ آنکھ لڑی تھی، میں اُن سے کنی کاٹنے لگا تھا۔ اب میں کبھی اُن کی دُکان سے گوشت لینے جاتا تو میری نظر اُن کی چھری ہی پر رہتی۔

عشق خانہ خراب نے اب اُسی بہار میں رنگ بھرنا شروع کر دیے تھے جو پہلی نظر میں مجھے بالکل بکواس دکھائی دی تھی۔ اب اُس کا گول طباق سا چہرہ مجھے چاند کی طرح نظر آنے لگا تھا اور چیاں سی آنکھیں ستارہ دکھائی دینے لگی تھیں، چاند چہرہ ستارہ آنکھیں! آگے کو نکلی ہوئی تھوتنی ایسی محسوس ہوتی جیسے وہ صرف مجھے دیکھ کر ہی آگے کو بڑھ آئی ہو اور کہہ رہی ہو "آؤ مجھے چوم لو!"

سوتے جاگتے اب ہر وقت میرے ذہن پر بہار چھائی رہتی تھی مگر ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کس طرح اظہارِ مدعا کروں! میری فطری بزدلی بار بار مجھے کچھ کرنے سے روک دیتی تھی۔

اسی دوران میں ایک عجیب ماجرا ہوا۔ میں شیخ جی کی دُکان پر قیمہ کٹوا رہا تھا اور میری نظر اُن کے ٹوکے پر جمی ہوئی تھی کہ معاً انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "اے اللہ دتے! اب تم کبھی ہمارے گھر نہیں آتے بیٹے!"

"آں... ہاں... جی... جی ہاں!" میں بوکھلا کر بولا۔

"جب تم چھوٹے تھے تو ہر وقت ہمارے گھر میں گھسے رہتے تھے اور بہار کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ شاید اب تم اس لیے نہیں آتے کہ بڑے ہو گئے..."

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے!" میں اُن کی بات کاٹ کر جلدی

سے بولا۔ خدا نے میری شب و روز کی دعائیں سن لی تھیں۔ لمحے بھر توقف کے بعد میں نے کہا ”میں... میں اب آیا کروں گا۔“ شیخ جی بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ بہلے سے کھیلنے کی آرزو تو نہ جانے کب سے میرے دل میں مچل رہی تھی! میرے دل کی کلی یوں ایک دم کھل اٹھے گی، یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا!

میں قیمہ لے کر لوٹا تو میرا دل گارڈن گارڈن ہو رہا تھا اور میں ترنگ میں آکر نہ جانے کیا کیا اول فول گنگنا رہا تھا۔

وہ جھروکے سے جو جھانکے تو بس اتنا پوچھوں
کھڑا رہوں کہ چلا جاؤں؟

اور جب میں گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا وہ واقعی جھروکے سے جھانک رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ زور زور سے گانے لگوں، ”کھڑا رہوں کہ چلا جاؤں“، مگر ابھی تک میرے اور اس کے درمیان رومانی مکالموں کا تبادلہ نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ بات مجھے ذرا قبل از وقت معلوم ہوئی۔ میں نے صرف ہمت کر کے ایک عدد آنکھ مارنے پر اکتفا کیا مگر نہیں شاید میں ناتجربے کاری کے سبب ایک آنکھ مارنے کی بجائے دونوں آنکھیں بیک وقت مار گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں سامنے پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ چلو ابتدا تو ہوئی۔ آج دو آنکھیں ماری ہیں، کل ایک آنکھ مارنا بھی آجائے گی۔ دونوں آنکھیں بند ہونے کے سبب میں اُس وقت بہار کے چہرے پر پیدا ہونے والے جذبات کا معائنہ نہ کر سکا تھا۔ خیر پھر کبھی سہی!

میرے اور اُس کے گھر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ درمیان میں جو گلی تھی، وہ بہت پتلی تھی۔ اگر میں اپنی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اُس سے راز و نیاز کرنا چاہتا تو کوئی قباحت نہیں تھی لیکن آتے جاتے آنکھ لڑاتے تو بہت دن گزر گئے تھے، میں نے اپنی کھڑکی میں کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اُس شب مجھ پر کچھ زیادہ ہی عشق کا بھوت سوار تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے تو میں بے چینی سے ابا کے خراٹوں کا انتظار کرنے لگا کہ کب میری سماعت سے اُن کے خراٹے ٹکرائیں اور کب میں اُٹھ کر کھڑکی کھولوں۔ میرے ابا اُسی کمرے میں سوتے تھے جہاں کھڑکی تھی۔ خدا خدا کر کے پہلے ہلکی ہلکی خوں خوں شروع ہوئی، اور پھر ”خوں اوں اوں، خوں اوں اوں“ کی دلنواز صداؤں سے ابا کا کمرہ گونجنے لگا۔

اب میدانِ عمل میں اُترنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ میں نے کروٹ لی، اور پھر اُسی کروٹ لیٹے کا لیٹا رہ گیا۔ یہ آخر میں نے کیا حماقت کی تھی؟ میں نے سوچا۔ بہار کو میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ رات کو میں کھڑکی میں آؤں گا۔ ہوں نہ آخر کند ذہن! میں نے خود پر دو چار بار لعنت بھیجی اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر ایسے میں نیند آسانی سے کب آتی ہے! دل کی لگی سونے کب دیتی ہے! کیا اُسے پتا چل گیا ہو گا کہ میں کھڑکی میں آؤں گا! میں نے دن کے وقت اُسے آنکھیں تو ماری ہی تھیں۔ کوئی عجب نہیں کہ وہ اشارہ سمجھ گئی ہو اور اب کھڑکی میں کھڑی ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر رہی ہو! یوں بھی دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ کھوپڑی میں طرح طرح کے خیالات نے ادھم مچا دیا اور خیالات کی اِس دھما چوکڑی نے بالآخر مجھے اٹھنے پر مجبور کر ہی دیا۔

جب میں اپنے بستر سے اُٹھا تو میری دونوں ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کچھ دیر میں نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں پر قابو پایا، اور پھر جتنی دعائیں یاد تھیں، اُن سب کا ورد کرتا ہوا بڑھنے لگا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ بڑے بھیا کی چارپائی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اے دلِ بیتاب سنبھل! کمبخت بنا بنایا کھیل یوں تو نہ بگاڑ! میں اپنے دل کو دل ہی دل میں ڈانٹتا، جو پسلیاں توڑ کر باہر آنے کے لیے مچل رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ دیکھ! وہ لبِ بام ایک عدد چاند طلوع ہو رہا ہے اور تو بہت جلد بغیر راکٹ کے چاند تک پہنچنے والا ہے۔ دل آخر تھا تو اپنا ہی، بار بار کی ڈانٹ پھٹکار اور بہلاووں سے مان ہی گیا۔

آخر امی اور ابا کی چارپائیوں سے بچتا بچاتا میں کھڑکی تک پہنچ ہی گیا جس کی چٹخنی بند تھی۔ میں ایک طویل سانس لیتے لیتے رک گیا کہ کہیں ابا کے خراٹوں میں بریک نہ لگ جائے! دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے آہستہ آہستہ چٹخنی کھول ہی لی، اور پھر بڑی بیتابی کے ساتھ ذرا سا پٹ کھولا۔ سامنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر اُس میں بہار موجود نہیں تھی۔

ہائے بہار! کیا تو میرا انتظار کر کے چلی گئی؟ اے دیکھ ظالم تیرا عاشق، تیرا سودائی، تیرا اللہ دتا راہ کی ساری رکاوٹیں ہٹاتا ہوا تیرا شربتِ دیدار پینے آ پہنچا ہے۔ کیا تو شربت نہیں پلائے گی؟ میرے ہونٹ بند رہے اور میرا دل بہار کو کھڑکی میں نہ پا کر رومانی ڈائیلاگ بولتا رہا۔ شاید اِس بھروسے پر مچلتا رہا کہ وہ سراپا ناز اُس کی آواز سن کر اور پھڑک کے بستر سے نکل آئے مگر غالباً وہ گھوڑے اور گدھے سبھی بیچ کر سوتی تھی۔ اُس نے دل کی صدا نہ سنی اور میں دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوبارہ آکر اپنے بستر میں گھس گیا۔ جب میں نے لحاف اوڑھ لیا تو خیال آیا کہ کھڑکی تو کھلی ہی چھوڑ آیا ہوں، کہیں کوئی چور اُدھر کے راستے گھر میں نہ آجائے! اِسی خوف سے ساری رات بار بار آنکھ کھلتی رہی مگر اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اُٹھ کر کھڑکی لگا دوں۔

دوسرے دن کالج سے لوٹ کر آنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آج دن ہی میں بہار سے رات کا اپائنٹمنٹ لے لوں۔ ایک شیخ جی کا خوف تھا تو خود اُنھوں نے اپنی کم بختی کو دعوت دے دی تھی۔

بیچاروں کو بھلا کیا خبر تھی کہ میں اُن کی حور شمائل لونڈیا پر لٹو ہوں اور کسی طرح اُس پر پٹو ڈالنے کی فکر میں ہوں!

شیخ جی کی بیوی کا نام گلبدن تھا۔ گل، پھول کو کہتے ہیں اور وہ واقعی پھول تھیں مگر گوبھی کا! میں اُنھیں پڑوس کی نسبت سے خالہ کہتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل پڑیں۔

”ارے یہ آج چاند کدھر نکل آیا!“ وہ چہکیں۔

”خالہ سلام!“ میں نے کہا۔

”وعلیکم سلام بیٹے، جیتے رہو!“ اُنھوں نے جواب دیا، پھر قریب ہی پڑی ہوئی دوسری پیڑھی میری طرف کھسکاتے ہوئے بولیں۔

”یہاں بیٹھ جا اللہ دتے!“

میں پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ وہ سینی میں مسور کی دال لیے چن رہی تھیں۔ میں نے اُنھیں خوش کرنے اور کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے کہا ”خالہ! تم پہلے سے بہت دُبلی نظر آرہی ہو۔“

”ارے ہاں کیا بتاؤں بیٹا! بس اب تو چل چلاؤ ہے۔ بس ایک ارمان ہے دل میں کہ بہارو کا بیاہ دیکھ لوں۔“ وہ اپنی تھلتھلاتی توند سے سینی ہٹاتے ہوئے بولیں۔ وہ بہار کو بہارو ہی کہا کرتی تھیں۔ اِس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، اُنھوں نے نعرہ مارا ”ارے بہارو! اندر کہاں چھپ گئی کمبخت! یہ تو اپنے گھر کا بچہ ہے، اِس سے کیا پردہ!“

خالہ گلبدن کا نعرہ سن کر میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دیدارِ محبوب کی ساعتیں آ پہنچی تھیں۔

پہلی بار تو میں اُس بہارِ مکمل کو دیکھ کر لرز ہی گیا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنی ماں سے کچھ ہی کم ہو گی۔ وہ اِٹھلاتی، بل کھاتی، اپنا پہاڑ سا جسم چراتی کسی چٹان کی طرح لڑھکتی آگے بڑھی۔ اُس وقت مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں میں اُس چٹان کے نیچے آکر دب نہ جاؤں، پس نہ جاؤں۔ قریب تھا کہ میں بھاگ کھڑا ہوتا، مگر اُسی وقت بہار کی آگے کو نکلی ہوئی تھوتنی حرکت میں آئی اور اُس تھوتنی میں موجود ہونٹ ہلے۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی مٹکے میں کنکر ڈال کر زور زور سے ہلائے۔ اُس نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر نہیں چھپی تھی بلکہ رفعِ حاجت کے لیے گئی تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اُس سے کس طرح خلوت حاصل ہو اور کیسے رات کے بارے میں بتاؤں کہ معاً قدموں کی بھاری چاپ گونجی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو روح قبض ہو گئی۔ شیخ جی چلے آرہے تھے۔

”ارے اللہ دتے!“ شیخ جی مجھے دُور سے دیکھ کر ہی ہنکارے ”بھئی یہ اچھا ہوا کہ ہمارا بیٹا آگیا۔ اب ہم سری پائے اِسی کے ساتھ کھائیں گے۔“

شیخ جی کی بات سن کر میری جان میں جان آئی ورنہ میں تو اچانک اُنھیں دیکھ کر یہی سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ میرے سری پائے الگ کر دیں گے۔ اُنہی کی بات سے میری سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ اُن کا آنا خلافِ توقع نہیں تھا بلکہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے آئے تھے۔

”کیوں، کیا تو کھانا کھا کر آیا ہے اللہ دتے؟“ وہ مجھے خاموش دیکھ کر قریب آتے ہوئے بولے۔

”جی ہاں، جی ہاں!“ میں نے جان چھڑانے کی غرض سے فوراً گردن ہلائی حالانکہ میرے پیٹ میں چوہوں نے باقاعدہ ریس شروع کر دی تھی۔ میں کالج سے آکر، بہار کی للک میں کھانا کھائے بغیر ہی شیخ جی کے گھر کی طرف دوڑ لیا تھا۔

اِسی دوران میں بہار اپنی ماں گلبدن کے قریب زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ چکی تھی۔ شیخ جی نے وہیں اپنی شیخانی کے قریب کھانا کھانے کے لیے چٹائی بچھوالی جو قریب ہی لپٹی پڑی تھی اور شیخانی نے اُسے ہاتھ بڑھا کر گھسیٹ لیا تھا۔

”ہاں بھئی اور سنا اللہ دتے! تیری پڑھائی وڑھائی تو ٹھیک چل رہی ہے؟“ شیخ مجھ سے پھر مخاطب ہوئے، اور پھر میرا جواب سنے بغیر شیخانی یعنی خالہ گلبدن سے بولے ”ارے بھئی گلو! اب کھانا ملے گا کہ نہیں! دکان پر اُس بدمعاش چھنے کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ تجھے خبر ہی ہے کہ وہ ذرا ہاتھ لپک ہے۔“

شیخانی اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتی ہوئی اُٹھیں اور تربوز کی طرح لڑھکتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئیں۔

شیخ جی کی موجودگی میں میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بہار کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ سکوں۔ جب تک شیخ جی کھانا کھا کر ٹل نہ گئے میں میاں مٹھو بنا بیٹھا رہا جیسے مجھ جیسا شریف لڑکا نہ پہلے کوئی پیدا ہوا تھا اور نہ آئندہ اِس کے امکانات تھے۔ شیخ جی کھانا آتے ہی اُس پر اِس طرح ٹوٹ پڑے تھے جیسے قلعہ فتح کر رہے ہوں، اِس لیے میں کھانے کے دوران میں اُن کی ”بلبکی“ سے محفوظ رہا تھا۔

اُدھر شیخ جی گھر سے نکلے، اِدھر میرا دل پہلو سے نکلنے کے لیے بیتاب ہونے لگا۔ بہار کی اور میری انکھیاں لڑ گئی تھیں۔ ظالم نے مجھے اُس وقت ایسی مست نظر سے دیکھا تھا کہ اگر اُس کی اماں درمیان میں نہ بیٹھی ہوتی تو میں بہک جانے کا موقع ہرگز نہ کھوتا۔

”میں ذرا تیرے ابا کا کرتہ کاڑھنے کے لیے لے آؤں۔“ کچھ دیر بعد ہی خالہ گلبدن زور لگا کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

میرا دل ایک دم کئی فٹ اُچھلنے کے لیے مچلا مگر میں نے فوراً سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”کیا ہوا تم کو؟“ بہار منمنائی۔

”عشق!“ میں نے گھبرا کے کہہ دیا۔

”کس سے؟“ اُس نے ترچھی نظر سے وار کیا۔

”تم سے اور کس سے!“

میرا جواب سننے کے بعد اُس نے شرما کر بیٹھے بیٹھے ہی دُہرا ہو جانا چاہا،

اور پھر اپنی آگے کو نکلی ہوئی تھوتنی پیچھے کرتے ہوئے نشیلی آواز میں بولی "بڑی بھی بھش!"

"اور کیا چھوٹی بھش!" میں نے بھی اُسی کے انداز میں کہا اور پھر مجھے اصل بات یاد آ گئی۔ میں جلدی سے بولا "تم رات کو کھڑکی میں آ جانا ضرور!"

"کب؟" اُس نے نظر جھکا کر پوچھا اور دوپٹے کو اپنی انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"جب سب سو جائیں" میں نے جواب دیا۔

"مگر بیچ میں تو گلی ہے" اُس نے کہا۔

"تو کیا ہوا! گلی تو ہوتی ہے بیچ میں! وہ آخر کہاں جا سکتی ہے اور..." میں نے اپنا جملہ اُدھورا ہی چھوڑ دیا کیونکہ خالہ گلبدن کی آمد سے زمین ہلتی ڈولتی محسوس ہونے لگی تھی، دھم، دھم، دھم! جیسے سڑک کوٹنے کا انجن چلا آ رہا ہو۔

مطلب نکل ہی گیا اِس لیے اب میرا وہاں رُکنا فضول تھا۔ خالہ گلبدن کے آتے ہی میں کھسک لیا۔

میں نے کئی شعر ایسے پڑھے تھے جن میں عاشق کو انتظار کی کیفیت سے گزرتے دِکھایا گیا تھا۔ عاشق کو اپنے محبوب کے انتظار میں بڑا مزہ آتا تھا مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ یوں تو میں نے اُس سے کھڑکی میں آنے کا وعدہ لے لیا تھا مگر اب میری ہوا خراب ہو رہی تھی۔ کبھی دماغ میں آتا کہ اظہارِ عشق تو کر ہی دیا ہے اب مزید رومانی ڈائیلاگ بولنے کی ضرورت نہیں اور کبھی یہ سوچتا کہ وعدہ خلافی شیوۂ عاشقی نہیں۔ اِسی گردگھیے میں دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب میرا یہ حال ہے تو اس کا کیا ہو گا؟

بالآخر امّی نے لالٹین کی لَو مدھم کی اور اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں۔ میں نے پہلے ہی بستر میں گھس کر سونے کی اداکاری شروع کر دی تھی۔

کچھ دیر ہی میں سارے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ میں گزشتہ رات کی طرح ابّا کے خرّاٹے نشر ہونے کے انتظار میں تھا۔ وہ امّی سے بہت پہلے کمرے میں سونے جا چکے تھے۔ جب کافی دیر تک "خوں اوں اوں، خوں اوں اوں" کی دلنواز صدائیں میری سماعت سے آ کر نہ ٹکرائیں تو میں فکرمند ہو گیا۔ یہ آج ابّا کو کیا ہو گیا ہے کہ بغیر خرّاٹے لیے سو رہے ہیں؟ میں سوچنے لگا۔

ابھی میں کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ معاً مجھے چوڑیوں کی کھنا کھن سنائی دی۔ یا الٰہی خیر! کہیں موقع غنیمت جان کر کوئی چڑیل ڈڑیل تو گھر میں نہیں گھس آئی! میں نے سوچا اور دہل کر رہ گیا۔ اُسی وقت میں نے ایک سرگوشی سنی۔

"مجھے بڑھاپے میں تمھارے یہ چونچلے بالکل اچھے نہیں لگتے" یہ نسوانی آواز تھی۔

"اب ایسا بوڑھا بھی نہیں ہوا" مردانی سرگوشی اُبھری۔

"ارے کہیں کوئی بچہ نہ جاگ جائے! ویسے بھی جاڑے ہیں، کمبخت گھڑی گھڑی پیشاب کرنے کو اُٹھتے رہتے ہیں" نسوانی آواز میں احتجاج تھا۔

اُس کے بعد چوڑیاں پھر کھنکھنائی تھیں اور کچھ دیر بعد تو باقاعدہ کھنن کھنن شروع ہو گئی تھی۔ اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ "خوں اوں اوں، خوں اوں اوں" کی دلنواز صدائیں کیوں بلند نہ ہو سکی تھیں۔ مجھے اپنی خیریت اِسی میں نظر آئی کہ عشق کے بھوت کو سر سے اُتارنے کے بعد منہ لپیٹ کر سو جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے دن کالج جاتے ہوئے میں نے جب بہار کو کھڑکی میں کھڑا ہوا دیکھا تو اُس کی آگے کو نکلی ہوئی تھوتنی سوجی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً مجھ سے خفا تھی۔ شاید وہ رات کو کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑی میرا انتظار کرتی رہی تھی۔ غالباً اِسی لیے اُسے نزلہ بھی ہو گیا تھا کیونکہ میری طرف دیکھتے ہوئے آستین سے اپنی ناک بھی پونچھتی جا رہی تھی۔ میں نے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ کر جلدی سے معافی کے لیے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اُس نے فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے دانت، تھوتنی سے باہر کر دیے، گویا میرا قصور بخش دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسی وقت نعرۂ مستانہ مار کر بے ہوش ہو جاؤں مگر کالج کو دیر ہو رہی تھی اِس لیے یہ ارادہ موقوف کر دیا۔

دوسرے دن میں شیخ جی کے کھانے کا وقت نکال کر آ گیا۔ خالہ گلبدن تو خیر مجھے اور میری جانِ بہار کو اکیلا چھوڑ کر ٹل گئیں مگر کمبخت ننھے کسی طرح ٹلنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ ظالم سماج کی طرح میرے اور بہار کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ ننھے شیطان کی دوسری کوشش کا نتیجہ تھا۔ خالہ گلبدن دھوبن کے لیے میلے کپڑے اکٹھے کرنے اوپر کی طرف گئی تھیں۔ میں ابھی اِسی گومگو میں تھا کہ محبوب کے ساتھ تنہائی کس طرح نصیب ہو کہ خدا نے میری سن لی۔ اوپری منزل سے خالہ گلبدن کی گرجدار آواز آئی۔ وہ ننھے کو بلا رہی تھیں۔

ننھے کے وہاں سے کھسکتے ہی میں بھی اپنی جگہ سے کھسکا اور بہار سے سٹ گیا۔ سٹنے سے اُس کے گرم گرم گوشت کی گرمی مجھے اپنے رگ و پے میں اُترتی محسوس ہوئی اور مجھ پر نشہ سا طاری ہو گیا جیسے میں نے چرس لگا لیا ہو۔

"تم نے رات کو مجھے کاہے کو بے وقوف بنایا تھا؟" بہار لجا کر منمنائی۔

جواب میں جب میں نے اُسے جلدی جلدی وجہ بتائی تو وہ زور سے قہقہا کر ہنسی کہ میں ڈر گیا۔ زور سے ہنسنے کے سبب اُس کے جسم کا ایک مخصوص حصہ اِس طرح اَپ اینڈ ڈاؤن ہو رہا تھا جیسے

سامنے بار بار گر اور اُٹھ رہا ہو۔ اُس کے وسیع و عریض جسم میں زلزلہ سا آ گیا تھا جس کے جھٹکے میں اپنے جسم تک میں بھی محسوس کر رہا تھا۔

"خیر کل جو ہوا سو ہوا" میں نے گھبرا کر الگ ہٹتے ہوئے مطلب کی بات کہی "آج رات میں ضرور..."

"نہیں!" اُس نے میری بات کاٹ دی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"تم رات کو یہیں آ جاؤ!"

"کیا؟" میں اُس کی بات سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

"ہاں!" وہ بڑے اعتماد سے بولی "میں دروازہ کھول دوں گی"

"اور تمھارے امّاں ابّا؟"

"وہ اُوپر سوتے ہیں اور ننھے بھی!" اُس نے آل لائن کلیئر کا سگنل دیا۔

"نہیں!" میں نے سہمتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" اُس نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اگر تم ابھی سے ڈر گئے تو پھر آگے کیا ہو گا؟" وہ فکرمند لہجے میں بولی۔

"آگے تو وہی ہو گا جو ہونا چاہیے تم بے فکر رہو! فی الحال تم پہلے کھڑکی میں تو آؤ!" میں نے اُسے تسلی دی "مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں جو یہاں نہیں ہو سکتیں"

"اچھا!" وہ مرے ہوئے دل سے بولی "تم کہتے ہو تو پہلے یہی سہی!" گویا اُس نے بعد کے لیے بھی ابھی سے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔

میری اچھی بہار، میری جانِ بہار، میری گُل گلزار! میں اظہارِ تشکر کے لیے ذرا جاندار سے لفظ سوچ رہا تھا کہ ننھے پھر آ دھمکا۔ میں نے اب چھوٹ لینا ہی غنیمت جانا۔

"ارے کیا چل دیا بیٹا؟" میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ خالہ گلبدن کی آواز سنائی دی "ارے بیٹھ! تیرے لیے چائے تو بنا دوں یہ بہار تو تیرا بالکل خیال ہی نہیں کرتی"

میں نے بمشکل خالہ کو ٹالا اور ٹہل لیا۔

رات آئی تو پھر وہی سب کچھ ہوا جو گزشتہ راتوں میں ہوتا آیا تھا۔ وہی سناٹا، وہی دھکڑپکڑ، وہی ابّا کے خرّاٹوں کا انتظار! میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ آج رات ابّا کے کمرے سے مانوس سرگوشیاں سنائی نہ دیں تو بہت اچھا ہو۔ کہتے ہیں کہ دعا کی "قبولی" کا بھی وقت بھی مقرر ہوتا ہے۔ سو وہ بھی ایسا ہی وقت تھا۔ میری مراد بر آئی۔ خرّاٹے، دلنواز خرّاٹے سنائی دینے لگے تھے۔ میں بستر سے اُٹھ کر ابّا کے کمرے میں گھس گیا۔ کھڑکی کی چٹخنی میں نے دن ہی میں کھول دی تھی اور بعد میں بھی کئی بار چیک کی تھی کہ کہیں کسی نے لگا تو نہیں دی!

کھڑکی کھلتے ہی میری نظر اُس غارت گرِ ہوش پر پڑی جس نے مجھ جیسے بزدل میں اتنی ہمت پیدا کر دی تھی کہ رات کے وقت ابّا کے کمرے میں گھس پڑا تھا۔

میں نے کھڑکی تو کھول دی تھی مگر کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ابّا کی چارپائی کھڑکی سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ ڈر کے مارے میرے سارے جسم پر کپکپی چڑھی ہوئی تھی۔

"اللہ دتے جانی!" مجھے رات کے سناٹے میں بہار کی آواز کسی ہتھنی کی چنگھاڑ محسوس ہوئی۔

"ذرا... ذرا آہستہ بولو!" میرے ہونٹ کانپے مگر شاید میری آواز اُس تک نہیں پہنچ سکی۔

"کیا کہا جانم؟" وہ پھر دہاڑی۔

اُسی وقت ابّا کی چارپائی چرچرائی۔ اُنھوں نے شاید کروٹ بدلی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں اتنی زور سے کھڑکی بند کی کہ ابّا ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

"کون ہے؟" ابّا اُٹھتے ہی گرجے۔

ابّا کی گرج سن کر بہت ضبط کرنے کے باوجود بھی دو چار بوند پیشاب خطا ہو ہی گیا۔

"وہ ابّا... بلی... ہاں بلی!" میں ہکلایا۔

"مگر تو یہاں اِس وقت کیا کر رہا ہے؟ اب تک سویا نہیں؟" ابّا نے میرے بہانے کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"کمرے میں بلی... بلی گھس گئی تھی... میں نے سوچا کہیں دودھ... دودھ نہ پی..."

"ابے یہاں دودھ کہاں سے آ گیا؟ یہ کوئی باورچی خانہ ہے؟" ابّا میری بات کاٹ کر جھنجھلائے۔

"ہاں باورچی خانہ... وہ باورچی خانے ہی میں بھاگ گئی ہو گی" میں نے بات بنائی۔

"تو رات کے وقت بلی کے پیچھے پھر رہا ہے! تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"ہاں!" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"کیا کہا؟" ابّا پھٹ پڑے اور اتنی زور سے "دہاڑے" کہ امّی کلبلا کر جاگ اُٹھیں۔

"ہائے مار! رات کو بھی چین سے نہیں سونے دیتے کمبخت!" امّی آنکھیں مَلتے ہوئے بولیں۔

"کسے کمبخت کہا؟" ابّا کی گولہ باری کا رُخ ایک دم امّی کی طرف ہو گیا۔

"مچھروں کو!" امّی نے سہم کر جواب دیا "بہت دیر سے کان پر بھنبھنا رہے تھے" پھر اُن کی نظر مجھ پر پڑی۔ چند لمحے وہ حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھتی رہیں، پھر بولیں "اللہ دتّا! تو یہاں اِس وقت کیا

کر رہا ہے؟"

"بلی پکڑ رہا ہے۔" مجھ سے پہلے ابا بول پڑے۔

"بلی؟" امی نے حیرت سے کہا۔

"اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور کچھ نہیں!" ابا بولے پھر مجھے ایک زوردار ڈانٹ پلا کر کمرے سے نکال دیا۔

عشق کے پہلے مرحلے ہی میں مجھے اتنے سخت قسم کے حالات پیش آنے کا گمان نہیں تھا۔ ابھی تو میں رومانی ڈائیلاگ بھی نہیں بول پایا تھا! ہائے اب کیا ہو گا؟ میں اس رات سونے سے پہلے سوچ رہا تھا۔ میں نے کیا "جبر جوڑ" قسم کے ڈائیلاگ یاد کیے تھے۔ کیا وہ سب ڈائیلاگ بن بولے ہی رہ جائیں گے؟ میں نے سنا تھا کہ جب ہیرو اپنی ہیروئن کے ساتھ اکیلا ہوتا ہے تو اس طرح کا کوئی مکالمہ ضرور بولتا ہے۔ اے فلانی! تیری جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اس مکالمے میں ضرورت کے مطابق ایک تبدیلی کی تھی اور وہ تبدیلی میرے خیال میں اشد ضروری تھی ورنہ میری جان جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے ڈوبنے کی جگہ تیرنا سوچا تھا اور اپنی محبوبۂ دلنواز کی آنکھوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے "جھیل جیسی" کے الفاظ بھی مکالمے سے آؤٹ کر دیے تھے۔ ان کی جگہ مجھے دوسرے مناسب الفاظ نہیں مل سکے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ کہوں گا۔ اے بہار! تیری آنکھوں میں تیرنے کو جی چاہتا ہے۔ عموماً ہیرو لوگ اپنی ہیروئنوں سے یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ وہ بغیر ہیروئن کے زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں ذاتی طور پر مرنے کے حق میں نہیں ہوں اس لیے یہ مکالمہ مجھے بڑا منحوس لگتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ایسا کوئی موقع آیا بھی تو میں پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر مکالمہ بولے بغیر کام نہ چلا تو کہوں گا۔ اے بہار! میں تیرے بغیر بھی یقیناً زندہ رہ سکتا ہوں لیکن بہتر یہ ہے کہ تو بھی میرے ساتھ ہو۔ بہرحال سوچا تھا کیا، کیا ہو گیا! کیونکہ اب مجھ میں اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ ایک بار موقع پر پکڑے جانے کے بعد دوبارہ بہار کو کھڑکی میں آنے کے لیے مدعو کر سکتا۔ جب وہ کھڑکی میں نہ آتی تو رومانی ڈائیلاگ کا تبادلہ کیسے ہوتا، اور جب رومانی ڈائیلاگ نہ بولے جاتے تو عشق کیسے پروان چڑھتا!

میں نے موجودہ صورتِ حال پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ عشق کے بھوت کو سر پر سے اُتار دوں۔ بیٹا بھوت! اب کسی اور کے سر پر جا کر سوار ہو جاؤ! کم از کم میرا سر اتنا پختہ نہیں کہ ابا کے جوتے کھا کر سلامت رہ سکے۔ میں نے عشق کے بھوت سے کہا اور سو گیا۔

بہار نے دو چار دن کھڑکی سے بڑی "شش کاریاں" ماریں مگر میں بھی ڈھیٹ ہو گیا تھا۔ مجال کیا کہ ایک بھی "شش" کے جواب میں نظر اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھ لوں۔ اُس کے بعد پورا ایک دن امن سے گزرا۔ ایک بھی "شش" سنائی نہیں دی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو جان بچی لاکھوں پائے مگر دوسرے ہی دن میں اُس کے ... میں آ گیا۔

میں کالج سے لوٹ کر نظر نیچی کیے جا رہا تھا کہ اچانک ... کا دروازہ کھلا۔ بہار مجھ پر اس طرح جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ اُس نے میری کلائی پکڑی اور غڑاپ سے گھر میں گھسیٹ لیا۔ مجھے لگا جیسے میری کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

"میری کلائی تو چھوڑ دو!" میں نے آہ بھر کے فریاد کی۔

اُس نے کلائی چھوڑ کر دروازے کی کنڈی لگا دی اور پھر ... ہوئی آواز میں بولی: "اللہ دتا! بے وفا! میں تیرے بغیر نہیں جی ..." مکالمے کے اختتام تک اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو آ گئے۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل ڈانواڈول ہونے ... میں نے واقعی اُس پر بڑا ظلم کیا تھا۔ جب محبوب کی آنکھوں میں آ... ہوں تو اُس وقت کیا ڈائیلاگ ہونا چاہیے؟ میں نے سوچا اور جب کچھ دماغ میں نہ آیا تو سیدھے سیدھے اپنا قصور مان کر معافی مانگ لی۔

"مجھے معاف کر دو میری پھلجھڑی!" میں نے کہا، پھر اُسی وقت ... خالہ گلبدن کا خیال آ گیا۔ میں بولا: "خالہ کہاں ہیں؟"

"وہ مجھے کو ساتھ لے کر خالہ کے گھر گئی ہیں۔" اُس نے اپنے آ... پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"تو... تو تم اس وقت گھر میں بالکل اکیلی ہو؟" یہ کہتے ہوئے ... دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔

"ہاں!" اُس نے سر ہلایا، پھر میری معلومات میں مزید اضافہ ... "ابا بھی کھانا کھا کر جا چکے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے پھر میری کلائی پکڑ لی ... اندر کی طرف گھسیٹنے لگی۔

"میں چل رہا ہوں، کلائی چھوڑ دو!" میں نے کلائی ٹوٹنے کے ... سے التجا کی جو سن لی گئی۔

وہ مجھے اندر کمرے میں لے گئی جہاں صرف ایک کھڑی چارپائی ... پڑی ہوئی تھی۔ میں اُس پر بیٹھ گیا مگر جب وہ میرے برابر بیٹھ... چارپائی احتجاج کرنے لگی۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں، کیا ہوا اللہ دتے؟ بیٹھو نا!" اُس نے بڑے پیار... لہجے میں کہا۔

"چارپائی ٹوٹ جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو بیٹھو! میں اپنے لیے آنگن سے پیڑھی اُٹھا لاتی ہوں۔" وہ بولی۔ ایک بار پھر چارپائی زور سے چرچرائی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی، پھر تھرکتی ہوئی سی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہاں تو میں اُس کے ساتھ تنہا... کے خواب دیکھتا تھا لیکن اب موقع ملا تھا تو میری حالت غیر ہوئی ...

رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح فرار ہو جاؤں۔ میں ابھی اپنے فرار کے امکانات پر غور ہی کر رہا تھا کہ وہ پیڑھی لے کر آ گئی۔

اُس نے پیڑھی بالکل میرے پیروں کے قریب بچھائی اور اُس پر بیٹھ گئی۔ ہر چند کہ پیڑھی خاصی بڑی تھی اور شاید گھر والوں کے جسم دیکھتے ہوئے بنوائی گئی تھی مگر جب بہار اس پر براجمان ہوئی تو پیڑھی غائب ہو گئی۔

"تو تھک گیا ہو گا اللہ دتے! لا تیرے پاؤں داب دوں۔" یہ کہتے ہی میرا جواب سنے بغیر اُس نے میرے دونوں پیر جکڑ لیے۔ وہ اب عشق میں بہت آگے جا چکی تھی اور "تم" سے "تو" پر اُتر آئی تھی۔

یا الٰہی! اب میں کیسے فرار ہو سکوں گا؟ میں نے سوچا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

"ذرا... ذرا آہستہ!" میں اُس کے ہاتھوں کا دباؤ برداشت نہ کر سکا۔ "بلکہ یہ پیر دبانا چھوڑو! آؤ کچھ پیار بھری باتیں کریں!" میں نے اپنے پیروں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے تجویز پیش کی۔

"سچی بھتی!" بہار نے جھوم کر اپنے مخصوص انداز میں کہا اور سچ مچ میرے پاؤں چھوڑ دیے۔ پھر بولی: "اچھا پہلے تو کر!"

"نہیں پہلے تم!" میں بولا، پھر فوراً ہی کہا: "لیکن اگر ایسے میں کوئی آ گیا تو کیا ہو گا؟ مجھے اور تمہیں اس طرح گھر میں اکیلے دیکھ کر کوئی کیا کہے گا؟"

"کوئی کہے تو کہے، میری جوتی سے!" اُس نے ہمک کر کہا۔

"اور بدنامی جو ہو گی۔" میں نے اُسے ڈرایا۔

"تو ہوا کرے۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

گویا بہار نے مجھے اپنا میاں اور خود کو میری بیوی تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے سوچا اور یہ سوچ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میرا سارا خوف ہوا ہو گیا۔ میں نے بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے پوچھا: "تو تم میری بیوی بننے پر تیار ہو؟"

وہ شاید براہِ راست کسی ایسے سوال کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے اس نے جواب دینے کی بجائے اپنا بھاری سر میرے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا میری بہار!" میں پھر لہرایا۔

"ہوں!" اُس نے ہنکارا بھرا اور اپنی آگے کو نکلی ہوئی تھوتنی میرے دونوں گھٹنوں کے درمیان چھپانے لگی جیسے شرما رہی ہو۔

"لیکن اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی کس طرح بنیں؟" میں فکرمند لہجے میں بولا۔

"کیوں، اس میں کیا حل بیل لگتے ہیں؟" اُس نے سر اُٹھا کر کہا۔

گھٹنوں پر سے اُس کا بھاری سر اُٹھا تو مجھے سکون محسوس ہوا اور میں نے دل میں دعا کی کہ خدا کرے اب وہ دوبارہ ایسا نہ کرے۔

وہ مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولی: "تو چپ کیوں ہو گیا؟"

"دراصل میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ابا اور امی سے یہ بات کون کرے گا؟" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ ابھی وہ میری شادی نہیں کریں گے۔"

"کیوں؟" اس نے سوال کیا۔

"ابھی تو بڑے بھیا کی بھی شادی نہیں ہوئی اور پھر بھائی صاحب ہیں۔ میرا نمبر تو تیسرا ہے۔" میں نے اُسے صورتحال سمجھائی۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے سوچ میں ہو، پھر ایک دم بولی: "تو پھر بھاگ چلیں!"

میں اُس کی بات سن کر اُچھل پڑا۔ میں نے سنا تھا کہ عشق میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے لیکن اس وقت کو اتنے آناً فاناً تو نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مجھے بھاگنے کے نتائج کا قطعی علم نہیں تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بھاگ کر جایا کہاں جائے، پھر اُس کے بعد کیا کیا جائے۔ ان تمام باتوں پر غور کرتے ہوئے میرا سر چکرا گیا اور میں نے گھبرا کر اُسی سے پوچھا: "اے جان! میں تجھ پر قربان مگر بھاگ کر ہم جائیں گے کہاں؟ ظالم سماج تو ہر جگہ موجود ہو گا۔"

"یہ ظالم سماج کون آدمی ہے جس سے تو اتنا ڈر رہا ہے؟" وہ میری بقیہ بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بھڑک کر بولی۔

اُس کی بات سن کر میری بتیسی نکلنے والی تھی مگر میں نے فوراً اُس پر قابو پا لیا کیونکہ یہ وقت ہنسنے کی بجائے رونے کا تھا۔ میں نے اُسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ظالم سماج کون ہے!

اُس نے میری بات سن کر ایک عدد پھنکار ماری جسے عرفِ عام میں طویل سانس لینا بھی کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ چند لمحے بعد اُس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹ حرکت میں آئے: "اللہ دتے! جب میں تیرے ساتھ ہوں تو دنیا سے کیا ڈرنا!"

"ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں ایک دم خوش ہو کر بولا۔

پھر بھاگنے کا سارا پروگرام اُسی نے طے کر دیا۔ میرا کام صرف گردن ہلانا تھا، سو میں بار بار ہلاتا رہا۔ بھاگنا اتنا آسان ہو گا، یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے اور اُس وقت تک پھوٹتے رہے جب تک وہ پروگرام کی تفصیلات بتاتی رہی۔

اُس کے پاس پورے سو روپے جمع تھے جو وہ عشق کی راہ میں قربان کرنے پر تیار تھی۔ اِس کے علاوہ اُس نے یقین

دلایا تھا کہ بھاگنے سے پہلے وہ دو ایک بار شیخ جی کی جیب پر بھی ہاتھ صاف کرلے گی۔ ہم دونوں بھاگ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی جھٹ سے شادی کرلیں گے۔ میں میٹرک پاس ہی ہوں اِس لیے مجھے نوکری ملنے میں دیر نہیں لگے گی۔

جب اُس نے میری جان چھوڑی اور میں اُس کے گھر سے نکلا تو خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت فرد محسوس کر رہا تھا۔ بھلا اب کسی نے اتنا کامیاب عشق کیا ہوگا!

اُس دن بدھ تھا اور فرار کے لیے کافی سوچ بچار کے بعد جمعے کی رات منتخب ہوئی تھی۔ اُس نے کہا بھی تھا کہ جمعے سے جمعرات اچھی رہے گی مگر میرے خیال میں جمعے کا مبارک دن اِس کام کے لیے زیادہ مناسب و موزوں تھا۔

اُس دن کے بعد سے میں اپنے بھائی بہنوں، اماں ابا اور گھر کے در و دیوار کو یوں بہ حسرت دیکھنے لگا جیسے سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میری اِس تبدیلی کو سب سے پہلے امّی نے محسوس کیا۔

دوسرے دن جب میں اکیلا بیٹھا ہوا، بالکل عاشقانہ پوز بنائے ہوئے دُور کہیں خلا میں گھورنے کی پریکٹس کر رہا تھا کہ امّی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میں اچھل پڑا۔

"یہ تُو کل سے کچھ کھویا کھویا کیوں ہے اللہ دتّے؟ کیا بات ہے؟" امّی نے محبت سے کہا۔

میرا جی چاہا کہ اُن کے سینے سے لگ جاؤں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں اور کہوں۔ اے پیاری امّی جان! تمھارا اللہ دتّے اب ہمیشہ کے لیے تمھیں چھوڑ کر پردیس سدھارنے والا ہے۔ مگر میں کچھ کہہ تو نہ سکا البتہ اُن سے چپٹ کر رونے لگا۔

"ارے ارے پگلے! یہ کیا؟ یہ تُو رو کیوں رہا ہے؟" وہ میرے گھنے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے کہنے لگیں۔ "میں تجھ پر قربان! کیا تیرے ابا نے کچھ کہا ہے؟"

اُس دن مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میں امّی سے کتنی محبت کرتا تھا! بہار سے کیے ہوئے سارے وعدے جیسے آنسوؤں میں بہنے لگے۔

"تُو نے بتایا نہیں کہ کیوں رو رہا تھا؟" جب میں امّی کے سینے سے الگ ہٹ کر آنسو پونچھنے لگا تو امّی نے پھر پوچھا۔

اب میں اُنھیں بھلا کس طرح بتاتا کہ میرے رونے کا سبب کیا تھا! مجھے بہانہ بنانا پڑا کہ کالج میں پرنسپل صاحب نے بہت ڈانٹا تھا کیونکہ میں دیر سے پہنچا تھا۔

"تُو فکر نہ کر! میں تیرے ابا سے کہہ کے تجھے سائیکل دلوا دوں گی تاکہ تُو وقت پہ کالج پہنچ جایا کرے اور تجھے ڈانٹ نہ کھانا پڑے" امّی نے مجھے دلاسا دیا۔

مجھے علم تھا کہ وہ دلاسا ہی دلاسا تھا کیونکہ وہ پہلے دو ایک بار مجھ سے یہ کہہ چکی تھیں مگر اُس وقت میں نے معاملے کو مزید طول نہ دینے کے سبب اِس طرح سر ہلایا جیسے میں نے اُن کی بات پہ یقین کر لیا ہو۔

بات آئی گئی ہو گئی اور پھر رات ہوئی تو میرے تصوّر میں دوبارہ بہار رقص کرنے لگی، خواب میں بھی اُس کے ساتھ بار بار بھاگتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح سو کر اٹھا تو نہائے بغیر کالج بھاگا۔ بہار نے ایک بار پھر سے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی حالات ہوں اُس کے ساتھ ضرور بھاگ جاؤں گا۔

اُس دن کالج سے آکر میں پھر بہار سے ملا اور موقع ملتے اُسے یقین دلا دیا کہ میں بھاگنے پر پوری طرح تیار ہوں۔ وہ بھی تیار رہے۔ اُس نے میری معلومات میں اضافہ کیا کہ وہ شیخ جی کی جیب پہ ہاتھ صاف کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور سو روپے بڑھ کر سات روپے آٹھ آنے ہو چکے ہیں۔ میں نے اِس پہ خوشی کا اظہار کیا اور پھر خالہ گلبدن دوبارہ سر پر مسلط ہوئیں تو میں وہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل آیا۔ اب تو یوں بھی بہار ساری زندگی کے لیے میرے قبضے میں آنے والی تھی اِس لیے اُس وقت مزید شربت پینا اِتنا ضروری نہیں رہ گیا تھا۔

بہار کنڈی لگانے کے بہانے دروازے تک میرے ساتھ آئی تھی اور چلتے چلتے اُس نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے دغا کی تو اس بار وہ مجھے ہرگز معاف نہیں کرے گی اور زہر کھا جائے گی۔

گھر سے بھاگنے کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا اِس لیے میں نے پہلے سے یہ بھی نہیں سوچا کہ اِس سلسلے میں کیا کیا تیاریاں ضروری تھیں! میں تو بس رات کو حسبِ معمول تہبند باندھ کر جلدی سے بستر میں گھس گیا تاکہ مجھے سوتا ہوا سمجھا جائے۔ اِسی غرض سے میں نے لحاف اُوپر تک تان لیا تھا۔ بڑے بھیا نے پانی پلانے کے لیے مجھے دو ایک بار آوازیں بھی دیں مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجبوراً اُنھیں خود ہی گرم بستر سے نکل کر پانی ڈھونڈنا پڑا۔

میں نے سوچا کہ چلو بہار کے ساتھ بھاگ جاؤں گا تو عذابوں سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ اللہ میاں کتا بھی بنا دے مگر کسی کو چھوٹا بھائی نہ بنائے، بڑا ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کسی کا یہ تجربہ نہ ہو مگر میرے ساتھ کچھ ایسی ہی گزرتی تھی۔ پانی پلا اللہ دتا، کتاب اٹھا کر دے تو اللہ دتا اور گھر کا سودا لائے تو اللہ دتا! اُن کا بس چلتا تو اپنی بجائے بیت الخلا بھی مجھے ہی بھیج دیتے!

اللہ دتا پیشاب کر آ! بڑی زور کا پیشاب لگ رہا ہے۔

بڑے بھیا کی چارپائی میرے قریب ہی بچھتی تھی اِس لیے جب تک اُن کی کھلبلاہٹیں بند نہ ہو جاتیں، میں اپنے بستر سے اٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خدا خدا کرکے اُنھیں قرار آ گیا اور میرا دلِ بے قرار ابا کے خراٹوں کی صدائیں سننے کو مچلنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب میرے دلِ بے قرار نے مچلنا بند کیا اور ابا کے خرّاٹے گونجنے لگے تو میں نے بستر سے اُٹھنے کا قصد کیا۔ ابھی میں اُٹھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے جسم پر موجود کپڑوں کا خیال آیا۔ یہ تو بڑی سُبکی کی بات ہوگی کہ میں تہبند باندھے ہوئے بھاگ پڑا ہوں۔ میں نے سوچا گلی محلّے کی بات تو اور تھی لیکن محبوبۂ دلنواز کے ساتھ کسی دوسرے شہر میں تہبند باندھ کر پھرنا اچھا تو نہیں لگے گا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ کیسا عاشق ہے جو تہبند باندھے گھوم رہا ہے! مجھے کم از کم پاجامہ تو پہن لینا چاہیے! ویسے بھی جاڑے ہیں، تہبند میں بہت ہوا بھرتی ہے۔

کھونٹی قریب ہی تھی۔ قمیص پہنے ہی ہوئے تھا۔ صرف پاجامے کا مسئلہ تھا۔ میں نے بستر سے اُتر کر جوتے نہیں پہنے تاکہ آواز نہ ہو اور پنجوں کے بل چلتا ہوا کھونٹی تک پہنچ گیا۔

نیچے میرا پاجامہ تھا اور اُس کے اُوپر بڑے بھیا کا پاجامہ پھر اُن کی قمیص! بڑے بھیا خالی بنڈی اور تہبند میں سونا پسند کرتے تھے۔

میں نے پہلے اُن کی قمیص اُتاری، اور پھر پاجامہ! اُس کے بعد دوسرے ہاتھ سے پاجامہ اُتار لیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنا سانس تک روک رکھا تھا کہ کہیں بڑے بھیا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اپنا پاجامہ سنبھال کر میں نے اُن کا پاجامہ کھونٹی پہ لٹکایا، پھر قمیص ٹانگنے کے لیے جلدی سے ہاتھ بڑھایا تو اُن کی جیب میں موجود پیسے زور سے بجے۔ میری جان ہی نکل گئی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور قمیص کھونٹی پر ڈالی مگر قمیص پھسل کر نیچے گر پڑی۔ بڑے بھیا کی جیبوں میں نہ جانے کیا کیا الّم غلّم بھری تھی، قمیص گرتے ہی زور کی آواز ہوئی اور پیسے بھی کھنکنائے۔ میں نے چاہا کہ جلدی سے بھاگ کر اپنے بستر میں جا گھسوں مگر میرے پَیر من من بھر کے ہو گئے۔ یہی وہ لمحے تھے کہ اگر میں چاہتا تو اپنی جان بچا لیتا مگر میں نے یہ لمحے ضائع کر دیے۔ نتیجے میں جو کچھ ہوا، وہ میرے لیے بڑا توہین آمیز تھا۔

قمیص گرتے ہی بڑے بھیا اُٹھ بیٹھے تھے اور اپنے بستر پہ بیٹھے بیٹھے دہاڑے تھے "آج میں نے تجھے پکڑ لیا اللہ دتّے! اب پتا چلا میرے پیسے تُو چُراتا تھا!"

"نن... نہیں بڑے بھیا... میں... میں..."

"بڑے بھیا کے بچّے!" وہ چیخے حالانکہ میں ہرگز اُن کا نہیں تھا۔ "میں تجھے ابھی بتاتا ہوں!" یہ کہتے ہی اُنھوں نے بستر سے زقند لگائی اور میری گُدّی تھام لی۔

جب کبھی بڑے بھیا مجھے کبوتر جان کر باز کی طرح مجھ پر جھپٹتے تھے تو میں اپنی مدد کے لیے امّی ہی کو پکارا کرتا تھا۔ وہی مجھے بڑے بھیا کے "پنجۂ ستم" سے چھڑاتی تھیں۔ اُس وقت بھی مجھے امّی ہی یاد آئیں اور میں زور سے چیخ پڑا "امّی... امّی!"

"کیا ہوا، کیا ہوا میرے بچّے!" چند لمحے بعد ہی امّی نے میری آواز پر لبیک کہا لیکن اُس وقت تک بڑے بھیا دو تین کرارے ہاتھ جما چکے تھے۔

امّی دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلیں اور سچویشن دیکھ کر حیران رہ گئیں مگر جب بڑے بھیا کا ہاتھ پھر مجھے ملنے کو اُٹھا تو وہ لپک کر قریب آ گئیں۔

"بات تو بتا، ہوا کیا؟ کیوں اِسے دُھنے جا رہا ہے؟" امّی نے بڑے بھیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میری جیب سے پیسے چُرا رہا تھا کہ میں نے عین موقع پر پکڑ لیا" بڑے بھیا نے ہنکار کر بتایا۔

"کیوں رے؟" امّی نے مجھے گھور کر پوچھا۔

"نہیں... نہیں امّی!... چاہے جیسی قسم لے لو جو میں نے پیسے چرائے ہوں" میں نے بڑے بھیا کے خوف سے امّی کی آڑ لیتے ہوئے گھگھیا کر جواب دیا۔

"لے پھر جھوٹ بولا!" بڑے بھیا نے آنکھیں نکالیں۔

اُسی وقت اُس الزام سے بچنے کی ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے امّی سے کہا "یہ اپنے پیسے گن کر دیکھ لیں اور نہیں تو میرا جھاڑا لے لو امّی!"

میری بات سنتے ہی بڑے بھیا نے جھک کر اپنی قمیص اُٹھائی اور جلدی میں جیب جو خالی کی تو پیسوں کے ساتھ ہی ایک گراری دار چاقو بھی نکل آیا۔

"یہ تُو اپنی جیب میں چاقو کیوں رکھے پھرتا ہے رے؟" امّی چاقو دیکھ کر بڑے بھیا پر گرم ہو گئیں۔

"یہ... یہ میرا نہیں امّی! بلکہ... میرے ایک دوست کا ہے" بڑے بھیا جواب طلبی پر گڑبڑا گئے۔

"یہ تُو تجھے لفنگوں کا ساتھ نہیں چھوڑے گا؟" امّی برس پڑیں۔

اُسی وقت ابا کی گرج سنائی دی "یہ آدھی رات کے وقت کیا مقدمہ درپیش ہو رہا ہے؟"

"سو جاؤ کمبختو چپ چاپ سے! ورنہ اُٹھ گئے تو دونوں کو دُھن ڈالیں گے" امّی نے سرگوشی کے انداز میں کہا، پھر زور سے بولیں "ابھی آ رہی ہوں"

بڑے بھیا مجھ سے پہلے بستر میں جا دبکے تھے۔ ابا کی آواز

سن کر اُنھیں پیسے گِنا بھی یاد نہیں رہے تھے، پھر یہ کہ وہ خود چاقو رکھنے کے جرم میں ماخوذ ہو چکے تھے۔ اگر یہ بات ابّا کے علم میں آجاتی تو خود اُنھیں اپنی ٹانٹ بچانا مشکل ہو جاتی۔

میں بھی جلدی سے کھونٹی پر پاجامہ ٹانگ کر دوبارہ بستر میں گھس گیا تھا۔

کچھ دیر تک امّی اور ابّا کے باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہی تھیں، اور پھر سناٹا چھا گیا تھا۔ حضرتِ عشق مجھے مصیبت میں تنہا چھوڑ کر کبھی کے پھوٹ لیے تھے۔ اب سناٹا ہوا تو پھر آدھمکے مگر اب میں اُن سے نالاں ہو چکا تھا۔ بھاڑ میں جائے عشق اور چولھے میں جائے بہار! میں نے سوچا۔ اگر زہر کھاتی ہے تو کھالے، مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ مصائب کا سامنا کر سکوں۔ میں بہار کو بالکل اپنے ذہن سے جھٹک کر سویا تاکہ وہ کہیں خواب میں آکر اودھم نہ مچائے۔

اُس دن کے بعد سے میں بہت چوکنا ہو کر چلنے لگا کہ کہیں پھر کسی دن وہ مجھے پکڑ کر اندر نہ گھسیٹ لے۔ میں نے بہار کی "شش کاریاں" سنیں اور کنکریاں بھی کھائیں مگر نظر اُوپر نہ اُٹھائی۔ تقریباً مہینے ڈیڑھ مہینے تک "شش کاریاں" اور کنکریاں مجھ پر برستی رہیں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ سابقہ تلخ تجربات نے مجھے چکنا گھڑا بنا دیا تھا لیکن میں اِس دوران میں یہ ضرور سوچتا تھا کہ اگر اُس نے کسی دن کنکری مارنے کے بجائے کوئی بڑا سا پتھر کھینچ مارا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ ایسا نہیں ہوا۔ میری وعدہ خلافی کے باوجود اُس نے زہر نہیں کھایا تھا، اِس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُسے مجھ سے سچا عشق نہیں تھا۔

کوئی مہینہ ڈیڑھ مہینہ گزرا ہو گا کہ اچانک وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی۔ اِس کا اندازہ مجھے پہلی بار اُس وقت ہوا جب نہ تو میری سماعت سے اُس کی "شش شش" ٹکرائی اور نہ ہی میری چاند پر کوئی کنکری پڑی۔ میں نے اُس دن ڈرتے ڈرتے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا اور اُسے کھڑکی میں نہ پا کر حیران رہ گیا تھا۔

یا تو بہار نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر مجھ پہ صبر کر لیا تھا یا کوئی اور بات تھی مگر اُس دن کے بعد کھڑکی خالی ہی رہی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید میری طرح اُس کے سر سے بھی عشق کا بھوت اُتر گیا ہو لیکن بات کچھ اور تھی جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

ایک صبح جب میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا تو میں نے ابّا کے کمرے سے امّی کی آواز آتے سُنی۔ امّی کی زبان سے بہار کا نام سن کر میں چونک پڑا تھا۔ وہ ابّا سے بہار کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب میں اُن کی پوری بات نہ سمجھ پایا اور لپک کر کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔

"کہیں ہوائی نہ ہو! عورتیں بس یوں ہی اُڑاتی ہیں!" میں نے ابّا کی آواز سُنی۔

"اے لو تو کیا تُو او بہن مجھ سے جھوٹ بولیں گی! تم خود باہر جاؤ گے تو پتا چل جائے گا۔ سارے محلے میں شیخ جی کی [illegible] ہو رہی ہے۔ نوندیلے نے یہ کوتک کر ڈالا اور اُن کے کان پر جوں بھی نہ رینگی!" جواب میں امّی کی آواز اُبھری۔

تو کیا بہار میری بجائے کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی؟ میں نے سوچا۔ کہیں اُس نے واقعی زہر تو نہیں کھا لیا؟

"ابے تو یہاں کھڑا کیا کن سوئیے لے رہا ہے؟" پیچھے بڑے بھیّا کی آواز آئی تو میں اُچھل پڑا۔

"نن... نہیں تو بڑے بھیّا!" یہ کہہ کر میں نے جلد رفوچکر ہونا چاہا مگر وہ کب آسانی سے میری جان چھوڑنے والے تھے۔ اُنھوں نے پیچھے سے میری قمیص کا کالر پکڑ لیا۔

"چل ذرا میرے جوتے پر پالش کر دے۔" اُنھوں نے [illegible]

"مجھے کالج جانے کو دیر ہو جائے گی بڑے بھیّا!" میں [illegible] سے بولا۔

"بس دو ہاتھ مار دے، دو منٹ لگیں گے۔" اُنھوں نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

پھر مجھے کالج جانے سے پہلے بڑے بھیّا کے جوتوں پر [illegible] کرنی ہی پڑی مگر میرا ذہن بہار ہی میں اُلجھا رہا۔

میں گھر سے نکلا تو گلی میں خلافِ توقع لوگوں کو دو دو، چار چار کی ٹولیاں بنائے ہوئے اِدھر اُدھر کھڑے دیکھا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شیخ جی کے گھر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ اُس وقت کالج جانے کو دیر ہو رہی تھی اِس لیے میں نے رُک کر لوگوں کی باتیں نہیں سنیں لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ شیخ جی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

اور پھر دو تین دن ہی میں مجھے ہی کیا پورے محلے کو تفصیلات کا علم ہو گیا، اُن تفصیلات کا بھی جو پہلے دن لوگوں کو معلوم نہ ہو سکی تھیں اور اُلجھن کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ یہ وہ تمام تفصیلات جاننے کے بعد اپنی بزدلی پر فخر محسوس کیا۔ میں بزدل نہ ہوتا تو مارا ہی گیا تھا۔ میری بزدلی نے مجھے بچا لیا۔ اگر میں دلیری دکھا کر بہار کے ساتھ بھاگ گیا ہوتا تو شاید پھر پچھتاتا رہتا۔

دراصل سارے فساد کی جڑ وہ چوکیدار تھا جو گلیوں میں رات کو "جاگتے رہو، جاگتے رہو!" کا شور مچاتا پھرتا تھا۔ اُس نے نصف شب کے قریب خالہ گلبدن کو گلی کے نکڑ پر ایک نوزائیدہ بچہ رکھ کر فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ بیچاری خالہ گلبدن رات کے [illegible]

[illegible] اپنا لحیم شحیم جسم اُس کی نظر سے نہ چھپا سکی تھیں۔ چوکیدار نے اُنھیں رُک جانے کے لیے للکارا تو وہ گھبرا کر لڑھک گئیں مگر جان بنی ہوئی تھی اِس لیے پھر اُٹھ کر فوراً بھاگیں۔ عورت ذات ہونے کے سبب چوکیدار کی یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ اُنھیں پکڑ لیتا مگر اُس نے ضرور دیکھ لیا کہ وہ گلی کے کس گھر میں گھسی تھیں! چوکیدار نے وہ ٹوکری اُٹھائی جس میں نوزائیدہ بچہ پڑا ہوا رو رہا تھا اور سیدھا تھانے پہنچ گیا۔

پولیس آئی تو بہار نے پھیل مچا کر سارا بھانڈا پھوڑ دیا کہ وہ نوزائیدہ بچہ خالہ گلبدن کا نہیں اُس کا "مدکارنامہ" تھا۔ گلبدن زبردستی اُس نوزائیدہ بچے کو بہار کے پہلو سے اُٹھا کر گلی کے نکڑ پر پھینک آئی تھیں۔

بہار نے وہ گل نو ماہ قبل اپنی خالہ کے گھر کھلایا تھا جہاں وہ خالہ کی محبت سے مجبور ہو کر کئی کئی ہفتے رہ جاتی تھی۔ کسی کو نہیں تھی کہ خالہ کی محبت تو صرف دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ہاں بہار یہ اچھی طرح جانتی تھی اور بہار کے خالہ زاد بھائی کا وہ دوست جس نے بہار کو محبت کا تحفہ دیا تھا۔ خود بہار کی خالہ کو بھی اِس کا علم اُس وقت ہوا جب گل کھل چکا تھا اور کسی صورت پھیلائے بغیر مُرجھانے پر آمادہ نہ تھا۔

بہار کا عاشقِ بامراد بڑا کائیاں بالک نکلا۔ جیسے ہی بھانڈا [illegible] کی نوبت آئی، وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب [illegible] شیخ جی انٹی میں جا تو دبائے بہت دن اُسے ڈھونڈتے پھرے [illegible] لگ جائے تو ڈرا دھمکا کر بہار کو اُس کے سر چپیک دیں مگر [illegible] ہاتھ آنے والا تھا! اور پھر ایک دن وہی ہوا جو ہونا تھا! [illegible] اوں ایں اوں" کرتا ہوا شیخ جی کا نواسا آدھمکا۔

شیخ جی کی رسوائی الگ ہوئی اور محلہ الگ چھٹا۔ اُنھیں بدنامی [illegible] کے لیے فوری طور پر روپوش ہونا پڑا تھا۔ یہ پتا نہیں چل سکا [illegible] اُنھوں نے کیسے جان چھڑائی! مگر یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ [illegible] نے اپنی دُکان اور مکان دونوں بیچ دیے ہیں۔ نہ جانے وہ [illegible] کے اندھیرے میں آکر گھر کا سارا سامان لے گئے تھے۔

میں نے پیش آنے والے واقعے کی روشنی میں بہار سے [illegible] عشق کا جائزہ لیا تو میری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ شیخ جی [illegible] کرنے پر اکسانا، خالہ گلبدن کا مجھے اور بہار کو بار بار تنہا چھوڑ [illegible] بہار کا ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر کر مجھے لبھانا اور پھر میرے [illegible] بھاگنے کا پروگرام بنانا، اِن تمام باتوں میں یقیناً ایک جائز [illegible] رشتہ تھا۔ گویا بندر کی بلا زبردستی طویلے کے سر منڈھی جا [illegible] اور بندر کام دکھلانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر گیا تھا۔

تو یہ تھی بہار جو مجھے عشق دوم کے وقت یاد آئی۔ ہاں اُس عشق اور اِس عشق میں ایک بنیادی فرق ضرور تھا۔ وہ عشق رفتہ رفتہ ہو گیا تھا اور یہ عشق کیا جانے والا تھا۔ اُس عشق کی نوعیت ذاتی تھی اور اِس عشق کی سرکاری!

اُس شب سونے سے پہلے میں اپنے ذہن میں عشق کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ بس ذرا ایک دن صبر کی ضرورت تھی تاکہ اُس سے اگلے دن صبح ہی صبح میدانِ عمل میں اُچھل کود مچائی جا سکے۔

دوسرے دن جب میں دفتر سے گھر کے لیے روانہ ہوا تو میرے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔ میں نے اِس تھیلے میں سامانِ عشق رکھ لیا تھا جو ایک عدد دھوتی اور ایک عدد کُرتے پر مشتمل تھا۔ یہ وہی "سامان" تھا جو مجھے سیٹھ دشوا ناتھ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

گھر پہنچتے ہی ابّا کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر میرا دَم خشک ہو گیا۔

"ادھر آ اللہ دتّا!" اُنھوں نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میں ڈرا ڈرا اُن کے قریب پہنچا تو اُنھوں نے میری کلائی پکڑ لی اور اپنے کمرے کی طرف چلنے لگے۔

"اے میں پوچھوں ہوا کیا جو دوپہر سے نے جبرے بیٹھے ہو؟" امّی پیچھے آتی ہوئی بولیں۔

"تو اِس معاملے میں نہ بول اللہ دتّے کی ماں ورنہ میں کہہ رہا ہوں مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔" ابّا نے پلٹ کر آنکھیں نکالیں، امّی جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔

"اے مجھے کیا، تم جانو تمھارا پوت جانے!" امّی ہاتھ نچا کر بولیں۔

خوف کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ لرزتے کانپتے قدموں سے میں ابّا کے ساتھ اُن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اُنھوں نے مجھے اپنی چارپائی پر بٹھا دیا اور خود سامنے مونڈھے پر بیٹھ کر مدھم مگر سخت لہجے میں بولے: "دیکھ اگر تُو نے مجھ سے جھوٹ بولا تو کھال اُدھیڑ دوں گا۔ بول جو پوچھوں گا سچ سچ بتائے گا؟"

زبان تو خیر کیا ساتھ دیتی، میں نے سر ہلا دیا۔

"بھتّا سا سر مت ہلا، مُنہ سے بول!" ابّا نے ڈانٹا۔

"ہاں!" میں نے بمشکل کہا۔

"تُو کل جی بی روڈ گیا تھا؟" ابّا نے سوال کیا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یقیناً ابّا کو یہ خبر مستاد [illegible] نے پہنچائی تھی۔ میں نے دل مضبوط کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" ابّا غالباً کوشش کر کے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے

دے رہے تھے۔

"میں وہاں ایک سرکاری کام سے گیا تھا۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"سرکاری کام!" ابا کے لہجے میں حیرت تھی۔ میرا جواب یقیناً ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ "کیسا سرکاری کام؟" اس بار ان کا لہجہ کچھ نرم تھا اور اس میں تجسس بھی تھا۔

"مجھے... مجھے دفتر کی طرف سے حکم ہے کہ... کہ..." میں کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا حکم ہے؟ بتاتا کیوں نہیں ہے؟" مجھے چپ دیکھ کر ابا کو پھر غصہ آنے لگا۔

"کہ... کہ میں سرکاری کام کے بارے میں کسی کو کچھ... کچھ بھی نہ بتاؤں۔" میں نے رک رک کر مطلب کی بات کہہ ہی دی۔

"مجھے بھی؟" ابا غرائے۔

میں خاموش رہا۔

"سن اللہ دتا! مجھے ایسی نوکری نہیں کرانی کہ تجھے ایسی بدنام جگہوں پر جانا پڑے جہاں تیرا اخلاق بگڑنے کا امکان ہو، سمجھا!" ابا اٹھتے ہوئے بولے "میں آج ہی بندو خاں کو بلا کر بات کروں گا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جوان بچوں کو اس طرح بگاڑا جائے!"

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں، "اے میرے پیارے ابا! نوکری میں تو عشق بھی لڑانا پڑتا ہے" مگر ظاہر ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔

ابھی میں ابا کے ساتھ انہی کے کمرے میں تھا کہ امی آ گئیں اور آتے ہی بولیں "ہو گئے راز و نیاز باپ بیٹے میں! میں بھی تو سنوں آخر بات کیا ہے؟"

"تو باہر جا!" ابا نے مجھے وہاں سے کھسک لینے کا اشارہ کیا۔

ان کے چہرے سے اب غصے کی بجائے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور کمرے سے نکل گیا مگر اسی کے ساتھ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ امی اور ابا کے درمیان ہونے والی گفتگو ضرور سنوں۔ دیکھوں تو سہی کہ ابا پر میری بات کا کیا ردعمل ہوا ہے۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ابا کے برابر والے کمرے میں جھانکا جو بڑے بھیا کا کمرہ تھا۔ اس وقت وہ موجود نہیں تھے۔ ابا کے اور ان کے کمرے ایک دروازے کے ذریعے ملے ہوئے تھے جو عموماً بند رہتا تھا مگر اس دروازے سے کان لگا کر ابا کے کمرے میں ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔

جب میں نے دوسرے کمرے میں پہنچ کر درمیانی دروازے سے کان لگایا تو اس وقت امی کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ارے تم تو بے فضول میں فکر کر رہے ہو۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو بندو خاں کیسے گوارا کر لیتے۔ آخر وہ اللہ دتا سے اپنی بیٹی بیاہ رہے ہیں۔ یہ کوئی ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں!"

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ابا کی آواز آئی "تو پھر کیا کہتی ہو، بندو خاں کے پاس نہ جاؤں؟"

"میرا تو خیال ہے کہ بندو خاں کو خود سب کچھ خبر ہو گی۔ آخر تو خفیہ ہی میں ہیں۔" امی کی آواز بلند ہوئی۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" ابا کی آواز سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ "تو اپنے طور پر اللہ دتا سے پوچھیو مزور کہ وہاں کیوں گیا تھا اور سمجھا بھی دیجیو ذرا ہاتھ پیر بچا کر کام کرے۔"

اب مزید وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ کسی بھی بڑے بھیا آ کر گردن دبوچ سکتے تھے۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

دوسرے دن صبح میں منصوبے کے مطابق اذان کے ساتھ ہی جاگ اٹھا۔ امی وضو کر رہی تھیں۔ مجھے بستر سے اٹھتے دیکھا تو بولیں "نماز پڑھ کر مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے اللہ دتا!"

"مگر امی! مجھے تو اسی وقت دفتر کے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔" میں نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنی صبح!" امی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔" میں بولا۔ "آپ شام کو بات کر لیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" امی یہ کہہ کر کلی کرنے لگیں، پھر بولیں "ناشتہ تو کر لیتا۔"

"نہیں، دیر ہو جائے گی، بازار میں کچھ کھا پی لوں گا۔" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو جان!" امی پھر وضو کرنے میں لگ گئیں۔

منہ ہاتھ دھو کر اور ہاتھ میں تھیلا لٹکا کر میں کچھ دیر میں گھر سے روانہ ہو گیا۔ مجھے جلدی اس لیے تھی کہ ابھی بھیس بدلنا تھا۔ بھیس بدلنے کے لیے میں نے پہلے ہی کمپنی باغ منتخب کر لیا تھا۔ پہلے مجھے وہاں پہنچنا تھا، پھر وہاں سے کشمیری گلی جانا تھا۔

کمپنی باغ پہنچ کر میں نے پیڑوں کی آڑ میں لباس تبدیل کیا اور اپنے اتارے ہوئے کپڑے تھیلے کے اندر رکھ لیے۔ اب اپنے لباس سے ایک ہندو نوجوان نظر آ رہا تھا۔

میں نے باغ سے نکل کر ایک یکہ کیا اور کشمیری گلی روانہ ہو گیا۔

یکے کو گلیوں میں لے جانے کی بجائے میں نے اسے باہر ہی چھوڑ دیا اور اس طرف چل دیا جہاں اس جانِ بہار سے مجھے سرکاری عشق لڑانا تھا۔

ابھی میں اس گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے سے پپیپا سا لڑھکتا ہوا میری طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے وجود نے چھوٹی سی گلی کا بڑا حصہ گھیر رکھا تھا۔ یہ وہی تھی، وہی

جس کے دامِ زلف میں گرفتار ہونے میں وہاں پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھالی نظر آ رہی تھی اور وہ تنہا تھی۔ جب وہ میرے قریب پہنچی تو میں ٹھٹک کر ایک طرف ہو گیا، پھر اسی وقت میں نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک بڑی زوردار آہ بھری۔

اس کی نگاہ میری طرف اٹھی اور پھر اس نے شرما کر اپنا بھیلی جیسا سر جھکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا "ہائے رام!"

وہ قریب سے گزر گئی تو میں اس کے پیچھے چل دیا۔ چند قدم چل کر وہ مڑی اور میری طرف دیکھا۔ میں نے پھر سینے پر ہاتھ مارا اور بائیں آنکھ دبا دی کیونکہ میں نے گزشتہ دن دفتر میں اپنے ماتحت کمال کو آنکھ مار مار کر اس کی خاصی مشق کر لی تھی۔ کمال میرے آنکھ مارنے پر بوکھلا اٹھتا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ میں اس طرح صرف ایک آنکھ مارنے کی مشق کر رہا ہوں تاکہ بوقتِ ضرورت میری دونوں آنکھیں بند نہ ہو جائیں۔

آنکھ مارنے کا ردعمل شدید ہوا۔ میں نے اس پہاڑ جیسے جسم کو ہلتے ڈولتے دیکھا، پھر ایک چھناکا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود تھالی زمین پر گر گئی تھی اور تھالی میں جو چیزیں تھیں وہ تھالی سے باہر جا پڑی تھیں۔ وہ معاً تھالی اٹھانے جھکی تو اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور خود بھی لڑھک گئی۔

اس کے منہ سے گرتے ہی ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی اور میں گھبرا گیا۔ میں اس سے چند ہی قدم پیچھے تھا۔ گرنے کے سبب اس کی ساڑی کچھ اٹھ گئی تھی اور مگدر جیسی پنڈلیاں نظر آنے لگی تھیں جن پر گھنے بالوں کا جنگل اگا ہوا تھا۔ وہ منظر اتنا بھیانک تھا کہ میں نے ایک بار تو گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں مگر جیسے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، آنکھیں کھول دیں۔

وہ اٹھنے کی کوشش میں بار بار لڑھک رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر جو ایک دم میرے جسم کو جھٹکا لگا تو مجھے یہ سمجھنے میں کافی دیر لگی کہ میں کس طرح اس گوشت کے ڈھیر پر گرا۔ میں چونکا اس وقت جب میرے کان میں آندھی سی چلنی شروع ہوئی۔ اس کی ناک میرے کان سے قریب تھی اور وہ گھرے گھرے سانس لے رہی تھی۔ میں اپنے محبوب اپنے مطلوب سے ہمکنار تھا اور محبوب اس لذتِ غیر متوقع سے سرشار آنکھیں بند کیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

مجھے جیسے ہی صورتِ حال کا اندازہ ہوا کہ میں سرِعام کیا حرکت نازیبا کر رہا ہوں تو ایک دم اچھل کر الگ ہو گیا۔ اگر کوئی مجھے اس حال میں دیکھ لیتا تو بڑی واویلا مچتی۔ ایک لڑکی گلی میں چت پڑی تھی اور اس کے اوپر میں استراحت فرما تھا۔ لڑکی سے تو لوگ جو کچھ کہتے وہ کہتے مگر میری اچھی طرح "دھلائی" لگا دیتے۔

میں اس کے اوپر سے ہٹا تو شاید وہ بھی سپنوں کی دنیا سے زمین پر آ گئی اور آنکھیں کھول دیں۔

"ہائے رام! مجھے اٹھاؤ نا!" وہ ایک دلنواز ادا سے بولی۔

میں اس بار چوکنا تھا اس لیے اکڑوں بیٹھ کر زور لگانے لگا۔ پہلے وہ بیٹھنے میں بمشکل کامیاب ہوئی، پھر خدا خدا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی مگر اب پھر وہی تھالی اٹھانے کا مسئلہ درپیش تھا جسے اٹھانے کے چکر میں وہ زمیں بوس ہوئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ تھالی اٹھانے کے لیے دوبارہ جھکتی اور دوبارہ لڑھکتی، میں نے جلدی سے کہا "تم رہنے دو! میں تھالی اٹھائے دیتا ہوں۔"

"ناریل اور کٹوری بھی!" اس نے مجھے جھکتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

میں نے کٹوری اٹھائی، پھر ناریل۔ تھالی میں پھول بھی تھے جو زمین پر گر کر مٹی میں سن گئے تھے اور کچھ اس کے نیچے آ کر مسل گئے تھے۔ میں نے پھول نہیں اٹھائے اور تھالی اس کی طرف بڑھا دی۔

"تم شاید پوجا کرنے مندر جا رہی تھیں!" میں نے تھالی دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "تم بھی چلو!" اس نے بے تکلفی سے مندر چلنے کی دعوت دی۔

"چلو!" میں بولا اور اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! اس نے خود ہی میری مشکل حل کر دی تھی اور میں خوش تھا۔

"اگر تم نہ ہوتے تو... تو... تو مجھے کون اٹھاتا... تم نے مجھے اپنی بانہوں میں لے کر... ہائے رام!... یہ میں کیا کہہ گئی۔" اس نے شرما کر دوہرا ہو جانا چاہا مگر ایسا ممکن نہ ہوا۔

مجھے ایک بار پھر تھالی گرنے کا خطرہ منڈلاتا نظر آیا اور بولا "دیکھو تھالی نہ گر جائے۔"

اس نے اپنا دو ہاتھ قابو میں کر لیا جو بے قابو ہو رہا تھا، پھر بولی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام ال... وہ میرا نام..." میں جھونک میں اپنا اصل نام بتانے والا تھا کہ رک گیا۔ پھر میں نے اسے اپنا نام شنکر بتایا اور اسی کے ساتھ اس کا نام پوچھا۔

"پاروتی۔" وہ اپنی دانست میں اٹھلا کر بولی۔ "مگر سب مجھے پارو کہتے ہیں۔"

"ہائے پارو!" میں نے عاشقانہ لہجے میں کہا۔ "کیسا سندر نام ہے۔"

"اور تمہارا نام بھی تو سندر ہے، شنکر! مانو مٹھاس ہی مٹھاس!"
وہ مجھ پر واری نیاری ہونے لگی اور مجھے ڈر لگا کہ کہیں راستے ہی میں وہ بھرپور اظہارِ عشق نہ کر ڈالے۔ وہ بار بار مجھے ایسی ہی مست نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

مندر کی سیڑھیوں تک اس کے اور میرے درمیان اسی طرح رومانی ڈائیلاگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے میرے اور اس کے عشق میں خاصی پختگی آ چکی تھی۔

میرا ارادہ مندر میں داخل ہونے کا نہیں تھا اور نہ اس سے پہلے میں نے کوئی مندر اندر سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کے پوجا پاٹ سے بھی مجھے پوری طرح واقفیت نہیں تھی۔ میں اسی لیے مندر کی سیڑھیوں تک پہنچ کر رک گیا۔

"بھگوان کے درشن نہیں کرو گے شنکر!" پاروتی عرف پارو نے مجھے رکتے دیکھ کر ایک ادائے دلبری سے کہا۔

اس نے کچھ اس طرح یہ جملہ ادا کیا تھا کہ اگر مندر کی بجائے کانجی ہاؤس میں بھی ساتھ چلنے کے لیے کہتی تو شاید میں انکار نہ کر پاتا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں!" میں ریشہ خطمی ہو کر بولا اور قدم بڑھا دیئے مگر اس کے باوجود میرا دل ایک انجانے سے خوف کے سبب تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔

"بول شری بجرنگ بلی کی جے!" میں نے مندر میں داخل ہوتے ہی اپنے قریب سے ایک فلک شگاف نعرہ سنا اور اچھل پڑا۔

میں دانستہ پاروتی سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا تاکہ جو وہ کرے، اسی پر میں عمل کرتا جاؤں۔ کچھ دور چل کر پاروتی نے چھت سے لٹکے ہوئے ایک گھنٹے کو زور سے ہلایا، پھر میں نے بھی یہی کیا۔

ایک بات جو میں نے بطورِ خاص محسوس کی، وہ یہ تھی کہ جیسے جیسے میں بڑھتا جا رہا تھا، وہ مندر کچھ تنگ سا ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس عمر کو پہنچ کر میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ ہندوؤں کے مندر ان کی ذہنی عکاسی کرتے ہیں، تنگی اور تاریکی! جگہ تنگ ہونے ہی کے سبب اب وہاں کافی ہجوم نظر آنے لگا تھا۔ ہر طرف منڈے ہوئے سروں پر موٹی موٹی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ میرے اور پاروتی کے ارد گرد اب لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔

"بول شری رادھے شیام جی کی جے!" کسی نے پرجوش نعرہ مارا اور اس بار وہاں موجود افراد نے بھی اس کا ساتھ دیا اور میرا دل دہل کر رہ گیا۔

"یا اللہ!" گھبراہٹ کے عالم میں میرے منہ سے بے ساختہ اللہ کا نام نکل گیا۔ پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔

میری اطراف میں ہندو ہی ہندو تھے۔ مندر میں کسی کی زبان پر اللہ کا نام آنا کتنی بڑی قیامت ڈھا سکتا ہے، اس کا اندازہ مجھے فوراً ہی ہو گیا۔

ہندو ہونے کی ظاہری علامت صرف وہ دھوتی تھی جو میں نے باندھ لی تھی۔ نہ میرے سر پر چوٹی تھی اور نہ ماتھے پر ٹیکا!

میری اطراف میں چلتے ہوئے لوگ میری زبان سے اللہ کا نام سن کر ایک دم رک گئے۔ پہلے انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر ان میں سے کوئی چلایا "مار ڈالو، یہ مُسلا ہے، ملیچھ!"

اس کے بعد تو جیسے ہر طرف سے مُسلا اور ملیچھ کی پکار شروع ہو گئی۔ میرا خون خشک ہو گیا کیونکہ میں ان کے نرغے میں تھا۔ پاروتی آگے چل گئی تھی اور اب حیرت سے پلٹ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"مار دو!" کوئی چیخا اور مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیا۔

"چندا نکل کر نہ جاوے!" کوئی دوسرا ہنکارا۔

ایک ہاتھ میری گدی پر پڑا اور میں لہرا کر دوسرے شخص پر جا پڑا۔ نہ جانے کیسے میرا سر براہِ راست اس شخص کی ناک پر پڑا اور اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکرایا اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک دم نیچے بیٹھ گیا تاکہ مزید پٹائی سے بچ سکوں۔

"کہاں، کہاں!" کوئی چیخا۔

"اس کے پاس چاکو ہے، چاکو!" کسی دوسرے نے قیاس آرائی کی۔
دوسرے شخص کی قیاس آرائی نے غالباً انھیں سہما دیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے اور اسی دوران میں بیٹھے بیٹھے ہی میں ایک شخص کی ٹانگوں کے درمیان گھس کر دوسری طرف نکل گیا۔ کچھ فاصلہ میں نے اسی طرح طے کیا، پھر ایک دم اٹھ کر بھاگنے لگا۔

"وہ گیا، وہ گیا، پکڑو!"

لوگ ایک دوسرے سے کہتے رہے اور چیختے رہے مگر جب میں کافی دور نکل گیا تو انھوں نے میرا تعاقب شروع کیا۔ یقیناً اس کا سبب وہ قیاس آرائی ہی تھی جس کی رو سے میرے پاس ایک عدد چاقو تھا۔ وہ چاقو کے خوف سے فوراً ہی میرے پیچھے نہیں بھاگے تھے۔

اب میں مندر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا اور میرا تعاقب کرنے والے بہت پیچھے چیختے چلاتے چلے آ رہے تھے۔ اس گڑبڑ میں میرے ہاتھ سے وہ تھیلا بھی کہیں گر گیا تھا جس میں میرے کپڑے تھے۔

مندر سے نکلتے ہی میں نے ایک پتلی سی گلی کا رخ کیا اور اس میں دوڑتا چلا گیا۔ گلی سے گزرتے ہوئے ایک آدھ آدمی نے مجھے روک کر کچھ پوچھنا بھی چاہا مگر میں نہ رکا۔ میں وہ گلی عبور کر کے دوسری گلی میں گھس گیا۔ اس وقت مجھے نہ سمت کا ہوش تھا نہ یہ کہ کدھر جانا چاہیے۔ میری حیرانگی کا اس وقت [illegible] جب میں نے خود کو اس

گلی میں پایا جہاں پاروتی کا گھر تھا۔ میں لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ دراز قد، سر پر چھوٹے چھوٹے بال، بائیں رخسار پر ایک مسا، ماتھے پر ہلال نما زخم کا نشان! یہ تھا ان چار مفرور مجرموں میں سے ایک کا حلیہ جو میں نے "دشوا ناتھ کیس" کی فائل میں پڑھا تھا۔ بالکل اسی حلیے کا شخص اس وقت پاروتی کے گھر سے متصل دوسرے مکان کے دروازے سے نکل رہا تھا۔ اس پر ایک نظر پڑتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص بھی مجھے دیکھ کر چونکا تھا مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور مکان سے نکل کر اس کے دروازے میں تالا لگانے لگا۔

میں اس وقت تلملا کر رہ گیا۔ اگر میرے پاس ریوالور ہوتا تو میں اسے ہرگز وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہ دیتا مگر اس کے باوجود ہمت کر کے اس کی طرف بڑھا۔ وہ اب تالا لگا کر میری ہی طرف آ رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی خالص ہیروانہ انداز میں دونوں ٹانگیں چوڑا کر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کیں اور اس کی راہ میں حائل ہو گیا حالانکہ اس طرح دھوتی کھل جانے کا بھی خطرہ تھا مگر مجھے یہ خطرہ بہرحال مول لینا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، راستہ چھوڑ دو!" وہ میرے قریب پہنچ کر غرایا۔

"تم اس طرح نہیں بھاگ سکتے بچو!" میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"ابے ہٹتا ہے راستے سے کہ ہاتھ جھاڑ دوں!" وہ غصے سے سرخ ہو گیا اور "تم" سے "تو" پر اتر آیا۔ اسی کے ساتھ اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

جواباً میں نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"ابے تیری یہ مجال!" اس نے میرے اس ہاتھ پر کلائی ماری جس سے میں اس کا گریبان پکڑے ہوئے تھا۔

اسی کے ساتھ "چھر" کی آواز ہوئی اور اس کا گریبان پھٹ گیا کیونکہ میں مضبوطی سے گریبان پکڑے ہوئے تھا۔

"اچھا تو لے!" اس نے میرے گریبان پر بھی جھٹکا مارا۔ میرا گریبان بھی پھٹ گیا اور بٹن ٹوٹ کر دور جا گرے۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ میں اس کے اوپر آ رہا۔ اسے شاید توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں اتنا ہی بھوڑ ثابت ہوں گا کہ کسی بوری کی طرح اس پر آ رہوں گا۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ پشت کے بل گرا اور میں اس کے اوپر براجمان ہو گیا مگر اس نے مجھے زیادہ دیر اپنے اوپر استراحت کا موقع نہیں دیا۔ اس نے اچانک اپنے گھٹنے سکوڑے اور میرے پیٹ پر جما دیے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پیٹ میں دو بڑی بڑی گانٹھیں سی لگ گئی ہوں جن میں میرے جسم کی ساری جان سمٹ آئی ہو۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ میں خواہش کے باوجود نہ چیخ سکا اور اچھل کر ایک طرف جا پڑا۔ پیٹ میں تکلیف کی شدت نے مجھے گٹھڑی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اسی لیے اس وقت کچھ بھی نہ کر سکا جب مجرم کو اپنی آنکھوں کے سامنے زمین سے اٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر ہی میں اس پتلی سی گلی کو عبور کر گیا۔

مجرموں میں سے ایک کے ساتھ یہ میرا پہلا مڈبھیڑ تھا اور یہ پہلا مڈبھیڑ ہی مجھے بہت مہنگا پڑا تھا۔ میں درد سے کراہتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اے کاش اس خبیث کا راستہ نہ روکا ہوتا۔

کچھ دیر بعد جب درد میں ذرا کمی ہوئی تو میں نے زمین سے اٹھنے کا قصد کیا۔ غنیمت یہ گزری کہ اس دوران میں کوئی اس گلی میں نہ آیا۔ میں اٹھ ہی رہا تھا کہ معاً میری نگاہ زمین پر پڑے ہوئے ایک لفافے کی طرف گئی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ لفافے پر جس شخص کا نام لکھا ہوا تھا، اس پر نظر پڑتے ہی میں اچھل پڑا۔ لفافے پر سیٹھ دشوا ناتھ کا نام لکھا ہوا تھا۔

میں ابھی یہ ارادہ ہی کر رہا تھا کہ لفافہ کھول لوں، مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے نظر اٹھائی تو اوسان خطا ہو گئے۔ وہی شخص دوبارہ گلی میں دوڑتا ہوا داخل ہو رہا تھا جس سے کچھ دیر پہلے میری جھڑپ ہوئی تھی۔

"بھاگ اللہ دتا!" کوئی میرے اندر زور سے چیخا اور میں نے اس چیخ پر فوراً لبیک کہا۔ میں نے گلی کی مخالف سمت دوڑ لگا دی۔ گلی کا نکڑ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں گلی سے نکل کر ایک چھوٹی سی سڑک پر آ گیا۔ مجرم ابھی بہت پیچھے تھا۔ میرے سامنے سے ہی ایک تانگا گزر رہا تھا جس کی پچھلی نشست پر ایک مولانا بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر تانگے پر چڑھ گیا۔

"ارے ارے یہ کیا بدتمیزی ہے!" مولانا چراغ پا ہو گئے۔

"وہ... وہ مجھے مار ڈالے گا۔ خدا کے لیے مجھے... مجھے تانگے میں بیٹھا رہنے دیں!" میں گڑگڑایا اور اس گلی کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے مجرم برآمد ہونا تھا۔

"کیا ہوا مولینا صیب؟" تانگے والا مڑ کر بولا۔ "یہ کون آ گیا تانگے میں؟"

"پتا نہیں کون ہے، کوئی ہندو بچہ لگتا ہے۔" مولانا نفرت سے بولے۔

"جبھی تو میں کہوں یہ تانگا ایک دم کیوں الار ہو گیا۔" تانگے والے نے اپنی قابلیت کا اظہار کیا اور پھر براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا: "کون ہے بے تو اور کہاں جائے گا؟"

"جہاں تم جاؤ گے پیارے بھائی!" میں نے لجاجت سے جواب دیا۔

"ابے میں تو جُمّا مسجد جا رہا ہوں۔" تانگے والا بولا۔

"مجھے بھی وہیں جانا ہے۔" میں نے کہا۔ میری نگاہ بدستور

اسی طرف جمی ہوئی تھی جہاں سے مجرم کو ظاہر ہونا تھا کیونکہ ابھی تانگہ کسی طرف مڑا نہیں تھا۔ میں نے مجرم کو گلی سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پایا اور جلدی سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"تم کسی سے لڑ کر آئے ہو صاحبزادے؟" مولانا کی آواز سنائی دی۔ "تمھارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ مٹی بھی لگی ہوئی ہے۔"

میں نے مولانا کے سوال کو نظر انداز کر جانا چاہا مگر وہ جھاڑ کے جھنکڑ ثابت ہوئے۔ انھوں نے اپنا سوال دہرایا اور اسی وقت تانگے والا بول پڑا۔ "اکنی لوں گا جامع مسجد کی!"

حالانکہ وہ زیادہ کرایہ بتا رہا تھا مگر میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میرے پھٹے ہوئے کرتے کی جیب میں کئی آنے موجود تھے۔ تانگے والے کی مداخلت نے مجھے وقتی طور پر مولانا کے سوال جواب سے بچا لیا۔

تانگا ابھی کشمیری گیٹ کی حدود میں تھا اور جہاں سے گزر رہا تھا، وہاں سے میرا دفتر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اس حالت میں گھر نہیں جانا چاہیے۔ اگر امّی نے یا ابا نے سوال شروع کر دیے تو میں کیا جواب دوں گا کہ میری یہ درگت کیسے، کیوں اور کہاں بنی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں کچھ نہ پوچھتے۔ یوں بھی ایک بار نوکری جاتے جاتے بچی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے تانگے والے سے رکنے کو کہا۔

"اے تو تو کہ رہا تھا کہ جامع مسجد جائے گا؟" تانگے والا بُرا سا مان کر بولا۔

"نہیں، بس مجھے یہیں سڑک کے کنارے اُتار دو۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو دو پیسے ڈھیلے کر!"

"میاں تانگے والے دو پیسے تو تم زیادہ مانگ رہے ہو۔" مولانا کو ایمانداری کا ہیضہ معلوم ہوتا تھا اسی لیے وہ میری طرفداری میں بولے۔

"اچھا میاں جی، ایک پیسا تو دلا دو!" تانگے والا فیصلہ طلب انداز میں بولا۔

اس دوران میں تانگا سڑک کے کنارے رک گیا تھا۔ میں جلدی سے اُترا اور فوراً ہی ایک پیسا جیب سے نکال کر تانگے والے کو دے دیا۔

تانگا بڑھ گیا تو میں پیدل ہی اس سڑک کی طرف ہو لیا جو سیدھی میرے دفتر تک پہنچتی تھی۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے میک اپ روم کا رُخ کیا جہاں ہر وضع قطع کا لباس ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہاں پہنچ کر میرا جی چاہا کہ نواب کا بھیس بدل مگر میں نے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا کیونکہ مجھے اب دفتر میں بیٹھنا تھا۔ میں نے ایک پتلون اور قمیص پہن لی۔ پتلون ذرا سی ڈھیلی تھی مگر مجھے اس کا ہرا رنگ پسند آیا تھا اس لیے "ڈھیلے پن" کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

جب میں بھیس بدلنے کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تو پتلون کولھوں پر سرک آئی۔ میں نے اسے اوپر کیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ پھٹا ہوا کرتا اور دھوتی میں میک اپ روم ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ لفافہ میں نے اب پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا جو مجھے اس گلی سے ملا تھا جہاں مجرم کے ساتھ میرا زبردست ٹکراؤ ہوا تھا۔

میں پتلون کو بار بار اپنے پیٹ کی طرف کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں میرے ماتحت کمال کے علاوہ ایک نوجوان نظر آ رہا تھا جس کا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا مگر میں اس کے نام سے ناواقف تھا۔ میں نے اسے دفتر ہی میں دیکھا تھا۔

کمال اور وہ نوجوان مجھے کمرے میں آتا دیکھ کر اپنی اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو، بیٹھو!" میں نے ہاتھ اٹھا کر افسرانہ شان سے کہا اور کرسی کی طرف بڑھا۔

ہاتھ اٹھاتے ہوئے میں یہ بھول ہی گیا کہ اسی ہاتھ سے پتلون سنبھالے ہوئے تھا۔ نتیجے کے طور پر پتلون کھسک کر کولھوں پر آ گئی اور اسی وقت کوئی زور سے ہنس پڑا۔ یہ گستاخی! میں نے سوچا اور پلٹ کر قہر آلود نگاہ سے کمال اور اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ پر ہنسنے والا وہ نوجوان ہی تھا جو مجھے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر ہنستے ہنستے چُپ ہو گیا تھا۔

"کمال! یہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟" میں نے اس گستاخ نوجوان کو مخاطب کرنا کسرِ شان سمجھا اور کمال پر برس پڑا۔

"سر! انھیں... انھیں ڈی آئی جی نے بھیجا ہے۔" کمال نے بتایا۔

"مگر کیوں؟"

اِس بار میرے سوال کا جواب اس نوجوان نے دیا۔ "سر میں آپ کا نیا ماتحت کمار ہوں، سب انسپکٹر کمار!"

"مگر تم ہنسے کیوں تھے؟" میں غرّایا۔

"غلطی ہو گئی سر! آئندہ رو دیا کروں گا۔"

"بالکل ٹھیک!" میں زور دے کر بولا، پھر فوراً ہی مجھے غلطی کا احساس ہو گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ "یہ تم رو دو گے کیوں؟"

"اس لیے سر کہ آپ ہنسنے سے خفا ہوتے ہیں۔" کمار نے جواب دیا۔

میں لاجواب سا ہو کر رہ گیا اور پھر پتلون سنبھالتا ہوا اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ مجھ سے ایک ہی ماتحت نہیں جھکتا جا رہا تھا کہ دوسرا آ گیا۔ کمال تو خیر مجسّم "یس سر" تھا اس لیے گوارا تھا مگر یہ ماتحت کچھ گستاخ قسم کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے کس بل بہت جلد نکال دوں گا۔ یہ اہم فیصلہ کرنے کے بعد میں نے "دفتری پتلون" کی جیب سے وہ لفافہ نکالا جس کے اوپر وشوا ناتھ کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ لفافہ لڑائی بھڑائی کے دوران میں یقیناً مجرم کی جیب سے گرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجرموں نے ہی وہ خط سیٹھ وشوا ناتھ کو لکھا ہو گا۔

پھر جب میں نے لفافہ پھاڑ کر خط پڑھنا شروع کیا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ وہی سیٹھ کے خیر خواہ تھے جو پہلے بھی اس سے "قلمی دوستی" کرتے رہے تھے۔ طرزِ تحریر میرا جانا پہچانا تھا۔ میں خط پڑھنے لگا۔

سیٹھ!

ہم بہت خوش ہیں کہ تم نے حماقت کا ثبوت نہیں دیا اور زیورات پہنچا دیے...

خط کا پہلا فقرہ پڑھ کر ہی میں چونک پڑا کہ بات ہی ایسی تھی۔ میں نے تو اسے کچھ اور ہی کہانی پڑھائی تھی اور میرے خیال کے مطابق وہ پٹ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ تھیلے میں زیورات اور نوٹوں کی بجائے پتھر اور ردّی کاغذ رکھ دے۔ سیٹھ نے میری تجویز سے مکمل اتفاق کیا تھا۔ پھر وہ مجرموں کے جھانسے میں کیسے آ گیا؟ اپنے اس سوال کا جواب پانے کے لیے میں بقیہ خط پڑھنے لگا۔

... زیورات کے ساتھ ہی ہمیں مطلوبہ رقم بھی مل گئی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اب تمھیں عقل آ گئی ہے۔ زیورات اور روپوں کے ساتھ ہمیں تمھارا ایک خط بھی ملا جس میں تم نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کاغذات تمھارے سپرد کر دیے جائیں۔ پیارے سیٹھ! تم شاید یہ بھول گئے کہ ہم نے اپنے پچھلے خط میں قطعی یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر تم نے ہمارا مطالبہ پورا کر دیا تو وہ کاغذات تمھیں دے دیں گے۔ زیورات اور جو رقم تم نے ہمارے مطالبے پر ادا کی ہے، وہ تو صرف اس کا معاوضہ ہے کہ کاغذات صیغۂ راز ہی میں رہیں۔ اگر تمھیں کاغذات مطلوب ہیں تو اس کا معاوضہ الگ ہو گا۔ تمھاری اطلاع کے لیے ہم یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ ان کاغذات کا سودا اب بھگوان داس سے طے ہو رہا ہے۔ بھگوان داس ان کاغذات کے بدلے ہمیں بیس ہزار روپے ادا کرنے پر راضی ہو گیا ہے مگر کیونکہ تم ہمارا ایک مطالبہ خاموشی کے ساتھ پورا کر چکے ہو اور تم نے ایمانداری کا ثبوت دیا ہے اس لیے ہم تمھیں بھی کاغذات خریدنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم کچھ بڑھ کر بولی لگانے پر آمادہ ہو تو ہم بھگوان داس سے سودا نہیں کریں گے۔ ان کاغذات کی کم سے کم بولی پچاس ہزار پر چھوٹے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم دونوں میں سے کون بڑھ کر بولی لگاتا ہے۔ تم جتنی بولی لگا سکتے ہو، کھریا مٹی سے اپنے پھاٹک پر آج رات نو بجے کے بعد لکھ دو۔ اس کے بعد ہم دوبارہ تم سے رابطہ قائم کر لیں گے کہ تمھیں رقم کہاں پہنچانی ہے اور کاغذات کہاں سے ملیں گے مگر شرط یہ ہے کہ تمھاری لگائی ہوئی بولی ہمارے لیے قابلِ قبول ہو۔

تمھارے خیر خواہ

تو سیٹھ وشوا ناتھ ان کاغذات کی خاطر مجرموں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ اسی کے ساتھ مجھے اس پر غصہ بھی آیا۔ کمبخت ان کاغذات کے بدلے مجرموں کو تو ہزاروں روپے کی مالیت کے زیورات اور پانچ ہزار نقد ادا کر چکا تھا مگر مجھے صرف دو ہزار روپے دے کر ہی ٹرخا رہا تھا۔ وہ کاغذات یقیناً اس سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے جس کا اظہار خود سیٹھ نے کیا تھا۔ بھلا ایک یتیم خانے سے اسے اتنی کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کی جایداد بچانے کے لیے وہ ہزاروں روپے داؤ پر لگا دیتا؟ میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ کوئی نہ کوئی بات ان کاغذات میں ایسی ہے جو سیٹھ نے مجھے نہیں بتائی۔ ان کاغذات کے عوض سیٹھ سے جتنی رقم طلب کی گئی تھی، اتنی رقم میں تو سیٹھ یتیم خانے کے لیے کئی عمارتیں خرید کر دے سکتا تھا۔ یہ باتیں سوچ کر مجھے سیٹھ پر تاؤ آنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ خط میرے ہتھے چڑھ جانے کے بعد اب مجرم مزید محتاط ہو جائیں گے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ وہ اسی مضمون سے ملتا جلتا خط سیٹھ کو ضرور لکھیں گے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ مضمون کی عبارت میں کچھ تبدیلی کر دیں اور پھاٹک کی بجائے کسی دوسری جگہ سیٹھ سے "بولی" لکھوائیں۔

سیٹھ وشوا ناتھ نے میرے مشورے پر عمل نہ کر کے اور مجھے دھوکے میں رکھ کر بہرحال اپنے حق میں اچھا نہیں کیا تھا۔ اب مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا تھا اور کاغذات کے سلسلے میں اس نے مجھے جو کہانی سُنائی تھی، وہ بھی اب مجھے گپ معلوم ہونے لگی تھی۔ پھر حقیقت کیا ہے؟ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال پیدا ہو رہا تھا اور اسی کے ساتھ بھگوان داس ایک سوالیہ نشان کی صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔ آخر اس معاملے سے اس کا کیا تعلق تھا؟

ابھی میرا ذہن قلابازیاں ہی کھا رہا تھا کہ اس سلسلے میں پہلے سیٹھ وشوا ناتھ کو ٹٹولوں یا بھگوان داس کو ہلاؤں جلاؤں، ڈی آئی جی تیواڑی کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور میری طلبی کی

میں فوراً ہی پتلون سنبھالتا ہوا اٹھا۔ پھر جب میں کمار کی میز کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس نے ایک کاغذ کا ٹکڑا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے وہ پرچہ لے لیا۔ پرچہ پڑھتے ہی میرا خون کھول اُٹھا۔ اس نے لکھا تھا "سر! آپ شاید بھولے سے اپنے بڑے بھائی کی پتلون پہن آئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ اس حلیے میں آپ ڈی آئی جی صاحب سے ملنے نہ جائیں ورنہ وہ آپ کو ڈانٹ پلا دیں گے۔ آپ میک اپ روم میں جا کر کوئی پتلون پہن لیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں کمار کی آنکھوں کے سامنے وہ پرچہ لہرا کر چیخا۔

"سر! یہ صرف ایک مشورہ ہے جسے قبول کرنا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔" کمار میرے غصّے کو نظر انداز کر کے سنجیدگی اور سکون سے بولا۔

"مگر تم میرے ماتحت ہو۔ تمھیں کیا حق ہے مجھے مشورہ دینے کا؟" میں نے بدستور چیخ کر کہا۔

"غلطی ہو گئی سر! آئندہ کبھی کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ میں تو آپ کے بھلے کی سوچ رہا تھا۔" کمار بولا۔

"ایک دن میں یہ دوسری غلطی ہے۔ اگر تم نے تیسری غلطی کی تو... تو میں تمھیں اپنی ماتحتی سے عاق کر دوں گا، سمجھے!" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل گیا۔

مگر کمرے سے نکل کر میں نے میک اپ روم ہی کا رخ کیا تھا اور وہاں سے دوسری پتلون پہن کر ڈی آئی جی تیواڑی جی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ جلدی اور غصّے میں اس بار میں نے بہت تنگ پتلون پہن لی تھی جو میرے کولھوں پر تان پورے کے غلاف کی طرح منڈھ گئی تھی مگر اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں ڈی آئی جی کے کمرے تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسی لیے دوبارہ میک اپ روم کی طرف لوٹنے کا ارادہ چھوڑ دیا تھا۔ یوں بھی مجھے ڈی آئی جی صاحب تک پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔

میں جب تیواڑی جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کسی فائل کے مطالعے میں مصروف تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سُن کر انھوں نے نگاہ اٹھائی اور فائل بند کر دی۔ میں نے سلام جھاڑا جس کا جواب انھوں نے صرف گردن ہلا کر دیا۔

میں ان کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ چَرّ کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہوا؟ کیسی آواز تھی یہ؟" تیواڑی جی نے حیرت سے

"پ پ... پتا نہیں... پتا نہیں سر!" میں جلدی سے بولا حالانکہ مجھے سب پتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ تنگ پتلون اچھا خاصا چیخ اٹھی تھی اور اب مجھے اپنے کولھے نسبتاً آزاد محسوس ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب تک کرسی پر بیٹھا ہوں، غنیمت ہے مگر اُٹھ جاؤں گا تو کیا ہو گا۔

"میں نے تمھیں یہ پوچھنے کے لیے بُلایا تھا کہ تم نے سیٹھ وشوا ناتھ کیس کے سلسلے میں کیا کیا؟" تیواڑی جی نے کہا "تم کہاں تک پہنچے مجرموں کا سراغ ملا یا نہیں؟"

"سر! ابھی کام جاری ہے مگر اُمید ہے کہ جلد ہی مجرم پکڑے جائیں گے کیونکہ میں ان کا ٹھکانا تلاش کر چکا ہوں۔" میں نے سینہ پھُلا کر جواب دیا۔

"ویری گُڈ! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔" تیواڑی جی تحسین آمیز لہجے میں بولے۔

ان کی تعریف سے میں اور پھُول گیا۔ میں نے ڈینگ ماری۔ "آج صبح تو سر! میں نے ایک مجرم کی مینگ ہی نکال دی۔"

"مجرم کی مینگ! یہ کیا ہوتی ہے؟" تیواڑی جی حیرت سے بولے۔

"آپ مینگ نہیں سمجھتے، کمال ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، میں سمجھاتا ہوں۔ یہ جو خربوزہ اور تربوز ہوتے ہیں، یہ تو آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔ ان کے اندر بیج ہوتے ہیں اور ان بیجوں میں جو ہوتا ہے، اُسے مینگ کہتے ہیں۔ یہ مینگ سوجی کے حلوے میں بھی..."

"یہ تم نے کیا ہانکنا شروع کر دیا!" تیواڑی جی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"معاف کیجیے گا سر! میں سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ کو مینگ کا مطلب معلوم نہیں۔ خیر تو سر! کیا ہوا صبح، وہ میں بیان کر رہا تھا۔"

"سیدھی طرح!" تیواڑی جی نے وارننگ دی۔

"میں ان چاروں مفرور مجرموں میں سے ایک کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے ٹکرا گیا بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے اسے خود پر... نہیں بلکہ خود سے ٹکرانے کا موقع دیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ گلی تنگ ہو اور کوئی دونوں ٹانگیں چوڑی کرا کر سینہ تان کر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو کیا کریں گے آپ! ظاہر ہے کہ آپ کو لامحالہ اس شخص سے ٹکرانے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ تو یہی میں نے کیا سر! میں اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑا [illegible]، بڑا تلملایا کرے تو کیا کرے مگر ہوا وہی جو میں نے سوچا تھا۔ اُسے مجھ سے ٹکرانا پڑا، پھر..."

"کیا تم اپنی [illegible] [illegible] کر سکتے!" تیواڑی جی کے ہاتھوں سے صبر کا دامن [illegible] چھوٹنے لگا۔

"میں مختصراً ہی تو بتا رہا ہوں سر!" میں جلدی سے بولا۔ "خیر آپ کہتے ہیں تو اور مختصر کر دیتا ہوں۔ تو ہو... یہ سر کہ جب وہ رفتہ رفتہ میری طرف بڑھا تو..."

"خاموش... خاموش!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمھاری خرافات اتنی تفصیل کے ساتھ سُن سکوں۔"

ان کی زبان سے خرافات کا لفظ سُن کر میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گویا میں اُنھیں خرافات سنا رہا تھا! یہ سوچ کر میرا مُنہ لٹک گیا۔

"اب میں تم سے جو سوال کروں، اس کا کم سے کم الفاظ میں جواب دو!" تیواڑی جی نے حکم دیا، پھر قدرے توقف سے بولے۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تمھیں ملا کہاں تھا؟"

"کشمیری گیٹ میں۔" میں نے واقعی مختصر گفتگو کا فیصلہ کر لیا۔ میں تو اپنا سارا جوشِ بیان صَرف کیے دے رہا تھا اور انھیں وہ خرافات معلوم ہو رہی تھی۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی! مجھے بُرا مان جانے کا پورا حق تھا۔

"اس وقت تم اس گلی میں کیا لینے گئے تھے؟" تیواڑی جی نے دوسرا سُوال کیا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جس پر آپ خرافات ہونے کا الزام لگا سکتے ہیں سر! اس لیے میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔" میں مُنہ پھُلا کر بولا۔

"جواب دو!" انھوں نے مجھے ڈانٹا۔

"میں ایک مندر سے پٹ کر بھاگا تھا اور اس گلی میں جا گھُسا تھا۔" میں نے بتایا۔

"مندر سے پٹ کر! مگر تم مندر میں کیوں گئے تھے؟"

"مجھ سے ایک لڑکی نے کہا تھا۔"

"کون لڑکی؟"

"پاروتی۔"

"پاروتی کون؟"

"دیکھیے سر! اب آپ خود بات کو طول دیے جا رہے ہیں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میرے سوال کا جواب دو!" تیواڑی جی [illegible] کی تلوار کٹ مونچھیں پھڑکیں اور میں نے نگاہ جھکا لی کیونکہ وہ مونچھیں مجھے بڑی خوفناک لگتی تھیں جیسے ان کی نوکیں میری کھوپڑی میں [illegible] گھُس جائیں گی۔ جب انھوں نے دوبارہ ڈانٹ پلائی اور [illegible] اپنی تلوار کٹ

تو [illegible] پھر [illegible] کا [illegible] زبان [illegible] میں بولا "سر! یہ وہ لڑکی ہے جسے مجرموں نے اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔ میں اس کے ذریعے مجرموں تک پہنچنا چاہتا تھا۔" یہ کہہ کر میں چپ ہو گیا۔

"ایک بات بتاتے ہو اور دوسری الجھن پیدا کر دیتے ہو۔" تیواڑی جی زچ ہو کر بولے۔ "اچھا تفصیل کے ساتھ ابتدا سے واقعات بیان کرو۔"

"آپ اسے خرافات تو نہیں کہیں گے؟" میں نے ہمت کر کے نگاہ اٹھائی۔

نہ جانے میرے لہجے میں کیا بات تھی کہ تیواڑی جی ہنس پڑے، پھر بولے "اچھا بابا بیان کرو، نہیں کہوں گا خرافات!"

میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ سیٹھ وشوا ناتھ نے مجھے جو روپے دیے تھے، ان کا ذکر گول کر کے باقی تمام باتیں تیواڑی جی کو بتا دوں کیونکہ اب مجھے سیٹھ سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی جو میں ان کا غلاظت کے بارے میں تیواڑی جی یا کسی اور کو کچھ نہ بتاتا۔ اسی کے ساتھ میں نے تیواڑی جی کا موڈ دیکھ کر یہ فیصلہ بھی کیا کہ زیادہ تفصیل سے گریز کروں۔ یہ دو عدد اہم فیصلے کرنے کے بعد میں نے بولنا شروع کیا اور از اوّل تا آخر سب کچھ بتا دیا۔

"خیر باقی باتیں تو پھر ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ تمھیں کشمیری گیٹ سے آئے کتنی دیر ہوئی ہے؟" تیواڑی جی میری پوری رام کہانی سن کر بولے۔

"یہی کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سر!" میں نے جواب دیا لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ تیواڑی جی نے وہ سوال کیوں کیا تھا۔

"تو پھر تم واقعی احمق ہو۔" وہ کسی قدر برہم ہو کر بولے۔ "اب تک مجرم وہاں سے فرار ہو چکے ہوں گے۔ تمھیں چاہیے تھا کہ فوراً اس مکان پر چھاپا مارتے۔"

تیواڑی جی کے تیور دیکھ کر میری سٹّی گم ہونے لگی۔ واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی تھی لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ان کا اندازہ درست ثابت ہوتا، پھر بھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے اس خیال کا اظہار کر سکتا۔ میں نے اسی میں عافیت جانی کہ اپنا قصور تسلیم کر لوں۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! مجھ سے غلطی ہو گئی۔" میں گردن جھکا کر بولا۔

"میں نے آج ہی ایک ذہین سب انسپکٹر کمار کو تمھارے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ بھی میرا تربیت یافتہ ہے۔ تمھیں اس کیس میں اس سے کافی مدد ملے گی۔" تیواڑی جی کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ میں نے اپنا قصور مان لیا تھا۔

میرا جی چاہا کہ کمار کی بدتمیزی کا ذکر کر دوں مگر یہ اس بات کا موقع نہیں تھا۔ میں اس لیے خاموش ہی رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر تیواڑی جی چند لمحے بعد پھر بولے "میں تمھیں لائن آف ایکشن بتاتا ہوں۔ میرے خیال میں تمھارا طریق کار غلط تھا۔ تمھیں براہ راست اس لڑکی سے معلومات حاصل کرنا تھیں جسے زیورات وغیرہ کا تھیلا پہنچایا گیا تھا، اتنا لمبا چکر چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب سب سے پہلے تم اس مکان پر چھاپا مارو جہاں مجرم ٹھہرے ہوئے تھے۔" تیواڑی جی نے کہا۔ "مگر سر! آپ نے تو کہا تھا کہ وہ فرار...."

"پوری بات تو کرنے دو۔" تیواڑی جی میری بات کاٹ کر بولے۔ "مجھے یقین ہے کہ اب مجرم وہاں نہیں ہوں گے لیکن ممکن ہے، وہاں کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے مجرموں کا سراغ لگانے میں آسانی ہو۔ اب سمجھے!"

"جی سر!" کچھ نہ سمجھ کر بھی میں نے گردن ہلا دی۔

"پھر اس مکان کے بارے میں پتا لگاؤ کہ وہ کس کی ملکیت ہے اور مجرموں نے اسے کیسے حاصل کیا۔ اس سلسلے میں تم کمار پر بھروسا کر سکتے ہو۔ وہ تمام معلومات آج ہی فراہم کر دے گا۔ اس کے بعد مالک مکان سے ملو اور پتا لگاؤ کہ اس سے مجرموں کا کیا تعلق ہے۔ اسی کے ساتھ انوری بائی کو بھی ٹٹولو...."

"مگر وہ بُرا مان گئی تو؟... تو کیا ہوگا سر؟" میں بات کاٹ کر بولا۔

"شٹ اپ!" تیواڑی جی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کیا کرو! میرا مطلب یہ ہے کہ پتا چلاؤ، اس کا مجرموں سے کیا تعلق ہے۔" "سیٹھ وشواناتھ کے سلسلے میں کیا کیا جائے سر؟"

میرے سوال پر وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر بولے "میرا خیال ہے کہ سیٹھ وشواناتھ نے تمھیں اناتھ آشرم (یتیم خانہ) اور گردوارے کے بارے میں جو کہانی سنائی ہے، وہ غلط ہے مگر اس خیال کی تائید میں ثبوت چاہیے۔ تمھیں اس سلسلے میں بھی تحقیقات کرنا ہیں کہ واقعی اناتھ آشرم اور گردوارے والوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہے یا نہیں!"

"اور بھگوان داس کے بارے میں کیا خیال ہے سر؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے بھی ملو اور پتا لگاؤ کہ اس کے اور سیٹھ وشواناتھ کے درمیان کیسے تعلقات ہیں یا کیسے تعلقات رہے ہیں۔ تم اس سلسلے میں سیٹھ وشواناتھ سے بھی پوچھ گچھ کر سکتے ہو۔ یہ کوئی بہت گہرا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ سیٹھ وشواناتھ اور بھگوان داس دونوں کی نگرانی شروع کرا دو، فوری طور پر انھیں مزید ماتحت فراہم کر دیے جائیں گے۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھو کہ مجھے حالات سے مطلع کرتے رہو۔ سیٹھ وشواناتھ بہر حال معمولی آدمی نہیں ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" تیواڑی جی اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولے اور سامنے رکھی ہوئی فائل اٹھالی۔

مجھے معاً پھٹی ہوئی پتلون کا خیال آیا اور میں نے جلدی سے قمیص باہر کر لی تاکہ کچھ تو پردہ پوشی ہو سکے۔ شکر یہ ہوا کہ جب میں دروازے کی طرف بڑھا تو تیواڑی جی فائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

میں نے ان کے کمرے سے نکلتے ہی میک اپ روم کا رُخ کیا ابھی میں اس کے دروازے تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ میری روح قبض ہو گئی۔ چچا بندو خاں سامنے سے آ رہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی انھوں نے "اللہ دتا بیٹا"، کا نعرہ لگایا تھا۔ میں نے فوری کام کا بہانہ کر کے بمشکل ان سے جان چھڑائی، وہ بھی اس وعدے پر کہ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ان کی بٹیا، یعنی میری ہونے والی جورو نے شامی کباب بنائے تھے اور شامی کباب بنانے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس بار میں نے میک اپ روم میں پہنچ کر جلد بازی کا ثبوت نہیں دیا اور جو کپڑے میرے جسم پر بالکل فٹ آئے وہی پہنے۔

میک اپ روم سے نکل کر میں نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں دونوں ماتحتوں کو احکامات جاری کرنے لگا۔ میں نے ان دونوں ہی کو فوری طور پر کشمیری گیٹ پہنچ کر پہلے پاروتی سے مل کر معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا تھا، پھر اس کے برابر والے مکان پر چھاپا مارنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اچھی طرح پتا سمجھا دیا تھا۔ دراصل میں خود وہاں جاتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ کہیں کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ صبح کا واقعہ ابھی تازہ تھا۔ پھر یہ کہ میں پاروتی سے کیا کہتا۔ کمار نے اس مکان کی تلاشی کا وارنٹ بنایا اور اس پر تیواڑی جی کے دستخط کرا لایا۔ اس کے بعد کمال اور کمار روانہ ہو گئے۔

میں نے اس دوران میں فیصلہ کیا کہ بھگوان داس سے مل لوں۔ اس کی حویلی دیکھی ہوئی تھی اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ہی میں دفتری موٹر سائیکل لے کر چل پڑا۔ بھگوان داس کی حویلی پہاڑی دھیرج میں تھی۔ اس نے پہلے ایک بار مجھے چوٹ دی تھی اس لیے میں اس کی طرف سے تپا ہوا تھا۔ اس بار میں اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل اس کی حویلی کے پھاٹک پر [illegible]ی۔ حویلی کا پھاٹک بند تھا اور وہاں از قسم چوکیدار [illegible]ی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سلاخوں دار پھاٹک [illegible] اندر جھانکا۔ پھاٹک کی دائیں جانب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی [illegible]وئی تھی جس کے سامنے ایک کھُرّی چارپائی پڑی تھی مگر [illegible]ئی نہ تھی۔ چند لمحے بعد ہی میں نے کسی کے کھانسنے کی آواز [illegible]ی۔ گویا وہاں کوئی نہ کوئی موجود ضرور تھا۔ میں نے ہانک [illegible] "ارے کوئی ہے؟"

جواب میں کھانسی کی آواز پھر آئی۔ اس کے بعد قدموں کی [illegible] سنائی دی، پھر کچھ دیر بعد ہی ایک بوڑھا سر پہ بڑا سا پگڑ [illegible]ھے، پھاٹک کی طرف آتا دکھائی دیا۔

بوڑھے نے پھاٹک کھولا اور میں نے موٹر سائیکل ایک طرف [illegible] کر دی۔

"کا بات ہے بابو؟" بوڑھے نے سوال کیا۔

"مجھے بھگوان داس جی سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اُو تو دو روج سے ناہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"کھُد ہمیں بھی ناہیں مالوم بابو کہ اُو کدھر گئے رہے۔"

"کیا تمھارے علاوہ کوٹھی میں اور کوئی نہیں؟"

"ناہیں۔"

"کیا ان کے بیوی بچے نہیں؟"

بوڑھا عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔ "تم شاید سیٹھ کو [illegible] ناہیں۔ سادی ای ناہیں کی تو بیوی کیسی اور بچے کیسے!"

"ہوں۔" میں نے ایک طویل سانس لیا، پھر بولا "تمھارے [illegible] حویلی میں اور بھی تو ملازم ہوں گے؟"

"ہاں بابو! تین اور رہئیں پر دِنکو پرسوں سیٹھ جی چھٹی دے [illegible]یے رہے۔ اب میں ہی...."

"تمھیں کچھ بتا کر نہیں گئے وہ کہ کہاں جا رہے ہیں اور کب [illegible]گے؟"

"ہم ان کے ملاجم رہے بابو کہ اُو ہمار!"

اب وہاں مزید وقت ضائع کرنا فضول ہی تھا اس لیے میں [illegible] دفتر واپسی کا فیصلہ کیا۔ دفتر کی طرف لوٹتے ہوئے میرا ذہن [illegible]ہوا تھا۔ بھگوان داس کا روپوش ہو جانا کوئی سوچا سمجھا [illegible] معلوم ہوتا تھا ورنہ وہ دو روز قبل خود اپنے ملازمین کو چھٹی [illegible]۔ وہ کیوں روپوش ہو گیا تھا، یہ بات بہر حال الجھا دینے والی [illegible] دفتر کی طرف لوٹتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ سیٹھ وشواناتھ [illegible] لیا جائے۔ اس سے بھی تو بھگوان داس کے بارے میں پوچھا جاسکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے موٹر سائیکل کا رُخ موڑ دیا۔

جب میں سیٹھ وشواناتھ کی کوٹھی میں داخل ہوا تو وہ اپنی بگھی میں بیٹھ کر کہیں جا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر حیرت نظر آنے لگی۔ میری آمد یقیناً اس کے لیے خلاف توقع ہی رہی ہوگی۔

"آپ... آپ اس وقت انسپکٹر صاحب! کہیے کیا حکم ہے؟" وہ بگھی سے اترتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت ذرا ایک ضروری کام سے جا رہا تھا مگر ظاہر ہے کہ آپ بھی کسی ضروری کام ہی سے آئے ہوں گے۔ آئیے اندر چلیں۔"

میں موٹر سائیکل کھڑی کر کے اس کے پیچھے چل دیا۔

نشست گاہ میں پہنچتے ہی وہ بولا "کیا مجرم پکڑے گئے انسپکٹر؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر اب وہ زیادہ دن آزاد نہیں رہ سکیں گے۔"

"کاغذات کے سلسلے میں تو آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا!"

"جی ہاں۔" میں بولا۔ "اس وقت میں آپ سے کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے آیا تھا۔ تفتیش کے دوران میں ایک شخص کا نام سامنے آیا ہے۔ میں اس کے بارے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما دی۔ "کیا آپ بھگوان داس نامی کسی شخص سے واقف ہیں؟"

میں نے سیٹھ وشواناتھ کو واضح طور پر چونکتے دیکھا۔ اس کے چہرے سے بدحواسی کا اظہار ہونے لگا تھا مگر چند لمحے بعد ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور بولا "ہاں میں اسے جانتا ہوں۔ کسی زمانے میں میری اور اس کی شراکت تھی لیکن یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ یہ بتائیں کہ اس معاملے میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال آپ اس کے بارے میں جو بھی جانتے ہوں بتا دیں تاکہ تفتیش میں آسانی ہو۔" میں نے کہا۔

میرا جواب سن کر سیٹھ کا چہرہ بجھ سا گیا۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولا "بھگوان داس، لالچی، بددیانت اور کمینہ خصلت شخص ہے اسی لیے میری اور اس کی زیادہ دن نہیں نبھ سکی۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ میں اسے قطعی پسند نہیں کرتا۔ طویل عرصہ گزرا کہ میری اور اس کی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔"

"کیا ان کاغذات سے بھگوان داس کو بھی کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جو آپ کو چاہئیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

اس بار سیٹھ پھر چونک اٹھا۔ "وہ... اسے... اسے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے! مگر نہیں.... شاید وہ اس طرح مجھے چوٹ پہنچانے کے لیے ان کاغذات میں دلچسپی لے رہا ہو۔"

"تو گویا آپ کے اور اس کے درمیان رنجش ہے؟"

"میں تو اس جیسے گھٹیا شخص سے دشمنی رکھنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہوں مگر بہرحال میرے اور اس کے تعلقات بہتر نہیں ہیں۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے اعتراف کیا۔

"اچھا اب میں چلوں گا۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

سیٹھ وشوا ناتھ بھی صوفے سے اٹھا۔ اس کے چہرے سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ معاً وہ بولا "آپ کدھر جائیں گے؟"

"اپنے دفتر۔" میں نے جواب دیا۔

"سروج کو ذرا کشمیری گیٹ جانا تھا مگر بگھی میں لے جا رہا ہوں۔ مجھے چاندنی چوک جانا ہے۔ اگر آپ خیال نہ کریں تو اسے وہاں چھوڑ دیجیے گا۔" سیٹھ کے لہجے میں درخواست تھی۔

سروج کا ذکر آتے ہی میری آنکھوں میں اس کا سراپا گھوم گیا، خوشبو میں مہکتا ہوا بدن! "ضرور، ضرور!" میں جلدی سے بولا۔ "میں انھیں کشمیری گیٹ پر اتار دوں گا۔"

"پھر میں ابھی آیا، آپ باہر چلیے۔" سیٹھ وشوا ناتھ یہ کہہ کر اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا اور میں نے بیرونی دروازے کا رُخ کیا۔

باہر پہنچ کر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سیٹھ وشوا ناتھ اپنی حسین و نوجوان بیٹی سروج کے ہمراہ اندر سے آتا دکھائی دیا۔ میری نگاہ سروج پر جم کر رہ گئی۔ وہ اس وقت بڑی "آفت" نظر آ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ ملتے ہی اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"نمستے انسپکٹر جی!" اس نے قریب آ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"آداب!" میں نے بھی جواب دیا۔

"اچھا بھئی سروج! ہم چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر سیٹھ وشوا ناتھ بگھی میں بیٹھ گیا۔

میں نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، پھر اس پر سوار ہو کر سروج کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد ہی مجھے اپنی پشت پر ایک لذت انگیز سی گرمی کا دباؤ محسوس ہوا۔ سروج کا جسمانی لمس مجھے شدت سے محسوس ہوا اور پھر جب اس نے پیچھے سے میری کمر میں ہاتھ ڈالا تو بس میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے لگا۔ موٹر سائیکل چلتے ہی کسی شرابی کی طرح لہرائی۔

"ہائے رام! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ سنبھالیے نہ موٹر سائیکل!"

سروج میری پشت پر مزید چپکتے ہوئے کنگنائی مگر اس کی آواز میں خوف نہیں تھا۔

میں نے موٹر سائیکل سنبھال لی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ موٹر سائیکل حویلی سے نکل کر سڑک پر آ چکی تھ

"جب آپ پتاجی سے باتیں کر رہے تھے تو مجھے پتا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی ایک جھلک دیکھ کمرے کی طرف آئی تھی جہاں آپ بیٹھے تھے۔" سروج نے

"مگر میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔" میں بولا۔

"میں نے آپ کو چھپ کر دیکھا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میرا من چاہ رہا تھا۔"

"آپ کمرے میں بھی تو آ سکتی تھیں۔"

"پتاجی جب کسی مہمان سے ملتے ہیں تو وہاں کسی کا پسند نہیں کرتے۔" اس نے بتایا، پھر چند لمحے توقف کر بولی۔ "یہ آپ لوگ بھگوان داس جی کی کیا بات کر رہے تھ

"بس تھی ایک بات۔" میں نے اس ذکر کو ٹال جانا

"بتلائیے نا!" وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

"ہر بات بتلانے کی نہیں ہوتی۔" میں بولا۔

"آپ کو میری قسم!" اس نے میری کمر کو مزید اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ایک ادا سے کہا۔ انداز قربان ہو تھا۔ "یہ بتائیے تاکہ آپ کو بھگوان داس جی کے بارے میں کر ہوا تھا جس کے متعلق آپ نے پتاجی کو بھی پوچھنے پر کچھ نہیں

"آپ یہ باتیں نہیں سمجھ سکیں گی۔" میں نے کہا۔ میں نے ٹالنا چاہا ورنہ از اوّل تا آخر اسے سب کچھ بتانا پڑتا لیکن اور مجھے اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ میں نے مختصراً تمام حالات سے آگاہ کیا کہ کس طرح کچھ لوگ اس کے بلیک میل کر رہے ہیں، پھر یہ بتایا کہ کس طرح مجھے وہ خط ملا مجرموں نے بھگوان داس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے سروج کو بھی بتا دی جو اس کے باپ کو نہیں بتائی تھی۔ وہ پوری تو ساری بات سنتی رہی۔ تمام باتیں بتانے کے باوجود میں کو چند باتوں سے بے خبر رکھا تھا۔ ایک تو یہ کہ اس کے با مجھے ان کاغذات کو حاصل کرنے کے سلسلے میں کچھ رقم بھی اور آئندہ مزید رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دوسرے یہ نے جس خط میں بھگوان داس سے ان کاغذات کا سودا کے بارے میں لکھا تھا، اس خط کے اندراج کیا گیا لکھا تھا نہیں چاہتا تھا، یہ بات کسی طرح سیٹھ تک پہنچے کہ مجھے تمام علم ہو چکا ہے۔ میں نے آخر میں سروج سے کہا کہ وہ ان با سیٹھ سے نہ کرے۔

"بالکل نہیں!" سروج نے مجھے یقین دلایا اور مجھ یقین آ گیا۔

سروج کو کشمیری گیٹ اتار کر میں اپنے دفتر کی طر جو اسی محلے کے اختتام پر تھا۔

دفتر پہنچے ہوئے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرے دوں ماتحت کمار اور کمال آ گئے۔ میں نے ان سے رپورٹ ب کی۔

رپورٹ کے مطابق پاروتی کا اس معاملے سے کوئی تعلق ں تھا۔ مجرموں میں سے ایک نے پڑوسی ہونے کے ناتے پاروتی کہا تھا کہ ایک شخص سرخ تھیلا دے جائے گا، وہ اسے رکھ لے ۔۔ لوگ اس وقت گھر پر نہیں ہوں گے۔ پاروتی نے یلا اس شخص سے لے کر رکھ لیا تھا اور پھر جب مجرم آئے تو انھیں دے دیا تھا۔

اس مکان کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ ایک مشہور ے بشیرے کی ملکیت تھا۔ پہلے بشیرے خود وہاں رہتا یکن محلے والوں نے بہت عرصہ قبل ہی اسے وہ مکان چھوڑ یں۔۔ رہائش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجرموں کے نے سے قبل وہ مکان خالی ہی پڑا تھا۔ کچھ دن ہی سے ۔۔ وہاں دیکھا جاتا رہا تھا۔ مجرموں نے محلے والوں کو بتایا ۔ انھوں نے وہ مکان بشیرے سے کرائے پر لے لیا ہے۔ بظاہر ۔ ن کے عادات و اطوار شریفوں جیسے تھے اس لیے محلے الوں نے ان کی رہائش پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس مکان کی تلاشی سے کچھ برآمد نہ ہو سکا تھا۔ مکان خالی پڑا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مجرم مکان چھوڑ چکے تھے۔ بشیرے کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اب ی روڈ پر کہیں رہتا تھا، کہاں، یہ کسی کو علم نہیں تھا۔

"سر! بشیرے کا پتا لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ وہ ایک شخص ہے اور پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ ضرور ہوگا۔" پنی بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "جی، بی روڈ کے تھانے س کی موجودہ رہائش گاہ کا پتا بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔"

"اتنی بات میں بھی جانتا ہوں، زیادہ عقلمند بننے کی نش نہ کیا کرو!" میں نے کمار کو ڈانٹ پلا دی، پھر حکم "اب تم فوراً چند معلومات حاصل کرنے روانہ ہو جاؤ!" ۔ کر میں نے گرودوارے اور یتیم خانے کے بارے میں بتایا۔ "تمھیں پتا چلانا ہے کہ واقعی یتیم خانے اور گرودوارے کے درمیان اس قسم کا کوئی جھگڑا چل رہا ہے یا نہیں! ر کا وقت ختم ہونے سے پہلے تمھیں یہ معلومات حاصل کے لوٹ آنا ہے، سمجھے!"

کمار میرے حکم پر فوراً روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ گیا ہی تھا ن علاوہ نئے چہروں نے میرے کمرے میں اینٹری دی۔

میں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ انھیں میں نے پہلے اپنے سابق باس دلاور خاں کے ساتھ دیکھا تھا۔

"ہمیں ڈی آئی جی صاحب نے بھیجا ہے سر!" ان میں سے ایک نے بقیہ کی نمائندگی کی۔

"گویا تم لوگ میرے نئے ماتحت ہو!" میں نے گردن اکڑا کر کہا۔

"یس سر!"

میں نے ان میں سے ۔۔ کو سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی پر مامور کر دیا اور ایک کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ بھگوان ۔۔ بارے میں پتا چلائے۔ سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی رات دن ہونا تھی اور ان دونوں کو باری باری یہ کام انجام دینا تھا۔ ان دونوں سے تازہ ترین اطلاعات حاصل کرنے کی ذمے داری میں نے کمال کے سپرد کی تھی۔

مجرموں تک پہنچنے کے لیے اب ایک کی بجائے دو ذریعے پیدا ہو گئے تھے، انوری بائی اور بشیرے! بشیرے نے انھیں اپنا مکان کرائے پر دیا تھا اور وہ خود بھی جرائم پیشہ تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجرموں اور اس کے درمیان رابطہ رہا ہے۔ دوسرا ذریعہ انوری بائی تھی۔ سیٹھ وشوا ناتھ کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ زیورات کا تھیلا انوری بائی کو پہنچائے، اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ مجرموں میں سے کوئی انوری بائی سے راہ و رسم رکھتا تھا۔

موجودہ صورت حال میں انوری بائی سے میرا ملنا ناگزیر تھا۔ خود تیواڑی جی نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ بشیرے بھی جی، بی روڈ پر رہتا تھا، جی، بی روڈ پہنچ کر اس سے ملنے کی سبیل بھی ہو سکتی تھی۔ تمام باتوں پر غور کرتے ہوئے میں نے اسی رات جی، بی روڈ جانے کا فیصلہ کیا۔

کمار دفتری اوقات ختم ہونے سے پہلے ہی ضروری معلومات حاصل کر کے لوٹ آیا مگر اس نے جو کچھ بتایا، وہ سن کر میں الجھن کا شکار ہو گیا۔ گرودوارے اور یتیم خانے کے درمیان واقعی جھگڑا چل رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیٹھ وشوا ناتھ نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، وہ غلط نہیں تھی۔ میرا اور تیواڑی جی کا بھی یہی خیال تھا کہ سیٹھ نے مجھے بیوقوف بنایا ہے۔ اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ اس یتیم خانے کا صدر سیٹھ وشوا ناتھ ہی تھا۔

میں نے فوری طور پر تیواڑی جی کو اس بات سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا کہ سیٹھ نے مجھے جو کہانی سنائی تھی، وہ سچ تھی۔ میں دفتری اوقات ختم ہوتے ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ موٹر سائیکل میں نے ساتھ لے لی تھی تاکہ رات کو جی، بی روڈ

جانے اور آنے میں دقت نہ ہو اور خواہ مخواہ میرا کرایہ بھی دفتری مد میں خرچ نہ ہو۔

رات کا کھانا کھا کر میں گھر سے روانہ ہو گیا۔ جس وقت میں جی، بی روڈ پہنچا تو وہاں کی رونق شباب پر تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی میرا ٹکراؤ چچا چھٹو خاں سے نہ ہو اور میری دعا قبول ہوئی۔

میں نے موٹر سائیکل، انوری بائی کے کوٹھے کے نیچے کھڑی کی اور دھڑکتے دل سے کوٹھے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا کیونکہ اس سے پہلے میں کسی طوائف کے کوٹھے پر نہیں چڑھا تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور میری سماعت سے طبلے کی تھاپ کے ساتھ گھنگھروؤں کی چھنا چھن بھی ٹکرا رہی تھی۔ جب میں نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا تو ایک سریلی آواز بھی سنی سے

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

دائیں جانب دروازہ تھا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں چار پانچ افراد گاؤ تکیے لگائے بیٹھے تھے اور ان کے درمیان ایک "شعلہ"، رقصاں تھا۔ سرخ کپڑوں میں ملبوس وہ رقص کرتی ہوئی لڑکی ایک شعلہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک جانب طبلے والا اور سارنگی والا بیٹھا تھا جن کے ساتھ ایک بوڑھا سا پتلا دبلا شخص ہارمونیم بجا رہا تھا۔ سازندوں کے قریب ہی ایک فربہ سی عورت کلے میں پان دبائے بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھی۔ میں بھی ایک جانب جوتے اتار کر بیٹھ گیا۔

"شعلہ"، رقص کرتا ہوا میرے سامنے سے گزرا۔ میں نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس شعلے کا نام انوری بائی ہوگا مگر بعد میں یہ بات غلط ثابت ہوئی۔

وہ غزل ختم ہوئی تو میرے علاوہ وہاں موجود تمام ہی افراد نے اپنی اپنی جیبوں سے نوٹ نکالے۔ رقاصہ بڑے انداز میں چلتی ہوئی ان سب کے پاس گئی اور نوٹ بٹور کر فربہ عورت کو دے دیے، پھر سازندوں کے قریب جا بیٹھی۔ تماشبینوں میں سے دو اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہاں مجھ سمیت صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رقاصہ کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ رقاصہ نے، فربہ عورت کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے فرمائیے حضور!"، فربہ عورت میری طرف دیکھتی ہوئی بولی "آپ نرگس سے کیا چاہتے ہیں۔ کیا ... کو قیام کا ارادہ ہے ؟"

"مجھے ان سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" میں نے ...

"میاں صاحبزادے! ایسی ضروری باتوں کا ... گئے شروع ہوتا ہے۔ فی الحال گانا سنو اور سننے دو ..." قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک شیروانی پوش بزرگ نے ... جن کے چہرے پر کھچڑی داڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔

مجھے اس شخص کی مداخلت پر غصہ آ گیا اور ...

"قبلہ آپ سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہیں۔"

"سرکاری کام!" شیروانی پوش حیرت سے ... اس کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔

"جی ہاں سرکاری کام!" میں زور دے کر بو... انوری بائی سے کچھ معلومات کرنا ہیں۔ سمجھے آپ!" ... ہوئے میں نے رقاصہ کی طرف انگلی اٹھائی اور گرد... کر کہا "میرا تعلق خفیہ سے ہے۔"

"خفیہ پولیس، یعنی سی آئی ڈی!" شیروانی پو... حیرت سے بولا اور پھر فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ... "آپ .... آپ معلومات کریں۔ معاف کیجیے گا ... کریں .... میں سمجھا تھا کہ آپ شب باشی کی بات کرنا ... ہیں۔ پھر معافی چاہتا ہوں، خدا حافظ!" یہ کہتے ہی ... پوش اس طرح دروازے کی طرف لپکا جیسے موت ... میں ہو۔

وہاں موجود دوسرے شخص نے بھی فوری ط... شیروانی پوش کی تقلید کی تھی۔ وہ بھی کھسک لیا تھا۔

"سرکار! یہ میرے دھندے کا وقت تھا۔ اگر ... کچھ معلومات کرنا ہی تھیں تو محفل جمنے سے پہلے ہی ... لے آتے۔" فربہ عورت عاجزانہ لہجے میں بولی۔

"ہم تمہارے پابند ہیں کیا؟ جب چاہیں آئیں ... چاہیں نہ آئیں!" میں نے بدستور سخت لہجے میں ... دراصل شیروانی پوش کے خوفزدہ ہو جانے سے ... اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔

"فرمائیے کیا حکم ہے؟" فربہ عورت بولی "... انوری بائی کہتے ہیں، مگر ٹھہریں!" یہ کہہ کر وہ نوجوا... سے مخاطب ہوئی "نرگس! تم اندر جاؤ!" پھر اس ... کو بھی فوراً ہی وہاں سے ہٹا دیا۔

نرگس اور سازندے اندرونی کمرے کی طر...

... تو فربہ عورت، یعنی انوری بائی میرے قریب آ بیٹھی۔

"اب فرمائیے!" انوری بائی نے کہا۔ اس کے چہرے ... کسی قدر ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ وہ ... ڈری ڈری سی بھی لگ رہی تھی۔

"تم سیٹھ وشوا ناتھ کو جانتی ہو انوری بائی؟" میں نے ... سوال کیا۔

"جی نہیں سرکار! میں اس نام کے کسی سیٹھ سے واقف ... نہیں ہوں۔" انوری بائی نے بے جھجک جواب دیا اور میں اس ... جھوٹ بولنے پر حیران رہ گیا۔ اسے یہ خوف بھی نہیں تھا کہ وہ ... ایک انسپکٹر سے جھوٹ بول رہی ہے۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" میں نے سختی سے کہا "میں نے ... اسے تمہارے کوٹھے پر چڑھتے دیکھا تھا۔"

"یقین کریں سرکار! میں سچ بول رہی ہوں۔" انوری بائی ... لجاجت سے بولی۔

"کل تمہیں جو شخص ایک سرخ تھیلا دے گیا تھا، کیا تم ... اسے نہیں جانتیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ... ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ ... تو وہ ... سیٹھ تھا .... مگر .. مگر میں اس کے نام ... سے واقف نہیں تھی .... مجھے .... مجھ سے تو بشیرے ... نے صرف ... وہ ... وہ کچھ نہیں .... کچھ بھی نہیں کہا۔" انوری بائی ... گڑبڑا سی گئی اور بدحواس نظر آنے لگی۔

اس کی زبان سے بشیرے کا نام سن کر میں چونک پڑا۔ "... کیا کہا تھا تم سے بشیرے نے؟ جواب دو!" میں سختی سے ... بولا۔

"وہ ... وہ سرکار! کچھ بھی نہیں ... میں ... میری ... زبان سے یوں ہی بشیرے کا نام نکل گیا تھا۔" وہ ہکلاتی ... ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ واضح طور پر پریشان نظر ... آنے لگی تھی۔

"دیکھو انوری بائی! اگر تم نے سب کچھ سچ سچ نہ بتا دیا تو ... تمہارے حق میں بہت برا ہوگا۔ بتاؤ بشیرے نے تم سے کیا ... کہا تھا؟"

"میں تجھے بتاتا ہوں چٹی کہ میں نے اس سے کیا کہا تھا!" ... پھنکارتی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا اور میرا دم ... خشک ہو گیا۔ دروازے سے ایک لمبا تڑنگا شخص اندر آ رہا ... تھا اور اس کے تیور بہت خطرناک دکھائی دیتے تھے۔

"بشیرے!" انوری بائی تقریباً چیخ پڑی "خدا کے لیے یہاں .... یہاں ہنگامہ کر کے میرا دھندا خراب نہ کر! میں نے .. اس سے کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بشیرے دانت پیستا ہوا بولا "میں دروازے کے باہر کھڑا تیری اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو نظر آنے لگا۔

میں نے کڑر کڑر کی دہشتناک آواز سنی۔ بشیرے نے گراری دار چاقو کھول لیا تھا۔

"ہاں بھئی چٹی!" بشیرے مضحکہ اڑانے والے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "اب بتا تجھے کیا معلوم کرنا ہے اور تو کون ہے؟" یہ کہتا ہوا بشیرے، چاقو لہراتا میری طرف بڑھا۔

مارے دہشت کے میرا پیشاب خطا ہونے لگا۔ میرا حلق خشک ہو گیا اور میں بمشکل اتنا کہہ سکا "پیارے بھائی! میں تو بس یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ مجھے ... مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں کرنا۔ سچی بھئی!"

اب بشیرے میرے قریب آ کر رک چکا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چوڑے پھل کا کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔ پھر معاً اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا اور میری گھگھی بندھ گئی۔

"چٹی! جھوٹ بولے گا مجھ سے!" اس نے میری آنکھوں کے سامنے چاقو لہرایا "ابھی میں تیری آنتیں باہر کر دوں گا۔"

"خدا کے لیے پیارے بھائی مجھے معاف کر دو!" میں گھگھیایا۔

"تو پھر بتا کہ تو سیٹھ وشوا ناتھ کو کیسے جانتا ہے؟" بشیرے نے میرے گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا اور اپنی خونخوار سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔



اگر میں سچ مچ کا ہیرو ہوتا یعنی کہانیوں والا ان بریک ایبل ہیرو تو ایسی کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ پھر تو میں بڑے اطمینان سے جھٹکا مار کر اپنا گریبان چھڑا لیتا اور بشیرے کے ہاتھ سے گراری دار چاقو چھین کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتا جیسا کہ عموماً ایسے مواقع پر ہیرو کرتے ہیں مگر حیف بلکہ صد حیف میں کمزور دبلے بس اللہ دتا تھا اور بزدل۔ میں نے اسی لیے بشیرے کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"آنکھیں کھول چٹّی!" بشیرے غرّایا۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور عاجزانہ لہجے میں بمشکل کہا۔

"جی پیارے بھائی!"

"پیارے بھائی کے بچے! میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا!" وہ دانت پیس کر بولا۔

"کیا پیارے بھائی؟" میں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جان کر انجان بن گیا۔

"پھر دہراؤں!" اس نے میرے گریبان کو جھٹکا دیا۔ "میں نے تجھ سے یہ پوچھا تھا کہ تو سیٹھ وشوا ناتھ کو کیسے جانتا ہے؟ اب میں اپنا سوال نہیں دہراؤں گا' سمجھا!"

"سمجھ گیا پیارے بھائی!" میں نے مُردہ سی آواز میں کہا۔ مجھے اس وقت تیواڑی جی یعنی اپنے ڈی آئی جی کی وہ نصیحت یاد آ رہی تھی کہ کسی کو اپنی سرکاری حیثیت کے بارے میں نہ بتایا جائے لیکن یہ حماقت مجھ سے پہلے ہی سرزد ہو چکی تھی۔ میں نے تماشبینوں پر رعب جھاڑنے کے لیے اپنی حیثیت کا اظہار کر دیا تھا پھر اب اسے چھپانے سے کیا حاصل تھا یوں بھی جب سامنے کھلا ہوا چاقو ہو تو ساری نصیحتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ بشیرے کو سب کچھ بتا ہی دینا چاہیے' تیواڑی جی کو بھلا اس کا کیا پتا چلے گا۔

"ابے تو پھر چپ ہو گیا!" بشیرے نے مجھے خاموش دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

"بتاتا ہوں بتاتا ہوں پیارے بھائی!" میں جلدی سے بولا۔ "دراصل میرا گلا گھٹ رہا ہے اس لیے مجھ سے بولا نہیں جا رہا۔" اور یہ حقیقت بھی تھی۔ بشیرے نے اتنی زور سے میرا گریبان پکڑا ہوا تھا کہ گردن پر بھی اس کے ہاتھ کا دباؤ پڑ رہا تھا۔

"اچھا اب بول!" اس نے گریبان پر اپنی گرفت قدرے ڈھیلی کر دی۔

"دراصل بات یہ ہے پیارے بھائی کہ پچھلے دنوں سیٹھ وشوا ناتھ کے کچھ قیمتی زیورات چوری ہو گئے تھے اور انہی زیورات....."

"مجھے معلوم ہے آگے بول!" بشیرے نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"تو ان زیورات کی چوری کا کیس اب میرے پاس ہے۔" میں نے بات تفتیش کر رہا ہوں۔"

"تو وہ چوری کا کیس تیرے پاس ہے؟" بشیرے نے عجب میں پوچھا۔

"ہوں۔" میں نے جلدی سے ہنکارا بھرا۔

"اور تو اسی وجہ سے سیٹھ وشوا ناتھ کو جانتا ہے؟" بشیرے سوالیہ تھا۔

"ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا تعلق پولیس سے ہے؟"

"نہیں' میں سی آئی ڈی میں ہوں۔" میں نے تصحیح کی۔

"اچھا تو تیرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے؟" نہ جانے بشیرے نے دوبارہ مجھ سے کیوں اس بات کی تصدیق چاہی۔

"ہوں۔" میں دوبارہ ہنکارے بھرنے لگا۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے؟"

"ہوں۔" میں سوال کو پوری طرح سنے اور سمجھے بغیر ہنکارا۔ اس سے پہلے کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا' بشیرے نے میرا دیا۔ میں یہ سمجھا' شاید وہ اس یقین کے بعد کہ میرا تعلق سی آئی ڈی مجھ سے مرعوب ہو گیا ہے مگر میری غلط فہمی فوراً ہی دور ہو گئی' اور میں نے اس کی غراہٹ سنی!

"تجھ جیسے چوہے اور سی آئی ڈی میں!" بشیرے نے غرّا نے مجھے بھی ان میں سے سمجھ لیا جو تیری یہ بڑھکیں سن کر میاں سے تھے۔"

ادھر اس کا فقرہ ختم ہوا اُدھر مجھے تارے نظر آ گئے۔ اس کا قوت سے میرے منہ پر پڑا تھا' میں لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش جسمانی توازن کھو بیٹھا تھا۔ پھر ایک زوردار آواز ہوئی اور میری چیخ نکل گئی۔ لمحے بھر کو میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگا ناچیں' پھر ذہن پر کچھ دیر کے لیے تاریکی سی چھا گئی۔ یہ مجھے بعد ہوا تھا کہ میرا سر پیچھے رکھے ہوئے طبلے کے کنارے سے ٹکرا

"شاید بیہوش ہو گیا۔" میں نے بشیرے کی آواز سنی اور ایک نئی راہ سوجھ گئی۔

"مگر کمبخت نے میرے طبلے کے بائیں کا ناس مار دیا ہے چھوڑ کرا" انوری بائی کی غصیلی آواز سنائی دی' پھر وہ بشیرے سے مخاطب ہوئی۔ "بشیرے! خدا کے لیے اس مصیبت کو یہاں سے جا یا پھر تو یہاں سے ٹل جا! میں اسے سازندوں سے اٹھوا کر کمرے میں ڈلوائے دیتی ہوں۔ جب یہ ہوش میں آ جائے گا تو بھگا دوں گی۔"

"دراصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ہے کون!" بشیرے کی آواز آئی۔

انوری بائی اپنا جملہ پورا نہ کر پائی تھی کہ بشیرے زور سے ہنس پڑا' بولا۔ "تو اس پر یہ ...ہوئی کرتی ہے انوری بائی کہ تجھے مَردوں کی پہچان ... اس نے یقیناً تجھے دھونس دینے کے لیے جھوٹ بولا ہوگا۔"

"لیکن بشیرے! یہ چکر کیا ہے؟ اس تھیلے میں کیا تھا جو وہ سیٹھ مجھے ... دے گیا تھا؟"

"یقین جان انوری بائی! یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!"

بشیرے کا جواب سن کر میں حیران رہ گیا۔ اسی وقت کمبخت ایک ... نہ جانے کدھر سے آ کر میری ناک کے پاس بھن بھن کرنے لگی اور ... کھجلی محسوس ہونے لگی۔ اگر میں اس وقت ناک کھجانے لگتا تو بیہوشی کا راز فاش ہو جاتا اور پھر مجھے دوبارہ بشیرے کے ظلم کا نشانہ بننا پڑتا۔ میں اسی لیے دَم سادھے پڑا رہا اور دل ہی دل میں اس نابکار مکھی کی سات پشتوں کو بُرا بھلا کہتا رہا۔

"اور وہ آدمی کون تھا جو مجھ سے تھیلا لے گیا تھا؟" انوری بائی بشیرے سے پوچھ رہی تھی۔

"وہ تو خیر میرا ہی ایک جاننے والا تھا۔"

"پھر تو اس آدمی کو ضرور معلوم ہوگا کہ تھیلے میں کیا تھا۔ تُو نے اس سے کیا پوچھا؟"

"اس کا کام تو صرف اتنا تھا کہ تجھ سے تھیلا لے کر ایک جگہ پہنچا دے جس طرح تیرا کام صرف یہ تھا کہ تو سیٹھ سے وہ تھیلا لے کر رکھ لے جب میرا آدمی تجھے بتائے کہ میں نے اسے بھیجا ہے تو' تو اُسے دے دے۔ خیر تو اپنا بوڑھا دماغ نہ تھکا اس معاملے میں!"

"مگر اس کمبخت کا کیا ہوگا جو یہاں لمبا لمبا لیٹا ہے؟" انوری بائی نے اس وقت یقیناً میری ہی طرف اشارہ کیا ہوگا۔

"اگر یہ بیہوش نہ ہو جاتا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو جاتی۔"

"کیسا اندازہ؟" انوری بائی بولی۔

"میرا اندازہ ہے کہ اسے اسی سیٹھ نے بھیجا ہوگا جو تجھے یہاں آ کر دے گیا ہے۔" بشیرے نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "خیر اب ایسا ہی کر اسے اندر والے کمرے میں ڈلوا دے جب اسے ہوش آ جائے تو بھگا دینا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ ادھر کا رُخ نہیں کرے گا۔"

انوری بائی اسی وقت سازندوں کے نام لے لے کر انہیں پکارنے لگی جو اندر کے کمرے میں تھے۔

"اچھا میں چلا۔" بشیرے کی آواز آئی' پھر قدموں کی چاپ ... دور ہوتی گئی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بلا ٹلی۔ فطری بزدلی کے سبب میں نے جو مصنوعی بیہوشی طاری کر لی تھی اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا تھا ورنہ مجھ پر نہ جانے کیا گزرتی۔ اس ...

بات معلوم کرنے آیا تھا وہ مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ بشیرے اور انوری بائی میں جو باتیں ہوئی تھیں' ان سے سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ ان دونوں ہی کو مجرموں نے اپنا آلۂ کار بنایا تھا۔ انوری بائی کا تو مجرموں سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں معلوم ہو رہا تھا مگر بشیرے کا اُن سے تعلق ضرور تھا۔ بشیرے ہی نے انوری بائی کو آمادہ کیا تھا کہ وہ سیٹھ وشوا ناتھ سے تھیلا لے کر رکھ لے' پھر جب بشیرے کا آدمی اس سے تھیلا لینے آئے تو وہ اُسے تھیلا دے دے۔ مجرموں کے لیے اس درمیانی آدمی کا بندوبست بھی بشیرے ہی نے کیا تھا جس کا کام صرف اتنا تھا کہ انوری بائی سے تھیلا لے کر پاروتی تک پہنچا دے۔ پھر پاروتی سے وہ تھیلا مجرموں نے حاصل کر لیا تھا۔ اتنا لمبا چکر چلانے کا مقصد یہی رہا ہوگا کہ مجرم پردے میں رہیں اور وہ اس کوشش میں کامیاب رہے تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ میں پاروتی تک جا پہنچا تھا مگر مجرم پھر بھی جُل دے کر نکل گئے تھے۔ انھوں نے بشیرے کو بھی یہ ہوا نہ لگنے دی تھی کہ اس تھیلے میں قیمتی زیورات اور روپے تھے۔ غالباً وہ اس سلسلے میں بشیرے پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہتے تھے ورنہ بشیرے کے علم میں ضرور ہوتا کہ تھیلے میں کیا تھا۔ میں نے سوچا میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے نتائج اخذ کر رہا تھا۔

میں اسی طرح آنکھیں بند کیے سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ معاً اچھل پڑا۔ نہ جانے کب انوری بائی کے سازندے اس کمرے میں آ گئے تھے اور مجھے ڈولی ڈنڈا کرنے کے لیے اٹھانے لگے تھے۔

"ارے یہ تو ہوش میں آ گیا!" کوئی حیرت سے بولا اور میری ٹانگ چھوڑ دی۔

مجھے اس شخص سے اتنی گستاخی کی اُمید نہیں تھی۔ ٹانگ فرش سے ٹکرائی اور میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب اٹھ بھی بیٹھو شہزادے!" انوری بائی کی طنز بھری آواز سنائی دی جو اپنے دونوں بھاری کولھوں پر ہاتھ دھرے میرے قریب ہی کھڑی ہوئی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت میرے سر کے پچھلے حصے میں چمک پیدا ہوئی۔ میں نے اس جگہ ہاتھ پھیرا تو چپچپاہٹ سی لگی۔

"خون!" میں خوفزدہ ہو کر بڑبڑایا اور اپنی انگلیوں پر لگے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔

"اب چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ میں اُسے پھر بلا لوں گی جس کے سامنے تم بھیگی بلی بن گئے تھے۔" انوری بائی نے دھمکی دی اور اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔

جاتو گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ میری بوکھلاہٹ دیکھ کر انوری بائی ہنس پڑی مگر میں نے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیر کی طرح دروازے سے نکل گیا۔

کیونکہ میری ٹوٹ پھوٹ کا ذمے دار میرا محکمہ ہی تھا اس لیے میں اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتا ہوا انوری بائی کے کوٹھے سے اتر آیا۔

کچھ فاصلے ہی پر سڑک کے کنارے میری سرکاری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے میں اس پر بیٹھا اور سامنے دیکھا کہ کہیں جھونک میں کسی سے ٹکرا نہ جاؤں کیونکہ اب اس بازار میں پہلے سے زیادہ ہجوم نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھی تو بس اٹھی کی اٹھی رہ گئی۔ اس وقت ایک کار میرے سامنے سے گزری تھی اور میری نگاہ اسی کی طرف اٹھی تھی۔ اس کار کو چلانے والا ایک ایسا شخص تھا جسے دیکھ کر میں اپنی ساری ٹوٹ پھوٹ بھول گیا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کار کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور اپنی موٹر سائیکل اس کے پیچھے ڈال دی۔ وہ کار کچھ دور جا کر بائیں جانب مڑ گئی اور پھر مڑتے ہی اس کی رفتار کم ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی موٹر سائیکل آہستہ کر لی۔

کچھ فاصلہ عبور کر کے وہ سڑک کے کنارے رک گئی اور اسی وقت میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ اس کار کی طرف بڑھنے والا چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ سنبھل اللہ دتا! آج کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

اس کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے والا انہی مجرموں میں سے ایک تھا جن کی مجھے تلاش تھی۔ یہ وہی تھا جو مجھ سے کشمیری گیٹ میں ٹکرا گیا تھا اور جس کی جیب سے وہ لفافہ گر گیا تھا جو سیٹھ وشوا ناتھ کو پہنچایا جانے والا تھا۔

کار سے میری موٹر سائیکل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے میں نے احتیاطاً اس طرف سے منہ پھیر لیا مگر کار وہاں چند لمحوں سے زیادہ نہیں رکی۔

ادھر کار اسٹارٹ ہوئی ادھر میں نے اپنی موٹر سائیکل بڑھائی۔ کار فراٹے بھرتی رہی اور میں اپنے سر کے پچھلے حصے میں اٹھنے والی ٹیسوں کو فراموش کرتا ہوا اس کے پیچھے لگا رہا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہو نہ ہو آج مجھ سے یقیناً کوئی کارنامہ سرزد ہو گا۔

مختلف راستوں سے گزر کر جب وہ کار بارہ ٹوٹی کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں ذرا حیران ہوا۔ میرے خیال کے مطابق اس کار کو پہاڑی دھیرج پہنچنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا اب وہ کار ایک دو منزلہ مکان کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ اس وقت میری [illegible] اس مندر کی عمارت کے پیچھے تھی جو اس دو منزلہ مکان کے قریب [illegible] میں نے کار کو رکتے دیکھ کر ہی موٹر سائیکل کے بریک لگائے [illegible] بھی پہاڑی دھیرج کی طرح ہندوؤں کا محلہ تھا۔ یہاں بس اکا دکا ہی مسلمانوں کے تھے۔

اس عمارت میں کار کھڑی کرنے کے لیے کوئی گیراج نہیں [illegible] لیے کار کو سڑک کے کنارے کھڑا کرنے کے بعد کار میں بیٹھے [illegible] افراد باہر آ گئے تھے۔ میں مندر کی آڑ لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے کار ڈرائیو کر کے وہاں تک پہنچنے [illegible] اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کنجی نکالی اور مکان کے درواز[ے پر] پڑا ہوا تالا کھولنے لگا۔ میں نے غور سے اس طرف دیکھا تو مجھے پہلی [بار] احساس ہوا کہ مکان کے دو دروازے تھے جو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ [دونوں] ہی پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ تالا چھوٹے دروازے کا کھولا گیا تھا۔ [یہ] بات وقتی طور پر میرے لیے الجھن کا سبب ضرور ثابت ہوئی مگر میری یہ الجھن ختم ہو گئی۔ میری الجھن اس وقت ختم ہوئی جب میں [نے] ان دونوں کو دروازہ کھول کر یکے بعد دیگرے اس میں داخل ہو[تے دیکھا]۔ وہ دونوں جس دروازے میں داخل ہوئے تھے وہ ایک زینہ تھا۔ مجھے سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ گویا وہ دروازہ اوپر تک پہنچنے کا دروازہ تھا اور جس بڑے دروازے میں اب بھی [تالا] نظر آ رہا تھا وہ نیچے کی منزل کا دروازہ تھا۔

جب وہ دونوں میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو میں [نے ماحول] کا جائزہ لیا۔ وہ مندر کی پشت تھی۔ میں نے موٹر سائیکل مندر کی [دیوار سے] لگا کر کھڑی کی اور آڑ سے نکل آیا کیونکہ اب دیکھ لیے جانے کا خطرہ [نہیں] تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اگر ان میں سے [کسی کی] نگاہ مجھ پر پڑ جاتی تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ یوں بھی اب مجھے [ان سے] کام نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ دونوں کون [ہیں] اور ان کے درمیان کیا سودے بازی ہو رہی ہے؟

یہ میری خوش قسمتی ہی تھی۔ وہ دونوں جلدی میں تھے کہ [ان سے] دروازہ اندر سے نہیں لگایا گیا تھا۔ دروازے کو صرف بھیڑ دیا گیا تھا اسی لیے وہ میرے ہاتھ کے دباؤ سے کچھ اندر ہو گیا تھا۔ باہر کی طرف کھلتا تھا مگر میں نے اس لیے اس پر ہاتھ رکھ کر دیکھا [تھا کہ معلوم] ہو جائے وہ اندر سے بند کیا گیا ہے یا کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

میرا دل اس وقت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا جب [میں احتیاط] کے ساتھ تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جا رہا تھا۔

میں نے دروازے میں داخل ہو کر اسے پھر بھیڑ دیا [اور احتیاط] کے ساتھ زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔

زینے کی آخری سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس اور ہاتھ پیر بھی [پھول] گئے۔ مگر میں جلد ہی اپنے تیز تیز سانسوں اور اپنی حالت پر قابو [پا] گیا ورنہ وہ دونوں ہی زینے میں میری موجودگی سے واقف ہو جاتے۔ [غالب]اً زینے کے فوراً بعد ہی کوئی کمرہ تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ [چنانچہ] میری سماعت سے ان کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

"مگر تم لوگوں کو یہ خیال تو کرنا ہی چاہیے کہ تم سب کو بمبئی سے [بلانے] والا میں ہی ہوں۔" ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

جواب میں دوسری آواز ابھری جو یقیناً اسی مجرم کی تھی جو جیپ ڈرائیو [کر کے] یہاں کار میں سوار ہوا تھا۔ "لیکن سیٹھ بھگوان داس! تم نے بھی تو ہمیں اندھیرے میں رکھا تھا۔ تم نے ہمیں ان کاغذات کی اہمیت سے کب آگاہ [کی]ا تھا۔"

"ان فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم لوگ مجھے وہ کاغذات [د]ے رہے ہو یا نہیں۔ تم لوگوں کی وجہ سے خواہ مخواہ مجھے بھی روپوش [ہو]نا پڑا ہے۔"

"وہ تو خیر تم سی آئی ڈی والوں کے خوف سے روپوش ہوئے..."

"بکواس نہ کرو۔ میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔"

"اور ہم لوگ بھی سودے میں کسی رعایت کے عادی نہیں ہیں۔ [اس کے] لیے بیس ہزار زیادہ نہیں تھے۔ سیٹھ وشوا ناتھ یقیناً اس سے زیادہ [د]ے سکتا ہے مگر ہم نے تم سے اس لیے رابطہ قائم کیا ہے کہ پہلے ہمارا معاملہ [تم]ہی سے طے ہوا تھا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ پندرہ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ اس سے [ز]یادہ میں ایک پیسا نہیں دوں گا۔"

بھگوان داس اور اس مجرم کے درمیان کاغذات کی سودے بازی [ہ]و رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اے کاش کسی طرح اس وقت مجرم کو پکڑ لوں۔ اگر یہ مجرم پکڑا گیا تو اس کے بقیہ ساتھیوں کو پکڑنا بھی مشکل نہیں ہو گا۔ کیا ہو، کیا نہ ہو؟ میرے ذہن میں چکر سا چلتا رہا اور پھر آخر کار مجھے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ میں پولیس کو یہاں بلا لاؤں اور اس مجرم کو پکڑوا دوں۔ میرے پاس خفیہ کا شناختی کارڈ موجود تھا ہی۔ پولیس والے میرے کہنے پر فوراً آ جائیں گے۔ اسی کے ساتھ مجھے ایک اور خیال آیا کہ ادھر میں پولیس کو بلانے گیا اور ادھر مجرم رفو چکر ہو گیا تو کیا ہو گا؟

جب میری سمجھ میں اب تک یہ سامنے کی بات نہیں آئی۔ میں بآواز بلند یہ جملہ کہنے ہی والا تھا کہ اپنے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ لیا۔ دراصل وہ ترکیب ذہن میں آنے سے میں اس قدر خوش ہو گیا تھا کہ قریب ہی ایک خطرناک مجرم کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھا تھا جو میری مزید ٹوٹ پھوٹ کا سامان فراہم کر سکتا تھا۔

وہ سامنے کی ترکیب یہ تھی کہ میں اس مکان کے دروازے کی کنڈی باہر سے لگا کر چل دوں تاکہ میری غیر موجودگی میں مجرم وہاں سے فرار نہ ہو سکے۔

میرے خیال میں وہ مکان یا تو خود بھگوان داس کی ملکیت تھا یا اس کے کسی دوست کا تھا جس سے اس نے وقتی طور پر رہائش کی خاطر لے لیا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا مگر یہ پتا لگ چکا تھا کہ بھگوان داس بھی یعنی سی آئی ڈی والوں کو غچہ دینے کے لیے وہاں رہ رہا تھا تاکہ بار بار نظر میں آئے بغیر با آسانی مجرموں سے ساز باز رکھ سکے اور کاغذات کے لیے سودے بازی کر سکے۔

میں جس طرح آہستہ آہستہ زینے پر چڑھا تھا اسی طرح آہستگی کے ساتھ ایک ایک سیڑھی اترا تاکہ میرے قدموں کی چاپ سن کر مجرم چوکنا نہ ہو جائے۔

زینے میں تاریکی تھی مگر نیچے سڑک پر روشنی تھی۔

آخر کار میں نیچے پہنچ ہی گیا۔ پھر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ نیچے پہنچتے ہی ادھر ادھر دیکھے بغیر میں نے جلدی سے دروازہ بھیڑا اور کنڈی لگا دی۔

ابھی میں کنڈی لگا کر پلٹ ہی رہا تھا کہ ایک بھاری ہاتھ میرے شانے پر پڑا۔ پھر میں نے ایک ہاتھ کو کنڈی کی طرف بڑھتے دیکھا جس نے دوبارہ کنڈی کھول دی۔ اسی کے ساتھ ایک بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "واہ بیٹا! چپ چاپ کام دکھا کر کھسکا جا رہا ہے۔"

اس دوران میں میرے شانے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھنے والے نے میرا چہرہ اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری سٹی گم ہو گئی تھی۔ کوتاہ قد، بھاری جبڑے، گندمی رنگ اور بڑھی ہوئی توند، سیٹھ وشوا ناتھ کیس کا دوسرا مجرم!

مجھے دیکھ کر حیرت اس کے چہرے پر بھی نظر آئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے خوفناک انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید بے تکلفی کا ثبوت پیش کرتا، میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا قدم اٹھانا ہے۔

میں نے ایک دم "بچاؤ، بچاؤ!" کا نعرہ مارا اور سرپٹ ایک طرف ریس لگا دی۔ سڑک ویران نہیں تھی اس لیے وہ کمبخت میرا پیچھا کر کے مجھے نہیں پکڑ سکتا تھا۔

آتے جاتے ہوئے لوگ "کیا ہوا، کیا ہوا؟" کہتے ہوئے میری طرف لپک پڑے۔

اس کوتاہ قد کو یقیناً مجھ سے کسی ایسی "نازیبا حرکت" کی توقع نہیں رہی ہو گی اسی لیے وہ ٹھٹکا اور میری مخالف سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک کئی افراد میرے قریب پہنچ چکے تھے اور میں بھاگتے بھاگتے رک گیا تھا۔ رکتے ہی میں نے کوتاہ قد کی طرف دیکھا تھا اور اسی وقت اس نے مخالف سمت میں راہ فرار اختیار کی تھی۔

مجھ سے ایک دھوتی بند راہگیر نے بھاگنے کا سبب پوچھا۔

"وہ... وہ مجھ سے میرا بٹوا چھین رہا تھا۔" مجھے فوری طور پر یہی بہانہ سوجھا۔

"اچھا!... وہ جو بھاگا جا رہا ہے؟" دھوتی بند بولا۔

"ہاں!" میں نے جلدی سے کہا۔

پھر وہ تین چار راہ گیر کوتاہ قد کو پکڑنے بھاگ لیے جو ایک گلی میں مڑ رہا تھا۔ ہنگامے کی آوازیں شاید بھگوان داس اور اس مجرم نے بھی سن لی ہوں گی کیونکہ چند لمحے بعد ہی میں نے پہلے مجرم کو اس مکان سے نکل کر تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھا تھا۔ لمحے بھر کو دروازے میں بھگوان داس کا چہرہ بھی نظر آیا تھا مگر پھر غائب ہو گیا تھا۔ اس نے شاید اندر سے دروازہ لگا لیا تھا۔

اب مجھے اس طرف جاتے ہوئے خوف سا محسوس ہو رہا تھا جہاں میں نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی مگر مجبوری مجھے ادھر قدم اٹھانے ہی پڑے کیونکہ موٹر سائیکل سرکاری تھی اور وہاں سے چوری بھی ہو سکتی تھی۔ میرے خوف کا سبب یہ تھا کہ وہاں سے بھگوان داس کا مکان زیادہ دور نہیں تھا۔

میں بہرحال کسی طرح ہمت کر کے موٹر سائیکل تک پہنچ ہی گیا۔ پھر میں وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے موت میرا تعاقب کر رہی ہو۔

جب میں جامع مسجد پہنچا تو مجھے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اگر کچھ اور دیر ہو جاتی تو عبدالحمید خاں جراح اپنی دکان بڑھا کر چلے جاتے۔ جس وقت میں نے ان کی دکان کے سامنے پہنچ کر موٹر سائیکل روکی، وہ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے جو مختلف چھوٹے بڑے مرہم کے ڈبوں اور شیشیوں پر مشتمل تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی انھیں سلام جھاڑا۔

"جیتے رہو۔" انھوں نے دعا دی اور پھر اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کا سبب پوچھنے لگے۔

"بس ذرا ایک دفتر کا کام تھا، اس میں دیر ہو گئی۔" میں نے انھیں محتاط جواب دیا اور پھر فوراً ہی ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لیے بول اٹھا کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ وہ میرے دفتر کے بارے میں انکوائری نہ کرنے لگیں۔ میں بولا۔ "میرے سر کے پچھلے حصے میں چوٹ آ گئی ہے، آپ دوا لگا دیں۔"

"کیا!" وہ حیرت سے بولے۔ "کیسے چوٹ آ گئی؟"

مجھے ان سے اس سوال کی توقع تھی اس لیے جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ "موٹر سائیکل سے گر گیا تھا۔"

"آؤ، ادھر آؤ، دیکھوں۔" وہ فکرمندانہ لہجے میں بولے۔

میں موٹر سائیکل پہلے ہی کھڑی کر چکا تھا اس لیے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ جب انھوں نے میرے سر کے پچھلے حصے پر ہاتھ رکھا تو میں کراہ اٹھا۔

"خون جم گیا ہے، ابھی صاف کرتا ہوں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "شاید سر کی کھال پھٹ گئی ہے۔"

میں جواب میں کچھ نہ بولا اور وہ اپنا کام کرتے رہے۔ [میں] خاں صاحب سے بہت ڈرتا تھا اور یہ خوف اسی دن [سے] ذہن میں بیٹھ گیا تھا جس دن انھوں نے میری ختنہ کی تھی۔ [اس لیے] دوا لگانے کے دوران میں بالکل دم سادھے رہا۔ [وہ یہ] بھی سکتے تھے، یہ سوچ کر زخم میں مرچیں لگنے کے باوجود چپ رہا تھا۔

میں گھر پہنچا تو سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ امّی اور ابا [جان] نے وہی پٹی پڑھائی تھی جو جراح عبدالحمید خاں [نے]۔ "اس نگوڑی پر چڑھتا ہی کیوں ہے تو؟" امّی نے [کہا اور پھر] نہیں تو موٹر سائیکل کو ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔

"تو پھر کیا پیدل جایا کرے!" ابا امّی کی مخالفت پر [اتر آئے] تھے۔ "خدا کا شکر تو ادا نہیں کرتیں کہ بیٹے کو سواری کے لیے موٹر سائیکل ملی ہوئی ہے، الٹے شکوے کر رہی ہو۔"

"ارے تم تو بس چپ ہی رہا کرو، نہ تمھاری الٹی نہ سیدھی!" امّی چنچنا کر بولیں۔

میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لباس تبدیل کرنے کے [بہانے وہاں سے] کھسک لیا۔

اس رات میں صبح تک خواب میں مجرموں کو پکڑتا رہا۔ [اس] کے باوجود بھی میں کچھ دیر بڑبڑاتا رہا تھا۔ "بچ کر نہ جانے پائے۔ ڈال دو ہتھکڑیاں!"

میں دفتر پہنچا تو میرے کمرے میں کمال اور کمال کے علاوہ [ایک اور] ماتحت بھی موجود تھا جسے گزشتہ دن بھگوان داس کی تلاش سونپا گیا تھا۔

"اے تم ادھر آؤ!" میں نے اسے قہر آلود نگاہ سے گھورتے [ہوئے] ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"یس سر!" وہ یہ کہتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا۔

وہ بھی کمال کی طرح "یس سر" تھا۔ یہ جان کر میرا خون [کھولنے] لگا۔ وہ میری میز کے سامنے آ کھڑا ہوا تو میں نے سخت لہجے میں [پوچھا]۔

"تم نے بھگوان داس کا پتا لگایا؟"

"سر! ابھی اس کا پتا نہیں چل سکا۔ ظاہر ہے سر کہ یہ کام [ایک] دن کا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تم قطعی نااہل ہو۔" میں اس پر گرم ہو گیا۔

"یس سر!"

"بکواس بند کرو!" میں دہاڑا۔ "مجھے اپنے ماتحتوں میں [ایسے] 'یس سر' نہیں چاہییں، سمجھے! تمھیں ہر حال میں کل ہی اس کا [پتا] لگا لینا چاہیے تھا۔"

"لیکن سر! وہ... وہ کئی دن سے..."

"اپنی کوٹھی سے غائب ہے۔" میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "یہی کہنا چاہتے تھے تم؟"

"یس سر!"

"پھر تمھیں کیا جھک مارنے کے لیے یہ کام سپرد کیا گیا تھا، [ب]ولو جواب دو!"

مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکا، سوائے بغلیں جھانکنے کے!

"سنو! وہ اپنی کوٹھی سے غائب ہو کر بارہ ٹوٹی کے ایک دو منزلہ مکان میں جا چھپا تھا۔ اگر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں تو کوئی کام ہی نہ ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے مکان کا محل وقوع سمجھایا۔ پھر بولا۔ "پتا لگاؤ کہ وہ اب بھی اسی مکان میں چھپا ہوا ہے یا واپس اپنی کوٹھی پہنچ گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم کرو کہ بارہ ٹوٹی والا مکان اسی کا ہے یا اس کے کسی دوست کا! سمجھ گئے؟"

"یس سر!"

"تو پھر دفع ہو جاؤ!" میں اس کے یس سر کہنے سے چڑ گیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے دوسرے "یس سر" کو پیشی کا اشارہ کیا، یعنی کمال کو! کمال بھی میرے تیور دیکھ کر جلدی سے میز کے سامنے آ کھڑا ہوا مگر اس نے میرا پارہ چڑھا ہوا دیکھ کر یس سر کہنے سے گریز کیا۔ یہ الگ بات کہ اس کا پورا وجود "یس سر" بن گیا تھا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی اور افسرانہ شان سے بولا۔ "بتاؤ کہ ان دونوں کی طرف سے کیا رپورٹ ملی جنھیں سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا؟"

"بڑی عجیب رپورٹ ملی ہے سر!" کمال پرتجسس انداز میں بولا۔

"بیان کرو!" میں نے کھردرے سے لہجے میں اسے حکم دیا۔ وہ خواہ مخواہ تجسس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا لہجہ محسوس کر کے اس کا چہرہ اتر گیا۔

"سیٹھ وشوا ناتھ رات نو بجے اپنی بگھی میں بیٹھ کر گھر سے نکلا اور لال قلعے جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بگھی رکوائی اور اس سے اتر کر قلعے کی ایک دیوار تک گیا، پھر اس نے دیوار پر کھریا مٹی سے بیس کا ہندسہ لکھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بگھی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی پہنچ گیا۔ پھر وہ رات بھر کہیں نہیں گیا۔" کمال رپورٹ دے کر خاموش ہو گیا۔

"اور کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا۔

"اسے خاص بات تو نہیں کہا جا سکتا مگر سر! نو بجے سے کوئی گھنٹے بھر پہلے دو نوجوان سیٹھ سے ملنے آئے تھے۔" کمال نے بتایا۔

کمال یہ کہہ کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے جو رپورٹ دی تھی وہ واقعی اہم تھی۔ گویا سیٹھ وشوا ناتھ نے ان کاغذات کی قیمت بیس ہزار روپے لگا دی تھی۔ میں اس نتیجے پر اس خط کی روشنی میں پہنچا تھا جو سیٹھ وشوا ناتھ کو مجرموں نے لکھا تھا اور جو میرے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس خط میں مجرموں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کاغذات کے عوض جتنی رقم دینے پر آمادہ ہو، اپنی کوٹھی کے پھاٹک پر لکھ دے۔ پہلا خط میرے ہتھے چڑھ جانے کے بعد مجرموں نے یقیناً سیٹھ کو دوسرا خط لکھا ہوگا اور اس خط میں لال قلعے کی دیوار پر رقم کے ہندسے لکھنے کی ہدایت تحریر کر دی ہوگی۔ اس تبدیلی کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ مجھے اس گڑبڑ [سے] بے خبر رکھا جا سکے۔ بھگوان داس اور ایک مجرم کے درمیان ہونے والی گفتگو میں خود اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ بھگوان داس پندرہ ہزار سے زیادہ دینے پر آمادہ نہ تھا اور اس سے بیس ہزار کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مجرم، سیٹھ وشوا ناتھ کی پیشکش قبول کر سکتے تھے کیونکہ وہ بھگوان داس سے پانچ ہزار زیادہ ادا کرنے پر راضی تھا۔

ان حالات میں مجرم لازماً آج ہی سیٹھ وشوا ناتھ سے رابطہ قائم کر کے اسے یہ بتانے والے تھے کہ بیس ہزار کی رقم کہاں پہنچانے اور کہاں سے اسے کاغذات ملیں گے۔ گویا اب سیٹھ وشوا ناتھ سے بیس ہزار اینٹھ کر مجرم بہت جلد رفو چکر ہونے والے تھے۔ اب یہ بہت ضروری ہو گیا تھا کہ اس سے پہلے ہی مجرموں پر ہاتھ ڈال دیا جاتا۔

گزشتہ تجربات کی روشنی میں میرے لیے یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ مجرم اس بار بھی سیٹھ وشوا ناتھ سے رقم اینٹھنے کے لیے کوئی پیچیدہ اور لمبا راستہ اختیار کریں گے تاکہ انھیں خود سامنے نہ آنا پڑے۔

مجرموں نے بیک وقت بھگوان داس اور سیٹھ وشوا ناتھ سے رابطہ قائم کیا تھا تاکہ جس سے بھی زیادہ رقم مل سکے، اس سے سودا کر لیں۔ خوش قسمتی سے یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ بھگوان داس سے ان کا معاملہ نہیں پٹا۔

مجرموں تک پہنچنے کے لیے میرے پاس صرف ایک ذریعہ تھا اور وہ ذریعہ تھا لشیرے! لیکن اس ذریعے کو استعمال کرتے ہوئے میں خوفزدہ تھا۔ اس جیسے خطرناک شخص سے دشمنی مول لینا میری نظر میں انتہائی خطرناک تھا۔ وقتی طور پر تو میں قانون اور اپنی حیثیت کا سہارا لے کر اس کا بھرکس نکال سکتا تھا لیکن بعد میں وہ میرا کچومر نکال سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے تازندگی تو حوالات یا جیل میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ وہ کبھی نہ کبھی تو آہنی سلاخوں سے باہر آتا۔ اس کے بعد وہ میرا کیا حشر کرتا، مجھے کس طرح انتقام لیتا، یہ سوچ کر ہی میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔

یہ تو ثابت ہو ہی چکا تھا کہ ان مجرموں کا تعلق بشیرے سے

ضرور تھا ورنہ وہ انھیں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہ دیتا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ بشیرے جی بی روڈ ہی پر کہیں رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ان مجرموں کے ایک ساتھی کا جی بی روڈ پر پایا جانا معنی خیز تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بشیرے کا کشمیری گیٹ والا مکان نظر میں آ جانے کے بعد مجرموں نے اب بشیرے کے جی بی روڈ والے ٹھکانے پر پڑاؤ ڈال دیا ہو۔ ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بہت ضروری تھا کہ بشیرے جلد از جلد زیرِ دام لایا جائے مگر کیسے؟ یہی سوچتے ہوئے میری نگاہ اپنے دوسرے ماتحت کمار کی طرف اٹھی جو میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے اس کی نگاہ ملی تو وہ جھٹ سے بولا "یس سر!" اس کا انداز چڑانے والا تھا۔

"کچھ نہیں، خاموش بیٹھو اور اب یس سر نہ کہنا!" میں نے اسے ڈانٹا۔ اسی وقت میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔

ایک پنتھ دو کاج! میں نے سوچا۔ اچھا بیٹا کمار! تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی افسر سے پالا پڑا تھا۔ میرے خیال میں جس خیال نے روشنی کر دی تھی، وہ یہ تھا کہ بشیرے پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کمار کو سامنے کر دوں۔ مجرم بھی تو پس پردہ رہ کر سارا کھیل کھیل رہے تھے تو پھر میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا تھا۔ اگر بشیرے کسی سے دشمنی باندھتا یا انتقام لیتا تو وہ میری بجائے کمار ہی ہوتا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اپنے گستاخ ماتحت کمار کو مخاطب کیا "ادھر آؤ!"

کمار میرا حکم سن کر مسکراتا ہوا میری میز کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"حکم فرمائیں سر!" کمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہر چند کہ مجھے اس کی مسکراہٹ بہت زہر معلوم ہو رہی تھی مگر اس وقت میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تم بشیرے کو جانتے ہو؟"

"جی ہاں!" کمار نے جواب دیا "وہی جس کے کشمیری گیٹ والے مکان میں مجرموں نے پناہ لے رکھی تھی اور جو جی بی روڈ پر رہتا ہے؟"

"ہاں وہی!" میں نے زور دے کر کہا "اب حالات سے پتا چلتا ہے کہ مجرموں کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ بشیرے پر ہاتھ ڈال دیا جائے تاکہ..."

"مگر یہ بات تو کل ہی پتا لگ چکی تھی سر!" کمار کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"تو پھر؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"پھر یہ سر کہ بشیرے کو کل بھی پکڑا جا سکتا تھا" کمار نے کہا۔

"کسے کب پکڑنا ہے اور کب چھوڑنا ہے، یہ تم سے زیادہ بہتر میں جانتا ہوں" میں سخت لہجے میں بولا "تمھیں جو حکم دیا جا رہا ہے وہ کرو!"

"مگر ابھی تو آپ نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا۔"

"تم فضول بحث بند کرو تو میں احکامات جاری کروں۔ تم تو درمیان میں ادھر ادھر کی اڑانے لگتے ہو۔ کیا میں تمھارے خیال میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں؟ کیا میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا ہوگا، کچھ نہیں کیا ہوگا؟"

"وہ تو آپ کے سر پر بندھی ہوئی پٹی سے ہی پتا چل رہا ہے سر!"

"خاموش!" میں کمار کی بات سن کر پھٹ پڑا۔

"اگر میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے سر جس سے آپ کے نازک احساسات کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں!" کمار بظاہر عاجزی سے بولا لیکن وہ مسکرا اب بھی رہا تھا۔

"سنو! تمھیں اس غنڈے کو ابھی پکڑ کر لانا ہے اور اس کی زبان کھلوانی ہے" میں نے کمار کی معافی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں اگر تم چاہو تو اپنا شناختی کارڈ دکھا کر پولیس کی مدد بھی لے سکتے ہو۔"

"میرا خیال ہے سر کہ پولیس کو اس معاملے سے دور ہی رکھا جائے" کمار بولا۔

"تو کیا تم اسے اکیلے پکڑ لاؤ گے؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر آپ کہیں تو آپ کی تسلی کے لیے کمال صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "ایک سے دو بھلے۔"

ادھر کمال اور کمار میرے حکم پر بشیرے کو پکڑنے روانہ ہوئے، ادھر میں ڈی آئی جی تیواڑی جی سے ملنے چل دیا کیونکہ انھوں نے مجھ سے گزشتہ دن کہہ دیا تھا کہ میں انھیں حالات سے باخبر رکھوں۔

تیواڑی جی نے مجھے کچھ دیر بعد ہی اپنے کمرے میں بلوا لیا تھا۔ جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا ان کی نگاہ میری طرف اٹھی پھر فوراً استفسار آمیز لہجے میں بولے "اللہ دتا! یہ تم نے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"

"سر! میں یہی بتانے تو حاضر ہوا ہوں" میں میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"یعنی یہ کہ تم نے سر پر پٹی کیوں باندھی ہے؟" یہ کہتے ہوئے تیواڑی جی کی نوکدار مونچھیں پھڑکیں اور مونچھیں صرف دو

موقعوں پر پھڑکتی تھیں، ایک تو اس وقت جب وہ مسکراتے تھے اور ایک اس وقت جب وہ سخت ناراض ہوتے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں چند لمحے لگے کہ وہ ناراض نہیں ہوئے تھے بلکہ مسکرائے تھے۔

میں ان کی میز کے قریب پہنچ گیا تو انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔

"سر! میرے سر پر یہ پٹی عبدالحمید خاں جراح نے باندھی ہے، اسے میں نے خود نہیں باندھا" میں نے تیواڑی جی کی معلومات میں اضافہ کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

تیواڑی جی نے مجھے گھورا۔ میری لن ترانی سننے کے بجائے موضوعِ گفتگو بدل دیا۔ وہ بولے "تم انوری بائی سے ملے؟"

"انوری بائی سے بھی ملا سر! سیٹھ دھنونا تھ سے بھی اور بھگوان داس کے بھی درشن کر لیے۔"

"درشن!" تیواڑی جی کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

"جی ہاں" میں نے جلدی سے کہا "اسے صرف درشن کرنا ہی کہا جا سکتا ہے سر! آپ خود سوچیں سر کہ کسی کو صرف دیکھ لینے کا نام تو ملاقات نہیں ہوتا۔"

"خیر خیر! یہ بتاؤ کہ کیس کچھ بڑھا کہ نہیں؟" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

"کیس تو اب ختم ہونے کو ہے سر!" میں نے سینہ پھلا کر کہا۔

"کیا؟" تیواڑی جی اس بار ذرا چونکے۔

پھر اس سے پہلے کہ تیواڑی جی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا میں نے انھیں از اول تا آخر تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ وہ بڑے صبر و سکون سے میرا بیان سنتے رہے۔ شاید اس کی وجہ گزشتہ دن کا تجربہ تھا جب انھیں مجبوراً تفصیل سننا پڑی تھی۔

جب میں چپ ہو گیا تو وہ بولے "ضروری نہیں کہ تمھارا اندازہ درست ہی ہو۔"

"اب رہ ہی کیا گیا ہے سر! بس بشیرے کی زبان کھلوانا ہے اور اسے یقیناً علم ہوگا کہ مجرم کہاں چھپے ہوئے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا، مجرموں نے اسی کے گھر پناہ لی ہے" میں نے کہا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ تمھارے قیاسات قطعی غلط ہیں لیکن قبل از وقت اتنے یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال اب نہایت تیزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تم نے جو قدم آج اٹھایا ہے وہ کل ہی اٹھا لینا چاہیے تھا۔ خیر اب تم جاؤ، مجھے آئی جی صاحب سے کچھ ضروری گفتگو کرنے جانا ہے" یہ کہہ کر تیواڑی جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں دوبارہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور اس وقت تک خیالی گھوڑے دوڑاتا رہا جب تک کہ کمار اور کمال واپس نہ آ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق انھیں واپسی میں کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے انھیں دیکھتے ہی میں نے تیوریوں پر بل ڈال لیے۔

"تم لوگوں نے واپسی میں اتنی دیر کیوں لگائی؟" میں نے جواب طلبی کے انداز میں کہا۔

"اس لیے سر کہ بشیرے کی تلاش میں ہم جی بی روڈ کا ایک ایک کوٹھا جھانکتے پھر رہے تھے" کمار نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں تم لوگوں میں ذرا بھی عقل نہیں" میں برہم ہو کر بولا "اس کی تلاش میں اتنی دیر لگانے کی بجائے کیا تم لوگ پولیس کے ریکارڈ سے اس کا پتا نہیں معلوم کر سکتے تھے جبکہ وہ ایک بدنام شخص ہے؟ جی بی روڈ کے تھانے سے اس کا پتا باآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا۔"

"ہم نے ایسا ہی کیا تھا" کمار نے جواب دیا۔

"پھر ادھر ادھر مارے پھرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں کمار کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھا۔

"اس لیے سر کہ اس کے گھر پر پڑا ہوا تالا ہی ہمارا منہ چڑا رہا تھا" کمار نے اس طرح کہا جیسے وہ تالے کے منہ چڑانے کا بدلہ مجھے منہ چڑا کر لے رہا ہو۔

"تو وہ تمھیں انوری بائی کے کوٹھے پر ملا ہوگا" میں نے اندھیرے میں تیر چلانا چاہا تاکہ اپنے ماتحتوں پر رعب ڈال سکوں۔

"جی نہیں" کمار نے جواب دیا۔

"پھر کہاں ملا؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

کمار کا جواب سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں پھٹ پڑا "تو پھر اتنی دیر سے یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ تم جھک مار کر آ رہے ہو؟"

"اگر آپ جھک مارنے سے ہی خوش ہوتے ہیں تو یہی سہی۔ سر! میں اس سلسلے میں کیا..."

"بکو مت اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھو!" میں نے اس کی بات کاٹ کر ڈانٹا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" کمار اپنی میز کی طرف بڑھ گیا تو کمال ڈرتے ڈرتے بولا۔

"تم بھی دفع ہو جاؤ!" میں ہاتھ اٹھا کر چیخا۔

جب وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئے تو میں سوچنے لگا کہ تیواڑی جی نے غلط نہیں کہا تھا۔ بشیرے کا اس طرح تالا لگا کر غائب ہو جانا معنی خیز تھا۔ کہیں بشیرے کھسک تو نہیں گیا۔ ممکن ہے اس نے مجرموں کو وہ واقعہ سنایا ہو جو انوری بائی کے کوٹھے پر اسے پیش آیا تھا۔ اس نے میرا حلیہ بھی بتا دیا ہوگا۔ مجرموں

نے یقیناً اُسے میری اصلیت سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ پھر بارہ ٹوٹنی پر ایک مجرم سے میرا ٹکراؤ بھی ہوا تھا۔ ان حالات میں عین ممکن تھا کہ مجرم بشیرے سمیت کہیں جا چھپے ہوں تاکہ میں بشیرے کے ذریعے ان تک نہ پہنچ سکوں۔

ابھی میں کسی فیصلہ کُن مرحلے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ میرا وہ ماتحت واپس آ گیا جسے میں نے بھگوان داس کی تلاش میں بھیجا تھا۔

"سر! آپ نے جس مکان کا پتا دیا تھا، وہ مقفّل ہے۔ اس مکان کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی شخص رام پرشاد کا ہے جو اپنے بیوی بچّوں سمیت حال ہی میں تیرتھ یاترا پر گیا ہوا ہے۔"

"تم نے یہ معلوم کیا کہ بھگوان داس سے اس شخص کا کیا تعلق ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"بھگوان داس اور وہ بچپن کے دوست ہیں۔" میرے ماتحت نے بتایا۔

"اس مکان کے سامنے کوئی کار کھڑی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نو سر!"

"اس کے بعد تم بھگوان داس کی کوٹھی پر گئے؟"

"جی ہاں! بھگوان داس وہاں بھی نہیں ہے۔"

میں نے جواب سن کر طویل سانس لیا۔ "سبھی کمبخت گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے۔" میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا سر؟" میرا ماتحت مجھے بڑبڑاتے دیکھ کر بولا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید میں نے اُسے کچھ کہا ہے۔

"کچھ نہیں، اُدھر جا کر بیٹھو!" میں نے ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔

بشیرے کے غائب ہو جانے سے میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مجرموں تک پہنچنے کے لیے کیا راستہ اختیار کروں؟ اب صرف اور صرف ایک ہی شخص ایسا سامنے رہ گیا تھا جس سے بہرحال مجرم رابطہ قائم کرنے پر مجبور تھے اور وہ شخص تھا سیٹھ وشوا ناتھ!

اگر سیٹھ وشوا ناتھ کسی طرح تعاون پر آمادہ ہو جاتا یا اسے آمادہ کیا جا سکتا تو مجرموں کو پکڑا جا سکتا تھا لیکن وہ تو مجرموں سے اس قدر خوفزدہ تھا کہ ان کا ہر مطالبہ خاموشی سے تسلیم کرتا چلا جا رہا تھا۔ سیٹھ وشوا ناتھ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس کی حسین نوجوان بیٹی سُرج کا خیال آیا۔ اگر اس سلسلے میں وہ اپنے باپ کو کھانے اور قانون سے تعاون کے لیے کہے تو شاید یہ بات بن جائے اور سیٹھ وشوا ناتھ شاید اپنی بیٹی کی بات مان لے۔

میں نے سُرج کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ اگر وہ مکمل پر میرے عشق میں مبتلا نہیں تو کم از کم ہاف پرسینٹ ضرور مبتلا ہے۔ اس ہاف پرسینٹ عشق سے بہت کام نکالا جا سکتا تھا۔ بھلا نوجوان لڑکی اپنے محبوب کی بات کس طرح ٹال سکتی ہے۔

سُرج سے ملاقات کے لیے ضروری تھا کہ کہیں اور ملا جائے۔ کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں میرے اور اس کے سوا کوئی نہ ہوتا۔ ایسی ہی تو میں اسے شیشے میں اتار سکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں نے کاغذ نکالا اور اسے خط لکھنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی جوان جہان لڑکی کو خط لکھ رہا تھا اس لیے میں بہت دیر تک مختلف کاغذ لکھ لکھ کر پھاڑتا رہا۔ پھر آخر میں خط لکھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ میں نے اسے لکھا تھا۔

جان سے پیاری کنوکماری سُرج!

جُگ جُگ جیو!

جب سے تمھیں دیکھا ہے، میرے من کی شانتی بھنگ ہو گئی ہے۔ ہر سمے تمھارا ہی چاند سا مکھڑا میرے سپنوں میں آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے۔ تم سے ملنے کو میرا من تڑپ رہا ہے یعنی بے چین ہے۔ تمھارے پتا جی کے بارے میں بھی مجھے بہت چنتا یعنی فکر ہے اور اسی سلسلے میں مجھے تم سے ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنا ہے۔ میں کمپنی باغ کے صدر دروازے پر تمھارا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ میرا پریم پتر، یعنی محبت نامہ پڑھتے ہی وہاں آ جاؤ۔

تمھارا اور صرف تمھارا

اندرجیتا

یہ خط لکھ کر میں نے ایک لفافے میں بند کیا اور اس پر سُرج کا نام لکھ دیا، پھر لفافہ ہاتھ میں لے کر اپنے ماتحت کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"یہ لفافہ سیٹھ وشوا ناتھ کی بیٹی سُرج ہی کو دینا، کسی اور کو نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے سیٹھ کی کوٹھی کا پتا سمجھایا اور پوچھا "سمجھ گئے؟"

"یس سر!" اس نے جواب دیا اور میرے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

"اچھا تو پھر روانہ ہو جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور میرا ماتحت ساتھ ساتھ ہی دفتر کی عمارت سے نکلے۔ وہ میرے سامنے ہی ایک تانگے میں سوار ہوا تھا۔ میں چاہتا تو کچھ دور تک اسے اپنی موٹر سائیکل پر چھوڑ سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

کمپنی باغ پہنچنے سے پہلے میں نے راستے میں ایک جگہ آلو چھولے

...ین پلیٹیں صاف کیں تاکہ خالی پیٹ اظہارِ عشق کرتے ہوئے ...بت کے سبب میری زبان نہ لڑکھڑا جائے۔

میں نے اپنی دانست میں سُرج کو بہت متاثر کُن خط لکھا ...۔ مجھے امید تھی کہ وہ خط پڑھتے ہی مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ ...ٹھے گی۔

میں نے کمپنی باغ میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکل صدر دروازے ...قریب کھڑی کر دی۔ ... اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

جب مجھے ٹہلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی اور میں مایوس ہونے ...ا تو میری نگاہ سیٹھ وشوا ناتھ کی بگھی پر پڑی جو سامنے سے چلی ...ہی تھی۔

بگھی، صدر دروازے کے قریب آ کر رُک گئی تو میری توقع ...ے مطابق اس میں سے وہ سراپا قیامت ساڑی میں لپٹی ہوئی ...زی جس کا مجھے انتظار تھا۔ وہ ہلکی آسمانی ساڑی میں بہت ...سین نظر آ رہی تھی۔ سُرج کے اترتے ہی کوچوان نے بگھی ایک ...رف لے جا کر کھڑی کر دی۔

میں لپک کر سُرج کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ...س کے حسین چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے غصّہ تھا۔

"آداب شریمتی جی!" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"آداب۔" وہ روکھے سے لہجے میں بولی۔

"اندر چل کر تنہائی میں بات کریں گے۔" میں نے رشیہ خلی ہو کر کہا۔

"چلیے۔" اس کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا۔

میں اسے لے کر کمپنی باغ کے اندر پہنچا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اس لیے وہاں تفریح کرنے والے خاصی تعداد میں تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔

میں کسی تنہا گوشے کی تلاش میں ایک طرف بڑھا۔ اس طرف گھنے درخت لگے ہوئے تھے اور کئی کنج بھی نظر آ رہے تھے۔ سُرج میرے قدم سے قدم ملائے چل رہی تھی۔

جیسے ہی میں اس کے ہمراہ ایک گھنے پیڑ کے پیچھے پہنچا، ایک دم چوڑیوں کی چھنا چھن میری سماعت سے ٹکرائی اور اسی کے ساتھ میری نگاہ اس نوجوان جوڑے پر پڑی جو ہم دونوں کو دیکھ کر سٹپٹا گیا تھا۔ لڑکی اپنا لباس درست کرنے لگی تھی اور لڑکا گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں بالکل نہ سمجھ پایا کہ وہ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل کیا کر رہے تھے اور ہمیں دیکھ کر اس قدر گھبرا کیوں گئے تھے۔ میں نے نوجوان کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے اسے مخاطب کیا۔ "ہم کدھر ہی اور چلے جاتے ہیں، تم اطمینان سے بیٹھو پیارے بھائی!"

اس نوجوان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنا سر تو ہلایا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"اسی لیے میں کبھی ایسی جگہوں پر نہیں آتی۔" میں نے سُرج کی بڑبڑاہٹ سنی۔

"کس لیے شریمتی جی؟ کیا ہوا؟" میں اس کی طرف مڑ کر بولا۔

"کیا آپ کے پاس آنکھیں نہیں ہیں!" سُرج نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا اور میں اس کے غصّے کا سبب نہ سمجھ سکا۔

اسی وقت وہ نوجوان سُرج سے مخاطب ہوا۔ "آپ یہاں بیٹھیں بہن جی! ہم لوگ جا رہے ہیں۔" پھر اس سے پہلے کہ سُرج کوئی جواب دیتی وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "چلو شکنتلا! اور نہ چاچی ناراض ہوں گی۔"

سُرج سُنتے ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ چند لمحے بعد ہی وہ جوڑا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر گھاس پر بچھاتے ہوئے سُرج سے کہا۔ "آپ کی خوبصورت ساڑھی خراب ہو جائے گی اس لیے رومال پر بیٹھ جائیے۔"

"شکریہ!" سُرج سپاٹ لہجے میں بولی۔ "رومال میرے پاس بھی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر رومال نکالا اور مجھ سے خاصے فاصلے پر بچھا کر بیٹھ گئی۔

میں مجبوراً اپنے بچھائے ہوئے رومال پر بیٹھ گیا، پھر اسے مخاطب کیا۔ "میں نے دراصل آپ کو اس لیے بُلایا تھا کہ...!"

"مجھ سے عشق جھاڑ سکیں۔" سُرج میری بات کاٹ کر بولی۔ اس کے لہجے میں سختی تھی۔

"ج... جی... جی!" میں ہکلا کر رہ گیا۔

اسی وقت سُرج نے دوبارہ اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف پھینکتی ہوئی بولی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

"بدتمیزی!" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں بدتمیزی!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "آپ نے مجھے کیا کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رکھا ہے جو اس طرح کی بکواس لکھی تھی؟ جان سے پیاری کنوکماری اور جب سے تمھیں دیکھا ہے وغیرہ، یہ سب کیا خرافات ہے؟ آپ کو ہمّت کیسے ہوئی یہ سب لکھنے کی؟"

میں تو نماز بخشوانے کے چکّر میں تھا اور اُلٹے روزے گلے پڑ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواب میں کہوں تو کیا کہوں۔ پھر بھی میں ہمّت کر کے بولا۔ "دراصل یہ سب باتیں تو بس میں نے یوں ہی لکھ دی تھیں، حقیقتاً تو مجھے آپ سے ایک اور بات کرنا تھی۔"

"تو آپ نے یہ میرے ساتھ تفریح کی تھی!" سُرج کی آواز میں

نمایاں طور پر طنز تھا۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ "سنیے! میں آپ کا وہ بیہودہ خط پڑھ کر ہرگز نہ آتی لیکن صرف اس لیے چلی آئی کہ آئندہ آپ میرے ساتھ اس قسم کی تفریح کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ رہا پتا جی کا مسئلہ تو وہ پتا جی جانیں۔ آپ اس سلسلے میں ان سے بات کریں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سمجھے آپ!"

مجھے سروج سے ایسے رویّے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ تو بالکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لے کر کافی دیر سہلایا تھا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے، سنیے تو سہی! آپ تو بالکل ناراض ہی ہو گئیں۔" میں جلدی سے بولا مگر وہ نہیں رکی۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے رومال پر پڑی جس پر وہ بیٹھی تھی۔ میں نے بآوازِ بلند کہا۔ "سروج جی! اپنا رومال تو لیتی جائیں۔"

"اس رومال کو آپ بطور نشانی رکھ لیجیے گا۔" وہ بغیر مڑے اور رکے بغیر بولی اور تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔

میں نے پہلے اٹھ کر اس کا رومال زمین سے اٹھایا، پھر لپیٹا۔ اس کے بعد میں دونوں رومالوں کو اپنی جیب میں ٹھونستا ہوا دل برداشتہ سا وہاں سے چل دیا۔

وہ دن بڑا منحوس ثابت ہو رہا تھا، ہر طرف سے ناکامی ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ میں جب کمپنی باغ کے صدر دروازے پر پہنچا تو سروج کی بگھی مجھے جاتے ہوئے دکھائی دی۔

نہ جانے میرے دماغ میں کیا سمائی کہ میں نے براہِ راست سیٹھ وشوا ناتھ سے وہ بات کرنے کا فیصلہ کیا جو میں اس کی بیٹی کے ذریعے اس سے کہلوانا چاہتا تھا۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے اپنی موٹر سائیکل بگھی کے پیچھے ڈال دی، پھر کچھ دیر بعد ہی بگھی پیچھے رہ گئی اور میں آگے نکل گیا۔ اب میں قرول باغ جا رہا تھا تاکہ سیٹھ وشوا ناتھ سے فیصلہ کن بات کر سکوں۔

میں جب سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی ابھی کہیں سے آیا ہے اور اشنان، یعنی غسل کر رہا ہے۔ مجھے سیٹھ کے ملازم نے اسی کمرے میں بٹھا دیا تھا جہاں پہلے بھی میں کئی بار آ چکا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ بگھی سروج نے تو لی تھی، پھر سیٹھ وشوا ناتھ کیا پیدل ہی کہیں گیا تھا؟ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ سیٹھ کے پاس بگھی کے علاوہ ایک عدد کار بھی ہے۔

مجھے سیٹھ کا انتظار کافی دیر کرنا پڑا، جب وہ آ کر میرے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر بشاشت محسوس کی۔ میں یہ سمجھا کہ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر نکلا ہے اس لیے مجھے ایسا لگ رہا ہے۔

"کہیں انسپکٹر صاحب! کیسے آنا ہوا؟" سیٹھ وشوا … مجھے مخاطب کیا۔

میں تمہید سے گریز کرتے ہوئے فوراً اصل معاملے … اور بولا۔ "دیکھیں سیٹھ جی! اگر آپ ہمارے ساتھ تعاون کر… بہت جلد پکڑے جا سکتے ہیں۔"

"تو کیا آپ کے خیال میں، میں نے ایسا نہیں کیا ہے؟" خلافِ توقع سیٹھ کے ماتھے پر بل پڑتے دیکھے جیسے اسے بُرا … گزرا ہو۔

"میرا مقصد آپ پر کوئی الزام لگانا نہیں تھا سیٹھ جی!" جلدی سے بولا۔ "میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ مجرموں … خوف زدہ نہ ہوں اور ان کی دھمکیوں میں نہ آئیں۔" یہ جملہ میں … زور دے کر کہا تھا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ سیٹھ وشوا ناتھ مجرموں … ہے اور ان کا ایک مطالبہ پورا کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ مجرموں … مطالبہ پورا کرنے پر بھی آمادگی کا اظہار کر چکا تھا۔ اگر ایسا نہ … گزشتہ رات لال قلعے کی ایک دیوار پر میں کا ہندسہ لکھنے …

"کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر!" سیٹھ وشوا ناتھ میری بات … "میں کسی کی دھمکیوں میں آنے والا آدمی نہیں۔" اس کے لہجے … تھا جس سے میں چڑ گیا۔

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں، جھوٹ نہ بولو سیٹھ! تم اندر سے … ہو مگر میں یہ بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں … تعاون پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے غصے کو پیتے ہوئے … "کاغذات کے سلسلے میں آپ کو مجرموں کی طرف سے اور کوئی … خط تو نہیں ملا سیٹھ جی؟"

"کیسے کاغذات اور کس سلسلے میں دھمکی؟"

سیٹھ وشوا ناتھ کی بات سن کر میں چکرا گیا۔ آخر آج … گیا ہے؟ میں نے سوچا اور نرم لہجے میں بولا۔ "وہی کاغذات … کے قبضے میں ہیں اور جن کی وجہ سے وہ آپ کو بلیک میل …"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں انسپکٹر! میری تو کچھ سمجھ … آ رہا۔" سیٹھ وشوا ناتھ کسی قدر ترش لہجے میں بولا۔ "کیسے … کیسی بلیک میلنگ؟"

اسی وقت میں نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی … دیکھا۔ سروج اس کمرے سے گزر کر کوٹھی کے اندرونی حصے … رہی تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر نہیں چونکا مگر وہ ضرور چونکی … توقع نہیں تھی کہ میں کمپنی باغ سے سیدھا اس کی کوٹھی پہنچ … وہ میری جانب حقارت بھری نگاہ سے دیکھتی ہوئی تیزی سے … اندر والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں دوبارہ سیٹھ وشوا ناتھ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "…

سیٹھ جی کہ آپ میری بات نہیں سمجھ پا رہے۔ میں ان کاغذات کا ذکر کر رہا ہوں جو مجرموں کے قبضے میں ہیں اور جن کی آپ کو اشد ضرورت ہے، وہی اناتھ آشرم والے کاغذات!"

"اناتھ آشرم کے کاغذات؟" سیٹھ حیرت سے بولا۔ "وہ تو میرے پاس موجود ہیں، وہ کاغذات مجرموں کے پاس کہاں سے پہنچ جاتے؟"

"وہ کاغذات، زیورات کے ساتھ چوری ہو گئے تھے۔" قریباً سیٹھ جی!" میں رو دینے والے انداز میں بولا۔

"یہ کاغذات آپ کے تھے یا میرے؟" سیٹھ وشوا ناتھ نے عجیب سا سوال کیا۔

"ظاہر ہے کہ وہ آپ ہی کے تھے!" میں نے سوال کی نوعیت نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر ان کے بارے میں آپ زیادہ بہتر جان سکتے ہیں یا میں؟"

"آپ مجھ سے زیادہ جان سکتے ہیں۔" میں سیٹھ کی بات سمجھتے ہوئے بولا۔ "مگر آپ ہی نے تو مجھ سے کہا تھا کہ اگر وہ کاغذات نہ ملے تو..."

"بس بس!" سیٹھ وشوا ناتھ نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "میں نے آپ سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی میرے کاغذات چوری ہوئے تھے۔ ہاں ایک بار زیورات ضرور چوری ہوئے تھے جو مجھے واپس مل چکے ہیں اور میرے پاس موجود ہیں۔"

سیٹھ وشوا ناتھ میرے منہ پر سفید جھوٹ بول رہا تھا اور اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں اسی لیے کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔ "سیٹھ جی! آپ قانون کی راہ میں روڑے اٹکا کر اچھا نہیں کر رہے!"

"انسپکٹر!" وشوا ناتھ کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ "اپنا لہجہ درست کرو! تم تو کیا تمہارا آئی جی اور ڈی آئی جی بھی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ تم شاید ابھی سیٹھ وشوا ناتھ سے واقف نہیں ہو۔"

اس کے لہجے کی سختی نے مجھ پر فوری اثر کیا۔ میں اس سے مرعوب ہو گیا۔ جو شخص میرے آئی جی اور ڈی آئی جی کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا، اس کے سامنے میں تو بہرحال بہت "چھوٹی چڑیا" تھا۔ میں اسی لیے معاملے کو بگڑتا دیکھ کر پھر عاجزی پر آ گیا۔

"سیٹھ جی! میں معافی چاہتا ہوں۔ میں تو جو کچھ کر رہا تھا، آپ ہی کے لیے کر رہا تھا اور یہ سوچ کر کہ اگر کاغذات مل گئے تو آپ میرا بقیہ انعام بھی دے دیں گے۔"

"انعام چاہیے؟" سیٹھ وشوا ناتھ معاً مسکرایا، پھر بولا۔ "انعام مل جائے گا لیکن ایک شرط پر! وہ شرط یہ ہے کہ اب پچھلی تمام باتوں کو بھول جاؤ اور اس کیس کو یہیں دبا دو۔"

"اور وہ کاغذات؟" میں بولا۔ "جو مجرموں کے پاس ہیں۔"

"ان کاغذات کو بھی بھول جاؤ اور مجرموں کا خیال بھی دل سے نکال دو۔"

"کیا آپ کو وہ کاغذات مجرموں نے دے دیے؟" میں اپنے تجسس کو نہ دبا سکا۔

"پھر وہی بات!" سیٹھ وشوا ناتھ کا لہجہ دوبارہ سخت ہو گیا۔ "میں نے تم سے کہہ دیا کہ ان باتوں کو بھول جاؤ۔"

"اچھا۔" میں نے ایک طویل سانس لیا۔

"تم بیٹھو، میں ابھی تمہارا انعام لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر سیٹھ وشوا ناتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ پلٹا تو اس کے ہاتھوں میں نئے نئے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی تھی جو اس نے میری طرف بڑھا دی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی سیٹھ جی!" میں نے نوٹوں کی گڈی لے کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت تھی انسپکٹر! ورنہ تم خواہ مخواہ فضول سوالات کر کے میرا اور اپنا وقت ضائع کرتے رہتے۔ کوشش کرنا یہ کیس اب فائل ہو جائے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر کیس حل ہی کیا جائے۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا۔ وہ اب "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تھا اور یہ بات میں کافی دیر سے محسوس کر رہا تھا۔ اس کا رویّہ اب پہلے کے مقابلے میں یکسر بدل چکا تھا جسے سرپرستانہ رویّہ ہی کہا جا سکتا تھا۔

میں نے اس کی بات کے جواب میں صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اسی وقت سیٹھ وشوا ناتھ کا ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ سیٹھ نے اسے سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"سیٹھ جی! بھگوان داس جی آئے ہیں اور ترنت (فوراً) آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" ملازم نے سوالیہ نگاہ کے جواب میں کہا۔

بھگوان داس کا نام سن کر نہ صرف سیٹھ وشوا ناتھ اچھل پڑا تھا بلکہ میں بھی ایک دم چونک اٹھا تھا۔ آخر یہ بھگوان داس کہاں سے اچانک آ ٹپکا؟ اور وہ بھی سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی پر!

"بھگوان داس اور یہاں!" سیٹھ وشوا ناتھ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "آخر اسے یہاں آنے کی ہمت کیسے ہو گئی!" پھر وہ بلند آواز میں ملازم سے مخاطب ہوا۔ "اس سے کہہ دو کہ میں موجود ہوں مگر اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ وہ آئندہ یہاں نہ آئے۔"

ملازم، سیٹھ کا حکم سن کر چلا گیا مگر چند لمحے بعد ہی الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ اس بار وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ وشوا ناتھ کچھ پوچھتا، وہ خود ہی بولا۔ "سیٹھ جی! وہ زبردستی گھسے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے انھیں روکنا بھی چاہا تھا پر وہ نہیں رکے۔"

"اسے دھکے دے کر نکال دو۔" سیٹھ وشوا ناتھ برہم ہو کر چیخا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"دھیرج وشوا ناتھ، دھیرج!" اسی وقت میں نے اپنے عقب

سے ایک آواز سنی اور مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر بھگوان داس کھڑا نظر آرہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کسی ہتھیار کی بجائے کچھ کاغذات نظر آرہے تھے۔ دروازے کے قریب ہی وشوا ناتھ کا ملازم سہم کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"تم... تم یہاں تک آگئے... تمھاری یہ جرأت! میں... میں...!" سیٹھ وشوا ناتھ غصّے کے سبب ہکلانے لگا۔

"وشوا ناتھ! اس سے پہلے کہ تم مجھے اپنی کوٹھی سے دھکّے دے کر نکلواؤ، میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن یاد رکھنا کہ تم اس طرح اپنے ہونے والے جنوائی (داماد) کی توہین کر رہے ہو۔"

"خاموش ہو جا بدزبان!" سیٹھ وشوا ناتھ گلے کی پوری قوت سے چیخا اور غصّے کے سبب اس کا جسم کانپنے لگا۔

میں حیرت سے ان دونوں کے درمیان ہونے والے زبردست ڈائیلاگ سن رہا تھا۔ میری عقل حیران تھی کہ آخر بھگوان داس سیٹھ وشوا ناتھ کا ہونے والا داماد کیسے ہو سکتا ہے؟ گویا وہ سروج جیسی قاتل حسینہ کا شوہر بن جانے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ وہ دونوں ہی اس قدر جذباتی ہو رہے تھے کہ اس کمرے میں میرے وجود کو انھوں نے قطعی فراموش کر دیا تھا۔ ان دونوں کی نگاہیں آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں جیسے دو درندے ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے پہلے مخالف کی طاقت کا اندازہ لگا رہے ہوں۔ معاً میں نے بھگوان داس کو سیٹھ وشوا ناتھ کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"وشوا ناتھ! میں تمھیں کچھ اہم کاغذات کی نقلیں دکھانے لایا تھا۔ لو یہ دیکھو! اور ہاں تم انھیں پھاڑ بھی سکتے ہو کیونکہ ان کی اور بھی نقلیں میرے پاس موجود ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بھگوان داس سیٹھ وشوا ناتھ کے قریب پہنچ گیا اور اس کی طرف اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے کاغذات بڑھائے۔

میں نے سیٹھ وشوا ناتھ کا چہرہ تاریک ہوتے محسوس کیا، پھر اس کا کانپتا ہوا ہاتھ کاغذات کی طرف بڑھتے دیکھا۔

ان کاغذات پر سیٹھ وشوا ناتھ نے بس ایک نگاہ ڈالی تھی اور پھر انھیں بھگوان داس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اب سیٹھ وشوا ناتھ کے چہرے پر غصّے کی بجائے انتہائی گہرے رنج و ملال کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔

"وشوا ناتھ! کیا اب بھی تم مجھے یہاں سے دھکّے دے کر نکلوا دو گے؟" بھگوان داس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ اس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔

جواب میں سیٹھ وشوا ناتھ کچھ نہ بولا۔ اس کا سر جھکتا چلا گیا۔

"تم آخر بازی ہار گئے وشوا ناتھ!" یہ کہہ کر بھگوان داس نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ کاغذات اب اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیے تھے۔

اسی وقت اندرونی دروازے کی طرف سے تیز تیز قدموں کی آواز ابھری، پھر چند لمحے بعد ہی سروج نظر آئی۔ وہ کمرے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئی اور دروازے ہی پر رک کر اس طرح کھوئی کھوئی نگاہ سے ادھر دیکھنے لگی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ بالآخر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "پتا جی! یہ... یہ چاچا بھگوان داس...؟"

"چاچا نہیں صرف پتا بھگوان کہو سروج!" بھگوان داس نے ہنس کر بولا۔ "پتی (شوہر) بھگوان ہی ہوتا ہے۔"

"سروج! تم اندر جاؤ!" سیٹھ وشوا ناتھ کی بھرّائی ہوئی سی آواز ابھری اور اسی وقت اسے وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی تو میں نے دیکھا کہ وہ آبدیدہ تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "انسپکٹر! یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ تم جا سکتے ہو۔"

مجھے مخاطب کیے جانے پر بھگوان داس چونک اٹھا تھا اور اس نے میری طرف بہت غور سے دیکھا تھا۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں یہ نہ جان سکا کہ وہ مجھے پہچان سکا یا نہیں۔ اس کا میرا سامنا صرف ایک بار ہوا تھا، وہ بھی کچھ دیر کے لیے اس وقت جب میرے سابق افسر دلاور خان نے مجھے اس کی نگرانی کا حکم دیا تھا اور میں نے اسی کی کار میں بیٹھ کر پہاڑی دھیرج سے دہلی دروازے تک اس کی نگرانی کی تھی۔

میرے وہاں رکنے کا اب کوئی جواز نہیں رہا تھا اس لیے مجھے دروازے کی طرف قدم بڑھانے پڑے حالانکہ میری خواہش تھی کہ میں رک کر معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کروں۔

میں وشوا ناتھ کی کوٹھی سے نکل آیا۔ ابھی دفتر کا وقت ختم نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے گھر کا رخ کرنے کی بجائے دفتر جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی میں اب تیواڑی جی سے مل کر انھیں تازہ ترین حالات سے مطلع کرنا چاہتا تھا۔ معاملات اس قدر الجھ گئے تھے کہ میری سمجھ میں کچھ کھوپڑی میں نہیں سما پا رہے تھے۔ میں بشیرے اور مجرموں کے غائب ہو جانے سے یوں ہی پریشان تھا کہ سروج اور سیٹھ وشوا ناتھ کے بدلے ہوئے رویوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ پھر اچانک ڈرامائی انداز میں بھگوان داس کے سامنے آنے سے میں اور بھی بوکھلا گیا تھا۔ میں نے سیٹھ وشوا ناتھ سے "انعام" تو ضرور وصول کر لیا تھا مگر میرا ارادہ ہرگز یہ نہیں تھا کہ اس کیس کو دبا دوں اور ایسا ہونا ناممکن ہی تھا۔ میں خود ہی تمام باتوں سے تیواڑی جی کو آگاہ کر چکا تھا۔ میں چاہتا بھی تو وہ مجھے ایسا ہرگز نہ کرنے دیتے۔ وشوا ناتھ اس بات سے بے خبر تھا اور سمجھ رہا تھا کہ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا، اسی لیے اس نے بہت آسانی سے کہہ دیا تھا کہ میں تمام باتیں بھول جاؤں اور کیس کو دبا دوں۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تیواڑی جی کو تمام باتیں بتا دوں گا اور پہلے ہی کی طرح اس بار بھی "انعام" کے ذکر کو گول کر جاؤں گا۔

انھی تمام باتوں پر غور کرتا ہوا میں دفتر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دفتر کی بجائے کسی لائبریری میں آگیا ہوں۔ میرے تینوں ماتحت بڑے انہماک سے اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔

"تو یہ میرے پیچھے باجماعت اخبار بینی ہو رہی ہے یہاں!" میں نے قدرے بلند آواز میں بولا کیونکہ سب سے زیادہ خار مجھے کمار پر تھا۔

"جی ہاں سر!" کمار پُرسکون انداز میں اخبار سے نگاہ ہٹا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی اخبار پڑھا کریں، اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔"

"بکواس مت کرو!" میں نے اسے ڈانٹا۔ "یہ دفتر ہے، سرکاری دفتر، لائبریری نہیں۔"

"میں نے تو آپ کو ایک نیک مشورہ دیا تھا سر! آپ برا مان گئے تو میں اپنے الفاظ واپس لیے لیتا ہوں۔ میں نے تو اس لیے اخبار پڑھنے کا مشورہ دیا تھا کہ شاید آپ کو چالیس سالہ طوائف انوری بائی کے اغوا سے کوئی دلچسپی ہو۔"

"کیا!" میں ایک دم اچھل پڑا۔

"جی ہاں۔" کمار بدستور پُرسکون آواز میں بولا۔ "اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ رات انوری بائی کو چند مسلح افراد نے اغوا کر لیا اور پولیس اغوا کرنے والوں کی تلاش میں ہے۔"

میں نے جواب میں کچھ کہے بغیر کمار کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا مگر مجھے وہ خبر نظر نہ آئی۔ ظاہر ہے کہ مجھے علم نہیں تھا، وہ خبر کس صفحے پر اور کس جگہ چھپی تھی۔

"کہاں ہے وہ خبر؟ جھوٹ بولتے ہو مجھ سے!" میں نے اخبار اس کے سامنے پھینکتے ہوئے خجالت اور غصّے کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"سیدھے سیدھے یوں کیوں نہیں کہتے سر کہ آپ کو وہ خبر نہیں ملی۔" کمار بدستور اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا جس سے مجھے چڑ ہونے لگی تھی۔ اتنی اچھی بات ہو گئی تھی اور وہ ذرا سا بھی پُرجوش نظر نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ نہ اس پر کسی سنسنی خیز خبر کا کوئی اثر ہوتا تھا، نہ میرے غصّے کا وہ کوئی اثر قبول کرتا تھا۔ میں نے اخبار اس کے سامنے پھینکا تو اس نے بڑے اطمینان سے اسے اٹھایا اور ایک صفحہ سامنے کرتا ہوا بولا۔ "یہ رہی وہ خبر!"

میں نے اخبار اس سے لے لیا۔ میری نظر اس خبر کی سرخی پر پڑی۔

"پی ڈی رائٹر کا، ایک چالیس سالہ طوائف انوری بائی کا اغوا"

میں اخبار لے کر اپنی سیٹ پر آبیٹھا اور پوری خبر پڑھنے لگا۔ خبر میں وہی تھا جو زبانی طور پر کمار نے بتایا تھا۔ اخبار کے رپورٹر نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے انوری بائی کی نوجوان و حسین بیٹی نرگس کی بجائے چالیس سالہ طوائف انوری بائی کو اغوا کیا تھا۔

میں نے خبر پڑھ کر اخبار رکھ دیا۔ نہ معلوم کیوں مجھے انوری بائی کا اغوا بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہو رہا تھا۔ کسی نہ کسی طور وہ بھی اس معاملے سے متعلق تھی۔ بشیرے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا، اب انوری بائی کے اغوا کی خبر بھی مل گئی تھی۔ ان دونوں واقعات میں مجھے کسی نہ کسی ربط کی تلاش تھی۔ پھر مجھے دفتری اوقات کے ختم ہونے کا خیال آیا۔ میں نے تیواڑی جی سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں اجازت ہے سر؟" کمال یادو اور میرا نیا ماتحت کورس میں بولے۔

"اور مجھے بھی!" کمار بھی بول پڑا۔

"ہرگز نہیں!" میں فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "میں ابھی گھر نہیں جارہا اور جب تک افسر دفتر میں بیٹھے ماتحتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ چھٹی نہ کریں، سمجھ گئے!"

"سمجھ گئے سر!" کورس پھر سنائی دیا اور اس بار کمار کی آواز بھی اس کورس میں شامل تھی۔

"حرام خور کہیں کے!" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ "افسر تو صبح ہو کہ شام، رات ہو یا دن مارا مارا پھر رہا ہے اور یہ ہیں کہ عیش کر رہے ہیں کمبخت کہیں کے!" میں بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے سے نکل گیا تھا۔

میں تیواڑی جی کے پاس بالکل عین موقع پر پہنچا۔ وہ بس اٹھنے ہی والے تھے۔

"ہاں بھئی، کیا بات ہے اللہ دتا! مجھے آج ذرا جلدی گھر پہنچنا ہے۔ میرا بڑا سالا ادہر دو دن سے آرہا ہے۔" تیواڑی جی نے کہا۔

"سر! حالات نے ایک نئی کروٹ لی ہے جس سے آپ کو مطلع کرنا بہت ضروری..."

"کیا تم کل یہ بات نہیں کر سکتے؟" تیواڑی جی کو شاید جلد سے جلد گھر پہنچنے کی لگی ہوئی تھی۔

"نہ جانے کل تک کیا ہو جائے سر! حالات بہت نازک ہیں۔" میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیسے حالات؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟" تیواڑی جی بیزار سے لہجے میں بولے۔

مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں تیواڑی جی بھی سیٹھ وشوا ناتھ کی طرح ہر بات سے منکر نہ ہو جائیں اور یہ نہ کہنے لگیں کہ میں ہر بات کو بھول جاؤں۔ یہی سوچ کر میں جلدی سے بولا۔ "سر! انوری بائی کو

گزشتہ رات کچھ مسلح افراد نے اغوا کر لیا ہے۔" میں نے یہ بات پہلے اس لیے کی تھی کہ ابتدا ہی میں سنسنی خیزی پیدا ہو سکے۔

"تو تم مجھے یہی بتانے آئے تھے؟" تیواڑی جی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "میں یہ خبر صبح ہی پڑھ چکا ہوں۔"

"میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا سر کہ انوری بائی کا اغوا اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں لالہ! تمھیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو تفتیش کرو۔ ویسے پولیس بھی اغوا کرنے والوں کی تلاش میں ہے۔ اس سلسلے میں تم اُس پولیس انسپکٹر سے بھی مل سکتے ہو جو انوری بائی کے اغوا کی تفتیش کر رہا ہے۔ بس یا تمھیں کچھ اور کہنا ہے؟"

"کہنا تو بہت کچھ ہے سر! مگر آپ ٹھنڈے دل سے میری بات تو سنیں۔" میں ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"تو کیا تمھارے خیال میں میں اپنے کان بند کیے بیٹھا ہوں!" تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑکیں اور میں دہشت زدہ ہو گیا۔

"میرا... میرا یہ مقصد نہیں تھا سر!" میں گھگھیایا۔

"پھر کیا مقصد تھا؟" تیواڑی جی بلا وجہ گرم ہو گئے۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم سر!" میں گڑگڑا کر کہہ گیا۔

"اللہ دتا!" تیواڑی جی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو!"

"نہیں تو سر!"

"پھر کیا چاہتے ہو تم؟"

"آپ کو سیٹھ وشوا ناتھ کیس کے بارے میں تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنا۔" میں نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"یہی بات تم پہلے نہیں کہہ سکتے تھے؟ خواہ مخواہ میرا اتنا وقت ضائع کر دیا جبکہ میں بتا چکا ہوں کہ میرا بڑا سالا دہرادون سے آ رہا ہے۔" تیواڑی جی سخت لہجے میں بولے۔ "ہاں بتاؤ! تم تو آج صبح کہہ رہے تھے کہ کیس بس ختم ہونے کو ہے۔ وہ منڈا ابشیرے ہاتھ لگا؟"

"جی نہیں سر!" میں نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ "وہ لاپتا ہو چکا ہے۔ میں نے کمار اور کمال کو بھیجا تھا۔ وہ دونوں جی بی روڈ کا ایک ایک کوٹھا دیکھ آئے مگر وہ نہیں ملا۔"

"کیا اس کا پتا پولیس سے حاصل نہیں کیا گیا تھا؟" تیواڑی جی نے مجھے گھورا۔

"پتا حاصل کر لیا گیا تھا مگر وہ اپنے ٹھکانے پر نہیں ملا۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔"

"ہوں!" تیواڑی جی کچھ سوچنے لگے۔ "اور اس بھگوان داس کا کیا رہا؟"

"وہ بھی غائب ہو گیا تھا مگر پھر مل گیا۔" میں نے ...

"کیا مطلب؟"

"اس بات کی وضاحت کے لیے مجھے ذرا تفصیل ... گا اور آپ کو ابتدا سے آج پیش آنے والے واقعات ... میں بولا۔

"اچھا تو پھر شروع ہو جاؤ مگر یہ خیال رہے کہ میں ... کا عادی نہیں ہوں۔" تیواڑی جی نے مجھے وارننگ دی ... پھر کیا تھا، میں نے کسی طوطے کی طرح اقصہ ... بس درمیان میں "انعام" والے مسئلے کو گول کر گیا۔

تیواڑی جی مجھ سے تمام حالات جان کر کچھ دیر خا... جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر معاً مجھ سے بولے۔ "ا... سے کر آؤ۔"

ان کے انداز و اطوار سے اب ایسا معلوم ہو رہا تھا ... انھیں گھر جانے کی جلدی نہ ہو۔ مجھے فائل لانے کے ... نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کچھ دیر بعد کیس کی فائل لیے میں ان کے سامنے ... تیواڑی جی فائل کی ورق گردانی کرنے لگے، پھر آخر ... فائل اتنی زور سے میز پر پٹخی کہ میں اچھل پڑا۔

"یہ فائل تمھیں کس لیے دی گئی تھی؟" انھوں ... میں پوچھا۔

"تفتیش... تفتیش کرنے کے لیے سر!" میرا حلق خشک ...

"لیکن تم نے جو تفتیش کی اس میں لکھی؟"

"وہ سر!... وہ مجھے اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی ... تو... پتا ہے سر!... سر کہ میں دن رات تفتیش ہی میں ... ہوں... پھر... پھر میں اس فائل کی خانہ پُری کب کرتا ...

"اگر تم دلاور خان کی طرح اس کیس پر کام کرتے ... کا شکار ہو جاؤ..."

"خدا نخواستہ!" میں درمیان میں بول اٹھا۔

"کیا؟" تیواڑی جی نے آنکھیں نکالیں۔

"کچھ نہیں سر!" میں رو دینے کے انداز میں بولا ...

"تم کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ اور یہ کیس کسی ... کے سپرد کرنا پڑے تو؟" تیواڑی جی نے اپنی بات ... "ابھی اور اسی وقت فائل مکمل کر کے لاؤ۔ میں تمھا... ہوں۔"

"آپ کو سر! آج... آج جلدی بھی تو جانا تھا ... سالے دہرادون سے..."

"جہنم میں جھونکو اسے!" تیواڑی جی برہم ہو کر ...

... رہے سر!" میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

... بہتر ہے؟" تیواڑی جی نے میری طرف نگاہ اٹھا کر مونچھیں ...ں۔

... کہ میں... میں ابھی فائل کو مکمل کر کے لاؤں۔" میں ... بنائی۔

... دفع ہو جاؤ!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔

... فائل لے کر اپنے کمرے میں پہنچا تو کمار کے علاوہ میرے ... منہ لٹکائے ہوئے تھے جیسے شدید حالتِ غم میں ... ان بچوں کی مانند جنھیں اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد ... راستے نے روک لیا ہو۔ میں ان پر ایک نظر ڈالتا ہوا اپنی ...ا۔

... نے فائل اور قلم کھول کر لکھنا شروع کیا مگر بار بار ان کے کھانسنے ... سے میرا دھیان بٹنے لگا۔ میں لکھتے لکھتے ایک دم سر اٹھا کر ... بولا۔ "تم سب دفع ہو جاؤ!"

... اور میرا نیا ماتحت تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے مگر کمار اپنی جگہ ... رہا۔

... کیوں بیٹھے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

... جب تک افسر دفتر میں بیٹھے ماتحتوں پر بھی لازم ہے کہ چھٹی نہ ... اپنے بڑے سکون کے ساتھ خود میرا ہی وہ جملہ دہرا دیا جو ... میں نے کہا تھا۔

... یہ میرا حکم ہے کہ تم اس وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ!" میں ... ہاتھ مار کر کہا۔ "اس وقت میں ایک اہم رپورٹ لکھ رہا ہوں ... کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔"

... آپ ہر روز کا کام اسی روز ختم کر دیا کریں تو آپ کو اتنی ..."

... تم سے مشورہ نہیں مانگ رہا ہوں سمجھے! تم جا سکتے ہو!" میں نے ... بلا کرتے ہوئے کہا۔

... بمشکل ٹلا تو میں دوبارہ فائل کا پیٹ بھرنے لگا۔ وہ کمبخت ... میرے منہ لگنے لگا تھا۔ میں نے سوچا کسی وقت تیواڑی جی ... ہوا تو کم از کم اپنے پاس سے اس بدبخت کا پتا ضرور صاف ...

... کی خانہ پُری میں مجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ میرا حافظہ بلا ... ایک ایک بات بالکل صحیح اور من و عن لکھی تھی اور ... وہ خط بھی لگا دیا تھا جو مجھے ایک مجرم سے جھگڑے کے ... ملا تھا۔ اس خط کے علاوہ جو مجھے مجرموں نے جو دھمکی آمیز ... وہ بھی فائل میں لگا کر میں تیواڑی جی کے پاس پہنچ گیا۔

... نے آج تک کی کل تفتیش فائل میں لکھ دی ہے؟" تیواڑی جی ... لیتے ہوئے بولے۔ ان کے لہجے سے پتا چل رہا تھا جیسے انھیں یقین ہو کہ میں انٹ شنٹ رپورٹ لکھ لایا ہوں۔ انھوں نے اس بات کا اظہار بھی کر دیا۔ "نہ معلوم کتنی باتیں ایسی ہوں گی جو تم بھول گئے ہو گے اور فائل میں نہیں لکھی ہوں گی۔ خیر میں خود دیکھتا ہوں۔"

"سر! کوئی بات ایسی نہیں جو میں بھول گیا ہوں یا فائل میں نہ لکھی ہو۔" میں نے انھیں یقین دلایا۔ وہ شاید میرے حافظے کی قوت سے آگاہ نہیں تھے۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔" وہ اس طرح بولے جیسے میرا امتحان لینے والے ہوں اور بہت جلد میری ناکامی کا اعلان کر کے حکم دینے والے ہوں، بن جا مرغا!

تیواڑی جی فائل کی ورق گردانی کرنے لگے۔ میں نے ان پر اپنی قوتِ حافظہ کا رعب ڈالنے کے لیے کہا۔ "سر! آپ اس فائل میں درج کوئی بھی بات مجھ سے پوچھ کر دیکھ لیں۔ میں بتا دوں گا کہ وہ بات فائل کے کس صفحے پر درج کی گئی ہے۔"

فائل پڑھتے پڑھتے میری بات سن کر تیواڑی جی نے سر اٹھایا اور بڑی غصیلی نگاہ سے مجھے دیکھ کر بولے۔ "اور نہ بتایا گیا تو؟"

"تو پھر... پھر سر! آپ مجھے جو سزا دیں گے قبول کر لوں گا۔"

"بتاؤ مجرموں کا حلیہ فائل کے کس صفحے پر درج ہے؟" تیواڑی جی واقعی میرا امتحان لینے لگے۔

میں نے ذہن پر زور ڈالا اور فوراً ہی میری آنکھوں میں صفحہ نمبر پانچ گھوم گیا جس کے وسط میں لکھا تھا۔ ان مجرموں کا حلیہ مندرجہ ذیل ہے۔ میں نے تیواڑی جی کے سوال کا جواب دیا۔ "صفحہ نمبر پانچ کے وسط میں سر!"

تیواڑی جی نے میرا جواب سن کر فائل کے صفحے پلٹے اور ایک صفحہ پڑھنے لگے، پھر انھوں نے جس قدر غصیلی نگاہ سے مجھے دیکھا تھا، اسی قدر حیرت اور غیر یقینی نگاہ سے دیکھا۔ چند لمحے توقف کے بعد انھوں نے ایک اور سوال کیا۔ "تم جو ابھی رپورٹ لکھ کر لائے ہو اس میں شیرے کا تذکرہ تم نے کس صفحے پر کیا ہے؟"

"صفحہ نمبر آٹھ کی ابتدائی سطروں میں سر!" میں نے فوراً جواب دیا۔

"حیرت انگیز!" تیواڑی جی خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "واقعی حیرت انگیز!" پھر انھوں نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا! مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ تم اتنی خوبیوں کے مالک ہو!"

"سر! آپ کی عزت افزائی ہے۔" میں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"اب میں سوچ رہا ہوں کہ آئی جی صاحب نے مجھے جو نیا کیس دیا ہے، وہ بھی تمھارے ہی سپرد کر دوں ورنہ میرا خیال تھا کہ یہ کیس دلاور خاں کو دوں گا۔" تیواڑی جی نے مجھے تعریفی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دلاور خاں!" میں حیرت سے بولا۔ "مگر وہ تو سر! زخمی ہو چکے ہیں..."

"اب وہ صحت یاب ہو چکا ہے اور کل سے ڈیوٹی پر آنے والا ہے،" تیواڑی جی نے بتایا، پھر بولے "خیر نئے کیس پر بعد میں بات ہوگی، پہلے ہم وشوا ناتھ کیس پر گفتگو کریں گے۔" یہ کہہ کر انھوں نے

طویل سانس لیا اور کچھ دیر خاموش رہے۔ تقریباً ایک منٹ بعد انھوں نے گفتگو کا آغاز کیا "میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں کچھ نتائج اخذ کیے ہیں، تم بھی غور کرو کہ میرے اخذ کیے ہوئے نتائج کس حد تک درست ہیں۔ پہلا مسئلہ مجرموں کا ہے کہ ان کا تعلق کہاں سے ہے؟ اس سلسلے میں پہلے تم اپنا خیال ظاہر کرو۔"

"مجرموں کے سلسلے میں دو بار ایک شہر کا نام آیا ہے یعنی بمبئی!" میں چند لمحے سوچ کر بولا "پہلی مرتبہ بھگوان داس کے اس بیان میں جو اس نے دلاور خاں کو دیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ بمبئی میں موجود اس کے کسی دوست نے مجرموں کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ بھگوان داس کو یہ لوگ اچھے کردار کے معلوم نہیں ہوئے تھے اس لیے اس نے انھیں اپنے یہاں رکھنے کی بجائے ایک مکان کرائے پر دلا دیا تھا۔ اسی ضمن میں دوسری تصدیق بھی خود بھگوان داس ہی کی زبانی سامنے آئی۔

گزشتہ شب جب میں اس کی کار کا تعاقب کرتا ہوا بارہ ٹونٹی کے ایک مکان تک پہنچا پھر اس کے اور مجرم کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو بھگوان داس کی زبان سے یہ سنا کہ اس نے مجرموں کو بمبئی سے دہلی بلوایا تھا۔ اگر بھگوان داس کا پہلا بیان یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ اس طرح وہ دلاور خاں کو اپنی طرف سے مطمئن کرنا چاہتا تھا تو وہ گفتگو جو اس نے گزشتہ شب مجرم سے کی، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ مجرموں کا تعلق بمبئی سے ہے۔" یہ کہہ کر میں داد طلب انداز میں تیواڑی جی کو دیکھنے لگا۔

تیواڑی جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، شاید میرے آخری فقرے کو سن کر! "بہت خوب!" وہ ہنس کر بولے "تم نے درست نتائج اخذ کیے، مجھے تم سے اتفاق ہے۔ تم نے جو کچھ کہا، اس سے ایک اور بات سامنے آتی ہے کہ مجرموں کو یہاں بلوانے والا شخص بھگوان داس تھا۔ اب ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھگوان داس نے انھیں یہاں کیوں بلوایا؟ اور یہ بہت اہم سوال ہے۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی مجھے سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔

"اس موقع پر مجھے وہ خط یاد آ رہا ہے جس کا مختصراً ذکر میں نے فائل میں بھی کیا ہے، مجرموں کی طرف سے لکھا ہوا پہلا خط جو انھوں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو تحریر کیا تھا۔" یہ کہہ کر میں وہ خط یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا جو کافی عرصہ قبل پڑھا تھا مگر حسبِ عادت میرے ذہن نے اسے "ٹیپ" کر لیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر خواب کے سے عالم میں بولنے لگا۔ "وہ خط کچھ یوں شروع ہوتا تھا۔ بھگوان داس سے ہمارا یہ سودا طے ہوا تھا کہ ان کاغذات کے بدلے ہم وہ قیمتی زیورات

اپنے پاس رکھ لیں گے اور کاغذات اسے دے دیں گے۔ بات بھی طے ہوئی تھی کہ وہ کاغذات وصول کرنے سے پہلے ہمیں دے گا مگر وہ اپنے سودے سے پھر گیا۔ اس نے ہمیں صرف زیورات پر ٹرخانا چاہا اسی لیے ہم نے اسے کا... مگر اس کے باوجود ہمیں امید تھی کہ وہ مطلوبہ رقم دے دے گا مگر ابھی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ اس گھر پر چھاپہ... ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے حفاظت کی خاطر وہ زیورات... دیے تھے لیکن..."

"شہر واللہ دتا!" اچانک تیواڑی جی کی آواز... ٹکرائی اور میرے صفحۂ ذہن پر جو الفاظ ابھر رہے تھے... گئے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ تیواڑی جی اب کہہ رہے تھے "تم واقعی حیرت انگیز صلاحیت کے مالک ہو۔" یہ کہہ کر میز کی دائیں جانب ہاتھ بڑھا کر کوئی شے دبا دی، پھر... تمھاری آواز ٹیپ کر لی اور اب اسے دوبارہ سنو... کہ اب ہمیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے یعنی بھگوان... کو یہاں کیوں بلوایا ہے؟ اچھا تو غور سے اپنی آواز...

چند لمحے بعد ہی دوبارہ میری آواز کمرے میں گ... پہلی بار اپنی آواز ٹیپ پر سنی تھی اس لیے مجھے بڑا... سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر جیسے ہی میری آواز... اور "شہر واللہ دتا" سنائی دی، تیواڑی جی نے ہاتھ... کا بٹن دبا دیا۔

"مجرموں کے اس خط سے پتا چلتا ہے کہ بھگوان... کے پاس موجود کچھ کاغذات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجرموں کو یہاں بلوایا۔ بھگوان داس اور وشو... میں شریکِ کار بھی رہ چکے ہیں جیسا کہ تم نے فائل میں... صورت میں بھگوان داس کو وشوا ناتھ کی بہت سی با... ہے۔ اس کے علم میں یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ وشوا... جو اسے مطلوب ہیں، کہاں ہوں گے۔" تیواڑی جی روا... جا رہے تھے اور میں غور سے ان کی باتیں سن رہا... نے اس سلسلے میں مجرموں کو قیمتی زیورات کا لالچ د... کے بدلے بھی کچھ رقم دینے کا وعدہ کیا جس سے بعد... مجرموں نے وہ کاغذات پڑھ کر مزید فائدہ اٹھانے... زیورات کی حیثیت ضمنی ہے کہ اصل اہمیت ان کاغذ... انھی کاغذات کے سلسلے میں مجرموں نے وشوا ناتھ کو...

اب سوچنا یہ ہے کہ بھگوان داس وہ کاغذات کیوں... تھا اور ان کاغذات کی اہمیت کیا تھی؟" یہ کہہ کر... ہو گئے۔"

"مگر سر! سیٹھ وشوا ناتھ کا بیان تو یہ تھا کہ وہ کاغذات ایک یتیم خانے کے تھے۔" میں نے کہا۔

"یہ بیان غلط بھی ہو سکتا ہے۔" تیواڑی جی بولے۔

"مگر اس کے اس بیان کی تصدیق ہو چکی ہے۔"

"ممکن ہے وشوا ناتھ نے یہ بیان اسی لیے دیا ہو کہ ہمیں غلط راستے پر ڈالنا چاہتا ہو اور اس طرح وہ اصل کاغذات اور ان کی اہمیت سے ہماری توجہ ہٹانا چاہتا ہو۔ ذرا سوچو کہ وہ یتیم خانے کے ان کاغذات کی وجہ سے مجرموں کو ہزاروں روپے کے قیمتی زیورات دے دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ دس ہزار روپے نقد بھی مجرموں کو دے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید بیس ہزار روپے بھی دینے پر آمادگی کا اظہار کرتا ہے۔ کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے؟ اتنی بڑی رقم میں تو وہ ایک کیا درجن بھر یتیم خانوں کے لیے نئی جائیداد خرید کر دے سکتا ہے۔ وشوا ناتھ نے یقیناً ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا تھا۔ بے شک یتیم خانے کے کاغذات بھی کسی کے پاس دبے ہوں گے مگر مجرم اسے جن کاغذات کے سلسلے میں بلیک میل کر رہے تھے، وہ کاغذات یتیم خانے کے نہیں ہوں گے۔" تیواڑی جی کا لہجہ پُر یقین تھا۔

"پھر وہ کاغذات کیسے تھے؟" میں با آوازِ بلند سوچنے لگا۔

"تم نے فائل میں لکھا ہے، ان کاغذات کے بارے میں وشوا ناتھ نے تم سے کہا تھا کہ کیس کی تفتیش میں ان کا ذکر نہ آئے اور تم خاموشی سے وہ کاغذات اسے دے دو۔"

"جی ہاں۔" میں نے تصدیق کی۔

"اس بات کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟" تیواڑی جی بولے، پھر مجھے خاموش دیکھ کر خود ہی کہنے لگے "اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ان کاغذات میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو قانون کی گرفت میں آ سکتی تھی۔ اگر یہ بات فرض کر لی جائے تو پھر وشوا ناتھ کا بلیک میل ہونا بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔"

"مگر بھگوان داس کو ان کاغذات سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟" میں نے کہا۔

"بھگوان داس خود بھی امیر آدمی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مالی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا ہوگا۔" تیواڑی جی بولے "ہاں آج جو وہ وشوا ناتھ کی کوٹھی میں بیٹھا رہا، اس سے ایک نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے، سمجھے کچھ؟"

"جی نہیں سر!" میں نے اعتراف کیا۔

"بھگوان داس اور وشوا ناتھ کے درمیان ہونے والی گفتگو یاد کرو۔" تیواڑی جی نے کہا۔ "وشوا ناتھ کی بیٹی سروج نے بھگوان داس کو باپا کہا تھا، تم نے بتایا تھا نا!"

"جی سر!"

"جواب میں بھگوان داس نے اس سے کیا کہا تھا؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

"کہ وہ اسے صرف بھگوان داس کہے اور یہ کہ پتی (شوہر) تو لیں بھی بھگوان سمان ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اور اس سے پہلے بھی بھگوان داس نے وشوا ناتھ سے کہا تھا کہ وہ اس کا ہونے والا داماد ہے۔"

"جی ہاں، اسی طرح کی کوئی بات کہی تھی۔" میں جلدی سے بولا۔

اب میرا ذہن بھی ایک نتیجے تک پہنچتا جا رہا تھا۔

"بھگوان داس کو پہلے وشوا ناتھ کوٹھی سے دھکے دے کر نکلوا دینا چاہتا تھا مگر بعد میں اس کا سر جھک گیا تھا، ان کاغذات کی نقلیں دیکھ کر جو اسے بھگوان داس نے دکھائے تھے۔" تیواڑی جی بولے "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان دونوں کے تعلقات خوش گوار نہیں کشیدہ تھے۔ ان حالات میں بھگوان داس کا یہ کہنا کہ وہ وشوا ناتھ کا ہونے والا داماد ہے، کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے؟"

اب میرا ذہن واضح طور پر ایک نتیجے تک پہنچ چکا تھا اسی لیے میں نے فوراً کہا "بھگوان داس، وشوا ناتھ کی بیٹی سروج سے شادی کرنا چاہتا ہوگا اور وشوا ناتھ نے اس کی عمر دیکھتے ہوئے سختی سے انکار کر دیا ہوگا۔ بھگوان داس نے اسی لیے وہ کاغذات حاصل کرنا چاہے ہوں گے کہ وشوا ناتھ پر اس سلسلے میں دباؤ ڈال کر اسے مجبور کر سکے۔"

"بالکل یہی بات ہے لیکن اس میں ایک بات الجھا دینے والی ہے۔" تیواڑی جی یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے، پھر خود ہی بولے "بھگوان داس کے آنے سے پہلے وشوا ناتھ کا تمھارے ساتھ رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے تم سے جو باتیں کیں، ان سے تو ایسا پتا چلتا ہے جیسے کاغذات اسے مل گئے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تم سے یہ کیوں کہتا کہ کیس دبا دو۔"

"جی ہاں، سر! میں بھی اس وقت یہی سمجھا تھا کہ اس نے مجرموں کا مطالبہ پورا کر کے ان سے کاغذات حاصل کر لیے ہیں۔"

"پھر بعد میں وہ کاغذات بھگوان داس کے پاس نکلے، یہ کیسے ہوا؟"

"اس کے علاوہ یہ بھی کہ سیٹھ وشوا ناتھ نے دعویٰ کیا تھا، وہ قیمتی زیورات بھی اس کے پاس موجود ہیں جو چوری ہو گئے تھے جب کہ مجرموں کے اس خط سے جو میرے ہاتھ چڑھ گیا تھا، یہ بات پتا چلتی ہے کہ سیٹھ وشوا ناتھ نے وہ قیمتی زیورات مجرموں کو دے دیے تھے۔"

"ہاں یہ بات سوچنے والی ہے۔" تیواڑی جی نے یہ کہہ کر میز پر رکھا ہوا اپنا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی، پھر کش لیتے ہوئے کہا "وشوا ناتھ کو مجرموں کا مطالبہ پورا کرنے کے بعد کاغذات تو مل سکتے تھے کیونکہ وہ مجرموں کے کس کام کے تھے مگر زیورات کی واپسی کا سوال پیدا

نہیں ہوتا۔" بات کرتے کرتے تیواڑی جی رکے اور مجھ سے پوچھا "تھک گئے ہو گے؟"

"جی... جی نہیں سر... جی نہیں۔"

"ہوں! بیوقوف! یوں بھی دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت تم خود کو میرا ماتحت تصور نہ کرو۔ ہم دوستانہ فضا میں بات کر رہے ہیں۔" تیواڑی جی نے یہ کہہ کر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آ رہے تھے۔ اس دوران میں ان کی مونچھیں ایک بار بھی نہیں پھڑپھڑائی تھیں۔

چپراسی کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے دو کپ چائے لانے کا حکم دیا۔ چائے آنے تک وہ خاموش ہی بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔

جب چائے آ گئی اور وہ اس کی دو چار چسکیاں لے چکے تو بولے۔ "خیر زیورات کا مسئلہ تو ضمنی ہے اور اس کی تصدیق بھی ہو سکتی ہے کیونکہ میں نے وہ زیورات دیکھے تھے۔ وشوا ناتھ سے کسی بہانے وہ زیورات دکھانے کے لیے کہا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہمیں یہ سوچنا ہے کہ مجرموں نے کاغذات کا سودا کس سے کیا، سیٹھ وشوا ناتھ سے یا بھگوان داس سے؟"

معاً میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا اور میں بول اٹھا۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا سر کہ مجرموں نے دونوں ہی افراد سے سودا کیا ہو؟"

"یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"انھوں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو تو اصل کاغذات دیے ہوں اور ان کی فوٹو کاپیاں بھگوان داس کو دے دی ہوں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے بھگوان داس کے ہاتھ میں فوٹو کاپیاں ہی دیکھی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

تیواڑی جی میری بات سن کر چونک پڑے۔ "یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی! بالکل سامنے کی بات تھی۔ تمھارا خیال قطعی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ اسی صورت میں وشوا ناتھ کے بدلے ہوئے رویے کا جواز بھی پیدا ہو جاتا ہے۔"

"لیکن سر! انوری بائی کے اغوا اور بشیرے کے لاپتا ہونے کو کس خانے میں فٹ کیا جا سکتا ہے؟" میرے ذہن میں جو سوال بہت دیر سے ادھم مچا رہا تھا وہ آخر زبان پر آ ہی گیا۔ "یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مجرم مطالبے کی رقم وصول کرنے کے بعد یہاں رکے ہوں۔ ان دونوں کو سامنے سے ہٹانے کا یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ مجرم وہ راہ بند کر دینا چاہتے ہوں جس کے ذریعے ان تک پہنچا جا سکے۔ اگر سیٹھ وشوا ناتھ یا بھگوان داس سے ان کا سودا ہو رہا تھا اور اس کے بعد انھیں یہ شہر چھوڑ دینا تھا تو پھر انھوں نے انوری بائی اور بشیرے کو سامنے سے کیوں ہٹایا؟"

"اخباری اطلاع کے مطابق انوری بائی کے اغوا کی وا رات نو بجے کے قریب ہوئی اور غالباً یہ وہی وقت ہے جب بارہ ٹوٹی کے علاقے میں مجرموں کے دو ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ اندازہ درست ہے؟"

"جی ہاں سر! تقریباً یہی وقت ہو گا۔" میں نے جواب د

"یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جن مسلح افراد نے انوری با کیا، ان کی تعداد تین تھی۔ مختلف شواہد اور تفتیش سے پتہ چ مجرموں کی تعداد چار تھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت انور کو اغوا کیا جا رہا تھا، مجرموں میں سے دو بارہ ٹوٹی کے علاقے میں شاید ان کا کوئی ساتھی لال قلعے کے اطراف میں منڈلا رہا ہو تا قلعے کی دیوار پر جو لکھے اُسے وہ پڑھ سکے۔ ان باتوں سے پتا چل کہ انوری بائی کو اغوا کرنے والے یہ مجرم ہرگز نہیں تھے۔ ایسی صو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ انوری بائی کے اغوا کی واردات کسی کا سبب ہو۔"

"لیکن سر! پھر بشیرا کیوں لاپتا ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"ممکن ہے کہ مجرموں نے بطور احتیاط اُسے کچھ دن کے ہو جانے کا مشورہ دیا ہو۔" تیواڑی نے جواب دیا۔ "بہرحال جب انوری بائی بازیاب نہیں کر لی جاتی، کچھ کہنا مشکل ہے اور بشیر کب تک روپوش رہے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی بات فیصلہ کن جا سکتی ہے۔"

"اگر کسی طرح وہ کاغذات ہاتھ آ جائیں سر تو بہت سی ہو سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں سر کہ وشوا ناتھ یا کو اس پر مجبور کیا جائے؟"

"وہ دونوں ہی بہت با اثر افراد ہیں اس لیے ایسا ممک سرکاری حلقوں تک ان دونوں ہی کی پہنچ ہے لیکن بہرحال کا سراغ تو لگانا ہی پڑے گا۔ اس کی صرف ایک صورت ہے"

"وہ کیا؟" میرے دل میں اشتیاق پیدا ہوا۔

"یہ بات میں تمھیں کل بتاؤں گا۔ فی الحال ایک کام ک" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "تم اس پولیس انسپکٹر سے ملو جو کے اغوا کی تفتیش کر رہا ہے۔ جس وقت انوری بائی کو اغوا کیا کچھ تماشبین بھی موجود تھے۔ پولیس انسپکٹر نے یقیناً ان کے بیا لیے ہوں گے اور تماشبینوں سے اغوا کرنے والوں کا حلیہ بھی اس طرح یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے گی کہ انوری بائی کو نے اغوا نہیں کیا جو وشوا ناتھ کو بلیک میل کر رہے تھے۔ یہ کا کسی ماتحت سے بھی لے سکتے ہو۔"

"بہتر ہے، میں کل صبح ہی یہ کام کر لوں گا۔" میں نے

میں سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی کر رہا تھا۔ کیا اب بھی نگرانی ی رکھی جائے؟"

"ہاں فی الحال یہ ضروری ہے۔" تیواڑی جی نے جواب دیا۔ "ن ہے کوئی نئی بات سامنے آ جائے۔" اس کے بعد تیواڑی جی اُٹھ ے ہوئے۔ "اچھا اب چلا جائے۔"

اس روز میں بہت خوش خوش گھر لوٹا۔ خود تیواڑی جی نے مجھے میں گھر پہنچایا۔ اس خوشی میں اس رات میں اپنی مرہم پٹی بھی کرانا ... دوسرے ... صبح جراح کے پاس پہنچ سکا۔

دوسرے روز دفتر پہنچتے ہی میں نے کمار کی پریڈ لگوا دی۔ حالانکہ ام میں کمال سے بھی لے سکتا تھا مگر میں نے دانستہ کمار کو جی بی کے تھانے بھیجا۔

کمار تقریباً گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ہی لوٹ آیا تھا اور اس دوران میں نے پورا اخبار چاٹ ڈالا تھا۔ میں نے ہر اہم اور غیر اہم خبر پڑھ ڈالی

کمار سے مجھے انوری بائی کو اغوا کرنے والوں کا جو حلیہ معلوم ہوا ے تیواڑی جی کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ ان تینوں میں سے کسی بھی بلیک میلنگ میں ماخوذ مجرموں سے نہیں ملتا تھا۔ اس کے کمار نے ایک اور دھماکا خیز اطلاع دی تھی۔ وہ اطلاع یہ تھی ری بائی اپنے کوٹھے پر پہنچ گئی مگر اس میں پولیس کی کوششوں کو دخل نہیں تھا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے ہی رہا کر دیا تھا۔ جس وقت اس پولیس انسپکٹر سے ملا تھا تو اس پولیس انسپکٹر کو یہ اطلاع ملی تھی وہ یہ اطلاع پا کر انوری بائی کا بیان لینے روانہ ہو گیا تھا۔

میں نے کچھ دیر غور کیا، پھر کمار کو حکم دیا کہ وہ انوری بائی کو ساتھ آئے۔ میرے خیال میں انوری بائی سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔

کمار میرے حکم پر دوبارہ جی بی روڈ روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ان دونوں میں سے میرا ایک ماتحت آ گیا جن کے سپرد سیٹھ وشوا ناتھ نگرانی تھی۔ اس نے بتایا کہ رات آٹھ بجے کے قریب سیٹھ وشوا ناتھ اپنی یں بیٹھ کر قطب روڈ گیا تھا جہاں ایک عمارت میں اس نے کئی گھنٹے ے تھے۔ اس دوران میں نگرانی کرنے والے نے وہاں باری باری افراد کو آتے دیکھا تھا جن میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ ایسا معلوم رہا تھا جیسے وہ لوگ وہاں کسی خاص غرض سے جمع ہوئے تھے۔ نگرانی نے والے نے یہ ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ اس عمارت کے قریب جا کر ہونے والی کارروائی کا جائزہ لیتا یا ان لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش ا کیونکہ اُسے صرف سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی کا حکم دیا گیا تھا۔

سیٹھ وشوا ناتھ کے بارے میں یہ اطلاع میرے لیے بڑی عجیب ی۔ میں نے سوچا کہ تیواڑی جی سے ملاقات ہونے پر انھیں اس سلسلے میں ضرور آگاہ کروں گا۔ میرا وہ ماتحت کیونکہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اس لیے میں نے اُسے چھٹی دے دی۔ اس سے پہلے میں نے اس سے قطب روڈ کی اس عمارت کا محل وقوع پوچھ لیا تھا۔

میں نے بطور احتیاط اسی وقت کمال کو قطب روڈ روانہ کر دیا۔ یہ حکم دے کر کہ وہ اس عمارت کے بارے میں معلوم کر کے آئے، وہ کس کی ملکیت ہے اور وہاں کون رہتا ہے۔

حسب توقع کمار جلد ہی لوٹ آیا مگر وہ تنہا تھا۔ میں نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔ "انوری بائی کو ساتھ لے کر نہیں آئے؟"

"کیا اسے یہیں لے آؤں سر؟" کمار شوخی سے بولا۔ "میں نے تو اُسے حوالات میں بند کر دیا ہے تاکہ وہاں آپ کو اس سے تنہائی میں ملنے کا موقع . . ."

"یہ کیا بکواس شروع کر دی تم نے!" میں نے بگڑ کر کہا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ سر آپ کو تفتیش میں آسانی رہے۔ یہ لیجیے حوالات کی چابی۔" کمار نے ایک چابی میری طرف بڑھائی۔ "حوالات نمبر دو!"

میں نے اس سے چابی جھپٹ لی اور بغیر کچھ کہے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر میری مدد کی ضرورت ہو تو میں بھی ساتھ چلوں سر!" کمار کے لہجے کی شوخی بدستور تھی۔

"نہیں!" میں نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

جیسے ہی میں حوالات کا دروازہ کھول کر اندر پہنچا، انوری بائی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

"کیا دیکھے جا رہی ہو انوری بائی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یہ... یہ کہ تم... تم..." وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"ہاں میں وہی ہوں انوری بائی جسے تم نے پرسوں رات اغوا ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے مجھے بشیرے کے ہاتھوں بننے والی اپنی درگت یاد آ گئی اور میں نے فوراً ہی بات بنائی۔ "اگر میں اس روز بیہوش ہو جانے کی اداکاری نہ کرتا تو تمھارے اور بشیرے کے درمیان ہونے والی گفتگو کبھی نہ سن پاتا۔ ہم لوگوں کے کام کرنے کا طریقہ پولیس والوں سے بہت مختلف ہوتا ہے انوری بائی جسے تم نہیں سمجھ سکتیں۔"

"آپ صحیح کہتے ہیں جناب!... بالکل... بالکل صحیح کہتے ہیں۔" آخر کار انوری بائی بولی۔

"اب میں تم سے جو بھی سوال کروں اس کا بالکل صحیح جواب دینا۔ یہ تمھارے ہی حق میں بہتر ہو گا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بہتر ہے جناب!" انوری بائی نے جواب دیا۔ "مجھے اگر معلوم ہوتا کہ اتنی گھسیٹی ہو گی تو کبھی بشیرے کی بات نہ مانتی۔"

"پہلی بات یہ بتاؤ کہ تمھیں وہ لوگ اغوا کر کے کہاں لے گئے تھے؟"

میں نے پوچھا۔

"انھوں نے مجھے بیہوش کر دیا تھا، کوئی چیز سنگھا کر!" انوری بائی نے جواب دیا۔ "جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کمرے میں پایا۔"

"کیا تم نے ان میں سے کسی کو پہلے بھی دیکھا تھا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں وہ تینوں ہی میرے لیے اجنبی تھے۔"

"ہوں۔" میں نے بالکل جاسوسانہ انداز میں سر ہلایا اور ٹہلتے ہوئے دریافت کیا۔ "اب یہ بتاؤ کہ وہ لوگ تم سے کیا چاہتے تھے؟"

جواب میں انوری بائی نے بتایا کہ ان لوگوں نے اس سے وہی سوالات کیے تھے جن کے جوابات معلوم کرنے میں اُس تک پہنچا تھا۔

انوری بائی نے اُسے، جو بھی معلوم تھا، بتا دیا تھا۔ انوری بائی سے وہ لوگ اُن مجرموں کا پتا معلوم کرنا چاہتے تھے جو سیٹھ وشوا ناتھ کو بلیک میل کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ انوری بائی ان سے ناواقف تھی اور نادانستگی میں اُن کا مہرہ بن گئی تھی اس لیے اُس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا اور انھیں بتا دیا تھا کہ جو کچھ اس نے کیا بشیرے کے اشارے پر کیا تھا۔ جب ان اغوا کرنے والوں کو انوری بائی کی باتوں پر یقین آگیا تو انھوں نے اس سے مزید پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ انھوں نے انوری بائی ہی سے بشیرے کا پتا دریافت کیا تھا جو انوری بائی نے انھیں بتا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ انوری بائی کو اُس کمرے میں بند کر کے چلے گئے تھے۔ انوری بائی نے بتایا تھا کہ کوشش کے باوجود اسے نیند نہ آسکی تھی اور اسی رات ہی کو اس نے عمارت کے کسی دوسرے حصے سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی تھیں جیسے کسی فرد یا افراد پر تشدد کیا جا رہا ہو۔ انوری بائی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ان آوازوں میں بشیرے کی آواز بھی شامل تھی لیکن وہ اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ممکن ہے یہ صرف اُس کا شبہہ رہا ہو۔ انوری بائی نے دو راتیں اور ایک دن وہاں گزارا تھا اور اس دوران میں اُس پر نہ تشدد کیا گیا تھا اور نہ اُسے بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔ پھر دوسری رات کی صبح اس نے خود کو اپنے کوٹھے پر پایا تھا۔ غالباً سوتے ہی میں اُسے بیہوشی کی دوا سنگھا دی گئی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئی تھی تو اس کی بیٹی نرگس نے اُسے بتا دیا تھا کہ دو نوجوان انوری بائی کو بیہوشی کی حالت میں کوٹھے پر چھوڑ گئے تھے۔ یہ دونوں انھی نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے اُسے اغوا کیا تھا۔ وہ انوری بائی کی بیٹی نرگس سے کہہ گئے تھے کہ کچھ دیر بعد انوری بائی کو خود بخود ہوش آجائے گا اسی کے ساتھ انھوں نے نرگس کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے شور مچا کر لوگوں کو متوجہ کیا تو وہ آئندہ خود اُسے اغوا کر کے لے جائیں گے۔ نرگس اُن کی دھمکی میں آگئی تھی اور اُس نے شور مچانے سے گریز کیا تھا۔

انوری بائی سے مزید کچھ دیر پوچھ گچھ کے بعد میں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

"کبھی گانا سننے کا جی چاہے یا میری بچی نرگس کے لیے ہو تو حضور غریب خانے پر ضرور تشریف لائیں۔" انوری بائی جاتے دعوتِ گناہ دی۔

"ہاں اگر دل چاہا تو ضرور آؤں گا۔" میں نے یوں ہی انوری بائی کو رخصت کر کے میں تیواڑی جی کے کمرے بڑھا۔ انوری بائی کے بیان سے ایک بالکل نئی کہانی سامنے آ

آخر وہ کون لوگ تھے جو میرے علاوہ مجرموں کی تلاش میں ر

تیواڑی جی اس دن مجھ سے بہت محبت کے ساتھ پیش انھوں نے مجھے فوراً ہی بلوا لیا تھا اور پھر میں اُن کے کمرے میں ہوا تھا تو لپک کر بولے تھے۔ "آؤ آؤ اللہ دتا! میں تمھارا ہی انت تھا۔"

میں نے تیواڑی جی کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی انھیں انو سے معلوم ہونے والی تمام باتوں سے آگاہ کر دیا اور پھر آخر میں کون لوگ ہو سکتے ہیں سر!"

"مجرموں کی تلاش اگر ہمارے سوا کسی اور شخص کو ہو سکتی صرف وشوا ناتھ ہو سکتا تھا۔" تیواڑی جی نے فوراً کہا۔ "اس بھگوان داس کا نام میں اس لیے نہیں لوں گا کہ مجرم براہِ راست سے ملتے رہتے تھے۔"

"لیکن سر! اگر اُسے یہی قدم اٹھانا تھا تو پھر اتنی دیر پھر یہ کہ اُس نے اس سلسلے میں کن لوگوں کی مدد حاصل کی ہے

"ہاں یہ بات سوچنے والی ہے۔" تیواڑی جی نے کہا۔ "ا والوں کا جو حلیہ تم نے بیان کیا ہے، وہ غنڈوں کا حلیہ نہیں ہو اس مسئلے پر بعد میں غور کریں گے۔ اس وقت تو میں نے تمھیں د کے لیے بلایا تھا جو کل بتاتے ہوئے رُک گیا تھا۔ دراصل کل میں اس لیے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں اس بات پر خود بھی اچھی طرح کر لینا چاہتا تھا۔ بہر حال اب میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا ہوں۔"

"میں وہ بات جاننے کے لیے بے چین ہوں سر!" میں بہ

"کل میں کہہ رہا تھا، یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ان کا میں کیا ہے اور یہ جاننے کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ صورت اللہ دتے کہ وہ کاغذات کس طرح حاصل کر لیے جائیں۔"

"مگر کس طرح سر؟" میں حیران ہو کر بولا۔

"سنو! اس بات پر تو خیر شک کیا جا سکتا ہے اور یقین نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کاغذات سیٹھ وشوا ناتھ کی تحویل میں پہنچ

گے مگر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کاغذات کی نقلیں کے پاس ضرور موجود ہوں گی۔" تیواڑی جی نے کہا۔

"مگر آپ ہی نے تو کہا تھا سر کہ اس سلسلے میں بھگوان داس کو ڈ ... نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ وہ بہت بارسوخ شخص ہے۔"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" تیواڑی جی سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے بولے۔ "میں نے بھگوان داس سے کاغذات حاصل کرنے کے لیے ایک اور ہی طریقہ سوچا ہے۔"

پھر تیواڑی جی نے جو کچھ کہا، اُسے سن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ تیواڑی جی یہ بات کریں گے۔

"کیوں، خاموش کیوں ہو گئے اللہ دتا؟" تیواڑی جی نے کہا۔ "کیا یہ طریقہ مناسب نہیں یا تمھیں خوف محسوس ہو رہا ہے؟"

"خوف؟ . . . نہیں ہرگز نہیں سر!" میں سینہ تان کر بولا۔ "جب مجھے آپ کی پشت پناہی حاصل ہے تو خوف کیسا!"

"تو پھر آج رات یہ کام ہو ہی جانا چاہیے۔" تیواڑی جی فیصلہ کن انداز میں بولے۔

میں نے تیواڑی جی سے ہامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری ہوا خراب ہو رہی تھی۔

جب میں تیواڑی جی سے مل کر اپنے کمرے میں پہنچا تو کچھ دیر بعد ہی کمال قطب روڈ سے واپس آگیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ عمارت سیٹھ وشوا ناتھ ہی کی ملکیت ہے مگر عموماً ویران ہی رہتی ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ بس مہینے میں دو ایک بار ہی وہاں کچھ افراد کو دیکھا جاتا ہے جو عموماً چند گھنٹے اس عمارت میں گزار کر چلے جاتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ رات کے وقت بھی وہاں کوئی رہتا ہو۔

میں نے اُس وقت کمال کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میرے ذہن میں تو خیالات کی کھچڑی سی پک رہی تھی اور دل میں رہ رہ کر ہول سے اُٹھ رہے تھے۔

پھر وہ دن تیاریوں میں گزرا۔ اس دوران میں مَیں نے کمال کو بھیج کر یہ پتا بھی کرا لیا کہ بھگوان داس اب اپنی کوٹھی ہی میں واپس آگیا ہے۔

خدا خدا کر کے دفتر کا وقت ختم ہوا مگر جیسے جیسے رات قریب آتی جا رہی تھی میرا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دفتر چھوڑنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے تینوں ماتحتوں کو سمجھایا کہ انھیں کیا کرنا ہے اور ٹھیک رات کے بارہ بجے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے مجھ سے ملنا ہے۔

میں اپنے دفتر سے روانہ ہوا تو اپنے ماتحتوں کی طرح میرے پاس بھی ایک تھیلا تھا جس کے اندر تمام ضروری سامان موجود تھا جو رات کو کام آنا تھا۔

رات کی مہم کے لیے تیواڑی جی نے اپنی جیپ دے دی تھی لیکن اس سے پہلے جیپ کے نمبر بدل دیے گئے تھے۔ کمار کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ کمال اور میرے دوسرے ماتحت کو ان کے گھروں سے لے کر ٹھیک بارہ بجے جامع مسجد پہنچ جائے، جیپ سمیت! جہاں سے مجھے جیپ میں بیٹھنا تھا۔

میں گھر جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ رات بارہ بجے گھر سے نکلنے کے لیے کیا بہانہ کروں؟ آخر سوچتے سوچتے میرے ذہن میں صرف یہی ترکیب آسکی کہ نو دس بجے ہی گھر سے دفتر کے کام کا بہانہ کر کے نکل جاؤں اور رات کو دیر سے آنے کے لیے کہہ جاؤں ورنہ رات کو بارہ بجے گھر سے نکلا تو بہت پوچھ گچھ ہو گی کہ اس وقت کون سا کام درپیش ہے۔ دو تین گھنٹے میں گھوم پھر کر بآسانی گزار سکتا تھا۔

پھر میں نے جو سوچا تھا اُسی پر عمل کیا۔ لے دے تو خیر اس وقت بھی ہوئی مگر میں نے ابا کو اس کی بھنک نہیں لگنے دی اور خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں تھیلا لٹکائے گھر سے ساڑھے نو بجے ہی کھسک لیا۔

سر کے زخم میں اب بھی ہلکی سی کسک تھی لیکن اس وقت تک جراح عبدالحمید خاں اپنا منڈیا بڑھا کر چلے گئے تھے اس لیے میں نے مرہم پٹی کو صبح تک کے لیے ٹال دیا۔

وہ ڈھائی گھنٹے بڑی مشکل سے گزرے۔ پھر ٹھیک بارہ بجے میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے پہنچ گیا اور چند لمحے بعد ہی کمار بھی جیپ لے کر آگیا۔

میں جلدی سے جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا جو شاید میرے ہی لیے خالی چھوڑی گئی تھی۔ کمال اور میرا دوسرا ماتحت جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جیپ کا ڈرائیور کمار تھا۔

جیپ بڑی تیزی سے پہاڑی دھیرج کی طرف اُڑی جا رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی سے میرا ذہن پرواز کر رہا تھا۔

راستے میں ایک تاریک سی جگہ دیکھ کر کمار نے جیپ سڑک کے کنارے روک لی پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہاں لباس تبدیل کر لیے جائیں سر! یہ جگہ مناسب ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور تھیلا لے کر جیپ سے اُتر گیا۔

سڑک کے کنارے پیڑ کی آڑ میں جا کر میں نے سیاہ لباس پہنا اور چہرے پر بھی سیاہ نقاب چڑھا لی، پھر جو لباس اُتارا تھا وہ تھیلے میں رکھ کر اپنی جیب پر ہاتھ رکھا۔ ریوالور جیب میں موجود تھا۔ اس کے بعد میں جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران میں میرے تینوں ماتحت بھی لباس تبدیل کر چکے تھے۔ چند لمحے بعد ہی جیپ پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

میری ہدایت کے مطابق کمار نے جیپ کو بھگوان داس کی کوٹھی کے قریب جا کر ہی روکا مگر یہ کوٹھی کا پچھلا حصہ تھا۔ منصوبے کے مطابق ہم چاروں باری باری چہار دیواری پر چڑھ کر اندر کود گئے۔ کمال یہ دن ہی میں معلوم کر آیا تھا کہ کوٹھی میں سوائے چوکیدار کے اور کوئی نوکر موجود نہیں ہے۔ بقیہ نوکروں کی چھٹی کے دن شاید ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

اندر کودنے کے بعد کچھ دیر ہم نے سُن گُن لی پھر میرے اشارے پر کمار اور کمال کوٹھی کے چوکیدار کا بندوبست کرنے روانہ ہو گئے۔ میں اور میرا ماتحت کیاریوں میں رُکے رہے۔

وہ دونوں خلافِ توقع جلد ہی لوٹ آئے تو میں چونکا۔

"کوئی ہم سے پہلے ہی اُس غریب کو باندھ کر مُنہ میں کپڑا ٹھونس گیا ہے۔" کمار نے بتایا اور میں یہ سُن کر اُچھل پڑا۔ میں نے فوراً ہی اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

میں لرزتے کانپتے قدموں سے اپنے ماتحتوں کے ہمراہ کوٹھی کے عقبی دروازے تک پہنچا تو میرے ذہن کو دوسرا جھٹکا لگا۔ دروازہ کُھلا ہوا تھا۔

"یقیناً کوئی ہم سے۔۔۔ ہم سے پہلے اندر گیا ہے اور۔۔۔ اور شاید ابھی اندر ہی موجود ہے۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

ہم سبھی سیاہ لباس میں تھے اِس لیے مجھے علم نہیں تھا کہ میرے قریب کون ہے ورنہ شاید میں اپنا جی کڑا کر لیتا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میری سماعت سے اس کے دل جلا دینے والی آواز ٹکرائی۔ وہ کمار کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تو پھر اس میں اتنے کانپنے کی کیا بات ہے سر! آپ کا جسم تو اِس طرح کانپ رہا ہے جیسے آپ کو جاڑا بخار آ گیا ہو۔"

اُس کی آواز سُن کر میں غصے سے کھول اُٹھا اور تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر زور سے بولا۔ "بکومت! میں ہرگز نہیں کانپ رہا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سینہ تان لیا، پھر بولا۔ "چلو!" میرے جسم میں غصے کے سبب گرمی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی جس سے یہ فائدہ ہوا تھا کہ میرا جسم کانپنا بند ہو گیا تھا۔

میں اپنے ماتحتوں سمیت دروازے میں داخل ہوا۔ وہ ایک چوڑی سی راہداری تھی۔ کمار نے رہنمائی کے لیے پنسل ٹارچ روشن کر لی تھی جس کی رہنمائی میں ہم راہداری میں بڑھ رہے تھے۔ وہ راہداری کچھ دور چل کر ہی دائیں جانب مڑتی تھی۔ رفتہ رفتہ غصے پر اب پھر خوف غالب آ گیا تھا اور میرا وہ ہاتھ کانپنے لگا تھا جس سے میں نے ریوالور پکڑا ہوا تھا۔ خود کو مزید غصے میں مبتلا رکھنے کے لیے میں نے کمار کا کہا ہوا فقرہ یاد کیا اور ترکیب کارگر رہی۔

دائیں جانب مڑتے ہی کچھ فاصلے پر روشنی نظر آئی۔ وہ روشنی ایک کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ میرے قدم رُکنے لگے اور یہ بات اس کمبخت کمار نے شاید محسوس کر لی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "سر! ڈریں نہیں۔ یہاں کوئی معلوم نہیں ہوتا ورنہ تھوڑی بہت آہٹ تو ہوتی۔"

میرے تن بدن میں پھر آگ لگ گئی اور میں دوبارہ یہ بھول گیا کہ کہاں ہوں۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "احمق آدمی! اگر وہ لوگ ہمیں آتا دیکھ کر چھپ گئے ہوں تو؟ اور پھر وہ اچانک ہی ہم پر حملہ آور ہو جائیں تو؟"

"تو یہ کہ ہم اُن کا مقابلہ کریں گے سر!" کمار نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"مقابلہ کریں گے!" میں نے اُس کے لہجے کی نقل اُتاری اور غصے میں تیزی کے ساتھ بڑھا۔ "مقابلہ تم نہیں، میں کروں گا کیونکہ میں تمہارا افسر ہوں اور تم میرے ماتحت!"

میرے تینوں ماتحت میرے پیچھے تھے اور میں آگے۔ میں غصے کے عالم میں دندناتا ہوا اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے کھلے ہوئے دروازے سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ پھر جیسے ہی میں نے کمرے کا منظر دیکھا میرے مُنہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں تیورا کر فرش پر گر پڑا۔

زندگی میں پہلی بار میں نے ایسا بھیانک منظر دیکھا تھا جسے دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میری اس نازیبا بزدلانہ حرکت کا اثر میرے ماتحتوں پر کیا پڑے گا اور وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔

جس منظر نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ کمرے کے فرش پر ایک لاش پڑی تھی جس کی اطراف خون پھیلا ہوا تھا۔ بیہوش ہونے سے پہلے میں اس لاش کی بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا مگر اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ لاش بھگوان داس کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ دوبارہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ دیر میری سمجھ ہی میں نہ آ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ میں جہاں تھا، وہ جگہ میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔ میں خالی خالی سی نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ایک کمرہ تھا، خالی کمرہ جس میں میرے سوا تمام ہی اشیا بے جان تھیں۔ میں اس کمرے کے ایک صوفے پر دراز تھا۔ آرائش سے وہ کمرہ کسی امیر کبیر شخص کی نشست گاہ معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی اور اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"میں آخر کہاں ہوں اور یہ نشست گاہ کس کی ہے؟" میں نے سوچا۔ پھر جیسے ہی مجھے گزرے ہوئے واقعات یاد آئے، میں ایک دم صوفے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ل۔۔۔ لا۔۔۔ لاش!" میں بےساختہ بڑبڑایا اور میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جو بیہوش ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے اپنے تینوں ماتحتوں کا خیال آیا۔ وہ تینوں کمبخت مجھے تنہا چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے؟ یہ سوچتے ہوئے مجھے غصہ آ گیا۔

میں نے غصے ہی کے عالم میں کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اگر مجھے اپنے ماتحتوں پر غصہ نہ آ گیا ہوتا تو شاید میں اس کمرے سے نکلنے کا تصور بھی نہ کر سکتا۔ غصے ہی کے سبب مجھے یہ احساس نہ ہو سکا کہ اب میرے جسم پر سیاہ چست لباس موجود نہیں تھا اور نہ ہی میرے چہرے پر سیاہ نقاب چڑھی ہوئی تھی۔ سیاہ چست لباس کی بجائے اب میرے جسم پر وہ لباس تھا جسے میں نے راستے میں اُتار کر تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ لباس کی تبدیلی کا احساس مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں نے اپنے ماتحت کمار کے جسم پر بھی سیاہ چست لباس نہیں دیکھا تھا۔

میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس کمرے سے نکلا اور ایک روشن راہداری میں پہنچ گیا مگر ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ ٹھٹک کر رُک گیا۔ میری سماعت سے ایسی آوازیں ٹکرائی تھیں جیسے قریب ہی کہیں بہت سے افراد جمع ہوں۔ مجھے باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بغور اطراف کا جائزہ لیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی کہ وہ آوازیں اسی راہداری میں موجود ایک کُھلے ہوئے دروازے سے باہر آ رہی تھیں۔ وہ کُھلا ہوا دروازہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں ہمت کر کے اُس کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے اپنی جیب سے ریوالور نکالنا نہیں بھولا تھا، یہ سوچ کر کہ نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔

کُھلے ہوئے دروازے میں قدم رکھتے ہی میں نے بآوازِ بلند کہا۔

"ہینڈز اَپ!"

"یہ کیا بدتمیزی ہے!" جواب میں ایک درشت و سخت آواز سنائی دی جسے سُن کر میرے ہاتھ سے ریوالور چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

وہ آواز میرے ڈی آئی جی، تیواڑی۔۔۔ کی تھی جو اس کمرے میں موجود تھے۔ انہی کے قریب میرا ماتحت کمار کھڑا ہوا تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں نے گڑبڑا کر ریوالور جیب میں رکھ لیا اور اس کمرے میں ہونے والی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

تیواڑی جی مجھے ڈانٹ کر پھر اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو اس کمرے کے فرش پر کوئی پاؤڈر چھڑک رہے تھے۔ اسی وقت میری نگاہ کمار کے جسم پر موجود لباس سے ٹکرائی تھی اور پھر مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ میرے جسم پر بھی سیاہ چست لباس نہیں ہے۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں نے بھگوان داس کی لاش دیکھی تھی کیونکہ کمرے کے فرش پر اب بھی خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا مگر اب وہاں لاش نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر میں چکرا گیا۔ میرے لیے تو یہی بات اُلجھن کا سبب بنی ہوئی تھی کہ وہاں تیواڑی جی کہاں سے ٹپک پڑے؟ اس کے علاوہ یہ کہ میرا لباس کیسے تبدیل ہو گیا؟ بیہوش ہونے سے پہلے میں کمرے کا اچھی طرح جائزہ نہیں لے پایا تھا

لیکن اب مجھے اس کمرے میں موجود مسہری کے سرہانے کھلی ہوئی تجوری نظر آ رہی تھی۔

میں ابھی اپنے خیالوں ہی میں گم تھا کہ تیواڑی جی کی آواز سنائی دی مگر وہ مجھ سے نہیں کمار سے مخاطب تھے "جب تک یہ لوگ اپنے کام سے فارغ نہ ہو جائیں، تم یہیں رہو گے۔ میں اللہ دتا کو اپنے ساتھ لے کر اسپتال جا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ بھگوان داس کو اب ہوش آ گیا ہو۔"

میں تیواڑی جی کی بات سن کر چونکا مگر اس سے پہلے کہ کچھ کہتا، انھوں نے قدم بڑھاتے ہوئے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

وہ مجھے لے کر کوٹھی کے پھاٹک تک آ گئے جو کھلا ہوا تھا۔ پھاٹک کے باہر ہی ایک جیپ موجود تھی اور یہ وہی جیپ تھی جس میں ہم وہاں پہنچے تھے مگر اب اس کے نمبر بدلے ہوئے تھے۔ جیپ کے قریب ہی ایک وین کھڑی تھی جس میں غالباً وہ لوگ آئے تھے جو اندر کارروائی میں مصروف تھے۔ وہ لوگ کیا کر رہے تھے، اس کا صرف میں نے اندازہ ہی لگایا تھا۔ ان سبھی کو میں نے اپنے دفتر کے ایک شعبے میں دیکھا تھا۔ وہ شعبہ فنگر پرنٹس کا تھا مگر اس سے پہلے میں نے ان لوگوں کو مصروفِ کار نہیں دیکھا تھا۔ اب تک میں نے ان کے بارے میں صرف سنا ہی سنا تھا۔ پھاٹک سے نکلتے ہوئے میری نگاہ اس کوٹھری کی طرف بھی اٹھی تھی جہاں چوکیدار رہتا تھا مگر اس کوٹھری کے کواڑ بند ہونے کے سبب میں یہ نہ دیکھ پایا تھا کہ اندر چوکیدار موجود تھا یا نہیں۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ کمار نے اس چوکیدار کو بھی اب کھول ہی دیا ہو گا۔

میں اب تک اپنے بقیہ دو ماتحتوں، کمال اور گپتا کے بارے میں بھی لاعلم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ جب جیپ ایک جھٹکے سے بڑھی تو میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اسی کے ساتھ تیواڑی جی نے مجھے مخاطب کیا "مجھے علم نہیں تھا اللہ دتا کہ تم اس قدر جی چھوڑ ثابت ہو گے۔"

"جی... جی سر... سر! جی چھوڑ!" میں گڑبڑا گیا۔

"ہاں جی چھوڑ!" تیواڑی جی گیئر بدلتے ہوئے بولے "ایک زخمی شخص کو دیکھ کر تمھارا چیخ مار کر بیہوش ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ تم بزدل ہو۔"

"چیخ!... میں... میں تو بالکل بھی نہیں چیخا تھا سر! وہ... وہ کمار کا بچہ بالکل... بالکل جھوٹ بول رہا ہو گا سر!"

"مگر اتفاق سے کمار کے علاوہ وہاں تمھارے دو اور ماتحت بھی موجود تھے۔" تیواڑی جی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ... وہ تو بس میرے منہ سے یوں ہی آ، نکل گئی تھی۔"

"اور پھر تم یوں ہی بیہوش بھی ہو گئے تھے، کیوں؟"

"وہ تو نہ جانے کیسے بس... چکر سا... چکر سا آ گیا تھا ورنہ... ورنہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں بیہوش ہو جاتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں، ماضی میں کس قدر بہادری کا ثبوت دیتا رہا ہوں۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے اور اسی لیے حیرت ہے۔" تیواڑی جی بولے "پتا نہیں اس وقت تمھارے اندر اتنی ہمت کیسے پیدا ہو گئی تھی۔"

"ہمتِ مرداں مددِ خدا!" میں نے جلدی سے کہا "آدمی ہمت کرتا ہے تو خداوند پاک بھی اس کی مدد کرتا ہے۔" میں نے وہ جملہ دہرا دیا جو اپنی امی سے سنا تھا۔

"ضرور، ضرور!" تیواڑی جی کی آواز میں طنز تھا۔

معاً مجھے وہاں تیواڑی جی کی غیر متوقع موجودگی کا خیال آ گیا اور میں نے فوراً ہی سوال داغ دیا "سر! آپ... آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں تم لوگوں کے پیچھے پیچھے ہی یہاں پہنچا تھا کیونکہ مجھے خطرہ تھا، تم لوگوں کے ساتھ کوئی بھی غیر معمولی واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ میں نے ان کاغذات کے حصول کی خاطر بہرحال جو بھی قدم اٹھایا، وہ قانونی نہیں تھا۔" تیواڑی جی نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ مجھے ان واقعات سے آگاہ کرنے لگے جو میری بیہوشی کے بعد پیش آئے تھے۔

تیواڑی جی نے جو کچھ بتایا، اس کا حاصل یہ تھا کہ جب ہم بھگوان داس کی کوٹھی میں داخل ہوئے، اس سے پہلے ہی کچھ افراد وہ اہم کاغذات نذر کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ انھوں نے ظاہر یہی کیا تھا کہ وہ چور تھے لیکن وہ یہ ظاہر کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اس کا اندازہ تجوری میں موجود زیورات سے لگایا جا سکتا تھا۔ اگر وہ لوگ واقعی چور ہوتے تو زیورات چھوڑ کر نہ جاتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ لوگ بھگوان داس کو قتل کرنے کی کوشش بھی نہ کرتے۔

لباس کی تبدیلی کا معمہ بھی تیواڑی جی کی گفتگو سے حل ہو گیا تھا کیونکہ وہاں تیواڑی جی فنگر پرنٹس کے شعبے والوں کو بلوانے والے تھے اس لیے انھوں نے میرے ماتحتوں کو لباس تبدیل کر لینے کا حکم دیا تھا۔ میرا لباس بیہوشی کے درمیان ہی تبدیل کر دیا گیا تھا، پھر مجھے وہاں سے اٹھا کر اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں ڈال دیا گیا تھا تاکہ کسی کو میری بیہوشی کا علم بھی نہ ہو سکے۔ میں اگر انڈرویئر پہننے کا عادی نہ ہوتا تو شاید مجھے اس بات پر اور بھی شرم آتی کہ میرے ماتحتوں نے میرا لباس تبدیل کیا تھا۔

تیواڑی جی کی اطلاع کے مطابق میرے بقیہ دونوں ماتحت کمال اور گپتا اسپتال میں تھے تاکہ جیسے ہی بھگوان داس ہوش میں آئے، اس کا بیان لے سکیں۔ بھگوان داس کو شدید زخمی حالت میں تیواڑی جی نے فوراً ہی اسپتال بھیج دیا تھا۔ اس کے جسم پر چاقوؤں سے ضربیں لگائی گئی تھیں۔ چاقو استعمال کرنے کا سبب غالباً یہ تھا کہ فائروں کی آواز سن کر اردگرد کے رہنے والے لوگ متوجہ نہ ہو جائیں۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے جب تیواڑی جی کی جیپ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ مجھے یہ سوچ کر ہول آنے لگا کہ اتنی رات میں گھر پہنچوں گا تو ابا اور امی کو کیا جواب دوں گا مگر

مجھ میں اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ تیواڑی جی سے کچھ کہہ سکتا۔

وہ اسپتال کا ایک الگ کمرہ تھا جہاں بھگوان داس کو رکھا گیا تھا۔ تیواڑی جی کی ہدایت پر اسے غالباً جنرل وارڈ میں نہیں رکھا گیا ہو گا، میں نے سوچا اور تیواڑی جی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہو گیا۔

ہم دونوں کو آتا دیکھ کر کمال اور گپتا ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمال کے چہرے سے بد دلی کا اظہار ہونے لگا تھا کیونکہ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تھے تو وہ کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کمرے میں اس وقت ایک نانی سی نرس بھی موجود تھی جس کا رنگ سیاہ تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھ کر اخلاقاً دانت نکال دیے اور مجھے یوں لگا جیسے گھپ اندھیرے میں روشنی سی ہو گئی ہو۔ اس کے دانت اتنے ہی اجلے تھے۔ بھگوان داس سامنے ہی مسہری پر پڑا تھا اور اس کے جسم پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی۔

"اسے ہوش آیا؟" تیواڑی جی نے نرس سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" نرس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟" تیواڑی جی نے دوسرا سوال کیا۔

"ڈیوٹی روم میں۔" نرس بولی۔

"انھیں یہاں بھیجو۔" تیواڑی جی نے کہا اور پھر جب نرس چلی گئی تو ہماری طرف متوجہ ہو کر بولے "تم تینوں میں سے کسی ایک کو یہاں صبح تک رہنا ہے۔ پھر صبح دوسرا آ کر اس کی جگہ لے گا۔"

اس سے پہلے کہ نزلہ مجھ پر گرتا، میں نے فوراً اپنی افسری سے فائدہ اٹھایا اور گپتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "گپتا! صبح تک تم یہاں رہو گے، صبح ساڑھے چھ بجے تک۔ اس کے بعد کمال تمھاری جگہ لے گا۔ میں دوپہر سے پہلے یہاں آ جاؤں گا، پھر تم چلے جانا۔"

تیواڑی جی نے درمیان میں مداخلت نہیں کی مگر جب میں خاموش ہوا تو انھوں نے مجھے مخاطب کیا "تمھیں خبر ہے کہ میں تم لوگوں کو یہاں موجود رہنے کے لیے کیوں کہہ رہا ہوں؟"

میں بغلیں جھانکنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ مجھے کیا پتا کہ ان کے دل میں کیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ کہہ دوں، عالم الغیب تو بس اللہ ہے مگر میں نے خاموشی ہی میں عافیت جانی۔

"مجھے علم تھا کہ تمھاری کھوپڑی میں یہ بات نہیں آ سکتی۔" تیواڑی جی جواب نہ پا کر تھوڑے سے گرم ہو گئے، پھر ذرا دیر توقف کے بعد بولے۔ "سنو! جن لوگوں نے کسی مصلحت کے پیشِ نظر بھگوان داس کو قتل کرنا چاہا تھا، جب انھیں یہ علم ہو گا کہ بھگوان داس ابھی زندہ ہے تو وہ اسے ختم کرنا چاہیں گے۔ اب سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گیا سر!" میں نے جلدی سے سر ہلایا "ہمیں یہ کوشش کرنا ہے کہ بھگوان داس کو قتل نہ ہونے دیں۔"

ممکن تھا، مجھے تیواڑی جی کی مزید پھٹکار کھانا پڑتی کہ اسی وقت ایک ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔

تیواڑی جی سادہ کپڑوں میں تھے اس لیے انھیں ڈاکٹر سے پہلے اپنا تعارف کرانا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر سے بھگوان داس کے بارے میں پوچھا "ڈاکٹر! اسے کب تک ہوش آ سکتا ہے؟"

"صبح سے پہلے مشکل ہی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا، پھر بولا "ویسے ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ اتفاق سے چاقو ایسی جگہ لگے ہیں جس سے ان کی زندگی خطرے میں نہیں پڑی۔"

تیواڑی جی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا، پھر بولے "یہاں مستقل طور پر میرا ایک آدمی رہے گا۔"

"بہتر ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اس کے بعد تیواڑی جی نے مجھے اور کمال کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا کیونکہ گپتا کو وہیں رہنا تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ڈاکٹر بھی کمرے سے نکلا۔

تیواڑی جی نے پہلے کمال کو اس کے گھر چھوڑا، پھر مجھے۔

میں لرزتے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہوا اور پھر دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ امی میرے انتظار میں اس وقت تک جاگ رہی تھیں۔ انھوں نے پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ عموماً بہت کم غصے میں آتی تھیں مگر اس رات تو حد ہی ہو گئی تھی۔ انھوں نے چھوٹتے ہی دو چار ہاتھ جھاڑ دیے۔ میں سر جھکائے پٹتا رہا تو وہ اور برہم ہو گئیں "بتا کہاں تھا اب تک؟" انھوں نے میرے بال پکڑ کر سر اوپر کرتے ہوئے غصے سے کہا۔

"ن... نو... نوکری... امی... ڈیوٹی پر!" میں نے بمشکل کہا۔

"بھاڑ میں گئی ایسی نوکری، چولھے کی جڑ میں!" انھوں نے میرے بال چھوڑ دیے "کہہ دے اپنے ہوتے سوتوں سے کہ جو کام کرانا ہو دن میں کرا لیا کریں۔ میں رات میں ڈیوٹی نہیں کراؤں گی۔ بھلا بتاؤ، جوان جہان بچہ اور یوں راتوں کو مارا پھرے۔"

"بھئی یہ آدھی رات کو کیا مہابھارت شروع کر دی!" ابا جی کی آواز سنائی دی اور میرا دم خشک ہو گیا۔

"تم تو بس پڑے سناتے رہو۔ تمھیں کیا، کون آیا ہے، کون نہیں آیا۔" امی نے بھی جواباً چیخ کر کہا "خدا کی مار! چار بجنے والے ہیں اب اور تمھارا پوت ڈیوٹی سے اب لوٹا ہے۔"

"کون اللہ دتا؟" ابا جی نے پوچھا۔

"اور کون!"

"اچھا اب تو سو جاؤ، محلے والے کیا کہیں گے۔ صبح اس کی خبر لوں گا۔" ابا جی نے فرمان جاری کیا۔

امی بڑبڑاتی ہوئی، ابا کے کمرے کی طرف چلی گئیں اور میں لپک کر اندر والے کمرے کی طرف بڑھا۔ صبح کے خوف سے تھکن اور نیند کے باوجود

میری آنکھ فوراً نہ کھلی مگر نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے اس لیے میں سو گیا۔ صبح آنکھ کھلنے کے باوجود میں چادر سے منہ ڈھانپے پڑا رہا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ابا زنبیل لے کر سودا لینے گھر سے نکلیں اور اس دوران میں مجھے فرار کا موقع مل جائے۔

پھر میں نے اسی ترکیب پر عمل کیا۔ اِدھر ابا نکلے اور اُدھر میں جھٹ سے اُٹھ بیٹھا۔ پھر میں نے گھر سے ناشتہ کر کے ریس لگا لینے میں دیر نہیں کی تھی۔ چلتے چلتے امی نے پھر وارننگ دے دی تھی کہ اگر میں نے آئندہ رات کو دیر سے آنے کی کوشش کی تو وہ میرے گٹے جھاڑ دیں گی۔

وقتی طور پر تو میں نے ابا کے متوقع "حملے" سے جان بچالی تھی لیکن اب دفتر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ آخر اس طرح کب تک گاڑی چلے گی۔ یہ تو آئے دن کی مصیبت ہو گئی تھی۔ میری نظر میں اس کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا تھا۔ وہ یہ کہ کسی طرح اپنے دفتر والوں سے ابا کو یہ یقین دلوا دوں میں راتوں کو آوارہ گردی نہیں کرتا بلکہ اپنے فرائض پورے کرتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں اپنے متوقع خسر یعنی چچا بندو خاں پر ڈورے ڈال سکتا تھا کہ انھیں اپنے ابا سے گفتگو کرنے پر آمادہ کر لیتا اور میرے خیال میں وہ اپنے ہونے والے داماد کی بات ہرگز نہ ٹالتے۔

دفتر پہنچتے ہی میں نے پہلے لوہری کا رُخ کیا جہاں بڑے صاحب بہادر کا کمرہ تھا۔ چچا بندو خاں صبح ہی صبح مجھے دیکھتے ہی کھل گئے۔ میں نے انھیں دور ہی سے سلام داغا۔

"جیتے رہو، جیتے رہو!" انھوں نے دعا دی، پھر فوراً ہی شکایات کے دفتر کھول دیے۔ "تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ ایک ہی دفتر میں ہونے کے باوجود نہیں ملتے۔"

"وہ دراصل چچا! بات یہ ہے کہ نئی نئی نوکری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ خوب محنت سے کام کروں تاکہ آپ کا نام روشن ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

میری بات سن کر انھوں نے بڑی زور سے سر ہلایا۔ "ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی۔ اپنے افسروں کو خوش رکھو۔" یہ کہہ کر انھوں نے منہ میں موجود پان چبانے کے لیے اپنے کلّوں کو جنبش دی۔

میں نے اس وقفے سے پورا فائدہ اٹھایا اور ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "میں ایک مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں چچا!"

"ہاں ہاں، کہو کہو!" وہ ایک دم فکر مند نظر آنے لگے۔

"دفتری کام ہی کے سلسلے میں اکثر رات کو بھی مجھے دیر ہو جاتی ہے جس پر امی اور ابا سخت ناراض ہوتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں خفیہ کے کاموں کو، یہاں دن اور رات کا خیال نہیں کیا جاتا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" چچا بندو خاں نے سر ہلایا۔ "مگر تمھیں رات کو دیر کیوں ہو جاتی ہے؟ دفتر تو بند ہو جاتا ہے وقت پر!"

"دفتر کے علاوہ بھی تو کام ہوتے ہیں چچا! مثلاً کسی مجرم کی نگرانی کرنا ہو، رات کے وقت کہیں چھاپا مارنا ہو یا کسی سے کیس کے بارے میں پوچھ گچھ۔۔۔"

"میں سمجھ گیا۔" چچا بندو خاں بولے۔ "مگر یہ سرکاری باتیں ہیں، میں ابا کو تو نہیں بتا سکتا۔ خیر تم فکر نہ کرو، میں آج ہی شام تمھارے گھر آؤں گا اور کسی نہ کسی طرح تمھارے ابا کو سمجھا دوں گا۔" یہ کہہ کر چچا بندو خاں رُکے، پھر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے بیٹے! تمھیں اسی وجہ سے رات کو دیر ہو جاتی ہے؟"

میں سمجھ گیا کہ چچا بندو خاں بھی مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ انھیں اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر لاحق تھی۔ وہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ ان کا ہونے والا داماد کہیں بُری صحبت میں نہ پڑ جائے۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "چچا! آپ چاہے کسی قسم لے لیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"ارے میرا مطلب یہ نہیں تھا بیٹے!" چچا بندو خاں میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا کیونکہ مجھے تمھارے کام کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں اپنے ڈی آئی جی سے بھجوا دوں کہ۔۔۔"

"نہیں بیٹے! نہیں، اس کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے پورا اعتماد ہے۔" چچا بندو خاں نے دوبارہ میری بات کاٹ دی اور گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے بولے۔ "آج دوپہر کو تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔" ان کا لہجہ حکمیہ تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بیٹی کے پکائے ہوئے کھانے کے قصیدے پڑھنے لگتے، میں جلدی سے بول اٹھا۔ "چچا! میں آپ کا حکم ہرگز نہ ٹالتا مگر آج دوپہر کے وقت میں دفتر سے باہر رہوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"اچھا تو پھر کل سہی!" چچا بندو خاں مردہ سی آواز میں بولے۔ پھر اگلے ہی لمحے انھیں کچھ خیال آگیا اور پُرجوش لہجے میں پوچھنے لگے۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ میں کل تمھارے لیے کیا پکوا کر لاؤں؟"

"مسور کی دال۔" میں نے جل کر کہہ دیا کیونکہ وہ کسی طرح جان چھوڑ رہے تھے۔

"ارے نہیں بیٹا!" وہ ہنس کر بولے، پھر خود ہی کہا۔ "اچھا شامی کباب پکوا لاؤں گا۔"

"نہیں چچا! مسور کی دال۔" میں بھی اپنے ہونے والے خسر کو زچ کرنے پر تل گیا۔

"کیا تمھیں بہت اچھی لگتی ہے مسور کی دال؟" چچا بندو خاں بغور دیکھ کر سنجیدہ ہو گئے۔ بھلا وہ اپنے ہونے والے داماد کی فرمائش کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر میں کل مسور کی دال ہی پکوا کر لاؤں گا۔ وہ تو مسور کی دال بھی ایسی پکاتی ہے کہ آدمی انگلیاں چاٹنے لگے۔" چچا بندو خاں نے کہا۔ "وہ" کون ہو سکتی تھی، یہ سمجھنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ چچا یقیناً میری ہونے والی بیوی لو رانی "برخورداری" ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

پھر چچا بندو خاں نے میری جان اسی وقت چھوڑی جب میں نے ان سے آئندہ روز دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کا وعدہ کر لیا حالانکہ مجھے مسور کی دال قطعی زہر لگتی تھی۔

چچا بندو خاں سے ملنے کے بعد میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ کمال اور گیتا کی ڈیوٹی تو رات ہی سے اسپتال میں تھی اس لیے کمرے میں صرف کمار ہی تھا۔ کمار کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ رات کو اسپتال میں اُسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ رات کے وقت ڈیوٹی دیتا تو ذرا بٹیا کو پتا تو چلتا!

کمار نے مجھے سلام کرنے کے بعد اطلاع دی۔ "سر! ابھی وہ آپ کے پیارے لال ہنر آئے تھے۔"

"کون پیارے لال ہنر؟" میں اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے منہ بنا کر بولا۔

"آپ کے انھی دونوں ماتحتوں میں سے ایک جنھیں آپ نے سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی پر لگایا ہے۔" کمار نے بتایا۔

"اچھا تو اس کا نام پیارے لال ہے۔" میں نے کہا۔

"پیارے لال ہنر!" کمار نے میری تصحیح کی۔

"یہ ہنر کیا ہے؟" میں کسی قدر خفگی سے بولا۔

"یہ تو آپ انھی سے پوچھیے گا سر! ویسے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شاید وہ اسے تخلص کہتے ہیں۔" کمار نے اس انداز میں کہا جیسے میری معلومات میں اضافہ کر رہا ہو۔

"پھر کہاں غارت ہو گیا وہ؟" میں نے کمار کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"شاید وہ اپنے کسی دفتری دوست سے ملنے گئے ہیں۔ انھوں نے ابھی دوبارہ آنے کے لیے کہا تھا۔"

"ٹھیک ہے آنے دو۔" میں نے کہا، پھر وشوا ناتھ کیس کی فائل نکال کر اس کی خانہ پُری کرنے لگا تاکہ آئندہ مجھے تیواڑی جی کی پھٹکار نہ کھانا پڑے۔ میں گزشتہ رات سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات فائل میں لکھ رہا تھا۔

ابھی میں اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ وہ شخص آگیا جس کے آنے کی خبر کمار نے دی تھی، یعنی میرا نیا ماتحت پیارے لال ہنر!

"حاضر ہو سکتا ہوں حضور؟" وہ دروازے ہی پر رُک کر بڑے ادب سے بولا۔

"ہم حضور نہیں سر ہیں سمجھے!" میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ "آئندہ تم ہمیں سر کہو گے۔"

"قبلہ سر! کیا باریابی کی اجازت نہ ملے گی؟" وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا بولا۔

"آجاؤ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر گویا اجازت دے دی۔

وہ کمرے میں داخل ہو کر میری میز کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ پہلی بار میں نے نہ اُس کے نام پر توجہ دی تھی اور نہ عادات و اطوار پر۔ یوں بھی اسے اور اُس کے ساتھی کو میرے کمرے میں صرف چند منٹ بیٹھنے کا موقع ملا تھا کیونکہ میں نے انھیں فوراً ہی کام پر لگا دیا تھا۔ اب پہلی بار اُس کے رنگ ڈھنگ میرے سامنے آ رہے تھے۔

"کیا قبلہ سر اپنے خادم کو نشست پر بیٹھنے کی اجازت مرحمت نہیں فرمائیں گے؟" وہ کسی قدر جھکتے ہوئے بولا۔

"یہ تم سر کے ساتھ بار بار قبلہ کیوں لگا دیتے ہو، صرف سر کہو! اور بیٹھ جاؤ۔" میں نے اُسے لتاڑا۔

"دراصل لفظ قبلہ میں بطور تکریم استعمال کر رہا تھا۔ بہر حال حکم حاکم۔" وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"رپورٹ دو!" میں نے بغیر کسی تمہید کے اُسے حکم دیا۔

"عرض کرتا ہوں۔" اُس نے بالکل اس طرح کہا جیسے غزل سنانے سے پہلے شاعر کہتے ہیں۔ "اے تقدیرِ الٰہی کہیں یا تقاضائے وقت کہ اِس ہیچ مداں و ہیچ عبارت نے شبِ گزشتہ جس وقت سے اپنے فرائض منصبی سنبھالے، اُسی وقت سے۔۔۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو!" میں ہاتھ اٹھا کر زور سے بولا۔ "کیا کہا تم نے؟"

اُس نے دوبارہ اپنا جملہ لفظ بہ لفظ دُہرا دیا اور اس بار بھی میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔

"تم کس زبان میں بات کر رہے ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"خاکسار اردو بول رہا ہے مگر دعویٔ زبان دانی بہر حال نہیں کر سکتا کیونکہ بقول شاعر کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم آتی گاڑھی اردو نہ بولو؟" میں اُسے گھورتے ہوئے بولا۔

"غالباً آپ کرخنداری سننا پسند فرماتے ہیں۔ بہر حال سمع خراشی کے لیے معذرت! میں سعی کروں گا کہ فصاحت کا خیال رکھوں اور بلاغت سے گریز کروں۔" اس نے کہا۔

"بہر حال تم جو بھی کرو، مجھے اس سے کوئی بحث نہیں، تمھاری بات میری سمجھ میں ضرور آنا چاہیے۔"

"جی ہاں اپنی اپنی استطاعتِ ذہنی کی بات ہے۔ بہر حال دوبارہ عرض کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا، پھر ذرا دیر بعد بولا۔ "خادم گزشتہ رات نو بجے سے صبح نو بجے تک تضائے مُبرم کی طرح سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی کے اِرد گرد منڈلاتا رہا۔"

"کس کی طرح منڈلاتا رہا؟" میں نے پوچھا۔

"نفضائے مبرم کی طرح۔" اُس نے جواب دیا۔
"یہ کس چڑیا کا نام ہے جس کی طرح تم منڈلاتے رہتے ہو؟" میں نے چڑ کر دریافت کیا۔
"قبلہ... اوہ معافی کا خواستگار ہوں، صرف سر! یہ کسی پرندے کا نام نہیں بلکہ اُس کے معنی نہ ٹلنے والی موت کے ہیں۔ میں نے ذرا وضاحت کے لیے تشبیہ استعمال کی تھی۔"
"تم گاڑھی اردو بولنے سے باز نہیں آؤ گے!" میں نے آنکھیں نکالیں۔
"میں اپنی سطح سے کس حد تک گر کر بات کروں، قبلہ... اوہ صرف سر!" وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔
پھر کئی بار سخت سست سننے اور بار بار وضاحت کرنے کے بعد اپنی رپورٹ دینے میں کامیاب ہو سکا۔ بات صرف اتنی تھی کہ گزشتہ رات نو بجے کے بعد سے صبح ہونے تک کئی بار سیٹھ دشوا ناتھ سے کچھ نوجوان ملنے آئے تھے۔ صبح سات بجے ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی بھی سیٹھ سے ملنے آئی تھی جو سرج کی ہم عمر تھی لیکن اُس کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ سیٹھ کی بیٹی سرج سے ملنے آئی تھی یا سیٹھ دشوا ناتھ سے۔
میرا ماتحت پہلے لال بجھکڑ ماغ چاٹ کر چلا گیا تب مجھے اسپتال جانے کی سوجھی۔ کمال دفتر میں بیٹھ کر خواہ مخواہ کرسی توڑ رہا تھا اس لیے میں نے پہلے یہ سوچا کہ اُسے بھی ساتھ لیتا جاؤں اور کمال کی بجائے اس کی ڈیوٹی وہاں لگا دوں مگر اس کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ کمال کو اتنی لفٹ نہیں دینا چاہیے۔ ساتھ لے جانے کا مطلب غیر ضروری لفٹ دینا ہی تھا۔ یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اُسے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اسپتال پہنچنے کا حکم دوں اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔
میں سرکاری موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اسپتال پہنچا۔ وہاں کمال موجود تھا جو مجھے دیکھتے ہی ایک دم مستعد نظر آنے لگا تھا۔ کمرے میں اس وقت وہ تنہا ہی تھا، وہاں کوئی نرس نہیں تھی۔

کمال نے مجھے بتایا کہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے پہلے بھگوان داس کو ہوش آیا تھا مگر ہوش آتے ہی اُس نے اتنی چیخ پکار مچائی تھی کہ ڈاکٹر کو مجبوراً اُسے دوبارہ بیہوش کر دینا پڑا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ذرا سی بھی تکلیف برداشت نہیں کر پاتے۔
کمال ابھی یہی بتا پایا تھا کہ میں بول پڑا۔ "تم نے اس دوران میں اس کا بیان لینے کی کوشش نہیں کی؟"
"سر... یس سر!... میں تو فوراً ہی قلم کاغذ لے کر اُس کے سرہانے پہنچ گیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ فی الحال میں بیان نہ لوں جب تک مریض کے حواس بحال نہ ہو جائیں اور یوں بھی بھگوان داس کس کی بات سُن رہا تھا۔" کمال نے جواب دیا۔
"اب اسے کب ہوش آئے گا؟" میں نے سوال کیا۔
"یہ تو سر!... سر!... ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔
"پوچھ کر آؤ اس سے!" میں نے اُسے ڈانٹا۔

اِدھر کمال کمرے سے نکلا، اُدھر ایک نوجوان و حسین لڑکی کمرے میں "اینٹری" دی۔ وہ پھولدار ساڑی میں خود بھی ایک تر پھول دکھائی دے رہی تھی، ایسا پھول جسے دیکھ کر بے اختیار اُ... جی چاہے۔ اِس کے ساتھ ہی ایک خوشبو کا جھونکا بھی کمرے میں... کیا۔ "کیا بھگوان داس جی اسی کمرے میں ہیں؟" اُس نے اندر آتے ہی سوال کیا۔ اس کی آواز میں بھی کھنک تھی۔
"جی... جی ہاں!" میں اس کے حسین کتابی چہرے پر نظر... ہوئے بولا۔
پھر خود بخود ہی اُس کی نگاہ سامنے بچھے ہوئے لوہے کی... کی طرف اٹھی تھی اور وہ بے اختیار سی ہو کر ادھر لپکی تھی۔
"چاچا جی!" اُس نے پلنگ کے قریب پہنچ کر بھرائی... میں کہا تھا۔ "یہ کیا ہو گیا آپ کو چاچا جی؟"
پھر مجھے اس کی سسکیاں سنائی دی تھیں۔ اُس کی پُشت... جانب تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا۔ وہ شا... آنسو پونچھنے کے لیے اس میں سے رومال نکال رہی تھی۔
میرا دل بھی اس کی سسکیاں سُن کر بھر آیا۔ یہ میرا انسانی... تھا کہ اس موقع پر اُسے تسلی دیتا۔ یہ سوچ کر میں کرسی سے اٹھا... کے قریب پہنچا۔
اُس نے غالباً میرے قدموں کی چاپ سُن لی تھی اسی لیے... دم مڑ کر دیکھا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہرحال تعجب ہوا کہ اس کی آنکھوں... آنسو نہیں تھے مگر اُس کے دائیں ہاتھ میں رومال تھا۔ اس کے... پر مجھے دکھ کی بجائے الجھن نظر آ رہی تھی۔
"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے... فکر کی بات نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دی۔
"آپ کون ہیں؟" اُس نے مجھ سے سوال کیا۔
مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی اس لیے میں کچھ گڑبڑا...
"میں... میں... ان کا ہمدرد... دوست... نہیں ہمدرد ہوں۔"... ہوئے مجھے بھگوان داس کی عمر کا خیال آ گیا تھا۔ میرے اور اُس... بہرحال رشتۂ دوستی نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ میں سمجھ چکا تھا کہ... حسینہ بھگوان داس کی بھتیجی ہے مگر اس کے باوجود اپنے اطمینان... کے لیے بولا۔ "آپ... آپ بھگوان داس کی کون ہیں؟"
"یہ میرے چاچا ہیں۔" اُس نے بتایا۔ "ہم لوگ آج صبح... سے یہاں پہنچے تھے۔"
وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر میں نے درمیان ہی میں... دیا۔ "کیا آپ کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں؟"
"جی ہاں، میری ماتا جی اور پتا جی ہیں۔" اُس نے جواب...
"ہمیں چوکیدار سے سب کچھ معلوم ہوا تھا! اور پھر میں..."
"آپ کے پتا جی آپ کے ساتھ اسپتال نہیں آئے؟"...

میرا سوال سُن کر نہ جانے کیوں وہ کچھ سٹپٹا سی گئی، پھر بولی۔ "... گاڑی میں اُن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ دراصل وہ دل کے... ہیں اسی لیے جب انھیں یہاں پہنچ کر چاچا جی کے بارے... اچانک تو ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ رہ گئیں ماتا جی تو... وہ پتا جی کی دیکھ بھال کے لیے وہیں رہ گئی تھیں مگر مجھ سے... ت نہ ہو سکا اور میں... میں فوراً یہاں آ گئی۔" یہ کہہ کر اُس نے... دل سا تھام لیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب اس نے اپنی... پر قابو پا لیا تھا۔
اسی وقت کمال دروازہ کھول کر اندر آ گیا اور وہاں اس نوخیز... کو دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا۔ مجھے اس کی مداخلت گراں گزری۔ اس... نے بھی چونک کر کمال کی طرف دیکھا تھا۔
"ڈاکٹر نے کیا بتایا؟" میں نے کمال سے فوراً پوچھا۔
"وہ کہتا ہے نرکہ شام سے پہلے ہوش آ جائے گا۔" کمال نے... دیا۔
"ٹھیک ہے، تم دفتر جاؤ اور اگر کمار وہاں سے نہ چلا ہو تو اُسے... طرف سے حکم دو کہ فوراً یہاں پہنچے۔" میں نے کہنے کو تو یہ بات...

... کہتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس لڑکی کے سامنے ایسی... نہیں کرنا چاہیے تھی مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
کمال میرا حکم سن کر فوراً وہاں سے چلا گیا۔
میں نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے فوراً اس لڑکی سے کہا۔ "... میرا دوست تھا اور جسے میں نے بلوایا ہے وہ بھی دوست ہے۔"
"جی۔" لڑکی آہستہ سے بولی۔ اس کے چہرے پر اب الجھن نظر... لگی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ کچھ مضطرب سی دکھائی دینے... لگی۔
"آپ ادھر کرسی پر آرام سے بیٹھ جائیں۔" میں نے اس سے کہا۔
"نہیں میں... میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔ "دراصل... نے چاچا جی کو بہت دن بعد دیکھا ہے اور... اور میرا جی چاہتا ہے... بس انھیں دیکھتی ہی رہوں۔ آپ کو میری وجہ سے خواہ مخواہ... ت ہو رہی ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔"
"ارے نہیں، اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔" میں ریشہ خطمی... بولا۔ "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ آپ تو کھڑی رہیں اور میں بیٹھ جاؤں۔"
میں محسوس کر رہا تھا کہ لڑکی کے اضطراب میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا... تھا اور میں اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ میری بات کے جواب... میں کچھ نہیں بولی تھی۔
"یہاں پانی ہوگا؟ میرا گلا کچھ خشک سا ہو رہا ہے۔" چند لمحے... کے بعد لڑکی نے بس اچانک ہی کہا تھا۔ اسی کے ساتھ اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تھی۔ پھر وہ ایک دم اس طرح اُچھل پڑی تھی جیسے کوئی خلاف توقع چیز دیکھ لی ہو۔ میں نے اُس کی نگاہ کمرے میں موجود کھڑکی کی طرف اٹھی دیکھی تھی۔ معاً اُس نے اپنا ہاتھ بھی کھڑکی کی طرف اٹھایا اور لکنت آمیز لہجے میں کہا۔ "ابھی.... ابھی مجھے وہاں کھڑکی میں ایک..... ایک خوفناک سے چہرے والا شخص نظر آیا تھا۔"
لڑکی کی بات سُن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مجھے تیواڑی جی کی بات یاد آ گئی تھی کہ جن لوگوں نے بھگوان داس کے گھر سے وہ کاغذات غائب کیے تھے اور اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، وہ اب بھگوان داس کو زندہ دیکھ کر اُسے ختم کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ کھڑکی میں اس لڑکی کو جس شخص کا خوفناک چہرہ نظر آیا تھا، وہ بھی انہی میں سے ہو سکتا تھا جو بھگوان داس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ سوچتے ہی میرا دورانِ خون تیز ہو گیا اور سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں نے فوراً ہی کھڑکی کی طرف لپکنے کا ارادہ کیا اور اسی ارادے کے ساتھ میرے قدم اُٹھے مگر اس وقت مجھ پر اس قدر بدحواسی طاری ہو گئی تھی کہ میرا ایک پاؤں دوسرے پاؤں سے اُلجھ گیا۔ پھر اُس سے پہلے کہ میں مُنہ کے بل زمین پر گرتا، میرے ہاتھ میں جو بھی آ سکا، اُسے پکڑ لیا۔ وہ اس نوخیز حسینہ کی حسین کلائی تھی جو میرے ہاتھ آئی تھی۔ وہ شاید اِس غیر متوقع اور ناشائستہ حرکت کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکی۔
نتیجے کے طور پر وہ بھی میرے ساتھ ہی ساتھ چیختی ہوئی زمین پر آ رہی۔ اسی وقت میری سماعت سے کھٹ کھٹ کی کئی آوازیں ٹکرائیں۔ لڑکی کا وینٹی بیگ اس کی کلائی سے نکل کر فرش پر گر گیا تھا جسے اس نے نہ جانے کیوں بند نہیں کیا تھا۔ وینٹی بیگ کھلا ہوا تھا اس لیے اس میں جو کچھ بھی تھا، فرش پر بکھر گیا تھا اور انہی بکھرنے والی اشیا میں جس شے نے مجھے سب سے زیادہ حیران پریشان کیا تھا، وہ ایک چھوٹا سا ریوالور تھا، اسی لڑکی کی طرح خوبصورت مگر خطرناک! وینٹی بیگ کے ساتھ ہی لڑکی کے ہاتھ سے ریشمی رومال گرا تھا اور شاید وہ کھلا ہوا چھوٹا سا چاقو بھی اسی رومال میں لپٹا ہوا تھا جو رومال کے ساتھ ساتھ ہی زمین پر گرا تھا۔ لڑکی نے میرے سامنے ہی وہ ریشمی رومال اپنے وینٹی بیگ سے نکالا تھا، اپنی آنکھوں میں آنے والے "متوقع آنسو" پونچھنے کے لیے! اس رومال کے ساتھ ہی غالباً اُس نے چاقو بھی نکالا تھا جسے میں شاید اِس لیے نہ

؎ مجھ حقیر فقیر کو علم ہے کہ یہ لفظ "ت" سے ہے مگر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ اسے "ت" سے لکھتے ہوئے مجھے کبھی یہ چھچھ والا طوطا محسوس نہیں ہوتا۔ آپ اسے میرا جہل نہیں، مجبوری سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ اے، اڈی، مہر

دیکھ سکا تھا کہ وہ رومال میں چھپا ہوا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ چاقو کھلا ہوا کیوں تھا۔

میری نگاہ نے چند ہی لمحوں میں یہ سارا "ماجرا" دیکھ لیا تھا اور انہی چند لمحوں میں یکے بعد دیگرے کئی سوال میرے ذہن میں ابھرے تھے۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب پا سکتا یا سوچ سکتا، معاً اس نوخیز حسینہ کے جسم نے حرکت کی اور وہ کسی چیل کی طرح اپنے ریوالور کی طرف جھپٹی۔ ریوالور میری دسترس سے بھی دور نہیں تھا لیکن مجھ سے پہلے وہ اس پر جھپٹا مار چکی تھی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا تھا۔

صورت حال انتہائی خطرناک تھی۔ اگر میں اس کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتا تو فوراً ہی ریوالور اس کے قبضے میں پہنچ جاتا۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوتا۔ میں تو خیر میں ہوں، مجھ سے بھی بڑا کوئی "بزدلیر" موت کو سامنے دیکھ کر جینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہی ہے۔ ہاتھ تو خیر مصروف تھا اس لیے میں نے پیر مارنا غنیمت جانا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میرے پیر کی زد میں اس جسم نازنین کا کون سا پارٹ تھا لیکن جب میری سماعت سے اس کی چیخ ٹکرائی تو میں یہ سمجھے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کوئی نازک قسم کا پارٹ ہی ہوگا۔

چوٹ کھا کر چیخنے کے باوجود بھی ریوالور پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میری طرح وہ بھی ہاتھ پیر رکھتی ہے اور انہیں "مار" بھی سکتی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب اس کا گھٹنا میرے پیڑو پر پڑا۔ وہ تو خیر چیخ چاخ کر چوٹ سہہ گئی تھی کہ صنف نازک تھی مگر گھٹنا پڑتے ہی میرے چودہ سے کچھ زیادہ ہی طبق روشن ہو گئے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیڑو دبا لیا تھا جس کے اندر درد کا گولا سا پیدا ہو گیا تھا۔ شاید میرے ہاتھ اسی گولے کو پکڑنے کی کوشش ناکام کر رہے تھے۔

اسی وقت میں نے ایک دم دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی، پھر اسی کے ساتھ اس نوخیز حسینہ کو ریوالور تھامے ہوئے اٹھتے دیکھا تھا۔

"اپنے ہاتھ اٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گی۔" میں نے زمین پر پڑے ہی پڑے نوخیز حسینہ کی آواز سنی تھی مگر وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے مخاطب تھی، غالباً اس سے جس نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔

"کون ہو تم؟" جواب میں دوسری آواز سنائی دی تھی جس میں سختی تھی اور یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ آواز میرے گستاخ ماتحت کمار کی تھی۔

کمار کی آواز سن کر مجھے اپنی پوزیشن کا خیال آیا۔ میں بہرحال اچھی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے بغیر سوچے سمجھے اور پیڑو کے درد کی پروا کیے بغیر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"اے! تم بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو!" نوخیز حسینہ نے مجھے حکم دیا۔

میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل ضروری سمجھی کہ کمار اس کا حکم مان چکا تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ شاید اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا اور ابھی دم توڑ گئی تھی کہ کمرے کے اندر کا ڈرامائی سین دیکھ کر آ جائے گی۔ میری دانست میں کمار نے ایسا کر کے سخت ... دیا تھا۔

"میں نے تم سے کوئی سوال کیا تھا لڑکی!" کمار نے ... میں لڑکی کو مخاطب کیا۔ "بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئی ...؟"

"فی الحال تم اس قابل نہیں ہو کہ مجھ سے کوئی سوال ..." ... نے حقارت سے کہا۔ "زیادہ رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں ... جو حکم دے رہی ہوں اس پر فوراً عمل کرو ورنہ میں یکے بعد دیگرے ... کو گولی مار دوں گی۔ تم دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے ... ہوئے ہاتھ دیوار پر رکھ کر کھڑے ہو جاؤ! چلو جلدی!" ... میں حکم تھا۔

میں کمار کو مشورہ ہی دینے والا تھا کہ وہ لڑکی کی بات ... اسی وقت اسے نہ جانے کیا سوجھی، اس نے لڑکی پر چھلانگ ... اسی کے ساتھ کمرے میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ لڑکی ... سے شعلہ نکلا تھا۔ اس نے کمار پر گولی چلا دی تھی۔ ہر چند ... ماتحت ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا لیکن اس وقت وہ اور میں ... میں سوار تھے، اس لیے مجھے اس کے یوں دنیا سے سفر کر جانے ... ہی چاہیے تھا۔ وہ بڑے زور سے چیخا تھا اور دھم سے زمین ... میں اس سے یہی سمجھا تھا کہ اس کا "اینڈ" ہو گیا مگر حقیقتاً ... تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ گولی اس کے بائیں بازو ... مجھ پر اتنی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ میرے دونوں پیروں نے ... اٹھانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں اس مار دھاڑ ... سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کا بایاں کاندھا مجھ سے ... کے فاصلے پر ہوگا۔ وہ میرے بالکل مقابل نہیں بلکہ ذرا ... اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں گروں بھی تو اس پر نہ گروں ... میں اسے ایک بار گرا چکا تھا۔ اگر دوسری بار بھی حادثہ ... مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

پھر میں نے اپنے لہراتے ہوئے جسم کو لاکھ سنبھالا ... خونخوار حسینہ پر نہ گرے مگر وہ میرا جسم ہی کیا جو کہا مان لے ... اس پر جا رہا۔ پھر میرے ہی ساتھ ساتھ وہ بھی اچک ... لیکن اس بار صورت حال ذرا مختلف تھی۔ پہلے میں ... تھے لیکن اس بار اس کا نازک بدن میرے نیچے تھا۔ ... شانے کے بل گری تھی اور غالباً اس طرح گرنے سے ...

... اس کے منہ سے ایک مدھم سی چیخ نکلی تھی ... تے ہی اس کے ... ہوئی تھی۔ گرتے ہی وہ نہ جانے کیسے پٹ ہو گئی تھی ... ایں ہاتھ آگے ہو گیا تھا جس میں ریوالور اب تک دبا ہوا تھا۔ ... مجھے خطرے کا احساس ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے سوچا ... اس نے لیٹے ہی لیٹے ریوالور پیچھے کی طرف کر کے میرا حساب ... کر دیا تو کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی میں اس کے نازک بدن ... پر اجان دیتے ہوئے کچھ آگے کھسکا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ہاتھ کے نیچے اس کا ہاتھ ... بم ہے جو ذرا گرفت ڈھیلی ہوتے ہی پھٹ پڑے گا۔

... صورت حال تھی، وہ ظاہر ہے کہ مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتی ... بھلا کب تک اس پری وش پر اجمان رہ سکتا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت ... تھی کہ اس سے ریوالور چھین لینے کی کوشش کرتا۔ میں ساری ... کوششوں کا مخالف رہا ہوں جن میں زندگی جیسی پیاری شے ... لگا دینا پڑے۔ اس صورت میں صرف یہی ممکن تھا کہ اس ... کے دست حنائی سے ریوالور چھیننے کا "کار خیر" میری بجائے ... انجام دے۔

... کمار کو تو میں صبر ہی کر چکا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ وہ اس دار فانی سے ... یا اب یہی صورت ممکن تھی کہ میں کسی کی مدد حاصل کرنے کے لیے ... سے چیخنا شروع کر دیتا اور پھر میں نے یہی کیا۔ میں چیخنے لگا۔ ... بچاؤ!"

... نوخیز اور خونخوار حسینہ میرے نیچے سے نکلنے کے لیے جدوجہد ... اسی وقت مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ کمار مرا نہیں زندہ تھا۔ میں ... بائیں جانب آہٹ سن کر ادھر دیکھا تھا۔ کمار اپنے بائیں بازو کو ... تھے دبائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ... اذیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا خون آلود بازو بھی دیکھ ... سے خون بہہ کر اس کی انگلیوں کے درمیان رس رہا تھا۔ ... لیتے ہی میں نے چیخنا بند کر دیا تھا کہ بہرحال یہ کسر شان تھا۔ ایک ... زیب نہیں دیتا کہ اپنے ماتحت کے سامنے اس طرح چیخے۔ لیں ... مجھے امید بندھ گئی تھی کہ وہ زخمی ہونے کے باوجود اس لڑکی سے ... چھین لے گا۔

... میرے چیخنے کی آوازیں یقیناً کمرے سے باہر بھی گئی ہوں گی۔ ... کا یقین مجھے چند ہی لمحے بعد ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ اچانک ... کمرے میں داخل ہونے والی ایک نرس تھی اور ایک وارڈ ...

... کا منظر دیکھ کر وہ دونوں چند لمحے تو مبہوت سے کھڑے ... پھر انھوں نے ڈر کر بھرے گلے کی طرح چیخنا شروع ... تھا۔

... پھر جو کچھ ہوا چند ہی لمحے میں ہو گیا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک نوجوان کمرے میں کودا تھا۔ اس نے ایک ہی نظر میں کمرے کا جائزہ لے کر مجھے اس لڑکی کے اوپر سے کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نابکار نے میرے کولہے پر ایک لات بھی رسید کر دی تھی اور میں اٹھتے اٹھتے زمین چاٹ گیا تھا۔ وہ نوخیز حسینہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وارڈ بوائے اور ...

نرس نے اسی وقت چیخنا بند کر دیا تھا جب وہ نوجوان کھڑکی سے کمرے میں کودا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ اس نوجوان کا چہرہ مجھے نہ جانے کیوں اجنبی نہیں لگا تھا مگر اس وقت خوف کے سبب شاید میرا حافظہ بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

میں فرش پر قطعی بے حس و حرکت پڑا تھا اور دل ہی دل میں وہ تمام آیتیں پڑھ رہا تھا جو رد بلا کے لیے میری امی نے مجھے یاد کرائی تھیں۔ میں اس لیے بھی قطعی ساکت پڑا تھا کہ کہیں اس ظالم حسینہ اور اس کے ساتھی کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

معاً دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور اسی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ لڑکی کے ساتھی نے بھگوان داس کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ لڑکی کا ہاتھ تھامے کھلی ہوئی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری جانب کود گیا تھا۔

اسی وقت نرسوں، وارڈ بوائز اور ڈاکٹروں کی ایک فوج کی فوج کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"کیا ہوا، کیا ہوا یہاں؟ گولی کس نے چلائی تھی؟" بیک وقت بہت سی آوازیں سنائی دیں۔

"سر! وہ... وہ مجرم بھاگے جا رہے ہیں، ان کا پیچھا کیجیے!" میں نے فرش سے اٹھتے ہوئے کمار کی آواز سنی جو میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

"ان کا پیچھا کیجیے اور دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا لیجیے!" میں نے چڑ کر اس کے لہجے کی نقل اتاری اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "کیا دیکھا نہیں کہ وہ مسلح ہیں اور خونی ہو رہے ہیں!"

"مگر... مگر سر! ریوالور تو آپ کے پاس بھی ہوگا!" کمار کراہتے ہوئے بولا۔

"اور تمھارے پاس بس تو ہوگا!" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"میں تو... ایسا ہی تو نہیں تھا ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا!" کمار بولا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے جیسے تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس وقت تک کمرے میں داخل ہونے والوں نے مجھے اور کمار کو گھیر لیا تھا اور کچھ لوگ مقتول بھگوان داس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر کسی ڈاکٹر کی نظر کمار کے زخمی بازو پر پڑی تھی۔

"ارے آپ... آپ تو زخمی ہیں!" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر اس نے فوراً ہی کمار کو ایک نرس کے ساتھ ڈریسنگ کے لیے بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آپ تو زخمی نہیں؟"

جواب دیا۔

اسی لمحے کسی نے تقریباً چیختے ہوئے بھگوان داس کے قتل کی اطلاع دی۔ کمرے میں موجود تمام افراد وہاں جمع ہو گئے۔

مجھے مُردہ چہرے دیکھ کر ڈر لگتا ہے اس لیے میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اگر میں کسی کا مُردہ چہرہ دیکھ لوں تو رات کو سوتے وقت بار بار وہ آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔

کچھ دیر بعد ہی کمار ڈریسنگ کرا کے لوٹ آیا۔ اس وقت بھگوان داس کی لاش وہاں سے اٹھائی جا رہی تھی۔

فرش پر اب تک اس لڑکی کا کھلا ہوا وینٹی بیگ، کھلا ہوا چاقو اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ پہلے کمار ہی ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کمرے میں اب میرے اور کمار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تمام افراد بھگوان داس کی لاش کے ساتھ جا چکے تھے۔

"یہ وینٹی بیگ اور بقیہ چیزیں اس لڑکی ہی کی ہیں شاید؟" اس نے تصدیق طلب لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ... وہ لڑکی تھی کون سر؟" کمار نے ہچکچاتے ہوئے [illegible] دیا۔

"بھگوان داس کی بھتیجی۔" میں نے وہی بات دُہرا دی جو اس لڑکی نے بتائی تھی۔

"بھگوان داس کی بھتیجی!" کمار کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اور اس کا ساتھی؟"

"بھگوان داس کا بھتیجی داماد ہو گا، اور کون ہو سکتا ہے۔" میں جان کر کمار کی باتوں کے اوٹ پٹانگ جواب دے رہا تھا حالانکہ اب اس تمام ہنگامے کے بعد مجھے یقین ہو چکا تھا کہ لڑکی نے اپنے بارے میں بے پر کی اُڑائی تھی۔ وہ انہی مجرموں سے تعلق رکھتی تھی جو بھگوان داس کے گھر سے کاغذات لے اڑے تھے اور اُسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ کمار شاید سمجھ گیا تھا کہ میں اُسے کچھ بتانا نہیں چاہتا اس لیے اُس نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی۔

"اگر آپ کہیں سر تو میں یہ سارا سامان یہاں سے اٹھا لوں۔ ممکن ہے کہ اس سے قاتلوں کو تلاش کرنے میں کوئی مدد مل سکے۔" کمار نے کہا۔

"ہاں اٹھا لو!" میں نے اجازت دے دی اور اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال آیا کہ کمار زخمی ہے۔ لمحے بھر کو میرے دل میں اُس کے لیے رحم کا جذبہ جاگا مگر اسی وقت مجھے اس کی دل جلانے والی باتیں یاد آگئیں۔

کمار وہ وینٹی بیگ اٹھانے کے لیے جھک ہی رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹک کر رُک گیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت بُرا ہوا سر!" اُس کے چہرے سے لمحے بھر [illegible] اظہار ہوا، پھر وہ اپنے مخصوص پُرسکون لہجے میں بولا۔ "یہاں موجود تھے سر! ذمے داری آپ کی تھی میری نہیں۔"

"کیسی ذمے داری؟ کیا بکواس شروع کر دی تم نے؟" [illegible] ہو گیا۔

"میں تو تیواڑی جی سے کہہ دوں گا کہ اس وقت میں [illegible]" وہ بدستور معنی خیز اور غصہ دلانے والے انداز میں بولا۔

"کس وقت نہیں تھے تم یہاں!؟ اور اس بات کا تمہ[illegible] کیا تعلق؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے [illegible] درمیان میں تیواڑی جی کا نام آجانے سے میری ہوا خراب [illegible] یوں بھی وہاں میری موجودگی کے باوجود بھگوان داس کو [illegible] اس کی جوابدہی میرے لیے مشکل تھی اور اب کمبخت کمار [illegible] چکر چلا رہا تھا۔

"اچھا سر! مجھے اجازت دیں۔ میں یوں بھی زخمی ہوں۔" [illegible] نے کہا اور چلنے لگا۔

"ٹھہرو!" میں چیخا۔ "تم اس طرح نہیں جا سکتے۔ یہ نہ [illegible] میں تمہارا افسر ہوں۔"

"اگر آپ نہ بھی چیخیں تو بھی میرے افسر ہی رہیں [illegible] کر بولا۔ "فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"تم کیا کہنا چاہتے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں آپ کو کم از کم ایک جواب طلبی سے بچا سکتا ہوں [illegible] وقت ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ مجھے اس لڑکی کے بارے میں [illegible] دیں گے۔"

"جواب طلبی! کیسی جواب طلبی؟" میں غصے میں بولا۔

"یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا مگر جلدی کیجیے! اگر [illegible] گزر گیا تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔" کمار نے معنی خیز انداز میں کہا۔

پھر مجبوراً مجھے کمار کو سب کچھ بتانا ہی پڑا۔ میں نے [illegible] مختصر کی تھی تاکہ اس سے وہ بات پوچھ سکوں جو میری جواب[طلبی کا سبب] بن سکتی تھی۔ اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے کمار سے وہ بات [بتانے کا] مطالبہ کر دیا۔

"یہاں سے بھگوان داس کی لاش کو فوراً ہی نہیں اٹھا[نا چاہیے] تھا۔" کمار نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"حیرت ہے سر کہ آپ یہ سوال کر رہے ہیں۔" کمار واقعی [illegible] بولا۔ "اُسے قتل کیا گیا تھا اور اس کی لاش اس وقت تک یہیں [رہنی چاہیے] تھی جب تک ضابطے کی کارروائی مکمل نہ ہو جاتی، یعنی لاش [illegible] منتقل جا چکی ہوتیں اور فنگر پرنٹس کا محکمہ مختلف اشیا پر سے [illegible]

[illegible] ہوں اور پیروں کے نشانات حاصل نہ کر لیتا۔ اب سمجھے آپ!"

کمار کی بات سن کر میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ [illegible] مجھ سے زبردست حماقت سرزد ہوئی تھی جس پر یقیناً میرا جواب طلب [کیا جا] سکتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے تو اس وقت میری حالت [کھ]سیانی بلی جیسی ہو رہی تھی اور مجھے ایک کھمبے کی ضرورت تھی جو کمار [کی صور]ت میں میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس پر اپنے پنجے نکالے۔ [جس] وقت بھگوان داس کی لاش یہاں سے اٹھائی جا رہی تھی، تم بھی تو [موجود] تھے۔ اس وقت تم نے یہ بات کیوں نہیں بتائی؟" میرا انداز بالکل [جوا]ب طلبی کا سا تھا۔

"آپ ہی کی طرح میں بھی انسان ہوں سر! مجھ سے بھی حماقت ہو [سکتی] ہے۔" کمار نے جواب دیا۔ اس کی بات اور لہجے میں چھپا ہوا طنز [مجھے] سلگا گیا۔

"گویا اس حماقت میں تم اور میں برابر کے شریک ہیں؟ یہی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"معاف کیجیے گا سر! آپ یہ باتیں کر کے خواہ مخواہ وقت ضائع کر [رہے] ہیں۔" کمار نے کہا۔ "آپ شاید یہ بھول گئے کہ میں نے کہا تھا، اب [بھی] وقت ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ آپ جواب طلبی سے بچنے کے لیے دوبارہ یہاں لاش منگوا [ل]یں۔" کمار بولا۔ "اس وقت شاید ڈاکٹر صاحبان بھی بدحواس ہو گئے [ور]نہ وہ ایسا نہ کرتے۔ اب انھیں غلطی کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔"

کمار کی بات سن کر میری آنکھوں میں تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں [گھوم گ]ئیں اور پھڑپھڑانے لگیں۔ میں اپنا غصہ تھوک کر جلدی سے بولا۔ "تو [جلد از ج]لد لاش کو یہاں لانے کا بندوبست کراؤ۔ اُسے غالباً مردہ خانے [لے ج]ایا گیا ہو گا۔"

پھر کمار ہی نے ساری بھاگ دوڑ کی تھی۔ میں تو بس اُس کے ساتھ [ساتھ] تھا۔ کمار نے اسی دوران میں کمار سے یہ وعدہ لے لیا تھا وہ اس [بات کا ک]سی سے ذکر نہیں کرے گا کہ لاش ایک بار وہاں سے اٹھائی جا [چکی تھی]۔ غالباً کمار کو میرے علاوہ اپنی جواب طلبی کی بھی فکر رہی ہو گی [ورنہ ظ]اہر ہے میری اس سے رشتے داری نہیں تھی جو وہ مجھ سے ہمدردی [کرتا]۔

تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد میں نے کمار کو خفیہ کے دفتر [بھیج د]یا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ وہاں اس حادثے کی اطلاع دے کر اپنے [illegible] سکتا ہے۔ میں وہیں رک گیا مگر اس کمرے میں نہیں جہاں بھگوان داس [illegible] بلکہ ڈیوٹی روم میں جا بیٹھا تھا۔

قتل کے سبب سارے اسپتال میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور [illegible] اس کمرے والے برآمدے میں اچھا خاصا مجمع تھا لیکن ڈاکٹروں نے وہاں کمرے کے سامنے، وارڈ بوائز کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ کسی کو کمرے کے اندر نہ جانے دیں۔

اس وقت ڈیوٹی روم میں کئی ڈاکٹر تھے جو اَب یہ جان چکے تھے کہ میرا تعلق کس محکمے سے ہے۔ وہ بھگوان داس کے قتل کے بارے میں میرا عندیہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے اور میں "اَن کہانیاں" بھر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں انھیں کس طرح ساری خفیہ باتیں بتا سکتا تھا۔ ان کے سامنے مجھے اپنی شخصیت کا اظہار بھی محض اس غلطی کی تلافی کے لیے کرنا پڑا تھا جو نادانستگی میں مجھ سے سرزد ہو گئی تھی۔ اگر کمار اور میں ڈاکٹروں کو یہ نہ بتاتے کہ ہم بہت اہم افراد ہیں تو بھگوان داس کی لاش کو دوبارہ اس کمرے میں پہنچایا جانا ممکن نہ ہوتا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں کسی طرح تیواڑی جی تاڑ نہ لیں کہ لاش ایک بار وہاں سے اٹھائی جا چکی تھی۔ میں نے اسی لیے ان ڈاکٹروں کو بھی اپنی دانست میں سانٹ لیا تھا کہ وہ یہ بات پی جائیں۔ ڈاکٹروں نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیانات دیتے ہوئے لاش کو وہاں سے ایک بار اٹھائے جانے کا ذکر نہیں کریں گے۔

مجھے تیواڑی جی اور خفیہ کے عملے کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ لوگ میری توقع سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ تیواڑی جی ڈیوٹی روم میں آنے کی بجائے سیدھے موقع واردات پر پہنچے تھے، عملے سمیت۔ مجھے اُن کے آنے کی اطلاع ایک وارڈ بوائے سے ملی تھی۔ پھر میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

جب میں اس کمرے کے سامنے پہنچا جہاں بھگوان داس کو قتل کیا گیا تھا تو دیکھا، ہجوم منتشر ہو رہا تھا۔ غالباً تیواڑی جی نے وہاں پہنچتے ہی انھیں وہاں سے ہٹ جانے کی تاکید کی ہو گی۔ میں نے تیواڑی جی کو کمرے کے دروازے میں کھڑا ہوا دیکھا۔ اُن کے قریب ہی مجھے اپنا ماتحت کمار کھڑا ہوا نظر آیا۔ تیواڑی جی اس کمرے میں موجود عملے کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔

مجھے قریب آتے دیکھ کر وہ پلٹے اور ان کی نوکیلی مونچھیں پھڑپھڑائیں جنھیں دیکھ کر میں ڈر گیا۔ "آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ تم یہاں موجود تھے اس کے باوجود بھگوان داس کو قتل کر دیا گیا؟" وہ اس طرح بولے جیسے بھگوان داس کو میں نے ہی قتل کیا ہو۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ دوبارہ بول اٹھے۔ "کیا تم اس حادثے کی اطلاع مجھے ٹیلیفون پر نہیں دے سکتے تھے؟ کمار کو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ زخمی بھی تھا؟"

"سر!... سر!... مجھے... ٹیلیفون کا خیال نہیں آیا تھا۔" میں نے بمشکل کہا، پھر میں انھیں پیش آنے والے واقعات بتانے لگا مگر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔

"مجھے کمار سے تمام واقعات معلوم ہو چکے ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"پھر آپ ہی بتائیے سر کہ اس میں میرا کیا قصور تھا۔" میں مردہ سی

آواز میں بولا۔

"تمہیں اس لڑکی کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر لینا چاہیے تھا۔" تیواڑی جی سخت لہجے میں بولے۔

"مگر سر! یقین کریں کہ جس وقت وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی میری دونوں آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔" میں نے انھیں اس حقیقت سے آگاہ کیا جو شاید ان کے علم میں نہیں تھی۔

"احمق میری مراد ان آنکھوں سے نہیں، ذہن کی آنکھوں سے تھی۔" وہ بگڑ کر بولے۔

"ذہن کی آنکھیں!" میں نے حیرت سے کہا۔ "سر! ذہن میں بھی آنکھیں ہوتی ہیں، یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا۔"

"بکواس بند کرو!" تیواڑی جی غرائے اس کے بعد وہ مجھے مختلف ہدایات دینے لگے کہ وہ چلے جائیں تو مجھے کیا کیا کرنا ہے۔ ان ہدایات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جو افراد قتل کے وقت وہاں موجود تھے یا فوراً ہی وہاں آ گئے تھے، ان سب کے بیانات قلمبند کیے جائیں۔

کچھ دیر بعد ہی تیواڑی جی جب کمال کو وہاں چھوڑ کر جانے والے تھے تو مجھے وہ بات یاد آ ہی گئی جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی تیواڑی جی کو مخاطب کیا۔ "سر! لڑکی کا ساتھی انہی تینوں میں سے ایک تھا جنھوں نے انوری بائی کو اغوا کیا تھا۔"

تیواڑی جی میری بات سن کر چونک پڑے اور بولے۔ "کیا مطلب؟ جب انوری بائی کو اغوا کیا گیا تھا تو تم وہاں کب تھے؟"

"ہر چند کہ میں وہاں نہیں تھا مگر مجھے ان کا حلیہ معلوم ہو گیا تھا۔" میں گردن اکڑا کر بولا۔ "میں نے اپنے ماتحت کمار کے ذریعے ان لوگوں کا حلیہ اس پولیس انسپکٹر سے معلوم کرایا تھا جو انوری بائی کے اغوا کی تفتیش کر رہا تھا۔"

تیواڑی جی طویل سانس لے کر بولے۔ "ہاں مجھے یاد آ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھگوان داس کے قاتل وہی ہیں جنھوں نے انوری بائی کو اغوا کیا تھا اور یقیناً انہی لوگوں نے گزشتہ رات بھگوان داس کے گھر سے کاغذات غائب کیے تھے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے تیواڑی جی کا لہجہ خود کلامی کا سا ہو گیا، پھر وہ خاموش ہو گئے۔ اُن کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔ معاً وہ پھر بول اُٹھے۔ "تم یہاں سے فارغ ہو کر مجھ سے ملو۔ میرے خیال سے اس کیس کی کڑیاں ملتی جا رہی ہیں۔"

"بہتر ہے سر!" میں نے جلدی سے گردن ہلا دی اور تیواڑی جی نے جانے کے لیے قدم اٹھا دیے۔

مجھے اسپتال سے فراغت پانے میں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ بھگوان داس کی لاش اب پوسٹ مارٹم کے لیے دے دی گئی تھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔

اسپتال سے میں سیدھا دفتر روانہ ہو گیا۔ کمال بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ دفتر پہنچتے ہی میں فوراً تیواڑی جی سے ملنے روانہ ہو گیا۔

تیواڑی جی اس وقت میرے ہی منتظر تھے۔ میں ان کی ہدایت پر کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ بولے۔ "اس کیس کے درمیان ایک قتل بھی ہو گیا ہے، اس لیے اب معاملات خاصے نازک ہو گئے ہیں۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ جلد سے جلد اس معاملے کو نمٹا دیا جائے۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی نے چند لمحے توقف کیا، پھر بولے۔ "اب تک جو واقعات سامنے آئے ہیں، اُن کی روشنی میں یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ سارا ہنگامہ ان کاغذات کے لیے ہوا ہے جو سیٹھ وشوا ناتھ کی ملکیت تھے۔ وہ کاغذات کس نوعیت کے تھے، اس سلسلے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سیٹھ وشوا ناتھ انھیں قانون کی نظر سے چھپانا چاہتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس سارے ہنگامے کے پیچھے سیٹھ وشوا ناتھ کا ہاتھ ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نے کن لوگوں کی مدد حاصل کی ہے اور وہ لوگ کیوں سیٹھ وشوا ناتھ کی خاطر اس معاملے میں ملوث ہو گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ سیٹھ وشوا ناتھ نے انھیں خرید لیا ہو لیکن اس میں زیادہ جان معلوم نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اب تک جو افراد سامنے آئے ہیں، ان مجرموں کے علاوہ جنھیں تم نے بمبئی سے یہاں بلایا تھا، وہ سبھی نوجوان ہیں۔ انوری بائی کو اغوا کرنے والے بھی تین نوجوان ہی تھے اور آج جو حادثہ پیش آیا اس میں بھی دو نوجوان افراد ہی ملوث ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ کہ ان کاغذات سے سیٹھ وشوا ناتھ کے سوا اور کسے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ بات پہلے ہی سامنے آ چکی ہے کہ سیٹھ وشوا ناتھ اور بھگوان داس کے درمیان دشمنی تھی۔ بھگوان داس، سیٹھ وشوا ناتھ پر دباؤ ڈال کر اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ بھگوان داس سے کاغذات حاصل کر کے اُسے قتل کرانے والا سیٹھ وشوا ناتھ ہی ہو؟ میں نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ کیا تم ان سے متفق ہو؟" یہ کہہ کر تیواڑی جی مجھے سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگے۔

"سر! مجھے آپ کی باتوں سے پورا اتفاق ہے مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" تیواڑی جی نے دریافت کیا۔

"آپ نے ابھی کہا تھا کہ جو افراد سامنے آئے ہیں، وہ سبھی نوجوان ہیں۔ آپ نے اس بات کو اہم نکتہ قرار دیا تھا۔ میں یہی بات نہیں سمجھ سکا۔ ویسے آپ کے یہ کہنے نے میرے ذہن میں اور باتیں بھی آئی ہیں۔"

"مثلاً؟" تیواڑی جی میری بات کا جواب دیے بغیر بولے۔

"مثلاً یہ سر کہ گزشتہ رات سیٹھ سے ملنے والے بھی نوجوان تھے، پھر اس سے پہلے ایک رات قطب روڈ کی جس عمارت میں بیٹھا گیا تھا، وہاں بھی نوجوان ہی جمع ہوئے تھے اور..."

"کیا؟" تیواڑی جی میری بات سن کر اچھل پڑے۔ "تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟ یہ تو بہت ہی اہم بات تھی۔"

"کل شام ہی مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا سر کہ آپ کو اس سلسلے میں بتاؤں گا لیکن کل کیونکہ ساری توجہ بھگوان داس کی طرف تھی، اس لیے میں یہ بات بھول گیا۔" میں نے کہا۔

"ذرا تفصیل سے بتاؤ۔" تیواڑی جی نے میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے مجھے حکم دیا۔

"میں نے قطب روڈ کی اس عمارت کے بارے میں معلوم کرا لیا ہے۔ وہ عمارت سیٹھ وشوا ناتھ ہی کی ملکیت ہے۔" یہ کہہ کر میں نے وہ باتیں دُہرا دیں جو مجھے اپنے ماتحتوں سے معلوم ہوئی تھیں اور جو سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی کر رہے تھے، پھر آخر میں بولا۔ "آج صبح بھی ایک نوجوان لڑکی سیٹھ وشوا ناتھ سے ملی تھی۔"

تیواڑی جی چونک اُٹھے۔ "کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جس سے آج تم ٹکرائے تھے اور جس نے بھگوان داس کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟ تم نے اپنے ماتحت سے اس لڑکی کا حلیہ معلوم کیا تھا جو آج صبح سیٹھ وشوا ناتھ سے ملی تھی؟"

"لیکن سر! یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لڑکی سیٹھ وشوا ناتھ ہی سے ملی ہو گی۔ وہ سیٹھ کی بیٹی سروج کی کوئی سہیلی بھی ہو سکتی ہے یا سیٹھ کی کوئی رشتہ دار۔ اس لڑکی کو بہرحال سیٹھ کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ اندر پہنچ کر وہ کس سے ملی، یہ نہیں کہا جا سکتا۔"

"مگر تم نے میرے سوال کا جواب اب بھی نہیں دیا۔ میں نے تم سے اس لڑکی کا حلیہ معلوم کیا تھا۔" تیواڑی جی کا لہجہ کسی قدر سخت ہو گیا۔

"وہ سر!... میں نے اس لڑکی کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، اس لیے حلیہ نہیں معلوم کیا۔"

"یہ اطلاع تمہیں تمہارے کس ماتحت نے دی تھی؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

"پیارے لال ہنر نے۔" میں نے جواب دیا، پھر یہ بتانا بھی ضروری سمجھا کہ وہ رات بھر ڈیوٹی دے کر اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہو گا۔

"اسے اسی وقت کمال کو بھیج کر بلواؤ!" تیواڑی جی نے حکم صادر کیا، پھر خود ہی کہا۔ "ٹھہرو میں کمال کو یہیں بلا کر حکم دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

چند لمحے بعد ہی چپراسی اندر آ گیا جسے تیواڑی جی نے کمال کو بلا کر لانے کا حکم دیا۔ کچھ دیر بعد ہی کمال وہاں پہنچ گیا۔ اُس کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ غالباً اس غیر متوقع طلبی سے گھبرا گیا تھا۔ تیواڑی جی نے اُسے پیارے لال ہنر کو اپنے ساتھ لے کر آنے کا حکم دیا۔

جب کمال وہاں سے چلا گیا تو تیواڑی جی پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "نوجوانوں کا اجتماع اور اُس میں سیٹھ وشوا ناتھ کی شرکت، یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ جس عمارت میں وہ اجتماع ہوا، وہ سیٹھ وشوا ناتھ ہی کی ملکیت ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ آئی جی صاحب نے مجھے ایک نئے کیس کی فائل دی ہے۔"

"جی ہاں سر!" میں نے گردن ہلائی۔

"میں وہ کیس دلاور خان کے سپرد کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ کیس بھی اب اسی کیس کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔" تیواڑی جی سگریٹ کا طویل کش لے کر بولے۔

پھر تیواڑی جی نے مجھے تفصیل کے ساتھ اس کیس کے بارے میں بتایا جس کی فائل وہ مجھے دینے والے تھے اور جو اب اسی کیس کی ایک کڑی معلوم ہوتا تھا۔

تیواڑی جی نے مجھے اس کیس کی جو تفصیلات بتائیں، ان سے میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا جس پر تیواڑی جی پہنچے تھے۔

تفصیلات کے مطابق دہلی میں نوجوانوں کی کوئی ایسی خفیہ تنظیم سرگرم عمل تھی جو حکومت کے خلاف کام کر رہی تھی اور چند بڑے سرمائے دار اس کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان سرمائے داروں میں سے اب تک صرف دو کے نام سامنے آئے تھے۔ اُن میں سے ایک کا نام راؤ بہادر کشوری لال تھا اور دوسرے کا نام مضفر علی بیگ تھا۔

تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد تیواڑی جی نے مجھ سے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ یہ نوجوان جو سامنے آئے ہیں، اسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کا کسی ایسی عمارت میں جمع ہونا جو عموماً خالی پڑی رہتی ہے معنی خیز بات ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ جو چند سرمائے دار اس خفیہ تنظیم کی پُشت پناہی کر رہے ہیں، ان میں سیٹھ وشوا ناتھ بھی شامل ہو۔"

"لیکن سر! اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان نوجوانوں کا تعلق اس خفیہ تنظیم سے ہے تو سیٹھ وشوا ناتھ نے انھیں اپنے ذاتی مقصد کے لیے کس طرح استعمال کر لیا؟" میرے ذہن میں جو سوال پیدا ہوا، وہ زبان پر آ گیا۔

"ہاں یہ بات سوچنے والی ہے۔" تیواڑی جی پُر فکر لہجے میں بولے، پھر چند لمحے توقف کے بعد خود ہی کہا۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان کاغذات کا تعلق تنظیم سے بھی ہو۔"

"اگر ایسا ہی تھا تو پھر سیٹھ وشوا ناتھ نے مجرموں کے ہاتھوں بلیک میل ہونا کیوں گوارا کیا؟ وہ پہلے ہی سے تنظیم کے افراد کو اس سلسلے میں استعمال کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے پہلے خود ہی معاملے کو نمٹانے کی کوشش کی ہو اور جب ناکام رہا ہو تو تنظیم کے نوجوانوں کو استعمال کیا ہو۔" تیواڑی جی نے خیال آرائی کی۔

"سر! ان مجرموں کا تو سرے سے اب پتا ہی نہیں چل رہا جو سیٹھ وشوا ناتھ کو بلیک میل کر رہے تھے۔"

"ظاہر ہے کہ اب وہ کہاں ملیں گے۔" تیواڑی جی ہنس کر بولے۔

"وہ کاغذات کے عوض رقم اینٹھ کر یہاں سے رفو چکر ہو گئے ہوں گے۔"

"اور سر! وہ غنڈا بشیرے بھی اب تک لاپتا ہے۔" میں بولا۔

"ہاں اگر وہ ہاتھ آ جاتا تو کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ تم اُسے پھر تلاش کرانا۔ خیر اب میں تمھیں سمجھاتا ہوں کہ کن خطوط پر کام کرنا ہے!" یہ کہہ کر تیواڑی جی کافی دیر مجھے اس لائحۂ عمل سے آگاہ کرتے رہے جو آئندہ اختیار کرنا تھا۔

اسی دوران میں مجھے سیٹھ وشوا ناتھ کا وہ دعویٰ یاد آ گیا کہ جو قیمتی زیورات چوری ہوئے تھے اور تیواڑی جی کے ذریعے اس تک پہنچ چکے تھے، وہ اس کے پاس موجود ہیں جبکہ ایسا نہیں تھا۔ مجرموں کی طرف سے سیٹھ وشوا ناتھ کو جو خط لکھا گیا تھا اور جو میرے ہتھے چڑھ گیا تھا، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ مجرموں کو وہ قیمتی زیورات مل چکے ہیں۔ میں نے اس طرف بھی تیواڑی جی کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھی۔

"میں نے تم سے کہا تو تھا کہ یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں۔ ان زیورات کو میں پہچانتا ہوں۔ میں کسی بھی وقت سیٹھ وشوا ناتھ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور کسی بہانے وہ زیورات دیکھنے کے لیے کہہ دوں گا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس نے تم سے جھوٹ بولا ہو گا تو زیورات نہ دکھانے کی خاطر کوئی بہانہ تراش لے گا۔"

ابھی تیواڑی جی کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ چپراسی نے کمال اور پیارے لال ہنر کے آنے کی اطلاع دی۔

"کمال سے کہو کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے اور پیارے لال کو اندر بھیجو۔" تیواڑی جی نے چپراسی کو حکم دیا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا پیارے لال ہنر، تیواڑی جی کے سامنے بھی ویسی ہی گاڑھی اردو بولے گا جیسی میرے سامنے بولی تھی؟

چند لمحے بعد ہی پیارے لال ہنر کمرے میں داخل ہوا اور اس کی آواز سنائی دی۔ "آداب عرض سرکار!" اس کے مخاطب تیواڑی جی تھے۔

تیواڑی جی نے ہاتھ کے اشارے اس کے آداب کا جواب دیا، پھر اپنی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "بیٹھو۔"

پیارے لال ہنر میرے برابر والی خالی کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ تیواڑی جی دریافت کرتے وہ بول اٹھا۔ "کیسے یاد فرمایا سرکار نے؟"

میں نے تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑکتی ہوئی دیکھیں اور یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ وہ میری توقع کے خلاف خفا ہونے کی بجائے مسکرا رہے تھے۔

"پہلے یہ بتاؤ، کیسی نبھ رہی ہے اللہ دتا سے؟" تیواڑی جی نے مسکرا کر کہا۔ "تمھاری اردو سے تو بہت تنگ ہو گا تمھارا افسر!"

"بس کیا عرض کروں سرکار! آج پہلی بار ہی ذرا تفصیلا حاصل ہوا تھا۔" پیارے لال ہنر نے میری طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہر حال، اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔"

پیارے لال ہنر اور تیواڑی جی کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ وہ اسے اچھی طرح جانتے تھے اور یہ کہ وہ اس کی گاڑھی اردو سے نالاں نہیں تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ تیواڑی جی کے سامنے بھی گاڑھی اردو بول رہا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے تاؤ آ رہا تھا۔

"خیر یہ باتیں پھر ہوں گی۔ اس وقت میں نے تمھیں ایک بات معلوم کرنے کے لیے بلایا تھا۔" تیواڑی جی نے پیارے لال سے کہا۔

"حکم فرمائیے سرکار!" پیارے لال ہنر بولا۔

"اللہ دتا سے معلوم ہوا تھا کہ آج صبح کسی نوجوان لڑکی کو سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ اس لڑکی کا حلیہ جاننا چاہتا ہوں۔" تیواڑی جی مطلب کی بات پر آئے۔

"بجا۔" پیارے لال ہنر نے کہا اور میں سوچنے لگا کہ وہ کیا چیز بجانے کے لیے کہہ رہا ہے؟ حیرت اس بات پر تھی کہ تیواڑی جی اس کی یہ ناشائستہ بات سن کر کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ چند لمحے بعد پیارے لال ہنر دوبارہ بولا۔ "وہ نسیم کے جھونکے کی مانند میرے قریب سے گزری تھی جس سے مشک اٹھا تھا۔ رفتار ایسی کہ زمانہ ٹھوکریں کھاتا محسوس ہو، یوں جیسے عید کا زرپوش ہلال، چتون ایسے جیسے شرر میں دھنش، زلفیں جیسے کالی گھٹا امنڈ آئی ہو، آنکھیں ایسے ہوئے دو جام ہوں، عارض ایسے کہ کشمیر کے سیب یاد آئیں، وہ کہ خدائے سخن میر صاحب کے بقول گلاب کی پنکھڑیاں دکھائی دے جیسے بستر دیبا و حریر، رنگ و بدن وہ کہ پیرہن چھلکے، دائیں رخسار پر ایک نمایاں خال کہ نظر نہ لگ جائے۔"

"بس بس اتنا کافی ہے۔" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر مسکرا کر بولے، پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں بھئی اللہ دتا! تم نے سنا! اب بتاؤ، کیا اس حلیے کی لڑکی اسپتال میں آئی تھی؟"

غصے کے مارے میرا برا حال تھا۔ پیارے لال ہنر نے جو کچھ کہا تھا، وہ قطعی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا اور اب تیواڑی جی میرا امتحان لینے پر آمادہ تھے۔ میں اسی لیے جھلا کر بولا۔ "میں نہیں سمجھ سکا کہ اس شخص نے کیا بتایا ہے۔"

"اس لڑکی کے بائیں رخسار پر تل تھا۔" تیواڑی جی نے میں نے ذہن پر زور دیا مگر مجھے یاد نہ آ سکا۔ میں نے نفی کو یہی جواب دے دیا۔

"کیا وہ لڑکی بے حد خوبصورت تھی؟" تیواڑی جی نے دوسرا سوال کیا۔

"بے حد خوبصورت تو نہیں کہا جا سکتا تھا، ہاں تھی حسین۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی اور خاص بات جو تم نے اس لڑکی میں محسوس کی ہو؟" اس بار تیواڑی جی میری بجائے پیارے لال ہنر سے مخاطب ہوئے۔

تیواڑی جی کی بات سن کر پیارے لال ہنر چند لمحے خاموش رہا جیسے کوئی بات یاد کرنے کی کوشش میں ہو، پھر وہ بولا۔ "اس کا قد غیر معمولی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ساڑھے پانچ فٹ سے بھی کچھ زیادہ ہی رہی ہو گی مگر اس کے جسم کا تناسب ایسا تھا کہ قامت بار نظر نہیں ہوتا تھا۔"

تیواڑی جی نے اس کی بات سن کر میری طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا اور میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔

"جی نہیں سر! وہ لڑکی اتنی لمبی نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"تو گویا یہ وہ لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے اسپتال میں ہنگامہ کیا تھا۔" تیواڑی جی طویل سانس لے کر بولے، پھر انھوں نے سگریٹ سلگائی۔ اس کے بعد مجھ سے کہا۔ "لڑکی کے ساتھی کا حلیہ بتاؤ۔ ممکن ہے کہ پیارے لال نے اسے سیٹھ وشوا ناتھ کے یہاں آتے جاتے دیکھا ہو۔"

میں نے اس کا حلیہ بیان کیا۔

"جی ہاں، جی ہاں سرکار!" پیارے لال ہنر جلدی سے بولا۔ "اس حلیے کا ایک نوجوان کل رات سیٹھ وشوا ناتھ سے ملا تھا مگر اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔"

تیواڑی جی کے کہنے پر پیارے لال ہنر نے دوسرے نوجوان کا حلیہ بتایا جسے سن کر اس بار میں چونک پڑا۔

"کیوں، کیا ہوا؟ کیا تم اس نوجوان کو جانتے ہو؟" تیواڑی جی نے مجھے چونکتے دیکھ کر پوچھا۔

"سر! انوری بائی کو اغوا کرنے والے تین نوجوانوں میں سے یہی ایک تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اور پہلے نوجوان کے بارے میں تم بتا ہی چکے ہو۔" تیواڑی جی سخت تیز لہجے میں بولے۔ "اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ انوری بائی کے اغوا میں سیٹھ وشوا ناتھ ہی کا ہاتھ تھا۔"

"اور اس اغوا کا مقصد مجرموں تک پہنچنا ہی ہو سکتا ہے۔" میں بولا۔ "کیونکہ مجرموں تک پہنچنے کے لیے ہم نے بھی انوری بائی ہی کو ذریعہ بنانا چاہا تھا۔"

"اس طرح تو ایک اور ہی کہانی بن رہی ہے۔" تیواڑی جی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "انوری بائی کا بیان ہے کہ اغوا کرنے والوں نے اس سے پوچھا تھا، زیورات کا تھیلا اس نے کسے دیا اور اس نے کس کے کہنے پر ایسا کیا۔ جواب میں انوری بائی نے بتایا کہ اس نے بشیرے کے کہنے پر ایسا کیا، اس کے سوا وہ کچھ نہیں جانتی اور تھیلا لے جانے والے کو بھی نہیں پہچانتی۔ اس کے بعد انوری بائی کو اغوا کرنے والوں نے بشیرے پر ہاتھ ڈالا۔ غالباً تم نے مجھے بتایا تھا کہ جس عمارت میں انوری بائی کو اغوا کر کے لے جایا گیا تھا وہاں اس نے عمارت کے کسی دوسرے حصے سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنی تھیں جیسے کسی شخص پر تشدد کیا جا رہا ہو۔ انوری بائی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ان آوازوں میں بشیرے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ بشیرے کی زبان کھلوانے اور اس سے مجرموں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے انھیں تشدد کرنا ہی پڑا ہو گا۔ پھر وہ بشیرے سے..." تیواڑی جی کچھ کہتے کہتے رکے، پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ انھوں نے بشیرے کے ساتھ ہی ساتھ سیٹھ وشوا ناتھ کو بلیک میل کرنے والوں کو بھی چھاپ لیا ہو مگر ایسا اسی وقت ممکن ہے جب بلیک میلر، بشیرے کے ساتھ ہی رہ رہے ہوں۔ بہر حال انھوں نے بلیک میلروں کو پکڑ لیا، پھر ان سے نہ صرف وہ اہم کاغذات حاصل کر لیے بلکہ قیمتی زیورات بھی چھین لیے۔"

"لیکن سر! وہ کاغذات تو میں نے مقتول بھگوان داس کے پاس دیکھے تھے۔" میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"کاغذات نہیں ان کی نقلیں!" تیواڑی جی زور دیتے ہوئے بولے۔

"جی... جی ہاں نقلیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"بلیک میلروں نے ان کاغذات کی نقلوں کا سودا بھگوان داس سے کیا ہو گا اور اصل کاغذات سیٹھ وشوا ناتھ کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس مسئلے پر ہم پہلے بھی غور کر چکے ہیں۔" تیواڑی جی بولے۔ "اب یہ اور بھی ضروری ہے کہ میں سیٹھ وشوا ناتھ سے مل کر اس کے پاس وہ زیورات دیکھوں۔ اگر زیورات اس کے پاس موجود ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کڑیاں ملائی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی پیارے لال ہنر سے مخاطب ہوئے۔ "اچھا اب تم جاؤ۔ کل سے تم اور حمید براہ راست مجھے رپورٹ دو گے۔ تمھارے افسر اللہ دتا کو کل سے میں ایک اور معاملے میں الجھا رہا ہوں۔ یہ تم سے نہ مل سکیں گے۔ ہاں وہ رپورٹس تحریری ہونا چاہئیں۔"

"بہتر ہے، میں حمید سے بھی کہہ دوں گا۔" پیارے لال ہنر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جب پیارے لال ہنر چلا گیا تو تیواڑی جی مجھ سے بولے۔ "تم موقع پا کر ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہنا۔ راؤ بہادر کے یہاں ٹیلیفون موجود ہے۔ ہاں میرے گھر کا ٹیلیفون نمبر بھی لکھ لو۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی نے اپنے گھر کا فون نمبر بتایا، پھر بولے۔ "گھر کا فون نمبر اس لیے دے رہا ہوں کہ شاید دن کے وقت تمھیں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کا موقع نہ مل سکے۔"

میں نے فون نمبر لکھ کر کہا۔ "مگر سر! میں اس سلسلے میں اپنے گھر والوں

سے کیا کہوں گا، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"کہہ دینا کچھ دن کے لیے دفتری کام سے تمھیں باہر بھیجا جا رہا ہے۔" تیواڑی جی نے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

اس کے بعد تیواڑی جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ دفتری اوقات کبھی کے ختم ہو چکے تھے۔ میں تیواڑی جی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں پہنچا جہاں کمال مظلوم صورت بنائے بیٹھا تھا۔

"سر! اسپتال والوں کی طرف سے اس چاقو کے بارے میں یہ رپورٹ موصول ہوئی ہے۔" کمال نے ایک بند لفافہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

میں نے لفافہ پھاڑ کر رپورٹ پڑھی اور چونک اٹھا۔ تیواڑی جی کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اس چاقو کا پھل زہر آلود ہی ثابت ہوا تھا۔ جب تیواڑی جی اسپتال سے چلے تھے تو انھوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اس چاقو کا کیمیائی تجزیہ کرا لوں، ممکن ہے کہ چاقو کا پھل زہر آلود ہو۔ اس وقت میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مگر پھر بھی وہ چاقو کیمیائی تجزیے کے لیے دے دیا تھا۔ اسپتال والوں نے کہا تھا کہ وہ شام تک اس کے بارے میں رپورٹ دے دیں گے۔ یہ وہی چاقو تھا جو اس لڑکی کے ہاتھ سے گرا تھا جس سے اسپتال میں میرے دو دو ہاتھ ہوئے تھے۔ لڑکی یقیناً وہ زہریلا چاقو بھگوان داس کو قتل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہوگی۔ اس نے اسی لیے میری توجہ کھڑکی کی جانب مبذول کرائی تھی مگر میری بدحواسی نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ لڑکی کو یہ موقع نہیں مل سکا تھا کہ بھگوان داس کے جسم میں وہ زہریلا چاقو اتار دیتی۔ باہر اس کا ساتھی بھی موجود تھا اس لیے جب وہ کافی دیر واپس نہ آئی تو اسے فکر ہوگئی ہوگی۔ پھر اس نے کھڑکی کے پاس رک کر سن گن لی ہوگی۔ اس کے بعد ہی اس نے مداخلت کا فیصلہ کیا ہوگا۔

اسپتال والوں سے میں کہہ آیا تھا کہ وہ شام تک رپورٹ بھجوا دیں۔ رپورٹ کے ساتھ ہی انھوں نے چاقو بھی بھیجا تھا۔ چاقو کے علاوہ وینٹی بیگ سے جو سامان گرا تھا، وہ بے مصرف ہی ثابت ہوا تھا۔ اس سے لڑکی کی شخصیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔ وینٹی بیگ میں سامانِ آرائش کے علاوہ صرف چند سو روپے ملے تھے۔

میں نے وہ رپورٹ اور چاقو، کمال کے سپرد کر دیا اور بولا۔ "کل سے تمھیں اور گپتا کو راؤ بہادر کشوری لال کی نگرانی کرنا ہے۔ تم دونوں اپنی تحریری رپورٹ براہِ راست تیواڑی جی کو دو گے۔"

"تو سر آپ.... کیا آپ اس کیس پر اب کام نہیں کر...."

"نہیں، یہ بات نہیں۔" میں کمال کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں ایک اور اہم کام میں مصروف ہو جاؤں گا اور کل سے دفتر بھی اسی لیے نہیں آسکوں گا۔" میں نے تجسس پیدا کرنے کی غرض سے کمال کو تفصیل سے آگاہ نہیں کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ راؤ بہادر کشوری لال کا پتا کمال کو بتا دوں جو مجھے تیواڑی جی سے معلوم ہوا تھا۔ ہر چند کہ راؤ بہادر مشہور شخصیت تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ کمال کو بھی اس کا پتا معلوم ہوتا۔ میں نے اسی لیے اس سے پوچھا: "تمھیں راؤ بہادر کا پتا معلوم ہے؟"

"یس سر!" کمال نے جواب دیا۔ "پہاڑ گنج میں اس کی سرخ حویلی خاصی مشہور ہے کیونکہ وہاں آئے دن بڑے بڑے انگریز افسران کی دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم اٹھا دیے۔ کمال میرے پیچھے تھا۔

کمرے سے نکل کر کمال تو رخصت ہو گیا اور میں میک اپ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے مجھے کچھ ضروری سامان لے کر گھر جانا تھا۔

تیواڑی جی نے مجھے آئندہ لائحۂ عمل کے بارے میں جو بتایا تھا اس میں سب سے مشکل مرحلہ میرے لیے بس ایک ہی تھا، چندیا پر اُسترا پھروا کر لمبی سی چوٹی رکھنا! میں نے اس وقت تو تیواڑی جی کے سامنے ہامی بھرلی تھی مگر اب میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آگئی تھی۔ میں نے چاند پر اُسترا پھروانے کی بجائے وِگ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دو دھوتیاں دو کرتے اور ایک عدد مطلوبہ وِگ لے کر میں، میک اپ روم سے نکلا۔ سارا سامان میں نے ایک تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ پھر مجھے ایک اور قباحت کا خیال آیا کہ میں میک اپ کہاں کروں گا۔ گھر سے میک اپ کر کے تو نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر کہیں راستے میں یہ کوشش کرتا تو دیکھ لیے جانے کا خطرہ بھی تھا اور پھر میں جو کپڑے اتارتا، انھیں کہاں رکھتا۔ یہ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ کل صبح گھر سے دفتر ہی آجاؤں اور یہیں سے میک اپ کر کے نکلوں۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے وہ سامان میک اپ روم ہی میں چھوڑ دیا اور گھر جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ صبح مجھے بہر حال دفتر آنا تھا اس لیے دفتری موٹر سائیکل استعمال کی جا سکتی تھی۔ میں صبح وہاں موٹر سائیکل چھوڑ کر اپنی مہم پر روانہ ہو سکتا تھا۔

میں جب موٹر سائیکل پر اپنے گھر جا رہا تھا تو میرے ذہن میں وہ تمام باتیں گردش کر رہی تھیں جو تیواڑی جی نے مجھے سمجھائی تھیں۔

میں گھر پہنچا تو وہاں چچا بند و خاں موجود تھے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ انھوں نے دفتری اوقات کے بعد گھر آنے کے بارے میں کہا تھا تاکہ میرے ابا اور امی کو سمجھا سکیں۔ مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی وہ چہکے: "اللہ دتا! تم ڈی آئی جی صاحب ہی کے کمرے میں تھے نا جب دفتر کا وقت ختم ہوا؟"

"جی ہاں چچا!" میں نے کہا۔ "مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"بس معلوم ہو گیا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولے۔ "بھئی ہم تمھارے بزرگ ہیں، اگر ہم تمھاری خیر خبر نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا!"

"آپ دفتر سے چلتے وقت میرے کمرے میں گئے ہوں گے۔ وہاں میرے ماتحت نے بتایا ہوگا کہ میں تیواڑی جی کے پاس ہوں۔" میں بولا۔

"دیکھا مہر دین!" چچا بند و خاں نے میرے والد کو مخاطب کیا۔ "کتنا عقلمند ہے اللہ دتا۔ ذرا سی دیر میں اصل بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ آخر ہے نا خفیہ میں!"

"تو اللہ دتا کے ماتحت بھی ہیں!" ابا حیرت سے بولے۔

"ارے اور کیا!" چچا بند و خاں نے گردن اکڑا کر اس طرح کہا جیسے انھوں نے ہی مجھے ماتحت فراہم کیے ہوں۔ پھر وہ مزید بولے۔ "ایک چھوڑ کئی کئی ماتحت ہیں اللہ دتا کے! افسر ہے افسر! ہم نے اپنے بیٹے کو ایسی ویسی نوکری نہیں کرائی۔"

کچھ دیر بعد جب چچا بند و خاں گھر سے چلے تو میرے حق میں فضا سازگار ہو چکی تھی۔ میرے افسر ہونے نے گھر میں بڑا رعب جما دیا تھا۔ مجھے اگر پتا ہوتا کہ اس لفظِ افسر میں اتنا جادو ہے تو پہلے ہی چیخ چیخ کر اپنے گھر والوں ہی کو کیا، گلی محلے والوں تک کو بتا دیتا، میں افسر ہوں۔ مجھے: اسنبھل کر بات کی جائے۔

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ گھر میں میری افسری کے سبب دھاک بیٹھ جانے سے بڑے بھائی جان کچھ زیادہ خوش نہیں تھے لیکن میں نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا۔ یوں بھی ابا اور امی وہاں موجود تھے۔ ایسے میں وہ مجھے کسی بہانے جتیا نہیں سکتے تھے۔

میں نے یہ موقع غنیمت جانا کہ عرضِ مدعا کر دوں۔ میں نے بات کہنے سے پہلے ذرا کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر بولا۔ "ابا! مجھے میرے ڈی آئی جی صاحب کچھ دن کے لیے دلی سے باہر بھیجنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ اپنے ابا سے میری طرف سے کہنا، وہ اجازت دے دیں گے۔"

"کیا ڈی آئی جی صاحب نے خود مجھ سے یہ بات کہلوائی ہے؟" ابا کو میری بات پر جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔ بہر حال یہ معمولی بات نہیں تھی کہ ایک بڑے سرکاری افسر نے ان سے کچھ کہلوایا تھا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میں نے ان سے اجازت حاصل کرنے کی غرض سے ٹرپ کا اِکا چلا تھا۔

"ہاں ابا!" میں نے انھیں یقین دلایا۔ "انھوں نے مجھ سے یہی کہا تھا۔"

"وہ میرا نام بھی جانتے ہیں کیا؟" ابا نے پوچھا۔ وہ اصل معاملے کو نظر انداز کرتے ہوئے برابر ڈی آئی جی صاحب ہی کے متعلق پوچھے جا رہے تھے۔

میں نے زیادہ جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا اور بولا: "انھیں میں نے نام نہیں بتایا، بس انھوں نے یہی کہا تھا کہ اپنے ابا سے یہ کہہ دینا۔"

"اب اگر کبھی موقع دیکھو تو بتا دینا۔ ایسے بڑے لوگوں کو نام معلوم ہونے چاہئیں۔" ابا نے تاکید کی، پھر شاید انھیں یاد آگیا کہ اصل بات کیا تھی۔ انھوں نے پوچھا: "ہاں وہ تجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟"

ہر چند کہ میں دہلی کے ارد گرد قریب شہروں کے دو چار نام جانتا تھا مگر میری اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ابا کے سامنے مسلسل جھوٹ بولے جاؤں اور وہ بھی اتنے بڑے بڑے جھوٹ! چھوٹا موٹا جھوٹ تو خیر چل جاتا ہے اس لیے میں نے بڑے جھوٹ پر چھوٹے جھوٹ کو ترجیح دی اور بولا۔ "وہ اس بارے میں کل ہی بتائیں گے۔ یہ معاملہ بہت خفیہ ہے ابا!"

"اچھا تو یہ بات تو کل معلوم کر کے گھر آئے گا۔" ابا نے کہا۔

"نہیں ابا!" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے وہیں سے روانہ ہو جانا پڑے گا۔"

"تو گھر کتا جیتو!" ابا بولے۔ "تاکہ ہمیں فکر نہ ہو۔"

مجھے دفتر سے میک اپ کر کے نکلنا تھا اور ابا خواہ مخواہ اس پروگرام میں کھنڈت ڈال رہے تھے اس لیے میں نے ہمت کر کے ایک عدد جھوٹ اور بول دیا۔ "ابا! مجھے دفتر سے فوراً ہی روانہ ہو جانا پڑے گا۔ اس کے علاوہ یہ کہ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہوں گے۔"

"اچھا تو تُو اکیلا نہیں جا رہا۔" ابا مطمئن انداز میں بولے۔

"یہ ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے!" امی جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھیں، ایک دم پھٹ پڑیں۔ "یہ باپ بیٹے اتنی دیر سے منکے جا رہے ہیں باتیں! میں تو جیسے کچھ ہوں ہی نہیں۔ پہلی دفعہ بیٹا، پردیس جا رہا ہے اور یہ بھی نہیں کہ اسے اسٹیشن تک ہی چھوڑ آئیں!"

"بھئی تو میں کیا کروں، بات ہی ایسی ہے۔" ابا نے کہا۔

"ایک دن کو دُکان بند کر دو گے تو کون سی آفت ٹوٹ پڑے گی!" امی جھنجھنائیں۔

"میں کب دُکان بند کرنے سے انکاری ہوں مگر بات تو سمجھو۔ یہ دفتر سے سیدھا اسٹیشن جائے گا۔ اس کے ساتھ دفتر والے بھی ہوں گے۔ پھر یہ یہاں کہاں آتا پھرے گا!"

اس کے بعد امی چپ ہو گئیں۔ پتا نہیں وہ بات سمجھ گئی تھیں یا ابا سے روٹھ گئی تھیں، بہر حال میری مشکل آسان ہو گئی۔

اس کے بعد میں کپڑے وغیرہ بدل کر کھانا کھانے باورچی خانے کے سامنے چٹائی بچھا کر بیٹھنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک چپت پڑی، اسی کے ساتھ بھائی جان کی آواز سنائی دی: "اے کہاں جا رہا ہے؟" میرے چپت جھاڑ کر غالباً وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ میں ان

کی نظر میں افسر وفسر بالکل نہیں، وہی اللہ دتا ہوں اور اس بات کو میں فوراً سمجھ گیا۔

"بھائی جان! مجھے نہیں معلوم کہ دفتر والے مجھے کہاں بھیج رہے ہیں"، میں نے دانت نکال کر جواب دیا۔

"اچھا خیر، کھانا کھا کر میرے جوتوں پر پالش کر دینا۔" انھوں نے حکم دیا۔

"جی بہتر ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے فوراً ہامی بھر لی اور پھر مجھے کھانا کھا کر ان کے جوتوں پر پالش کرنا ہی پڑی تھی۔

دوسرے دن صبح جب میں ٹین کے بکسے میں اپنے کپڑے وغیرہ اور ضروری سامان رکھ کر گھر سے چلنے والا تھا تو امی بولیں۔

"خط تو لکھے گا وہاں سے!"

"اگر کام سے فرصت ملی تو ضرور لکھوں گا امی!" میں نے ایک اور مصیبت ٹالنے کے لیے کہا۔ اب بھلا میں دہلی ہی میں رہ کر خط کہاں سے لکھ سکتا تھا۔

"اچھا لوٹے گا کب؟" امی نے دوسرا سوال کیا۔

"بس جلد ہی لوٹ آؤں گا۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"جلدی کی کوئی حد ہے!"

"یہ تو مجھے دفتر جا کر ہی پتا چلے گا کہ واپسی کب ہو گی۔ ویسے ڈی آئی جی صاحب کہہ رہے تھے کہ ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔"

"دیکھ اپنے کھانے پینے کا خیال رکھیو۔" امی نے نصیحت کی۔ "اور کسی اجنبی کے ہاتھ سے کچھ مت کھیو۔"

"اچھا میں خیال رکھوں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" میں نے انھیں اطمینان دلا دیا۔

"ارے تیرے بچے ہوں گے تو تجھے پتا چلے گا کہ کتنی فکر ہوتی ہے اولاد کی!"

ڈیوڑھی میں موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں ٹین کا بکسا اٹھا کر وہاں تک لے گیا اور اسے ایک رسی کے ذریعے کیریر سے باندھ دیا۔ جب تک میں گھر سے نہ نکل گیا، امی برابر نصیحتیں کرتی رہیں۔

دفتر پہنچتے ہی میری مڈبھیڑ اپنے سابق افسر دلاور خاں سے ہو گئی۔ میرے ہاتھ میں ٹین کا بکس دیکھ کر انھوں نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیا کباڑ دفتر میں اٹھا لائے؟" پھر انھیں فوراً ہی یہ خیال آ گیا کہ میں نے اب تک انھیں سلام نہیں کیا۔ وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولے۔ "بہت دماغ خراب ہو گئے ہیں تمھارے! سلام تک نہیں کیا مجھے!"

میں نے فوراً سلام جھاڑ دیا اور بولا۔ "ایسی بات نہیں سر! بلکہ سابق سر! میں تو اب بھی آپ کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں۔"

"سنا ہے آج کل بہت اونچے اڑ رہے ہو۔ تیواڑی جی سے بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔ ہاں بھئی آخر سفارشی ٹھہرے۔"

دلاور خاں کی بات سن کر میرے پتنگے تو لگے مگر اس وقت میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور قدم بڑھا دیے۔

"ارے بھئی چلے کہاں؟ میری بات کا جواب نہیں دیا۔" دلاور خاں اپنی "بھٹ کٹ" مونچھیں سہلاتے ہوئے بولے۔

"پھر فرصت سے جواب دوں گا۔ اس وقت مجھے ذرا جلدی ہے۔" میں نے بغیر مڑے کہا اور بڑھتا رہا۔

میں اپنے ہمراہ وہ کپڑے نہیں لے جا سکتا تھا جو گھر سے لے کر چلا تھا، اس لیے انھیں وہیں بکس سمیت میک اپ روم میں چھوڑ دیا اور جو کپڑے پہنے ہوئے تھا، وہ بھی اتار کر دھوتی کرتہ پہن لیا۔ میں نے اتارے ہوئے کپڑے بھی اسی بکس میں رکھ دیے، پھر اس تھیلے میں سے وہ وگ نکالی جو میں گزشتہ دن ہی اپنی چندیا پر فٹ کر کے دیکھ چکا تھا۔

جب میں دفتر سے نکلا تو میرے ہاتھ میں کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا تھا جس میں ایک دھوتی کرتہ اور کچھ ضروری سامان تھا۔ میرے پیروں میں بھی اب بوٹوں کی بجائے پھٹی ہوئی چپلیں تھیں۔ میں نے دفتر سے نکلنے کے لیے جان بوجھ کر پچھلا دروازہ استعمال کیا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں کی نظر مجھ پر پڑے۔

میں نے میک اپ روم سے چلتے وقت وگ لگانے کے بعد اپنا چہرہ دیکھا تھا تو خود مجھے اپنی صورت اجنبی اجنبی سی معلوم ہوئی تھی۔ اس وگ نے میرے چہرے کو جیسے بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب میں اپنے لباس اور چہرے مہرے سے قطعی کوئی دیہاتی ہندو نوجوان نظر آ رہا تھا۔ سپاٹ چندیا پر لمبی سی چوٹی نے بڑا کمال دکھایا تھا۔ اس حلیے میں اگر ایک بار مجھے میرے گھر والے بھی دیکھ لیتے تو شاید نہ پہچان سکتے۔

میں نے اب تک جو کچھ کیا تھا، تیواڑی جی کی ہدایات کے مطابق ہی کیا تھا اور آئندہ بھی انھی کی ہدایات پر عمل کرنے والا تھا۔ صرف میں نے ایک ہی حکم عدولی کی تھی کہ چاند پر استرا پھروا کر چوٹی نہیں رکھی تھی اور اس کی بجائے وگ لگائی تھی۔ پتا نہیں تیواڑی جی کے ذہن میں وگ کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔

دفتر سے کچھ دور جا کر میں نے ایک تانگا کیا، پہاڑ گنج کے لیے! میں نے بقدر ضرورت پیسے اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ تانگا چلا تو میرے خیالات کا ٹٹو بھی چلنے لگا۔ میں یہ سوچ رہا تھا، تیواڑی جی نے اتنے یقین سے یہ بات کیوں کہی تھی کہ مجھے فوراً نوکر رکھ لیا جائے گا؟

اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور مجھے دس بجے سے پہلے پہلے اپنی منزل تک پہنچ جانا تھا۔ تیواڑی جی نے بتایا تھا، دس بجے کے بعد کوئی ٹھیک نہیں ہوتا کہ راؤ بہادر کشوری لال اپنی کوٹھی ہی میں

رہیں۔ میں وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ تانگا میں نے حویلی سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

پہلے تو مجھے حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوتے وقت کچھ جھجک محسوس ہوئی، پھر میں ہمت کر کے اندر چلا ہی گیا۔

دائیں جانب پھولوں کی کیاریاں لگی ہوئی تھیں اور بائیں جانب پیڑ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں پختہ راستہ تھا جو سامنے موجود پرانی عمارت تک چلا گیا تھا۔ میں نے ارد گرد نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں ہمت کر کے اور بڑھا۔ اسی وقت پیچھے سے میری پشت پر کوئی چیز آ کر لگی اور میرے پیروں کے پاس گری۔ وہ ایک کچا امرود تھا۔ میں ایک دم اچھل پڑا تھا اور مڑ کر دیکھنے لگا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا اگر وہاں کوئی نہیں تو وہ کچا امرود کس نے پھینکا تھا؟ ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے اپنی چندیا سہلانا پڑی۔ نہ معلوم کون اس غریب پر چاند ماری کر رہا تھا۔

دفعتاً میری سماعت سے ایک نسوانی قہقہے کی آواز ٹکرائی اور میں اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا تھا، وہ یہ تھا کہ کسی چڑیل نے قہقہہ لگایا ہو۔ عجیب چنچناتا ہوا سا قہقہہ تھا وہ! میں نے ایک دم مڑ کر دیکھا۔ پیڑوں کے قریب مجھے ایک دراز قد لڑکی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

"اے بانگڑو!" وہ وہیں سے چلائی۔

"میرا نام بانگڑو نہیں، میں رام بھروسے ہوں۔" میں نے بھی چیخ کر جواب دیا۔

"اچھا!" اس نے اس طرح حیرت سے چیخ کر کہا جیسے میں نے اس کے علم میں اضافہ کیا ہو۔

پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی جیسے ہی میرے قریب پہنچی، میں چونک پڑا۔ پھر میری نگاہ اس کے دائیں رخسار پر موجود نمایاں تل کا جیسے طواف کرنے لگی۔

"کیا دیکھ رہا ہے آنکھیں پھاڑ کے!" اس نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرے منہ سے بہت زور کی "سی" نکل گئی۔ اس نے بہت زور سے میرے گال پر نوچ لیا تھا۔

میں تصویرِ حیرت بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ سو فیصد وہی لڑکی ہو سکتی تھی جس کا حلیہ پیارے لال نے بتایا تھا، وہی لڑکی جو گزشتہ روز دشوا ناتھ کی کوٹھی میں جاتی دیکھی گئی تھی۔

"کیا چاہیے تمھیں؟ کس سے ملنا ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

میں نے بھی باری باری اس کے سوالوں کے جواب دے ڈالے۔ "نوکری چاہیے، راؤ بہادر صاحب سے ملنے آیا ہوں اور میں گنگیری سے آیا ہوں۔"

"گنگیری!" وہ حیرت سے بولی۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"اس گاؤں کا نام ہے جہاں سے میں آیا ہوں اور جہاں میری سوتیلی ماتا اور سگے پتا جی رہتے ہیں۔" میں نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی کا ایک ٹکڑا سنا دیا۔

"گویا تم سوتیلی ماں کے ظلم کا شکار ہو کر گھر سے بھاگے ہو۔" وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"مگر... مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے حیرت کا اظہار کرنا ضروری سمجھا کیونکہ میں نے یہی کہانی سوچی تھی۔

"بس چل گیا پتا!" اس نے ایک ادا سے کہا۔ "ہم بہت سی باتوں کا پتا چلا لیتے ہیں۔ ہم سے بڑا گیانی تمھیں پورے دلی میں نہیں ملے گا۔"

"وہ راؤ بہادر صاحب ہیں گھر پر؟" میں مطلب کی بات پر آ گیا۔

"یہ تمھیں گھر نظر آ رہا ہے بانگڑو!" اس نے آنکھیں نکالیں۔ "یہ گھر نہیں حویلی ہے۔"

"بالکل حویلی ہے مگر میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ میرا نام بانگڑو نہیں، رام بھروسے ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ "ہم تمھیں بانگڑو ہی کہیں گے۔ اگر تمھیں یہاں نوکری کرنا ہے تو اس پر آئندہ کوئی اعتراض نہیں کرو گے، سمجھے!"

"سمجھ گیا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اپنا گال ادھر لاؤ!" اس نے حکم دیا۔

"ک... کیوں؟" میں نے ڈر کر کہا۔

"نوکری نہیں کرنی؟"

"کرنی ہے۔"

"تو پھر لاؤ گال ادھر! تمھارے گال بڑے پھولے پھولے اور نرم نرم ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرے ناخنوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں اس کے خوفناک ارادے بھانپ کر پیچھے ہٹتا، وہ بڑھی اور میرے گال پر چٹکا مارا۔

"ہائے!" میں بلبلا اٹھا۔

"بس اب تم خود کو نوکر سمجھو۔" اس نے مجھے خوشخبری سنائی۔ "چلو میں تمھیں بھیا کے پاس لے چلتی ہوں۔"

"چلیں۔" میں اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ "راؤ بہادر صاحب آپ کے بھائی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور وہ میری بات کبھی نہیں ٹالتے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر حویلی کے اندر لے گئی۔ میرے دوسرے ہاتھ میں اب تک ٹین کا بکس تھا۔ حویلی کی ایک ایک شے سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا مگر میں ایک بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہاں صفائی نہیں تھی۔ بہت سی چیزوں پر گرد جمی نظر آ رہی تھی اور فرش بھی صاف نہیں تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ایک بڑے سے ہال نما کمرے سے گزری۔ میں نے اس کمرے میں ایک بہت بڑی میز دیکھی جس کی اطراف متعدد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس ہال نما کمرے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں پہنچ گئے۔ حویلی خاصی بڑی تھی۔ اس راہداری کی دائیں جانب بڑا سا صحن نظر آ رہا تھا اور صحن کی دوسری جانب بھی ویسی ہی راہداری تھی۔ دونوں ہی راہداریوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جو بند تھے۔

راہداری میں کچھ دور چل کر ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے اس کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ اس ادھیڑ عمر شخص پر پڑی جسے ایک سفید ریش بوڑھا کوٹ پہنا رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص اپنے لباس سے بالکل انگریز دکھائی دے رہا تھا اور اس کا سرخ و سفید رنگ بھی انگریزوں جیسا ہی تھا۔

"ارے تم یہ کسے پکڑ لائیں کملا!" ادھیڑ عمر شخص نے کوٹ کی آستین میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے لڑکی کو مخاطب کیا اور اس طرح پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ اس "ظالم" لڑکی کا نام کملا تھا۔

"آپ کہتے تھے بھیا کہ میں نوکروں کو بھگا دیتی ہوں، دیکھیے اس بار میں خود ایک نوکر لے آئی ہوں۔ آپ اسے فوراً رکھ لیجیے۔" کملا نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے مجھے آگے کی طرف دھکا دیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ سفید ریش بوڑھا مجھے ایسی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے مجھ پر رحم آ رہا ہو۔

"ابھی معلوم تو کر لو کہ یہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے۔" ادھیڑ عمر شخص نے کہا جو یقیناً راؤ بہادر کشوری لال ہی تھا کیونکہ کملا نے اسے بھیا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ بتا ہی چکی تھی کہ راؤ بہادر اس کا بھائی ہے۔

"میں اس سے سب کچھ پوچھ چکی ہوں۔" کملا جلدی سے بولی۔ "بیچارہ اپنی سوتیلی ماں کا ستایا ہوا ہے۔"

کملا کی بات سن کر راؤ بہادر کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "اور اب یہ یہاں تمھارے رحم و کرم پر ہو گا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ کم از کم دو تین مہینے تو یہاں گزار ہی لے۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ بغیر نوکروں کے کوٹھی کا کیا حال ہو گیا ہے۔ ایک بیچارہ رامو بابا کہاں تک صفائی کا خیال رکھے۔" راؤ بہادر نے سفید ریش بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رامو بابا تمھارے اور میرے کام کر دیتا ہے تو بہت ہے۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں بھیا! میں اسے رسی تڑوا کر نہ بھاگنے دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ٹھوکا دیا اور بولی۔ "کیوں بانگڑو، تو نہیں!"

"بانگڑو!" راؤ بہادر حیرت سے بولا۔ "عجیب نام ہے۔ کملا! تم اس کا اور کوئی نام رکھ دو۔"

"اس نے اپنا نام تو کچھ اور بتایا تھا بھیا! مگر یہ صورت سے بانگڑو لگتا ہے، اس لیے میں نے ہی اس کا یہ نام رکھا ہے۔" کملا نے "کارنامہ" بیان کیا۔

راؤ بہادر نے طویل سانس لیا اور پھر بولا۔ "اچھا، میں چلتا ہوں۔" پھر وہ بوڑھے رامو بابا سے مخاطب ہوا۔ "ارے میں نے کہہ دیا تم نے کہ گیرج سے گاڑی نکال لے؟"

"ابھی کہاں کہا ہے چھوٹے بابو! ابھی کوٹ پہنتے ہوئے آپ نے یہ حکم دیا تھا۔" رامو بابا بولا۔

"ارے ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" راؤ بہادر نے کہا۔ "میں نہیں رہا تھا۔ ہاں سنو! اسے بھی ساتھ لیتے جاؤ اور سرونٹ کوارٹر میں کوئی جگہ دے دو۔"

رامو بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ جب میں رامو بابا کے ساتھ کملا کے قریب سے گزرا تو بازو میں اس نے اتنی زور سے نوچا کہ میرے منہ سے ضبط کے باوجود سسکی سی نکل گئی۔

"کملا!" معاً راؤ بہادر کی آواز گونجی۔ "تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ گی!"

"کیا ہوا بھیا! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" کملا معصومیت سے بولی۔

غالباً راؤ بہادر نے اسے چٹکی بھرتے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی حرکتوں سے بخوبی واقف تھا۔

رامو بابا کے ہمراہ حویلی کے پچھلے حصے کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ تیواڑی جی نے اتنے یقین کے ساتھ کیوں کہا تھا کہ نوکری مل جائے گی۔ انھیں یقیناً علم ہو گا کہ راؤ بہادر کے یہاں نوکر نہیں ٹکتے۔ ممکن ہے، انھیں اس کا سبب بھی معلوم رہا ہو مگر صرف اس لیے نہ بتایا ہو کہ کہیں میں جی نہ چھوڑ بیٹھوں۔

چلتے چلتے معاً رامو بابا نے مجھے مخاطب کیا۔ "بی بی دل کی بری نہیں ہیں بس ذرا۔۔۔"

"بی بی کون؟" میں نے پوچھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ راؤ بہادر کی بیوی کا ذکر کر رہا ہے۔

"کملا دیوی، میں انھیں بچپن ہی سے بی بی کہتا ہوں۔" رامو بابا نے جواب دیا۔

رامو بابا یقیناً کملا ہی کے بچپن کا ذکر کر رہا ہو گا، اپنے بچپن کا نہیں اس لیے میں نے اس سے وضاحت نہیں چاہی۔

"بی بی بچپن ہی سے بہت چنچل ہیں۔" رامو بابا پھر بولا۔ "ہر وقت ان کے ہاتھوں میں کھجلی اٹھتی رہتی ہے لیکن دل بڑا اچھا پایا ہے انھوں نے!"

رامو بابا راستے بھر اپنی بی بی کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں اس کی نوچ کھسوٹ سے دل برداشتہ نہ ہوں اور محنت سے کام کرتا رہوں کہ میرے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

حویلی کے عقب میں سرونٹ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ بوڑھے نے ایک بڑا سا گچھا نکال کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں اس کے ساتھ اندر گیا۔ ایک کمرہ تھا، چھوٹا سا صحن جس کی ایک جانب غسل خانہ، بیت الخلاء اور باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ کمرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ بڈھا مجھے کچھ دیر بعد آنے کے لیے کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے اس دوران میں اس کوارٹر کا اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ صفائی کرنے کے بعد اسے رہائش کے قابل بنایا جا سکتا تھا۔ وہیں صحن میں مجھے جھاڑو، بالٹی، لوٹا اور ایک لوہے کی پرات بھی پڑی ہوئی نظر آ گئی تھی۔

مجھے اب بہرحال وہاں رہنا ہی تھا اس لیے میں نے جھاڑو اٹھائی اور صفائی میں جٹ گیا۔ بوڑھے کی واپسی تک میں کمرے کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہاں بیٹھا جا سکے لیکن ابھی میں نے صحن کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ صفائی کرنے کے بعد میں اپنے بکس پر بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنے ساتھ بستر نہ لا کر میں نے حماقت کا ثبوت دیا تھا لیکن جب بوڑھا لوٹا تو مجھے اپنی حماقت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ اپنے ساتھ دو کمبل، گدا اور تکیہ لے کر آیا تھا۔

اس نے کمرے کو صاف دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ "تم محنتی لگتے ہو۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"رام بھروسے۔" میں نے جواب دیا۔

بوڑھے نے بستر زمین پر بچھا دیا تھا اور اب وہ میرے ساتھ بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"تم کچھ دیر آرام کر لو۔" بوڑھے نے کہا۔ "پھر میں تمھیں اپنے ساتھ لے جا کر ساری حویلی گھما دوں گا اور تمھارا کام بھی تمھیں سمجھا دوں گا۔"

"بابا! کیا تمھارے علاوہ یہاں اور کوئی نوکر نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو اور ہیں۔" بوڑھے نے بتایا۔ "مگر ایک ڈرائیور ہے، نارائن اور دوسرا ہوشیار باورچی ہے جانکی۔"

پھر بوڑھے رامو سے مجھے راؤ بہادر کشوری لال کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں کیونکہ وہ راؤ بہادر کے باپ کے وقت سے وہیں ملازم تھا۔

راؤ بہادر کی بیوی دس سال قبل مر چکی تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ راؤ بہادر کا ایک لڑکا بھی تھا لیکن وہ بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لڑکے کے سوا راؤ بہادر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ راؤ بہادر کے ماں باپ بھی مر چکے تھے۔ بس ایک چھوٹی بہن کملا تھی جس کی ہر جائز اور ناجائز ضد راؤ بہادر پوری کرتا تھا۔ کملا ہی کی وجہ سے وہاں نوکر زیادہ نہیں ٹکتے تھے مگر پریشانی کے باوجود راؤ بہادر اس سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ جو تین ملازم اس حویلی میں رہ گئے تھے، وہ ایک طرح سے خاندانی ملازموں کی حیثیت رکھتے تھے اور تینوں ہی بوڑھے تھے۔ ان تینوں ہی نے کملا کو گودوں میں کھلایا تھا اس لیے کملا ان پر مشق ستم نہیں کرتی تھی پھر بھی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتی تھی۔

راؤ بہادر کا خطاب صرف انگریز نواز ہندوؤں کو دیا جاتا تھا اس لیے مجھے حیرت تھی کہ وہ کسی ایسی خفیہ تنظیم کی پشت پناہی کیسے کر سکتا ہے جو حکومت کے خلاف ہو۔

اب تک میں صرف یہی جان سکا تھا کہ راؤ بہادر کی نوجوان اور حسین بہن کملا کا کوئی نہ کوئی تعلق سیٹھ وشوا ناتھ یا اس کی بیٹی سروج سے ضرور ہے ورنہ وہ سیٹھ کی کوٹھی میں نہ جاتی۔

بوڑھے رامو نے مجھے اسی دن ساری حویلی کی سیر کرا دی اور میرے سپرد جو کام کیے، اچھی طرح سمجھا دیے۔ میرے سپرد جو کام تھے، ان میں ساری حویلی کی صفائی بھی تھی۔ راؤ بہادر اور کملا کی خوابگاہوں کی صفائی کا کام اس نے اپنے ہی ذمے رکھا تھا۔ بوڑھے رامو نے حویلی میں موجود دوسرے بوڑھے، یعنی جانکی سے بھی مجھے ملوا دیا تھا اور نارائن سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔

اسی دن شام سے میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس دوران میں کئی بار مجھے کملا کے ظلم کا شکار ہونا پڑا تھا۔ جب میں ہال کمرے کی صفائی کر رہا تھا تو پھر کملا وہاں آ دھمکی اور اسے دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔

"یہاں صفائی کر کے برابر والا کمرہ بھی ابھی صاف کر دینا۔" کملا نے حکم دیا۔ "آج میری ایک سہیلی آنے والی ہے۔" یہ کہتی ہوئی وہ میرے قریب آنے لگی۔

مجھے علم تھا کہ برابر والا کمرہ نشست گاہ ہے۔ رامو بابا مجھے وہ کمرہ دکھا چکا تھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اسی دوران میں کملا میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس وقت جھکا ہوا ایک کرسی صاف کر رہا تھا۔ اسے قریب محسوس کر کے میں کچھ اور جھک گیا تاکہ میرے رخسار اس کی دسترس سے دور رہیں اور اس

کے ناخنوں میں کھجلی نہ اٹھے۔

اس نے شاید یہ بات محسوس کر لی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس میں "نچاپن" کا عیب نہ ہوتا تو وہ مجھے کتنی خوبصورت معلوم ہوتی۔

معاً اس نے جھک کر میرا گال سہلایا اور سسکاری بھر کے بولی "ہائے بانگڑو! تمھارے گال کتنے چکنے ہیں۔ بس یہ جی چاہتا ہے کہ ان میں چٹکیاں بھرتی ہی رہوں۔"

اسی وقت میں جھکائی دے کر اس کی دسترس سے نکل گیا۔

"اچھا جاؤ! اس وقت معاف کیا۔" وہ اس طرح بولی جیسے مجھے جاگیر بخش دی ہو۔

ہال کمو گرد سے اتنا اٹا ہوا تھا کہ اس کی صفائی میں مجھے بہت دیر لگ گئی اس لیے برابر والے کمرے کی صفائی کے لیے مجھے کم وقت ملا۔ اس وقت تک میں پوری طرح صفائی نہیں کر پایا تھا جب میں نے اس کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔

اسی کے ساتھ میں نے ایک نسوانی ہنسی کی آواز بھی سنی تھی اور چونک اٹھا۔ یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں نہ کہیں ضرور سنی تھی مگر مجھے فوراً یاد نہ آسکا کہ یہ آواز اس سے پہلے کہاں سنی تھی۔ یہ آواز بہرحال کملا کی نہیں تھی۔

قدموں کی آواز جس قدر قریب آتی جا رہی تھی، اسی قدر میرے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے اس کمرے میں آنے سے پہلے اپنا کام ختم کر دوں۔ اسی دوران میں مجھے کملا کی آواز بھی سنائی دی تھی اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی سہیلی کو لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کملا اپنی سہیلی کو لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"ارے بانگڑو! تو ابھی تک یہاں صفائی نہیں کر پایا!" کملا نے مجھے مخاطب کیا۔

اسی وقت کملا کی سہیلی بول اٹھی "مبارک ہو کملا! شاید یہ کوئی نیا بھنسا ہے۔ اس سے پہلے میں نے اسے یہاں نہیں دیکھا۔"

"ہاں آج ہی آیا ہے یہ!" کملا نے بتایا۔

میں نے اس کی سہیلی پر نظر پڑتے ہی اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا تاکہ وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ نہ لے سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے مجھ پر کوئی شک ہو۔

"اچھا اب تم ایسا کرو بانگڑو! جانکی سے جا کر کہو کہ وہ چائے بنائے۔ جب وہ چائے بنا لے تو لے کر آجانا۔" یہ کہہ کر کملا اپنی سہیلی سے مخاطب ہوئی "آؤ بیٹھو سروج!"

ہاں وہ سروج ہی تھی، سیٹھ وشوا ناتھ کی بیٹی سروج! اسی کو دیکھ کر مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے کیونکہ اس کا وہاں ... لیے قطعی خلاف توقع تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر میرے ذہن میں یہ بھی آیا تھا کہ گزشتہ روز صبح کملا اس سے ملنے گئی ہو گی۔

کملا کا حکم سنتے ہی میں فوراً وہاں سے کھسک لیا تھا لیکن دل میں یہ خواہش ضرور پیدا ہوئی تھی کہ ان دونوں کے درمیان ... والی گفتگو سن سکوں۔ ان دونوں ہی کے باپ بہرحال مشتبہ ... میں تھے۔

میں جانکی سے چائے کے لیے کہہ کر الٹے پاؤں نشست ... دروازے تک پہنچ گیا۔ میں دروازے کی ایک طرف کھڑا ہوا ... سے آنے والی آوازیں سن رہا تھا۔

اندر سے سروج کی جانی پہچانی آواز سنائی دے رہی تھی "... وہاں رہنا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ وہ جگہ زیادہ ... نہیں ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" کملا کی آواز آئی "میں ان کا بندوبست کر سکتی ہوں مگر...!"

"تم کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئیں؟ کہو نا!" سروج کی ... دی۔

"بس ذرا بھیا سے ڈر لگتا ہے۔ تمھیں تو پتا ہی ہے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔" سروج نے بات کاٹ کر کہا "معلوم ہے، تم جو بات کہنا چاہتی ہو اور جس کی وجہ سے ... ہو لیکن ہم پہلے بھی تو ایک بار یہ تہ خانہ استعمال کر چکے ہیں۔"

سروج کی زبان سے کسی تہ خانے کا ذکر سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں یقیناً کوئی اہم بات کر رہی تھیں جو میری ... پوری طرح نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ میں ان کی پہلے ہونے والی باتیں نہ سن سکا تھا۔

"اگر ایسا ہی ہے کہ وہ وہاں غیر محفوظ ہیں تو پھر مجبوری ہے۔" چند لمحے بعد کملا کی آواز آئی "تم نے اس سلسلے میں چاچا جی سے بات کی ہے؟"

"ہاں بات کی تھی۔" سروج نے جواب دیا "پتا جی بھی کہہ رہے تھے۔ اس عمارت کے بارے میں ابھی کچھ دن ہوئے ایک شخص کو ... کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ کوئی سی آئی ڈی ... ہی ہو گا۔ اس پوچھ گچھ سے ایک روز پہلے ہی تو وہاں ..."

"پھر تو واقعی انھیں وہاں نہیں رہنا چاہیے۔" کملا کی آواز ... فکر مندی کا عنصر ہو رہا تھا "آج رات ہی انھیں یہاں پہنچا ..."

میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہیں کھڑا ہوا ان دونوں کی باتیں ... رہوں مگر اسی وقت میں نے قریب ہی کہیں قدموں کی چاپ ... چونک پڑا۔ اب میرا وہاں کھڑا رہنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں ...

... نشست گاہ میں موجود ان دونوں حسیناؤں کو کچھ پتا ... دروازے پر کھڑا ہوا ان کی باتیں سن رہا ہے۔

... کچھ دور ہی چلا ہوں گا کہ رامو بابا ادھر آتا دکھائی دیا۔ میں ... کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔

"ہاں بیٹے رام بھروسے؟" رامو بابا میرے قریب آکر بولا۔ "... بی بی جی کی مہمان آئی ہیں، ان کے لیے چائے لینے جا رہا ہوں۔"

... دیا۔

... رامو بابا مسکراتا ہوا بڑھ گیا۔

... میں جانکی چائے بنا چکا تھا۔ میں چائے کے کپ ٹرے ... نشست گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

... بھی میں بہت آہستہ قدموں سے نشست گاہ کے دروازے ... تاکہ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ دونوں باتیں کرتے ... نہ ہو جائیں۔ ایسا میں نے اس لیے کیا تھا کہ شاید اس ... کانوں میں کوئی کام کی بات پڑ جائے اور میری توقع رائیگاں ...

... اندر سے کملا کی آواز آ رہی تھی "بھیا زیادہ سے زیادہ گیارہ ...

... اپنے کمرے میں سونے چلے جاتے ہیں اس لیے ساڑھے گیارہ ... بالکل ٹھیک ہے۔ میں خود پھاٹک پر موجود رہوں گی لیکن ... ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، تم مطمئن رہو۔" سروج نے کہا "اب مجھے چلنا ...

... ارے چائے تو پیتی جاؤ! پتا نہیں وہ بانگڑو کہاں مر گیا!"

... سنتے ہی میں ہڑبڑا گیا اور جلدی سے قدم اٹھایا۔ چائے کے ... گرتے گرتے بچے مگر میں نے ٹرے سنبھال ہی لی۔

"... اتنی دیر میں آ کے مرا ہے!" کملا نے مجھے ڈانٹا۔

... اس وقت سروج کی نگاہ میرے چہرے کی طرف اٹھی اور میں نے ... ہوئے دیکھا۔ یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ مجھے ... کہ اس نے مجھے پہچان نہ لیا ہو۔ میں نے لرزتے کانپتے قدموں ... ہوئے چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور الٹے قدموں واپس ہونے ... دوران میں مجھے یوں محسوس ہوتا رہا تھا جیسے سروج کی ... ہیں میرے چہرے پر جمی رہی تھیں۔

"... اس بانگڑو کو اتنی غور سے کیوں دیکھ رہی تھیں تم؟" میں ... سے نکلتے ہوئے کملا کی آواز سنی۔

"... مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں ایسا لگا تھا جیسے میں نے ... کہیں دیکھا ہو مگر یاد نہیں آ رہا۔" سروج نے بتایا۔

"... ارے یہ تو آج ہی اپنے گاؤں سے بھاگ کر یہاں آیا ہے۔"

کملا نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا "تم نے کسی اور...." اس کے بعد کملا کی آواز اتنی مدھم ہو گئی کہ میں کچھ نہیں سن سکا کیونکہ میں کمرے سے نکل کر وہاں رکا نہیں تھا۔

میرا دل اس وقت اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ میں دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ سروج مجھے پہچان نہیں سکی تھی۔ اگر وہ مجھے پہچان جاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔

پھر میں جانکی کے پاس پہنچ گیا تھا جو باورچی خانے کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا چلم کے دم لگا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا "آ بھئی رام بھروسے! تو بھی ایک آدھ دم لگا لے۔"

"نہیں چاچا! میں چلم نہیں پیتا۔" میں نے جواب دیا اور اس کے برابر پڑے ہوئے دوسرے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ جلدی سے اپنے کوارٹر میں چلا جاؤں مگر ابھی مجھے چائے کی ٹرے اور کپ اٹھا کر بھی لانے تھے۔

میں کچھ دیر جانکی کے پاس بیٹھ کر دوبارہ نشست گاہ کی طرف چل دیا۔ جب وہاں پہنچا تو نشست گاہ خالی تھی۔ میں نے چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر وہاں سے باہر آ گیا۔ سروج جا چکی تھی اور غالباً کملا اسے حویلی کے پھاٹک تک چھوڑنے گئی تھی۔

میں چائے کی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر سیدھا اپنے کوارٹر کی طرف ہو لیا۔ ابھی میں اپنے کوارٹر کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ سامنے سے کملا کو آتے دیکھ کر چونک اٹھا۔ جدھر سے وہ آ رہی تھی، ادھر حویلی کا عقبی پھاٹک تھا۔ وہ پھاٹک بھی رامو بابا مجھے دکھا چکا تھا۔ میں چونکا اس لیے تھا کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ سروج کو حویلی کے عقبی پھاٹک کی طرف لے گئی ہو گی اور وہیں تک چھوڑنے گئی ہو گی۔

کملا پر نظر پڑتے ہی میں نے تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دیے تھے تاکہ جلدی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاؤں۔

کملا شاید میرا ارادہ بھانپ گئی تھی اس لیے وہ دور ہی سے چیخی۔

"اے بانگڑو!"

میں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ کچھ دیر بعد ہی میرے قریب آگئی۔

"تو نے اس سے پہلے کبھی میری سہیلی کو دیکھا تھا؟" کملا نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے جسم کے رونگٹے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ میں اتنا گڑبڑایا کہ میرے منہ سے سروج کا نام نکلتے نکلتے رہ گیا۔ میں بولا "سر... سہ... سہیلی... آپ کی سہیلی کو میں نے اس سے پہلے کبھی... کبھی نہیں دیکھا، کبھی نہیں۔"

"تو اس میں ماتنے گھبرانے کی کیا بات ہے میرے بانگڑو!" یہ کہتے ہی اس نے اپنا کام دکھا دیا۔

اس نے اتنی زور سے چٹکی لی تھی کہ یقیناً میرے بازو پر نیل پڑ گیا ہوگا۔ میں ہائے کر کے رہ گیا اور وہ ہنستی ہوئی چلی گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

پھر میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اندر سے کنڈی لگائی اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہی میں اپنے حواس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا اور میرا ذہن، سروج اور کملا کے درمیان ہونے والی گفتگو میں الجھ گیا۔

رات ساڑھے گیارہ بجے وہاں کون لوگ آنے والے تھے؟ وہ کہاں تھے اور کیوں غیر محفوظ تھے؟ وہ تہ خانہ کہاں تھا جس کا ذکر میں نے سنا تھا؟ کیا وہ تہ خانہ اسی حویلی میں تھا؟ میرے ذہن میں پے در پے سوالات ابھرتے رہے۔ ان تمام سوالوں کے جواب مجھے رات ہونے سے پہلے نہیں مل سکتے تھے۔ وہ بھی اس وقت جب میں رات کے وقت اپنے کوارٹر سے نکلنے کا خطرہ مول لیتا۔ اس کے بعد بھی ضروری نہیں تھا کہ مجھے اپنے تمام سوالوں کے جواب مل ہی جاتے۔

پھر کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد میں نے خطرہ مول لینے ہی کا فیصلہ کیا۔ اب مجھے بڑی بے چینی سے رات ساڑھے گیارہ بجے کا انتظار تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کب تک خیالوں ہی خیالوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر غرق تھا کہ جب دستک سنائی دی تو اچھل پڑا۔ کچھ دیر کوشش کے باوجود بھی نہ بول سکا۔ پھر جب ذرا حلق تر ہوا اور سوکھے میں نے زبان پھیری تو سہمی سہمی سی آواز میں پوچھا "کون"

"میں ہوں رامو!" جواب میں رامو بابا کی آواز "میں یہ لالٹین دینے آیا تھا۔"

"اچھا کھولتا ہوں دروازہ۔" میں یہ کہتا ہوا پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری اطراف تھی۔ ایک اجنبی جگہ، اکیلا گھر اور تاریکی! پتا نہیں وہاں ڈر کیوں نہیں لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ میری توجہ کو پیش آنے والے واقعے کی طرف تھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو کمرے میں روشنی آ رامو بابا بولا "تم اندھیرے میں کیوں پڑے ہوئے تھے! لالٹین کے لیے۔ وہ تو مجھے خود خیال آ گیا۔"

"بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی اس لیے پتا نہیں گھر اندھیرا چھا گیا۔" میں نے رامو بابا سے لالٹین لے

کھانے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ آؤ ساتھ ہی وہیں سامنے چٹائی بچھا کر کھانا کھائیں گے۔" رامو بابا نے تجویز

پہر کا کھانا بھی ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ میں نے لہرایا اتفاق کیا اس لالٹین کمرے میں رکھ کر ان کے ساتھ ہو قبل میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔

باورچی خانے تک پہنچا تو وہاں ایک کو بھی دیکھا۔ رامو بابا نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ تھا، راؤ بہادر کشوری لال کا ڈرائیور!

بہادر کا ڈرائیور نارائن بھی رامو بابا اور جانکی کی طرح بڑھاپے کے علاوہ اسے ایک اور مرض تھا۔ وہ بعد اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ کھانا کھانے کے بھی وہ مسلسل بولتا رہا۔ وہ ان بوڑھوں میں سے اپنی جوانی کے قصے سنانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ والا ان قصوں میں دلچسپی کا اظہار کرے نہ کرے، وہ لے جاتے ہیں۔

وقت ایک انگریز "میم" سے اپنے دھواں دھار

داستان ہولی پر سنا رہا تھا "اب کیا ہوا الم بھر دے کر میں میم صاحب پر عاشق ہو گیا۔"

میم پر یا صاحب پر بھی؟" میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔

"نہیں بس میم پر!" وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولا "صاحب کیسے عاشق ہو سکتا تھا، وہ تو بوڑھے تھے۔"

"صاحب اگر جوان ہوتے تو کیا تم ان پر عاشق ہو جاتے؟" لقمہ دیا۔

"تو خیر دوسری بات تھی۔ تم آ گئے تو سنو کہ ہوا کیا...!"

ہونا کیا تھا، ایک دن صاحب گھر پر نہیں تھے تو بس نکل گیا۔ یہی کہو گے نا تم!" اس بار میری بجائے جانکی بگوان جھوٹ نہ بلوائے تو سچ اس دفعہ یہ قصہ سن چکا ہوں۔" تو تمہیں کون سنا رہا ہے!" نارائن جلبلا کر بولا۔ دوسرے کو...!"

اس بیچارے کو بگاڑنا چاہتے ہو، بس رہنے دو!" بغیر نہ رہ سکا۔

بار رام بھروسے میں کبھی اکیلے میں تمہیں یہ پورا واقعہ سناؤں خوامخواہ بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔" نارائن تنگ میری جان چھوٹ گئی۔

کھانے ہی کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت کوٹھی میں نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

کملا اور راؤ بہادر کھانا کھا کر ساتھ ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ راؤ بہادر اور کملا دونوں ہی کار چلا لیتے تھے اور کبھی کبھار وہ نارائن کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے۔

کھانے سے فراغت پا کر میں نے اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔

میں دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

ایک بات میرے لیے الجھن کا سبب بنی ہوئی تھی کہ میں رات ساڑھے گیارہ بجے بیرونی پھاٹک کا رخ کروں یا عقبی پھاٹک کی طرف جاؤں۔ کملا نے سروج سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے پھاٹک پر موجود ہوگی۔ کس پھاٹک پر موجود ہوگی، اس کی وضاحت نہیں ہوئی تھی۔

کملا نے سروج کو عقبی پھاٹک سے رخصت کیا تھا اس لیے میرا خیال پہلا ادھر ہی گیا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ خطرناک وقت آنے سے پہلے ہی عقبی پھاٹک کے قریب کہیں چھپنے کی جگہ تلاش کر لوں۔ یہ سوچ کر میں اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت دور کہیں سے نو بجنے کے گھنٹے سنائی دیے۔

میں جب دروازہ کھول کر باہر آیا تو ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے پہلے تو ڈر لگا، پھر ہمت کر کے بڑھا۔ عقبی پھاٹک وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن وہاں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہاں مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں چھپا جا سکتا۔ پھاٹک کے اندر اور باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی مگر کچھ دیر بعد ہی میری آنکھیں اندھیرے میں تھوڑا بہت دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ میں مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ مجھے پھاٹک کی بیرونی سمت، بائیں طرف ایک پیڑ نظر آیا۔ اس پیڑ کے پیچھے چھپا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں وہ سلاخوں دار پھاٹک کھول کر وقت مقررہ سے پہلے ہی باہر پہنچ جاتا۔ ابھی صرف نو بجے تھے اور ساڑھے گیارہ بجنے میں پورا ڈھائی گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب گیارہ بجے کے گھنٹے سنائی دیں گے تو میں اپنے کوارٹر سے نکل کر باہر پہنچ جاؤں گا۔

میری اس منصوبہ بندی میں اگر کوئی خرابی تھی تو صرف یہ کہ عقبی پھاٹک کی بجائے وہ لوگ بیرونی پھاٹک سے آتے تو میں ٹاپتا رہ جاتا مگر ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں دوبارہ اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

گیارہ بجنے تک کئی بار میری فطری بزدلی مجھ پر غالب آئی مگر ہر بار میں نے اپنے دل کو سنبھال لیا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ پھر جیسے ہی گیارہ بجے کے گھنٹے بجے اور میں نے گنے، میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ وقتِ امتحان آ پہنچا تھا۔ میں ڈگمگاتے قدموں سے دروازہ

کھول کر عقبی پھاٹک کی طرف بڑھا۔ پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے کئی بار میری ٹانگیں اتنی زور سے کپکپائیں کہ مجھے زمین پر بیٹھنا پڑا، پھر جیسے تیسے میں پھاٹک تک پہنچ ہی گیا۔ اب پھاٹک کھولنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ کچھ تو بدحواسی، کچھ اندھیرا، مجھے پھاٹک کی کنڈی مل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ پھر جب میرے کانپتے ہاتھ کنڈی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے تو جیسے میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ پھاٹک میں تالا پڑا ہوا تھا۔

لو بیٹا اللہ دتا کر لو دکانداری! کوئی جیسے میرے اندر بولا۔ خیریت چاہتے ہو تو یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے کھسک لو ورنہ یوں بھی رات کا وقت ہے تارے نظر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

کچھ دیر میں گومگو کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ میدان چھوڑ کر بھاگ جانا، بہرحال میری شان کے خلاف تھا۔ مجھے وہ معرکہ سر کرنا ہی تھا۔ پھاٹک میں تالا لگا ہوا ہے تو کیا ہوا، میں پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کود سکتا ہوں۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ دل نے میری بات کچھ مانی کچھ نہ مانی مگر میں نے اس کی پروا کیے بغیر وہ کارنامہ یعنی پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کودنے کا کارنامہ انجام دینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

پھاٹک زیادہ بلند نہیں تھا۔ عام حالات میں اس پر چڑھنا کوئی ایسا دشوار کام نہ ہوتا لیکن وہ تو خاص بلکہ خاص الخاص حالات تھے اس لیے میرا کانپنا اور بار بار پھسل جانا کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ بہرحال تفصیلات بہت طویل ہیں کہ میں نے وہ کارنامہ کس طرح انجام دیا صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف کودتے ہوئے میرے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی۔ میں تو پھاٹک سے کودنے میں کامیاب ہو گیا مگر میری دھوتی یہ کارنامہ انجام دینے میں ناکام رہی۔ وہ کمبخت وہیں اوپر اٹکی رہ گئی۔ نتیجتاً مجھے اسے بھی نیچے لانا پڑا اور اس کوشش میں وہ کئی جگہ سے پھٹ گئی۔ میں نے اسے جلدی سے الٹا سیدھا کر کے باندھا اور لپک کر پیڑ کے پیچھے چھپ گیا۔

ابھی مجھے پیڑ کے پیچھے چھپے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ سناٹے میں دور کہیں قدموں کی چاپ ابھری۔ جو پھاٹک کی سمت ہی بڑھتی معلوم ہو رہی تھی تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے سوچا۔ پھاٹک کی طرف بڑھنے والی قدموں کی چاپ کملا ہی کی ہو سکتی تھی ورنہ اس وقت اور کون ادھر آتا۔ ہرچند کہ میں پھاٹک سے باہر تھا اور مجھے کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں تھا مگر اس کے باوجود کچھ اور بھی سکڑ سمٹ گیا۔ اب قدموں کی چاپ بہت قریب آ گئی تھی، پھر چند لمحے بعد ہی میں نے ایسی آوازیں سنیں کہ جیسے پھاٹک کا تالا کھولا جا رہا ہو۔ قدموں کی چاپ اس سے پہلے ہی رک گئی تھی۔

پھر جیسے ہی ہلکی سی آواز کے ساتھ پھاٹک کھلا، میں اچھل پڑا۔

میں نے جلدی سے اپنا سر پیچھے کر لیا۔ پھاٹک کے قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ روشنی اس لالٹین کی تھی جو کملا کے ہاتھ کو میری نظر کملا کے چہرے پر بھی پڑی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ آدھی رات کسی لڑکی کا گھر سے نکلنا اور بے خوف ہونا میرے لیے ہی تھا۔

اس کے بعد وقت جیسے اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ مجھے یوں کہ ساری رات ہی اسی طرح گزر جائے گی۔ سانس بھی رک لے رہا تھا کہ کہیں کملا نہ سن لے۔

خدا خدا کر کے وہ روح فرسا لمحے گزرے۔ اس دو مجھے کھانسی اٹھی مگر میں نے گلے ہی میں اس کا گلا گھونٹ پھاٹک کی مخالف سمت، دائیں جانب ذرا فاصلہ تھی۔ وہ بگھی اسی گلی سے نکل کر سڑک پر آئی تھی اور اعصاب تن گئے تھے۔ بگھی پھاٹک کی طرف بڑھ رہی کی بائیں جانب اور پیڑ کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس لیے کی نظر سے محفوظ رہا۔

پھاٹک کے قریب پہنچتے پہنچتے بگھی مڑ گئی۔ وہ تھی اب دوبارہ اس کا رخ اسی سمت ہو گیا تھا۔ میرے بہت قریب تھا۔ اس کا پائیدان مجھے صاف بگھی کے رکتے ہی کملا تیزی سے بڑھی اور میں اس کے بائیں ہاتھ میں تھی جس کی روشنی میرے کندھے میں تیزی سے بائیں جانب سرکا۔ کملا چند قدم اور بڑ روشنی کی زد میں آنے لگا۔ اب اس کے سوا کوئی چا بگھی کے پچھلے پائیدان پر چڑھ جاتا کیونکہ وہ بہرحال پھر میں نے بگھی کے پچھلے پائیدان پر چڑھنے پر اگر مجھے چند لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو روشنی میں آ جاتا کہ ڈھول پیٹنے میں کیا کسر رہ جاتی۔ میں اس سراپا ناز واقف تھا، وہ ڈھول پیٹنے میں بڑی ایکسپرٹ تھی جس رخساروں اور بازوؤں پر موجود تھیں۔ روشنی کی آڑی تر بس چند انگل دور تھیں۔

دفعتاً میری سماعت سے کملا کی آواز ٹکرائی: "ارے تم تم کیوں آ گئیں؟ اور وہ ... وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"میں نے ان دونوں کا بندوبست کر دیا ہے" کی آواز سنی۔ "میں وہیں سے آ رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" کملا کی آواز میں حیرت تھی۔

سروج یقیناً بگھی سے اتر آئی تھی اور کملا اس ہوئی تھی مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ باری باری

باشرت دیار پی سکتا۔

"میں ابھی ان دونوں کو جیت گڑھ کے ٹھکانے کی طرف روانہ کر کے آئی ہوں۔ گھر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ تمہیں بھی اس سے مطلع کرتی چلوں" سروج کہہ رہی تھی۔ "ویسے مجھے ادھر آنا ہی تھا تاکہ تمہیں خطرے سے آگاہ کر دوں۔"

"خطرہ؟ کیسا خطرہ؟" کملا تعجب سے بولی۔

"وہ خطرہ جسے تم نے اپنے گھر میں پناہ دے دی ہے۔ وہ جسے تم نکوم اور بھولا بھالا سمجھ رہی ہو، وہی تمہارے اور ہمارے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ میں نے اسی لیے ان دونوں کو یہاں لانے کی بجائے بیت گڑھ بھیج دیا" سروج نے معنی خیز لہجے میں بتایا۔

میرے کان کھڑے ہو گئے اور جسم پر موجود رونگٹوں نے بھی انگڑائیاں لینا شروع کر دیں تاکہ بوقتِ ضرورت وہ بھی کھڑے ہو سکیں۔

"کیا تم اس بانگڑو کی بات کر رہی ہو؟" کملا نے پوچھا۔ اس کی آواز میں ہنسی اور تمسخر کا عنصر شامل تھا جو ظاہر ہے میرے ہی لیے تھا۔

"ہاں اسی کی!" سروج زور دیتے ہوئے بولی۔ "وہ بانگڑو نہیں بلکہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر اللہ دتا ہے۔ سب سمجھیں!"

"سی آئی ڈی انسپکٹر اللہ دتا!" اس بار کملا کی شوخی ہوا ہو گئی تھی۔ "مگر تم نے یہ بات مجھے دن میں کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"اس لیے کہ اس وقت مجھے کوشش کے باوجود یاد نہ آ سکا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔" سروج نے بتایا۔ "یہاں سے جانے کے بعد بھی میرے دل میں خلش رہی اور پھر مجھے یاد آ ہی گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ اگر اس کا سر گھٹا ہوا نہ ہوتا، اس پر لمبی سی چٹیا نہ ہوتی اور جسم پر دھوتی کی بجائے کوئی اور لباس ہوتا تو وہ بالکل اللہ دتا ہی ہوتا۔ میں نے اس کے باوجود اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے پہلے اس کے دفتر ایک آدمی بھیجا۔ وہ وہاں نہیں تھا، پھر میں نے خود اس کے گھر کا رخ کیا کیونکہ میں اس کے گھر سے واقف ہوں۔ اس کے نوکر سے مجھے پتا چلا کہ وہ کسی دفتری کام سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد میرا شک یقین میں بدل گیا کہ وہ اللہ دتا ہی ہے جو تمہارا نیا نوکر بنا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر سروج خاموش ہو گئی۔

"مگر وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟" کملا کا لہجہ خود کلامی کا سا تھا۔

"یہ سوچنا تو خیر بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو اس بات پر غور کرو کہ اس سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑائی جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی مشکل نہ ہوگا۔ تم کسی بھی بہانے اسے نوکری سے نکال سکتی ہو۔" سروج نے مشورہ دیا۔

"مگر... مگر میں... میں اس بانگڑو کو سبق ضرور دوں گی،" تھرائی کملا کی آواز میں غصہ تھا۔ "اسے اتنی ہمت کس طرح ہوئی کہ بیلا گھس پڑا۔ چلو ابھی اسے دیکھتے ہیں۔"

"نہیں، اس وقت کوئی ہنگامہ نہ کرو!" سروج نے کہا۔ "صبح جو چاہو اس کا حشر کرنا۔ یوں بھی مجھے دیر ہو گئی ہے، پتا جی فکرمند ہوں گے۔ میں چلتی ہوں۔"

بیٹا اللہ دتا! اگر تم اس وقت بنفس نفیس یہاں موجود نہ ہوتے اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے تو تمہیں چٹنی بنا دیا جاتا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور خود کو داد دینے لگا۔

"تم جانتی ہو سروج! میں اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ خیر تم تو جاؤ مگر میں ابھی اس انسپکٹر کی دُم کو مزا چکھاتی ہوں۔" کملا کی غصیلی آواز سنائی دی۔

اس نے مجھے انسپکٹر کی بجائے 'انسپکٹر کی دُم' کہا تھا اس لیے میں نے دل ہی دل میں اسے گھوڑی کی دُم کہا اور حساب برابر کر لیا۔ اسی وقت روشنی کی آڑی ترچھی لکیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔

"کل ضرور آنا سروج! بیٹھ کر تفصیل سے بات کریں گے۔" کملا کی آواز آئی۔

"آؤں گی۔" سروج نے جواب دیا اور اسی کے ساتھ قدموں کی چاپ ابھری۔

میں نے محسوس کر لیا کہ سروج بگھی پر چڑھ چکی ہے۔

"چلو بابا! اب گھر چلو!" سروج کی آواز بلند ہوئی۔ وہ یقیناً بگھی کے کوچوان سے مخاطب ہوئی تھی۔

میں ابھی گومگو کے عالم میں تھا کہ بگھی چل پڑی۔ وہ صورتِ حال میرے لیے سخت آزمائشی تھی۔ اگر میں بگھی کے پائیدان سے کودتا تو یقیناً کملا کی نظر میں آ جاتا اور نہ کودتا تو بگھی کے پچھلے حصے پر خود کملا کی نظر پڑ جاتی۔ چند لمحوں بعد ہی بگھی کا پچھلا حصہ اس کے سامنے آ جاتا۔ مجھ میں بہرحال اتنی ہمت نہ تھی کہ بگھی سے کود کر ریس لگا جاتا۔ ایک تو اس طرح ہاتھ پیر ٹوٹنے کا خطرہ تھا۔ دوسرے اگر میں ایسا کرتا تو وہ دونوں آفتیں کب مجھے ریس لگانے دیتیں۔ اگر وہ "چور چور" کا نعرہ لگا کر ہی میرے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتیں تو میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس سوچ بچار اور ڈھک ڈھکی میں یہ ہوا کہ میں پائیدان پر ہی براجمان رہا۔

یا تو میری قسمت ساتھ دے رہی تھی یا کملا غصے میں زیادہ ہی آ گئی تھی جو بگھی کے بڑھتے ہی وہاں سے ٹل گئی تھی اور اس نے نہ وہاں کھڑا رہنا ضروری سمجھا نہ پھاٹک کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھتے ہوئے ایک بار بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔ جب بگھی پھاٹک کے سامنے سے گزر رہی تھی تو بگھی کی طرف کملا کی پشت تھی۔ اگر وہ اس وقت بگھی کی طرف مڑ کر دیکھ لیتی تو میری خیریت نہیں تھی۔ وہ اس وقت لالٹین تھامے تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر بگھی پھاٹک کے سامنے سے گزر ہی گئی اور ایک زبردست

خطرہ ٹل گیا۔ اب میں روشنی کی زد میں نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کملا پھاٹک بند کر رہی تھی پھر میں نے اسے زمین پر رکھی ہوئی لالٹین اٹھاتے دیکھا جو غالباً پھاٹک بند کرتے وقت اس نے زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے بعد بگھی اس گلی میں مڑ گئی جدھر سے آئی تھی۔ اب میں قطعی محفوظ ہو چکا تھا۔

مجھے اس دھوتی کرتے اور تھیلے کا ضرور افسوس تھا جو کملا کی کوٹھی ہی میں رہ گئے تھے کیونکہ بہرحال وہ سرکاری ملکیت تھے۔ اس کے علاوہ کوئی سامان نہیں تھا جو میں وہاں چھوڑ کر رفو چکر ہو رہا تھا۔

چلتے چلاتے ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ مجھے اپنی یادداشت پر بڑا فخر ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ میں دوسروں کی یادداشت کا بھی کبھی کبھی امتحان لیتا رہتا ہوں۔ آپ چاہے اسے میری بچکانہ حرکت کہیں یا کچھ اور مگر مجھ میں یہ عادت خبیثہ ہے ضرور!

آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر مجھے یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں خفیہ کے دفتر سے چلا تھا تو میرے ہاتھ میں ایک کپڑے کا تھیلا تھا جس میں ایک دھوتی کرتہ اور ضروری سامان تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے یہی لکھا تھا۔ پھر جب میں نے کملا کی سرخ حویلی پر پہنچنے کا حال لکھا تو اسی کپڑے کے تھیلے کو بڑی صفائی سے ٹین کے بکس میں تبدیل کر دیا اور اس کا دوبارہ ذکر کیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں چلوں تو تھیلا لے کر اور وہ ٹین کا بکس بن جائے؟ تو آپ کھا گئے نا غچہ! ویسے مجھے اس بات پر تعجب ضرور ہے کہ یہ لوگ جو اپنی "آپ بیتیاں" لکھتے ہیں برسہا برس بعد بھی انہیں لفظ بہ لفظ تمام مکالمے کس طرح یاد ہوتے ہیں! فلاں نے اس موقع پر ناک کھجاتے ہوئے یہ کہا۔ "فلانی" نے اپنے سینے پر دوپٹے کا آنچل درست کرتے ہوئے یہ رومانی ڈائیلاگ بولا۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں ایکسٹرا آرڈنری ذہین واقع ہوا ہوں اور میری یادداشت بھی غضب کی ہے اس لیے اگر میں اب سے تیس چالیس سال پہلے کہی جانے والی باتیں لفظ بہ لفظ لکھ رہا ہوں تو یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں۔

خیر چھوڑیں ان باتوں کو آپ شاید میری لاف زنی سے بور ہو گئے۔ آئیے میں آپ کو بہادر گنج لے چلوں جہاں ایک بگھی ٹمک ٹمک چلی جا رہی ہے اور جناب اللہ دتا عرف اے ڈی مہرا اس کے پائیدان پر تشریف فرما ہیں اور اضطراری طور پر کھانسی اٹھ رہی ہے۔

تو جناب ادھر میں کھانسا ادھر حالات نے مجھے بچا لیا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کھانسی کا گلا دبا دوں مگر ناکام رہا۔ کھل... کھل... کھل! کھانسی تھی کہ آئے ہی چلی جا رہی تھی جیسے اب آ کر پھر کبھی نہ آئے گی۔

معاً میں نے بگھی کا پچھلا پردہ اٹھتے دیکھا اور اس کے ساتھ ایک حیرت زدہ آواز سنی۔ وہ حیرت زدہ آواز سروج ہی کی تھی۔

"بابا! بگھی روکو!" وہ چیخی۔ پھر جیسے اس نے خود پر قا[بو] سخت لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "اگر تم نے بھاگنے کی ک[وشش کی] تو گولی مار دوں گی۔ میرے پاس پستول ہے۔"

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں "ارے تم تو خود پستول ہو، پ[ستول] کی کیا ضرورت ہے" مگر وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں یہ ر[سک] ضائع کرتا۔ یوں بھی پستول کا نام سن کر میری ہوا خراب ہو[گئی]۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ [...] کی سیاہ نال میری طرف تھی۔ بگھی اب رک گئی تھی۔

"بابا! بگھی سے اتر کر اس بہروپیے کو سنبھالو جو بگھی پر بیٹھا ہے۔" سروج نے کوچوان کو بلند آواز میں حکم دیا۔

کہنے کو تو وہ کوچوان بابا تھا مگر کمبخت کا ڈیل ڈول [...] اگر ایک بار مجھ جیسے جوان کا ہاتھ بھی پکڑ لے تو چھڑا نہ سکے۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے بے تکلفی کے ساتھ پیش آ[تا] غنیمت جانا، خاموشی سے پائیدان کی جان چھوڑ دوں۔ میں [...] اتر گیا۔

"اب اسے پکڑ کر بگھی میں لے آؤ بابا!" سروج نے دوسر[ا حکم دیا]۔

"ن... نہیں، مجھے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ [...] میں خود ہی بگھی پر چڑھ جاؤں گا۔" میں جلدی سے بولا اور بگھی کے لیے بڑھا۔

"آؤ... آؤ اللہ دتا! اچھا ہوا تم خود ہی پھنس گئے ور[نہ] تمہارا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑتا کیونکہ تم نے بڑے پر پ[رزے] نکالنے شروع کر دیے ہیں۔" میں جب بگھی پر سوار ہو رہا تھا تو یہ کہا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی پستول تھا۔

"مگر... مگر... میں نے... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے" عاجزی سے بولا۔

وہ میری بات کا جواب دیے بغیر سختی سے بولی۔ "[...] بیٹھ جاؤ!" مجھے حکم دے کر وہ کوچوان سے مخاطب ہوئی۔ "[...] قرول باغ کی بجائے جیت گڑھ چلنا ہے۔"

چند لمحے بعد ہی بگھی پھر چل دی۔ پائیدان کی نسبت نشست آرام دہ تھی، بس اگر کوئی خرابی تھی تو یہ کہ ایک [...] میری طرف پستول تانے بیٹھی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی میں نے ہمت کر کے سروج کو پھر مخا[طب کیا]۔

"آپ... آپ مجھے... مجھے کہاں لے جا رہی ہیں شریمتی [جی؟]" دانستہ "تم" کی بجائے اسے "آپ" سے مخاطب کر رہا تھا حالا[نکہ] میں وہ میرے لیے "تم" ہی رہی تھی اور میں اسے شریمتی جی [...] "پیاری سروج" کہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

"اللہ دتا! تم نے یقیناً کچھ ایسی باتیں جان لی ہیں جو [...]

[...]ں جانا چاہیے تھیں۔" اس کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔ "ان حالات [میں] یہ ضروری ہے کہ..." اس نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا [چھو]ڑ دیا اور ریوالور سیدھا کر لیا۔

"ارے باپ رے!" اس کا مطلب سمجھ کر میرے منہ سے بے ساختہ [نکل] گیا... "کیا آپ مجھ... مجھ غریب کو بلی چڑھا دیں گی شریمتی [جی]؟"

"[...] کیا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا کہ تمہارا کیا کیا جائے مگر فی الحال [اس] لیے تمہیں بیل کی طرح آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ اس [سے] دوسروں کی آزادی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" اس نے جواب [دیا]۔ "اور اب تم اپنی چونچ بند رکھو گے!"

میرے چہرے پر چونچ نام کی کوئی شے نہیں تھی اس لیے میں [نے] اس کے جملے کا مقصد یہی سمجھا کہ چونچ سے مراد یقیناً میرے خوبصورت [ہون]ٹ ہو سکتے ہیں۔ میں اس ناشائستہ تشبیہ پر احتجاج کر سکتا تھا۔ [مگر] یہ موقع احتجاج کا نہیں برداشت کا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی [پس]ند کیا۔

مجھے اب اپنے دونوں ماتحتوں کمال اور گپتا کی یاد ستا رہی تھی۔ [معل]وم ان دونوں میں سے اس رات کس کی ڈیوٹی لگی ہوئی ہو سان[...] سے کسی کو راڈ بہادر کی کوٹھی کے باہر موجود ہونا چاہیے تھا لیکن [...] بختوں میں اتنی عقل کہاں تھی کہ کوٹھی کے عقبی پھاٹک کا خیال [...] رکھتے۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ بس اگر اس وقت توانائی کی [...] تھی ورنہ تو آج "دی اینڈ" ہونے ہی والا تھا۔ سروج کے ارادے [خط]رناک نظر آ رہے تھے۔

میں اس سے پہلے کبھی جیت گڑھ نہیں گیا تھا، ہاں اس کے [بار]ے میں سنا ضرور تھا۔ وہاں ایک پہاڑی تھی جس پر کوئی تاریخی [عم]ارت بنی ہوئی تھی اور اس پہاڑی کی اطراف میں جنگل پھیلا ہوا تھا۔ [مع]لوم نہیں تھا کہ وہ یادگار عمارت کیوں اور کس نے تعمیر کرائی تھی۔ [اس] کے بارے میں صرف یہ اندازہ تھا کہ کسی ظالم نے اپنی جیت کی [نشا]نی کے طور پر اسے بنوایا ہو گا اسی لیے اس کا نام جیت گڑھ پڑا [ہو]گا۔

وہ سفر خاصا طویل ہو گا۔ راستے میں کئی بار میرے جی میں آئی [کہ س]روج پر جھپٹ پڑوں مگر ہر بار یہ سوچ کر رہ گیا، اگر پستول [چل] گیا تو کیا ہو گا؟ سروج نے مجھے چونچ بند رکھنے کا حکم دیا تھا اور [میں] نے اس حکم پر سختی سے عمل کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے غصہ [د]لائے اور وہ مایوسی اس انگلی کو حرکت میں لے آئے جو پستول کی لبلبی پر [تھی]۔ ویسے بھی عورت ذات کا کیا بھروسا! وہ بعد میں فیصلہ کرنے [کی] بجائے فوری فیصلہ بھی کر سکتی تھی جو بہرحال میں نہیں چاہتا تھا۔

کافی طویل سفر کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے بگھی اونچے نیچے ناہموار راستوں پر چل رہی ہو۔ بار بار دھچکے لگ رہے تھے۔ بگھی کی رفتار بھی اب پہلے سے کم ہو گئی تھی۔ اس کا سبب غالباً ناہموار راستہ ہی تھا۔ یہ دھچکے بازی بھی کافی دیر رہی پھر ایک بڑے دھچکے کے بعد بگھی رک گئی۔

بگھی رکتے ہی سروج اس سے اتر گئی۔ اس کے ساتھ اس نے مجھے اترنے کا حکم دیا۔ میں بگھی سے اترا تو خود کو جنگل میں پایا۔

"یہ آپ مجھے کہاں لے آئیں شریمتی جی؟" میرے منہ سے ڈری ڈری سی آواز نکلی حالانکہ مجھے علم تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے۔

سروج نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر اپنے وینٹی بیگ کو کھول کر ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی، پھر اسے جلا کر ایک طرف کیا۔ اس نے ٹارچ کو تین بار جلایا بجھایا۔ وہ پیڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جدھر سروج نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تھی۔ اس پگڈنڈی کے دونوں طرف پیڑ تھے۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اسی طرف سے روشنی کی ایک باریک سی لکیر ابھری اور غائب ہو گئی۔ ایسا تین بار ہوا اور پھر تاریکی چھا گئی۔ میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسی حیرت کے سبب میں اس بات پر بھی دھیان نہ دے سکا کہ اس دوران میں اگر میں چاہتا تو سروج پر جھپٹ پڑنے کی آرزو پوری کر سکتا تھا کیونکہ اس کی تمام توجہ پگڈنڈی پر مرکوز تھی۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اس پگڈنڈی پر متحرک روشنی نظر آئی جو ہماری ہی طرف بڑھ رہی تھی۔ سروج کی توجہ اب بھی اسی طرف تھی اور غیر محسوس طور پر اس کے پستول کی نال کا رخ بھی بدل گیا تھا۔ اب پستول کا رخ میری طرف نہیں تھا۔ میں جیسے ایک خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہو گیا۔ کس سوچ میں ہو اللہ دتا کے بچے! میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹ پلائی۔ ابے اگر تو نے یہ موقع، یہ سنہری موقع کھو دیا تو پھر ساری زندگی پچھتائے گا۔ ہمت کر اور بڑھ کر اس چڑیا کو دبوچ لے۔ اگر اس کے ساتھی آ گئے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔

سروج مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر اس پر جست لگانے کے لیے پوز بنایا جس طرح کہ ایسے موقعوں پر ہیرو پوز بناتا ہے، پھر میں اپنی جگہ سے اچھلنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے دبوچ لیا۔ اس نے میرے دونوں بازوؤں کو اس طرح جکڑ لیا تھا کہ میرے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی تھی۔

اسی وقت سروج نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھیں اتنی دیر میں تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں اس لیے اسے چونکتے ہوئے دیکھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔

"ارے کیا ہوا بابا!" وہ حیرت سے بولی اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ کمبخت بگھی کا کوچوان تھا جو نہ جانے کب بگھی سے اتر کر میرے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس خبیث نے عین موقع پر میری امیدوں کو خاک

میں ملا دیا تھا۔

"ملی بی جی! یہ تم پر جھپٹنے والا تھا اس لیے میں نے اسے بے بس کر لیا۔" کوچوان کی منحوس آواز مجھے اپنے پیچھے سنائی دی۔

"کیوں اللہ دتا یہ کیا بدمعاشی تھی!" سروج نے مجھے ڈانٹا۔

"نہیں... نہیں شریمتی جی! بابا صاحب کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے... مجھے... مجھے تو... میں نے تو انگڑائی لینے کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔" مجھے بر وقت ایک عمدہ بہانہ سوجھ گیا۔

"اچھا تو تم انگڑائی لے رہے تھے!" یہ کہہ کر وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسی، پھر کوچوان سے کہا۔ "اسے چھوڑ دو بابا!"

اس دوران میں پگڈنڈی پر چل کر آنے والے بہت قریب آچکے تھے۔ وہ دو تھے۔

سروج کے کہنے پر کوچوان نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ کمبخت نے اتنی زور سے پکڑا تھا کہ میرے دونوں بازو دُکھ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے دونوں بازوؤں کو حرکت دے کر اُن کی دُکھن دُور کروں مگر میں نے اپنی اس خواہش کو سختی سے کچل دیا ورنہ وہ بوڑھا خبیث مجھے کچل ڈالتا۔

پگڈنڈی سے آنے والے اب سروج کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ان دونوں نے ٹارچیں جلا رکھی تھیں۔ ان دونوں میں سے ایک قریب پہنچتے ہی حیرت سے بولا۔ "ارے تم سروج! تم کیوں چلی آئیں؟" اسی وقت اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ "اور یہ کون ہے؟" یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔

"یہ سی آئی ڈی انسپکٹر اللہ دتا ہے۔" سروج نے جواب دیا۔

"انسپکٹر اللہ دتا!" وہ شخص حیرت سے بولا۔ "مگر... مگر اسے تو میں نے دیکھا ہے۔ یہ وہ تو معلوم نہیں ہوتا۔"

"اس نے غالباً اپنی چاند پر استرا پھروا کر چٹیا رکھ لی ہے یا... یا شاید وگ پہنے ہوئے ہے۔" سروج نے بتایا۔

"یہ تو ابھی پتا چل جاتا ہے۔" دوسرا آنے والا بولا اور میری طرف بڑھا۔

اس شخص نے چوٹی پکڑ کر کھینچی اور وگ اس کے ہاتھ میں آگئی۔ میرے گھونگریالے بال جھوم کر باہر آگئے۔ اسی وقت میرے چہرے پر دوبارہ ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی اور میں نے آنکھیں مینچ لیں۔

"بہت خوب!" میری سماعت سے پہلے شخص کی آواز ٹکرائی۔ "یہ وہی بیوقوف اللہ دتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر... مگر اسے یہاں کیوں لے آئیں؟ اور... اور یہ تمہیں اس وقت کہاں مل گیا؟"

"کملا کی حویلی میں!" سروج نے جواب دیا، پھر مختصراً اسے ان حالات سے آگاہ کر دیا جو اس کے علم میں تھے اور جن سے وہ گزر رہی تھی۔

"پھر تو معاملہ خطرناک ہے۔" دوسرے شخص نے ... ختم ہوتے ہی کہا۔ "کملا کا سی آئی ڈی والوں کی نظر میں آجانا عجیب سی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے ہمیں جو کچھ ... انھیں کیا کیا معلوم ہو چکا ہے۔"

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ وہ لوگ راؤ کشوری لال کی بجائے کملا کو اہمیت دے رہے تھے۔ اس ... کملا اور سروج کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی یاد آئی ... کی گفتگو سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اس کی حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ قطعی بے خبر تھا۔ گیارہ بجے رات وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا اور اسی لیے انھوں نے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت رکھا ... بات بے معنی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ سروج کی ... سن کر چونک اٹھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب تھی۔

"سی آئی ڈی والے ہمارے بارے میں کیا کیا معلوم کر چکے ... جاننا اب ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں ہے۔" سروج کہہ رہی ... "اللہ دتا کی خاطر تواضع کر کے سب کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"خاطر تواضع" پر سروج نے کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا ... اس کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ یہ مطلب جان کر میری ... ہونے لگی۔ "پھر بیٹا اللہ دتا! اب آگیا بُرا وقت!" میں نے سوچا ... مگر بچنے کی کوئی راہ فی الحال نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کئی ... اور میں اکیلا!

"اچھا اب میں تو چلتی ہوں۔" سروج نے کہا۔ "تم لوگ ... لے جاؤ۔ میں کل کسی وقت دن میں آؤں گی۔ امید ہے کہ اس ... تمہیں بہت سی باتیں علم میں آچکی ہوں گی۔ اس کے بعد ہی آئندہ ... لیے کوئی پروگرام بنائیں گے۔ مجھے یوں بھی بہت دیر ہو گئی ... پتاجی فکرمند ہو رہے ہوں گے۔"

"ہاں تم جاؤ۔ اسے ہم سنبھال لیں گے۔" پہلے شخص ... پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "چل بھئی جاسوس کی اولاد! ... ہی انتظار ہے سہی!"

سروج کا اشارہ پا کر کوچوان بگھی پر چڑھ گیا اور پھر سروج بھی اس میں بیٹھ گئی۔

بگھی کے روانہ ہوتے ہی وہ دونوں مجھے لے کر پگڈنڈی کی ... چل دیے۔

"کیوں شنکر! اس کی آنکھوں پر رومال نہ باندھ دیں؟" ... شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"ارے یار! کیا دیکھے گا اسے اندھیرے میں! پھر ابھی ... پتا کہ اسے زندہ بھی چھوڑنا ہے یا نہیں! ویسے تم کہتے ہو تو ... لیتے ہیں۔" دوسرے شخص یعنی شنکر نے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر میری روح فنا ہو گئی۔ ظالم اس طرح میری موت کا ذکر کر رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں نے اب تک ان دونوں کے پاس کوئی خطرناک ہتھیار از قسم پستول، چاقو وغیرہ نہیں دیکھا تھا جس کے سبب میں کچھ ہمت پکڑنے لگا تھا۔ یہ تو مجھ پر ظاہر ہو ہی چکا تھا کہ وہ میری "خاطر تواضع" کرنے والے تھے۔ اس کے بعد میری زندگی کا فیصلہ ہوتا جو میرے خلاف بھی ہو سکتا تھا گویا میری زندگی سخت خطرے سے دوچار تھی۔ میں نے سوچا کہ ان حالات میں کوئی سچ مچ کا ہیرو ہوتا تو کیا کرتا؟ جواب فوراً ہی میرے ذہن میں آگیا۔ ہیرو ایسے موقعوں پر عموماً نہیں بلکہ اپنا دشمنوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور دشمنوں میں سے ایک آدھ کو جہنم رسید اور ایک آدھ کو قریب المرگ چھوڑ کر وہاں سے ٹہل لیتا ہے۔ تو کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟ میں نے پھر غور کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ میں اپنی کوشش میں ناکام ہو جاؤں گا لیکن میدانِ عمل میں کود پڑنے سے مجھے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ ہیرو کیونکہ بہادر ہوتا ہے اور یہ اس کی شان کے خلاف بات ہے جو وہ اپنے دشمنوں پر غفلت میں حملہ کرے اس لیے فیصلہ کیا پہلے انھیں للکار کر خبردار کر دوں گا۔

پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب میں میدانِ عمل میں کود پڑا۔ معاً میں نے بلند آواز میں انھیں مخاطب کیا۔ "اے میری جانِ عزیز کے دشمنو! خبردار، ہوشیار کہ میں تم پر حملہ کرنے والا ہوں۔ سنبھلو!" یہ کہتے ہی میں پلٹا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر پل پڑا۔

میری یہ حرکت ان دونوں ہی کے لیے قطعی خلافِ توقع رہی ہوگی اسی لیے وہ میرے للکارنے اور ہوشیار کرنے کے باوجود پہل نہ کر سکے۔

مجھے احساس تھا کہ میں تنہا ہوں اور وہ دو ہیں اس لیے میں نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو بیک وقت چلایا تھا۔ ایک کے پیٹ پر میری لات پڑی تھی اور دوسرے کے منہ پر گھونسا، مگر جیسا کہ ایسے موقع پر ہونا چاہیے تھا، وہ نہ ہوا یعنی ایک تو پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتا اور دوسرا چکرا کر زمین پر گر پڑتا۔ وہ کمبخت تو لات اور گھونسا کھا کر جوں کے توں کھڑے رہے تھے اور پھر دوسرے ہی لمحے انھوں نے مجھے اس طرح دبوچ لیا تھا جیسے باز کبوتر کو دبوچ لیتا ہے۔

پھر جو انھوں نے میری ٹھکائی لگائی تو مجھے اپنی امی یاد آنے لگیں کیونکہ نانی کا بہت عرصے قبل انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی قبر سے اٹھ کر مجھے بچانے نہیں آ سکتی تھیں اس لیے مجھے نانی یاد کرنے کی بجائے امی ہی یاد آئیں۔

"ہائے میری پیاری امی جان! تم کہاں ہو؟ دیکھو تمہارے اللہ دتا کو یہ ظالم کس بُری طرح کوٹ رہے ہیں!" میں نے فریاد کی اور نہ جانے میری فریاد میں کیا اثر تھا کہ وہ دونوں مجھے فٹ بال کی بجائے ایک دم انسان سمجھنے لگے اور ان کے ہاتھ رک گئے۔

ان میں سے ایک ہنس پڑا تھا، پھر دوسرا بھی اس کا ساتھ دینے لگا تھا۔ میں گھٹنے پیٹ میں دیے اور اپنے سر کو گھٹنوں کے اندر چھپائے گٹھری بنا زمین پر پڑا تھا اور مار پیٹ رک جانے کے باوجود اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔

"اٹھ کر کھڑا ہو جا!" معاً مجھے حکم ملا۔

میں نے فوراً تعمیلِ حکم کی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بالکل اسی طرح جیسے اگر مجھے ذرا بھی دیر ہو گئی تو وہ بُرا مان کر پھر مجھ سے فٹ بال کھیلنے لگیں گے۔

"جی پیارے بھائی!" میں نے کھڑے ہوتے ہی نہایت عاجزی سے کہا۔

"ابے تو جاسوس ہے یا مسخرا؟ تجھے کس نے اس محکمے میں بھرتی کر لیا؟" ان میں سے ایک ہنس کر بولا۔ "ابھی ہم سے پٹ چکا ہے اور ہمیں ہی پیارے بھائی بنا رہا ہے!"

"اب آپ کچھ بھی سمجھ لیں پیارے بھائی! مسخرا سمجھ لیں یا جاسوس! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میں تو ہرگز ہرگز جاسوس بننا نہیں چاہتا تھا، وہ تو میرے ہونے والے سسر نے مجھے جاسوس بنوا دیا!"

"ہونے والے سسر نے!" وہ میری بات میں دلچسپی لیتا ہوا بولا۔ "تو تیری شادی ہونے والی ہے؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "مگر پہلے بڑے بھیا کی شادی ہوگی۔" میں اس کی معلومات میں اضافہ کرنے لگا۔ "ابا نے یہی شرط لگا رکھی ہے!"

"لیکن اگر تو ہمارے ہاتھوں مارا گیا تو تیری بیوی شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جائے گی!"

"خدا نہ کرے، تمہارے منہ میں خا..." میں "خاک" کہتے کہتے رک گیا کہ کہیں وہ بُرا نہ مان جائے۔ "میرا مطلب ہے پیارے بھائی کہ آپ ایسا کیوں کرنے لگے؟" میں جلدی سے بولا۔ "آپ تو مجھے بہت شریف اور خاندانی آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ غریب کو قتل کر کے آپ کو بھلا کیا ملے گا؟"

"اچھا اب زیادہ باتیں نہ گھول! چپ چاپ ہمارے ساتھ چل۔ اور سن! اگر اب تو نے چلتے چلتے بہادر بننے کی کوشش کی تو پھر تیری خیر نہیں۔ ہم تجھے یہیں جنگل میں گلا دبا کر پھینک جائیں گے۔"

"ارے نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" میں فوراً بول اٹھا اور قدم بڑھا دیے۔

"ٹھہر جا!" مجھے پھر حکم ملا۔

میں رک گیا۔ انھوں نے میری آنکھوں پر رومال باندھ دیا اور ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر پتا نہیں کتنی دیر اور کتنی دور میں اس عالم میں چلتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار میں گرتے گرتے بچا۔ اگر میرا دشمن، میرے ہاتھ کو پکڑے نہ ہوتا تو یقیناً میں پہلے ہی ٹھوکر کھا کر "لم لیٹ" ہو جاتا۔ مجھے یوں معلوم ہوا تھا جیسے بلندی پر چڑھ رہا ہوں۔

میں نے معاً چلتے چلتے کچھ قدموں کی چاپ سنی جو قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر ایک نسوانی اور جانی پہچانی آواز سن کر میں چونک پڑا۔

"ارے شنکر! یہ... یہ تم کسے پکڑ لائے ہو؟" نسوانی آواز ابھری۔

"یہ وہی ہے جس سے اسپتال میں تمھارا پھینٹا ہوا تھا۔" مردانہ آواز میں جواب دیا گیا اور اسی کے ساتھ مجھ سے رکنے کے لیے کہہ کر میری آنکھوں سے رومال کھول دیا گیا۔

"ارے! یہ تو واقعی وہی ہے!" نسوانی آواز پھر سنائی دی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی تیز روشنی میری آنکھوں میں چبھی اور میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں ہنڈا تھا۔

"یہ... یہ... اسے تم... یہ تمھیں کہاں مل گیا؟" اس لڑکی کی آواز پھر ابھری۔ اس کے لہجے سے انتہائی حیرت کا اظہار ہو رہا تھا اسی لیے وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

"چلو اندر غار میں چلو! وہیں تفصیل سے باتیں ہوں گی۔" لڑکی کو جواب دیا گیا پھر مجھے چلنے کا حکم ملا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں کھولی دیں۔ اس وقت وہ لڑکی مڑ رہی تھی مگر اس کے چہرے کی جھلک میں نے دیکھ لی تھی۔ یہ وہی تھی، وہی خطرناک حسینہ جو اسپتال میں بھگوان داس کو قتل کرنے آئی تھی۔ اس کی آواز اسی لیے مجھے پہلی بار سن کر ہی جانی پہچانی معلوم ہوئی تھی۔ تو یہ ظالم یہاں چھپی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا۔

ہنڈے کی روشنی میں چند ہی قدم کے فاصلے پر ایک غار کا دہانہ نظر آ رہا تھا۔ وہ خطرناک حسینہ، اس میں داخل ہو گئی اور اسی کے ساتھ میں نے اپنے دونوں دشمنوں سمیت غار میں قدم رکھا۔

وہاں ایک شخص اور موجود تھا جسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ یہ وہ تھا جس نے بھگوان داس کو گولی ماری تھی۔

بُرے پھنسے بیٹے اللہ دتا! یہاں ایک عدد قاتل پہلے ہی سے موجود ہے۔ میں نے قاتل کی طرف سہمی سہمی نظر سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ حالانکہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتا مگر میں اس سے اس طرح خوفزدہ ہو گیا تھا جیسے کوئی سزائے موت پانے والا مجرم جلاد کو دیکھ کر سہم جاتا ہے۔

وہ شخص یا نوجوان اسی وقت اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا جب ہم غار میں داخل ہوئے تھے۔ غار میں کئی بستر لگے ہوئے تھے اور ایک بندوق رکھی ہوئی بھی نظر آ رہی تھی۔

پھر وہ چاروں مجھے گھیر کر بیٹھ گئے، بالکل اسی طرح جیسے بھائی بچپن میں امی کو اس وقت گھیر کر بیٹھ جاتے تھے جب وہ کوئی کہانی سنانے والی ہوتی تھیں۔

پہلے مجھے وہاں لے کر آنے والوں میں سے ایک نے [illegible] دُہرائیں جو اسے سرنج سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ بھگوان داس کے قاتل سے مخاطب ہوا۔ "اب اس کی زبان کھلوانا ہے تاکہ پتا چلے سی آئی ڈی والے کملا کے پیچھے کیسے لگ گئے!"

"ہاں بھئی جاسوس! کیا کہتا ہے! سیدھی طرح سب کچھ دے گا یا منطقی مالش کی ضرورت پیش آئے گی؟" بھگوان داس کا قاتل مجھ سے براہ راست مخاطب ہوا۔

"پیارے بھائی! بھلا مجھے کچھ بتانے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ کچھ پوچھ کر تو دیکھیں، پھر کہیں کہ بھئی اللہ دتا تم نے یہ بات نہیں بتائی۔" میں نے جلدی سے نظر جھکا کر جواب دیا کیونکہ وہ کمبخت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا۔

"ناممکن!" وہ بولا۔ "تم اتنے سیدھے نہیں ہو سکتے جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ اگر تم ایسے ہی ہوتے تو اس محکمے میں نہ ہوتے میری جان!" اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔ "مجھ سے اڑنے کی کوشش تمھیں مہنگی پڑے گی پیارے جاسوس!"

میں سخت الجھن میں پڑ گیا۔ وہ عجیب ٹیڑھا آدمی تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں سب کچھ بتا دینے پر آمادہ ہو گیا ہوں۔ معاً ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اس طرح میں اسے اپنی بات کا مکمل یقین دلا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اچھا ایسا کرو پیارے بھائی! تم مجھ سے جو چاہو قسم لے لو! پھر تمھیں یقین آ جائے گا کہ میں سچ بول رہا ہوں۔"

میری بات سن کر وہ ایک دم زور سے ہنس پڑا، پھر سخت لہجے میں بولا۔ "دیکھ بے! اگر تو یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے الّو بنانے میں کامیاب ہو جائے گا تو اسے دماغ سے نکال دے۔ اگر تو نے یہ بات اپنے دماغ سے نہ نکالی تو میں خود تیرے دماغ کے سارے کیڑے جھاڑ دوں گا، سمجھا!"

"بالکل سمجھ گیا پیارے بھائی!" میں نے اسے یقین دلایا۔ "خود سوچو کہ میں تم سے کس طرح جھوٹ بول سکتا ہوں جبکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تمھیں بھگوان داس کو قتل کرتے دیکھا ہے۔" میں نے ایک اور دلیل پیش کی۔

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"م... میرا مطلب یہ... یہ کہ پیارے بھائی!... تم... تم... قاتل ہو نا... تو پھر تمھارے سامنے میں... میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں!" میں نے گڑگڑا کر کہا۔

"یہ کیا بے تکی بات کہی تو نے!" وہ بدستور غرایا۔

"مطلب یہ... یہ ہے پیارے بھائی... کہ میں... میں... اس وقت تم سے... تم سے... سخت خوفزدہ ہوں۔" میں نے دل کی بات کہہ ہی دی۔ "میں اسی لیے تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"ویسے رنجیت! یہ بات ہے بہت خطرناک کہ یہ بھگوان داس [illegible] عینی شاہد ہے اور تمھیں بھگوان داس کے قاتل کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔" لڑکی درمیان میں بول اٹھی۔ "یہ ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"خطرناک تو یہ اس وقت ثابت ہو گا جب یہاں سے زندہ بچ کر جائے گا۔" بھگوان داس کا قاتل دانت پیستا ہوا بولا۔

"لیکن اسے قتل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس سے تمام باتیں معلوم کر لی جائیں۔" لڑکی نے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔

ان کی باتیں سن کر مجھ پر موت کی دہشت طاری ہونے لگی۔ میرا دل بیٹھنے لگا اور جسم پر کپکپی سی مسلط ہو گئی۔ جن لوگوں نے موت کو خود سے اتنے قریب دیکھا ہے، وہی میری کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اب میں اس بات پر پچھتا رہا تھا کہ خواہ مخواہ گڑے مردے اکھاڑ بیٹھا اور اس ظالم کو اس کے قاتل ہونے کا احساس دلا دیا۔ اب تو گویا میری موت یقینی ہی تھی، چاہے وہ میری سچی باتوں پر یقین کرتے یا نہ کرتے۔

"شنکر! تمھارے پاس چاقو تو ہو گا!" معاً بھگوان داس کے قاتل نے جسے لڑکی نے رنجیت کہہ کر مخاطب کیا تھا، اپنے اس ساتھی سے بولا جو مجھے وہاں لے کر آیا تھا۔

"ہاں ہے، یہ لو!" شنکر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو رنجیت کو تھما دیا۔

"ن... نہیں... نہیں!" میں گھگھیا کر چیخ پڑا اور ایک دم اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر شنکر نے شاید میرا ارادہ بھانپ لیا تھا۔ اس نے میرے دونوں کندھے پیچھے سے پکڑ لیے تھے کیونکہ وہ پیچھے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"چپ چاپ بیٹھا رہ!" شنکر غرایا۔ "رستے کی مار بھول گیا!"

کھٹکے والا چاقو بٹن دباتے ہی کھل گیا اور ایک بار پھر مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ میرے قتلے بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

"مجھے... مجھ... چھوڑ دو مجھے... تمھیں تمھارے بھگوان کی قسم... تمھیں تمھاری ماتاؤں کی قسم... تمھیں تمھارے باپوں کی قسم..." پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے انھیں کتنی قسمیں دیں مگر وہ بدبخت تو جیسے "قسم پروف" تھے کسی بھی قسم کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"اسے باندھ کیوں نہیں ساتھی سے اتنا مچل رہا ہے۔" شنکر نے تجویز پیش کی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" رنجیت نے اتفاق کیا۔

پھر انھوں نے میرے مچلنے اور تڑپنے کے باوجود رسی میں جکڑ دیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں دونوں باندھ دیے گئے تھے اور میں نے اب ہر حربہ ناکام ہوتے دیکھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

"ابے چوپ!" رنجیت نے مجھے ڈانٹا مگر میری آہ و بکا نہ رکی۔

اب میں ان کے درمیان بندھا پڑا تھر تھر کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اس دن کو بھی کوس رہا تھا جب میرے ہونے والے خسر نے مجھے اس ناہنجار محکمے میں بھرتی کرایا تھا۔ نہ ان کی نظر انتخاب اپنی لونڈیا کے لیے مجھ پر پڑتی، نہ میں نوکر ہوتا اور نہ یوں میرے قتل کا سامان ہوتا۔

"ہائے چاند خاں! مرادیانہ آخر جو ڑے ہیں!" میں نے روتے روتے سوچا۔

"ابے تو بھیل مچانے سے باز نہیں آئے گا سالے ڈرپوک!" رنجیت نے مجھے چاقو دکھایا۔

میری چیخیں اور سسکیاں جیسے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ رنجیت کھلا ہوا چاقو لیے میری طرف کھسک رہا تھا۔ اب آخری وقت آ پہنچا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور پھر دہشت سے کانپتے کانپتے میری اطراف جیسے اندھیرا پھیل گیا۔ میرا آخری احساس یہ تھا کہ رنجیت کا چاقو والا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھ رہا تھا، گویا وہ میرے گلے پر چاقو پھیرنے والا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد کافی دیر تو میں یہی سمجھتا رہا کہ عالم بالا میں ہوں اور جو آوازیں مجھے اپنی اطراف سنائی دے رہی ہیں وہ فرشتوں کی ہیں۔ فرشتوں ہی کے درمیان ایک نسوانی آواز سن کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مجھے سیدھا جنت میں بھیجا گیا ہے اور وہ نسوانی آواز کسی حور کی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ جو بے گناہ قتل کر دیا جاتا ہے، وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ چلو یہ اچھا ہوا۔ قتل ہونے میں تکلیف تو ہوئی مگر جنت مع حور کے مل گئی۔ رہے فرشتے تو جب میں حور سے بے تکلف ہونے کی کوشش کروں گا تو خود ہی یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا مگر جیسے ہی آنکھیں کھولیں کہ حور کا دیدار کروں، دھم سے دنیا میں آ گرا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ تو ابھی میں قتل نہیں ہوا۔ میں نے سوچا۔ اسی وقت میں نے

رنجیت کی منحوس آواز سنی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا شنکر! پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ بیہوشی کا ڈھونگ رچا رہا ہوگا لیکن یہ تو واقعی بیہوش ہو گیا۔" رنجیت کہہ رہا تھا۔

"ہاں معاملہ تو واقعی عجیب ہے۔ تم نے ہر طرح آزما کر دیکھ بھی لیا ہے کہ واقعی یہ بیہوش ہو گیا ہے۔" شنکر نے جواب دیا۔

"کیا خبر یہ واقعی دل کا اتنا ہی کمزور ہو۔" شنکر کے ساتھی نے رائے زنی کی۔

"اب کیا کیا جائے؟" رنجیت کے لہجے سے بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

"سوائے اس کے ہم اور کیا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کریں۔" شنکر کی آواز سنائی دی۔

بیٹا اللہ دتا! ہوش ہی میں نہ آنا ورنہ ہمیشہ کے لیے بیہوش کر دیے جاؤ گے۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ یہی بیہوشی ایک بار اور میرے لیے فائدہ مند ثابت ہو چکی تھی؟ اس وقت جب انوری بائی کے کوٹھے پر میں بیہوش ہو گیا تھا لیکن اس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت میری زندگی کسی زبردست خطرے سے دوچار نہیں تھی۔

"ایسا کیوں نہ کریں کہ اب سو جائیں۔ صبح اٹھ کر اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔ یوں بھی یہ بندھا پڑا ہے کہاں جائے گا!" لڑکی کی آواز سنائی دی اور میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا، گویا صبح تک جان بچنے کی امید بندھ گئی تھی۔

"نیند تو خیر مجھے بھی آ رہی ہے، کئی راتوں سے ٹھیک طرح سو نہیں پایا مگر اس وقت ہی معاملہ نمٹ جاتا تو اچھا تھا۔ رات کے وقت ہم اس کی لاش بھی آسانی سے ٹھکانے لگا سکتے تھے!" میں نے رنجیت کی خرزدہ کر دینے والی آواز سنی اور دل میں اسے برا بھلا کہا۔ کمبخت کس طرح میری لاش ٹھکانے لگانے کی بات کر رہا تھا۔

"دن میں بھی کیا فرق پڑے گا۔" لڑکی کی آواز ابھری۔ "ادھر دن کے وقت بھی کون آتا ہے؟"

"ہاں یہ تو ہے، میں تو بس احتیاطاً کہہ رہا تھا۔" رنجیت نے جواب دیا، پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "ہاں بھئی شنکر اور ہریال! تم کیا کہتے ہو؟"

"جو پنچوں کی رائے!" شنکر خوش مزاجی سے بولا۔

"اچھا تو بندیا! پھر ایسا کرو کہ ہنڈا بجھا کر لالٹین جلا دو۔" رنجیت نے لڑکی سے کہا۔

"مگر اسے تو میرے بستر سے اٹھاؤ! میرا خیال ہے اسے ادھر ڈال دو۔" بندیا بولی۔ شاید اس نے کسی طرف ہاتھ سے اشارہ بھی کیا ہوگا جو آنکھیں بند ہونے کے سبب میں نہ دیکھ سکا۔

پھر مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے بستر سے اٹھایا گیا اور سخت زمین پر پٹک دیا گیا۔ جب وہ لوگ میرا ڈولی ڈنڈا کر رہے تھے تو میں نے سانس تک روک لیا تھا کہ کہیں ان کمبختوں کو شبہ نہ ہو جائے کہ ہوش میں آ چکا ہوں۔ انھوں نے مجھے بڑی بے دردی سے زمین پر پھینکا تھا۔ بس میرا ہی دل جانتا ہے کہ میں نے کس طرح چیخ کو حلق ہی میں گھونٹ لیا تھا۔ میرے داہنے کولہے پر بڑی زبردست چوٹ لگی تھی۔

"باہر پہرے پر کون رہے گا؟" میں نے رنجیت کی آواز سنی۔

"اب کون آئے گا؟ ویسے تم کہو تو میں چلا جاتا ہوں۔" شنکر کے ساتھی ہریال کی آواز سنائی دی۔

"ہاں کسی نہ کسی کو باہر رہنا ضرور چاہیے۔" رنجیت نے کہا۔

"اچھا تو پھر میں چلا۔" ہریال بولا اور پھر میں نے اس کی دور ہوتی چاپ سنی۔

"رنجیت! میں ایک بات سوچ رہا ہوں، وہ یہ کہ رات کو ہوش تو آ ہی جائے گا۔ ہوش میں آنے کے بعد کیا یہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا؟" شنکر کی دل جلانے والی آواز ابھری۔

"بندھا تو پڑا ہے، فرار کہاں سے ہو جائے گا!" اس بار بندیا بولی۔

"نہیں بندیا! شنکر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں مگر تم غار کے کھلے ہوئے دہانے کو کیوں بھول رہی ہو؟ کیا یہ لڑھکتا ہوا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا؟" رنجیت نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" بندیا نے اتفاق کیا۔ "لیکن کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے کہ میں ایک کیل گاڑ کر اس کے جسم پر بندھی ہوئی رسّی کا ایک سرا اس سے باندھ دوں۔ کیا خیال ہے؟" شنکر نے تجویز پیش کی۔

"خیال برا نہیں۔" رنجیت کی آواز آئی۔

پھر ان کمبختوں نے فرار کی وہ واحد راہ بھی مسدود کر دی جو انہی کی گفتگو سے میرے ذہن میں آئی تھی۔ میرے ہاتھ پہلے ہی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور پیر بھی گرفت سے آزاد نہیں تھے۔ اب انھوں نے ایک اور نئی مصیبت میرے گلے ڈال دی تھی۔ انھوں نے میرے پیروں پر بندھی ہوئی رسّی کو نہ جانے کس طرح پھندا لگا کر کیل میں پھنسا دیا تھا۔ میں اس تمام کارروائی کے دوران میں بالکل ایسا بنا پڑا رہا تھا جیسے مجھ میں زندگی کے آثار ہی نہیں ہیں۔

غار میں اب ہنڈے کی تیز روشنی کی بجائے لالٹین کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی کیونکہ لالٹین کی لو بلند نہیں تھی۔ اب وہ

لوگ میری طرف سے مطمئن ہو کر اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے تھے۔ لڑکی کا بستر شنکر اور رنجیت کے درمیان تھا۔ میں پلکوں کے درمیان چھوٹی سی جھری بنا کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوگ سو گئے ہوں۔ انھوں نے اپنے جسموں پر چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ وہ تو سو گئے تھے مگر میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ بھلا میں کس طرح سو سکتا تھا۔ اس شخص کو نیند آ بھی کیسے سکتی ہے جس کا صبح ہوتے ہی [illegible] جانے والا ہو۔ میں نے سنا تھا کہ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے لیکن اس رات مجھے یہ بات بالکل گپ معلوم ہوئی۔ یہ کہاوت یقیناً کسی ایسے شخص نے گڑھی ہوگی جو نیند کا بہت کچا ہوگا۔

پھر اس طرح نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ پھر معاً غار میں ایک سرگوشی گونجی اور میں چونک اٹھا۔ کسی نے شنکر کو پکارا تھا لیکن شنکر بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سرگوشی رنجیت کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی لیکن اس بار بھی جواب نہیں ملا۔ چند لمحے بعد ہی رنجیت نے بندیا کو پکارا۔ اس کی آواز اب بھی مدھم تھی۔ پتا نہیں وہ شنکر اور بندیا کو کیوں پکار رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ بطور ہمدردی اس سے پوچھوں۔ کیا بات ہے پیارے بھائی! کیا کھٹمل کاٹ رہے ہیں؟ مگر مجھے فوراً ہی خیال آ گیا کہ میں بیہوش ہوں اس لیے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے مگر میری نگاہ بستروں ہی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے رنجیت کو بندیا کے بستر کی طرف لیٹے ہی لیٹے کھسکتے دیکھا۔ پھر رنجیت کا ایک ہاتھ اپنی چادر سے نکل کر بندیا کی چادر میں رینگ گیا۔ میں نے اس ہاتھ کو بندیا کے جسم پر حرکت کرتے دیکھا اور حیران ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ کمبخت وہاں کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

"بندیا! اے بندیا! کیا سو گئی؟" معاً رنجیت کی سرگوشی ابھری۔

"اوں... اوں..." بندیا کسمسائی۔

اسی وقت رنجیت "گڑوپ" سے اپنی چادر اتار کر اس کی چادر میں گھس گیا۔

"اوں ہوں، کیا ہے... کیوں ستا رہے ہو؟" بندیا کی آواز سنائی دی۔

"آہستہ بولو! شنکر جاگ جائے گا۔" رنجیت بولا اور مجھے یوں لگا جیسے اس نے بندیا کی طرف کروٹ لی ہو۔

"اوں ہوں... اپنا منہ ادھر رکھو بدبو آ رہی ہے۔" بندیا نے سرگوشی کی۔

پھر رنجیت نے اتنی آہستہ کچھ کہا کہ میں نہ سن پایا۔

"نہیں، آج نہیں!" بندیا نے کہا۔

"مگر تم نے وعدہ کیا تھا آج کا!"

"ہاں جاؤ نا!" بندیا کے لہجے میں بیزاری تھی۔ "آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"واقعی؟"

"واقعی!"

"اچھا تمھاری مرضی!" رنجیت کی آواز آئی اور پھر میں نے اسے دوبارہ اپنے بستر پر جاتے دیکھا۔

جب غار میں دوبارہ خاموشی چھا گئی تو میرے دل میں پھر ہول اٹھنے لگے۔ جب تک ان دونوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی رہی تھیں، مجھے ایک سکون سا تھا مگر اب میں پھر بے چین ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ موت کا فرشتہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ میں ہرگز مرنے کے حق میں نہیں تھا لیکن وہ ظالم مجھے مار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ مسلسل جاگنے کے سبب میری آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ میں اس دوران میں کئی بار اپنے ہاتھ پیروں پر بندھی ہوئی رسّی کی مضبوطی کا اندازہ کر چکا تھا۔ رسّی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔ میرے دونوں پیر تو جیسے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ معاً مجھے کھانسی اٹھی جسے میں نہ روک پایا اور آہستہ سے کھانسا تاکہ میرے دشمن بیدار نہ ہو جائیں۔

میرے ذہن میں غنودگی چھا گئی تھی یا قدم قدم بڑھتی ہوئی موت کے خوف سے مجھ پر نیم بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی، مجھے یاد نہیں۔ میں تو اس وقت چونکا تھا جب میرے پیر شکنجے سے آزاد ہو رہے تھے۔ میں نے ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں مگر مجھے کچھ نظر نہ آ سکا تھا۔ غار میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے قریب ہی کسی کو محسوس کیا، وہ جو میرے پیروں کو رسیوں کی گرفت سے آزاد کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔

پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب میرے پیر آزاد ہو گئے مگر اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں یا اپنے محسن کو مخاطب کر سکوں۔ اس دوران میں میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی کسی حد تک عادی ہو چکی تھیں مگر اس کے باوجود مجھے اپنے محسن کا وجود ایک ہیولے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اب وہ میری طرف جھک رہا تھا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے!" معاً مجھے اپنے کان کے بالکل قریب بھاری سرگوشی سنائی دی اور میں ایک دم کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح اٹھ بیٹھا۔

"تم... مگر... میرے ہاتھ..." میں مدھم آواز میں بولا۔

"بھاگ جاؤ! تمھیں پیروں سے بھاگنا ہے، ہاتھوں سے نہیں۔" اس بار سرگوشی میں تلخی اور جھنجھلاہٹ تھی جیسے اسے میرا بولنا ناگوار گزرا ہو۔

وہ ایسے لمحے نہیں تھے کہ میں اس پُراسرار سرگوشی پر مزید غور کرسکتا۔ بس مجھے یہ احساس ہو سکا تھا کہ وہ سرگوشی کسی عورت کی ہے لیکن وہ عورت بندیا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میں بندیا کی سرگوشیاں کچھ دیر پہلے ہی سن چکا تھا اور اس کی واضح اور بلند آواز بھی میں نے سنی تھی۔ پھر وہ عورت کون تھی اور اس غار میں عین اس وقت کہاں سے ٹپک پڑی تھی جب میں موت کے کنارے پہنچ چکا تھا؟ اس بارے میں میرا ذہن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ ویسے بھی مجھے آم کھانے سے کام تھا، گٹھلیاں گننے سے نہیں اس لیے میں نے وہاں سے نو دو گیارہ ہو جانے ہی میں عافیت جانی۔

میں نے جلدی سے ایک طرف قدم اٹھایا تو اس پُراسرار عورت نے میرا بازو پکڑ کر میرا رُخ دوسری طرف کر دیا اور اپنی مخصوص کھرکھراتی آواز میں سرگوشی کی "غار کا دہانہ ادھر ہے بانگڑو!"

بانگڑو! میں چونک اُٹھا۔ مجھے اس بیہودہ عرفیت سے تو صرف ایک ہی لڑکی نے پکارا تھا مگر یہ وہ بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے بھلا کیا غرض تھی جو مجھے موت کے مُنہ سے نکالنے وہاں پہنچ جاتی۔ چند لمحے میرا دماغ چکرایا تو ضرور مگر میں وہاں رکا نہیں۔ مجھے اب غار کا دہانہ نظر آگیا تھا۔

غار کا دہانہ نسبتاً بلندی کی طرف تھا۔ میں اُچک اُچک کر قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا مگر اس سے پہلے کہ میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا، میں نے اس ہیولے کو تیزی کے ساتھ اپنے قریب سے گزرتے محسوس کیا۔ پھر وہ ہیولا مجھ سے پہلے غار کے دہانے سے نکل گیا۔ یہ محسوس کر کے کہ اب میری مددگار و محسن، وہ پُراسرار عورت اس غار میں نہیں ہے، مجھ پر خوف غالب آنے لگا۔ میں اب جلد سے جلد اس غار سے نکل جانا چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے میں غار کے دہانے تک پہنچ گیا اور پھر اس سے باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ باہر بھی اندھیرا ہی تھا مگر اتنا نہیں جتنا غار میں تھا۔ غار کے اندر جلتی ہوئی لالٹین شاید اس پُراسرار عورت نے بجھا دی تھی۔

مجھے یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ اس وقت میں پہاڑی پر تھا۔ ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں زیادہ بلندی پر نہیں تھا۔ نیچے کچھ ہی فاصلے پر گھنا جنگل پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اندھیرے میں پیڑوں کے ہیولے ہولے اس طرح ہلتے دکھائی دے رہے تھے جیسے بھوت ہوں۔

میں وہاں جائزہ لینے کی خاطر صرف چند لمحے رکا اور پھر اللہ کا نام لے کر اترنا شروع کر دیا۔ ایک تو اندھیرا، دوسرے راہ ناہموار، تیسرے اجنبی جگہ، چوتھے خوف کا غلبہ! اترتے ہوئے بار بار میں خود کو سنبھال رہا تھا مگر کب تک! آخر لڑھکنی کھا ہی گیا۔ میرا پاؤں کسی گول اور چکنے پتھر پر پڑا تھا اور وہ پتھر اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا۔ اس کے [illegible] جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا تھا۔

ایسے مواقع پر عموماً دیکھا گیا ہے کہ کوئی ہیرو جب [illegible] سے لڑھکتا ہے تو اس کے ہاتھ آزاد ہوتے ہیں تاکہ [illegible] سے اُبھرے ہوئے اس تاریخی پتھر کو پکڑ کر لٹک جائے [illegible] پر ہمیشہ ہیرو کے ہاتھ میں آ جاتا ہے مگر میرے ساتھ صورت [illegible] مختلف تھی۔ ممکن ہے کہ میرے ہاتھ پشت سے نہ بندھے [illegible] بھی وہ یادگار تاریخی پتھر مل ہی جاتا مگر حیف صد حیف کہ [illegible] اس لیے میرا نیچے کی طرف لڑھکتے چلے جانا مجبوری [illegible] تھی۔ میری جگہ کوئی ہیرو ہوتا تو لڑھکنے اور جسم پر جگہ جگہ چوٹیں [illegible] کے باوجود ہرگز نہ چیختا مگر افسوس کہ میں انسان تھا اس [illegible] ہی ایک غلط چیخ میرے حلق سے خارج ہو ہی گئی۔

ابھی میں لڑھک کر پہاڑی کے دامن میں پہنچا ہی تھا [illegible] دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دینے لگی جو جنگل [illegible] سے میری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ [illegible] کر ریس لگا دوں مگر مجھے ایسا کرنے میں بہرحال وقت لگتا۔ [illegible] دھمک اب بہت قریب آ چکی تھی۔

"بیٹے اللہ دتا! پھر پھنسا۔" میں نے دل ہی دل میں [illegible] اٹھ کر جلدی سے قریبی پیڑ کی طرف بڑھا جو مجھ سے زیادہ [illegible] نہیں تھا۔ میں اس پیڑ کے تنے سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ چند [illegible] ہی کچھ فاصلے سے کوئی بھاگتا ہوا پہاڑی کی طرف گیا۔

مجھے علم تھا کہ میرے دشمنوں میں سے ایک باہر پہرا [illegible] تھا۔ پہاڑی کی طرف بھاگ کر جانے والا وہی ہو سکتا۔ وہ [illegible] چیخ سن کر ہی متوجہ ہوا ہوگا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ وہ [illegible] کہاں مجھ سے ٹکرا جاتا اور بے خبری میں مجھے "ٹیک" لیتا۔

مجھے احساس ہو چکا تھا کہ اب میرے دشمنوں کو بہت [illegible] پتا چل جائے گا کہ میں انھیں غوطہ دے کر چھوٹ لیا ہوں [illegible] وہاں سے کھسک ہی لینا بہتر ہے ورنہ اگر دوبارہ ان کے ہتھے [illegible] گیا تو وہ مجھے ذبح کرنے کے لیے صبح کا انتظار نہیں کریں گے [illegible] سوچتے ہی میں تیزی سے جنگل میں بڑھا۔

کچھ دور چل کر ہی مجھے ایک پگڈنڈی مل گئی۔ یہ شاید [illegible] پگڈنڈی تھی جس سے مجھے لے جایا گیا تھا۔ میں نے اس پر [illegible] لگانا شروع کر دی۔

وہ پگڈنڈی مجھے اس جنگل سے باہر لے آئی۔ یہ غالباً [illegible] جہاں سے سرِ شام نے مجھے بگھی سے اتار کر ان ظالموں کے سپرد [illegible] تھا۔ وہاں بگھی کس طرف سے آئی تھی، میں اندازہ نہ لگا سکا [illegible] بھاگتے بھاگتے میرا سانس پھول گیا تھا اس لیے میں نے چند لمحے رک کر [illegible] بے قابو سانسوں کو درست کرنے کی کوشش کی اور جب یہ چند لمحے [illegible] نظر آئے تو مجبوراً پھر اللہ کا نام لے کر ایک طرف دوڑنے لگا [illegible] مکانی نظر آئے [illegible] میں جب تک اس علاقے سے نکل نہ جاتا، غیر محفوظ ہی تھا۔ [illegible] میرے دشمن مجھے غار میں نہ پا کر یقیناً میری تلاش میں دوڑ پڑے [illegible] ہوں گے۔ یہ خیال میرے لیے تازیانے کا کام کر رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے مجھے ایک طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس طرف یقیناً کوئی آبادی تھی۔ میں نے اپنا رخ [illegible] اسی جانب کر لیا۔ اب کتوں کے بھونکنے کی آوازیں میری منزل کا [illegible] تعین کر رہی تھیں۔

پھر میں کافی دیر دوڑنے کے بعد اس آبادی میں پہنچ ہی گیا لیکن [illegible] وہاں پہنچ کر ایک نئی مصیبت نے مجھے گھیر لیا۔ کتے میرے پیچھے لگ [illegible] گئے۔ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھائے لے رہے تھے۔ ان میں [illegible] سے کچھ تو بے حد بے تکلفی پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ میں چیخ چیخ کر انھیں [illegible] دھتکار رہا تھا۔

[illegible] معاً میری سماعت سے ایک تیز سیٹی کی آواز ٹکرائی جو کہیں [illegible] قریب ہی سے سنائی دی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی "پکڑو، پکڑو، [illegible] جانے نہ پائے، بھاگو!" کا شور بلند ہوا۔ کتوں نے نئے شور سے کہیں شروع کر دیا [illegible] اور مجھ پر جھپٹنے لگے۔

ابھی میں کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ ماجرا کیا ہے، سامنے والی گلی سے [illegible] ایک درازقد شخص بھاگتا ہوا نکلا اور مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں چیختا ہوا دھڑام [illegible] سے زمین پر گر گیا اور وہ ناہنجار نو دو گیارہ ہو گیا۔ میں ابھی زمین سے [illegible] اٹھ نہیں پایا تھا کہ مجھ پر دو ٹارچوں کی روشنیاں پڑیں۔

"پکڑو، پکڑو! یہی ہے، یہی ہے!" کوئی چیخا۔

میں "ارے، ارے" ہی کہتا رہ گیا اور مجھے دبوچ لیا گیا۔

"آج پکڑا گیا بیٹا، بہت دن بعد!" کسی نے دانت پیس کر کہا۔

"ارے باندھ لو اسے، باندھ لو!" کسی نے مشورہ دیا۔

"ہاں ابھی باندھا، رسّی ہے میرے پاس!"

میرے ہاتھ پہلے ہی پشت پر بندھے ہوئے تھے، انھوں نے [illegible] میرے بازو وغیرہ بھی رسّی سے باندھ دیے۔

"ارے سنو تو، سنو تو سہی کمبختو!" میں نے فریاد کی۔ "ارے [illegible] وہ چور تو بھاگ گیا جس کے پیچھے تم بھاگ رہے تھے!"

"چُپ!" کسی نے میرے سر پر دھول جمائی۔

میں چیختا چلاتا رہا اور انھیں بے گناہی کا یقین دلاتا رہا [illegible] مگر وہ مجھے کشاں کشاں ایک طرف لے جانے لگے۔

"جب پکڑے جاتے ہیں بیٹا، تو سب ایسے ہی چیختے ہیں۔" کسی [illegible] نے کہا اور میرے پہلو میں کہنی جما دی۔

میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی مگر ان ظالموں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

مجھے پکڑ کر لے جانے والے دو وردی پوش تھے، بقیہ افراد سادہ کپڑوں میں تھے جو یقیناً اس آبادی کے باسی تھے۔ اب میں معاملے کی نوعیت سمجھ گیا تھا۔ کچھ ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے چور سمجھ رہے تھے اور انھوں نے مجھے پکڑ کر اپنی دانست میں بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ اب وہ مجھے تھانے لے جا رہے تھے۔

"اچھا چلو بیٹا، تھانے لے چلو! وہاں پہنچ کر بتاؤں گا کہ میں کون ہستی ہوں۔" میں نے سوچا اور چیخنا چلانا بند کر دیا کیونکہ ان کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

تھانے کے پھاٹک پر پہنچ کر لوگ تو رک گئے اور وہ دونوں سپاہی جو شاید گشت پر تھے، مجھے ساتھ لیے، خواہ مخواہ دھکے دیتے تھانے میں داخل ہو گئے حالانکہ چلنے میں میں کوئی اڑی نہیں کر رہا تھا۔

وہ دونوں مجھے لے کر سامنے نظر آنے والے برآمدے میں پہنچ گئے جہاں ایک اَدھیڑ عمر سپاہی ڈیسک کے سامنے بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ ڈیسک پر ایک موٹا سا میلا رجسٹر رکھا ہوا تھا جس کے قریب ہی قلمدان موجود تھا۔

"دیوان جی، اے دیوان جی!" مجھے لے کر آنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے اَدھیڑ عمر کو مخاطب کیا۔

"ہاں، ہاں!... کیا ہوا... کیا ہے؟" اونگھتے اَدھیڑ عمر چونک کر بولا۔

"یہ چور ہے۔ اسے ہم نے گشت کرتے ہوئے پکڑا ہے!"

"میں چور نہیں ہوں!" میں نے اس موقع پر مداخلت ضروری سمجھی۔

"چُپ بے!" دیوان جی نے مجھے ڈانٹ پلائی، پھر سپاہیوں سے کہا "اس کے پاس کچھ مال برآمد نہیں ہوا؟"

"ہم نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ یہ چوری کر سکتا!" ایک سپاہی نے جواب دیا۔

"اچھا میں روزنامچے میں لکھ لیتا ہوں۔ صبح تھانیدار صاحب کے سامنے اسے پیش کر دیا جائے گا۔ فی الحال اسے حوالات میں ڈال دو!"

"دیوان جی! آپ میری بات تو سنیں، میں چور...؟"

"تو چور تیرا باپ چور!" دیوان جی نے میری فریاد سنے بغیر دوبارہ مجھے ڈانٹ دیا۔

میرے لیے تو خیر کچھ بھی کہہ دیا جاتا، میں اتنا بُرا نہ مانتا مگر اس کھوسٹ نے میرے ابا کو بھی چور کہہ دیا تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور میں چیخ پڑا۔ "مجھے کچھ بھی کہہ لو لیکن میرے ابا کو کچھ کہا

تو اچھا نہیں ہوگا، ہاں!"

"ابے چوری اور سینہ زوری!" دیوان جی نے آنکھیں نکالیں "تُو شاید ابھی مجھے جانتا نہیں۔ وہ چار چوٹ کی مار لگاتا ہوں کہ اچھے اچھوں کو نانی یاد آجاتی ہے۔"

"اچھا بتاؤں گا دیوان جی، میں تمھیں بھی!" میں جل کر بولا۔

"اپنے دھمکی دیتا ہے مجھے! تیری تو میں...." یہ کہہ کر دیوان جی نے ایک موٹی سی گالی دی اور قریب رکھا ہوا چھوٹا سا ڈنڈا اٹھا کر میری کمر پر جڑ دیا۔

"ابے دیوان جی کا غصہ بہت خراب ہے۔ کیوں اپنی کمبختی کو آواز دے رہا ہے۔" ایک سپاہی نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"نام بتا اپنا!" دیوان جی موٹا رجسٹر کھول کر اپنی طرف کھسکاتے ہوئے دہاڑے۔

"اللہ دتا۔" میں نے ہونٹ بھینچ کر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا کیونکہ دیوان جی کا ڈنڈا اتنی زور سے میری کمر پہ پڑا تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"باپ کا نام؟"

"مہردین۔"

"کہاں رہتا ہے؟"

"چنبلی قبر پر۔"

"ابے واہ بیٹا۔ شہر تیرا اتنی دور ہے اور دھاوے یہاں تک ملتا ہے۔" دیوان جی نے کہا، پھر سپاہیوں کو مجھے وہاں سے لے جانے کا حکم دیا۔

مرتا کیا نہ کرتا، میں بوجھل قدموں سے سپاہیوں کے ساتھ چل دیا کیونکہ مجھ میں اب دیوان جی کے ڈنڈے کھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ تو کچھ سننے پر آمادہ نہیں تھے۔

میں نے ابھی تک حوالات کا صرف نام ہی نام سنا تھا، کبھی حوالات کی ہوا نہیں کھائی تھی۔ جس وقت میں تھانے پہنچا تھا، صبح کے چار بج رہے تھے۔ پھر اس وقت سے صبح نو بجے تک مجھے حوالات میں رہنا پڑا اور اس دوران میں دو بار الٹیاں آئیں۔ ایسی سڑاند اور بدبو تھی وہاں کہ لاکھ جی سنبھالا مگر ابکائی لیتے ہی بنی۔

جب مجھے حوالات میں بند کیا گیا تھا تو رسیوں کی گرفت سے نجات مل گئی تھی مگر جگہ جگہ سے جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کہیں جسم پر خراشیں تھیں، کہیں زخم اور کسی حصے پر سوجن آگئی تھی۔ ایک تو تکلیف دوسرے حوالات کی بدبو، پھر نیند آتی تو کیسے! جاگنے کے سبب دماغ الگ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

صبح نو بجے جب مجھے تھانیدار کے سامنے پیش کیا گیا تو بری حالت تھی۔ تھانیدار نے مجھ پر قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو وہ تُو ہے!"

"میں وہ نہیں ہوں جو مجھے سمجھا جا رہا ہے۔" میرے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"اچھا تو پھر لاٹ صاحب ہے تُو؟ ہیں؟" تھانیدار کسی بندر کی طرح بھپکی دی۔

"تھانیدار صاحب! دیکھیے پہلے جو میں کہوں اس کے بعد جو دل میں آئے کیجیے گا۔"

"تو میں تیرے باپ کا نوکر ہوں سالے کہ تو جو کہے ہیں!"

"آپ میرے نہیں سرکار کے نوکر ضرور ہیں اور سرکار اس کا جواب طلب کر سکتی...."

"ابے بس بس! یہ تو کہاں کی ہانکنے لگا!"

مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا، بغیر رکے اسپیڈ جاؤں گا تاکہ دل میں حسرت تو نہ رہے کہ میں بتا ہی نہ پا کون ہوں۔

"سنیں تھانیدار صاحب! میں بھی آپ ہی کی طرح محافظ ہوں، کوئی چور نہیں اور...."

"ابے... ابے... چور سے ایک دم ساہوکار بنا" تھانیدار نے پھر میری بات کاٹی۔

"میں خفیہ میں ہوں، سی آئی ڈی میں، سمجھے!" غص ہوئے میرے لہجے میں زور پیدا ہو گیا تھا۔ شاید یہی سبب نے اس بار میری بات نہیں کاٹی۔ اس کے چہرے پر اب ا آثار نظر آنے لگے تھے۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک "میں خفیہ میں انسپکٹر ہوں، سی آئی ڈی انسپکٹر اللہ دتہ۔"

"سی آئی ڈی انسپکٹر!" تھانیدار کے لہجے میں اب حیرت تھی۔ اردگرد کھڑے ہوئے سپاہی بھی اب مجھے حیرت لگے تھے۔

"ہاں انسپکٹر!" میں نے اور زور سے کہا۔ "آپ ٹیلی فون کر کے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ آپ ڈی آئی جی تیواڑی جی سے بات کریں۔"

تھانیدار کے چہرے سے اب ایسا معلوم ہو رہا تھا حیرت زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ خوفزدہ بھی ہو۔ اس اکڑفوں رخصت ہو گئی تھی۔

"تم... کیا تم سچ بول رہے ہو؟" تھانیدار رکتے

بولا۔ اب وہ "تُو" سے "تم" پر اتر آیا تھا اور اس کا مطلب اسے میری بات پر یقین آگیا ہے۔

یں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ تھانیدار کے کمرے میں فون موجود ی لیے میرے ذہن میں یہ فوری ترکیب آئی تھی۔ میں نے اسے رب کرنے کی خاطر کہا۔ "اگر میں خفیہ میں نہ ہوتا تو ڈی آئی جی صاحب یسے جانتا!"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" تھانیدار خود کلامی کے سے انداز میں بولا، ے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ "جو کچھ ہوا، اس کا سبب غلط فہمی م ڈی آئی جی صاحب سے تو اس کی شکایت نہیں کرو گے؟"

میرے پھیلنے اور انتقام لینے کی باری تھی اس لیے میں پھٹ

یں نے رات کو تمھارے سپاہیوں سے، تمھارے دیوان جی بھی سے کہا کہ میں چور نہیں ہوں اور یہ کہ وہ میری بات ٹھنڈے ے سن لیں مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی بلکہ مجھے زدوکوب ارے دیوان جی نے رات میری کمر پہ ڈنڈا مارا تھا۔"

"ہر سنگھ!" تھانیدار نے وہاں موجود سپاہیوں میں سے و پکارا۔

"یس سر!" سپاہی نے فوراً اٹینشن ہو کر ایڑیاں بجائیں۔

"دیوان جی کو بلا کر لاؤ!" تھانیدار نے حکم دیا، پھر اسے خیال میں اب تک کھڑا ہوا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "آپ یہاں کرسی پر بیٹھ جائیے!" اب وہ "تم" کہتے کہتے مجھے "آپ" کہنے تھا اور یہ محسوس کر کے میرا سینہ باہر آنے لگا تھا۔

میں تھانیدار کے سامنے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر اس طرح یا جیسے سامنے بیٹھے ہوئے توندل کی بجائے میں ہی تھانیدار ہوں۔ دار نے کمرے میں موجود سپاہیوں کو وہاں سے ٹہلا دیا۔

چند لمحے توقف کے بعد تھانیدار مجھ سے رازدارانہ لہجے میں ویسے یہ تو بتائیں کہ اس علاقے میں کیا کوئی بڑا چکر چل رہا جو یہاں سی آئی ڈی چھوڑی ہوئی ہے؟"

"یہ سب سرکاری راز ہیں جو نہیں بتائے جا سکتے۔" میں ردن اکڑا کر جواب دیا۔

"اچھا اچھا۔" تھانیدار معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر بولا۔ "چھا یہ بتائیں، کچھ کھائیں گے آپ! ناشتے کا وقت ہو رہا ہے۔"

بھوک تو خیر مجھے لگ رہی تھی مگر میں نے وہاں ناشتہ کرنا شان کے خلاف سمجھا اور انکار کر دیا۔

"میں آپ کے لیے بازار سے نہیں، گھر سے ناشتہ بنوا کر دیتا ہوں۔ آپ کہیں تو!" تھانیدار اب کھلی کھلی چاپلوسی تر آیا تھا۔ اس نے شاید اسی لیے وہاں سے سپاہیوں کو لیا تھا۔

"نہیں، نہیں! اس وقت بالکل بھوک نہیں۔" میں نے استغنا دکھائی۔

اسی وقت ادھیڑ عمر دیوان جی کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ انھیں شاید اس سپاہی نے میری حیثیت سے آگاہ کر دیا تھا جو بلا کر لایا تھا۔

"جی سرکار!" دیوان جی، تھانیدار کی میز کے پاس آکر کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"دیوان جی! تمھارے بال سفید ہو گئے مگر ابھی تک تمھیں آدمی کی پہچان نہیں۔ تمھیں معلوم ہے، یہ کون ہستی ہیں!" تھانیدار نے دیوان جی کو ڈانٹ پلاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"سرکار! اگر مجھے یہ پتا ہوتا تو میں ایسا قصور کیوں کرتا۔" دیوان جی مردہ سے لہجے میں بولے۔

"انھوں نے مجھے تو مجھے میرے ابا حضور کو بھی چور کہا تھا۔" میں نے تھانیدار کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"کیوں دیوان جی؟" تھانیدار نے آنکھیں نکال کر تصدیق چاہی۔

"غلطی ہو گئی سرکار!" دیوان جی گھگھیائے اور اس طرح گھگھیائے کہ مجھے ان پر رحم آنے لگا۔

"ان سے معافی مانگو!" تھانیدار نے گویا بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"معاف کر دیجیے حضور! مجھے آپ کے مرتبے کی خبر نہیں تھی۔" دیوان جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"اچھا جاؤ معاف کیا، تم بھی کیا یاد کرو گے!" میں نے افسرانہ شان سے کہا۔

"بڑا کرم حضور، بڑا کرم!" دیوان جی رخصت ہو گئے۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" تھانیدار نے اس طرح کہا جیسے عدالت برخواست ہونے کا حکم دے رہا ہو۔

دیوان جی چلے گئے تو مجھے خیال آیا کہ میرے پاس گھر یا دفتر تک پہنچنے کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ اگر میں تھانیدار سے پیسے مانگتا تو کرکری ہوتی اس لیے سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" تھانیدار نے مجھے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ اس طرح وہ عزت بچائی جا سکتی تھی جو میں نے تھانیدار کی نظر میں پیدا کر لی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تمھارے پاس کوئی سواری ہے؟"

"میرے پاس تو نہیں لیکن بندوبست کیا جا سکتا ہے۔" تھانیدار نے جواب دیا۔ "جانا کہاں ہے آپ کو؟"

"اپنے دفتر جاؤں گا، کشمیری گیٹ!" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ظاہر ہے کہ اس حلیے میں گھر کا رخ تو کیا ہی نہیں جا

تھا۔ دفتر کے میک اپ روم میں میرے کپڑے وغیرہ موجود تھے۔

"ٹھیک ہے، میرے ایک جاننے والے کے پاس تانگا ہے، میں وہ منگوائے دیتا ہوں۔" تھانیدار بولا۔

"اس آبادی میں کوئی اچھا ڈاکٹر بھی ہے؟" میں نے کہا۔ معاً مجھے اپنے جسم کی مرمت کا خیال آ گیا تھا کیونکہ کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی۔

"ہاں، ہاں! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" تھانیدار جلدی سے بولا۔ "آپ کے چہرے وغیرہ پر خراشیں نظر آ رہی ہیں اور بائیں آنکھ بھی سوج رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔

دوسرے ہی لمحے ایک سپاہی اندر آ گیا۔ "یس سر!"

"دیکھو، ڈاکٹر مول چند کے پاس جاؤ۔ اس سے میرا نام لینا اور اسے ساتھ ہی لے کر آ جانا۔ کہنا کہ اپنا بیگ وغیرہ ساتھ لے کر آئے، اسے مرہم پٹی کرنا ہے۔ راستے میں چودھری نعمت اللہ کا گھر پڑے گا، ان سے کہنا کہ وہ فوراً اپنا تانگا بھیج دیں، سمجھ گئے!"

"یس سر!" سپاہی یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد ہی ڈاکٹر پہنچ گیا تھا۔ اس نے کہیں پٹی باندھی، کہیں دوا لگائی اور مجھے "فٹ فاٹ" کر دیا۔

جب میں تانگے میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو تھانیدار، دلوان جی اور دوسرے پولیس والے مجھے اس طرح رخصت کر رہے تھے جیسے وہ اپنے کسی بڑے افسر کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

وہ سبزی منڈی کا علاقہ تھا اور وہاں سے کشمیری گیٹ بہت دور تھا۔ تانگے میں مجھے راستہ کچھ زیادہ ہی طویل محسوس ہوا تھا لیکن کیا کیا جا سکتا تھا، پھٹ پھٹ تو تھی نہیں کہ میں جلدی سے پہنچ جاتا۔

راستے بھر میرا ذہن ان سوالوں میں الجھا رہا تھا جو تواڑی جی کی طرف سے متوقع تھے اور جن کے مجھے بہرحال جواب دینے تھے۔ میں نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ تیواڑی جی کو اس پُراسرار عورت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا جس نے میری جان بچائی تھی۔ اس طرح میں ان کی نظر میں ہیرو ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کہانی کے تانے بانے بُن لیے جو مجھے تیواڑی جی کو سنانا تھی۔

میں جب دفتر پہنچا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ میں نے تانگے کو باہر سڑک ہی پر چھوڑ دیا۔ میں تانگے سے اتر گیا تو تانگے والے نے ادب سے جھک کر سلام کیا اور واپسی کی اجازت چاہی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور واپسی کے لیے کہہ دیا۔ وہ تانگا موڑنے لگا اور میں دفتر کی عمارت میں داخل ہو گیا۔

میں دل ہی دل میں دعا کرتا ہوا بڑھ رہا
سے مڈبھیڑ نہ ہو ورنہ وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر
سوچیں گے اور کہیں گے۔ میری دعا قبول ہوئی
میک اپ روم کی طرف چل دیا۔ میک اپ روم
نے اس نفرت انگیز دھوتی اور پھٹے ہوئے کرتے
جھاڑا اور اپنے بکس سے استری کیا ہوا ایک
میں اپنی دانست میں میک اپ روم سے
نکلا۔ میرے ماتحتوں میں سے اس وقت دو تو سیٹھ
نگرانی کر رہے تھے اور درد راؤ بہادر کشوری لال
تھے۔ رہا پانچواں یعنی کمار تو وہ زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے
کہ وہ دفتر آیا ہو گا اس لیے اپنے کمرے کا رخ کرنے کے
ڈی آئی جی تیواڑی جی کے کمرے کا رخ کیا۔

وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ تیواڑی جی ڈی آئی جی
ہیں۔ میں وہیں بیرونی کمرے میں ان کا انتظار کرنے
بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اپنے ماتحت کمار
اس کے گلے میں پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں اس نے بازو
تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس
گیا جیسے کہ دیکھا ہی نہ ہو اور اگر دیکھ بھی لیا ہے تو
نہیں دینا چاہتا۔

کچھ دیر بعد ہی کمار میرے قریب پہنچ گیا۔ "آداب
"وعلیکم آداب!" میں نے جواب دیا۔ "مگر کیسے ہو؟"
اسی طرح کہا جیسے افسران اپنے ماتحتوں سے یا بڑے اپنے
مزاج پرسی کرتے ہیں۔

"میں تو بھگوان کی دیا سے ٹھیک ہوں سر! مگر آپ
کچھ ... معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے میرے چہرے کا جائزہ
مسکرا کر کہا۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جس پر مجھے خار آتا تھا۔
"کیوں مجھے کیا ہوا؟" میں نے تیوریوں پر بل ڈال
"کچھ ٹوٹ پھوٹ نظر آ رہی ہے۔"
"زبان سنبھال کر بات کرو، میں تمہارا افسر ہوں سمجھے!"
اسی وقت تیواڑی جی کمرے میں داخل ہوئے اور میں
میں نے انھیں سلام جھاڑا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے جواب
طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ میری آمد اس وقت ان کے
تھی۔ اسی حیرت کے سبب وہ کمار کے سلام کا جواب نہ
"تم... تم اللہ دتا!... کیا ہوا تمہیں؟... اچھا اندر آؤ!"
کمار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "وہ غنڈا البتہ تیرے ہاتھ لگ گیا!"
"یس سر!" کمار نے جواب دیا۔ "اسے میں نے حوالات
دیا ہے۔"

کا جواب سن کر میں چونک پڑا۔
پوچھ گچھ کی اس سے؟" تیواڑی جی نے سوال کیا۔
ی نہیں سر!" کمار بولا۔ "میں ابھی اسے پکڑ کر لایا ہوں۔ میں آپ
ع دینے چلا آیا تھا کیونکہ آپ نے یہی حکم دیا تھا۔ اگر کہیں تو اب
ی زبان کھلوانے کی..."
دیر ٹھہرو!" تیواڑی جی اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "پہلے میں
سے بات کر لوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ، میں تمہیں بلوا

ے سر!" کمار یہ کہہ کر واپسی کے لیے مڑ گیا اور میں تیواڑی جی
ن کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
ے کی گرفتاری سے بہت سی باتیں سامنے آ سکتی تھیں،
ن مجرموں کے بارے میں جو سیٹھ وشوا ناتھ کو بلیک میل کر رہے

ن کرسی پر بیٹھتے ہی تیواڑی جی نے پہلا سوال میری ٹوٹ پھوٹ
ے میں کیا۔
ایک لمبی کہانی ہے سر! لمبی اور دردانگیز!" میں نے ٹھنڈا
تے ہوئے جواب دیا۔
ا یہ کہانی ضرور سننا چاہوں گا لیکن تم اختصار سے کام لو گے۔"
انے سابقہ روایات کے پیش نظر مجھے وارننگ دی۔
ت بہتر سر!" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔
ر اس سے پہلے کہ میں اسٹارٹ لیتا، معاً ان کی نگاہ میرے
لے بالوں پر پڑ گئی اور وہ بولے۔ "تم سے میں نے کہا تھا کہ سترا
پلی رکھنا۔ کیا تم نے ایسا نہیں کیا؟"
... وہ سر! میں نے وگ... وگ لگائی تھی۔" میں نے بوکھلا
دیا کیونکہ اس وقت دور تک میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی
سلسلے میں جواب طلبی کر سکتے ہیں۔
ل؟" ان کی نوکیلی مونچھیں پھڑکیں۔ "جب میں نے تمھیں
ا تو تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"
ل لیے سر کہ... کہ وگ بالکل... فٹ آ گئی تھی... قطعی پتا
تا کہ..."
کواس نہ کرو!" انھوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے ڈانٹ دیا۔ "آئندہ
ر کسی حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرو گے، سمجھے!"
جھ گیا سر!" میں نے جلدی سے گردن ہلا دی۔
اچھا اب جلدی سے شروع ہو جاؤ!" انھوں نے حکم دیا۔
واڑی جی نے پہلے ہی مرحلے میں ڈانٹ پلا کر میرا سارا جوش
دیا تھا اس لیے میں اپنی کہانی میں زیادہ نمک مرچ نہ لگا سکا
ر چکا تھا۔ میں کیونکہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس پُراسرار عورت کے
ے انھیں کچھ نہیں بتاؤں گا جس نے مجھے "موت کے غار"

سے فرار کرایا تھا اس لیے کہانی کا وہ حصہ بیان کرتے ہوئے کئی بار میں گڑبڑا گیا۔

میں نے نہ جانے رو میں آ کر کیا کہا تھا کہ ایک دم تیواڑی جی نے میری بات کاٹ دی۔ "کیا کہا؟"

تیواڑی جی نے مجھے درمیان میں ٹوکا تو خیال آیا کہ اس قدر ڈینگ

کی نہیں ہانکنا چاہیے تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے بات بنانے کی خاطر کہا۔ "جی ہاں سر! میں نے زور لگا کر وہ رسّی توڑ دی۔ ہو سکتا ہے وہ رسّی گلی ہوئی یا کمزور رہی ہو۔"

"ہوں، آگے کہو!" تیواڑی جی بولے اور میں نہیں سمجھ سکا کہ انھیں میری بات کا یقین بھی آیا یا نہیں۔

میں دوبارہ "گرگنے" لگا۔ اب میں اپنی کہانی کا آخری حصہ سنا رہا تھا۔ جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ تھانیدار پر اپنی شخصیت ظاہر کر دی تو وہ پھر بھڑک اٹھے۔

"کیا تمھیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اپنی سرکاری حیثیت کسی پر ظاہر نہیں کرنا!" ان کی نوکیلی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔

"تو سر! میں... میں پھر کرتا بھی کیا؟" میں روہانسی آواز میں بولا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ... وہ مجھے پھر حوالات میں ڈال دیتا اور... اور پھر..."

"اچھا اچھا، بس!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ انھیں شاید میری حالت پر رحم آ گیا تھا یا اُن کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہے، پھر سگریٹ سلگا کر کش لیتے ہوئے بولے۔ "تمھاری ساری بھاگ دوڑ سے کم از کم ایک بات تو کھل کر سامنے آ گئی کہ بھگوان داس کو سیٹھ وشوا ناتھ ہی نے قتل کرایا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کھل گئی کہ اس کے جرائم میں اس کی بیٹی سروج بھی شامل ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اب بھی اس پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اگر وہ قاتل ہاتھ آ جاتا جس نے بھگوان داس کو گولی ماری تھی تو بات بن سکتی تھی۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے سر!" میں بول اٹھا۔ "میں یقیناً اس غار تک پہنچ سکتا ہوں جہاں وہ قاتل اور اس کے ساتھی چھپے ہوئے ہیں۔ وہاں سے انھیں بہت آسانی کے ساتھ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

"تم احمق ہو بالکل!" تیواڑی جی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تمھارے خیال میں وہ لوگ اب بھی وہاں بیٹھے تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے کہ تم وہاں پہنچو اور انھیں گرفتار کر لو!"

میں لاجواب ہو گیا۔ تیواڑی جی نے غلط نہیں کہا تھا۔ میرے فرار ہونے کے بعد یقیناً انھوں نے وہ ٹھکانا چھوڑ دیا ہو گا۔

"ہاں ایک دلچسپ بات اور سنو!" تیواڑی جی بولے۔ "سیٹھ وشوا ناتھ سے میں کل ملا تھا۔ اس کے پاس وہ قیمتی زیورات موجود ہیں۔"

"مگر سر! یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "وہ زیورات تو

اُس نے بلیک میلروں کو دے دیے تھے۔ پھر وہ اس کے پاس کہاں سے آگئے!"

"تو کیا میں تم سے جھوٹ بول رہا ہوں!" تیواڑی جی سختی سے بولے۔ "جس طرح اُس نے مجرموں سے وہ اہم کاغذات حاصل کیے، کیا زیورات حاصل نہیں کر سکتا تھا!"

میں بغلیں جھانکنے لگا کیونکہ اب میری سمجھ میں بات آگئی تھی۔ خود سیٹھ وشواناتھ ان بلیک میلروں سے وہ زیورات خرید سکتا تھا۔ بلیک میلروں کو تو بہرحال وہ زیورات بیچنے ہی ہوں گے۔ یہ تو ان کے لیے اور اچھا تھا کہ خود سیٹھ وشواناتھ ہی وہ زیورات خرید لیتا۔

"سر! سیٹھ وشواناتھ کی نگرانی سے کوئی نئی بات سامنے آئی؟" میں نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

"نہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں اس غنڈے کے بیان سے یقیناً کوئی عقدہ کھل سکتا ہے جسے کمار پکڑ کر لایا ہے۔"

"تو پھر میں اس کی زبان کھلواؤں جا کر؟" میں جلدی سے بولا کیونکہ بشیرے سے انتقام لینے کا یہ سنہری موقع تھا۔

"ہاں جاؤ!" انھوں نے مجھے اجازت دے دی۔ "اور جو نئی بات معلوم ہو مجھے ضرور بتانا۔ اس کے بعد ہی میں تمھیں آئندہ کا لائحہ عمل بتاؤں گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تیواڑی جی کے کمرے سے نکل کر میں نے اپنے کمرے کا رُخ کیا کیونکہ حوالات کی چابی کمار ہی کے پاس ہونا چاہیے تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کمار کو مخاطب کیا۔ "حوالات کی چابی مجھے دے دو!"

"یہ لیجیے سر!" اس نے میز کی دراز سے چابی نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولا۔ "اگر کہیں تو میں بھی ساتھ چلا چلوں۔ وہ بہرحال غنڈا ہے اور آپ ٹھہرے شریف آدمی۔ یوں بھی آپ اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ اگر وہ آپ کے رعب میں نہ آیا تو..."

"چپ!" میں نے کمار کو سختی سے ڈانٹ دیا اور چابی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اس کے بعد میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

جس وقت میں نے حوالات کا دروازہ کھولا، بشیرے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے دروازہ کھلتے ہی میری طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

میں کچھ اس کی بے بسی پر اور کچھ اسے مرعوب کرنے کی خاطر زور سے ہنس پڑا۔ وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے اُسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔

"آ گئے نا آخر جال میں!" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"تو تم... تم واقعی وہی ہو جو کہہ رہے تھے؟" بشیرے …

"ہاں میں وہی ہوں جو تم سے انوری بائی کے کوٹھے … خوفزدہ ہونے کی میں نے کیسی عمدہ اداکاری کی تھی! تم … میں واقعی خوفزدہ ہو گیا ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا اور نہ … نہیں ہوا تھا۔ کہو تو وہ باتیں بتا دوں جو اس وقت تم نے … کی تھیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی یادداشت کا کمال دکھایا … میری بات پر یقین آ جائے۔ میں نے من وعن ان … جن کا تبادلہ اُس کے اور انوری بائی کے درمیان ہوا تھا۔ … ہنس کر بولا۔ "اگر میں تم سے خوفزدہ ہو جانے اور … رہ جاتا تو کیسے وہ باتیں نہ جان سکتا۔"

بشیرے کا واسطہ اب تک پولیس ہی سے رہا تھا۔ یہ پہلا … سی آئی ڈی والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اس لیے اُس کا … غیر فطری نہیں تھا۔ اس وقت وہ سہمی ہوئی نگاہ سے … رہا تھا۔

"اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری رگڑائی نہ لگے تو … سیدھے سیدھے بتاتے جاؤ!" میں نے اُسے خوفزدہ دیکھ … سے فائدہ اٹھایا۔

"پوچھیے۔" وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ گویا اُس نے …

"پہلے یہ بتاؤ بشیرے کہ تم اُن لوگوں کو کس طرح جانتے … تمھارا کیا تعلق ہے جنھیں تم نے قیام کی خاطر اپنا کشمیری گیٹ … دیا تھا؟"

"میں سال بھر پہلے ایک بار بمبئی گیا تھا۔ میری ملاقات … میں ہوئی تھی۔ وہ بمبئی کے نامی گرامی بدمعاش تھے۔" … نے جواب دیا۔

"وہ یہاں دہلی میں تم سے کب ملے؟" میں نے دوسرا …

"اور انھیں تمھارا پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے بمبئی ہی میں انھیں اپنا پتا دیا تھا اور کہا تھا … آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں۔ کوئی ہفتے بھر پہلے مجھ سے ملے …

"اور تم نے انھیں اپنے کشمیری گیٹ والے مکان میں …

"ہاں!" بشیرے بولا۔ "کیونکہ جی بی روڈ پر میرا … چھوٹا سا کمرہ ہے۔"

"اچھا وہ تھیلے والا کیا چکر تھا؟"

"انھوں نے اس سلسلے میں مجھے تفصیلات نہیں … انھوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا کہ میں کسی ایسی طوائف … کر دوں جس سے میرے تعلقات ہوں۔ اس طوائف کو … ایک تھیلا دے کر جائے گا جو میں اپنے کسی آدمی سے کشمیری … کیونکہ اس وقت وہ لوگ مکان پر موجود نہیں ہوں گے …

… پڑوس میں رہنے والی لڑکی کو دے جائے۔ پھر ایسا ہی ہوا تھا۔"

… بشیرے چپ ہو گیا۔

"پھر وہ لوگ تمھارا کشمیری گیٹ والا مکان چھوڑنے کے بعد … رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ان لوگوں کے لیے ایک اور ٹھکانے کا بندوبست … دیا تھا کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ ان کے پیچھے پولیس لگ گئی ہے۔ … خبر نہیں تھی کہ کوئی لمبا معاملہ ہے اور پولیس کی بجائے سی آئی ڈی … پیچھے لگی ہوئی ہے ورنہ میں کبھی انھیں گلابو طوائف کے یہاں … ٹھہراتا۔" بشیرے نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنی صفائی … پیش کی۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم اتنے دن سے غائب کہاں تھے؟" میں … گویا آخری سوال کیا۔

"نہ جانے وہ کون تھے جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ انھوں نے … سے انھی چاروں کا پتا پوچھا تھا۔ پہلے تو میں ان لوگوں سے دوستی … کے سبب پتا بتانے سے ہچکچاتا رہا مگر جب انھوں نے مار پیٹ شروع … اور مجھے ختم کر دینے کی دھمکی دی تو پھر زبان کھولنا ہی پڑی۔ میں … گلابو کا پتا بتا دیا۔" بشیرے نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "… اس کے بعد میں کل رات تک اسی عمارت میں قید رہا مگر کل رات … وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔"

بشیرے کی بات سن کر میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ کمار کو … بشیرے کے بارے میں کیسے پتا چلا کہ وہ اپنے دشمنوں کی قید سے نکل … ہے؟ مگر ظاہر ہے کہ بشیرے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا … تھا۔ میں نے اس سے ایک اور بات دریافت کی۔ "تم جس عمارت سے … فرار ہوئے کیا وہ قطب روڈ پر ہے؟"

"جی ہاں جناب!" بشیرے نے جواب دیا اور مجھے حیرت سے … دیکھنے لگا۔ "آپ کو... کیسے پتا چلا؟"

"ہم خفیہ والے ہیں بیٹے! ہمیں کیا پتا نہیں ہوتا۔" میں گردن … اکڑا کر بولا۔ میں بھلا اسے کیوں بتاتا کہ یہ نتیجہ میں نے کس طرح اخذ کیا … تھا اور اس سے کیوں کہتا کہ جب اس پر تشدد کیا جا رہا تھا، انوری بائی … کی اسی عمارت میں تھی جس نے اس کے چیخنے کی آوازیں سنی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ بشیرے نے جو کچھ بتایا تھا، وہ قطعی درست تھا۔ میرے خیال میں بلیک میلروں نے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا اور ہر بات سے لاعلم رکھا تھا۔ بشیرے کو اب مزید حوالات میں رکھنے کا کوئی جواز تو نہیں تھا مگر تیواڑی جی کی اجازت کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔

جب میں وہاں سے چلنے لگا تو بشیرے گھگھیایا۔ "مجھے اور کب تک یہاں رہنا پڑے گا؟"

"میں ابھی اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے افسرانہ شان سے جواب دیا اور حوالات سے نکل کر دروازے میں تالا ڈال دیا۔

تیواڑی جی کے پاس دوبارہ جانے سے پہلے میں نے یہ ضروری سمجھا، اپنے ذہن میں چبھنے والے اس سوال کا جواب ضرور جان لوں کہ کمار کو بشیرے کے بارے میں فوراً کس طرح پتہ چل گیا؟

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کمار کو مخاطب کیا۔ "یہاں آؤ!"

"سر! آپ کی آواز مجھے یہاں بیٹھ کر بھی واضح اور صاف سنائی دے رہی ہے۔ فرمائیے!" کمار پُرسکون آواز میں بولا۔

"میں کہہ رہا ہوں، ادھر آؤ!" مجھے طیش آ گیا۔ "میں تمھارا افسر ہوں۔ میں تمھیں جو حکم دوں، اس پر بغیر بحث کیے عمل ہونا چاہیے۔"

"اچھا خیر! اگر آپ اپنی میز کے سامنے مجھے کھڑا کر کے افسری ہی چھانٹنا چاہتے ہیں تو یہی سہی۔" اس نے مسکرا کر کہا اور اپنی کرسی سے اٹھنے لگا۔

میں نے اس کی نامعقول بات کا کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ جب وہ "یس سر" کہہ کر میری میز کے سامنے آ کھڑا ہوا تو میں نے اُسے مخاطب کیا۔ "بشیرے کے بارے میں تمھیں کیسے پتا چلا کہ وہ اب جی بی روڈ پر مل سکتا ہے؟"

"کمال ہے سر کہ آپ اتنی سیدھی سی بات نہیں سمجھ سکے!" اس نے اس طرح کہا جیسے مجھے بالکل گھامڑ تصور کر رہا ہو۔

"میری بات کا جواب دو۔ میں زیادہ بکواس سننا پسند نہیں کرتا۔" میں نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے سختی سے کہا۔

"سر! یہ سرکاری میز ہے اور اتنی زور سے ہاتھ مارنے پر اسے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔" میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ مجھے نصیحت کرنے لگا۔

میرا پارہ اور چڑھ گیا اور میں بلند آواز میں بولا۔ "اس سے پہلے کہ میں میز کی بجائے تمھیں کوئی نقصان پہنچا دوں، میرے سوال کا جواب دے دو!"

"آپ تو ایک دم خفا ہو جاتے ہیں سر! ذرا چھری کے نیچے دم لیا کیجیے۔"

"کیا؟" میں دہاڑا۔

"میرا مطلب تھا کہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا کیجیے۔ اس میں اتنے ناراض ہونے کی بات تو نہیں تھی۔"

"تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں! آخر آپ میرے سر ہیں۔ میں بھلا آپ کی حکم عدولی کیسے کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر پھونکو جلدی سے!"

"اب یہی بات تو آپ کی غلط ہے۔ آپ مجھے آدمی سے کتا بنائے دے رہے ہیں، پھر شکایت کرتے ہیں کہ میں حکم نہیں سنتا۔"

پھر کافی دیر تک چیخ چیخ کے بعد میں اس سے یہ معلوم کر سکا تھا کہ اس نے میری غیر موجودگی میں جی بی روڈ کے تھانے کے سپرد یہ کام کر دیا تھا۔ اس نے تھانیدار سے کہا تھا کہ وہ بشیرے کے بارے میں محتاط رہے اور جیسے ہی بشیرے نظر آئے فوراً اسے مطلع کیا جائے۔ تھانیدار نے اپنا فرض پورا کیا تھا بلکہ اس نے بشیرے کو پکڑوا کر تھانے بلوا لیا تھا اور فوراً ہی کمار کو اس کی خبر کر دی تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنے کمرے میں رکنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ میں نے تیواڑی جی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا کہ آج ان سے کمار کی شکایت کروں گا۔ وہ میرے لیے مستقل عذاب بن کر رہ گیا تھا۔

جب میں تیواڑی جی کے پاس پہنچا تو وہ میرے ہی منتظر تھے۔ میں نے بشیرے سے حاصل ہونے والی معلومات من و عن بیان کر دیں تو وہ بولے "کس نتیجے پر پہنچے تم؟"

میں نے بشیرے کے بیان پر غور کیا ہوتا تو کچھ کہتا بھی۔ میں تو اس کمبخت کمار سے مغز مارتا رہا تھا۔ میں نے اس لیے تیواڑی جی ہی سے پوچھا۔ "آپ بتائیں سر! اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

"تمھاری کھوپڑی میں گودا نہیں!" تیواڑی جی بکے۔

"ہے کیوں نہیں سر! گودا ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں تو دراصل آپ کے خیالات جاننا چاہتا تھا۔"

تیواڑی جی نہ جانے کیوں اس بار مسکرا دیے۔ مجھے یہ موقع بڑا غنیمت معلوم ہوا۔ بس کبھی کبھار ہی تو ان کا موڈ خوشگوار ہوتا تھا۔ یہ سنہری موقع تھا کہ میں کمار کی شکایت کر دیتا پھر میں نے موقع ضائع نہیں کیا تھا۔

"سر! وہ دیکھیے... وہ جو میرا ماتحت ہے کمار، بے حد نااہل اور سخت..."

"کیا؟ یہ تم درمیان میں کیا قصے لے بیٹھے؟ بات کچھ ہو رہی ہے اور تم کچھ ہانک رہے ہو!" تیواڑی جی کے لہجے میں سختی آگئی اور مسکراہٹ مونچھوں کے پیچھے جا چھپی۔

"ہاں تو آپ کیا بتانے والے تھے سر!" میں نے کمار کے معاملے کو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا۔

"تمھارا سر!"

"تو پھر بتائیے۔" میں نے جلدی سے ان کے فقرے پر غور کیے بغیر کہہ دیا مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ بہرحال اب ڈانٹ تو مقدر ہی تھی تو کھائی۔

مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر انھوں نے اپنا موڈ صحیح کر لیا، سگریٹ کے دو چار لمبے لمبے کش لیے، پھر بولے "بشیرے کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح اسے اور انوری بائی کو اغوا کیا گیا اسی طرح سیٹھ وشواناتھ کے آدمیوں نے ان چاروں کو بھی چھاپ لیا ہوگا۔ اس کے بعد ان سے کاغذات حاصل کرنا اور ساتھ زیورات چھین لینا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا ہوگا۔ اب"

"جی سر!" میں نے جلدی سے سر ہلایا۔ "اور یہ تو پہلے ہی پتا چل چکا ہے کہ بھگوان داس کو ان بلیک میلروں نے کاغذات کی کاپیاں دی تھیں۔" میں نے قابلیت بگھارنے کے لیے کہا۔

"اس کے بعد ان مجرموں کو یا تو چھوڑ دیا گیا ہوگا اور وہ بمبئی بھاگ گئے ہوں گے یا پھر انھیں ختم کر دیا گیا ہوگا لیکن زیادہ قرین قیاس ہے کہ انھیں مقصد برآری کے بعد چھوڑ دیا گیا ہوگا۔" تیواڑی جی کچھ سوچنے لگے، پھر کچھ دیر بعد خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔ "ان مجرموں نے یقیناً ان کاغذات کا مطالعہ کیا ہوگا، جانتے ہوں گے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ سیٹھ کو بلیک میل نہ کرتے۔ اب اگر کسی طرح وہ ہاتھ آجائیں تو پتا چل سکتا ہے کہ ان کاغذات میں کیا تھا۔"

"سر! ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ جو ترکیب بھگوان داس کے ساتھ استعمال کی گئی تھی، یہاں بھی آزمائی جائے۔" میں نے تیواڑی جی کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"کیا مطلب؟" تیواڑی جی نے مجھے گھورا۔

"سیٹھ وشواناتھ سے زبردستی وہ کاغذات حاصل کر لیے جائیں اور وہی ڈاکے کا سوانگ رچایا جائے۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"تم احمق ہو پورے!" تیواڑی جی منہ بنا کر بولے۔ "کیا وشواناتھ کو اتنا بیوقوف سمجھتے ہو کہ اس نے وہ کاغذات اب تک سنبھال کر رکھ چھوڑے ہوں گے جو تم یا کوئی اور انھیں حاصل کر لے۔ اس نے ان بلیک میلروں سے کاغذات حاصل کرنے کے بعد انھیں ضائع کر دیا ہوگا یا اگر انھیں ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا ہوگا تو بہت حفاظت سے رکھوا دیا ہوگا، کسی ایسی جگہ جو اس کی نظر میں ہو اور جہاں کوئی نہ پہنچ سکے۔ وہ جگہ بہرحال اس کی کوٹھی نہیں ہوگی کیونکہ وہاں سے ایک بار کاغذات چوری ہو چکے ہیں۔"

"کیا وہ جگہ قطب روڈ کی عمارت نہیں ہو سکتی جہاں کاغذات رکھتے ہوں؟" میں نے یونہی اندھیرے میں تیر پھینکا۔

"ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی۔" تیواڑی جی بولے۔ "یہ تو اسی وقت سوچا جا سکتا ہے جب اس بات کا یقین ہو کہ وہ ضائع نہیں کیے گئے ہیں۔ پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ بشیرے کی

عمارت میں بھی کچھ نہیں ملے گا کیونکہ وہ بشیرے کے فرار سے آگاہ ہو گیا ہوگا۔ اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ بلیک میلر ہاتھ آجائیں۔ ہاں تم نے بشیرے سے ان کے نام پوچھے؟"

"نام... وہ تو میں نے نہیں پوچھے... ابھی آتا ہوں پوچھ کر۔" میں جلدی سے اٹھنے لگا۔

"بیٹھو!" تیواڑی جی نے مجھے ڈانٹا۔

میں اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا پھر بولا: "نام... وہ سر!... سوال سے کیا..." میں کوششوں کے باوجود اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ میرے بولتے ہی تیواڑی جی مجھے گھورنے لگے تھے۔

"کچھ ہو یا نہ ہو، تمھیں بہرحال اس سے نام ضرور پوچھنے تھے۔" تیواڑی جی نے سگریٹ کو اس طرح ایش ٹرے میں مسلا جیسے سگریٹ کی بجائے مجھے مسل رہے ہوں، پھر وہ دوبارہ بولے۔ "تفتیش پوری ہونی چاہیے، چاہے اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے یا نہ اٹھایا جائے۔"

"آئندہ ایسا ہی ہوگا سر!" میں نے انھیں یقین دلایا، پھر بشیرے کا ذکر یاد آیا کہ لگے ہاتھوں ان سے یہ بھی پوچھ ہی لوں کہ اسے بند رکھوں کہ چھوڑ دوں۔ میں بولا: "سر! بشیرے سے بلیک میلروں کے نام معلوم کر کے میں اسے چھوڑ دوں؟"

"اور کیا اس کا اچار ڈالو گے!"

"سر! آپ کہہ رہے تھے کہ مجھے آئندہ کے بارے میں لائحہ عمل..."

"اس سلسلے میں کل بات کرنا۔ ابھی میں خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ ہاں فائل میں آج ہی اب تک پیش آنے والے تمام واقعات لکھ دینا۔"

"بہتر ہے سر!" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

میں وہاں سے سیدھا حوالات پہنچا جس کی چابی میری جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ بشیرے سے میں نے ان بلیک میلروں کے نام معلوم کر لیے پھر بولا: "اچھا بھئی بشیرے! تو بھی کیا یاد کرے گا کس سے پالا پڑا ہے۔ جا تو آزاد ہے۔"

بشیرے یہ مژدہ سن کر کھل اٹھا۔ وہ چلا گیا تو میں نے حوالات کا دروازہ بند کیا اور تالا لگا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے جس مصیبت سے بچنے کی دعا کی تھی، وہ مصیبت چچا بندو خاں کے روپ میں سامنے سے چلی آرہی تھی۔ وہ تنگ سی راہداری تھی اور وہاں فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے چچا بندو خاں یعنی میری ہونے والی بیوی کے ابا نے مجھے دیکھ ہی لیا۔

"اے بیٹے اللہ دتا!" وہ دور ہی سے چہکے۔ "ارے کہاں تھا کتنے دنوں سے؟" یہ کہتے ہوئے وہ قریب آگئے۔ پھر جیسے ہی انھوں نے قریب سے میرا چہرہ دیکھا، ایک دم انتہائی فکرمند لہجے میں بولے۔

"ارے یہ کیا ہوا؟ کیا کسی سے لڑائی ہو گئی؟"

"تانگے سے گر پڑا تھا چچا!" میں نے بہانہ کیا۔

"زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟" انھوں نے جلدی سے کہا۔ "کوئی چھپا چوٹ وغیرہ؟"

"نہیں چچا! ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے انھیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "چھپا چوٹ" سے مراد اندرونی چوٹ ہی ہو سکتی تھی۔ وہ شاید اپنی بیٹی اور میری ہونے والی یعنی متوقع شریک حیات کے مستقبل کی طرف سے پورا اطمینان کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ تو مجھے بھی زور کی بھوک لگ رہی تھی اور کچھ چچا بندو خاں کا اصرار تھا کہ میں انھی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاؤں، اس لیے میں نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ اس کے بعد انھوں نے فرضی حادثے یعنی میرے تانگے سے گرنے کی پوری تفصیل بڑے غور سے سنی اور مجھے تانگے پر چڑھنے اترنے کے آزمودہ گر بتاتے رہے جو ان کی ساری زندگی کا نچوڑ تھے۔ چچا بندو خاں ہمیشہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے جیسے میرے دودھ کے دانت بھی ابھی نہیں ٹوٹے ہوں اور میں بھی ان کے سامنے بالکل بھولے شاہ بن جاتا تھا۔

چچا بندو خاں کے ساتھ کھانا کھا کر میں نے وہاں سے چھوٹ لینے میں دیر نہیں کی۔ اپنے کمرے میں جا کر میں نے سیٹھ وشواناتھ کیس کا فائل نکالا اور اس کا پیٹ بھرنے لگا۔ اسی دوران میں نہ جانے کہاں سے وہ کمبخت 'تفضلئے مجرم' آ ٹپکا، یعنی پیارے لال سہنر! مجھے کمار کی موجودگی ہی اس وقت وہاں گراں گزر رہی تھی کہ وہ بھی آگیا۔ اب بھر گیا فائل کا پیٹ، بیٹا اللہ دتا! میں نے سوچا اور فائل بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ وہ ادب آداب کے مراحل طے کر چکا تھا۔ وہ میری میز کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"کہو!" میں نے پھاڑ کھانے والے انداز میں کہا۔

"سرکار! خادم یہ عرض کرنے حاضر ہوا تھا کہ یہ شب بیداریاں فلک کج رفتار نے کب تک کے لیے ہمارے نصیب میں رقم کر دی ہیں؟"

اس نے حسب معمول گاڑھی اردو بولنا شروع کر دی۔

"میری بات تمھارے پلے پڑتی ہے کہ نہیں؟" میں نے اس سے کہا۔

"جی ہاں سرکار والا تبار!"

"تو پھر تمھاری بات بھی میری سمجھ میں آنی چاہیے! سمجھ گئے!" میں اسے گھور کر بولا۔

"بجا فرمایا قبلہ نے مگر خادم کی فہم سے خود ہی یہ عقدہ بالاتر ہے کہ شعور کی سرحد ادراک کہاں سے آغاز ہوتی ہے اور کہاں اختتام پذیر

ہوتی ہے۔" اس نے پھر ایک ایسا جملہ ادا کیا جو میری سمجھ میں نہ آسکا۔

"دیکھو پیارے لال ہنر! اگر تم نے مجھے پریشان کرنے ہی کی ٹھان لی ہے تو کان کھول کر سن لو۔ میں زیادہ عرصے یہ برداشت نہیں کروں گا۔" میں نے برہم ہو کر کہا اور اسی وقت میری نگاہ کمار کی طرف اٹھ گئی جس کے ہونٹوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جو میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی تھی۔ وہ یقیناً میری حالت دیکھ کر مزا لے رہا تھا۔

"حضور کی طبع نازک پر کیا گراں ہے کیا نہیں، خادم سمجھنے سے قاصر ہے۔ اگر حکم فرمائیں تو خادم فردِ شبِ گزشتہ پیش کرے؟" اس کا لہجہ سوالیہ تھا جس سے میں نے سمجھا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو جواب طلب ہے۔ میں یہ ضرور سمجھ گیا کہ وہ مجھے کچھ پیش کرنا چاہتا ہے۔

"لاؤ، دو جو دینا چاہتے ہو۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وہ میری طرف اس طرح حیرت سے دیکھنے لگا جیسے میرے سر پر اچانک سینگ نکل آئے ہوں۔

"خادم سمجھ نہیں سکا کہ حضور کیا طلب فرما رہے ہیں۔" وہ حیرت سے بولا۔

"ابے تم مجھے کچھ پیش کرنا چاہتے تھے نا! تو پھر پیش کرو!" میں نے تنگ آکر کہا۔

"وہ تو میں فردِ شبِ گزشتہ کا ذکر کر رہا تھا حضور! مگر غالباً آپ کچھ اور سمجھ رہے ہیں۔"

"میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا مجھے!" اب میرا ضبط جواب دے گیا اور میں چیخ پڑا۔

پیارے لال ہنر کچھ ٹپٹا سا گیا اور میری بجائے کمار سے مخاطب ہوا۔

"برادرِ من! اگر کہو تو میں تم ہی سے عرض کر دوں۔ حضور کا مزاج تو کچھ ناساز معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں، جاؤ! جو کہنا ہے اسی سے کہو۔" میں نے اپنی بلا کمار کے گلے ڈال دی۔

"پیارے لال بھائی! آپ میرے پاس آجائیں۔" کمار نے کہا۔ "دراصل آپ آدمی دیکھ کر بات کیا کریں۔ ظاہر ہے کہ آپ کی زبان کوئی پڑھا لکھا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے۔"

"کیا!" میں دہاڑا۔ کمار سراسر مجھے اَن پڑھ کہہ رہا تھا، وہ بھی میرے منہ پر ورنہ پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہ کو بھی بُرا کہہ دیتے ہیں۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟" میرا مخاطب کمار ہی تھا۔

"سر! میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا۔" کمار پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میں تو پیارے لال جی سے مخاطب تھا۔"

"مگر تم نے بات تو میرے ہی بارے میں کی تھی۔" میں اپنی بات پر اڑ گیا۔ "ان کی بات کوئی پڑھا لکھا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے، اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم سر! اگر کہیں تو پیارے لال جی سے کہوں کہ اس بات کا مطلب آپ کو سمجھا دیں!" کمار نے گویا مجھے دعوت دی۔

میں نے کمار کو مزید منہ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ خواہ مخواہ خون جلتا اس لیے میں نے کہا: "اچھا اب تم دونوں مجھے ہرگز تنگ نہیں کرو گے۔ میں فائل میں ضروری اندراجات کر رہا ہوں۔"

میں نے فائل دوبارہ کھول لی مگر اس وقت تک ایک لفظ نہ لکھ سکا جب تک وہ "قضائے مُبرم" وہاں سے ٹل نہ گیا۔ وہ دونوں اتنی زور زور سے باتیں کر رہے تھے کہ میرا کچھ لکھنا ہی مشکل ہو گیا اور جہاں تک میرا خیال ہے، ایسا وہ دانستہ کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ میں ان حالات میں سوائے دانت پیسنے کے اور کیا کر سکتا تھا۔

میں اس کی پریکٹس کرتا رہا۔

پیارے لال ہنر کے جاتے ہی کمار نے مجھے مخاطب کرنا چاہا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ پیارے لال ہنر آخر چاہتا کیا تھا۔ کچھ بھی چاہتا ہو گا کمبخت! مجھے کیا! میں نے سوچا تھا اور فائل بھرنے لگا جو کسی طرح بھر کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہرحال وقت ختم ہونے تک میں نے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات اس میں لکھ ہی دیے۔

جب میں فائل بند کر کے میز کی دراز میں رکھ رہا تھا تو ایک بار پھر کمار نے مجھے مخاطب کیا: "سر! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"جو کہنا ہو اکرے، دفتری اوقات میں کہا کرو۔ دیکھتے نہیں دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے اور میں جانے والا ہوں۔ کل بات کرنا۔" میں نے منہ بگاڑ کر افسرانہ شان سے جواب دیا۔

"پھر نواڑی جی کی ڈانٹ پڑے تو مجھے بُرا بھلا کہیے گا!" کمار نے مجھے چڑایا۔

"تم پھر اپنی حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تمہارا افسر ہوں اور تم میرے ماتحت! تمہیں مجھ سے زبان سنبھال کر بات کرنا چاہیے۔" میں برہم ہو کر بولا۔

"مگر سر! جس طرح آپ ہمارے افسر ہیں اور ہم آپ کے ماتحت، اسی طرح آپ کا بھی تو کوئی افسر ہے جس کے آپ ماتحت ہیں۔" کمار نے بحث کرنے کے انداز میں کہا۔

"پھر میں کیا کروں؟ تمہیں اس سے آخر کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر کہ میں نہیں چاہتا، جس طرح آپ اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ پلا دیتے ہیں، آپ کو بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں زچ ہو کر بولا۔

"پیارے لال رپورٹ دینے آیا تھا اور اس رپورٹ میں ایک اہم بات ہے جو بہر حال آپ کو جاننا چاہیے کیونکہ اس سلسلے میں اب آپ ذمے دار ہیں۔ آپ نہ ہوتے تو میں یہ ذمے داری قبول کر لیتا۔"

مجھے علم تھا کہ پیارے لال اور میرا دوسرا ماتحت مجید سیٹھ وشوا ناتھ کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں اسی لیے فوراً کمار کی بات سننے پر آمادہ ہو گیا۔ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور تھی جو پیارے لال ہنر نے اسے بتائی تھی۔ اس کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات اہم ہے۔

"ہاں بتاؤ، وہ کیا رپورٹ دے کر گیا ہے؟" میں نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

ابھی کمار کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ کمال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی سلام جھاڑا اور اس پر نظر پڑتے ہی مجھے غصہ آگیا۔ کمال اور گپتا، راؤ بہادر کشوری لال کی نگرانی کر رہے تھے۔ راؤ بہادر ہی کی حویلی سے گویا سر ونت نے مجھے "اغوا" کیا تھا اور ان کمبختوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

"تم لوگ آخر کیا جھک مارتے رہتے ہو؟" میں کمال پر بگڑا۔

"کہاں سر؟" کمال میرا پارہ چڑھا ہوا دیکھ کر بوکھلا گیا۔

"وہیں راؤ بہادر کشوری لال کی کوٹھی پر اور کہاں!" میں جھلا کر بولا۔

"کیا ہو گیا سر؟ کیا راؤ بہادر کو کچھ ہو گیا؟" کمال نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

"اسے تو خیر کچھ نہیں ہوا مگر مجھے ضرور ہو جاتا۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے سوچا کہ مجھے یہ بات کمار کی موجودگی میں نہیں کہنا چاہیے تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں دوبارہ جلدی سے بولا: "کل رات کیا تم ڈیوٹی پر تھے؟"

"یس سر!" کمال نے جواب دیا۔

"کب سے کب تک؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"رات نو بجے سے صبح نو بجے تک سر!" کمال نے جواب دیا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرا سا گیا ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر آہستہ سے بولا: "بس میں کچھ دیر کو وہاں سے ضرور ہٹا تھا، وہ بھی مجبوراً سر!"

"کیا مجبوری تھی؟" میں نے جواب طلب کیا۔

"وہ دراصل سر! ... میرے پیٹ میں شام ہی سے کچھ گڑبڑ تھی مجھے... مجھے مونگ کی دال ذرا مشکل ہی سے ہضم ہوتی ہے۔ میں نے راشد کی امّی سے کہا بھی تھا کہ کچھ اور پکا لے مگر وہ..."

"یہ راشد کی امّی کون ہے اور ان سرکاری کاموں میں کہاں سے ٹپکی؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"سر! ... میں... میں اپنی بیوی کا ذکر کر رہا تھا۔" کمال نے دانت نکال دیے۔

"اچھا سر! میں اب چلتا ہوں، ویسے بھی دفتر کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" دفعتاً کمار درمیان میں بول پڑا۔

"نہیں!" میں نے سختی سے کہا۔ "تم ابھی نہیں جاؤ گے۔"

"سر! ابھی کچھ دیر پہلے آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ دفتری اوقات میں بات کی جائے۔"

"میں اپنا وہ حکم واپس لیتا ہوں اور اب حکم دیتا ہوں کہ وہ بات کہو جو تم کہنا چاہتے تھے۔" میں نے سختی سے کہا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" کمار کے بولنے سے پہلے ہی کمال بول پڑا۔

"پہلا حکم تو یہ ہے کہ جب میں کسی سے بات کر رہا ہوں تو بیچ میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ دوسرا حکم یہ کہ اپنی چونچ بند کیے اس وقت تک کھڑے رہو جب تک میں تم سے مخاطب نہ ہوں۔"

"یس سر!" کمال فرماں برداری سے بولا۔

"ہاں تم بھی سنو، تم بھی درمیان میں آئندہ کبھی نہیں بولو گے۔" میں نے کمار کو بھی لتاڑ دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، جلدی سے مطلب کی بات پر آگیا: "بتاؤ پیارے لال ہنر کیا کہہ کر گیا ہے؟"

اس بار کمار نے نہیں ستایا اور پیارے لال ہنر آپ سے جو کچھ کہہ کر گیا تھا مجھے بتا دیا۔ پیارے لال ہنر کی رپورٹ کے مطابق صبح پانچ بجے کے قریب کوئی نوجوان سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی میں گیا تھا، پھر تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی سیٹھ وشوا ناتھ کی کار کوٹھی سے نکلتی نظر آئی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف سروج بیٹھی ہوئی تھی۔ پیارے لال ہنر نے اس کا تعاقب نہیں کیا تھا کیونکہ تعاقب کے احکام صرف سیٹھ وشوا ناتھ کے لیے تھے۔ سروج کی روانگی کے بعد وہ نوجوان بھی کوٹھی سے نکل کر چلا گیا تھا۔

"پیارے لال ہنر اور گپتا تک ہمارا یہ حکم بھی پہنچا دیا جائے کہ آئندہ وہ سروج کا بھی تعاقب کریں۔" میں نے کمار سے کہا، پھر کمال سے مخاطب ہوا: "اور تم لوگ بھی اب راؤ بہادر پر نظر رکھنے کے علاوہ اُس کی بہن کملا پر بھی نظر رکھو گے۔"

"سر! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کمال صاحب بیوی بچوں والے آدمی ہیں۔ آپ ان سے ایک جوان لڑکی پر نظر رکھنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔" کمار بولا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"تم کون ہوتے ہو! میں کسی پر بھی نظر رکھواؤں یا نہ رکھواؤں۔" میں نے کمار کو ڈانٹا۔

"بہتر ہے سر! میں گپتا سے بھی کہہ دوں گا۔" کمال نے کہا۔

"اور کوئی خاص بات؟" میں نے کمال سے پوچھا۔

"نہیں سر! میری ڈیوٹی کے دوران میں تو گزشتہ رات کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔" کمال بولا۔

میں اس کا جواب سن کر جل بھن گیا یعنی اس کی غفلت کے سبب میں بلی چڑھتے چڑھتے رہ گیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی مگر ظاہر ہے کہ میں اپنے ماتحتوں کو تو نہیں بتا سکتا تھا گزشتہ رات میری کس کس طرح رگڑائی ہوئی تھی اس لیے اپنا غصہ پی گیا۔

میں نے کمال اور کمار کو رخصت کر دیا پھر اپنے کمرے سے نکل کر میک اپ روم کا رخ کیا تاکہ وہاں سے اپنا بکس لے لوں ظاہر ہے کہ اب میں رام بھروسے بن کر کملا کی حویلی میں تو رہ نہیں سکتا تھا اس لیے شہر سے باہر رہنے کا ڈراما تو ختم کرنا ہی تھا گویا اب میں جس سرکاری کام سے باہر گیا ہوا تھا اُسے پورا کر کے دہلی آچکا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی میں سرکاری موٹر سائیکل پر گھر کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ زخمی چہرے کے بارے میں گھر پر جو پوچھ گچھ ہو سکتی تھی، اس کا حل میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ وہی تانگے سے گر پڑنے کا بہانہ جو چچا بندو خان سے میں نے کیا تھا، میرے کام آسکتا تھا۔

میں موٹر سائیکل دباری میں کھڑی کر کے جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہوا امّی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

"ہائے میرے لعل کو کیا ہوا؟" وہ دل ہلا دینے والے انداز میں چیختی ہوئی میری طرف بڑھیں۔

"کیا ہوا، کیا ہوا!" اندر کمرے سے ابّا کی آواز آئی۔

اس دوران میں امّی میرے قریب پہنچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا چکی تھیں۔ ابّا کی آواز کے جواب میں انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔ "ارے یہاں آکر تو دیکھو، اللہ دتے کو کیا ہو گیا"

امّی کچھ ایسے رقت آمیز انداز میں چیخی تھیں کہ میرا دل بھی ہول گیا تھا اور میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا تھا کہ واقعی مجھے کچھ ضرور ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر امّی کی طرح میری آنکھوں میں بھی آنسو امنڈ آئے تھے۔

ابّا اس طرح بھاگتے ہوئے کمرے سے نکلے جیسے اچانک مجھ پر مرگی ورگی کا دورہ پڑ گیا ہے لیکن مجھے امّی کے سینے سے لگا دیکھ کر انھیں ایک دم شاید بریک سا لگ گیا۔ ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز رک گئی تھی۔

"ہوا کیا آخر؟" وہ کسی قدر جھنجلا کر بولے۔

میری پشت کیونکہ ابّا کی طرف تھی اس لیے وہ میرے چہرے پر موجود نقش و نگار نہ دیکھ سکے تھے۔

"ارے ابھی تمھیں بھی پتا نہیں کہ کیا ہوا! یہ دیکھو!" امّی نے میرا چہرہ ابّا کی طرف کر دیا۔

"ارے یہ کیا ہوا اللہ دتا؟" ابّا بھی چونک اٹھے مگر امّی کی طرح انھوں نے آسمان سر پر نہیں اٹھایا تھا جس سے میرے دل کو ڈھارس بندھی کہ معاملہ زیادہ سیریس نہیں ہے۔

"ابّا! میں تانگے سے گر گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے اب اُسے چھوڑو گی بھی یا نہیں! تھکا ہوا آرہا ہوگا۔" ابّا، امّی سے بولے۔

امّی نے مجھے سینے سے جدا کیا اور اسی کے ساتھ حادثے کی تفصیلات شروع ہو گئیں۔ اب میں چارپائی پر بیٹھ چکا تھا اور امّی نے پاندان سنبھال لیا تھا۔

"مگر تو گیا کہاں تھا؟" ابّا نے ایک دم غیر متوقع سوال کیا جس کے بارے میں پہلے سے میں نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔

"علی گڑھ!" میرے منہ سے نکل گیا۔

"اچھا اچھا، وہاں گیا تھا تو! ٹھہرا کہاں تھا؟" ابّا نے دوسرا جڑ دیا۔

وہ تو خیر ہوئی کہ گزشتہ سال میرا ایک دوست علی گڑھ کا نمائش دیکھنے گیا تھا جو سال کے سال لگتی ہے اور اس نے مجھے علی گڑھ کے قصّے سنائے تھے اس لیے مجھے ایک آدھ محلّے کا نام یاد رہ گیا تھا۔ میں نے جھٹ جواب دے دیا۔ "بالائے قلعہ۔"

"بالائے قلعہ تو بہت بڑا ہے، وہاں کس جگہ؟" ابّا پورے "انکوائری کمیشن" بنے ہوئے تھے۔ اب مجھے کیا خبر تھی کہ علی گڑھ سے ان کی کیا یادیں وابستہ تھیں مگر اس وقت نہ جانے امّی کو کیا ہوا کہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"کیسے مزے لے لے کر علی گڑھ کا ذکر ہو رہا ہے۔ اب بڑھاپا ہے یہ باتیں چھوڑ دو۔ اولاد جوان ہو گئی ہے۔" امّی غصّے میں بولیں۔

ابّا ہنس پڑے مگر میں کچھ نہ سمجھ پایا۔ "اس موئی کا خیال اب تو دل سے نکال دو!"

امّی کس موئی کا ذکر کر رہی تھیں میرے پلّے کچھ نہ پڑا۔ اسی وقت ابّا بولے۔ "ارے بھئی تو علی گڑھ گیا تھا تو کم سے کم کچھ تو ہی لیتا آتا اور کچھ نہیں تو مٹری کے بسکٹ ہی لے آتا۔"

"تم نہیں چھوڑو گے علی گڑھ کا تذکرہ!" امّی پھر بگڑیں۔

امّی کی مداخلت سے مجھے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ابّا کی گرفت سے بچ گیا ورنہ نہ جانے کہاں میرا جھوٹ پکڑا جاتا۔ میں ان دونوں کو نوک جھونک کرتے چھوڑ کر وہاں سے کھسک لیا۔

دوسرے دن میں جیسے ہی دفتر پہنچا، تیواڑی جی نے طلب کر لیا۔ میں اُن کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ بولے۔ "ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ بمبئی پولیس کے پاس ان غنڈوں کا ریکارڈ ضرور ہوگا۔ میں آج ہی بمبئی پولیس ہیڈ آفس کو تار دے رہا ہوں کہ انھیں گرفتار کر کے تمھارا؟"

ظاہر ہے کہ مجھے سر ہی ہلانا تھا سو ہلا دیا۔

اسی دن ان مجرموں کے حلیے اور نام بمبئی پولیس کو تار کے ذریعے اس ہدایت کے ساتھ بھیج دیے گئے کہ انھیں فوراً گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا جائے کیونکہ وہ دہلی پولیس کو مطلوب ہیں۔

پھر دوسرے ہی دن دفتر کا وقت ختم ہونے تک تار کا جواب مل گیا۔ بمبئی پولیس نے ان چاروں بلیک میلروں کو گرفتار کر لیا تھا اور بہت جلد انھیں دہلی بھیجنے والی تھی۔



ان چاروں کمبختوں نے مجھے بہت ستایا تھا۔ لڈے گھسیٹتے دیے تھے اس لیے ان کی گرفتاری کے بارے میں جان کر میں خوش ہو گیا۔ بڑی دھونس دھپڑ دیتے تھے، اب بتاؤں گا بدبختوں کو کہ اللہ دتا سے ٹکر لینے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اس دن میں اتنا خوش تھا کہ کمار کی لا پروا گستاخیاں بھی نظر انداز کر گیا۔

دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو رپورٹ ملی کہ راؤ بہادر کشوری لال کی بہن کملا، سیٹھ وشوا ناتھ سے ملی تھی۔ یہ واقعہ گزشتہ رات کا تھا۔ میں نے اپنے ماتحتوں کو احکام جاری کر دیے تھے کہ کملا اور سورج کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ اس دوران میں کملا تو سامنے آئی تھی مگر سورج، گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔ نہ جانے وہ ظالم کہاں "الوپ" ہو گئی تھی۔ اس رات کے بعد سورج کہیں نہیں دیکھی گئی تھی جس رات اس نے میرے کریا کرم کا بندوبست کرایا تھا۔ یہ بات میں نے اسی دن تیواڑی جی کے کان میں بھی ڈال دی۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں کسی بہانے سیٹھ وشوا ناتھ سے ملوں اور اس بارے میں پتا چلاؤں۔ میں نے اپنے ننھے منّے سے دماغ پر بڑا زور ڈالا مگر کوئی مناسب بہانہ سوجھ ہی نہ سکا۔ میں کھجانے لگا کہ ناحق تیواڑی جی سے یہ بات کہہ دی۔ اب اگر میں سیٹھ وشوا ناتھ سے نہ ملا تو خواہ مخواہ تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھوں کے پھڑپھڑانے کا ناخوشگوار نظارہ کرنا پڑے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں بہ مجبوری سرکاری موٹر سائیکل پر سوار ہو کر دفتر سے نکل ہی پڑا۔

تمام راستے میرا ذہن "بہانہ، بہانہ" کی گردان کرتا رہا اور اسی چکّر میں قرول باغ پہنچ گیا۔ مجھے علم تھا کہ گپتا اور کمال راؤ بہادر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، سیٹھ وشوا ناتھ، میرے ماتحت مجید اور پیارے لال ہنر کے حصّے میں ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اس وقت سیٹھ کی کوٹھی کے ارد گرد منڈلانا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا، لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لوں کہ وہ کہیں منڈلانے کی بجائے کسی مسجد میں تو نہیں سو رہے۔ یہ سوچ کر میں نے کوٹھی کی اطراف چکّر کاٹا مگر دونوں میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ ہو نہ ہو، وہ کمبخت کسی مسجد میں پڑے سستا رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ اب تک شاید ان کا واسطہ کسی ایسے افسر سے نہیں پڑا تھا جو اُن پر نظر رکھتا ہو۔ ویسے بھی جو دوسروں پر نظر رکھنے کے عادی رہے ہوں، ان پر کیسے نظر رکھی جا سکتی ہے مگر میرا مسئلہ مختلف تھا۔ جب میری موٹر سائیکل سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجید اور پیارے لال ہنر دونوں کی خبر لوں گا۔ ایک خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا کہ ارد گرد قریب موجود کسی مسجد کو تلاش کر کے وہاں ان میں سے کسی ایک کو رنگے ہاتھوں پکڑ لوں لیکن فی الحال میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے جیسے ہی موٹر سائیکل کھڑی کی ایک ملازم لپکتا ہوا میرے قریب آگیا۔ میں اسے اور وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیٹھ وشوا ناتھ کوٹھی میں موجود تھا مگر سورج کے بارے میں اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ملازم نے مجھے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھایا جہاں پہلے بھی میں کئی بار آچکا تھا۔

مجھے زیادہ دیر سیٹھ وشوا ناتھ کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس دوران میں مجھے ایک بہانہ سوجھ چکا تھا اور یہ بہانہ مجھے اس وقت سوجھا تھا جب سیٹھ کے ملازم سے بات کر رہا تھا۔ سورج، اس وقت

کوٹھی میں موجود نہیں تھی اس لیے یہ بہانہ چل سکتا تھا۔
"کیسے آنا ہوا انسپکٹر صاحب!" سیٹھ دشوا ناتھ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ بظاہر وہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر موجود تاثرات سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اسے میری آمد ناگوار ہوئی تھی۔
"دراصل مجھے آپ سے نہیں، سروج سے ملنا تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر موجود تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"سروج سے!" اس نے حیرت سے کہا۔ "وہ تو موجود نہیں ہے مگر آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"
"انھوں نے مجھ سے پانچ روپے اُدھار لیے تھے اور آج واپس دینے کا وعدہ کیا تھا۔"
"آپ سے سروج نے پانچ روپے اُدھار لیے تھے؟ کیا بکواس کر رہے ہیں آپ؟" سیٹھ دشوا ناتھ سخت اور غصیلے لہجے میں بولا۔
"جی ہاں، آدمی پر کبھی کبھی بُرا وقت پڑ جاتا ہے۔ دراصل کل ہوا یہ کہ وہ مجھے چاندنی چوک میں مل گئیں۔ انھوں نے مجھے دہی بڑے کھانے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ اب جو دہی بڑے کھا کر انھوں نے بٹوا کھولا تو اس میں پیسے نہیں تھے۔ انھیں دہی بڑے والے کے سامنے شرمندگی سے بچانے کے لیے میں نے پانچ روپے اُدھار دے دیے۔ ظاہر ہے کہ بُرے وقت میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آج اپنے روپے لے جاؤں۔"
سیٹھ دشوا ناتھ مجھے ہونٹ بھینچے گھورے جا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی میں خاموش ہوا وہ پھٹ پڑا۔ "انسپکٹر! میں تمھاری اس بدتمیزی کی شکایت تمھارے افسروں سے بھی کر سکتا ہوں، سمجھے!"
"لیکن اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے سیٹھ جی! میں اپنا قرض ہی تو واپس لینے آیا ہوں۔" میں نے سیٹھ کی گھن گرج کے جواب میں آہستہ سے کہا۔
"سنو! سروج کو شملہ گئے ہوئے آج تیسرا دن ہے پھر کل وہ تمھیں چاندنی چوک میں کہاں سے مل گئی؟" سیٹھ دشوا ناتھ نے مجھے گھورا۔ وہ غصے میں "آپ" سے "تم" پر اتر آیا تھا۔
"مگر آج کل تو بڑی سردی ہے۔ شملے میں ان کی قلفی جم جائے گی۔ وہ وہاں کیوں گئی ہیں؟" میں بولا۔
"بھاڑ جھونکنے!" سیٹھ دشوا ناتھ پھاڑ کھانے والے انداز میں تقریباً چیخ پڑا۔
"آپ کی دختر نیک اختر ہونے کے باوجود ان کا بھاڑ جھونکنا ذرا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا مگر ظاہر ہے کہ مجھے اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ ویسے بھی کسی پیشے میں کوئی عیب نہیں۔"

"تم یہاں سے خود دفع ہو رہے ہو یا میں تمھیں دھکے دے کر نکلوا دوں!" سیٹھ دشوا ناتھ کا پارہ چڑھتا ہی چلا گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ خواہ مخواہ اتنا غصہ کیوں کر رہا ہے۔
میرے وہاں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے رکنا فضول ہی تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔
"آئندہ تم ادھر کا رخ نہیں کرو گے!" دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے سیٹھ دشوا ناتھ کی آواز سنائی دی۔
میں نے مڑ کر سیٹھ کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور مجھے گھور رہا تھا۔ سیٹھ نے اس وقت میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لازماً کسی غیر قانونی حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ ان کاغذات میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس نے بلیک میلروں سے حاصل کیے تھے۔ بلیک میلر پکڑے جا چکے تھے اور اب بہت جلد سیٹھ کی پول بھی کھلنے والی تھی کیونکہ بلیک میلروں کو علم تھا کہ ان کاغذات میں کیا لکھا تھا اور سیٹھ بھی اس بات سے واقف تھا۔ میں نے سوچا، اگر اسے بتا دوں کہ بلیک میلر پکڑے جا چکے ہیں اور انھیں بہت جلد دہلی کے لیے "ریمانڈ" کیا جانے والا ہے تو سیٹھ کی ساری فوں فاں دھری رہ جائے گی۔ وہ بھیگی بلی نظر آنے لگے گا۔ یہ سوچ کر میں نے سیٹھ کو مخاطب کیا۔ "سیٹھ جی! اگر آپ کہیں تو میں آپ کی معلومات میں یہ اضافہ کر دوں کہ وہ بلیک میلر پکڑے جا چکے ہیں جن سے آپ کاغذات کا سودا کر رہے تھے۔"
سیٹھ دشوا ناتھ میری توقع کے مطابق واقعی اچھل پڑا، بالکل اسی طرح جیسے کھٹمل نے بہت زور سے کاٹ لیا ہو۔ "کک... کیا... کیا... انسپکٹر!" وہ ہکلایا۔
اب ہوا خراب ہوئی بیٹا! میں نے دل میں کہا۔ میں اسے مزید دہلانے کے لیے بولا۔ "بہت جلد بمبئی پولیس انھیں دہلی بھیجنے والی ہے۔"
"انسپکٹر... انسپکٹر اللہ دتا!... سنیے... یہاں آئیے... میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔ ذرا تفصیل سے بتائیے۔" وہ میری طرف بڑھتا ہوا بولا۔
"جی نہیں، میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔" میں اینٹھ گیا۔
"آپ بیٹھیں تو سہی انسپکٹر صاحب!" وہ نرمی و عاجزی سے بولا۔ "سروج نے آپ سے جو روپے اُدھار لیے تھے وہ تو لیتے جائیں۔"
"فری فنڈ" میں پانچ روپے کی آمدنی ہو رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر رک جانے میں حرج نہ سمجھا۔ پھر سیٹھ اور میں دوبارہ صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ہاں انسپکٹر! وہ آپ کیا کہہ رہے تھے؟" سیٹھ دشوا ناتھ نے مخاطب کیا۔
"کمبخت کا "کائیاں پن" ملاحظہ ہو!" میں نے سوچا۔ پانچ روپے دیتے نہیں کر رہا اور مفت میں سب کچھ پوچھے لے رہا ہے۔ میں نے بھی گولیاں نہیں کھیلیں بیٹا! پہلے پانچ روپے کھرے کروں گا پھر بتاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں بولا۔ "پانچ روپے سیٹھ جی!"
"ارے ہاں، وہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے پانچ روپے کی بجائے سو روپے کا کرارا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ کے پاس کھلا نہیں ہوگا اس لیے سو روپے ہی رکھ لیں۔ حساب کتاب پھر کبھی ہو جائے گا۔ یوں بھی آپ سے کیا حساب کتاب! رکھ لیں۔"
پانچ روپے کی بجائے سو روپے مل رہے تھے اس لیے میری باچھیں باہر آ ہی جانا چاہیے تھیں۔ میں نے سو کا نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا۔
"دہی بڑے کھائیں گے یا آلو چھولے؟" سیٹھ نے مجھے مزید خوش کرنے کی خاطر کہا۔
"آلو چھولے!" میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ "مرچیں ذرا تیز!"
سیٹھ نے وہیں سے نعرہ مار کے اپنے ایک ملازم کو میری پسندیدہ چیز لانے کا حکم دیا۔
میں اس دوران میں سیٹھ کی طرف سے غیر متوقع آؤ بھگت کو دیکھ کر کچھ کھٹک گیا تھا۔ اب مجھے کچھ کچھ احساس ہو چلا تھا کہ سیٹھ کا اکڑ فوں دور کرنے کے لیے میں نے اسے بلیک میلروں کے بارے میں بتا کر اچھا نہیں کیا مگر اب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ میرے لیے بس اب یہی ممکن تھا کہ انھیں مزید کھیت نہ چگنے دیتا۔
"ہاں تو وہ آپ بلیک میلروں کی گرفتاری کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ آخر وہ پکڑے کیسے گئے؟" سیٹھ پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔
"جس طرح سب مجرم پکڑے جاتے ہیں۔" میں نے "اڑن گھائی" بھری۔
"پھر بھی کچھ بتا تو چلیے!" سیٹھ پُراشتیاق لہجے میں بولا۔
"میں نے اپنے دفتر میں یہ بات سنی تھی بس مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔
اس نے شاید اندازہ لگا لیا کہ میں کچھ بتاتے ہوئے جھجک رہا ہوں۔ وہ بولا۔ "آپ مجھے اس سلسلے میں جو بات بھی بتائیں گے یقین کریں کہ میرے سوا کسی کو پتا نہیں چلے گی۔"
پھر آلو چھولے آنے تک سیٹھ مجھ پر بار بار "ڈورے" ڈالتا رہا کہ کسی طرح میں کچھ قبول دوں مگر میں آئیں بائیں شائیں اڑاتا رہا۔

اور کچھ بتا کر نہ دیا۔ آلو چھولے کھا کر میں نے دو گلاس پانی پیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ سیٹھ نے مجھے لاکھ روکنا چاہا مگر مزید رکنے کا مقصد اپنا دماغ چٹوانا ہی تھا اس لیے میں نے اس کی ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑا دی۔ چلتے چلتے سیٹھ نے مجھے آتے جاتے رہنے کے لیے کہا اور میں وعدہ کر کے وہاں سے چل لیا۔
میں نے واپسی میں ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا کہ شاید اب کوئی نظر آ جائے مگر میرے دونوں ماتحت غائب تھے۔
دفتر پہنچ کر میں سیدھا تیواڑی جی کے کمرے کی طرف ہو لیا۔ میں انھیں سروج کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ تیواڑی جی نے مجھے کچھ دیر بعد ہی اندر بلا لیا۔ تیواڑی جی اپنے کمرے میں اس وقت تنہا نہیں تھے۔ میں نے ان کے سامنے کرسی پر ایک نوجوان لڑکی کو بیٹھے ہوئے دیکھا، نوجوان اور حسین! جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا تھا، اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت تھیں جن میں عجیب سی حیرانی تھی۔ پہلی بار میں یہی سمجھا تھا کہ وہ حیرانی شاید میرا رُوئے زیبا دیکھ کر پیدا ہوئی ہے مگر بعد میں میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ حیرانی تو ان خوبصورت آنکھوں کا حصہ تھی۔ میں نے ایسی آنکھیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس عجیب سی حیرانی نے اس کی آنکھوں کے حسن کو بڑھا دیا تھا۔
"آؤ اللہ دتا!" تیواڑی جی نے مجھے مخاطب کیا۔ "میں تمھیں دو بار تمھارے کمرے میں دیکھوا چکا تھا۔ شاید تم سیٹھ دشوا ناتھ کی طرف گئے تھے۔"
"یس سر! میں وہیں سے آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر تیواڑی جی کے ہاتھ کا اشارہ پا کر اس لڑکی کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"خیر وہ بات بعد میں ہو گی۔" تیواڑی جی بولے۔ "تمھارے انتظار میں لیوسی کو بہت دیر ہو گئی ہے۔ اس کا وہاں سے زیادہ غائب رہنا مناسب نہیں۔"
"کہاں سے سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"صفدر علی بیگ کے دفتر سے!" تیواڑی جی نے جواب دیا۔
میں چونک پڑا۔ صفدر علی بیگ وہی تھا جس کا نام راؤ بہادر کشوری لال کے ساتھ ہی سامنے آیا تھا، انھی سرمایہ داروں میں سے ایک جو انگریزوں کے خلاف کام کرنے والی خفیہ تنظیم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ میرے علم میں اب تک یہ بات نہیں تھی کہ تیواڑی جی اس پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔
"لیوسی!" تیواڑی جی نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "یہ ہے انسپکٹر اللہ دتا۔" تیواڑی جی نے میری طرف اشارہ کیا۔
"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر ال... لا... دتا۔" لیوسی نے

میرے نام کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے میری طرف مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس دن اور اس وقت پہلی بار مجھے اپنا نام کچھ برا سا محسوس ہوا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی کسی عورت سے ہاتھ نہیں ملایا تھا اس لیے جب اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں کچھ گڑبڑا سا گیا مگر کسی نہ کسی طرح اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام ہی لیا۔

"اللہ دتا! جس کیس پر تم کام کر رہے ہو، لیوسی بھی اسی پر کام کر رہی ہے۔ یہ بھی تمھاری طرح انسپکٹر ہے۔ میں نے اسے صفدر علی بیگ کے پیچھے لگایا تھا۔ یہ صفدر علی بیگ کے دفتر میں ملازمت حاصل کر چکی ہے۔ میری ہدایت پر اس نے وہاں ایک آدمی کے لیے اور گنجائش نکال لی ہے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ کمار یا تمھارے کسی دوسرے ماتحت کو اس جگہ بھیجوں گا کیونکہ تم راؤ بہادر کشوری لال کے معاملے میں الجھے ہوئے تھے لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمھیں خود لیوسی کے ساتھ رہنا چاہیے۔" تیواڑی جی مجھے تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔ "لیوسی ہرچند کہ تمھاری ماتحت نہیں مگر تمھاری زیرِ نگرانی ہی اس کیس پر کام کرے گی۔"

"مجھے کب اور کہاں پہنچنا ہوگا سر؟" میں نے پوچھا۔

"صفدر علی بیگ کا دفتر کھاری باؤلی میں ہے۔" تیواڑی جی کی بجائے لیوسی نے جواب دیا۔ "آپ کل صبح نو بجے وہاں پہنچ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے صفدر علی بیگ کے دفتر کا محلِ وقوع سمجھایا، پھر بولی۔ "اب سمجھ گئے آپ؟"

"جی ہاں۔" میں نے سر ہلایا۔

"ہاں یہ اور سن لیجیے کہ وہاں میرا نام لیوسی نہیں، چمپا ہے۔" لڑکی نے بتلایا۔ "اور آپ میرے کزن ہیں۔"

لیوسی کا کزن بننا مجھے کچھ زیادہ بھلا نہ لگا مگر ظاہر ہے کہ میں اس پر احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔"

"تم نے صفدر علی بیگ کو اللہ دتا کا کیا نام بتایا ہے؟" تیواڑی جی نے لیوسی سے پوچھا۔

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "لیکن کل ضرور کوئی نام بتانا پڑے گا۔ ویسے میں نے رمیش سوچا تھا لیکن اب انھیں دیکھ کر سوچ رہی ہوں کہ کوئی اور نام ہونا چاہیے۔"

"کیوں؟" میں بول اٹھا۔ لیوسی کی مسکراہٹ مجھے عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔

"فضول باتیں نہیں!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔ "اب تم جاؤ لیوسی! تمھیں بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"او کے، سر!" لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اب بھی ... نگاہ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

لیوسی چلی گئی تو تیواڑی جی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولے۔ "لیوسی بڑی ذہین لڑکی ہے۔ ہرچند کہ وہ تمھارے ساتھ کام کر رہی ہے مگر تم اس پر حکم نہیں چلاؤ گے اور اس کے ... دھیان دو گے، سمجھے!" میں نے سر ہلا دیا تو تیواڑی جی نے ... سلگانے کے بعد ایک طویل کش لیا، پھر کہا۔ "ہاں اب بتاؤ ... چلا سورج کا؟"

"سیٹھ کا بیان ہے کہ وہ تین دن قبل شملے روانہ ہو چکا ... وہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑکیں مگر وہ ناراض نہیں تھے بلکہ مسکرا رہے تھے۔ "یہ بہت چالاک ہے زہ!" تیواڑی جی ... "جانتے ہو اس کا مطلب کیا ہوا؟"

میں کچھ جانتا تو بتاتا بھی اس لیے بغلیں جھانکنے کے ... کر سکا۔

"تم نرے گھامڑ ہو۔" تیواڑی جی میری طرف سے کوئی ... پاکر بولے۔ "ذرا ذہن پر زور نہیں دیتے۔ اس نے اپنی بیٹی ... سے اس لیے شملے بھیج دیا کہ اگر ہم براہِ راست اس پر ہاتھ ڈالیں تو بھی کچھ ثابت نہ کر پائیں۔ تمھیں سورج ہی نے پھنسایا تھا۔ بیان کی روشنی میں اگر کوئی قدم اٹھایا جاتا تو سیٹھ وشواناتھ ... دیتا کہ اس کی بیٹی دہلی میں تھی ہی نہیں۔ اب سمجھے!"

"سمجھ گیا سر!" میں نے کہا۔ میں واقعی سمجھ گیا تھا۔ میرے ... بعد سورج کے لیے خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

"ویسے تم نے سیٹھ سے یہ بات معلوم کیسے کی؟" تیواڑی ... سوال کیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جب انھیں حقیقت سے آگاہ ... خلافِ توقع زور سے ہنس پڑے۔ "تم بھی بس چیز ہو۔" ... نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے بھی دانت نکال دیے۔ میں سو روپے کے نوٹ ... کر گیا تھا اور یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ بلیک میلروں کی گرفتاری کے بارے میں بھی سیٹھ کو بتا چکا ہوں۔

اسی وقت چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ایک ... تیواڑی جی کو دیا۔ تیواڑی جی نے لفافہ پھاڑ کر اندر سے کاغذ نکالا ... اسے پڑھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "لو بھئی اللہ دتا! بمبئی نے ان چاروں بلیک میلروں کو آج صبح بمبئی سے دہلی کے لیے روانہ کر دیا گیا ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا سر!" میں خوش ہو کر بولا۔ "اب جا... نٹ جائے گا۔"

"خیر بغیر کسی ثبوت کے معاملہ تو نہیں نمٹے گا، ہاں یہ ضرور ہے کہ صورتِ حال واضح طور پر سامنے آ جائے گی۔" تیواڑی جی نے کہا۔

"ہاں سر! میں ایک بات تو پوچھنا بھول ہی گیا۔" میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "مجھے میک اپ میں وہاں جانا ہے یا..."

"نہیں، میک اپ کی ضرورت نہیں۔" تیواڑی جی میری بات کاٹ کر بولے۔ "ہاں یہ ضرور ہے کہ تمھیں مسلمان نظر نہیں آنا چاہیے۔ اس کے لیے لباس کافی ہے۔"

"تو سر! میں دھوتی باندھ کر جاؤں؟" میں نے دریافت کیا۔

"پینٹ اور شرٹ کافی ہے۔ ہندو مسلمان دونوں ہی یہ لباس پہنتے ہیں۔ دھوتی کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں۔" تیواڑی جی نے جواب دیا۔ "جو لباس اس وقت پہنے ہوئے ہو، یہ بھی چلے گا۔"

"بہتر ہے سر!" میں نے کہا۔ "اب میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں جاؤ۔" تیواڑی جی نے جانے کی اجازت دے دی۔

تیواڑی جی کے کمرے سے نکل کر میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میرا ذہن لیوسی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ اس کیس پر کام کر رہی تھی جس سے میں پہلے ناواقف تھا۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ جیت گڑھی کی پہاڑی کے اس غار سے مجھے فرار کرانے والی وہ پراسرار عورت لیوسی بھی تو ہو سکتی تھی پھر خود ہی مجھے اپنا یہ خیال زیادہ صحیح معلوم نہ ہوا۔ بھلا لیوسی وہاں کیسے پہنچ سکتی تھی اور اگر اس نے ایسا کیا بھی تھا تو یہ بات اب تک تیواڑی جی کے علم میں آ چکی ہوتی۔ تیواڑی جی مجھ سے جواب طلب کر سکتے تھے، میں نے انھیں یہ کیوں نہیں بتایا کہ مجھے دشمنوں کی قید سے فرار کرانے میں ایک عورت کا ہاتھ تھا، میری کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ یہی سوچتا ہوا میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

"سر تیواڑی جی دو بار آپ کو بلوا چکے ہیں بلکہ طلب کر چکے ہیں۔" جیسے ہی میں کمرے میں پہنچا، کمار کی منحوس آواز سنائی دی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے شانِ افسرانہ سے کہا اور اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

"تو یہ کریں کہ فوراً ان سے مل لیں ورنہ جھاڑ پڑے گی۔" کمار نے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا۔

"زبان سنبھال کر، سمجھے!" میں نے پلٹ کر کمار کو گھورا۔ "[illegible] تم کون، قاضی کہ شیخ؟"

کمار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ ڈھیٹ یوں مسکرا رہا تھا جیسے میں نے اسے ڈانٹنے کی بجائے اظہارِ محبت کیا ہو۔ پورا چکنا گھڑا تھا کمبخت! میرا بس چلتا تو اس کی مسکراہٹ پر پابندی عائد کر دیتا اور اسی کے ساتھ دفتر میں بڑا بڑا لکھوا دیتا کہ دفتری اوقات میں مسکرانا قطعی منع ہے مگر مصیبت تو یہ ہے، دفتری قوانین ایسے لوگ بناتے ہیں جنھیں خود براہِ راست اس طرح کے حالات سے سابقہ نہیں پڑتا۔

میں اس کی مسکراہٹ کا زہر پی کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور اسی وقت اس نے مخصوص انداز میں گردن ہلائی، گردن ہی کے ساتھ اس کے ہونٹ بھی ہلے۔ "اچھا، اب میں سمجھا۔ آپ یقیناً تیواڑی جی کے پاس سے ہو کر آ رہے ہیں ورنہ طلبی کے بارے میں سن کر سرپٹ دوڑ لیتے۔"

اس نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا مگر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ہرگز نہیں! تمھارا خیال بالکل غلط ہے۔"

اس وقت کمار نے ڈانٹ کھا کر نہ جانے کیوں زیادہ منہ ماری نہیں کی ورنہ وہ اتنی جلدی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میرا ذہن ایک بار پھر لیوسی کی طرف، پھر لیوسی کے بعد صفدر علی بیگ کی جانب منتقل ہو گیا۔ میں نے اس فائل کا اب تک تفصیلی مطالعہ نہیں کیا تھا جو بعد میں تیواڑی جی نے دی تھی۔ اس فائل میں راؤ بہادر کشوری لال اور صفدر علی بیگ کے متعلق تمام تفصیلات موجود تھیں۔ مجھے آئندہ روز صبح صفدر علی بیگ کے دفتر پہنچنا تھا اس لیے ضروری تھا کہ میں صفدر علی بیگ کے بارے میں ضروری باتوں سے آگاہ ہو جاؤں۔ یہ سوچ کر میں نے میز کی دراز سے مطلوبہ فائل نکالی اور کھول کر پڑھنے لگا۔

تفصیلات کے مطابق صفدر علی بیگ کی عمر تقریباً چالیس سال تھی مگر اچھی صحت کے سبب وہ کچھ کم عمر کا نظر آتا تھا۔ انگریز سرکاری افسران کی بیگمات میں وہ خاصا مقبول اور پسندیدہ تھا۔ چھ عدد بچوں کا تنہا باپ ہونے کے باوجود رنگین مزاج آدمی تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں جن میں سے ایک چار بچوں کی ماں تھی اور دوسری بیوی کے دو بچے تھے۔ دونوں بیویاں الگ الگ رہتی تھیں۔ صفدر علی بیگ ان دونوں کے درمیان اس طرح انصاف قائم کیے ہوئے تھا کہ ایک ہفتہ ایک بیوی کے پاس گزارتا اور دوسرا ہفتہ دوسری کے پاس۔ صفدر علی بیگ کی ایک کوٹھی پل بنگش میں تھی اور دوسری کوٹھی ترکمان گیٹ میں لیکن ان دونوں کوٹھیوں کے علاوہ اس کے پاس ایک کوٹھی اور تھی، تیسری کوٹھی! یہ تیسری کوٹھی سرائے خلیل میں تھی۔ اس تیسری کوٹھی کا علم شاید بقیہ کوٹھیوں والیوں کو نہیں تھا کیونکہ یہاں صفدر علی بیگ اپنی "تیسری بیویوں" کے ساتھ انصاف کیا کرتا تھا۔ پل بنگش والی بیوی سمجھتی کہ صفدر علی بیگ ترکمان گیٹ والی کے کولھوں سے لگا بیٹھا ہوگا، ترکمان گیٹ والی سمجھتی کہ پل بنگش والی کے یہاں اس نے رات گزاری ہوگی اور صفدر علی بیگ ان دونوں کو چھوڑ کر تیسری کوٹھی میں "تیسریوں" کا حق ادا کر رہا ہوتا۔ تو یہ تھا صفدر علی بیگ! اس کا دفتر کھاری باؤلی میں تھا۔ اس کا کاروبار درآمدات تھا، غیر ملکی سامان کی ہندوستان میں کھپت! اسی لیے انگریز افسران اور خصوصاً ان کی بیگمات سے وہ بڑے اچھے تعلقات رکھتا تھا کہ اس کا کوئی کام کسی مرحلے

بھر بھی نے یں آذری اپنے مقصد میں کامیاب تھا۔

صفدر علی بیگ کے بارے میں تمام تفصیلات جان کر مجھے بڑی حیرت تھی۔ بھلا اس جیسے عیاش اور کاروباری شخص کو کیا پڑی تھی کہ وہ حکومت کے خلاف کام کرنے والی کسی خفیہ تنظیم کی پشت پناہی کرتا۔ یہ بات ہر چند کہ میرے گھٹ میں اترنہیں دے رہی تھی مگر میں نے اتاری۔ میں فائل بند کر کے میز کی دراز میں رکھ ہی رہا تھا کہ "قضائے مُبرم" آ ٹپکا اور اس کے ٹپکنے کی آواز "آداب عرض سرکار!" کے ساتھ شروع ہوئی۔

"وانیکم آداب!" مجھے کہنا ہی پڑا کیونکہ وہ تقریباً میرے سر پر سوار تھا۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا "کہاں سے آرہے ہو؟"

"بندۂ ناچیز اپنے فرائض کی تکمیل کر کے براہِ راست . . ."

"اِدھر اُدھر کی نہ ہانکو!" میں نے میز پر ہاتھ مار کر اُسے دھمکایا "میرے سوال کا جواب دو!"

"بندے نے وہی تو عرض کیا حضور!" وہ کسی قدر جھک کر بولا۔ اس کے چشمے کا فریم شاید ڈھیلا تھا۔ جھکنے کے سبب چشمہ میری میز پر گر پڑا۔

"ارے!" اس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر وہ اندھوں کی طرح میز پر ہاتھ پھیرنے لگا حالانکہ چشمہ سامنے ہی پڑا تھا۔ چشمے کے بغیر شاید اُسے بہت کم نظر آتا تھا۔

"اگر کوئی تمہارا چشمہ اتار کر تمہاری پٹائی لگانا شروع کر دے تو بعد میں تم اُسے شاید بالکل نہ پہچان سکو گے۔" میں نے اس کا مذاق اُڑایا۔

"نصیبِ دشمناں حضور یہ کیا بد فال اپنی زبانِ مبارک سے نکالی . . . مل گیا۔" اس نے فقرہ اُدھورا چھوڑ کر چشمے کو اس طرح پکڑا جیسے وہ بھاگ جائے گا، پھر جلدی سے چشمہ ناک پر جما کر بولا "اب فرمائیے!"

میں نے اپنا سوال دُہرایا اور اس نے جواب میں لفظ بہ لفظ وہی کہا جو پہلے کہہ چکا تھا۔ اس بار میں اپنے ذہن پر زور ڈال کر سمجھ ہی گیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"حضور! خادم پر دروغ گوئی کا الزام لگا رہے ہیں۔" اس نے رونی صورت بنالی جیسے اس کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی ہو۔

"تم کس مسجد میں سو رہے تھے؟" میں نے اُسے گھور کر پوچھا۔

"حضور شاید آگاہ نہیں کہ بندہ سیّد زادہ نہیں برہمن زادہ ہے۔" وہ مُنہ بنا کر بولا۔

"تو کیا ہوا تم کوئی بھی زادے ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!"

"گستاخی معاف حضور! بندہ صرف اور صرف برہمن زادہ ہے ورنہ 'زادہ' کے ساتھ اور بہت سی ایسی تراکیب بھی بن سکتی ہیں جن سے ابتذال کا احتمال ہو سکتا ہے۔" اس نے پُر زور لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو!" میں جھنجلا کر بولا۔

"سر! پیارے لال جی کی مراد حرام زادہ وغیرہ سے ہے۔" کمار نے مسکرا کر پیارے لال مہتر کی بات سمجھانا چاہی۔

"حرام زادہ!" میں بھڑک اٹھا "انھوں نے حرام زادہ کسے کہا؟"

"پتا نہیں سر! یہ تو پیارے لال جی ہی بتا سکتے ہیں۔" کمار نے کندھے اُچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"اے برادرِ من!" پیارے لال مہتر، کمار کی طرف گھوم گیا "غلط فہمی پیدا نہ کرو۔ حضور یوں ہی برافروختہ ہیں۔"

"دیکھیے سر! اب آپ کو پیارے لال جی، برافروختہ کہہ رہے ہیں۔" کمار اس طرح بولا جیسے پیارے لال مہتر نے مجھے موٹی سی گالی دی ہو۔

"کیوں بھئی تم نے مجھے بُرا فروختہ کیوں کہا۔ بتاؤ کیوں کہا؟"

"بُرا فروختہ نہیں سرکار! خادم نے بَرافروختہ کہا ہے۔" پیارے لال بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "کیوں ناحق زبان کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں حضور!"

"اگر اب تم نے مجھے بُرا فروختہ یا بَرا فروختہ کہا تو میں تمہارے گلے پر چھری پھیر دوں گا، سمجھے!" میں نے برہم ہو کر کہا۔ پھر کمار کو مخاطب کیا "اس کا مطلب کیا ہے؟"

"سر! بُرا فروختہ کا مطلب ہے، وہ بُرا آدمی جسے فروخت کر دیا گیا ہو۔" کمار نے مطلب بیان کیا۔

"بھگوان کے لیے برادرِ من! مزید میرے صبر کا امتحان نہ لو!" پیارے لال مہتر، کمار کی طرف دیکھ کر گڑگڑایا۔

"کیوں بھئی میں بکاؤ مال ہوں، بولو؟" میں نے ایک بار پھر میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ مجھے "بُرا فروختہ" کا مطلب سُن کر واقعی غصہ آگیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ ناہنجار پہلے بھی یقیناً اپنی جناتی زبان میں مجھے اسی طرح گالیاں دیتا رہا ہو گا۔

کمار کو شاید اس کی حالت پر رحم آگیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سر! دراصل غلطی میری ہی ہے۔ پیارے لال جی نے بُرا فروختہ نہیں بَرافروختہ کہا ہو گا اور غلطی سے میں نے بَرا کو بُرا سمجھ . . ."

"بالکل . . . بالکل حضور!" پیارے لال مہتر جلدی سے بولا "خادم نے بُرا نہیں بَرا ہی کہا تھا۔"

"پھر اس 'بَرا' کا کیا مطلب ہے؟" میں نے سختی سے دریافت کیا۔

"سر! بُرا فروختہ کا تو وہی مطلب ہے جو میں نے پہلے بتایا تھا مگر بَرافروختہ کا مطلب بالکل مختلف ہے۔" کمار پُرسکون لہجے میں مسکرا کر بولا اور اسی کے ساتھ اس نے پیارے لال مہتر کو نہ جانے کیوں آنکھ مار دی پھر جلدی سے کہا "بَرافروختہ، مہربان آدمی کو کہتے ہیں۔"

"جی . . . جی ہاں . . . جی ہاں حضور!" پیارے لال مہتر نے فوراً

. . . کمار نے تمہیں ابھی آنکھ کیوں ماری تھی؟" میں نے اُسے گھورتے . . .

. . . ا۔

مجھے . . . مجھے حضور!" پیارے لال مہتر گڑبڑا گیا۔

اور کیا مجھے!" میں نے آنکھیں نکالیں۔

جی ہاں سر! میں نے آپ ہی کو آنکھ ماری تھی۔ درمیان میں پیارے . . . گئے۔" کمار مسکرا کر بولا۔

کیا؟" میں گرم ہو گیا "تم نے مجھے کیوں آنکھ ماری تھی؟"

سر! آنکھ ہی تو ماری تھی، کوئی پتھر تو نہیں۔"

آئندہ تم ہرگز دفتری اوقات میں آنکھ نہیں مارو گے۔" میں نے . . . کی۔

دراصل سر! میں نے بہت دن سے کسی کو آنکھ نہیں ماری تھی۔ سوچا کہیں آنکھ مارنا ہی نہ بھول جاؤں اس لیے ریہرسل کر رہا . . . سر! کیا میں دفتری اوقات کے علاوہ آپ کو آنکھ مار سکتا ہوں؟ صرف دفتری اوقات میں آنکھ مارنے کے لیے منع کیا ہے نا!" کمار مسکراتے ہوئے بولا۔

ہرگز نہیں!" میں نے سختی سے جواب دیا۔ "نہ تم مجھے دفتری اوقات میں مارو گے نہ اس کے بعد! میں تمہارا افسر ہوں، دوست نہیں، سمجھے!"

بالکل سمجھ گیا سر!" کمار نے یقین دلایا۔ "آئندہ آنکھ مارتے ہوئے اس بات کا پورا خیال رکھوں گا کہ نشانے پر آپ نہ ہوں۔"

خادم اب اجازت چاہے گا حضور!" پیارے لال مہتر نے موقع غنیمت دیکھ کر لینا چاہا۔

دفع ہو جاؤ!" میں ہاتھ اٹھا کر چیخا، پھر فوراً مجھے خیال آیا کہ ابھی . . . اس کا جواب تو طلب کیا ہی نہیں۔ وہ جان چھڑا کر جانے کے لیے . . . اٹھا کہ میں نے کہا "ٹھہرو!"

جی حضور حکم!" وہ مڑ کر بھیگی بلی بن گیا۔

آج دن کے وقت تمہیں ہی سیٹھ وشوا ناتھ کی کوٹھی کے گرد . . . تھا؟" میں نے پوچھا۔

حضور گستاخی معاف! لفظِ منڈلانا پرندوں کے لیے مخصوص ہے . . . منڈلاتے ہیں اور حضور کے علم میں ہے کہ خادم کوئی پرند نہیں، انسان . . . پیارے لال مہتر پھر اپنی اصلیت پر اُتر آیا۔

تم پرند ہو کہ چرند مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم . . ."

جی حضور! کیا فرمایا، چرند؟" وہ میری بات کاٹ کر بولا "یہ تو . . . میرے نسب پر حملہ فرما رہے ہیں۔"

بکومت! میرے سوال کا جواب دو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

حضور بطریقِ احسن بھی استفسار فرما سکتے ہیں۔" پیارے لال مہتر . . . منایا۔

"تم نے پھر گالیاں دینا شروع کر دیں!" میں نے اس کی بات نہ سمجھ کر اُسے ڈانٹا۔ میرے پلّے کچھ بھی نہ پڑا تھا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

"جی . . . جی . . . بھگوان نہ کرے کہ خادم اس قدر گستاخی کا مرتکب ہو۔" وہ اپنے دونوں گالوں پر طمانچے مارتا ہوا بولا۔

مجھ پر اب جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ اس ناہنجار سے ذرا سی بات معلوم کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے اس لیے کمار کو مخاطب کیا۔

"کمار! اس سے پوچھو کہ یہ آج دوپہر ڈیوٹی پر کیوں نہیں تھا؟" پھر میں نے پیارے لال مہتر سے کہا "جاؤ اسے بتاؤ کہ تم دوپہر کے وقت کہاں تھے؟"

پیارے لال نے بھی یہی غنیمت جانا کہ کمار کو اپنا ترجمان بنا لے۔ میں نے کمار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی، شرارت آمیز مسکراہٹ! پیارے لال مہتر اپنے ڈیل ڈول سمیت، چشمہ سنبھالتا ہوا اس کرسی میں جا کر دھنس گیا جو کمار کی میز کے سامنے پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ پیارے لال مہتر ہولے ہولے کچھ منک رہا ہے اور کمار سر ہلا رہا ہے۔

جب ان دونوں کو منکتے اور سر ہلاتے ہوئے کافی دیر ہو گئی پھر میرے کانوں تک "سبحان اللہ" اور "واہ واہ" کی آوازیں پہنچیں تو میں برداشت نہ کر پایا۔ میں نے بلند آواز میں انھیں مخاطب کیا "یہ تم لوگ سرکاری باتیں کر رہے ہو یا طلسم ہوشربا شروع کر دی ہے؟"

"سر! سرکاری باتیں تو بہت دیر ہوئی ختم ہو چکی ہیں۔" کمار نے جواب دیا "اب تو پیارے لال جی مجھے اپنا نیا سہ غزلہ سُنا رہے ہیں۔"

"یہ سہ غزلہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سرکاری نہیں ہوتا سر! اس لیے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" کمار نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا تو یہ تم لوگ دفتری اوقات میں غیر سرکاری باتیں کر رہے ہو، کیوں؟" میں سخت لہجے میں بولا۔

"سر! اشعار کو باتیں کہہ کر کیوں بد ذوقی کا ثبوت دے رہے ہیں!" کمار نے کہا، پھر پیارے لال مہتر سے مخاطب ہو گیا "جی حضور ارشاد!"

"خاموش!" میں دہاڑا "خبردار جو اب تم دونوں نے کوئی غزلہ وزلہ بکا!" یہ کہہ کر غصّے کے عالم میں میں کُرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کمبخت میری موجودگی میں یہ حرکت کر رہے تھے۔ میں بھلا کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ سرکاری وقت کو وہ اس طرح ضائع کریں۔

"اچھا پیارے لال جی! پھر کبھی سہی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ باذوق لوگ دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔" کمار نے ٹھنڈا سانس بھر کر پیارے لال مہتر سے کہا۔

"بجا فرمایا برادرِ من!" پیارے لال مہتر نے اپنا بھٹا سا سَر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا "یار زندہ صحبت باقی!"

"تم نے میری طرف سے جواب طلب کر لیا؟" میں نے پیارے لال مہتر

کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"جی ہاں سر!" کمار نے جواب دیا۔ "پیارے لال جی دن بھر وہیں رہے تھے۔"

"پھر یہ مجھے نظر کیوں نہیں آیا وہاں؟"

"ہو سکتا ہے سر کہ پیارے لال جی کی طرح آپ کی نظر بھی کمزور ہو گئی ہو۔"

"خاموش!" میں چیخ پڑا اور اس دوران میں پیارے لال سنہر وہاں سے ٹل لیا۔

"بہتر ہے سر! اب خاموش رہوں گا۔ ویسے آپ ہی مجھ سے گفتگو کر رہے تھے۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ آپ سے بات کر کے خواہ مخواہ اپنا موڈ خراب کرتا۔" کمار نے بظاہر منہ بنایا مگر مسکراہٹ اب بھی ہونٹوں پر تھی۔

"میں تم سے جتنی بات پوچھا کروں، اتنی بات کیا کرو! نہ کم نہ زیادہ سمجھے!" میں نے بات بگڑتے دیکھ کر کہا کیونکہ میں بہرحال یہ جاننا چاہتا تھا کہ پیارے لال سنہر اس وقت وہاں تھا یا نہیں۔ میں اس واقعے کو بنیاد بنا کر اور اسے پیارے لال سنہر کی نااہلی کے ثبوت میں نیواڑی جی کے سامنے پیش کر کے اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

"سر! اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ آپ مجھے خاموش رہنے کا حکم دے چکے ہیں۔" کمار اڑیل گھوڑا بن گیا۔

"اور اب میں ہی تمہیں بولنے کا حکم دے رہا ہوں۔" میں تند لہجے میں بولا۔

"آپ اپنے کسی ایک حکم پر قائم کیوں نہیں رہتے سر؟"

"اس لیے کہ میں تمہاری طرح اڑیل ٹٹو نہیں ہوں۔" دل کی بات میری زبان پر آ گئی۔

"معاف کیجیے گا سر! آپ عموماً ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔"

"تم احمق ہو۔ بھلا باتوں کا بھی سر یا پیر ہوتا ہے۔ باتیں تو بس باتیں ہوتی ہیں۔ ہاں بتاؤ، کیا جواب دیا تھا اس نے؟" میں پھر مطلب کی بات پر آ گیا۔

"آپ کو پتا ہے سر کہ یہ خفیہ کا محکمہ ہے۔ اس اعتبار سے ہم لوگ خفیہ ہوئے۔ اگر ہم خفیہ لوگ یوں نظر آنے لگیں تو کام نہ بگڑ جائے۔"

"مگر میں بھی تو خفیہ لوگوں میں ہوں۔ خفیہ کو تو دوسرا خفیہ نظر آنا چاہیے۔" میں نے دلیل پیش کی۔

"کبھی کبھی جب زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے سر! تو ایک خفیہ کو دوسرا خفیہ نظر نہیں آتا۔" کمار نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"تو وہ مسجد میں جا کر نہیں سویا تھا؟" میں نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ ہی لیا حالانکہ کمار کی باتوں نے مجھے بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

"وہ بھی میری طرح ہندو ہے سر! پھر وہ مسجد میں کیسے سو سکتا ہے!"

"ہاں تم درست کہہ رہے ہو۔" کمار کی بات نے مجھے طرح مطمئن کر دیا۔ اس کی یہ دلیل میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ لگتا تھا کہ میرے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آ گئی۔ خواہ مخواہ دیر تک مغز ماری کرنا پڑی۔ کمار کی اس دلیل سے میں ... تھا اسی لیے یہ سوچنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ دنیا میں سونے کے لیے مسجد کے علاوہ بھی اور بہت سے ٹھکانے ہیں۔ میں نے ... لمحے توقف کے بعد پھر مخاطب کیا۔ "اس سے ... اب نظر آیا کرے، کم از کم خفیہ لوگوں کو تو نظر آ ہی جایا کرے۔ بھی کیا احتیاط!"

"ٹھیک ہے سر! میں اسے آئندہ کے لیے یہ تاکید کر ... ویسے آپ کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ اپنی آنکھیں کسی ڈاکٹر ... ہی لیں۔ کیا خبر نظر کمزور ہو گئی ہو...؟"

"چو... او... پ!" میں نے "چپ" کو حتی المقدور کھینچ ... واقعی چپ ہو جائے اور میری مراد پوری ہو ہی گئی۔ اس کی ... بکبک بند ہو گئی تھی۔

دفتر کا وقت ختم ہو گیا تو میں گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ دفتری موٹر سائیکل دانستہ نہیں لی تھی کیونکہ مجھے دوسرے دن ... بے روزگار نوجوان کا پارٹ ادا کرنا تھا اور اتنی عقل مجھ میں ... بے روزگاروں کے پاس موٹر سائیکلیں اور موٹریں نہیں ہوتیں ... میں دفتر سے پیدل ہی ٹہلتا ہوا تانگے کے اڈے کی طرف ... دیا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں اڈے پر پہنچا ... مگر ایک "بلڈوزر" کو اپنی طرف لڑھکتے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے ... دیکھ کر پہلے میرے پیروں تلے سے جوتا نکلا، پھر زمین نکلی کیونکہ ... میرے پیروں کے درمیان جوتا تھا اس لیے نکلنے میں بہرحال ... ہی کو کرنا چاہیے تھی۔

"شنکر!" "بلڈوزر" ہاتھی کی طرح چنگھاڑتا ہوا مجھے ... میں نے فرار ہونے کے لیے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سامنے ... تانگا کھڑا تھا جو بس چلنے ہی والا تھا۔ میں اچھل کر اس میں سوار ... تانگے کی پچھلی نشست پر پہلے ہی تین سواریاں موجود تھیں۔ میرے ... ہوتے ہی تانگا الار ہو گیا اور تانگے والے نے فوراً لگام کھینچ کر ... کو چلنے سے روک دیا ورنہ تانگا پلٹ ہی جاتا۔ وہ تینوں سواریاں ... الار ہوتے ہی ایک دم چیخی تھیں اور تانگے والے کے منہ سے بھی ... فوارہ چھوٹ پڑا تھا کیونکہ تانگا الار ہونے کے سبب اس کا ... بڑی زور سے زمین کے ساتھ ٹکرایا تھا۔

... شنکر! پھر مجھے... اپنی پارو کو چھوڑ کر بھاگ گئے ... "بلڈوزر" ہانپتا ہوا اب تانگے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ... ابے اتر نیچے حرامزادے! ابھی سب کو مروا دیا ہوتا۔" ایک ... نے مجھے تانگے سے نیچے دھکا دے دیا۔ ... مجھے توقع نہیں تھی کہ اچانک میرے ساتھ ایسی ناشائستہ حرکت ... مجھے تانگے سے دھکا دے دیا جائے گا اس لیے میں ... توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ "بلڈوزر" تانگے کے قریب پہنچ چکا ... میں اسی پر گرا۔ "بلڈوزر" "ہائے رام" کہہ کر لمبا لمبا ہو گیا اور ... میں "بلڈوزر" ہی پر لمبا ہوا ہوں گا۔ ... وہاں بھیڑ لگ گئی۔ میں تو فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ... "بلڈوزر" ابھی زمین ... میں جکڑا ہوا تھا مگر ... استراحت فرما رہا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اسے اٹھانے کی کوشش ... زمین پر لڑھک جاتا۔

"... ابے بتا، یہ کیا حرکت کر دی تھی تو نے!" تانگے والے نے ... گریبان کو جھٹکا دیا جسے وہ پہلے ہی تانگے میں پکڑ چکا تھا۔

"... میں... مجھے... مجھے تو جامع مسجد جانا تھا پیارے... بھا..." میں نے بمشکل کہا۔

"تو تیرے دیدے پھوٹ گئے تھے کیا؟ تو نے دیکھا نہیں ... پوری ہیں سواریاں؟ اگر تانگا لوٹ جاتا تو؟"

"مجھے... مجھے ذرا جلدی... جلدی جانا تھا وہاں اس لیے...!"

"جلدی جانا تھا لاٹ صاحب کو!" تانگے والے نے حقارت ... "سالے اب کبھی میں نے تجھے ادھر دیکھ لیا تو سر پھوڑ دوں ..." پھر اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر میرا گریبان چھوڑ دیا۔ ظاہر ... میں گالی کا کیا جواب دیتا۔ گالی دینے سے خود اس کا منہ گندا ... ہو رہا تھا، میں کیوں اپنا منہ گندا کرتا۔ میری امی نے بتایا تھا کہ جو ... دیتا ہے، اس کا منہ گندا ہو جاتا ہے۔

"کیا ہوا بھئی، کیا ہوا؟" کسی شخص نے تانگے والے کو مخاطب ... تانگے پر سوار ہونے والا تھا۔ وہ شاید ابھی ابھی اڈے پر ... تھا۔

"میاں ہونا کیا تھا۔" وہ میری طرف انگلی اٹھاتا ہوا بولا۔ "یہ ... کھڑا تھا، پتا نہیں شیطان نے اس کے ساتھ کیا حرکت ... کہ کھٹ اچھلا اور میرے تانگے میں آ پڑا۔"

تانگے والے کا جواب سن کر وہ شخص زور سے ہنس پڑا اور ... موجود دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ میں ان پگلوں کو حیرت ... دیکھنے لگا جو بے بات ہنسنے لگے تھے۔ میری دانست میں تانگے ... والے نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو وہ دانت نکال لیتے۔

اس دوران میں پتا نہیں خود یا کسی کی مدد سے وہ "بلڈوزر" زمین ...

ایک بار فرار ہونے کی کوشش کا نتیجہ دیکھ چکا تھا اس لیے اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"کیوں بے اپنی لگائی کو چھوڑ کر کہاں بھاگا جا رہا تھا؟" کسی نے اسی وقت میری گدی سہلائی۔ وہ شخص شاید اس "بلڈوزر" کی ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں سن کر ہی مجھے اس کا مفرور شوہر سمجھ بیٹھا تھا اور اب مجھے نصیحت فرمانے کا نیک کام انجام دے رہا تھا۔

اتنے ہی میں "بلڈوزر" میرے قریب پہنچ گیا۔ مجھے حیرت تھی تو یہ کہ اس ظالم نے مجھے اتنے دن بعد پہچان کیسے لیا اور وہ بھی قمیص پینٹ میں! مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میری اور اس کی جب ملاقات ہوئی تھی تو میں دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ رہا میرا سوال کہ میں اسے کیسے پہچان گیا تھا تو یہ سیدھی سی بات تھی۔ اس جیسی ساری دلی بھر میں دو تین ہی ہوں گی۔ وہ بھولنے والی "چیز" نہیں تھی۔

"شنکر پیارے! آخر جاگ اٹھے نہ بھاگ ہمارے! اسی جیون میں ملن ہو گیا ورنہ میں تو سمجھی تھی اب اگلے جنم میں ملن ہو گا۔" وہ میرے قریب آ کر چنگھاڑی۔ اس کمبخت کو اردگرد موجود لوگوں کی بھی پروا نہیں تھی۔ اس کی آواز بھی جسم ہی کی طرح موٹی اور بھاری تھی۔

لوگ ہنسنے لگے اور میں شرمانے لگا مگر وہ بے غیرت سرعام اظہارِ عشق سے باز نہیں آ رہی تھی۔ اب اس نے اپنا مگدر جیسا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈالنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

"تم جا کہاں رہی تھیں پاروتی؟" میں نے بمشکل اس سے پوچھا تاکہ اپنی جان جلدی سے چھڑا کر بھاگ سکوں۔

"اب تم مل گئے ہو شنکر! اب بھلا میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ تمہی کہیں لے چلو مجھے!" اس نے کھلے عام دعوتِ وصل دی۔

"سبحان اللہ!" کسی من چلے نے فقرہ کسا۔

"ابے لے جا نا کہیں!" کوئی دوسرا ہنکارا۔

"دانہ ہے دانہ، عیش آ جائیں گے۔" کسی تیسرے نے مشورہ دیا۔

"تم ان لوگوں کی باتیں سن رہی ہو پاروتی!" میں رو دینے والے لہجے میں بولا۔

"ہاں شنکر!" اس نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "دنیا والے تو دو پریمیوں کو ملتے دیکھ کر اسی طرح باتیں بناتے ہیں، جلتے ہیں۔"

لوگوں نے مجھے اور اسے تماشا بنا لیا تھا اور مستقل فقرے بازی کر رہے تھے اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پاروتی کو لے کر وہاں سے کہیں ٹہل لوں۔ یہ سوچ کر میں نے اسے مخاطب کیا۔

"پاروتی! آؤ چلیں۔ یہاں بہت لوگ جمع ہو گئے ہیں۔"

بس اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ وہ میرے ساتھ ہو لی۔ نہ اس نے یہ پوچھا کہ میں اسے کیوں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں اور نہ یہ کہ کہاں لے جا رہا ہوں۔ وہ کسی ایسی شریف بھینس کی طرح ساتھ ساتھ چل دی جو ذرا بھی سینگ مارنے کی قائل نہ ہو۔ میں اسے ساتھ ساتھ لیے جلدی سے سڑک پار کر کے ایک گلی میں گھس گیا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ جلد از جلد لوگوں کی نظروں سے دور ہو جاؤں۔ میں جب تک لوگوں کو نظر آتا رہا وہ مجھ پر لفظوں کے پتھر برساتے رہے۔ اب تک میں نے اسے صرف اس لیے برداشت کیا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا مگر گلی میں پہنچتے ہی میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔

"کون ہے تو؟ میرے پیچھے کیوں لگ گئی ہے؟" میں نے اسے سرے سے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا۔

"ہائے رام! یہ تمھیں کیا ہوا شنکر! اپنی پارو سے ایسی باتیں کر رہے ہو!" اس نے رخساروں کی چربی میں دبی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے پھیلائیں۔

"میرا نام شنکر ونکر نہیں، اللہ دتا ہے، سمجھی پاگل کہیں کی!" میں نے آنکھیں نکالیں مگر وہ بھلا کہاں ڈرنے والی تھی۔

"تو پھر کیا میں سپنا دیکھ رہی ہوں! کیا تم وہ دن بھول گئے شنکر! جب... جب میں مندر جا رہی تھی اور... اور تم راستے میں مل گئے تھے..." وہ آنکھیں بند کیے خواب کے عالم میں بڑبڑائے جا رہی تھی اور میں اُلّو بنا اس کے سامنے کھڑا ہوا اس کی بکواس سن رہا تھا۔ "پھر جب میں گر گئی تھی اور تم مجھے اٹھاتے ہوئے... مجھ پر آ رہے تھے تو... تو شنکر!... وہ سمے میں نہیں بھول سکتی۔ میں جب سے... اسی دن سے اب تک ہر رات یہی ایک سپنا دیکھ رہی ہوں... تم... تم شنکر مجھے اپنی باہوں میں لے کر..." اب میں سمجھا کہ وہ میرا چہرہ کیوں نہ بھول سکی تھی۔

معاً میرے ذہن میں اس سے جان چھڑانے کی ایک ترکیب آ گئی اور میں نے اس پر فوراً عمل کیا۔ اگر وہ آنکھیں کھول دیتی تو پھر شاید مجھے یہ سنہری موقع نہ ملتا مگر ہائے رے بدنصیبی! اِدھر میں نے ریس لگانے کے لیے زقند لگانا چاہی اُدھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"تمھیں یاد ہے نا شنکر!" آنکھیں کھولتے ہی اس نے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا، تصدیق کی خاطر!

"آ... آ!" میں چیخ پڑا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے میری کلائی شکنجے میں کس دی ہو۔ میں جلدی سے گھبرا کر بولا "یاد آ گیا... یاد آ گیا... سب یاد آ گیا... مم... میری کلا

"تو تم مسخری کر رہے تھے نا! شنکر ہی ہو نا! نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، میری کلا زور آزمائی کی۔

میں پھر چیخ اٹھا "ہاں میں... میں مسخری کر رہا مسخری... میں شنکر ہوں... شنکر!" مجھ سے یہ بھی کہتی کہ آدمی کی بجائے میں گدھا ہوں تو کر لیتا، شنکر تو پھر آدمی ہی کا نام تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ اس اعتراف کے بعد اس نے میری کلائی چھوڑ دی۔ سو کے سبب دورانِ خون متاثر ہوا تھا اس لیے میں اپنی ہاتھ سے سہلانے لگا۔

"تم پینٹ بوشیٹ میں کتنے سندر لگ رہے ہو، بالکل انگریج بابو لگو ہو" وہ پیار بھری نظر سے مجھے بولی۔

"ان باتوں کو چھوڑو پاروتی!" میں جلدی سے گلی میں ہم دونوں اکیلے ہیں۔ کوئی اِدھر آ گیا تو کیا

"پریمکائیں تو اپنے پریمیوں سے اکیلے ہی ملتی گھبرانا کیسا!" اس نے لڑکی ہو کر دلیری کا ثبوت د لڑکا ہو کر بزدلی دکھا رہا تھا۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم اس وقت جا کہاں رہی تھیں" نے زچ ہو کر پوچھا۔

"اپنی موسی کے گھر، تیلی واڑے مگر..."

"سنو سنو!" میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات تم سے پھر کبھی فرصت سے ملوں گا۔ اس وقت مجھے ذ پہنچنا ہے۔ چلو میں تمھیں تانگے میں وہاں چھوڑ دوں گھر چلا جاؤں گا۔"

"نہیں، تم پھر نہیں ملو گے۔" اس نے ضد کی۔

"یقین کرو پاروتی! میں ضرور ملوں گا، ضرو

"اچھا کھاؤ بھگوان کسم!"

"بھگوان کسم!" میں نے جلدی سے اس کی فرما کر دی۔

"اپنی پارو کی کسم!" اس نے مزید مضبوطی کی خا قسم لی۔

"پارو کی کسم!" میں نے اس کی یہ خواہش بھی پو ہر چند کہ میری امی نے بتایا تھا کہ کسی کی جھوٹی قسم نہیں اس طرح جس کی قسم کھائی جاتی ہے، اس کی زندگی خطرے

کھاتا۔ میری بلا سے وہ زندہ رہتی یا مرجاتی، مجھے کیا فرق پڑتا۔

پھر میں نے جب اس سے چلنے کے لیے کہا تو وہ فکرمندی سے لہجے میں بولی "تم مجھے ساتھ تو لے جا رہے ہو مگر... مگر..." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی... کوئی تانگے والا مجھے اپنے تانگے میں نہیں بٹھائے گا۔ میں اسی لیے تو اتنی دیر سے اڈے پر کھڑی تھی۔ حالانکہ میں بھی کبھی گھر سے نکلتی ہوں پر ان لوگوں کو کوئی خیال نہیں۔" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ سارے جہاں کا دکھ اس کی آواز میں سمٹ آیا تھا مگر اس کے باوجود مجھے اس پر رحم نہ آیا۔

"تو پھر ایسا کرو پاروتی، کہ گھر واپس چلی جاؤ۔" میں نے مشورہ دیا "تمھارا گھر یہاں سے شاید زیادہ دور بھی نہیں ہے۔"

"نہیں!" وہ بولی "موسی کے گھر میرا جانا بہت ضروری ہے۔ ماتا جی اور پتا جی رات کو وہیں رہیں گے کیونکہ موسی بہت بیمار ہیں۔ کچھ پتا نہیں کب انھیں بھگوان اپنے پاس بلا لے۔ تم خود ہی سوچو شنکر! میں رات کے وقت اکیلی کس طرح گھر میں رہ سکتی ہوں۔ برا بھلا وقت آتے کیا دیر لگتی ہے۔ ویسے بھی گلی محلے کے لڑکے مجھے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کے دل میں کوئی ایسی ویسی بات آ گئی تو کیا ہوگا؟ انھیں پتا چل گیا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں تو پھر... پھر بھگوان نہ کرے، برا ہوگا۔"

اب میں اس موٹی بھینس کو کیسے سمجھاتا کہ اس کی عزت و آبرو قطعی محفوظ رہے گی، وہ بالکل فکرمند نہ ہو۔ بھلا کون اس سے اپنی قسمت پھوڑتا۔ وہ تو میں ہی تھا جو اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس کے ماں باپ یقیناً بے وقوف نہیں تھے جو اسے اکیلے گھر میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ تو خدا سے دعا کرتے ہوں گے کہ کوئی لڑکا اس گوشت کے پہاڑ سے سر پھوڑے۔ رہی گلی محلے کے لڑکوں کی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی بات تو اس کا سبب اس کا بے ہنگم و بے ڈول جسم ہوگا جو ظاہر ہے "قابلِ دید" شے تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں کہ اس نے ایک تجویز پیش کی "شنکر! اگر تم آج رات میرے گھر رہ جاؤ تو پھر میں موسی کے نہیں جاؤں گی۔"

ارے بدبخت کیوں میری جان کی لاگو ہو رہی ہے؟ میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر بولا "اگر میں رات بھر گھر سے غائب رہا تو میرے پتا جی میرا کچومر نکال دیں گے مار مار کے!"

میرا جواب سن کر وہ اداس سی ہو گئی جیسے اس کی ساری تمناؤں پر

آواز میں بولی۔

یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیے مگر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں نے سوچا کہ میری جیب میں بڑی رقم ہے۔ سیٹھ وشوا ناتھ سے گھاڑا ہوا سو روپے کا نوٹ مجھے یاد آ گیا تھا۔ زیادہ پیسے لے کر کوئی نہ کوئی تانگے والا یہ بوجھ ڈھونے پر راضی ہو ہی سکتا تھا۔ میں نے کہا "پاروتی! تم فکر نہ کرو۔ میں تمھیں تمھاری موسی کے گھر ضرور پہنچاؤں گا، چلو میرے ساتھ!"

"چلو!" وہ مُردہ سی آواز میں بولی جیسے یہ مجبوری وہ اپنی

موسی یعنی خالہ کے گھر جانے پر رضامند ہوئی ہو اور میں اس کی مجبوری اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے سپنوں کو حقیقت کا روپ دینے پر اُتارو ہو گئی تھی مگر میں نے اس کے سپنوں کو خاک میں ملا کر اسے مزید سپنے دیکھنے کے لیے مجبور کر دیا تھا اور اس کے ساتھ رات کو رہنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

میں اسے ساتھ لیے گلیوں گلیوں ایک سڑک پر نکل آیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ایک تانگا اِدھر سے گزرا تو میں نے اسے ہاتھ دکھا کر روک لیا۔

"تیلی واڑے چلو گے؟" میں نے تانگے والے سے پوچھا۔

"کیا یہ بھی تمھارے ساتھ ہے؟" تانگے والے نے پاروتی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں انھیں تیلی واڑے اتارنا ہے، اس کے بعد تم مجھے جامع مسجد پہنچا دینا" میں نے تانگے والے کو پوری بات بتا دی۔

"یہ تو بڑا... آ... لمبا چکر پڑ جائے گا" تانگے والا "بڑا" کے الف کو کھینچتا ہوا بولا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ زیادہ پیسوں کے چکر میں ہے۔

"بولو کیا لو گے؟" میں نے پوچھا، پھر بولا "تم چاہو تو آگے اور سواریاں بھی بٹھا سکتے ہو۔ ہم دونوں پیچھے بیٹھ جائیں گے۔"

"کیا!" تانگے والا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا جیسے میں نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔ وہ پاروتی کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا "کیا ان کے بعد کسی اور کی گنجائش رہ جائے گی! مجھے اپنی گھوڑی کو مارنا ہے، اتنا بوجھ کھچوا کر!"

"اچھا تو پھر پیسے بتاؤ" میں نے کہا۔

"پورا رُپیا لوں گا" تانگے والے نے جواب دیا۔

"ایک روپیا!" میں نے حیرت سے کہا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ آج تک میں نے اتنی بڑی رقم کرائے کی مد میں کبھی خرچ نہیں کی تھی۔

"چلنا ہے تو بیٹھو ورنہ میرا رستہ کھوٹا مت کرو۔"

اس لیے میں نے یہ کڑوا گھونٹ پی لینا ہی مناسب سمجھا اور تانگے والے کی بجائے پاروتی سے مخاطب ہوا "چلو بیٹھو!"

"پر شنکر! میرے پاس تو بس اکنی ہے۔" پاروتی بولی۔ اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم چلو تو! میرے پاس روپیا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی تو وہ تانگے کی طرف بڑھنے پر راضی ہوئی۔

پھر ادھر پاروتی نے تانگے کے پچھلے پائیدان پر پاؤں دھرا، اُدھر تانگے والا چیخ اٹھا "ارے... ارے تانگا لوٹ جائے گا۔"

مجھے بھی یہ خطرہ فوراً ہی محسوس ہو گیا تھا۔ تانگے کا پائیدان زمین سے لگ گیا تھا۔ پاروتی کا ایک پیر تانگے کے اندر تھا ایک ابھی زمین پر اور چہرے پر بدحواسی نظر آ رہی تھی۔

معاً تانگے والے کو ایک ترکیب سوجھ گئی اس نے مجھ سے تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھ جانے کے لیے کہا میں لپک کر تانگے پر چڑھ گیا۔ اب تانگے والے کا اور میرا بوجھ تانگے کے اگلے حصے پر پڑا تو پچھلا حصہ کچھ زمین سے اٹھا۔ تانگے والے نے مڑ کر پاروتی سے بیٹھ جانے کے لیے کہا مگر جیسے ہی پاروتی تانگے پر چڑھی صورتِ حال بگڑ رہی ہو گئی۔ پہلے اس کے جسم کا نصف وزن تانگے پر تھا اور اب وہ پوری کی پوری تانگے پر چڑھ بیٹھی تھی۔ گھوڑی کے اگلے دونوں پیر زمین سے اٹھ گئے تھے اور تانگا پیچھے جھک گیا تھا۔

"اتارو... ارے اتارو اس لعاش کو!... مجھے نہیں چاہیے رُپا دُپا" تانگے والا مجھ سے چیخ کر بولا۔

اس جھاڑ کی "چیتھڑی" سے جان چھڑانے کا یہی تو ایک سنہری موقع ملا تھا، پھر بھلا اس موقع کو اتنی آسانی سے کیسے گنوا سکتا تھا اس لیے میں پھیل گیا۔ میں نے جواب میں کہا "تم ایک دفعہ زبان دے چکے ہو، اب اس سے نہیں پھر سکتے۔ میں یوں بھی تمہارے منہ مانگے پیسے دے رہا ہوں، ہاں!"

"ارے پیسے گئے بھاڑ میں! تو اتار اسے میرے تانگے سے!" تانگے والا "تم" سے "تو" پر اُتر آیا۔

اسی وقت میری نگاہ سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر پڑی اور جیسے میرے ذہن میں روشنی سی ہو گئی میں نے فوراً ہی تانگے والے کو مخاطب کیا کیونکہ وہ اڑان گھائی بھرنے لگا تھا "چچا میاں! بس یہی تو مسئلہ ہے کہ تانگا اُلار ہو گیا ہے۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ ایسا کرو کہ وہ پتھر اٹھا لاؤ اور آگے رکھ لو۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

تانگے والے کی سمجھ میں میری بات آ گئی مگر وہ خود پتھر اٹھا کر لانے پر راضی نہ ہوا۔ مجبوراً مجھے تانگے سے اترنا پڑا۔ گھوڑی کا وزن میرے اترنے سے اور کم ہو گیا تو تانگا "چرر" شاید تانگے کا پائیدان صدائے احتجاج بلند کرنے لگا تھا۔ والے کے صبر کا دامن بالکل ہی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اُچھل کر تانگے سے نیچے آیا اور پاروتی کا پکڑ کر اسے تانگے سے نیچے گھسیٹنے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایک ... خاطر وہ اپنے تانگے سے تو ہاتھ نہیں دھو سکتا تھا۔

"اُتر سُسری اتر!" تانگے والا چیخ کر زور لگا رہا مگر پاروتی ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔

"ہائے رام، ہائے رام!" جواب میں پاروتی بھی چنگھاڑنے لگی "شنکر! اے شنکر!" پاروتی نے مجھے پکارا۔

جوان جہان عاشقِ نامراد کی موجودگی میں ایک بڈھا کھوسٹ اس پر ہاتھ ڈال رہا تھا اس لیے اسے چنگھاڑنا ہی چاہیے تھا مگر عاشقِ نامراد یعنی میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑا ہوا تھا جسے اٹھانے کے لیے تانگے سے کودا تھا سامنے ہی وہ گلی تھی جس کو عبور کر کے پاروتی کے ہمراہ اس سڑک پر پہنچا تھا۔

بیٹا اللہ دتا! لگا لے ریس! جو ہو گا، دیکھا جائے گا میں نے دل میں کہا اور پھر فوراً ہی سرپٹ بھاگنے کے لیے قدم اٹھایا اور سامنے پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا کر گرا مگر فوراً ہی اٹھ کر پتّی بھر لی۔ پتا نہیں اس کمبخت تانگے والے کی نظر نہ جانے کیسے مجھ پر پڑ گئی اور اس نے مجھے فرار ہوتے دیکھ لیا۔

"ٹھیر سسر! اس لعاش کو میرے متھے منڈھ کر کہاں جا رہا ہے۔ تجھ سے نکسان نہ دھروا لیا تو میرا نام بھی کلن نہیں" یہ چیختا ہوا، وہ پاروتی کا ہاتھ چھوڑ کر میرے پیچھے بھاگا۔

"ارے باپ رے!" میں اچھل کر اور تیزی سے بھاگنے لگا۔

تانگے والے پر انتقام کا بھوت سوار تھا اور یہ بھوت اتنی تیز دوڑا رہا تھا کہ میری پوری کوشش کے باوجود اس کے میرے درمیان فاصلہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

پھر آخر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ تانگے والے نے پکڑ ہی لیا۔ وہ میرا گریبان تھامے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا میں بھی جواب میں پھنکارے مار رہا تھا۔

"سا... سالے... حرا... حرامی... ما... ماڈ... ڈالوں گا..." تانگے والا پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان مجھے ڈرا دھمکا رہا تھا۔

"پیا... پیارے... چچ... چچا... می... میاں... ما... ماف... کر دو... اب... آئندہ... ہرگز..."

"اپنی اماں... اماں کو چھو... چھوڑ کر... سسری... سو... بھاگ رہا... جا رہا تھا... حرا... حرامی پلّے!... نکال... نکال میرا نک... نکسان!"

اب میں نے بڑی حد تک اپنے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پا لیا تھا اور تانگے والے کا مطالبہ سن کر میری جان میں جان آ گئی تھی۔ وہ میری جان نہیں پیسے مانگ رہا تھا اور پیسے میرے پاس بہت تھے۔

"کتنے... کتنے پیسے چاہئیں بولو؟ پیارے چچا میاں!" میں نے نرمی سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"پانچ روپے... پانچ روپے سے... اس سے کم نہیں ہوں گے... دُھرا ٹوٹ گیا ہے، میرے تانگے کا!" تانگے والا بھی اب اپنے پھولے ہوئے سانسوں پر قابو پا چکا تھا۔

پتا نہیں، کچھ ٹوٹا بھی تھا یا نہیں، اس پر میں نے غور کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے تو بس اتنا سوچا کہ پانچ روپے میں رہائی مل رہی ہے۔ میں نے جلدی سے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو روپے کا نوٹ باہر آ گیا۔ اس نوٹ کے علاوہ میرے پاس بارہ آنے اور بھی تھے مگر میں نے وہ نہیں نکالے۔

سو روپے کا نوٹ میرے ہاتھ میں دیکھ کر تانگے والے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، پھر خود بہ خود اس کا ہاتھ میرا گریبان چھوڑ کر نیچے جھول گیا۔ وہ اس طرح آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میری بجائے اس کے سامنے قطب کی لاٹ کھڑی ہو۔

"لو!" میں نے اس کی طرف سو روپے کا نوٹ بڑھایا۔ "اپنے پانچ روپے کاٹ کر بقیہ مجھے دے دو۔"

"بابو جی... ہم گریبوں... گریبوں کے پاس اتنے روپے... اتنے سارے بہت سے روپے کب ہوتے ہیں؟" تانگے والا ہکلانے لگا۔ پتا نہیں سو روپے کے نوٹ نے اس پر کیا جادو کر دیا تھا جو وہ اس طرح ہکلانے اور گھگھیانے لگا تھا۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد پھر بولا۔ "کوئی روپیا دھیلی ہو تو دے دو۔"

میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور سو روپے کا نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس نے خود اپنے مطالبے میں کمی کر دی تھی تو پھر میں فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ میں نے جیب سے اٹھنی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"خدا تمہارا بھلا کرے بابو جی!" اس نے مجھے دعا دی اور پلٹ کر واپس جانے لگا مگر پھر فوراً ہی رک گیا اور بولا "وہ... وہ بٹیا کو تانگے سے اتار لیں بابو جی!"

مفت کی اٹھنی نے "سسری" کو "بٹیا" بنا دیا تھا مگر اس سسری یا بٹیا سے جان بچا کر ہی تو میں بھاگا تھا، پھر کس طرح دوبارہ اسے گلے کا ہار بنانے پر آمادہ ہو جاتا۔

"اس ہتھنی سے میرا کوئی تعلق نہیں، وہ خواہ مخواہ میرے گلے پڑ گئی تھی۔" میں جل کر بولا۔ "تم جو چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔"

"اچھا تو پھر ابھی دیکھو ہوں سسری کو!" تانگے والے نے "بٹیا" کو پھر "سسری" بنا دیا۔ "کیسی ٹھسک کے بیٹھی ہے تانگے میں!" یہ کہہ کر تانگے والا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس چلا گیا۔

میرا جی تو بہت چاہا تھا کہ واپس جا کر پاروتی کی رسوائی کا تماشا دیکھوں مگر میں نے اپنا جی مار لیا۔ خواہ مخواہ دوبارہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ پھر میں بھی وہاں سے چل دیا۔ وہ گلی آگے جا کر ایک چھوٹی سی سڑک پر نکلتی تھی جسے عبور کرنے کے بعد چھوٹا سا میدان تھا، پھر دو گلیاں پار کر کے تانگے کا وہی اڈا تھا جہاں مجھے وہ مصیبت ملی تھی مگر میں نے دوبارہ ادھر کا رُخ کرنا مناسب نہ جانا اور وہیں اس چھوٹی سڑک پر رک کر کسی سواری کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے میں پاروتی کے ساتھ بھی اس سڑک سے گزرا تھا مگر کوئی سواری نہ دیکھ کر آگے چل دیا تھا کیونکہ تانگے کے اڈے سے حتی الامکان دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں کوئی سواری نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اب میں سواری کا انتظار کرنے کے لیے وہاں رک سکتا تھا کیونکہ میرے ساتھ پاروتی نہیں تھی۔

میں وہاں کھڑا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی سواری بڑی غنیمت ہوتی ہے۔ اگر میں دفتر سے موٹر سائیکل پر سوار ہو کے نکلتا تو کبھی پاروتی کے پھیرے میں نہ آتا۔ یہ مصیبت وہی تھی جسے جاسوسی کے شوق میں ایک بار میں نے خود گلے لگانا چاہا تھا۔ وہی جس کے پڑوس میں بشیرے کا گھر تھا جہاں بلیک میرا گریشر ہے تھے اور انھوں نے پاروتی کو اپنا آلۂ کار بنا لیا تھا۔ میں خود اس سے عشق جھاڑنے جا پہنچا تھا اور پھر اسی کے ساتھ مندر میں گھس گیا تھا جہاں سے مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ ظالم جب سے مجھے سپنوں میں دیکھ رہی تھی عشق کے ہاتھوں وہ اتنی مجبور ہو گئی تھی کہ اس نے وہ واقعہ بھی بھلا دیا تھا جو مجھے مندر میں پیش آیا تھا۔ وہ بھولی بھالا اب بھی مجھے اللہ دتا کی بجائے شنکر سمجھنے ہی پر مُصر تھی یا شاید جان بوجھ کر خود کو دھوکا دے رہی تھی۔

کافی دیر بعد مجھے ایک یکہ ادھر آتا دکھائی دیا۔ میں وہاں کھڑے کھڑے سوکھ گیا تھا اور اس یکّے کو گرس رہا تھا جب پہلی بار اس "ہیلی کاپٹر" کو دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یکہ نظر آتے ہی میں اس کی طرف اس طرح لپکا جیسے کئی دن کا بھوکا، کھانے پر جھپٹتا ہے۔ یکے والے نے تاڑ لیا کہ مجھے کہیں جلدی پہنچنا ہے اس لیے اس نے جامع مسجد تک

کے لیے پوری اٹھنی کا مطالبہ کر دیا جو میں نے فوراً ہی منظور کر لیا حالانکہ وہ دُگنے پیسے وصول کر رہا تھا۔

یکے میں مریل گھوڑا جتا ہوا تھا۔ اس نے بڑی دیر لگائی اور راستے میں مزید سواریاں بھی بٹھائیں۔ بہرحال خدا خدا کر کے میں اس رات گھر پہنچا۔

گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ امّی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "میری جوتی سے! کل لوچار! تم میں ابّا بتا ہونا چاہیے!"

"چار ہیں سر سے میں چار! یقین نہیں تو پوچھ لیجو حاجی جی سے!" ابّا کی آواز سنائی دی۔

"کل سے اس موئی علیگڑھ والی کا کیا ذکر چھیڑا ہے کہ میرے لتّے ہی لے لیے ہیں تم نے!"

اسی وقت میں نے "اینٹری" دی۔ پتا نہیں وہ دونوں کس مسئلے پر گرما گرم بحث کر رہے تھے اور کیا ایسی خفیہ بات تھی کہ مجھے دیکھتے ہی ان دونوں کو بریک لگ گیا۔

"آج بڑی دیر کر دی اللہ دتّے!" ابّا مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں ابّا! ذرا آج کل دفتر میں زیادہ کام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تم نے اپنے صاحب کو میرا نام بتا دیا؟" ابّا نے سوال کیا۔

"ہاں... ہاں ابّا! ... وہ بتا دیا میں نے۔" میں ابّا کے سوال سے کچھ گھبرا سا گیا تھا اس لیے جھوٹ بولنے کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آئی۔

"جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے، ہیں!" انھوں نے مجھے گھورا اور میرا پیشاب خطا ہونے لگا۔ وہ جب بھی مجھے اس طرح گھورنے لگتے تھے، میری حالت غیر ہو جاتی تھی۔

"ن... نہیں تو ابّا۔ میں نے انھیں..."

"رہن دے، رہن دے! زبان لڑکھڑا رہی ہے جھوٹ بولتے ہوئے اور جھوٹ بکنے سے باز نہیں آ رہا۔" ابّا نے مجھے ڈانٹا۔ پتا نہیں وہ ہمیشہ کس طرح میرے جھوٹ سچ کا اندازہ لگا لیتے تھے اسی لیے میں ان کے سامنے جھوٹ بولتے ہوئے ڈرتا تھا۔

میں نے عافیت اسی میں جانی کہ چپ سادھ لوں۔ ایک چپ سو کو ہرائی ہے۔

ابّا کو شاید مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ ڈانٹنے والے لہجے میں بولے "چل جا کر کپڑے بدل!"

"جی ابّا جی!" میں نے کہا اور وہاں سے کھسک لیا۔

میری جیب میں سو روپے کا نوٹ تھا جو مجھے اپنے بکس میں چھپانا تھا ورنہ اس پر کسی گھر والے کی نظر پڑ جاتی تو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ سیٹھ وشوا ناتھ سے مجھے جو ہزار روپے پہلے "بطور انعام" ملے تھے، ان میں سے میں نے اب تک کئی پانچ پانچ کے نوٹ چاٹ مصالحوں میں اور سیر و تفریح میں اُڑا دیے تھے مگر اس کے باوجود ابھی پاس بہت نوٹ تھے نئے نئے، بغیر مڑے کرارے نوٹ! ان نوٹوں کو اکثر رات کے وقت تنہائی میں دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوا کرتا تھا اور ان کے چکنے کاغذ پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا کرتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نوٹوں میں سے جب بھی میں نے کوئی نوٹ نکالا تھا، مجھے افسوس ہی ہوا تھا۔ کیا خبر کہ جس کے پاس وہ نیا نوٹ پہنچے، وہ اسے توڑ مروڑ دے۔ دھنے نوٹ اس لیے تو نہیں تھے کہ انھیں موڑا جاتا۔ میں نے ان میں سے کسی نوٹ کو موڑنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ میں نے انھیں بکس کے اندر کپڑوں کی تہ میں سیدھا سیدھا لٹا دیا تھا۔ ہاں اس وقت مجھے مشکل ضرور پیش آئی تھی جب بکس دفتر لے جانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اتنی بڑی رقم دفتر کے میک اپ روم میں چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔ جس دن میں روانہ ہونے والا تھا اس سے پہلے ہی رات کے وقت سارے نوٹ نکال کر کتابوں کے اس "انبار" میں چھپا دیے تھے جو اب میرے لیے بیکار ہو چکا تھا۔ وہ میٹرک تک کی کتابیں تھیں اور اس لیے امّی نے نہیں بیچی تھیں کہ یہ بقیہ چھوٹے بھائیوں کے کام آئیں گی۔ جب میں اپنا بکس دفتر سے لے آیا تھا تو دوبارہ نوٹ اس میں چھپا دیے تھے۔ میں نے احتیاطاً اپنے بکس میں ایک چھوٹا سا تالا بھی لگانا شروع کر دیا تھا تاکہ میری غیر موجودگی میں بڑے بھیّا کسی دن ہاتھ صاف نہ کر جائیں اور میں ٹاپتا رہ جاؤں۔ روزانہ خرچے کے لیے مجھے امّی سے چونّی مل ہی جاتی تھی کیونکہ میں نے اپنی پہلی پوری تنخواہ انہی کے ہاتھ پر لا کر رکھی تھی۔ اسی دن کے بعد سے مجھے دو پیسے اور اکنی کی بجائے پوری چونّی ملنے لگی تھی جس پر بڑے بھیّا نے احتجاج بھی کیا تھا مگر امّی نے انھیں ڈانٹ دیا تھا کیونکہ میں کماؤ پوت تھا اور وہ نکھٹو! بس وہ مارے گھبرے، دن میں کسی وقت ابّا کی غیر موجودگی میں دکان سنبھال لیتے تھے۔ اس پر بھی ابّا ہمیشہ فریاد ہی کرتے رہتے تھے۔ کبھی وہ امّی سے شکایت کرتے کہ بڑے بھیّا نے دو تین گلّے سے چُرا لی اور کبھی ریوڑیاں مرتبان سے نکال کر کھا لیں اور ابّا نے انھیں عین موقع پر ریوڑیاں کھاتے ہوئے پکڑ لیا۔ محلّے ہی میں ابّا کی چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی۔ ابّا کی خواہش تھی کہ بڑے بھیّا "کاروبار" میں ان کا ہاتھ بٹائیں مگر وہ تھے کہ ابّا کے ہتھے ہی نہیں چڑھتے تھے۔ انھیں اپنے یار دوستوں کے ساتھ گھومنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ بقول ابّا کے بڑے بھیّا آوارہ ہو گئے تھے اور بُری صحبت میں پڑ کر وہ اپنی صحت اور جوانی تباہ کر رہے تھے۔ انہی کے ڈر سے میں اپنے نئے کرارے نوٹوں کی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ میں آئے دن گھر میں یہی سنتا رہتا تھا کہ انھوں نے ابّا کی جیب صاف کر دی یا امّی کے پاندان سے پیسے اُڑائے ہیں۔ ان حالات

میں ان کی طرف سے محتاط ہونا ہی چاہیے تھا۔ رہے بڑے صاحب تو ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ ابّا جی نے انھیں اپنے ایک بزاز دوست کی دکان پر رکھوا دیا تھا جو اکثر بھائی صاحب کی ایمانداری کی تعریفیں ابّا سے کرتا رہتا تھا۔ بھائی صاحب سے اسے شکایت نہیں تھی، وہ ہمیشہ پورا کپڑا ناپتے تھے، کبھی "کھینچ" نہیں کرتے تھے۔

جب میں اس کمرے میں پہنچا جہاں میرا بکس، لکڑی کی ایک ...ی کے برابر رکھا ہوا تھا تو میں نے احتیاط سے اردگرد کا جائزہ ...کمرہ خالی تھا۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر بکس کا تالا کھولا، کپڑے اٹھا کر نئے کرارے نوٹوں کا دیدار کیا۔ نئے نوٹوں کا ...دیدار کرتے وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ اس وقت ...گھر والے جاگ رہے ہیں۔ عموماً میں نوٹوں کا دیدار اس وقت کیا ...کرتا تھا جب ہر طرف سے خراٹے نشر ہونے لگتے تھے۔ میں نے ...سارے نوٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہی نوٹ تھے جن کے طفیل میں نے ...میرے سیر سپاٹے کیے تھے، جتنا جی چاہا چاٹ کھائی تھی اور انہی ...کے دم سے میرے بالوں میں ہلکے ہلکے گھونگر پڑے تھے۔ سیٹھ وشوا ناتھ ...سے "انعام" ملنے کے دوسرے ہی دن میں نے چاندنی چوک جا کر پورے ...روپے میں، ایک مشہور نائی کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے ...سارے سر میں چمٹیاں گرم کر کر کے لگائی تھیں۔ میں نے ایسا اس ...لیا تھا کہ سچ مچ ہیرو لگنے لگوں۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میرے بالوں ...کی لٹ بھی ماتھے پر گر کر جھومتی رہا کرے مگر ایسا ممکن نہ ہوا تھا۔

پھر میں جیب سے سو کا نوٹ نکال کر ان نوٹوں کے ساتھ رکھ ...رہا تھا کہ ایک ہاتھ پیچھے سے آیا اور میرے ہاتھ سے سو کا نوٹ چھین ...میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی ...کہ نوٹ چھیننے والے کی طرف دیکھ لیتا۔ ویسے میں نے ایک ہی ...جھلک میں وہ ہاتھ پہچان لیا تھا۔ وہ بڑے بھیّا ہی تھے جو دبے پاؤں ...جانے کب میرے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ابے اللہ دتّا! تیرے یہ عیش!" بڑے بھیّا کی زہریلی آواز سنائی دی۔ "ابے ہمیں بھی تو بتا، تو کہاں داؤ لگاتا ہے۔ ہم تو بیگم ...کہیں ہمیشہ غلام گرتا ہے۔"

میں نے جواب میں کہنا چاہا کہ جُوا کھیل کر دہ روپے حاصل نہیں کیے مگر میرے حلق سے آواز ہی نہیں نکلی۔

"ابے بولتا کیوں نہیں۔" بڑے بھیّا نے جھک کر میرا کان پکڑا اور شاید اسی وقت ان کی نگاہ بکس میں موجود نوٹوں پر پڑی اور ...تقریباً چیخ پڑے۔ "ابے... ابے اللہ دتّا! اتنے... اتنے سارے نوٹ... اتنے!" مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو... ابے تو

تو چھپا رستم نکلا... تیرے پاس اتنے روپے!"

"یہ کیا شور ہو رہا ہے اندر کمرے میں!" باہر سے ابّا جی کڑکے۔

"ابے چھپا دے جلدی سے چھپا دے!" بڑے بھیّا چیخے "اگر ابّا نے دیکھ لیا تو سب دھر والیں گے۔"

"کیا چھپا رہے ہو کمبختو!" ابّا کے قدموں کی چاپ اب بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

بڑے بھیّا، ابّا کی غیر متوقع آمد سے اتنے بوکھلا گئے تھے کہ انھوں نے مجھے تو نوٹ چھپانے کا مشورہ دے دیا تھا مگر انھیں اپنے ہاتھ میں موجود سو روپے کے نوٹ کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ وہ نوٹ ان کے ہاتھ ہی میں تھا۔ ابّا کو دیکھتے ہی ان کی سٹی اس طرح گم ہو گئی جیسے وہ سارے نوٹ انھوں نے ہی کہیں سے چرائے تھے حالانکہ وہ تو میری محنت اور "کارکردگی" کا صلہ تھے۔ جب بڑے بھیّا کو اس سو کے نوٹ کو چھپانے کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابّا کی نظر اس نوٹ پر پڑ چکی تھی۔ وہ اس نوٹ کو اپنے نیفے میں اڑسنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

"چھپا مت، چھپا مت حرام خور! میں نے نوٹ دیکھ لیا ہے۔" ابّا گرجے "تو اسے بھی اپنے راستے پر لگا رہا ہے۔" ابّا نے میری طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسی کے ساتھ وہ تیزی سے لپک کر بڑے بھیّا تک پہنچ گئے اور ان کی گدّی پر ہاتھ ڈال دیا۔ "نکال نوٹ اِدھر! بول گلّے میں سے چرایا تھا؟" غالباً ابّا ابھی یہ محسوس نہ کر پائے تھے کہ وہ سو روپے کا نوٹ ہے ورنہ ایسی بات نہ کہتے بھلا ان کے گلّے میں سو کا نوٹ کہاں سے آ جاتا۔

میرا بکس کھلا پڑا تھا جس میں نوٹ صاف نظر آ رہے تھے اور میں جیسے پتھر کا بت ہو گیا تھا۔ مجھ میں ہلنے جلنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میری کھوپڑی پر دنادن ہتھوڑے برسا رہا ہو۔

پھر ابّا کے ہاتھ میں جیسے ہی سو روپے کا نوٹ آیا وہ ہکّا بکّا رہ گئے۔

"ابّا... ابّا... یہ نوٹ میرا... نہیں ہے... یہ... یہ تو اللہ دتّا کا ہے۔" بڑے بھیّا نے مردہ سی آواز میں حقیقت کا انکشاف کر دیا۔ پھر مجھے پوری طرح "مجرم" ثابت کرنے کے لیے انھوں نے میرے بکس کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "ابّا!... اس کے بکس میں بہت سارے اور بھی نوٹ ہیں... تم خود دیکھ لو ابّا!"

ابّا اب عالم حیرت سے لوٹ کر پھر کمرے میں آ گئے تھے۔ وہ بڑے بھیّا کی گدّی تھامے بکس کی طرف بڑھے۔ مارے خوف کے

میرے پیٹ میں گڑ گڑ ہونے لگی۔ قریب رکھی ہوئی لالٹین کی روشنی کچھ ترچھی ہو کر بکس پر پڑ رہی تھی مگر اس کے باوجود نوٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہی ابا کی نگاہ نوٹوں پر پڑی ان پر بھی بڑے بھیا کی طرح دورہ سا پڑ گیا۔ وہ ان نوٹوں کو نہ جانے کتنی بڑی رقم سمجھے تھے کیونکہ نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی

چیخ نکال دی تھی۔

"شش... تنکو... تنکورن!... اری تنکورن! اری دیکھ... دیکھ... یہ... یہ نوٹ... بہت سارے... تنکورن!" ابا دہشت زدہ سی آواز میں امی کو ان کا نام لے لے کر پکار رہے تھے۔

چند لمحے بعد ہی امی بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں اور انہی کے ساتھ میرے دونوں چھوٹے بھائی بھی کمرے میں گھس آئے "یہ کیا... کیا ہوا؟ خدا خیر کرے... کیوں اس طرح چیخ رہے ہو؟" امی گھبرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"اری انھیں کہاں لے آئی!" ابا میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخے "جلدی سے انھیں باہر کر کے کنڈی لگا دے... جلدی کر جلدی!"

امی پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھیں، ابا کی چیخ پکار سے اور بوکھلا گئیں۔ وہ خوفزدہ سی آواز میں بولیں "کیا... کیا سانپ نکل آیا؟"

"اری تو... تو پہلے کمرے سے انھیں تو نکال، بعد میں پوچھیو کیا ہوا!"

امی نے میرے دونوں بھائیوں کو کمرے سے نکال کر کنڈی چڑھا دی اور لرزتی کانپتی ابا کی طرف بڑھیں "میرے پیٹ میں تو ہَول اٹھ رہے ہیں، جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟" امی نے کہا۔

"یہ دیکھ ادھر!... نظر آیا کچھ؟" ابا نے امی کا بازو پکڑ کر انھیں بکس کے قریب کیا۔ اب انھوں نے بڑے بھیا کی گدی سے ہاتھ ہٹا لیا تھا کیونکہ اب بڑے بھیا کی حیثیت میرے سامنے "چھوٹے مجرم" کی سی ہو گئی تھی اور وہ گال پر ہاتھ رکھے بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔

امی کی آنکھیں بھی پھٹی رہ گئیں۔ کچھ دیر تک وہ اس طرح نوٹوں کو دیکھتی رہیں جیسے انھیں اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو، پھر انھوں نے زور زور سے سینے پر ہاتھ مارا "ہائے! اب کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا، پولیس آئے گی اور ہم سب کو باندھ کر لے جائے گی... دیکھ لے!... تیرے لونڈوں نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"

کوئی اور وقت یا موقع ہوتا تو شاید امی "تیرے لونڈوں" پر حسبِ عادت احتجاج کرتیں اور ابا کو بھی "شریکِ جرم" ٹھہراتیں مگر اس وقت تو ان کی فاختہ اڑی ہوئی تھی۔ تمام سین میں اب تک میری حیثیت خاموش تماشائی کی سی ہو رہی تھی لیکن اب میں کچھ کچھ

بولنے کے لیے اپنا حلق تر کر رہا تھا کیونکہ ابا کے ادا کردہ ... روشنی میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ میری محنت کی کمائی ... کا مال سمجھ رہے تھے۔ حلق تر کرنے کے بعد میں نے ہونٹ ... کوشش کی تو مجھے یہ خیال آیا کہ ابا کو کس طرح ساری بات ... یہ تو سرکار کے "خفیہ راز" تھے، انھیں اس طرح تو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ ابا کی ... مجھے دہلا دیا "اللہ دتا کمبخت! بتا تو نے یہ نوٹ کہاں سے چرائے ..."

"اب... اب... یا... آ... آ..." میں نے بمشکل کہا ...

"چو... چوری کا مال نہیں... ہے ابا!"

ابا کے لیے میرا جواب غیر متوقع ہی تھا۔ وہ تو شاید یہ سمجھے ... کہ میں ان کی کڑک سن کر فوراً ہی اعترافِ جرم کر لوں گا۔ اسی لیے ... کے چہرے پہ لمحے بھر کو حیرت سی نظر آئی اور اس بار انھوں نے ... کڑک سے کام لیا "پھر یہ اتنے سارے نوٹ تیرے پاس کہاں ... آ گئے؟"

میں جواب میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ سرکاری راز ہے ... نہیں بتایا جا سکتا مگر ابھی میرے منہ سے "سرکاری..." ہی ... کہ انھوں نے میری بات اچک لی اور میری مشکل آسان ... "یہ سرکاری نوٹ ہیں؟" ابا بولے "مگر تو دفتر کی دولت ... کیوں اٹھا لایا؟"

ابا کی مداخلت نے کہانی کو ایک اور ہی رنگ دے دیا ... امی کی بات نے تو سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ میرے کچھ بولنے ... ہی انھوں نے کہا "میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ میرا اللہ دتا ... ہو سکتا۔ وہ بھلا چوری کیوں کرتا، وہ تو خود سرکاری افسر ہے!"

امی کی بات سن کر ابا کو بھی شاید پہلی بار یہ احساس ہوا ... ایسا ویسا نہیں سرکاری افسر ہوں۔ ان کی کڑک دم توڑ گئی ... کی طرح بیٹھ گئے۔ انھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا ... "یہ نہیں پوچھوں گا اللہ دتا بیٹا کہ سرکار نے تجھے کس کام کے ... دولت دی ہے کیونکہ تو خفیہ میں ہے اور بندہ خان مجھے بتا ... کہ خفیہ باتیں نہیں پوچھنا چاہئیں مگر بس اتنا بتا دے، یہ ... تک ہمارے گھر میں رہے گی؟"

اب میں پوری طرح ہمت پکڑ چکا تھا۔ میں نے کہا ... "مجھے دفتر کی طرف سے مستقل طور پر دی گئی ہے تاکہ جو بھی ... اخراجات ہوں، میں آسانی سے کر سکوں۔ جب یہ خرچ ہو جا... تو اور رقم دفتر سے مل جائے گی۔" میں نے بڑھ بار ہی اور ... ملنے والے متوقع "انعامات" کے لیے بھی راستہ صاف کر ...

"اچھا... اچھا!" ابا حیرت سے بولے "پھر تو تیری نوکری شاہی ... ہے۔ ویسے یہ ہیں کتنے؟"

... پانچ ہزار روپے دیے گئے تھے جن میں سے کچھ سرکاری کاموں ... خرچ ہو گئے!" یہ کہتے ہوئے مجھے سو کے نوٹ کا خیال آیا اور میں ... بات بنائی "آج مجھے دفتر کی طرف سے ایک سرکاری کام پہ بھیجا گیا ... جس میں روپے خرچ ہو سکتے تھے۔ روپے گھر پہ تھے اس لیے مجھے دفتر ... دے دیا لیکن اتفاق سے خرچ نہیں ہوا۔ میں وہی سو روپے ... کا نوٹ بکس میں رکھ رہا تھا کہ بڑے بھیا آ گئے اور انھوں نے مجھ سے سو ... روپے کا نوٹ چھین لیا اور پھر مجھ سے کہنے لگے کہ میں سارے نوٹ ... بتا دوں۔"

میری بات سنتے ہی ابا نے بڑے بھیا کو اس طرح گھور کر دیکھا ... جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں انھیں کچا چبا جائیں گے، پھر سخت ... لہجے میں انھیں مخاطب کیا "دفع ہو جا یہاں سے!"

بڑے بھائی پروانۂ رہائی ملتے ہی وہاں سے کھسک لیے اور ان ... کے نکلتے ہی ابا نے پھر کنڈی لگا دی۔ سو کا نوٹ اب بھی ان کے ہاتھ ... میں تھا جو انھوں نے بڑے بھیا سے چھین لیا تھا۔

"اللہ دتا! تو آمد خرچ کا حساب تو رکھتا ہوگا بیٹا؟" انھوں نے ... پوچھا۔

"ہاں ابا! جب بھی پیسے خرچ ہوتے ہیں، میں دفتر میں لکھوا دیتا ... ہوں۔" میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی ... تھی کہ میں ابا کے سامنے کس طرح دھڑا دھڑ جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ ... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک تو ان کی طرف سے نظر ہٹا کر جھوٹ ... بول رہا تھا، دوسرے ان کے انتہائی نرم رویے نے میری ہمت بڑھا ... دی تھی۔

"دیکھ بیٹا! اتنی بڑی رقم اس طرح رکھنا ٹھیک نہیں۔" ابا نے ... مجھے سمجھایا "تو یہ ساری رقم اپنی امی کے بڑے صندوق میں رکھوا دے ... جو میرے کمرے میں رہتا ہے۔ جب تجھے جتنی رقم درکار ہوا کرے اپنی ... اماں سے لے لیا کریو۔"

"سنو!" امی بول اٹھیں "ایسا کیوں نہ کرو کہ سارے پیسے شیخ جی ... کے گھر رکھ آؤ، جب ضرورت پڑے گی منگا لیں گے۔"

"تو تو نِری پھوہڑ ہے تنکورن۔ تجھے کبھی عقل نہیں آئے گی۔ ساری ... اگر کل ہی ضرورت پڑ گئی پھر؟ اب میں گھڑی گھڑی ان کے پاس ... بھاگا پھروں گا!" ابا نے امی کو جھڑک دیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" امی ٹھنڈا سانس لے کر بولیں۔

پھر ابا کی تجویز پر عمل کیا گیا جو ابا نے پیش کی تھی۔ وہ سارے ... نئے نوٹ ایک کپڑے میں باندھ کر بڑی رازداری کے ساتھ ... امی کے بڑے صندوق میں منتقل کر دیے گئے جس پر کوئی آدھ سیر وزنی

تالا ہر وقت لٹکا رہتا تھا۔ سو روپے کا وہ نوٹ بھی انہی نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا گیا تھا جو اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ آئندہ دن کے "سرکاری اخراجات" کی مد میں مجھے صرف پانچ روپے کا ایک نوٹ ہی مل سکا، وہ بھی میرے کہنے پر!

دوسرے دن صبح میں امی سے چوتی لے کر اور پانچ روپے کا نیا نوٹ جیب میں ڈال کر اپنے "مشن" پر روانہ ہو گیا۔ گھر سے میں کچھ جلدی ہی نکلا تھا کیونکہ مجھے صفدر علی بیگ کا دفتر تلاش کرنا تھا اور پھر مقررہ وقت پر وہاں پہنچنا بھی تھا۔

مجھے علم نہیں تھا اور نہ تیواڑی جی نے کچھ بتایا تھا کہ وہاں نوکر ہو کر کرنا کیا ہے۔ پھر یہ کہ لیوسی عرف چمپا نے میرے لیے وہاں کون سی جگہ نکالی ہے۔ وہ مجھے سارے دفتر کی جھاڑو دینے پر بھی نوکر رکھوا سکتی تھی۔ یہ تو قسمت کی لاٹری تھی۔ اب تو جو ہوتا مجھے بھگتنا ہی تھا۔ بظاہر تو لیوسی میری ماتحتی میں تھی لیکن صفدر علی بیگ کی حد تک میری نکیل اسی کے ہاتھ میں تھی۔

کھاری باؤلی پہنچ کر صفدر علی بیگ کا دفتر تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ لیوسی نے مجھے جو نشانیاں بتائی تھیں، ان کی مدد سے میں بآسانی وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ مسجد فتح پوری سے مڑ کر کچھ دور چلنے کے بعد ہی سیدھے ہاتھ کی ایک دو منزلہ عمارت میں صفدر علی بیگ کا دفتر تھا۔

دفتر میں داخل ہوتے ہی میں کچھ ٹھٹکا۔ راہداری میں صاف ستھرا فرش بچھا ہوا تھا۔ میں راہداری میں چلتا ہوا ایک ہال نما بڑے سے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہاں ہر دو طرف کچھ کچھ فاصلے سے میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے اکثر پر لوگ موجود تھے۔ میں ایک میز کی طرف بڑھ گیا۔

"شریمتی چمپا دیوی کہاں پدھارتی ہیں؟" میں نے میز کے قریب پہنچ کر اس شخص سے سوال کیا جو اپنا چشمہ اتار کر رومال سے اس کے شیشے صاف کر رہا تھا۔

اس آدمی نے میری بات کا جواب دینے سے پہلے چشمہ ناک پر جمایا، پھر بولا "وہ ادھر چلے جائیے!" اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔

میں اس شخص کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھ گیا۔ وہ ایک دروازہ تھا جسے کھول کر میں ایک اور کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک طرف دو میزیں اور دوسری جانب ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ میری نظر کمرے میں داخل ہوتے ہی چمپا یعنی لیوسی پر پڑ گئی تھی۔ اودے رنگ کی ساڑی اس کے سرخ و سفید اور متناسب جسم پہ بہار دے رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

"تم آ گئے رمیش!" وہ مجھے دیکھتے ہی بولی "آؤ، آؤ!"

میں اس کی طرف بڑھا۔ اس کی میز کے سامنے جو کرسی پڑی ہوئی

تھی، میں اُس پر بیٹھ گیا۔ اب میری پُشت ان دونوں افراد کی طرف تھی جو مخالف سمت کی میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"صاحب جی بس اب آنے ہی والے ہوں گے"، لیوسی نے مجھے اطلاع دی۔

"صاحب جی" سے اُس کی مراد صفدر علی بیگ ہی ہو سکتا تھا اس لیے میں نے وضاحت نہیں چاہی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں نے مدھم لہجے میں پوچھا: "مجھے یہاں کام کیا کرنا پڑے گا؟"

"کلرکی!" اس نے جواب دیا۔ "کیوں، کیا تمھیں کوئی اعتراض ہے؟"

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو کلرکی تھی، اگر مجھے وہاں جھاڑو بھی دینا پڑتی تو انکار نہ کرتا۔ میں نے لیوسی کو مطمئن کرنے کے لیے کہا: "فکر نہ کرو، میں ہر کام کر سکتا ہوں۔"

ابھی مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اسی کے ساتھ لیوسی نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک دراز قد اور وجیہہ شخص دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہی صاحب جی یعنی صفدر علی بیگ ہو سکتا تھا۔ اس کے جسم پر بہترین تراش کا سوٹ تھا اور ہونٹوں کے گوشے میں پائپ دبا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے کمرے میں موجود افراد کے سلام اور آداب کا جواب دیتا ہوا، دائیں جانب موجود دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بلاشبہ میں اس شخص کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ وہ بالکل انگریز معلوم ہوتا تھا۔ سرمئی سوٹ میں اس کا گورا رنگ کچھ اور بھی گورا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی ایک باوردی چپراسی چند فائل اور مرچے کا ایک خوبصورت تھیلا اٹھائے ہوئے تھا۔

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا تو لیوسی بیٹھ گئی اور مجھے بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد ہی باوردی چپراسی دروازے کے باہر آ کر کسی مجسمے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ پھر چند لمحے اور گزرے، اس کے بعد گھنٹی بجی۔ چپراسی جلدی سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ چپراسی دوبارہ صاحب جی کے کمرے سے نکلا تو سیدھا ہماری طرف آیا۔

"صاحب جی آپ کو یاد کر رہے ہیں چمپا جی!" چپراسی نے قریب آ کر ادب سے لیوسی کو بتایا۔

لیوسی فوراً ہی اُٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے بولی۔ "تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آئی۔"

میں نے جواب میں سر ہلانا کافی سمجھا۔ لیوسی صاحب جی کے کمرے میں چلی گئی۔ اس دفتر کے رکھ رکھاؤ دیکھ کر مجھ پر احساس کمتری مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ میری نظر میں وہاں جاسوسی کرنا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ پتا نہیں لیوسی کس طرح وہاں جاسوسی کر رہی تھی۔ مجھے اس وقت یہ علم نہیں تھا کہ انٹرویو بھی دینا پڑے گا اس لیے جب لیوسی نے صاحب جی کے کمرے سے واپس آ کر یہ اطلاع دی تو میں گھبرا گیا۔

"ان... انٹر... انٹرویو... مگر میں... میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا... وہ... وہ مجھ سے کیا پوچھیں گے" میں ہکلایا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں" لیوسی نے مسکرا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ "بہرحال تمھیں صاحب کو اپنی طرف سے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرو گے۔ نوکری کے لیے انٹرویو دینا پڑتا ہے۔ تمھیں بہرحال یہ نوکری حاصل کرنا ہے" لیوسی کی ... تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ میری بوکھلاہٹ سے ... لے رہی تھی۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے" میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "... مالک..."

"نہیں بھگوان مالک ہے" لیوسی نے جلدی سے میری بات ... دی۔ "یہ نہ بھولو کہ تمھارا نام رمیش ہے اور تم میرے کزن ہو" ... آواز اب بھی مدھم تھی۔

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"اب جلدی سے کھڑے ہو جاؤ، دیر نہ کرو۔"

جب میں کرسی سے اُٹھ کر صاحب جی کے کمرے کی طرف بڑھا تو میری حالت غیر تھی۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے اور میں چلتے بار بار سنبھل رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پیپر ... دینے جا رہا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ صاحب جی کی ایک جھلک دیکھ کر ہی میں اتنا مرعوب ہو گیا تھا تو ان کے روبرو جا کر میرا کیا حال ... میں دروازے کے قریب پہنچا تو باوردی چپراسی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ سامنے ہی بڑی سی بیضوی میز کے پیچھے صاحب جی کا چہرہ دھوئیں کے بادلوں میں چھپا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پائپ اب بھی ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا، وہ کسی ریلوے انجن کی طرح دھواں چھوڑ رہے تھے۔ میں نے سوچا سلام سے آغاز کرنا چاہیے مگر پھر مجھے فوراً ہی عقل آ گئی۔ میں نے ... کر گلا صاف کرتے ہوئے صاحب جی کو دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

"بیٹھو!" صاحب جی نے ہونٹوں سے پائپ نکالتے ہوئے ... سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اُن کی آواز ... بارعب تھی۔

میں کانپتے قدموں سے کرسیوں کی طرف بڑھا۔ میں اس قدر ... ہوا تھا کہ جب کرسی پر بیٹھا تو گرتے گرتے بچا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" صاحب جی نے میرے بیٹھتے ہی سوال ...

"رمیش!" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ پتا نہیں کیوں ... بار بار میرے حلق میں اٹک رہی تھی۔

"پورا نام؟" حکم ملا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!" میرے مُنہ سے یہ جُملہ نکلنے ہی والا تھا کہ میں نے خود کو سنبھال لیا اور جلدی سے بولا۔ "رمیش... رمیش بنرجی!"

"بنرجی!" صاحب جی نے حیرت سے دُہرایا۔ "مگر چمپا نے تو تمہیں اپنا کزن بتایا تھا؟" صاحب جی کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"جی... جی ہاں... میں کزن ہوں، اس کا کزن!" میں صاحب جی کی حیرت کا سبب نہ سمجھ کر بولا۔

"لیکن وہ تو بنگالی معلوم نہیں ہوتی۔ پھر تم کس طرح..." صاحب جی نے چند لمحے کا توقف کیا، پھر بولے۔ "تمار باڑی کوتھائے؟"

میں یہ تو نہ سمجھ سکا کہ صاحب جی نے آخر میں کیا کہا تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا، صاحب جی نے بنگالی زبان میں کچھ کہا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس موقع پر بوڑھا ہی نظر آنا چاہیے تھا اور یقیناً بوڑھا ہی نظر آ رہا تھا۔ بوڑھا نظر آنے کے بعد شاید اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ کچھ کہا بھی جائے اس لیے میں خاموش ہی رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر صاحب جی نے پھر اپنا آخری جملہ دُہرایا کہ شاید میں ان کی بات سن یا سمجھ نہ پایا ہوں مگر اس بار بھی میں صرف ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔

"تعجب ہے کہ تم بنگالی ہونے کے باوجود بھی بنگلہ زبان نہیں سمجھ سکے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمھارا گھر کہاں ہے؟ بہرحال..." صاحب جی کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

اب میں سمجھ گیا کہ سارا فساد میرے پورے نام کا پھیلایا ہوا ہے۔ لیکن میں نے یوں ہی روارَوی میں اپنے نقلی نام کو پورا کرنے کے لیے اس میں "بنرجی" جوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ایک لفظ میرا شجرۂ نسب ہی بدل کر رکھ دے گا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے بات برابر کرنے کے لیے کہا۔ "میرے پتا جی کے پتا جی کے پتا جی، بنگالی تھے۔ میں تو سرا ہیں دلّی ہی کی پیدائش ہوں۔"

"اچھا تو خیر یہ بات ہے" صاحب جی دھواں چھوڑتے ہوئے بولے، پھر انھوں نے ایک اور سوال کیا۔ "کہاں تک پڑھے ہو؟"

"ایف اے تک سر!" میں نے یہ سوچ کر جلدی سے جواب دیا کہ صاحب جی دوبارہ میرے بنگالی یا غیر بنگالی ہونے کے بارے میں تفتیش شروع نہ کر دیں۔

"ٹھیک ہے، چمپا تمھیں تمھارا کام سمجھا دے گی۔ ایک بات کا تمھیں خاص طور سے خیال رکھنا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو، سمجھ گئے؟"

"یس سر!"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

میں جب صاحب جی کے کمرے سے باہر آیا تو سردی کے باوجود میرے چہرے پر پسینہ بہہ رہا تھا جسے میں نے جیب سے رومال نکال کر صاف کیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ چمپا نے صاحب جی کو پہلے ہی سادھ لیا تھا ورنہ اتنی جلدی میری جان نہ چھوٹتی اور شاید اس طرح آسانی سے مجھے نوکر بھی نہ رکھ لیا جاتا۔ صاحب جی کے کمرے میں میز کرسیوں کے علاوہ میں نے ایک مسہری بھی پڑی ہوئی دیکھی تھی جس کی وہاں موجودگی کا مقصد میں بالکل نہ سمجھ سکا تھا۔ میں نے کسی دفتر میں اس طرح مسہری پڑی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے باہر آتے ہوئے سوچا تھا کہ لیوسی کو بھی وہاں مسہری کی موجودگی کے بارے میں پتا ہوگا اور وہ ضرور جانتی ہوگی، مسہری وہاں کیوں پڑی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں میرا ذہن بس اس مسہری میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں نے لیوسی کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر پہلا سوال اسی مسہری کے بارے میں کیا۔

میرا سوال سُن کر نہ جانے کیوں لیوسی کچھ شرما سی گئی، پھر بولی۔ "تم ان فضول باتوں کے بارے میں نہ سوچو اور یہ بتاؤ کہ صاحب جی نے تمہیں نوکری دے دی یا نہیں؟"

"ہاں نوکری مل گئی" میں نے جواب دیا۔ "صاحب جی نے کہا ہے کہ تم مجھے میرا کام سمجھا دوگی۔" یہ کہہ کر مجھے خیال آیا کہ اُسے بھی اس کا شجرۂ نسب بتا دوں تاکہ صاحب جی اس سے کچھ پوچھیں تو وہ میری بات کی تصدیق کر سکے۔ پھر میں نے اُسے ساری بات بتا دی۔

"تم پورے بگلوٹ معلوم ہوتے ہو!" وہ ناک چڑھا کر بولی اور اس موقع پر مجھے اس کی پُھک سی ناک بڑی پیاری لگی۔ "تمھیں آخر اپنے نام کے ساتھ بنرجی لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس آپ ہی آپ لگ گیا تھا، میرا اس میں کوئی قصور نہیں" میں نے صفائی پیش کی۔

پھر لیوسی نے اس کمرے میں موجود ایک شخص کو ہال نما بڑے کمرے میں ٹہلا دیا اور مجھے اس شخص کی میز کا قبضہ مل گیا۔ اب اس کمرے میں لیوسی اور میرے علاوہ صرف ایک ادھیڑ عمر شخص کی میز تھی جس کے بارے میں لیوسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اونچا سنتا ہے۔ اس کی میز میری میز سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔

دوپہر ہونے تک کئی بار لیوسی صاحب جی کے کمرے میں آتی جاتی رہی۔ کبھی کبھی وہ اتنی دیر صاحب جی کے کمرے میں رہی کہ مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی۔ ایک بار جب وہ اندر سے نکلی تو میں نے اس کی ساڑی بھی کچھ بے ترتیب سی دیکھی۔ یہ بات بھی میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ جب لیوسی اندر جاتی تھی تو باوردی چپراسی اس طرح دروازے کے بالکل سامنے مستعد کھڑا ہو جاتا تھا جیسے اب کسی نے اندر جانے کی کوشش کی تو وہ

اسے زبردستی روک دے گا۔ پتا نہیں لیوسی اتنی اتنی دیر اندر کیا کرتی رہتی تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ لیوسی کی اندر موجودگی کے دوران میں، ایک مہمان کو صاحب جی کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ میں نے دیکھا کہ وہ مہمان بہت جلدی میں معلوم ہوتا تھا اور اسے شاید چپراسی پہچانتا بھی تھا کیونکہ چپراسی نے اُسے دیکھتے ہی دانت نکال دیے تھے۔ مہمان نے چپراسی کے قریب جا کر کچھ سرگوشی کی تھی، پھر فوراً ہی چپراسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تھی۔ اس کے بعد مجھے ایسا لگا تھا جیسے اندر سے کنڈی کھولی گئی ہو۔ پھر چپراسی اندر چلا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہ آسکا تھا کہ اندر سے کنڈی کیوں لگائی گئی تھی؟

اب بوڑھا ہونے کے بعد میں اپنی سرگزشت لکھتے ہوئے یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں تو مجھے خیال آرہا ہے کہ صاحب جی یقیناً اس دن مجھے نوکری دینے کا خراج لیوسی سے وصول کر رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اب اس عمر کو پہنچنے کے بعد صاحب جی کے کمرے میں مسہری کی موجودگی کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔

بہرحال چپراسی نے باہر آکر اس مہمان کو اندر بھیج دیا تھا، پھر اس کے کچھ دیر بعد ہی لیوسی، صاحب جی کے کمرے سے نکلتی دکھائی دی۔ میں نے اس وقت لیوسی کے چہرے پر غور و فکر کے آثار دیکھے تھے جیسے وہ کسی الجھن کا شکار ہو گئی تھی یا کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اجنبی مہمان بہت جلد چلا گیا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی صاحب جی کمرے سے نکلے تھے اور چپراسی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا تھا۔ پھر جیسے ہی صاحب جی باہر گئے تھے، لیوسی نے اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی تھی۔ میری میز کے سامنے پہنچ کر اس نے پنسل سے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ میں حیرت سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا اور حیرت سے وہ تحریر پڑھ رہا تھا جو وہ کاغذ پر گھسیٹ رہی تھی۔ "میں صاحب جی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم باہر کا خیال رکھنا۔ تمہاری برابر والی میز پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی کسی بہانے میں اس کمرے سے باہر بھیج دوں گی۔ یہ خیال رہے کہ جب تک میں اندر کمرے میں رہوں، کوئی اس کمرے میں نہ جائے۔"

پنسل رکھ کر لیوسی ایک دم مڑی اور میری برابر والی میز پر بیٹھے ہوئے آدمی سے بلند آواز میں مخاطب ہوئی۔ "رحیم صاحب! آپ ریکارڈ کیپر سے لندن ٹریڈرز کا فائل نکلوا لائیں۔ صاحب جی کو اس کی ضرورت پڑے گی۔"

وہ شخص کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بہرا تھا اس لیے یہی جملہ لیوسی کو اس کے بالکل کان کے قریب جا کر بلند آواز میں دُہرانا پڑا، پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ اِدھر وہ شخص کمرے سے نکلا اُدھر لیوسی، صاحب جی کے کمرے میں داخل ہوئی۔

ابھی لیوسی کو گئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ مانوس قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں بوکھلا گیا۔ صاحب جی کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ چمپا کہاں گئی ہے؟" صاحب جی نے مجھ سے پوچھا۔

"چم... چم... پا... وہ... وہ..." میں ہکلا کر رہ گیا۔

"جواب دو!" صاحب جی نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"وہ... وہ آپ کے... آپ کے کمرے میں..." آخر گھبراہٹ میں میری زبان پر سچی بات آہی گئی۔

"ہوں!" صاحب جی نے عجیب سے انداز میں ہنکارا بھرا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

اسی وقت لیوسی، صاحب جی کے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اس نے شاید صاحب جی کی آواز سُن لی تھی۔ میں نے لیوسی کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھی جیسے وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ "وہ سر!... میں... میں... آپ کے کمرے میں اپنا قلم بھول آئی تھی... وہ لینے گئی تھی۔"

"میں نے تم سے اس سلسلے میں کوئی سوال تو نہیں کیا۔" صاحب جی عجیب سے لہجے میں بولے، پھر لیوسی کی میز پر پڑے ہوئے قلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمہارا قلم تمہاری میز ہی پر پڑا ہے۔"

"ارے!" لیوسی نے حیرت کا اظہار کیا اور تیزی سے اپنی میز کی طرف بڑھتی ہوئی، میری میز کے برابر سے گزری۔

پھر اس وقت میں اچھلتے اچھلتے بچا جب میری میز کے پاس سے گزرتے ہوئے لیوسی نے ایک لفافہ پھسلا دیا۔ وہ لفافہ یقیناً لیوسی کے اُس ہاتھ میں تھا جسے وہ اپنی ساڑی میں چھپائے ہوئے تھی۔ صاحب جی قریب ہی موجود تھے اور میری روح فنا ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ لفافہ لیوسی نے یقیناً صاحب جی کے کمرے سے پار کیا ہوگا اور اب وہ چوری کا مال میرے سر منڈھ رہی تھی کہ رنگے ہاتھوں نہ پکڑی جائے۔ میرے سامنے ایک فائل کھلی رکھی تھی، لفافہ اُسی پر گرا تھا۔ میں نے جلدی سے اُس فائل کو بند کر دیا تاکہ لفافہ چھپ جائے۔

لیوسی اب اپنی میز تک پہنچ چکی تھی اور صاحب جی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ پھر جیسے ہی صاحب جی کمرے میں داخل ہوئے اور کمرے کا دروازہ بند ہوا، میں نے جلدی سے فائل کھول کر وہ لفافہ نکالا۔ لفافہ بند نہیں تھا۔ میں نے لفافے میں موجود چیزوں کو دیکھنے کے لیے اُسے فائل پر الٹ دیا اور اس بار واقعی اچھل پڑا۔ لفافے میں

[...]تصویریں اور ایک پرچہ نکلا تھا۔ لفافہ الٹنے کے سبب پرچہ [...] تصویر الٹی ہو گئی تھی مگر دوسری تصویر سیدھی تھی اور اسی [...] اچھل پڑنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تصویر بندیا کی تھی، اس قاتل [...] تصویر جس نے بھگوان داس کو قتل کرنا چاہا تھا اور بعد میں [...]جیت گڑھ کی پہاڑی کے ایک غار میں نظر آئی تھی۔ میں نے [...] دوسری تصویر یا اٹھا کر سیدھی کی۔ وہ رنجیت کی تصویر تھی، [...] داس کے قاتل کی تصویر! میں دوبارہ اُچھلا مگر اپنی "اچھال" [...] کر ان تصویروں کے ساتھ موجود پرچہ اٹھا کر پڑھنے [...] رات یہ دونوں سرائے خلیل والی کوٹھی پر پہنچیں گے۔ تصویریں [...] روانہ کی جا رہی ہیں کہ ان لوگوں کو آپ پہچان سکیں۔ باقی [...] کو گھپال زبانی بتا دے گا۔" اس تحریر کے نیچے کسی کے دستخط [...] تھے۔

ابھی میرے حواس دوبارہ اپنی جگہ واپس نہیں آئے تھے کہ معاً [...]زے کی چرچراہٹ سُن کر میں چونک پڑا۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو [...]یز کے برابر والی میز پر بیٹھنے والے کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ [...] کے پیچھے پیچھے صاحب جی کا باوردی چپراسی بھی تھا۔ میں نے [...]ر جلدی سے فائل بند کر دی۔ مجھے اتنی مہلت بھی نہ مل سکی [...]ر ان تصویروں اور پرچے کو اس لفافے میں رکھ سکتا۔

اسی وقت معاً صاحب جی کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ پھر [...]ں دوبارہ اپنی میز کی طرف بڑھتے دیکھ کر تو میری سٹی ہی [...] گُم ہو گئی۔

"یس سر!" جیسے ہی صاحب جی میری میز کے قریب پہنچے، میں [...]ر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تم کون سی فائل دیکھ رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے صاحب جی [...] فائل اٹھالی جس میں بندیا اور رنجیت کی تصویریں تھیں۔ اس کے [...] صاحب جی کچھ کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔

اسی وقت بہرا، یعنی میرا آفس کولیگ، یعنی رحیم، صاحب جی [...] مخاطب ہوا۔ "سر! چمپا جی نے کہا تھا کہ آپ کو اس فائل کی بھی ضرورت [...] میں یہ ریکارڈ کیپر سے لے آیا ہوں۔"

صاحب جی بڑھتے بڑھتے رُکے اور مڑ کر رحیم کی بجائے لیوسی [...] مخاطب ہوئے۔ "چمپا! کون سی فائل ہے یہ؟"

"وہ... وہ سر! آج... آج آپ ڈکٹیشن دے رہے تھے تا [...] تو میں نے سوچا تھا سر... کہ شاید اس فائل کی ضرورت [...] پڑے... یہ لندن ٹریڈرز کی فائل ہے۔" لیوسی نے ہکلا کر [...] بات پوری کی۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اسے واپس بھجوا دو!" [...] صاحب جی نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

لیوسی کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور رحیم سے فائل لے کر چپراسی کو دیتے ہوئے بولی۔

"اسے شکلا جی کو دے آؤ۔"

چپراسی نے سر ہلایا اور فائل لے کر چلا گیا۔ رحیم اپنی میز پر جا بیٹھا اور لیوسی بھی دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر کچھ لکھنے لگی۔ میں لیوسی کو یہ بتانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کہ اس نے مجھے جو لفافہ صاحب جی کے کمرے سے چُرا کر دیا تھا، وہ دوبارہ گھوم پھر کر صاحب جی کے ہتھے چڑھ گیا ہے لیکن اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی میز سے اٹھ کر لیوسی کے پاس تک پہنچ سکتا۔

پھر اسی دن دفتر کا وقت ختم ہوتے ہوتے ایک واقعے نے مجھ پر اور گھبراہٹ سوار کر دی۔ لیوسی، صاحب جی کے کمرے سے نکل کر سیدھی میری میز کی طرف آئی اور جلدی سے پنسل اٹھا کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگی اور میں "لکھت" کے ساتھ "پڑھت" کا فرض ادا کرتا رہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ صفدر علی بیگ کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے بظاہر دفتری کام سے اپنی سرائے خلیل والی کوٹھی لے جا رہا ہے لیکن مجھے کچھ دال میں کالا نظر آرہا ہے۔ اگر تم کل مجھے دفتر میں نہ دیکھو تو یہ سمجھ لینا کہ اس نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔ اس کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے، تم سمجھ ہی سکتے...!" ابھی لیوسی اتنی ہی لکھ پائی تھی کہ صاحب جی اپنے کمرے سے نکل آئے اور انھوں نے لیوسی کو مخاطب کیا۔

"یس سر!" لیوسی جلدی سے سیدھی کھڑی ہوئی۔ "میں چل رہی ہوں سر!"

میں نے جلدی سے اس کاغذ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لیا جس پر لیوسی نے لکھا تھا۔

چند لمحے بعد ہی لیوسی، صاحب جی اور ان کا باوردی چپراسی وہاں سے چلے گئے اور ان کے جاتے ہی میں نے جلدی سے وہ کاغذ اپنی جیب میں رکھ لیا جس پر لیوسی نے لکھا تھا۔

اس دن صاحب جی یعنی صفدر علی بیگ کے دفتر سے لوٹ کر آنے کے بعد رات گئے تک میرا ذہن خلفشار کا شکار رہا۔ اس قاتل حسینہ بندیا اور سیج پور کے قاتل رنجیت کا صفدر علی بیگ سے کیا تعلق تھا؟ پھر یہ کہ ان دونوں کو صفدر علی بیگ کے پاس کیوں بھیجا جا رہا تھا؟ کیا کوئی اور قتل ہونے والا تھا؟ میرے ذہن میں پے در پے سوالات اُبھر رہے تھے۔ ان تصویروں کے ساتھ موجود پرچے سے یہ تو ظاہر ہو ہی گیا تھا کہ بندیا اور رنجیت، صفدر علی بیگ کے لیے اجنبی تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان دونوں کی تصویریں اسے کیوں بھیجی جاتیں مگر وہ کون تھا جس نے ان دونوں کی تصاویر بھیجی تھیں؟ میں نے ان سوالوں پر غور تو بہت کیا مگر ظاہر ہے کہ میں کہانیوں کا ہیرو تو تھا نہیں جو ذرا سی ذہانت

سی "ہوشیاری" کے بعد معاملے کی تہ تک جا پہنچتا۔ میں تو غریب اللہ دتا تھا اس لیے جب سوچتے سوچتے دماغ تھک گیا تو ہر سوال پر خاک ڈال کر اور دل کو یہ تسلی دے کر سو گیا کہ کل جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ پہلے لیوسی اغوا تو ہو۔ کیا خبر اسے خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہو۔ اب وہ اتنی زیادہ حسین مہ جبین بھی نہیں کہ لوگ اسے اغوا کریں۔

دوسرے دن جب میں گھر سے نکلا تو مجھے پھر اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سچ مچ لیوسی اغوا نہ کر لی گئی ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو میرے لیے بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ صفدر علی بیگ جانتا ہی ہے کہ لیوسی سے میرا گہرا تعلق ہے۔ پھر اگر اس نے مجھے بھی اغوا کر لیا تو کیا ہوگا؟ ایک دل نے کہا۔ بیٹا اللہ دتا! یہ خطرہ ہی مول نہ لو۔ نہ اس کے دفتر جاؤ گے نہ وہ تمھیں اغوا کر سکے گا۔ اس وقت میدانِ عمل سے ریس لگا جانا ہی دانشمندی ہے۔ دوسرے دل نے کہا۔ نہیں، پہلے چل کر دیکھ تو لو کہ لونڈیا اغوا بھی ہوئی ہے یا نہیں! کہیں ایسا نہ ہو کہ کھودا پہاڑ، نکلے چوہا یا چوہیا! پھر یوں ہوا کہ میں نے دوسرے والے دل کی بات مان لی اور اسی میں عافیت تھی ورنہ میدانِ عمل سے راہِ فرار اختیار کرنے کی صورت میں تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں ضرور پھڑکتیں، خوشی کے اظہار میں نہیں بلکہ ناراضگی کے اظہار میں!

میں دل پر کئی من وزنی پتھر رکھ کر صفدر علی بیگ کے دفتر پہنچ ہی گیا۔ جب میں نے دفتر میں پہلا قدم رکھا تو میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ آنے کو تو میں وہاں آ گیا تھا مگر اب بُرا خراب ہو رہی تھی۔ جہاں سے لوگوں کو اغوا کر لیا جاتا ہو اور جہاں قاتلوں کی تصویریں بھیجی جاتی ہوں، وہاں قدم رکھنا معمولی دل گردے کا کام تو نہیں۔

پھر وہ ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ لونڈیا یعنی لیوسی یعنی پُراسرار جاسوسہ غائب تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت دُم دبا کر بھاگ لوں۔ دفتر والوں سے پتا چلا کہ لیوسی کی درخواست موصول ہوئی ہے جس میں اس نے طویل رخصت مانگی ہے اور صاحب جی یعنی صفدر علی بیگ نے اس کی چھٹی منظور کر لی ہے۔ واہ بیٹا! ہمیں ہی گھسا دیا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ زبردستی اس سے درخواست پر دستخط کرائے ہوں گے اور پھر خود ہی درخواست منظور کر لی ہوگی۔

میں نے کئی بار وہاں سے بہانہ کر کے اٹھنا چاہا مگر ہر بار صاحب جی نے کسی نہ کسی کام سے لگا دیا اور اسی چکر میں دوپہر ہو گئی۔ اس دن صاحب جی کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ ان کے چپراسی نے لنچ ٹائم ہونے سے کچھ پہلے "خوشخبری" دی، وہ مجھے یہ عزت بخشنا چاہتے ہیں کہ میں حقیر فقیر لنچ ان کے ساتھ کروں، یعنی ان کے ساتھ کار میں بیٹھ کر لنچ کرنے جاؤں۔ اس دوران میں وہ مجھ سے کچھ ضروری دفتری بات چیت بھی کریں گے۔

لے بیٹا! پھنسا دیا اس نے جال میں! اب بول کیسے ... بھرے گا؟ میں نے اپنے دل سے کہا جو "خوشخبری" ... مچلنے لگا تھا۔ میں غور کرنے لگا کہ کیا داؤ چلوں جو اس ... لنچ میں اب بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا اور مارے ڈر کے ... خطا ہونے لگا تھا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ میں بغیر ... پا سکتا۔ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تاکہ اغوا ہونے سے پہلے کم ضروریات سے تو فارغ ہو ہی جاؤں، کیا خبر اغوا ہونے ... اس کا موقع ملے نہ ملے۔ ابھی میں کرسی سے اٹھا ہی تھا ... کا چپراسی ان کے کمرے سے نکل کر میری طرف بڑھا ... مجھے یاد کیا جا رہا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو صبح سے ... "یاد" تھی۔

"صاحب جی سے کہنا، میں ابھی پیشاب پھر کے آیا ..." چپراسی سے کہا اور پھر تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ چپراسی پیغام دینے صاحب جی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اگر میں وہاں مزید رکتا تو پیشاب خطا ہو جانے کا خدشہ ... پیشاب خانہ کار استعمال نما کمرے میں سے تھا۔ دفتر کی پچھلی سمت ... بنا ہوا تھا۔ ہال کمرے سے ایک چھوٹی سی راہداری اس طرف ...

میں تقریباً دوڑتا ہوا پیشاب خانے والی راہداری تک پہنچا ... وقت مجھے راہِ فرار نظر آ گئی۔ اسی راہداری کے اختتام پر ... سا دروازہ تھا جو عقبی گلی میں نکلتا تھا۔ یہ سنہری موقع ہے ... جائے۔ پیشاب خانہ اس راہداری میں دائیں جانب ... بھاگنے کو تو خیر میں بھاگ لیتا۔ وہاں مجھے اس وقت رکنے ... نہیں تھا مگر ظالم پیشاب "لب دم" تھا۔ اب پیشاب کے بغیر ... نہیں تھا۔ میں جھٹ سے پیشاب خانے میں گھس گیا۔ میں ... رہا۔ بس اے ظالم بس! مگر پیشاب تھا کہ آتے ہی چلا آ رہا ... آج اتر کر پھر کبھی نہ اترے گا۔ اسی دوران میں کسی کے قدموں کی ... سنائی دی۔ کوئی اور حاجت مند "رفع حاجت" کی خاطر ادھر ... میں پیشاب خانے سے نکلا تو میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ اب قریب ... تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر میرے پیشاب نے خطا ... چاہا مگر میں نے اسے اس بار ہرگز خطا ہونے کا موقع نہ دیا ... کا باوردی چپراسی تھا جسے یقیناً صاحب جی نے ادھر ... ہوگا کہ میں موقع پا کر ریس نہ لگا جاؤں۔ اس کے اور میرے درمیان ... صرف گز دو گز کا فاصلہ تھا، گویا یہ فاصلہ اغوا اور فرار کے درمیان ... اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پیشاب کرنے ادھر آیا ہو۔

"صاحب جی اپنے کمرے سے نکل کر باہر والے ... کا انتظار کر رہے ہیں، جلدی سے جائیے۔" چپراسی نے مجھ ... ہی کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بالکل قریب آ گیا۔

"تو کیا تم مجھے یہی بتانے ادھر دوڑے آ گئے تھے!" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "میں نے تم سے کہا تو تھا کہ ابھی پیشاب پھر کے آ رہا ہوں۔ کیا صاحب جی کو یہ بات نہیں بتائی تھی؟"

"میں نے صاحب جی سے کہہ دیا تھا جناب!" اس نے جواب ...

"... میں تو یہاں پیشاب کرنے آیا تھا۔"

"اچھا تو پھر تم پیشاب کرو، میں صاحب جی کے پاس جا رہا ہوں۔" ... پیشاب خانے کی سمت بڑھا۔

باوردی چپراسی بیچارہ مجبوراً پیشاب خانے میں گھس گیا۔ ادھر وہ پیشاب خانے میں گھسا، ادھر میں نے تیزی سے پلٹ کر پیشاب خانے کی کنڈی باہر سے لگا دی۔ اس نے اندر سے دروازہ پیٹا اور ساتھ ہی چیخا مگر میں اب وہاں کب رکنے والا تھا۔

میں بھاگتا ہوا عقبی دروازے سے نکل گیا اور پھر گلیوں گلیوں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بس چلتا ہی رہا۔ کافی دور جا کر میں ایک سڑک پر نکلا۔ وہ بھی کھاری باؤلی ہی کا علاقہ تھا مگر اب میں صفدر علی بیگ کے دفتر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ وہاں سے لاہوری گیٹ کا چوراہا زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے پتا نہیں کہ اس جگہ کو لاہوری گیٹ کیوں کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں گیٹ نام کی کوئی شے نہیں۔ بہرحال چوراہے سے میں نے ایک یکہ کیا اور اپنے دفتر یعنی کشمیری گیٹ روانہ ہو گیا۔ اب میرے پاس میدانِ عمل سے فرار ہونے کا مناسب جواز تھا۔

دفتر پہنچتے ہی بھیا بندو خاں سے مڈبھیڑ ہوئی اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ تو اپنی حور شمائل بیٹی، یعنی میری متوقع بیوی کی نیک سیرتی کے قصے سناتے رہے اور میں "ہوں ہاں" کرتا ہوا ان کے کھانے پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ کھانا کھاتے ہی میں بھیا بندو خاں کو گھسا دے کر وہاں سے بھوٹ لیا اور سیدھا تیواڑی جی کے کمرے کا رخ کیا۔

تیواڑی جی اس وقت مجھے خلافِ توقع کچھ بجھے بجھے سے لگے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ ان پر اوپر سے لتاڑ پڑی تھی۔ بات ہی ایسی تھی۔ وہ چاروں بلیک میلر جو بمبئی سے چل کر دہلی آ رہے تھے، راستے میں اللہ کو پیارے کر دیے گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ اتنی اہم بات لیک آؤٹ کیسے ہوئی! آخر مجرموں کو کیسے پتا چل گیا کہ بلیک میلر گرفتار کر کے دہلی لائے جا رہے ہیں؟ اس موقع پر اگر میں تیواڑی جی کو بتا دیتا کہ یہ کارنامہ ان کے خادم یعنی حضرت اللہ دتا نے انجام دیا ہے تو وہ میری ایک ایک بوٹی نوچ کر کھا جاتے۔ وہ میں ہی تو تھا جس نے سیٹھ دشوا ناتھ کو دھمکانے کی غرض سے اسے یہ بتا دیا تھا کہ بلیک میلر گرفتار ہو گئے ہیں اور اب لائے جانے والے ہیں۔ ان چاروں کو راستے میں کھانے کے اندر زہر دے دیا گیا تھا۔ تفتیش جاری تھی۔ وہ بیرا پکڑا گیا تھا جو ان لوگوں کے لیے ریل میں موجود باورچی خانے سے کھانا لے کر آیا تھا۔ بیرے کا بیان تھا کہ راستے میں ایک شخص اس سے ٹکرایا تھا اور سالن گرتے گرتے بچا تھا۔ بیرے کے خیال میں وہ کوئی مسافر تھا جو اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ بعد میں جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور اس مسافر کو تلاش کیا گیا جو بیرے سے ٹکرایا تھا تو ظاہر ہے وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ ان چاروں بدمعاشوں کو سپردِ خاک کرنے کے اخراجات خواہ مخواہ سرکار کے گلے پڑ گئے تھے۔ فکرمند ہونے کے باوجود تیواڑی جی نے مجھ سے ناوقت آنے کا سبب ضرور دریافت کیا تھا۔ میں نے جواب میں انھیں ساری کتھا کہانی سنا دی تھی اور اسی کے ساتھ وہ کاغذ بھی بطور ثبوت ان کے سامنے رکھ دیا تھا جس پر لیوسی نے اپنے اغوا کیے جانے کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ تیواڑی جی سگریٹ سلگا کر کچھ سوچنے لگے تھے۔

"اب کیا سوچنا ہے سر! مجرم کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔" میں نے تیواڑی جی کو خاموش دیکھ کر مشورہ دیا۔

"وہ کیسے؟" انھوں نے چونک کر پوچھا۔

"ہمارے پاس صفدر علی بیگ کی سرائے خلیل والی کوٹھی کا پورا پتا موجود ہے۔ اس پر فوراً چھاپا مارا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمھارے پاس وارنٹ ہے؟" تیواڑی جی نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ آپ بتا دیجیے۔" میں گڑبڑا کر بولا۔

"آپ بنا دیجیے!" تیواڑی جی نے میرے لہجے کی بھونڈی نقل اتاری۔ "پتا ہے، صفدر علی بیگ کا براہِ راست وائسرائے بہادر تک سے رابطہ ہے۔ تمھاری، میری سب کی نوکری دو منٹ میں تیل ہو جائے گی اگر وہاں کچھ نہ ملا۔"

"پھر... پھر کیا کیا جائے سر؟" میں بھولپن سے بولا۔

"پہلے اس بات کا تعین کر لینا اشد ضروری ہے کہ اب بھی لیوسی اسی کوٹھی میں ہے اور بھگوان داس کا قاتل بھی وہیں چھپا بیٹھا ہے، سمجھے!"

"بالکل سمجھا سر!"

"خاک سمجھے!"

"وہ بھی سمجھا سر!"

"کیا؟" تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑکیں اور میں دہل گیا۔

"کچھ... کچھ نہیں سمجھا سر!"

پھر تیواڑی جی ہی نے مجھے وہ بات سمجھائی جو سمجھنے کی تھی مگر اس دوران میں دلاور خاں، یعنی اپنے سابق باس کا نام سن کر جیسے میری سماعت میں کڑواہٹ سی گھل گئی جسے غالباً تیواڑی جی نے بھی محسوس کر لیا۔ وہ

بولے "میں انسپکٹر دلاور کو ہرگز تمھارے ساتھ نہ بھیجتا مگر کمار ابھی پوری طرح صحت مند نہیں ہوا ہے۔ میں نے آج بھی اس سے پوچھا تھا، ابھی اس کے بازو کا زخم پوری طرح نہیں بھرا۔"

کچھ دیر بعد ہی میں تیواڑی جی کے پاس سے اٹھ آیا۔ میں نے لاکھ تیواڑی جی سے کہا کہ وہ اس "مشن" پر صرف دلاور خاں کو بھیج دیں مگر وہ رام نہ ہوئے۔ ان کا فرمانا یہ تھا کہ کیس بنیادی طور پر میرا ہے اس لیے مجھے ضرور دلاور خاں کے ساتھ جانا پڑے گا، یعنی اپنی جانِ ناتواں کو داؤ پر لگانا پڑے گا۔

مجھے ابھی اپنے کمرے میں آکر بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرے سابق باس دلاور خاں اپنی چھیرکٹ مونچھوں سمیت آدھمکے اور آتے ہی بولے "اب پتا لگے گا بیٹا! کون کتنا بہادر ہے۔"

"بے شک، بے شک!" میں نے سر ہلایا۔

دلاور خاں میرے سامنے کرسی پر براجمان ہو گئے، پھر فرمایا "پہلی بار بس دھکیل میں تم سے کارنامہ سرزد ہو گیا تھا، گویا اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی تھی، اب دیکھوں گا تمھیں!"

"ضرور دیکھیے گا سر! یہ واقعی قابلِ دید شے ہیں۔" کمار نے گرہ لگائی۔ وہ کمرے ہی میں موجود تھا اور ہم دونوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"تم خاموش رہو!" دلاور خاں نے کمار کو ڈانٹ دیا۔ "یہ دو افسران کا معاملہ ہے اور ماتحتوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔" یہ کہہ کر دلاور خاں مجھ سے مخاطب ہوئے "ذرا کیس کی فائل دکھاؤ تاکہ میں اس کوٹھی کا پتا ذہن نشین کر لوں۔ ویسے بھی تیواڑی جی یہ کیس میرے ہی سپرد کرنے والے تھے۔"

میں نے خاموشی سے فائل میز کی دراز سے نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی اور وہ اس طرح اس کا مطالعہ کرنے لگے جیسے فائل پڑھتے ہی کیس حل کر دیں گے۔

دلاور خاں میرے پاس سے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ٹلے اور ٹلتے ٹلتے حکم جاری کیا "ٹھیک پونے بارہ بجے جامع مسجد کے صدر دروازے پر سیڑھیوں کے نیچے مجھے کھڑے ملنا، سمجھے! اور ہاں سیاہ کپڑے پہن کر آنا، اس کے علاوہ ایک سیاہ نقاب بھی جیب میں ڈالتے لانا۔"

تیواڑی جی مجھے یہ سب پہلے ہی بتا چکے تھے اور انھی سے دلاور خاں نے سنا ہوگا مگر وہ اس طرح حکم جاری کر رہے تھے جیسے انھی کی چھوٹی سی کھوپڑی میں تمام منصوبہ براہِ راست ٹپکا ہو۔ میں نے جواب میں سر ہلا دیا اور دلاور خاں مجھ پر ایک فاسلانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

میں دفتر سے گھر پہنچا تو مجھ پر سخت گھبراہٹ طاری تھی اور اس گھبراہٹ کا ایک بڑا سبب دلاور خاں تھے۔ ان کے انداز و اطوار اور گفتار سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے اگلے پچھلے تمام حساب بے باق کرنے کے چکر میں تھے۔ مجھے اور انھیں چوری چھپے بیگ کی سرائے خلیل والی کوٹھی میں داخل ہونا تھا۔ اس کے بعد کو تلاش کرنا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ تصدیق بھی کرنا تھی کہ وہاں ... کا قاتل اور اس کی "ساتھن" یعنی بندیا موجود ہے یا نہیں ... وہاں سے لیوسی کو چپ چاپ نکال لانا تھا کیونکہ بقول تیواڑی ... لیوسی کی زندگی خطرے میں تھی۔

دفتر سے میں سیاہ لباس اور نقاب کا بندوبست کر ... تھا اور گھر آتے ہی امی کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی تھی ... کو دفتر کے کام سے جانا ہے۔ جس وقت میں امی سے یہ بات ... میرا جی چاہ رہا تھا کہ لگے ہاتھوں ان سے اپنا دودھ بھی بخشوا ... کیا خبر واپسی ہو بھی یا نہیں! میں نے بمشکل اپنی اس خواہش کا ... کچلا تھا ورنہ اگر امی کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ ان کے لختِ جگر کی زندگی داؤ پر لگنے جا رہی ہے تو وہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ ... وہ بھلا کوئی معمولی مشن تو تھا نہیں، ایک نوخیز دختر بردہ حسینہ کو ظا... پنجۂ ستم سے چھڑانا تھا اور وہ بھی خطرناک ترین حالات میں! وہاں ... میں جہاں مجھے اینٹری دینی تھی، ایک عدد قاتل بھی موجود تھا ... نے میرے سامنے جگوان داس کو سورگ یا نرگ باش کر دیا ... بھلا مجھے "جنت مکانی" بنانے میں کوئی دیر لگاتا۔

پھر جب رات کو ٹھیک پونے بارہ بجے میں سیاہ لباس ... اور اپنے روئے زیبا پر بھی سیاہ نقاب چڑھائے، دلاور خاں کی ... پر ان کے پیچھے بیٹھا ہوا سرائے خلیل کی طرف جا رہا تھا تو مجھے ... رہا تھا جیسے سرائے خلیل نہیں مقتل کی طرف جا رہا ہوں۔



رات اندھیری، راہیں سونی اور چاروں طرف موت کے فرشتے پھر پھر اڑتے ہوئے! بھلا کب کوئی یوں اپنی موت کا سامان کرتا ہوگا جیسا کہ میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے کیا تھا۔ دلاور خاں نے ... آدھا دم تو راستے ہی میں نکال دیا۔ وہ دو ڈرائی پھٹ پھٹ ... بار بار میں ان کی چوڑی چکلی پشت سے لپٹ لپٹ گیا۔ انھوں نے اس حرکت پر مجھے کئی بار ڈانٹا بھی مگر جس کی زندگی کو خطرہ درپیش ہو وہ تھوڑی بہت ڈانٹ پھٹکار سے کب باز آتا ہے۔ موٹر سائیکل پر بھی چلاتا ہوں مگر اس طرح نہیں کہ راستے میں انگریزی کا ... بناتا چلوں۔ ایک بار میں نے ان سے گھگھیا کر کہا بھی کہ ... بھی اس کوٹھی کا پتا یاد دے، میں وہاں پیدل چل کر آ جاؤں گا، ... مجھے پھٹ پھٹ سے اتار دیں مگر وہ بھلا اس موقع کو کس طرح ... دیتے۔ میں نے آخر اتنی جسارت ہی کیوں کی کہ ان کی ماتحتی سے نکل بھاگا اور نہ صرف نکل بھاگا بلکہ ان کا مدِمقابل بن بیٹھا۔ وہ اسے اپنی کسرِ شان ہی سمجھتے تھے۔ مجھ جیسا کل کا لونڈا اور انسپکٹر! بقول ان کے بڑا برا زمانہ آ لگا تھا۔ اس بات کا اظہار وہ دفتر میں ہر ایک سے کرتے رہتے تھے اور یہ باتیں میرے کانوں تک بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ میں اب تک ان باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا رہا تھا لیکن اب تو میں ان کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ انھوں نے شاید طے کر لیا تھا کہ مجھے نااہل، بزدل اور نہ جانے کیا کیا ثابت کر کے چھوڑیں گے اور میں یہ سب ثابت کروانے پر مجبور تھا۔

خدا خدا کر کے سرائے خلیل کا علاقہ شروع ہوا۔ یہ علاقہ کاروباری زیادہ اور اقامتی کم تھا اس لیے یہاں قبرستان کی سی خاموشی طاری رہتی۔ یوں بھی اب نصف شب کا وقت تھا۔ اس قبرستان کی سی خاموشی میں دلاور خاں کی پھٹ پھٹ کا شور اتنا بلند ہو رہا تھا کہ قبروں سے مُردے تک اٹھ کر حقیقتِ حال دریافت کرنے آ جائیں اور پوچھیں، اے لوگو! آخر تمھیں کیا تکلیف ہے جو یوں رات کو آوارہ پھر رہے ہو؟ اس موقع پر میں نے دلاور خاں کو مشورہ دیا کہ وہ پھٹ پھٹ سے اتر لیں ورنہ دشمن کو سُن گُن لگ جائے گی۔ پتا نہیں کیوں انھوں نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔

پھٹ پھٹ سے اتر کر میری جان میں جان آئی کہ چلو اس مرحلے میں تو جان بچ ہی گئی، اب آگے جو ہو، اللہ مالک ہے۔

دلاور خاں نے شاید دن کے وقت ہی ادھر کا ایک پھیرا لگا لیا تھا ورنہ وہ اس آسانی سے سیدھے مطلوبہ کوٹھی کی طرف نہ بڑھتے رہتے۔ ویسے وہ ڈینگ سی مارتے تھے کہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وہ سیدھے اسی کوٹھی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے اس جھوٹ کا پول اس وقت اور کھلا جب کوٹھی سے کچھ فاصلے پر انھوں نے گھنی جھاڑیوں کے درمیان اپنی پھٹ پھٹ چھپائی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے سلیمانی سرمہ تو لگا نہیں رکھا تھا جو انھیں اندھیرے میں سب کچھ صاف صاف نظر آ رہا ہو۔ اس اندھیرے میں جھاڑیوں کی تلاش بہرحال اتنی آسان نہیں تھی۔

جہاں پھٹ پھٹ چھپا کر کھڑی کی گئی تھی، وہاں سے کوٹھی زیادہ دور نہیں تھی۔ دلاور خاں آگے آگے تھے اور میں پیچھے پیچھے تاکہ اگر کوئی خطرہ ہو تو چپ چاپ سے انھیں وہیں چھوڑ کر ریس لگا جاؤں۔ ایک ایک قدم سو سو من کا ہو رہا تھا اور دل کا یہ عالم تھا کہ ساری زندگی کے لیے اسے جو دھڑکنیں الاٹ ہوئی ہیں بس ابھی انھیں خرچ کر دے گا۔

کوٹھی کی چار دیواری کے قریب پہنچ کر دلاور خاں نے میرے کان سے منہ لگایا اور غرّائے "ہمیں اس چار دیواری پر چڑھنا ہے۔"

"مگر یہ تو بہت اونچی ہے سر!" میں منمنایا۔ اس موقع پر میں نے

دلاور خاں کو تکلفاً "سر" نہیں کہا تھا بلکہ سچ مچ "سر" بلکہ "دماسر" مان لیا تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں!" وہ پھنکارے۔

"آپ کیا کریں، ہاں یہ ایک مسئلہ ضرور ہے۔" میں نے پُر فکر انداز میں سر ہلایا۔ "آپ ایسا کریں سر کہ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر چار دیواری پر چڑھ جائیں۔" میں نے انھیں مشورہ دیا۔

"اور تم؟"

"مم ... میں ... میں سر! ... میں یہیں رہ کر آپ کا انتظار کروں گا ... آپ اندر گھوم پھر کے آجائیے۔"

"واہ بیٹا! تو تو بڑا چالاک ہے! میں اندر چلا جاؤں، موت کے مُنہ میں کود جاؤں اور تو یہاں چین کی بنسری بجاتا رہے۔" دلاور خاں چمک کر بولے۔ "ہرگز نہیں! تمھیں بھی میرے ساتھ اندر چلنا پڑے گا۔ مجھ سے زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو، میں نے تم جیسے بہت سے لونڈے چلائے ہیں اور تم جیسے کتنے ہی میری ٹانگ کے نیچے سے نکل چکے ہیں۔"

پھر میں نے دلاور خاں کو لاکھ یقین دلایا کہ میرے پاس "بنسری" وغیرہ بالکل نہیں جو میں بجاؤں اور نہ میرے پاس پَر ہیں کہ اڑنے کی کوشش کروں مگر وہ نہ مانے۔

"تو پھر چڑھیے!" میں نے مردہ دلی سے کہا۔ "میں بھی کوشش کرتا ہوں۔"

دلاور خاں خاصے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا کر چار دیواری تو پکڑ لی مگر اپنا جسم نہ اٹھا سکے۔ حالانکہ میں بآسانی چار دیواری پر چڑھ سکتا تھا مگر بھلا کیوں موت کے مُنہ میں کودنے پر راضی ہوتا اور پہل کرتا۔ میں نے انھیں ناکام دیکھ کر پھر اپنا مشورہ دُہرایا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولے۔ "مگر میں چار دیواری پر چڑھ کر تمھیں بھی اوپر کھینچ لوں گا۔" انھوں نے آخر میں وارننگ دی۔

پہلے چڑھ تو سہی "بیٹا رام!" بعد میں کون تیرے ہاتھ میں ہاتھ دے گا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور بولا۔ "بالکل سر آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" دلاور خاں برف خانے کے چمار کی طرح اینٹھ گئے۔

اس کے بعد میں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دلاور خاں کے جسم پر کتنا "بدگوشت" موجود ہے لیکن جب انھوں نے میرے کندھوں پر سواری کی تو میرے مُنہ سے بڑے زور کی "ہائے" نکل گئی۔ دلاور خاں نے جواب میں دَم دلاسا دینے کی بجائے ڈانٹ پلائی اور مجھے آہستہ آہستہ اٹھنے کا حکم دیا۔

ظاہر ہے کہ ان کے بوجھ کو لے کر اٹھنا مجھ ناتواں کے بس میں تھا ہی کب جو تعمیلِ حکم کرتا۔ ہاں یہ ضرور ... کر انھیں زمین پر پٹخ دیتا۔ میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کر دیا۔

"اچھا یونہی بیٹھے رہو! میں اسی طرح چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔" دلاور خاں نے کہا اور اسی وقت کہیں قریب ہی سے کتوں کی غراہٹیں سنائی دیں۔

میرے جسم پر موجود سارے رونگٹے اٹین شن ہو گئے۔

"یا الٰہی!" دلاور خاں کی آواز بھی سنائی دی جس میں ... پر گھبراہٹ کا عنصر شامل تھا۔

کتوں سے میری رُوح فنا ہوتی ہے اس لیے کہ وہ نہ صرف ... اور بھونکتے ہیں بلکہ کاٹ بھی لیتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کم بخت کہاں ... غراہٹیں نشر کر رہے تھے۔ وہ کہیں میرے آس پاس ... تھے اور آس پاس ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ... دانت میرے کولھے وغیرہ میں اتر سکتے تھے۔ یہ خیال آتا تھا کہ ... سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ پتا نہیں مجھ میں کہاں سے ... طاقت آئی اور مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دَم اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے ... ارے!" دلاور خاں نے میری غیر متوقع حرکت پر صدائے احتجاج بلند کی مگر اس وقت ہر صدا پر کتوں کی صدا ... ہو رہا تھا کیوں کہ اب وہ باقاعدہ بھونکنے لگے تھے۔

مجھے تو بس اتنا احساس ہوا تھا کہ اچانک میرے کندھوں پر موجود ناقابلِ برداشت بوجھ ختم ہو گیا تھا۔ پھر میں نے دلاور خاں کی چیخ سنی تھی جو چار دیواری کی دوسری سمت سے سنائی دی ... میرے ایک دَم اٹھ کھڑے ہونے کے سبب وہ شاید بلکہ یقیناً اندر جا پڑے تھے اور کتے ان کا سواگت یعنی استقبال کرنے پہنچ پڑے تھے۔ کتوں کی آوازوں اور دلاور خاں کی چیخوں کے ساتھ ساتھ ہی کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا اور انہی چند لمحوں ... مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میری جانِ ناتواں خطرے سے دوچار ... بلکہ تین چار ہو چکی ہے۔ واقعہ سخت تھا اور جان عزیز ... پیش آ چکا تھا، وہ اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔

چار دیواری کی دوسری سمت پہرے کی خاطر کتے ہوں گے جنھوں نے یقیناً دلاور خاں کو تاک لیا ہوگا۔ پہلے انھوں نے ... نکال کر دلاور خاں کو دھمکانے کی کوشش فرمائی ہوگی اور پھر ... دلاور خاں کسی ناخواندہ مہمان کی طرح اندر جا ہی پڑے ہوں گے ...

... کی مزاج پُرسی کی ہوگی اس کے بعد اپنے نوکیلے دانتوں ... واضح کرنے لگے ہوں گے۔ ان کتوں کی زبان سمجھنے والے ... وہاں موجود رہے ہوں گے جو کمک لے کر ان کے پاس ... ہوں گے۔

... میں وہاں سے بھوٹ لینے کے امکانات پر غور ہی کر رہا ... دلاور خاں کا واویلا کچھ تیز ہو گیا۔ پھر بھاری قدموں ... دیئے گئے۔ کتوں کا کورس بھی بطور بیک گراؤنڈ ... غالباً دلاور خاں کتوں کی آؤ بھگت سے ناخوش ہو ... گیٹ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ بھاری قدموں کی ... کے پہاڑ جیسے جسم کی ہو سکتی تھی۔ چار دیواری کی ... سے بلند ہونے والے صوتی اثرات سے میں نے یہی ... لیا تھا۔

... دلاور خاں کو وہاں چھوڑ کر بھاگوں کہ نہ بھاگوں؟ میں اسی ... میں مبتلا تھا کہ کچھ فاصلے پر موجود کوٹھی کا پھاٹک ایک ... آواز کے ساتھ کھلا۔ میں نے دلاور خاں کے ہیولے کو ... سے نکل کر بھاگتے دیکھا، ان کے پیچھے پیچھے تین عدد کتوں ... تھے جو بھونک بھونک کر شاید دلاور خاں سے یہ کہہ ... "ایسی بھی کیا جلدی ہے، چلے جانا، ابھی تو آئے تھے۔" ... دلاور خاں بھاگے، اِدھر ان کے پیچھے کتے لپکے، پھر چند لمحے بعد ... دوڑتے ہوئے پھاٹک تک پہنچے۔ ان کے ہاتھوں ... ٹارچیں جن میں سے ایک کی روشنی دلاور خاں اور کتوں ... پر تھی اور دوسری ٹارچ کا دائرہ اِدھر اُدھر گردش ... وہ دوسرا شخص غالباً دلاور خاں کے کسی ساتھی یا ساتھیوں ... ٹارچ گھما رہا تھا۔

... اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا۔ وہاں سے حرکت کرنے کا مقصد ... کو خطرے میں ڈالنا ہوتا۔ میں کسی وقت بھی ٹارچ ... کی زد میں آ سکتا تھا۔ اس وقت بوکھلاہٹ کے سبب ... ذہن ہی سے نکل گئی تھی کہ ٹارچ کا دائرہ حرکت ... ضروری نہیں تھا کہ وہ اس جگہ سے گزرتا ہی نہیں جہاں ... کھڑا تھا۔

... ہوا، میری حماقت رنگ لے آئی۔ روشنی کا متحرک ... پہنچ ہی گیا۔

... کا ساتھی!" ان دونوں میں سے شاید وہی چیخا جس نے ... لیا تھا۔

... دلاور خاں کو کتے ریس لگوا رہے تھے، ان دونوں نے غالباً ... کا پروگرام بنا لیا۔

... نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جدھر مُنہ تھا اُدھر بھاگ لیا مگر فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کیوں میں انہی دونوں کی طرف دوڑنے لگا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں پلٹ کر مخالف سمت بھاگا۔ "یہ آؤ دیکھا نہ تاؤ" دیکھنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے کچھ نہ دیکھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو!" وہ دونوں پیچھے سے نعرے مار رہے تھے مگر میں بھلا کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ میں اب اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ ان کی باتوں میں آ جاتا۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر ان کے ہتھے چڑھ گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کہیں ان میں سے کسی کے پاس ریوالور نہ ہو۔ وہ بہ آسانی دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹوا سکتے تھے مگر اسی خیال کے ساتھ دوسرے خیال نے میرا پیشاب خطا ہونے سے روک لیا تھا۔ دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا تھا کہ اگر ان کے پاس ایسا کوئی خوفناک ہتھیار ہوتا تو اب تک استعمال کر چکے ہوتے یا اگر ہے تو مصلحتاً استعمال نہیں کرنا چاہتے تاکہ گولی چلنے کی آواز سن کر آس پڑوس والے اِدھر نہ دوڑ پڑیں۔ یہ سوچ کر میں بگٹٹ دوڑتا ہی رہا۔

دوڑتے دوڑتے اچانک موڑ آیا اور میں اِدھر مڑ گیا۔ میں اب تک چار دیواری کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا کیوں کہ وہاں آتے وقت میں نے اندازہ کر لیا تھا آس پاس جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے تھے۔ کسی جھاڑی میں اُلجھ کر میں گر بھی سکتا تھا یا کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر ہاتھ پیر توڑ سکتا تھا۔

وہ موڑ بھی چار دیواری کا تھا گویا میں اسی کوٹھی کے گرد چکر کاٹ رہا تھا یا چکر کاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ رات کا وقت، اندھیرا اور دشمن تعاقب میں، ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرا سٹر بڑا جانا یا عقل سے پیدل ہو جانا کوئی غیر معمولی کیس نہیں تھا۔

ابھی مجھے موڑ سے گزر کر بھاگتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پیچھے سے ٹارچ کی روشنی پڑی۔ میری نگاہ سامنے تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ایک گھنے درخت پر پڑتی ہوئی دیکھی جو مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ پیڑ عمارت کی چار دیواری سے زیادہ دور نہیں تھا۔

اگر میں تیزی سے بھاگ کر اس پیڑ پر چڑھ جاؤں تو دشمن کو "گولی" دے سکتا ہوں۔ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ ٹارچ وقفے وقفے سے جل اور بجھ کر گویا میری رہنمائی کا فرض ادا کر رہی تھی۔ دشمن بار بار ٹارچ کی روشنی ڈال کر اپنا دل "پلشوری" کر لیتے تھے کہ ان کا شکار ابھی غائب نہیں ہوا بلکہ "پُنیاں پُنیاں" ان کے آگے آگے دوڑ رہا ہے۔

پیڑ تک پہنچتے پہنچتے میں بُری طرح ہانپ چکا تھا۔ یہ

"ہپ ہپ!" کچھ تو خوف کے سبب تھی اور کچھ دوڑ لگانے کے سبب۔ پیڑ پر چڑھنا میرے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا اس لیے مجھے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ عام حالات ہوتے تو مجھے اتنی دیر بھی لگتی جتنی دیر اس وقت لگی پھر اگر جوتے اتارنے کی مہلت بھی مل جاتی تو اتنی مشکل بھی پیش نہ آتی۔ وہ تو خیریت گزری کہ پیڑ کا تنا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں جلد ہی کسی بندر کی طرح ایک موٹی سی شاخ تک پہنچ گیا۔ میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ چند لمحے وہاں اسی ڈال پر بسیرا کیجیے۔ یوں مگر دشمنوں کے خوف نے میری اس خواہش پر پانی پھیر دیا۔ میں پھدک کر ایک اور اونچی شاخ پر چڑھ گیا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک مجھے یقین نہ ہو گیا کہ دشمن کی نظر سے محفوظ ہو چکا ہوں۔ اس وقت میری چھوٹی سی کھوپڑی میں دور دور تک یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ناہنجار بھی میری ہی طرح بندر ثابت ہو سکتے ہیں اور انھیں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ میں اس پیڑ پر براجمان ہوں۔

مجھے اس بات کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا جب میں پیڑ پر چڑھا تھا کہ میرے علاوہ وہاں اور بھی بسیرا کرنے والے موجود تھے جن میں سے دو ایک تیاؤں تیاؤں اور ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے ہوئے اڑ گئے تھے اور بقیہ غالباً اڑنے کو پر تول رہے تھے۔ شاید انہی کمبختوں کی وجہ سے دشمنوں کو یہ شبہ ہوا تھا کہ میں پیڑ پر چڑھ گیا ہوں۔

ایک شاخ پر ڈیرا جمائے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی دھمک بالکل پیڑ کے نیچے آ کر رک گئی۔ پھر میں نے ٹارچ کے روشن دائرے ادھر ادھر حرکت کرتے دیکھے۔ یا خدا! مجھے دشمن سے محفوظ رکھ! میں نے دل ہی دل میں دعا کی، بہ آوازِ بلند اس لیے دعا نہیں کی کہ کہیں خدا کی بجائے دشمن میری دعا سن کر اسے بددعا میں تبدیل نہ کر دیں۔

"وہ جا کہاں سکتا ہے!" سناٹے میں ایک آواز ابھری جو یقیناً دشمنوں ہی میں سے کسی کی آواز تھی۔ ہانپنے کے سبب وہ بھی پوز دے دے کر بول رہا تھا۔ "میں نے ابھی تو اس پر ٹارچ کی... روشنی پھینکی تھی۔"

"ہاں میں نے بھی اسے دیکھا تھا، وہ سیدھا ہی دوڑ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے..." جواب میں دوسری ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ہانپنے کے سبب ہی وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر پایا تھا۔

پہلے شخص نے اس پوز کو غنیمت جان کر فوراً سوال جڑ دیا۔ "کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ کہ وہ اس پیڑ پر چڑھ گیا ہو۔" دوسرے شخص نے اپنے "ہو سکتا ہے" کی تشریح کر دی۔

مگر پہلا کچھ زیادہ ہی "کائیاں بالک پن" کا ثبوت دے رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے اتفاق نہیں کیا اور میرا جی چاہا کود کر اس پر قربان ہو جاؤں مگر ایسا سوچا تو جا سکتا تھا، کیا جا سکتا تھا ورنہ وہ مجھے سچ مچ قربانی کا بکرا بنا سکتا تھا۔ گلے پر چھری پھیرنے سے پہلے پھر بھی اسے دانہ پانی دکھا پلا دیتے ہیں مگر مجھے ان سے یہ توقع نہیں تھی۔

"اگر وہ پیڑ پر نہیں چڑھا تو پھر آخر کہاں مر گیا؟" کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی جس میں کسی قدر جھ... جاتی تھی۔

"مریں تو تیرے اماں ابا، میں کیوں مروں!" اس شخص کی زبان سے اپنے لیے مرنے کا ذکر سن کر اتنا جھلا گیا کہ جو منہ میں آیا وہ زبان پر پھسل پڑا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا تھا اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے کہ اول فول نہ بک جاؤں جسے سن کر میرے دشمن ...

"ارے... یہ... یہ آواز کہاں سے آئی!" یقیناً اچھل پڑا ہو گا جس کا اظہار اس کے لہجے سے ہو رہا تھا۔

"آواز میں نے بھی سنی ہے اور اب یقین ہے کہ وہ پیڑ ہی پر چڑھا ہوا ہے۔" دوسرے شخص نے پُر... میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دو ٹارچوں کی آڑھی ترچھی روشنی ... اور شاخوں سے اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ میرا دل جیسے اچھلتا ہوا حلق میں آ گیا اور وہاں پہنچ کر "دھائیں دھائیں" کی رٹ ... نہ جانے اس وقت اس دل کم بخت کو یہ کیا شرارت سوجھی تھی بہرحال میرا دل تھا، "اللہ دتا" کا دل کسی ہیرو کا دل نہیں جو حالات میں معمول کے مطابق اپنی جگہ فٹ رہ کر دھک دھک ... رہتا ہے اور ادھر ادھر نہیں ٹہلتا۔

میں خوف کے سبب کچھ اور سمٹ سمٹا گیا پھر اس چ... ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگا جو بلی یا چوہوں کو سامنے دیکھ کی آرزو کرتا ہے۔ میں کوئی چھوٹا سا چوہا نہیں، اللہ دتا تھا اس ... کوئی بِل تو نظر نہیں آیا، ہاں ٹارچ کی روشنی نے مجھے اتنا ... ولا دیا کہ میں کہاں ہوں۔

جس پیڑ پر میں براجمان تھا اس کی کچھ شاخیں اس چھت تک پہنچ رہی تھیں جس سے وہ دشمن برآمد ہوئے تھے اس کھوئی کھوئی آنکھوں والی لونڈیا یعنی لیوسی عرف جمیا کا ... تھا۔ اس عمارت میں بندیا اور رنجیت بھی ہو سکتے تھے۔ ... پھر بھی صنفِ نازک تھی مگر رنجیت سے میری بڑی خراب ہوا ... نے خود میری آنکھوں کے سامنے بھگوان داس کو گولی مار دی تھی۔ ... قاتلوں سے نہیں ڈرتے یقیناً بڑے بہادر ہوتے ہوں ... بہت ڈرتا تھا اور ڈرتا ہوں۔ ان تمام باتوں کو مدِنظر ...

...ارت میرے لیے مقتل سے کم نہیں تھی پھر بھلا میں خود اپنے ...ے چل کر مقتل کی طرف کس طرح چلا جاتا۔

"...وہ... وہ دیکھو پیڑ!" سناٹے میں ایک آواز گونجی اور میں نے ...اپنا پیر کھینچ لیا جس پر نہ جانے کیسے کسی ٹارچ کی روشنی پڑ ...ی۔

"تم نیچے رہو، میں پیڑ پر چڑھتا ہوں۔" دشمنوں میں سے ایک ...نے ساتھی سے کہا۔ "اگر وہ پیڑ سے نیچے کود پڑے تو تم اسے ... لینا۔"

"ٹھہرو، زیادہ بہادر بننے کی کوشش نہ کرو، ریوالور اس کے ...ی ہو سکتا ہے!"

"نہیں اس کے پاس ریوالور نہیں ہو سکتا ورنہ وہ اس طرح نہ ... مجھے پیڑ پر چڑھنے دو۔"

مجھے ان کم عقلوں کی عقل پر رونا آیا جو یہ سمجھ رہے تھے کہ میرے ...یوالور نہیں ہے مگر یہ رونے کا نہیں عمل کا وقت تھا، میدانِ عمل ...ود پڑنے بلکہ چھلانگ لگانے کا وقت! میں نے اسی لیے رونے ...رام ملتوی کر دیا۔ ان لوگوں کے "مذاکرات" سے پہلی بار مجھے یہ ...یا تھا کہ میرے پاس ریوالور بھی موجود ہے مگر یہ خیال بھی بس ...ی کی حد تک رہ گیا۔ ریوالور تو تھا مگر اس خطرناک ہتھیار کو چلاتا ...یں اور کسی جیتے جاگتے زندہ آدمی کو گولی مار دیتا، یہ بھلا کس ...کن تھا چاہے وہ میرا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ میں ...ے ڈرانے دھمکانے کا کام لے لیتا مگر اس وقت تو میں خود اتنا ...ڈرا ہوا تھا کہ خطرہ تھا کہیں سرکاری ریوالور ہی ہاتھ سے نہ چھوٹ ...ئے۔ یہی سبب تھا کہ اس وقت بار بار ہمت پکڑنے کے باوجود ...والور نہ نکال سکا جو میرے سیاہ لباس کی ایک اندرونی جیب ...ڑا ہوا تھا۔

...یرا ذہن ابھی "کیا کروں، کیا نہ کروں" کی گردان میں مصروف تھا کہ ...ل میں سے ایک نے پیڑ پر "چڑھائی" کا آغاز کر دیا۔

...اب بولو بیٹا اللہ دتا! آ پہنچا نا آخر وقت! اور دکھاؤ بزدلی! ...اگو اور نہ بچو اور پیڑ پر چڑھ جاؤ۔ میرے اندر جیسے کوئی "گھمکا"! ...بجنے لگے حلق میں دل کی "دھائیں دھائیں" کچھ اور بڑھ گئی۔

"...کود پڑو میدانِ عمل میں، لگا دو چھلانگ میدانِ عمل میں ورنہ! ...گزر جائے گا اور تو طوطا بنا رہ جائے گا۔" میرے اندر سے صدائیں ...آتی رہیں اور پھر یہ صدائیں مجھ پر اتنی چھا گئیں کہ میں نے واقعی ...ا یعنی اس عمارت کی چھت پر چھلانگ لگانے کا ...ر کر لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی کہ ...اخ پر براجمان تھا اس سے اتر کر دوسری اور پھر تیسری شاخ تک پہنچ گیا۔ یہی تیسری ظالم شاخ اس عمارت کی چھت تک پہنچتی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہیں تھا، ہوش تھا تو بس اتنا کہ کسی نہ کسی طرح عمارت کی چھت تک پہنچ کر فوری پیش آنے والے خطرے سے تو نجات حاصل کر ہی لوں۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ نہ اس وقت مجھے ان کتوں کی "بھوں بھوں" سنائی دے رہی تھی جو دلاور خاں کو ریس لگوا کر دوبارہ اس عمارت میں راگ الاپنے لگے تھے اور نہ یہ خیال رہا تھا کہ اگر میں پیڑ سے نیچے جا پڑا تو میرا کیا حشر ہو گا۔

پتا نہیں پیڑ پر "چڑھائی" کرنے والا بہت محتاط تھا جو آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر پیڑ پر چڑھ رہا تھا یا میرے ہی جسم میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا میرے حق میں بہتر تھا اس لیے کہ جب میں نے اس عمارت کی چھت پر چھلانگ لگائی اور پیڑ کی طرف مڑ کر دیکھا تو دشمن لاپتا تھا۔

میرا دشمن پیڑ پر چڑھا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی میری طرح اس عمارت کی چھت پر زقند مار سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں دشمن کا انتظار کرنے کے لیے وہاں رکا نہیں اور فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔ اتنی دیر اندھیرے میں رہنے کے سبب مجھے کچھ کچھ سجھائی دینے لگا تھا۔ اب مجھے یہ فکر تھی کہ اس چھت سے نیچے جانے کا راستہ بھی ہے یا نہیں کیوں کہ چھت بہرحال دشمن کے شر سے محفوظ نہیں تھی۔ نیچے بھی دشمن ہی دشمن ہو سکتے تھے مگر فی الحال مجھے اس دشمن کی فکر تھی جو بالکل میری چاند پر ہی سوار ہونے کی فکر میں تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے کچھ فاصلے پر مجھے چھت کی دائیں جانب ایک چھوٹی سی منڈیر کا ہیولا سا نظر آیا۔ میں اس طرف لپکا۔ ابھی میری "لپک جھپک" کسی خاص نتیجے تک نہ پہنچ سکی تھی کہ "دھم" کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ "دھم" عقب سے سنائی دی تھی جدھر پیڑ تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دم مڑ کر دیکھ لیا اور شاید اس "دھم" نے بھی میرا ہیولا دیکھ لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ "دھم" کی وہ آواز پیدا کرنے والا، میرا دشمن ہی ہو سکتا تھا جو چھت پر کود چکا تھا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!" سانپ کی سی پھنکار سنائی دی۔

میں اب اس منڈیر کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور اس کی حقیقت مجھ پر عیاں ہو چکی تھی۔ اس منڈیر کی دوسری جانب سیڑھیاں تھیں، ویسی ہی چھوٹی سی منڈیر سیڑھیوں کی دوسری جانب تھی۔ کچھ اور نہیں تو میں جھپٹ کر اس منڈیر کی دوسری جانب تو پہنچ ہی سکتا تھا تاکہ اگر سچ مچ دشمن گولی چلا دے تو وقتی طور پر ہی سہی، میری جان تو بچ جائے۔ دشمن کی پھنکار سن کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔ میں بھلا کچی گولیاں تھوڑی کھیلا تھا جو اس کے کہنے سے

وہاں مرنے کے لیے رُک جاتا۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میرے دشمن کو میری طرح اندھیرے میں کچھ زیادہ نہیں سوجھ رہا ہوگا۔ وہ مجھے صرف اس لیے رکنے کو کہہ رہا تھا کہ ذرا سکون و اطمینان سے گولی مار سکے۔

اُلو کی دُم! میں نے اپنے دشمن کو اپنی دانست میں اُلو کی دُم سوچ کر گویا انتقام لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے تیزی کے ساتھ حرکت کی۔

"ٹھہر جا!" مجھے کھسکتے دیکھ کر دشمن پھر دہاڑا مگر اب میں کہاں ٹھہرنے والا تھا۔

میں منڈیر کی دوسری جانب پہنچ کر ایک ہلّے میں دو دو سیڑھیاں اترتا ہوا بھاگا۔ بھاگنے کا سبب اور وہاں نہ رکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ظالم جب چھت تک پہنچ سکتا تھا تو سیڑھیوں تک پہنچنے میں اسے کیا دیر لگتی۔

اب میں نے اوکھلی میں سر تو دے ہی دیا تھا اس لیے موسل سے ڈرنا فضول تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا اور دل کڑا کر لیا تھا کہ جو ہو سو ہو مگر اس ظالم کے ہاتھ نہیں آؤں گا جو واضح الفاظ میں مجھے قتل کی دھمکی دے چکا تھا۔

زینے کے اختتام پر مجھے مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ اسی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک کواڑ بھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور دوسرا کھلا ہوا۔ زینے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب میں صاحب جی یعنی صفدر علی بیگ کے نوکر کو پیشاب خانے میں بند کر کے وہاں سے پھوٹ لیا تھا۔ یہ منظر میری آنکھوں میں اس لیے ریپیٹ ہوا تھا کہ مجھے وہاں بھی کواڑ نظر آ گئے تھے۔ یہ کواڑ میری جان بچانے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔

پھر میں نے وہی کیا جو سوچا تھا۔ زینے سے اترتے ہی جھٹ کواڑ بھیڑے اور کنڈی لگا دی۔ کنڈی لگاتے ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے میں نے جہنم کا یا موت کا دروازہ بند کر دیا ہو۔ اسی وقت

"دھڑ دھڑ" سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔

"اب نہ لگا چتا میں تیرے ہاتھ!" میں بڑبڑایا اور فوراً ہی زینے کے دروازے سے ہٹ گیا یوں جیسے دروازے کی دوسری جانب آدمی یا میرا دشمن نہ ہو شیر ہو۔

فوری خطرے سے وقتی طور پر محفوظ ہونے کے بعد میرے تنے ہوئے اعصاب کسی قدر ڈھیلے پڑے۔ دل اپنی جگہ حلق سے دوبارہ سینے میں پہنچ گیا مگر اس کی "دھاڑ دھاڑ" اب بھی جاری تھی۔ میں نے خود کو ایک برآمدے میں پایا۔ اس برآمدے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اسی بلب کی مدھم روشنی زینے تک پہنچ رہی تھی۔

برآمدے میں اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ برآمدے کی بائیں جانب بڑا سا صحن تھا اور صحن کی دوسری جانب بھی ویسا ہی برآمدہ تھا۔ وہاں بھی ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ اس طرف بلب کے علاوہ اور کوئی روشنی نہیں تھی لیکن اس طرف والے برآمدے میں کچھ فاصلے پر بلب کے علاوہ بھی روشنی تھی۔ وہ روشنی ایک کھلے ہوئے دروازے سے برآمدے تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کچھ دور ایک بڑا سا دروازہ نظر آیا جو کھلا ہوا تھا۔ وہ شاید صدر دروازہ تھا جسے کھول کر میرے دشمن باہر گئے ہوں گے۔

میرے اندازے کے مطابق اس عمارت میں صفدر علی

بیگ، بندیا اور رنجیت کو بھی ہونا چاہیے تھا مگر اس وقت تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عمارت خالی پڑی ہو۔

یہ تمام جائزہ لینے میں چند ہی لمحے صرف ہوئے تھے مگر ان چند لمحوں میں عمارت کو خالی محسوس کر کے میرے دل سے اس عمارت کی وہ دہشت نکل گئی تھی جو پہلے میرے دل میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر وہاں کوئی تھا تو صرف اسی کمرے میں تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کہیں وہ سب کم بخت اسی کمرے میں تو موجود نہیں مگر اس خیال کو میں نے فوراً ذہن سے جھٹک دیا۔ اگر وہاں کوئی ہوتا تو ان حالات میں یوں کمرے کے اندر بیٹھ کر چین کی بنسری نہ بجا رہا ہوتا۔ عمارت میں کسی کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہاں لیوسی عرف چمپا بھی نہیں تھی۔ پھر یہ کہ اگر وہ وہاں کسی کمرے میں بند بھی تھی تو مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جب خود آدمی کی جان کو خطرہ ہوتا ہے تو اسے دوسرے کی جان سے دلچسپی نہیں رہتی، وہ اپنی جان کی فکر کرتا ہے۔ میں بزدل تھا اور ہوں، کوئی ہیرو نہیں اس لیے مجھے بھی بس اپنی جان کی فکر تھی کہ کسی طرح وہاں سے بچ بچا کر نکل جاؤں۔ رہا لیوسی کو اس عمارت سے بخیر و خیریت نکال لے جانے کا مشن، تو اس پر میں نے خاک ڈال دی تھی اور یوں بھی یہ مشن میرے نہیں دلاور خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔ میں تو بس ان کی ونگ تھا۔ یہ الگ بات کہ حالات ہی کچھ ایسے پیش آ گئے تھے جو سارا بوجھ مجھ ناتواں کے کمزور کاندھوں پر آ پڑا تھا۔

بس مجھ پر ایک دھن سوار تھی "فرار"۔ میرا اپنا عمل تھا ... اچھل کود کر لی میدانِ عمل میں! اب خیریت اسی میں تھی کہ ٹھنڈے ٹھنڈے وہاں سے پھوٹ لیا جائے۔ جس لمحے میں نے یہ فیصلہ کیا ٹھیک اس لمحے زینے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں اچھل پڑا۔ بھاگ بیٹا اللہ دتا! میں نے سوچا اور صدر دروازے کی طرف لمبی لگائی۔ مجھے علم تھا کہ میرے دشمنوں میں سے ایک تو زینے کا دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا اور دوسرا پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا میرے ٹپکنے کا منتظر تھا۔ عمارت کا دروازہ بھی کھلا تھا اور پھاٹک بھی

لیں لگانے سے بھلا کون روک سکتا تھا مگر یہ میری خام خیالی
جس کا احساس مجھے چند لمحے بعد ہی ہو گیا۔ میں نے ان موذی حرام
کو نظر انداز ہی کر دیا تھا جو عمارت کے باہر اور چار دیواری کے
جیل جھول رہے تھے۔ صدر دروازے تک پہنچنے سے پہلے
"بھوں بھوں" کا "عرفان" ہو گیا۔ اسی کے ساتھ جیسے میری
جان کی جان نکل گئی۔ کاش وہ کم بخت میری راہ میں دیوار نہ بنے

تے۔

میں پھر پلٹ کر بھاگا۔ اب یہی صورت تھی کہ میں اس کھلے
کمرے کے کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتا اور پھر موقع دیکھ
کر منصوبے پر عمل کرتا۔ تیزی سے پلٹنے کا ایک سبب یہ بھی
کہیں وہ بدتمیز کتے عمارت کے اندر نہ گھس آئیں اور میری تکا بوٹی
ان کے نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے بچنے کا واحد راستہ یہی
میں کہیں دبک جاتا اور دبکنے کے لیے فی الحال وہی کھلا ہوا
مجھے پناہ گاہ نظر آ رہا تھا۔

زینے کا دروازہ اب بھی پیٹا جا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ شخص مجھے
بے وقوف کیوں سمجھ رہا تھا کہ میں دروازہ کھول کر اپنی موت کو
اپنے گلے لگا لوں گا۔ وہ یقیناً "لنگوٹ" ہی تھا ورنہ ایسی حرکت
رہا ہوتا۔

میں بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا اور ایک دم ٹھٹک کر
میری سماعت سے ایک حیرت زدہ سی نسوانی آواز ٹکرائی تھی۔
کے ساتھ میری نگاہ اس کمرے میں موجود ایک مسہری پر پڑی تھی
حیران کا حیران" رہ گیا تھا۔

اس مسہری پر لیوسی عرف چمپا دراز تھی اور مجھے اپنی کھوئی کھوئی
زدہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں یہ بھی
تھا کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پیر
کی گرفت سے آزاد نہیں تھے۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ
جائے گی۔ میرا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور جسم پر بھی
س تھا اس لیے یقیناً اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا مگر میں اسے
گیا تھا۔

"تم... لیو... لیوسی!" میں عالمِ حیرت سے نکلنے کے
ہکلا کر رہ گیا۔

"تم... اللہ دتا... تم... تم!" لیوسی کی آواز سے
حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے یقیناً مجھ جیسے شخص سے یہ
نہیں ہوگی کہ یوں شیر کی کچھار میں گھس پڑوں گا۔ اب اسے
کیا پتا تھا کہ میں خود شیر کی کچھار میں نہیں گھسا تھا بلکہ
مجھے اس میں گھسنے پر مجبور کیا گیا تھا، ہانکا کیا گیا تھا

"ہاں لیوسی! میں... میں تمہیں دشمنوں کے چنگل سے نکال کر لے جانے آ پہنچا ہوں۔" میں نے موقع غنیمت جان کر ایک عدد ڈائیلاگ جڑ دیا جیسا ڈائیلاگ عموماً ایسے مواقع پر ہیرو بولتے ہیں۔ ڈائیلاگ ادا کرتے ہوئے نہ جانے کب میرا سینہ باہر آ گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا، سچ مچ یوں لگ رہا تھا جیسے میں واقعی ہیرو ہوں اور کہانیوں کے ہیرو کی طرح عین موقع پر ولن سے اپنی ہیروئن کو بچانے پہنچ گیا ہوں۔

میں سینے پر ہاتھ مار کر دوسرا ڈائیلاگ بولنے کی تیاری کر رہا تھا کہ لیوسی نے میری ساری ہوا نکال دی۔ اس نے کہا: "جلدی سے میرے ہاتھ پیر کھول دو، صفدر علی بیگ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

"صف... صفدر... صفدر علی بیگ..." میں ہکلا کر رہ گیا۔ صفدر علی بیگ کا نام سن کر میں پھر اپنی جون میں لوٹ آیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرے اندر جو ہیرو بیدار ہوا تھا، پھر میٹھی نیند سو گیا تھا۔ اب نہ میں ہیرو رہا تھا، نہ لیوسی میری نظر میں ہیروئن رہی تھی۔

"ہاں، ہاں صفدر علی بیگ! وہ... وہ ابھی یہیں تھا۔ جلدی کرو، میرے ہاتھ پیر کھول دو۔" لیوسی نے تیزی سے کہا۔

"ل... لیکن وہ... آ گیا تو... تو کیا ہوگا؟" میں گڑبڑا کر بولا۔ "تم مجھے تم مجھے کہیں... کہیں چھپا دو... کہاں چھپ جاؤں میں!" میرے اوسان دوبارہ خطا ہونے لگے تھے۔

"ڈرو مت!" یہ کہتے ہوئے لیوسی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اِدھر آؤ، اِدھر!"

ابھی لیوسی کی درخواست منظور کرنے پر میں غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک اچھل پڑا۔ غالباً لیوسی نے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن لی تھیں جنھیں سن کر میں نے اچھلنا ضروری سمجھا تھا۔ وہ اچھلی تو نہیں تھی مگر چونک ضرور گئی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اسی کمرے کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔

صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ اگر ان چند لمحوں کو میں ضائع کر دیتا یعنی یہ چند لمحے لیوسی کی درخواست پر عمل کرنے میں گزار دیتا تو یقیناً چھاپ لیا جاتا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ یا ہاتھ اڑانے کی بجائے مجھے پہلے اپنی فکر کرنا چاہیے تھی اور میں نے یہی کیا۔ لیوسی بھی تاڑ گئی کہ میں کس چکر میں ہوں۔ اس کا اندازہ اس نے شاید میرے سر کی گردش سے لگایا ہوگا۔ میرا سر گردش میں تھا اور ستارہ بھی! سر اس لیے گردش میں تھا کہ میں آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف کسی ایسی جگہ کی تلاش

میں تھا جہاں چھپ سکوں۔

وہ کمرہ خاصا بڑا تھا اور اس میں ضروریات کی سبھی چیزیں موجود تھیں مگر میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ چھپوں تو کہاں چھپوں۔

"سنگھار میز کے پیچھے چھپ جاؤ' جلدی!" لیوسی نے اپنے سر کی حرکت سے ایک طرف اشارہ کیا اور مسہری پر "ڈھیر" ہوگئی۔

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ میں اس طرح سنگھار میز کی طرف جھپٹا جیسے ہیرو' پردیس سے لوٹنے کے بعد اپنی محبوبہ پر نظر پڑتے ہی اس کی جانب جھپٹتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ میں ہیرو تھا اور نہ سنگھار میز' ہیروئن! اس لیے میں نے اپنے جذبات کو زیادہ بے قابو نہ ہونے دیا اور اس سے لپٹنے کی بجائے اس کے بڑے سے بیضوی آئینے کے پیچھے اکڑوں بیٹھ گیا۔ سنگھار میز اور کمرے کی دیوار کے درمیان جو تھوڑا سا خلا تھا' میں نے خود کو اس میں فٹ کر لیا تھا۔ میری کمر دیوار سے لگی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ میز پر رکھے ہوئے تھے۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب بہت قریب آ چکی تھیں۔ پھر جیسے ہی قدموں کی چاپ کمرے میں گونجی میری "ہستی" نے گم ہونا شروع کر دیا۔ قدموں کی چاپ سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والے دو افراد تھے مگر اس وقت تو میری حالت ہی اور تھی۔ میں اس وقت تک یہ نہ سمجھ سکا کہ آنے والے دو ہیں جب تک ان کے درمیان مکالمے بازی نہ ہوگئی۔

"مگر یہاں... یہاں تو اس لڑکی کے علاوہ... کوئی نہیں...

...ب" ایک آواز سنائی دی۔ لفظوں کے درمیان وقفہ لمبے لمبے ...دن کا تھا۔ وہ شخص ہانپ رہا تھا۔ وہ آواز میرے لیے آشنا تھی' منحوس آواز' صفدر علی بیگ کی آواز!

"وہ... وہ یہاں نہیں... لیکن ہے یہیں... جناب!" دوسری آواز ...بھری جو میرے لیے اجنبی تھی بھی اور نہیں بھی! کیوں کہ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہاں مجھے کچھ کچھ شبہ سا ضرور ہو رہا تھا کہ ...سی حرام خور کی آواز ہوگی جو ہاتھ اور پیر دونوں دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا' وہی جسے میں زینے میں بند کر آیا تھا۔

"یہاں نہیں ہے اور ہے بھی! کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟" صفدر علی بیگ نے اسے ڈانٹا۔

"جناب! میری مراد اس کمرے سے نہیں تھی۔ وہ کہیں اور بھی تو چھپ سکتا ہے۔"

"تو جاؤ اس چوہے کو ڈھونڈو! مگر سنو پہلے پھاٹک پھر صدر دروازہ تاکہ وہ اندر ہو تو بھاگ کر نہ جا سکے۔ ...پھاٹک پر کھڑا ہے' اسے بھی اندر بلا لو!" صفدر علی بیگ ...دیا۔ شہزاد شاید اس حرام خور کے دوسرے ساتھی کا نام تھا جسے بدمعاش نے پیڑ کے نیچے کھڑا کر دیا تھا تاکہ میں پیڑ سے کود کر جاؤں۔

"بہتر ہے جناب!"

دوسرے ہی لمحے کسی کے قدموں کی چاپ دور ہوتی ...اور یہ کسی' یقیناً صفدر علی بیگ کا پالتو چمچا تھا۔

جب صفدر علی بیگ نے مجھے چوہا کہا تھا تو مجھے بڑا ...تھا۔ میرا جی چاہا تھا کہ جواب میں اسے بھی بجو کہہ دوں ...نے اپنا جی مار لیا۔ میں ایک بار اپنے غصّے کا انجام دیکھ ...وقت پیڑ پر چڑھا ہوا تھا اور غصّے میں بلبلا پڑا تھا۔ صورت ...کی "سنگینی" اس بات کا تقاضا کر رہی تھی کہ میں چکنا گھڑا ...جاؤں' سو میں انسان سے گھڑا بن گیا کیوں کہ گھڑے کی زندگی اتنی جلدی خطرے میں نہیں پڑتی۔

اب اس کمرے میں دو دشمنوں کی بجائے صرف ایک رہ گیا تھا اس لیے خطرہ نصف ہوگیا تھا' اسی حساب کی ...میری "دھکڑ پکڑ" بھی آدھی رہ گئی تھی۔ اس کے جاتے ہی ...چھری کی تاک میں لگ گیا تھا تاکہ صفدر علی کا رخ تاڑ ...سکوں اور یہ بھی دیکھ سکوں کہ وہ کہیں لیوسی' خانم کو ...بنانے کے لیے پر تو نہیں تول رہا۔ وہاں ایک چھری کیا کئی ...موجود تھیں جن سے میں "نظارہ مار سکتا تھا" مگر اپنے ...دیئے اور اسے اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر نہ بھگانے کی خاطر ...چھریوں سے جان کر انجان بنا ہوا تھا۔ اب جو ضرورتاً میں ...ختم کیا تو چھریاں ہی چھریاں نظر آنے لگیں۔ ان میں سے ایک تقریباً میری آنکھ کی سیدھ میں تھی۔ اگر میں تھوڑا سا ...ایک آنکھ ضرور اس سے لگا سکتا تھا۔ پہلا اسٹیج چھری ...لڑاتا اور دوسرا آنکھ لگانا تھا۔ میں نے باری باری دونوں ...پر آنکھ رکھی۔ اب کمرے کا منظر میرے سامنے تھا۔

مگر ذرا ٹھہریے! میں ایک بات لکھنا شاید بھول گیا ...بار بار مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے درمیان میں ...نشر کرنے لگتا ہوں' اس سے یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ...ساتھ ساتھ وقت بھی رک گیا ہوگا یا وقت آگے بھاگ گیا ...میں کمنٹری نشر کرتا رہ گیا ہوں گا۔ واقعتہً ایسا نہیں ہے ...ابھی اس حرام خور کے جانے' پھر چھری تلاش کرکے اس ...لگانے کا جو ذکر کیا' یہ گنتی کے دو تین لمحے ہوں گے' اِدھر ...

...میں نے چھری سے آنکھ لگائی! لیکن اگر میں اتنا لکھ کر نہ گ... ...تو گویا اپنی سرگزشت نہ لکھتا' گھاس کاٹتا۔ نہ میری ...پڑھنے والا میری پتلی حالت سے آگاہ ہو پاتا نہ میرے ...ٹھنڈک پڑتی کہ میں نے سب کچھ ایمانداری سے لکھ دیا ...نہیں ماری اور خود کو اس بہانے ہیرو ثابت نہیں ...

...میں ہیرو نہیں تھا اس لیے کمرے کا منظر دیکھ کر مجھ پر دہشت ...ہو جاتا کوئی ایسا بے جا نہیں تھا۔ صفدر علی بیگ کے ہاتھ ...ریوالور تھا اور وہ لیوسی کو گھورتا ہوا قدم بہ قدم مسہری کی ...بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درندگی تھی یا مجھے نظر ...آ رہی تھی۔

"اب تجھے زبان کھولنا ہی پڑے گی! میں نے کل سے اب تک ...صبر کر لیا" صفدر علی بیگ کی آواز گونجی۔

"مم... میں کل... کل رات ہی آپ کو سب کچھ سچ سچ ...چکی ہوں" لیوسی نے کہا۔ اس کی آواز سے گھبراہٹ کا اظہار ہو ...رہا تھا۔

"جھوٹ تھا وہ سب کچھ!" صفدر علی بیگ دہاڑا "میں تیرے ...بارے میں سب کچھ معلوم کرا چکا ہوں۔ تو نے دفتر میں اپنا پتا بھی ...غلط لکھوایا ہے۔ تو پتلی واڑے میں نہیں رہتی۔ میرے آدمی وہاں ...جا کر پتا لگا چکے ہیں۔ اس محلے میں چمپا نام کی کوئی ایسی لڑکی نہیں ...ملی جو اپنے گھر سے غائب ہو۔ سمجھی تو!"

جواب میں لیوسی اس بار کچھ نہیں بولی۔

"سن! اگر اب بھی تو نے جھوٹ بولا تو گولی مار دوں گا۔ تو شاید یہ سمجھ رہی ہوگی کہ میرا پہلو گرما کر مجھے بے وقوف بنا دیا تو ایسا نہیں ہے۔ مجھے روزِ اوّل سے تجھ پر شک تھا اور میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تو کتنے پانی میں ہے۔" اب صفدر علی بیگ مسہری کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اور اس کے ریوالور کی نال کا رخ لیوسی کے سینے کی طرف تھا۔ "میں تجھے گولی مار دوں گا اور تیری لاش کا پتا بھی نہیں چلے گا' سمجھی! اپنے ان ساتھیوں کے بھروسے میں نہ رہنا جنھوں نے یہاں ہنگامہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک زخمی ہو کر بھاگ چکا ہے اور اب شاید زندگی بھر اِدھر کا رخ نہیں کرے گا اور دوسرا بھی اگر فرار نہیں ہوا تو کسی چوہے کی طرح پکڑ لیا جائے گا۔"

صفدر علی بیگ نے مجھے پھر چوہا کہا اور میں پھر اپنا غصّہ پی گیا کیوں کہ فی الحال کبھی چکنا گھڑا بننے اور کبھی چوہا بننے ہی میں عافیت تھی۔

"بول زبان کھولنے پر تیار ہے کہ سینے میں گولی اتار دوں؟" صفدر علی بیگ غرّایا اور میں ڈر گیا کہ کہیں وہ ظالم سچ مچ اس ننھی سی جان یعنی لیوسی کا سینہ نہ چھید دے۔

بس اچانک ہی کمرے میں لیوسی کی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔

ارے بیٹا اللہ دِتّا! یہ تو چیں بول گئی' موت کو سامنے دیکھ کر! اب تیری بھی خیر نہیں۔

"عورت کے آنسو ان مردوں کے دل پر اثر کرتے ہیں جو عورت کو نہیں سمجھتے۔ مجھ پر تیرے رونے دھونے کا کوئی اثر نہیں ہوگا کیوں کہ میں ان بے وقوف مردوں میں سے نہیں ہوں" صفدر علی بیگ اب بھی درندہ بنا ہوا تھا حالانکہ میرا دل یہ چاہ رہا تھا کہ اس مظلوم' بے بس اور مجبور عورت یا لڑکی کے ساتھ خود بھی "بھوں بھوں" کرنے لگوں۔

"مم... میں... سب... سب کچھ... سب کچھ بتا دوں گی... سب کچھ!" اچانک سسکیوں کے درمیان لیوسی کی بھرّائی ہوئی آواز سنائی دی اور میرے فرشتے کوچ کرنے کا پروگرام ترتیب دینے لگے۔

ہائے اللہ دِتّا! وہ سب کچھ بتانے پر راضی ہے۔ اب کیا ہوگا بیٹا! وہ تجھے بھی پھنسوا دے گی۔ نہیں' وہ مجھے نہیں "پھنسوائے" گی۔ اسے نہیں پھنسوانا چاہیے' پھنسوا دیا تو بچ بڑے وقت سے! مگر کیسے؟ میری چھوٹی سی کھوپڑی میں بھونچال سا آ گیا۔

"تو راہِ راست پر آ ہی گئی تو!" صفدر علی بیگ نے طویل سانس لیا' پھر چند لمحے رک کر بولا "لیکن اچھی طرح سمجھ لے اگر اب تو نے جھوٹ بولا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"مجھے... مجھے پانی... پانی پلا دیجیے..." لیوسی کی آواز مجھے اب صفدر علی بیگ سے بھی زیادہ منحوس محسوس ہو رہی تھی۔

"تھوڑی دیر صبر کر لے' شہزاد یا کریم کو آ جانے دے" صفدر علی بیگ نے انتہائی نخوت سے کہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ان دو کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ لی جو مسہری سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تھیں۔

کرسی پر براجمان ہوتے کے بعد صفدر علی بیگ نے اپنی ایک ٹانگ' دوسری ٹانگ پر چڑھا لی۔ اب اس کے چہرے پر پہلی سی درندگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اب کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا' اس شکاری کی طرح جس کے جال میں شکار پھنس چکا ہو مگر میری حالت غیر تھی۔ میرا ذہن یہ سوچ سوچ کر ہی نکلنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ اگر واقعی لیوسی نے سب کچھ بتا دیا تو کیا ہوگا۔

"کیا تو پانی پیے بغیر شروع نہیں ہو سکتی؟" چند لمحوں بعد صفدر علی بیگ نے لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر اب اس کی آواز میں درندگی نہیں تھی۔

"مجھے... سخت... پیاس... مجھ پر بولا... نہیں جائے گا۔ میرا حلق خشک... خشک ہو رہا..." لیوسی نے بہ مشکل جواب دیا اور میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

"ٹھیک ہے، کچھ دیر رُک جا! ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی آتا ہی ہوگا۔"

جس وقت صفدر علی بیگ نے یہ جملہ کہا، اسی وقت پہلی بار میری نگاہ صراحی پر پڑی جو سنگھار میز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ صراحی ایک تپائی پر رکھی تھی اور اس کے قریب دو گلاس موجود تھے۔ اب تک میں سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کمرے میں پانی نہیں ہوگا اس لیے صفدر علی بیگ اپنے چمچوں یا کف گیروں کا انتظار کر رہا ہے لیکن وہاں صراحی دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ آخر وہ ظالم، لیوسی کو پانی کیوں نہیں پلا دیتا؟ بے چاری کتنی پیاسی ہے، حلق سوکھا جا رہا ہے، بولا تک نہیں جا رہا اور یہ کم بخت اسے پانی پلانے پر آمادہ نہیں۔ بھلا ایسا بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے پیاسے انسان کو پانی نہ پلائے! میں نے سوچا، یقیناً صراحی خالی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا جو مجھے کچھ دیر بعد معلوم ہوا تھا اور پھر میں غصّے سے کھولنے لگا تھا۔ اس وقت ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا تھا کہ شاید صفدر علی بیگ، کمرے میں اس صراحی کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ میرا دل چاہا تھا کہ اسے صراحی کے بارے میں بتا دیتا۔ شاید میں ایسا کرتا بھی مگر فوراً ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا اور میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کہیں بھول چوک میں کچھ "بک" ہی نہ پڑوں۔

پھر اس وقت تک میرا دل بہت رفتار سے "دھڑ دھڑ" کرتا رہا تھا جب تک صفدر علی بیگ کے دونوں چمچے اس کمرے میں نہ آ گئے تھے۔ کمرے میں تقریباً پانچ دس منٹ تک مکمل خاموشی چھائی رہی تھی جو مجھے موت کی سی خاموشی محسوس ہوئی تھی۔ میرے دل کی "دھڑ دھڑاہٹ" کا عجب عالم تھا، کبھی دھیرے دھیرے، کبھی ایک دم بہت تیز تیز! کبھی یوں لگتا کہ بس اب دل ڈوبا اور کبھی محسوس ہوتا، نہیں ابھی زندہ ہوں۔

"ہم نے عمارت کا ایک ایک گوشہ دیکھ لیا ہے، وہ یہاں نہیں ہے۔" چمچوں میں سے ایک بولا۔

"وہ یقیناً بھاگ گیا ہوگا۔" دوسرا چمچا بھی پیچھے نہ رہا۔

"ہوں۔" صفدر علی بیگ نے ہنکارا بھرا، پھر ایک چمچے کو گھورتا ہوا بولا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ چھت پر کود کر زینے کے راستے اندر آ گیا تھا!"

"میں نے... غلط نہیں کہا تھا جناب!" چمچا بوکھلا یا۔ "آپ اس سے پوچھ لیں... شہزادے سے! اس نے بھی پیٹر پر اسرار پیر دیکھا تھا۔"

"پیٹر پر پیر! کیا بک رہے ہو؟" صفدر علی بیگ [illegible] چلائی۔

میں سمجھ گیا کہ شاید ابھی تک ان دونوں چمچوں نے [illegible] "دیگ" یعنی صفدر علی بیگ کو تفصیلی حالات سے آگاہ [illegible] کیا۔

چمچے نے پیٹر پر پیر نظر آنے والی حکایت بیان کی پھر [illegible] تک حکایت پہنچا دی جہاں میں اسے زینے میں بند کر کے چھوڑ [illegible] لیا تھا۔ اس کے بعد وہ بولا۔ "میں اس امید پر دروازہ پیٹتا رہا [illegible] کہ آپ اندر موجود ہیں، دروازہ پیٹنے کی آواز سن کر ادھر [illegible] ہو جائیں گے مگر... مگر جیسا کہ آپ نے بتایا، آپ اس وقت عمارت کے باہر تھے۔ پھر جب آپ لوٹے تھے تو اس وقت میں..."

"بس بس!" صفدر علی بیگ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "زیادہ رام کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔" پھر کسی قدر توقف کے بعد اس نے دوبارہ چمچے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا زینے کا دروازہ بند ہونے کے بعد تم دوبارہ چھت پر پہنچ [illegible] کے ذریعے..."

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب مگر میں یہ سمجھ رہا [illegible] کہ آپ... آپ اندر موجود..."

"درمیان میں میری بات مت کاٹو، سمجھے!" صفدر علی بیگ نے چمچے کو ڈانٹا۔ "بہتر یہ ہے کہ اب تم دونوں میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔"

ابے کم بخت! لیوسی کو پانی تو پلوا دے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور مجھے شدید حیرت ہوئی کہ صفدر علی بیگ نے میرے دل کی بات سن لی۔ چمچے جانے ہی والے تھے کہ صفدر علی بیگ نے ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ وہ لیوسی کو پانی پلا دے۔

چمچا حکم سنتے ہی صراحی کی طرف بڑھا۔ اس کا رُخ اب سنگھار میز کی طرف تھا۔ میرا دم خشک ہونے لگا۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ اگر ان کم بختوں کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ میں کہاں چھپا بیٹھا ہوں تو میری خیر نہیں تھی۔

جب تک چمچا، گلاس میں پانی لے کر مسہری کی طرف مڑ گیا، میرے کانوں اور کھوپڑی میں سائیں سائیں سی ہوتی رہی۔ اب میں سمجھا کہ صفدر علی بیگ نے خود لیوسی کو پانی پلانا اپنی شان کے خلاف سمجھا تھا۔ یہ جان کر مجھے بڑا غصہ آیا کہ میری بیس پانی موجود تھا مگر ظاہر ہے، میں اپنا غصہ اپنے سوا کسی

پر نہیں اتار سکتا تھا، سو میں نے یہی کیا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمچے نے لیوسی کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے نے پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ جس چمچے نے لیوسی کو سہارا دے کر اٹھایا تھا، وہ بہت بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ پتا نہیں صفدر علی بیگ نے اس کی حرکت دیکھی تھی یا نہیں مگر مجھے تو واضح طور پر اس کی حرکت نظر آئی تھی اور اسی لیے مجھے بڑی شرم آئی تھی۔ لیوسی کسمسا کر رہ گئی تھی مگر اس نے صدائے احتجاج بلند کرنا نہ جانے کیوں ضروری نہ سمجھا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ اس طرح کی حرکتیں اس کے لیے نئی نہ ہوں۔ بہر حال اس نے بھر گلاس پانی پی کر ہونٹوں پر زبان پھیری، پھر اُسے چت لٹا دیا گیا۔

"اب تم دونوں جا سکتے ہو۔" صفدر علی بیگ بولا۔ "ہاں خیال رہے کہ آج رات تم دونوں کو سونا نہیں اور بہت چوکنا رہنا ہے۔"

"بہتر ہے جناب!" چمچوں نے بیک زبان کہا اور رخصت ہو گئے۔

میرا دل پھر "دھکڑ پکڑ" ہونے لگا۔ وہ لمحہ آ پہنچا تھا جو میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیتا۔ لیوسی کہہ ہی چکی تھی کہ وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہے اور پھر وہ لمحہ آ ہی گیا۔

"ہاں تو اب بتاؤ، تم کیا بتانے والی تھیں؟" صفدر علی بیگ نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ اس کا لہجہ اب پہلے کی نسبت بہت بدلا ہوا تھا۔ اب وہ کچھ کچھ آدمی نظر آ رہا تھا۔

لیوسی نے ایک طویل سانس لیا اور پھر میں نے اس کی زبان سے جو کچھ سنا، اسے سن کر میرا بھی جی چاہا کہ ایک بہت طویل سانس کھینچوں، چاہے اس "کھینچائی" کی صدا صفدر علی بیگ کیوں نہ سن لے۔ یہ الگ بات کہ میں نے اپنی بزدلی کے سبب یہ ہمت نہیں کی۔ میرے سینے سے جیسے کئی من کی بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں دریائے حیرت میں غوطے مارنے لگا تھا اور بات بھی انتہائی حیرت کی تھی۔ لیوسی نے صفدر علی بیگ کو بتایا تھا کہ اسے راؤ بہادر کشوری لال نے اس کے پیچھے لگایا تھا۔ پہلی بار لیوسی کی زبان سے راؤ بہادر کا نام سن کر میں حیران ہوا تھا کہ وہ بھلا راؤ بہادر کو کیسے جانتی ہے؟ مگر وہ بھی میری طرح خفیہ میں تھی۔ یقیناً تیواڑی جی نے اسے بھی تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہوگا۔ بہر حال وہ میرے ساتھ اس کیس پر کام کر رہی تھی۔

"تمھیں راؤ بہادر کشوری لال نے میرے پیچھے لگایا تھا!" صفدر علی بیگ کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"جی ہاں!" لیوسی نے جواب دیا۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"مگر کیوں؟" صفدر علی بیگ کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔ "اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ تو وہی بہتر جان سکتے ہیں۔" لیوسی نے آہستہ سے کہا۔

صفدر علی بیگ کے چہرے پر لمحے بھر کو ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، پھر اس نے لیوسی کو گھورتے ہوئے کسی قدر سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیا اس نے تمھیں یہ نہیں بتایا کہ ایسا کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے؟ وہ آخر تم سے کیا کام لینا چاہتا تھا؟"

"وہی کام جو میں انجام دے رہی تھی۔" لیوسی نے بے دھڑک کہا۔

"یعنی؟" صفدر علی بیگ کے لہجے میں چبھن تھی۔

"آپ کی نگرانی اور آپ کی نقل و حرکت پر نظر!"

"اگر ایسا ہی تھا تو پھر تم نے میری میز کی دراز سے وہ لفافہ کیوں اُڑایا جسے میں دانستہ تمھیں آزمانے کی خاطر وہاں چھوڑ گیا تھا؟" صفدر علی بیگ نے سوال کیا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، آپ کس لفافے کی بات کر رہے ہیں؟" لیوسی نے انجان بننے کی بڑی خوب صورت اداکاری کی جس کی داد اُسے بالکل نہیں ملی۔ داد کی بجائے لیوسی کو بے داد کا شکار ہونا پڑا کیوں کہ اس کے جھوٹ پر صفدر علی بیگ ایک بار پھر آدمی سے درندہ بننے لگا تھا۔

"بکواس مت کرو!" صفدر علی بیگ دہاڑا۔ "تم سب کچھ جانتی ہو۔ میرا نام صفدر علی بیگ ہے۔ تم جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں میں نے دیکھی اور برتی ہیں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ اگر تم واقعی زندہ رہنا چاہتی ہو تو سب کچھ اگل دو۔" صفدر علی بیگ اب کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ "سنو! میں اس لفافے کی بات کر رہا ہوں جس میں دو تصویریں تھیں اور ایک پیغام! وہ لفافہ میں نے جان بوجھ کر اپنی میز کی دراز میں چھوڑا تھا۔ جب وہ شخص لفافہ لے کر آیا تھا اور میں نے تم سے کہا تھا کہ باہر چلی جاؤ تو تم چونک اٹھی تھیں اور تمھارے چہرے سے اُلجھن کا اظہار ہونے لگا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی۔ مجھے پہلے ہی تم پر شک تھا کہ تم میری ٹوہ میں لگی رہتی ہو اس لیے میں نے تمھیں آزمانے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جیسے ہی اپنے کمرے سے اٹھ کر کہیں گیا تم تیر کی طرح میرے کمرے میں جاؤ گی۔ یہ بات تمھارے علم میں تھی کہ میں اپنے ضروری کاغذات کس دراز میں رکھتا ہوں۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ وہ شخص

کوئی ضروری پیغام لے کر آیا ہوگا۔ پھر تمہاری توقع کے عین مطابق وہ لفافہ تمھیں میز کی دراز میں مل گیا۔ مجھے واپسی میں ذرا سی دیر ہوگئی ورنہ میں خود اسی وقت تمھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا۔ مجھے دیر ہوگئی اسی لیے تمھیں اتنا موقع مل گیا کہ وہ لفافہ تم نے اپنے ساتھی تک پہنچا دیا' وہی جسے تم نے اپنا کزن ظاہر کیا تھا۔ یہ تمہاری بدقسمتی کہ وہ گھامڑ ثابت ہوا۔ جس وقت تم نے وہ لفافہ اپنے ساتھی کو دیا تھا' میں تمہارے قریب ہی موجود تھا اور سارا کھیل دیکھ رہا تھا۔ پھر تمہارے احمق ساتھی نے وہ لفافہ جس فائل میں چھپایا تھا' وہ بھی میں خود اس سے لے کر اپنے کمرے میں آبیٹھا۔ یوں وہ لفافہ دوبارہ مجھ تک پہنچ گیا۔ اس کھیل کے بعد کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ میں تمہاری طرف سے آنکھیں بند کیے رہتا۔ میں نے آج اس احمق پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ تمھیں دفتر میں نہ پاکر شاید وہ کچھ کھٹک گیا تھا۔ اب سمجھیں تم کہ میں تمہارے بارے میں کیا کیا جان چکا ہوں اور تمہاری کوئی چال بازی مجھے مطمئن نہیں کرسکتی!'' صفدر علی بیگ نے سارا کچا چٹھا سنا دیا جسے سن کر کئی بار میری بھی فاختہ اُڑی۔ پھر اس نے دوبارہ جیب سے ریوالور نکال لیا اور اس سے کسی کھلونے کی طرح کھیلنے لگا۔ اس کا مقصد لیوسی کو دہشت زدہ کرنا تھا مگر اسے کیا خبر تھی کہ لیوسی کے علاوہ وہ نادانستہ طور پر مجھے بھی دہشت زدہ کررہا ہے۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں' ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ!'' صفدر علی بیگ کے خاموش ہوتے ہی لیوسی جلدی سے بولی۔ ''دراصل میں سمجھ نہیں سکی تھی کہ آپ اسی لفافے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو میں نے آپ کی میز سے چُرایا تھا۔''

''بہت بھولی ہو تم! ہوں!'' صفدر علی بیگ نے عجیب سے لہجے میں کہا' پھر کسی قدر سخت آواز میں بولا۔ ''تم نے غالباً اس لیے اقبالِ جرم کرنا ضروری سمجھا کہ تردید ممکن نہیں۔''

''نہیں' حقیقت یہی ہے' میں پہلے آپ کی بات سمجھ نہیں سکی تھی۔'' لیوسی نے پُرزور لہجے میں صفدر علی بیگ کو اپنی بات کا یقین دلانا چاہا۔

''چلو' تم کہتی ہو تو یقین کیے لیتا ہوں۔'' صفدر علی بیگ بولا' پھر سوال کیا۔ ''کیا تمھیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ وہ احمق نوجوان تمہارا ساتھی تھا اور کزن نہیں تھا؟''

''مجھے اعتراف ہے۔'' لیوسی نے جواب دیا۔ ''مگر اس سے براہِ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے اس سے راؤ بہادر ہی نے ملوایا تھا اور کہا تھا کہ میں اسے بھی آپ کی فرم میں ملازمت دلوا دوں۔ راؤ بہادر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس پر اعتماد کرسکتی ہوں۔ میں نے ہی وہ لفافہ' حفاظت کے خیال سے اسے دے دیا تھا۔'' لیوسی نصف سچائی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ سچائی بڑی قوت رکھتی ہے' اتنی کہ جھوٹ میں نصف بھی شامل کردی جائے تو اپنا رنگ دیتی ہے۔ غالباً اس راز سے لیوسی واقف تھی اسی لیے نصف سچائی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ صرف اتنا کام دکھا رہی تھی کہ خفیہ کی جگہ راؤ بہادر کشوری لال کا نام فٹ کرتی جارہی تھی۔

''بقول تمہارے راؤ بہادر نے تمھیں میری نگرانی اور نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے کہا تھا' پھر تم نے وہ لفافہ کیوں چرایا؟'' صفدر علی بیگ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میری ذمے داری صرف اتنی ہی نہیں تھی۔'' لیوسی بے جھجک جواب دیا۔ ''راؤ بہادر نے مجھ سے کہا تھا کہ اس نگرانی اور نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا ایک مقصد ہے۔''

''وہ مقصد بھی بیان کر جاؤ۔'' صفدر علی بیگ کا لہجہ سپاٹ تھا جس سے نہ غصے کا اظہار ہو رہا تھا نہ نرمی کا۔

''راؤ بہادر کے خیال میں آپ کوئی خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں' اس کھیل کی نوعیت کیا ہے' مجھے یہی پتا لگانا تھا۔ میں اسی لیے وہ لفافہ چُرایا تھا۔ آپ نے اس سے پہلے کبھی کسی ملاقاتی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ مجھے کمرے سے چلے جانے کے لیے کہا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا اسی لیے میں چوکنا ہوگئی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ اس ملاقاتی کی اہمیت کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ... کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا... کہ... آپ اور میں ... کمرے میں تنہا ہوں... میرا مطلب... اور... اور آپ نے مجھے نظر انداز کرکے ملاقاتی کو بلوا لیا ہو۔''

''راؤ بہادر نے تمھیں میرے پیچھے لگا کر یقیناً انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا ہے' تم واقعی ذہین ہو۔'' صفدر علی بیگ بولا' پھر مسکرایا۔ ''تم نے جو اندازے قائم کیے' وہ بالکل صحیح ثابت نکلے۔ اگر مجھ جیسے گھاگ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً تمہارے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتا۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے چمپا کہ تمھیں مجھ جیسے سخت شکاری سے واسطہ پڑا۔''

''معاف کیجیے گا' میرا نام چمپا بھی نہیں' لیوسی ہے۔'' لیوسی نے جلدی سے کہا۔ غالباً وہ اس طرح اپنا اعتماد بحال کرچکی تھی اور نصف سچائی کو پوری سچائی ثابت کرنے کے

...ہی تھی۔

...مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ اگر تم اپنا اصل نام خود نہ بتاتیں تو ...پوچھتا۔'' یہ کہتے ہوئے صفدر علی بیگ نے ریوالور دوبارہ ...میں رکھ لیا جسے دیکھ کر میرے دل کو بڑی تسلی ہوئی۔

...اب فوری خطرہ ٹل گیا تھا۔ صفدر علی بیگ نے چند لمحے ...کر کہا۔ ''اب تم اپنا اصل پتا بھی بتا دو!''

''میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا اور نہ کچھ چھپانے کا ...وہ ہے مگر... مگر...'' آخری لفظ کہتے ہوئے لیوسی کی ...ز بھرا گئی اور وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی۔

''مگر کیا؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟'' صفدر علی بیگ نے ...لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ... یہ کہ اس کے بعد آپ... آپ میری جان بخشی ...دیں گے؟'' لیوسی نے بھرائی ہوئی آواز میں مطلب کی بات ...دی۔ اس نے اپنی آواز میں شاید اس لیے ''بھراہٹ'' ...بل تھی کہ صفدر علی بیگ بالیقینہ خلطی ہو جائے مگر وہ ریشہ بڑا ...ت تھا کسی طور ''خلطی'' ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔

''اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔'' صفدر علی بیگ نے ایک ...لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میں... میں آپ کی بات کا مطلب... نہیں سمجھ سکی۔'' ...ی نے گھبرا جانے کی شان دار اداکاری کی یا شاید وہ سچ مچ ہی ...ا گئی تھی۔ میں اس لیے کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لیوسی ...رے اندازوں سے کہیں مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ میری ...ھ میں بس کچھ کچھ ہی آئی تھی۔ وہ کہاں اداکاری سے کام لے ...ہی تھی اور کہاں واقعی گھبرائی ہوئی تھی' یہ سمجھنا میرے لیے ...ل نہیں تھا۔ اس نے صفدر علی بیگ جیسے شخص' کائیاں شخص ...ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہ معمولی بات نہیں تھی۔ یہ الگ بات ...وہ چلنے کے باوجود ''نہیں'' چل کر دے رہا تھا۔

''تم اتنی بھولی اور نا سمجھ بھی نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہی ...' صفدر علی بیگ نے لیوسی کو معنی خیز انداز میں دیکھتے ...ہوئے کہا۔ ''مگر خیر! تم اگر یہی چاہتی ہو کہ میں تمھیں ایسا ہی سمجھوں ...سنو' تم نے جو کچھ بتایا ہے' وہ جب تک سچ ثابت نہ ہو جائے' ...تمہاری جاں بخشی ممکن نہیں۔ اس وقت تک تمھیں یہیں رہنا پڑے ...ہاں اگر اس دوران میں تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش ...کی تو تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں ...تم اتنی ذہین ضرور ہو کہ اسے محض دھمکی نہیں سمجھو گی۔''

''لیکن... لیکن آپ کس طرح... کس طرح پتا چلائیں گے کہ راؤ بہادر...''

''میرے خیال میں تمھیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونا چاہیے کہ میں تمہارے بیان کی صداقت کس طرح پرکھوں گا مگر جاننا چاہتی ہو تو سنو! ابھی تم صفدر علی بیگ کو نہیں سمجھ پائیں کہ وہ کیا ہے اور یہ سمجھنے کے لیے تمھیں ایک عمر میرے ساتھ گزارنا ہوگی جو ظاہر ہے' ممکن نہیں۔ میں تم جیسی تتلیوں کو گلے کا ہار بنانے کے حق میں نہیں۔'' صفدر علی بیگ مسکرایا۔ ''ہر چند کہ مجھے تمہاری باتوں پر یقین آچکا ہے لیکن اب میں نے ایک اور ہی فیصلہ کیا ہے' تمھیں چارا بنانے کا فیصلہ! سمجھیں کچھ! لیکن نہیں' تم یہ بات نہیں سمجھ سکو گی کیوں کہ بہر حال اتنی ذہین نہیں ہو۔''

صفدر علی بیگ' لیوسی کو چارا بنانا چاہتا تھا مگر کس کے لیے؟ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور کچھ نہ سمجھ سکا۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے میرے گھٹنے دُکھنے لگے تھے لیکن اٹھ کر کھڑا ہونا خطرناک تھا اس لیے میں جیسے بیٹھا تھا بیٹھا رہا اور صفدر علی بیگ کی باتوں پر کان اور چہرے پر نظر لگا دی۔

اب وہ کہہ رہا تھا۔ ''چمپا یا لیوسی' یا جو بھی تمہارا اصل نام ہے' تم راؤ بہادر کشوری لال کے لیے اہم حیثیت کی مالک بن گئی ہو اور تمہاری یہ حیثیت تمہارے اغوا کے سبب بنی ہے۔ تمہارے مفرور احمق ساتھی نے اسے بتا چل گیا ہوگا کہ تم غائب ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ تم دفتر سے میرے ساتھ گئی تھیں۔ ان حالات میں اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ تمھیں میں نے اغوا کرلیا ہے۔ اغوا کرنے کے بعد میں تمھیں کہاں رکھ سکتا ہوں' اس سے بھی وہ بہ خوبی آگاہ ہے۔ اسے میری اس قیام گاہ کا علم بھی ہے جو بہت کم لوگوں کو ہے۔ تمہارے اغوا سے اس نے یہی نتیجہ نکالا ہوگا کہ تم میرے بارے میں کسی اہم بات سے آگاہ ہوچکی ہو۔ اس صورت میں تمہاری حیثیت اس کے لیے اہم بن جاتی ہے' سمجھیں!'' صفدر علی بیگ رُک رُک کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کرتا رہا۔ ''آج رات یہاں جو کچھ ہوا' وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ یہ سارا ہنگامہ تمہاری بازیابی کے لیے ہی تھا۔ یہ الگ بات کہ میں نے اور میرے آدمیوں نے اس کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا جس کے نتیجے میں تم اب بھی میرے سامنے بندھی پڑی ہو۔ میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ راؤ بہادر نے اس سلسلے میں قانون کی مدد کیوں نہیں لی! وہ اگر راؤ بہادر ہے تو میرا نام بھی صفدر علی بیگ ہے۔ اعلیٰ سرکاری حلقوں میں اگر اس کی پہنچ ہے تو میری بھی ہے' یہ وہ بھی جانتا ہے اور میں بھی! اس نے اسی لیے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ میں کسی حد تک سمجھ چکا ہوں کہ وہ یہ۔

سارا تمہیں کیوں نہیں رہا ہے! لیکن اپنے قیاس کو یقین کی حد تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ میں اسے مزید مواقع فراہم کروں اور تمہیں آزاد کرنے کی بجائے یہیں قید رکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس صورت میں وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ دوبارہ تمہاری بازیابی کی کوشش کرے گا اور ناکامی کے بعد ایک بار پھر! اس طرح وہ کھل کر سامنے آ جائے گا اور یہی میرا مقصد ہے۔ اگر وہ کھل کر سامنے آ گیا تو اس سے نمٹنا میرے لیے آسان ہو جائے گا۔ شاید اسے ابھی اس بات کا اندازہ نہ ہو سکے اور جب تک وہ اندازہ لگا پائے گا وقت گزر چکا ہو گا۔ صفدر علی بیگ پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں جتنا اس نے سمجھا ہے۔" یہ کہہ کر صفدر علی بیگ مسکرانے لگا۔

ابے کم بخت! کیا ساری رات اسی طرح باتیں "گھیٹو" لیتے ہوئے گزار دے گا یا سوئے گا بھی! میں نے سوچا کیوں کہ اب تھکن کے ساتھ ساتھ ہی میرے ذہن پر غنودگی کا حملہ بھی ہونے لگا تھا مگر اس کی باتیں ہی ختم ہو کر نہیں دے رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے یونہی بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی تو کیا ہو گا؟ پھر تو میں فرار بھی نہ ہو سکوں گا۔

"ہاں، میں نے تم سے تمہارا پتا پوچھا تھا جو تم نے اب تک نہیں بتایا۔" چند لمحے گزرنے کے بعد صفدر علی بیگ کی آواز پھر بلند ہوئی۔

مجھے بھی علم نہیں تھا کہ لیوسی کہاں رہتی ہے۔ اس نے جواب میں محلے کا نام لال کنواں بتایا تھا، پھر مزید پوچھ گچھ پر اپنے گھر کے محل وقوع سے بھی آگاہ کیا تھا۔ لال کنواں، جامع مسجد سے تقریباً ڈیڑھ پونے دو میل ہو گا۔ اگر لیوسی نے واقعی صحیح پتا بتایا تھا تو میں بھی اب بہ آسانی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ صفدر علی بیگ کے استفسار پر لیوسی نے اپنے بارے میں مزید معلومات بھی اسے فراہم کی تھیں۔

لیوسی نے بتایا تھا کہ اس کی ایک بوڑھی ماں ہے اور ایک چھوٹا بھائی جو زیر تعلیم ہے۔ معاشی مجبوریاں اسے راؤ بہادر کشوری لال تک لے گئی تھیں اور پھر وہ اس کے اشاروں پر ناچنے لگی تھی۔ صفدر علی بیگ نے لیوسی سے راؤ بہادر کشوری اور اس کی بہن کملا کے بارے میں بھی مختلف سوالات کیے۔ میں خود ان دونوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیوسی نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، غلط نہیں تھا۔ ان سوالات کا مقصد غالباً یہی تھا کہ صفدر علی بیگ لیوسی کی صداقت کو قدم قدم پر آزمانا چاہتا تھا۔ لیوسی، راؤ بہادر کشوری لال کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی، شاید اسی لیے اس نے یہ چال چلی تھی جو بظاہر مجھے کامیاب نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے اس چال کا کوئی مقصد بھی رہا ہو مگر میں اس وقت کچھ اور نہ سمجھ سکا۔

کچھ دیر مزید سوال جواب کے بعد صفدر علی بیگ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر اب کسی قدر اطمینان نظر آ رہا تھا۔

"اب میں تم سے کل رات ملوں گا۔" صفدر علی بیگ نے کہا۔ "تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اگر وہ سچ ثابت ہوا تو رہائی تمہاری ہو گی۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے صفدر علی بیگ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ "اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں تمہارے ہاتھ اور پیر بندھے ہوئے نہیں ہوں گے تاکہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو لیکن اس کے باوجود تم رہو گی یہیں!"

اپنی بات پوری کر کے صفدر علی بیگ جھکا اور پھر دوبارہ کھڑا ہوا تو میں نے اس کے ہاتھ میں لمبی سی رسی دیکھی جو غالباً مسہری کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔

"وہ دونوں کم بخت چلے گئے اور مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ تمہیں مسہری کے ساتھ باندھنا بھی ضروری ہے ورنہ تم سے کوئی حماقت بھی سرزد ہو سکتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے صفدر علی بیگ نے لیوسی کے جسم کو مسہری سے باندھ دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر کمرے کی کھڑکیاں دیکھیں، اس کے بعد دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے کے قریب سوئچ بورڈ تھا۔ صفدر علی بیگ کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا اور پھر کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے اور چکھے بھی تو اپنا ہی نقصان کرے۔ دشمن سمجھ رہا تھا میں اس سے ڈر کر بھاگ گیا لیکن میں تھا کہ اس کی چھاتی پر مونگ اور دیگر دالیں دلنے کے لیے وہیں موجود تھا۔ یہ سوچ کر دشمن کے جال میں پھنسنے کے باوجود میری باچھیں کھل اٹھی تھیں مگر کمرہ تاریک تھا اس لیے کھلی ہوئی باچھوں کا حسین نظارہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔

قدموں کی چاپ معدوم ہوتے ہی کمرے میں "غوں غاں" کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ "غوں غاں" لیوسی نے اپنی ستواں سی ناک سے پیدا کی تھی۔ میں فوراً لپک کر اس کے پاس نہیں پہنچا تھا اس لیے وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور اٹھنے کے لیے زور مارا۔ وہ تو مجھے فوراً یاد آ گئی کہ احتیاط سے اٹھنا چاہیے ورنہ سنگھار میز الٹ جاتی۔ پھر کے الٹنے سے جو زوردار چھناکا بلند ہوتا وہ مجھے لے ڈوبتا۔

میں بڑی احتیاط سے سنگھار میز کے پیچھے سے نکلا اور اندازے سے مسہری کی طرف بڑھنا شروع کیا مگر چند قدم چلنے کے بعد مجھے شبہ ہوا کہ "صحیح طرف" نہیں جا رہا۔ میں رک گیا۔

"غوں غاں کرتی رہو تاکہ میرا سفر تمہاری ہی طرف جاری رہے۔" میں نے لیوسی کو مخاطب کیا کیوں کہ اس کے کان بہرحال کھلے ہوئے تھے جن میں صفدر علی بیگ نے روئی یا کپڑا ٹھونسنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس احمق کو کیا خبر تھی کہ مجھ جیسا شخص ایسے موقع پر صرف کانوں سے کام چلا سکتا ہے۔

پھر اس کے بعد "غوں غاں، غوں غاں" بلند ہوتی رہی اور ہر "غوں غاں" کے ساتھ میرے قدم مسہری کی طرف بڑھتے رہے۔ کمرے میں تاریکی پھیلے ہوئے بھی خاصی دیر ہو چکی تھی اس لیے ویسے بھی مجھے کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔

آخر میں مرکزِ "غوں غاں" تک پہنچ ہی گیا۔ میں نے "غوں غاں" کو ٹٹولا۔

"غوں غاں!" اس بار بڑے زور کی آواز ابھری اور میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا ہاتھ "غوں غاں" کے کس حصے پر پڑا تھا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا وہ حصہ ممنوعہ ہی رہا ہو گا ورنہ اتنی زور کی "غوں غاں" نہ ہوتی۔

میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر ہاتھ سے ٹٹول کر مسہری کا سرا محسوس کیا اور اس پر بیٹھ گیا تاکہ اطمینان سے کوئی مناسب لائحہ عمل بنا سکوں۔

"اوں، اوں"۔ اس بار "غوں غاں" کی بجائے "اوں، اوں" سنائی دی۔ اب مجھے ناک کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ صرف ناک سے مختلف قسم کے "صوتی اثرات" پیدا کیے جا سکتے ہیں بلکہ اگر اداکاری اور والات خوش گوار ہوں تو لیلیٰ مجنوں اور الہا اودل کی کہانیں بھی "الاپی" جا سکتی ہیں۔

میں نے دوبارہ ہمت اور عقل سے کام لے کر ہاتھ بڑھایا۔ ساتھ ہی میں نے آہستہ سے کہا۔ "اوں اوں کرتی رہو تاکہ میرا ہاتھ اس طرح سیدھا تمہاری ناک تک پہنچے اور پھر ناک کے نیچے میں تمہارا منہ تلاش کر سکوں جس میں کپڑا ٹھنسا ہوا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ تم "غوں غاں اور اوں اوں" کرنے کی تکلیف سے بچ جاؤ گی۔"

میرا جملہ ختم ہوتے ہی "اوں اوں" کے سگنل بلند ہونے لگے۔

"بس بس!" میرا ہاتھ اس کی ناک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے اس کی ناک پکڑ لی اور پھر فوراً ہی چھوڑ دی، یہ سوچ کر کہ اگر زیادہ دیر میں ناک ہی پکڑے بیٹھا رہا تو دوسرے ضروری کام رہ جائیں گے۔ ابھی مجھے اس کا منہ بھی تلاش کرنا تھا لیکن ناک مل جانے کے بعد اب میں ایسا فکر مند نہیں رہا تھا۔ ناک سے اس کا منہ زیادہ دور ثابت نہ ہوا۔ میں نے اس کے منہ میں انگلیاں ڈال کر کپڑا باہر کھینچ لیا۔

جیسے ہی کپڑا باہر آیا، وہ چہچہائی مگر یہ چہچہاہٹ مدھم سروں میں تھی۔ "تم اتنا بے وقوف... بے وقوف کیوں بناتے ہو!"

"لو، میں تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا! ایک تو تمہارے منہ سے کپڑا نکال دیا اوپر سے تم..."

"فضول باتیں چھوڑو اور جلدی سے رسیاں کھول دو!" لیوسی کے لہجے میں سختی سی آ گئی جو مجھے ناگوار گزری۔

"جناب بلکہ جنابہ! آپ مجھے اس انداز میں ہرگز حکم نہیں دے سکتیں! یہ نہ بھولیں کہ آپ اس کیس پر میری زیرِ نگرانی کام کر رہی ہیں، ہاں!" میں بھی اینٹھ گیا کیوں کہ اس وقت میری گنتی چڑھی ہوئی تھی۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تمہیں حکم نہیں دے رہی تھی۔" لیوسی کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "میں نے تو تم سے درخواست کی تھی اللہ دتا!"

"تو پھر یوں کہو نا!" میں بھی نرم پڑ گیا۔ "میل مروت میں تو چاہے مجھ سے جھاڑ دلوا لو، دے لوں گا لیکن..."

"ٹھیک ہے" لیوسی میری بات کاٹ کر بولی۔ "اب جلدی سے رسیاں کھول دو تاکہ ہم دونوں یہاں سے فرار ہو جائیں۔"

فرار کا ذکر سن کر میرے خون میں حرارت آ گئی اور اسی کے ساتھ مجھے موقع محل کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ لیوسی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس چوہے دان سے نکلنا بہت ضروری تھا ورنہ دشمن، نہ صرف لیوسی کو بلکہ مجھے بھی دوسری دنیا کی سیر کرانے کا پروگرام بنا سکتا تھا۔

"بالکل، بالکل!" میں نے تائید کی۔ "ہمیں یہاں سے فوراً فرار ہو جانا چاہیے۔ کیوں کہ ابھی راہِ فرار کے بارے میں بھی طے کرنا ہے اس لیے تمہاری رسیاں کھلنا اشد ضروری ہیں۔"

پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ میں نے لیوسی کے جسم پر بندھی ہوئی رسیاں کھولنے میں وہ تیزی دکھائی کہ بس! محاورہ تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑنا ہے مگر لیوسی نے ایسا نہیں کیا۔ وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑنے کی بجائے پنجے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سنو اللہ دتا! ہم کھڑکی کھول کر پہلے باہر کودیں گے، پھر چار دیواری پر چڑھ کر..."

"بس، بس! رہنے دو!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "یہ راہِ فرار مسدود ہے۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ عمارت کی چاروں طرف گویا چار دیواری کے اندر کئی عدد خطرناک قسم کے کتے چھوٹے ہوئے ہیں جو کھڑکی سے باہر کودتے ہی ہمارا انٹرویو شروع کر دیں گے۔"

"پھر... پھر کیا ہو؟" لیوسی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"یہ مجھ سے پوچھو!" میں نے سینہ پھلا کر کہا مگر فوراً ہی سینے کو پچکا لیا کیوں کہ تاریکی کے سبب لیوسی میرا پھولا ہوا سینہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مقصداً سے پھولا ہوا سینہ دکھانا ہی تھا ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ سینہ پھلاتا۔

"ہاں تم مجھ سے بہتر راہ سوچ سکتے ہو کیوں کہ تم بہرحال کسی نہ کسی طرح تو یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہو گے۔ ہاں وہ میں تم سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی اور کون تھا تمھارے ساتھ؟"

"دلاور خاں۔" میں نے جواب دیا۔ "کتوں نے انھیں دوڑا دیا تھا۔"

"پھر تم کیسے بچ گئے؟" وہ روا روی میں پوچھ بیٹھی ورنہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے میرے جذبوں، ولولوں اور جرأتوں کی عبرت انگیز اور سبق آموز داستان جو میں بعد میں بیان کروں گا۔ فی الحال یہاں سے چھوٹنے کی فکر کرو۔" میں نے حسبِ عادت اور حسبِ دستور شیخی بگھارنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا مگر میں ابھی اپنے ذہن میں پوری کہانی ترتیب نہ دے پایا تھا میری مراد اس کہانی سے ہے جو مجھے تیواڑی جی کو سنانا تھی اس لیے وقتی طور پر بات ٹال گیا۔

"ٹھیک ہے تفصیلات پھر بیان کر لینا، فی الحال وہ بات بتاؤ جو تم بتانا چاہتے تھے۔" لیوسی نے میری "لن ترانی" کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ابھی بتاتا ہوں۔" میں بولا۔ "جس طرح میں یہاں پہنچا تھا اسی طرح یہاں سے فرار بھی ہو سکتا ہوں بلکہ اپنے ساتھ تمھیں بھی لے کر اُڑن چھو ہو سکتا ہوں۔"

"آخر بتا بھی چکو کہ کس طرح!" لیوسی کی آواز میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

"دیکھو! اس عمارت کے باہر ایک پیڑ ہے، کہو ہے!" میں نے کہا۔

"مجھے کیا معلوم! تم کہہ رہے ہو تو ہو گا۔"

"ہو گا نہیں بلکہ ہے!" میں زور دے کر بولا۔ "میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"اچھا ہے، ہے، ہے! بس اب تو تمھیں چین آ گیا۔" لیوسی واقعی جھنجلا گئی تھی۔ "آگے تو کہو۔"

"تم ہاں کرتی جاؤ، میں آگے فرار کے منصوبے کی تفصیل بیان کرتا جاؤں گا۔"

"بیان کرو، میں ہاں کہتی جاؤں گی۔" لیوسی را[ضی] ہو گئی۔

"تو سنو! اس پیڑ کی ایک عدد شاخ عمارت کی چھت [تک] پہنچتی ہے، کہو ہاں!"

"ہاں۔"

"عمارت کی چھت سے ایک زینہ بہ آسانی آدمی کو نیچے [برآمدے] تک لا سکتا ہے، کہو ہاں!"

"ہاں۔"

"اس برآمدے سے اس کمرے کے دروازے تک پہنچا [جا سکتا] ہے، کہو ہاں!"

"ہاں۔"

"تو جس طرح میں نے باہر سے عمارت کے اندر اس ک[مرے] تک آنے کا راستہ بتایا، اسی طرح اس کمرے سے نکل کر عمار[ت سے] باہر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ کہو ہاں!"

"نہیں!" لیوسی پُرزور لہجے میں بولی۔

"ہاں" کی بجائے "نہیں" میرے لیے غیر متوقع لفظ تھا۔ وہ اب تک میری مرضی کے مطابق "ہاں ہاں" کرتی رہی [تھی] اس لیے میں حیران ہو کر بولا۔ "یعنی کیا مطلب!"

"یعنی مطلب یہ کہ تم خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔" [اس] نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"وہ کس طرح؟" میں بہکا۔

"وہ اس طرح کہ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند [ہے] اور جب تم یہاں آئے تھے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔"

"ارے یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا!"

"اس لیے کہ تم اپنی ہر بات پر صرف "ہاں" سن[نا چاہتے] تھے۔"

"پھر اب کیا ہو گا؟" میں نے اپنا منصوبہ فیل ہو[تے دیکھ کر] اداس لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو میں نے پہلے کہا تھا۔" لیوسی بولی۔

"یعنی کھڑکی کھول کر باہر کودنے کا منصوبہ؟"

"ہاں!"

[ہ]اں!" میں نے اس کی نقل اتاری، پھر بولا۔ "اور اگر کتوں [نے] بوٹی بوٹی کر ڈالا پھر؟"

[د]یکھو اللہ دتا! اب بہت وقت ضائع ہو چکا ہے، سنجیدہ [ہو جاؤ۔ م]یں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں کہ تم اتنے بے وقوف اور [بزدل ن]ہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو۔" لیوسی سنجیدگی سے [بولی۔]

[م]یں کیوں ہوتا بے وقوف اور بزدل! میں تو بچپن ہی سے [بہادر اور] ذہین ہوں۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے!"

"[و]ہی جو تم درحقیقت ہو اور وہی جو تم ظاہر نہیں کرنا [چاہت]ے۔"

"[پ]تا نہیں تم کیا فلسفہ جھاڑ رہی ہو۔ بہرحال میں نے تمھیں [خطر]ے سے آگاہ کر دیا ہے، اب تم جانو اور تمھارا کام!" میں [نے کہ]ا۔

"اب میں جانوں اور میرا کام!" لیوسی آہستہ سے ہنس [کر بو]لی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے تو تم افسری چھانٹ رہے تھے۔"

"وہ تو میں ہوں۔" اپنی افسری پر آنچ آتے دیکھ کر میں [نے کہا۔]

"[خ]یر ان باتوں کو چھوڑو، میں کھڑکی کھولتی ہوں۔" لیوسی [نے کہ]ا۔

"[پ]ھر سوچ لو!"

"سوچ لیا۔" لیوسی نے جواب دیا اور پھر اس کے قدموں [کی] "چپ چپ" اندھیرے میں ایک جانب بڑھتی ہوئی سنائی دی۔ [اس] "چپ چپ" کا راز یہ تھا کہ وہ ننگے پاؤں تھی۔ پتا نہیں اس [کم]رے میں لیوسی کے سینڈل موجود ہی تھے یا ان لوگوں نے بیچ کھائے تھے۔

کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ چٹخنی سرکنے کی آواز آنے لگی [ج]سے سن کر مجھ پر پھر ہول سوار ہونے لگا کہ نہ جانے اب کیا ہو گیا [تھ]ا۔ لیوسی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی اور یہ احتیاط [ا]س وقت بھی تھا۔ میں ڈر کے مارے اب تک مسہری پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

بالآخر کھڑکی کا ایک پٹ کھل ہی گیا جس کے ذریعے مدھم [رو]شنی کمرے میں در آئی۔ پھر لیوسی نے دوسرا پٹ بھی آہستہ [س]ے کھول دیا۔ خیریت گزری کہ کھڑکی میں جنگلا نہیں تھا ورنہ [کھ]ڑکی کا نام ہی باقی رہ جاتیں اور فرار کا منصوبہ چوپٹ ہو جاتا۔

اس وقت ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جسے محسوس کر کے [خ]وشی بھی ہو رہی تھی اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں نے اکثر پڑھا [او]ر سنا تھا کہ طوفان آنے سے قبل ہمیشہ خاموشی ہوتی ہے۔ پتا نہیں وہ کتے، وہ خوفناک کتے کیوں خاموش تھے جو ہر طرح کا راگ الاپنے میں ماہر تھے اور جنھوں نے دلاور خاں جیسے "شیر دل" سی آئی ڈی انسپکٹر کو ریس لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیوسی اس وقت کھڑکی سے سر نکال کر ادھر اُدھر نظارہ مار رہی تھی۔ ایک حسینہ فرار ہونے کے لیے "پَر" تولنے والی تھی مگر وہاں کوئی نہ تھا جو اسے اس ارادے سے باز رکھ سکتا۔ ہاں ایک میں ضرور تھا تو میرے ساتھ ہی تو وہ "بھاگ" رہی تھی یا مجھے اپنے ساتھ بھگا لے جانا چاہتی تھی۔ ایسی صورت میں میرے لیے اسے باز رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں تو خود نہ جانے کب سے ہاتھ اور پَیر دونوں ہی فرار کے لیے تول رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اب تک "تلائی" نہیں ہو پائی تھی۔

اچانک لیوسی نے سر اندر کر لیا اور میری طرف مڑی۔ میں سمجھا کہ کھڑکی کے باہر اس نے یقیناً کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔ یہ سوچ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے جو بار بار خطا ہونے میں مشاق ہو چکے تھے۔ پھر لیوسی نے مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا، قریب آنے کا اشارہ!

"کک... کیا ہے؟" میں ہکلایا۔ "کھڑکی کے... باہر... کون... کون ہے؟"

جواب میں لیوسی نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ پہلے جیسے انداز میں ہاتھ ہلایا۔

مرتا کیا نہ کرتا! میں قہراً، جبراً، مجبوراً مسہری سے اٹھا اور پنجوں کے بل بہت ہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا لیوسی کی طرف بڑھا جیسے فرش پر نہیں بتاشوں پر چل رہا ہوں جن کے ٹوٹ جانے سے مجھے دلی صدمہ پہنچ سکتا ہے۔

پھر میں جیسے ہی لیوسی کے قریب پہنچا، اس نے اپنا منہ گویا میرے کان میں گھسیڑ دیا اور منمنائی۔ "ہر طرف سناٹا ہے، کوئی بھی نہیں، آؤ نکل چلیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرے کان سے منہ

اب میری باری تھی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ لیوسی کی اس حرکت کا مقصد کیا ہے، یعنی وہ میرے کان میں منہ گھسیڑ کر کیوں منمنائی تھی اور اس سے پہلے اس نے اپنے نازک ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیوں کیا تھا۔ وہ غالباً اونچا بول یا سن کر دشمنوں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے جواباً اسی لیے اس کے کان میں منہ گھسیڑ دیا تھا اور اسی کی طرح منمنایا تھا۔ "مگر وہ کم بخت کتے کیوں نہیں بھونک رہے؟"

"ضروری تو نہیں کہ وہ ساری رات مسلسل بھونکتے رہیں"۔ لیوسی نے میرے کان میں کہا۔

"لیکن وہ گئے کہاں؟" میں بھی لیوسی کے کان میں بولا۔

"وہ عمارت کے پھاٹک پر ہوں گے اور کہاں ہو سکتے ہیں!" لیوسی کی منمناہٹ میں اب جھنجلاہٹ شامل ہو چکی تھی۔

"اور وہ دونوں حرام خور، پھر خود صفدر علی بیگ؟" جب تک مجھے ہر طرف سے تسلی نہ ہو جاتی بھلا کس طرح میدانِ عمل میں چھلانگ لگا دیتا۔

"صفدر علی بیگ سو چکا ہوگا، رہے اس کے گرگے تو ظاہر ہے کہ اگر جاگ بھی رہے ہوں گے تو عمارت ہی کے کسی کمرے میں ہوں گے" لیوسی نے جواب دیا "آخر تم اس سوال جواب میں وقت کیوں گنوا رہے ہو!"

ہر چند کہ لیوسی کے جواب نے مجھے بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا مگر پھر بھی مجھے "دھک دھکی" لگی ہوئی تھی۔

"اپنے جوتے اتار دو تاکہ باہر کودو تو کم سے کم آواز ہو" لیوسی نے مشورہ دیا۔

"لیکن جوتے ہاتھ میں ہوں گے تو میں چاردیواری پر کس طرح چڑھوں گا؟" میں نے اس کے کان میں اعتراض کیا۔

"میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا کہ جوتے ہاتھ میں لیے رہو" اس نے میرے کان میں اعتراض کا جواب دیا۔

"تو پھر کیا کانوں سے لٹکا لوں!" میں جھنجلاہٹ میں یہ بھول گیا کہ مجھے ہر بار اس کے کان میں "منمنا" چاہیے۔

پھر میں مزید بھی کچھ کہنے والا تھا کہ لیوسی نے اپنا نازک سا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا اور حالات اس قدر سنگین نہ ہوتے تو میں اس نازک سے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا لیکن اس وقت تو بات ہی دوسری تھی۔ جانِ عزیز داؤ پر لگی ہو تو کیسی نازکی، کیسا لمس اور کیسا گداز! ہاں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا چاہیے تھا، اس کے کان میں کہنا چاہیے تھا۔

"تمہیں جوتے زیادہ پیارے ہیں کہ زندگی؟" اس نے میرے کان میں لفظ انڈیلے اور اسی کے ساتھ میرے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"زندگی!" میں نے جلدی سے اس کے کان میں کہہ دیا۔ اسی کے ساتھ زندگی خطرے میں پڑنے کا احساس، میرے حواس پر غالب آگیا۔

پھر اس سے پہلے کہ لیوسی مجھے مزید دہلاتی، میں نے ...
اتار دیے اور سوچا کہ جان ہے تو جوتے بھی ہیں ورنہ ...
کام کے!

جوتے اتار کر میں نے ان پر ایک حسرت ناک نگاہ ڈا...
کہ وہ سرکاری جوتے نہیں، میرے اپنے جوتے تھے، میرے گا...
پسینے کی کمائی کے جوتے! ابھی انھیں خریدے ہوئے دن ...
ہوئے تھے۔ پہلی تنخواہ پر خوش ہو کر ابا نے پہنوائے تھے۔ ...
رہو، جس پیر میں رہو، خوش رہو پیارے، جوتو! ہم تو مجبو...
ہیں۔

پھر کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف اُچک سے کودنے میں ...
لیوسی نے کی۔ میں اس کے بعد کودا اور کودا بھی کیا، کھڑکی سے ...
کر نیچے زمین پر رکھ دیے۔

چند ہی قدم پر چاردیواری تھی۔ میں اور لیوسی ایک دو...
کا ہاتھ پکڑے پنجوں کے بل چلتے ہوئے چاردیواری تک ...
گئے۔ دور کہیں کسی جگہ، غالباً عمارت کے صدر دروازے پر بلب ...
جلا دیا گیا تھا جو پہلے روشن نہیں تھا۔ اسی بلب کی ہلکی سی رو...
وہاں تک آڑھی ترچھی ہو کر پہنچ رہی تھی۔ وہی مدھم روشنی کم...
کی کھڑکی سے اندر پہنچی تھی۔

اس وقت ظاہر ہے کہ میرے دل کا عجب عالم رہا ہوگا ...
ایسے موقعوں پر بڑی اچھل کود اور ہنگامے ہوتے ہیں جب ہی...
ہیروئن کو لے کر فرار ہو رہا ہو یا ہیروئن، ہیرو کو بھگا کر لے جا ...
ہو مگر اس وقت کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آ رہا تھا۔ رقیب ...
ہیروئن کو بے بس و مجبور کرنے کے بعد اور اسے آئندہ رات ک...
ڈیٹ دے کر چین کی بنسری بجا رہا تھا۔ کمال یہ کہ اس بنسری ک...
آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے کیوں کہ حالات ان ...
تھے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھے گا بھی یا لیٹ ...
جائے گا اس لیے میں نے اس موقع پر لیوسی کو پہل کرنے کا چانس ...
دیا تھا لیکن اب اونٹ کی کھونٹ کا تعین ہو چکا تھا، منزل سامنے ...
تھی، بس اس پر چڑھنے کی دیر تھی اس لیے میں نے لیوسی پر سبقت ...
حاصل کرنا چاہی۔ ویسے بھی ضروری نہیں کہ ہر معاملے میں عورت ذات ...
ہی پہل کرے۔ بعض مواقع پر مرد ہی کو پہل کرنا پڑتی ہے، سو ...
میں نے ہی پہل کی۔

میں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے چاردیواری پکڑ لی، پھر دونوں ...
بازوؤں پر زور ڈال کر اٹھنے لگا۔ لیوسی قد میں مجھ سے چھوٹی ...
تھی اس لیے منہ دیکھتی رہ گئی۔

میں چاردیواری پر چڑھ کر دوسری طرف کودنے ہی والا تھا ...

...وسی کا خیال آگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا منہ اور دونوں ...
...ئے کسی بچے کی طرح اوپر دیکھ رہی تھی، ایسا بچہ جو اپنی ...
...ں کی گود میں آنے کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑا ہو۔ ہر چند کہ ...
...اس سے کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا، پھر بھی مجھے اس پر ...
...آگیا۔

...یں نے اپنے دونوں گھٹنے چاردیواری پر ٹکا دیے اور ایک ...
...کی طرف بڑھا دیا۔ دیکھنے میں تو وہ مجھے اب تک گلاب کا ...
...ی تھی مگر جب میں نے اسے اوپر کی طرف کھینچا تو گوبھی کا ...
...سوس ہوئی کیوں کہ گوبھی کا پھول، گلاب کے پھول سے ...
...زن کا ہوتا ہے۔

...ذرا سا اوپر آتے ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے چاردیواری ...
...ا میرا بوجھ کم ہو گیا۔ پھر چند لمحے بعد ہی وہ بھی میری ...
...نزل یعنی چاردیواری پر چڑھ چکی تھی۔

...یں چاردیواری سے نیچے چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ ...
...نے میرا بازو پکڑ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ ...
...س نے مجھے بولے بغیر ہاتھ کے اشاروں سے سمجھایا ...
...رح کمرے کی کھڑکی سے کودا گیا تھا، اسی طرح چاردیواری ...
...سری طرف کودنا یا اترنا ہے۔

...یں لیوسی کی بات سمجھ گیا۔ اس بار لیوسی اور میں ایک ساتھ ...
...ری سے اترے۔ لیوسی کے پیر تقریباً آدھے فٹ اوپر تھے ...
...چاردیواری کی دوسری سمت یعنی بیرونی سمت لٹک ...
...ں مگر جب اس نے چاردیواری چھوڑی تو زیادہ دھمک ...
...ئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شاید وہ پنجوں کے بل زمین تک ...

...چاردیواری سے اترنے کے بعد یعنی اس عمارت لگویا مقتل ...
...اُترتے ہی نہ میں ایک دم سرپٹ دوڑا، نہ لیوسی کسی ہد کی ...
...وڑی کی طرح بھاگی۔ میں نے تو خیر اس لیے فوراً ریس نہیں ...
...ی کہ اس عمارت سے باہر آجانے کے باوجود بھی میرا دم ...
...تھا۔ میں تنہا بھاگنے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ لیوسی ...
...نے تیزی پھرتی کیوں نہیں ہوئی تھی، یہ اس نے مجھے ...
...بتایا تھا۔ بقول اس کے وہ سُن گن لے رہی تھی کہ آس ...
...ئی "خطرہ" تو ہاتھ میں ریوالور لیے نہیں چھپا ہوا۔

...نہ جانے کس لمحے لیوسی نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ ...
...دیا تھا۔ مجھے تو اس کا احساس اس وقت ہوا جب لیوسی ...
...ہاتھ دبایا اور قدم بڑھانے کا اشارہ کیا۔ اس وقت میرا ایک ...
...من من بھر بلکہ ٹن ٹن بھر کا ہو رہا تھا مگر مجھے بہر حال ...
...دگی کی لاج رکھنا ہی پڑی۔ لیوسی ایک عورت ہو کر مردانگی ...

کا اظہار کر رہی تھی تو بھلا میں بزدلی کس طرح دکھا جاتا!

جس وقت میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تھا، عین اسی وقت کتوں میں سے کسی کو کوئی راگ الاپنے کی سوجھی۔ وہ راگ کون سا تھا، خوف زدہ ہونے کے سبب میں نہ پہچان سکا۔ ایک نے الاپ لیا تو دوسرے نے بھی تان اٹھائی اور پھر باقاعدہ مقابلہ شروع ہو گیا۔

میں الاپ سنتے ہی ٹھٹک کر رُک گیا تھا اور اسی لمحے لیوسی میرے کان میں منمنائی تھی "جلدی سے نکل چلو، رکو مت!"

اس وقت میری نکیل لیوسی نے تھام لی تھی ورنہ میں تنہا ہوتا تو شاید بے نکیل اونٹ کی طرح نہ جانے کدھر نکل جاتا۔

بدحواسی اور اندھیرے کے باوجود میں نے حتی الامکان سمتوں کا خیال رکھا تھا۔ اب میں اور لیوسی اس عمارت سے کچھ دور نکل آئے تھے۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ میرا حافظہ اتنے خطرناک مراحل سے گزرنے کے باوجود بھی صحیح سالم تھا۔

میں اور لیوسی اس وقت احتیاطاً جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر چند کہ ننگے پیر ہونے کے سبب بار بار میرا جی کراہ اٹھنے کو چاہ رہا تھا مگر میں نے اپنی چونچ بند رکھی تھی، یہ سوچ کر کہ لیوسی کی چونچ بھی بند ہے اور میری ہی طرح اس کے نازک تلووں میں بھی کنکر پتھر چبھ رہے ہوں گے۔

وہ میرے حافظے ہی کا کمال تھا کہ مجھے یاد آگیا، دلاور خاں نے اپنی پھٹ پھٹ انہی جھاڑیوں میں چھپائی تھی۔

"ٹھہر جاؤ لیوسی!" میں نے بڑے "ڈرامائی" انداز میں بآوازِ بلند کہا تھا اور لیوسی کا ہاتھ دبایا تھا جو اب تک میرے ہاتھ میں تھا۔

"آہستہ بولو، سناٹے میں آواز دور دور تک سنی جا سکتی ہے" لیوسی نے رک کر مدھم لہجے میں کہا۔

"اچھا" میں اس بار بہت آہستہ بولا۔

"کیا کہا؟" لیوسی نے سرگوشی کی۔

"میں نے اچھا کہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تم یہاں رکے کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ میں تو میں میرے ابا بھی یہاں سے پیدل گھر نہیں جا سکتے" میں نے تجسس پیدا کرنے کی خاطر ابھی اصل بات بتانا ضروری نہ سمجھا۔

"مجبوری ہے اور جان بچانے کی خاطر ایسا کرنا بہت ضروری ہے" لیوسی نے پھر وہی داؤ آزمایا جو پہلے آزما چکی تھی یعنی مجھے

جان پیاری ہے یا جوتے؟ میں نے جان بچانے کے حق میں رائے دی تھی لیکن اس بار ترپ کا پتا گویا میرے ہاتھ میں تھا' یعنی پھٹ پھٹ موجود ہونے کا اہم راز! میں لیوسی کو اس اہم راز سے پردہ اٹھا کر دانتوں کے بیچ انگلی دبانے پر مجبور کرنا چاہتا تھا تاکہ اس پر میرا رعب بیٹھ سکے۔ اس کا عہدہ چاہے میرے برابر ہی سہی مگر بہرحال وہ میری ماتحتی میں کام کر رہی تھی۔ مجھے اتنا تو چاہیے تھا کہ خود کو اس سے برتر ثابت کروں۔

"دیکھو لیوسی! انسان اگر عقل مند ہو اور اس کی عقل حاضر نہ ہو' بروقت موقع ادھر ادھر نہ ٹل جائے تو وہ کسی مجبوری کو خاطر میں نہیں لاتا۔" میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی دانست میں زبردست مکالمہ بولا' ایسا مکالمہ جو میرے خیال میں کسی ہیرو ہی کو بولنا چاہیے تھا۔

"آخر تمہارا مقصد کیا ہے' ان باتوں سے؟" لیوسی کسی قدر جھنجلا گئی۔ "اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ خطرے کی حدود سے نکل آئے ہو تو اس بات کو ذہن سے نکال دو۔ دشمن اب بھی ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اگر انھیں ذرا بھی شک ہو گیا تو وہ ہمیں ڈھونڈنے عمارت سے باہر نکل پڑیں گے اور پھر کسی صورت ہمیں زندہ بچ کر نہیں جانے دیں گے۔"

لیوسی کی بات سن کر میں دہل اٹھا اور تجسس پیدا کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں ہکلانے لگا۔ "کیا... کیا واقعی وہ... وہ ہمیں گولی... گولی مار دیں گے؟"

"مجھے اب مزید بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو!" لیوسی سنجیدگی سے بولی۔ "میں تمہیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔"

"یقین... یقیناً سمجھ چکی ہوگی مگر میں... میں تمہیں ایک اہم بات بتانے والا تھا... جب میں اور دلاور خاں..."

"جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو اور اداکاری چھوڑ دو' یہ وقت اس کا نہیں ہے۔" لیوسی نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"یہاں انہی جھاڑیوں میں سے... کسی میں پھٹ پھٹ موجود ہے جو... جو..." میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے خیال آگیا تھا کہ کہیں دلاور خاں پھٹ پھٹ پر بیٹھ کر نہ چلے گئے ہوں۔

"میں سمجھ گئی۔" لیوسی بولی۔ "تم اور دلاور خاں موٹر سائیکل پر یہاں آئے ہو گے مگر کیا خبر یہ وہی جھاڑیاں ہیں یا نہیں!"

"مجھ سے چاہے جیسی قسم لے لو یہ وہی جھاڑیاں ہیں۔" میں لیوسی کو یقین دلانے کے شوق میں ہکلانا بھی بھول گیا۔

"اگر ایسا ہے تو پھر موٹر سائیکل تلاش کرو۔ جھاڑیوں کا سلسلہ زیادہ طویل معلوم نہیں ہوتا۔"

"ہاں ہاں! بالکل!" میں جلدی سے بولا۔

پھر کچھ دیر بعد موٹر سائیکل کیا ملی گویا دونوں جہان کی دولت مل گئی۔ دلاور خاں کو کتوں نے یقیناً اتنا موقع نہیں دیا ہوگا کہ جھاڑیوں کا رخ کر سکتے۔ اس لمحے' صرف اس لمحے مجھے وہ بزدل کتے بڑے پیارے لگے۔ اگر وہ دلاور خاں کو ریس نہ لگواتے تو میں اور لیوسی یوں چین کی بنسری بجاتے ہوئے وہاں ہرگز نہ چھوٹ سکتے۔

میں نے موٹر سائیکل جھاڑیوں سے نکال کر لیوسی کو بیٹھنے کے لیے کہا اور کک ماری۔ چند لمحے بعد سویا ہوا انجن جاگ اٹھا۔ سناٹے میں اس کی آواز مجھے قیامت کا شور محسوس ہوئی۔ میں جیسے تیسے گدی پر بیٹھ کر ہینڈل سنبھالا اور اللہ کا نام لے کر کچی سڑک پر دھول اڑانے لگا۔ اندھیرے میں کچھ پتا نہیں دے رہا تھا کہ کہاں گڑھا ہے اور کہاں زمین ہموار ہے اس لیے میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا پھر بھی ہینڈل بے قابو ہونے کے آثار تھا۔ بار بار دھچکے لگ رہے تھے اور ہر دھچکے کے ساتھ لیوسی مجھ سے مزید چمٹی جا رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس طرح میری کمر تھام رکھی تھی جیسے اسے خطرہ ہو' میری "کمر گرا" نہ جائے۔ وہ یوں میری پشت سے چمٹی ہوئی تھی جیسے بندریا کا بچہ اپنی "امی جان" سے چمٹتا ہے حالانکہ نہ میں امی تھا اور نہ وہ بندریا کا بچہ یا بچی۔

کچھ دیر بعد کچی سڑک ختم ہو گئی۔ میں نے پختہ سڑک کی طرف موٹر سائیکل موڑ دی جو نہ بالکل تاریک تھی اور نہ نامعلوم۔ میں اب تک نقاب پوش بنا ہوا تھا لیکن اب مزید بنے رہنے پر آمادہ نہیں تھا اور اس کا سبب تھا۔ پہلے تو میرے ساتھ دلاور تھے جو خود نقاب پوش کے روپ میں تھے۔ اگر رات کو گشت لگانے والے پولیس والے پکڑ لیتے تو وہ خود معاملے کو "سلٹا" دیتے مگر اب صرف میں ہی نقاب پوش تھا اور میرے پیچھے ایک عدد "مہ لقا" بھی براجمان تھی۔ پولیس والے مجھے اس مہ لقا کے ساتھ' چہرے پر سیاہ نقاب چڑھائے جاتے ہوئے دیکھ لیتے تو "آو بدا" کر رکتے۔ وہ یہی سمجھتے کہ ایک نقاب پوش مہ لقا کو اغوا کر کے لیے جا رہا ہے۔ ان کی "رگِ قانونیت" بھی زور سے پھڑک اٹھتی اور وہ اپنے فرض کے ہاتھوں مجبور ہو ایک مہ لقا کی عزت و ناموس بچانے دوڑ پڑتے۔ میں خود کو اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں سمجھتا تھا اس لیے میں نے شرافت سے نقاب اتار کر جیب میں ٹھونس لی۔

ہر چند اب سڑک ناہموار نہیں تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ لیوسی کو میری کمر کی طرف سے فکر لاحق ہو مگر وہ اب تک اسی طرح مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ مجھے آخر کار صدائے احتجاج بلند کرنا ہی پڑی۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "لیوسی! اب تم میری کمر کی فکر چھوڑ دو' یہ نہیں گرے گی۔"

لیوسی نے جواب میں شاید ہلکی سی "اوں" کی تھی۔ کہیں یہ ظالم سو تو نہیں گئی؟ میں نے سوچا اور ڈر گیا۔ میرے ذہن میں فوری خیال یہ آیا تھا کہ اگر ایسا ہی ہے تو وہ کسی بھی لمحے موٹر سائیکل سے لڑھک جائے گی اور اپنے ساتھ ہی مجھے بھی لڑھکانے کا بندوبست کر دے گی۔ یہ خیال آتے ہی میں زور سے چیخا۔ "لیوسی! اے لیوسی!"

"ہوں' ہوں!" اس بار وہ زور سے بولی مگر کمر پر گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ "کیوں چیخ رہے ہو؟ کیا بات ہے؟"

"تو تم جاگ رہی ہو نا!"

"ہاں' ہاں کیوں؟"

"میں سمجھا تھا کہ تم سو گئی ہو اور سہانے سپنے دیکھنے میں مشغول' ہو۔"

"ہاں' میں سپنا ہی دیکھ رہی تھی۔"

"یعنی تم واقعی سو گئی تھیں؟" مجھے اس کی اس حرکتِ نازیبا پر غصہ آنے لگا۔

"نہیں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

"تم سو بھی نہیں رہی تھیں اور سپنا یعنی کہ خواب بھی دیکھ رہی تھیں!" میں نے حیرت سے کہا کیوں کہ بات ہی ایسی عجیب تھی۔

"کچھ سپنے کھلی آنکھوں بھی تو دیکھے جاتے ہیں۔" اس کی آواز میں غنودگی سی تھی جیسے وہ واقعی سوتے میں بول رہی ہو۔ لیوسی نے میری معلومات میں اضافہ کیا تھا جس کا اظہار میں نے لفظوں میں بھی کر دیا۔

جواب میں لیوسی نے ایک عدد لمبا سانس کھینچا تھا' پھر میری کمر کے گرد اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد لیوسی کا صرف ایک ہاتھ کمر کے گرد رہ گیا تھا۔ پہلے لمبا سانس کھینچنا' پھر گرفت ڈھیلی ہونا' اس کے بعد کمر کے گرد صرف ایک ہاتھ رہ جانا' اسٹیپ بائی اسٹیپ ایسا کیوں ہوا تھا' اس وقت یعنی عمر کے اس حصے میں میرے لیے یہ حرکات ناقابلِ فہم ہی تھیں۔ ہاں مجھے اس وقت سکون سا ضرور محسوس ہوا تھا کہ چلو اچھا ہوا میری کمر کے گرد جو پھندا پڑ گیا تھا' وہ تو کسی حد تک بلکہ بڑی حد تک ڈھیلا ہوا۔

"اللہ دتا!" اچانک لیوسی نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم اتنے بے رحم کیوں ہو؟"

"میں... میں بے رحم! نہیں تو... تم سے کس نے کہا؟" میں لیوسی کی زبان سے اپنے بارے میں قطعی غیر متوقع بات سن کر حیران رہ گیا۔ پتا نہیں اس نے کس سے میرے بارے میں انٹ شنٹ باتیں سن لی تھیں اور مجھے حیرت تھی کہ اس نے ان باتوں پر یقین کیسے کر لیا تھا۔

"بعض باتیں کہنے سننے کی نہیں ہوتیں خود ہی محسوس کر لی جاتی ہیں۔" لیوسی نے شاید پھر لمبا سانس کھینچا' شاید اس لیے کہ پھٹ پھٹ کے شور میں لمبا سانس ہی کسی حد تک سنائی دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ اس کا کلکیا سا منہ اور ستک سی ناک میرے بائیں کان کے قریب تھی۔

اس وقت پھٹ پھٹ' ایک عدد چوراہے سے گزر رہی تھی۔ دائیں جانب جو سڑک جا رہی تھی' وہ قرول باغ کی طرف جاتی تھی۔ قرول باغ جہاں سیٹھ وشوانا تھ رہتا تھا اور جہاں اس کی حسین بیٹی سروج رہتی تھی یا رہا کرتی تھی کیوں کہ تازہ اطلاعات کے مطابق وہ ظالم شہر ہی چھوڑ بھاگی تھی یا اسے بھگا دیا گیا تھا۔ اس طرف سے گزرتے ہوئے میرا ذہن سروج میں پھنس گیا یا سروج میرے ذہن میں پھنس گئی' بہرحال بات ایک ہی ہے۔ یہی سبب تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں لیوسی ڈارلنگ کی طرف سے غافل ہو گیا کہ وہ کیا اڑنگ بڑنگ اڑا رہی ہے۔ میں چونکا اس وقت جب لیوسی نے عشق کا ذکر کیا۔

"عشق!" میں نے حیرت سے کہا۔ اس وقت میں کیوں کہ سروج کے بارے میں سوچ رہا تھا اس لیے یہی سمجھا کہ وہ سروج سے میرے "سرکاری عشق" کے متعلق استفسار کر رہی ہے۔ میں اسی لیے ہکلا کر مزید بولا۔ "وہ... وہ تو سرکاری عشق تھا' سرکاری..." میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری طرح خفیہ میں ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اس نے سرکاری عشق کے بارے میں بھی پتا چلا لیا ہو۔

"سرکاری عشق!" لیوسی نے بھی میری طرح حیرت سے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟ میں نے تو تم سے کچھ اور پوچھا تھا۔"

"اچھا اچھا پھر ٹھیک ہے۔" میں جلدی سے بولا۔ "تو پھر پوچھو۔" میرے سینے سے جیسے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے سرکاری عشق سے واقف نہیں تھی۔

"لیکن تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں کیا کہہ رہا تھا' یہ تو میں بھول ہی گیا۔"

"ہوں۔" اس نے اس طرح ہنکارا بھرا جیسے سمجھ گئی ہو کہ میں اسے "الّو" یعنی الّو کی مادہ بنا رہا ہوں اور وہ مادہ بننے پر راضی ہو گئی ہو یعنی الّو مادہ! پھر چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولی۔ "خیر تم نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔ میں تم سے یہ پوچھ

رہی تھی کہ کبھی تم نے عشق کیا ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں کئی عشق کیے ہیں۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے؟"
میں نے اکڑ کر کہا تا کہ وہ ظالم کہیں مجھے نابالغ نہ سمجھ بیٹھے۔ پھر میں نے بغیر رکے کہا "میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ عشق کیسے کرتے ہیں۔"

"مجھے بھی بتا دو۔"

"کیا؟"

"یہی کہ عشق کیسے کرتے ہیں؟"

"دراصل عشق کے لیے دو افراد کا ہونا ضروری ہے۔" میں نے اپنی قابلیت کا اظہار شروع کر دیا۔ "انہی دونوں میں سے ایک عدد عشق کرتا ہے اور دوسرا عشق کرواتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان دونوں افراد کے بیچ ایک نادیدہ سڑک یعنی روڈ ہوتی ہے جو ان دونوں کو آپس میں ملاتی ہے۔ یہ نادیدہ سڑک ایک دل سے دوسرے دل کی طرف جاتی ہے گویا یوں سمجھ لو کہ دل سے دل کو روڈ جاتی ہے جسے کچھ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے یا جاتی ہے۔ اب سمجھیں تم کہ عشق کیسے...."

میرا جملہ ابھی مکمل نہیں ہو پایا تھا کہ لیوسی نے کسی قدر تیز آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا!"

"ہوں۔"

"ایک کار ہمارا تعاقب کر رہی ہے اور تیزی سے ہمارے قریب آتی جا رہی ہے۔"

"کک... کدھر... کدھر...." میں گھبرا گیا اور اسی وقت میں نے ایک دم مڑ کر دیکھا اور پھٹ پھٹ لہرا گئی۔

"ہینڈل سنبھالو۔" وہ چیخی، پھر دوسرے ہی لمحے دوسرا حکم جاری کیا۔ "رفتار تیز کرو۔ اس کار میں آنے والے ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔"

"مم... مگر... مگر تمہیں اتنی دور سے وہ... وہ ٹپ کیسے گئے؟"
یہ کہتے ہوئے میں نے رفتار بڑھا دی۔

"میں کچھ دیر سے یہ بات محسوس کر رہی تھی لیکن اب یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ کار ہمارا ہی تعاقب کر رہی ہے۔ تمہارے پاس ریوالور تو ہوگا!"

"ریوا... ریوالور!... ہاں ہے مگر تم... تم کیا کرو گی اس کا؟"

"مجھے دو، ریوالور مجھے دو!" اس کے لہجے میں تیزی آ گئی۔

"وہ... وہ میری دائیں جیب میں ہے... تم خود ہاتھ ڈال کر نکال لو... اس لیے کہ اگر میں نے ہینڈل چھوڑا تو... تو پھر تم تو جانتی ہو کہ ایسے موقعوں پر کار یا پھٹ پھٹ کسی شرابی کی طرح سڑک پر لہرانے لگتی ہے۔ پھر اس کے بعد...." میں نے فقرہ ادھورا ہی چھوڑ دیا کیوں کہ اس وقت تک لیوسی میری سیاہ پینٹ کی دائیں جیب سے ریوالور نکال چکی تھی۔

پیچھے آنے والی کار کی تیز روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں تھی۔ مارے خوف کے مجھے زور کا پیشاب لگنے لگا اور یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں پھٹ پھٹ کو سڑک کے کنارے کھڑا کر کے اس "ضروری فرض" کی ادائیگی کر سکتا۔ ان حالات میں یہ اشد ضروری ہو گیا تھا کہ میں جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جاتا جہاں اس فرض سے سبکدوش ہو سکتا۔ یہ سوچ کر میں نے پھٹ پھٹ کو مزید تیز بھگانا شروع کر دیا۔ میں اس تاک میں بھی تھا کہ ادھر ادھر کوئی سڑک یا گلی نظر آئے تو پھٹ سے پھٹ پھٹ کو موڑ لوں اور دشمن کی نظر سے اوجھل ہو جاؤں جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہیرو کیا کرتے ہیں۔

دھائیں! اچانک سناٹے میں ایک بم سا پھٹا، اسی دھائیں کے ساتھ میرا ذہن "بھائیں بھائیں" سا ہو گیا۔ میری چھوٹی سی کھوپڑی میں "بھائیں بھائیں" ہونے لگی جیسے وہ میری چھوٹی سی کھوپڑی نہ ہو بلکہ کوئی بڑی سی ویران حویلی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ بھی تو نہ آیا کہ وہ "دھائیں" کیوں ہوئی اور پھر بھائیں بھائیں کیوں ہونے لگی۔

"رفتار اور تیز کر دو!" لیوسی کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

میرے ہاتھ اور پیر جیسے خود کار انداز میں حرکت کرنے لگے۔ یوں جیسے میں خواب میں پھٹ پھٹ پر بیٹھا اڑا چلا جا رہا ہوں، اڑا چلا جا رہا ہوں اور کوئی مجھے اڑائے لیے جا رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کتنی دیر اس "عالمِ نامعلوم" میں "محوِ پرواز" رہا۔ مجھے چونکا اٹھنے کا اس وقت خیال آیا جب پے در پے کئی بار لیوسی نے مجھے پکارا۔

"کک... کیا... کیا ہے؟" میں جیسے نیند سے [illegible]
حالانکہ پہلے بھی میں لیٹا نہیں بیٹھا ہی تھا۔

"یہ تم کدھر جا رہے ہو؟" لیوسی نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!"

"مگر مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "موٹر سائیکل موڑو۔"
مجھے اچانک جیسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ موٹر سائیکل موڑنے کے لیے کہہ رہی تھی، عجب "احمق الذّار" تھی وہ! شاید وہ بھی گھبراہٹ میں میری طرح سب کچھ بھول گئی ہے۔ میں نے سوچا اور خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "دشمن پیچھا کر رہا ہے۔ ایسے میں دانش مندی کا تقاضا ہے

[illegible]رسینگ سمائیں "سما" دیے جائیں۔"
جواب میں میری سماعت سے لیوسی کے ہنسنے کی آواز ٹکرائی۔ [illegible]موقع پر مجھے ہرگز کسی مندر کی گھنٹیاں بج اٹھنے کی طرح [illegible]ن نہیں ہوئی۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا، میرے خوف پر گویا [illegible]لب آ گیا اور میں نے چنچنا کر کہا۔ "کیوں قہقہیا رہی ہو؟"
وہ میری بات سن کر اور بھی زور سے قہقہائی۔ اس کے [illegible]اپنی "قہقہاہٹ" میں بریک مار کر بولی۔ "مجھے تمہاری یہ [illegible]ر آئی۔"
[illegible]ہیں! میں گویا ادائیں دکھا رہا ہوں! گویا میں بھی تمہاری [illegible]ی لونڈیا ہوں!" میں اور "بمک" اٹھا۔
اچھا اب زیادہ اداکاری مت کرو، موٹر سائیکل موڑو۔" لیوسی [illegible]سنجیدہ ہو گیا۔
اب بڑی حد تک میرے حواس جو پہلے غائب ہو چکے تھے، [illegible]ڑائے گئے تھے اور کچھ کچھ مجھے بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ خطرہ [illegible]یا ہے ورنہ لیوسی یوں ہنس ہنس کر باتیں نہ "گھول" رہی ہوتی۔ [illegible]کے باوجود میں نے مڑ کر دیکھنا ضروری سمجھا کیوں کہ میں ہرگز [illegible]ہ سکا تھا خطرہ ٹل کیسے گیا!
دور دور تک کوئی کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ [illegible]یکھتے ہی ایک عدد لمبا سا سانس لینا ضروری سمجھا۔ اسی کے [illegible]و میرے ذہن میں سوالوں کے بچھو ڈنک مارنے لگے۔ مجھے یہ [illegible]د آ گیا کہ اس وقت بڑی زور کا پیشاب لگا تھا اور شاید [illegible]ڑا بہت خطا بھی ہو گیا تھا لیکن اب کیوں کہ راوی "امن چین" [illegible]تا تھا اس کا رسٹر یعنی اس وجہ سے اب پیشاب ویشاب [illegible]ل اٹھنا "عبث" تھا۔ نہ جانے کب پیشاب لگنا بند ہو گیا تھا اور [illegible]یکلم بند تھا۔ اس صورتِ حال میں ظاہر ہے کہ سوالوں کے [illegible]خوں کو کلبلانا ہی چاہیے تھا اور وہ کلبلا کلبلا کر لیوسی پر [illegible]ے کرنے لگے۔
اب میں موٹر سائیکل موڑ کر اور کچھ دور واپسی کا سفر طے [illegible]کے بعد لال کنویں کی طرف جا رہا تھا کیوں کہ پہلے لیوسی [illegible]ان چھوڑنا تھا۔
راستے میں لیوسی نے مجھے اس "دھائیں" کی اسٹوری سنائی [illegible]جس سے میری کھوپڑی میں "بھائیں بھائیں" ہونے لگی تھی اور [illegible]کچھ دیر کے لیے گویا "انا غفیل" ہو گیا تھا۔
لیوسی نے بتایا تھا کہ جب وہ کار قریب آ گئی تھی تو اس [illegible]نے کار کے ٹائر کو نشانہ بنا دیا تھا۔ کار کے اگلے پہیے کو نشانہ [illegible]بنایا گیا تھا اور کیوں کہ وہ اسپیڈ میں تھی اس لیے حادثے کا [illegible]شکار ہو گئی تھی یا شکار کر دی گئی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ہی بقول [illegible]

ہوئے مارے گئے، ظاہر ہے کہ لیوسی وہاں یہ دیکھنے کے لیے نہیں رک سکتی تھی۔ وہ بس یہ دیکھ سکی تھی کہ دشمنوں کی تعداد دو تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ دونوں صفدر علی بیگ ہی کی دیگ کے چمچے تھے۔

پہلے مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ لیوسی نے صفدر علی بیگ کو اپنا صحیح پتا ہی بتایا تھا لیکن جب اس نے مجھ سے لال کنویں کی طرف چلنے کو کہا تھا تو یقین کرنا ہی پڑا تھا۔ شاید صحیح پتا بتانے کا سبب یہ تھا، اس وقت تک لیوسی کو یقین نہیں ہوگا کہ میں اسے وہاں سے نکال لے جانے کا کارنامہ سرزد کر دوں گا۔ صفدر علی بیگ یقیناً اس کے بارے میں پوچھ گچھ کراتا اور پتا غلط ہونے کی صورت میں اس کی مینگ نکال دیتا۔

جب میں نے لال کنویں پہنچ کر پھٹ پھٹ روکی تو لیوسی سے اپنا سرکاری ریوالور لے لیا، پھر اسے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہاری امی تو بہت ناراض ہوں گی کہ تم کہاں غائب رہیں۔ اس طرح جوان جہان لڑکیوں کا راتوں کو گھر سے غائب رہنا بہرحال تشویش ناک بات ہے۔"

میری بات سن کر لیوسی مسکرائی، پھر بولی۔ "وہ بہرحال فکرمند تو ہوں گی مگر اب ان باتوں کی عادی ہو چکی ہیں۔"

"یعنی تم اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہتی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تمہیں فکر کیوں ہو گئی؟" اس نے بھی سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"مجھے! نہیں تو! میں تو بس حیران ہو رہا تھا اس بات پر!" میں نے کہا، پھر پوچھا۔ "کیا انہیں معلوم ہے کہ تم خفیہ میں ہو؟"

"ہاں وہ جانتی ہیں۔" لیوسی نے جواب دیا، پھر بولی۔ "اچھا اب تم جاؤ، یہ باتیں پھر کبھی فرصت سے کریں گے۔"

"ہاں وہ یاد آیا، تم نے صفدر علی بیگ کو اپنا صحیح پتا بتا دیا تھا، اگر وہ رات برات ادھر آ گیا تو؟"

"میرے فرار کے بعد اب وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ وہ سمجھے گا کہ میں نے اسے دوبارہ بھی بے وقوف بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ یا اس کا کوئی گرگا یہاں تک پہنچ گیا تو میں اس سے نمٹ لوں گی، تم فکر نہ کرو۔" لیوسی نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے پھٹ پھٹ اسٹارٹ کی، اس پر بیٹھا اور ٹاٹا، بائی بائی کرتا ہوا جامع مسجد کی طرف ہو لیا۔

جب میں جامع مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

"اللہ اکبر، اللہ اکبر!"

میری امّی نے مجھے اللہ اکبر کا مطلب سمجھا دیا تھا' اللہ
بڑا ہے۔ اس وقت اِس صدا کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میرا
جی چاہا کہ جھٹ موٹر سائیکل روکوں اور جا کر سجدے میں
گر پڑوں مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ نماز' اذان کے کچھ
دیر بعد ہوتی ہے۔ میں گھر پہنچ کر پھر واپس آ جاؤں گا اور جب
میں امّی سے کہوں گا' نماز پڑھنے جا رہا ہوں تو وہ خوش ہو کر
یہ پوچھنا ہی بھول جائیں گی کہ میں ساری رات کہاں غائب
رہا۔

گھر پہنچا تو ابا اور امّی دونوں جاگ چکے تھے۔ دروازہ
امّی ہی نے کھولا تھا اور توقع کے مطابق ایک دم برس پڑی
تھیں "کیوں اپنی صحت کے پیچھے پڑ گیا ہے' مٹ گئے ایکڑ دے
دل سے مجھے نہیں کرانی نوکری۔ کوئی حد حساب بھی تو ہو' صبح
کام' رات کام' دن کام' رات دن کام! اتنا سارا کام تو نے لیا
ہی کیوں؟"

مجھے علم تھا کہ وہ کچھ دیر تک جھک کر اور ابا کی مداخلت
کے بعد چپ ہو رہیں گی اس لیے چپ چاپ بس اتنا ہی کہا۔
"ایسے کہہ کر تو گیا تھا امّی!"

"تو یہ کہہ کر گیا تھا کہ ساری رات غائب رہے گا!" انھوں
نے آنکھیں نکالیں "خدا کی مار رات بھر بار بار میری آنکھ کھلتی
رہی اب آ گیا ہو گا' جب آ گیا ہو گا۔"

میں نے اس مکالمے بازی کے دوران میں پھٹ پھٹ
کھڑی کر دی تھی اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ امّی
بڑبڑاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ اب مجھے ابا کا
سامنا کرنا تھا اور ان کا سامنا کرتے ہوئے میری ہوا سرکتی تھی۔
پتا نہیں وہ کیا پوچھیں اور میں کیا کہہ بیٹھوں اور کہیں کوئی سرکاری راز
میری زبان سے سلپ ہو جائے۔

میں ڈرتا جھجکتا اندر پہنچا مگر اس دن ابا خلافِ توقع
کچھ خوشگوار موڈ میں تھے۔ ایک آدھ سوال کے بعد بولے "جا
اور جا کر آدمی بن! چہرے پر پھٹکار برس رہی ہے' پتا نہیں کہاں
سے چلا آ رہا ہے۔"

میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اماں اور ابا میں سے
کسی کی نگاہ میرے پیروں پر نہیں گئی تھی جن میں جوتے نہیں
تھے۔ میں جلدی سے اس کمرے کی طرف لپکا جہاں سوتا تھا
اور جہاں میرے پرانے جوتے موجود تھے جنھیں میں نے نئے جوتوں کی
خوشی میں "طلاق" دے دی تھی۔

ابا اس وقت صحن میں غسل خانے کی موری کے سامنے بیٹھے
وضو کر رہے تھے اور امّی بھی لوٹا چھوڑ کر دروازہ کھولنے اٹھی
تھیں۔ وہ بھی غالباً وضو ہی کر رہی تھیں۔ ابا مسجد میں نماز پڑھنے
جاتے تھے۔ اگر میں نماز پڑھنے کا اعلان کرتا تو یقیناً وہ خوش
ہو کر مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتے۔ ہر چند کہ وہ میرے ابا
اور میں ان کا برخوردار' سلمہٗ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے
کہیں آتے جاتے بس میرا دل ہی دہلتا رہتا تھا۔ پتا نہیں کہ
اور کس بات پر آنکھیں نکالنے لگیں۔ یہ سوچ کر میں نے گھر
نماز پڑھنے کو ترجیح دی تاکہ مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر
امّی تو خوش ہو ہی جائیں اور یہ بھی کہ اللہ کا شکر ادا ہو جائے
جس نے میری جان بچائی تھی ورنہ دوسرے جہان کا ٹکٹ کٹنے
میں دیر ہی کتنی رہ گئی تھی۔

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے' پیر میں چپلیں ڈالیں
وقت بھائی صاحب کمرے کے سامنے سے گزرے جو فجر کی نماز ابا کے
ساتھ ہی پڑھتے تھے' رہے بڑے بھیا تو وہ دیر سے اٹھتے
جب میں وضو کرنے کے ارادے سے باہر جانے ہی والا تھا
مجھے یاد آیا کہ نماز پڑھنے سے پہلے نہا بھی لینا چاہیے۔ ذرا پاک
صاف ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہوں تو اچھا ہے۔ اس کے
علاوہ یہ کہ نہانے سے تھکن بھی اتر جاتی ہے۔

میں نے تولیا کندھے پر ڈالا اور کمرے سے نکل کر غسل خانے
کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں ابا اور بھائی صاحب نماز پڑھنے
جا چکے تھے اور امّی' صحن میں ایک طرف جا نماز بچھا کر نماز پڑھنے
کھڑی ہو گئی تھیں۔

میں غسل خانے میں گھس گیا' بالٹی میں پانی بھرا اور نہانے لگا
صابن ملنے کے لیے صابن دانی دیکھی تو اس میں کپڑے دھونے کا صابن
رکھا ہوا تھا۔ یا تو نہانے کا صابن ختم ہو گیا تھا اور امّی نے خساست
سے مجبور ہو کر اور صابن نہیں منگایا تھا یا پھر نہانے کا صابن کسی
نے وہاں سے ٹہلا دیا تھا۔ اس زمانے میں ابھی ٹائلٹ سوپ
ایجاد نہیں ہوا تھا' نہانے کے صابن بس ایسے ہی تھے۔ کپڑا دھونے
اور نہانے کے صابن میں بس یہی کوئی رتی دو رتی کا فرق ہوتا تھا۔

دونوں ہی میں سے آتی تھی' کسی میں سے کم کسی میں سے زیادہ
یا یوں سمجھیں کہ اچھے اور خوشبودار صابن امّی کی قوتِ خرید سے
باہر تھے۔ میں نے اس صابن سے نہانے کا پروگرام ملتوی کیا اور
جھٹا جھٹ جسم پر پانی انڈیل کر غسل خانے سے باہر آ گیا' کپڑے
پہن کر!

نماز پڑھی تو بڑا لطف آیا۔ رات بھر جاگنے کے سبب
ہر چند کہ نیند سے برا حال ہو رہا تھا مگر ظاہر ہے کہ دفتر تو جانا
ہی تھا۔ تیواڑی جی کو رپورٹ بھی تو دینا تھی کہ میں نے کیا کارنامہ

ہے۔ امّی نے مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر بڑی دعائیں دی
اور تاکید کی تھی کہ آئندہ باجماعت نماز پڑھا کروں۔ میں نے
سعادت مند بچوں کی طرح فوراً سر ہلا دیا تھا' اقرار میں!

ناشتے واشتے سے فارغ ہو کر میں نے دفتر جانے کی تیاری
کپڑے بدلے اور رد باری کی طرف بڑھ گیا جہاں پھٹ پھٹ
کی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں پھٹ پھٹ پر پھٹ پھٹ کرتا ہوا دفتر
جا رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جلو لیوسی کو بھی ساتھ
لے لوں۔ اسے بھی تو آخر رپورٹ دینا ہی ہو گی اور یوں بھی وہ
کارنامے کی عینی شاہد تھی۔

میں نے لال کنویں کا رخ کر لیا۔

میں لیوسی کے گھر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ مستات گھر سے تشریف
لے جا چکی تھیں۔ وہ دفتر ہی گئی ہو گی۔ میں نے سوچا اور پھر چل
پڑا پھٹ پھٹ پر بیٹھ کر!

نہ جانے وہ کون سی بری گھڑی تھی کہ میرے ذہن سے
نکل ہی گیا کہ اس کم بخت صفدر علی بیگ کا دفتر بھی
کھاری باؤلی ہی میں ہے اور اس وقت مجھے اس راستے سے
نہیں جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ میری چھوٹی سی کھوپڑی میں یہ
بات بھی نہ آئی کہ وہ ظالم بھی اس وقت دفتر پہنچنے والا ہو گا۔
یوں سمجھیں کہ میری کم بختی ہی تھی جو مجھے ادھر گھیر کر لے گئی تھی۔



میں مسجد فتح پوری کی پشت سے کھاری باؤلی میں داخل ہوا
ہی تھا کہ مخالف سمت سے ایک تیز رفتار کار میری طرف بڑھی' پتا
نہیں وہ کم بخت مجھے دیکھ سکا تھا یا نہیں مگر میری نظر اس پر ضرور پڑ
گئی تھی۔ تیز رفتار کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے صفدر علی بیگ نظر
آیا تھا اور اسی کے ساتھ میرے پیروں کے طوطے اڑ گئے تھے
حالانکہ اس وقت ہاتھوں کے طوطے بھی بآسانی اڑ سکتے تھے لیکن
جیسا کہ سبھی کو معلوم ہے' طوطا' طوطا ہوتا ہے اور اس میں اتنی عقل
نہیں ہوتی کہ کس وقت کس مقام سے اڑنا چاہیے۔ یہی سبب تھا کہ اس
وقت ہاتھوں کی بجائے میرے پیروں کے طوطے اڑے۔ ظالم طوطے
نہ جانے کب میری لاعلمی میں ہاتھوں سے اڑ کر پیروں پر جا بیٹھے
تھے پھر یوں ہوا کہ اِدھر طوطے اڑے اور اُدھر میرا پیر پوری قوت
سے بریک پر پڑا نتیجہ ظاہر ہے پھٹ پھٹ الٹ کر ایک طرف
گری اور میں اس کی سیٹ سے گویا پرواز کرتا ہوا دوسری طرف
گرا۔ صفدر علی بیگ کی کار میرے اور پھٹ پھٹ کے درمیان سے

گزرتی چلی گئی۔

لوگ میری طرف دوڑ پڑے۔ میں سڑک کے کنارے آنکھیں میچے "عالمِ استغراق" میں پڑا تھا۔ میں کولھوں کے بل زمین پر آیا تھا اور میرے کولھوں پر خاصا گوشت تھا اس لیے کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ نہ ہو پائی تھی۔ بس ذرا ایک آدھ جگہ سے کہنی وغیرہ چھل چھلا گئی تھی۔ مجھے یہ یقین کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میں زندہ ہوں۔ مجھے فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ جانا بلکہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانا چاہیے تھا لیکن جو حادثہ ہو چکا تھا اس کا اثر سارے جسم پر تھا۔ میں اسی لیے اس وقت تک نہ اٹھ سکا جب تک لوگوں نے سہارا دے کر نہ اٹھایا۔ اللہ کے کسی نیک بندے نے میری پھٹ پھٹ کی عیادت بھی کر ڈالی تھی یعنی اس کا انجن بند کر دیا تھا۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ نہ میری کھوپڑی پھٹی ہے اور نہ جسم کے کسی اور حصے سے خون جاری ہے تو گویا مایوسی کے عالم میں اپنی اپنی راہ لی۔ میں اب لنگڑاتا لنگڑاتا پھٹ پھٹ تک پہنچ کر اسے کھڑا کر چکا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ پھٹ پھٹ میری طرح ڈھیٹ ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ گزرے ہوئے حادثے کے نشانات موجود تھے۔ کہیں سے کچھ ٹوٹ گیا تھا، کہیں سے کچھ مڑ گیا تھا۔ ادھر ادھر شیشے کے ٹکڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ایک لمبی سی "ہائے" کی کیونکہ وہ "زخمی پھٹ پھٹ" میری نہیں بلکہ میرے سابق باس دلاور خاں کی تھی، اُن کی ذاتی ملکیت۔ گزشتہ رات وہ بے چارے سخت زخمی ہو گئے تھے اور صبح ہوتے ہی ان کی پھٹ پھٹ نے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔

صفدر علی بیگ کا اب دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔ وہ بدبخت کام دکھا کر ریس لگا گیا تھا مگر یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ دوبارہ میری "مزاج پرسی" کے لیے یہاں نہ آ دھمکتا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے زخمی پھٹ پھٹ کے تازہ زخموں کی پروا کیے بغیر اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں دیر نہیں لگائی۔ وہ کچھ دیر صدائے احتجاج بلند کرنے کے بعد اسٹارٹ ہو ہی گئی۔

میں جیسے تیسے کسی نہ کسی طرح اپنے دفتر تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا کیونکہ راستے میں کئی جگہ پھٹ پھٹ نے ہچکیاں لیں اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا مگر میں بھی ایک ہی کائیاں ہانک تھا۔ میں اس کا سارا "ڈرامی پن" سمجھ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وہ ہچکیاں، آخری ہچکیاں بہرحال نہیں ہیں۔

میرے دونوں کولھے دکھ رہے تھے مگر دکھن اتنی نہیں تھی کہ میں "ہائے ہائے" کرتے لگتا۔ ہر چند کہ کہنی میں مرچیں سی لگ رہی تھیں لیکن میں اس کا معائنہ کر چکا تھا۔ کہیں کہیں خون ضرور چھلک آیا تھا مگر بہا نہیں تھا۔

میں نے پھٹ پھٹ کو عمارت سے باہر اس جگہ کھڑا کیا جہاں اس کی ایک اور "ساتھن" کھڑی تھی تاکہ وہ اپنا دکھ درد اس سے بیان کرنے میں لگ جائے اور میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے پھوٹ لوں۔

میں جب خفیہ کی عمارت میں داخل ہوا تو اپنا سینہ ذرا سی کوشش کر کے خوب پھلا لیا۔ میں بہرحال ایک عدد زبردست کارنامہ انجام دے کر آ رہا تھا اور یہ کوئی معمولی بات ہرگز نہیں تھی۔ دشمن کے حصار سے یوں باہر آنا اور نہ صرف خود باہر آنا بلکہ ایک عدد حسینہ کو بھی ساتھ اڑا لانا کسی اور کے بس کا روگ کہاں تھا۔

میں اس توقع پر سینہ پھلائے ہوئے چل رہا تھا کہ آتے جاتے لوگوں کی نظر مجھ پر پڑے مگر بدقسمتی کہ اس وقت وہ راہداری خالی تھی جس سے میں گزر رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں یہ شدید خواہش انگڑائیاں "مار" رہی تھی کہ کوئی سامنے ہو اور میں اس پر اپنی بہادری کا رُعب پیلوں۔ تیواڑی جی بہرحال میرے افسر تھے اس لیے اُن پر رُعب پیلنا ممکن نہیں تھا۔ میں اُن سے صرف داد و تحسین کی توقع رکھتا تھا۔ واہ اللہ دتا! کمال کر دیا! تم تو واقعی شیر دل ہی ثابت ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے اور اس جیسے بہت سے کلمات سننے کے لیے ہر چند کہ میرا دل بے تاب ہوا جا رہا تھا اور دامنِ صبر بار بار ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا مگر رُعب پیلنے کا نشہ اس سے بھی سوا ہوتا ہے۔ تیواڑی جی پر بہرحال رُعب نہیں پیلا جا سکتا تھا اس لیے مجھے اس "کارِ خیر" کے لیے اپنے ماتحت ہی یاد آئے۔ میرے خیال میں کم از کم کمار کو اس وقت دفتر میں ضرور موجود ہونا چاہیے تھا اور یوں بھی میں اس بدزبان و گستاخ سے خار کھاتا تھا اس لیے تیواڑی جی سے اپنی تعریف سننے کی بجائے میں نے پہلے رعب جھاڑنا یا پیلنا ازبس ضروری جانا۔ میں سینہ پھلائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے میں گھسنے سے پہلے چپراسی نے سلام کیا جس کا جواب میں نے گردن کی معمولی سی حرکت سے دیا کیوں کہ میں نے افسرانِ کو بھی ایسے مواقع پر یہی حرکت کرتے دیکھا تھا۔ گردن کو مخصوص انداز میں ہلکی سی حرکت دینا گویا افسرانہ شان کا تقاضا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ خالی تھا۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ کم از کم کمار کو وہاں ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ٹھیک ہے بیٹا! آج آیا ہے میرے بائیں پر! میں نے سوچا۔ پہلے تو میں اسی سے جواب طلب کروں گا کہ وہ دفتر دیر سے کیوں پہنچا۔ افسر موجود ماتحت ندارد! بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے! میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ مجھے ساری تپش اس پر تھی کہ جو منصوبہ بنا کر وہاں آیا تھا وہ فلاپ ہو گیا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مزید اپنی کرسی پر براجمان رہوں یا تیواڑی جی کی پھڑکتی ہوئی مونچھوں کا دیدار کرنے، ان کے کمرے میں پہنچوں کہ معاً بھاری قدموں کی چاپ گونجی اور اسی کے ساتھ میرے سابق باس انسپکٹر دلاور خاں کمرے میں داخل ہوئے۔

دلاور خاں پر پہلی نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ ان کا ایک ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی پٹی کے اندر پڑا ہوا تھا۔ چہرے پر خراشوں کے نشانات تھے اور جسم کے جو حصے کپڑوں میں چھپے ہوئے تھے، ان کے بارے میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں کہاں مزید ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر گرج پڑے "اللہ دتا! میں تمھیں دیکھ لوں گا۔"

"سر! دیکھ لوں گا، سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا خدانخواستہ اس وقت میں آپ کو نظر نہیں آ رہا؟ خدا نہ کرے، کیا آپ کی آنکھیں بھی سر، متاثر......"

"چو.... پ!" انھوں نے ڈانٹ پلائی "میں تمھیں اندھا نظر آ رہا ہوں، ہیں!" یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف اس طرح بڑھے اور گھورا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سالم نگل جائیں گے۔

میں ڈر گیا "نن...... نہیں سر آپ...... آپ کی تو دونوں آنکھیں بالکل سلامت ہیں۔ دراصل مجھے...... مجھے کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔"

"غلط فہمی کا بچہ!" انھوں نے حقارت سے کہا۔

دلاور خاں نے براہِ راست میرے شجرۂ نسب پر حملہ کیا تھا مگر سچویشن ایسی تھی کہ میں نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔

"مجھے چار دیواری کی دوسری طرف پھینک کر تم کہاں بھاگ گئے تھے، بولو!" دلاور خاں نے پھر آنکھیں نکالیں "پھر پہلی بات تو یہ کہ تم ایک دم اٹھ کیوں کھڑے ہوئے تھے؟"

"وہ میں کتوں کے بھونکنے کی وجہ سے ڈر گیا تھا سر!" میں نے جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر کچھ بھی نہیں سر! میں وہاں سے آپ کی موٹر سائیکل لے کر بھاگ آیا تھا۔" میں نے دانستہ جھوٹ بولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دلاور خاں سے اپنا کارنامہ بیان کر دوں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں ان پر تیواڑی جی سے لتاڑ پڑوانا چاہتا تھا تاکہ ان کی ساری "طرم خانی" نکل جائے۔ میں انھیں فی الحال اندھیرے میں رکھنا چاہتا تھا۔

"بزدل کہیں کا!" دلاور خاں زیرِ لب بولے "بھاگ آیا تھا موٹر سائیکل لے کر!" انھوں نے میرے لہجے کی بھونڈی نقل اتاری۔ "یہ نہیں سوچا کہ میں وہاں سے کس طرح لوٹوں گا!"

"سر! اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت ہی کہاں تھا،" میں معصولیت سے بولا "آپ کو تو پتا ہی ہے۔"

"ہاں پتا ہے مگر تمھیں اس وقت پتا چلے گا جب تم تیواڑی جی سے ملو گے۔ میں ابھی انھیں تمھارا سارا کارنامہ سنا کر آ رہا ہوں۔ صرف تمھاری وجہ سے سارا منصوبہ فیل ہو گیا ورنہ میں مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا اور وہاں سے لیوسی کو بھی برآمد کر لاتا۔" دلاور خاں نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کیا آپ نے سر؟ اب کیا ہوگا؟ تیواڑی جی تو مجھے نوکری سے نکال دیں گے۔" میں مظلوم ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"اس وقت نہیں سوچا تھا جب مجھے چھوڑ کر بھاگے تھے! پتا ہے ان حرامی کتوں نے میری پنڈلی بھنبھوڑ کر رکھ دی۔ وہ تو میری ہی ہمت ہے کہ اس حالت میں بھی دفتر آ گیا ورنہ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو مہینوں بستر پر پڑا کراہتا رہتا۔" پتا نہیں، وہ جھوٹ بول رہے تھے یا سچ کیوں کہ میں نے انھیں لنگڑاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"اور یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہوا سر؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"تمھارا سر!" انھوں نے جل کر کہا۔

"میرا سر آپ کے ہاتھ میں ہو گیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟"

"بکو مت! اور یہ بتاؤ کہ میری موٹر سائیکل کہاں ہے؟ میں نے کچھ دن کے لیے تیواڑی جی سے چھٹی لے لی ہے۔ کل سے میں اس وقت تک دفتر نہیں آؤں گا جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤں۔ پتا ہے کتا کاٹ لیتا ہے تو پیٹ میں کتنے بڑے بڑے انجکشن گھونپے جاتے ہیں؟"

"پتا ہے سر! اسی لیے تو میں کتوں سے ڈرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا، پھر کسی قدر ڈرتے ڈرتے ہوئے انھیں موٹر سائیکل کے بارے میں بتایا۔

"کیا؟ تم نے اس کا کباڑا کر دیا! میں تم سے پیسے دھروا لوں گا، ہاں! وہ سرکاری نہیں میری ذاتی موٹر سائیکل ہے، سمجھے! میں ابھی دیکھتا ہوں اسے جا کر!" یہ کہتے ہوئے دلاور خاں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلے اور کسی سے ٹکرا گئے۔

"ارے ارے کیا ہوا سر! یہ آپ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں؟" مجھے کمار کی آواز سنائی دی۔ دلاور خاں یقیناً اسی سے ٹکرائے تھے۔ دلاور خاں جس وقت جھنجھنا کر کمرے سے نکل رہے تھے، کمار کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دلاور خاں اسے ایک عدد ڈانٹ پلا کر چلے گئے تھے اور وہ کمرے میں آ گیا تھا۔

"یہ تمھارے دفتر آنے کا وقت ہے؟" میں نے کمار پر نظر پڑتے ہی میز پر گھونسا مار کر کہا۔ جوشِ جذبات میں گھونسا کچھ زیادہ ہی زور سے میز پر پڑ گیا اور میرا ہاتھ جھنجھنا اٹھا جس کی وجہ سے مجھے اور طیش آ گیا۔

کمار نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس وقت جب وہ کمرے

میں داخل ہوا تھا تو ہونٹوں پر مخصوص دل جلا دینے والی مسکراہٹ موجود تھی لیکن شاید میرا پُر جلال چہرہ دیکھ کر وہ چوکڑی بھول گیا تھا اور السا بھی بلد ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور وہ کچھ سہما سہما سا نظر آنے لگا تھا۔

لوہا گرم ہو تو فوراً دوسری ضرب لگانا چاہیے تاکہ وہ ٹھنڈا ہو کر دوبارہ سخت نہ ہو جائے، یہ سوچ کر میں دوبارہ گرج اٹھا۔ ”بتاؤ تم دفتر دیر سے کیوں آئے؟ میں تمہارا افسر ہوں اور تم سے جواب طلب کر رہا ہوں!“

”غلطی ہو گئی سر! آئندہ ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔“ کمار مردہ سے لہجے میں بولا۔

”اب ایسا کیوں ہوا؟“ میں اس کے دب جانے پر اور شیر ہو گیا۔

”معاف کر دیجیے سر!“ اس نے چاپلوسی کے انداز میں کہا۔

”ہرگز نہیں!“ میں نے خود کو مزید طیش دلانے کی خاطر دوبارہ میز پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کا ایک مقصد کمار کو اور بھی رعب میں لینا تھا۔

”تو کیا آپ میری شکایت تیواڑی جی سے کر دیں گے؟“ وہ روہانسا سا ہو گیا۔

”اور کیا چھوڑ دوں گا تمہیں!“ میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”میں بہت دن سے تمہاری گستاخیوں کو نظر انداز کر رہا تھا لیکن اب میرے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ہے اور آج کے بعد یہ چھلکتا ہی رہے گا۔“

جواب میں کمار کچھ نہ بولا اور سر جھکائے ہوئے اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اس کی حالت پر ترس آنے لگا۔ ہائے ہائے کیسا کیسا چہکتا تھا اور آج کیا حال ہو گیا۔ میرے دل میں آئی کہ اس کا قصور معاف کر دوں۔ آخر وہ بیچارہ بھی تو آدمی ہی تھا، ہو گئی ہو گی کسی وجہ سے دیر! میرے دل میں رحم کے جذبات انگڑائیاں لینے لگے مگر اسی لمحے کمار کی گزشتہ گستاخیاں یاد آنے لگیں۔ میں نے سوچا کہ اگر آج سانپ نکل گیا تو پھر ہمیشہ لکیر ہی پیٹتا رہوں گا، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ کیا خبر پھر کبھی مجھے یہ سنہری موقع ملے نہ ملے۔ کہیں مجھے اس ”کافر گری“ پر سچ مچ رحم نہ آ جائے، یہ سوچ کر میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے فی الحال اس سے اپنا کارنامہ بیان کرنے کے پروگرام کو بھی موقوف کر دیا تھا۔

”کہاں جا رہے ہیں سر؟“ میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو کمار کی التجا آمیز سی آواز سنائی دی۔

میں نے بغیر مڑے اور بغیر رکے بلند آواز میں کہا۔ ”تیواڑی جی کے پاس!“ میں نے یہ الفاظ اس طرح ادا کیے تھے جیسے تیواڑی جی سے ملنے کے بعد کمار کو توپ دم کرا دوں گا یا اب اس کی موت کا فرمان ہی لے کر لوٹوں گا۔ ویسے میرا ارادہ تھا بھی خطرناک! میں اس موقع سے کم از کم اتنا فائدہ تو اٹھا ہی سکتا تھا کہ کمار سے اپنی جان چھڑا لیتا۔ میں نے سوچا تھا کہ جاتے ہی سب سے پہلے کمار ہی کا مسئلہ اٹھاؤں گا۔ یوں بھی کمار ”اعترافِ جرم“ کر چکا تھا۔

جب میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تیواڑی جی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو دل ہی دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ مجھے بیک وقت کئی عدد خوشیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ پہلی خوشی کمار کو ذلیل و خوار کر کے، دوسری خوشی دلاور خاں کو بے وقوف بنا کر اور متوقع لنا کا سلسلہ فراہم کر کے اور تیسری خوشی جو سب سے زبردست خوشی ایک بڑا کارنامہ انجام دے کر! جس کی تفصیلات میں، تیواڑی جی کو بتانے جا رہا تھا۔ مجھے خود حیرت ہو رہی تھی کہ اس وقت میرے قدم زمین پر کیسے پڑ رہے تھے۔

بہرحال میں جیسے تیسے تیواڑی جی کے کمرے تک پہنچ ہی گیا۔ میں نے چپراسی سے اندر خبر بھجوائی تو مجھے فوراً ہی تیواڑی جی نے بلا لیا۔

”آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے تیواڑی جی نے سگریٹ کو بڑے زور سے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ان کے تیور مجھے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ تیواڑی جی کے تیور کیوں بگڑے ہوئے ہیں۔ انہیں یقیناً دلاور خاں نے میرے خلاف بھرا ہو گا لیکن میں ایک دم انہیں سب کچھ بتا کر مزا کرکرا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی مجھے پہلے کمار کا مسئلہ پیش کرنا تھا اس لیے بیٹھنے کی اجازت ملتے ہی میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے پہلے کھنکھار کر گلا صاف کیا، پھر بولا۔ ”سر! باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی پہلے مجھے آپ سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنا ہے۔“

تیواڑی جی نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر اس طرح بولے جیسے اپنے غصے کو ضبط کر رہے ہوں۔ ”کرو بات!“

”بات یہ ہے سر، کہ میرا ماتحت کمار ہمیشہ دیر سے دفتر آتا ہے اور اس معاملے میں انتہائی غیر ذمہ دار ہے۔“ میں نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ”میں اب تک اس کی نااہلیوں کو نظر انداز کرتا آیا ہوں اور بار بار میں نے اسے وارننگ دی ہے مگر اس کے کان پر ایک عدد جوں بھی نہیں رینگی۔“ یہ کہہ کر میں رک گیا اور نظر اٹھا کر تیواڑی جی کے چہرے کو دیکھنے لگا کہ ان پر میری بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر تیواڑی جی کے بھنچے ہوئے ہونٹ کھلے۔

”اور کچھ کہنا ہے؟“

”جی... جی سر! وہ آج بھی بس ابھی ابھی دفتر آیا ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”سر! اس سے دوسرے ماتحتوں پر بھی برا اثر پڑنے کا شدید خطرہ ہے۔ میں... میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے تحریری طور پر جواب طلب کریں بلکہ... بلکہ سر! اس کا کہیں، کسی اور شہر میں تبادلہ کر دیں۔“

”ہوں!“ تیواڑی جی نے ہنکارا بھرا اور اسی وقت ان کی نوکیلی مونچھوں کو حرکت میں آتے دیکھ کر میرا دم خشک ہونے لگا۔ میں نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔ ”تو وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح دیر سے دفتر آیا ہے؟“

جی سر! بالکل سر!“ میں نے فوراً کہا۔

تم احمق ہو!“ تیواڑی جی ایک دم پھٹ پڑے۔

میں کبھی ہنستا اور کبھی بکتا ہونے لگا۔ ایک ساتھ ہنستا بکتا اس ... ہو سکا کہ تیواڑی جی کے اچانک بدل جانے والے رویّے ... بے چکر دم“ بنا دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں تیواڑی جی سے اپنے احمق ہونے کا سبب ... کرتا، انھوں نے پھر ”چاند ماری“ شروع کر دی۔ ”اس سے ... میں اس لیے جواب طلب نہیں کروں گا کہ وہ دفتر کا وقت ... ع ہونے کے بعد سے کچھ دیر پہلے تک میرے کمرے میں تھا ... تم سے ضرور جواب طلب کروں گا۔“

... ک... کیا... کیا سر! وہ... کمار آپ کے پاس تھا مگر...“

مچپ رہو!“ تیواڑی جی نے مجھے ڈانٹ پلائی اور خود میز پر ... طرف رکھا ہوا گلاس اٹھا کر پانی پینے لگے۔ موقع غنیمت ... تیواڑی جی کی پیاسی مونچھوں نے بھی خود کو تھوڑا بہت تر کر ... ا۔ تیواڑی جی نے جیب سے رومال نکال کر ان کی ”تری“ ختم ... خشک لہجے میں بولے۔ ”کل رات تم دلاور خاں کو چھوڑ کر کیوں ... گئے تھے؟ جواب دو!“ آخری الفاظ کہتے ہوئے ان کی نوکیلی ... ں پھڑ پھڑا اٹھیں اور لہجہ بھی سخت ہو گیا۔

میں اس وقت دل ہی دل میں کمار پر جھلا رہا تھا۔ اس ... نے میری خوشیوں پر پانی پھیرنے کی سازش کی تھی اور تیواڑی جی ... اپنے میرا امپریشن خراب کر دیا تھا جب کہ یہ وقت امپریشن ڈالنے ... اس بدبخت نے ایک بار پھر مجھے ”ڈز“ لگا دی تھی۔

تم نے جواب نہیں دیا اللہ دتا!“ چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ ... جی پھر دہاڑے۔

”سر! پہلے میں کمار کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ... اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ آپ کے...“

”اللہ دتا!“ تیواڑی جی نے میری بات کاٹ دی۔ ”ادھر دیکھو!“ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہیں اٹھائیں۔

”میں تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو مجھے!“ وہ ... آنکھیں ڈال کر غرائے۔ وہ شاید کسی طرح میری اس ... سے آگاہ ہو چکے تھے کہ میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے ... ڈر جاتا ہوں۔

یس سر!“ میں نے سہم کر کہا۔

تو پھر رپورٹ دو، رات کیا ہوا تھا؟“

معاً مجھے لیوسی یاد آ گئی۔ کیا وہ دفتر نہیں پہنچی؟ گھر پر تھی نہیں ... تو کہاں گئی وہ؟ میں نے اسی رَو میں، تیواڑی جی سے سوال ... کیا لیوسی دفتر نہیں آئی؟“

”تو اب میرا کام یہ رہ گیا ہے کہ میں سارے دفتر میں ایک ایک کمرہ جھانک کر یہ دیکھتا پھروں، کون دفتر آیا ہے، کون نہیں آیا!“ تیواڑی جی پھنکارے۔

”ن... نہیں... نہیں سر! میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا میں تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ویسے لیوسی آ کہاں سے جاتی دفتر؟“ تیواڑی جی مجھے گھور کر بولے۔ ”کیا تم نے ہی مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے صفدر علی بیگ نے اغوا کر لیا ہے؟“

”ہاں بتایا تو سر!“ میں نے کہا، پھر اپنی آواز میں ”بے پروا شان“ پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”مگر سر! اب حالات بدل چکے ہیں بلکہ بدل دیے گئے ہیں سر! اور حالات بدلنے کا سہرا آپ میرے سر پر باندھ سکتے ہیں سر!“

”کیا بک رہے ہو؟“ تیواڑی جی سخت لہجے میں بولے۔ ”سیدھی طرح بات کرو!“

”میں بک نہیں رہا سر، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ میں نے تیواڑی جی کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”جب حقیقت آپ کے سامنے آئے گی سر، تو آپ یقیناً کرسی یعنی اپنی کرسی سے اچھل پڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس وقت آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کا یہ اللہ دتا درحقیقت کیا ہے!“

”احمق، بے وقوف اور گھامڑ!“ تیواڑی جی نے جواباً کہا۔ ”تم اپنے بارے میں میری رائے نہیں بدل سکتے!“ یہ کہہ کر انھوں نے دوبارہ سخت لہجہ اختیار کر لیا۔ ”اب اگر تم نے تفصیل رپورٹ دینے سے ذرا بھی بچنا چاہا اور ادھر ادھر کی اڑائی تو میں تمہیں اپنے کمرے سے فوراً نکال دوں گا۔ تم اس ہوا میں نہ رہنا کہ بڑے صاحب کے سفارشی ٹٹو ہو۔ تم انھیں مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ تمہیں یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ وہ سخت اصولی آدمی ہیں۔ جب میں تمہارے جواب طلب کر کر کے فائل کا پیٹ بھر دوں گا تو پھر وہ بھی تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکیں گے، سمجھے!“ تیواڑی جی نے اپنی بات ختم کر کے مجھے گھورا۔

ابھی میں تیواڑی جی کی دھونس میں آنے کا خیال ہی کر رہا تھا کہ ان کا اردلی کمرے میں داخل ہو کر باادب بالملاحظہ ہو گیا۔ تیواڑی جی نے اس کی طرف سوالیہ نگاہ اٹھائی۔

”سر! مس لیوسی آپ سے ملنا چاہتی ہیں، انھیں اندر بھیج دوں؟“ اردلی نے ادب سے کہا۔

تیواڑی جی چونکے، میری طرف دیکھا اور پھر اثبات میں گردن ہلا کر بولے۔ ”اسے آنے دو!“

میری دونوں باچھیں جس حد تک کھل سکتی تھیں کھل گئیں۔ تیواڑی جی کی نگاہ دروازے کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور اب

کے چہرے سے سختی کی بجائے کسی قدر الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کم بخت پہلے کہاں مرگئی تھی؟ اگر پہلے سے آگئی ہوتی تو کم از کم مجھے تیواڑی جی کی لال پیلی آنکھوں کا دیدار تو نہ کرنا پڑتا اور نہ اتنی ڈانٹ پینا پڑتی۔

چند لمحے بعد وہ غارت گرِ ہوش، اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی بجائے لپ اسٹک سجائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے جسم پر سبز رنگ کی ساڑھی تھی جس پر ہلکے سُرخ رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ وہ بڑی تر و تازہ، نکھری ستھری اور چھلی چھلائی دکھائی دے رہی تھی۔

تیواڑی جی کا اشارہ پاکر اس نے میرے برابر والی کرسی سنبھال لی اور میں مہک اٹھا۔ اس کے جسم کی خوشبو سے نہیں بلکہ اس عطر سے جو اس نے اپنی ساڑھی اور بلاؤز وغیرہ پر چھڑکا ہوگا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے میری جانب بڑی قاتل نگاہ سے دیکھا تھا۔ اگر میری بجائے وہاں کوئی اور اس قاتل نگاہ کی زد پر ہوتا تو "کم لیٹ" ہو جاتا مگر میں تو ٹھہرا اللہ دتا اس لیے وار سہہ گیا۔

"ہوں!" تیواڑی جی نے سگریٹ سلگا کر معنی خیز انداز میں لیوسی کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا؟"

لیوسی کے حسین چہرے پر لمحہ بھر کو حیرت سی نظر آئی، پھر اس نے کہا: "کیا اللہ دتا نے کچھ نہیں بتایا سر!" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف بھی دیکھا۔

"نہیں!" تیواڑی جی بولے اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"دراصل سر! سب کچھ تو اللہ دتا ہی نے کیا تھا۔ اگر... اگر یہ..."

"کیا کیا تھا اس نے؟" تیواڑی جی جھنجلا گئے۔ "تفصیلی رپورٹ دو!"

"تفصیلی حالات کا علم تو مجھے بھی نہیں سر!" لیوسی نے کہا۔ "مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ اس عمارت میں جہاں دو مسلح افراد پہرا دے رہے تھے اور جس کے کمپاؤنڈ میں خطرناک کتے چھوٹے ہوئے تھے، وہاں کسی نہ کسی طرح اللہ دتا پہنچ گئے، پھر یہی نہیں بلکہ انھوں نے مجھے بھی ایک کمرے میں تلاش کر لیا۔ میں اس کمرے میں رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ پھر اللہ دتا ہی نے مجھے کھولا تھا، اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے بہ مشکل فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ ہمارا تعاقب بھی کیا گیا تھا لیکن ہم نے متعاقب کار پر فائر کر کے اس کا ایک ٹائر پھاڑ دیا اور وہ کار حادثے کا شکار ہو گئی۔" لیوسی یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"پھر؟" تیواڑی جی کی آواز سنائی دی۔

"پھر اللہ دتا نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور..."

"ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی نے لیوسی کی بات کاٹ دی اور میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب نہ ان کی آنکھوں میں غصہ تھا اور نہ مونچھیں کلبلا رہی تھیں۔ وہ مجھے کیوں اس طرح دیکھ رہے تھے، میں ہرگز نہ سمجھ پایا۔ میں نے کچھ دیر تو ان کی طرف دیکھتے رہنے کا رسک لیا، پھر نگاہ جھکا لی۔ یہ سوچ کر کہ کہیں ان کا موڈ خراب نہ ہو جائے۔ کافی دیر بعد ان کی پُرسکون آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ مجھ ہی سے مخاطب تھے۔ "اللہ دتا! میں اب تک تمھیں نہیں سمجھ پایا یا تم چیز ہی مختلف ہو یہ..."

"ہو سکتا ہے سر، ہو سکتا ہے!" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے زور سے گردن ہلائی۔

"کیا ہو سکتا ہے؟" تیواڑی جی کی آواز اب بھی پُرسکون تھی جس میں غصے کا شائبہ تک نہ تھا۔

"یہ... یہ سر کہ میں... میں مختلف چیز ہوں... مگر کیا میں آپ کو آدمی کی بجائے چیز معلوم ہوتا ہوں؟"

"تم پھر شروع ہو گئے!"

"نہیں تو سر!"

"پھر تفصیل بیان کرو! کیا ہوا تھا کل رات؟"

لیوسی میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھے جا رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس بات پر اتنی خوش ہوئے جا رہی تھی۔

"سر! میں پہلے بھی آپ سے یہی کہہ رہا تھا کہ حقیقت جان کر آپ اپنی کرسی سے اچھل پڑیں گے۔ مجھے پتا نہیں کہ لیوسی کا بیان سُن کر آپ واقعی کرسی سے اُچھلے تھے یا نہیں کیوں کہ اس وقت میں آپ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سر! میں آپ کو حقیقت ہی تو بتا رہا تھا جب آپ نے مجھے احمق، بے وقوف اور گھامڑ کہا تھا حالانکہ میں آپ کے خیالات سے قطعی متفق نہیں تھا۔" میں نے بُرا مان جانے والے انداز میں کہا۔

تیواڑی جی خلافِ توقع ایک دم ہنس پڑے اور ان کی دیکھا دیکھی لیوسی نے بھی دانت نکال دیے مگر میں کوشش کے باوجود نہ ہنس پایا کیوں کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا تھا ہنسنے کی بات کیا تھی۔

"اچھا چلو، احمق، بے وقوف اور گھامڑ تمھاری بجائے دلاور خاں سہی جس نے مجھ سے مِس رپورٹنگ کی تھی۔ اب تم خوش ہو۔" تیواڑی جی ہنستے ہنستے رُک کر بولے۔

میں واقعی خوش ہو گیا اور اس بار میری بتیسی کا کچھ حصہ بھی باہر آ گیا۔

"یہ ہوئی نا بات!" تیواڑی جی مسکرائے جس کا ساتھ ان کی

...نکیلی مونچھوں نے بھی دیا۔ "اب تم ابتدا سے تمام واقعات بیان کرو!"

گزشتہ تجربات نے مجھے یہ سکھا دیا تھا کہ تیواڑی جی تفصیلات ...نے سے ہمیشہ کنی کاٹتے ہیں اور یہ مجبوری ہی میری ولولہ انگیز داستان سنتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی وقت تھا کہ میں انھیں اپنا کارنامہ سننے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے پہلے ...یق ضروری سمجھی۔

"سر! کیا آپ واقعی سچے دل سے یہ کہہ رہے ہیں کہ پورے ...ات نہیں گے؟" میں نے کہا۔

"اور کیا بھگوان کی سوگند (قسم) کھا کر تمھیں یقین دلاؤں!" ...اڑی جی نے سگریٹ کا کش لے کر میری طرف دیکھا۔

"پھر تو ٹھیک ہے۔" میں نے اطمینان سے سر ہلایا۔ "ورنہ آپ مجھے درمیان میں روک کر جلدی جلدی رپورٹ دینے کو ...یں تو میں گڑبڑانے لگتا ہوں۔"

"میں تمھیں نہیں گڑبڑاؤں گا، بس!" تیواڑی جی نے یقین ...یا اور مجھے یقین آگیا کیوں کہ میں اس وقت ان کے چہرے کا جائزہ ...رہا تھا۔ ان کی مونچھیں پُرسکون تھیں اور یہ اس بات کا ثبوت ...کہ وہ خفا نہیں ہیں۔

خود کو ہیرو اور دوسروں کو زیر و شاہت کرنے کا وقت آ پہنچا ...حالات سازگار تھے، یعنی پوری طرح میرے حق میں تھے۔ زندگی ...جب جب ایسے مواقع مجھے ملے ہیں، میں نے ان سے پورا فائدہ ...یا ہے اسی لیے تو تا زندگی مجھے بزدیر کی بجائے دلیر سمجھا جاتا ...ا۔

چند لمحے بعد ہی میری چونچ، یعنی مُنہ نے کھلنے کا عمل کیا اور پھر ...مدد کروٹ بدل کر میں نے "گوہر افشانی" شروع کر دی۔

"سر! یہ بس میرا ہی دل جانتا ہے کہ گزشتہ رات میری زندگی ...بار موت سے گلے ملتے ملتے بچی اور ہر بار میں نے موت کو اپنے ...ٹھے سے بھگا دیا اس لیے کہ میری تربیت آپ کے ہاتھوں ہوئی ...، میں نے اشارٹ لیتے ہی تیواڑی جی پر بھی مکھن کا "پلستر" ...دیا تاکہ وہ صبر و سکون کے ساتھ میرے کارنامے کو ہضم کر جائیں۔ ...ٹھیک کہہ رہا ہوں سر!" میں نے تیواڑی جی سے تائید چاہی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو، آگے بیان کرو!" تیواڑی جی نے ...۔

"رات اندھیری تھی۔ میں اور دلاور خاں پھٹ پھٹ ...بیٹھے سرائے خلیل کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ پہلے ...ر خاں بہت آہستہ پھٹ پھٹ چلا رہے تھے کیوں کہ انھیں ...س رہا تھا۔ میرے کہنے پر ہی انھوں نے پھٹ پھٹ تیز بھگائی ...دلاور خاں کو خوف زدہ دیکھ کر میں نے ہی انھیں تسلی بھی دی تھی کہ جب میں ان کے ساتھ ہوں تو وہ ہرگز نہ ڈریں مگر اس کے باوجود ان کا خوف کم نہ ہوا۔ چل چلا چل، چل چلا چل ہم سرائے خلیل پہنچ گئے۔ دلاور خاں، صفدر علی بیگ کی کوٹھی تک پھٹ پھٹ پر ہی بیٹھ کر پہنچنا چاہتے تھے مگر میں نے انھیں ایسا ہرگز نہ کرنے دیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں سر کہ رات کے سناٹے میں چڑیا کی آواز بھی بھینس کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ کو یہاں بھینس پر اعتراض ہو تو کوئی اور ڈکرانے والا جانور فرض کر سکتے ہیں۔ بہر حال سر! میری مداخلت کے بعد دلاور خاں کو پھٹ پھٹ کا انجن بند کرنا ہی پڑا۔ دراصل وہ یہ بھول گئے تھے کہ پھٹ پھٹ کے شور سے دشمن چوکنا ہو سکتے ہیں۔ وہ پھٹ پھٹ ہی پر سوار ہو کر چلنے پر شاید اس لیے بضد تھے کہ پیدل نہیں چلنا چاہتے تھے مگر انھیں میری وجہ سے پیدل ہی بہت دُور تک چلنا پڑا۔ اب آپ ہی بتائیں، آپ ہی فیصلہ کریں سر کہ غلطی پر میں تھا یا وہ؟" یہ کہہ کر میں نے عالمِ جوش میں تیواڑی جی کی طرف دیکھا۔

"غلطی پر دلاور خاں تھا، آگے کہو!" تیواڑی جی نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

"اللہ آپ کے بچے اور نواسوں کے بچے جیتے رکھے!" میں نے ان کے فیصلے پر خوش ہو کر دعا دینا ضروری سمجھا۔

"اللہ دتا! کیا تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے!" لیوسی نے درمیان میں ٹکڑا لگایا۔

میں نے جواباً لیوسی پر بڑی قہر آلود نگاہ ڈالی۔ جب تیواڑی جی صبر و سکون کا مظاہرہ کر رہے تھے تو بھلا وہ کون ہوتی تھی بیچ میں بولنے والی! خواہ مخواہ تیواڑی جی کی "چمچی" بن رہی تھی۔ آخر میں نے تیواڑی جی کو دُعا ہی تو دی تھی، کوئی گالی تو نہیں دی تھی جو وہ مجھ پر غیر سنجیدگی کا چارج لگا رہی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں "کھسیا" کر لیوسی سے کچھ کہتا، تیواڑی جی بول اٹھے: "لیوسی! تم ابھی اللہ دتا کو نہیں سمجھ پائیں اور شاید میں بھی اسے پوری طرح نہیں سمجھ پایا۔ بہر حال اتنا اندازہ ضرور ہوا ہے کہ یہ اپنی مرضی کا مولا ہے۔ یہ ذرا سی دیر میں پٹڑی سے اتر جاتا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جب تک یہ اپنی بات پوری نہ کر لے، بیچ میں نہ بولو۔"

لیوسی کا چہرہ بن گیا اور میں نے اسے سختی سے ہونٹ بھینچتے دیکھا جیسے اُسے خطرہ ہو کہ کہیں بھولے سے ہونٹ کھل نہ جائیں۔ حالانکہ اس کے اُبھرے اُبھرے ہونٹ اچھے لگتے تھے اور بھینچنے کے بعد ان کا کباڑا ہو گیا تھا مگر مجھے کیا پڑی تھی جو اسے اس راز سے آگاہ کرتا۔

"ہاں بھئی اللہ دتا! کیا کہہ رہے تھے تم؟" تیواڑی جی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا سر!" میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔ "کیا کہہ رہا تھا سر؟"

"اللہ دتا!" تیواڑی جی نسبتاً بلند آواز میں بولے۔

"یس سر!" میں نے جلدی سے کہا۔

"پٹری سے نہ اترو!"

"ہرگز نہیں سر! یہ کیسے ہو سکتا ہے سر! اول تو میں کسی پٹری پر چڑھا ہی نہیں تھا لیکن آپ کہتے ہیں تو نہیں اترتا۔ ویسے سر! شاید آپ چار دیواری کو اپنی زبان، یعنی اپنی گھریلو زبان میں پٹری کہہ رہے ہیں۔ خیر اپنی اپنی بولی ہے۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول بول کر اڑ جائیں گے، یعنی یہ چمن، گویا اپنا دتی یوں ہی رہے گا۔"

"تم پھر اول فول بکنے لگے!" اس بار تیواڑی جی کے لہجے میں سختی تھی اور ان کی نوکیلی مونچھیں بھی کسی قدر حرکت میں آگئی تھیں۔ "تم یہ بتا رہے تھے کہ دلاور خاں کی موٹر سائیکل کا انجن تم نے بند کرا دیا تھا تاکہ شور نہ ہو۔"

"بالکل ٹھیک سر! آپ نے بالکل ٹھیک یاد دلایا۔" میں جلدی سے بولا تاکہ کارنامے کا بیان کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ "آپ . . . آپ خفا نہ ہوں سر! میں ابھی بقیہ بیان جاری کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک طویل سانس لیا اور تیواڑی جی نے ایک اور سگریٹ سلگا کر اس کا طویل کش لیا۔ "ہاں تو سر!" میں نے دوبارہ اسٹارٹ مارا۔ "وہ میں ہی تھا جس نے دلاور خاں کو یہ مفت مشورہ دیا کہ پھٹ پھٹ کسی جھاڑی میں چھپا دی جائے اور موقع واردات کی طرف پیدل سفر کیا جائے۔ میرے اس مشورے میں بڑی دور اندیشی تھی جو بعد میں واقعی سود مند ثابت ہوئی۔ خیر بعد کی بات بعد میں، فی الحال ذکر تھا موقع واردات تک پہنچنے کا! تو سر! میں نے وہاں پہنچ کر دلاور خاں کی اس بات سے بھی اختلاف کیا کہ چار دیواری پھاند کر اندر کود جائے۔ آپ پوچھیں کیوں؟ . . . خیر نہ پوچھیں، میں خود بتائے دیتا ہوں۔ سر! آپ خود سوچیں، کیا دشمن ہمارے لیے اپنے گھر یعنی کوٹھی کے دروازے کھلے رکھتے؟ بہرحال میں نے مشورہ دیا کہ کوٹھی کے اردگرد گھوم کر کوئی پیڑ وغیرہ تلاش کیا جائے۔ میرے اس مشورے کو دلاور خاں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ پھر یہی نہیں وہ مجھے زبردستی زمین پر بٹھا کر میرے کندھوں پر سوار ہو گئے۔ بھلا بتائیے، یہ ظلم تھا کہ نہیں مگر میں صرف آپ کا خیال کر کے یہ ظلم سہہ گیا۔ اس کے بعد دلاور خاں نے مجھ سے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ اب ذرا غور کریں سر کہ کہاں میں، کہاں وہ ایمن دھان پان، وہ پہلوان! بہرحال کسی نہ کسی طرح میں زور مار کر اٹھا۔ اسی وقت کتے بھونکے جو چار دیواری کی دوسری جانب موجود تھے۔ دلاور خاں کو یقیناً بچپن میں کسی کتے نے کاٹ کھایا ہو گا اسی لیے وہ کتوں سے ڈرتے ہیں۔ کتوں کو بھونکتے سن کر ہی شاید ان کے اوسان خطا ہوئے تھے اور پھر وہ دھڑام سے چار دیواری کے اندر جا پڑے تھے۔ اسی وقت میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اب آپ خود سوچیں سر کہ اگر میں فرار ہونا چاہتا تو مجھے کون روک سکتا تھا۔ مجھے پتا ہی تھا کہ پھٹ پھٹ کہاں چھپائی گئی ہے۔ میں پھٹ پھٹ پر بیٹھ کر رفوچکر ہو جاتا مگر نہیں سر! میں نے میدان عمل سے بھاگنا نہیں سیکھا۔ ادھر کتوں نے دوڑ لگائی، ادھر میں نے متوقع پیڑ کی تلاش میں کوٹھی کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ مسلح دشمن ہرچند کہ مجھے بھاگتے دیکھ چکے تھے مگر میں نے ان کی پروا نہ کی۔ اب آپ سوچیں گے کہ مجھے پیڑ کی تلاش کیوں تھی؟ تو سنیں! میں عمارت کے قریب موجود کسی پیڑ پر چڑھ کر اس کی چھت پر جست لگانا چاہتا تھا۔ آخر میرا منصوبہ کامیاب ہوا سر! مجھے متوقع پیڑ مل گیا۔ میرے پیچھے دو مسلح افراد تھے، یعنی صفدر علی بیگ کی دیگ کے چمچے! میں جانتا تھا کہ وہ چاہتے تو مجھے گولی مار دیتے لیکن اسی کے ساتھ مجھے یہ یقین بھی تھا، وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہیں گے اور ہرگز قتل نہیں کریں گے۔ آپ وجہ پوچھیں تو پہلے میں ہی بتا دیتا ہوں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ وجہ یہ تھی سر کہ ایک تو وہ مجھ پر فائر کر کے وہاں بسنے والوں کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتے ہوں گے، دوسرے یہ کہ زندہ پکڑنے کے بعد وہ میری زبان کھلوانا چاہتے ہوں گے کہ آخر میں ہوں کون اور وہاں کس لیے تشریف لایا ہوں۔ بتائیے سر! کیا میں نے غلط اندازہ لگایا تھا؟" اس بار میں نے سوال جڑ ہی دیا۔

"کمال ہے اللہ دتا!" تیواڑی جی نے دل کھول کر داد دی۔ "ایسے موقعوں پر اندازے کی ذرا سی غلطی، موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ تم نے واقعی انتہائی ذہانت اور دلیری کا ثبوت دیا۔ خیر بقیہ واقعات بیان کرو اور اگر ممکن ہو تو ذرا اختصار کے ساتھ، ہم اتنے ستالو ہیں چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی، لیوسی سے مخاطب ہوئے۔ "تم بھی پیو گی نا چائے؟"

"پی لوں گی سر!" لیوسی نے گردن ہلائی اور میری طرف دیکھا۔ اس کے ابھرے ابھرے ہونٹ کافی دیر بعد بھینچ کر کھلے تھے اور اب اس کے چہرے سے ناگواری کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔

تیواڑی جی نے اپنے اردلی کو بلانے کے لیے "ٹرنگ ٹرنگ" کی، یعنی گھنٹی بجائی اور میں نے لیوسی کی طرف ایک عدد مسکراہٹ پھینکی جسے اس نے فوراً کیچ کر لیا اور جواب میں اس نے بھی یہی کارروائی کی۔

اردلی کمرے میں داخل ہوا تو تیواڑی جی نے اسے فوراً چائے لانے کا حکم دیا، پھر مجھ سے بولے۔ "مجھے ابھی یاد آیا کہ آئی جی صاحب کے پاس بھی جانا ہے اس لیے تم جلدی جلدی بقیہ . . ."

"اگر زیادہ جلدی ہو تو سر! آپ ان کے پاس ہو آئیں۔ ہم دونوں یہیں بیٹھے ہیں۔" میں نے تیواڑی جی کی بات کاٹ کر کہا۔

"خیر اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔" تیواڑی جی بولے۔ "تم آگے کہو!"

میں سمجھ گیا کہ تیواڑی جی دراصل مجھ سے جلدی جان چھڑانا چاہتے ہیں ورنہ آئی جی صاحب کے پاس واقعی ضروری جانا ہوتا تو پیروں کی بجائے سر کے بل دوڑے دوڑے جاتے چاہے سلیپر گر جانے کے سبب دو چار پنجیاں ہی کیوں نہ کھا جاتے۔ یہ سوچ کر مجھے بھی ان پر کچھ رحم آ گیا۔ آخر وہ داد تو دے ہی چکے تھے اور برابر دیے چلے جا رہے تھے۔ ان کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لینا چاہیے تھا۔ یوں بھی میں نے دلاور خاں کا پتا کاٹ ہی دیا تھا۔ اپنی ساری بزدلی میں نے ان کے سر تھوپ دی تھی اور ان پر ہاتھ پڑنے کے سارے راستے ہموار کر دیے تھے۔ اب صرف یہ ظاہر کرنا رہ گیا تھا کہ میں کتنا دلیر ہوں۔

"تو پھر سر سنیں!" میں نے ایک نظر لیوسی پر ڈالتے ہوئے دوبارہ اپنی "ولولہ خیز" داستان شروع کر دی۔ لیوسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے میں نے نظر انداز کر دیا۔ "پھر یوں ہوا سر کہ میں پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیڑ پر چڑھ ہی گیا۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے سر کہ جوتوں سمیت پیڑ پر چڑھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ پھر دشمن مسلح دشمن اس پیڑ کے نیچے تک پہنچ گئے۔ میں پیڑ پر تھا اور وہ نیچے! کم بختوں کو نہ جانے کیا سوجھی کہ مجھے گالیاں بکنے لگے۔ اب آپ ہی بتائیں سر کہ کون شریف اور خاندانی آدمی، گالیاں سن کر چپ رہ سکتا ہے! یہ تو بے غیرتی ہوئی اور ظاہر ہے سر کہ میں بے غیرت نہیں تھا۔ میں نے بھی انھیں جواب میں خوب سنائیں!"

"کیا؟" تیواڑی جی درمیان میں بول اٹھے۔ "وہ نیچے سے تمھیں گالیاں بک رہے تھے اور تم انھیں اوپر سے یعنی پیڑ کے اوپر سے؟"

"اور کیا سر!" میں ہاتھ نچا کر جوش میں بولا۔ "یہ بھی کوئی شرافت ہوئی بھلا سر! اگر لڑنا ہے تو لڑو، گالیاں کیوں بکتے ہو!"

"اچھا پھر؟" تیواڑی جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا، وہ کم بخت بھی پیڑ پر چڑھنے کی سوچنے لگے۔" میں بولا۔

"اللہ دتا! . . . اوہ سر! اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات میں بھی پوچھ لوں ان سے؟" لیوسی نے مسکرا کر تیواڑی جی سے کہا۔

"پوچھ لو مگر غیر متعلق بات نہیں۔" تیواڑی جی بولے۔

"یہ بتاؤ اللہ دتا!" لیوسی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا تم کسی پُراسرار قوت کے مالک بھی ہو؟"

میں لیوسی کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ آخر میرے بیان میں پُراسرار قوت کہاں سے ٹپک پڑی؟

"پُراسرار قوت!" میں چکرا کر بولا۔ "نہیں تو! ہاں اگر قوت کی کہو تو ٹھیک بھی ہے۔ مجھ میں قوت تو ہے، پُراسرار قوت ہرگز نہیں۔ یوں بھی میں جنات اور خبیث ارواح سے ڈرتا ہوں۔"

"لیوسی! میں نے تم سے کہا تھا کہ غیر متعلق بات نہیں کرو گی!" تیواڑی جی نے مداخلت کی۔ "کیا تم پر بھی اللہ دتا کا اثر ہو گیا ہے!"

"سر! میں غیر متعلق بات ہرگز نہیں کر رہی۔" لیوسی جلدی سے بولی۔ "کوئی کیا سوچ رہا ہے، یہ وہی جان سکتا ہے جو کسی پُراسرار قوت کا مالک ہو۔ ابھی اللہ دتا نے کہا ہے کہ دشمن بھی پیڑ پر چڑھنے کی سوچنے لگے۔ میں دراصل یہ پوچھنا چاہتی ہوں سر کہ اللہ دتا کو کس طرح پتا چلا، دشمن کیا سوچ رہے تھے؟"

"ہاں یہ بات تو ہے اور اس کا جواب اللہ دتا ہی دے سکتا ہے۔" تیواڑی جی نے مسکرا کر لیوسی کی تائید میں کہا اور میری طرف دیکھنے لگے۔

"دراصل سر! بات یہ ہے کہ ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ بیچ میں خواہ مخواہ بول پڑیں۔ کوئی کیا سوچ رہا تھا، یہ جاننا کون سی مشکل بات ہے۔ بس ذرا کانوں کو چوکس رکھنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کانوں سے سوچنے کا کیا تعلق؟" لیوسی پھر بول اٹھی۔

"ہے، یقیناً ہے۔" میں زور دے کر بولا۔

"ثابت کرو!" لیوسی بھی اڑ گئی۔

اسی وقت تیواڑی جی کو طیش آ گیا اور انھوں نے ہم دونوں ہی کو ڈانٹ کر مجھے بقیہ بیان جاری رکھنے کا حکم دیا۔

"دراصل سر! ان دونوں کے درمیان مکالمات کا جو تبادلہ ہوا تھا، اسے سن کر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ پیڑ پر چڑھنے کی سوچ رہے ہیں۔" میں نے دوبارہ اسٹوری شروع کرنے سے پہلے وضاحت کر دی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "بیان جاری رہے۔"

"بیان جاری ہے سر!" میں جلدی سے بولا۔ "پھر یہ ہوا سر کہ ان دونوں میں سے ایک تو پیڑ کے نیچے ہی کھڑا رہا اور دوسرا پیڑ پر چڑھنے لگا تاکہ میں پیڑ سے کودنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے گپک لے۔ سر! ریوالور میرے پاس بھی تھا مگر میں نے اسے کئی وجوہ سے استعمال نہیں کیا۔ میں چاہتا تو ان دونوں ہی کو باری باری ٹھنڈا کر دیتا، ان کے سینوں یا کھوپڑیوں یا جسم کے دوسرے

حصوں میں سوراخ کر دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ آپ پوچھیں کیوں؟"

"میں قطعی نہیں پوچھوں گا، تمہیں خود سب کچھ بتانا پڑے گا!"

میں ڈرامائی انداز پیدا کرنے کے لیے خاموش ہوا تو تیواڑی جی بولے۔ ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ایک وجہ تو سر، یہ کہ خونِ ناحق بہانا گناہ ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ دوسری اہم وجہ یہ کہ ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد میرا مشن اُدھورا رہ جاتا۔ اب سمجھے آپ سر! بس اسی لیے میں نے ان دونوں کو زندہ چھوڑ دیا ورنہ انھیں قتل کرنا میرے دائیں اور

بائیں دونوں ہاتھ کا معمولی کام تھا۔ بہرحال اب وہ لمحہ آگیا تھا کہ مجھے اس پیڑ پر سے عمارت کی چھت پر لمبی چھلانگ مارنا تھی۔ میں ایک دم شاخ پر بیٹھے بیٹھے اُچھلا اور آپ یقین کریں سر کہ تقریباً کسی عقاب کی طرح پرواز کرتا ہوا اس عمارت کی چھت پر آ گرا۔ ہے نا کمال کی بات؟"

"بالکل، بالکل!" اس بار لیوسی نے بھی مجھے میری بہادری کی داد دی مگر وہ داد دیتے ہوئے اپنی سُتواں سی ناک کھجا کر مسکرا بھی رہی تھی۔

"پھر کیا تھا سر! اللہ دے اور بندہ لے، یعنی اللہ دتا لے! میں نے جھٹا جھٹ ریس لگائی۔ مجھے یقین تھا کہ چھت سے نیچے جانے کے لیے کوئی زینہ ضرور ہوگا۔ پھر یہی ہوا۔ ادھر میں زینے تک پہنچا، اُدھر دشمن بھی میرے پیچھے چھت پر کودا۔ اس نے مجھے گولی مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے رک جانے کا حکم دیا۔ بھلا بتائیں سر! میں اس دھمکی میں کیسے آجاتا! میں کوئی بے وقوف یا بزدل تو تھا نہیں۔ میں نے جواب میں اسے ایک عدد ڈانٹ پلائی اور کہا، 'چُپ بے!' مگر یہ کہتے ہی میں وہاں رُکا نہیں اور بگٹٹ زینہ اترنے لگا۔ وہ بھی میرے پیچھے بھاگا مگر میں کہاں اور وہ کہاں! وہ تو وہ اس کے فرشتے بھی مجھے کیا، میری گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔ بس یوں سمجھیں کہ میرے پیروں میں پر لگ گئے تھے۔ پھر میں نے ایک اور عقل مندی دکھائی۔ زینے سے اترتے ہی جھٹ اس کا دروازہ بند کر دیا۔ بیٹے رام نے بہت دروازہ پیٹا مگر میں بھلا دروازہ کیوں کھولتا۔ اس کے بعد میں نے انتہائی برق رفتاری سے ساری عمارت کا چکر لگایا اور پھر مجھے ایک کمرے میں یہ مسمات، مسہری پر بندھی ہوئی مل ہی گئیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے لیوسی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ چاہتی تھیں کہ میں انھیں فوراً کھول دوں مگر میں جانتا تھا کہ دانش مندی کا تقاضا یہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں خطرہ اِدگرد منڈلا رہا تھا۔ مجھے یقین کامل تھا کہ صفدر علی بیگ بھی اسی عمارت کے باہر ہوگا اور کسی بھی لمحے اس کمرے میں پہنچ جائے گا۔ میرے اس خیال کی تصدیق لیوسی سے

کو وہاں سے لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوا، اس کا بیان لیوسی سے سُنا جاسکتا ہے کیوں کہ سر! میں بولتے بولتے تھک گیا ہوں اور..."

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو اللہ دتا!" تیواڑی جی میری بات کاٹ کر جلدی سے بولے اور اسی وقت ان کا اردلی چائے لے آیا۔

چائے پینے کے دوران میں لیوسی نے بقیہ واقعات اختصار کے ساتھ بیان کر دیے۔ واقعات بیان کرتے ہوئے وہ بار بار میری طرف مسکرا کر دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے بیان میں میری ایک حماقت کا بھی ذکر نہیں کیا بلکہ واقعی، یعنی مجھے سچ مچ کا ہیرو ثابت کر کے رکھ دیا۔ اس کے بیان کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ اگر میں اسے بچانے بر وقت نہ پہنچ جاتا تو وہ اگلے جہاں کو سدھار چکی ہوتی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر لیوسی وہ باتیں کیوں گول کر گئی تھی جن سے میری فطری بزدلی کا اظہار ہوتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ لیوسی کا بیان سننے کے بعد تیواڑی جی پہلے سے بھی زیادہ مجھ سے متاثر اور خوش نظر آنے لگے۔ ان کی باچھیں اور مونچھیں دونوں کھلی پڑ رہی تھیں۔ وہ بار بار مجھے ستائش آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور میں شرما کر گردن جھکا لیتا تھا۔

"مجھے فخر ہے کہ اللہ دتا پر میں نے جو محنت کی، اسے جو تربیت دی تھی، وہ رائیگاں نہیں گئی۔" آخر میں تیواڑی جی نے اعتراف کیا۔

"بندہ کس قابل ہے سر! آپ ہی نا قابل... وہ... یہ کہ آپ ہی قابل ہیں۔" میں تیواڑی جی کو مکھن لگاتے ہوئے لفظوں کے انتخاب میں گڑبڑا گیا مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"خیر جو ہوا سو ہوا، اب سوچنا یہ ہے کہ اگلا قدم کیا اٹھایا جائے؟" تیواڑی جی خود کلامی کے سے انداز میں بولے، پھر فوراً ہی لیوسی کو مخاطب کیا، "تم اتنی دیر سے کیوں آئیں؟ کیا سو گئی تھیں؟"

"نہیں سر! سونا کیسا! میں تو اسی کیس کے سلسلے میں ایک جگہ گئی تھی۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"اس کیس کے سلسلے میں!" تیواڑی جی نے حیرت سے کہا۔ "وہ کہاں؟"

"کوٹلہ فیروز شاہ۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"تم... تم کوٹلہ فیروز شاہ گئی تھیں؟" میں نے ناقابلِ یقین لہجے میں کہا۔

"ہاں کیوں، کیا ہوا؟ وہاں جانے میں؟" لیوسی میری طرف دیکھتی ہوئی پُرسکون آواز میں بولی۔

"رہنے دو بس!" میں چڑ کر بولا۔ "کوٹلہ فیروز شاہ جائیں گی! ارے وہاں، دن ہو کہ رات، اچھے اچھوں کا پیشاب بلکہ بہت کچھ خطا

... اس میں بہادر بننے کی کون سی بات ہے! کیا وہاں فقیر رہتے ... مجھے پھاڑ کھاتے!" اس بار لیوسی واقعی پھاڑ کھانے والے لہجے ... اسے شاید میری بات بُری لگ گئی تھی۔

... فقیر! اسے شیر کیا ہے جن بھوت کے آگے! وہاں جن بھوت ... جن بھوت! اور میں نے تو اپنے دوستوں سے یہ تک سنا ... آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کے فرزندوں ارجمندوں ... بھی وہاں ٹہلنے آتی ہیں کیوں کہ وہاں سے خونی دروازہ ... زیادہ دُور نہیں۔ اگر چلو دُور بھی مان لو تو روحوں کا کیا ہے، ... ٹہلیں پھریں، پھر یہ کہ..."

... بس بس! بہت ہو گیا۔" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بھکے۔

... کیا ہو گیا سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

... تمھارا سر!" وہ گرم ہو گئے۔ "اب تم اپنی چونچ بالکل بند ... اور خواہ مخواہ گھامڑ ہونے کی اداکاری نہیں کرو گے۔ ... سے بات کرنے دو! اگر اب تم بولے تو کمرے سے ... نکال دوں گا۔"

... ارے واہ! ابھی تو تعریف کے ڈونگرے بلکہ پورے پورے ... مجھ پر برسا رہے تھے اور اب ایک دم مجھ پر برس ... تیواڑی جی کو سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ہائے ... مطلب نکل جانے کے بعد کیسی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ ... میں نے ایک عدد ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش بیٹھے ... رہنا قبول کر لیا۔

... لیوسی!" تیواڑی جی نے میرے منہ پر اپنی دھمکی کا ... رکھ کر لیوسی کو مخاطب کیا۔ "تم وہاں کیوں گئی تھیں؟"

... میں نے ان لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سے ... اندازہ لگایا تھا کہ اس رات جو دو افراد، یعنی ایک عورت اور ... پیچھے جانے والے تھے، اب انھیں کوٹلہ فیروز شاہ ... جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفدر علی بیگ کا ٹھکانا ... نظروں میں آچکا ہے۔ سر! میں نے یہ بھی اندازہ ... لگایا کہ یہ کارروائی، صفدر علی بیگ ہی کے ایما پر عمل میں آئی ... لڑکی نے تفصیل بتائی۔

... کیا یہ باتیں ان لوگوں نے تمھارے سامنے ہی کی تھیں؟" ... تیواڑی جی نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

... نہیں سر!" لیوسی نے جواب دیا۔ "جب صفدر علی بیگ ... پوچھ گچھ کر رہا تھا تو اس کے ایک گُرگے نے آکر اس ... کچھ کہنا چاہا تھا۔ صفدر علی بیگ نے اُسے خاموش رہنے ... کا اشارہ کیا تھا، پھر اس کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا

تھا۔ انھوں نے کمرے سے باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر باتیں کی تھیں جن میں سے بہت سی باتیں میں نہ سُن سکی۔ ان کی زبانوں سے ادا ہونے والے جو بے ترتیب سے الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے، میں نے انھی کی روشنی میں یہ اندازے لگائے۔"

"ہوں!" تیواڑی جی نے ہنکارا بھرا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ دشمن لاعلمی ہی میں ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے سر!" لیوسی نے تائید کی۔

"اچھا خیر، یہ بتاؤ کہ تم کوٹلہ فیروز شاہ گئیں تو کچھ سراغ ملا؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

"نہیں سر! ان کھنڈرات میں بہت دیر تک میں چکراتی رہی لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آسکا۔" لیوسی نے بتایا۔

"ویسے تمھیں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا مگر خیر!" تیواڑی جی یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے۔ چند لمحے بعد وہ پھر بولے۔ "اگر تم اس کام کے لیے رات کا انتخاب کرتیں تو بہتر تھا۔"

"بس غلطی ہو گئی سر!" لیوسی نے اعتراف کیا۔

میں سوچنے لگا کہ یا تو تیواڑی جی اور لیوسی، دونوں ہی عقل سے پیدل ہیں یا پھر میں یہ ساری باتیں خواب کے عالم میں سُن رہا ہوں۔ بھلا رات کے وقت اور کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات! توبہ توبہ! اگر کوئی جن بھوت چمٹ گیا تو ساری پھنے خانی دھری رہ جائے گی۔ کیا بعید کہ وہاں چڑیلیں بھی ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میرے پیٹ میں ہَول کے مارے گولے سے بننے لگے حالانکہ تیواڑی جی مجھے نہیں لیوسی کو رات کے وقت وہاں جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔

کوٹلہ فیروز شاہ کے بارے میں لیوسی اور تیواڑی جی کا تبادلۂ خیال جاری و ساری تھا اور میں دہشت زدہ سا ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ میں چونکا بلکہ باقاعدہ اُچھلا اس وقت جب اس گفتگو میں میرا ذکرِ خیر آیا۔

"ک... کیا... کیا سر!... م... میں... میں... ن... نہیں سر!... میں لیوسی کے ساتھ... نہیں..." میں ہکلانے لگا۔

"بکو مت اللہ دتا!" تیواڑی جی نے مجھے ڈانٹا۔ "ہر وقت حماقت کا مظاہرہ اچھا نہیں لگتا۔"

"مظاہرہ! ارے نہیں سر! میں... میں مظاہرہ ہرگز نہیں کر رہا سر! میں... میں سچ... بالکل سچ بول رہا ہوں۔ مجھ سے آپ چاہے جس کی قسم لے لیں۔ میں... میں وہاں جیتے

ہی ہرگز نہیں جاؤں گا، ہاں!"

"یہ میرا حکم ہے، سمجھے!" تیواڑی جی نے آنکھیں نکالیں اور ساتھ ہی اپنی مونچھیں بھی پھڑپھڑا دیں جو میری کمزوری تھیں۔

"تو... تو پہلے کیوں نہیں کہا تھا سر!" میں نے نظریں جھکا کر کہا، پھر اپنی تسلی کے لیے بولا۔ "لل... لو... لیوسی بھی ساتھ ہو..."

"ہاں!" میرا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی تیواڑی جی پُراسرار لہجے میں بولے، پھر قدرے توقف سے کہا۔ "میں نہیں مان سکتا کہ تم جیسا نوجوان ان خرافات پر یقین رکھتا ہوگا۔ اب خاموشی اور سکون سے میری بات سنو!" یہ کہہ کر تیواڑی جی نے لیوسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا اور بولے۔ "کچھ اور ذرائع سے بھی پتا چلا ہے کہ ان کھنڈرات میں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جارہا ہے۔"

وہ ذرائع کیا تھے، تیواڑی جی نے ان پر روشنی نہیں ڈالی۔ میرا عالم یہ تھا کہ آدھا سو رہا تھا، آدھا جاگ رہا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں، یعنی کوٹلہ فیروز شاہ میں عمارتیں وغیرہ رہی ہوں گی مگر اب وہاں صرف کھنڈرات تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ آسیبی ہیں۔ یہی میری ساری تشویش کا سبب تھا۔ انسانوں سے تو خیر آدمی کسی نہ کسی طرح لڑ بھڑ لے لیکن جن بھوت اور چڑیلوں سے کوئی لڑ سکتا ہے یا کوئی لڑا ہے! میری سٹی اگر گم نہ ہوتی تو بے چاری کیا کرتی!

میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ساری "چک پھیریاں" وہ بدذات رنجیت اور اس کی "نمو" بندیا، لگوا رہے ہیں۔ حرامزادے اور حرامزادی! کہیں ایک "چک" بیٹھتے ہی نہیں کہ "جھٹ" جائیں اور "پھٹ" ان حرام خوروں کو پکڑ لائیں۔

"دچھوندنے میں سے چھوندا نکل پڑتا ہے۔"

پہلے ان حرامی بلیک میلروں کا چکر چلا۔ وہ خدا خدا کرکے جہنم رسید ہوئے کہ اسی دوران میں بھگوان داس سلمہ بھگوان کو پیارے ہوگئے یا پیارے کردیے گئے۔ چلو جان چھوٹی! مگر کہاں جان کے کو بلد بار لالے بلکہ پیلے اور کالے پڑ رہے تھے۔ جان نہ ہوگئی، میاں جی کا تبرک ہوگئی جہاں چاہو سسری کو داؤ پر لگا دو۔ مجھے اگر پہلے سے ذرا بھی سن گن لگ جاتی کہ اس کم بخت خفیہ میں جان کو اتنی فالتو چیز سمجھا جاتا ہے تو ہمیا بندہ خاں کے "بہتیرے" میں کبھی نہ آتا اور نہ ان کی سُگھڑ بیٹی کا شوہر ہونے پر آمادہ ہوتا۔ خود تو بڑے میاں اسٹول پر بیٹھے داڑھی کھجاتے رہتے ہیں اور مجھے پھنسوا دیا اس "لپاڈگی" میں کہ چل بیٹا، چڑھ

جاسوسی پہ رام بھلی کرے گا، وہ تو یہ غنیمت تھا کہ وقت بے وقت مجھے ہیرو بننے کا چانس ملتا رہتا تھا جس سے مجھے سرور سا رہتا تھا اور سارے دُکھ بھول جاتا تھا ورنہ ایسی نوکری پر ایک تو کیا میں دس بار لعنت پڑھتا اور رسّی تڑوا کر بھاگ لیتا۔

قسمت مہربان تو گدھا پہلوان! میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

ہاں چلتے چلاتے ایک راز کی بات اور بتاتا چلوں۔ یہ اس لیے بہت ضروری ہے کہ کہیں آپ، یعنی وہ جو میری سرگزشت پڑھ کر میری روح کو ثوابِ دارین سے ہم کنار کر رہے ہیں، یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ عمر کے اس دَور میں واقعی میں دلیر یا ذہین ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب جب میں اپنی یہ کتھا کہانی لکھ رہا ہوں تو اتنا گھامڑ اور پھسڈی نہیں رہا جتنا کبھی تھا یا زندگی کے بڑے حصے میں رہا تھا۔ اگر میں گیارہ عدد بچوں کا باپ ہونے کے بعد بھی گھامڑ ہوتا تو ہرگز اپنی پول نہ کھولتا۔ تو یہ سارے قصے، واقعات میری جوانی، نوجوانی اور ادھیڑ عمری کے ہیں، اور ان کے واقعات جب میں خفیہ میں ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ کو یہ کتھا کہانی پڑھتے پڑھتے کہیں خدانہ کرے واقعی ذہانت یا دلیری کا دھوکا ہونے لگے تو یہ بات ذہن کے کسی کونے کھدرے میں ضرور ڈال لیجیے گا کہ میں نے یہ سرگزشت اس وقت رقم کی جب ریٹائر ہوچکا تھا اور مجھ میں تھوڑی بہت عقل آچکی تھی۔

اچھا، آپ میری تقریر دل پذیر سن کر بور ہونے لگے! میں آپ کو پھر دلی لیے چلتا ہوں، دلی جو کبھی میرا شہر تھا اور جہاں میں نے بڑے بڑے ہنگامے کیے اور کرائے تھے۔

لیجیے میں اپنے تصور کے ٹٹو کو تیزی سے دوڑاتا ہوا پہنچ گیا۔ یہ دلی ہے، یہ کشمیری گیٹ، یہ میرے دفتر یعنی خفیہ کی عمارت اور یہ لیں، یہ ہے تیواڑی جی کا کمرہ جہاں اُن کی مونچھیں پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر مجھ سے ہر بات منوا لیتی ہیں۔ ذرا سنیے کیا فرما رہے ہیں، اپنے تیواڑی جی!

"سنا تم نے اللہ دتا!" تیواڑی جی نے کہا۔

"بالکل سنا سر!" میں نے چونک کر زور سے گردن ہلائی۔ وہ کیا کیا ہانک رہے تھے، میں نے بالکل نہیں سنا تھا۔ میں تو تصور میں کوٹلہ فیروز شاہ جا پہنچا تھا جہاں ایک ناہنجار چڑیل نے مجھے مرغا بنا دیا تھا۔

تیواڑی جی میرا سر ہلتا ہوا دیکھ کر یقیناً یہی سمجھے ہوں گے کہ میں نے ان کی ساری باتیں اور تمام ہدایات پوری توجہ سے سنی ہیں۔ اس لیے وہ مزید منکنے لگے۔ "تمھیں اور لیوسی کو بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا کیوں کہ مجرم تمھارے حق میں انتہائی خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔

اس میں کیا شک ہے سر! ادھر ہم دونوں انھیں نظر آئے، ادھر انھوں نے کیا ہمارا تیا پانچا!" میں نے تیواڑی جی سے اتفاق کیا۔

تیواڑی جی نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "لیوسی! اب ایک بات کم از کم، تمھارے بیان کی روشنی میں کھل کر سامنے آگئی ہے کہ صفدر علی بیگ، راؤ بہادر کشوری لال اور بیجو دشوا ناتھ کے درمیان کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ضرور ہے۔ تمھارا صفدر علی بیگ کی سرائے خلیل والی کوٹھی سے آگاہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم نے غالباً یہی کہا تھا۔ تم نے صفدر علی بیگ کو جس راہ پر ڈال دیا تھا، ضروری نہیں کہ تمھارے فرار کے بعد وہ اسی فیصلے پر قائم رہا ہو۔

لیکن اس کا ایک امکان ہے ضرور! ہمیں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ صفدر علی بیگ اور راؤ بہادر کے درمیان ٹھن گئی ہے اور ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر تیواڑی جی سوچنے لگے۔

"سر! اس ساری اکھاڑ پچھاڑ کی بجائے کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان سب کو پکڑ کر لے آئیں۔ ان سب کو یہاں لاکر، حوالات میں بند کرنے کے بعد وہ چار چوٹ کی مار لگائیں کہ انھیں اپنی اپنی نانیاں اور دادیاں یاد آجائیں، پھر جب وہ نانیوں اور دادیوں کو یاد کرچکیں تو ان سے سب کچھ پوچھ لیں کہ بتاؤ 'بیشارامو' یہ سب کیا چکر ہے۔ مار کے آگے تو بھوت بھاگتا ہے سر! میرے ابا یہی کہتے ہیں۔" بولتے بولتے میں نے اچانک تیواڑی جی کی طرف دیکھا جو مجھے بُری طرح گھور رہے تھے کیوں کہ انھوں نے اس طرح گھورنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بولتے بولتے مجھے ایک دم بریک لگانا پڑا۔

"بند کیجیے بکواس!" تیواڑی جی سخت لہجے میں بولے۔

"بند کرچکا سر!" میں نے سعادت مندی سے کہا، یعنی میں نے اس کے ساتھ یہ بات تسلیم کرلی کہ واقعی بکواس ہی کر رہا تھا لیکن اپنے دل میں یہی کہہ رہا تھا کہ میں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔

"سنو! اب کمار کے ہاتھ کا زخم تقریباً ٹھیک ہوچکا ہے۔" تیواڑی جی مجھ سے بولے۔

"ٹھیک تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھا سر! بس خواہ مخواہ گلے میں پٹی ڈال کر دولہا بنا پھرتا ہے تاکہ میں اسے کوئی کام نہ بتا دوں۔" میں موقع ملنے پر کمار کی غیبت سے نہ چوکا۔

"خیر! اب تم اسے صفدر علی بیگ کی نقل و حرکت کی نگرانی پر لگا دو۔" تیواڑی جی نے بات کو رفع دفع کرنے کی خاطر میرے کہے پر کان نہ دھرے، پھر کسی قدر توقف سے بولے۔ "اور وہ راؤ بہادر کی نگرانی کون کر رہا ہے؟"

"کمال اور رگھبیر۔" میں نے جواب دیا۔

"ان دونوں کو بھی محتاط رہنے کی تاکید کردو۔" تیواڑی جی نے حکم دیا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "سنو اللہ دتا! ہر کیس میں ایک ہی طریقِ کار کام نہیں دیتا۔ ہرچند کہ میں نے تربیت کے دوران میں تمھیں ایک طریقہ یہ بھی بتایا تھا، یعنی براہِ راست ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کا طریقہ جن پر شبہ ہو لیکن یہ کیس مختلف ہے۔ صفدر علی بیگ اور راؤ بہادر جیسے لوگوں پر بغیر کسی واضح ثبوت کے ہرگز ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا۔ جب تک اس کیس کی ساری الجھی ہوئی گتھیوں کے سرے نہ مل جائیں اور ثبوت فراہم نہ ہوجائیں، ہم کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ یہ بات غالباً میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"آپ کا ارشاد تو تولے بلاوَن رتی صحیح ہے۔" میں نے تائید کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

"یہ تو تولے بلاوَن رتی، کیا بات ہوئی؟" تیواڑی جی نے مجھے گھورا۔

"دراصل سر! جب میرے ابا کسی بات سے پوری طرح متفق ہوتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔" میں نے جلدی سے جواب دیا اور پھر اسی وقت مجھے یہ بات یاد آگئی کہ ابا نے مجھے کئی بار ایک تاکید کی تھی جس پر عدیم الفرصتی کے سبب میں اب تک عمل نہ کر پایا تھا۔ میں نے اسی لیے جلدی سے کہا۔ "سر! میرے ابا کا نام جبل مہر دین ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں!" تیواڑی جی نے آنکھیں نکالیں۔ "میں نے تم سے یہ کب پوچھا تھا کہ تمھارے ابا یا اماں کا نام کیا ہے؟"

مجھے تیواڑی جی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میرے ابا کا نام سن کر اس قدر سرد مہری کا ثبوت دیں گے اس لیے میرا دل بجھ گیا۔ لو بھلا بتاؤ، انھیں اتنے دلیر بیٹے کے ابا کا نام جاننے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ میں اس بات پر بُرا مان جانے میں قطعی حق بہ جانب تھا۔ یوں بھی ابا یا اماں کے بارے میں ہر شخص ذرا جذباتی ہوتا ہے۔ میں اسی لیے بُرا مان جانے والے لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے سر! اگر آپ کو میرے ابا کے نام سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر مجھے بھی آپ کے ابا سے..."

"اللہ دتا!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر دہاڑے۔ "اگر تم نے میرے سورگ باشی (جنت مکانی) پتاجی کے بارے میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالا تو میں اسی وقت تمھیں ڈس مس کردوں گا۔"

اپنے ابا کی بات آئی تو کتنی جلدی "ڈس اور مس" کرنے پر آمادہ ہیں! میں نے سوچا اور تیواڑی جی اپنا غصہ سگریٹ پر اتارنے لگے۔ وہ

بالکل ریل کا انجن بن گئے تھے۔ دھکا دھک دھواں چھوڑے جا رہے تھے، وسل وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔

معاملہ بگڑتے دیکھ کر لیوسی نے مداخلت کی: "سر! دراصل اللہ دتا کی نیند پوری نہیں ہو سکی اسی لیے بس زبان سے ایسی ویسی لاتعلق باتیں پھسل رہی ہیں۔ آپ خیال نہ کیجیے سر!"

"نیند پوری نہیں ہوئی تو سو جائے گھر جا کر! یہاں آنے کو کس نے کہا تھا!" تیواڑی جی، سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے پھنکارے۔

"ٹھیک ہے سر! میں انھیں ساتھ لیے جا رہی ہوں،" لیوسی نے کہا: "آج رات کو بھی جاگنا ہے اس لیے میں بھی سو لوں گی۔" یہ کہہ کر لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس سے کہہ دو لیوسی کہ اب تک کی تمام تفصیل فائل میں لکھ کر جائے۔" تیواڑی جی اتنے خفا تھے کہ مجھ سے براہِ راست مخاطب ہونا بھی پسند نہیں کر رہے تھے۔ ان کے نتھنے بار بار پھول اور پچک رہے تھے، جبڑے بھنچے ہوئے تھے اور نوکیلی مونچھیں آپ ہی آپ پھڑپھڑا رہی تھیں۔

"بہتر ہے سر!" لیوسی نے جواب دیا اور میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ "اٹھو!"

مجھے خیر تیواڑی جی پر تو غصہ آ ہی رہا تھا مگر اسی کے ساتھ اپنے ابا پر بھی تاؤ آ رہا تھا جو بار بار میرے لتے لیتے تھے کہ بتا دے اپنے صاحب کو میرا نام! اُسے بتایا کہ نہیں؟ بڑے لوگوں کو نام معلوم ہو تو بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ جی میں تو آ رہا تھا کہ ابھی دوڑا دوڑا گھر جاؤں اور کہوں، "کر لو گدکنداری! جسے نام بتانے کے لیے اس قدر تڑپ رہے تھے، اس نے کیا سلوک کیا!" مگر میں نے یہ سوچ کر اس ارادے پر عمل کرنا موقوف کیا کہ وہ بھی تیواڑی جی سے کم نہیں تھے۔ اُدھر سے بھی دو چار لتاڑیں ہی پڑتیں اور میں مزید "لتاڑم لتاڑ" کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں اسی لیے چپکے سے خراماں خراماں، اس سراپا ناز کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جس نے عین موقع پر میری مزید دُرگت ہونے سے مجھے بچایا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ آخری وقت میں یہ ابا کا قصہ نکل پڑا ورنہ تیواڑی جی پر میری بہت اچھا امپریشن پڑ چکا تھا۔ میں نے سوچا خیر پھر کبھی سہی، ابھی تیواڑی جی زندہ ہیں، رہا میں تو مرنے کا میرا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ موت کا فرشتہ مجھے زبردستی گھسیٹ گھساٹ کر لے جائے اور میری ایک نہ چلنے دے۔ ویسے یہ طے ہے کہ اپنی مرضی سے خوشی خوشی کبھی نہیں مروں گا۔ یہاں چپکے سے یہ بات بتا دوں کہ مرنے سے ہوا سب کی خراب ہوتی ہے، بس یہ ہے کہ اس بات کو قبول کر نہیں دیتے۔ یہ جو سرفروشی وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں، ہوا ان کی بھی کبھی نہ کبھی ضرور سرکتی ہو گی مگر سرفروشی کا بھرم رکھنے کی خاطر بے چارے مُنہ سے کچھ نہیں پھوٹتے اور چپ چپاتے بلی چڑھ جاتے ہیں۔

اس دن بھی کیوں کہ مجھے موت سامنے ٹہلتی نظر آ رہی تھی اور بار بار پھر پھر کر ذہن میں ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ اے پاک پروردگار تیرا ہی آسرا ہے۔ آج رات اگر کوٹلہ فیروز شاہ سے بچ کر آ گیا تو گیارہ سوا پیسے کی ریوڑیاں تو تیرے نام پر بانٹ ہی دوں گا۔

میں تیواڑی جی کے کمرے سے نکل کر چل تو رہا تھا لیوسی کے ساتھ مگر میرا ذہن کہیں اور یعنی کوٹلہ فیروز شاہ میں تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو اللہ دتا!" چلتے چلتے لیوسی نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونک پڑا۔

"میں... میں... کچھ... کچھ بھی نہیں۔" میں ہکلا کر بولا۔

"تم تیواڑی جی کو چھیڑنے سے بھی باز نہیں آتے!" لیوسی نے ... کر کہا: "یہ تو سوچ لیا کرو کہ وہ ہمارے افسر ہیں۔"

"ارے میں اور انھیں گھسوں گا!" میں نے حیرت سے کہا: "ذرا سی بات کرتا ہوں تو ان کی مونچھیں پھڑکنے لگتی ہیں۔ اگر کبھی نہ کرے، خدا نہ کرے انھیں پکڑ کر کسی چیز سے گھسنے کا ارادہ کیا ہی ڈالیں گے مجھے!"

لیوسی میری بات پر ہنس پڑی حالانکہ میری دانست میں یہ ہنسنے کی بات نہیں تھی۔

"تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔" لیوسی نے اپنی ہنسی کو بریک لگا...

"تم سنجیدہ ہونے کی کہہ رہی ہو، ارے میں تو سخت رنجیدہ ہوں۔" میں دل گیر لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" لیوسی کے لہجے سے دلچسپی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اب اتنی ننھی جان، معصوم جان بھی نہ بنو۔" میں جل... "تمھارے سامنے ہی تو انھوں نے مجھے نوکری سے ڈس مس کر... دھمکی دی تھی۔"

"تم نے بھی حد کر دی تھی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں تم بھی مجھے ہی مجرم ٹھہراؤ۔ آخر کو لوگی نا افسر کا پا...

"اچھا خیر، چھوڑو ان باتوں کو! سنجیدگی سے یہ بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے؟ کتنی دیر لگے گی تمھیں دفتر میں؟ مجھے تم سے... پروگرام بھی طے کرنا ہے۔"

"رات کا پروگرام! ہائے!" میں نے ایک عدد لمبا سا ...

"لیوسی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ پروگرام تم خود نمٹا لو؟ تم تو بہ... بہادر ہو۔ جن، بھوت، چڑیل تمھارے سامنے کیا حیثیت ... ہیں!" میں نے خوشامدانہ لہجے میں اسے بانس پر چڑھانے کی کو... کی مگر وہ بھی ایک کائیاں تھی، کسی طور بانس یا بلّی پر چڑھنے آمادہ نہیں ہوئی۔

اس نے میری بات سن کر مسکراتے ہوئے انکار...

...دن ہلائی۔ "یہ تو ممکن ہی نہیں ہے، کسی طرح ممکن نہیں۔"

"کیوں، کیا تمھیں اکیلے ڈر لگے گا؟" میں نے دوسرا حربہ ...زمایا۔

"ہاں، بالکل!" وہ ڈھٹائی سے بولی: "میں ٹھہری عورت ...تم بہرحال مرد ہو۔ اگر عورت کے ساتھ مرد ہو تو بزدل سے ...دل عورت بھی شیر ہو جاتی ہے۔"

"بالکل غلط!"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ عورت، مادہ ہوتی ہے اور مادہ جون بدلنے ...بعد بھی مادہ ہی رہنی چاہیے۔ عورت شیرنی تو ہو سکتی ہے شیر ...نہیں! کہو، میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس وقت تک ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے، اس کمرے ...پہنچ چکے تھے جس میں لیوسی بیٹھتی تھی۔ اس نے میری بات ...انداز کر دی اور مجھے اپنے کمرے کے بارے میں بتا کر کہا: ...میں یہاں ہوں، تم اپنا کام نمٹا کر آ جاؤ۔ دفتر سے ساتھ ہی ...یں گے۔ یہاں سے چل کر کسی اچھے سے ہوٹل میں کچھ کھائیں ...پئیں گے، رات کا پروگرام طے کریں گے اور پھر سو جائیں ...گے۔" وہ یہ کہتے ہوئے کمرے کے دروازے پر رک گئی۔

"لیوسی! تم نے وہاں تیواڑی جی کے سامنے بھی سونے ...بات کی تھی۔ اس وقت بھی میں تمھیں ایک بات بتانا بھول ...اور اب بھی بھولا جا رہا تھا۔ وہ تو بس اس وقت تم نے سونے ...پھر ذکر کیا تو مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ میں تمھیں اپنے پاس واس ...نہیں سلاؤں گا، ہاں! میں تو منّی کو بھی پاس نہیں سلاتا، مجھے نیند ...نہیں آتی کسی کو پاس سلا کر!"

"یہ منّی کون ہے؟" لیوسی نے عجیب سے لہجے میں ...پوچھا۔

"میری چھوٹی بہن اور کون!" میں نے کہا۔

"بہت ہی شریر ہو تم!" لیوسی بولی اور کھلکھلا کر ہنس ...دی۔

"اس میں شرارت کی کوئی بات نہیں! میں نے پہلے ہی ...بتا دیا ہے، ہاں!"

"اچھا جاؤ، جلدی سے کام نمٹا کر آؤ!" یہ کہہ کر وہ اپنے ...کمرے میں چلی گئی۔

میں بھی اپنے کمرے کی طرف چل دیا جو وہاں سے زیادہ ...دور نہیں تھا۔ اب مجھے کمار کی خبر لینا تھی۔ اس بدذات نے مجھے تیواڑی جی کے سامنے بڑا ذلیل کرایا۔ اگر حرام خور مجھے پہلے ہی بتا دیتا کہ صبح ہی صبح دفتر آ مرا ہے تو کون سا ظلم ہو جاتا! اس نے دانستہ میرے خلاف سازش کی تھی۔ جس وقت میں اسے ڈانٹ رہا تھا تو اس طرح بھیگی بلی بلکہ پلّا بن گیا تھا کم بخت جیسے واقعی عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔

میں بل کھاتا، لہراتا اور غصے میں تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا اور چونک کر رک گیا۔ کمرے کے اندر سے عجیب عجیب سی مانوس اور غیر مانوس آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی بڑی بے سُری آواز میں ایک شعر گا رہا تھا ؎

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

"ہا ہا ہا! کمال کر دیا، واہ واہ! کیا حسبِ حال شعر کہا ہے!" یہ آواز اُسی ظالم کمار کی تھی: "اور اس پر آپ کا ترنم، واہ!"

"ارے میاں کاہے کو شرمندہ کرتے ہو، کبھی تھا ترنم! اور یہ کہ ایسا شعر کہنا بھی اپنے نصیب میں کہاں! یہ تو ... ... سے جگر خوں کرنے کا کام ہے۔ حضرت میر تقی میر کا شعر ہے یہ! میں نے جو دو غزلہ اسی کا زاد پر کہا ہے، ابھی وہ تو سنا ہی نہیں۔" یہ دل خراش صدا، اُسی "تقاضائے مبرم" یعنی ... لال ہنر کی صدا تھی۔

"تو پھر ہو جائے دو غزلہ!" کمار نے شہ دی۔

"کہیں کم بخت وہ بد ذوق نہ آ مرے، ایسے میں!" پیارے لال ہنر کی فکر مندانہ آواز آئی۔

"کون، وہ اپنے صاحب بہادر؟ شری اللہ دتا جی؟" کمار بولا۔

"ہاں مجھے اسی کی طرف سے خطرہ لاحق ہے۔ حسن و ذوق تو اسے چھو کر نہیں گیا!"

سب سن رہا ہوں بیٹا، سب سن رہا ہوں! میں نے دل ہی دل میں کہا اور خون کے کئی عدد گھونٹ ایک ساتھ پی گیا۔

"ارے پیارے لال جی! آپ بھی خواہ مخواہ ان سے ڈرتے ہیں۔ مجھے نہیں دیکھتے، کیسے چٹاچٹ اور جھٹا جھٹ جواب دیتا ہوں۔" کمار، پیارے لال ہنر کو چڑھانے لگا، بلّی پہ!

"میاں تمھاری بات اور ہے ہماری اور! تم ٹھہرے ایس، آئی اور ہم اے، ایس، آئی! عہدوں کا بھی تو فرق ہے!"

"خیر جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔"

"سعادت مندی ہے تمھاری میاں! خاندانی ہو ورنہ کون

آج کے زمانے میں کسی کی عزت کرتا ہے۔ اب اسے ہی دیکھ لو، کل کا لونڈا ہے، افسر بن کر دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے۔"

"خیر آپ دل چھوٹا نہ کریں اور وہ دوغزلہ سنائیں جو آپ نے اس کافر ادا یعنی سیٹھ کی حسین و نوجوان بیٹی سورج کو دیکھ کر کہا ہے۔ آپ نے اس دوغزلے کا ذکر چھیڑ کر میرے دل میں بڑا اشتیاق پیدا کر دیا ہے۔"

"تم جیسے صاحبِ ذوق بھی کہاں ملتے ہیں میاں، سنو!"

"ترنم سے ہوگا دوغزلہ!"

"ہاں، ہاں! ترنم ہی سے سناؤں گا۔ اس دوغزلے کی ردیف میں نے سورج کو بنایا ہے اور قافیے ہیں جان و جاں، آسماں وغیرہ بلکہ پوری ردیف 'ہے سورج' رکھی ہے۔"

"واہ!" کمار کی آواز سے ایسا پتا چلا جیسے وہ اچھل پڑا ہو "جان و جاں ہے سورج' آسماں ہے سورج! بھئی کیا کہنے ہیں پیارے لال جی! ردیف قافیہ سن کر ہی نشہ ہونے لگا، بس اب ہو جائے دوغزلہ!"

"میرا دل میری جان جاں ہے سورج.... او.... اوج...."

پیارے لال ہنر نے ریکنا شروع کیا۔

اب صبر کا دامن بلکہ گریباں تک میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اس لیے میں نے کمرے میں انٹری دینے میں دیر نہیں لگائی۔

ادھر میں نے کمرے میں انٹری دی اور ادھر جیسے سورج کا جیم پیارے لال ہنر کے حلق میں اٹک گیا۔

"یہ خبطیہ کا دفتر ہے کہ ہڑبونگ خانہ! کیا سمجھ رکھا ہے تم لوگوں نے ہیں! ہیں!" میں چیخا "تم لوگ جو میری غیبت کر رہے تھے، سب میں نے سن لی ہے۔ مجھے کم بخت کہا گیا ہے، باذوق کہا گیا ہے اور...."

"سر! باذوق نہیں، بدذوق کہا تھا' پیارے لال جی نے!"

کمار نے میری بات کاٹ کر تصحیح کی۔

"تم چپ رہو! تم بھی کم نہیں ہو تم بھی نمبری ہو۔ تم سے تو خیر بعد میں سمجھوں گا۔ بہر حال مجھے کوئی نہ کوئی ذوق ضرور رکھا گیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ کوئی بُری بات ضرور ہے!"

یہ کہہ کر میں نے پیارے لال ہنر کو مخاطب کیا اور اپنی سیٹ کی طرف بڑھا "ادھر آؤ تم! پہلے تم ہی سے جواب طلب کروں گا!"

پیارے لال ہنر کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی فاختہ اڑ گئی ہو یا اڑا دی گئی ہو۔ وہ کسی ایسی گائے کی طرح میری میز کی طرف بڑھ رہا تھا جسے ذبح کیا جانے والا ہو۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ میری میز کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔

"ہاں اب بتاؤ! میں کم بخت ہوں یا تم؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "اگر زیادہ گاڑھی اردو بگھارو تو سمجھ لو، مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے 'صفا صفا' جواب چاہیے۔"

"میرے منہ میں خاک! میں کیوں حضور والا کی شان میں ایسے نازیبا الفاظ استعمال کرتا!" پیارے لال ہنر اپنا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے چاپلوسی کے لہجے میں بولا۔

"شان گئی بھاڑ میں اور نازیبا گئی چولھے کی جڑ میں! مجھے تو بس یہ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کہا؟"

"عذرِ گناہ بدتر از گناہ! بس سرکار، غلطی ہو گئی، معافی کا خواستگار ہوں۔" پیارے لال ہنر گھگھیایا۔

"تمھاری بس اتنی بات میرے پلے پڑی ہے کہ تم نے غلطی کا اعتراف کر لیا ہے اور شاید معافی بھی مانگنا چاہتے ہو مگر...."

"معافی مانگنا نہیں چاہتا بلکہ...."

"کیا کہا؟ معافی نہیں مانگنا چاہتے؟" میں نے حسبِ عادت میز پر گھونسا مارا۔

"حضور! معافی چاہتا ہوں۔ آپ نے میرا پورا جملہ تو سماعت ہی نہیں فرمایا تھا۔" پیارے لال ہنر رو دینے والے انداز میں بولا۔

"تو پہلے ہی کیوں نہیں کہا تھا؟"

"میں نے کہا تھا مگر بس ذرا زبان سے مجبور ہوں' لاکھ چاہتا کہ سہل ممتنع میں گفتگو کروں مگر ہائے رے استاد مرحوم! وہ ہمیشہ دقت پسندی کے قائل رہے۔ دراصل وہ غالب پسند تھے اور انھوں نے میری تربیت بھی اسی ڈھب...."

"بس! بس! زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے یاد آ گیا کہ پیارے لال ہنر نے مجھے کل کا لونڈا بھی کہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے ایک بار پھر جلال آ گیا اور میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "تم نے مجھے کل کا لونڈا بھی کہا تھا' ہیں؟"

پیارے لال ہنر بغلیں جھانکنے لگا' سچ مچ نہیں بلکہ محاورتاً! کیوں کہ اُس کی بغلوں میں جھانکنے کے لیے دھرا کیا تھا' سوائے پسینے کی بدبو کے!

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" میں نے اس پر دوبارہ یلغار کی۔

"ایک بار بلکہ بار بار معافی چاہتا ہوں حضورِ والا!

[...]ندہ محتاط رہوں گا۔" پیارے لال ہنر آخر کار مردہ آواز [...] بولا۔

"اور ہاں یہ بتاؤ، تمھارے بچے کتنے ہیں؟" میں نے [...] بظاہر ایک غیر متعلق سا سوال کیا۔

"جی حضور! کیا فرمایا؟" پیارے لال ہنر حیران ہو [...] بولا۔

"میں نے یہ پوچھا ہے تمھارے کتنے بچے ہیں؟" میں نے [...] ایک لفظ پر زور دے کر اپنا سوال پھر دہرایا۔

"آٹھ ہیں حضور!" اس نے جواب دیا۔

"کتنے لڑکے ہیں اور کتنی لڑکیاں؟" میں نے دوسرا [...] [...]غ۔

"سات تو لڑکیاں ہیں سرکار! ان میں سے دو کی شادی ہو [...] [...] لڑکا سب سے چھوٹا ہے۔"

"تمھاری سب سے بڑی بیٹی اور پھر اُس سے چھوٹی [...] عمر کیا ہوگی؟"

"حضور! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا' آپ میرا خاندانی پس منظر کیوں دریافت فرما رہے ہیں!" پیارے لال ہنر الجھے ہوئے لہجے میں بولا "بہر حال حکمِ حاکم مرگِ مفاجات! بڑی لڑکی پچیس برس کی ہوگی اور اس سے چھوٹی دو سال کم!"

"تمھارے خیال میں سیٹھ دشانا تھ کی کافر ادا بیٹی سورج کی عمر کیا ہوگی؟"

"جج.... جی.... جی!" پیارے لال ہنر ہکلا گیا۔

وہ اب یقیناً سارے سوال و جواب کا مطلب سمجھ چکا تھا ورنہ ہکلاتا کیوں۔

"جواب دو!" میں میز پر ہاتھ مار کر چیخا اور پیارے لال ہنر اچھل پڑا۔

"وہ.... وہ بھی کوئی بیس بائیس سال کی ہوگی۔" اُس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"اور تم اس سے عشق لڑا رہے ہو' اس پر دوغزلے کہہ رہے ہو' اسے جان و جاں بنا رہے ہو' اسے جو تمھاری بیٹیوں کے برابر ہے! شرم نہیں آتی تمھیں؟ ہیں!" میں دہاڑا۔

شاید اس سے پہلے پیارے لال ہنر کو اس طرح کسی نے بے عزت نہیں کیا تھا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اور وہ چشمہ اتارنے کے بعد جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھنے لگا۔

آنسو میری بہت بڑی کمزوری ہیں' چاہے وہ عورت کی بجائے مرد ہی کی آنکھوں میں کیوں نہ آ جائیں۔ ہر چند کہ پیارے لال ہنر نے مجھے نہ جانے کیا کیا بُرا بھلا کہا تھا مگر اس وقت اسے روتا دیکھ کر میرا دل بھی رو اٹھا۔

"بس' بس پیارے لال ہنر بس! اب میں تم سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا مگر خدا کے لیے اب آنسو نہ بہانا۔ تمھیں 'ٹھونکرا' مارنے دیکھ کر.... وہ جو کہتے ہیں کلیجی یا کلیجہ منہ کو آنا' تو وہ منہ کو آ رہا ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

پیارے لال ہنر آنسو پونچھنے کے بعد چشمہ لگا کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ.... آپ بڑے رقیق القلب ہیں حضور!" اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"کیا.... کیا ہیں؟" میں نے خود اپنے بارے میں پوچھا۔

"سر! آپ کہیں تو میں اس کا مطلب بیان کر دوں؟" اچانک کمار کی آواز میرے کانوں میں پڑی جو کافی دیر سے سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کمار پر برستا' پیارے لال ہنر بول اٹھا "نہیں' ہرگز نہیں! تم معنی بالکل نہیں بتاؤ گے! تمھاری اردو خود ابھی کمزور ہے اور اصلاح طلب ہے۔ تم پہلے بھی حضور کو ایک لفظ کے غلط معنی بتا کر میری طرف سے بدظن کر چکے ہو۔"

"ٹھیک ہے' میرا کیا ہے! تم دیتے رہو مرکو گالیاں! اگر وہ ہی کچھ نہیں کہتے تو مجھے کیا ضرورت ہے' ان کے یا تمھارے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی!" کمار نے اس طرح کہا جیسے وہ پیارے لال ہنر سے خفا ہو گیا ہے۔

"جھوٹ، سفید جھوٹ!" پیارے لال ہنر، کمار کے خاموش ہوتے ہی چیخ اٹھا "حضور! بھگوان کی قسم' میں نے آپ کو نہ پہلے کبھی کوئی نازیبا اور مبتذل لفظ کہا' نہ اس وقت!" یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی رقیق القلب کے معنی بتا دیے۔

"میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ بس کی پڑیا یہی کمار ہے۔" میں نے پیارے لال ہنر کی قسم سے متاثر ہو کر کہا "آج میں سمجھا کہ تم کتنے شریف' نیک اور اچھے آدمی ہو۔ اسے تو میں ابھی سمجھوں گا!" میں نے کمار کی طرف دیکھ کر دانت پیسے۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ سورج تو شملے گئی ہوئی تھی' پھر پیارے لال ہنر کو کہاں سے نظر آ گئی۔ ابھی میں اس سلسلے میں اس سے سوال ہی کرنے والا تھا کہ لیوسی' کمرے میں داخل

ہوئی اور آتے ہی بولی: "اللہ دتا! بڑی دیر کر دی تم نے! میں تمھارا انتظار کرتے کرتے خود ہی آ گئی۔ چل رہے ہو یا نہیں!"

"ابھی تو میں نے کچھ نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"پھر؟ کیا ارادے ہیں؟ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو سو گئے نہیں کچھ دیر!" لیوسی میز کے قریب آتی ہوئی بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے، چلو چلتا ہوں۔" میں بولا۔ "فائل میں رپورٹ کل لکھ دوں گا۔ بس ایک منٹ بیٹھو!" میں نے میز کی جانب پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں کمار جیسے کمینے بھٹ بد زبان اور گستاخ ماتحت سے نے بحث کرتا اس لیے میں نے کمار سے نمٹنے کا ارادہ وقتی طور پر ملتوی کر دیا اور سیدھے سبھاؤ اسے صفدر علی بیگ کی نگرانی سونپ دی اور فوراً ہی وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد میں نے پیارے لال ہنر سے سروج کے بارے میں بتایا۔ پیارے لال ہنر کی اطلاع کے مطابق سروج اسی دن صبح دیکھی گئی تھی۔ وہ رات کے وقت کسی گاڑی سے دہلی پہنچی تھی۔ پتا نہیں وہ شملے ہی گئی تھی یا کہیں اور! بہرحال یہ بات معلوم کر کے میں نے پیارے لال ہنر کو ٹہلا دیا۔

"ویسے تمھیں رپورٹ لکھنے میں دیر کتنی لگے گی؟" جب پیارے لال ہنر بھی چلا گیا تو لیوسی نے پوچھا۔

"بس کوئی پندرہ منٹ لگیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر لکھ ہی لو! میں بیٹھی ہوں۔" لیوسی نے کہا۔

میں دراز کھول کر "سیٹھ وشوا ناتھ کیس" کا فائل نکالتے ہوئے بولا۔ "تیواڑی جی تو بس خواہ مخواہ بار بار اسی میں سب کچھ لکھواتے رہتے ہیں حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب کیس نمٹ جائے تو ساری رام کہانی ایک ساتھ لکھ دی جائے۔ یوں ہوا، پھر وہ ہوا، اس کے بعد توں ہوا یا ٹوں ٹوں ہوا۔"

"تیواڑی جی جو کچھ کہتے ہیں، غلط نہیں کہتے، سمجھے!" لیوسی مسکرا کر بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی مخالف پارٹی سے مل گئیں!" میں نے فائل کھولتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اب تیواڑی جی مخالف پارٹی ہو گئے!"

"اور کیا!" میں جل کر بولا۔ "بات بے بات آنکھیں نکالیں گے، مونچھیں پھڑکائیں گے، سر دھنیں گے۔ بھلا بتاؤ یہ کوئی طریقہ ہے!"

"تم ہی تو انھیں ستاتے رہتے ہو۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک، تم اگر ان کا پارٹ نہیں لو گی تو پھر..."

"اچھا اب تم رپورٹ لکھ رہے ہو یا باتیں ہی کیے جاؤ گے!" لیوسی میری بات کاٹ کر بولی۔ "باتیں کرتے رہو گے تو جو کچھ دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے گا۔"

"نکل گیا دماغ سے!" میں نے چڑ کر کہا۔ "تم نے کیا اپنا دماغ سمجھ رکھا ہے! مجھے ایک ایک بات پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہے، یہاں تک کہ وہ سارے ڈائیلاگ جو تم نے کل رات صفدر علی بیگ کے سامنے ادا کیے تھے۔ کیا سمجھ رہی ہو تم مجھے!"

"لوں امتحان؟" وہ بولی۔

"لو امتحان!" میں نے زور دے کر کہا۔ "آج تک ہر امتحان میں درجہ اول آیا ہوں۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو کل ایف۔ اے تک کے سارے سرٹیفکیٹ لا کر دکھا دوں گا۔"

"یہاں تک میں کبھی ہوں، اس وقت تمھارا موڈ رپورٹ لکھنے کا ہے نہیں اس لیے وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے اُٹھ چلو!"

"اور وہ تمھارے تیواڑی جی جو ناک بھوں بلکہ مونچھیں چڑھائیں گے۔"

"وہ تم جانو! مگر اب میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ یوں بھی اب دوپہر ہونے والی ہے اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

"اچھا تو خیر چلو۔" میں نے فائل بند کر دی۔ "یہ کل لکھ لوں گا دفتر آتے ہی۔ کل پھر یہ کہ آج رات بھی تو جان زار داؤ پر لگانا ہے۔"

میں فائل کو دوبارہ میز کی دراز میں بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کچھ دیر بعد ہی میں لیوسی کے ہمراہ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ راستے ہی میں دلاور خان کا ایک ماتحت شرما مل گیا۔

"اللہ دتا جی! آپ نے خان صاحب کے سارے کس بل نکال دیے ہیں۔" شرما ساتھ ساتھ چلتا ہوا بولا۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے انجان بننے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ڈی آئی جی صاحب کے پاس ان کی طلبی ہوئی تھی۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو ایسا جان پڑ رہا تھا کہ بس رو دیں گے۔ آپ کو بڑی موٹی موٹی گالیاں بک رہے تھے۔" شرما نے بتایا۔

"ظاہر ہے کہ انھیں موٹی گالیاں ہی بکنا چاہئیں، پتلی نہیں کیوں کہ وہ خود بھی تو موٹے ہیں اور تم جانو موٹاپے کا اثر دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ سنا ہے، دماغ پر بھی چربی چڑھ جاتی ہے۔" شرما میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا اور پھر ہنستا ہوا

...طرف چلا گیا۔ لیوسی اس دوران میں خاموش ہی کھڑی رہی تھی۔ اب میں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ لیوسی کو دفتر کے لوگوں سے بے تکلف ہونا یا کوئی غیر ضروری بات کرنا ناپسند ہی تھا۔

چونکہ کوٹلہ فیروز شاہ کی مہم در پیش تھی اس لیے لیوسی کے کہنے پر میں نے سرکاری موٹر سائیکل لے لی۔

جب میں نے لیوسی کو پھٹ پھٹ پر پیچھے بٹھایا تو مجھے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آ گیا جب اس نے میری کمر کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے بلکہ اس وقت بھی لیوسی میری کمر چھڑانے کی کوشش شروع نہ کر دے، یہ سوچ کر میں نے پھٹ پھٹ آگے بڑھاتے ہوئے لیوسی سے کہا۔ "دیکھو ذرا میری کمر پہ ستم کر دینا کل رات بھی بس بال بال بچا ہے۔ رات کی طرح دونوں ہاتھوں سے دبوچ مت لینا۔"

یہ فقرہ کہنے سے پہلے لیوسی میری کمر میں ہاتھ ڈال چکی تھی۔ جیسے ہی اس نے میری بات سنی، ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور ناگوار سے لہجے میں بولی۔ "تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو! ہر وقت دوسروں کا مذاق اڑاتے رہتے ہو۔"

"اچھا زیادہ بلبلاؤ مت! یہ بتاؤ چلنا کدھر کو ہے؟" یہ کہتے ہوئے میں پھٹ پھٹ کو سڑک پر لے آیا۔

"مجھے نہیں معلوم!" اس کی آواز میں اب بھی غصہ تھا۔ "مجھے تم سے صرف چند ضروری باتیں کرنا ہیں جو کہیں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"تو پھر دفتر ہی میں کر لی ہوتیں!"

"بس غلطی ہو گئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہو۔"

"خیر اب تو پتا چل گیا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر میری بات سنو! یہاں سے سیدھے کمپنی باغ چلتے ہیں۔ وہیں کسی پیڑ کی چھتیاں تلے ضروری باتیں کر لیں گے۔ وہاں دہی بڑے اور چھولے والے بھی گھومتے رہتے ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے پیٹ پوجا بھی کرتے جائیں گے۔ تم کہہ بھی تو رہی تھیں بھوک لگ رہی ہے!" میں نے تجویز پیش کی۔

"میں یہ سب واہیات چیزیں نہیں کھاتی۔" اس نے کہا۔

"پھر تمھاری بھوک کا کیا ہو گا؟"

"گھر جا کر کھا لوں گی۔"

"تو پھر کمپنی باغ ہی کی طرف چلوں نا؟"

"ہاں۔"

اس کے بعد لیوسی نے خود سے کوئی بات نہیں کی اور میری باتوں کے جواب میں بھی بس "ہوں ہاں" کرتی رہی۔ پتا نہیں وہ کیوں [illegible] ہو گئی تھی حالانکہ میں نے کوئی ایسی بے جا بات نہیں کی تھی۔ بھلا جانتے بوجھتے کون اپنی کمر سے دشمنی کر سکتا ہے۔

کمپنی باغ پہنچ کر میں پھٹ پھٹ کو گیٹ سے اندر لیے چلا گیا۔ پھر کسی قدر اندر پہنچ کر اسے ایک پیڑ کے قریب روک لیا۔ لیوسی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اتر گئی۔

"تم آؤ اُدھر بیٹھیں گے۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار میں سروج کے ساتھ بیٹھا تھا۔ لیوسی بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ساتھ چل دی۔

دوپہر کا وقت تھا اسی لیے لوگوں کی "آر جار" کم تھی۔ نوجوان جوڑوں کی بجائے کچی عمروں کے لونڈے لپاڑے زیادہ تھے۔ لیوسی کا غصہ اب بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک عارضی بل پڑا ہوا تھا اور ستواں سی ناک کے دونوں نتھنے بھی کسی قدر پھولے ہوئے تھے۔ میں اسے ساتھ لیے ٹھیک اسی جگہ جا بیٹھا جہاں کبھی سروج کو لے کر بیٹھا تھا۔ وہ ساڑھی سمیٹ کر ہری ہری گھاس پر بیٹھ گئی۔ اس کی ساڑھی اور گھاس کے رنگ میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ لیوسی مجھ سے کچھ خفا سی لگ رہی تھی اس لیے میں نے اسے خوش کرنے کی خاطر گھاس پر بیٹھتے ہی اپنے اس خیال کا اظہار کر دیا۔

جواب میں خوش ہونے کی بجائے اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ "تمھیں مثال دینے کے لیے بس گھاس ہی نظر آئی!"

"کیوں گھاس کو تم کیا سمجھتی ہو! اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کچھ نہ کچھ سوچ کر بنائی ہے۔ گھاس کو اتنا حقیر نہ سمجھو لیوسی! اس سے گھوڑوں اور گدھوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ سوچو اگر گھاس نہ ہوتی تو یہ بیچارے جانور کیا کھاتے! پھر یہ کہ اس سے آنکھوں میں کتنی تراوٹ آتی ہے! میرے ابا تو کہتے ہیں کہ صبح ہی صبح گھاس پر ننگے پاؤں چلنے سے تلووں کے ذریعے جسم میں ٹھنڈک بھرتی ہے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ گھاس انسانی صحت کے لیے بھی..."

"بس، بس!" لیوسی نے ہاتھ اٹھا کر میری پُرجوش تقریر روک دی۔ "میں یہاں تم سے گھاس کے فوائد پر بات کرنے نہیں آئی۔"

"چھولے، چھولے، دہی بڑے!" اسی وقت کہیں قریب ہی سے کسی خوانچے والے کی دل کش صدا سنائی دی۔

میں نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔ "دو پلیٹ دہی بڑے اور دو پلیٹ چھولے، مرچیں تیز!" میں نے اسے آرڈر دیا۔

"میں نہیں کھاؤں گی۔" لیوسی ناک چڑھا کر بولی۔ ممکن ہے اس نے بھوں بھی چڑھائی ہو مگر اس وقت میری زیادہ توجہ چھولوں کی طرف تھی اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ناک کے ساتھ ہی اس کی بھوں بھی چڑھی تھی یا نہیں!

اُدھر دہی بڑے والے نے اپنے دہی بڑوں کی شان میں قصیدے پڑھ کر لیوسی کو دہی بڑے کھانے پر پھسلایا، اُدھر میں

اُڑ گیا کہ اسے ضرور میرا ساتھ دینا پڑے گا۔

"میری پلیٹ میں مرچیں کم ڈالنا!" آخر لیوسی نے ہتھیار ڈال ہی دیے اور دہی بڑے کھانے پر مجبور ہو گئی۔

دہی بڑے والے کے پاس ایک چھوٹی سی مٹی کی مٹکی میں پانی تھا میں نے اور لیوسی نے، چھولے اور دہی بڑے کھا کر دو دو گلاس پانی پیا۔ میری جیب میں پانچ روپے کا نیا کرارا نوٹ تھا اس لیے دہی بڑے والے کو وہ نوٹ دیتے ہوئے میں کچھ "کچیا"، سارا وقت میں سوچ رہا تھا کہ ہائے یہ نیا نوٹ اس بدبخت میلے کچیلے دہی بڑے والے کے پاس جائے گا اور یہ نہ جانے اس کی کتنی تہیں کرے گا! یہی سبب تھا کہ جب پیسے دینے کا نمبر آیا تو میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نئے نوٹ کو سہلانے لگا اور میرا یہ عمل میرے کام آ گیا۔ نیا نوٹ مجھ سے جدا ہوتے ہوتے بچ گیا۔ ہوا یہ کہ اس دوران میں لیوسی نے ایک خفیہ جگہ سے چھوٹا سا بٹوا نکال کر دہی بڑے والے کا حساب صاف کر دیا۔

"ارے لیوسی! میں... میں دے رہا تھا پیسے... میں..."

میرا ہاتھ اب بھی جیب ہی میں تھا۔

"ایک ہی بات ہے، تم نے پیسے دیے یا میں نے!" لیوسی بولی۔ اب اس کے لہجے میں پہلا سا "ترا پن" نہیں رہا تھا، غالباً یہ چھولوں اور دہی بڑوں کا اثر تھا۔ اسے بھی یقیناً میری ہی طرح مزا آیا تھا۔

چھولے والا، پیسے لے کر چلا گیا تو میں نے تصدیق کی خاطر لیوسی سے کہا "کیوں مزا آیا نا!"

"ہاں ٹھیک تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"اپنے ساتھ رہو گی تو یہی عیش کرو گی۔"

اِس بار اُس کے اُبھرے اُبھرے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر وہ ایک ادا سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی "تم بس جی جلانے والی باتیں مت کیا کرو۔ اچھا خاصا موڈ ایک دم خراب کر دیتے ہو۔"

"سچی بھئی!" میں نے چٹکارا مارتے ہوئے کہا۔

"بس جتو مت اب زیادہ! تم نے مجھ سے کمر میں ہاتھ ڈالنے کو کیوں منع کیا تھا؟"

"میں نے؟ نہیں تو! میں نے تو بس یہ کہا تھا کہ ذرا خیال رکھنا، رات کی طرح..."

"اچھا خاک ڈالو اس بات پر!"

"یہاں تو مل نہیں سکتی، اس کے لیے گھر جانا پڑے گا" میں نے کہا۔

"کیا نہیں مل سکتی؟" وہ حیرت سے بولی۔

"خاک!" میں نے جواب دیا "یہاں مٹی ضرور مل سکتی ہے اور تم جانو، مٹی اور خاک میں فرق ہوتا ہے!"

"تم پھر شروع ہو گئے!"

ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بارہ تیرہ سالہ ایک لڑکا طرف آتا دکھائی دیا۔ لیوسی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لڑکے نے قریب آ کر ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جو بند تھا۔

"کیا ہے یہ؟" میں نے لڑکے سے لفافہ لیتے ہوئے کہا۔

"لفافہ" لڑکے نے جواب دیا۔

"ابے یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے، یہ بتا کہ یہ لفافہ مجھے کیوں دیا ہے؟"

"وہ جو ادھر بیٹھی ہیں، اس پیڑ کے نیچے..." لڑکے نے میری پشت کی طرف اشارہ کیا۔ "انھوں نے دیا ہے کہ آپ کو دے آؤں، دو پیسے دیے تھے انھوں نے مجھے اس کام کے!"

میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور لیوسی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔ لفافے کے اوپر صرف "اللہ دتا" لکھا ہوا تھا۔ میں اور لیوسی تقریباً دوڑتے ہوئے اس پیڑ کی طرف بڑھے جس کی طرف لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔ لڑکے کے جملے سے پتا چل رہا تھا کہ مجھے وہ لفافہ کسی عورت یا لڑکی نے بھیجا تھا۔ اس تجسس میں کہ وہ عورت یا لڑکی کون ہے جو مجھے وہ لفافہ اس نے کیوں بھیجا ہے، میں نے لفافہ کھول کر بھی نہیں دیکھا۔

وہ لڑکا بھی ہمارے ساتھ ہو لیا تھا۔ ہم اس پیڑ تک پہنچ گئے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ لیوسی اور میں نے ایک ساتھ لڑکے کی طرف پلٹ کر دیکھا جو ہمارے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

"ابے کہاں ہے وہ جس نے تجھے یہ لفافہ اور دو پیسے دیے تھے؟" میں نے لڑکے کا بازو پکڑ کر کہا۔

"ابھی تو یہیں تھی، مجھے کیا پتا کہ کہاں گئی! ہاتھ چھوڑو میرا" لڑکا بڑا "اینٹھو" تھا۔

میرا جی چاہا کہ اس کے دو چار ہاتھ جڑ دوں اور میں نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا بھی لیا مگر لیوسی نے مجھے روک دیا "چھوڑ دو اسے! وہ جو بھی ہو گی، سامنے نہیں آنا چاہتی ہو گی اسی لیے غائب ہو گئی۔ اس میں لڑکے کا قصور!"

میں نے لڑکے کا بازو چھوڑ دیا۔ کچھ دور پہنچتے ہی اس نے مجھے گالی دی اور ایک دم بھاگ اٹھا۔ بڑا حرامی لونڈا تھا کوئی! گالی کھا کر میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے والا تھا کہ لیوسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"اسے دفع ہو جانے دو، یہ دیکھو کہ لفافے میں کیا ہے؟" لیوسی نے کہا۔

"حرامی، کمینہ، ذلیل، الو کی دُم فاختہ!" میں نے اس لڑکے کو ...یاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی جس کا اب دور دور تک ...نہیں تھا۔

"ارے اب اسے جھونکو بھی جہنم میں!" لیوسی بولی۔

"کیسے جھونکوں؟ وہ حرامی تو بھاگ گیا!" میں جھلا کر بولا۔

"تو بھاگ جانے دو! لاؤ لفافہ مجھے دو!" لیوسی نے میری ...ن ہاتھ بڑھایا۔

میں نے وہ لفافہ لیوسی کو تھما دیا اور غصے میں یہ بھول ہی گیا ...اس پر لیوسی کا نہیں میرا نام لکھا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اُس نے ...نے مجھے بھیجا تھا، لیوسی کو نہیں۔

لیوسی نے مجھ سے لفافہ لیتے ہی اُسے کھول لیا۔ لفافے میں ...ایک چھوٹا سا پرچہ نکلا تھا جسے لیوسی پڑھ رہی تھی۔ میں کیونکہ ...اس کے برابر نہیں سامنے کسی قدر فاصلے سے کھڑا تھا اس ...ز وہ پرچہ نہیں پڑھ سکا۔

جب لیوسی وہ پرچہ پڑھ کر چونک اٹھی تھی تو مجھے خیال ...تھا کہ وہ لفافہ اسے نہیں دینا چاہیے تھا لیکن اب یہ سوچنا ...ول تھا۔ لیوسی، پرچہ پڑھ ہی چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں لیوسی ...ہاتھ سے پرچہ لیتا یا اس سے چونک اٹھنے کا سبب پوچھتا، اس ...پرچہ میری طرف بڑھا دیا اور مجھے عجیب سی نظروں سے ...بتی ہوئی بولی "یہ غار والی کون ہے؟"

"غار والی!" میں بھی چونکا اور پرچہ اُس کے ہاتھ سے لے ...پڑھنے لگا، گھسیٹ میں صرف چند جملے لکھے تھے۔

پیارے بانگڑو!

امید ہے کہ تم مجھے بھولے نہیں ہو گے۔ فی الحال ...ٹلہ فیروز شاہ کا رخ نہ کرنا ورنہ تمھاری ننھی سی جان خطرے ...میں پڑ سکتی ہے۔ اگر تمھیں اس سلسلے میں مزید تفصیلات ...جاننے کا شوق ہو تو آج رات سات بجے استاد جھنگا کے گھر ...پہنچ جاؤ۔ استاد جھنگا، بھاٹک حبش خان میں رہتا ہے اور ...وہاں خاصا مشہور ہے۔ تمھیں کوئی بھی اس کے گھر کا پتا بتا ...دے گا۔ تم پہچان تو گئے نا مجھے! میری تمھاری ملاقات ...بیت گڑھ کی پہاڑی کے ایک غار میں ہوئی تھی۔

غار والی۔

پرچہ پڑھ کر میری فاختہ اڑ گئی جو کوٹلہ فیروز شاہ کا نام سن ...کر بار بار اڑنے کے لیے پر تول رہی تھی مگر میں اسے کسی نہ ...کسی طرح اُڑنے سے روکے ہوئے تھا۔ میری آنکھوں ...میں اس رات کا تاریک منظر گھوم گیا جب اسی پُراسرار غار والی ...نے میری جان بچائی تھی ورنہ میں اس وقت لیوسی کے ہمراہ کوٹلی باغ میں سیر گشت کرنے کی بجائے شاید باغِ ارم میں گلچھڑے اُڑا رہا ہوتا۔

"کہاں کھو گئے اللہ دتا! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" لیوسی کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔

"کس بات کا جواب؟" میں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

"یہی کہ غار والی کون ہے؟" لیوسی نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!" میں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"یا یہ کہ بتانا نہیں چاہتے؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی "جب کہ تمھاری اور اس کی ملاقات بھی ہو چکی ہے۔"

میں لیوسی کے لہجے سے چڑ گیا اور بولا "ہاں ہوئی ہے ملاقات پھر؟ تم قاضی کہ ملا؟"

"تم مجھ سے کچھ چھپا کر اچھا نہیں کرو گے۔" لیوسی سنجیدگی سے بولی "مجھے یہ عورت، دشمن کی آلۂ کار معلوم ہوتی ہے۔"

میرا دل چاہا کہ میں لیوسی کی اس بات پر خوب ہنسوں اور پھر میں واقعی ہنس پڑا۔ بھلا بتاؤ، وہ کتنی احمقانہ بات کہہ رہی تھی، غار والی اور دشمن کی آلۂ کار! ارے وہ تو میری ہمدرد تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں مجھے موت کے منہ سے نکالتی مگر میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی، اگر بتا دیتا تو میری ساری دلیری کا بھرم کھل جاتا، پھر بھلا میں لیوسی کو کس طرح اس کے بارے میں کچھ بتاتا۔

لیوسی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی حیران حیران سی آنکھیں مزید حیران نظر آ رہی تھیں اور اس حیرانی کا سبب یقیناً میری ہنسی تھی۔ میں نے اسے مزید حیران کرنے کی خاطر دو ٹوک لہجے میں کہا "سنو لیوسی! اب میں واقعی تمھارے ساتھ کوٹلہ فیروز شاہ نہیں جاؤں گا۔ مجھے نوکری سے زیادہ اپنی جان پیاری ہے۔ نوکری چلی گئی تو اور بھی مل جائے گی لیکن اگر جان چلی گئی تو پھر بس چلی گئی۔ کھیل ختم پیسا ہضم!"

لیوسی کچھ دیر اس طرح میری طرف دیکھتی رہی جیسے وہ میری بات سمجھ ہی نہ سکی ہو، پھر اس نے اچانک اپنا رویہ بدل لیا۔ اُس کے چہرے پر اب حیرت کی بجائے ایک خوشگوار تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی "کیا یونہی کھڑے کھڑے ہی پیسا ہضم کرتے رہو گے، بیٹھو گے نہیں!"

"بیٹھ جاؤں، بیٹھ جاؤں، میں نے کب منع کیا ہے!" میں

اُس کے بدلے ہوئے رویتے پر حیران ہو کر بولا۔

"چلو اب یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ تمھاری غار والی بھی تو یہیں بیٹھی تھی!" یہ کہتی ہوئی وہ مسکرا کر مجھ سے پہلے ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

مجھے بھی مجبوراً بیٹھنا ہی پڑا ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ رسّی تڑا کر بھاگ جاؤں۔ پتا نہیں ان خبیث والوں نے مجھے کس چکّر میں پھنسا دیا تھا۔ جب دیکھو جان خطرے میں!

"ہاں تو تم کوٹلہ فیروز شاہ نہیں چلو گے؟" لیوسی نے پھر وہی دروح فرسا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"ہرگز نہیں!" میں نے انکار میں اتنی زور سے گردن ہلائی کہ جھٹکا آگیا۔ "ہائے!" میں کراہا۔

"کیوں، کیا ہوا؟" لیوسی نے پوچھا۔ "ہائے ہائے کیوں شروع کر دی؟"

میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے گردن سہلانے لگا، پھر جل کر بولا۔ "دیکھتی نہیں ہو، گردن میں جھٹکا آگیا!"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" وہ ہنس کر بولی۔ "اب کیا ہوگا؟ چلو کوئی بات نہیں گردن بدلوا دیں گے۔"

"گردن بدلوا دیں گے۔" میں نے منہ چڑا کر کہا۔ "آسان سمجھ لیا ہے گردن بدلوانا، مر جاتا ہے آدمی اس سے!"

"تو کیا ہوا؟ ایک دن سبھی کو مرنا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تو تم نہ مر جاؤ!"

"میں بھی مر جاؤں گی اک دن! جو پیدا ہوا ہے اسے مرنا تو یقیناً ہے۔"

"دیکھو لیوسی! اگر اب تم نے مرنے ورنے کا ذکر کیا تو میں ابھی گھر چلا جاؤں گا۔ میں ایسی باتیں قطعی پسند نہیں کرتا، ہاں!"

"اچھا خیر، یہ بتاؤ کیا واقعی تم نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟" لیوسی نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میں نے تم سے کب کہا ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمھیں نوکری سے زیادہ اپنی جان پیاری ہے۔"

"وہ تو ہے۔"

"تمھیں خبر ہے کہ ہمارے محکمے میں دانستہ حکم عدولی کا مطلب کیا ہے؟"

"نہیں، خیر تو تم بتا دو۔"

"ڈس مس! سمجھے!"

"یعنی ذرا سی بات پر گئی نوکری؟"

"ہاں۔"

"مگر میں کس کی حکم عدولی کر رہا ہوں؟"

"ڈی آئی جی تیواڑی جی کی حکم عدولی!" لیوسی ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی۔ "کیا انھوں نے تمھیں یہ حکم نہیں دیا کہ تم میرے ساتھ کوٹلہ فیروز شاہ جاؤ گے؟"

"ہاں دیا تو تھا۔" میں نے جواب دیا۔ لیوسی نے مجھے سوال جواب کر کے جکڑ دیا تھا۔

"پھر یہ حکم عدولی ہوگی یا نہیں کہ تم آج رات میرے ساتھ وہاں نہیں جاؤ گے؟"

"ہاں ہوئی تو مگر..." میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"مگر... مگر یہ کہ تم... تم اگر چاہو تو... تو میری جان بچ سکتی ہے اور نوکری بھی!"

"وہ کیسے؟"

"تم تیواڑی جی سے کہہ دینا کہ مجھے پیچش ہو گئی تھی۔"

"مگر میں جھوٹ کیوں بولوں؟"

"ہاں یہ بات بھی ہے۔" میں نے پُر فکر انداز میں گردن ہلائی پھر چند لمحے بعد ہی میرے ذہن میں جھوٹ بولنے کی وجہ آگئی۔ میں نے کہا۔ "ہمارے مذہب میں کسی کی جان بچانے کے لیے اگر جھوٹ بھی بولنا پڑے تو اس سے گناہ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بات ایک پیر جی نے بتائی تھی۔"

"مگر میں تو عیسائی ہوں، تمھارے مذہب کی باتوں سے میرا اتفاق کرنا ضروری تو نہیں۔"

"لو یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا!" میں نے جھلا کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"میں ایک شرط پر تمھاری خاطر جھوٹ بول سکتی ہوں۔"

"بتاؤ، جلدی سے بتاؤ!" میں خوش ہو کر بولا۔

"یہ بتاؤ کہ غار والی کون ہے؟"

"ہائے یہی پتا ہوتا تو پھر کیا تھا!" میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"پھر تم اس سے جیت گڑھ کی پہاڑی کے ایک غار میں کیوں ملے تھے؟"

"ارے میں ملا تھا اس سے کہ وہ خود مجھ سے ملی تھی بلاوجہ تو مجھ پر الزام لگا رہی ہو۔"

"اچھا تو وہ خود تم سے وہاں ملنے آئی تھی، ہیں؟"

"اور کیا!"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"نام نہیں بتایا تھا اس نے!"

"عمر کیا ہوگی اس کی؟"

"ارے اندھیرے میں عمر نظر آتی ہے کسی کی!" میں چڑ [illegible]

"تو تم اندھیرے میں ملے تھے اُس سے؟"

"پھر وہی! میں نہیں ملا تھا اُس سے، وہی ملی تھی مجھ سے اب [illegible] کہ نہیں!"

"خیر چلو مان لیا، وہی تم سے ملی ہوگی مگر اس سے ملاقات [illegible] کوئی مقصد تو ضرور ہوگا نا!"

"مجھے نہیں معلوم مقصد وقصد! مقصد وقصد اُسے ہی [illegible]" میں نے جل کر کہا۔ "اور سنو! اب خدا کے لیے میرا مغز [illegible] بند کر دو! اب میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں [illegible] چاہے میرے لیے جھوٹ بولو یا نہ بولو! میں خود تیواڑی جی [illegible] کہہ دوں گا کہ مجھے پیچش ہو گئی تھی۔"

"اور میں کہہ دوں گی کہ تمھیں کوئی پیچش ویچش نہیں [illegible] تھی بلکہ تم غار والی کے کہنے میں آکر میرے ساتھ نہیں گئے۔"

لیوسی نے ایک دم آنکھیں بدل لیں۔

"تم... تم میرا بھانڈا پھوڑ دو گی؟" میں سچ مچ گھبرا [illegible]

"اور کیا چھوڑ دوں گی!"

"تم بڑی وہ ہو۔"

"ہوں تو سہی۔" اس نے اعتراف کیا۔ "کسی اور طرح تم باز [illegible] نہیں آتے۔"

"اچھا ایسا کرو۔" معاً مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ "میں ٹھیک [illegible] رات کو تمھارے گھر آجاؤں گا، یہ بتانے کے لیے کہ میں [illegible] تمھارے ساتھ چلوں گا یا نہیں!"

"ٹھیک ہے، سمجھ گئی میں!"

"کیا سمجھ گئیں؟"

"تم سات بجے چپ چاپ حبش خاں جا کر اس غار والی سے [illegible] پھر یہ فیصلہ کرو گے کہ تمھیں میرے ساتھ جانا چاہیے یا [illegible] یہی بات ہے نا؟"

لیوسی واقعی بڑی کائیاں "بالک بلکہ" بالکہ تھی۔ میں نے [illegible] سوچا تھا مگر لیوسی سے اس کا اعتراف نہیں کیا۔

"ٹھیک ہے، نو بجے تمھیں ہر حال میں آنا ہے، چاہے میرے [illegible] چلو یا نہ چلو۔" لیوسی اٹھتے ہوئے بولی۔ "پھر اس کے بعد ہی میں [illegible] پروگرام بناؤں گی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ فی الحال تم مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو!"

"ذرا یہ پرچہ ایک بار مجھے پھر دکھانا!" لیوسی نے میری طرف ہاتھ بڑھایا کیوں کہ پرچہ اب تک میرے ہاتھ ہی میں تھا۔

میں اسے وہ پرچہ دیتے ہوئے ذرا ڈرا کہ کہیں وہ ہتھیا نہ لے مگر دے ہی دیا۔ لیوسی نے اس پرچے پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ مجھے واپس کر دیا تو میرے دل کو تسلی ہوئی۔ میں نے اسے پینٹ کی جیب میں احتیاط سے رکھ لیا اور خالی لفافہ وہیں پھاڑ کر پھینک دیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد میں لیوسی کو سرکاری پھٹ پھٹ پر بٹھائے ہوئے لال کنویں کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے لیوسی کو اس بار خود اپنی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت دے دی تھی کہ کہیں پھر وہ "بمک" نہ جائے۔

راستے میں بھی لیوسی نے غار والی کے متعلق "کرید اکرادی" کی مگر میں باری باری کبھی آئیں کبھی بائیں اور کبھی شائیں اڑاتا رہا۔ لیوسی کو میں اس کے گھر چھوڑ کر حوض قاضی کی طرف ہو لیا اور پھر چاوڑی سے گزرتا ہوا جامع مسجد پہنچ گیا۔

اپنے گھر پہنچ کر مجھے تھکن اور نیند کا شدید احساس ہوا۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ابا کھانا کھا کر دُکان پر جا چکے تھے۔ بڑے بھیّا گھر پر نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر میرے دل کو سکون ہوا۔ اس وقت بھائی صاحب گھر میں ہوتے نہیں تھے۔ وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر نہیں آتے تھے بلکہ پٹیل کے چھوٹے سے کٹور دان میں صبح ہی کھانا لے جاتے تھے اور وہیں بزاز کی دُکان پر کھانا کھا لیتے تھے جہاں نوکر تھے۔ گھر میں امّی، چھوٹے دو بھائیوں اور چھوٹی بہن کے سوا کوئی نہیں تھا، گویا راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ امّی نے تھوڑی بہت انکوائری ضرور کی کہ میں آج دوپہر ہی کو دفتر سے کیسے چلا آیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر رات کی لائن قِٹ کر لی۔ میں نے ان سے کہا، رات کو کیوں کہ مجھے پھر دفتر کے کام سے جانا ہے اس لیے چھٹی لے آیا۔ وہ مطمئن ہو گئیں اور اس بات پر خوش بھی ہوئیں کہ میں اب کچھ کچھ عقل پکڑتا جا رہا ہوں، یعنی دفتر والوں سے میں نے دن میں چھٹی لے کر رات کا بدلہ نکال لیا۔ امّی نے کھانے کی پوچھا تو میں ٹال گیا۔ چھولوں اور دہی بڑوں سے خاصا آسرا ہو گیا تھا۔ کپڑے بدل کر میں نے امّی سے کہا کہ وہ مجھے ٹھیک چھ بجے جگا دیں۔ اس کے بعد میں اندر کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔

اس وقت اگر گھوڑوں کے علاوہ دیگر جانور بھی سونے

سے روکنا چاہتے تو میں انھیں بھی اُونے پونے بیچ باچ کر سوجاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

"ارے اُٹھ گا نئیں چھ بج رئیے ایں!" امّی نے جب میرا شانہ پکڑ کر ہلایا تو مجھے یوں لگا جیسے ابھی آنکھ لگی تھی اور ابھی امّی نے جگا دیا۔ پتا نہیں اتنی جلدی چھ کیسے بج گئے تھے!

میں کچھ دیر "اوں آں" کرتا رہا' پھر اٹھنا ہی پڑا۔

میں نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا' کپڑے بدلے اور پھر ڈُباری سے سرکاری پھٹ پھٹ نکال کر اسے دھکیلتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اسی وقت پیچھے سے امّی کی آواز آئی "ارے کیا آج بھی صُبو کر دے گا؟"

"نہیں امّی! جلدی آجاؤں گا۔" میں نے دروازے ہی سے ہانک لگائی۔

جب میں گھر سے نکلا تو ساڑھے چھ ہو رہے تھے۔ مجھے سات بجے استاد چھنگا کے گھر پہنچنا تھا اور ابھی استاد کا گھر بھی ڈھونڈنا تھا اس لیے میں نے پھٹ پھٹ کچھ تیز ہی دوڑائی۔

راستے بھر غاروالی کی کھرکھراتی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ وہ کون ہو سکتی ہے؟ اس نے مجھے استاد چھنگا کے گھر بلایا تھا اس لیے یہ تو طے ہی تھا کہ آج اس کا دیدار ہو جائے گا۔

غاروالی کون ہو سکتی ہے؟ بار بار یہ سوال میرے ذہن میں ڈنک مار رہا تھا اور بار بار مختلف چہرے میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ سیٹھ وشوا ناتھ کی حسین و جمیل و نوجوان بیٹی سروج اسی دن دلّی پہنچی تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ کہیں وہی غاروالی نہ ہو! مگر یہ خیال زیادہ دیر ذہن میں نہ جم سکا۔ تو پھر داد بہادر کی پٹاخہ بہن کملا ہو گی' وہی تو مجھے "بانکڑو" کہتی تھی لیکن اسے میری جان بچانے کی کیا پڑی تھی' وہ تو خود میری جان کی لاگو ہو گئی تھی۔ کہیں وہ غاروالی' بھگوان داس کے قاتل رنجیت کی پھلجھڑی بندیا نہ ہو' اس رات وہی تو غار میں تھی۔ اس خیال کو بھی ذہن سے جھٹکنا پڑا۔ بھلا جو عورت یا لڑکی اتنی خطرناک ہو کر بھرے اسپتال میں زہر آلود چاقو سے کر بھگوان داس کو قتل کرنے پہنچ گئی ہو' وہ بھلا کیوں مجھے مرنے سے بچانے لگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود میرے گلے پر چھری پھیر دیتی۔ وہ تو خیر ہو اس پُراسرار کھرکھراتی ہوئی آواز والی کی جو اس نے مجھے وہاں سے اُڑن چھو کرا دیا۔ پھٹ پھٹ بھاگتی رہی اور میرا ذہن بھی دوڑ

لگاتا رہا۔

میں پھاٹک حبش خاں کے علاقے میں داخل ہوا تھا کہ یوں سمجھیں کہ اچانک ہی میری کھوپڑی میں چکا چوند سی ہو گئی۔ واہ بیٹا اللہ دتّا! تو سچ مچ بانکڑو ہی ہے' ان غلط نہیں کہتی۔ اتنی سامنے کی بات تیری سمجھ میں نہیں میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ارے کم بخت! وہ غاروالی استاد چھنگا کی لونڈیا بھی تو ہو سکتی ہے!



غاروالی! غاروالی!

میرے سر کے اندر یعنی کھوپڑی میں پے در پے جھماکے سے ہو رہے تھے' ایسے جھماکے جو عموماً ان مواقع پر ہیرو کی کھوپڑی میں ہوا کرتے ہیں جب ہیرو کسی الجھی ہوئی گتھی کا کوئی سرا ڈھونڈ لیتا ہے تو اسی طرح اپنی کھوپڑی میں جھماکے پیدا کرتا ہے۔ میں نے بھی سرا پکڑ لیا تھا اور اب اس سرے کو پکڑ کر لٹکنے کی خاطر استاد چھنگا کے اڈے پر جا رہا تھا کیوں کہ وہ سرا استاد چھنگا کی لونڈیا ہی ہو سکتی تھی۔

کچھ دُور چلا تھا کہ مجھے ایک مسجد نظر آئی جس کے دروازے سے نمازی باہر آ رہے تھے۔ میں نے پھٹ پھٹ روک لی۔ پھٹ پھٹ کا انجن بند کیے بغیر میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک اُدھیڑ عمر بارِیش کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور بولا "میاں صاحب! حضرت استاد چھنگا کا گھر آپ کو معلوم ہے؟"

"میاں صاحب" نے مجھے قہر آلود سی نگاہ سے دیکھا اور زیرِ لب لاحول پڑھ کر فرمایا "برخوردار! شرم آنا چاہیے تمھیں! صورت شریف لگتے ہو اور ایک بدمعاش کا پتا پوچھتے پھر رہے ہو!"

"بدمعاش!" میں حیرت سے بولا۔

"اور کیا!" میاں صاحب نے کہا "اسے کون نہیں جانتا' کم بخت نے شریفوں کا محلّہ خراب کر رکھا ہے۔"

میں نے میاں صاحب کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی رگِ تجسس کو پھڑکتے ہوئے محسوس کر کے فوراً پوچھ لیا "کیا استاد چھنگا ایک عدد جوان بیٹی کے باپ بھی ہیں؟"

"میری کوئی رشتہ دار لگتی ہے' اس سے جو مجھے معلوم ہو گا کہ کتنے بچے ہیں!" میاں صاحب چڑ کر بولے' پھر بڑبڑاتے ہوئے ...گئے۔

...میں نے "سنیے سنیے" کی ہانک لگائی مگر انھوں نے پلٹ ...یں دیکھا۔

...ستاد چھنگا بدمعاش ہے' یہ اطلاع میرے لیے بھی تشویش ناک ...ن اس وقت غاروالی کو دیکھنے کا جذبہ تمام جذبات پر حاوی ...اس لیے چند لمحات سے زیادہ تشویش میں مبتلا نہ رہ سکا۔ ...ہر کافی دیر بعد اور خدا خدا کر کے میرے ہی ایک ہم عمر نے ...نگا کے حویلی نما گھر کا پتا بتایا۔ جب میں اس حویلی نما گھر کے ...نچا تو سوچنے لگا کہ میاں صاحب کچھ سرکے ہوئے تھے۔ بھلا ...ے شاندار گھر میں رہنے والا بھی بدمعاش ہو سکتا تھا۔

...ں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ صدر دروازے پر دستک ...پیچھے سے کسی نے میری کمر پر ہاتھ رکھا اور میں اچھل پڑا۔

"...بابو جی! ایک دھیلے کا سوال ہے۔" میری سماعت سے ...پتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

...میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک میلے کچیلے سے ٹوپی دار برقعے میں ...ڑھیا کھڑی تھی بلکہ نصف جھکی ہوئی تھی۔ اس کی کمر کمان ...تھی' پورا جسم برقعے میں چھپا ہوا تھا' یہاں تک کہ بھیک ...کے لیے بھی اس نے برقعے سے ہاتھ نہیں نکالا تھا۔

...س عمر میں اتنا سخت پردہ! میں کھول گیا۔ ایسی ہی پردہ ...تی ہے تو پھر بھیک کیوں مانگنے نکلی ہے۔ پھر یہ کہ کم بخت ...بے موقع مجھے اُچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"...دھیلا تو کیا' میں تجھے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا خبیث ...!" میں نے جھلّا کر کہا۔

"...ے تیرے جسم میں کیڑے پڑیں۔" جواب میں بڑھیا نے ...ری۔

"...کیا کہا' میرے جسم میں کیڑے پڑیں۔" میں گلا پھاڑ کر چیخا۔ "...یہ مجال!"

"...چل پھر نکال دھیلا!" بڑھیا نے اپنا مطالبہ دُہرایا "ورنہ ...کوسوں گی۔"

"...میرے ابا کا دینا آتا ہے مجھ پر!" میں چنچنایا "چل رستہ ...!"

"...خدا تجھے غاروالی کی صورت نہ دکھائے تو نامرادی مر..." بڑھیا نے مجھے پھر کوسا۔

"...ل ہاں نہ دکھائے صورت! اور مرے تُو!" میں غصّے میں ...ور اسی کے ساتھ چونک پڑا۔ آخر اس بڑھیا کو غاروالی کے ...ا کیسے پتا چلا؟ جیسے ہی میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا' ...ری سے بولا "تو... تو کیسے جانتی ہے اسے؟"

"پہلے دھیلا دے!" بڑھیا اپنے مطالبے پر اَڑ گئی۔

غاروالی کی خاطر دھیلا تو کیا' میں پورا روپیا لُٹانے کو تیار تھا۔ میں نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک اَدھنّا مل گیا۔ میں نے اَدھنّا' بڑھیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لے دھیلے کی بجائے اَدھنّا لے مگر جلدی سے بتا دے کہ غاروالی کہاں ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔" بڑھیا نے اَدھنّا لے کر اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہا "تیری پینٹ کی پچھلی پاکٹ میں ہے۔"

"کون؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"غاروالی۔" بڑھیا نے جواب دیا۔

"کیا؟ کیا بک رہی ہے تُو؟" میں نے غصّے میں کہا "غاروالی میری پچھلی پاکٹ میں کس طرح آسکتی ہے!"

میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑھیا ایک دَم جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی "پتا ہے' میں کون ہوں؟"

"نہیں... نہیں!" میں اسے ایک دَم سیدھا کھڑا ہوا دیکھ کر سٹپٹا گیا تھا۔

"میں کوٹلہ فیروز شاہ کی چڑیل ہوں۔" بڑھیا نے کہا۔

"ارے باپ رے اچ... چڑیل.. نن... نہیں نہیں..." یہ کہتے ہوئے میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ بھلا چڑیل سے بھی کوئی نظر ملا سکتا ہے جو میں یہ ہمّت کرتا۔

کچھ دیر بعد جب میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو چڑیل غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ چلو' جان بچی' لاکھوں پائے' بس ایک اَدھنّے ہی کا تو نقصان ہوا۔

پھٹ پھٹ کا انجن بند کر کے میں نے اسے ایک طرف پہلے ہی کھڑا کر دیا تھا اور استاد چھنگا کے دروازے پر دستک دینے والا تھا کہ وہ ذلیل چڑیل ٹپک پڑی۔ "خدا اسے غارت کرے!" میں زیرِ لب بڑبڑایا اور پھر دروازے کی کنڈی پکڑ کر ہلائی۔

"اچھا!" کہیں دور سے ایک مردانہ اور بھاری آواز سُنائی دی' پھر اسی کے ساتھ دروازے کی دوسری طرف قدموں کی چاپ ابھری۔

کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھُل گیا۔ دروازے میں ایک مینڈک نما بھاری بھرکم آدمی کھڑا تھا۔

"کس سے ملنا ہے؟" اس نے سوال کیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میری بجائے کسی اور کا منتظر تھا۔ اس کے لہجے میں بھی سختی سی تھی۔

"مجھے حضرت استاد چھنگا سے ملنا ہے۔" میں نے عاجزی سے کہا کیوں کہ مینڈک نما ہونے کے باوجود چہرے سے وہ شخص

خطرناک ہی لگ رہا تھا۔

میری بات سُن کر نہ معلوم کیوں اس کے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور بدصورت دانت نظر آنے لگے۔

"کہاں سے آیا ہے تو؟" اِس بار اس کا لہجہ کسی قدر نرم تھا۔

"چتلی قبر سے!" میں نے سچ سچ بتا دیا۔

"بھیجا کس نے ہے تجھے؟"

"غار والی نے!" میں نے جواب دیا۔

"یہ غار والی کون ہے؟" وہ پیشانی پر بَل ڈال کر بولا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!" میں نے کہا۔ "ویسے میرا اندازہ ہے کہ وہ حضرت استاد جھنگا کی صاحبزادی ہوگی۔"

"کیا بکتا ہے!" مینڈک نما کسی تیندوے کی طرح غرّایا۔

"ہو ممکن ہے پیارے بھائی، میرا اندازہ غلط ہو۔" میں نے اسے گرم ہوتے دیکھ کر، بات کو رفع دفع کرنے کی غرض سے کہا۔

"اچھا اچھا، جا بیٹا اندر! تجھ سے تو استاد ہی نمٹتے گا۔" مینڈک نما نے اس طرح کہا جیسے وہ مجھے استاد جھنگا کے ہاتھوں ذبح کرانے لے جا رہا ہو۔

یوں تو مجھے اندر جاتے ہوئے ڈر سا لگ رہا تھا مگر میرے اندازے کے مطابق وہاں غار والی بھی تھی جو بہرحال میری ہمدرد تھی۔ وہ مجھے ہرگز استاد جھنگا کے ہاتھوں ذبح نہ ہونے دیتی۔

یہ سوچ کر میں دروازے میں داخل ہو گیا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ دونوں جانب، دائیں اور بائیں پیڑ لگے ہوئے تھے اور درمیان میں پختہ اینٹوں سے راستہ بنایا گیا تھا۔ وہ مینڈک نما میرے آگے آگے پھدکتا ہوا چل رہا تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے ڈرتا جھجکتا بڑھ رہا تھا۔

پختہ راستے کے اختتام پر سیڑھیاں تھیں، تین چار سیڑھیاں! اس کے بعد پھر ایک دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ وہ ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی اور پھر ایک چھوٹے سے کمرے سے گزر کر میں، مینڈک نما کے ساتھ ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک بڑی سی چوکی پر مسند سے ٹیک لگائے، ایک ادھیڑ عمر مگر سرخ و سفید چہرے والا شخص حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس شخص کے علاوہ کمرے میں سات آٹھ افراد اور تھے۔ دو کم عمر لڑکے سرخ و سفید چہرے والے کے دونوں پیر دبا رہے تھے۔ کمرے میں موجود بقیہ افراد میں سے کچھ تاش کھیل رہے تھے اور کچھ شطرنج!

مجھے اور مینڈک نما کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر کسی نے لفٹ نہیں دی تھی، سوائے ایک شخص کے جو سرخ و سفید چہرے والے کی چوکی سے لگا بیٹھا تھا۔ اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ سرخ و سفید چہرے والا، داڑھی مونچھوں سے بے نیاز تھا۔ وہ کڑھے ہوئے گلے کا ڈھیلا کُرتہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور سر گھٹا ہوا تھا۔

"ابے تو یہ کسے پکڑ لایا؟ کون ہے یہ؟" سرخ و سفید چہرے والے کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔ وہ مینڈک نما سے مخاطب تھا۔

"مجھے خود پتا نہیں استاد، یہ کون ہے۔" مینڈک نما نے جواب دیا۔ "یہ کہہ رہا تھا کہ اسے غار والی نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

"یہ میرا آدمی ہے استاد!" معاً چوکی کے قریب بیٹھا شخص بول اٹھا۔ "اسے میں نے یہاں بلوایا تھا۔" یہ کہہ کر اس شخص نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔" سرخ و سفید چہرے والے نے اپنا گنجا سر ہلا کر حقے کی نے منہ میں لگائی۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک عدد اضافی انگلی تھی۔ یہ ہے استاد جھنگا! میں نے سوچا اور اس شخص کی طرف بڑھ گیا جو میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔

اجنبی شخص نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور سرگوشی کی۔ "غار والی نے تمھارے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے، پھر میں تمھیں وہ پیغام بتاؤں گا۔"

"ابے دَم نہیں ہے ہاتھوں میں کم بختو!" استاد جھنگا کی آواز سُن کر میں دہل گیا اور میری نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے ان دونوں لڑکوں کی کمر پر باری باری گھونسے مارے تھے جو اس کے پاؤں دبا رہے تھے۔ دونوں لڑکے "ہائے" کہہ کر چوکی پر اوندھے گر پڑے تھے۔ "ابے اٹھو، اٹھو حرام خورو! ورنہ پھر جما دوں گا ہاتھ۔" استاد جھنگا پھنکارا۔

دونوں لڑکے "ہائے، اُوئی" کرتے ہوئے، پھر پاؤں دبانے لگے۔ مینڈک نما اس دوران میں کمرے سے جا چکا تھا۔ اس کی ڈیوٹی بھی شاید کنڈی کھولنے اور بند کرنے پر لگی ہوئی تھی۔

میں ایک بار پھر اس اجنبی کی طرف متوجہ ہو گیا جس نے خود کو غار والی کا قاصد ظاہر کیا تھا۔ اس اجنبی کو غار والی کی بجائے وہاں دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ کم بخت مجھے پھر گولی دے گئی تھی۔ اس نے خود آنے کی بجائے اپنے کسی پیغمبر کو بھیج دیا تھا۔

"وہ خود کیوں نہیں آئیں؟" میں نے اجنبی کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"یہ جگہ ان باتوں کے لیے نہیں ہے۔" اجنبی نے تنبیہ کی۔

"پھر کس لیے ہے، اے میرے عزیز؟"

ابھی اجنبی میرے سوال کا جواب نہ دے پایا تھا کہ کمرے میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔

"ارے استاد فتو تم!" یہ کہتے ہوئے استاد جھنگا ایک دم [illegible] پھڑا ہوا تھا اور اس کے وزن سے چوکی چرچرا اٹھی تھی۔ "آؤ، [illegible] چلے آؤ!" استاد جھنگا پُرجوش آواز میں ہاتھ ہلا ہلا کر اس دُبلے پتلے شخص کو قریب بُلا رہا تھا جسے اپنے ساتھ لیے ہوئے مینڈک نما کمرے [illegible] داخل ہوا تھا۔

استاد جھنگا کی چیخ دہاڑ کے سبب کمرے میں موجود بقیہ افراد [illegible] اس چپاتی یعنی استاد فتو کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

استاد فتو اپنے لباس ہی سے لکھنوی معلوم ہو رہا تھا، سر پر [illegible]مل کی دو پلّو ٹوپی، جسم پر سفید لکھنوی کُرتہ اور چوڑی دار پاجامہ [illegible] پیروں میں گرگابی! وہ اس طرح نزاکت سے چلتا ہوا استاد [illegible]جھنگا کی چوکی تک پہنچا جیسے بتاشوں پر چل رہا ہو۔

استاد جھنگا نے چوکی سے نیچے اُتر کر اسے اپنے گلے لگا لیا، پھر اپنے [illegible] ساتھ چوکی پر بٹھا کر بولا۔ "کب آئے؟"

"آج صبح!" استاد فتو نے جواب دیا۔

"اور اب رات کو آ رہے ہو؟"

"میں نے سوچا کہ چلو ذرا تمھارے دعووں کو بھی آزما لوں ورنہ [illegible] ظاہر ہے کہ سیدھا تمھارے پاس ہی آتا۔ یاد ہے، تم پچھلے [illegible] سال لکھنؤ آئے تھے تو تم نے کیا کہا تھا؟" استاد فتو معنی خیز لہجے [illegible] میں بولا۔

"یار استاد، مجھے تو یاد نہیں کہ سال بھر پہلے میں نے تم سے کیا کہا تھا، تمھی بتا دو! اچھا لو حقہ تو پیو!" استاد جھنگا نے استاد فتو [illegible] کی طرف حقے کی نے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ دلّی میں آ کر کسی اجنبی کے لیے یہ بڑا مشکل کام ہے جو کوئی اپنی جیب سلامت لے جائے۔" استاد فتو نے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں یاد آیا۔" استاد جھنگا ہنس کر بولا۔ "تو تمھیں اب [illegible] تک وہ بات یاد ہے استاد!"

"بس استاد، دیکھ لیا تمھارا دعویٰ!" استاد فتو زیرِ لب [illegible] مسکرایا۔

"کیوں، کیا ہوا استاد؟"

"اماں صبح سے شام ہو گئی تمھارے چاندنی چوک میں ٹہلتے ہوئے۔ گنّیاں تھیں میری جیب میں! کسی کی ہمت ہی نہیں [illegible] ہوئی ہاتھ ڈالنے کی! اب بھی اسی طرح جیب میں پڑی ہیں۔" استاد [illegible] فتو نے کہا۔

"کمال ہے!" استاد جھنگا کے لہجے میں حیرت تھی۔ وہ چند [illegible] لمحے خاموش رہا، پھر کمرے میں موجود افراد کو مخاطب کر کے [illegible] بولا۔ "ابے لونڈو! آج چاندنی چوک میں دن بھر کون رہا تھا؟"

"میں تھا استاد!" ایک شخص نے جواب دیا جو شطرنج کھیل [illegible] رہا تھا۔

"ابے مجیدے، تو تھا بے غیرت! ناک کٹوا دی دلّی کی! یہ استاد فتو کیا کہہ رہے ہیں، سُنا تو نے!"

"سُنا استاد!" مجیدے نے جواب دیا۔

"پھر؟"

"پھر یہ کہ استاد، وہ گنّیاں نقلی ہیں۔" مجیدے نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔ "خدا جھوٹ نہ بُلائے استاد، تو تین بار کسوٹی لگوائی ہے۔ گنّیوں پر کسوٹی کا نشان موجود ہوگا، تم خود دیکھ لو!"

"اماں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے!" استاد فتو جلدی سے بولا اور اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر گنّیاں نکال لیں، پھر انھیں خود ہی اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے طویل سانس لیا اور استاد جھنگا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ "مان گئے استاد! گنّیوں پر کسوٹی کا نشان موجود ہے۔"

"تو یہ لوگ جیب کترے ہیں!" میں نے سوچا۔ غار والی کا ان سے کیا تعلق؟ کہیں وہ بھی تو جیب کتری نہیں! معاً میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ استاد جھنگا کو کوئی اشارہ کر رہا تھا۔ جواب میں استاد جھنگا نے چند لمحے کچھ سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے، کام ہو جائے گا، پیشگی بھی بھیجی ہے؟"

"ہاں، یہ لو استاد!" اجنبی نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا جس میں کچھ بندھا ہوا تھا، پھر اسے استاد جھنگا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ پانچ سو ہیں، پانچ سو مہینے بھر بعد!"

استاد جھنگا نے رومال لے کر اپنے قریب رکھ لیا اور بولا۔ "وہ آدمی کون ہے؟"

اجنبی نے میری طرف اشارہ کیا اور میں ڈر کے مارے اچھل پڑا۔ استاد جھنگا نے اپنے دو آدمیوں کو نام لے کر پکارا، پھر بولا۔ "اس کا چہرہ کر لو! باقی باتیں میں بعد میں بتا دوں گا۔"

استاد فتو بھی میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ چند لمحے بعد استاد جھنگا سے مخاطب ہوا۔ "کیا کوئی اور دھندا بھی شروع کر دیا ہے استاد؟"

"ہاں استاد! کئی دھندے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ آج کل کے خرچے بھی تو بہت ہیں۔ پولیس کا ریٹ بھی اب پہلے سے ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔" استاد جھنگا نے جواب دیا، پھر اجنبی سے بولا۔ "اس کا پتا وہی ہے جو تم نے آتے ہی بتایا تھا؟"

"ہاں استاد!" اجنبی نے جواب دیا۔

"بس بے فکر ہو جاؤ۔ اپنے اُوپر والوں سے کہہ دینا، کام ہو جائے گا۔" استاد جھنگا بولا۔

میری عقل چکرا رہی تھی کہ آخر یہ سب کیا ڈراما ہو رہا ہے۔ اس اجنبی نے کہیں چُپ چُپاتے مجھے استاد جھنگا کے ہاتھوں بیچ تو نہیں دیا

تو نہیں دیا؟ آخر یہ غاروالی کیا چکر چلا رہی ہے؟ ابھی سوالوں کا سلسلہ جاری تھا کہ اس اجنبی نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

بڑے کمرے سے نکل کر چھوٹے کمرے میں آتے ہی اجنبی رک گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں رک جانا مناسب سمجھا۔ وہ کمرہ خالی تھا اور اس سے گزر کر ڈیوڑھی میں پہنچا جا سکتا تھا۔

اجنبی میرے بالکل قریب آگیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "استاد جھینگا نہ صرف مشہور جیب تراش ہے بلکہ اس کے اور بھی دھندے ہیں۔ یہ پیسے لے کر لوگوں کو قتل بھی کرا دیتا ہے۔"

"ن... نہیں... تم... تم جھوٹ بول..."

"فضول باتیں نہ کرو، وقت کم ہے، میری بات غور سے سنو!" اجنبی نے مجھے ڈانٹا۔ "مجھے استاد جھینگا کے پاس اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تمھارے قتل کا بندوبست کر دوں..."

"اور... اور تم نے... تم نے یہ بندوبست کر..."

"میں تم سے کہہ رہا ہوں، خاموشی سے میری بات سنو!"

"اچھا!" میں نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"مگر میں نے غاروالی کے کہنے پر ایسا نہیں کیا۔"

میری باچھیں کھل گئیں۔ "تم... تم بہت عظیم بلکہ مہاعظیم انسان ہو مگر پھر تم نے استاد کو روپے کیوں دیے تھے؟"

"تمھاری حفاظت کے لیے!" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں کچھ نہ سمجھا۔

"مجھے ان کے حکم پر بہرحال یہاں آنا تھا۔ میں نے یہاں آکر استاد جھینگا کو اور ہی پٹی پڑھائی۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے ایک شخص کی حفاظت کرنا ہے کیوں کہ کچھ لوگ، اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اب سمجھے! ہزار روپے مہینہ طے ہوئے ہیں تمھاری حفاظت کے!"

"اور یہ رقم، یہ بڑی رقم غاروالی میرے لیے خرچ کر رہی ہے! ہائے وہ کتنی عظیم عورت ہے!" میں بولا۔

"نہیں، یہ رقم غاروالی کی نہیں، تمھارے دشمنوں کی ہے جو انھوں نے تمھارے قتل کے لیے دی تھی!"

"ہزار روپے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں دو ہزار!" اجنبی نے جواب دیا۔

"تو پھر بقیہ ڈیڑھ ہزار روپے بیچ میں تم ہضم کیے جا رہے ہو پیارے بھائی!"

"بکومت!" اجنبی نے مجھے ڈانٹ دیا، پھر بولا۔ "غاروالی نے کہلوایا ہے کہ تم کوٹلہ فیروز شاہ کا رخ نہ کرنا ورنہ تمھاری زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میں ہرگز ادھر نہیں جاؤں گا۔" میں نے جلدی سے سر ہلا کر کہا۔

"اور سنو! اس گھر سے پہلے تم نکلو گے، میں بعد میں نکلوں گا۔"

"پھر ملیں گے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں نہیں!" اجنبی نے رکھائی سے جواب دیا۔

"مگر تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ بات کرنا..."

"مجھے تم سے جو بات کرنا تھی، وہ کر چکا۔ اب مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔" یہ کہہ کر اجنبی آگے بڑھا۔

"ارے سنو تو! پہلے مجھے نکلنا ہے۔"

"اچھا تو پھر جاؤ!" اجنبی نے رک کر کہا۔

میں قدم بڑھا کر اس کے قریب پہنچا اور کہا۔ "ویسے تم نے تو غاروالی کو دیکھا ہی ہوگا، کیسی ہے وہ؟"

"تم جا رہے ہو یا میں واقعی استاد جھینگا سے تمھارے قتل کی بات کر لوں؟" اجنبی غرایا۔

"ارے نہیں پیارے بھائی! ناراض نہ ہو جانا!" میں نے جلدی سے کہا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "بس غاروالی سے میرا 'سلام علیکم' کہہ دینا۔"

میں اجنبی کا جواب سننے وہاں نہیں رکا تھا اور شاید اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ بھلا بتاؤ، جو عورت قدم قدم پہ جان بچا رہی ہو، اپنی نہیں میری، اسے کم سے کم سلام تو کہلوا ہی دینا چاہیے تھا۔ آخر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے، دنیا میں!

اس حویلی نما گھر سے نکلتے ہی میں نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تھی اور چل دیا تھا۔ اس گھر سے نکلتے ہوئے دروازے کے قریب میری ملاقات استاد جھینگا کے مینڈک نما چیلے سے بھی ہوئی تھی مگر ہمارے درمیان مکالمے بازی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے خاموشی سے میرے لیے دروازہ کھول دیا تھا اور جب میں باہر چلا گیا تھا تو دوبارہ کنڈی لگالی تھی۔

اس گلی کے اختتام پر مجھے پھر وہی چڑیل نظر آئی تھی اور میں نے بریک لگا دیے تھے کیوں کہ وہ راستہ گھیرے کھڑی تھی۔ اس کی کمر پھر جھک گئی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلائے ہوئے تھی۔ پھر مجھے اس کی آواز بھی سنائی دی، وہی کانپتی ہوئی آواز! "ایک دھیلے کا سوال ہے۔"

میرے اوسان خطا ہونے لگے مگر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "اے محترمہ چڑیل صاحبہ! یقین کریں کہ میں کوٹلہ فیروز شاہ کا رخ ہرگز... ہرگز نہیں کروں گا۔"

"اگر تم آج رات وہاں نہ آئے تو میں زندگی بھر تمھارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔" اس نے کہا۔

"ارے باپ رے!" میں بوکھلا گیا۔ "کیا کچھ پیسے لے دے کر کام نہیں چل سکتا!"

جواب میں مجھے اس کی منحوس ہنسی سنائی دی، پھر چند لمحے بعد "اگر آج رات تم نہ آئے تو میں تمھارا خون پی جاؤں گی۔"

میری ہمت جواب دے گئی۔ اب تک میں نے بہت ہمت کا ثبوت دیا تھا۔ بھلا چڑیلوں سے بات کرنا معمولی دل کا کام ہے! بھاگ لے بیٹا اللہ دتا! کہیں یہ چڑیل اسی وقت خون پینے کا پروگرام نہ بنا لے! یہ خیال آتے ہی میں نے جلدی سے موٹر سائیکل موڑی اور رفوچکر ہو گیا۔ اپنے پیچھے مجھے اس چڑیل کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ میں نے جیسے تیسے موٹر سائیکل ڈیوڑھی میں کھڑی کی اور اپنے کمرے میں گھس کر بے حس و حرکت بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت تقریباً ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ نو بجے میں نے لیوسی کے گھر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس کے پاس جا سکتا۔

ایک طرف غاروالی کا حکم تھا کہ کوٹلہ فیروز شاہ نہ جاؤں اور دوسری طرف کوٹلہ فیروز شاہ کی ایک چڑیل کا فرمان تھا کہ ضرور پہنچوں ورنہ وہ میرا یعنی اللہ دتا مسلم کا خون پی جائے گی۔

"اے میرے پاک پروردگار! میں کروں تو کیا کروں!" میں سوچنے لگا۔ "یہ میں کس مشکل میں پھنس گیا! پہلے تو صرف انسانوں سے دشمنی ہو رہی تھی، اب یہ چڑیلیں اور جن بھوت وغیرہ بھی پیچھے لگ گئے!"

کیا کروں، کیا نہ کروں؟ میرا ذہن گردان کرتا رہا۔ پھر مجھے مصیبت کے وقت لیوسی ہی یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے مشورہ کر لوں، پھر وہ جو مشورہ دے، اس پر عمل کروں۔ یہ سوچ کر میں اٹھ بیٹھا تھا۔ اسی وقت امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ارے تو یہاں گرمی میں کیوں پڑا ہے رے! آنگن میں چارپائی پر لیٹ جا!" امی نے کہا۔ "اور کھانا نہیں کھائے گا۔ ابا بھی اب دکان بند کر کے آتے ہی ہوں گے۔"

"ہائے پیاری امی! تمھیں کھانے کی پڑی ہے اور تمھارے بیٹے کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے سوچا کہ امی کو بتا دوں مگر صبر کر گیا اور بولا۔ "امی! بھوک بالکل نہیں ہے اور پھر مجھے دفتر کے کام سے بھی ابھی جانا ہے۔"

"تیرے دفتر کے کاموں سے تو میں تنگ آگئی ہوں۔ ختم ہی نہیں ہو کے دیتے!" امی چنچنائیں۔

امی کو چنچناتا ہوا چھوڑ کر میں کمرے سے نکلا اور پھر ڈیوڑھی سے موٹر سائیکل نکالنے میں دیر نہ کی کیوں کہ میں سن ہی چکا تھا ابا آنے والے ہیں۔ وہ آ جاتے تو گھر سے نکلنا اور بھی مشکل ہو جاتا۔

اب میں لال کنویں جا رہا تھا، لیوسی کے گھر!

لیوسی مجھے اپنی منتظر ہی ملی۔ میں نے موٹر سائیکل کھڑی کر کے جیسے ہی دروازے پر دستک دی تھی، دروازہ کھل گیا تھا۔

"آؤ آؤ، میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"تمھاری امی تو برا نہیں مانیں گی؟" میں نے دروازے میں داخل ہوتے وقت کہا۔

"کس بات کا؟"

"اس بات کا کہ تم جوان لڑکوں سے ملتی ہو۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

وہ چلتے چلتے ایک دم رک گئی اور حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم جوان ہو؟"

"اور کیا نھا دودھ پیتا بچہ ہوں! کیا سمجھتی ہو تم مجھے!" میں سینہ پھلا کر بولا۔ "میری تو شادی کی بات بھی ہو چکی ہے جناب بلکہ جناب! بس ذرا بھائی صاحب اور بڑے بھیا نمٹ جائیں۔"

"تم نے دیکھا ہے اپنی ہونے والی بیوی کو؟"

"توبہ توبہ!" میں نے اپنے دونوں گالوں پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تم کیسی باتیں کر رہی ہو! کیا تم مجھے اتنا ہی بے شرم سمجھتی ہو!"

لیوسی ہنس پڑی، پھر بولی۔ "چلو، بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر آگے بڑھی اور اسی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

لیوسی نے مجھے بتایا کہ اس کی والدہ کہیں گئی ہوئی ہیں اور چھوٹا بھائی اندر والے کمرے میں پڑھ رہا ہے۔ وہ مجھے بیرونی کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں دو چار کرسیاں اور میز وغیرہ پڑی ہوئی تھی۔ میں اور وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اس سے پہلے کہ لیوسی کچھ کہتی، مجھے پہلے غاروالی، پھر کوٹلہ فیروز شاہ کی چڑیل کا خیال آگیا اور میں اداس ہو گیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں لیوسی کو مخاطب کیا۔ "سنو! میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اگر اس موقع پر تم نے مجھے کوئی نیک مشورہ نہ دیا تو میں... میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ میری زندگی... تباہ ہو جائے گی۔ لیوسی پیاری! میرے لیے کچھ کرو! مجھے مشورہ دو، قیمتی مشورہ کہ میں ان حالات میں کیا کروں، کیا نہ کروں!"

"مگر تم نے ابھی تک مجھے حالات سے آگاہ نہیں کیا۔" وہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں نے کہا، پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "میں دو پاٹوں کے بیچ پس رہا ہوں لیوسی! ایک طرف غار والی ہے اور دوسری طرف کوٹلہ فیروز شاہ کی چڑیل! غار والی کہتی ہے کہ میں ہرگز کوٹلہ فیروز شاہ نہ جاؤں ورنہ مارا جاؤں گا، کوٹلہ فیروز شاہ کی چڑیل کا کہنا ہے کہ اگر آج رات میں وہاں نہ گیا تو وہ میرا خون پی جائے گی، جیتا جاگتا جوان خون! بھلا بتاؤ، یہ کوئی شرافت ہے!"

"اچھا تو تم اس چڑیل کو بالکل نہیں پہچانتے؟" لیوسی ہنس کر بولی۔

"ارے یہاں جان پر بنی ہوئی ہے اور تم ہنسے جا رہی ہو! اس چڑیل سے میری کون سی رشتے داری رہی ہے جو اسے پہچان لیتا!"

"رشتے داری نہیں ہے تو ہو سکتی ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" لیوسی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں کرنی اس سے رشتے داری و شتے داری، ہاں!" میں نے لیوسی کے لہجے کی معنویت کو نظر انداز کر دیا اور غصے میں بولا۔ "تم مجھے کوئی مشورہ نہیں دے سکتیں تو نہ دو مگر میرے حال زار پر ہنسو تو مت!"

"ویسے تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" لیوسی نے پوچھا۔

"لو اور سنو! اگر میں ہی کوئی فیصلہ کر لیتا تو تم سے مشورہ لینے کیوں آتا!"

"نہیں تو خیر وعدے کے مطابق آنا ہی تھا۔ تم نے تو بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"جی نہیں! میں وہ وعدہ پورا کرنے نہیں آیا تھا۔ مجھے تو میری مشکل یہاں تک کھینچ لائی ہے۔" میں بولا۔

"تو اگر اس سلسلے میں تم میرا ہی مشورہ چاہتے ہو تو سنو کہ اس چڑیل کا کہنا مان لو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم پر عاشق ہو گئی ہے اور جب کوئی عشق کرتا ہے تو پھر اپنے معشوق کو مرنے نہیں دیتا۔ وہ جب تمہیں وہاں بلا رہی ہے تو تمہاری حفاظت بھی کرے گی۔" لیوسی نے مشورہ دیا مگر مشورہ دیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہ مجھے مسلسل دیکھے جا رہی تھی اور مسکرائے جا رہی تھی جس سے میں کھٹک رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ مصیبت پر خوش کیوں نظر آ رہی ہے۔

"میں ہی رہ گیا ہوں چڑیلوں کے لیے!" میں نے روہانسا ہو کر کہا۔

"آخر چڑیلوں کے سینے میں بھی تو دل ہوتا ہے۔ اگر وہ تم پر عاشق ہو گئی ہے تو اس میں کون سی بُری بات ہے!"

"مگر وہ بڑھیا ہے، بڑھیا!" میں نے غصے سے ہاتھ نچا کر کہا۔

"واقعی!" لیوسی مسکرا کر بولی۔

"اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں!"

"تو اگر وہ جوان ہوتی تو تم اس کا عاشق ہونا گوارا کر لیتے؟"

"یہ میں نے کب کہا!" میں گڑبڑا کر بولا۔ لیوسی خواہ مخواہ اس چڑیل کو میرے سر باندھے دے رہی تھی۔

"دراصل، چڑیلیں جیسی نظر آتی ہیں، ویسی نہیں ہوتیں۔"

"اچھا!"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "وہ جب چاہیں بوڑھی ہو سکتی ہیں اور جب چاہیں جوان!"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" میں خوش ہو کر بولا مگر دوسرے ہی لمحے مجھ پر خوف غالب آ گیا۔ "مگر... مگر ہوتی تو وہ چڑیلیں ہیں!"

"ہوا کریں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے! وہ جس پر ایک بار عاشق ہو جاتی ہیں، اس کے لیے جان بھی دے دیتی ہیں۔"

"تو اُن کے پاس جان ہوتی ہے؟" میں نے اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر پوچھا۔ "میری امی تو کہتی ہیں کہ وہ بدروحیں ہوتی ہیں۔"

"تم اس بحث میں نہ پڑو پیارے اللہ دتا! اور میرا مشورہ مان کر کوٹلہ فیروز شاہ چلے چلو۔" لیوسی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم کہتی ہو تو چلا چلتا ہوں۔" میں مردہ سے لہجے میں بولا۔ "ایک بار پھر سوچ لو، کہیں کچھ ہو ہوا نہ جائے!"

"تم بیٹھو، میں ابھی لباس سے کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی۔

لیوسی، کمرے سے چلی گئی تو میں سوچنے لگا، اس کی دلیل مضبوط تھی۔ انسانوں سے تو خیر کسی نہ کسی طرح نمٹ بھی لیا جاتا ہے مگر بھلا اس بدروح سے میں کیسے نمٹوں گا! ان حالات میں کوٹلہ فیروز شاہ جانا از بس ضروری تھا۔ رہا غار والی کا مشورہ تو اس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ ایک عدد چڑیل مجھ حقیر فقیر پر عاشق ہو چکی ہے۔ اگر اس کے علم میں یہ بات ہوتی تو وہ شاید میری طرف سے زیادہ فکر مند نہ ہوتی۔

کچھ دیر ہی میں لیوسی لباس تبدیل کر کے آ گئی۔ اس کا گورا جسم سیاہ لباس میں کھل رہا تھا۔

"کیا مجھے بھی گھر مل کر سیاہ لباس پہننا پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "یہ کپڑے بھی چل جائیں گے کیوں کہ گہرے رنگ کے ہیں۔ اندھیرے میں یہ رنگ نظر نہیں آئے گا۔ اگر تم سفید کپڑے پہنے ہوتے تو میں ضرور لباس بدلنے کے لیے کہتی۔"

میں لیوسی کے ہمراہ اس کے گھر سے نکلا۔ لیوسی کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا بھی تھا۔ اس تھیلے کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ میں نے لیوسی سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ اس تھیلے میں کیا ہے۔

میں نے پھٹ پھٹ اسٹارٹ کی اور لیوسی، تھیلا سنبھالتی ہوئی پھٹ پھٹ پر بیٹھ گئی۔

"ریوالور تو ہو گا تمہارے پاس؟" پھٹ پھٹ چلتے ہی لیوسی نے پوچھا۔

"ہاں ہے تو سہی مگر... مگر میں کسی کو گولی نہیں ماروں گا، ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔" لیوسی نے کہا۔

"بتائے گا تو اس وقت بعد میں اس سے پوچھوں گا۔"

لیوسی ہنس پڑی اور پھر کچھ نہ بولی۔

میں ایک سڑک پار کر کے کچھ دیر بعد گلی قاسم جان سے گزرتا ہوا بَلّی ماران پہنچا، پھر وہاں سے چاندنی چوک میں نکل آیا۔ گھنٹہ گھر، پھر فوارے سے گزرتا ہوا میں لال قلعے کے سامنے نکل آیا۔ اس کے بعد سیدھا دریا گنج کی طرف ہو لیا۔ جب میں دہلی دروازے سے گزر رہا تھا تو پھٹ پھٹ کی رفتار کچھ کم ہونے لگی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ مجھ پر اب رفتہ رفتہ خوف غالب آنے لگا تھا۔ دہلی دروازے سے گزر کر خونی دروازہ تھا اور پھر اس کے بعد وہ جگہ جہاں جانے سے میری روح فنا ہو رہی تھی یعنی کوٹلہ فیروز شاہ!

"تم نے رفتار کم کیوں کر دی؟" لیوسی نے پوچھا۔

"ن... نہیں تو!" میں ہکلایا۔

"رفتار بڑھاؤ!" لیوسی نے کہا۔ "ہم جتنی جلد وہاں پہنچ جائیں اچھا ہے کیوں کہ وہاں پہنچنے کے بعد بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔"

"کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ تمہیں وہیں چل کر پتا چلے گا۔" لیوسی نے جواب دیا۔

پھر مجھے پھٹ پھٹ کی رفتار بڑھانا ہی پڑی۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناسکتی تھی! میں اب بار بار یہ سوچ کر دل کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ چڑیل سچ مچ بقول لیوسی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔ اس خیال سے میرے دل کو بڑی تقویت ہو رہی تھی۔

خونی دروازے سے کچھ دور نکل کر آنے کے بعد ہی لیوسی نے مجھ سے پھٹ پھٹ روکنے کے لیے کہا اور میں نے فوراً اس پر عمل کیا۔ لیوسی اور میں پھٹ پھٹ سے اتر گئے۔

"موٹر سائیکل یہیں کہیں جھاڑیوں میں چھپا دو۔" لیوسی نے سڑک کی دونوں سمت پھیلے ہوئے تاریک میدان کی طرف اشارہ کیا۔ جھاڑیوں کے ہیولے بھوت پریتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"تم تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔" میں نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔ "کہیں وہ چڑیل مل گئی جو پھاٹک حبش خاں میں..."

"اب یہ اداکاری چھوڑ دو اللہ دتا!" لیوسی میری بات کاٹ کر سنجیدگی سے بولی۔ "تم نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا، خواہ مخواہ مجھ کیسے جا رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے بولا۔ "میں نے کب کہا کہ تمہیں نہیں پہچانتا!"

"پھر تم کیوں اس بہانے مجھے 'چڑیل چڑیل' کہے جا رہے ہو؟" لیوسی منہ بنا کر بولی۔

"میں نے تمہیں چڑیل کب کہا؟"

"اور کس طرح کہو گے! میں تو صرف اس لیے وہاں گئی تھی کہ اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت پڑ جائے تو تمہارے کام آ سکوں۔" لیوسی نے کہا۔

"کہاں گئی تھیں؟" میں حیران ہو کر بولا۔

"پھاٹک حبش خاں، اور کہاں! تو چڑ کر بولی۔

"تو تم وہاں موجود تھیں؟... مگر مجھے نظر کیوں نہیں آئیں؟"

"ایک دھیلے کا سوال ہے۔" معاً میری سماعت سے اسی چڑیل کی کانپتی ہوئی آواز ٹکرائی جو پھاٹک حبش خاں میں مجھے ملی تھی۔

"ارے باپ رے! وہ... وہ آ گئی... مگر... مگر..." میں ہکلا کر رہ گیا۔ "تم... تم..."

"ہاں میں!" لیوسی ہنس کر بولی۔ "اب زیادہ بنو مت!"

"تو وہ... وہ چڑیل تم... تم تھیں... تم..."

"میں چڑیل نہیں، لیوسی ہوں سمجھے! اور اب اگر تم نے مجھے چڑیل کہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔"

تو یہ تھی لیوسی کی سازش! میں نے سوچا۔ اس نے چڑیل بن کر مجھے کوٹلہ فیروز شاہ آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تم بڑی چال باز ہو!" میں نے بُرا مان جانے والے انداز میں کہا۔

"تم بھی تو کم نہیں۔" لیوسی نے ہنس کر کہا، پھر بولی۔ "اب جلدی کرو! ضروری نہیں کہ ادھر کوئی آئے ہی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور چونک اٹھی۔

میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ دور، بہت دور روشنی کا ایک نقطہ سا نظر آ رہا تھا۔

"کوئی ادھر ہی آ رہا ہے، ہمیں فوراً سڑک سے اتر کر میدان میں رینگ جانا چاہیے۔" لیوسی تیز لہجے میں بولی۔

"میں آدمی ہوں، کوئی کیڑا نہیں جو رینگ جاؤں، سمجھیں!"

"بیکار باتیں نہ کرو!" لیوسی نے کہا۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ہر وقت غیر سنجیدہ مت رہا کرو۔"

خطرے کا احساس مجھے بھی ہو چکا تھا اس لیے میں نے پھٹ پھٹ کو سڑک سے ایک طرف کے نشیب میں اتار لیا۔ لیوسی میرے ساتھ ساتھ تھی۔ سڑک کے کنارے کنارے، کافی کافی فاصلے سے لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کی مریل روشنی صرف کچھ دور تک نشیب کو نیم تاریک کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد تاریک میدان تھا جس میں جگہ جگہ گھنی جھاڑیاں تھیں۔

لیوسی اور میں بڑھتے رہے اور پھر تاریکی میں پہنچ گئے۔

"دیکھو اب وہ روشنی اور قریب آ گئی ہے۔" لیوسی نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے دور سڑک کی طرف دیکھا۔ لیوسی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے موٹر سائیکل ایک جھاڑی کے پیچھے "لٹا" دی۔

"وہ جو کوئی بھی ہے، اس کے گزر جانے کے بعد ہم اپنا سفر شروع کریں گے۔" لیوسی کی آواز سنائی دی۔

"موت کا سفر!" میں بھاری آواز میں بڑبڑایا۔ "اگر وہاں پہنچتے ہی جن بھوت نہ لپٹ جائیں تو مجھ سے کہنا۔"

"تجھ سے جن بھوت لپٹیں گے اور تم سے چڑیلیں! کیوں ٹھیک ہے نا!" لیوسی ہنس کر بولی۔

"تمہارے منہ میں خاک بلکہ دھول!" میں نے جل کر کہا۔

جواب میں لیوسی خاموش رہی۔ وہ مجھ سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ چند لمحے بعد اس کی خواب ناک سی آواز سنائی دی جیسے وہ نیند میں بول رہی ہو۔ "اللہ دتا! کیا تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے؟"

"پتھر کیوں ہوتا! پتھر ہو تمہارے سینے میں!" میں چڑ کر بولا۔

"کیا تم ایسے ہی ہو جیسے نظر آتے ہو؟"

"اور کیا میرے سر میں سینگ ہیں!"

لیوسی نے ایک طویل سانس لیا اور اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔

"تمہارے سر میں جوئیں تو نہیں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم پھر میرا مذاق اڑانے لگے!" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

"لو اور لو، میں مذاق اڑا رہا ہوں! اسے یہ بات کیسے نہیں معلوم کہ عورتوں کے سر میں جوئیں ہوتی ہیں۔ اس میں مذاق اڑانے کی کیا بات ہے! تم نے اپنا سر میرے کندھے سے لگا رکھا ہے۔ ایسی صورت میں کیا تمہارے سر کی جوئیں میرے کپڑوں میں نہیں آ جائیں گی۔ بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"ظالم! سنگ دل!" لیوسی کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی اور پھر میرے کندھے پر اس کے سر کا دباؤ ختم ہو گیا۔

"کون؟" میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ لیوسی میرے سوال کا جواب دیتی، میں چونک پڑا۔ میری سماعت سے کسی پھٹ پھٹ کے انجن کا شور ٹکرایا تھا جو رفتہ رفتہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ روشنی کا دائرہ اب واضح ہو چکا تھا۔

وہ روشنی کا نقطہ یقیناً اسی پھٹ پھٹ کی ہیڈ لائٹ کا تھا جو کچھ دیر پہلے نظر آیا تھا۔ پھٹ پھٹ اب قریب آتی جا رہی تھی۔ اس پر دو افراد سوار تھے۔ کچھ دیر ہی میں پھٹ پھٹ ہمارے سامنے سڑک پر سے گزر گئی۔

"یہ لوگ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"ان کی منزل بھی وہی ہو سکتی ہے، جو ہماری ہے۔" لیوسی نے سنجیدہ لہجے میں کہا پھر بولی۔ "اب ہمیں بھی چلنا چاہیے۔"

"کہاں؟ کدھر؟" میں گھبرا گیا حالانکہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کدھر چلنے کو کہہ رہی ہے۔

"کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف اور کہاں!" لیوسی نے جواب دیا۔ "میرے اندازے کے مطابق وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

چل بیٹا اللہ دتا، چڑھ جا سولی پر! یہ تیرا جھٹکا کرائے بغیر نہیں مانے گی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر بولا۔ "اپنا ہاتھ تو ہاتھ میں دے دو!"

"کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے؟" لیوسی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے!" میں نے لیوسی کے لہجے کی بھونڈی نقل اتاری۔ "اگر ہاتھ نہ پکڑا تو میں کھو نہیں جاؤں گا!"

"میں تمہیں خوب سمجھتی ہوں! اتنے ہی بھولے بچے ہو تم!"

"پہلے تو بہلا پھسلا کر یہاں تک لے آئیں اور اب ستا رہی ہو مجھے! ابھی بستی میں واپس چلا جاؤں گا ہاں!"

"لو پکڑ لو ہاتھ! بچوں کی طرح مت ٹھنکو!"

"ارے کہاں ہے ہاتھ؟" میں نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ اس کا ہاتھ پکڑ سکوں۔ پھر میرا ہاتھ اس کے جسم سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اسے پکڑ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" لیوسی نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں ایسی حرکتیں پسند نہیں کرتی!"

"تو مجھے کب پسند ہیں! اپنا ہاتھ دے دو میرے ہاتھ میں!" میں نے بھی غصے میں کہا۔

"آنکھیں کس لیے دی ہیں خدا نے؟" لیوسی منمنائی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اندھیرے میں تمہیں بھی دکھائی دیتا ہوگا مجھے نہیں۔"

لیوسی خاموش رہی اور میرا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات تک پہنچتے پہنچتے ہم کئی جگہ رکے۔ سڑک پر کبھی کوئی کار اور کبھی کوئی پھٹ پھٹ نظر آتی اور ہمیں رک جانا پڑتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس رات لوگ شہر سے باہر پکنک منانے جا رہے تھے۔ ہم دونوں سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اسی لیے جب کوئی کار یا پھٹ پھٹ نظر آتی، میدان میں رینگ جاتے، پھر جب لائن کلیئر ہو جاتی تو دوبارہ اپنا سفر شروع کر دیتے۔

کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات کے ہیولے دور ہی سے نظر آنے لگے تھے اور میری ہوا خراب ہونے لگی تھی۔ ایک بار پھر میرا جی چاہنے لگا تھا کہ اپنا ہاتھ چھڑاؤں اور بگٹٹ شہر کی طرف بھاگ لوں، خوب تیز، خوب تیز! مگر ہائے افسوس کہ اس ارادے پر میں عمل نہ کر سکا۔

"لل... لیوسی... لیو... سی!" میں نے خوف دور کرنے کی خاطر لیوسی کو مخاطب کیا۔

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرا۔

"اب... اب کیا ہوگا؟ کیا... کیا ہوگا اب لیو... سی... ای!"

"کیوں کیا ہوا؟" لیوسی نے پوچھا۔

"میرے... میرے پیٹ میں درد... سخت درد ہو رہا ہے۔" مجھے کوئی اور بہانہ نہیں سوجھا تو اپنے پیٹ ہی میں درد کر لیا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" وہ رکھائی سے بولی۔

"لو صاحب تم نے بھی آنکھیں بدل لیں! اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کبھی عورت ذات پر بھروسا مت کرو۔" میں فریادی لہجے میں بولا۔

"تم پھر بزدلی کا ڈھونگ رچانے لگے!" لیوسی نے سخت لہجے میں کہا۔

"لو اور لو، میں ڈھونگ رچا رہا ہوں! اب ہے نا یہ ظلم!" میں بولا اور رک گیا۔

"یہ تم رک کیوں گئے؟" لیوسی میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

"تھوڑی دیر سستا تو لینے دو! کیا خبر پھر یہ موقع ملے نہ ملے! بکرے کو بھی ذبح کرنے سے پہلے دانہ پانی دکھا دیتے ہیں!"

"اچھا سستا لو!" لیوسی نے زچ ہو کر کہا، پھر بولی۔ "مگر میرا ہاتھ تو چھوڑ دو۔"

"نہیں، ہرگز نہیں!" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ "تم... تم مجھے یوں اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتیں!"

میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ قدم آگے بڑھاؤں ہی نہیں مگر لیوسی کم بخت کب ماننے والی تھی۔ کچھ دیر گزری تھی کہ اس نے "چلو چلو" کی رٹ لگا دی اور مجھے مجبوراً ہمت پکڑنا پڑی۔

ان کھنڈرات کے درمیان جیسے بدروحیں بین کرتی پھر رہی تھیں۔ وہاں کوئی ذی روح نہ تو دکھائی دے رہا تھا نہ سنائی۔ لیوسی میرا ہاتھ تھامے کھنڈرات کے اطراف میں گھوم رہی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ رک گئی اور میں بھی حیران ہوا۔ وہاں ایک شکستہ سی دیوار کے قریب کئی کاریں اور پھٹ پھٹیں کھڑی ہوئی تھیں۔

"دیکھا میرا اندازہ بالکل صحیح تھا!" لیوسی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں کچھ نہ سمجھ پایا کہ وہ کس اندازے کی بات کر رہی تھی۔ مجھ پر اتنا خوف طاری تھا کہ جواب میں کچھ کہنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر لیوسی پھر میرے کان میں منمنائی۔ "راستے میں ہمیں جو کاروں اور موٹر سائیکلوں والے ملے تھے، وہ یہیں آئے ہیں۔"

لیوسی کے اس سفید جھوٹ پر مجھے غصہ آ گیا۔ وہ خواہ مخواہ اپنی قابلیت بگھار رہی تھی۔

"کیوں جھوٹ بول رہی ہو!" میں بولا۔ "وہ یہاں آتے تو دکھائی نہ دیتے!"

"آہستہ بولو!" لیوسی نے تیز سرگوشی کی۔ "غیر ضروری بہادری کا اظہار کبھی کبھی نقصان بھی پہنچا دیتا ہے۔"

اسی وقت کہیں دور سے کسی کار کے انجن کا ہلکا سا شور سنائی دیا اور میں اچھل پڑا۔ "کک... کو... کوئی پھر... پھر آ رہا ہے۔"

"ہاں!" لیوسی نے آہستہ سے کہا، پھر میرا ہاتھ کھینچتی ہوئی بولی۔ "آؤ، یہاں سے ہٹ جائیں... جو کوئی بھی ہے، ادھر ہی آئے گا۔"

پھر لیوسی مجھے وہاں سے ہٹا لے گئی۔ قریب ہی ایک ستون کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا اور وہ ستون اتنا موٹا تھا کہ لیوسی اور میں دونوں ہی اس کے پیچھے بہ آسانی چھپ سکتے تھے۔ لیوسی نے چھپنے کے لیے اسی ستون کا انتخاب کیا۔ وہاں سے وہ شکستہ دیوار قریب ہی تھی جس کے پاس کاروں اور پھٹ پھٹوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

لیوسی اور میں دونوں پنجوں کے بل زمین پر بیٹھے تھے۔ نہ جانے کب لیوسی نے موقع غنیمت جان کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔ لیوسی خاموش تھی اور مجھ میں تو خوف کے سبب اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کچھ بولتا۔ کار کے انجن کی آواز اب بہت قریب آ چکی تھی اور میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے تھے جو یقیناً پہلے آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔

ایک ایک لمحہ بڑی مشکل سے گزر رہا تھا۔ پھر کار کے انجن کی آواز جیسے میری کھوپڑی میں گونجنے لگی۔ میں نے لیوسی کے ہیولے کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ ستون کی آڑ سے دوسری طرف جھانک رہی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ کہیں لیوسی اسی طرح تاک جھانک کرتے کرتے مجھے وہاں چھوڑ کر نہ بھاگ لے! یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے اس کے قریب کھسک گیا اور خود بھی دوسری طرف جھانکنے لگا۔

دوسری طرف مجھے ایک کار کی ہیڈلائٹس نظر آئیں جو رفتہ رفتہ قریب آتی گئیں اور پھر کار رک گئی۔ اسی کے ساتھ ایک بار پھر تاریکی پھیل گئی۔ چند لمحے بعد ہی کار کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کوئی دراز قد شخص کار سے اترا۔ کار سے اتر کر اس نے دروازہ بند کیا، پھر چند لمحے اسی جگہ کھڑا رہا۔ وہ غالباً اِردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

معاً اندھیرے میں ایک شعلہ سا چمکا اور پھر میں اچھل پڑا۔ کار سے اترنے والے نے سگریٹ جلائی تھی اور اسی دوران میں اس کا چہرہ دیکھا مجھے نظر آگیا تھا۔ وہ صفدر علی بیگ تھا۔

سگریٹ سلگا کر وہ ایک طرف بڑھا۔ اندھیرے میں سگریٹ کا شعلہ صاف نظر آ رہا تھا جس سے اس کی سمت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کدھر بڑھ رہا ہے۔ اس نے بائیں جانب کا رُخ کیا تھا۔

"ہم اس کا پیچھا کریں گے۔" اچانک لیوسی مڑ کر میرے کان میں گھسی۔

"م... مگر... مگر کیوں؟" میں رو دینے والے انداز میں بولا۔

"تاکہ پتا چل سکے، وہ سب کہاں غائب ہوتے جا رہے ہیں!" لیوسی نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"اگر نہ بھی پتا چلا تو ایسی کون سی قیامت آجائے گی!" میں نے دانت بھینچ کر آہستہ سے کہا۔

"تو پھر کیا ہم یہاں جھک مارنے آئے ہیں!"

"مجھے کیا پتا!"

"اٹھو، وقت ضائع نہ کرو! کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" یہ کہتے ہی لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں "ارے ارے" ہی کرتا رہ گیا اور لیوسی ستون کی آڑ سے نکل کر چل دی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن یہ تاخیر بہرحال مجھے مہنگی پڑی۔ جب میں ستون کی آڑ سے نکلا تو لیوسی کا ہیولا کافی دور نکل چکا تھا۔ میں پنجوں کے بل بھاگا تاکہ جلدی سے اس کے پاس پہنچ جاؤں مگر اسی دوران میں لیوسی کا ہیولا غائب ہو گیا۔ اس کے اور میرے درمیان شاید کوئی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ہیولے کو دیوار کی دوسری سمت غائب ہوتے دیکھا تھا۔ میرے پیروں میں بریک لگ گئے۔ ہائے میرے اللہ! اب کیا ہوگا؟ میں نے گھبرا کر سوچا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پھر میری نگاہ کافی دور بائیں جانب ایک متحرک شعلے پر پڑی۔ میں نے سوچا۔ وہی صفدر علی بیگ ہے اور لیوسی اسی طرف گئی ہو گی۔ مجھے بھی اسی طرف جانا چاہیے۔ دل کڑا کر کے میں نے قدم اٹھائے اور بہت آہستہ آہستہ گویا رینگنے لگا۔ میری نگاہ اسی متحرک شعلے پر جمی ہوئی تھی مگر کچھ دیر بعد ہی وہ شعلہ بجھ گیا۔ اب ہر طرف تاریکی تھی۔ سوائے اس کے اب میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ جدھر چل رہا تھا، اُدھر ہی چلتا رہوں اور میں نے یہی کیا۔ پھر کچھ فاصلہ طے کرتے ہی مجھے مجبوراً اپنا راستہ بدل دینا پڑا۔ مجھے تنہا دیکھ کر ایک حرام زادی چمگادڑ نے اپنے پَر پھڑپھڑائے تھے اور میرے بالکل قریب سے اُڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اگر مجھے موت کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً چیخ پڑتا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ کو حلق ہی میں گھونٹ دیا تھا۔ اُدھر سے ایک چمگادڑ اُڑ کر آئی تھی، اس کا مطلب تھا کہ وہاں اس کی اور بھی "بہنیں" ہو سکتی تھیں۔ یہ سوچ کر مجبوراً میں نے راستہ بدلا تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ صورت ذات دغا دے گئی تھی۔ جو بڑے بڑے غلط نہیں کہتے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اکیلا واپس لوٹ ہی جاتا۔ اب مجھے بہرقیمت پر لیوسی کو تلاش کرنا تھا مگر اسے تلاش کرتے ہوئے میری روح بھی فنا ہو رہی تھی۔

جگہ جگہ ٹوٹی دیواریں، ملبہ، اینٹ، پتھر اور ستون تھے جن کے درمیان میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا۔ کئی بار تو میں گرتے گرتے بچا تھا اور کئی بار میرا پاؤں مڑا تھا۔ صفدر علی بیگ کا پتا تھا نہ لیوسی کا! وہ دونوں نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور میں ایک جگہ کھڑا ہوا لرز رہا تھا۔ اب مجھے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ وہ کھنڈرات جن بھوت اور چڑیلوں کے مسکن ہیں۔ ہو نہ ہو لیوسی کو کوئی بھوت اٹھا لے گیا ہوگا اور صفدر علی بیگ کا خون کسی چڑیل نے پی لیا ہوگا۔ میرے ذہن میں خوف کے بچھو کلبلانے لگے۔ بیٹا اللہ دتا! اب تیری باری ہے۔

"ن... نہیں... نہیں!" وہ پہلا اٹھا اور مجھے اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

رفتہ رفتہ مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی اور پھر نہ جانے کب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں دہشت زدہ ہو کر ایک طرف بھاگ اٹھا۔ "ب... بچاؤ... بچاؤ!" میں زور سے چیختا جا رہا تھا۔

"اللہ دتا! اللہ دتا!" کہیں دور سے مجھے لیوسی کی آواز سنائی دی۔

میں بھاگتے بھاگتے ایک دم رکا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ میں بس اچانک ہی زمین میں دھنسنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین بیٹھتی جا رہی ہو اور میں اس کے اندر دھنستا جا رہا ہوں۔ میں چیختا رہا، ہاتھ پیر چلاتا رہا مگر زمین دھنسنے سے باز نہ آئی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی میرے جسم کو جھٹکا سا لگا اور میں گر پڑا۔ زمین کی حرکت اب ختم ہو چکی تھی۔

میں نے دیکھا کہ سامنے ہی ایک دروازہ ہے جس کی ایک طرف مشعل روشن ہے۔ ہم دروازے میں کواڑ نہیں تھے۔ میں نے اٹھ کر کھڑا ہوا اور ریسیں کوشش میں دوبارہ اس گھاس پھوس پر گر پڑا جس پر پہلے گرا تھا۔ میں نے خود کو ایک گہرے کنویں میں پایا۔

اگر فوراً ہی دروازے کے باہر موجود اس بندوق بردار پر میری نظر نہ پڑ جاتی جو اب دروازے ہی کی طرف آ رہا تھا تو میں یہی سمجھتا کہ مجھے کسی جن یا بھوت نے اپنے طلسم میں گرفتار کر لیا ہے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی بندوق بردار نے اپنی دونالی بندوق کی نال

طرف کر دی تھی اور چیخ پڑا تھا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی کو پکارا تھا یتی سے میری طرف لپکا تھا۔

"گ... گولی... گولی مت مارنا پیارے بھائی! م... میں خود ...ار ہو جاؤں گا۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر فریاد کی۔

بندوق بردار میرے قریب پہنچا اور مجھے گریبان سے پکڑ کر ...الیا۔ اس کی سرخ سرخ خونی آنکھیں بڑی بے رحمی سے میرے ...ے کا جائزہ لے رہی تھیں اور میرا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اب ...اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

بندوق بردار نے میرے گریبان کو جھٹکا دیا، پھر مجھے دروازے ...ذریعے اس کنویں سے باہر گھسیٹ لے گیا۔ اسی وقت میں نے ...سی چرچراہٹ سنی اور بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دروازہ ...ب ہو چکا تھا۔

"آگے چل!" بندوق بردار نے میرا گریبان پھر کھینچا۔

"چل رہا ہوں، پیارے بھائی!" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اور کانپتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اسی وقت ایک اور بندوق بردار، دائیں جانب سے بھاگتا ...آیا۔

"ارے!" اس نے قریب آتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ... یہ کہاں سے آگیا؟" اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ...ئے کہا۔

"بس اوپر سے ٹپک پڑا۔" پہلے بندوق بردار نے تمسخر آمیز ...ے میں جواب دیا۔

"تم نے آواز دی تھی نا مجھے؟" دوسرے بندوق بردار نے کہا۔

"ہاں۔" پہلے والا بولا۔ پھر کہا۔ "کیا کریں اس کا؟"

"فی الحال تو اس وقت تک کے لیے اسے کسی کوٹھری میں ڈال ...یتے ہیں جب تک میٹنگ ہو رہی ہے۔" دوسرے نے مشورہ دیا۔

"لیکن اس سے کم از کم نام پتا تو پوچھ ہی لیا جائے، اس دوران ...یں!" پہلا معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" دوسرے نے اتفاق کیا۔

وہ ایک چوڑی سی راہداری تھی جو دائیں جانب ایک طرف مڑ گئی تھی اور بائیں جانب کسی قدر تاریکی تھی۔ ادھر کوئی مشعل نہیں تھی۔ سامنے ہی دو کوٹھریاں نظر آ رہی تھیں جن میں لکڑی کے سلاخوں دار دروازے لگے ہوئے تھے۔ سامنے بھی دیوار میں ایک مشعل پیوست تھی۔ ان میں سے پہلے والے نے اب تک میرا گریبان پکڑا ہوا تھا حالانکہ وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ میں بھاگنا تو درکنار، اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

"دوسرا تمام افراد آگئے؟" دوسرے بندوق بردار نے پہلے سے دریافت کیا۔ "مجھے ابھی تک کملا دیوی نظر نہیں آئیں۔"

"کیا تمھیں پتا نہیں کہ وہ آج نہیں آسکیں گی!" پہلے والے نے کہا اور میرا گریبان چھوڑ دیا۔

کملا کا نام سن کر میں چونک پڑا تھا۔ راؤ بہادر کشوری لال کی بہن کملا کو میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا!

پہلا بندوق بردار اب میرا گریبان چھوڑ کر کوٹھری کے دروازے پر پڑے ہوئے بڑے سے تالے کو کھول رہا تھا۔ اس دوران میں دوسرے بندوق بردار نے میری کمر سے اپنی بندوق کی نال لگا دی تھی۔

"کیوں، کملا دیوی آج کیوں نہیں آسکیں گی؟" دوسرے بندوق بردار نے پہلے سے سوال کیا۔

"ان کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ پتا ہی چلا ہے، آگے بھگوان جانے!" پہلے نے جواب دیتے ہوئے مجھے کوٹھری کے اندر دھکا دے دیا۔ میں اس ناشائستہ حرکت کے لیے پہلے سے تیار نہیں تھا اس لیے اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھا اور دھڑام سے گر پڑا۔ یوں بھی میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ گرتے ہوئے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔

"چُپ!" پہلے بندوق بردار نے مجھے زور سے ڈانٹا۔

"اچھا تم اس کا نام پتا پوچھو، میں اپنی جگہ جا کر پہرا دیتا ہوں۔ ممکن ہے، انھیں کسی چیز کی ضرورت ہو اور مجھے بلائیں۔" دوسرا بولا۔

"ہاں تم جاؤ، میں اس کے لیے کافی ہوں۔" پہلے نے جواب دیا۔

دوسرا بندوق بردار کوٹھری سے نکل گیا اور پہلا میری طرف بڑھا۔ میں ابھی تک کوٹھری کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔

"اٹھ کر بیٹھ بے!" پہلا بندوق بردار میرے قریب آ کر غرایا اور اسی کے ساتھ اس نے ایک ٹھوکر میرے شانے پر رسید کر دی۔ میں جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تاکہ وہ دوبارہ "خلوص" کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔

"ج... جی پیارے بھائی! فرمائیے!" میں نے لجاجت کے ساتھ کہا۔

"کون ہے تو؟" اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں سوال کیا۔

"م... میں... میں آدمی ہوں پیارے بھائی!" میں نے خوف زدہ لہجے میں گڑبڑا کر جواب دیا۔

"آدمی کے بچے!" اس نے یہ کہتے ہوئے جھک کر میرے منہ پر ایک گھونسا جڑ دیا۔

میں تو اُدھر بیٹھا ہی تھا، پھر "کم لیٹ" ہو گیا۔ گھونسے نے جیسے میرے جبڑے کو اپنی جگہ سے کھسکا دیا تھا۔ میں نے اپنے

دونوں ہاتھوں سے اس طرح جبڑا پکڑا ہوا تھا جیسے وہ مجھے تنہا چھوڑ کر کہیں ٹہل جائے گا۔ اسی کے ساتھ میں نے کراہنا بھی شروع کر دیا تھا۔

"سالے ڈرامچی! مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے! اب مجھے بتا رہا ہے کہ تو آدمی ہے! میرے پاس آنکھیں نہیں! بول؟" وہ غرّا کر بولا۔

"تم... تم... تم نے تو پوچھا... پوچھا تھا... میں... میں کون ہوں!" میں نے بہ مشکل ہمت کر کے جواب دیا۔

"ابے حرامی! میں نے تیرا نام پوچھا تھا' نام!" اس نے غصّے سے کہا۔

"تو... تو پھر یہ... یہ کہتے نا پیارے بھائی!" میں نے خوشی کا اظہار کیا اور تھوڑی سی ہمت پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ میرا جبڑا اب پھر اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔ صرف نام بتانے سے جان چھوٹ رہی تھی' اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو کیوں اتنی دیر لگاتا! مگر اس ظالم نے کلیر کٹ بات ہی نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر بھڑک اٹھتا' میں بول اٹھا۔

"خادم کو اللہ دتا کہتے ہیں۔"

"تجھے اس خفیہ راستے کا کس سے پتا چلا؟" اس نے دوسرا سوال داغ دیا۔

"کسی سے بھی نہیں پیارے بھائی!" میں نے اظہارِ حقیقت کر دیا۔

"پھر پٹنا چاہتا ہے!" وہ پھنکارا۔

"نن... نہیں!" میں جلدی سے بولا۔

"تو پھر سچ بول دے!"

"میں بالکل سچ بول رہا ہوں پیارے بھائی! مجھ سے چاہے جیسی قسم لے لو۔"

"قسم لے لوں تجھ سے!" وہ ایک قدم مزید آگے آ گیا۔ "کیوں تیری موت ڈنڈ پیل رہی ہے حرامی!"

"دیکھو تم نے ابھی کچھ دیر پہلے بھی مجھے حرامی کہا تھا اور اب پھر کہہ رہے ہو' یہ کوئی ٹھیک بات نہیں ہے پیارے بھائی! میں بُرا بھی مان سکتا ہوں۔" میں نے بُرا مان جانے والے لہجے میں کہا۔ مجھے واقعی یہ لفظ اس کی زبان سے سن کر طرارہ سا آ گیا تھا۔

"حرامی' حرامی' حرامی! دس دفعہ کہوں گا تجھے حرامی! اُلّو کا پٹھا! بُرا مان جائے گا!" وہ دانت پیس کر بولا۔

ایک تو لفظِ حرامی سن کر ہی مجھے غصّہ آنے لگا تھا اور اب اس نے مجھے اُلّو کا پٹھا کہہ دیا تھا' یعنی بر اہِ راست میرے ابا کو گالی دے دی تھی۔ وہ مجھے کوئی گالی دے دیتا تو شاید میرے تن بدن میں اتنی آگ نہ لگتی۔ اُلّو کا پٹھا' یعنی میرے ابا' اُلّو اور میں ان کا پٹھا' گویا بیٹا!

تیری تو ایسی تیسی سالے! تیری یہ مجال کہ میرے ابا کو اُلّو کہے۔ میں نے سوچا اور دانت کچکچا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا' اگر ہوش میں ہوتا تو اس گینڈے پر کیوں پل پڑتا! سارا ڈر اور خوف نہ جانے کہاں ہوا ہو گیا تھا۔

میں یوں خم ٹھوک کر میدان میں کود پڑوں گا' شاید اس نے نہیں سوچا تھا اسی لیے پہلے ہی ہلّے میں زمین چاٹ گیا۔ وہ نیچے اور میں اُوپر! بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گری تھی۔ میں اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں "اُڑا" کر اس سے ٹکرایا تھا اور میرا سر بڑی زور سے اس کے سینے پر پڑا تھا' پھر وہ شرافت کے ساتھ "ڈھیں" ہو گیا تھا۔ میں اس قدر غصّے میں تھا کہ اس کا حال احوال پوچھنے کی بجائے اس کے سینے پر کُدکنے لگا تھا۔

"بول سالے' اب بول! میرے ابا اُلّو کہ تیرے ابا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دباتے ہوئے پوچھا۔ یوں لگا جیسے وہ جواب میں آنکھیں نکال رہا ہو۔ "ابے آنکھیں نکال کر ڈرا رہا ہے مجھے!" میں نے اور زور سے اس کی گردن دبائی۔ مجھے غصّہ آ رہا تھا کہ گردن دبانے کے باوجود بھی وہ مجھے آنکھیں نکال رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ!" اچانک کوٹھری میں ایک جانی پہچانی اور کڑک دار آواز گونجی۔

"ابے باپ رے!" میرے مُنہ سے نکلا اور میرے ہاتھ کی گرفت اس شخص کی گردن پر ڈھیلی پڑ گئی جسے میں نے پچھاڑ رکھا تھا۔

میں نے اسی وقت مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک دراز قد شخص کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔ اسی کے قریب وہ دوسرا بندوق بردار کھڑا تھا جو کچھ دیر پہلے وہاں سے گیا تھا۔

"دیگ صاحب... ارے وہ... وہ ہینڈ بیگ... نن نہیں صفدر بیگ صص... صاب!" میں وہاں صفدر علی بیگ کو دیکھ کر اس قدر گھبرا گیا کہ اس کا اصل نام لینے کی بجائے اسے کبھی دیگ اور کبھی ہینڈ بیگ کہنے لگا۔

"ہوں!" صفدر علی بیگ نے ہنکارا بھر کر اتنی زور سے دانت بھینچے کہ اس کا اچھا بھلا چہرہ بگڑ گیا۔ "تو یہ تُو ہے! اس زہر کی پڑیا کا ساتھی جو مجھے جُل دے کر نکل گئی!"

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ لیوسی کی طرف تھا۔

"تُو اس روز بچ گیا ورنہ اُلٹا دیتا اپنی کار سے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "مگر اب... اب تُو یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

"کک... کیوں مائی ڈیئر سر!... مم... میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے!" میں نے نہ جانے کب اپنے شکار کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیے تھے مگر وہ بدستور اسی طرح لیٹا ہوا تھا۔ شاید وہ اچھل کود سے تھک گیا تھا اور اب موقع غنیمت جان کر ریسٹ کر رہا تھا۔

"سروپ کمار شاید بے ہوش ہو گیا ہے جناب!" دوسرا بندوق والا' صفدر علی بیگ کے کچھ جواب دینے سے پہلے بول اٹھا۔ اس نے صفدر علی بیگ ہی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

"ہاں' یہی معلوم ہوتا ہے۔" صفدر علی بیگ نے تائید کی' پھر میری طرف دیکھ کر غرّایا۔ "کھڑا ہو جا!"

"ابھی ہوا سر!" میں نے فرماں برداری کا اظہار کیا۔ "آپ کا حکم بھلا میں کیسے ٹال سکتا ہوں!" یہ کہتے ہوئے میں واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔

کوٹھری آدھی نیم تاریک اور آدھی روشن تھی۔ کوٹھری کے دروازے پر لگی ہوئی مشعل کی روشنی اسے پوری طرح روشن کرنے میں ناکام تھی۔ میں اور میرے دشمن' کوٹھری کے روشن حصّے میں تھے اس لیے ان کی ایک ایک حرکت مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے کھڑے ہونے کے بعد صفدر علی بیگ چوکنا نظر آنے لگا تھا۔

صفدر علی بیگ نے دوسرے بندوق والے کو حکم دیا۔ "جا کر پانی لاؤ اور اس کے مُنہ پر چھینٹے دو' یہ ہوش میں آ جائے گا۔" وہ حکم تو اسے دے رہا تھا مگر اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی۔

دوسرا بندوق والا کوٹھری سے نکل کر چلا گیا۔ اب مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے آخر کس طرح پہلے بندوق والے کو بے ہوش ہونے پر مجبور کر دیا! کہاں وہ گینڈا اور کہاں میں! کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔

اب خیر نہیں بیٹا اللہ دتا! میرے دل نے مجھے دھونسایا۔ ہوش میں آنے کے بعد بندوق والا تیری چٹنی بنا دے گا۔ میں سوچنے لگا کہ پیاری غار والی نے ادھر نہ آنے کا مشورہ غلط نہیں دیا تھا مگر بدبخت لیوسی نے چڑیل بن کر مجھے راستے سے بھٹکا دیا اور خود "آلوپ" ہو گئی۔ ہائے اب کیا ہو گا؟ میں تو مارا گیا بے موت!

"تیری موت ہی تجھے یہاں تک لے کر آئی ہے۔" اچانک صفدر علی بیگ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ "مگر تیری موت آسان ہرگز نہیں ہو گی۔"

"یعنی... یعنی بہت مشکل موت ہو گی؟" میں نے بات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ پھر پھیکی سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آ گئی اور میں بولا۔ "نن... نہیں سر! ... آپ یوں... یونہی مذاق کر رہے ہیں۔"

"یہ تو تجھے خود پتا چل جائے گا! ذرا چھری کے نیچے دَم لے لے!" صفدر علی بیگ نے مجھے ڈرایا۔

"کک... کیا چھری... چھری سے کاٹیں گے میرا گلا... نہیں... نہیں آپ... آپ..." میں ہکلا کر رہ گیا۔

اسی وقت دوسرا بندوق والا' ہاتھ میں ایک جگ لیے کوٹھری میں داخل ہوا مگر صفدر علی بیگ اس کی طرف متوجّہ نہ ہوا۔ وہ مجھ پر ہی نظر گاڑے رہا۔ دوسرے بندوق والے نے جھک کر اپنے ساتھی کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ بندوق اس نے کاندھے پر لٹکا لی تھی۔ میں اس کی حرکات و سکنات کو بہ غور دیکھنے لگا۔ زمین پر بے سُدھ پڑے ہوئے شخص کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ دوسرا بندوق والا گھٹنوں کے بَل زمین پر بیٹھ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے مُنہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی۔

"کیا ہوا؟" صفدر علی بیگ نے پوچھا۔

"یہ... یہ... سروپ کمار تو مر گیا جناب!" دوسرا بندوق والا اپنے ساتھی کے سینے پر ہاتھ رکھتا ہوا' بھرّائی بھرّائی سی آواز میں بولا۔

"م... مر... مر گیا... اماں مجھے پھنسوانے کے لیے کیوں جھوٹ بول رہے ہو!" میں بے اختیار بول اٹھا۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ میرے ہاتھوں کسی کا قتل ہو جاتا۔ یقیناً وہ حرامی "مکر" بنا کر لیٹ گیا ہو گا۔

"مر گیا مگر کیسے؟" صفدر علی بیگ بھی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"پتا نہیں جناب!" دوسرے بندوق والے نے جواب دیا۔ "ویسے جب ہم یہاں داخل ہوئے تھے تو... تو یہ سروپ کمار کے سینے پر چڑھا ہوا اس کا گلا دبا رہا تھا۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن... لیکن سروپ کمار اتنا کم زور تو نہیں تھا کہ اس چھپکلی سے اپنی گردن نہ چھڑا پاتا۔" صفدر علی بیگ کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔ "ممکن ہے اس کی موت کا سبب کچھ اور ہوا۔" یہ کہہ کر صفدر علی بیگ نے مجھے مخاطب کیا۔ "لڑائی کیسے شروع ہوئی تھی؟ کیا تُو نے اچانک حملہ کر دیا تھا؟ جواب دے ورنہ ابھی تجھے بھی اس کے ساتھ ہی لمبا لمبا لٹا دوں گا۔"

کہتے ہوئے صفدر علی بیگ نے اپنے ریوالور کو حرکت دی اور میں کانپ کر رہ گیا۔

"سر!... سر! اس نے میرے ابا کو گالی دی تھی، اُلّو کہا تھا اُنھیں! اور... اور اس سے پہلے حرامی بھی کہا تھا مجھے! اب... اب آپ ہی بتائیں سر!... آپ ہی فیصلہ کر دیں کہ کوئی شریف آدمی اپنے ابا جان کی شان میں ایسی نازیبا بات سن سکتا ہے؟" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تُو نے کیا کیا جو یہ مر گیا؟" صفدر علی بیگ سخت لہجے میں بولا۔

"سر! پہلے یہ... یہ تو دیکھ لیں کہ سچ مچ مر گیا ہے یا ایسے ہی جھوٹ موٹ مجھے تنگ کرنے کے لیے زمین پر لیٹا ہوا ہے!" میں بولا۔ میرا لہجہ التجا آمیز تھا۔

"بکواس مت کر! میں تجھ سے جو پوچھ رہا ہوں، اُس کا جواب دے!"

"سر! مجھے یہ تو... معلوم نہیں کہ... کہ یہ کس طرح مر گیا! مجھے تو بس غصہ آگیا تھا۔ آخر سر!... کبھی کبھی کوئی بات بُری بھی تو لگ جاتی ہے... قسم لے لیں، چاہے جیسی سر!... میں نے یہ سوچ کر اس کے سینے پر اپنے سر کی ٹکر نہیں ماری تھی کہ سچ مچ مر جائے گا۔ مجھے تو بس غصہ ہی آگیا تھا اور آپ جانیں سر!... اسی لیے تو بزرگوں نے کہا ہے کہ غصہ حرام ہے لیکن اس وقت... اس وقت سر!... میں اتنا غصے میں آگیا تھا کہ تمام اقوالِ زرّیں بھول گیا تھا کہ... آپ مجھے معاف کر دیں سر جی!" میں گھگھیایا۔

میری بات سن کر صفدر علی بیگ نے طویل سانس لیا، پھر بولا "تو یہ ہوا!" یہ کہہ کر اس نے دوسرے بندوق والے کو مخاطب کیا "رحیم! تم سروپ کمار کی لاش یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ! اور سنو، اس کی بندوق بھی ادھر پڑی ہے، وہ بھی اٹھا لو۔ لوگ وہاں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میٹنگ شروع ہونے میں ویسے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اسے میٹنگ کے بعد اچھی طرح سمجھیں گے۔"

دوسرے بندوق والے یعنی رحیم نے صفدر علی بیگ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت تک صفدر علی بیگ مجھ پر ریوالور تانے کھڑا رہا۔ پھر رحیم اور وہ مجھے کوٹھری میں بند کر کے وہاں سے چلے گئے۔

لو بیٹا اللہ دتا! لگ گیا نا آخر اینڈ! وہ دونوں چلے گئے تو میرے دل میں ہَول اُٹھنے لگے۔ پیٹ میں گڑ گڑ ہونے لگی۔ اس وقت میری حالت بالکل اس مجرم کی سی تھی جسے کچھ دیر بعد پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہو۔ خوف کے سبب میرا حلق خشک ہونے لگا تھا اور سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ دونوں پانی کا جگ وہیں بھول گئے تھے۔ میں نے کچھ دیر ہی میں سارا جگ خالی کر دیا مگر پیاس تھی کہ بجھ ہی نہیں رہی تھی۔ میں یہ سوچ سوچ کر سخت حیران ہو رہا تھا کہ میں نے کس طرح اس گینڈے کو قتل کر دیا! زندگی میں پہلی بار میرے ہاتھوں ایک عدد قتل ہوا تھا اور میں اس بات سے بے خبر تھا کہ اپنی جان بچاتے ہوئے اگر دوسرے کو دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹوا دیا جائے تو آدمی پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھتا۔ میں تو اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح وہاں سے زندہ بچ کر نکل بھی گیا تو سروپ کمار کو قتل کرنے کے جرم میں مجھے سزائے موت ہو جائے گی۔ ہائے اللہ دتا! کم بخت، یہ تُو نے کیا کر دیا؟ ہائے ہائے اب کیا ہوگا؟ یہ سوچ سوچ کر میرا دل کبھی بیٹھنے اور کبھی لیٹنے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر میرا دل یونہی بیٹھتا اور لیٹتا رہا۔ میں چونکا اس وقت جب میری سماعت سے متعدد قدموں کی چاپ ٹکرائی اور اسی کے ساتھ ساتھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آئیں جو قریب آتی جا رہی تھیں۔

پھر میں نے وہاں بہت سے اجنبی اور شناسا چہرے دیکھے اور حیرت زدہ رہ گیا۔ ان لوگوں میں سیٹھ وشوا ناتھ بھی تھا اور اس کی حسین و جمیل حور شمائل خطرناک بیٹی سروج بھی تھی۔ مجھے بھگوان داس کا قاتل رنجیت بھی نظر آیا اور اس کی ساتھی بندیا بھی! صفدر علی بیگ کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ان لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی نظر آئے جنھیں میں نے جیت گڑھ کے پہاڑی غار میں رنجیت کے ساتھ دیکھا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر لوگ تھے جو چلے آ رہے تھے۔

جس وقت سیٹھ وشوا ناتھ اور سروج، صفدر علی بیگ کے ہمراہ کوٹھری کے دروازے پر رکے تو وہ دونوں ہی چونک پڑے۔

"سیٹھ جی! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" صفدر علی بیگ نے سیٹھ وشوا ناتھ کو چونکتے دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"اسے کون نہیں جانتا! کیا اسی کو پکڑا ہے جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا؟" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا۔

"ہاں!" صفدر علی بیگ نے جواب دیا۔

"یہ سی آئی ڈی انسپکٹر اللہ دتا ہے۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے انکشاف کیا، پھر تائید کی خاطر سروج کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیوں سروج، تم بھی تو اسے اچھی طرح جانتی ہو؟"

"ہاں پتا جی! یہ وہی ہے مگر یہ یہاں کس طرح آ پہنچا؟" سروج بولی۔

"یہ سب قبول دے گا۔ رنجیت اور بندیا اس کے لیے کافی ہیں۔" صفدر علی بیگ نے کہا "مگر آپ نے اسے پہچانا! مجھے خود شک تھا کہ یہ لوگ سی آئی ڈی والے ہی ہو سکتے ہیں۔"

"کون لوگ؟" سیٹھ وشوا ناتھ نے وضاحت چاہی۔

"اس کی ایک ساتھی اور ہے۔ یہ دونوں میرے دفتر میں ملازم ہو گئے تھے۔ اب میں سمجھ گیا کہ یہ سب کیا چکر تھا۔" صفدر علی بیگ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔

"آپ بتا رہے تھے کہ اس نے سروپ کمار کو بھی قتل کر دیا ہے؟" سروج بولی۔

"ہاں!" صفدر علی بیگ نے بتایا "اس کی موت غالباً دل کی حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب واقع ہوئی ہے۔ میں نے اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔"

"پھر تو اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے!" سروج نے سفاک لہجے میں کہا "اس نے ہمارے ایک ساتھی کو قتل کر دیا ہے اور ہمیں بہرحال اس کا بدلہ لینا چاہیے۔"

"دھیرج بیٹی، دھیرج!" سیٹھ وشوا ناتھ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اسے اس وقت تک ضرور زندہ رکھنا پڑے گا جب تک کہ یہ سب کچھ اُگل نہ دے۔ اس سے ہمیں بڑی کام کی باتیں معلوم ہوں گی۔ کیوں صفدر علی بیگ؟" سیٹھ وشوا ناتھ نے صفدر علی بیگ سے تائید چاہی۔

"آپ کا خیال بالکل درست ہے سیٹھ جی!" صفدر علی بیگ نے اتفاق کیا۔ "ہمیں کم از کم اس سے یہ پتا چل جائے گا کہ ہمارے بارے میں حکومت کیا کیا باتیں جانتی ہے اور یہ کہ ہمارے خلاف کیا قدم اٹھایا جانے والا ہے۔ اس طرح ہم اپنے دفاع کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس سی آئی ڈی انسپکٹر کا یہاں تک پہنچ جانا معمولی بات نہیں ہے۔ میں سخت خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔"

کوٹھری کے آگے ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں چڑیا گھر کا کوئی جانور ہوں جسے دیکھنے کے لیے تماشائی جمع ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کی باتیں سن سن کر میں اندر ہی اندر دہل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کم بخت مجھ پر کیا کیا ظلم و ستم توڑنے والے تھے! میں کوٹھری کے فرش پر سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے میں کسی صدمے میں ہوں مگر یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

"ویسے یہاں کون کون رہے گا؟" سیٹھ وشوا ناتھ بولا۔

"میرے خیال میں اب یہاں زیادہ افراد کا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" صفدر علی بیگ نے جواب دیا "صرف رنجیت اور بندیا کافی ہیں۔ یوں بھی اُنھیں پولیس کی نظر سے بچنا ہے۔ سو یہی دونوں اس سے سب کچھ اُگلوا لیں گے۔ آج میں پہلی بار ان دونوں سے ملا ہوں اور میری رائے ان دونوں ہی کے بارے میں بہت اچھی ہے۔ وہ دونوں انتہائی چالاک اور بہادر ہیں۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے اتفاق کیا، پھر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ایک پستہ قد موٹے سے کہا۔ "آپ کا کیا وچار ہے ڈیسائی جی؟" "جو پنچوں کی رائے سو اپنی!" موٹے نے کہا جسے سیٹھ وشوا ناتھ نے ڈیسائی کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ "ویسے شنکر اور ہردیال بھی یہاں رہ جاتے تو زیادہ اچھا تھا۔ میں یہ بات اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ شخص خطرناک ہے۔ اس نے سروپ کمار جیسے بلوان (طاقت ور) کو قتل کر دیا ہے۔"

پھر کچھ دیر گفتگو کے بعد ڈیسائی کی بات مان لی گئی۔ وہاں اب رنجیت، بندیا، شنکر اور ہردیال کو رہنا تھا تاکہ وہ اچھی طرح میری مینگ نکال سکیں۔ ان تمام افراد کو اسی وقت اس فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ رنجیت اور بندیا مجھے نظر آ رہے تھے مگر شنکر اور ہردیال کہیں پیچھے کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ یہ وہی پوری ٹیم تھی جس نے جیت گڑھ کے پہاڑی غار میں میرے کریا کرم کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔

جاتے جاتے صفدر علی بیگ نے رنجیت سے سرگوشی کی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ رنجیت سے کہہ رہا تھا "جب یہ سب کچھ بتا دے تو اسے ختم کر دینا!" رنجیت نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سب باری باری وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ یہ رخصتی کا منظر بھی میرے لیے خاصا حیران کن تھا۔ سب سے پہلے سیٹھ وشوا ناتھ، سروج، صفدر علی بیگ، ڈیسائی اور ایک اجنبی شخص، اس طرف بڑھے تھے جہاں بہ ظاہر سپاٹ دیوار نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک دروازہ نمودار ہو کر غائب ہو گیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ ڈیسائی نے دیوار کے ایک پتھر پر دباؤ ڈالا۔ وہ پتھر رنگ میں، دیوار پر لگے ہوئے پتھروں سے کسی قدر مختلف تھا۔ چند لمحے بعد ہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور پھر دیوار کا ایک حصہ کھسک کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اب وہاں خلا نظر آ رہا تھا۔ تمام افراد اس خلا میں داخل ہو گئے اور اسی کے ساتھ دیوار بھی برابر ہو گئی۔

کچھ دیر بعد ہی چند افراد پھر اسی دیوار کی طرف بڑھے اور انھوں نے بھی وہی عمل دہرایا۔ وہ بھی خلا میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔ لوگ غائب ہوتے رہے اور میں انھیں حیرت سے دیکھتا

رہا۔ وہ سب اسی کنویں میں چلے جاتے تھے جس میں گر کر میں وہاں پہنچا تھا۔ ہر بار کنواں خالی ہوتا تھا اور اس میں دوسرے لوگ گھس جاتے تھے۔

تو یہ لوگ اسی چلتے پھرتے کنویں کے ذریعے آتے جاتے ہیں! میں نے سوچا اور غلط نہیں سوچا۔

سب چلے گئے اور وہاں صرف چار افراد رہ گئے' چار ریت کے ہرکارے! رنجیت' پندیا' شنکر اور ہردیال' ان سب کو وہاں اس لیے چھوڑا گیا تھا کہ مجھ سے سب کچھ اُگلوانے کے بعد مجھے "جنت رسید" کر دیں' جہنم رسید اس لیے نہیں کہ میں بہرحال بے گناہ مارا جانے والا تھا۔

"شنکر! یہ لو چابی' ذرا کھولو تو اسے!" رنجیت نے اپنی جیب سے چابی نکال کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کوٹھری کے تالے کی چابی غالباً اسے پہلے ہی دے دی گئی تھی۔

شنکر نے چابی لے لی اور کوٹھری کا تالا کھولنے لگا۔

"بہت دن بعد ملاقات ہو رہی ہے' ذرا تفصیل تعارف ہو جائے گا۔" شنکر تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم!" ہردیال بھی بولا۔ "اس رات تو یہ غار سے اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ!"

"ہاں مجھے بھی سخت حیرت ہے رنجیت کہ یہ ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود وہاں سے فرار کیسے ہو گیا!" پندیا نے رنجیت سے کہا۔

"ابھی سارا سبق خود فرفر سنا دے گا۔" رنجیت نے جواب دیا۔

"شاید اسے پتا نہیں کہ رنجیت چیز کیا ہے!"

اس دوران میں شنکر کوٹھری کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"آجا میری جان باہر!" شنکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

ہائے ظالمو! یوں تو مذاق نہ اُڑاؤ۔ یہ تو سوچو کہ گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہوں۔ میں نے سوچا مگر زبان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں اس لیے خاموشی کے ساتھ کوٹھری سے باہر آ گیا کہ اسی میں خیریت تھی۔

"ادھر آؤ قریب!" رنجیت نے حکم دیا۔

میں بوجھل قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ میرے پیروں میں ایک ٹانگ الجھ گئی۔ میں منہ کے بل زمین پر گرنے لگا۔

"زندہ باد پندیا! کیا خوب صورت ٹنگڑی ماری ہے۔" رنجیت نے اپنی "ٹھکو" کو داد دی اور "ٹھکو" زور سے ہنس پڑی۔

میں زمین پر پڑا ہوا' رنجیت کی "ٹھکو" یعنی پندیا کو دل ہی دل میں کوسنے لگا۔ خدا اس کی قبر میں بچھو دوڑا دے۔ یہ بد دعا

دیتے ہوئے معاً مجھے خیال آیا کہ وہ کم بخت قبر میں نہیں جائے گی۔ وہ تو ہندو ہے اور اسے جلایا جائے گا۔ میں نے اپنی بد دعا میں فوراً ترمیم کر لی۔ خدا کرے جب اس کی چتا کے شعلے بلند ہوں تو یہ زندہ ہو جائے پھر یہ چیختی چلاتی رہے مگر کوئی اسے شعلوں سے نکالے نہیں۔ یہ بد دعا مجھے کچھ غنیمت معلوم ہوئی۔

"اب اٹھ کر بیٹھ جائیں شریمان جی! بہت دیر زمین چاٹ لی!" رنجیت نے آگے بڑھ کر میرے سر میں ٹھوکر ماری۔

"ہائے!" میں چیخ پڑا اور فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ یقیناً گومڑا پڑ گیا تھا جہاں اس ظالم نے ٹھوکر ماری تھی۔ میں ایک ہاتھ سے سر سہلانے لگا۔

"پیارے! اگر اتنی ذرا سی چوٹ پر سر سہلاؤ گے تو کام چلے گا!" رنجیت نے بہ ظاہر ہمدردانہ لہجے میں کہا مگر لہجے کے اس پردے میں جو دھمکی تھی' وہ مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ابھی تو تمھارے سارے جسم پر پھول کھلانے ہیں۔ سرخ سرخ پھول!"

"رنجیت! ذرا میری بات سنو۔" پندیا نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ رنجیت اس کے قریب چلا گیا۔ اس زہر کی پڑیا نے رنجیت سے نہ جانے کیا کہا' میں نہ سن سکا کیوں کہ آواز مدھم تھی۔ میرے پلے صرف ایک لفظ پڑا "بچھو!" مگر میں سمجھ نہ سکا کہ آخر اس بات سے بچھو کا کیا تعلق ہے۔

رنجیت سر ہلا کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ تو پھر جاؤ لے آؤ!"

پندیا سر ہلا کر دائیں جانب چلی گئی۔

پندیا کے جاتے ہی رنجیت مجھ سے مخاطب ہوا۔ "استاد! تو تم سی آئی ڈی انسپکٹر ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ' وہ کیا ٹرک تھی کہ تم ہاتھ پیر بندھے ہونے کے باوجود اس غار سے فرار ہو گئے؟"

میں خاموش رہا۔ بھلا میں اس کے سامنے غار والی کا ذکر کر سکتا تھا۔ اس بے چاری نے تو میری جان بچائی تھی اور میں اس کا بھانڈا پھوڑ دیتا۔ "نہیں' ہرگز نہیں!" میں جوش جذبات میں آ کر زور سے بولا۔

"ہوں!" رنجیت معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرتا ہوا قریب آ گیا۔ "تو تم نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا!"

"میں نے تم سے یہ کب کہا' پیارے بھائی!" بالآخر میں ہکلا اٹھا۔

"پھر اس نہیں اور ہرگز نہیں' کا کیا مطلب تھا؟" وہ غراتا ہوا بولا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!" میں نے جواب دیا۔

...ستاد! تم مجھے نہیں چلا سکتے' سمجھے!" رنجیت مسکرا کر ...روز غار میں جب تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو ...کھا گیا تھا مگر آج دھوکا نہیں کھا سکتا۔ وہ پہلی ملاقات ...میں تمھیں سمجھ نہیں سکا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ تم واقعی بزدل ...میری رائے بدل چکی ہے' میں فریب میں نہیں آؤں گا۔"

...وقت دائیں جانب سے قدموں کی چاپ گونجی۔ پندیا ...ٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک ...یا دیکھی اور ایک چمٹی بھی۔

...ئیں؟" رنجیت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

..." پندیا نے جواب دیا۔ "مگر ذرا تمھیں محتاط رہنا پڑے ...بہت زہریلا ہے۔"

...دامت کرو۔" رنجیت نے جواب دیا۔

...کے قریب آ کر چمٹی اور وہ ڈبیا' رنجیت کو تھما دی۔ رنجیت ...زمین پر رکھ دی اور اپنے دونوں ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ...اسے پکڑ لو پیچھے سے اس کی کھوپڑی پھر لو تاکہ نہ یہ بھاگ ...بل سکے۔"

...نے' ارے! کیا... کیا کر رہے ہو تم لوگ! یہ... یہ بڑی ...ہے۔" میں جلدی سے بولا میں کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اتنا ...جانتا کہ جو کچھ بھی ہونے والا ہے' وہ میرے حق میں ہے ...

...دال خانہ بند رکھو بے!" شنکر نے مجھے ڈانٹا اور پھر اپنے ...ل کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا۔ ...یال لپک کر میرے پیچھے آ گیا اور پھر اس نے میری دونوں ...پے گھسیٹ کر اپنے بازوؤں میں جکڑ لیں۔

...کھڑا ہو جا!" شنکر نے مجھے حکم دیا۔

...!" ہردیال نے بھی میری کلائیوں پر زور ڈالتے ہوئے غرا کر کہا۔ ...یوں لگا جیسے میری کلائیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میں کراہ اٹھا اور ...را ہو گیا۔ ہردیال بھی میرے ساتھ ساتھ ہی اٹھا تھا اور اس نے ...ں نہیں چھوڑی تھیں۔

...ت میری نگاہ اس ڈبیا پر پڑی جس کا ڈھکنا رنجیت کھول ...اب چمٹی سے ڈبیا کو ٹھوکا دے رہا تھا۔ میں نے اس ڈبیا ...ایک بچھو دیکھا اور میری روح فنا ہو گئی۔ بچھو اپنے ڈنک پھیلا ...ڈبیا سے باہر آ گیا۔ پھر وہ زمین پر رینگنے لگا۔ میں ابھی ...سمجھ پایا تھا کہ وہ لوگ کیا کرنے والے ہیں۔ اگر مجھے ذرا سا ...ہو جاتا کہ ان کے کیا ارادے ہیں تو شاید پہلے ہی سے چیخنے لگتا ...یال نے مجھے پوری طرح جکڑ رکھا تھا اور شنکر بھی لپک کر پیچھے ...تھا' شاید اس لیے کہ میں زیادہ اُچھل کود مچاؤں تو وہ بھی

اپنے ساتھی کی مدد کر سکے۔ میرے سامنے رنجیت اور پندیا تھے۔ پندیا کے چہرے سے اس وقت ایسا اظہار ہو رہا تھا جیسے وہ کسی مداری کا تماشا دیکھ رہی ہو۔ اس کی نگاہ بھی رنجیت اور بچھو پر جمی ہوئی تھی۔

بچھو کچھ دیر تک زمین پر رینگتا' پھر رنجیت نے اسے چمٹی میں پکڑ کر اٹھا لیا۔ اسی کے ساتھ اس کے منہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔

"اب دیکھوں گا استاد کہ تم میں کتنا دم خم ہے!" چند لمحے بعد رنجیت نے کہا اور بچھو کو ہلاتا ہوا میری طرف بڑھا۔

اب سب کچھ میری سمجھ میں آ چکا تھا اسی لیے میں نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

رنجیت بچھو پکڑے ہوئے میرے قریب آ کر رک گیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ اس بچھو کے ڈنک تمھارے چہرے پر نہ گریں تو جو کچھ میں پوچھوں' اس کے صحیح صحیح جواب دو۔"

میں چیختے چیختے رک گیا۔ میری نگاہ بچھو پر گڑی ہوئی تھی جو اپنے ڈنک لہرا رہا تھا۔ رنجیت اس بچھو کو رفتہ رفتہ میرے چہرے کے قریب لا رہا تھا۔

"اسے... اسے دور... دور ہٹا لو... میں اللہ کی قسم سب کچھ بتا دوں گا... سچ سچ... بالکل سچ!" میں گھگھیایا۔

"جھوٹ تو نہیں بول رہے استاد؟" رنجیت نے مجھے گھور کر کہا۔

"نن... نہیں... میں نے اللہ کی قسم کھائی ہے... قسم کھا کر کوئی... کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے اسے یقین دلانے کی خاطر کہا۔

"بکواس مت کرو! یہ کوئی دلیل نہیں۔ میں دس بار بھگوان کی قسم کھا کر بھی جھوٹ بول سکتا ہوں۔" رنجیت نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"پھر... پھر میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں پیارے بھائی!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے مزید کہا۔ "اگر تم کہو تو میں اپنی پیاری امی جان کی قسم بھی کھانے کو تیار ہوں پیارے بھائی!"

جواب میں رنجیت کچھ دیر تک مجھے گھور کر دیکھتا رہا' پھر بولا۔ "کیا تمھارے محکمے میں اداکاری بھی سکھائی جاتی ہے؟" اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

"نن... نہیں تو پیارے بھائی!" میں نے رُندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔

"پھر تم اداکاری کیوں کر رہے ہو؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم اتنے خوف زدہ نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو!"

اے پاک پروردگار! تو ہی بتا کہ میں اس حرامی کو کس طرح یقین دلاؤں کہ مارے دہشت کے میرا خون خشک ہوا جا رہا ہے! میں نے دل ہی دل میں کہا اور بولا۔ "اے پیارے بھائی! یقین کرو' خدا کے لیے

اپنے بھگوان کی خاطر میری بات پر یقین کرو کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا اور تمہارے ہر سوال کا جواب سچ سچ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر رنجیت ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور میری جان میں جان آئی۔ وہ پھر بولا "بچھو کو میں فی الحال ڈبیا میں بند کیے دے رہا ہوں مگر یہ ڈبیا اس وقت تک یہیں رہے گی جب تک تم سب کچھ نہیں بتا دو گے۔ یہ یاد رکھنا کہ بچھو کو دوبارہ بھی ڈبیا سے نکالا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد بڑی احتیاط کے ساتھ رنجیت نے اس خطرناک بچھو کو ڈبیا میں بند کر دیا اور لوہے کی چھوٹی ڈبیا پر رکھ دی۔

"اسے چھوڑ دوں کہ پکڑے رہوں؟" ہردیال نے رنجیت سے پوچھا۔

"ابھی پکڑے رہو۔" رنجیت نے جواب دیا۔ "کیا خبر دوبارہ ضرورت پڑ جائے بچھو نکالنے کی!"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی پیارے بھائی!" میں نے رنجیت کو یقین دلایا۔

"خاموش رہو!" رنجیت نے مجھے ڈانٹ دیا۔

اسی وقت میرے ذہن میں وہ خوف ناک خیال آیا جس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ مجھے وہ سرگوشی یاد آ گئی تھی جو صفدر علی بیگ نے چلتے ہوئے کی تھی۔ "جب یہ سب کچھ بتا دے تو اسے ختم کر دینا۔" ہائے ہائے، یہ تو بہت برا ہوا۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ وہ ظالم بچھو دو ایک ہلکے ہلکے ڈنک مار لیتا۔ کم از کم جان تو بچی رہتی۔ وہ سرگوشی یاد آ جانے کے باوجود بھی میں نے سوچا کہ شاید رنجیت کو مجھ پر رحم آ جائے اور مجھ سے سب کچھ پوچھ پاچھ کر وہ مجھے ہلاک نہ کرے۔ ممکن ہے وہ میری سچائی سے متاثر ہو کر مجھے زندہ چھوڑ دے اور گھر جانے کی اجازت دے دے مگر میں پہلے اس سے وعدہ تو لے ہی لوں تاکہ وہ بعد میں اپنے وعدے کا پاس کرے۔ یہ سوچ کر میں نے رنجیت کو مخاطب کیا جو میری ہی طرف بڑھ رہا تھا۔ "اے پیارے بھائی! اگر میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو کیا تم مجھے گھر جانے دو گے؟"

"اچھا تو بچھو کو ڈبیا میں بند کرتے ہی تو پھر پر پرزے نکالنے لگا! شرائط رکھنے لگا میرے سامنے!" رنجیت نے میرے قریب آ کر میرے پھول جیسے رخسار پر الٹا ہاتھ جڑ دیا۔

میں سسک پڑا اور روتے ہوئے بولا۔ "مم... میں نے تو بس... بس اتنی سی... اتنی سی بات پوچھی تھی... میں نے کوئی شرط کب رکھی تھی!"

"اچھا یہ باتیں تو بعد میں طے ہوتی رہیں گی، پہلے تم رنجیت کی باتوں کا جواب دو۔" بندیا نے مداخلت کی۔

"پوچھو!" میں یہ کہتے ہوئے رو دیا اور آنسو میرے دونوں رخساروں پر بہنے لگے۔ زندگی میں اس سے پہلے مجھ پر ایسا برا وقت کبھی نہیں پڑا تھا۔

"پہلی بات تو یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟" رنجیت نے پہلا سوال کیا۔ بندیا بھی اب اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس کنویں کے ذریعے... جس... جس کے ذریعے تم لوگ آتے جاتے ہو۔" میں نے اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے مگر میں کچھ اور پوچھ رہا ہوں۔" رنجیت دانت پیستا ہوا بولا۔

"تو پھر پوچھو نا!" میں نے ٹھنک کر کہا۔

"تم یہاں کس طرح پہنچ گئے؟ میری مراد کوٹلہ فیروز شاہ ہے۔" رنجیت اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا جس کا اظہار اس کے لہجے سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔

"میں کوٹلے کس طرح پہنچا، یہی پوچھا ہے نا تم نے پیارے بھائی؟" میں نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"ابے ہاں! ہاں!" اس بار رنجیت چیخ پڑا۔

میں نے سہم کر جواب دیا۔ "پیارے... پیارے بھائی! میں پھٹ پھٹ پر بیٹھ کر یہاں پہنچا تھا۔"

تڑاخ! رنجیت کا ہاتھ پھر گھوم گیا اور میری آنکھوں میں بار ستارے ناچ گئے۔

"میں نے تجھ سے یہ پوچھا تھا؟ بول؟" اس نے غرا کر [illegible] نکالیں۔

"مم... میں نے... میں نے اس لیے تو دوبارہ پوچھ لیا تھا کہ کہیں میرا جواب غلط نہ ہو جائے... مگر... مگر..." میں [illegible] کے مارے اپنی بات پوری نہ کر سکا کیوں کہ رنجیت کے تیور [illegible] بہت خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے گھورے چلا جا رہا تھا جیسے بس کچا ہی چبا جائے گا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر بندیا کی آواز نے اس سکوت کو [illegible] وہ مجھ سے بولی۔ "رنجیت تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ تمہیں [illegible] اس ٹھکانے کے بارے میں کس سے پتا چلا؟ اب سمجھے تم؟"

"بالکل بالکل سمجھ گیا۔" میں جلدی سے بولا۔ "اگر... اگر یہ سوال پہلے کیا جاتا تو... تو میں فوراً اس کا جواب دے دیتا۔"

"خیر اب جواب دو!" بندیا کے لہجے میں نرمی تھی۔

بندیا کے لہجے کی نرمی سے متاثر ہو کر میں نے اس سے کہا۔ "پیاری بندیا! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ رنجیت صاحب کے بجائے تم مجھ سے سوال کرو؟"

اس سے پہلے کہ بندیا کوئی جواب دیتی، رنجیت نے میرے گال پر تھپڑ مارا اور غرایا۔ "سالے! سر پر موت ناچ رہی ہے، حرامی پن سے باز نہیں آ رہا! کیسی جستجو چل رہی ہے، پیاری!" اس نے میرے لہجے کی نقل اتاری۔ لفظ "پیاری" نے اسے جانے کس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ چند لمحے توقف [illegible]

[illegible] سخت لہجے میں بولا۔ "تجھ سے سوال میں ہی کروں گا، پیاری بندیا نہیں، سمجھ گیا!"

"بالکل سمجھ گیا پیارے بھائی!" میں نے جلدی سے کہا تاکہ وہ پھر میرے رخساروں پر اپنی انگلیوں کے نشان نہ بنا دے۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے جس بے رحمی سے چانٹے جڑے تھے ان سے میرے رخساروں پر آڑی ترچھی لکیریں ضرور بن گئی ہوں گی۔ اس بات کا اندازہ میں نے اپنے دونوں رخساروں پر ہونے والی جلن سے لگایا تھا۔

"تو پھر جواب دے سوال کا!" رنجیت پھنکارا۔

"کوئی... کوئی سوال تو کرو پیارے بھائی! اسی وقت میں جواب..."

"تو حرامی پن نہیں چھوڑے گا!" رنجیت میری بات کاٹ کر دہاڑا۔ "کیا تو نے بندیا کا سوال نہیں سنا؟"

"سنا تھا مگر... مگر تمہی نے تو ابھی کہا تھا کہ... کہ مجھ سے سوال تم کرو گے۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"سالے نے مغز چاٹ لیا!" رنجیت زمین پر تھوک کر بولا۔

"رنجیت! ایسا کرو کہ اس سے مجھے ہی سوالات کرنے دو۔" بندیا پھر بولی۔ "تمہیں بہت جلدی غصہ آ جاتا ہے۔ کیا فائدہ کہ کچھ بتانے سے پہلے ہی یہ تمہارے ہاتھوں مارا جائے۔"

"پھر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسی حرام زادے کی مرضی چلے گی۔" رنجیت جھنجھلایا۔

"یہ بات نہیں، تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو! میں مصلحتاً یہ بات کہہ رہی ہوں۔" بندیا نے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔" رنجیت زچ ہو کر بولا۔ "مگر اس نے تمہیں اب پیاری و یاری کہا تو میں اس کا خون پی لوں گا۔"

ابھی رنجیت کا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ رنجیت اور بندیا نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا اور اسی وقت میری نگاہ سامنے والی دیوار کی طرف اٹھ گئی۔ دیوار میں خلا نمودار ہو رہا تھا۔

"خطرہ!" اچانک ہردیال چیخا۔ اس نے یقیناً کچھ دیکھ لیا تھا۔

اس کی چیخ سنتے ہی بندیا اور رنجیت ایک دم زمین پر لیٹ گئے تھے اور شنکر جو غالباً خطرے کی نوعیت نہ سمجھ سکا تھا اور میرے پیچھے کھڑا تھا، سامنے آ گیا۔

"لل... لیوسی!" میں کوشش کے باوجود اپنی بے اختیار چیخ نہ روک سکا۔

خلا اب پوری طرح نمودار ہو چکا تھا اور دروازہ نظر آنے لگا تھا، اسی پراسرار کنویں کا دروازہ جس کے ذریعے کچھ دیر پہلے صفدر علی بیگ وغیرہ وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ اب اسی کنویں میں لیوسی کھڑی ہوئی نظر آئی تھی جس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں سیاہ چرمی تھیلا! لیوسی نے پوری طرح خلا نمودار ہونے سے پہلے ہی گولی چلا دی تھی اور میں اسی لیے چیخ پڑا تھا کہ کہیں کوئی بھولی بھٹکی گولی میری کھوپڑی یا سینے میں اپنا "گھونسلا" نہ بنا لے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب شنکر سامنے آ گیا تھا۔ پہلی گولی اس کی کنپٹی پر پڑی تھی اور وہ زمین بوس ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر شنکر اچانک سامنے نہ آ گیا ہوتا تو وہ گولی میرا کام تمام کر دیتی مگر جسے اللہ میاں رکھے اسے کون چکھے! اسی لیے گولی مجھے نہ چکھ سکی تھی۔

لیوسی کو غالباً میری چیخ سنتے ہی صورت حال کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے دوبارہ فوراً ہی گولی نہیں چلائی تھی۔ ہردیال بہت چالاک ثابت ہوا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے اسی طرح جکڑے ہوئے تھا اور میری ہی آڑ لیے چھپا ہوا تھا۔

بس اچانک ہی میں نے محسوس کیا کہ ہردیال کی گرفت میری کلائیوں پر ڈھیلی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔ اسی وقت لیوسی نے دوسرا فائر کیا۔ گولی زمین پر رگڑ کھاتی ہوئی بندیا اور رنجیت کے قریب سے گزر کر دیوار میں لگی۔ پھر اسی لمحے میری کلائیاں ہردیال کی گرفت سے آزاد ہو گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے سر کی دائیں جانب کنپٹی کے قریب کوئی سخت سی چیز لگتے ہوئے محسوس کی۔

ابھی میں کچھ نہ سمجھ پایا تھا کہ اچانک ہردیال کی تیز آواز گونجی۔ "لڑکی! اب اگر تم نے ایک بھی فائر کیا تو میں تمہارے ساتھی کا کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ ریوالور پھینک دو!"

لیوسی کو میں نے چونکتے دیکھا۔ کنویں کے اندر مشعل کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچ رہی تھی اس لیے میں اس کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات نہ دیکھ سکا۔

لیوسی کی غیر متوقع آمد نے ہر چند کہ میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا مگر اب اپنی زندگی داؤ پر لگتے دیکھ کر میں فوراً گھگھیا اٹھا۔ "لیو... لیوسی!... یہ سچ مچ مجھے گو... گولی مار دے گا۔ خدا کے لیے... تمہیں اللہ کی قسم ریوالور پھینک دو!" میرے لہجے میں التجا تھی۔

"لیکن... لیکن..." لیوسی اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی کیوں کہ اسی وقت پھر ایک دھماکا سنائی دیا۔ اسی دھماکے کے ساتھ لیوسی چیخ کر دہری ہو گئی۔

میں صرف یہ دیکھ سکا تھا کہ لیوسی پر کسی نے گولی چلائی تھی۔ گولی چلانے والا اگر چاہتا تو شاید لیوسی کو ختم بھی کر سکتا تھا مگر اس نے صرف لیوسی کے ہاتھ کو نشانہ بنایا تھا، اس ہاتھ کو جس میں لیوسی، ریوالور تھامے ہوئی تھی۔

جیسے ہی لیوسی چیخ مار کر دہری ہوئی تھی، رنجیت اور بندیا تیزی سے اٹھ کر خلا کی طرف بھاگ اٹھے تھے۔

پھر رنجیت نے لیوسی کو کنویں سے باہر گھسیٹ لیا تھا اور بندیا نے لیوسی کا سیاہ تھیلا اور قریب ہی پڑا ہوا ریوالور اٹھا لیا تھا۔

لیوسی کے کنویں سے باہر گھسیٹے جانے کے ساتھ ہی خلا دوبارہ برابر ہو گیا تھا۔

میں نے لیوسی کے ہاتھ سے خون ٹپکتا ہوا دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔

لیوسی پر گولی چلانے والی بندیا تھی۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے بہت سچا نشانہ لیا تھا۔ یہ بات مجھے رنجیت کے ایک فقرے سے پتا چلی۔ اس نے بندیا کے نشانے کی داد دی تھی۔

مجھے اپنی اور لیوسی کی حالت پر رونا آ گیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔ ”ہائے لیوسی! میں نے تو تم سے پہلے ہی منع کیا تھا، ادھر نہ آنے کو! مگر... مگر تم نہ مانیں اور اپنے ساتھ میرا بھی ’اینڈ‘ لکھوا دیا۔ ہائے اب کیا ہو گا؟“

ممکن ہے کہ لیوسی مجھے دم دلاسا دیتی مگر اسی وقت رنجیت کی کریہہ ہنسی بلند ہوئی، پھر وہ ہردیال سے مخاطب ہوا۔ ”لو بیٹا ہردیال! آج رات تمھارے عیش ہو گئے۔ تم بہت کہتے تھے کہ میں اکیلے ہی اکیلے مزے کرتا ہوں۔“ رنجیت نے لیوسی کے دراز گیسو پکڑے ہوئے تھے جس کے سبب لیوسی کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔

”مگر... مگر رنجیت!... یہ... یہ... شنکر... شنکر کی لاش...“ ہردیال ہکلا کر رہ گیا۔ وہ غالباً رنجیت کی طرح سفاک اور بے رحم نہیں تھا۔

”اسے جا کر سرنگ میں پھینک آؤ، ذرا اندر کی طرف! تاکہ جب لاش سڑنے لگے تو اس کی بدبو باہر نہ آئے۔“ رنجیت نے کہا۔

”اور... مگر... مگر کرپا کرم... کرپا کرم نہیں ہو گا کیا؟“ ہردیال بولا۔

”کیا رکھا ہے ان باتوں میں ہردیال! شنکر مر چکا ہے، اب تم اس کے بے جان جسم کو چاہے جلا دو، چاہے کہیں گاڑ دو یا کہیں پھینک دو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا! اب اس بے جان جسم سے اس شنکر کا کوئی واسطہ نہیں جو تمھارا دوست تھا، ساتھی تھا۔ کیوں بندیا! کیا میرا خیال غلط ہے؟“ رنجیت نے تائید طلب نگاہ سے بندیا کی طرف دیکھا جو اس وقت زمین پر بیٹھی ہوئی لیوسی کا سیاہ تھیلا کھول کر دیکھ رہی تھی۔

رنجیت نے بندیا کو مخاطب کیا تو اس نے سر اٹھایا اور بولی۔ ”میں تمھارے خیال سے متفق ہوں رنجیت! یوں بھی ارتھی بنانے اور پھر اسے جلانے کا بندوبست کرنا یہاں تقریباً ناممکن ہے۔“

”وہ... وہ شنکر... شنکر میرا دوست تھا... یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں... یہ درندگی ہے۔“ ہردیال زیر لب بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں بغاوت تھی۔ پھر وہ بلند آواز میں رنجیت سے مخاطب ہوا۔ ”کان کھول کر سن لو رنجیت! میں اب تک تمھاری درندگی کے بہت سے تماشے دیکھ چکا ہوں لیکن ساتھیوں کے ساتھ تمھارا یہ سلوک انتہائی گھناؤنا اور نفرت انگیز ہے۔“ یہ کہتا ہوا، وہ میرے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو جائے شنکر کی آخری رسوم ضرور پوری ہوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے شہر جانا پڑے!“

”تمھارے لہجے سے بغاوت کی بو آ رہی ہے ہردیال! اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رنجیت باغیوں کو پسند نہیں کرتا!“ رنجیت غصیلے لہجے میں بولا۔

”میں چاہوں تو ابھی تمھیں ٹھنڈا کر سکتا ہوں۔“ ہردیال نے ریوالور سیدھا کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ”مگر میں تمھاری طرح بھیڑیا نہیں ہوں۔“

اسی لمحے پے در پے دو دھماکے ہوئے اور میں اچھل پڑا۔

پہلی گولی ہردیال کے ہاتھ پر لگی اور اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا، پھر دوسری گولی نے اس کا سینہ چھید دیا۔ یہ دونوں گولیاں بندیا نے چلائی تھیں۔ ہردیال چیخ مار کر اپنے دوست شنکر کی لاش پر گرا۔ رنجیت خالی ہاتھ تھا اس لیے میں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا کہ وہ گولیاں بندیا ہی نے چلائی تھیں۔

وہاں لاش پر لاش گر رہی تھی۔ میرے اعصاب یہ خونی منظر دیکھ کر جواب دے گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور سر گھومنے لگا۔ میں نے بہت چاہا کہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکوں مگر ناکام رہا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ کیا ہوا۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو کوٹھری میں قید پایا۔ ہر طرف سناٹا پھیلا ہوا تھا مگر کہیں دور سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی سی آواز سنائی دے رہی تھی اور یہ سسکیوں کی آواز نسوانی تھی۔

میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مجھے بے ہوش ہونے سے پہلے کے واقعات یاد آ گئے۔

میں کوٹھری کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ میں ہمت رکھتا اٹھا اور لرزتے ہوئے قدموں سے کوٹھری کے سلاخوں والے دروازے تک پہنچا۔ میں دراصل اس بات سے خوف زدہ تھا کہ وہاں کوٹھری کے باہر دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہاں لاشوں کی موجودگی کا احساس مجھے دہشت زدہ کیے ہوئے تھا۔ کوٹھری کے باہر مشعل اب بھی روشن تھی مگر وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ جس جگہ لاشوں کو ہونا چاہیے تھا، وہ جگہ بھی خالی تھی مگر وہاں بڑے بڑے خون کے دھبے ضرور موجود تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہاں لاشیں نہیں ہیں مگر تنہائی کا خیال بھی کم سوہانِ روح نہیں تھا۔

میں دوبارہ کوٹھری کے فرش پر آ کر لیٹ گیا۔ مجھے احساس نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا اور یہ کہ ابھی رات ہی تھی یا دن نکل آیا تھا۔ وہاں دن رات کی تمیز مشکل ہی تھی کیوں کہ وہ جگہ زمیں دوز تھی۔ وہاں بہرحال سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اب آنا بند ہو چکی تھی۔ وہ آواز ظاہر ہے کہ بندیا کی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سسکیاں بھرنے والی لیوسی ہی ہو سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ لیوسی بہرحال عورت ذات تھی، پھر یہ کہ اس کے ہاتھ میں بھی گولی لگی تھی، اس پر مجھے ترس آنے لگا۔ بے چاری خواہ مخواہ میری خاطر اس جال میں آ پھنسی تھی جسے میں موت کا جال سمجھ رہا تھا۔ یہ بات اب پوری طرح میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ رنجیت اور بندیا دونوں انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ دونوں ہی خونی ہیں۔ ہردیال کو بندیا نے میرے سامنے ہی گولی ماری تھی۔ رہا رنجیت تو اسے میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اس نے بھی میرے سامنے ہی بھگوان داس کو قتل کیا تھا۔ رنجیت اور بندیا دونوں ہی قاتل تھے اور میں ان کی قید میں تھا۔ پھر مجھے قتل ہوتے کیا دیر لگ سکتی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا خون خشک ہونے لگا۔

ویسے لیوسی بھی اب میری نظر میں کم خطرناک نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی میرے ہی سامنے شنکر کو گولی ماری تھی، گویا وہ بھی قاتل یا قاتلہ بن گئی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میں بھی تو ایک عدد قتل کر چکا ہوں، یعنی میں بھی قاتل ہوں۔ چاہے وہ قتل خود بخود ہو گیا تھا مگر اس کا ذمے دار میں ہی تھا۔ نہ میں اس زور سے اس غریب کے سینے پر سر مارتا اور نہ وہ قتل ہوتا۔ یہ جگہ ہی کم بخت منحوس ہے، نہ میں یہاں آتا، نہ قاتل بنتا۔

معاً میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ لو بیٹا، اللہ دتا! آ رہے ہیں جلاد! اب تمھاری باری ہے۔ بھلا ان دونوں قاتلوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے آنے والا یا آنے والے! پڑھ پڑھا لو کلمہ تاکہ آخرت تو خراب نہ ہو۔ میرے ذہن تو کیا سارے جسم میں جیسے آندھیوں کے جھکڑ چلنے لگے۔ ظاہر ہے کہ آندھی میں تو بڑے بڑے پیڑ جھومنے لگتے ہیں، پھر اگر میرا جسم کانپ رہا تھا تو ایسی کون سی عجیب بات تھی۔ میں کانپتے ہوئے واقعی زور زور سے کلمہ پڑھنے لگا۔

قدموں کی چاپ اور بھی قریب آ گئی اور اب میری سماعت سے اس قاتل حسینہ کی آواز بھی ٹکرائی جو بندیا کے نام نامی سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”رنجیت! وہ لڑکی بڑے مضبوط اعصاب کی معلوم ہوتی ہے۔ اس قدر تشدد کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی اور...“

”خیال ہے تمھارا!“ رنجیت کی آواز نے بندیا کی بات پوری نہ ہونے دی۔ ”اگر مزید کچھ دیر اس کا جسم گرم سلاخوں سے داغا جاتا تو وہ چیں بول جاتی۔“

یہ سن کر اور جان کر کہ ان ظالموں نے لیوسی کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا ہے، میرے چھکے چھوٹ گئے اور پھر چھوٹے ہی رہے۔

”ممکن ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر جب دوسری طرح بھی کام نکل سکتا ہے تو کیا ضرورت ہے!“ بندیا کی آواز آئی۔ ”میں اس لیے تمھیں وہاں سے لے آئی کہ کہیں تم غصے میں آ کر اسے ختم ہی نہ کر دو۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا!“ رنجیت نے بے پروائی سے کہا۔

”فرق پڑتا ہے رنجیت!“ بندیا اپنے الفاظ پر زور دے کر بولی۔ ”جب تک یہ دونوں زبان نہ کھول دیں، انھیں قتل نہیں کرنا ہے۔ کم از کم یہ تو پتا چلانا ہی ہے کہ حکومت کو ہمارے بارے میں کیا کیا علم ہے اور یہ کہ ہم یہاں محفوظ بھی ہیں یا نہیں! یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان دونوں کے علاوہ سی آئی ڈی کے کچھ اور لوگ بھی ہمارے اس ٹھکانے سے واقف ہو چکے ہوں۔“

اب وہ دونوں مجھے نظر بھی آنے لگے تھے۔ وہ کوٹھری سے زیادہ دور نہیں تھے اور اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”بندیا! اس حرامی سے تمھی بات کرنا ورنہ مجھے غصہ آ گیا تو پھر تم جانتی ہی ہو۔“ رنجیت بولا۔

"لیکن کیا خبر ابھی اسے ہوش ہی نہ آیا ہو!" بندیا نے کہا اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

بشارا ہو! میں ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہوں کیسا سمجھے! میں نے دل ہی دل میں کہا اور جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

"کافی دیر ہو چکی ہے اب تو اسے ہوش آجانا چاہیے" رنجیت کی آواز آئی۔ "ویسے یہ لونڈا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم کہتی ہو کہ یہ انتہائی بزدل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت عیار ہے۔ حرام زادہ عین موقع پہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔"

"تم نے خود اسے ہلا جلا کر دیکھا تھا۔ وہ واقعی دہشت ہی سے بے ہوش ہوا تھا" بندیا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "لاؤ چابی مجھے دو! میں کوٹھری کھولتی ہوں... ارے یہ تو اب تک بے ہوش ہی معلوم ہوتا ہے!"

"کیا خبر ہماری آوازیں اور قدموں کی چاپ سن کر دانستہ لیٹ گیا ہو" رنجیت نے خیال آرائی کی اور میرا دل جل کر رہ گیا۔ چند لمحے بعد ہی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر رفتہ رفتہ قدموں کی چاپ میرے قریب آکر رک گئی۔ میں نے اس وقت اپنا سانس تک روک لیا۔ اسی لمحے میں بلبلا اٹھا۔ میرے دائیں کولھے پر بڑی زبردست ٹھوکر پڑی تھی۔

"ہائے!" میں نے کراہ کر اپنا کولھا دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"دیکھا!" رنجیت ہنس کر بولا۔ "پڑا تھا نا سالا مکر کیے ہوئے!"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے ہمیں آتے دیکھ کر جان بچانے کے لیے بے ہوشی کا سوانگ رچا لیا ہو یا ممکن ہے، اسے کچھ دیر پہلے ہوش آگیا ہو اور اب یہ سو رہا ہو" بندیا نے خیال آرائی کی۔

"اٹھ بے!" بندیا کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے رنجیت نے پھر پاؤں اٹھایا۔

"اٹھتا... اٹھتا ہوں پیارے بھائی! ابھی اٹھتا ہوں" یہ کہتا ہوا میں فوراً اٹھ بیٹھا۔

"باہر چل!" رنجیت نے مجھے دوسرا حکم دیا۔

میں نے اس حکم کی تعمیل میں بھی دیر نہیں کی اور جلدی سے اٹھ کر کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے کوٹھری سے نکلنے میں اتنی تیزی دکھائی تھی کہ وہ دونوں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس ظالم رنجیت کے لیے میرے دل سے بددعا نکل رہی تھی۔ اس نے اچھا خاصا بے ہوشی کا ڈراما فلاپ کر دیا تھا۔ نہ وہ کم بخت اتنی زور کی لات میرے کولھے پر مارتا اور نہ میرے منہ سے ہائے نکلتی۔

رنجیت کی دوسری ٹھوکر سے بچنے کے لیے میں کوٹھری سے نکل تو آیا تھا مگر اب سوچ رہا تھا کہ میں نے کوٹھری سے نکل کر اچھا نہیں کیا۔ کیا خبر اب اس کوٹھری میں دوبارہ لوٹ کر جانا ہو کہ نہ ہو!

بندیا اور رنجیت میرے پیچھے پیچھے ہی تھے۔ رنجیت نے مجھے رکنے کا حکم دیا اور میں کسی کٹھ پتلی کی طرح ساکت ہو گیا۔ پھر وہ دونوں میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ رنجیت مجھے گھورنے لگا تو میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ قاتل سے بھلا کس نے نگاہ ملائی ہے جو میں یہ جرأت کرتا۔

"سنو، اِدھر دیکھو میری طرف!" معاً بندیا نے مجھے مخاطب کیا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ تھی تو وہ بھی خطرناک مگر رنجیت کی طرح نہیں، اس سے ذرا کم!

مجھے اپنی طرف متوجہ پاکر بندیا پھر بولی۔ "اگر تم چاہتے ہو کہ زندہ بچ کر یہاں سے نکل جاؤ تو جو میں پوچھوں، اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دو۔"

میں ایک دم کھل اٹھا۔ اس قاتل حسینہ نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ مایوسی کے گھور بلکہ "گھنگھور" اندھیرے میں مجھے مسرت کی ایک ننھی منی سی کرن نظر آگئی تھی۔ میں یہ مژدہ سن کر اس بات تک کو بھول گیا تھا یا دانستہ وہ بات بھلا دی تھی کہ سب کچھ قبولوانے کے بعد وہ میرا ٹھکانا کر دیں گے۔ میں خوش ہو کر بکر دانت نکال کر بولا۔ "سچ بندیا! میں زندہ بچ جاؤں گا اور اپنی امی اور ابا کے پاس پہنچ جاؤں گا؟"

"ہاں بالکل سچ!" بندیا نے یقین دلایا۔

"پھر تو پ... پیاری... اللہ... نہیں صرف بندیا!" میں گڑبڑا گیا کیوں کہ مجھے یاد آگیا تھا کہ اس کا عاشق نامراد "پیاری" کہنے پر برا مان جاتا ہے۔

"ہاں، ہاں کہو، کیا کہہ رہے تھے تم؟" بندیا نے میری ہمت بندھائی۔

"دراصل میری یہ زبان بہت ناہنجار ہے، بس خلوص میں پھسل گئی اور میں نے تمھیں... ارے نہیں، اب میں وہ لفظ دوبارہ ہرگز نہیں کہوں گا" میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنا ضروری سمجھا کیوں کہ رنجیت ہونٹ بھینچے ہوئے مجھے گھور رہا تھا۔

"خیر تم اصل بات کرو، ان باتوں کو چھوڑو!" بندیا بولی۔

"یہ اور اصل بات کرے گا!" رنجیت درمیان میں بول اٹھا۔ اس کے لہجے میں نفرت اور غصہ تھا۔ "یہ اسی طرح تمھارا اور میرا

...جاتا رہے گا۔ یہ لاتوں کا بھوت ہے بندیا، باتوں سے نہیں ...نے گا۔"

"اچھا تم کچھ دیر تو صبر کر لو، پھر جو چاہے اس کا حشر کرنا" بندیا ...رنجیت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

"بالکل بالکل!" میں جلدی سے بولا۔ "انشاءاللہ حشر نشر کی ...بت ہی نہیں آئے گی، میں سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔"

"تو کچھ بتا بھی دے حرامی!" رنجیت آنکھیں نکال کر دہاڑا۔

"تو ابھی کچھ پوچھا بھی گیا ہو مجھ سے!" میں رو دینے والے ...داز میں آہستہ سے منمنایا۔

"پہلے تم اپنی وہ ادھوری بات کرو جو پہلے کہہ رہے تھے۔" ...ریا نے پھر گویا چارج سنبھال لیا۔

"وہ تو میں بھول گیا۔ نہ جانے کیا کہہ رہا تھا" میں نے کہا ...ر جھوٹ نہیں کہا۔ میں واقعی ڈر کے مارے بھول گیا تھا کہ پہلے ...یا کہہ رہا تھا۔

"سن لیا تم نے!" رنجیت نے بندیا سے کہا۔ اس کا لہجہ بڑا ...ہریلا تھا۔ "یہ اسی طرح چکر پھیریاں دیتا رہے گا۔"

"جب... بات یہ ہے کہ... کہ ان کے... ڈر سے... میں ...سب کچھ بھول جاتا ہوں" میں نے ڈرتے ڈرتے بندیا کو اصل ...ت بتا دی۔

"خیر اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جب تک میں نہیں کہوں گی، ...تمھیں قتل نہیں کریں گے اس لیے بے خوف ہو کر بات کرو" بندیا ...نے مجھے تسلی دی۔ یہ الگ بات کہ اس تسلی میں بھی دھمکی تھی۔ چند ...لمحے توقف کے بعد بندیا پھر بولی۔ "تو پھر تم سچ بولنے پر آمادہ ہو؟"

"قطعی!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا اور اسی وقت ...مجھے وہ بات یاد آگئی جو بھول گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "سنو ...بندیا! ابھی ابھی مجھے وہ بات یاد آگئی ہے جو پہلے کہنے والا تھا، ...جلدی سے سن لو کہیں پھر نہ بھول جاؤں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، پہلے وہی بات کرو" بندیا پرسکون آواز ...میں بولی۔

...میں اب دانستہ، رنجیت کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا ...کیونکہ زیادہ ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ میں بندیا کو وہ بات بتانے لگا ...جو پہلے بتانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اگر تم واقعی مجھے قتل نہیں ...کرو گی تو یقین کرو بندیا! یہاں سے بہ خیریت اپنی امی اور ابا ...کے پاس پہنچ جانے کے بعد میں اس نوکری پر بھی لعنت بھیج ...دوں گا! چاہے چچا بندو خاں اپنی لونڈیا کی شادی میرے ساتھ ...کریں یا نہ کریں!"

"کیا تمھاری شادی ہونے والی ہے؟" بندیا نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی صرف رشتہ طے ہوا ہے" میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "جب تک بڑے بھیا اور بھائی صاحب کی شادیاں نہیں ہو جاتیں، یہ رشتہ راز میں رہے گا۔ ابا نے یہ بات چچا بندو خاں سے صاف صاف کہہ دی ہے مگر... مگر تم یہ راز کسی پر ظاہر نہ کر دینا!"

"پھر تو تمھارا زندہ رہنا اور بھی ضروری ہے تاکہ تمھاری بیوی شادی ہونے سے پہلے ہی بیوہ نہ ہو جائے" بندیا معنی خیز لہجے میں بولی۔

"بالکل بالکل! میرا زندہ رہنا تو بہت ضروری ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"بندیا! تم نے خواہ مخواہ اس بدذات کو بکواس کرنے کا موقع دے دیا، مطلب کی بات کرو! وقت ضائع نہ کرو!" رنجیت درمیان میں پھر بول پڑا۔ اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔ بندیا ہی کا دم تھا کہ اس "سینگ مارو" کو برداشت کر رہی تھی جو بات بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔

"تم بات تو کرنے دو آخر! بار بار بیچ میں بول پڑتے ہو" بندیا نے بھی اس بار چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ آخر وہ بھی تو کم نہیں تھی۔ اگر رنجیت قاتل تھا تو وہ بھی قاتلہ تھی۔

"اب تک تم نے کوئی کام کی بات معلوم کی اس حرامی سے؟" رنجیت کو غصہ آگیا۔

"تو تم معلوم کر لو" بندیا منہ بنا کر بولی۔

"میرے پاس بھیجا فالتو نہیں ہے کہ اس سے چپٹاؤں!" رنجیت بپھر گیا۔ "اس وقت سے یہ وقت ہو گیا، ذرا دیر کو آرام نہیں ملا۔ ساری رات اسی چکر میں ہو گئی۔"

"تو کس نے کہا تھا، سو رہتے! کل دن بھی تو نکلے گا! تمھیں تو اسی وقت تلا بیلی لگ جاتی ہے، ہر بات کی!" بندیا نے کسی قدر نرم پڑ کر کہا۔

"ٹھیک ہے، ٹال دو اس سالے کو دوبارہ کوٹھری میں بند کر دو، فرصت سے اس کی خبر لیں گے" رنجیت بھی اب ٹھنڈا پڑ گیا۔ "اس حرامی نے خواہ مخواہ آج رات کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ آج رات کے لیے تم نے کوئی وعدہ کیا تھا، یاد ہے نا!"

"یاد ہے! تمھاری طرح نہیں ہوں" بندیا مسکرا دی۔

"تو پھر چلو!" رنجیت نے بھی مسکرا کر کہا۔

"اسے تو بند کر دو!" بندیا اس کی طرف کوٹھری کے تالے کی چابی بڑھاتے ہوئے بولی جو اس نے اپنے گریبان میں اڑس لی تھی۔

پھر ان دونوں نے مجھے کوٹھری میں دھکا دیا اور ایک مرتبہ

سکے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چلتے ہوئے رفوچکر ہوگئے۔ نہ جانے عین وقت پر ان کم بختوں کو کون سے وعدے وعید یاد آگئے تھے! حالانکہ میں تو سب کچھ بتا کر آزادی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

اب دوبارہ کوٹھری میں آکر جب میں نے بندیا کی باتیں یاد کیں جو اس نے کی تھیں تو میرے چودہ بلکہ اس سے بھی زیادہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ مجھے زندہ بچ کر نکل جانے کا جھانسا دے کر سب کچھ قبول وا لینا چاہتی تھی۔ بھلا جب صفدر علی بیگ میرے قتل کا حکم دے گیا تھا تو وہ مجھے کس طرح زندہ چھوڑ دیتے۔

بچ گیا، بیٹا اللہ دتا! ورنہ ہوگیا تھا ابھی کام! سب کچھ پوچھ پاچھ کر تجھے بھی ٹیں کر دیتے وہ! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ دونوں آپس میں لڑ پڑے اور بات ٹل گئی یا قضا ٹل گئی۔ میں یہ سوچتا ہوا کوٹھری کے فرش پر لیٹ گیا۔

کہتے ہیں اور غلط نہیں کہتے کہ نیند پھانسی کے پھندے پر بھی آجاتی ہے۔ پھانسی کے پھندے پر سونے کا تجربہ تو ابھی مجھے نہیں ہوا، اور خدا یہ تجربہ نہ کرائے مگر موت کے انتظار میں مجھے ضرور نیند آنے لگی۔ میں یہ سوچ کر کلمہ پڑھتے پڑھتے سویا کہ کیا خبر وہ ظالم سوتے ہی میں میرے گلے پر چھری پھیر دیں یا میرے سینے میں گولی اتار دیں اور مجھے آخری وقت میں کلمہ پڑھنے تک کی مہلت نہ ملے۔

وہ ایک زبردست دھماکا ہی تھا جسے سن کر میں سوتے سوتے اچھل پڑا تھا اور فوراً میری زبان پر کلمہ جاری ہوگیا تھا۔ چند لمحے بعد ہی دوسرا دھماکا سنائی دیا۔

"یا اللہ! تو ہی بچانے والا ہے، ہر مصیبت سے!" میں بڑبڑایا۔

پھر میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں ان ظالموں اور قاتلوں نے لیوسی کو تو قتل نہیں کر دیا؟ ویسے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت لیوسی سے زیادہ اپنی جان کی فکر تھی۔ وہ قاتل چاہے کسی کو بھی قتل کر دیں مگر مجھے زندہ چھوڑ دیں، یہ میری دلی خواہش تھی۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ اگر وہ مجھ سے کہتے کہ میری بجائے لیوسی کو قتل کرنے پر تیار ہیں اور مجھے وہاں سے زندہ سلامت نکل جانے کا موقع دے دیں گے تو میں فوراً اس بات پر راضی ہو جاتا مگر ان ظالموں نے تو یہ پیشکش بھی نہیں کی تھی۔ میں ان حالات میں بھلا لیوسی جیسی بیچاری کو کیوں قتل کروا دیتا۔ چلو اگر کسی دوسرے کے قتل سے اپنی جان بچ رہی ہو تو آدمی ایسی باتیں سوچتے بھی!

نہ جانے میں کتنی دیر کوٹھری کی سلاخیں مضبوطی سے پکڑے کھڑا رہا اور یہی سب خرافات سوچتا رہا۔ سلاخیں میں نے اس لیے مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھیں کہ میرے دونوں پاؤں کانپ رہے تھے۔

دو عدد دھماکے ہونے کے بعد موت کا سناٹا پھیل گیا تھا۔ وہ دھماکے گولی چلنے ہی کے تھے مگر گولی کس نے چلائی تھی اور کیوں، یہ سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ وہاں میرے علاوہ صرف لیوسی تھی اور وہ دونوں قاتل! اپنے بارے میں تو خیر مجھے یقین تھا کہ میں نے ہرگز گولی نہیں چلائی تھی کیوں کہ میرا ریوالور پہلے ہی ہلّے میں چھین لیا گیا تھا، ہاں البتہ دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اچانک میں چونک پڑا۔ میں نے ایک عجیب سی آواز سنی تھی جیسے کوئی فرش پر گھسٹ رہا ہو یا اسے گھسیٹا جا رہا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد ہی میں نے ایک لہولہان جسم کو کوٹھری کی طرف گھسٹتے دیکھا۔ اس کا چہرہ واضح طور پر مجھے دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور ریوالور کا رُخ میری طرف تھا۔

میں تو خیر ٹھہرا اللہ دتا اس لیے میرا ڈر جانا یا دہشت کھا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اگر میری جگہ کوئی سچ مچ کا ہیرو ہوتا تو کم از کم اسے پسینے ضرور آجاتے۔ رسوائی، قیدِ تنہائی، پھر دو عدد دھماکے اور ان تمام روح فرسا منازل سے گزرنے کے بعد ایک لہولہان جسم کا گھسٹتے ہوئے قریب آنا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ہاتھ میں ریوالور پایا جانا اور پھر ریوالور کا رُخ میری طرف ہونا، کیا یہ سب باتیں میرے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی نہیں تھیں! پھر اگر میرے ہوش بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اُڑنے لگے تو کیا عجب!

ہوش اُڑنے سے پہلے مجھے اتنا اندازہ بہر حال ضرور ہوگیا تھا کہ وہ لہولہان جسم کسی مرد کا نہیں، عورت کا ہے۔ دراز گیسو کھلے ہوئے تھے اور اس کا رُخِ زیبا یا نازیبا ان کے پیچھے چھپا ہوا تھا اس لیے میں نہ پہچان سکا تھا کہ وہ مستاۃ ہے کون!

ہوش اُڑ جانے کے باوجود مجھے کم سے کم اتنا احساس ضرور تھا کہ میں خطرے سے دوچار ہوں۔ خطرے سے بچنے کے لیے یہ اشد ضروری تھا کہ اگر ہاتھ نہیں تو میں پیر ضرور ہلاؤں۔ میں اتنا تو کر ہی سکتا تھا کہ کوٹھری کے کسی تاریک گوشے میں چھپ جاتا تاکہ متوقع قاتلہ مجھے سامنے نہ دیکھ کر کچھ دیر کو تو چکرا کر ہی رہ جاتی۔ اس دوران میں یہ ممکن تھا کہ وہ خود اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتی اور میں زندہ بچ جاتا۔ اسے زخمی حالت میں دیکھ کر میرے دل میں امید کی یہ شمع روشن ہوئی تھی مگر وہاں سے حرکت کرنے کے لیے

[قب]لہ ہوش صاحب کا ہونا از بس ضروری تھا جو کچھ دیر پہلے ہی [ا]ڑ چکے تھے۔ یہی سبب تھا کہ خطرے کا احساس ہونے کے باوجود [م]یں وہاں سے حرکت نہ کر سکا۔ میری نگاہ متوقع قاتلہ کے حرکت [کر]تے ہوئے جسم پر جمی ہوئی تھی اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا [او]ر دوسرے میں ایک چھوٹی سی تپڑے کی اٹیچی جو اس کے ساتھ ساتھ [زم]ین پر گھسٹ رہی تھی۔

یہ تو اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آنے والی لیوسی نہیں ہو [س]کتی۔ میں اس کے بارے میں سن ہی چکا تھا کہ ان ظالموں نے [ا]س کے جسم کو گرم سلاخوں سے داغا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ بھی [م]یری ہی طرح کسی جگہ قید رکھی گئی ہوگی۔ ایسی صورت میں بھلا یہ [ک]س طرح ممکن تھا کہ وہ ان دونوں کو "ٹیں" کر کے مجھے چھڑانے [پ]ہنچ جاتی! میری طرف گھسٹ گھسٹ کر آنے والی وہ حسین قاتلہ [ب]ندیا ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا اور یہ سوچ کر مجھ پر مزید جواسی [ط]اری ہوگئی۔

اس دوران میں وہ گھسٹتی ہوئی اتنی قریب آگئی کہ مجھے اس [ک]ا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس نے گھسٹتے ہوئے اپنے سر کو جھٹکا دیا تھا۔ اس طرح چہرے پر پڑے ہوئے دراز گیسو ہٹ گئے تھے۔ اس کے چہرے پر انتہائی کرب کے آثار نظر آرہے تھے۔

"بند... بندیا... بندیا!" میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

"اللہ... اللہ دتا!" بندیا کے ہونٹ ہلے۔ وہ اب کوٹھری کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

"نن... نہیں... نہیں!" میں پھر چیخ اٹھا کیوں کہ میں نے اسے کوٹھری کی سلاخ پکڑ کر اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی مجھے بھون ڈالے گی۔ اس نے اٹیچی ہاتھ سے چھوڑ دی تھی اور اسی ہاتھ سے زور لگا کر اٹھ رہی تھی۔

"چیخو... چیخو مت اللہ دتا!" وہ اٹھتے ہوئے کراہی۔ میں نے اس کے سینے سے خون کی بوندیں ٹپکتے دیکھیں۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ریوالور پھینک کر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں مجھے کوٹھری کی چابی نظر آئی۔ اس نے بمشکل تالا کھولا اور پھر کوٹھری کا دروازہ بھی کھولنے میں دیر نہیں کی۔ اسی کے ساتھ اس کا جسم کانپنے لگا اور پھر وہ زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ میں دروازہ کھلتے ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ خدا کرے اب یہ نہ اٹھ سکے اور یہیں پڑے پڑے مر جائے۔ میں نے دعا کی۔

"اللہ دتا!... یہاں... یہاں آؤ... باہر... جلدی... جلدی!" میں نے بندیا کی آواز سنی۔

میں نے دیکھا کہ اب اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا اور وہ کوٹھری کے دروازے کے قریب چار ول شانے چت پڑی تھی مگر اس کی نگاہ میری طرف ہی اٹھی ہوئی تھی۔

"ہونہہ... کیوں... کیوں... تم مجھے کیوں بلا رہی ہو بندیا؟ آخر وقت میں مجھے قتل کر کے... تمھیں کیا مل جائے گا!" میں نے بمشکل کہا۔

"اللہ دتا! وقت... وقت کم ہے... میں... میں تمھیں کچھ اہم باتیں... سنو، میں... میں وہ نہیں ہوں جو... جو تم سمجھ رہے ہو... میں اب بچ... بچ نہیں سکوں گی... جلدی... جلدی آؤ!" بندیا کے لہجے میں التجا اور کرب تھا۔

اللہ دتا ایک حسین لڑکی مرتے وقت تجھے پکار رہی ہے۔ تیری غیرت کو کیا ہوا کم بخت! مرتے وقت اس کے منہ میں دو گھونٹ پانی ڈال کر ہی ثواب کما لے۔ کسی نے جیسے میرے وجود میں کہا اور اسی کے ساتھ جیسے میرے اُڑے ہوئے ہوش دوبارہ مجھ میں واپس آگئے۔

میں دوسرے ہی لمحے کوٹھری سے تیزی کے ساتھ نکلا اور بندیا کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ بندیا نے جو ریوالور پھینکا تھا وہ مجھ سے کچھ دور ہی پڑا تھا مگر میں نے اسے پڑا رہنے دیا اور اٹھایا نہیں۔

"بیٹھ... میرے قریب بیٹھ جاؤ اللہ دتا!" بندیا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور بولا۔ "فرماؤ!"

"پہلے... پہلے تو یہ دیکھ لو کہ... کہ میں بندیا نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھی بدل گئی جس پر میں نے اس وقت زیادہ غور نہیں کیا کیوں کہ میری آنکھیں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہی تھیں۔

بندیا کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے چلے گئے تھے اور پھر میں نے اس کے چہرے سے ایک جھلی سی اترتے دیکھی تھی۔

"ارے... ارے... یہ کیا ہوا؟... بندیا... بندیا کہاں گئی؟" میں ہکلا کر رہ گیا کیوں کہ اب میرے سامنے بندیا کی بجائے ایک اور لڑکی کا چہرہ تھا جس کا رنگ سانولا تھا۔

"اب... اب تمھیں یقین آیا اللہ دتا؟" اس نے کہا۔

"مگر... مگر بندیا کہاں ہے؟" میں حیران ہو کر بولا۔

"وہ سلاخوں کے... پیچھے ہے..."

میں نے ایک دم کوٹھری کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو، وہاں تو کوئی بھی..."

"جیل میں... جیل میں ہے وہ!" اس نے میری بات کاٹ کر وضاحت کی، پھر جلدی جلدی بولنے لگی۔ "جب اسے بھگوان داس کو قتل کرنے کے لیے رنجیت کے ساتھ بھیجا گیا تھا تو اس سے پہلے ہی وہ... وہ ہمارے قبضے میں آگئی تھی اور... اور میں نے اس کی جگہ لے لی تھی۔"

"مگر... مگر تم... تم کون ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں... میں بھی تمھاری طرح سی... آئی... ڈی میں ہوں... اس کی... "

"لیکن میں نے تمھیں وہاں کبھی نہیں دیکھا!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں دوسری برانچ میں ہوں، پولیٹیکل برانچ میں! اور... اور میرا نام رجنی ہے، انسپکٹر لیس رجنی!... اب... اب سمجھے۔ تم کرائم برانچ میں ہو اور... اور مجھے تمھارے بارے میں علم تھا۔"

میں اس انکشاف پر اس قدر حیران ہوا کہ میری بولتی بند ہو گئی۔ میں چونکا اس وقت جب دوبارہ رجنی نے مجھے مخاطب کیا۔

"اس اٹیچی میں وہ... وہ تمام کاغذات موجود ہیں جو... جو مجرموں کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ تم... تم لیوسی کو یہاں سے نکال کرلے جاؤ... وہ اندر... اندر ایک کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ میں نے... میں نے اس کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ جاؤ جلدی کرو!" رجنی کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"مگر... مگر وہ... وہ رنجیت... وہ..." میں ہکلا کر رہ گیا اور اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"وہ زخمی ہو کر فرار تو ہو گیا ہے مگر... مگر شاید زندہ نہیں بچ سکے گا۔" رجنی نے بتایا۔ پھر اس نے مختصر الفاظ میں مجھے پیش آنے والے حالات سے آگاہ کیا۔

رجنی نے مجھے بتایا کہ وہ مجرموں کے ساتھ اس لیے ہو گئی تھی کہ ان کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر سکے اور ایسے ثبوت فراہم کرے جو ناقابلِ تردید ہوں۔ آخر کار وہ آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کے لیے اسے اپنی زندگی داؤ پر لگانا پڑی تھی۔

جن لوگوں پر مجرم ہونے کا شبہ تھا، وہ اتنے بارسوخ تھے کہ بغیر واضح ثبوت کے ان پر ہاتھ ڈالا جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ رجنی اسی ثبوت کی تلاش میں تھی۔ اس کے علاوہ رجنی اس کھوج میں بھی تھی کہ دہلی ہی تک اس تنظیم کا اثر تھا یا اس کی جڑیں دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ تنظیم کیا تھی، کیوں قائم کی گئی تھی اور اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے، اس سلسلے میں رجنی نے زبانی کچھ نہیں بتایا تھا۔ رجنی نے کہا تھا کہ مجھے اس ضمن میں تمام ضروری مطلوبہ معلومات ان کاغذات سے ہو جائیں گی جو اٹیچی میں موجود تھے۔ کیوں کہ لمحہ بہ لمحہ رجنی کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی اور موت دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہی تھی اس لیے وہ دانستہ تفصیلات میں جانے سے گریز کر رہی تھی لیکن میرے ذہن میں ابھی بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے۔

"کیا غار والی تم ہی تھیں؟" میں نے پوچھا اور یہ میرا گھامڑ پن ہی تھا کہ میں حالات کی روشنی میں اتنا تک نہ سمجھ پایا تھا حالانکہ بات واضح تھی۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور وہ آدمی کون تھا جو تمھارا پیغام لے کر استاد چھنگا کے گھر گیا تھا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ... وہ بھی میری برانچ کا آدمی تھا۔" رجنی نے جواب دیا۔ "اس کے لیے تنظیم میں، میں نے ہی جگہ پیدا کی تھی کہ... کہ وقت ضرورت اس سے کام..."

"ارے ایک انتہائی ضروری بات تو میں بھول ہی گیا۔" میں رجنی کی بات کاٹ کر بولا۔ "کہیں تم اس سے پہلے ہی مر... میرا مطلب ہے کہ..." سچی بات زبان پر آتے آتے رک گئی اور میں چپ ہو گیا۔ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ رجنی اب کچھ دیر کی مہمان ہے، اس عالمِ فانی میں!

"کہو! جلدی سے کہو... تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" رجنی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ رنجیت... میں اس کے بارے میں... وہ... وہ کہاں گیا؟" میں نے خوف زدہ لہجے میں ہکلا کر کہا کیوں کہ رنجیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا خوف ناک چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا تھا۔

"اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا... میں... میں جب یہ کاغذات لے کر فرار ہونے... بلکہ تمھیں اور لیوسی کو بھی اپنے ساتھ یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ لیوسی بے ہوش تھی اور... اور اسے... اسے بھی یہاں سے نکالنا ضروری تھا اس لیے... تم... تم یہ کام کر سکتے تھے لیکن رنجیت نے اچانک مداخلت کر کے سارا کھیل بگاڑ دینا چاہا۔ میں... میں نے غلط سوچا تھا کہ وہ سو گیا ہے... ایسا نہیں تھا... اسے شاید... شاید مجھ پر شبہہ ہو گیا تھا اور... اور وہ میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مجھ پر فائر کیا۔ میں بھی غافل نہیں، چوکنا تھی اور میرے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ میں نے بھی اس پر فائر

جھونک مارا۔ گولی اس کے دائیں شانے پر لگی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا... پھر... پھر..." رجنی کی آواز دھیمی پڑنے لگی اور وہ چند لمحے کے لیے رک گئی۔

"پھر... پھر کیا ہوا؟ کیا وہ زندہ بچ گیا؟" میں نے اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے تجسس کے تحت پوچھا۔

"ابھی... ابھی بتاتی ہوں۔ ذرا... ذرا سانس لینے دو۔" رجنی نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ مسلسل بولنے کی وجہ سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "پھر رنجیت اس کمرے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے زخمی... زخمی ہونے کے باوجود اس کا پیچھا کیا مگر... مگر وہ ہاتھ نہ آسکا۔ وہ... وہ سرنگ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ پھر... پھر وہ سرنگ میں داخل ہو گیا۔ اس سرنگ کے بارے میں مجھے علم تھا۔ یہ... یہ سرنگ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ہی بنائی گئی ہو گی۔ یہ... یہ سرنگ دہلی سے سیدھی آگرہ تک جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس سرنگ کو بہت دن سے بلکہ عرصۂ دراز سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس... اس سرنگ کے دہانے کو بند بھی کیا جا سکتا تھا... اور پھر اسے اندر سے کھولا جانا ممکن نہیں تھا... پھر میں نے... سرنگ کے قریب موجود دیوار کے ایک پتھر پر دباؤ ڈالا اور ایک بھاری پتھریلی سِل پھسل کر نیچے آگئی جس سے سرنگ کا دہانہ چھپ گیا۔ رنجیت اب اس سرنگ سے تہ خانے میں دوبارہ واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ سرنگ کیوں کہ ایک عرصے سے استعمال نہیں کی گئی اس لیے وہاں گھٹن کا ہونا... لازمی تھا۔ اس سرنگ میں تازہ ہوا پہنچانے کا جو بندوبست کیا گیا ہو گا... وہ... وہ یقیناً اس طویل عرصے میں ناکارہ ہو... ہو چکا ہو... گا... اس صورت میں رنجیت کا زندہ بچ جانا محال ہے۔" یہ کہہ کر رجنی ہانپنے لگی اور پھر اس کا سانس اکھڑنے لگا۔

پھر بہ مشکل رجنی نے مجھے تہ خانے ہی میں موجود اس کمرے کا محلِ وقوع سمجھایا جہاں لیوسی بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

"جاؤ!... اللہ دتا جاؤ! وقت کم ہے... میرے مرنے کا انتظار نہ کرو... یہ تہ خانہ اب... اب سے کچھ دیر بعد ملبے کا ڈھیر بن... بن جائے گا۔" رجنی رک رک کر کہہ رہی تھی۔

"کک کیوں... کیوں کیسے؟" میں چونک پڑا۔

"میں نے... دیکھا تھا کہ رنجیت نے بھاگتے ہوئے یہ... یہ کام کر دیا تھا... وہ... وہ مجھے اس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا کہ... کہ یہ زیرِ زمین دنیا کسی وقت بھی تباہ کی جا سکتی ہے۔ یہاں... ان تہ خانوں میں جگہ... جگہ گولہ بارود... کا ذخیرہ ہے... جو... جو ایک مخصوص پتھر پر دباؤ ڈالنے کے ٹھیک... ایک گھنٹے بعد... بھک سے اڑ سکتا ہے... وہ پتھر اسی راستے میں ایک جگہ تھا جدھر سے... رنجیت بھاگا تھا... میں نے اسے پتھر پر دباؤ ڈالتے ہوئے دیکھ... دیکھ لیا تھا۔ مجرموں نے شاید... شاید اس مقصد کے لیے یہ... یہ انتظام کیا تھا کہ... کہ اگر انھیں کبھی یہ خطرہ ہو کہ... کہ قانون کے ہاتھ یہاں تک بھی پہنچنے والے ہیں تو وہ... وہ سب کچھ تباہ کر دیں۔ یہ... یہ جگہ ایک طرح سے ان کا ہیڈ کوارٹر... تھی۔ انھوں نے اسی لیے اپنی تنظیم کے اہم کاغذات وغیرہ یہیں رکھے تھے تاکہ خطرے کی صورت میں انھیں کسی وقت بھی ضائع کیا..." رجنی کا سانس پھر اکھڑنے لگا اور وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

رجنی سے یہ جاننے کے بعد کہ وہ زیرِ زمین دنیا کسی وقت بھی بھک سے اڑ سکتی ہے، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پہلے میں انسانی ہمدردی کے ناتے رجنی کے پاس بیٹھا ہوا اس کی موت کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ مر جائے تو وہاں سے اٹھوں تاکہ اسے آخر وقت میں یہ ملال تو نہ ہو، کوئی دمِ آخر اس کے پاس نہیں تھا لیکن اب میں انسانی ہمدردی پر لعنت پڑھ کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

مجھے اب اس اٹیچی کا بھی ہوش نہیں رہا تھا جس میں مجرموں کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت تھے۔ بھلا جب زندگی خطرے میں ہو تو کون یہ "نخرے بازی" کر سکتا ہے! کوئی اور کر سکتا ہو تو کیا کرے مگر میں بہرحال اس موڈ میں نہیں تھا۔ اس وقت مجھے لیوسی کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔ میری بلا سے وہ بھی بارود کے ساتھ ساتھ بھک سے یا کسی اور طرح سے اڑ جائے۔ مجھے تو بس اپنی زندگی کی فکر تھی اسی لیے میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی اس دیوار کا رخ کیا جس میں میرے لیے زندگی کا دروازہ کھل سکتا تھا۔

"ٹھہرو!... ٹھہر اللہ دتا!" رجنی کی تیز آواز نے میرے قدم روک لیے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ رجنی کا ایک ہاتھ اٹیچی کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

"اسے... اسے لے جاؤ!" رجنی کہہ رہی تھی۔ "اور... اور سنو! گھبراؤ مت! ابھی صرف نصف گھنٹہ گزرا ہے... تمھارے پاس اتنا وقت ہے کہ... کہ لیوسی کو بھی اپنے ساتھ..." رجنی کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا اور وہ ہانپنے لگی۔

اے اللہ دتا! یہ تو واقعی ظلم ہے! تو لیوسی کو بچا سکتا ہے، ابھی وقت ہے، اتنا تو نہ گھبرا بیٹا نام! میرے اندر جیسے کوئی بولا۔

"آبے چپ!" میں نے اپنے اندر بولنے والے کو بآوازِ بلند ڈانٹ دیا۔ "سالے، اگر وقت سے پہلے ہی دھول دھان ہو گئی پھر؟"

مجھے زور زور سے بولتے دیکھ کر رجنی نہ جانے کیا سمجھی اور پھر

اس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب تک اٹیچی کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

"اچھا تو کبھی کیا یاد کرے گی کہ تیری آخری خواہش پوری نہیں کی۔" میں بڑبڑایا اور پلٹ کر تیزی کے ساتھ اٹیچی تک پہنچا۔ اٹیچی اٹھانے کے بعد میں پھر بڑبڑایا۔ "لیکن میں لیوسی کو۔۔۔"

اسی وقت قدموں کی ہلکی سی چاپ سن کر میں اچھل پڑا۔

قدموں کی وہ ہلکی سی چاپ، دائیں جانب سے سنائی دی تھی۔ میں نے اس طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ کیا وہ حرامی کسی طرح سرنگ کا دہانہ کھول کر باہر آنے، گویا تہ خانے میں، دوبارہ اینٹری دینے میں کامیاب ہوگیا؟ یہ خیال آتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اسی وقت رجنی کی آواز سنائی دی مگر یا تو وہ کوشش کے باوجود صرف غوں غاں کر کے رہ گئی تھی یا پھر میں ہی اتنا بدحواس ہوگیا تھا کہ اس کی بات نہ سمجھ پایا۔ میری نگاہ اس کی طرف اٹھی۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے اور جسم دھیرے دھیرے جیسے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ حرکت کر رہے تھے یا شاید کانپ رہے تھے مگر ان سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور ساکت ہوگیا۔

"اللہ دتا۔۔۔آ۔۔۔آ۔۔۔"

اچانک ایک نسوانی آواز سن کر میں اچھل پڑا اور یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ آواز دائیں جانب ہی سے آئی تھی، جدھر سے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی تھی۔

میں نے کسی کو لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور وہ کسی ایسے شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی بڑھ رہی تھی جس نے بے تحاشا پی لی ہو۔ وہ لیوسی کے سوا کون ہو سکتی تھی!

"اللہ دتا! مجھے۔۔۔ مجھے سنبھالو!" لیوسی کی آواز پھر آئی۔

"ل۔۔۔ لیوسی! تم۔۔۔ تم!" میں ہکلا کر رہ گیا۔

ہر چند کہ میں، لیوسی کو وہیں چھوڑ کر بھاگنے کا پروگرام بنا چکا تھا لیکن ابھی شاید اس کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔

قہراً جبراً مجبوراً میں، اٹیچی اٹھائے اس کی طرف لپکا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ تقریباً گرنے والی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچتے ہی گلے کا ہار بن گئی تھی اور یہ ہار بہت وزنی تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری نازک سی گردن میں ڈال دیے تھے اور مجھ سے چمٹ گئی تھی۔

"ارے۔۔۔ ارے یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہو! چھوڑو مجھے!" میں نے گھبرا کر کہا۔

"اب۔۔۔ اب اگر اس حالت میں مجھے۔۔۔ مجھے موت بھی آجائے تو قبول ہے۔" لیوسی آنکھیں بند کر کے بڑبڑانے لگی اور اسی کے ساتھ مجھے مزید جکڑ لیا۔

میں، رجنی سے سن ہی چکا تھا کہ وہ زیر زمین دنیا، بھک سے اڑنے والی ہے اس لیے لیوسی کی یہ بے وقت، بے تکلفی مجھے گراں گزری۔

"ارے جلدی سے چھوڑ دو مجھے ورنہ تمھارے ساتھ میں بھی بھک سے اڑ جاؤں گا۔" میں نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

میری بات سن کر لیوسی نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ بولی۔

"وہی جو ہونے والا ہے!" میں نے جلدی سے کہا اور پھر جلدی ہی سے اسے صورت حال کی "خطرناکی" سے آگاہ کر دیا۔

میں نے اچانک لیوسی کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

"میں۔۔۔ میں اپنے پیروں پر نہیں کھڑی ہو سکتی! میری پنڈلیاں اور رانیں شدید زخمی ہیں لیکن۔۔۔ لیکن تم۔۔۔ تم مجھے سہارا دے کر تو چل ہی سکتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے الگ ہوگئی مگر میرا دایاں بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں! میں۔۔۔ میرا بازو پکڑ کر جتنی بھی تیز چل سکتی ہو چلو!" میں نے قدم آگے بلکہ پیچھے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کیوں کہ میرا رخ لیوسی کی طرف تھا اور وہ دیوار میرے عقب میں تھی جہاں خلا پیدا کیا جا سکتا تھا۔

"لیکن۔۔۔ لیکن اللہ دتا!۔۔۔ ہم یہاں سے نکلیں گے کس طرح؟" لیوسی نے میرے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے سچ مچ ہیرو بننے کا خیال آیا۔ میں نے حتی الامکان اپنا سینہ پھلا کر اس کی بات کا جواب دیا۔ "یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو لیوسی! میں تمھارے ساتھ ہوں، تو پھر تمھیں فکرمند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی۔"

"تو۔۔۔ تو تمھیں یہاں سے نکلنے کا راستہ معلوم ہے؟" یہ سوال کرتے ہوئے لیوسی کا لہجہ پُرجوش تھا۔

"اللہ دتا کو کیا نہیں معلوم!" میں نے گردن اکڑا کر کہا۔ "وہ تو بس وقت وقت کی بات ہے ورنہ کیا رنجیت اور کیا بندریا، کیا صفدر علی بیگ وغیرہ، میں سب کو چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک سکتا ہوں۔"

"ارے!" اچانک لیوسی کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز

"یہ۔۔۔ یہ کون ہے؟"

میں نے دیکھا کہ لیوسی کی نگاہیں، رجنی کی لاش پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کی نظر شاید پہلے اس طرف نہیں اٹھ سکی تھی۔ رجنی کا سر، دوسری جانب ڈھلکا ہوا تھا اور اس کی لاش تھی بھی دور، اسی لیے لیوسی اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ لیوسی، رجنی کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔

"وہ مر چکی ہے۔" میں نے لیوسی کے سوال کا جواب دیا، پھر ذرا لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "رکو مت! قدم تیزی سے اٹھاؤ ورنہ تم بھی اس کی طرح لاش میں تبدیل ہو سکتی ہو!"

"کیا وہ بندریا ہے؟۔۔۔ اور۔۔۔ اور کیا تم نے اسے گولی ماری ہے؟" میری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے لیوسی حتی الامکان تیز قدم اٹھاتی ہوئی بولی۔

"یہ ایک 'مخفیہ راز' ہے جو اس وقت نہیں کھولا جا سکتا!" میں بولا اور بڑھ کر دیوار کے اس پتھر پر ہاتھ رکھ دیا جس کے دبانے سے خلا نمودار ہو سکتا تھا۔ میں اب لیوسی کے ساتھ دیوار تک پہنچ چکا تھا۔

فوراً ہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر چند لمحے بعد دیوار میں خلا نمودار ہونے لگا۔

لیوسی کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی اور پھر اس نے طویل سانس لیا۔

"آؤ!" میں، لیوسی کے ساتھ خلا کی طرف بڑھا۔ "تم نے دیکھا لیوسی کہ اللہ دتا کتنی توپ چیز ہے!"

"مگر۔۔۔ مگر تم کبھی کبھی بالکل احمق نظر آنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟" لیوسی میرے ساتھ بڑھتی ہوئی بولی۔

"یہ بھی ایک 'مخفیہ راز' ہے۔" میں رواروی میں کہہ گیا اور پھر مجھے خیال آیا کہ وہ کم بخت میرے ہی منہ پر مجھے احمق کہہ رہی تھی۔ "کیا کہا تم نے!" میں آنکھیں نکال کر بولا۔ "احمق ہوگی تم بلکہ احمق کی مادہ، احمق النساء!"

احمق النساء یعنی لیوسی نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔ اب میں اور وہ اس گہرے کنویں میں پہنچ چکے تھے جو کسی بھی لمحے "اپنی تشریف" اوپر لے جانے والا تھا۔

پھر وہی ہوا، اچانک میرے جسم کو جھٹکا سا لگا، اس کے بعد کنویں کی سطح بلند ہونے لگی۔ جھٹکا لگنے سے میں، لیوسی کے اوپر گر پڑا اور اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شاید اس کے جسم پر موجود متعدد زخموں میں سے کوئی زخم میرے نیچے دب گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ہلکی ہلکی گڑگڑاہٹ سی اب بھی سنائی دے رہی تھی اور سطح بلند ہوتے ہی کنویں میں تاریکی پھیل گئی تھی۔

لیوسی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

"ک۔۔۔ کیا ہوا لیوسی؟" میں نے اندھیرے میں اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا مگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی، گویا ٹٹولے جانے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ شاید میری طرح اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

"تم۔۔۔ تم نے میری زخمی پنڈلی۔۔۔ کچل دی۔" لیوسی کی آواز سنائی دی اور پھر وہ کراہنے لگی۔

اس کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ پھر میرے جسم کو جھٹکا سا لگا، اسی کے ساتھ میں نے خود کو اور لیوسی کو ہلکے ہلکے جھٹکے میں پایا۔ میں اور لیوسی، اس زیر زمین منحوس دنیا سے باہر آ چکے تھے۔ کنویں کی سطح رک چکی تھی۔ لیوسی کو میں نے واقعی گرے ہوئے دیکھا۔

اردگرد وہی شکستہ دیواریں اور کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے جن کی ویرانی، رات کے وقت اتنی اجاگر نہیں تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی۔

معاً میرے ذہن میں اس خطرے نے سر ابھارا کہ کہیں پھر وہ جگہ کنویں میں تبدیل نہ ہونے لگے۔ یہ خیال آتے ہی میں لیوسی پر برس پڑا جو "آرام" سے لیٹی ہوئی کراہیں "نشر" کر رہی تھی۔ "اب اٹھو گی بھی یا دوبارہ زمین کے اندر دھنسنا چاہتی ہو!"

میری بات سن کر لیوسی نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا دیا اور بولی۔ "میں۔۔۔ میں سہارے کے بغیر نہیں۔۔۔ نہیں اٹھ سکتی۔ میرا ہاتھ تھام لو اللہ دتا!"

"میلا ہاتھ تھام لو اللہ ڈتا!" میں نے منہ بگاڑ کر اس کے الفاظ دہرائے اور دل ہی دل میں کہا۔ تیرے ابا کا نوکر ہوں جو تجھے لادے لادے پھروں! پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے! میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہی دیا کیوں کہ میرے بائیں ہاتھ میں وہ چھوٹی سی اٹیچی تھی جو رجنی نے میرے حوالے کی تھی اور جس کے ذریعے میں سچ مچ ہیرو ثابت ہو سکتا تھا۔ رجنی مجھے بتا ہی چکی تھی کہ اس اٹیچی میں مجرموں کا سارا کچا چٹھا موجود ہے۔

لیوسی خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بن گئی تھی۔ اگر وہ میرے گلے نہ پڑ جاتی تو میں کب کا ان کھنڈرات سے نکل گیا ہوتا۔ مجھے اسی لیے اس پر تاؤ آ رہا تھا۔ پھر اس نے جیسے ہی میرا ہاتھ تھاما، میں نے اسے تقریباً گھسیٹ ہی لیا۔

وہ ہائے ہائے اور اُوئی اُوئی کرتی ہوئی اٹھ ہی گئی مگر میں نے اس کی "ہائے وائے" پر کان نہیں دھرے۔ بس اسے تقریباً کھینچتا ہوا تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔

"آہستہ... آ... ہستہ... اللہ دتا!" لیوسی نے ڈگمگاتے قدموں سے میرے ساتھ چلتے ہوئے فریاد کی۔ "میں اس قدر تیز نہیں چل سکتی۔"

"تو پھر یہیں رہ جاؤ اور بھک سے اُڑنے کا انتظار کرو۔" میں نے اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے تیور کر کہا۔

"کیا... کیا تم... تم مجھے اپنی پشت پر..."

"جی نہیں!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ وہ مجھے اپنی سواری کا گھوڑا بنانا چاہتی تھی اور ظاہر ہے کہ میں کوئی بوجھ ڈھونے والا جانور نہیں، آدمی تھا۔ میں نے ہاتھ چھڑانا تو چاہا تھا لیکن اس ناہنجار نے میری یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"میں اگر اس قابل ہوتی تو... تو ہرگز تمھیں یہ زحمت نہ دیتی اللہ دتا!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کوئی اندھی نہیں لگ رہی، ہاں!" میں جل کر بولا اور ہاتھ نچانے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا کیوں کہ میرا ایک ہاتھ اس ظالم کی گرفت میں تھا اور دوسرے میں اٹیچی تھی۔

اس کے بعد لیوسی نے مزید آہ و فغاں نہیں کی حالانکہ مقامات آہ و فغاں آئے تھے اور لیوسی کئی بار گرتے گرتے بچی تھی۔

ان کھنڈرات سے نکلتے نکلتے اس کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ میرے ساتھ تقریباً گھسٹنے لگی۔

"اب میں... میں مزید نہیں چل سکتی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈھیر ہو گئی اور کیوں کہ اس نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑا ہوا تھا اس لیے مجبوراً مجھے بھی ڈھیر ہونا پڑا۔

اسی وقت یوں معلوم ہوا جیسے قیامت آگئی ہو۔ میرے دونوں کانوں کے پردے جھنجھنا اٹھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زمین کو جاڑا بخار آگیا ہو۔ دھماکے پر دھماکا ہو رہا تھا اور زمین کانپ رہی تھی۔ میں جہاں ڈھیر ہوا تھا، وہیں لیوسی بھی پڑی تھی۔ نہ جانے کیسے میری ناک اس کی بغل میں گھس پڑی تھی۔ حالانکہ اس کے پسینے کی بدبو کے مارے مجھے اُبکائی آ رہی تھی مگر خوف کی وجہ سے میں ناک کی بجائے اپنا پورا چہرہ اس کی بغل میں گھسیڑے دے رہا تھا۔

جب دھماکے رکے تو مجھے رجنی کا خیال آیا اور میں اداس ہو گیا۔ ہائے وہ نازک سا جسم اس لیے تو نہیں تھا کہ یوں "بھک" کر اُڑ جائے۔ یہ سوچ کر میں نے ایک عدد طویل سانس کھینچنے کا آغاز کیا مگر اتنی زور کی اُبکائی آئی کہ "اُوئے" کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟... کیا ہوا اللہ دتا؟" لیوسی فکرمند لہجے میں بولی اور کہنیوں کے بل اٹھنے لگی۔

"ایک تو میری ناک سڑا دی اور پھر جلانے کو پوچھ بھی رہی ہو کہ کیا ہوا!" میں جل کر بولا۔ "سال بھر میں کبھی ایک آدھ بار نہا دھو بھی لیا کرو۔"

لیوسی میری بات کا جواب دینے کی بجائے کھنڈرات کی طرف دیکھنے لگی جو وہاں سے بس چند گز کے فاصلے پر تھے۔ میری نگاہ بھی اس طرف اٹھ گئی۔ وہ تو تھے ہی کھنڈرات، مزید کھنڈر بن گئے تھے۔

"اب یہاں سے اٹھو گی بھی یا اسی حسین منظر کا نظارہ کرتی رہو گی!" میں نے لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے جواب میں میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "اٹھاؤ مجھے!"

"تم نے پھر وہی لگائی!" میں آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں تم سے ویسے ہی جلا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے اُبکائی روکی ہے میں نے!"

"میں جلدی میں عطر لگانا بھول گئی تھی۔" اس نے کہا۔ "ویسے پسینہ سبھی کا بدبودار ہوتا ہے۔" وہ مُنہ بنا کر بولی۔

آج کا زمانہ ہوتا تو میں اسے تبت ٹالکم پوڈر لگانے کا مشورہ دیتا اور پوچھتا کہ اب بتاؤ، کہاں گئی پسینے کی بدبو! مگر وہ زمانہ اور تھا اس لیے چُپ ہو گیا۔ یوں بھی اب میری ناک محفوظ تھی، اس کی بغل سے دور! اور اب اُبکائی بھی نہیں آ رہی تھی۔

فوری خطرہ ٹل جانے کے بعد اب مجھے لیوسی پر رحم آنے لگا تھا۔ اس کی حالت واقعی خراب تھی۔ دوسرے پر رحم آنے کا بھی ایک وقت ہے۔ جب آدمی خود قابل رحم ہو تو ہرگز دوسرے پر رحم نہیں آنا چاہیے لیکن اگر اس منزل سے گزر جائے تو ضرور دوسرے کی طرف دیکھنا چاہیے۔ میں اسی لیے لیوسی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کا ہاتھ اب تک میری طرف اٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سی التجا تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "تم بھی کیا یاد کرو گی کہ تھا کوئی اللہ دتا!"

وہ کراہتی ہوئی اٹھی اور میں نے دوسرے ہاتھ سے اٹیچی اٹھا لی۔

"اگر تم پہلے کی طرح تیز تیز چلے تو میں تمھارا ساتھ نہیں دے پاؤں گی۔" لیوسی لڑکھڑاتے قدموں سے میرے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

"معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے زیادہ سبق نہ پڑھاؤ!"

"آخر تم مجھ سے اتنے بیزار کیوں نظر آ رہے ہو؟" لیوسی بولی۔ "پہلے تو تم اس طرح بات نہیں کرتے تھے۔"

"اچھا چپ چاپ چلتی رہو، زیادہ باتیں نہ کھپولو! ابھی وہ جگہ بہت دور ہے جہاں تم نے پھٹ پھٹ چھپوائی تھی۔ ابھی وہاں تک پیدل چل کر جانا ہے۔ اور چھپوا دو اتنی دور پھٹ پھٹ! اب خود پتا چل رہا ہوگا!" میں نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم خود بھی جانتے ہو کہ مصلحت اسی میں تھی۔" لیوسی آہستہ سے بولی۔

"سب پتا چل جاتی مصلحت، اگر میں تمھیں وہیں بھک سے اُڑنے کے لیے چھوڑ آتا۔"

"مجھے بے وقوف نہ بناؤ، تم ایسا ہرگز نہیں کرتے۔" لیوسی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "اگر مجھے خود ہی ہوش نہ آگیا ہوتا تو بھی تم تنہا فرار نہ ہوتے۔"

میں نے اسے بتانا ضروری نہ سمجھا کہ میں نے اس وقت کیا سوچا تھا۔ وہ تو اس کی زندگی ہی تھی کہ عین وقت پر گرتی پڑتی میرے پاس پہنچ گئی تھی ورنہ اس کا انجام بھی رجنی سے مختلف نہ ہوتا۔ وہ زبردستی مجھے اپنا محسن بنائے لے رہی تھی اس لیے اس "نیک بخت" کو اس کی خوش فہمی پر "مجبو" رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

"بس یہی تو بات ہے جس کی وجہ سے تم سر پر چڑھ گئی ہو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وقت تم یوں "گٹر گٹر" نہ کر رہی ہوتیں۔" میں سینہ پھلا کر بولا۔

کراہنے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ بظاہر تم انٹ شنٹ اور بے تکی باتیں کر کے مجھے تنگ کرتے رہتے ہو مگر... مگر تمھارے دل میں میرے لیے جگہ موجود ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں نا!"

"لو اور سنو، یہ کیا بات ہوئی!" میں بولا۔ "اتنے سے دل میں تمھارے لیے کہاں سے جگہ آ جائے گی! کمال ہے! خود بے تکی باتیں کرتی ہو اور مجھ پر الزام دھرتی ہو۔"

"تم یہی کہتے رہو مگر میں جانتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔" وہ ہنسی بولی۔

"جانتی ہو تو جانتی رہو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ذرا اور تیز چلو! اگر اسی طرح چلتی رہیں تو شام ہو جائے گی، وہاں تک پہنچتے پہنچتے جہاں پھٹ پھٹ ہمارا انتظار کر رہی ہے۔"

میری تاکید پر اس نے کچھ اور ہمت پکڑی حالانکہ اب تک بھی اسی کا دم تھا جو چل رہی تھی۔ اگر خدا نہ کرے میرا یہ حال ہوتا تو لمبا لمبا لیٹ گیا ہوتا اور چلنا تو درکنار اٹھ کر بھی نہ بیٹھتا۔

لیوسی اور میں اسی طرح چونچیں لڑاتے ہوئے بالآخر وہاں پہنچ گئے جہاں پھٹ پھٹ "لیٹی" ہوئی تھی۔ لیوسی کو سڑک تک مزید پیدل چلنا پڑا کیوں کہ وہاں کھائی کھڈے بہت تھے۔ لیوسی نے فرمائش کی تھی کہ میں اسے موٹر سائیکل پر بٹھا لوں، پھر سڑک کی طرف موٹر سائیکل گھسیٹتا ہوا پاپیادہ چلوں۔ ظاہر ہے کہ میں اس کا عاشق زار تو تھا نہیں جو خود دکھ جھیل کر اس سے چین کی بنسری بجواتا اس لیے اسے پیدل ہی چلنا پڑا۔

"میں جانتی ہوں اللہ دتا، کہ تم اس طرح مجھے سختیاں جھیلنے کا عادی بنانا چاہتے ہو۔" لیوسی نے کہا تھا اور پھٹ پھٹ کا ہینڈل پکڑ کر چلنے لگی تھی۔

سڑک تک آتے آتے اس کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی تھی۔ میں نے خود اسے تقریباً گود میں لے کر پھٹ پھٹ پر بٹھایا تھا۔ اٹیچی میں نے اسے ہی تھما دی تھی جو زیادہ وزنی نہیں تھی۔

جب میں نے پھٹ پھٹ اسٹارٹ کی تو وہ میری کمر سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے زخمی ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا ورنہ ڈانٹ دیتا۔ بھلا یہ کوئی ضروری ہے کہ بغیر لپٹا چپٹی کے پھٹ پھٹ پر بیٹھا ہی نہ جائے۔

اگر لیوسی مجھ سے یہ نہ کہتی کہ پہلے اسے اس کے گھر چھوڑ دوں تو بھی میں یہی کرتا۔ میرے محلے والے اگر اسے یوں سرعام مجھ سے لپٹا ہوا دیکھ لیتے تو ابا سے شکایت کر کے میری ٹھکائی کرا دیتے اور میں ہیرو ویرو بننا سب بھول جاتا۔

میں جب لال کنویں پہنچا تو اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ موٹر سائیکل، لیوسی کے دروازے پر رُکی تو اسی وقت ایک بوڑھی سی "لم ڈور" عورت نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ پھر لیوسی پر نظر پڑتے ہی وہ دروازہ کھول کر تیر کی طرح باہر آئی۔

"لیوسی! بیب مجھے... تجھے کیا ہوا؟" بڑھیا کی آواز میں

تشویش تھی۔

"کچھ نہیں ممی! کچھ بھی نہیں!" لیوسی پھٹ پھٹ سے اترتے ہوئے بولی اور اپنے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

"ن... نہیں تو... تو... سخت زخمی لگتی ہے۔" بڑھیا نے لیوسی کو سہارا دیا اور گھر کے اندر لے جانے لگی۔ اٹیچی اب بھی لیوسی کے ہاتھ میں تھی۔

دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں! یہ بھی خوب رہی۔ وہ سارے رازہائے سربستہ لے کر اُڑی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا اور جلدی سے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر گھس گیا۔

اندر گھستے ہی مجھے وہ دونوں نظر آ گئیں۔ لیوسی کی ممی اسے سہارا دیے چلی جا رہی تھی۔ یا تو خود لیوسی نے وہ اٹیچی اپنی ممی کو دے دی تھی یا بڑھیا ہی نے اپنی دخترِ نیک کا بوجھ سنبھال لیا تھا۔ بہرحال وہ اٹیچی اب بڑھیا کے ہاتھ میں تھی اور میں یہ منظر دیکھ کر جل بھن گیا تھا۔ میرے جی میں آئی کہ لپک کر بڑھیا سے اٹیچی چھین لوں مگر یہ حرکت مجھے ذرا اخلاق کے منافی نظر آئی اس لیے میں نے لیوسی کو پکارا۔

"آؤ... آؤ بیٹے! تم بھی آ جاؤ!" لیوسی کی بجائے بڑھیا میری طرف مڑ کر بولی۔ "لیوسی کو اس حالت میں دیکھ کر میں تمھیں بھول ہی گئی تھی۔"

میں قدم بڑھا کر ان دونوں کے قریب پہنچ گیا اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "یہ اٹیچی میری ہے، مجھے دے دیں۔"

بڑھیا نے لیوسی کی طرف دیکھا۔

"دے دیں ممی!" لیوسی بولی، پھر مجھ سے کہا۔ "کچھ دیر تو بیٹھو اللہ دتا!"

میں نے بڑھیا کے ہاتھ سے اٹیچی لے لی اور سکون کا سانس لیا۔ اٹیچی مجھے مل گئی تھی اس لیے اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی اس لیے وہاں کچھ دیر بیٹھا جا سکتا تھا، پھر بھی مجھے امی کا خیال تھا۔ میں رات بھر غائب رہا تھا۔ وہ رات بھر میں نہ جانے کتنی بار لوٹا نے کربیت الخلا گئی ہوں گی اور نہ جانے مجھے کیا کیا بُرا بھلا کہا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں بولا۔ "نہیں لیوسی! اب پھر ملیں گے۔ میری امی فکر کر رہی ہوں گی۔"

"ہاں ہاں جاؤ بیٹا!" لیوسی کی ممی نے جلدی سے کہا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمھیں اپنی ماں کا اتنا خیال ہے۔" پھر اس نے لیوسی کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "یہ بھی تمھارا ساتھی ہے؟"

"ہاں ممی!" لیوسی نے جواب دیا۔

اب وہ دونوں ماں بیٹی، اندرونی کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھیں۔

"اچھا تو میں چلا لیوسی!" میں نے کہا۔

"تم آج دفتر جاؤ گے؟" لیوسی نے مڑ کر پوچھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مجھ سے ملتے ہوئے دفتر جاؤ؟" اس نے رک کر کہا۔

"مگر... تم تو اس قابل نہیں ہو کہ دفتر چل..."

"میں دفتر جانے کے لیے نہیں کہہ رہی۔" وہ میری بات کاٹتی ہوئی بولی۔ "دراصل میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اگر موقع مل گیا تو آ جاؤں گا ورنہ پھر شام کو دفتر سے لوٹتے ہوئے آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ضرور!" اس نے تاکید کی۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں مڑ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ لیوسی کو مجھ سے کیا ضروری باتیں کرنا ہیں۔ وہ یقیناً ان رازہائے سربستہ کو جاننا چاہتی ہوگی جو خود بہ خود گویا میری جھولی میں آ گرے تھے اور جو اس اٹیچی میں بند تھے جسے ابھی کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

میں گھر پہنچا تو امی نے مجھے واقعی آڑے ہاتھوں لیا۔ غصّے میں میرے سر کے بال پکڑ کر دو چار ہاتھ مُنہ پر جڑ دیے۔ بڑے بھیا اس وقت میری بدقسمتی سے گھر پر موجود تھے۔ انھوں نے امی کو اور شہہ دی۔ "اور لگاؤ دو چار ہاتھ اماں! بدنام تو میں ہوں مگر آوارہ یہ ہے۔"

"تو چُپ رہ!" امی نے انھیں ڈانٹ دیا اور مجھ سے بولیں۔ "اب رہے گا، رات رات بھر گھر سے غائب؟"

"مگر امی، میں... میں تو آپ سے کہہ کر گیا تھا۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں صفائی پیش کی۔ "میں دفتر کے کام ہی تو گیا تھا۔ تمھارے سر کی قسم، جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"اے اماں کے سر کی جھوٹی قسم کھائی تو جان سے مار دوں گا۔" بڑے بھیا بھی میری طرف جھپٹے۔

امی نے میرے سر کے بال چھوڑ کر مجھے ان کے "ہتھے" میں آنے سے بچا لیا اور چیخ کر بولیں۔ "میرے ہوتے ہوئے تو کون ہوتا ہے، اس پر ہاتھ اٹھانے والا! کیا وہ جھوٹی قسم کھائے گا!"

"اماں! تمھاری ڈھیل ہی نے تو اسے بگاڑ دیا ہے۔" بڑے بھیا مجھے گھورتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ "میں تو اسے

ایک دن میں سیدھا کر دوں۔"

"پہلے خود تو سیدھا ہو جا کم بخت! پھر اسے سیدھا کریو! کب سے تجھ سے کہ رٹی تھی کہ بندو خاں کے گھر چلا جا، بار ڑے! مُرگی ٹلا یہاں سے!"

"غائب یہ رہے رات بھر اور میں اسے ڈھونڈتا پھروں!" بڑے بھیا بولے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے ٹل گئے تاکہ مزید لتاڑ نہ پڑے۔

میں موقع پا کر کمرے کی طرف بڑھا تو امی نے ہانک لگائی۔

"ارے کچھ ٹھونس بھی لیا ہے یا بھوکا ہی ہے؟"

"نہیں امی، رات سے کچھ نہیں کھایا۔" میں نے مڑ کر مظلوم لہجے میں جواب دیا۔

"اسی لیے تو سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ چل جلدی سے کپڑے بدل کر باورچی خانے میں آ جا، میں ابھی پراٹھے ڈالتی ہوں، سالن رات کا بچا رکھا ہے۔"

بھوک کے مارے واقعی میری آنتیں فریاد کر رہی تھیں اس لیے جلدی سے کمرے میں اٹیچی چھپانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے اور باورچی خانے میں پہنچ گیا۔ مجھے کوٹ کاٹ کر امی کے دل کی بھڑاس نکل گئی تھی اس لیے وہ مجھ پر صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں۔ عام حالات میں وہ کبھی گھی میں چُپڑے ہوئے پراٹھے نہیں کھلاتی تھیں مگر اس وقت انھوں نے ایسا ہی کیا اور میں بھی اکڑوں بیٹھ کر گرم گرم پراٹھے اُڑاتے چلا گیا۔ پراٹھوں کے ساتھ رات کی بچی ہوئی اُڑد کی دال تھی جسے امی نے گھی ڈال کر گرم کر دیا تھا۔ میں نے پورے تین پراٹھے کھانے کے بعد پانی کا کٹورا اٹھایا۔

"اور ڈالوں پراٹھا؟" امی نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

میں نے انکار کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہرچند کہ پراٹھوں میں مزہ آ رہا تھا مگر کم بخت پیٹ میں گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ کاش اللہ میاں، آدمی کے پیٹ میں بھی ایک عدد اسٹور روم الگ سے بنا دیتا کہ بوقتِ فرصت اچھی خوراک اس کے اندر جمع کر لیا کرتا اور جب بھوک سے جان لبوں پر آ رہی ہوتی تو کھٹا کھٹ جگالی کرنے لگتا، اونٹ کی طرح!

پیٹ بھرے پر عموماً دور کی سوجھتی ہے مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے دور کی نہیں قریب کی سوجھی، یعنی اپنے کمرے میں جانے کی! جہاں ایک چارپائی کے نیچے وہ اٹیچی موجود تھی جس کے سبب بی فاختہ، یعنی رجنی عرف بندیا نے نہ صرف دکھ جھیلا تھا بلکہ بےچاری دکھ جھیلتے جھیلتے اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس اٹیچی کے اندر انڈے نہیں تھے اور نہ خدانخواستہ

میں کوتا تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ تحریر میں فصاحت پیدا کرنے کے لیے محاورے ضرور لکھنا چاہئیں، سو عموماً میری کوشش یہی ہوتی ہے۔

امی سے میں نے یہی کہا تھا کہ اندر سے کمرے کی کنڈی لگا کر سو رہا ہوں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ مجھے نیند آ رہی تھی مگر بھلا یہ کس طرح ممکن تھا۔ اٹیچی کھول کر اس کے اندر موجود سربستہ رازوں کو جانے بغیر بھلا مجھے کیسے چین آ سکتا تھا۔

کنڈی لگاتے ہی میں نے اٹیچی کو چارپائی کے نیچے سے گھسیٹ لیا۔ میرا دل اس وقت دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ میں نے اٹیچی کو چارپائی پر رکھا اور پھر اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ اٹیچی کا پیٹ بالکل میرے پیٹ کی طرح "فُل فُل" بھرا ہوا تھا مگر میرے پیٹ میں پراٹھے تھے اور اٹیچی کے پیٹ میں فائلیں!

میں نے ایک ایک کر کے ساری فائلیں پڑھ ڈالیں اور میری آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود مزید کھل گئیں۔ میں جیسے جیسے فائلیں پڑھتا چلا جا رہا تھا، میرے اندر جوش پیدا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخری فائل پڑھنے تک میری نیند پوری طرح اُڑن چھو ہو چکی تھی۔

یہ عین ممکن ہے اور میرے اختیار میں ہے کہ ابھی وہ سب کچھ بیان کر دوں جو میں نے ان فائلوں میں پڑھا تھا لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ مجھے ایک بار کسی جہاں دیدہ اور قاری کی نفسیات سمجھنے والے مدیرِ شہیر نے بتایا تھا کہ جو واقعہ بھی بیان کرو، اس طرح بیان کرو، اس میں بھرپور تجسّس برقرار رہے۔ چاہے پہلے ہی سب کچھ معلوم ہو جائے مگر اسے بیان کرو آخر میں! اس طرح تجسّس برقرار رہتا ہے۔ تو میں اس مدیرِ شہیر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ابھی ہرگز یہ بیان نہیں کروں گا کہ اصل "ڈریا نہ" کیا تھا! "اصل ڈریا مے" کو آخر ہی میں بیان کرنا بھلا لگتا ہے، چاہے وہ پہلے ہی علم میں کیوں نہ آ جائے۔

مجھے اس وقت رجنی عرف بندیا پر بڑا پیار آ رہا تھا جس نے میرے لیے ہیرو بننے کے تمام مواقع بہ یک وقت فراہم کر دیے تھے۔ اس کی زندگی رائیگاں نہیں گئی تھی بلکہ میرے کام آ گئی تھی۔

جوشِ جذبات میں نیند ویسے ہی غائب ہو چکی تھی اس لیے میں نے فوراً خفیہ کے دفتر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ پھر کیا تھا، میں نے جھٹا جھٹ ساری فائلیں اٹیچی میں رکھیں اور اسے بند کر کے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں جب کمرے سے اٹیچی لیے باہر آیا تو امی، صحن میں بچھی ہوئی چوکی پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تھالی تھی اور وہ دال سے کنکریاں چن رہی تھیں۔

"ارے تُو تو سو رہا تھا! اب کدھر چلا؟" امی مجھ پر نظر پڑتے ہی بولیں۔

میں گڑبڑا گیا۔ جھوٹ کبھی نہیں پھلتا۔

"امی! وہ... وہ مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ... کہ دفتر..."

"ہر وقت دفتر!" امی میری بات کاٹتی ہوئی بولیں "اس موئے دفتر میں ہر وقت آگ لگی رہتی ہے۔ دن ہو کہ رات تیرے سر پہ ہر وقت دفتر سوار رہتا ہے۔ کیا آج چھٹی نہیں کر سکتا؟"

"اگر میں نے آج کی چھٹی کر دی امی، تو میری چھٹی کر دی جائے گی۔" میں نے مظلوم بن کر کہا۔

دھمکی کارگر ہوئی۔ امی کچھ دیر بڑبڑا کر چپ ہو گئیں۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں اٹیچی سمیت دفتر کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے لیوسی کا خیال بھی آیا مگر میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ فی الحال تو میری آنکھوں میں تیواڑی جی کا چہرہ گھوم رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جب انھیں پتا چلا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا کارنامہ وجود میں آ چکا ہے تو مسکراتے ہوئے ان کی مونچھیں بار بار کس طرح پھڑکیں گی۔

خیالوں کے اڑن کھٹولے پر بیٹھا ہوا، میں اڑتا رہا اور پھر اڑتے اڑتے دفتر پہنچ گیا۔

دفتر پہنچ کر میں نے اپنے کمرے کی طرف جانے کی بجائے تیواڑی جی کے کمرے کا رخ کیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تیواڑی جی ابھی ابھی آئے ہیں اور نہ جانے کیوں ان کی صورت پر بارہ بجے ہوئے ہیں، موڈ بہت خراب ہے۔ یہ بات مجھے ان کے پی اے نے بتائی تھی۔

"جورو سے جھگڑا ہو گیا ہو گا۔" میں نے جواب میں پی اے سے کہا۔

"جی!" پی اے حیرت سے بولا، پھر چند لمحے بعد کہا "وہ ابھی سیدھے گھر سے نہیں آ رہے بلکہ آئی جی صاحب کے کمرے سے آ رہے ہیں۔"

"پھر آئی جی صاحب نے ڈانٹ پلائی ہو گی۔" میں نے خیال آرائی کی۔

اس مرتبہ بھی پی اے نے حیرت کا اظہار کیا تھا، پھر کہا تھا "آتے ہی صاحب نے مجھے بے سبب ڈانٹ دیا تھا۔ میرا مشورہ مانیں تو کچھ دیر بعد مل لیں، آج صاحب بہت غصے میں ہیں۔"

پی اے نے مجھے لاکھ ڈرانا چاہا مگر اس وقت میں شیر ہو رہا تھا کیوں کہ میرے ہاتھ میں وہ اٹیچی تھی جس کے اندر میرے ہیرو بننے کا تمام سامان موجود تھا۔

"تم اطلاع تو کراؤ اندر!" میں نے کہا۔

"آپ جانیں۔" پی اے نے یہ کہتے ہوئے گھنٹی بجائی اور پھر چپراسی سے میری آمد کی اطلاع کرائی۔

میں پی اے کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"صاحب کی نوکیلی مونچھوں سے آپ نہ ڈرا کرو! بعض اوقات مسکرانے کی وجہ سے بھی ان کی مونچھیں پھڑکنے لگتی ہیں۔"

پی اے نے جواب میں دانت نکال دیے اور کہا "یہ مجھے بھی علم ہے جناب! مجھے صاحب کے ساتھ پورے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ میں انھیں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ وہ بہ ظاہر جتنے سخت نظر آتے ہیں، دل کے اتنے ہی نرم ہیں۔ پچھلے سال انھوں نے میری بہت اچھی رپورٹ لکھی تھی جس پر مجھے ترقی مل گئی تھی۔"

چپراسی کے آنے تک پی اے اپنے صاحب بہادر کی شان میں قصیدے پڑھتا رہا۔

"صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" کچھ دیر بعد چپراسی نے آ کر بتایا۔

"دیکھا تم نے!" میں اٹھتا ہوا پی اے سے بولا "بلا لیا نا فوراً!"

"جی ہاں! مگر اندر جا کر آپ کو صحیح صورت حال کا پتا چل جائے گا۔" پی اے نے آخری وقت بھی مجھے دھمکانے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں "دھمک" بھی جاتا مگر اس وقت تو مجھ پر کامیابی کا نشہ سوار تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا تیواڑی جی کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا، تیواڑی جی کی نگاہ دروازے ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے ان کے قریب جاتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے قریب پہنچتے ہی وہ مجھے پھاڑ کھائیں گے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے اور نوکیلی مونچھوں پر جارحانہ انداز چڑھ آیا تھا۔ وہ بار بار اپ اینڈ ڈاؤن ہو کر مجھے دہشت زدہ ہونے پر مجبور کر رہی تھیں۔

تیواڑی جی کو میں نے اس سے پہلے اتنے شدید غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا پی اے غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر کامیابی کا نشہ ہرن ہونے لگا اور میں لرزتے کانپتے قدموں سے بہ مشکل ان کی میز تک پہنچ سکا۔

اس وقت تیواڑی جی نے مجھ سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا حالاں کہ یہ بات خلافِ اخلاق تھی۔ پھر چند لمحے بعد ہی ان کی چنگھاڑ سنائی دی "یہاں کیوں آئے ہو؟"

"م... میں... میں سر؟"

"اور کیا تمھارا سر!" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولے۔

"مجھے کچھ کہنا تھا۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے میرا حکم سن لو!" وہ میز پر ہاتھ مار کر بولے۔

"سنائیں!" میں نے فرماں برداری کا اظہار کیا۔

"اگر ایک ہفتے کے اندر اندر وہ کیس نہیں نمٹا جو تمھارے سپرد کیا گیا ہے تو میں... میں تمھارا جواب طلب کر لوں گا، تحریری جواب!"

...یش کے عالم میں بولے "اس کیس میں رکھا ہی کیا ہے سر؟ تم سنا شی شو ہو... یسے بہت سے لونڈوں کو میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے ...ہے۔"

"ٹانگ کے نیچے سے سر!" میں نے حیرت سے کہا "وہ کس ...سر؟"

"بکواس مت کرو!" وہ چیخے۔

"ویسے سر آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو!" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولے۔

"یہ کیس میرے علاوہ اور کس کس کے سپرد کیا گیا ہے؟" میں نے ...چتے ہوئے کہا۔

"تمھیں اس سے کیا غرض!" وہ سخت لہجے میں بولے "میں نے ...جو وقت دیا ہے، اس سے ایک دن بھی زیادہ برداشت نہیں کیا ...گا۔ آئی جی صاحب بہت خفا ہیں۔ کل شام سر تھامسن نے ...طلب کیا تھا۔"

اب میں سمجھ گیا کہ سلسلہ کہاں سے چلا تھا۔ خفیہ کے ڈائریکٹر ...تھامسن نے آئی جی صاحب کو ڈانٹ پلائی ہو گی، آئی جی صاحب ...نے غصہ ڈی آئی جی تیواڑی جی پر اتارا ہو گا اور تیواڑی جی مجھ پر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہے ہوں گے۔

مجھے خاموش دیکھ کر تیواڑی جی پھر گرجے "بولو! ایک ہفتے کے ...در یہ کیس حل ہو جائے گا یا نہیں؟"

"اس کیس میں رکھا ہی کیا ہے سر! جب چاہوں چٹکی بجاتے ...ل۔" یہ کہتے ہوئے میں نے چٹکی بھی بجائی۔

"کیا بک رہے ہو!" تیواڑی جی نے مجھے گھورا "اور یہ کیا ...اپن ہے؟"

"کون سا سر؟" میں حیرت سے بولا۔

"تم نے چٹکی کیوں بجائی؟"

"تاکہ آپ کو یقین آ جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"ابھی تم کیا بکواس کر رہے تھے کہ جب چاہو یہ کیس حل کر دو؟"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا سر! آپ پوچھیں جو پوچھنا ہے۔"

...بنہ کر بولا۔

"اور اگر تم میرے سوالات کا جواب نہ دے پائے تو؟"

"تو جو چور کی سزا وہ میری!"

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ بھگوان داس کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟" ...نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ وہ سنگٹھن کے کچھ اہم رازوں سے واقف ہو گیا ...س لیے بھی کہ وہ سنگٹھن سے ...دت پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہ جاتا تو ممکن تھا، سنگٹھن کے راز کھول دیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ سنگٹھن کیا بلا ہے؟"

"یہ اس خفیہ تنظیم کا نام ہے جو حکومت کے خلاف کام کر رہی ہے۔" میں نے بتایا۔

تیواڑی جی اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور انھوں نے جلدی سے ایک سگریٹ سلگا کر اس کا کش لیا، پھر طویل سانس لے کر بولے۔

"اچھا تو تم حقیقت تک پہنچ چکے ہو! ذرا تفصیل سے بتاؤ!" اب تیواڑی جی کا لہجہ بدل چکا تھا۔

"جی نہیں! آپ سوال کریں، میں اس کا جواب دوں گا۔" میں ان کا بدلا ہوا لہجہ دیکھ کر پھیل گیا۔

"چلو یہی سہی!" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مسکرا کر بولے "یہ بتاؤ کہ اس خفیہ تنظیم کا مقصد کیا ہے؟"

"بہ ظاہر مقصد تو حکومت کے خلاف مسلح بغاوت ہے لیکن اصل مقاصد آزادی حاصل کرنا نہیں، کچھ اور ہیں جیسا کہ تنظیم کی اب تک کارکردگی سے پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا "چند سرمایہ دار جذباتی قسم کے نوجوانوں کو جمع کر کے اپنے اغراض و مقاصد پورے کر رہے ہیں لیکن تنظیم میں شامل نوجوانوں کو یہی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ وہ اس طرح آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرمایہ دار اس تنظیم کی صرف پشت پناہی نہیں کر رہے بلکہ تنظیم کی داغ بیل ہی انھوں نے ڈالی ہے!"

"جی ہاں سر! تنظیم کے نو بنیادی ارکان ہیں اور وہ سبھی سرمایہ دار ہیں۔"

"تنظیم کا صدر کون ہے؟"

"سیٹھ وشوا ناتھ۔" میں نے جواب دیا، پھر ان کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے بولا "تنظیم کا سیکریٹری یعنی معتمد صفدر علی بیگ اور خازن ڈلیسائی ہے، اے کے ڈلیسائی!"

"تنظیم کے کل ممبروں کی تعداد کتنی ہے؟"

"ایک سو چالیس۔" میں نے جواب دیا "اور میں ان کے نام پتے بھی جانتا ہوں۔"

"تم یہ سب باتیں اتنے یقین سے کس طرح کہہ رہے ہو اللہ دتا؟ تمھارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟" تیواڑی جی بولے۔

"میں ثبوت ہی ثبوت لے کر آیا ہوں سر!" یہ کہتے ہوئے میں نے اٹیچی کو تیواڑی جی کی میز پر رکھ دیا۔

"اس میں کیا ہے؟" تیواڑی جی نے حیرت سے کہا۔

"اس اٹیچی کے اندر وہ ثبوت ہیں سر جو میں نے اپنی جان پر

کمیں کر حاصل کیے ہیں۔ میں شیر کی کچھار میں گھس کر انھیں نکال کر لایا ہوں۔" میں گردن اکڑا کر بولا۔

"اچھا بیٹھو تو!" تیواڑی جی کی "رگ اخلاق" کافی دیر بعد پھڑکی کیوں کہ اب تک نہ انھوں نے مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا اور نہ میں نے خود یہ جسارت کی تھی اس لیے ابھی میں کھڑا ہوا ہی تھا۔

بیٹھتے ہی میں نے اٹیچی کھولی اور اوپر ہی رکھی ہوئی ایک فائل اٹھالی۔ اس فائل پر بڑے بڑے حروف میں سنگٹھن لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے بنیادی ارکان درج تھا۔

فائل میں پہلے کاغذ پر نو افراد کے نام، پتے اور عہدے درج تھے۔ اس کے بعد ان نو افراد کے حلف نامے تھے۔ میں نے بآواز بلند پہلا حلف نامہ پڑھنا شروع کیا۔ "میں سیٹھ وشوا ناتھ ولد دُوارکا ناتھ اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ تنظیم کے اغراض و مقاصد پر ہر حال میں عمل کروں گا۔ اپنے وطن کو بدیسی حکمرانوں کے چنگل سے نکالنے کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہو سکا، کروں گا۔ میرے تمام وسائل اور سارے ذرائع سنگٹھن کے لیے ہوں گے۔ میں اپنے خون سے دستخط کر کے اس عہد نامے کی توثیق کرتا ہوں۔" حلف نامہ پڑھ کر میں نے طویل سانس لیا، پھر بولا۔ "سر! اس حلف نامے کے نیچے سیٹھ وشوا ناتھ کے دستخط بھی ہیں، دھندلے دھندلے اور کتھئی سے!" یہ کہہ کر میں نے تیواڑی جی کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔

"تم... تم اللہ دتا!... تم نے تو کمال کر دیا!" جوش جذبات سے ان کی آواز اور مونچھیں دونوں ہی کانپ رہی تھیں۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ... کہ تمھیں اٹھ کر سینے سے لگا لوں! تم نے میری عزت رکھ لی۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ جو کیس پولیٹیکل برانچ والے بھی حل نہ کر سکے، وہ... وہ ہم نے... ہماری برانچ نے حل کر دیا مگر... مگر یہ کارنامہ تم نے انجام کیسے دیا؟"

مارے خوشی کے میری ہنسی نکلی پڑ رہی تھی، سینہ بار بار پھول اور پچک رہا تھا۔

"سب کچھ کیسے ہوا سر، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ پہلے آپ تمام فائلیں دیکھ لیں۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" تیواڑی جی خوش ہو کر بولے۔ "اتنے میں تمھارے لیے چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے گھنٹی بجائی اور چپراسی اندر آیا تو اسے فوراً چائے لانے کے لیے کہا۔

پھر تیواڑی جی نے اٹیچی سے فائلیں نکالنا شروع کیں۔ انھوں نے عہد ناموں والی فائل پہلے پڑھی مگر اس میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا کیوں کہ سارے ہی عہد ناموں کا مضمون سوائے ناموں کے یکساں تھا، صرف نام، پتے اور عہدے بدلتے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے وہ فائل اٹھائی جس پر اغراض و مقاصد لکھا ہوا تھا۔ ایک فائل میں اراکین کے نام پتے درج تھے۔ ایک فائل تنظیم کی اب تک کی کارکردگی سے متعلق تھی۔ تیواڑی جی نے اس فائل کو کافی توجہ سے پڑھا، پھر کافی دیر بعد اسے رکھتے ہوئے بولے۔ "تم نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا کہ درپردہ اس تنظیم کے مقاصد اور ہی ہیں۔ تنظیم کی کارکردگی سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔"

"آپ نے اس فائل میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ ان بلیک میلروں کو تنظیم ہی نے زہر دلوایا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں پڑھ چکا ہوں۔" تیواڑی جی نے تصدیق کی۔

"اس کا مقصد یہ ہوا کہ تنظیم ان بلیک میلروں کی قاتل ہے جو سیٹھ وشوا ناتھ کو بلیک میل کر رہے تھے۔"

"بالکل!" تیواڑی جی نے میرے اس خیال سے بھی اتفاق کیا۔

"اس فائل میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان بلیک میلروں کو کیوں قتل کرانا پڑا۔"

"اس لیے کہ عہد ناموں والی فائل ان بلیک میلروں کے ہاتھ چلی گئی تھی اور وہ اسے پڑھ چکے تھے۔" میں بولا۔

"یہ اہم فائل سیٹھ وشوا ناتھ اپنے پاس ہی رکھتا ہوگا اور وہیں سے یعنی اس کی تجوری ہی سے یہ فائل چوری بھی ہوئی تھی۔ پھر بعد میں حفاظت کے خیال سے اس فائل کو دیگر فائلوں کے ساتھ رکھا گیا ہوگا اور وہ جگہ یقیناً ان کی نظر میں محفوظ ہوگی۔" یہ کہتے ہوئے تیواڑی جی نے ایک اور فائل اٹھالی۔

مجھے علم تھا کہ اس فائل میں تنظیم کے ارکان کے تفصیلی حالات درج تھے۔ ان میں صرف دو نام ایسے تھے جن کے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور یہ نام آخر میں لکھے گئے تھے۔ یہ دونوں نام رنجیت اور ہندیا کے تھے۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ تنظیم کے بڑے ان دونوں کے ماضی سے واقف نہیں تھے۔

اس فائل پر تیواڑی جی نے سرسری سی نگاہ ڈالی تھی مگر آخری صفحے پر رک گئے تھے۔

"ہندیا اور رنجیت! غالباً تم پہلے بھی ان دونوں کا ذکر کر چکے ہو۔" تیواڑی جی فائل سے نظر ہٹائے بغیر بولے۔

"یہ دونوں وہی ہیں جو بھگوان داس کے قتل میں ملوث تھے" میں نے کہا۔

"اچھا!" تیواڑی جی طویل سانس لے کر بولے۔ "مجھے یاد آگیا لیکن ان دونوں کے ماضی سے تنظیم بھی واقف نہیں ہے۔ عجیب سی بات ہے۔ صرف ان دونوں ہی کے حالات درج نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں کچھ عرصے قبل ہی تنظیم میں شامل ہوئے ہوں۔"

"ویسے ان دونوں میں سے ایک کے ماضی سے آپ کا [...]ادم اچھی طرح واقف ہے۔" میں ڈرامائی انداز میں تیواڑی جی کی [...]ف دیکھتا ہوا بولا۔

"وہ کیسے؟" تیواڑی جی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہی تو آپ کے خادم کا کمال ہے سر!" میں اور بھی پھول [...]پھر تیواڑی جی کو بانس پر چڑھانے کے لیے بولا۔ "آخر شاگرد [...]تو میں آپ ہی کا ہوں۔ آپ ہی نے تو مجھے سب کچھ [...]ایا ہے۔"

"وہ تو خیر تمھاری لائقی ہے کہ ایسا سمجھتے ہو مگر بتاؤ تو سہی کہ [...]ات تنظیم بھی نہ جان سکی وہ تم نے کس طرح معلوم کر لی!"

"ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آپ سے پوچھا تھا سر کہ اس کیس [...]ر کون کون کام کر رہا ہے تو آپ نے فرمایا تھا، میں بکواس نہ کروں [...] سر مجھے علم تھا، خفیہ کی دوسری برانچ بھی اس کیس پر کام کر [...]تھی۔ پہلے یہ بتائیں کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"وہ بات بھول جاؤ اللہ دتا!" تیواڑی جی محبت بھرے لہجے [...]بولے۔ "پیار بھی اپنوں پر آتا ہے اور غصہ بھی! اس وقت میں [...]یں تھا۔ ویسے تمھارا خیال درست ہے۔ پولیٹیکل برانچ بھی [...]س پر کام کر رہی تھی لیکن اس کیس کا آغاز جرم سے ہوا تھا [...]منے ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ ہاں اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے۔"

"پولیٹیکل برانچ کی انسپکٹر لیس رجنی بھی مجرموں کے پیچھے [...]ئی تھی۔" میں نے انکشاف کیا۔

"ہاں، میں اسے جانتا ہوں، وہ بے حد ذہین لڑکی ہے۔" [...]ی جی نے کہا۔

"[...]ہے نہیں سر! بلکہ تھی!"

"کیا مطلب؟" تیواڑی جی تقریباً اچھل پڑے۔

"مجھے افسوس ہے سر، کہ میں اسے نہ بچا سکا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم! کیا وہ مجرموں کے ہاتھوں ماری گئی؟"

"جی ہاں سر!" میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا، پھر کہا۔ "[...] [...]ڑے کے جیتھڑے بکھر گئے۔"

"مگر کس طرح... کس طرح اللہ دتا؟" تیواڑی جی پر اضطراب [...]جے میں بولے۔

"ابھی کچھ فائل اور ہیں سر! آپ انھیں اور پڑھ لیں، پھر میں [...]پ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی غالباً اس وقت مجھ سے الجھنا نہیں [...]چاہتے تھے اس لیے فوراً میرے مشورے پر عمل کرنے لگے [...]ر ان کے چہرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ انھیں میرا مشورہ [...]ل گیا تھا۔

اب صرف دو فائلیں اور باقی تھیں۔ ان فائلوں میں سے ایک ان جنرل میٹنگوں کی رپورٹس سے بھری ہوئی تھی جو مختلف اوقات میں، مختلف جگہوں پر ہوتی رہی تھیں۔ دوسری فائل میں ان خفیہ اجلاسوں کی روداد تھی جن میں صرف بنیادی ارکان شامل ہوتے تھے۔ اس فائل کو پڑھ کر ہی میں نے واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور تھے، دکھانے کے اور! تنظیم کے بنیادی ارکان، یعنی سرمایہ دار، جذباتی قسم کے نوجوانوں کو غیر ملکی آقاؤں کے خلاف بھڑکا کر انھیں اپنے مفادات میں استعمال کر رہے تھے۔ بڑے پیمانے پر مختلف اشیا کی اسمگلنگ کرائی جاتی تھی اور ان نوجوانوں کو جھانسا یہ دیا جاتا تھا کہ اس طرح تنظیم کے لیے سرمایہ اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کو مطمئن کرنے کی خاطر کچھ اسلحہ بھی اسمگل کیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ بہت جلد مسلح جدوجہد کی جائے گی۔ یہ تمام باتیں مجھے ان نو بڑے سرمایہ داروں کے اجلاسوں کی روداد پڑھ کر معلوم ہوئی تھیں۔ ان نو میں سے تقریباً چھ بنیادی ارکان دو سال قبل تک سرمایہ داروں میں شمار نہیں کیے جاتے تھے گویا تنظیم ہی کے طفیل وہ سرمایہ دار بن گئے تھے۔ تنظیم کے ارکان کو گزارا الاؤنس کے نام پر باقاعدہ ماہانہ تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ تنظیم کے بڑے، ان جوشیلے نوجوانوں کے ذریعے اپنا ہر جائز و ناجائز کام نکالتے رہتے تھے، فیکٹریوں میں ہنگامے، ہڑتالیں، قتل و غارت گری، اسمگلنگ اور وہ سب کچھ جس سے سرمایہ داروں کے مفادات وابستہ ہوں!

تیواڑی جی نے وہ آخری فائل بھی بغور پڑھی۔ پھر فائل رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "اللہ دتا! تم نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے اپنے گزشتہ رویے پر افسوس ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ میں پوری طرح تمھاری صلاحیتوں سے واقف

نہیں تھا۔"

ظاہر ہے کہ مجھے یہ سن کر پھول ہی جانا چاہیے تھا اور میں پھول گیا، پھر بولا "ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے سر! ابھی تو مجھے اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر کبھی یہ موقع ملا تو آپ کو دکھاؤں گا کہ اللہ دتّا دراصل ہے کیا!"

"بالکل، بالکل!" تیواڑی جی نے سر ہلایا "مجھے تم سے یہی اُمّید ہے کہ میرا نام اونچا کر دو گے۔ ہاں وہ تم پندیا اور رنجیت کسی کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ اس کے ماضی سے واقف ہو؟" تیواڑی جی مطلب کی بات پر آ گئے۔

"پندیا، پندیا نہیں تھی۔" میں نے ایک راز سے پردہ اٹھا دیا اور پردہ اٹھاتے ہوئے یہ بھول ہی گیا کہ پردہ پوری طرح اٹھ نہیں سکا۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ پھر کون تھی وہ؟" تیواڑی جی حیرت اور الجھن زدہ لہجے میں بولے۔

"سر! وہ انسپکٹریس رجنی تھی جو بھیس بدل کر مجرموں میں شامل ہو گئی تھی۔"

"لیکن تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" تیواڑی جی نے سوال کیا۔

"میں نے تو اسے ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ لیا تھا سر! کہ ہو نہ ہو وہ بھیس بدلے ہوئے ہے مگر میں یقین کی حد تک پہنچ کر یہ انکشاف کرنا چاہتا تھا اسی لیے پہلے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے ڈینگ ماری۔

"مگر اس بات کا یقین ہونے کے بعد کہ وہ میک اپ میں ہے، تمھیں یہ کیسے پتا چلا، وہ انسپکٹریس رجنی ہے؟" تیواڑی جی نے پھر پوچھا۔

اس سوال پر میں ذرا سا چکرایا۔ دراصل سارا کریڈٹ میں خود چاہتا تھا۔ رجنی تو مر ہی چکی تھی اور اب اگر اس کی تعریف بھی کی جاتی تو کیا فائدہ ہوتا، دوسرے یہ کہ وہ مرنے کے بعد میری باتوں کی تردید بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا

مجھے چُپ دیکھ کر تیواڑی جی نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

"سر! اس نے مرنے سے پہلے مجھے اپنے بارے میں بتا دیا" میں نے بالآخر کہا۔

کچھ نہ سمجھ پاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم ابتدا سے تمام واقعات بتاؤ۔" تیواڑی جی نے یہ کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی اور سگریٹ سلگانے لگے۔

"یہ ٹھیک ہے سر!" میں نے سر ہلایا، پھر بولا "بس چند لمحے آپ مجھے خاموش رہنے کی اجازت دے دیں تاکہ میں اپنے ذہن میں تمام واقعات کو ایک مربوط شکل دے لوں۔"

تیواڑی جی نے مجھے کچھ دیر سوچنے کی اجازت دے دی۔

سوچنا صرف یہ تھا کہ خود کو ہیرو کس طرح ثابت کیا جائے ورنہ مجھے ایک ایک بات یاد تھی۔ دراصل جوشِ جذبات میں مجھے اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ پہلے سے سوچ لیتا، تیواڑی جی کے سامنے کیا کہنا ہے۔ میں تو سیدھا دفتر کی طرف دوڑ لیا تھا۔ اس وقت الٹا سیدھا جو بھی دماغ میں آیا، میں نے کہنا شروع کر دیا "سر! آپ کو علم ہے کہ گزشتہ رات مجھے اور لیوسی کو کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات میں جانا تھا۔"

تیواڑی جی نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"میں لیوسی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ سر! رات کے وقت ان آسیب زدہ کھنڈرات میں جانے کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ لیوسی تو خوف کے مارے کانپنے لگی تھی۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ آتی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں سر؟" میں نے تائید چاہی۔

"ظاہر ہے کہ وہ بہرحال عورت ہے اور تم مرد! عورت کے مقابلے میں مرد زیادہ بہادر ہوتا ہے۔" تیواڑی جی اس طرح بولے جیسے کوئی راز کی بات بتا رہے ہوں۔

"اللہ آپ کے بچّوں کو جیتا رکھے۔ یہ بات کہی ہے آپ نے نو تولے باون رتّی!" میں بولا۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟" تیواڑی جی میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

"ان کھنڈرات میں ایک اہم اجلاس ہونے والا تھا۔ وہاں لوگ جمع ہو رہے تھے اور غائب ہو رہے تھے۔ انھی لوگوں میں مجھے صفدر علی بیگ بھی نظر آیا جو غائب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں اس وقت لیوسی کے ہمراہ ایک ستون کی آڑ میں تھا اور جب صفدر علی بیگ نے اپنی کار سے اتر کر سگریٹ جلائی تھی تو مجھے اس کا منحوس چہرہ نظر آیا تھا۔ یہ بات میں نے اس

کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" یہ کہہ کر میں پھر تائیدی انداز میں تیواڑی جی کا مُنہ دیکھنے لگا۔

"کیوں، میں تمھیں اُلّو یا چمگادڑ کیوں سمجھتا؟" تیواڑی جی بولے۔

"اس لیے سر! کہ اندھیرے میں بھلا آدمی کسی کی صورت کیسے دیکھ سکتا ہے! ہاں اُلّو اور چمگادڑ کے بارے میں ضرور سنا ہے کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

تیواڑی جی ہنس پڑے، پھر بولے "خیر تم آگے کہو، میں تمھیں جانور نہیں انسان سمجھتا ہوں۔"

"مگر سر! اُلّو اور چمگادڑ کو جانور کیسے کہہ سکتے ہیں! میں نے تو سنا ہے کہ وہ پرندے ہوتے ہیں۔"

"تم پھر شرارت پر اتر آئے!" تیواڑی جی نے میری حماقت کو شرارت کا نام دیتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں مجھے جھڑکا "یہ بتاؤ کہ جب تم نے صفدر علی بیگ کو دیکھا تو کیا کیا؟"

ارے کرنا کیا تھا اُسے دیکھ کر تو میری ہوا خراب ہو گئی تھی مگر مائی ڈیئر پیارے ڈی آئی جی! میں تمھیں ہرگز یہ بات نہیں بتاؤں گا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر بولا "میں تو صفدر علی بیگ کو دیکھ کر قطعی نہیں ڈرا مگر لیوسی کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم وہاں سے مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئی۔ ہاں یہ بتا دوں کہ اس سے پہلے صفدر علی بیگ ان کھنڈرات میں غائب ہونے والا تھا یا تقریباً غائب ہو چکا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اس لیے سگریٹ کے شعلے پر نظر جما کر اندھیرے میں بھی اس کا تعاقب کیا جانا ممکن تھا۔ اس کا تعاقب اس لیے ضروری تھا سر! کہ معلوم ہو سکے، لوگ کہاں غائب ہو رہے ہیں اور کس طرح غائب ہو رہے ہیں! تو سر! میں نے صفدر علی بیگ کے تعاقب کا فیصلہ کیا مگر لیوسی کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے مجھے فیصلہ کرنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ میں نے ان کھنڈرات میں ٹامک اور ٹوئیاں دونوں ہی ماریں لیکن صفدر علی بیگ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ اس کی کار وہیں ایک شکستہ دیوار کے قریب کھڑی تھی اور اس کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی نہیں آئی تھی! اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ وہیں کھنڈرات میں موجود ہے۔ اس کار کے علاوہ دوسری کاریں اور پھٹ پھٹیں بھی وہاں موجود تھیں۔ کاروں اور پھٹ پھٹوں والے بھی یقیناً وہاں آئے تھے اور ابھی وہیں تھے۔ پھر وہ سب گئے کہاں؟ میرے ذہن میں بس دو بار سوال گونجا اور تیسری بار میں نے سمجھ لیا کہ وہ لوگ کہاں جا سکتے ہیں! آپ اگر میری جگہ ہوتے سر! تو کیا سوچتے؟"

"اگر تمھاری جگہ ہوتا تو کچھ سوچتا۔" تیواڑی جی امتحانی پرچے سے صاف دامن بچا گئے "کیا کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں کیا قدم اٹھاتا!"

"میری جگہ کوئی اور ہوتا سر! تو ڈر کے بھاگ گیا ہوتا۔" میں سینہ پھلا کر بولا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ کہہ دوں، آپ میری جگہ ہوتے سر! تو بھاگ لیتے مگر میں نے "کوئی اور" کہہ کر تھوڑی سی رعایت برت دی۔

"ہاں تو تم نے کیا سوچا اُس وقت؟" تیواڑی جی مجھے ایک بار پھر راہ پر لانے کے لیے بولے۔

"میں نے سوچا سر! کہ مجھے ہر حال میں وہ جگہ تلاش کرنا چاہیے جہاں وہ لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو وہاں، ان کھنڈرات کے نیچے کوئی تہ خانہ ہے۔ آپ یقین کریں گے سر! کہ میرا خیال قطعی درست ثابت ہوا؟"

"کیوں نہیں، ضرور یقین کروں گا۔" تیواڑی جی نے مجھے یقین دلایا "لیکن وہ راستہ تو خفیہ ہو گا؟"

"جی ہاں سر! قطعی! بڑی مشکل اور تلاش کے بعد مجھے وہ راستہ ملا۔" یہ کہہ کر میں نے اس چلتے پھرتے کنویں کی تفصیل بیان کی اور چیخ اٹھنے کا جواز پیش کیا "سر! میں چیخا اس لیے کہ اگر لیوسی خوف زدہ ہو کر بھاگ نہ اٹھی ہو تو میری چیخ سن کر اس طرف متوجہ ہو جائے اور بعد میں ہوا بھی ایسا ہی! پھر..."

"ہاں میں ایک بات بھول جاؤں گا۔" تیواڑی جی میری بات کاٹتے ہوئے بولے "لیوسی کہاں ہے؟"

"اپنے گھر۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟ وہ تمھارے ساتھ دفتر کیوں نہیں آئی؟"

"اس لیے سر! کہ وہ اس قابل نہیں ہے۔"

"کیا ہوا اسے؟"

"آپ میری پوری بات سن لیتے تو خود ہی آپ کو سب کچھ پتا چل جاتا، اس کا ذکر بھی بس آنے ہی والا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، تم اپنی بات جاری رکھو۔" تیواڑی جی بولے۔

"میں اس زیرِ زمین دنیا میں پہنچا سر! تو مسلح مجرموں سے میرا زبردست مقابلہ ہوا لیکن ان کی تعداد تقریباً دو درجن تھی، یعنی پوری چوبیس! میں بھلا کب تک ان کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ آپ ہی بتائیں سر! کہ اگر چوبیس افراد آپ کی گُدّی لگانے لگیں تو آپ کتنی دیر مقابلہ جاری رکھ سکیں گے؟"

تیواڑی جی کو شاید میری بات بُری لگی تھی جس کا اظہار ان کے

چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔ انھیں غالباً اپنی گٹائی والی بات پسند نہیں آئی تھی اس لیے وہ کسی قدر سنجیدہ سے لہجے میں بولے "میں چوبیس افراد کا مقابلہ کر سکتا ہوں یا نہیں، اس بات کو چھوڑو اور واقعات بیان کرو۔"

"میں تو اپنی معلومات میں اضافے کے لیے یہ بات پوچھ رہا تھا سر! ورنہ میرے ہوتے ہوئے بھلا کس کی مجال ہے جو آپ کی گٹائی لگا سکے۔" یہ بات کہتے ہوئے میں نے اپنے سینے پر ہاتھ بھی مارا تھا تاکہ تیواڑی جی کو میری بات پر یقین آ جائے۔

"تم خواہ مخواہ کیوں بکواس کیے جا رہے ہو!" اس بار تیواڑی جی کا لہجہ کچھ سخت ہو گیا اور ان کی نوکیلی مونچھیں بھی تھوڑی سی ہلیں جو خطرے کی علامت تھیں۔ "سیدھی سیدھی اور مختصر بات کرو!"

میں نے تیواڑی جی کا پارا چڑھتے دیکھ کر سنبھالا لیا۔ اچھا بھلا ہیرو بنتے بنتے کہیں میں ولن نہ بن جاؤں، یہ سوچ کر میں جلدی سے بولا "پھر یہ ہوا سر، کہ ان ظالموں نے مجھے ایک کوٹھری میں قید کر دیا۔ اس کے بعد مجھے موقع مل گیا کہ ان میں سے ایک کو دوسری دنیا کی سیر کرا دوں۔ میں نے وہ زور کی... وہ زور کی ٹکر اس کے سینے پر ماری کہ اس کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔ پھر لیوسی بھی وہاں پہنچ گئی، اسی کنویں کے ذریعے! مجھے یقین ہے کہ میری چیخ ہی نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ اب آپ ہی بتائیں سر، کہ اگر میں اس وقت نہ چیخا ہوتا تو لیوسی وہاں کس طرح پہنچ سکتی؟" یہ کہہ کر میں نے تیواڑی جی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ گڑبڑا گیا۔ وہ ابھی تک سنجیدہ تھے اور مجھے گھور رہے تھے۔

"تم پھر پٹڑی سے اُترے!" ان کا انداز وارننگ دینے کا سا تھا۔

"مگر سر، میں پٹڑی پر چڑھا ہی کب تھا جو اُتروں گا!" میں روا روی اور گھبراہٹ میں کہہ گیا۔

"اللہ دتا!" تیواڑی جی نے میز پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ میں اُچھل پڑا۔

"ج ج... جی... جی سر!" میں ہکلایا۔

"تم اپنی حماقت انگیز باتوں سے باز نہیں آؤ گے!"

"آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا سر، میں... میں پہلے ہی باز آ جاتا۔" میں عاجزی سے بولا۔

"بعض باتیں کہنے کی نہیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔" تیواڑی جی منہ بنا کر بولے "درمیان میں دانستہ احمقانہ باتیں کر کے سارا موڈ خراب کر دیتے ہو۔"

"اب نہیں کروں گا سر!" میں نے یقین دلایا۔

"اپنا وعدہ یاد رکھنا!" تیواڑی جی کسی قدر نرم پڑتے ہوئے بولے "میں اب یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ تم وہ نہیں جو خود کو ظاہر کرتے ہو اس لیے تم کم از کم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"توبہ توبہ سر! میری یہ مجال کہاں!" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے دونوں گالوں پر خود ہی تھپڑ مار لیے اور پچھتایا کیوں کہ جوشِ جذبات میں تھپڑ کچھ زیادہ زور سے پڑ گئے تھے۔

پھر میں نے بقیہ داستان مختصر طور پر تو ضرور بیان کی مگر یہ خیال رکھا کہ ہر بات سے میری ذہانت اور بہادری کا اظہار ہو۔ میں نے کہا "لیوسی کو ان لوگوں نے کچھ ہی دیر میں بے بس کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ میری طرح مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ صفدر علی بیگ کی وجہ سے مجھے اور لیوسی کو فوراً پہچان لیا گیا، پھر سیٹھ وشوا ناتھ اور سرج نے مجھے دیکھ کر یہ راز کھول دیا کہ میں خفیہ میں ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے خود پر اور لیوسی پر تشدد کی داستان سنائی اور اس تشدد کا سبب بھی بتایا، پھر کہا "بھلا میں کیسے زبان کھول سکتا تھا سر!" اس کے بعد میں نے سفید جھوٹ بولا "میری کوٹھری کا دروازہ سلاخوں دار تھا۔ میں نے اپنی پوری جسمانی طاقت لگا کر بڑی مشکل سے ایک سلاخ موڑی اور پھر اس سلاخ کو دروازے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک سلاخ نکال کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تو میں نے دوسری سلاخ پر زور آزمائی کی، پھر جب وہ سلاخ بھی نکل گئی تو میں خاموشی کے ساتھ کوٹھری سے باہر آ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس جگہ کی حیثیت ان لوگوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کی سی ہے۔ وہاں یقیناً مجھے ان لوگوں کے خلاف کوئی نہ کوئی ثبوت مل جائے گا۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد مجھے ایک کمرے کی الماری میں یہ تمام کاغذات ملے۔"

"کیا وہ الماری مقفل نہیں تھی؟" تیواڑی جی نے سوال کیا۔

"آپ نے اختصار کے لیے کہا تھا اس لیے میں نے تفصیل سے گریز کیا ورنہ اس الماری کی چابی میں نے جان پر کھیل کر حاصل کی تھی۔ جس کمرے میں رنجیت سو رہا تھا، اسی میں..."

"ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بولے "آگے بیان کرو۔"

میری جان میں جان آ گئی کیوں کہ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ تیواڑی جی یہ سوال کر بیٹھیں گے۔ میں اگر مزید کچھ کہتا تو یقیناً میرے منہ سے کوئی انٹ شنٹ بات نکل جاتی کیوں کہ اس وقت

ک مجھے جھوٹ بولنے کی زیادہ پریکٹس نہیں تھی۔

"جب میں، رنجیت کے کمرے سے چابیوں کا گچھا چُرا کر لے جا ہا تھا تو کھٹر پٹر سے شاید اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر میں تیزی کے اتھ وہاں سے نکل آیا تھا۔ پھر جب میں ایک الماری تلاش کر کے اس ں تمام فائلیں بھر رہا تھا تو رنجیت وہاں پہنچ گیا۔ بس پھر کیا تھا، اللہ دے اور بندہ لے۔ وہ گھونسم گھانس اور لپا ڈگی ہوئی کہ بس! سی ہنگامے کے دوران میں رجنی عرف بندیا وہاں پہنچ گئی۔ وہ سمجھ ی چکی تھی کہ میں بھی اسی کے بھائی بندوں میں سے ہوں، یعنی خفیہ کا ادمی ہوں اس لیے اس نے رنجیت پر ریوالور نکال لیا مگر رنجیت پہلے ہی چوکنا تھا۔ اس نے رجنی کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اسے ولی مار دی اور اسی وقت میں نے چھلانگ لگا کر رنجیت کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ میں نے رجنی کا انتقام لینے کی خاطر رنجیت پر ولی چلائی مگر بدقسمتی کہ میری چلائی ہوئی گولی اسے بس زخمی ہی کر سکی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا مگر جس سرنگ ا پہلے تذکرہ کر چکا ہوں، رنجیت اس میں بھاگتا چلا گیا۔ ہاں یہ بتانا یں بھول ہی گیا کہ راستے میں رنجیت نے بھاگتے ہوئے، ایک جگہ ک کر کسی پتھر پر دباؤ ڈالا تھا۔ میں نے اس تنگ و تاریک سرنگ ں کئی فائر کیے اور جب ریوالور خالی ہو گیا تو اسے وہیں پھینک کر رجنی خبر لینے دوڑا۔ رجنی لبِ دم تھی۔ اس نے مجھ سے رنجیت کے رے میں پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ رنجیت سرنگ میں بھاگ گیا ہے۔ رجنی نے مجھے سرنگ کا دہانہ بند کرنے کا طریقہ بتایا تاکہ رنجیت ر زندہ ہو تو سرنگ ہی میں قید ہو کر جان دے دے کیوں کہ سرنگ راستہ اندر سے کھولا جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس کے مشورے فوراً عمل کیا۔ پھر جب میں دوبارہ لوٹ کر اس کمرے میں پہنچا تو رجنی حالت بہت خراب تھی۔ میں اب تک اس اُلجھن میں تھا کہ رنجیت نے بھاگتے ہوئے، ایک جگہ رک کر وہ پتھر کیوں دبایا تھا؟ یہی سوال جب ں نے رجنی سے کیا تو جواب میں رجنی نے مجھے جو کچھ بتایا، اسے ن کر حیران رہ گیا۔"

تیواڑی جی خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔

"میں اس تہ خانے میں اسلحہ اور گولہ بارود تو دیکھ ہی چکا تھا اس لیے مجھے رجنی کی بات پر یقین آ گیا۔ پتا ہے سر، رجنی نے کیا بتایا؟" ارا داری میں حسبِ عادت پھر بات کرتے کرتے تیواڑی جی سے ہل کر بیٹھا۔

"اس نے بتایا تمھیں اور پتا مجھے چل جاتا!" تیواڑی جی بھکے۔ "ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا سر! آپ وہاں تھے ہی کب جو آپ کو پتا چلتا! خیر..." یہ کہہ کر میں نے تیواڑی جی کو وہ بات بتائی جو مجھے واقعی رجنی ہی سے معلوم ہوئی تھی۔

"اسی وقت رجنی نے تمھیں اپنے بارے میں بتایا ہو گا!" تیواڑی جی بولے۔

"جی ہاں سر! مگر آپ کو یہ راز کی بات کس طرح معلوم ہوئی؟"

"اندازہ بھی کوئی چیز ہے۔" تیواڑی جی نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اب ان کا موڈ کچھ کچھ بحال ہونے لگا تھا۔ وہ بولے "ہاں آگے کہو!"

"میں رجنی کو سہارا دے کر باہر لے آیا۔ مجھے پتا ہی تھی کہ وہاں سے یعنی اس زمین دوز دنیا سے کس طرح نکلا جا سکتا ہے۔"

"تمھیں کیسے پتا چلا؟" تیواڑی جی نے دریافت کیا۔

"مجھے جس کوٹھری میں قید کیا گیا تھا، اسی کے سامنے وہ خفیہ دروازہ تھا، یعنی چلتے پھرتے کنویں کا دروازہ!" میں نے بتایا۔ "میں نے اسی راستے سے صفدر علی بیگ اور دوسرے لوگوں کو جاتے دیکھا تھا۔"

"ہوں۔" تیواڑی جی نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ رجنی کو لے کر میں باہر آ گیا لیکن باہر آتے ہی اس کی حالت بگڑ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی اس نے دم توڑ دیا اور اسی وقت مجھے لیوسی کا خیال آیا جو وہیں کسی کمرے میں بہ قول رجنی بے ہوش پڑی تھی۔ رجنی دانستہ اس کے کمرے کا دروازہ کھول آئی تھی تاکہ اسے ہوش آ جائے تو وہ کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ لیوسی کو تلاش کروں، وہ گرتی پڑتی اِدھر آ نکلی۔ وہ زیرِ زمین دنیا کسی وقت بھی بھک سے اُڑ سکتی تھی۔ لیوسی کی حالت خراب تھی کیوں کہ اسے گرم سلاخوں سے داغا گیا تھا۔ میں اسے سہارا دے کر خفیہ راستے تک پہنچا اور پھر کسی طرح اسے وہاں سے نکال لایا۔ کھنڈرات کی حدود سے نکلتے ہی ایک زبردست دھماکا ہوا اور وہ زیرِ زمین دنیا تباہ ہو گئی۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"اگر تم درمیان میں بے تکی باتیں کرنا چھوڑ دو تو کام کے آدمی بن جاؤ۔" تیواڑی جی کے لہجے سے ایک بار پھر "صدقے واری" ہونے کا پتا چلنے لگا "تم نے واقعی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور میری ناک اونچی کر دی ہے۔"

معلوم نہیں، ان کی ناک کو نیچا کس نے کیا تھا۔ میرا دل تو چاہا

تھا کہ ان سے یہ بات پوچھ لوں مگر ڈر کے مارے نہیں پوچھی۔ جیسے تیسے تو ان کا موڈ بحال ہوا تھا۔

"تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو اب جا کر آرام کرو! باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔"

سر جی! اب سنبھالنے کے لیے ہے بھی کیا جو آپ سنبھالیں گے!

میں نے سوچا اور اثبات میں سر ہلا کر اٹھ گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ سارے دفتر میں ڈنکا پیٹتا پھروں کہ لے لوگو! دیکھو میں ہوں، وہ اللہ دتا جس نے ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا ہے مگر نیند کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اس لیے یہ پروگرام آئندہ روز پر چھوڑ دیا۔

پھر جب دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو ہر شخص مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں۔ ہر طرف سے "مبارک سلامت" کی صدائیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور تو اور دلاور خاں بھی مجھے مبارک باد دینے میرے کمرے میں آ گئے۔ ابھی مجھے دفتر پہنچے آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا کہ چچا بندو خاں دوڑے دوڑے میرے کمرے میں پہنچ گئے۔

"بڑے صاحب تمھیں یاد کر رہے ہیں بیٹے!" چچا بندو خاں نے آتے ہی کہا۔

"بڑے صاحب!" میں حیرت سے بولا۔

"ہاں دبی!" چچا بندو خاں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب سب بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں۔ میں نے خود اپنے کانوں سے تمھاری تعریف سنی ہے۔ چلو، جلدی سے چلو! صاحب لوگوں کی نظر سیدھی ہے، کیا پتا، کیا بخشش دیں!"

میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمار کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کُڑھ جائے لیکن اس بے حیا کے ہونٹوں پر حسبِ دستور وہی مسکراہٹ تھی جس سے مجھے چڑ تھی۔ سبھی دوست دشمنوں نے مجھے مبارک باد دی تھی مگر وہ ظالم مُنہ سے کچھ نہیں پھوٹا تھا۔

سر تھامسن نے مجھے بہت شاباش دی۔ آئی جی صاحب نے بھی باقاعدہ پیٹھ تھپکی۔ سر تھامسن نے جب یہ پیشکش کی کہ میرا عہدہ بڑھا دیا جائے اور میرا تبادلہ پولیٹیکل برانچ میں کر دیا جائے تو میں گھبرا گیا۔ موجودہ عہدہ قبول کرنے پر تو اتنی ساری مصیبتیں نازل ہو گئی تھیں، اگر مزید ترقی ہو گئی تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میری ہوا خراب ہونے لگی۔ پھر میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا کہ بے شک میری تنخواہ ضرور بڑھا دی جائے مگر عہدہ نہ بڑھایا جائے کیوں کہ میں ابھی اسی عہدے پر رہ کر سرکارِ والا تبار کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میری درخواست منظور کر لی گئی اور اسے میری نیک نیتی سمجھا گیا۔

پھر مجھے تیواڑی جی سے معلوم ہوا کہ رات ہی کو بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آ چکی ہیں اور تنظیم کے تمام بنیادی ارکان کے علاوہ بقیہ ایک سو بیس ارکان بھی جیل کی ہوا کھا رہے ہیں کیوں کہ ان کے خلاف ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہیں۔ جو افراد گرفتار نہیں کیے جا سکے، وہ اس وقت دہلی میں نہیں تھے لیکن جلد ہی انھیں بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ تنظیم کے صرف ایک رکن بلکہ رکنہ کو معاف کیا گیا تھا اور وہ تھی کملا! راؤ بہادر کشوری لال کی سفارش پر کملا کا قصور معاف کر دیا گیا تھا کیوں کہ راؤ بہادر ہی کی مخبری پر خفیہ کی اسپیشل برانچ حرکت میں آئی تھی۔ سیٹھ وشوا ناتھ، راؤ بہادر کو بھی تنظیم میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ راؤ بہادر کے سر تھامسن سے خصوصی تعلقات تھے اس لیے اس نے سب کچھ سر تھامسن سے کہہ دیا تھا۔

میری تنخواہ میں اسپیشل الاؤنس کے نام سے پورے پچاس روپے کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ پچاس روپے اس زمانے میں اتنی بڑی بات ہوتی تھی کہ ابا کو بڑی مشکل سے اپنی سماعت پر یقین آیا۔ اسی دن سارے محلے میں لڈو بانٹے گئے۔ بہ قول امی، ابا پورے مہینے پرچون کی دکان سے پچاس روپے نہیں کما پاتے تھے اور ایک میں تھا کہ تنخواہ کے علاوہ مجھے پچاس روپے مل رہے تھے۔ امی اور ابا دونوں ہی مجھ پر قربان ہوئے جا رہے تھے اور بڑے بھیا کو مسلسل ان دونوں کی لتاڑ کھانا پڑ رہی تھی۔

ابھی ہفتہ بھر ہی بہ خیریت گزرا تھا کہ سر تھامسن کا بُلاوا آ گیا۔ یہ بُلاوا بھی چچا بندو خاں ہی لے کر آئے تھے۔ راستے میں انھوں نے مجھے سمجھایا۔ "دیکھ بیٹا! گھوڑے کی پچھاڑی اور افسر کی اگاڑی بھاری ہوتی ہے۔ ذرا بچ کے رہیو!"

میں نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔

میں سر تھامسن کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا، وہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے ہیں۔ مجھے انھوں نے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا مگر خود نہ بیٹھے اور میں ان کے بولنے کا منتظر رہا۔

"ایلا ڈیٹا!" بالآخر انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"یس سر!" میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم کچھ دن کو آفس سے چھٹی لے لو!" انھوں نے کہا اور پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔

میری کیا مجال تھی جو اُن سے پوچھتا کہ آخر کیوں چھٹی لے لوں۔

بولا۔ "بہت بہتر ہے سر!"

انھوں نے کچھ دیر بعد خود ہی چھٹی لینے کا سبب بیان کیا۔ "مجھ کو ے پرائیویٹ کام ہے۔ بٹ یہ کام تم کو نفی ڈینشل رکھے گا۔ بولو تم کرے پرائیویٹ کام؟"

میں نے زور سے گردن ہلا دی۔

"تم امارا وائف کیٹی کو اچھی طرح جانتا اے!" بڑے صاحب کو ر بولنے میں دقت ہو رہی تھی اس لیے وہ انگریزی بولنے لگے۔ "کیٹی دنوں ایک نوجوان سے مل رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس نوجوان بارے میں پتا چلاؤ کہ وہ کون ہے۔ کل وہ کوٹھی پر بھی آیا تھا۔ ان سے میں نے ان دونوں کی باتیں سُن لیں۔ وہ دونوں کل شام ب مینار کے قریب ملیں گے۔ تم اس نوجوان کا تعاقب کر کے پتا چلانا ہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ کیٹی اس سے پہلے کبھی میرے دفتری لات میں دلچسپی نہیں لیتی تھی لیکن آج کل ایسا نہیں ہے۔ مجھے نوجوان پر شک ہے کہ کہیں وہ تو کیٹی کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا! یاد رکھنا کل شام ٹھیک پانچ بجے تمھیں قطب مینار کے موجود رہنا ہے۔ ایک بار پھر سن لو کہ یہ معاملہ راز میں رہنا چاہیے۔ ٹی کی درخواست لکھ کر تیواڑی کو دے جاؤ۔ میں اس سے کہہ دوں کچھ دن تمھیں آرام کرنے کا موقع دے دے اور تمھاری درخواست ر کر لے۔ ہاں سنو! تم اس سلسلے میں مجھ سے ملو گے کہاں؟ مجھے کس پتا چلے گا کہ تم نے کیا معلوم کیا؟"

"جہاں آپ کہیں سر!" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

بڑے صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے۔ "کوٹھی پر تو کیٹی ا تم مجھے یہیں دفتر آ کر رپورٹ دیا کرنا!" پھر صاحب نے خود ہی بات رد کر دی اور کہا۔ "یہ بھی ٹھیک نہیں۔ اس طرح چھٹی ا مانلاپ ہو جائے گا۔ ایسا کرو، تم چھٹی نہ لو! میں ذاتی طور پر تیواڑی ہ دوں گا کہ وہ تمھیں فی الحال کوئی کیس نہ دے اور تمھارے بیٹھنے پر بھی پابندی نہ لگائے۔ تم جب چاہو آؤ، جب چاہو ٹھیک ہے؟" صاحب نے مجھ سے تائید چاہی اور ظاہر ہے مجھے ہوا کرنا بھی کیا تھا۔

دوسرے دن احتیاطاً میں دفتر سے میک اپ کر کے چلا۔ میں چہرے پر مونچھوں کا اضافہ کر لیا اور سر پر وگ لگا لی تھی جس سے پیشانی کافی چوڑی معلوم ہونے لگی تھی اور بڑی حد تک میرا چہرہ تھا۔ میں نے حلیہ اس لیے بدلا تھا کہ صاحب کی کتو کیٹی مجھے سکے۔ میں، دفتر سے تین بجے ہی نکل گیا تھا۔

ل وقت سے کچھ پہلے ہی قطب مینار پہنچ گیا تاکہ قطب مینار پر اپنا پسندیدہ شوق پورا کر سکوں یعنی پیسے نیچے پھینک سکوں۔



ہوئے تھا میری سماعت سے ایک نسوانی قہقہے کی آواز ٹکرائی اور وہ قہقہہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ قہقہے کے جواب میں ایک مرد کی ہنسی سنائی دی اور میں گرتے گرتے بچا۔ وہ مردانہ ہنسی بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا!

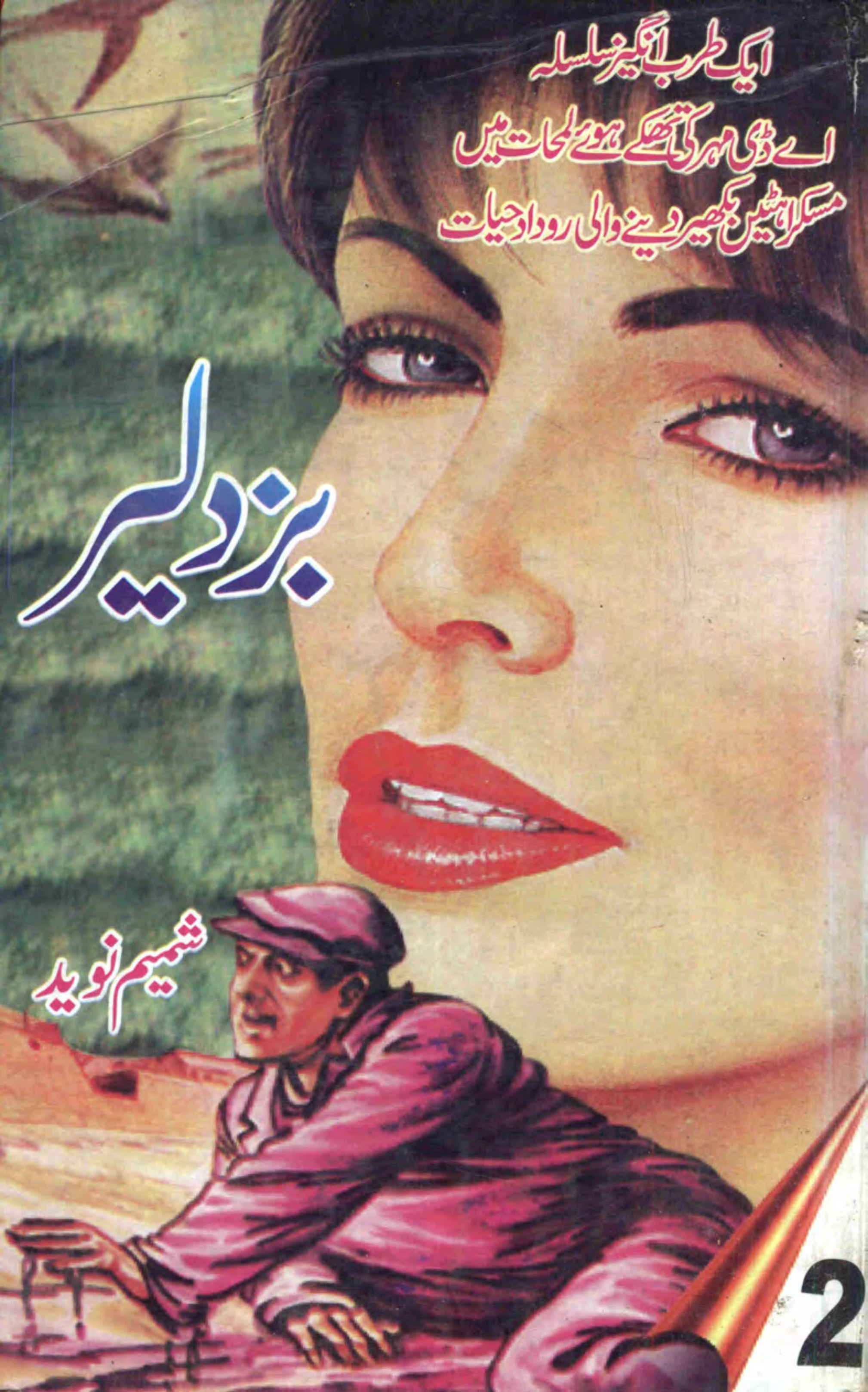
میں سیڑھیوں سے اتر رہا تھا اور وہ دونوں یعنی عورت اور مرد اوپر آ رہے تھے۔ اس کا اندازہ ان دونوں کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ وہ آپس میں رومانی ڈائیلاگ بول رہے تھے اور ان دونوں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میرے قدم رُک گئے۔

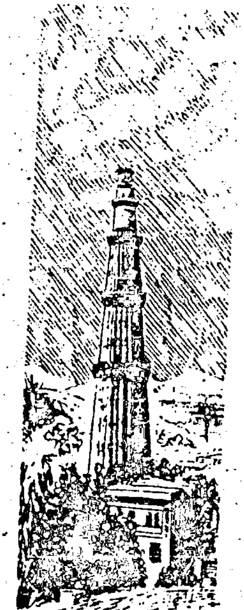
میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں چھپ جاؤں! خطرہ ہر لمحے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ اس نے کچھ کہا تو میں کم سے کم اسے دھمکا تو سکوں گا۔ میں نے سوچا اور گھبراہٹ میں یہ بھول ہی گیا کہ میک اپ کیے ہوئے ہوں اور وہ مجھے نہ پہچان سکے گا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے ریوالور پکڑ کر سیدھا کیا اور پھر اسی وقت وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔

ان دونوں میں سے ایک تو صاحب کی جورو کیٹی تھی اور دوسرا رنجیت!

ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات دوسرے حصے میں
ملاحظہ فرمائیں


ایک طرب انگیز سلسلہ
اے ڈی مہر کی تھکے ہوئے لمحات میں
مسکراہٹیں بکھیر دینے والی روداد حیات
بزدلیر
شمیم نوید
2



اس وقت میری حالت ایک ایسے شخص کی سی تھی جس کے سامنے کسی مُردے کا بھوت آگیا ہو۔ رنجیت میری دانست میں جہنم کا ٹکٹ کٹا چکا تھا۔ پھر کم بخت کہاں سے آمرا۔ بندیا، یعنی رجنی اس ناہنجار کو سرنگ میں بند کر کے مطمئن ہو گئی تھی اور اسی اطمینان کے عالم میں ٹھنڈے ٹھنڈے دوسری دنیا کو سدھار گئی تھی مگر وہ تو پھر میری چھاتی پر مونگ دلنے آپہنچا تھا۔ اس نے میرے سامنے ایک نہیں کئی قتل کیے تھے۔ اتنے خطرناک آدمی کو اپنے سامنے دیکھ کر چھکے تو کیا نہلے دہلے تک چھوٹنے لگتے تھے۔ مجھے صدق دل سے اعتراف ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

"خبردار!" رنجیت کو اپنے قریب آتا دیکھ کر میں چیخ پڑا۔

رنجیت میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس سے پہلے وہ کیٹی سے مخاطب تھا اس لیے میرے ہاتھ بلکہ ہاتھوں میں موجود ریوالور نہیں دیکھ سکا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور اس کے ساتھ ہی کیٹی بھی رک گئی۔ کیٹی کے چہرے سے حیرت کے ساتھ خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا مگر رنجیت خوف زدہ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف حیرت تھی۔

"اگر تم نے مجھ سے کچھ کہا تو تم ... میں اللہ قسم گولی مار دوں گا۔" میں نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ میں نے قسم اس لیے کھائی تھی کہ اسے میری بات کا یقین آجائے، دوسرے یہ کہ میں بھی قسم کھانے کے بعد اسے گولی مار دینے کا پابند ہو جاؤں کیوں کہ جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے اور میں یہ گناہ بہر حال نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ میری آواز سن کر رنجیت چونک اٹھا، پھر اس نے انتہائی تیزی کے ساتھ کیٹی کو اپنے سامنے گھسیٹ لیا۔ اس غیر متوقع حرکت پر کیٹی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اب کیٹی میرے ریوالور کی زد پر تھی اور رنجیت اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

"اللہ دتا! میں تمھیں پہچان چکا ہوں۔" معاً رنجیت نے مجھے مخاطب کیا اور میرے ہاتھوں سے ریوالور چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ "اگر اب تم نے گولی چلائی تو تمھارے صاحب کی بیگم ہلاک ہو جائیں گی۔ اس کے بعد تم جانتے ہی ہو کہ تمھارا کیا حشر ہوگا اس لیے اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔" یہ کہتے ہی وہ اُلٹے قدموں سیڑھیاں اترنے لگا اور مجبوراً کیٹی کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

احمق کہیں کا! میں نے سوچا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ اپنی جگہ سے ہلتا۔ میں تو یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ چلو جان بچی لاکھوں پائے وہ خود ہی دفع ہوا جا رہا تھا اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔

چند لمحے بعد ہی وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے

کی جورو کو اپنے کسی مقصد کے لیے پٹا رہا تھا۔ کیٹی کوئی ملکۂ حُسن تو تھی نہیں جو مَیں یہ سمجھتا کہ اس کے حُسنِ جہاں سوز نے رنجیت کو اپنا اسیر کر لیا تھا۔ یقیناً اس داستانِ عشق کے پیچھے کوئی اور کہانی تھی۔ وہ کہانی کیا ہو سکتی ہے، اس کے بارے میں کیٹی ہی کچھ بتا سکتی تھی۔ کیٹی کو شاید علم نہیں تھا کہ وہ ہاتھیوں سے گنّے کھانے کا خواب دیکھ رہی ہے ورنہ رنجیت کے قریب نہ جاتی۔

میں نے سوچا کہ ابھی وقت صاحب کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ان کی جورو بہرحال آگ سے کھیل رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جب صاحب کو پتا چلے گا، رنجیت کون ہے تو ان کی فاختہ اُڑ جائے گی۔ پھر جب کیٹی کو معلوم ہوگا کہ اس کا عاشقِ زار، قاتل ہے تو اس کے کس بل بھی نکل جائیں گے اور عشق کے سارے کیڑے بیک وقت جھڑ جائیں گے۔

پھٹ پھٹ اُڑی چلی جا رہی تھی اور اسی کے ساتھ میرا ذہن بھی اُڑ رہا تھا۔ صاحب کی کوٹھی کی طرف جاتے جاتے معاً مجھے خیال آیا کہ اگر رنجیت راستے میں مل گیا تو کیا ہوگا؟ اگر وہ کیٹی کو چھوڑنے کوٹھی تک گیا ہوگا تو اس وقت وہاں سے لوٹ رہا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے صاحب کی کوٹھی جانے کا ارادہ فی الفور ختم کر دیا اور پھٹ پھٹی موڑ لی۔ میں نے سوچا کہ اب صبح جا کر ہی دفتر میں صاحب کو رپورٹ دوں گا۔ گھر پہنچنے سے پہلے میں نے اپنا میک اپ ختم کر دیا تھا ورنہ امّی ایک اجنبی کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر جوتی سنبھال لیتیں۔

دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو میرے کمرے میں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اللہ کے فضل سے اس وقت میرے سارے ہی ماتحت وہاں جمع تھے۔ پیارے لال ہنر اپنی کوئی تازہ غزل، ترنّم سے سنا رہا تھا اور کمار کے ساتھ ساتھ بقیہ افراد بھی "واہ واہ" اور "سبحان اللہ" کی گردان کر رہے تھے۔ ان سب داد دینے والوں میں کمار کی آواز نمایاں تھی۔

"کیا ہنر دکھایا ہے ہنر جی نے! رعایتِ لفظی کی دُم دار پتنگ کس خوب صورتی سے لڑائی ہے! سبحان اللہ!" کمار کہہ رہا تھا۔

پیارے لال ہنر آنکھیں بند کیے، پھٹے بانس کی طرح شعر پڑھ رہا تھا ؎

باندھتے ہیں اپنے دل میں زلفِ جاناں کا خیال
اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم

میں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا انھیں گھور رہا تھا مگر کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔

"بھئی کیا کہنے پیارے لال جی! کیا خوب شعر کہا ہے۔" میرے ایک ماتحت مجید نے تعریف کی۔

یہ سن کر پیارے لال ہنر ایک دم گاتے گاتے رُک گیا۔ آنکھیں کھول کر مجید سے بولا۔ "قبلۂ محترم! اس ہیچ مداں، ہیچ سخن، ہیچ

اندر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسی وقت اُوپر سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ریوالور جیب میں رکھ لیا، پھر اُوپر جانے کے لیے مڑا۔ میں کچھ دیر بعد قطب مینار سے اترنا چاہتا تھا تاکہ رنجیت وہاں سے ٹل جائے۔

میں اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھتا رہا۔ لوگ اتر رہے تھے اور میں چڑھ رہا تھا۔ جب میں اوپر پہنچا تو ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ وہاں میرے علاوہ صرف ایک شخص تھا۔ جب تک وہ شخص وہاں رہا، میری ڈھارس بندھی رہی لیکن جب وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو میں ٹوٹنے لگا۔

"کہاں چلے بڑے بھائی! کچھ دیر تو اور رکیں۔" گھبراہٹ کے عالم میں اس اجنبی کو میں نے مخاطب کیا۔

وہ چلتے چلتے رک کر مڑا اور بولا۔ "دیکھتے نہیں، اندھیرا پھیل رہا ہے!"

"ہاں دیکھ تو رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر تم بھی اپنے گھر جاؤ۔" اس نے مجھے مشورہ دیا۔

"لیکن اگر وہ اب بھی نیچے ہوا تو؟" میرے مُنہ سے اصل بات نکل گئی۔

"کون نیچے ہوا؟" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔

"کک... کوئی نہیں... کوئی نہیں بڑے بھائی!" میں گڑبڑا کر بولا۔

"تم کچھ سرکے ہوئے لگتے ہو استاد!" اجنبی ہنس کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹھہرو، میں بھی چل رہا ہوں۔" میں نے ہانک لگائی۔

"تو آ جاؤ۔ مَیں تمھیں گود میں لے کر تو نہیں چلوں گا۔" اجنبی نے بغیر مڑے جواب دیا اور اسی کے ساتھ پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔

ایک سے دو ہوں گے تو کچھ ہمت بندھی رہے گی۔ میں نے سوچا۔ اگر میں تنہا ہوا تو شاید وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

میں اس اجنبی کے ساتھ ساتھ نیچے اتر آیا۔ نیچے اب اکّا دکّا افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ میں ڈرتا جھجکتا اس طرف بڑھا جہاں اپنی پھٹ پھٹی کھڑی تھی۔ اِرد گرد کا جائزہ لیتا ہوا مَیں بمشکل وہاں تک پہنچا اور پھر اسے اسٹارٹ کرکے بیٹھنے میں دیر نہیں کی۔

راستے بھر رنجیت کا چہرہ میری آنکھوں میں گھومتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ وہ ظالم آخر کس طرح اس سرنگ سے زندہ بچ کر نکل گیا؟ کیا اس سرنگ کے اندر بھی کوئی خفیہ راستہ موجود تھا جس کے ذریعے رنجیت جان بچا کر چھوٹ لیا؟ ہو نہ ہو، بات یہی ہوگی۔ میں نے کافی دیر غور و خوض کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کم بخت تھا بہت دیدہ دلیر! خفیہ تنظیم کے ارکان کی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں سے ظاہر ہے کہ وہ بھی بے خبر نہ رہا ہوگا۔ ایسی خطرناک صورتِ حال میں اسے دہلی سے فرار ہو جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ ظالم نہ صرف یہ کہ دہلی ہی میں تھا بلکہ خفیہ کے ڈائریکٹر کے سر تھا۔ اس

عبارت کی پرواز تخیل اتنی کہاں! میں نے عرض کیا تاکہ پہلوانِ سخن حضرت ناسخ کی غزل پیش کر رہا ہوں جو خادم کے دادا استاد تھے۔"

"ایک ہی بات ہے، ہے تو آپ ہی کے خاندان کی غزل!" مجید نے کہا۔ "مکرّر ارشاد!"

ابھی پیارے لال ہنر تان کھینچ کر اسٹارٹ ہی لینے والا تھا کہ میں چیخ اٹھا۔ "یہ دفتر ہے یا مشاعرہ گاہ؟"

"گاہ گاہ دفتر کو مشاعرہ بنا لینے میں کیا حرج ہے ڈیئر سر! مگر یہ آپ ناگاہ کدھر سے ٹپک پڑے؟" کمار نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی کوئی ٹپکا آم ہوں جو ٹپک پڑا!" میں برہم ہو کر بولا۔ "اگر ان دنوں کوئی کیس نہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم لوگ مٹھول کرنے لگو۔"

"ٹھٹھول تو سنا تھا ڈیئر سر! مگر یہ مٹھول آج پہلی بار سنا۔ نئے نئے لفظوں کی ایجاد میں آپ کا جواب نہیں سر!" کمار بولا، پھر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "ہنر جی! مٹھول کا قافیہ ٹٹول بھی تو ہو سکتا ہے۔ ویسے مٹھول کا مطلب آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں غصّے سے چیخا اور اسی وقت چچا بندو خاں کمرے میں داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے بیٹے! کیوں ناراض ہو رہے ہو؟" انھوں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں چچا!" میں انھیں غیر متوقع طور پر اپنے کمرے میں دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ "ذرا ان لوگوں کو یہ بتا رہا تھا کہ افسران سے کس طرح بات کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہی مجھے خیال آیا کہ وہ کس لیے آئے ہیں؟ کہیں صاحب نے تو نہیں بلایا؟

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ طلبی ہی کا حکم لے کر آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ چل دیا۔

کمرے سے نکلتے ہی چچا بندو خاں نے فکرمند لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "بیٹے اللہ تعالیٰ! یہ روز روز صاحب کے پاس طلبی اچھی نہیں۔ میں نے تمھیں پہلے بھی سمجھایا تھا۔"

"مگر چچا! اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں بولا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ جب صاحب بلائیں گے تو جانا ہی پڑے گا!" انھوں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے آج صاحب بہت چپ چپ ہیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا سا ہے۔ وہ ایک بار بھی نہیں مسکرائے حالانکہ عام طور پر اس وقت تک انھیں کئی بار مسکرانا چاہیے تھا۔" چچا بندو خاں کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔

صاحب روز مسکرایا کرتے تھے مگر اس دن نہیں مسکرائے تھے، یہ بات واقعی تشویش کی تھی۔ میں اس امر پر غور کرتا ہوا کہ صاحب کیوں نہیں مسکرائے، ان کے دفتر تک پہنچ گیا۔

جب مَیں صاحب کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو چچا بندو خاں نے مجھے ایک بار پھر سمجھایا۔ "کوئی ایسی صورت کرنا بیٹے کہ روز روز کی یہ طلبی ختم ہو جائے۔ بات ذرا سنبھل کر..."

"آپ بے فکر رہیں چچا!" میں ان کی بات کاٹتا ہوا صاحب کے کمرے میں گھس گیا۔

صاحب اس دن بھی اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی مَیں کمرے میں داخل ہوا، ان کی "ٹہل" ختم ہو گئی اور میری طرف اس طرح لپکے کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا کل کیٹی اس سے ملی تھی؟" صاحب نے پوچھا۔ ان کے لہجے میں شدید اضطراب تھا۔

"جی ہاں سر!" میں نے جواب دیا۔

"تم نے ان دونوں کی نگرانی کی تھی؟" صاحب نے فوراً ہی دوسرا سوال جڑ دیا۔

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی سر!"

"کیوں؟"

"اس لیے سر، کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے پہلے ہی اس کی آواز سُن لی تھی اور ریوالور نکال لیا تھا ورنہ اس وقت آپ کے سامنے زندہ نہ کھڑا ہوتا۔"

"آخر تھا کون وہ؟" صاحب کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"یہی تو راز ہے سر!" میں مسکرا کر بولا۔ "اگر آپ کو میں بتا دوں کہ وہ کون تھا تو آپ کی بھی فاختہ..." بس میں نے یہ کہتے کہتے ایک دم اپنا ہاتھ، مُنہ پر رکھ لیا۔ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ صاحب سے ایسی گستاخانہ بات نہیں کرنا چاہیے۔

"یہ تم نے مُنہ پر ہاتھ کیوں رکھ لیا؟ ہاتھ ہٹاؤ مُنہ پر سے! اور سیدھی طرح بات کرو!" صاحب کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

"اس کا نام رنجیت تھا۔" میں نے اپنے مُنہ سے ہاتھ ہٹاتے ہی انکشاف کیا۔ میرا خیال تھا کہ صاحب یہ نام سُن کر اُچھل پڑیں گے مگر ایسا نہیں ہوا اور میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کون رنجیت؟" صاحب نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنی بات جلدی ختم کرو! مجھے تم سے ایک اور اہم بات کرنا ہے۔" صاحب اس وقت انگریزی میں بات کر رہے تھے اس لیے بڑے رواں تھے، ہاں اردو بولتے ہوئے وہ ضرور ہکلانے لگتے تھے۔

مَیں نے جواب میں انھیں رنجیت کے متعلق مختصراً بتایا اور اس وقت وہ خلافِ توقع چونک اٹھے۔

"تفصیل سے بتاؤ۔" انھوں نے حکم دیا۔

مَیں شروع ہو گیا۔ بھگوان داس کے قتل سے لے کر رنجیت کے فرار ہونے تک میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔

صاحب نے پوری بات سُن کر طویل سانس لیا اور پھر اپنی کرسی

کی طرف بڑھ گئے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مجھے بھی بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد انھوں نے کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کیٹی کو اسی شخص نے اغوا کیا ہے۔"

"اغوا!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں" صاحب نے لمبا سانس کھینچا، "کیٹی کل سے غائب ہے۔ یہ بتاؤ تم نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ کل شام کیا ہوا تھا؟"

"بس یوں سمجھیں صاحب، کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے طوطے اُڑ گئے تھے۔" میں نے کہنا شروع کیا۔

"کیا اس کے پاس طوطے موجود تھے؟ وہ طوطوں کو ساتھ لایا تھا؟" صاحب حیران ہو کر بولے۔

پھر میں نے بہ مشکل صاحب کو سمجھایا کہ طوطے اڑنا اردو کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ میں نے لفظ بہ لفظ انگریزی میں کر دیا تھا، طوطے اڑنے کا اصل مطلب سچ مچ کے طوطے اُڑنا نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے صاحب کو اس محاورے کا مطلب سمجھایا۔

"اب تم کوئی محاورہ نہیں بولو گے!" صاحب نے حکم دیا۔ "آگے بیان کرو!"

"ٹھیک ہے سر!" میں نے کسی فرماں بردار بچے کی طرح سر ہلایا، پھر بولا: "تو میں کہہ رہا تھا سر کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے طوطے.... معاف کیجیے گا سر! یعنی کہ وہ گھبرا گیا۔ پھر وہ گھبرا کر آپ کی بیگم کے پیچھے چھپ گیا۔ اب اگر میں گولی چلاتا تو آپ کی جورو زخمی ہو جاتیں اس لیے میں نے اسے سامنے آ کر مقابلے کی دعوت دی مگر وہ جو ہا بھلا میرا کیا مقابلہ کرتا! وہ آپ کی جورو کو آڑ بنائے ہوئے دُم دبا کر وہاں سے بھاگ گیا۔"

"تم نے اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟" صاحب نے کہا۔

مجھے اس سوال کی توقع نہیں تھی اس لیے جھکرا کر بولا: "وہ مجھ سے بہت دہشت زدہ تھا اور اُلٹے پیروں سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ اگر میں اس کا پیچھا کرتا تو وہ مزید ڈر جاتا۔ اس صورت میں اس کا پاؤں بھی پھسل سکتا تھا۔ وہ پھسلتا تو آپ کی جورو کو بھی ساتھ پھسلاتا ہوا لے جاتا۔ یہ سوچ کر میں نے اس کا پیچھا نہیں کیا۔"

"تم نے اس کا تعاقب نہ کر کے ناقابلِ تلافی غلطی کی ہے۔" صاحب سنجیدگی سے بولے اور اسی وقت مجھے ایک بہانہ سوجھ گیا۔

"اس کے پاس بھی ریوالور تھا جسے اس نے آپ کی جورو کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اس کا تعاقب کیا تو وہ آپ کی جورو کو ٹھنڈا کر دے گا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"تم نے یہ بات پہلے تو نہیں بتائی تھی۔" صاحب نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلیں جب نہیں بتائی تو اب بتا دی سر!" میں نے دانت نکال دیے۔

صاحب کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولے: "کیٹی، رات سے گھر نہیں آئی، اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ پوری رات گھر سے غائب رہی ہو۔"

"کیا خبر اب وہ گھر آ گئی ہوں۔" میں نے صاحب کی ڈھارس بندھائی۔

"نہیں! ایسا ہوتا تو مجھے اب تک یہ اطلاع مل چکی ہوتی۔ میں ملازمین سے کہہ کر آیا تھا کہ کیٹی کے آتے ہی مجھے اس کی آمد سے مطلع کیا جائے۔"

ابھی صاحب کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ چچا بندو خاں، کمرے میں داخل ہوئے اور صاحب کی سوالیہ نظروں کے جواب میں بولے: "کوٹھی سے شرفو بابا آیا ہے۔"

"بھیجو اسے!" صاحب جلدی سے بولے اور چچا بندو خاں اُلٹے قدموں کمرے سے نکل گئے۔

"سر! میں نے کہا تھا کہ وہ آ گئی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔

چند لمحے بعد ایک بوڑھا کمرے میں داخل ہوا۔ اسے میں صاحب کی کوٹھی پر اس دن دیکھ چکا تھا جب کیٹی مجھے اپنے ہمراہ لے گئی تھی۔ میں نے بوڑھے کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ دیکھا۔

"ابھی ایک صاحب آیا تھا۔" بوڑھا، صاحب کی میز کے قریب پہنچ کر بولا۔ اس کی اردو بھی صاحب اور کیٹی کی صحبت میں بگڑ گئی تھی۔ "وہ صاحب یہ دے گیا ہے۔" بوڑھے نے وہ پیکٹ صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اس نے بولا تھا کہ میں اسی وقت اپنے صاحب کو اسے پہنچا دوں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

صاحب نے بوڑھے سے پیکٹ لے لیا اور کہا: "میم صاحب تو نئیں آیا بی؟"

"نئیں آیا صاحب!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"تم ابھی کچھ دیر باہر ٹھہرو۔" صاحب سوچتے سے انگریزی بول گئے۔

"جی صاحب؟"

میں نے صاحب کے جملے کا اردو میں ترجمہ کر کے بوڑھے کو مشکل سے بچا لیا اور وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ صاحب نے وہ پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے کھولو!"

ڈرتے ڈرتے میں نے وہ پیکٹ لے لیا۔ پیکٹ، ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لکڑی کا چھوٹا سا ڈبا تھا جس پر کپڑا چڑھا دیا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ صاحب خود وہ پیکٹ کیوں نہیں کھول

رہے تھے۔ اب اس عمر میں آ کر اور مختلف تجربوں سے گزرنے کے بعد میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ صاحب نے مجھ سے پیکٹ کیوں کھلوایا تھا۔ صاحب واقعی بڑے کائیاں تھے۔ اس پیکٹ کے اندر کوئی خطرناک چیز بھی ہو سکتی تھی اس لیے صاحب نے اسے خود کھولنے سے اجتناب کیا تھا۔

میں نے کپڑا اُدھیڑ کر دیکھا۔ وہ لکڑی کا ڈبا ہی تھا جس کا ڈھکنا کیلوں سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے ڈھکنا کھول دیا اور اسی کے ساتھ میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ ڈبے میں اوپر ہی رُوئی پر ایک کٹی ہوئی اُنگلی رکھی تھی جس میں انگوٹھی بھی تھی۔ میرے ہاتھ کانپے اور ڈبا میز پر گر پڑا۔

"کیوں کیا ہوا؟ کیا ہے اس میں؟" صاحب نے اپنی کرسی سے اٹھے بغیر متفکر لہجے میں پوچھا۔

"کٹی ہوئی انگلی۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا۔

"کٹی ہوئی انگلی!" صاحب نے حیرت سے میرے الفاظ دُہرائے اور پھر کرسی سے اُٹھ کر ڈبے پر جھک گئے۔ "اوہ!" صاحب کے مُنہ سے نکلا، پھر ہکلانے لگے: "یہ ... یہ تو کیٹی ... کیٹی کی انگلی معلوم ہوتی ہے ... یہ انگوٹھی ... انگوٹھی بھی اسی ... اسی کی ہے۔"

صاحب کے حواس کچھ دیر میں کسی قدر بحال ہوئے اور انھوں نے ڈبے سے کٹی ہوئی انگلی روئی سمیت نکال لی۔ انگلی کے نچلے حصے پر کہیں کہیں خون لگا ہوا تھا۔ روئی کے نیچے ایک لفافہ رکھا ہوا نظر آیا جس پر صاحب کا نام ٹائپ کیا ہوا تھا۔ صاحب نے کٹی ہوئی انگلی کو میز پر رکھ دیا تھا اور اب ڈبے سے وہ لفافہ نکال رہے تھے۔ کٹی ہوئی انگلی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا لی۔

صاحب نے لفافہ اٹھا کر چاک کیا اور اس میں سے پرچہ نکال کر پڑھنے لگے۔ پرچہ پڑھتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔ پرچہ پڑھ کر انھوں نے بغیر کوئی تبصرہ کیے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ان کے ہاتھ میں لرزش محسوس کر لی تھی۔

میں، صاحب کے ہاتھ سے پرچہ لے کر پڑھنے لگا۔ ٹائپ کی ہوئی انگریزی تحریر تھی، لکھا تھا: "سر تھامس! ہمیں یقین ہے کہ تم نے اپنی بیوی کی کٹی ہوئی انگلی اور انگوٹھی کو پہچان لیا ہوگا۔ اس کے بعد تمھیں یقین آ جانا چاہیے کہ تمھاری بیوی ہمارے قبضے میں ہے اور ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اس ہفتے ہم نے اس کی صرف ایک انگلی کاٹ کر بھیجی ہے مگر اگلے ہفتے تمھیں اس کا پورا دایاں ہاتھ، کلائی سے کاٹ کر بھیجا جائے گا، پھر بایاں ہاتھ کاٹ کر روانہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم باری باری دایاں پیر اور بایاں پیر، ٹخنے سے کاٹ کر تمھیں ارسال کر دیں گے۔ ہاتھوں اور پیروں کے بعد جسم کے مختلف اعضا تمھیں ہر ہفتے ملتے رہیں گے اور سب سے آخر میں کیٹی کا کٹا ہوا سر، مناسب پیکنگ میں تمھیں دستیاب ہوگا۔ ہم نے چاہا تھا کہ اس کی نوبت نہ آئے مگر تمھاری حماقت نے تمھیں یہ دن دکھایا۔ تمھارا ایک احمق انسپکٹر، ہمارے آدمی کے پیچھے لگ گیا اور ہمیں مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری بیوی اتنی اذیت ناک موت مرے لیکن اس کا انحصار تم پر ہے۔ تم چاہو تو اپنی بیوی کو اس اذیت ناک موت سے بچا سکتے ہو۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تم ہماری مطلوبہ شے ہمیں فراہم کر دو۔ ہم اپنی مطلوبہ شے کے بارے میں تمھیں اس وقت کچھ بتائیں گے جب تم اپنی رضامندی کا اظہار کر دو گے۔ ہمیں علم ہے کہ تم وقت کے بہت پابند ہو اور روزانہ صحیح وقت پر دفتر پہنچتے ہو، نہ پہلے، نہ بعد میں! اگر تم راضی ہو تو کل وقت پر دفتر نہ آنا۔ ہم سمجھ لیں گے کہ تم ہماری بات ماننے پر آمادہ ہو۔ اگر ٹھیک وقت پر تم دفتر پہنچ گئے تو ہم سمجھ لیں گے کہ تمھارا جواب انکار میں ہے۔ بقیہ باتیں تمھارے فیصلے کے بعد!"

اس تحریر کے نیچے صرف ایک انگریزی حرف "ایس" ٹائپ کیا ہوا تھا۔ وہ تحریر پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صاحب کی طرف وہ پرچہ بڑھا دیا۔

"کیا خیال ہے تمھارا؟ وہ کیا مطالبہ کریں گے؟" صاحب نے مجھ سے کہا۔ اب وہ بڑی حد تک خود پر قابو پا چکے تھے۔

میری فاختہ ابھی تک اُڑی ہوئی تھی اور واپس نہیں آئی تھی اس لیے مجھے جواب دینے میں کچھ وقت لگا۔ صاحب نے جب دوبارہ اپنا سوال دُہرایا تو میں بولا: "میں تو کچھ ... کچھ نہیں سمجھا سر!"

"تمھیں یاد ہوگا، میں نے بتایا تھا کہ ان دنوں کیٹی دفتری معاملات میں دلچسپی لینے لگی تھی جب کہ پہلے ایسا نہیں تھا۔" صاحب نے تصدیق طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے گردن ہلا دی: "یاد ہے سر!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ کیٹی کو ذریعہ بنا کر اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس کا تعلق دفتر ہی سے تھا۔ تمھاری مداخلت کے بعد اب انھوں نے دوسرا طریقہ استعمال کیا۔ وہ اب براہِ راست مجھ سے اپنا وہ مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار بالواسطہ طور پر انھوں نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کا جو مقصد بھی ہے، اس کا تعلق دفتر سے ہے۔" یہ کہہ کر صاحب چُپ ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ تائید کے سوا میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے تائید کرنے کے بعد صاحب سے دریافت کیا: "سر! کیا آپ کل وقت پر ہی دفتر آئیں گے؟"

"نہیں۔" صاحب نے جواب دیا: "فی الحال یہ ضروری ہے۔ اس طرح کم از کم یہ تو پتا چل جائے گا کہ ان کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ یقیناً اس کے بعد دوبارہ رابطہ قائم کریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے

کہ میں ان کے آگے جھک گیا ہوں بلکہ میرا مقصد ان سے رابطہ قائم رکھنا ہے۔ ہم ابھی تک مکمل تاریکی میں ہیں اور مجرموں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں تو یہ تک خبر نہیں کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں اور یوں بھی ایک زندگی خطرے میں ہے جسے بچانا ہمارا فرض ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود میری بیوی ہے لیکن اگر وہ میری بیوی نہ بھی ہوتی تو میں اس کی جان بچانے کے لیے حتی الامکان کوشش کرتا۔" یہ کہہ کر صاحب خاموش ہو گئے۔

معاملہ گمبھیر ہے، اس کا اندازہ مجھے گزشتہ دن ہی ہو چکا تھا۔ جس معاملے میں ایک عدد قاتل بھی ملوث ہو اسے گمبھیر ہونا ہی چاہیے اور اب تو یہ پتا چلا تھا کہ رنجیت جیسا قاتل بھی کسی کا چمچا تھا، کسی ہستی

ایس کا چمچا! اس کا مطلب یہ تھا کہ "حضرت ایس" کوئی بہت پہنچی ہوئی ہستی تھے۔ بھلا بتاؤ جو لوگ یوں قسط وار کسی جاندار کو قتل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں، ان سے کون پنجہ لڑائے گا۔ صاحب خواہ مخواہ مجھے رولنے کے سامان کر رہے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے تھوڑی بہت ہمت پکڑ کر صاحب کو مخاطب کیا کیوں کہ زیادہ ہمت پکڑنے میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کہا "سر! اب تو براہِ راست مجرموں سے آپ کے مذاکرات شروع ہو گئے ہیں اور ضروری نہیں کہ میں کباب میں ہڈی بنوں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ لوگ برا بھی مان سکتے ہیں۔ یوں بھی آپ نے میرے سپرد جو کام کیا تھا وہ میں انجام دے چکا ہوں۔ میں آپ کو اس شخص کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں جس سے آپ کی بیگم ملا کرتی تھیں۔"

صاحب مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ بالآخر چند لمحے بعد وہ بولے "ان باتوں سے تمھارا مقصد کیا ہے؟"

"وہ تو مجھے بھی نہیں معلوم سر!" میں نے اپنی دانست میں ایک راز پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

"پھر کیسے معلوم ہے!" صاحب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور میں بغلیں جھانکنے لگا، سچ مچ نہیں بلکہ محاورتاً!

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر میں نے صاحب سے اجازت طلب کی۔

صاحب نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "کل جب میں دیر سے دفتر آؤں گا تو مجرم یہی سمجھیں گے کہ میں نے ان کی بات مان لی ہے۔ اس کے بعد وہ یقیناً کھل کر سامنے آ جائیں گے، میرا مطلب ہے کہ وہ اپنا مطالبہ کرنے کی خاطر رابطہ قائم کریں گے۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے کیٹی کو کس لیے اغوا کیا ہے۔"

یہ کہہ کر صاحب خاموش ہو گئے۔

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد صاحب کی تیوری پھر کھلی "کل ہم آج سے زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوں گے کہ اس معاملے پر غور کر سکیں۔"

میرا جی چاہا کہ صاحب سے کہہ دوں، صاحب جی! آپ تنہا ہی "غور" کیجیے گا مگر یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

"کل جب مجرم مجھ سے رابطہ قائم کریں گے تو میں تمھیں بلوا لوں گا۔ اب تم جاؤ۔" صاحب نے بالآخر مجھے اجازت دے ہی دی۔

یہ خوش خبری سنتے ہی گویا میں وہاں سے رسی تڑا کر بھاگا۔ اپنے کمرے تک پہنچتے ہوئے میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ اس مصیبت سے کس طرح جان چھڑاؤں؟ مجھے اس کا صرف اور صرف ایک ہی حل نظر آیا کہ چھٹی لے کر کچھ دن کے لیے گھر بیٹھ رہوں۔ نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری! نہ میں دفتر آؤں گا نہ صاحب میری ننھی سی جان کو خطرے میں ڈالنے کا بندوبست کریں گے۔ میں جیسے ہی اپنے کمرے میں گھسا، ایک دم سناٹا چھا گیا حالانکہ پہلے بڑی "کھچڑیاں" پک رہی تھیں۔

اپنی کرسی پر بیٹھ کر میں نے دراز سے کاغذ نکالا اور چھٹی کی درخواست لکھنے لگا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی چھٹی کی درخواست نہیں لکھی تھی اور مجھے علم نہیں تھا کہ چھٹی مانگنے کے لیے کتنا سچ اور کتنا جھوٹ لکھنا پڑتا ہے۔ میں اسی لیے قلم کھول کر سوچنے لگا کہ لکھوں تو کیا لکھوں؟ اگر جھوٹ لکھا تو گناہ ہو گا اور سچ لکھنے کا سوال ہی نہیں۔

"آپ کچھ پریشان پریشان نظر آ رہے ہیں سر!" اچانک کمار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"پھر تم کون؟ قاضی کہ ملا؟" میں چڑ کر بولا۔

"میرا مطلب یہ تھا سر کہ اگر میں آپ کے کسی کام آ سکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔" اس کے لہجے میں مجھے پہلی بار ہمدردی کی جھلک نظر آئی اور میں سوچنے لگا کہ وہ اتنا برا بہرحال نہیں جتنا میں اسے سمجھتا رہا ہوں۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اچھا یہاں آؤ!"

کمار اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"جی سر!" اس کے لہجے میں سعادت مندی تھی۔

"تم نے کبھی دفتر سے چھٹی لی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں سر! کئی بار چھٹی لی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تم نے چھٹی کے لیے درخواست بھی یقیناً لکھی ہو گی؟"

"جی ہاں سر!"

"تمھیں یاد ہے، تم نے درخواست میں کیا لکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا تو آپ چھٹی کی درخواست لکھنا چاہتے ہیں سر!" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

"ہاں!" میں نے اعتراف کر لیا۔

"دراصل بات یہ ہے سر کہ سچ بات لکھ دی جائے تو چھٹی نہیں ملتی اس لیے مجبوراً جھوٹ لکھنا پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"تو پھر بتاؤ نا کہ کیا لکھا جائے؟"

"میں نے تو پیچش لکھی تھی۔" اس نے جواب دیا "آپ ایسا کریں کہ لکھ دیں دست آ رہے ہیں۔"

"پیچش ہی لکھ دوں تو کیا حرج ہے؟" مجھے دست آنا کچھ گندی سی بات لگی۔

"نہیں سر!" کمار نے کہا "اس سے ڈی آئی جی صاحب شک میں پڑ جائیں گے کہ آپ کو بھی وہی مرض ہوا جو آپ کے ماتحت کو ہو چکا ہے۔"

کمار کی بات میں وزن محسوس کر کے میں بولا "تم ٹھیک کہتے ہو، میں یہی لکھے دیتا ہوں۔"

"اگر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیں کہ آپ کی پونک چل رہی ہے تو اور بھی جلدی درخواست منظور ہو گی۔" کمار نے مشورہ دیا "یہ بھی لکھ دیں سر کہ آپ اٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔"

اسی وقت کمرے میں ہنسی کی دبی دبی سی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں نے نظر گھما کر دیکھا تو میرے سبھی ماتحت منہ دبائے ہنس رہے تھے اور ہنسی دبانے کے سبب ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہنس رہے ہو تم لوگ؟" میں نے ڈانٹ پلائی۔

میری ڈانٹ نے الٹا اثر کیا۔ وہ سبھی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"سر! یہ عجیب بدتمیز لوگ ہیں۔" کمار منہ بنا کر بولا "سچ مچ آپ کی پونک کب چل رہی ہے!"

"ہاں اور کیا!" میں بولا اور دوبارہ باآوازِ بلند دہاڑا "اب اگر کوئی ہنسا تو اسے کمرے سے نکال دوں گا۔"

"گستاخی معاف حضور!" پیارے لال ہنر اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا "کمار نے حضورِ والا کو صائب مشورہ نہیں دیا۔"

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟" میں نے کمار کی طرف دیکھا "صائب کا کیا مطلب ہے؟"

"صائب کا مطلب ہے غلط! پیارے لال جی کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ کو غلط مشورہ نہیں دیا، مطلب یہ کہ صحیح مشورہ دیا ہے۔" کمار نے بتایا۔

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"یہ آپ ان لوگوں سے پوچھیے۔" کمار نے کہا اور پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

اب میرے ماتحتوں نے ہنسی پر قابو پا لیا تھا اس لیے میں نے انھیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور درخواست لکھنے لگا۔ میں نے درخواست میں وہی لکھا تھا جس کا مشورہ کمار نے دیا تھا۔ درخواست لکھنے کے بعد میں اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ اب میرا رخ تیواڑی جی کے کمرے کی طرف تھا۔ جیسے ہی میں اپنے کمرے سے نکلا تھا، عقب سے ہنسی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر میں نے ان پر کان نہیں دھرا۔ میں نے سوچا کہ ان کم بختوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ہو گا۔

تیواڑی جی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اپنے سابق باس دلاور خاں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولے "سنا ہے آج کل تم بہت اونچے اڑ رہے ہو۔"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ کب سے دفتر آنے لگے؟" میں نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے چھٹی بڑھوا لی تھی، آج ہی دفتر آیا ہوں۔ یہاں آتے ہی تمھارے بارے میں پتا چلا کہ آج کل تم نے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ میں تمھاری ہی طرف آ رہا تھا۔ کہاں جا رہے ہو؟" دلاور خاں بولے۔

"ذرا تیواڑی جی کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے بھی کچھ دن کی چھٹی چاہیے۔" میں نے بتایا۔

"بیٹے! اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا۔" انھوں نے جھوم کر کہا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔" میں حیرت سے بولا۔

"تمھیں چھٹی نہیں ملے گی۔" انھوں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تم بچے ہو، رفتہ رفتہ اس دفتر کے رموز سمجھو گے۔ اگر چند دن اور میری ماتحتی میں رہ جاتے تو سب کچھ سمجھ لیتے مگر تم نے خود اوکھلی میں سر دیا۔ افسر بننے کا جو شوق تھا تمھیں! بیٹے! یہاں جو جتنا زیادہ کام کرتا ہے، اس پر اتنا ہی اور کام لاد دیا جاتا ہے۔ میں کوئی پاگل نہیں کہ ایک ایک کیس میں سالوں گزار دیتا ہوں۔ کچھ دن گھستے رہو گے تو تمھیں خود عقل آ جائے گی۔" یہ کہہ کر دلاور خاں نے قدم بڑھا دیے۔ "اچھا پھر ملیں گے۔ کبھی خود بھی میرے پاس آ جایا کرو۔ بزرگوں کی صحبت میں فائدہ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے یوں ہی سر ہلا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ انھوں نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر چھٹی نہ ملی تو کیا ہو گا؟ میں یہی سوچتا ہوا تیواڑی جی کے کمرے تک پہنچ گیا۔

تیواڑی جی نے مجھے اندر بلوانے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ کچھ دیر بعد ہی میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"کہو اللہ دتا! کیا حال ہیں؟ کیسے آئے؟" تیواڑی جی سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے بولے۔

میں نے کچھ کہنے کی بجائے چھٹی کی درخواست ان کی طرف بڑھا دی۔ وہ مجھ سے درخواست لے کر پڑھنے لگے اور میں دھڑکتے ہوئے دل سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم تو اُٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہو!" انھوں نے درخواست پڑھ کر چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی... جی ہاں!" میں جلدی سے بولا۔

"پھر تم اپنے پیروں پر چل کر یہاں کیسے آگئے؟" انھوں نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں بوکھلا گیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا "مگر سر!... یہ... یہ تو درخواست ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" وہ گھورتے ہوئے بولے۔

"درخواست میں تو ایسی ہی باتیں لکھی جاتی ہیں، مثلاً پیچش ہوگئی ہے، دست آ رہے ہیں وغیرہ۔" میں نے وضاحت کی، پھر اپنی مجبوری بیان کی "میں نے پہلی بار چھٹی کی درخواست لکھی ہے اس لیے لکھنے سے پہلے مشورہ بھی کر لیا تھا۔"

"کس سے مشورہ کیا تھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"اپنے ماتحت کمار سے مشورہ کیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"پھر تم اس کی شکایتیں لے کر آتے ہو!" تیواڑی جی برہم ہو کر بولے "خود احمقانہ حرکتیں کرتے ہو اور اس پر الزام دھرتے ہو۔ آخر تمھیں اس سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے بتایا نا سر کہ اس سے پہلے کبھی چھٹی کی درخواست نہیں لکھی تھی۔" میں رو دینے والے لہجے میں بولا۔

"جہاں تک میں سمجھا ہوں، تم جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتے ہو کہ لوگ تمھیں احمق تصور کریں لیکن ہر وقت ایسا مناسب نہیں ہوتا۔ ذرا خود سوچو، تمھارے ماتحت کی نظر میں تمھاری کیا عزت رہ جائے گی! ضروری تو نہیں کہ ہر وقت تم اداکاری ہی کرو۔"

اب میں تیواڑی جی کو کیسے سمجھاتا کہ یہ اداکاری نہیں حقیقت ہے۔ چند لمحے بعد میں نے مردہ سے لہجے میں کہا "پھر آپ ہی بتا دیں کہ میں درخواست میں کیا لکھوں؟"

"لیکن تمھیں ضرورت کیا ہے چھٹی کی؟ تم کیوں چھٹی لینا چاہتے ہو؟"

ظاہر ہے کہ میں انھیں سچ بات تو بتا نہیں سکتا تھا اس لیے سوچنے لگا، کہوں تو کیا کہوں؟

مجھے خاموش دیکھ کر تیواڑی جی پھر بولے "خیر چھٹی کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم نے صاحب کا کام کر دیا؟"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے حیرت سے کہا کیوں کہ صاحب نے تو کہا تھا، میں کسی سے اس کا ذکر نہ کروں۔

"ظاہر ہے مجھے صاحب ہی نے بتایا ہوگا۔" تیواڑی جی معنی خیز لہجے میں بولے۔

میں نے طویل سانس لیا اور دل ہی دل میں کہا۔ اب مل گئی چھٹی بیٹا اللہ دتا! انھیں تو سب پتا ہے۔ اب مجھے اُڑن گھائی نہیں بھرنے دیں گے۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ صاحب کا کام کر دیا تم نے؟" تیواڑی جی مجھے خاموش دیکھ کر پھر بولے۔

"ہاں انھوں نے جتنا کام کہا تھا، اتنا کام میں نے کر دیا۔" میں نے جواب دیا۔

"جتنے کام سے کیا مطلب؟"

"جب آپ کو صاحب نے سب کچھ بتا ہی دیا ہے سر، تو پھر میں کیا بتاؤں؟" میں بولا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے۔" تیواڑی جی نے کہا "مجھے تو صاحب نے صرف اتنا بتایا تھا کہ انھیں تم سے کچھ ذاتی نوعیت کا کام لینا ہے اس لیے فی الحال میں تمھیں کوئی کیس نہ دوں۔ میں تم سے اسی کام کے بارے میں پوچھ رہا تھا تاکہ وہ کام ہو گیا ہو تو تمھیں کوئی کیس دوں۔"

"بس تو پھر یوں سمجھیں کہ وہ کام ہو گیا مگر سر، مجھے کیا چھٹی نہیں ملے گی؟"

"نہیں۔" تیواڑی جی نے فیصلہ سنا دیا "یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ تمھیں چھٹی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کس طرح سر؟"

"تمھاری اس درخواست سے۔" تیواڑی جی نے اپنے سامنے پڑی ہوئی درخواست اُٹھاتے ہوئے کہا "ویسے بھی میں صاحب سے پوچھے بغیر تمھیں چھٹی نہیں دوں گا۔"

"اگر آپ صاحب ہی سے پوچھ کر مجھے چھٹی دینا چاہتے ہیں تو پھر چھٹی نہ ہی دیں۔" میں نے مردہ لہجے میں کہا اور سوچنے لگا کہ دلاور خاں نے غلط نہیں کہا تھا، مجھے چھٹی نہیں مل سکتی۔

"کیوں؟ صاحب سے پوچھنے پر تمھیں کوئی اعتراض ہے؟" تیواڑی جی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "مجھے بہر حال ان سے پوچھنا تو پڑے گا ہی! معلوم ہوتا ہے، تم نے ان کا کام کیا نہیں۔"

میں چپ رہا، پھر کچھ دیر بعد بولا "اچھا سر! میں جاؤں؟"

"جاؤ!" انھوں نے جواب دیا اور میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے کمرے کی طرف واپس جاتے ہوئے مجھے کمار پر غصہ آ رہا تھا۔ گناہ اور بے لذت! ایک تو اس نے مجھ سے جھوٹ لکھوایا، پھر چھٹی بھی نہیں ملی۔

میں کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ کمار نے ہانک لگائی "ڈیئر سر! چھٹی مل گئی؟"

میں اس پر برس پڑا "جس افسر کے تم جیسے نالائق ماتحت ہوں، اسے کس طرح چھٹی مل سکتی ہے! بتاؤ تم نے مجھ سے جھوٹی باتیں کیوں لکھوائیں؟"

"آپ ہی نے مشورہ مجھ سے مانگا تھا اور پیارے لال جی نے میرے مشورہ سے اتفاق کیا تھا۔" کمار نے اپنے ساتھ پیارے لال ہنر کو بھی لپیٹ لیا۔

"حضور! یہ سراسر بہتان ہے۔ خادم نے پہلے ہی عرض گزاری تھی کہ کمار کا مشورہ صائب نہیں ہے۔" پیارے لال ہنر نے اپنی صفائی پیش کی۔

"دیکھ لیجیے سر! پیارے لال جی اب بھی وہی کہہ رہے ہیں۔" کمار نے کہا۔

"اپنا چونچیں بند رکھو تم لوگ! میں جانتا ہوں، تم سب کی ملی بھگت ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔

"حضور گستاخی معاف! منقار پرندوں کی ہوتی ہے اشرف المخلوقات کے نہیں۔" پیارے لال ہنر بُرا مان جانے والے لہجے میں بولا۔

"منقار کیا ہوتی ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک طرح کی دوا ہوتی ہے سر جو دستوں کے دوران میں کھائی جاتی ہے۔ پیارے لال ہنر غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ کو دست لگ گئے ہیں تو منقار کھائیں۔" کمار نے وضاحت کی۔

"سراسر غلط! حضور! یہ الزام ہے اس بندۂ ناچیز پر! بندہ ہرگز اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر پیارے لال ہنر، کمار سے مخاطب ہوا "اے برادرِ عزیز! ناحق اس فقیر کے حق میں خار نہ بو۔ بندہ تو بالتخصیص من و تو سبھی کے لیے دعائے خیر کرتا ہے۔"

شام ہونے تک ان کم بختوں نے مل کر میرے دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ اِدھر دفتر کا وقت ختم ہوا، اُدھر میں بھاگا اُٹھ کر وہاں سے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس سے اچھا تو یہی ہے، میں کوئی کیس لے لوں اور ان نابکاروں کی ڈیوٹیاں لگا دوں۔ نہ یہ سب دفتر میں ہوں گے، نہ میری چھاتی پر بیٹھ کر مونگ دلیں گے۔

کافی دن سے میں نے لیوسی کی خیر خبر نہیں لی تھی۔ میں نے سوچا کہ اسے دیکھتا چلوں۔ میں اس دوران میں بس ایک بار اس کے گھر گیا تھا لیکن اس دن وہ گھر پر نہیں ملی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ میں نے کیا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ یہ سوچ کر میں دفتر سے لال کنویں کی طرف چل دیا۔

لیوسی کا گھر ایک پتلی سی گلی میں تھا۔ خلافِ معمول اس دن گلی میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ شاید گلی کے بچوں نے وہاں کے لگے ہوئے بلب پر نشانے بازی کی مشق کی تھی یا پھر بلب فیوز ہو گیا تھا۔ میں نے اسی لیے اپنی پھٹ پھٹ کی رفتار کم کر دی۔ پھر جیسے ہی میں نے پھٹ پھٹ روکی، کوئی چیز اُڑتی ہوئی مجھ پر آ گری۔ پھٹ پھٹ ایک طرف گری اور میں چیختا ہوا دوسری طرف گرا۔ وہ جو بھی تھا، خاصا وزنی تھا اور میں اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے گلے پر تھے اور میرا گلا دبا جا رہا تھا۔ اسی وقت گلی میں ایک اور پھٹ پھٹ کا شور سنائی دیا جو قریب آتا جا رہا تھا۔ پھر معاً ناتج کی روشنی کا دائرہ قریب ہی چکرایا۔ وہ شخص جو میرا گلا دبا رہا تھا، ایک دم اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے جھک کر اپنا دایاں پیر پکڑ لیا۔ اتنے میں وہ پھٹ پھٹ قریب آ کر رک گئی۔

"اللہ دتا تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے ایک اجنبی بھاری آواز سُنی۔

اسی وقت وہ شخص جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا، بھاگ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو!" اجنبی ہمدرد نے حملہ آور کو للکارا مگر وہ نہیں رکا اور تاریکی میں بھاگتا چلا گیا۔

اجنبی نے تیزی سے اپنی پھٹ پھٹ اس کے پیچھے بھگائی۔ اسی وقت لیوسی کے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک نازک سی آشنا آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کیا ہوا؟ کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال!" میں زمین سے اُٹھتے ہوئے چہکا۔ اب میرے حواس کسی قدر بحال ہو گئے تھے اور میں لیوسی کی آواز پہچان چکا تھا۔

"ارے تم اللہ دتا!" لیوسی کے لہجے میں حیرت اور خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں میں۔" میں نے اپنا گلا سہلاتے ہوئے جواب دیا، پھر اپنی موٹر سائیکل اُٹھانے کے لیے جھکا۔

"وہ چیخ کس کی تھی؟" لیوسی، دروازے سے باہر آتی ہوئی بولی۔

"ایک حملہ آور کی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم پر حملہ کیا تھا اس نے؟" وہ میرے قریب آ گئی۔

"ہاں۔" میں بولا۔

"پھر؟ کیا بھاگ گیا وہ؟"

"ظاہر ہے اللہ دتا کے سامنے کون ٹک سکتا ہے!" میں سینہ پھلا کر بولا اور اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ حملہ آور پھر ادھر نہ آ جائے۔

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" لیوسی نے پوچھا۔

"گھر میں تو چلو پہلے یا یہیں سب کچھ پوچھ لو گی!" میں نے جلدی سے کہا۔

"ہاں آؤ، آؤ!" وہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

میں لیوسی کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو گیا۔ اب وہ بظاہر بالکل

صحت مند نظر آ رہی تھی۔ لیوسی نے اندر پہنچتے ہی دروازہ لگا دیا۔ گھر میں سناٹا دیکھ کر میں نے کہا "تمھاری والدہ محترمہ اور چھوٹا بھائی کہاں ہیں؟"

"پتھروالا میں میری خالہ رہتی ہیں۔ وہ دونوں وہیں گئے ہیں۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"اب تو تم قطعی صحت مند نظر آ رہی ہو، پھر دفتر کیوں نہیں آتیں؟" میں نے لیوسی کے ساتھ باہر والے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"ابھی میرے زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ابھی مزید ہفتہ بھر لگے گا۔" لیوسی ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی، پھر کہا "آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔" اس نے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھ کر اس کرسی پر بیٹھ گیا۔

لیوسی نے اچانک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی "ویسے تم ہو بڑے کٹھور! پلٹ کر پوچھا بھی نہیں کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی!"

"اگر تم خدانخواستہ مر ہی جاتیں تو پوچھتا کس سے! ویسے میں ایک ہفتے پہلے آیا تھا، تم ڈاکٹر کے گئی ہوئی تھیں۔ تمھارے چھوٹے بھائی نے نہیں بتایا؟" میں نے کہا۔

"ہاں بتایا تھا۔" وہ طویل سانس لے کر میرا ہاتھ سہلاتی ہوئی بولی۔ "لیکن... لیکن ایک بار سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اس دن میں نہیں ملی تھی تو تم پھر کسی دن آ سکتے تھے۔ خیر چھوڑو ان شکوے شکایتوں کو! یہ بتاؤ، وہ کیا ہنگامہ تھا جو الجھی باہر ہو رہا تھا؟ وہ حملہ آور کون تھا؟"

"وہ اتنی جلدی بھاگ گیا کہ میں اس کا نام ہی نہیں پوچھ سکا اور نہ خود اس نے بتایا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" لیوسی منہ پھلا کر بولی۔

"مجھے خود کچھ خبر ہو تو بتاؤں بھی!" میں نے کہا۔

لیوسی اب تک سیٹھ وشواناتھ والے کیس سے بے خبر تھی کہ میں کس طرح اسے نمٹا چکا ہوں۔ اس کے استفسار پر میں نے خوب نمک مرچ لگا کر تمام واقعات بیان کر دیے اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ہر بات سے میرا ہیرو ہونا ثابت ہوتا رہے۔ یہ باتیں کم و بیش وہی تھیں جو میں نے تیواڑی تی سے کی تھیں۔

تمام واقعات سن کر اس نے پوچھا "اب تم کس کیس پر کام کر رہے ہو؟"

"کسی پر نہیں۔" میں نے جواب دیا "میں کچھ دن کے لیے چھٹی لینا چاہتا تھا مگر درخواست منظور ہی نہیں ہوئی۔"

"تعجب ہے۔" لیوسی بولی۔ اس کے چہرے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا "آخر درخواست کیوں منظور نہیں ہوئی؟"

جب میں نے لیوسی کو وجہ بتائی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا ہوا بولا "آخر اس میں اتنے ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"اگر میں تمھیں اچھی طرح سمجھ نہ چکی ہوتی تو بے وقوف ہی سمجھتی!" لیوسی اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"کیوں سمجھتیں! میں بُرا نہ مان جاتا!"

"مانتے تو مانتے رہتے، اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا!" لیوسی پھر میرا ہاتھ سہلانے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم!" میں اپنا ہاتھ چھڑاتا ہوا بولا۔

"کاش تم اتنے ہی بھولے اور بدھو ہوتے جتنا خود کو ظاہر کرتے ہو۔" وہ طویل سانس لے کر بولی۔

"میں کیوں ہوتا بدھو! بدھو بلکہ بدھن ہو گی تم!" میں نے آنکھیں نکالیں پھر بولا "اچھا اب میں چل رہا ہوں۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا بُرا مان گئے؟" لیوسی نے میرا ہاتھ پھر پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی "کچھ دیر تو اور بیٹھ جاؤ ظالم! آنکھیں دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئی تھیں!!"

"پہلے تم اپنے الفاظ واپس لو کہ میں بدھو ہوں۔" میں اکڑ گیا۔

"چلو واپس! اب تو خوش!" اس نے کہا۔

میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اب تک میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ پھر جیسے ہی میں کرسی پر بیٹھا اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور اسی کے ساتھ اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ میں گھبرا گیا کہ آخر اسے ہوا کیا اور اسی کے ساتھ مجھے کچھ غصہ بھی آیا کیونکہ میں اپنے ہاتھ پر نمی سی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنا تھوک میرے ہاتھ پر لگا دیا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور لیوسی جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گئی۔ میں نے غصے میں اپنا ہاتھ اس کی ساری سے پونچھ دیا۔

"گندی کہیں کی!" میں بڑبڑایا۔

"پتھر کہیں کے!" وہ بھی اسی انداز میں بڑبڑائی۔

"میں تمھیں انسان کی بجائے پتھر لگتا ہوں، ہیں؟" میں جھلا گیا۔

"ہاں تم پتھر ہو!" وہ چیخ پڑی اور اسی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دھیمے اور بھرائے ہوئے لہجے میں بڑبڑائی "پتھر، تم پتھر ہو!"

میری سمجھ میں کچھ نہ آ سکا کہ اچانک اسے ہو کیا گیا ہے۔ میں نے اسی میں عافیت جانی کہ وہاں سے کھسک لوں۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "لیوسی! تمھاری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ میں چل رہا ہوں، تم آرام کرو۔" یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔

اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور چہرہ سرخ تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔

"کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"ارے سچ!" میں ایک دم اچھل پڑا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا! یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں نے بھی ایک بار ایک لڑکی سے محبت کی تھی مگر حیف صد حیف میری محبت ناکام ہو گئی اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ بندر کی بلا تویلے کے سر منڈھ جاتی۔"

"تو کیا تم اب بھی اسے چاہتے ہو؟" وہ بدستور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"خدا نہ کرے خدا نہ کرے اپنا ہے، اس کا باپ قصائی تھا۔" میں نے کہا۔

"کیا تم کچھ دیر بیٹھ کر سنجیدگی سے بات نہیں کر سکتے؟" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"کیوں نہیں کر سکتا۔" میں بولا "اور اب تو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں بھی تم سے محبت کروں گا نا! پہلی محبت تو بس یوں ہی سی تھی۔" یہ کہہ کر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا تم سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہے ہو؟" لیوسی نے کہا۔ اب اس نے اپنی ساری کے دامن سے آنسو پونچھ لیے تھے۔

"تو کیا تم مذاق سمجھ رہی ہو!" میں بولا "میں واقعی تم سے محبت کرنے پر آمادہ ہوں۔ کسی لڑکی نے مجھ سے آج تک یہ بات کہی ہی نہیں ورنہ اب تک تو میں محبت کر چکا ہوتا۔ ہاں بہار نے یہ بات ضرور کہی تھی اسی لیے میں بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا۔"

"یہ بہار کون ہے؟" لیوسی نے پوچھا۔

"ہے نہیں تھی۔" میں نے تصحیح کی۔

"کیوں، کیا کہیں چلی گئی یا..." لیوسی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں وہ غائب ہو گئی، راتوں رات! کچھ پتا نہیں چلا کہ کہاں گئی!" میں نے بتایا۔ اس کے بعد بہار سے اپنے عشق کی داستان سنانے لگا۔ یہ داستان سنتے ہوئے لیوسی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی اور میں بار بار اس کے ہنسنے پر حیرت کا اظہار کرتا رہا۔

"تو یہ تھا تمھارا پہلا عشق، ناکام عشق!" وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" میں نے ٹھنڈا سانس لیا اور اسی وقت مجھے چچا بندو خاں کی لونڈیا یاد آ گئی جس سے میرا رشتہ ہو چکا تھا۔ میرے مستقبل کی بیوی تو وہ تھی، پھر لیوسی سے کس طرح عشق چل سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں فکرمند ہو گیا۔

میری فکرمندی لیوسی سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے کہا "کیا ہوا الٹو دتا! تم ایک دم اداس سے کیوں ہو گئے؟"

"اداسی کی وجہ ہے لیوسی!"

"کیا؟"

"میں... میں تم سے محبت نہیں کر سکوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی "شاید میری قسمت میں محبت... محبت کرنا لکھا ہی نہیں ہے۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟ ابھی ابھی تم اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔"

"ہاں لیوسی! اس وقت میں بھول گیا تھا کہ تم... تم میری ہونے والی بیوی نہیں بن سکتیں۔" میں نے بدستور بھرائی آواز میں کہا۔

"تم شاید اس لیے ایسا سوچ رہے ہو کہ میں عیسائی ہوں۔" لیوسی پھر سنجیدگی سے کہا "میں تمھیں ایک بات بتا دوں کہ اہل کتاب سے شادی جائز ہے۔ اگر اس پر بھی تمھیں کوئی اعتراض ہو تو میں تمھاری خاطر مسلمان بھی ہو سکتی ہوں۔"

"یہ بات تو میرے ذہن میں بھی نہیں تھی۔ لیوسی، وہ تو بات ہی کچھ اور ہے جس نے مجھے اداس کر دیا ہے اور میں محبت نہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا وہ بات مجھے بتانے کی نہیں ہے؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"اگر تم سننا ہی چاہتی ہو تو سن لو کہ میرا رشتہ چچا بندو خاں کی لونڈیا سے ہو چکا ہے۔" میں نے بتایا۔

"بندو خاں!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی "یہ وہ تو نہیں جو سرہتا سمن کا چپراسی ہے؟"

چچا بندو خاں کے لیے مجھے یہ الفاظ کچھ پسند نہیں آئے۔ جب میں انھیں چچا کہتا تھا تو لیوسی پر بھی لازم تھا کہ وہ ان کا احترام کرتی مگر میں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا اور صرف سر ہلا دیا۔

"تو تم ایک چپراسی کی ان پڑھ لڑکی سے شادی کرو گے؟" لیوسی بولی۔

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ بار بار چچا بندو خاں کو چپراسی کہہ رہی تھی، وہ بھی ہتک آمیز انداز میں! اور پھر اس نے میری ہونے والی بیوی کو بھی ان پڑھ کہا تھا۔ میں بھڑک اٹھا "ہاں کروں گا، ان کی لونڈیا سے شادی! تم کون ہوتی ہو کہ ملا؟"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو الٹو دتا!" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا "میں کون ہوتی ہوں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی اور چہرہ اتر گیا تھا۔

اسے اداس دیکھ کر ایک بار پھر میرا دل ڈانواڈول ہونے لگا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں نے اس کے رخساروں

پر آنسو بہتے دیکھے۔

"تم... تم رو کیوں رہی ہو لیوسی؟" یہ کہتے ہوئے میں اس کے آنسو اپنی قمیص کے دامن سے پونچھنے لگا، پھر بولا "شاید تمھیں میری بات بُری لگ گئی۔ تم خود سوچو کہ اپنے ہونے والے خسر اور ہونے والی بیوی کی شان میں کون شخص توہین آمیز الفاظ برداشت کر سکتا ہے!"

"اگر... اگر اللہ دتا! تمھیں میرے الفاظ سے دکھ پہنچا ہے تو میں... میں معافی چاہتی ہوں" وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"اچھا چلو معاف کیا مگر اب چچا بندو خاں کو چپراسی نہ کہنا" میں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور بات آئی اور میں نے لیوسی سے کہا "میں نے سنا ہے لیوسی کہ ہمارے مذہب میں چار شادیاں جائز ہیں۔ ایک بار میرے ابّا امّی سے یہ بات کہہ رہے تھے اور ظاہر ہے کہ ابّا غلط نہیں کہہ رہے ہوں گے۔ تو میں بھی ایسا ہی کیوں نہ کروں؟"

"کیا مطلب؟" لیوسی رونا دھونا بھول کر حیرت سے بولی۔

"مطلب یہ کہ چچا بندو خاں کی لونڈیا کو بھی گھر میں ڈال لوں اور تمھیں بھی!" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!" لیوسی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں، اس میں کیا حرج ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اپنی محبت میں کسی کو شریک نہیں کر سکتی" لیوسی نے جواب دیا۔

"تو پھر ایک اور ترکیب ہے" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "جب تک چچا بندو خاں کی لونڈیا سے میری شادی نہیں ہو جاتی، میں تم سے عشق کرتا رہوں"

لیوسی میری بات سن کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگی، پھر کچھ دیر بعد بولی "اللہ دتا! تم آخر عشق کو سمجھتے کیا ہو؟"

"عشق کروں گا جبھی تو سمجھوں گا۔ تم عشق تو کرنے دو مجھے! ابھی تو پہلا ہی دن ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں سمجھ چکی ہوں کہ تم سنجیدہ نہیں ہو ورنہ اس طرح میرے عشق کا مذاق نہ اڑاتے" لیوسی اداس لہجے میں بولی۔

"تم آخر کس طرح یقین کرو گی کہ میں عشق کرنا چاہتا ہوں، سنجیدگی سے عشق کرنا چاہتا ہوں!"

"عشق کیا نہیں جاتا اللہ دتا! عشق ہو جاتا ہے جس طرح مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے کہ اس قدر توہین برداشت کرنے کے باوجود بھی میرے دل سے یہ جذبات نہیں نکل سکے"

"نہ تو تم سوکن برداشت کرنے پر راضی ہوتی ہو، نہ کچھ دن کے لیے یعنی میری شادی ہونے تک عشق کرنے پر آمادہ ہوتی ہو، پھر عشق ہو تو کیسے ہو!" میں نے اسے مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب یہ ذکر چھوڑو، کوئی اور بات کرو" لیوسی بولی۔ اس کے لہجے میں اب بھی اُداسی تھی۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

"شاید ممی آ گئیں" لیوسی یہ کہتے ہوئے اٹھی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔

اب میں وہاں مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ آنے والی لیوسی کی ماں ہی تھی جس کے ساتھ لیوسی کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ لیوسی نے مجھے چائے پینے کے لیے روکنا چاہا مگر میں نہ رکا اور پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ لیوسی مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔

"آتے تو رہو گے؟" اس نے مجھے الوداع کرنے سے پہلے کہا تھا۔

"ہاں" میں نے کہا تھا اور دروازے سے نکل کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گھر جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ حملہ آور کون تھا؟ کہیں وہ رنجیت تو نہیں تھا؟ یہ سوچتے ہوئے مجھ پر ہَول سوار ہونے لگا۔ پھر مجھے اپنے پُراسرار ہمدرد کا خیال آیا۔ اگر وہ عین وقت پر نہ ٹپک پڑتا تو اس حملہ آور نے میرا گلا ہی گھونٹ دیا ہوتا۔ اس پُراسرار ہمدرد کے بارے میں بھی مجھے تشویش تھی۔ اسے آخر کیسے پتا چل گیا تھا کہ کوئی مجھے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کر رہا ہے اور پھر یہ کہ اسے کیا پڑی تھی جو میری جان بچائی۔ اس نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا اور خیریت پوچھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے جانتا تھا لیکن میرے لیے اس کی آواز اجنبی تھی۔ ممکن ہے وہ آواز بدل کر بولا ہو! میں نے سوچا اور یہی سب کچھ سوچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

دوسرے دن دفتر پہنچتے ہی کچھ دیر بعد سر تھامسن کے پاس میری طلبی ہو گئی۔ طلبی کا حکم لے کر چچا بندو خاں ہی آئے تھے اور وہ کچھ فکرمند دکھائی دے رہے تھے۔

اپنے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ان سے پوچھا "کیا صاحب آج وقت پر دفتر آ گئے تھے؟"

"نہیں" چچا بندو خاں نے جواب دیا، پھر بولے "اور یہ بڑی حیرت کی بات ہے بیٹے! جب سے میں صاحب کے پاس ہوں، ایسا پہلی بار ہوا ہے" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہے، پھر بولے "تم نے اپنی جان نہیں چھڑا لی ابھی تک؟"

"کیا کروں چچا! میں نے تو کل چھٹی کی درخواست بھی دی تھی مگر تیوارای جی نے منظور ہی نہیں کی" میں نے جواب دیا۔

"تم نے کوئی ڈھنگ کا بہانہ نہیں کیا ہوگا" چچا بندو خاں بولے۔

"دراصل ابھی تمھیں دفتری معاملات کا تجربہ نہیں ہے۔ کوئی ایسی بات ہوا کرے تو مجھ سے مشورہ کر لیا کرو"

"میں نے تو بہت عمدہ بہانہ کیا تھا مگر بات بنی ہی نہیں۔ بہرحال پھر کوشش کروں گا، آپ فکر نہ کریں" میں نے چچا بندو خاں کو تسلّی دی۔

"ہاں بیٹے! کچھ نہ کچھ کرو، اس سلسلے میں! یہ روز روز کی پیشیاں اور طلبیاں اچھی نہیں ہوتیں" چچا بندو خاں نے نصیحت کی اور میں نے سعادت مندی کے اظہار میں سر ہلا دیا۔

سر تھامسن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ غصے میں بھرے بیٹھے ہیں۔ اس دن انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں ان کی میز کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسی وقت ان کے سامنے رکھی ہوئی اپنی درخواست پر میری نظر پڑی اور میں سہم گیا۔ تیوارای جی پر مجھے شدید غصہ آیا۔ ظاہر تھا کہ انھوں نے ہی وہ درخواست سر تھامسن تک پہنچائی تھی۔

سر تھامسن نے وہ درخواست اٹھا کر برہم لہجے میں کہا "کیا ہے یہ؟"

"یہ... یہ سر!... سر! درخواست ہے" میں ہکلایا۔

"تم اس قابل نہیں ہو کہ بستر سے اٹھ بھی سکو، کیوں!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔

"نن... نہیں تو سر!"

"پھر اس درخواست میں یہ کیوں لکھا ہے؟"

"یہ... یہ تو سر! درخواست ہے چھٹی کی درخواست!" میں ڈرتے ڈرتے بولا "میں نے... میں نے پہلی بار درخواست لکھی تھی سر! اس لیے غلطی ہو گئی، معاف کر دیں"

"لیکن تم نے چھٹی کی درخواست لکھی ہی کیوں جب کہ میں نے تمھارے سپرد ایک ضروری کام کیا ہوا تھا؟" سر تھامسن بدستور غصے میں بولے۔

"وہ... وہ کام سر!... میں نے... میں نے کر تو دیا سر!" میں ہکلایا۔

"شٹ اپ!" صاحب نے مجھے ڈانٹ پلائی "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ابھی معاملہ شروع ہی ہوا ہے"

میں نے سر جھکا لیا اور اسی وقت چچا بندو خاں کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر وہ لفافہ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ صاحب نے چچا بندو خاں کے ہاتھ سے لفافہ لے کر دیکھا اور پھر ایک دم چونک کر بولے "کون دے گیا ہے یہ لفافہ؟"

"شرما جی دے گئے ہیں صاحب!" چچا بندو خاں نے جواب دیا۔ "انھوں نے کہا تھا کہ دفتر آتے ہوئے، ایک شخص نے انھیں یہ لفافہ دیا تھا"

"شرما کو بلا کر لاؤ!" صاحب نے حکم دیا، پھر لفافہ چاک کر کے اس میں سے پرچہ نکالا اور پڑھنے لگے۔

میں خاموشی سے صاحب کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پرچہ پڑھ کر میز پر رکھ دیا۔ ان کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ بالآخر انھوں نے مجھے مخاطب کیا "سنو! میں ایک بار جس شخص کے سپرد جو کام کر دیتا ہوں، اسی سے وہ کام کراتا ہوں اور انکار نہیں سنتا، سمجھ گئے!"

"جی سر!" میں نے گردن بھی ہلائی اور زبان بھی۔

"میں چاہوں تو یہ معاملہ کسی اور انسپکٹر کے سپرد بھی کر سکتا ہوں مگر ایسا نہیں کروں گا" صاحب کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

خاموش رہنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے خاموش ہی رہا۔

"تم چپ کیوں ہو، کچھ بولتے کیوں نہیں!" صاحب نے سخت لہجے میں کہا۔

"کک... کیا بولوں سر!" میں رو دینے والے لہجے میں بولا۔

"تمھیں ہر حال میں اس کیس پر کام کرنا پڑے گا!" صاحب کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"کیوں نہیں، بالکل!" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"اسے پڑھو، یہ اسی مسٹر ایس کا خط ہے" صاحب نے میز سے وہ پرچہ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا جو لفافے کے اندر سے نکلا تھا۔ میں نے پرچہ لے لیا اور پڑھنے لگا۔ یہ پرچہ بھی اس پہلے پرچے کی طرح انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا جو پہلے کٹی ہوئی انگلی کے ساتھ ملا تھا۔

سر تھامسن!

تم آج وقت پر دفتر نہیں آئے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تمھیں اپنی بیوی سے محبت ہے اور تم اس کے کٹے ہوئے مزید جسمانی اعضا کا دیدار نہیں کرنا چاہتے۔ اسی کے ساتھ تمھارے اس عمل سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ تم ہمارا مطالبہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔ ہمیں تمھارے دفتر میں موجود ایک فائل چاہیے، مراری لال مرڈر کیس کی فائل! یہ فائل کل رات بارہ بجے اپنے کسی بھی آدمی کے ہاتھ پُرانے قلعے بھیج دو۔ پُرانے قلعے کے صدر دروازے پر ہمارا ایک آدمی تمھارے آدمی سے وہ فائل وصول کر لے گا۔ اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی چالاکی تمھارے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اگر ہمارا یہ مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو پھر تم جانتے ہی ہو کہ ہم کیا کریں گے! تمھاری بیوی کے مزید جسمانی اعضا تمھیں ہر ہفتے بھیجے جاتے رہیں گے۔

تمھارا

ابھی میں نے پرچہ پڑھا ہی تھا کہ دروازہ کھلنے اور پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ آنے والا شرما تھا' سب انسپکٹر شرما' دلاور خاں کا ماتحت! اس نے صاحب کو سلام کیا اور پھر مودب انداز میں میز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"تم آج کس وقت دفتر آئے تھے؟" صاحب نے شرما سے سوال کیا۔

"سر! آج ... آج مجھے بس تھوڑی سی دیر ہو گئی۔ میں معافی چاہتا ہوں!" شرما خوف زدہ سا ہو کر بولا۔

"کتنی دیر؟" صاحب نے سختی سے پوچھا۔

"یہی کوئی دس پندرہ منٹ لیٹ پہنچا ہوں گا سر!" شرما نے جواب دیا۔

"تم نے جو خط بندو خاں کو دیا' یہ تمھیں کس نے دیا تھا؟" صاحب نے دریافت کیا۔

"وہ سر! ایک غیر ملکی تھا!" شرما نے بتایا۔

"کیا کہا تھا اس نے؟" صاحب نے سوال کیا۔

"اس نے کہا تھا کہ میں یہ خط فوراً آپ کو پہنچا دوں ..."

"تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ خود یہ خط کیوں نہیں پہنچا دیتا!" صاحب شرما کی بات کاٹ کر بولے۔

"اس نے کہا تھا کہ وہ ذرا جلدی میں ہے اور اگر خود خط لے کر گیا تو اسے دیر ہو جائے گی۔ کیوں کہ سر! آپ اسے جانتے ہیں اس لیے وہ اخلاقاً کچھ دیر بیٹھنے پر مجبور ہو جائے گا۔" شرما نے وضاحت کی۔

"وہ تمھیں ملا کہاں تھا؟" صاحب نے پوچھا۔

"عمارت کے صدر دروازے پر!" شرما نے جواب دیا۔ اس کے انداز و اطوار سے جلد بازی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اس کا حلیہ؟"

"سر! میں نے زیادہ غور نہیں کیا جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اس کی آنکھیں گول اور چھوٹی تھیں جبڑے بھاری تھے۔"

"کوئی اور خاص بات نوٹ کی تم نے؟ ذہن پر زور دے کر بتاؤ۔"

"میں نے اسے قریب ہی کھڑی ہوئی کار کی طرف جاتے دیکھا تھا' اس کی چال میں ہلکا سا لنگ تھا۔" شرما نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔

"وہ دائیں پیر پر دباؤ ڈال کر چل رہا تھا؟"

"شاید!" شرما بولا۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتے؟"

"نہیں سر! میں اس قدر غور نہیں کر سکا کیوں کہ یوں بھی مجھے دفتر آنے کے لیے دیر ہو رہی تھی۔"

"اس کی کار کا نمبر یاد ہے تمھیں؟"

"جی نہیں سر!"

"پھر کیا خاک یاد ہے تمھیں!" صاحب کے لہجے میں جھنجلاہٹ سی آ گئی۔

شرما خاموش رہا۔

"بالوں اور آنکھوں کا رنگ؟"

"بال سنہری تھے اور آنکھیں بھوری سر!"

"تم جا سکتے ہو۔" صاحب ہاتھ اٹھا کر بولے۔

شرما شاید اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ تیزی سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

"سنہری بال' چھوٹی چھوٹی گول بھوری آنکھیں' بھاری جبڑے' دائیں پیر پر ... نہیں چال میں لنگ ..." صاحب خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا رہے تھے۔ "مگر اس کے بال تو سیاہ تھے ... بالوں کا رنگ بدلا بھی تو جا سکتا ہے لیکن اس کے ماتھے پر دائیں جانب زخم کا نشان بھی تھا ... ممکن ہے' وہ میک اپ میں ہو۔ یہ رچرڈ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ... اگر ایسا ہے تو پھر سوزی کو بھی ..." بڑبڑاتے بڑبڑاتے صاحب ایک دم اچھل پڑے اور میرے ہاتھ سے وہ پرچہ جھپٹ لیا جو مجرموں کی طرف سے موصول ہوا تھا۔

میں حیران حیران سا صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ ایک دم اچھل کیوں پڑے؟ کہیں ان کی کرسی میں کھٹمل تو نہیں ہیں اور کسی کھٹمل نے تو صاحب کے نہیں کاٹ لیا؟ میرا جی چاہا کہ صاحب سے ان کی خیریت دریافت کر لوں مگر اپنے ارادے سے باز رہا کیوں کہ صاحب کا موڈ کچھ اکھڑا اکھڑا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"ایس سے سوزی بھی ہو سکتی ہے اور وہ شخص رچرڈ! اگر ایسا ہے کہ وہ دونوں واقعی یہاں آ گئے ہیں تو ... تو معاملہ خطرناک ہے! ان کی ہندوستان میں آمد کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کوئی بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے یا کھیلا جانے والا ہے۔" صاحب پھر بڑبڑانے لگے۔ وہ اس طرح بڑبڑا رہے تھے جیسے کمرے میں تنہا ہوں۔

مجھے یہ موقع غنیمت محسوس ہوا کہ صاحب سے جانے کی اجازت لے لوں۔ "میں جاؤں سر؟" میں آہستہ سے بولا۔

"ہاں۔" صاحب بے خیالی میں کہہ گئے لیکن جیسے ہی میں چلا' انھوں نے ہانک لگائی "کہاں چلے؟"

"اپنے کمرے میں سر!" میں نے رک کر جواب دیا۔

"نہیں!" صاحب نے حکم دیا۔ "ابھی بیٹھو!" یہ کہہ کر انھوں نے گھنٹی بجائی۔

میں مجبوراً بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں ان سے جان چھوٹنے کی دعائیں کرنے لگا۔ اسی وقت چچا بندو خاں' کمرے میں داخل ہوئے۔

"تیواڑی کو بولو کہ مراری لال مرڈر کیس کی فائل لے کر آئے اور اس انسپکٹر کو بھی ساتھ لے کر آئے جو اس کیس پر کام کر رہا ہے۔" صاحب نے چچا بندو خاں سے کہا۔

چچا بندو خاں' صاحب کا حکم سن کر چلے گئے۔ پھر جب تک تیواڑی جی اور انسپکٹر مولا داد نہ آ گئے' کمرے میں خاموشی ہی چھائی رہی۔ صاحب نہ جانے کس سوچ میں غرق رہے۔ میں نے بھی انھیں مخاطب نہیں کیا۔ انسپکٹر مولا داد بھی کرائم برانچ ہی میں تھا مگر اس سے میرا تعارف نہیں تھا البتہ میں نے اسے آتے جاتے ضرور دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں اور میں اس کا سبب جانتا تھا۔ سر تھامسن کے حضور طلبی بہر حال معمولی بات نہیں تھی۔ ذرا سی غلطی پر نوکری تیل ہو سکتی تھی۔

جب تیواڑی جی اور انسپکٹر مولا داد' صاحب کے ہاتھ کا اشارہ پا کر میرے برابر والی دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو صاحب نے تیواڑی جی کو مخاطب کیا "کیا رہا اس کیس کا؟"

"انسپکٹر مولا داد کی تفتیش کے مطابق مراری لال کے قاتل کا اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ اب آپ کہیں تو مزید تفتیش جاری رکھی جائے ورنہ کیس فائل کر دیا جائے۔" تیواڑی جی نے جواب دیا۔

"کیس کی فائل مجھے دو!" صاحب نے کہا اور تیواڑی جی نے فائل صاحب کو تھما دی۔ صاحب نے فائل اپنے سامنے رکھتے ہوئے دوبارہ تیواڑی جی کو مخاطب کیا۔ "وجہ قتل کا پتا چلا؟"

"جی نہیں سر! یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔" تیواڑی جی بولے۔

"پھر معلوم کیا ہوا ہے!" صاحب نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔ "اس کیس کو کتنے دن ہو گئے؟"

تیواڑی جی نے سوالیہ نظروں سے انسپکٹر مولا داد کی طرف دیکھا اور میں نے پہلی بار مولا داد کی آواز سنی۔ مولا داد ہکلا کر بولا۔ "چھ... ما... ما... مہینے... سا... سا... سر!"

میں اس وقت یہ سمجھا کہ شاید انسپکٹر مولا داد گھبراہٹ کے سبب ہکلا رہا ہے مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ پیدائشی ہکلا ہے۔

"چھ مہینے میں کچھ پتا نہیں چل سکا!" صاحب نے ناگواری سے کہا۔ "یہ کیس انسپکٹر اللہ دتا کو دے دو!" صاحب نے حکم دیا۔

"مگر سر! اللہ دتا تو چھٹی ..."

"ہم اس کی درخواست مسترد کر چکے ہیں۔" صاحب نے تیواڑی جی کی بات کاٹ کر کہا۔

لے بیٹا اللہ دتا! اب آئی تیری کم بختی! بہت اڑن گھائیاں بھرنے کی سوچ رہا تھا' اب بول! میں نے دل ہی دل میں کہا۔

"بہتر ہے سر!" تیواڑی جی فرماں برداری سے بولے۔

"اس کیس کے سلسلے میں اللہ دتا براہ راست مجھ سے رابطہ رکھے گا۔" صاحب نے کہا۔ "تم کسی قسم کی مداخلت نہیں کرو گے۔"

تیواڑی جی نے گردن ہلا کر پھر فرماں برداری کا اظہار کیا لیکن ان کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ انھیں صاحب کا یہ حکم کچھ اچھا نہیں لگا۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو۔" صاحب نے کہا۔

تیواڑی جی اور مولا داد کے ساتھ میں بھی اٹھنے لگا۔

"تم یہ فائل اپنے ساتھ لے جاؤ۔" صاحب نے مراری لال مرڈر کیس کی فائل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آج تمام دن تم اس فائل کا اچھی طرح مطالعہ کرو اور جو بات وضاحت طلب ہو' انسپکٹر مولا داد سے معلوم کرو پھر کل صبح مجھ سے ملو۔"

جب میں وہ فائل لے کر صاحب کے کمرے سے نکل رہا تھا تو میری سماعت میں صاحب کی بڑبڑاہٹ گونج رہی تھی۔ معاملہ خطرناک ہے ... یہاں کوئی بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے ... میں نے سوچا' ہائے یہ سارے بڑے کھیل میرے ہی مقدر میں رہ گئے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ کیٹی کا قتل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کیٹی کے اغوا میں رچرڈ کا ہاتھ تھا' پیلٹ میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک تھی۔ رچرڈ کون تھا اور سوزی کون' اس سے مجھے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

راستے ہی میں تیواڑی جی نے مجھے کرید لیا۔ "اللہ دتا! کیا بات ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صاحب نے براہ راست کسی کیس میں دلچسپی لی ہو۔ تمھیں یقیناً پتا ہو گا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔"

"میری کم بختی!" میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیا؟" تیواڑی جی میری بات سن کر چونک پڑے "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"وہ سر! مجھے ... مجھے کچھ پتا نہیں۔ فائل پڑھ لوں تو کچھ معلوم ہو۔" میں جلدی سے بولا۔

"پتا نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتے؟" تیواڑی جی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

مجھے علم تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جسے صاحب چھپانا چاہتے ہیں اس لیے مجھے بھی کسی کو کچھ نہیں بتانا چاہیے لیکن مسلسل جھوٹ بولے جانا بھی میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے آخر تنگ آ کر کہہ ہی دیا۔ "صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی نے کہا پھر جلدی سے بولے "صاحب کو نہ بتانا کہ میں نے اس بارے میں تم سے کچھ پوچھا تھا۔"

"نہیں بتاؤں گا سر!" میں نے کہا' پھر اسی وقت مجھے اپنی چھٹی کی درخواست کا خیال آ گیا اور بولا۔ "سر! جب میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ درخواست چاہے نامنظور کر دیں مگر صاحب سے اس کا ذکر نہ کریں تو پھر ..."

"تو کیا تم مجھ سے جواب طلب کر رہے ہو!" تیواڑی جی بات کاٹ کر غصے میں بولے۔

"ن ... نہیں سر! میں ... میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا!" میں ان کی پھڑکتی ہوئی نوکیلی مونچھیں دیکھ کر گھبرا گیا۔

"مجھ سے کچھ پوچھتے ہوئے یہ خیال رکھا کرو کہ میں تمہارا افسر ہوں' سمجھے!" تیواڑی جی نے مجھے تنبیہ کی۔

"سمجھ گیا سر!" میں مردہ سی آواز میں بولا۔

کچھ دیر بعد اور کچھ دور چل کر تیواڑی جی اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑ گئے اور انسپکٹر مولاداد میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے "مراری لال مرڈر کیس" کی فائل پڑھنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ انسپکٹر مولاداد سے زبانی طور پر کچھ گفتگو بھی کر لوں۔ ممکن ہے اس طرح مجھے کیس سمجھنے میں کچھ آسانی ہو۔

"اگر آپ کے پاس وقت ہو تو کچھ دیر کو میرے کمرے میں چلیں۔ میں اس کیس پر آپ سے کچھ گفتگو کر لوں۔" میں نے انسپکٹر مولاداد کی عمر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے "آپ" کہہ کر مخاطب کیا۔ وہ مجھ سے دُگنی عمر کا دکھائی دیتا تھا۔

"یے... یے... بیکار ہے... تم خا... خام... خام... خوامو... خوامو... مخواہ اپنا مغز خا... خا... خراب کرو گے۔" اس نے ہکلا کر جواب دیا۔ "ویسے... تو... تو تم... کہہ... کہہ... کہتے ہو تو چل... چلتا ہوں۔"

"ہاں پہلے ہی چلیں۔" میں نے کہا۔

وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ستار اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر انسپکٹر مولاداد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ اسی وقت کمار کی آواز سنائی دی۔ وہ انسپکٹر مولاداد سے مخاطب تھا۔ "آ... آ... داب... سا... سا... سر!"

"چا... چو... چوپ!" انسپکٹر مولاداد اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا ہکلایا' پھر مجھ سے بولا۔ "یہ... یہ با... با... باد... بدتمیز ہے۔ پے... پہلے میرا... ماتحت تھا مگر... میں نے اسے بھا... بھگا دیا... اس... اس سے کا... کا... کہہ دو... چ... چ... چُپ بیٹھے۔"

"کمار! تم بالکل خاموش بیٹھو گے اور درمیان میں کچھ نہیں بولو گے' سمجھے!" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "یہ نہ بھولو کہ میں تمہارا افسر ہوں

اور انسپکٹر مولاداد تمہارے سابق افسر رہ چکے ہیں۔"

"ہا... ہا... مگر... تم... میں نے... کک... کیا کہا ہے۔ میں نے تو بس آ... آ... داب ہی کک... کیا ہے سر!" کمار نے ایک بار پھر انسپکٹر مولاداد کے لہجے کی نقل اتاری۔

"ہم... میں یہاں... نن... نہیں بیٹھ... سکتا... تمہیں جو... جو کو... کچھ پوچھنا ہو... مم... میرے کمرے میں آکر ما... ما... معلوم کر لینا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر مولاداد اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمرے سے تیر کی طرح نکل گیا۔

مجھے کمار پر سخت غصہ آیا مگر اس وقت اپنا غصہ پی گیا کیوں کہ اس کیس کی فائل کا مطالعہ کرنا تھا۔ ابھی میں نے فائل کھولی ہی تھی کہ پیارے لال ہنر کی آواز سنائی دی۔ "قبلۂ محترم! اگر آپ اسے سمع خراشی تصور نہ فرمائیں تو یہ بندۂ حقیر کچھ عرض کرنے کی جسارت کرے۔"

"کیا خراشی؟" میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم باز نہیں آؤ گے اُلٹی ٹیڑھی الفاظ بولنے سے!"

"ہاں سر' میں بھی پیارے لال جی کو اکثر سمجھاتا رہتا ہوں کہ دفتر میں ایسی گندی باتیں نہ کیا کریں مگر یہ مانتے ہی نہیں۔" کمار نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"گندی باتیں!" میں نے کہا۔ "کیا یہ بھی کوئی گالی ہے؟"

"اور کیا سر!" کمار جلدی سے بولا۔ "اسی لیے تو میں..."

"بھگوان کے لیے کمار! میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں' دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ حضور کو میری جانب سے کبیدہ خاطر نہ کرو۔" پیارے لال ہنر' کمار کی طرف دیکھ کر گھگھیایا۔

"تو پھر سنائیں گے ترنم سے اپنا سہ غزلہ؟ اب تو انکار نہیں کریں گے؟" کمار نے کہا۔

"ابے یہ کیا بلیک میلنگ ہو رہی ہے' میرے سامنے!" میں بگڑ کر بولا۔

"نہیں سر! یہ بلیک میلنگ نہیں۔ دراصل پیارے لال جی نے ایک نیا عشق کیا ہے اور اپنی محبوبہ کی شان میں ایک سہ غزلہ لکھا ہے جسے میں نے ایک بار سنا ہے اور دوسری بار سننے کی ہوس ہے۔ آپ بھی چاہیں تو سن سکتے ہیں۔ ایسی پھڑکتی ہوئی چیز آپ نے پہلے کبھی نہیں سنی ہو گی۔" کمار نے مجھے سہ غزلہ سننے کا شوق دیا۔

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس بکواس سے!" میں منہ بگاڑ کر بولا' پھر کہا۔ "اگر دفتری اوقات میں یہ خرافات سن لی گئیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا' ہاں!"

"میری عرض داشت تو رہ ہی گئی قبلۂ محترم!" پیارے لال ہنر پھر بول اٹھا۔

"تم سب اپنی چونچیں بالکل بند رکھو گے کیوں کہ میں ایک اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہا ہوں۔" میں نے سختی سے حکم دیا۔

"ایسے ہی نازیبا الفاظ سن کر تو ملال ہوتا ہے حضور!" پیارے لال ہنر دُکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "خادم پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ منقار موقف پرندوں کو عطا کی گئی ہیں۔"

"تم نے پھر گندی باتیں شروع کر دیں۔"

"یہ ہرگز گندی باتیں نہیں قبلہ! منقار چونچ کو کہتے ہیں مگر صاحب زبان حضرات لفظ چونچ جیسا غیر شاعرانہ لفظ بولنے سے اجتناب کرتے ہیں۔" پیارے لال ہنر نے وضاحت کی۔

"کچھ بھی کرتے ہوں گے' مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔" یہ کہہ کر میں

نے فائل کھول لی۔

"یہ مراری لال مرڈر کیس کی فائل ہے نا سر؟" کمار نے کہا۔

"ہاں پھر؟ تم سے مطلب؟" میں پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

"مجھے کیا' میں تو آپ کو بہت سی مفت معلومات فراہم کرنا چاہتا تھا۔ آپ نہیں چاہتے تو نہ سہی' میرے ٹھینگے سے!" وہ چڑانے والے لہجے میں بولا۔

"تم تمیز سے بات نہیں کر سکتے!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی سر!" وہ بولا۔

میں سمجھ گیا کہ کمار کو اس کیس کے بارے میں یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم تھا ورنہ وہ اس قدر نہ اکڑتا۔ یوں بھی مجھے پتا چل چکا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے انسپکٹر مولاداد کا ماتحت رہ چکا ہے۔ میری ماتحتی میں آئے اسے ابھی کچھ ہی عرصہ تو ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میں ذرا نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "تم کیا جانتے ہو اس کیس کے بارے میں؟"

"اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر! آخر مجھ سے مطلب کیا!" وہ اینٹھ گیا۔

"میں تمھیں بہ حیثیت افسر حکم دیتا ہوں' بتاؤ!" میں چیخ اٹھا۔

"زیادہ نہ چیخا کریں سر! آپ کا گلا خراب ہو جائے گا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"یہ میری بات کا جواب ہے!" میں نے سخت لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بات کا جواب میں دے چکا ہوں۔"

"بھاڑ میں جاؤ۔" میں نے جل کر کہا اور فائل پر نگاہ جما دی۔

یا تو کمار اور پیارے لال ہنر کو مجھ پر ترس آ گیا تھا یا وہ مجھ سے منہ ماری کرتے کرتے تھک گئے تھے اس لیے کچھ دیر کو کمرے میں امن چین ہو گیا اور اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے جلدی جلدی فائل پڑھنا شروع کر دی۔ مراری لال پہلے کشن گنج میں رہتا تھا لیکن بعد میں اس نے موری گیٹ میں ایک بڑا سا مکان خرید لیا تھا۔ اسی مکان میں اس کا قتل ہوا تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا مگر چند ہی دن میں امیر بن گیا تھا۔ اس کے پاس اچانک اتنی دولت کہاں سے آ گئی تھی' اس سلسلے میں کسی کو کچھ علم نہ ہو سکا تھا۔

انسپکٹر مولاداد نے یہ پتا چلانے کے لیے کہ مراری لال کے پاس اچانک کہاں سے دولت آ گئی تھی' کافی پوچھ گچھ کی تھی۔ اس پوچھ گچھ کے نتیجے میں صرف اتنا پتا چل سکا تھا کہ مراری لال سے ایک غیر ملکی عورت سنڈریلا کو ملتے جلتے دیکھا گیا ہے۔ سنڈریلا کے ہمراہ اکثر اس کا ہندوستانی شوہر راجیش کو بھی مراری لال کے پاس آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ان دونوں میاں بیوی کا حلیہ بھی لکھا تھا۔ بیوی کا حلیہ پڑھ کر تو خیر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا مگر شوہر کا حلیہ پڑھ کر میرا حلیہ بگڑ گیا۔ وہ سو فیصد رنجیت کا حلیہ تھا۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے چین اچھل پڑا۔

"کیا ہوا سر؟" کمار نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔ وہ شاید میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں' تم چپ بیٹھو!" میں نے شرمندہ سا ہو کر اسے ڈانٹ دیا۔

"میں سمجھا کہ شاید کسی کھٹمل وٹمل نے کاٹ کھایا۔" کمار نے یہ کہہ کر مجھے مزید سڑا دیا۔

"تم چپ بیٹھو گے کہ تمھیں کمرے سے نکال دوں!" میں دہاڑا۔

"الٹا زمانہ آ گیا ہے' جس کا گلا دبا ڈوہی آنکھیں نکالتا ہے۔ ہمدردی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔" کمار نے آہستہ سے کہا۔

پتا نہیں' وہ کیا احمقانہ بات کہہ رہا تھا' بھلا بتاؤ' گلا دبایا جائے گا تو آنکھیں نکلیں گی ہی! وہ بڑبڑا کر خاموش ہو گیا اس لیے میں نے اسے مزید نہ چھیڑنا اپنے حق میں بہتر ہی جانا اور دوبارہ فائل کا مطالعہ کرنے لگا۔

مراری لال ڈیفنس منسٹری میں ریکارڈ کیپر تھا۔ کچھ عرصے قبل کشن گنج میں اس کا ایک ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا جسے فروخت کر کے اس نے موری گیٹ میں اچھا سا مکان خرید لیا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی اور نہ کشن گنج والا مکان اتنے داموں میں بکا تھا کہ وہ موری گیٹ والا مکان خرید سکتا' پھر اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آ گئی تھی' یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب انسپکٹر مولاداد کو نہ مل سکا تھا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ بھی پہلے کی نسبت بدل گئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں مر چکی تھی اور باپ قریب المرگ تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا تھا لیکن اس کی موت سے پہلے ہی جوان بیٹا قتل ہو گیا تھا۔ بوڑھا اب تک زندہ تھا۔ تفتیش کے دوران ہی میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ مقتول مراری لال' ایک لڑکی رکمنی سے عشق کرتا تھا اور رکمنی بھی اس کے عشق میں گرفتار تھی۔ رکمنی کے کچھ خطوط' مراری لال کے کمرے سے ملے تھے جن سے اس کے عشق کے بارے میں پتا چلا تھا۔ ایک خط مراری لال کا بھی ملا تھا جو شاید وہ اپنے قتل سے پہلے رکمنی کو نہیں بھیج سکا تھا۔ اس خط میں مراری لال نے لکھا تھا کہ بہت جلد حالات سازگار ہو جائیں گے اور وہ رکمنی کو اپنے ساتھ لے کر کسی اور شہر میں جا بسے گا' پھر وہاں رکمنی سے شادی کرے گا کیوں کہ وہاں مذہب کے اندھے قانون ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں گے۔ وہاں یہ کوئی نہ جان سکے گا کہ رکمنی اس کے سگے ماموں کی بیٹی ہے اور اس رشتے سے ماموں زاد بہن ہے جس سے ہندو دھرم کے مطابق شادی جائز نہیں۔

جس رات' مراری لال کو قتل کیا گیا' اس سے ایک دن پہلے راجیش اور اس کی غیر ملکی بیوی سنڈریلا کو وہاں دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں مراری

لال سے ملنے آتے تھے۔ مراری لال کا بوڑھا باپ کیوں کہ کچھ اونچا سنتا تھا اس لیے وہ یہ تو نہیں بتا سکا کہ بات کیا ہوئی' ہاں اس نے اتنا ضرور محسوس کر لیا' آپس میں کچھ تلخ کلامی ہوئی تھی اور پھر وہ دونوں میاں بیوی چلے گئے تھے۔ بوڑھے سے مزید پوچھ گچھ کی گئی تھی مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکا تھا۔

انسپکٹر مولا داد نے مراری لال کے قتل کا شبہہ اُنھی دونوں پر ظاہر کیا تھا۔ کافی تلاش و جستجو کے دوران دونوں میاں بیوی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔

میں نے فائل میں درج ایک ایک تفصیل ذہن نشین کر لی' اس کے بعد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں انسپکٹر مولا داد سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس سے گفتگو کے دوران میں کوئی کام کی بات پتا چل جاتی۔ میں نے جان بوجھ کر کمار سے انسپکٹر مولا داد کے کمرے کے بارے میں نہیں پوچھا اور اپنے دوسرے نائب کمال کو مخاطب کیا "کمال! انسپکٹر مولا داد کا کمرہ کدھر ہے؟"

"میں بتاؤں سر!" کمار بیچ میں بول اٹھا۔

"نہیں!" میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا اور کمال کو اشارہ کیا۔

"انسپکٹر دلاور خاں کے برابر والا کمرہ ہے سر!" کمال نے بتایا۔

"میں بھی یہی بتاتا سر! آپ ناحق مجھ غریب کو کاٹنے دوڑتے ہیں۔" کمار نے کہا۔

"چپ رہو! میں تم سے بات نہیں کر رہا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل گیا۔

انسپکٹر مولا داد کے کمرے میں پہنچ کر میں نے اور ہی منظر دیکھا۔ وہ کسی معاملے میں ہکلا ہکلا کر اپنے دو عدد ماتحتوں پر برس رہا تھا اور وہ دونوں مُنہ دبا کر ہنس رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا "آ... آؤ انسپکٹر... ال... ال... لا... دت... دتا!" اس نے میرے نام کے ٹکڑے کر دیے تو مجھے تاؤ آ گیا۔

"میں ال لادت دتا نہیں' اللہ دتا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ میرے نام کے ٹکڑے کیے دے رہے ہیں۔" میں کسی قدر ناراضگی سے بولا۔

"تت... تم... تمھارے... تت تو... ٹکڑے... نن... نہیں کر رہا!" وہ جل کر بولا۔

"میرے ٹکڑے! کر کے تو دیکھو ذرا! تم نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے!" میں ہتھے سے اُکھڑ گیا اور میز پر ہاتھ مارا۔ "اگر تم انسپکٹر ہو تو میں بھی انسپکٹر ہوں' ہاں!"

"مم... میری بلا سے!" وہ بھی غصّے میں بولا۔ وہ غالباً پہلے ہی اپنے ماتحتوں سے تپا بیٹھا تھا اور اسی تپن میں مجھ سے الجھ پڑا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس فضا میں اس سے مراری لال مرڈر کیس کے بارے میں کیا معلوم کیا جا سکتا تھا اس لیے میں چپ چاپ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لی کہ جو کچھ اس کیس کے بارے میں علم ہو گا' اس نے کیس کی فائل پر لکھ دیا ہو گا۔ اس کے کمرے سے دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر میں نے اپنے حافظے کا امتحان لیا اور خوش ہو گیا۔ فائل میں جو کچھ تحریر تھا' مجھے صفحہ نمبر کے ساتھ حفظ ہو گیا تھا۔ میں ابھی اپنے حافظے کا امتحان لے کر فارغ ہی ہوا تھا اور کیس کی فائل بند ہی کی تھی کہ پیارے لال ہنر اپنی سیٹ سے اٹھا اور پھر میری میز کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

"حضورِ والا! خادم آج صبح سے کچھ عرض کرنے کے لیے مضطرب ہے مگر بندہ نواز نظرِ عنایت ہی نہیں فرما رہے ہیں۔" اس نے نرمی اور آہستگی سے کہا۔ اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

"تم اگر زیادہ گاڑھی اردو نہ بولنے کا وعدہ کرو تو میں تمھاری بات سن سکتا ہوں۔" میں نے اس کی عاجزی کے مدِّ نظر کسی قدر نرمی برتی۔

"خاکسار اپنی عادات سے قاصر ہے۔ بہرحال بندہ کوشش کرے گا کہ گفتگو کے دوران میں ثقالت نہ آنے پائے۔" اس نے وعدہ کیا۔

"یہ ثقالت کیا ہوتی ہے؟ تم نے پھر ہانکنا شروع کر دی اِدھر اُدھر کی!" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"میری مراد ثقالت سے 'مشکل الفاظ' تھی۔" اس نے وضاحت کی۔

"تو پھر ٹھیک ہے' کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں بولا۔

"غریب خانے پر ہر ماہ ایک شعری نشست منعقد ہوتی ہے۔ خادم کی گزارش ہے کہ حضور اس ماہ اس کی صدارت قبول فرمائیں۔" پیارے لال ہنر مجسّم انکسار بن کر بولا۔

"مگر میں تو شاعر نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے حضور!" اس نے دانت نکالے۔ "شعری نشست کے لیے شاعر ہونا ضروری نہیں' ہاں سخن فہمی ضرور شرط ہے لیکن بندے کا خیال ہے بلکہ یقین سمجھیں کہ حضور اگر چاہیں تو کچھ اشعار موزوں کر لینا' کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"لیکن اس کے لیے کوئی تخلص بھی تو چاہیے۔" میں بولا۔

"وہ بھی ہو ہی جائے گا سرکار! پہلے آپ ہامی تو بھریں' باقی باتیں اس خادم پر چھوڑ دیں۔"

پتا نہیں' اس کم بخت کمار کے کان کتنے بڑے تھے کہ مدھم آواز میں بات کرنے کے باوجود اس نے ہماری باتیں سن لیں اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔ "پیارے لال جی! میرے خیال میں اپنے ڈیئر سر کا تخلص بلبل ٹھیک رہے گا' بلبل دہلوی!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' پیارے لال ہنر' کمار سے الجھ پڑا۔ "کمار! تم ہرگز اس معاملے میں خامہ فرسائی نہیں کرو گے ورنہ تمھیں اچھی طرح علم ہے کہ میں تمھاری شکایت لے کر تمھارے والدِ بزرگوار تک بھی جا سکتا ہوں۔ میرے صبر کا مزید امتحان نہ لو! تم جانتے ہو کہ انھیں بھی شعری ذوق ہے اور دوسری' میں ان کی عزت کرتا ہوں۔"

خدا جانے پیارے لال ہنر کی دھمکی میں کیا اثر تھا کہ کمار کی چونچ بند ہو گئی۔ میں نے اس سلسلے میں خاموشی بہتر سمجھی' پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے بولا "کب ہے تمھارے یہاں وہ... کیا بتایا تھا' تم نے... شاعری کی نشست؟"

"شعری نشست حضور!" پیارے لال ہنر نے تصحیح کی۔ "آئندہ ہفتے' ہفتے کی شب۔"

میں نے سنا تھا کہ صدارتیں ہمیشہ بڑے آدمی ہی کیا کرتے ہیں۔ مجھے مفت میں یہ موقع مل رہا تھا۔ اس بہانے میں بڑے آدمیوں کی صف میں شامل ہو سکتا تھا۔ رہا تخلص اور شعروں کا مسئلہ تو یہ کسی نہ کسی صورت بعد میں حل کیا جا سکتا تھا۔ یوں بھی پیارے لال ہنر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ باقی تمام معاملہ میں اس پر چھوڑ دوں اس لیے فوراً ہی میں نے ہامی بھر لی۔ مجھے اپنا نام ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور آج تو انسپکٹر مولا داد نے اس کے ٹکڑے کر کے مزید میرا دل دُکھا دیا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اصل نام کی بجائے تخلص ہی سے مشہور ہونا زیادہ بہتر ہے۔

پیارے لال ہنر میری رضامندی پا کر خوش خوش اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور میں تخلص رکھنے پر غور کرنے لگا۔ کافی سوچ بچار کے بعد آخر مجھے اپنا نیا نام سوجھ ہی گیا۔ اس نام کی خوبی یہ تھی کہ یہ خاصے پڑھے لکھے لوگوں کا سا نام لگتا تھا' بالکل انگلش اسٹائل کا نام تھا۔ "اللہ" کا میں نے "اے" لیا اور "دتّا" کا "ڈی"۔ اس طرح میں نے "اے ڈی" بنایا' پھر اس کے آگے اپنے ابا کے نام کا پہلا حصہ جوڑ دیا اور یوں اس دن میں اللہ دتا سے اے ڈی مہر بن گیا۔ اپنا نیا نام رکھ کر میں اتنا خوش ہوا کہ فوراً پیارے لال ہنر کو آواز دے کر اپنے پاس بُلا لیا اور اس کے کان میں آہستہ سے "مُنکا"۔ "اے ڈی مہر کیسا رہے گا؟"

"سبحان اللہ' سبحان اللہ کیا کہنے ہیں حضور!" اس نے بہ آوازِ بلند میرے نئے نام کی تعریف کی۔ "مہر کا تو جواب ہی نہیں۔"

"کیا سر نے کوئی شعر موزوں کر لیا؟" کمار نے پیارے لال ہنر سے پوچھا۔

"اس سے عمدہ اور نفیس بات ہوئی ہے۔" پیارے لال ہنر چہکا۔ "اسی لیے تو میں کہتا تھا کہ حضور میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔"

"اماں کیا ہو گیا پیارے لال جی! کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے!" کمار نے کہا۔

"حضور نے اپنا تخلص تخلیق فرما دیا کمار میاں!" پیارے لال ہنر چہکا۔ "حضورِ والا نے اپنا تخلص 'مہر' تجویز فرمایا ہے۔"

میں اپنی تعریف پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ ان کم بختوں کو علم نہیں تھا کہ میرے ابا کا نام مہر دین ہے اور میرے حق میں بہتر ہی تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے "مہر" تخلص رکھا ہے۔ یوں اس دن کے بعد میرے ابا' ابا ہونے کے ساتھ ساتھ میرا تخلص بھی بن گئے۔ میں نے سوچا کہ اب صاحب لوگ بھی مجھے "ایلا ڈیٹا" کہنے کی بجائے اے ڈی مہر کہا کریں گے اور میرے نام کی درگت نہیں بنے گی۔

ہر چند کہ کمار نے "مہر" پر اعتراض کیا تھا مگر میں نے اسے ڈانٹ پلا کر خاموش کر دیا تھا۔ کمار نے میری بجائے پیارے لال ہنر کو مخاطب کر کے کہا تھا "پیارے لال جی! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمھارے حضورِ والا اور میرے ڈیئر سر نے مہر انساں کا "مہر" چرا لیا ہے اور اس پر وہ لڑکی بُرا مان سکتی ہے جس کا نام مہر انساں ہو گا۔"

"مہر انساں سے میرے نام کا کوئی تعلق نہیں سمجھے! میں اے ڈی مہر ہوں۔ تم اپنی بکواس بند کرو!" میں نے کمار کو ڈانٹ دیا تھا۔

ممکن ہے کمار کچھ اور بھی شوشے بازی کرتا مگر پیارے لال ہنر میدان میں کود پڑا تھا اور اس نے کمار کو پھر وہی دھمکی دی تھی جسے سن کر پہلے اسے خاموش ہونا پڑا تھا۔

اس دن میں دفتر سے بہت خوش خوش گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔

دوسرے دن دفتر پہنچتے ہی میں خود ہی سر تھامسن سے ملنے پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے فوراً ہی اپنے کمرے میں بُلوا لیا۔ جب ان کا اشارہ پا کر میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ بولے "ہاں ایلا ڈیٹا! تم نے وہ پوری فائل پڑھ لی؟"

میں نے صاحب کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں پہلے اپنا نیا نام بتانا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا "سر! میرا نام ایلا ڈیٹا نہیں بلکہ اے ڈی مہر ہے۔"

صاحب میری صورت حیرت سے دیکھنے لگے' پھر بولے "مگر تم نے تو مجھے اپنا یہی نام بتایا تھا۔"

"کل میں نے اپنا وہ پرانا نام بدل دیا سر!" میں نے بتایا۔

"ویل!" صاحب خوش ہو کر بولے "یہ نام آسان ہے۔ تمھیں پہلے ہی یہ نام رکھ لینا چاہیے تھا۔" پھر چند لمحے توقف کے بعد انھوں نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"یس سر!" میں بولا۔ "میں پوری فائل پڑھ چکا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے وہ فائل ان کی طرف بڑھا دی۔ کیس کی فائل میں اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ میں نے مزید کہا "اس فائل کے صفحہ نمبر پندرہ پر ان دو افراد کا حلیہ درج ہے جن پر مراری لال کے قتل کا شبہہ کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے ایک کا پتا میں چلا چکا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرا سینہ

خود بہ خود پھول گیا۔

صاحب میری توقع کے مطابق چونک اٹھے "کس طرح اے ڈی؟" انھوں نے میرے نام کے پہلے حروف سے مجھے مخاطب کیا۔

مجھے اس بات پر تھوڑا سا افسوس ہوا کہ انھوں نے صفحہ نمبر یاد ہونے کی کوئی داد نہیں دی تھی۔ دراصل غلطی میری ہی تھی میں نے ایک ہی فقرے میں دو عدد چونکا دینے والی باتیں کہہ دی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صفحہ نمبر سے زیادہ چونکا دینے والی بات، قاتلوں میں سے ایک کا پتا چلا لینا تھی اور صاحب اسی پر چونکے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب نہیں تو کچھ دیر بعد سہی میں صاحب سے اپنے حافظے کی داد ضرور وصول کروں گا۔

مجھے چپ دیکھ کر صاحب پھر بولے "تم نے ان میں سے ایک کا پتا کیسے چلایا اے ڈی؟"

"فائل پڑھ کر سر!" میں نے جواب دیا پھر بولا "مراری لال کے قتل ہونے سے پہلے ایک غیر ملکی عورت سنڈریلا اور ایک دیسی شخص راجیش اس سے ملتے جلتے دیکھے گئے تھے۔ قتل سے ایک دن پہلے مراری لال اور ان کے درمیان کسی معاملے میں جھگڑا بھی ہوا تھا۔ مراری لال کے قتل کا شبہہ انہی دونوں پر ہے۔ انسپکٹر مولا داد نے اسی لیے ان دونوں کے حلیے فائل میں لکھے ہیں۔ اس نے راجیش کا جو حلیہ لکھا ہے وہ بالکل رنجیت سے ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ رنجیت ہی راجیش تھا۔"

"ویری گڈ!" صاحب نے مجھے شاباش دی "گڈ پہ وگریس!" پھر صاحب بولے "تم نے صفحہ نمبر پندرہ بتایا تھا نا؟" صاحب، فائل اٹھاتے ہوئے بولے۔

"یس سر! صفحہ نمبر پندرہ پر ابتدائی چھ سطروں کے بعد ان دونوں کا حلیہ لکھا ہوا ہے جو خود کو میاں بیوی ظاہر کرتے تھے۔"

صاحب، فائل کی ورق گردانی کرتے کرتے رک گئے اور میری طرف ستائش آمیز انداز میں دیکھتے ہوئے بولے "ونڈر فل میموری اے ڈی! تمھیں سطریں تک یاد ہیں۔"

میں پھول کر کپا ہو گیا۔ آخر میں نے صاحب سے اپنے حافظے کی داد وصول کر ہی لی تھی۔

صاحب، فائل کھول کر پڑھنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صفحہ نمبر پندرہ ہی دیکھ رہے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد ہی میں نے انھیں چونکتے دیکھا، پھر وہ بڑبڑائے "ممکن ہے۔ وہ... وہ سوزی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ اپنے چہرے میں یہ معمولی سی تبدیلیاں کرلے۔ قد، آنکھوں کا رنگ، بالوں کا رنگ اور... اور سب کچھ وہی ہے۔ اگر... اگر واقعی ایسا ہی ہے تو... تو بڑی خطرناک بات ہے۔" صاحب کا انداز خود کلامی کا سا تھا اس لیے میں خاموش ہی رہا۔ بالآخر کچھ دیر بعد صاحب نے خود ہی مخاطب کیا "اے ڈی! کڑیاں ملتی جا رہی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"بالکل ملتی جا رہی ہیں سر!" میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے صاحب کی ہاں میں ہاں ملا دی حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ کون سی کڑیاں مل چکی ہیں اور کون سی ابھی ملنا باقی ہیں۔

صاحب چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر بولے "مراری لال کے قتل میں رنجیت پر شبہہ کیا جا رہا ہے اور کیٹی کے اغوا میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ کچھ سمجھے کہ وہ لوگ یہ فائل کیوں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟"

میں خاک بھی نہیں سمجھا تھا مگر فوراً گردن ہلا دی "سمجھ گیا سر!"

"مجھے تم سے یہی امید تھی اے ڈی! تم بہت ذہین ہو۔ ہے نا یہی بات کہ اس فائل میں رنجیت اور سنڈریلا کا حلیہ درج ہے اور وہ لوگ یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ ہمارے ریکارڈ میں ان کے حلیے موجود رہیں۔"

"بالکل بالکل سر! میں بھی بالکل اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔" میں نے گویا گرہ لگائی۔ بغیر کچھ سمجھے سمجھداری کی سند دھیلے میں مل گئی تھی، صرف گردن ہلانے پر!

"اور اب سنو کہ 'ایلس' کے پردے میں کون ہو سکتا ہے!" صاحب معنی خیز لہجے میں بولے۔

"سنائیے سر!" میں اس طرح بولا جیسے صاحب کوئی دلچسپ کہانی سنا رہے ہوں۔

"اس 'ایلس' کے پردے میں بین الاقوامی مجرمہ سوزی بھی ہو سکتی ہے۔ اس فائل کو حاصل کرنے کا اصل سبب پتا ہے کیا ہے؟" صاحب بولے۔

"معلوم ہے سر!" میں نے پھر پہلے والی ترکیب آزمائی حالانکہ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ صاحب کی مراد "اصل سبب" سے کیا ہے۔

"اچھا تو پھر بتاؤ!" صاحب نے مسکرا کر کہا اور اس وقت ان کی مسکراہٹ مجھے بہت زہر لگی۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے پھانس لیا تھا۔

"وہ سر! اصل سبب..." میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "وہ... وہ تو آپ... آپ ہی بہتر جان سکتے ہیں۔" میں نے اپنی جان تو چھڑائی اور سوچنے لگا کہ اب بڑی پھٹکار، مگر خلاف توقع ایسا نہیں ہوا۔

"تم نے ٹھیک کہا اے ڈی!" صاحب بدستور مسکراتے ہوئے بولے۔ "اس ملک میں صرف چند افراد ہی یہ فائل پڑھنے کے بعد اصل سبب تک پہنچ سکتے ہیں۔ تم تو خیر ابھی لڑکے ہو اور ہندوستان سے کہیں باہر بھی نہیں گئے۔ تم شاید روا روی میں پہلے یہ کہہ گئے تھے کہ تمھیں اصل سبب معلوم ہے مگر بعد میں غالباً تمھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔"

"جی... جی ہاں سر! قطعی ایسا ہی ہوا تھا سر! بھلا جس اصل سبب تک اس ملک میں چند افراد ہی پہنچ سکتے ہوں، اس تک میں کس طرح پہنچ سکتا ہوں۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"خیر تفصیلات میں تمھیں پھر کبھی بتاؤں گا، فی الحال صرف اتنا سن لو کہ تمھیں اس معاملے میں بہت ہوشیار اور چوکنا رہنا ہے کیوں کہ جن

لوگوں سے سابقہ ہے، وہ انتہائی خطرناک ہیں اور ان کی نظر میں کسی کو قتل کر دینا بہت معمولی سی بات ہے۔" صاحب نے کہا اور ان کی بات سن کر میں دہل گیا۔ میں نے سوچا کہ دل کڑا کر کے ایک بار کہہ ہی دوں، صاحب جی! مجھ غریب پر رحم کریں اور مجھے اس چکر میں نہ پھنسائیں مگر اسی وقت صاحب بول اٹھے "تمھیں آج رات بارہ بجے پرانے قلعے کے صدر دروازے پر پہنچنا ہے۔ ممکن ہے کہ آج میری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو ہی جائے۔"

"مم... مجھے... مجھے سر!" میں ہکلا کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ اے خدا! کیا سارے ایسے مقامات میرے ہی مقدر میں رہ گئے ہیں جہاں جن بھوت رہتے ہوں۔ پرانے قلعے کے بارے میں بھی کوٹلہ فیروز شاہ کی طرح متعدد کہانیاں مشہور تھیں۔

صاحب غالباً سمجھ گئے کہ میں پرانے قلعے جاتے ہوئے جھجک رہا ہوں۔ انھوں نے کہا "تم بالکل نہ گھبراؤ اے ڈی! تمھاری حفاظت کا مکمل بندوبست کر دیا جائے گا۔ قلعے کے اندر اور باہر ہر طرف ہمارے مسلح آدمی ہوں گے۔ اس کا بندوبست میں دن ہی میں کر دوں گا۔"

"مم... مگر... مگر سر! آپ... آپ مجھے وہاں بھیج ہی کیوں رہے ہیں؟ کیا کوئی بہت ہی ضروری کام ہے؟" میں روہانسے لہجے میں بولا۔

صاحب غالباً کچھ زیادہ ہی پرجوش تھے اس لیے انھوں نے میرے لہجے کی طرف تو توجہ نہیں دی اور بولے "کیا تم ان لوگوں کا مطالبہ بھول گئے؟"

"تو کیا آپ ان کا مطالبہ پورا کر دیں گے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں" صاحب یہ کہہ کر مسکرائے۔

صاحب کے ہاں کہنے پر مجھے ایک بہانہ مل گیا۔ اگر صاحب کو کسی طرح اس بات پر راضی کر لیا جاتا کہ وہ مجرموں کا مطالبہ رد کر دیں تو میں پرانے قلعے جانے سے بچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے صاحب کو بانس پر چڑھانے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بولا "سر! یہ آپ کی شان کے خلاف ہے کہ آپ مجرموں کے سامنے جھک جائیں اور ان کا مطالبہ تسلیم کر لیں۔"

"تو کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں حقیقتاً اصل فائل انھیں بھیج دوں گا!" صاحب نے کہا۔

"پھر اور کیا سمجھوں سر! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ان کا مطالبہ..."

"یہ صرف ایک فریب ہوگا۔ اس فائل کا صرف کور ہوگا۔" صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل اٹھا کر کہا۔ "فائل کے اندر سادہ کاغذ ہوں گے، اب سمجھے!"

"مگر... مگر اس سے کیا فائدہ ہوگا سر؟ جب وہ فائل کھول کر دیکھیں گے تو انھیں سب کچھ پتا چل جائے گا اور پھر..."

"بشرطیکہ انھیں اتنا موقع ملا۔" صاحب ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔

میں سمجھ گیا کہ صاحب، مجرموں کو پھانسنے کی خاطر مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور میں تھا کہ کسی صورت اس پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی زندگی داؤ پر نہ لگانے کی غرض سے آخری حربہ استعمال کیا۔ میں بولا "صاحب! پرانے قلعے اور اس کی اطراف میں رات کے وقت بھوت پریت منڈلاتے رہتے ہیں اور میں ان سے بہت ڈرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے مختصراً اپنی ایک فرضی خالہ کا فرضی قصہ سنایا کہ وہ ایک بار پرانے قلعے گئی تھیں تو ایک بھوت ان سے لپٹ گیا تھا جس کے بعد آج تک وہ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔" صاحب نے کہا "بھوت وت نہیں ہوتے۔ تمھاری خالہ کو کوئی دماغی بیماری ہو گی۔"

صاحب کی بات سن کر میری آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔

"سنو!" صاحب نے مجھے مخاطب کیا "آج رات گیارہ بجے سے پہلے تیواڑی تمھیں ایک فائل پہنچائے گا۔ تمھیں وہ فائل لے کر اسی وقت گھر سے روانہ ہو جانا ہے تاکہ وقت پر پرانے قلعے کے صدر دروازے پر پہنچ سکو۔ تم گھر سے نکلنے میں دیر نہیں کرو گے! سمجھ گئے!"

"جی ہاں سر! سمجھ گیا۔" میں نے اسی طرح مردہ لہجے میں کہا جیسے اپنی پھانسی کا حکم سن کر سخت ملول ہو چکا ہوں۔

اس کے بعد صاحب نے مجھے اپنے کمرے سے نو دو گیارہ کر دیا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ کوٹلہ فیروز شاہ گیا تھا تو کم از کم لیوسی تھی مگر اس بار تنہا ہی مجھے موت کے منہ میں جانا پڑ رہا تھا۔ وہ منحوس فائل صاحب نے اپنے پاس ہی یہ کہہ کر رکھ لی تھی کہ وہ خود بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

دوپہر کے بعد صاحب کا بلاوا پھر آگیا۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ وہ پوری فائل پڑھ چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اسی وقت مقتول مراری لال کی محبوبہ رکمنی سے ملنے کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ ان کا خیال تھا کہ رکمنی سے مل کر انسپکٹر مولا داد نے حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ صاحب کے خیال میں رکمنی سے کوئی نہ کوئی کام کی بات ضرور معلوم ہو سکتی تھی۔

"مگر سر! رکمنی نہ جانے کہاں رہتی ہے۔ انسپکٹر مولا داد نے اس کا پتا فائل میں نہیں لکھا۔" میں نے کہا "میں اتنے بڑے شہر میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا!"

"مقتول مراری لال کا پتا تو فائل میں موجود ہے۔ کیا تم اس کے بوڑھے باپ سے رکمنی کا پتا معلوم نہیں کر سکتے! اتنی سی بات تمھیں خود بھی سمجھ لینا چاہیے تھی اے ڈی!" صاحب کے لہجے سے ہلکی سی خفگی کا اظہار ہوا۔

"یہ تو میں بھول ہی گیا تھا سر!" میں جلدی سے بولا "میں ابھی موری گیٹ جاتا ہوں، مقتول مراری لال کے گھر کا پتا مجھے یاد ہے۔"

"دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے تم یہ کام نمٹا دو گے تاکہ مجھے رپورٹ دے سکو۔" صاحب نے ہدایت کی۔

"بہتر ہے سر!" میں بولا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں صاحب کے کمرے سے باہر آیا تو چچا بندو خاں میری طرف لپکے اور پوچھا: "کوئی ایسی ویسی فکر کی بات تو نہیں بیٹے؟ مجھے تمھاری طرف سے بہت فکر ہے۔"

"کوئی ایسی فکر کی بات نہیں چچا! دراصل صاحب مجھ سے اپنا ایک ذاتی کام لے رہے ہیں اسی لیے بار بار بلواتے ہیں۔" میں نے چچا بندو خاں کی تسلی کے لیے کہا۔

"پھر تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اس موقع سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ ایسا وقت بار بار نہیں آتا۔" چچا بندو خاں خوش ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ آخر اس میں خوش ہونے کی کون سی بات ہے! یہاں تو جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے اور چچا ہیں کہ خوش ہو رہے ہیں۔

میں چچا بندو خاں سے رخصت ہی ہونے والا تھا کہ معاً مجھے خیال آیا، چچا بوڑھے اور تجربے کار آدمی ہیں کیا خبر کبھی ان کا جن بھوتوں سے پٹیا ہوا ہو۔ انھیں جن بھوت بھگانے کی کوئی نہ کوئی دعا ضرور یاد ہو گی۔ یہ سوچ کر میں چلتے چلتے رک گیا اور بولا: "چچا! آپ کو کوئی ایسی دعا معلوم ہے جس سے جن اور بھوت بھاگ جاتے ہیں؟"

"کیوں، کیا ہوا؟ کس کے سر پر آ گیا جن؟" چچا بندو خاں فکر مند لہجے میں بولے: "گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

"ابھی تو کسی کے سر پر جن نہیں آیا لیکن امکان ضرور ہے۔" میں نے گول مول بات کی۔

"کس کے سر پر جن آنے کا امکان ہے؟" چچا بندو خاں پہلے سے زیادہ فکر مند انداز میں بولے، پھر بغیر رکے کہا: "تمھیں پہلے سے یہ بات کیسے پتا چلی؟"

میں ان سے بات کر کے پھنس گیا تھا اس لیے جان چھڑانے کی خاطر سر تھامسن کا نام لے دیا۔

"کیا کہا؟" چچا بندو خاں اچھل پڑے۔ "صاحب کے سر پر جن آنے والا ہے مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمھیں اس کا پتا کیسے چلا!"

"صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج رات بارہ بجے وہ پرانے قلعے جائیں گے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں چچا کہ وہاں جن بھوت رہتے ہیں۔" میں نے ایک جھوٹ بول کر اسے نباہنے کے لیے دوسرا جھوٹ بولا۔

"صاحب کو شاید پتا نہیں ہو گا کہ وہ جگہ کتنی خطرناک ہے!" چچا بندو خاں کے لہجے میں ہمدردی کا اظہار ہونے لگا۔ "ہم ان کا نمک کھاتے ہیں، ہم پر لازم ہے کہ انھیں خطرے سے آگاہ کر دیں۔"

"میں انھیں سب کچھ بتا چکا ہوں چچا!" میں جلدی سے بولا کہ کہیں نمک حلالی کے چکر میں وہ میرا کونڈا نہ کر دیں۔

"پھر صاحب مانے نہیں تمھاری بات؟" چچا بندو خاں بولے۔

"وہ ان تمام باتوں کو خرافات بتاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ کہہ رہے تھے کہ اگر اب میں نے یا کسی اور نے ان سے یہ بات کی تو وہ سختی سے پیش آئیں گے۔"

"خدا ان کی حالت پر رحم کرے۔" چچا بندو خاں نے افسوس کا اظہار کیا، پھر بولے: "تو پھر میں انھیں نہ سمجھاؤں؟"

"ہرگز نہیں چچا! ورنہ وہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے آپ سے ذکر کیا ہو گا۔ پھر وہ آپ سے تو خفا ہوں گے ہی، مجھ پر بھی ناراض ہوں گے۔" میں نے چچا کو سمجھایا تاکہ میرے جھوٹ پر پردہ پڑا رہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے! جو خود کنویں میں گرنا چاہتا ہو، وہ دوسرے کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبتا ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ پرائی آگ میں کودتا پھروں۔"

مطلب کی بات پھر رہی جا رہی تھی اس لیے میں بولا: "چچا! اگر خدانخواستہ مجھے کسی ایسی جگہ مجبوراً جانا پڑ جائے تو بتائیں میں کون سی دعا پڑھوں؟"

"خدا نہ کرے بیٹے، کہ کبھی کسی جن سے تمھارا سامنا ہو۔" چچا بندو خاں بولے۔ "میرے نانا کے وظائف کی ایک کتاب میں جن بھگانے کی دعا لکھی ہوئی ہے۔ میں کل تمھیں ضرور وہ دعا بتا دوں گا۔ میں بھی وقت بے وقت کے لیے اسے یاد کر لوں گا۔ بڑے اللہ والے تھے میرے نانا بھی۔" یہ کہہ کر چچا بندو خاں نے اپنے نانا کا قصہ چھیڑ دیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی کام سے صاحب نے انھیں بلا لیا اور میری جان چھوٹ گئی ورنہ نہ جانے وہ کب تک میرا مغز چاٹتے رہتے۔ چلتے چلتے انھوں نے مجھے رکنے کے لیے کہا تھا مگر مجھے واقعی کام سے جانا تھا اس لیے کسی اور وقت بقیہ قصہ سننے کا وعدہ کر کے اپنی جان چھڑالی۔

میرے دفتر سے موری گیٹ زیادہ دور نہیں تھا اس لیے کچھ دیر بعد ہی میں پھٹ پھٹ پر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے مقتول مراری لال کا مکان ڈھونڈنے میں بھی زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ کچھ عرصے پہلے ہی اس مکان میں ایک قتل ہو چکا تھا اس لیے تھوڑی سی پوچھ گچھ ہی کافی ہوئی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح تھوک کے بھاؤ سے قتل نہیں ہوا کرتے تھے۔ ایک ایک قتل کو لوگ مہینوں اور سالوں یاد رکھتے تھے۔

میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے دروازے کی کنڈی ہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ اندر سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ کی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی چیخنے والا ہو اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہو۔ اس کے بعد میری سماعت سے ایک اجنبی سی نسوانی آواز ٹکرائی۔

"تم نے کچھ سنا؟" لہجہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔

"کیا؟" جواب میں ایک مردانہ آواز ابھری اور میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ مجھے اس مردانہ آواز پر ایک خطرناک شخص کی آواز کا دھوکا ہوا تھا لیکن آواز کیوں کہ بہت مدھم سنائی دی تھی اس لیے ابھی یقین کے ساتھ کسی فیصلے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔

مردانہ آواز کے بعد پھر وہی نسوانی آواز ابھری: "ابھی ابھی کسی موٹر سائیکل کے رکنے کی آواز سنائی دی تھی، یوں لگا تھا جیسے وہ اسی گھر کے دروازے پر آکر رکی ہو۔"

"کون آ سکتا ہے یہاں! آپ کو وہم ہوا ہے مادام! کوئی موٹر سائیکل والا گھر کے سامنے سے گزرا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" مردانہ آواز اس ... طور پر سنائی دی اور میں جان گیا کہ وہ کس کی آواز تھی۔

"ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے!" نسوانی آواز آئی۔

"لیکن میڈم اگر میں نے اس بڈھے حرام زادے کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا تو یہ پھر چیخنے چلانے لگے گا۔"

"میں دیکھتی ہوں دروازے تک جا کر!"

بھاگ لے بیٹا اللہ دتا! ورنہ خیر نہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور ایک ہی جست کے اندر اپنی پھٹ پھٹ تک پہنچ گیا۔ پتا نہیں کم بخت پھٹ پھٹ ہی عین وقت پر دغا دے گئی یا میں ہی بدحواسی کے عالم میں اسے اسٹارٹ نہ کر پایا، بہرحال جیسے بھی ہوا جو بھی ہوا میرے حق میں اچھا نہیں ہوا۔ میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں خوف زدہ نظروں سے اس دروازے کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا جو کسی بھی لمحے کھل سکتا تھا اور مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔

اور پھر میں نے واقعی دروازہ کھلتے دیکھا مگر پورا دروازہ نہیں کھلا بلکہ اس میں تھوڑی سی جھری پیدا ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے اس جھری سے میں نے ایک ریوالور کی نال جھانکتے دیکھی۔

ریوالور کی نال پر نظر پڑتے ہی میرے پیٹ میں ہول کے سبب ایک گولا سا بنا جس نے بلندی سے پستی کی طرف سفر شروع کر دیا۔ میرے جسم پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی اور یوں لگا جیسے پیروں کی جان نکل گئی ہو۔ اس ریوالور سے یقیناً مجھ غریب ہی کو "جنت رسید" کیا جانے والا تھا۔ ہر چند کہ جنت میں جانا اچھی بات ہے، خدا ہر بشر کو لے جائے مگر ابھی میں اس عالم آب و گل میں مزید رہ کر اس کی رونق میں اضافے کا سبب بننا چاہتا تھا۔

پھر جو کچھ ہوا؟ بس چند لمحوں میں ہو گیا۔ ادھر میں ہوا میں سے زمین پر گرا اور ادھر فضا میں سے گولی چلی۔ اگر شدت خوف سے زمین پر گرنے میں مجھے چند لمحوں کی دیر بھی ہو جاتی تو عالم بالا کا ٹکٹ کٹ ہی جاتا۔ خیر ہو میری بزدلی کی جو مجھے عین وقت پر موت کے منہ میں جانے سے بچا لیتی تھی ورنہ مرنے میں کسر ہی کیا رہ جاتی تھی۔ میں اوندھے منہ بے حس و حرکت زمین پر پڑا ہوا تھا کہ کہیں قریب ہی کوئی چیخا: "قتل ہو گیا... قتل ہو گیا!"

گولی چلنے کی آواز یقیناً دور دور تک سنائی دی ہو گی اور شاید کسی بندۂ بشر نے گولی چلنے کے بعد مجھے زمین پر گرتے بھی دیکھا ہو گا۔ غالباً مجھے ہی مقتول سمجھا جا رہا تھا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میں کس قدر سخت جان واقع ہوا ہوں۔ دوڑتے بھاگتے قدموں کی آوازیں سننے کے باوجود بھی میں نے اپنے جسم کو حرکت نہیں دی۔ جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جاتا کہ بے رحم قاتل وہاں سے فرار ہو چکے ہیں، میں بھلا کس طرح اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور لوگوں کو کیسے بتاتا کہ جسے وہ مقتول سمجھ رہے ہیں وہ زندہ ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے اپنے اردگرد لوگوں کی موجودگی کو محسوس کیا لیکن شاید وہ میرے بالکل قریب آنے سے ڈر رہے تھے اور دور کھڑے چھوٹے ہی تبصرے کر رہے تھے۔

"میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز سنی اور پھر اس شخص کو زمین پر پڑا ہوا دیکھا۔" کوئی شخص بتا رہا تھا۔

"مگر گولی چلائی کس نے؟" کسی نے سوال کیا۔

"یہ تو میں نہیں دیکھ سکا۔" پہلے شخص کی آواز پھر سنائی دی، پھر وہ چند لمحے توقف سے بولا: "گولی شاید اس کے سینے میں لگی ہے۔"

"مگر یہاں خون تو نظر نہیں آ رہا۔" کوئی اور بولا۔

"خون تو اس کے نیچے ہو گا۔" پہلے شخص نے قیاس آرائی کی۔ "جب لاش اٹھائی جائے گی تو زمین پر خون پھیلا ہوا نظر آئے گا۔"

معاً اسی وقت ... حیرت زدہ سی چیخ سنائی دی، پھر وہ ہکلایا۔

"وہ... وہ ادھر دیکھو!"

"ارے! ... یہ ... یہ تو بنواری لال ہے، مراری لال کا باپ!"

"ہاں وہی ہے۔" کسی نے تائید کی۔ "ارے اسے پکڑو، وہ گر رہا ہے!" تقریباً چیختے ہوئے کہا گیا۔

"خدا رحم کرے ہم پر۔ اسی کی بلائیں ہمارے ہی محلے پر ٹوٹنے کو رہ گئی ہیں۔" کسی کی آواز سنائی دی۔

میں سن تو سب کچھ رہا تھا مگر دیکھ نہیں رہا تھا کیوں کہ ایک تو میری آنکھیں بند تھیں، دوسرے میرا منہ زمین کی طرف تھا۔ میں نے جو کچھ سنا تھا اور اس سے میرے دل میں جو تجسس پیدا ہوا تھا، اب اسے مزید دبانا بس میں نہیں تھا۔ میں نے زمین پر پڑے پڑے بہت آہستہ سے کروٹ لی اور پلکوں کے درمیان چھوٹی سی جھری پیدا کر کے اطراف کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں قاتل مجھ پر دوبارہ گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ یہ سوچ کر میری ہمت بندھی اور میں جھٹ سے اٹھ کر بیٹھا اور پھر کھڑا ہو گیا۔

"ارے وہ... وہ تو زندہ ہے۔" کسی شخص نے میری طرف انگلی

اٹھاتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں اپنے قریب کھڑے آدمی سے کہا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل کی دوسری طرف دیکھا۔ موٹر سائیکل کے قریب ہی ایک بوڑھا زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اس کے سینے میں چاقو پیوست تھا اور کپڑے خون میں تر بہ تر تھے۔ اس کا ایک ہاتھ چاقو کے دستے پر تھا جیسے وہ اپنے سینے سے چاقو نکالنا چاہتا ہو۔ یہ تو مجھے پتا ہی چل چکا تھا کہ وہ بوڑھا، مقتول مراری لال کا باپ تھا۔ بوڑھا یقیناً قاتلوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکتا ہے، یہ سوچ کر میں لوگوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔

"ابے کون ہے تو؟ دھکا کیوں دے رہا ہے؟" کسی نے میرے پیٹ میں کہنی ماری۔

"ہٹ جاؤ سامنے سے! میں سی آئی ڈی انسپکٹر ہوں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا اور اس شخص کو دھکا دے کر آگے بڑھا جس نے کہنی ماری تھی۔

اپنی شخصیت سے پردہ اٹھاتے ہی مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ لوگوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی اور انھوں نے مجھے آگے جانے کا راستہ دیا۔ میں لپک کر بوڑھے کے قریب پہنچا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے کے چہرے پر سخت تکلیف و اذیت کے آثار تھے۔

"کون تھے وہ؟ جلدی بتاؤ!" میں نے بوڑھے سے کہا اور اس پر بھی رعب بٹھانے کے لیے بولا۔ "میں سی آئی ڈی انسپکٹر ہوں، سمجھے! جو کچھ تمھیں معلوم ہے سچ سچ بتا دو ورنہ حوالات میں بند کرا دوں گا!"

"وہ ... وہ ... وہی تھے ... وہی جو مراری کے پیچھے پڑے ... ہوئے ..." بوڑھا کراہا اور اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

"مراری لال کے پیچھے کون لوگ پڑے ہوئے تھے؟" میں نے جلدی سے سوال کیا۔

بوڑھا اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے دوبارہ دھمکی دوں مگر اسی وقت وہ بول اٹھا۔ "وہی دونوں ... وہی راجیش اور ... اور اس کی ولایتی بیوی!"

بوڑھے سے راجیش کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ میں سمجھ گیا کہ مردانہ آواز مجھے کیوں آشنا محسوس ہوئی تھی۔ راجیش کا حلیہ فائل میں پڑھ کر میں پہلے ہی یہ جان چکا تھا کہ وہ رنجیت ہی ہے۔ اب بوڑھے کی بات نے مجھے اس سلسلے میں مزید پریقین کر دیا تھا۔ میں رنجیت کی آواز بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ رنجیت کے ساتھ سنڈریلا تھی جسے اس نے میڈم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سنڈریلا کا لوب کرتا تھا اور اس کا اظہار رنجیت کے لہجے سے بھی ہوا تھا۔ بوڑھا ایک بار پھر کراہا تو میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ دونوں کیوں آئے تھے؟ انھوں نے تمھیں ..."

"وہ ..." بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "وہ ... اس فائل کو لے گئے جو ... مراری نے میرے ... پاس حفاظت سے بڑے ... صندوق میں ... اور ... اور پھر انھوں نے ... اس نے ... راجیش نے چاقو نکال کر ... میرے سینے ... آہ ..." بوڑھا اپنا جملہ پورا نہ کر سکا اور کراہنے لگا۔

"اس فائل میں کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ... معلوم نہیں ... وہ ... اس کے دفتر ... شاید دفتر کی فائل تھی۔" بوڑھے نے اٹک اٹک کر جواب دیا، پھر پانی مانگنے لگا۔

کوئی شخص دوڑ کر پانی لے آیا اور بوڑھے کے منہ میں ڈالنے لگا۔ پانی پیتے ہی بوڑھے کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے دو بار ہچکیاں لیں، پھر اس کا سر ایک جانب لڑھک گیا۔

میں نے اب تک کی ملازمت کے دوران میں اس سے پہلے اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا نہیں کیا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جب کوئی کسی خفیہ کے افسر کے سامنے یوں باتیں کرتے کرتے مر جائے تو کیا کرنا چاہیے۔ تربیت کے دوران میں تیواڑی جی شاید مجھے یہ بات بتانا بھول گئے تھے یا اگر بتائی بھی ہوگی تو مجھے یاد نہیں تھی۔ کچھ دیر تو میں گومگو کی حالت میں وہیں کھڑا رہا، پھر سوچا کہ جا کر تیواڑی جی کو سب کچھ بتا دوں۔ اس کے بعد جو وہ کہیں کروں۔ یہ سوچ کر میں نے قریب ہی کھڑی ہوئی اپنی پھٹ پھٹ اسٹارٹ کی اور دفتر کی طرف چل دیا۔ وہاں موجود لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے رہ گئے تھے، پتا نہیں کیوں!

دفتر پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں موٹر سائیکل کھڑی کر کے سیدھا تیواڑی جی کے کمرے کی طرف لپکا۔ چپراسی سے میں نے اپنی آمد کی خبر کرائی مگر اس وقت خلافِ معمول تیواڑی جی نے مجھے فوراً اندر نہیں بلوایا۔ مجھے تقریباً پانچ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ جب میں اندر پہنچا تو ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے۔

"کیا بات ہے، تم بار بار مجھے کیوں پریشان کرنے آجاتے ہو؟" تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑپھڑائیں جو ظاہر ہے کہ غصے کی علامت تھیں۔ وہ بغیر رکے برستے رہے۔ "تم جس کیس پر کام کر رہے ہو، اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ تمھیں اس سلسلے میں براہِ راست ڈائریکٹر صاحب سے رابطہ رکھنا چاہیے جیسا کہ وہ خود حکم دے چکے ہیں۔ جب اوپر اوپر اڑ رہے ہو تو اس کا نتیجہ بھی خود ہی بھگتو!"

غالباً تیواڑی جی نے میرے چہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ میں گھبرایا ہوا اور کچھ پریشان ہوں۔ انھیں سر تھامسن کے اس حکم سے بھی شاید دکھ پہنچا تھا کہ میں براہِ راست انھی کو جواب دہ ہوں اور تیواڑی جی بھی اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ یہ بات اب مجھے ایک عمر گزار کر معلوم ہوئی ہے کہ کوئی بھی افسر یہ نہیں چاہتا کہ اس کا ماتحت افسرانِ بالا کی

ناک کا بال بن جائے۔

میں نے تیواڑی جی کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ "سر! مراری لال کے باپ کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔"

تیواڑی جی یہ سن کر چونک پڑے اور ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ "کب؟ کہاں؟ کیسے؟ اور تمھیں اس کا کس طرح پتا چلا؟"

میں نے بھی ہر سوال کا جواب باری باری دیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے قتل ہوا ہے۔ قتل موری گیٹ میں ہوا ہے۔ قاتل نے اس کے سینے میں چاقو اتار دیا تھا اور مجھے اس قتل کا پتا یوں چلا کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔"

"تو قتل تمھارے سامنے ہوا؟" انھوں نے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں سر!" میں نے جواب دیا۔ "جب قاتل اس کے سینے میں چاقو اتار رہا تھا تو میں وہاں موجود نہیں تھا ورنہ ظاہر ہے کہ اسے اس طرح کی غیر قانونی حرکت نہ کرنے دیتا۔"

"پھر تم کہاں تھے؟" تیواڑی جی کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی۔

"میں اس مکان کے باہر تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کس مکان کے باہر؟"

"مراری لال کے۔"

"تم وہاں کیسے گئے تھے؟ جلدی اور تفصیل کے ساتھ بتاؤ۔" تیواڑی جی نے حکم دیا۔

میں نے واقعی جلدی جلدی بیان دینا شروع کر دیا۔ "سر! میں سر تھامسن کے حکم پر اس بوڑھے سے یعنی مقتول مراری لال کے باپ سے ملنے گیا تھا جو اب خود بھی مقتولوں میں شامل ہو چکا تھا۔ مجھے اس بوڑھے سے مراری لال کی محبوبہ رکمنی کا پتا معلوم کرنا تھا مگر وہ اتنی جلدی مر گیا کہ میں اس سے پتا معلوم ہی نہیں کر سکا۔ اب سر تھامسن اس سلسلے میں پوچھیں گے تو سر! میں انھیں کیا جواب دوں گا؟" میری گاڑی دوسری طرف بہک گئی۔ مجھے اب یاد آیا تھا کہ میں جس کام سے وہاں گیا تھا، وہ تو ادھورا ہی رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ بوڑھا مر جاتا، مجھے اس سے کم از کم رکمنی کا پتا تو پوچھ ہی لینا چاہیے تھا۔

"یہ تم کیا بکواس کرنے لگے!" تیواڑی جی نے آنکھیں نکالیں۔

"میں بکواس نہیں کر رہا سر! بلکہ یہ حقیقت ہے۔ پہلے مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔" میں رو دینے والے لہجے میں بولا۔ "ہائے! اس وقت میری عقل کو کیا ہو گیا تھا کہ میں نے اتنی اہم بات نظر انداز کر دی اور اس بوڑھے کو یونہی مر جانے دیا۔ اب کیا ہوگا؟ میں سر تھامسن کو آخر کیا جواب دوں گا؟"

"تم ہوش میں آؤ گے کہ نہیں اللہ دتا!" تیواڑی جی غرائے اور ان کی مونچھوں کو جیسے جاڑا بخار چڑھ آیا۔

اتنی خوف ناک صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود میں نے تیواڑی جی کو یہ بتانا از بس ضروری جانا کہ اب میں اللہ دتا نہیں رہا بلکہ ڈی مہرن چکا ہوں اور وہ مجھے اسی نام سے پکاریں۔

"تم اپنا نام کچھ بھی رکھ لو، اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، سمجھے!" تیواڑی جی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے اور میں اچھل پڑا، خوف کے مارے!

"آپ ... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! ... بالکل ٹھیک!" میں نے جلدی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی تا کہ ان کی مونچھیں مزید نہ پھڑپھڑائیں۔

"کام کی بات کرو بس! اس کے سوا کچھ نہیں۔" تیواڑی جی مجھے خوف زدہ دیکھ کر کچھ نرم پڑ گئے۔ "مجھے ترتیب کے ساتھ واقعات بتاؤ، اسی وقت میں تمھاری کچھ مدد کر سکتا ہوں ورنہ میرے کمرے سے دفع ہو جاؤ!"

"ہائے سر! ایسا تو نہ کہیے! اگر آپ نے بھی آنکھیں پھیر لیں تو میں کہیں کا نہ رہ جاؤں گا۔ آپ نے وہ محاورہ تو سنا ہی ہوگا سر! دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا! اس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ دھوبی ہیں۔ یہ تو بس محاورہ ہے!" میں نے اپنی دانست میں چاپلوسی کی۔

"تم پھر بہکنے لگے۔ میں نے تم سے واقعات بیان کرنے کے لیے کہا ہے۔" تیواڑی جی بولے۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم رکمنی کا پتا کیوں معلوم کرنے گئے تھے؟"

"سر تھامسن کے حکم ..."

"بڑے افسران کا نام نہیں لیا کرتے!" تیواڑی جی نے میری بات کاٹ کر مجھے ڈانٹا۔ "تم ڈائریکٹر صاحب کہہ سکتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ میں بھی ان کا نام نہیں لیتا۔"

"بہت اچھا سر!" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور یہ بھول گیا کہ پہلے کیا کہہ رہا تھا، سو میں نے تیواڑی جی سے پوچھ لیا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا سر؟"

"میرا سر!" تیواڑی غصے سے چیخ پڑے۔

"لیکن سر! آپ کے سر کا شاید ذکر نہیں تھا، کوئی اور بات تھی۔" میں سوچتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"تم رکمنی کے بارے میں بتا رہے تھے احمق!" تیواڑی جی نے جھنجلا کر کہا اور میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ہاں ہاں، یہی کہہ رہا تھا سر!" میں نے دانت نکال کر کہا۔ "آپ نے یاد دلایا، شکریہ! ہاں تو سر ... تھا ... معاف کیجیے گا، ڈائریکٹر صاحب کے حکم پر میں رکمنی سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ رکمنی کا پتا کیوں کہ کیس کی فائل میں موجود نہیں تھا اس لیے میں نے مقتول مراری لال کے باپ سے اس کا پتا معلوم کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں جا پہنچا۔ میں ابھی دستک ہی دینے والا تھا کہ مجھے اندر سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ پھر پتا ہے میں نے کس کی آواز سنی؟" میں رازدارانہ لہجے میں

بولا۔

تیواڑی جی مجھے جواب دینے کی بجائے گھورنے لگے۔

"میں بتاتا ہوں سر! اندر ایک مرد اور عورت باتیں کر رہے تھے اور مرد رنجیت تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔"

"رنجیت؟ وہی جو بھگوان داس کا قاتل تھا؟" تیواڑی جی کے سگریٹ کا کچھ دھواں نگلتے اور کچھ اگلتے ہوئے حیرت سے بولے۔

"جی ہاں سر! وہی!" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہی راجیش بنا ہوا تھا بلکہ بنا ہوا ہے۔ راجیش اور رنجیت ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔ وہ بڑا 'فراڈیا' ہے سر! میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ جب میں نے مراری لال مرڈر کیس کی فائل میں صفحہ پندرہ پر اس کا حلیہ پڑھا تھا تو فوراً سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی بدبخت رنجیت ہے۔"

"مگر وہ تو مارا جا چکا تھا۔ تمہی نے تو سیٹھ دشوانا تھ کیس کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اسے رجنی نے کوٹلہ فیروز شاہ کی زیرِ زمین سرنگ میں بند کر دیا تھا اور پھر وہ زیرِ زمین دنیا ایک دھماکے سے اُڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ رنجیت بھی مارا گیا ہو گا۔ اس پرانی سرنگ کے ذریعے وہ آگرہ تک تو پہنچ نہیں سکتا تھا، وہ بھی پیدل!"

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں سر کہ میں نے رنجیت کو زندہ سلامت دیکھا ہے۔" میں نے تیواڑی جی کو یقین دلایا۔

"خیر اس مسئلے پر بعد میں سوچیں گے، تم آگے بیان کرو۔"

"میں پھٹ پھٹ پر مراری لال کے مکان تک گیا تھا۔ میں نے پھٹ پھٹ اسی مکان کے دروازے پر کھڑی کی تھی۔ ان دونوں کی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ وہ وہاں میری موجودگی سے باخبر ہو گئے ہیں۔ رنجیت نے اس عورت سے کہا بھی کہ کوئی پھٹ پھٹ مکان کے سامنے سے گزری ہو گی مگر وہ عورت بڑی کائیاں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ احتیاطاً دیکھ لیتی ہے۔ پھر پتا ہے کیا ہوا سر! بس میری زندگی ہی تھی کہ بچ گیا بلکہ یوں سمجھیں کہ اگر میں اپنی ذہانت اور دلیری کا اظہار نہ کرتا تو اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا سر! تو اس وقت اُس کے کفن دفن کا بندوبست ہو رہا ہوتا۔ وہ تو بس ...."

"کچھ بکو گے بھی کہ کیا ہوا یا تمہید باندھتے جاؤ گے!" تیواڑی جی میری بات کاٹ کر سختی سے بولے۔

"پھر یہ ہوا کہ سر! اس مکان کا دروازہ تھوڑا سا کھلا اور اس میں سے ریوالور کی نال نکلی، سچ مچ کے ریوالور کی نال سر! اب بتایئے سر، میری جگہ آپ ہوتے تو کیا حال ہوتا آپ کا؟ ... ن ... نہیں میرا مطلب ہے کہ کوئی بھی ہوتا۔" میں تیواڑی جی کے تیور بدلتے دیکھ کر ایک دم گڑبڑا گیا اور پھر جلدی سے کہا۔ "میں نے اس موقع پر اپنے ہوش و حواس درست رکھے اور اس لمحے کا منتظر رہا کہ وہ ناہنجار عورت گولی چلائے۔ وہ

آخر مجھے سمجھتی کیا ہے! کیا میں ریوالور سے ڈر جاؤں گا، وہ بھی تیواڑی جی کا شاگرد ہو کر! پھر یہ ہوا سر کہ ادھر اس نے گولی چلائی اور اُدھر میں جھٹ سے زمین پر لیٹ گیا اور اس طرح میں نے اس کا منصوبہ قطعی ناکام بنا دیا۔ گولی میرے اوپر سے شوں کرتی ہوئی قریب ہی زمین میں دھنس گئی۔ میں پھر کھڑے ہو کر اسے چیلنج کرنے والا تھا کہ وہ دوبارہ گولی چلائے اور دوبارہ میں اس کی آرزو میں خاک میں ملا دوں مگر وہ شاید ایک ہی بار کے تجربے سے سہم گئی۔ اس نے دوبارہ گولی نہیں چلائی۔ چند لمحے بعد ہی گولی کی آواز سن کر وہاں بھیڑ ہو گئی۔" یہ کہہ کر میں نے بقیہ واقعات بھی بیان کر دیے۔

تیواڑی جی نے میری پوری روداد سن کر طویل سانس لیا، پھر بولے۔ "تم بہت بڑے احمق اور بے وقوف ہو۔"

"وہ کس طرح سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا کیوں کہ میں نے بظاہر کوئی ایسی حرکت اپنی دانست میں نہیں کی تھی۔

"تمہیں اس طرح وہاں اس بوڑھے کی لاش کو چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔" تیواڑی جی نے کہا۔

"مگر سر! وہ تو مر چکا تھا۔ اگر زندہ ہوتا تو پھٹ پھٹ پر بٹھا کر یہاں لے آتا۔ آپ یقین کریں سر کہ ایک مردہ شخص کو پھٹ پھٹ پر بٹھا کر لانا ...."

"بکو مت!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر دہاڑے۔ "میں نے تم سے یہ کہا ہے کہ تم اسے یہاں لے آتے؟"

"پھر ... پھر آپ کیا چاہتے تھے سر؟" میں نے بھولپن کے ساتھ کہا۔

"تم وہاں پولیس کو طلب کر سکتے تھے، کسی شخص کو قریبی تھانے بھیج سکتے تھے، پھر جب پولیس، لاش کو اپنی تحویل میں لے لیتی تو یہاں آ کر فوٹو گرافرز وغیرہ کو لے جاتے اور اس چاقو کو اپنے قبضے میں کر لیتے جس پر یقیناً قاتل کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔" تیواڑی جی غصے میں بولے۔

"مگر سر! میرے ساتھ پہلی بار ایسی صورتِ حال پیش آئی تھی اور آپ نے بھی کبھی اس سلسلے میں مجھے نہیں بتایا کہ اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔" میں نے صفائی پیش کی۔

"خود تمہاری کھوپڑی میں گودا نہیں ہے۔ ویسے تو بہت ذہین اور دلیر بنتے ہو!"

پھر سارے انتظامات تیواڑی جی ہی نے کیے تھے۔ میں تو بس ایک خاموش تماشائی کی طرح ان کے ساتھ ساتھ لگا رہا تھا۔ دفتر سے روانہ ہوتے وقت تیواڑی جی نے خود سر تھامسن کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

بوڑھے کی لاش کی طرح طرح سے [illegible] لوگوں کے

بیانات لیے گئے اور مراری لال کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ ایک ایک چیز کھول کر دیکھی گئی، یہاں تک کہ تکیوں تک کو اُدھیڑ ڈالا گیا۔ میرے ماتحتوں کی پوری ٹیم اس تمام کارروائی میں شریک تھی۔ بوڑھے کے سینے سے چاقو نکال کر محفوظ کر لیا گیا تاکہ فنگر پرنٹس ڈپارٹمنٹ والے اس پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات تلاش کر سکیں جس کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اوّل تو یہی ضروری نہیں تھا کہ قاتل نے دستانے نہ پہنے ہوں، دوم یہ کہ مقتول بوڑھے نے چاقو کو کئی بار اپنے سینے سے کھینچنے کے لیے اس کا دستہ پکڑا تھا۔ اس طرح قاتل کی انگلیوں کے نشانات مٹنے کا خطرہ تھا۔ بہرحال وہ چاقو آلۂ قتل کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے تیواڑی جی کی نظروں میں اہم تھا۔ جب لاش کی تصاویر اتار لی گئیں تو اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔

اس تمام کارروائی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ میرے لیے سر تھامسن کا سابقہ حکم برحال تھا یعنی مجھے اسی شب گیارہ بجے اپنے گھر سے پُرانے قلعے کے لیے روانہ ہونا تھا اور یہ سوچ سوچ کر وقت سے پہلے ہی میرا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ تیواڑی جی مجھے اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر موری گیٹ لے گئے تھے اس لیے میں نے اپنی پھٹ پھٹ دفتر ہی میں چھوڑ دی تھی۔ میری واپسی بھی تیواڑی جی کے ساتھ ہوئی۔ اس وقت میں تیواڑی جی کے ساتھ ان کی جیپ میں بیٹھا ہوا دفتر کی طرف لوٹ رہا تھا اور رات کے خیال سے دہل رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر انھیں مخاطب کیا۔ "سر! یہ نہیں ہو سکتا کہ رات کے معرکے میں کسی اور کو بھی میرے ساتھ کر دیا جائے؟"

"کیوں؟" تیواڑی جی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولے۔ "اکیلے جاتے ہوئے کیا ڈر لگ رہا ہے تمھیں؟"

میرے جی میں آئی کہ اعترافِ حقیقت کر لوں مگر اس طرح میری دلیری کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا اس لیے بات بنائی۔ "اکیلے سے دو بھلے ہوتے ہیں سر!"

"نہیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "اس طرح بات بگڑ سکتی ہے۔ مجرموں نے ایک شخص کو فائل لے کر آنے کے لیے لکھا ہے۔ اگر وہ ایک کی بجائے دو افراد کو آتا دیکھیں گے تو سامنے نہیں آئیں گے۔"

"پھر تو مجبوری ہے سر!" میں مردہ سے لہجے میں بولا، پھر مجھے ایک بہانہ اور سوجھا اور میں نے کہا۔ "ویسے سر! مجھے اس وقت کچھ بخار سا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا خبر رات گیارہ بجے تک زور کا بخار چڑھ آئے اس لیے اگر آپ میری بجائے کسی اور کو وہ فائل لے کر بھیج دیں تو بہتر رہے گا۔"

تیواڑی جی نے اپنے بائیں ہاتھ سے میری کلائی تھامی، پھر بولے۔ "تمھیں ٹھنڈا بخار معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ کا خیال بالکل درست ہے سر! مجھے ٹھنڈا بخار ہی ہے۔ آپ تو بڑے تجربے کار معلوم ہوتے ہیں سر!" میں دانت نکال کر بولا۔

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا، سمجھے!" تیواڑی جی ایک دم لہجہ بدل کر بولے۔ "تمھیں ہی جانا پڑے گا۔ میں ٹھیک گیارہ بجے فائل لے کر پہنچ جاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

"اوہ سر! وہ ٹھنڈا بخار اور بڑھ گیا تو؟" میں نے ان کے لہجے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"بکواس بند کرو اور خاموش بیٹھو! میں اس وقت ایک اور مسئلے پر غور کر رہا ہوں کہ پہلی بار جب مراری لال کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی تو وہ فائل وہاں کیوں نہیں ملی جو آج مجرموں کو مقتول بوڑھے نے دی تھی؟ یاد کر کے بتاؤ، بوڑھے نے یہی کہا تھا کہ وہ فائل اس کے صندوق میں تھی؟" تیواڑی جی میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہاں سر! اس نے یہی کہا تھا کہ وہ فائل اس کے مقتول بیٹے نے اس کے پاس حفاظت سے بڑے صندوق میں رکھوا دی تھی۔ اس نے رک رک کر بتایا تھا مگر بات یہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ تو جانتے ہی ہیں سر، کہ میرا حافظہ کتنا تیز ہے۔ آپ کہیں تو میں لفظ بہ لفظ بوڑھے کے الفاظ دہرا سکتا ہوں۔"

تیواڑی جی نے وہ الفاظ دہرانے کا حکم دیا اور میں نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔

"وہ فائل اس کے دفتر کی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اہم کاغذات ہی ہوں گے کیوں کہ مقتول مراری لال، ڈیفنس منسٹری میں ریکارڈ کیپر تھا۔" تیواڑی جی کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ وہ تقریباً بڑبڑا رہے تھے۔ "اس سلسلے میں ڈیفنس منسٹری سے بھی پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے کہ ریکارڈ سے کون سی فائل غائب ہے۔ ممکن ہے اس طرح کوئی نئی بات سامنے آئے۔ یہ کوئی لمبا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

میں تیواڑی جی کی بڑبڑاہٹ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتا رہا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ ان فضول باتوں میں اپنا مغز کھپاتا۔ دفتر پہنچنے تک تیواڑی جی کی یہی حالت رہی۔ کبھی وہ کسی سوچ میں ڈوب جاتے اور کبھی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگتے۔ کبھی اگر وہ مجھ سے مخاطب بھی ہوتے تو میں ہاں ہوں کر کے اپنی جان بچا جاتا۔

دفتر پہنچنے کے بعد میری تو گلو خلاصی ہو گئی مگر میرے تمام ماتحتوں کو انھوں نے روک لیا اور خود بھی رک گئے۔ میرے لیے یہ حکم تھا کہ فی الحال گھر جا کر آرام کروں اس لیے کہ مجھے رات کو کارگزاری دکھانا ہے۔ میرے ماتحتوں کو تیواڑی جی نے کیوں روک لیا تھا، یہ پوچھنے کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔ مجھے سر تھامسن بتا ہی چکے تھے کہ پُرانے قلعے کے اندر اور باہر مسلح افراد ہوں گے۔ میرے ماتحتوں کو بھی یقیناً اسی سلسلے میں روکا گیا ہو گا۔ تیواڑی جی انھیں ہدایات دینا چاہتے ہوں گے۔ مجھے یہ خوشی تھی کہ چلو اس بہانے ان حرام ہڈوں کی کچھ پریڈ تو ہو

ہی جائے گی اور اگر ان سے پرانے قلعے کا کوئی بھوت ووت لپٹ جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ خاص طور پر کار کے لیے تو میں دل سے دعا کر رہا تھا کہ اسے کوئی جن چیر پھاڑ دے۔ اس نے میرا بڑا لہو پیا تھا۔ جب میں دفتر سے چلا تو معلوم ہوا کہ سرنخاس خلافِ معمول اس وقت تک دفتر ہی میں موجود تھے۔ مجھے علم ہی تھا کہ مجرموں کو پھانسنے کے منصوبے کی تمام نگرانی وہ بہ ذاتِ خود کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے خود کہا تھا کہ اگر وہ مجرموں پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مجرموں سے ان کی پرانی شناسائی تھی۔

میں گھر پہنچا تو وہاں نشست گاہ میں ابا کے ساتھ کچھ اجنبیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ نشست گاہ کا ایک دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا جو اس وقت بند نہیں تھا۔ میں ڈیوڑھی سے گزرا تو کسی نے میرے ابا کو مخاطب کیا "کیوں جناب، کیا یہی ہے؟"

"نہیں، یہ چھوٹا ہے۔ اس سے بڑا ایک اور ہے۔ وہ سب سے بڑا ہے۔ بس عشاء کی نماز پڑھ کر آتا ہی ہو گا۔" ابا نے جواب دیا۔

"مگر عشاء کی نماز تو ختم ہو چکی!" کسی نے کہا۔

"دراصل وہ نماز کے بعد کچھ وظائف پڑھتا ہے، اسی میں دیر ہو جاتی ہے۔" ابا نے وضاحت کی۔

"اتنی سی عمر میں وظائف وغیرہ نہیں پڑھنے چاہئیں۔ کبھی کبھی وظیفے الٹے بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ اسے سمجھاتے نہیں!" ابا سے کہا گیا۔

پتا نہیں ابا نے کیا جواب دیا کیوں کہ میں اس وقت تک صحن میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے امی کو نشست گاہ کے اس دروازے سے کان لگائے کھڑا ہوا دیکھا جو صحن میں کھلتا تھا۔ ان کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مجھے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ میری طرف لپک آئیں۔

"اچھا ہوا تو آ گیا ورنہ مہمانوں کے لیے چائے وغیرہ بھیجنے کو مجھے تیرے ابا..."

"یہ لوگ ہیں کون؟" میں نے امی کی بات کاٹ کر کہا۔

"اپنی ہی برادری کے ہیں، لوہار ہیں اور کون ہوتے! ایں کوئی اپنے ...یں کو غیر برادری میں دوں گی!؟" انھوں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لوہار برادری ہیں مگر آئے کیوں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تیرے بھائی صاحب کو دیکھنے آئے ہیں۔" امی نے جواب دیا۔

"دیکھنے آئے ہیں!" میں پھر بھی کچھ نہ سمجھا اور حیرت سے بولا "کیا کریں گے بھائی صاحب کو دیکھ کر؟"

"اے تو تو بڑا بگلوٹ ہے۔ سبھی بیٹیوں والے لڑکوں کو دیکھتے ہیں، بغیر دیکھے کون اپنی بیٹی کسی کو دے دیتا ہے!"

امی کی بات سن کر میں نے ایک طویل سانس لیا "اچھا تو یہ بات ہے! یہ لوگ بھائی صاحب کا رشتہ لے کر آئے ہیں!"

"اچھا چل، چائے دے دوں تجھے!" یہ کہہ کر امی باورچی خانے کی طرف بڑھیں اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

جب میں ٹرے میں چائے اور پھل وغیرہ لے کر نشست گاہ میں جا رہا تھا تو بھائی صاحب بھی آ گئے۔ میں نشست گاہ کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ بھائی صاحب کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ ان کی چھوٹی سی کچی داڑھی مجھے کبھی پسند نہیں آتی تھی۔ صرف ٹھوڑی پر گنتی کے چند لمبے لمبے بال تھے۔ اس پر وہ اپنا حلیہ عجیب بنائے رکھتے تھے۔ ٹخنوں سے اوپر تنگ مہری کی شلوار اور لمبا کرتہ، یہ تھا ان کا لباس! سر پر وہ صافہ باندھتے تھے، بالکل ابا کی طرح! اگر ان کے چہرے پر دو چار جھریاں بھی پڑ جاتیں تو ابا میں اور ان میں داڑھی کے سوا کوئی فرق نہ ہوتا کیوں کہ ابا کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس حلیے میں بھائی صاحب اپنی عمر سے دس سال زیادہ ہی لگتے تھے۔ کئی بار ان کے رشتے آ چکے تھے مگر جو بھی انھیں دیکھ کر جاتا تھا، رشتے سے انکار کر دیتا تھا۔ بھائی صاحب کا قد چھوٹا اور دہانہ کچھ نکلا ہوا تھا۔ ہر چند کہ وہ روز مسواک کرتے تھے مگر آگے کے دو دانت پیلے ہی رہتے تھے۔ کئی بار امی نے ان سے دبی زبان میں کہا بھی تھا کہ وہ دوسرے نوجوانوں کی طرح ذرا بہتر حلیے میں رہا کریں مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی یا رینگی ہو گی تو انھوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی ہو گی۔

میں نشست گاہ کا دروازہ کھول کر اندر جانے ہی والا تھا کہ امی نے مجھے روک لیا "تو رہنے دے۔ اب یہ آ گیا ہے، یہ دے آئے گا!"

چھوٹے بھائی کی موجودگی میں بڑا بھائی تکلیف اٹھائے، یہ مجھے کچھ اچھا نہ لگا "نہیں نہیں امی! میں ہی دے آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے دائیں پیر سے میں نے نشست گاہ کا دروازہ کھول دیا اور امی ایک دم بے پردگی کے خیال سے پیچھے ہٹ گئیں۔ میں نشست گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں ابا کے ساتھ دو افراد اور بیٹھے تھے جنھوں نے بہت غور سے میری طرف دیکھا۔ میں نے انھیں سلام کیا اور جواب میں دعائیں وصول کر کے چائے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی۔ اسی وقت ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا "تمھارا کیا نام ہے میاں؟"

میں "اللہ دتا" کہتے کہتے رک کر بولا "اے ڈی مہر!"

میرے جواب پر ابا نے مجھے حیرت سے دیکھا، پھر بولے "یہ تو نے اپنے نام کا ناس کیوں مار دیا؟"

"اے ڈی کا مطلب اللہ دتا ہے ابا!" میں نے وضاحت کی۔ "انگریزی زبان میں اللہ، اے سے آتا ہے اور دتا، ڈی سے! میں نے اسی لیے یہ نام رکھ لیا ہے۔"

"اور اس کے ساتھ میرا نام کیوں جوڑ لیا ہے تو نے؟" ابا کے لہجے میں کسی قدر ناگواری تھی۔

مجھے کچھ اور جواز نہ سوجھا تو بولا "آپ کا نام مجھے بہت اچھا لگتا ہے ابا! اس لیے ساتھ لگا لیا ہے۔"

"آج کل ایسے ہی نام چل رہے ہیں بھائی صاحب!" اجنبیوں میں سے ایک نے میرے ابا کو سمجھایا "نام میں انگریزی بھی آ جائے تو بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس سے ترقی کے دروازے کھلتے ہیں۔"

"چل رہے ہوں گے ایسے نام! مگر مجھے اچھے نہیں لگتے۔" ابا نے منہ بنا کر کہا، پھر مجھ سے بولے "چل اندر جا!"

میں سعادت مندی سے سر ہلاتا ہوا نشست گاہ سے گھر میں چلا گیا، پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تاکہ لباس تبدیل کر لوں۔ جب میں لباس وغیرہ تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر صحن میں پہنچا تو دیکھا، امی پانوں کا خاص دان، بھائی صاحب کے ہاتھ میں دے کر انھیں نشست گاہ میں بھیج رہی ہیں۔

میں نے فرماں برداری کے اظہار میں آگے بڑھ کر امی سے کہا "لائیں امی، میں دے آؤں۔"

"نہیں!" امی نے مجھے سختی سے جھڑک دیا "اسی کو جانے دے۔"

میں اس وقت امی کے رویے پر سخت حیران ہوا۔ بھلا اس میں ناراضگی کی ایسی کون سی بات تھی۔

"چل تو ادھر چوکی پر بیٹھ! ابھی کھانا دیتی ہوں تجھے!" امی نے مجھ سے کہا اور میں تعمیلِ حکم میں چوکی کی طرف بڑھ گیا۔ بھائی صاحب خاص دان لے کر نشست گاہ کے دروازے کی طرف چلے گئے تھے۔

اس وقت مجھے بھائی صاحب پر بڑا ترس آ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ اجنبی اپنی بیٹی کے لیے بھائی صاحب کو پسند کر لیں۔

میں کھانا کھا کر فارغ ہوا تو وہ اجنبی بھی اٹھ گئے۔ ابا انھیں دروازے تک چھوڑ کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ رہے تھے کیوں کہ امی، کھانے کے برتن میرے سامنے سے اٹھا کر باورچی خانے میں رکھنے گئی تھیں۔

"شکورن!" ابا نے باورچی خانے کے دروازے ہی سے امی کو پکارا "تو رہے گی کم عقل کی کم عقل!"

"دیکھو جی! میں نے کہہ دیا ہے، مجھے کچھ بھی کہہ لو مگر میرے اماں ابا کو کچھ کہا تو مجھ سے برداشت نہ ہو گا، ہاں!" امی ہاتھ نچا کر غصیلی آواز میں بولیں۔

"ارے تو اس میں تمھارے اماں ابا کہاں سے ٹپک پڑے!" ابا تو سے "تم" پر آ گئے۔ امی کو غصے میں دیکھ کر اکثر ابا نرم پڑ جاتے تھے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

"اب میں اتنی کم عقل بھی نہیں ہوں کہ تمھاری بات کا مطلب نہ سمجھوں۔ زندگی گزر گئی تمھارے ساتھ! کم عقل کا آخر کیا مطلب ہوا؟" امی باورچی خانے سے نکلتی ہوئی بولیں۔

"تم تو ہر وقت بس تتیا مرچ بنی رہتی ہو، لڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی رہتی ہو۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ ان لوگوں سے کیا بات ہوئی، کیا نہیں ہوئی، بس لڑنے بیٹھ گئیں!"

"ہاں تو پھر بتاؤ نا!" امی کا پارہ ایک دم اتر گیا اور وہ بڑے اشتیاق سے بولیں "آخر میں بھی تو لڑکی کو دیکھنے جاؤں گی۔ کون سے دن کی کہا ہے انھوں نے؟"

"اور بھیج دو اپنے اس لاڈلے کو چائے لے کر وہاں!" ابا تنک کر بولے "لاکھ بار کہا ہے، بی بی! عقل پکڑ لے مگر کہاں! وہی کنّے کی ایک ٹانگ! ہزار بار سمجھایا کہ دیکھ، جس کی بات لگے، اسی کو سامنے کیا کر مگر کیا مجال جو میری بات گھٹ میں بیٹھ جائے!"

"ارے تو ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ گے بھی کہ یونہی تنکتے رہو گے!" امی پھر پٹڑی سے اترنے لگیں۔

"ارے ہونا کیا خاک تھا، ٹکا سا جواب دے گئے!" ابا نے بالآخر بتایا، پھر میری طرف دیکھ کر بولے "تو اپنے کمرے میں جا!"

"اچھا ابا!" میں نے فرماں برداری کے اظہار میں سر ہلایا اور چوکی سے اتر کر چپل پہنتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"سنا کچھ! وہ کہہ رہے تھے کہ چھوٹے سے کر دو تو کر دیں!" ابا نے اپنی دانست میں سرگوشی کی "اسی لیے کہتا ہوں کہ جب کوئی آئے تو اللہ دتا کو نہ بھیجا کرو!"

"اے بھاڑ میں جائیں، میرے لونڈوں کو کوئی رشتوں کی کمی ہے! اور پھر میں اللہ دتا کو کہاں چھپا کر رکھوں! جسے دیکھو بس اسی کی بات کرتا ہے۔ تم کو عقل نہیں کہ دو دو بڑے بیٹھے ہیں، پھر بھلا ہم چھوٹے کی ہامی کیسے بھر لیں گے! خاک پڑے ان کی صورتوں پر!"

"چلو ڈال دو خاک! تمھی کہہ رہی تھیں کہ بڑے اچھے لوگ ہیں!"

میں اس دوران میں اپنے کمرے کے اندر پہنچ چکا تھا اور اب مجھ پر یہ راز منکشف ہو چکا تھا کہ امی مجھے وہاں کیوں نہیں بھیج رہی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کسی ایسے موقع پر ہرگز کسی [illegible] بہت کو اپنا روئے زیبا دکھا کر کباب میں ہڈی نہیں بنوں گا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ابھی گیارہ بجنے میں بہت دیر ہے، کیوں نہ ایک پھیرا جامع مسجد تک کا لگا لوں۔ اس طرح جی بھی بہل جائے گا، وقت بھی کٹ جائے گا اور کھانا کھانے کے بعد ٹہل بھی ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر میں گھر سے نکلنے لگا تو امی نے ہانک لگائی "کہاں چلا؟ کیا پھر رات بھر غائب رہنے کا ارادہ ہے؟"

میں کیوں کہ کام کے علاوہ کم ہی گھر سے نکلتا تھا اور اکثر راتوں کو غائب بھی رہنے لگا تھا اس لیے وہ ایسا سوچنے میں حق بہ جانب تھیں۔

"فی الحال تو صرف ٹہلنے جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور موقع غنیمت جان کر رات کے لیے راہ ہموار کرنے لگا "ہاں رات گیارہ بجے مجھے دفتر کے ایک کام سے ضرور جانا ہے۔"

"اور پھر گیارہ بجے جاکر صبح لوٹے گا کیوں؟" وہ میرے قریب آتی ہوئی بولیں۔

"نہیں شاید رات بھر نہیں لگے گا۔ میں بس ایک ڈیڑھ بجے تک آجاؤں گا۔"

"تیری نظر میں ایک ڈیڑھ کوئی وقت ہی نہیں۔" امّی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "ٹھیک ہے جب تک کانے سروالی پکّے نہیں بدھنی کر لے مزے! ابھی تو امّاں کا راج ہے، اس کے بعد دیکھوں گی کہ کیسے گھر سے غائب رہتا ہے!"

"تم کہو امّی تو یہ نوکری چھوڑ دوں۔ مجھے بھی رات دن کی یہ بیدائی اچھی نہیں لگتی۔" میں نے دل کی بات کہہ دی کیوں کہ گھڑی گھڑی جان کے لالے پڑتے رہتے تھے۔

"ہرگز نہیں!" دور سے ابّا کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں تھے مگر ان کے کان باہر ہی لگے ہوئے تھے۔ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولے۔ "لگی لگائی روزی پر لات مارنا، ناشکری ہے۔ اتنی تنخواہ کہیں نہیں ملے گی۔ سر پر دو تین شادیاں آرہی ہیں۔ ان کا خرچہ کہاں سے پورا ہوگا۔ پھر پریشانی بھی کیا ہے؟ بس کبھی کبھی رات کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ بندو خاں مجھے بتا ہی چکے ہیں کہ خفیہ میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ تمھیں عقل نہیں آئے گی نسکوبن! ہمیشہ الٹی پٹی ہی پڑھاؤگی۔"

"اے میری بلا سے! اوڑھو گھماؤ رات رات بھر! تمھاری نظر میں تو بس پیسا ہی سب کچھ ہے۔" امّی تنک کر بولیں۔

"ٹھیک ہے بھئی اللہ دتا! تیری ماں یہی چاہتی ہے کہ تو نوکری چھوڑ دے اور در در مارا پھرے تو یہ جانے، مجھے کیا!" ابّا مجھ سے بولے۔

"ارے تو میں یہ کب کہہ رہی تھی!" امّی گھبرا گئیں۔ "میں تو بس راتوں کو غائب رہنے پر پریشان تھی۔"

"کیوں، بس ختم ہوگئی ساری ہیکڑی!" ابّا امّی کو چڑانے والے لہجے میں بولے۔ "تمھیں تو پیسے کی ذرا پروا نہیں!"

"تم تو جھاڑ کے جھینگڑے کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ میرا تو زبان ہلانا غضب ہے۔" یہ کہہ کر امّی نے کمرے کا رخ کیا اور ابّا بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیے۔

میں نے دروازے کا رخ کیا۔ ابھی میں ڈیوڑھی ہی میں تھا کہ بڑے بھیّا گھر میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"ابے تیرے پاس اٹھنّی ہوگی؟"

میری جیب میں کھلی اٹھنّی نہیں تھی، روپیا تھا اس لیے انھیں ٹالنے کے لیے کہا۔ "نہیں بھیّا! میرے پاس اٹھنّی نہیں ہے۔" میں جانتا تھا کہ اگر انھیں روپیا تھما دیا تو پورا روپیا ہی ہضم کر جائیں گے۔ وہ اکثر مجھ سے پیسے "نوچتے" رہتے تھے۔

"ابے جھوٹ نہ بول، واپس دے دوں گا۔ بس ایک داؤ لگ جائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب آگئے۔ "نکال پیسے!"

میں سمجھ گیا کہ جوئے میں پیسے ہار کر آرہے ہیں اور مجھے دیکھ کر دوبارہ ان کی "رگِ جوا" پھڑک اٹھی ہے۔ اب تک انھوں نے مجھ سے جتنی بار بھی پیسے لیے تھے، واپس نہیں کیے تھے تو پھر اب میں ان کا کس طرح یقین کر سکتا تھا مگر میرے یقین کرنے نہ کرنے سے ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر میں نے ان کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ خود میری جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم برآمد کر لیں گے اور ایسی صورت میں مجھے ان کی گالیاں بھی سننا پڑیں گی۔ وہ بڑی گندی گالیاں بکتے تھے۔ یہ سوچ کر میں نے چاندی کا خوبصورت روپیا جیب سے نکالا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

روپیا دیکھ کر وہ بولے۔ "ابے تو تو کہہ رہا تھا تیرے پاس پیسے نہیں ہیں!"

"میں نے اٹھنّی کو منع کیا تھا بھیّا! آپ خود میرا ننگا جھاڑا لے کر دیکھ لیں۔ میرے پاس اس ایک روپے کے سوا کچھ بھی نہیں۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ابے حرامی! میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں، تو بہت دھیترا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے روپے پر جھپٹّا مارا اور تیزی کے ساتھ گھر سے نکل گئے۔

روپیا کا روپیا گیا اور گالی مفت میں کھائی۔ میں روپے اور گالی کا غم لیے بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کے دروازے سے نکلا اور مٹیا محل کی طرف چل دیا۔ کچھ دور چل کر مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ مجھے خوف تو لگا کیوں کہ اس وقت گلی میں میرے اور متعاقب شخص کے سوا اور کوئی نہیں تھا، پھر بھی میں نے مڑ کر دیکھ ہی لیا۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ وہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن میں نے اسے کہاں دیکھا تھا، یہ یاد نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور ماتھے پر کسی زخم کا نشان تھا، بائیں رخسار پر بڑا سا مسّا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا چہرہ خوف ناک سا تھا جس میں بڑا حصہ اس کی سرخ سرخ پھوٹی اور گول آنکھوں کا تھا۔ میں نے تیز تیز قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ مجھے اس دن کا واقعہ یاد آگیا تھا جب لال کنویں میں کسی اجنبی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ کہیں یہی تو وہ حملہ آور نہیں؟ میں نے سوچا اور مزید تیز چلنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ گھر سے نکلا مگر اب واپسی ممکن نہیں تھی۔

میں تیز تیز چلتا ہوا جامع مسجد تک پہنچ گیا۔ وہاں خاصی رونق اور بھیڑ بھاڑ تھی۔ میں نے اپنی اطراف کا جائزہ لیا۔ اب وہ مونچھوں والا مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ میرا وہم ہوگا۔ میں نے سوچا۔ وہ شخص

بس اتفاق سے ادھر آنکلا ہوگا لیکن ایسا ہی تھا تو پھر اس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا سا کیوں لگا تھا؟ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ میں ایک الجھن میں گرفتار ہوگیا تھا۔

گھومنے پھرنے میں میرا زیادہ جی نہیں لگا اور پھر جیب بھی خالی تھی اس لیے میں کچھ دیر بعد ہی گھر کی طرف لوٹ گیا۔ پھر جیسے ہی میں مٹیا محل سے چتلی قبر کی طرف مڑا، مجھے وہ مونچھوں والا پھر نظر آیا۔ وہ ایک پنواڑی کی دکان پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ میری خوش قسمتی سے اس وقت ایک آدھ راہ گیر آجا رہا تھا اس لیے ہمت کر کے میں بڑھتا ہی رہا۔ اس بار میں نے پلٹ کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ شخص میری اس جسارت پر برا بھی مان سکتا تھا۔

جیسے تیسے ہانپتا کانپتا میں گھر پہنچ ہی گیا۔ پھر میں ٹھیک گیارہ بجے ہی گھر سے پھٹ پھٹ سمیت نکلا۔ اسی وقت سنسان گلی جیسے جاگ اٹھی۔ میں نے ایک جیپ کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ تیواڑی جی بالکل صحیح وقت پر پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے جیپ میں بیٹھے ہی بیٹھے میری طرف ایک فائل بڑھائی۔ "یہ لو اور اسی وقت روانہ ہو جاؤ!" ان کا لہجہ حکمیہ تھا۔

میں نے ان سے فائل لیتے ہوئے سوچا کہ انھیں مونچھوں والے کے بارے میں بتا دوں مگر فائل مجھے پکڑاتے ہی انھوں نے جیپ اسٹارٹ کر دی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

مرتا کیا نہ کرتا، میں نے وہ فائل پھٹ پھٹ کے کیریر میں لگائی اور اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ چند لمحے بعد ہی پھٹ پھٹ کا انجن غرّایا اور میں اس پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا، اے میرے پاک پروردگار! بس اب تو ہی بچانے والا ہے۔ مجھے اگر تھوڑی بہت تسلی تھی تو صرف اس بات پر کہ وہاں پہلے ہی سے میرے محکمے کے دوسرے افراد موجود ہوں گے۔ اگر کوئی جن بھوت پیچھے لگا بھی تو سبھی کے پیچھے لگے گا۔ مجھے ان مجرموں سے زیادہ جنات کا خوف تھا۔ کسی آدمی سے تو لڑ بھڑ کر بچا بھی جا سکتا ہے مگر جن بھوت سے لڑنا آدمی کے بس کا کام نہیں۔

میں نے کسی مولوی صاحب سے سنا تھا کہ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ اس وقت میں اسی پر عمل کر رہا تھا۔ مجھے جتنی آیتیں بھی یاد تھیں، بہ آوازِ بلند پڑھتا جا رہا تھا۔

پرانے قلعے پہنچنے میں ایک مصیبت اور تھی کہ راستے میں کوٹلہ فیروز شاہ کے کھنڈرات بھی پڑتے تھے، وہی کھنڈرات جہاں ایک بار میری جانِ عزیز جاتے جاتے بچی تھی۔

پھٹ پھٹ دوڑتی رہی، سناٹا مجروح ہوتا رہا اور میں بلند آواز میں آیتیں پڑھتا رہا، یہاں تک کہ دہلی دروازے تک پہنچ گیا۔ اس زمانے میں وہاں بھی کم ہی آبادی تھی اور دہلی دروازے سے نکلنے کے بعد تو بس ویرانی ہی ویرانی تھی، گویا دہلی دروازے سے نکلنے کا مطلب شہر سے نکلنا تھا۔

ابھی میں دہلی دروازے سے نکل کر کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک دم مجھے یوں لگا جیسے کوئی سخت سی چیز میرے سینے سے ٹکرائی ہو اور پھر میں موٹر سائیکل سے اچھل کر دور جا گرا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ موڑ کے بعد ہی سڑک کے بیچوں بیچ ایک موٹا سا رسّا تنا ہوا تھا جو دونوں جانب موجود پیڑوں سے باندھا گیا تھا۔ میرے سینے سے وہی رسّا ٹکرایا تھا۔ میری پھٹ پھٹ اپنے ہی زور میں کچھ دور چل کر "ڈھیر" ہوگئی مگر اس کا انجن اب بھی شور مچائے جا رہا تھا۔ انجن شاید اس مداخلتِ بے جا پر صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔

میں ابھی گر کر اٹھنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکا تھا کہ نہ جانے کدھر سے دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور مجھے دبوچ لیا۔

"بتا وہ فائل کہاں ہے؟ جلدی ورنہ آنتیں باہر کر دی جائیں گی۔" ان میں سے ایک نے مجھے تقریباً بھنبھوڑتے ہوئے کہا اور اسی کے ساتھ میں نے چوڑے پھل والے چاقو کی چمک دیکھی۔

"فف... فا... فائل...؟" خوف کے مارے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں فائل! بتا، جلدی بتا!" مجھ سے کہا گیا اور پھر شاید اس شخص نے آنتیں باہر کرنے کا ارادہ بدل دیا۔ وہ غالباً اب میرے گلے پر چاقو پھیرنا چاہتا تھا کیوں کہ چاقو کی نوک میری گردن پر تھی۔

"پھٹ پھٹ... پھٹ پھٹ کے کیریر میں لگی ہوئی ہے۔" میں نے جلدی سے گھبرا کر کہہ دیا۔ وہ شاید موت کا خوف ہی تھا جس نے میری زبان پر پڑا ہوا تالا کھول دیا تھا۔ خوف کا مجھے بڑا وسیع تجربہ ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کبھی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور کبھی فر فر چلنے لگتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان اسی وقت فر فر چلتی ہے جب زبان کھولنے سے جان بچنے اور نہ کھولنے سے جان جانے کا خطرہ ہو۔

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے میری بات کی تصدیق کرنے کے لیے کہا اور خود مجھے بدستور دبوچے رہا۔ یہ وہی تھا جس نے میری صراحی دار گردن پر چاقو کی نوک رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ساتھی تقریباً دوڑتا ہوا میری پھٹ پھٹ کی طرف بڑھا۔ نیم تاریکی اور سناٹے میں پھٹ پھٹ کا انجن اب بھی غرّا رہا تھا جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ پھٹ پھٹ کہاں ہے۔

"رسّا بھی کھول دینا!" چاقو والا بلند آواز میں اپنے ساتھی سے

بولا "کہیں کوئی اور گاڑی ادھر نہ آ نکلے" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے سڑک کے کنارے کی طرف گھسیٹا اور میں گھسٹتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ہی چاقو والے کے ساتھی نے فائل مل جانے کی خوش خبری سنائی، پھر بولا "اب میں رستا کھول رہا ہوں، تم اس کا بندوبست کرو۔"

لفظ "بندوبست" کتنا بامعنی تھا، اس کا اندازہ مجھے دوسرے ہی لمحے ہو گیا۔ میری دائیں کنپٹی پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور اسی کے ساتھ آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے تھے، پھر دوسری بار یہی عمل دہرایا گیا تھا۔ یوں لگا جیسے کسی نے مجھے اندھے کنویں میں پھینک دیا ہو۔ میں نے کنویں میں گرتے ہوئے شاید ہاتھ پیر بھی چلائے تھے، پھر اس کے بعد کیا ہوا، مجھے نہیں معلوم!

ہوش و حواس بحال ہوئے تو ایسا لگا جیسے کوئی مجھے جھولا جھلا رہا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو پتا چلا کہ کسی ... کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا ہوں۔ نیم تاریکی میں کسی کو میں نے اپنے برابر بیٹھا ہوا پایا۔ شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ مجھے ہوش آ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ مجھے کچھ پوچھنے یا بولنے کا موقع ملتا، اس کی منحوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کیا اب بھی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے ہیں سر! یا ٹھیک ٹھاک ہیں؟"

یہ منحوس آواز میرے ماتحت کمار کی تھی جسے سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا۔ میں نے ناراض ہو کر کہا "بکو مت!"

"خیریت گزری سر، کہ وہ آپ کو ذبح کرنے کی بجائے صرف بے ہوش کر کے بیچ سڑک پر ڈال گئے ورنہ ہمارا محکمہ آپ جیسے بہادر اور ذہین شخص کی خدمات سے محروم ہو جاتا۔" کمار نے پھر طنز کیا۔

"ذبح ہوتے تم، میں کیوں ہوتا!" میں بگڑ کر بولا، پھر پوچھا۔ "یہ جیپ کون چلا رہا ہے؟"

"ڈی آئی جی صاحب۔" کمار نے جواب دیا، پھر بتایا "ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹے پرانے قلعے میں آپ کا انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو گئے اور پھر ڈائریکٹر صاحب کے حکم پر واپسی کا سفر شروع ہوا..."

"کیا وہ بھی وہاں موجود تھے؟" میں نے کمار کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"جی ہاں۔" کمار نے جواب دیا، پھر اپنی بات پوری کی "واپسی میں دہلی دروازے سے پہلے ہمیں آپ سڑک پر بے ہوش ملے۔ قریب ہی آپ کی موٹر سائیکل پڑی ہوئی تھی۔ آپ کے پاس سے فائل غائب تھی۔ آپ کو تیواڑی جی نے اس جیپ میں ڈال لیا اور کمال کو آپ کی موٹر سائیکل لانے کی خاطر جیپ سے اتار دیا۔" یہ کہہ کر کمار خاموش ہو گیا۔

"بقیہ سب لوگ کہاں گئے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اپنے اپنے گھر۔" کمار نے کہا "اب آپ کو گھر چھوڑ کر ڈی آئی جی صاحب مجھے میرے گھر چھوڑیں گے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" میں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا "مجرم تو بہت چالاک نکلے۔"

"جی ہاں سر!" کمار بولا "اور کیوں کہ فائل لے کر آپ جا رہے تھے اس لیے انھیں مزید آسانی ہو گئی۔"

"تمھاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟" میں یہ کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو حماقت کا ثبوت دے کر ان سے مقابلے کی کوشش کرتا مگر آپ نے یقیناً ذہانت سے کام لیا ہو گا۔ آپ نے فوراً فائل انھیں دے دی ہو گی۔" کمار معصومیت سے بولا۔

"ہاں اور کیا!... ہرگز نہیں!" میں اعترافِ حقیقت کرتے کرتے ایک دم رک گیا "تم مجھے کیا سمجھتے ہو! میں نے ان سے زبردست مقابلہ کیا تھا اور..."

"اس کے بعد ہتھیار ڈال دیے تھے۔" کمار نے میرا جملہ اچک لیا۔

"ہرگز نہیں!" میں اکڑ کر بولا "ہتھیار میرے ہاتھ میں تھے ہی نہیں جو ڈالتا۔ تمھارا اندازہ قطعی غلط ہے۔ آئے بڑے انکل لڑانے والے!"

اسی وقت جیپ، جامع مسجد کے سامنے سے گزری۔ کمار نے میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے جیپ کو دہلی دروازے کے سامنے رکتے دیکھا، پھر تیواڑی جی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اللہ دتا! اگلی سیٹ پر آ جاؤ!"

"ابھی آیا سر!" یہ کہہ کر میں جیپ سے اتر گیا اور پھر تیواڑی جی کے برابر جا بیٹھا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمھیں کیا واقعہ پیش آیا؟" تیواڑی جی میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

میں نے ان سے پورا واقعہ بیان کر دیا مگر شوشے بازی سے باز نہ آیا۔ مجرم صرف دو تھے جن کی تعداد میں نے دس بتائی اور پھر ان سے سخت مقابلے کا منظر بیان کیا "ایک کی ناک پر میرا گھونسا پڑا اور اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ وہ تڑپ کر زمین پر گرا۔ دوسرے کی کنپٹی پر میرا بایاں ہاتھ پڑا اور وہ کسی شہتیر کی طرح لہرا کر زمین بوس ہو گیا۔ اسی لمحے تیسرے شخص نے مجھ پر چھلانگ لگائی جس کی ٹانگوں کے درمیان میرا گھٹنا پڑا۔ وہ چیخ کر الٹ گیا۔ اسی وقت کسی نے پیچھے سے میری پشت پر سواری کرنا چاہی۔ میں نے اسے اٹھا کر سامنے پھینک دیا۔ اب سر، بقیہ افراد دور کھڑے یہ سوچ رہے تھے کہ وہ کیا کریں!"

"لیکن تمھیں یہ کس طرح پتا چلا کہ بقیہ افراد دور کھڑے کیا سوچ رہے تھے؟" تیواڑی جی نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا سر!" میں گڑبڑا گیا "شاید انھی میں سے کسی نے یہ بات بتائی تھی۔"

"نری بکواس!" تیواڑی جی نے تبصرہ کیا۔

"پھر معلوم ہے کیا ہوا سر!" میں نے حسبِ عادت تجسس پیدا کرنے کی خاطر بات کو آگے بڑھایا۔

"مجھے نہیں پوچھنا!" تیواڑی جی سختی سے بولے اور جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تم نے ان کا مقابلہ کیا اور بالآخر وہ تمھیں بے ہوش کر کے ڈال گئے اور فائل لے اُڑے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم!"

میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ ابھی تو میرے دل میں نہ جانے کیا کیا تھا جسے تیواڑی جی سننے پر تیار نہیں تھے۔ وہ اب مجھے میرے گھر کے دروازے پر اتار کر ٹہل جانا چاہتے تھے۔ میں نے مُردہ سی آواز میں کہا "ہاں سر! بالآخر تو یہی ہوا تھا جو آپ نے کہا مگر اس دوران میں بڑا ہنگامہ برپا کیا میں نے!"

"یقیناً کیا ہو گا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ کچھ سننا چاہتا ہوں۔" تیواڑی جی رکھائی سے بولے۔ قدرے توقف کے بعد شاید انھیں کچھ خیال آیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا وہ سب غیر مسلح تھے؟ ان میں سے کسی نے ریوالور وغیرہ نہیں نکالا؟"

"وہ سب قطعی مسلح تھے سر! مگر میں نے انھیں اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ ریوالور نکال سکتے۔" میں نے موقع دیکھ کر رنگ جمایا۔

"تم نے دس آدمیوں میں سے کسی ایک کو ریوالور نکالنے کا موقع نہیں دیا؟" تیواڑی جی کے لہجے میں چبھن تھی۔

"اور کیا سر! میں تو بھوٹ کی لاٹھی کی طرح ان کے سروں پر گھوم رہا تھا۔ پھر کسی کو یہ موقع کس طرح مل جاتا!" میں جلدی سے بولا "آپ کو پتا ہی ہو گا سر کہ بھوٹ کتنی عجیب چیز ہوتی ہے۔ امی بتاتی ہیں کہ میرے نانا بھی زبردست بھوٹیے تھے۔ وہ چارپائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دیتے تھے، پھر بھوٹ گھماتے تھے۔ مجال ہے جو کسی کبوتر چارپائی کے نیچے سے نکل جائے!" میرے لہجے میں بلا کا جوش تھا۔

نہ جانے کیا بات ہوئی کہ تیواڑی جی اس وقت خلافِ توقع ہنس پڑے اور بولے "تم ٹھیک کہہ رہے ہو اور تمھاری ماتا جی بھی اپنے پتاجی کے لیے غلط نہیں کہتی ہوں گی مگر جب ان میں سے کسی نے کوئی ہتھیار نکالا ہی نہیں تو پھر تمھیں یہ کس طرح پتا چل گیا کہ وہ سب مسلح تھے؟"

بال کی کھال نکالنے میں تیواڑی جی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ آخر پتے نا پڑا نے گھاگ! میں گڑبڑا کر بولا "وہ... وہ سر! ایک بار لڑتے ہوئے میرا ہاتھ ایک مجرم کی جیب میں چلا گیا تھا، بس اتفاق سے سر! اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بقیہ مجرم بھی مسلح تھے۔"

"تم نے وہ ریوالور کیوں نہیں نکال لیا؟" تیواڑی جی نے کہا۔

"آپ تو جانتے ہیں سر کہ مجھے خون خرابہ پسند نہیں۔" میں بولا۔ "اگر میں ریوالور نکال لیتا تو ان دسوں کی لاشیں گرا دیتا، اس لیے میں نے ان کی صرف گُتائی لگانا مناسب خیال کیا۔"

اسی وقت تیواڑی جی نے جیپ کو بریک لگائے اور بولے۔ "لو تمھارا گھر آ گیا، اترو!"

جب میں جیپ سے اتر کر اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا تو کمار کی زہریلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "خیر سے بدھو گھر کو آئے۔"

"کیا کہا؟" میں ایک دم پلٹ کر دہاڑا "تو نے کسے بدھو کہا؟"

اس وقت جیپ ایک زناٹے سے آگے بڑھ چکی تھی اور میری چیخ پکار لاحاصل ہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوسرے دن صبح دفتر پہنچتے ہی اس ناہنجار کمار سے انتقام لوں گا۔ یہ سوچتا ہوا میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں پھٹ پھٹ پر گیا تھا اور خالی ہاتھ آیا تھا، یہ دیکھ کر امی نے استفسار کیا تھا۔ وہ سرکاری پھٹ پھٹ کو بھی اب اپنی ہی ملکیت سمجھنے لگی تھیں۔

"وہ میں نے اپنے ایک اور ساتھی کو ضرور دے دی، کل واپس مل جائے گی۔ مجھے بڑے صاحب خود اپنی جیپ میں چھوڑ کر یہاں گئے ہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

بڑے صاحب بنفسِ نفیس مجھے وہاں چھوڑ کر گئے تھے، اس پر امی نے خوشی کا اظہار کیا، گویا ان کا بیٹا اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ بڑے صاحب خود اسے چھوڑنے آئے تھے مگر ساتھ ہی نصیحت کی "بیٹے! اپنے ہاتھ کی چیز دوسرے کو نہیں دیتے۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اس طرح چیز خراب ہو جاتی ہے۔"

دوسرے دن میں دفتر پہنچا تو مجھ پر کمار سے انتقام لینے کا بھوت سوار تھا مگر پتا چلا کہ وہ حضرت ابھی دفتر ہی تشریف نہیں لائے۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہوا، ایک بہانہ ڈانٹ پھٹکار کے لیے اور ہاتھ لگا۔ کمرے میں اس وقت کمار کے سوا میرے بقیہ ماتحت موجود تھے جن کی آنکھوں اور چہروں سے گزشتہ رات کی تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ ابھی میں اپنی کرسی پر سنبھل کر بیٹھا ہی تھا کہ پیارے لال ہنر اپنی نشست سے اٹھ کر میری میز کی طرف بڑھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ نظر آ رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے نہایت مودبانہ انداز میں وہ لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظریں اٹھاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر

لفافہ لے لیا اور بولا "کیا ہے اس میں؟"

"حضور والا! یہ اسی مشاعرے کا دعوت نامہ ہے جس کے بارے میں اسی ہیچ مداں نے گزشتہ روز عرض گزاری تھی۔" پیارے لال ہنر اپنا چشمہ سنبھالتا ہوا، دانت نکال کر بولا "ملاحظہ فرمایئے۔"

میں نے لفافہ کھول کر اس میں سے پرچہ نکالا اور پڑھنے لگا۔ پرچہ پڑھ کر میری باچھیں کھل اٹھیں۔ میں نے ان میں سے چند الفاظ کئی بار پڑھے۔ وہ الفاظ یہ تھے "زیر صدارت جناب ایل ڈی مہر"۔

"بھئی کیا واقعی تم نے یہ کام کر ہی ڈالا؟" میں خوش گوار حیرت کے ساتھ بولا۔

"جی ہاں بندہ پرور! یہ بندۂ ناچیز دروغ گو بہرحال نہیں ہے۔ ذرا مصرعۂ طرح بھی تو ملاحظہ فرمائیں۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں انکساری کے ساتھ ساتھ یہ تاثر بھی پایا جاتا تھا جیسے اپنے اس کارنامے پر دادِ طلب ہو۔ بہرحال بات تھی بھی قابلِ داد۔ کسی مشاعرے کی صدارت یوں ہی تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو نہیں مل جاتی۔

میں نے اس کے کہنے پر وہ سطر بآوازِ بلند پڑھی جس کے اوپر مصرعۂ طرح لکھا ہوا تھا "رگ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں"۔

"رگ گل نہیں بندہ نواز، رگِ گل!" پیارے لال ہنر نے تصحیح کی۔

"یعنی پھول کی رگ؟" میں نے سمجھنے والے انداز میں کہا "یعنی پھول کی رگ بھی ہوتی ہے؟ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ میں نے تو پھول کی رگ کبھی نہیں دیکھی۔ ویسے اگر رگ ہوتی ہوگی تو پھڑکتی بھی ہوگی۔"

"اسی کا نام تو شاعری ہے قبلۂ محترم!" پیارے لال ہنر نے سمجھایا۔

"جو کسی کو نظر نہیں آتا، وہ شاعر کی آنکھ دیکھ لیتی ہے۔ ویسے یہ مصرعہ لکھنوی طرز کا ہے مگر استاد بے کل دہلوی کا کہنا ہے کہ صرف لکھنؤ والے ہی معنی آفرینی پیدا نہیں کر سکتے، دلی والے بھی پیچھے نہیں ہیں۔ اس مصرعے میں قافیہ 'پر' اور ردیف 'باندھتے ہیں' مقرر کی گئی ہے۔ اب دیکھیے لوگ کیا کیا شعر نکالتے ہیں! نظر باندھتے ہیں، جگر باندھتے ہیں وغیرہ۔"

میں یہ سن کر گھبرا گیا اور بولا "مگر ان میں سے میں کوئی چیز نہیں باندھ سکوں گا۔"

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں بندہ پرور!" یہ کہہ کر وہ میری طرف جھکا اور سرگوشی کی "میرے پاس اساتذہ کے بہت دیوان ہیں، بس ذرا سی الٹ پھیر کی ضرورت پڑے گی۔ آپ بالکل پروا نہ کریں۔ جہاں میں اپنے لیے محنت کروں گا، وہیں آپ کے لیے بھی چھ سات شعر نکال لوں گا۔"

میں اس وقت پیارے لال ہنر کی بات قطعی نہ سمجھ سکا۔ یہ الگ بات کہ اس کے بعد زندگی بھر میں نے اپنی شاعرانہ عظمت برقرار رکھنے کے لیے اس کی بتائی ہوئی ترکیب ہی پر عمل کیا۔ اب بھی میرے ہاں، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پچاس کے قریب اساتذہ کے دیوان ہیں۔ بعض زمینیں ایسی ہیں جن میں کئی استادوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ہر غزل سے بہ آسانی ایک ایک شعر لے کر ایک نئی غزل بنائی جا سکتی ہے۔ بس ذرا مقطع مشکل ہوتا ہے مگر کسی نہ کسی شعر میں "مہر" آ ہی جاتا ہے۔

"ٹھیک ہے، تم جانو۔" میں نے پیارے لال ہنر سے کہا "لیکن دو ایک دن پہلے غزل بنا کر دے دینا تاکہ میں زیر زبر درست کر لوں۔"

"بجا فرمایا۔" اس نے جلدی سے سر ہلایا "خادم خود سن لے گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔

ادھر پیارے لال ہنر اپنی کرسی پر بیٹھا، ادھر کمار کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اسے فوراً ہی آڑے ہاتھوں لیا "یہ وقت ہے دفتر آنے کا؟" میں دہاڑا۔ میں نے اس بات کا پہلے ہی یقین کر لیا تھا کہ وہ تیواڑی جی کے پاس نہ گیا ہو۔ ایک بار وہ پہلے ایسی ہی حرکت کر چکا تھا۔ وہ تیواڑی جی کے پاس تھا اور مجھ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ اسی وقت دفتر آیا ہے۔ میں نے تیواڑی جی سے اس کی شکایت کی تھی تو مجھے ہی الٹی باتیں سننا پڑی تھیں۔

"کیوں کیا ہوا؟" کمار حیرت سے بولا "دیر سے آنے کی تو آپ فوراً پوچھ لیتے ہیں، کبھی یہ بھی پوچھا کہ یہ وقت ہے، دفتر سے جانے کا!"

"زبان درازی کرتے ہو اپنے افسر سے!" میں نے اسے دھمکانا چاہا۔ "میں جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو!"

"بس ہو گئی دیر! جو کرنا ہے کر لیجیے۔" اس کے لہجے میں خود سری تھی۔

"اچھا یہ بات ہے!" میں چیخ کر بولا "میں آج ہی تمھیں اس زبان درازی کا مزا چکھا دوں گا۔"

"بہت دیکھے ہیں مزا چکھانے والے!" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا اور اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں اس کا رویہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہوا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی مجھ سے اس طرح اور اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ہر چند کہ وہ بات بات پر میرا مذاق اڑاتا رہتا تھا مگر سخت لہجہ کبھی اختیار نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک چڑانے والی مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی جس کا آج دور دور تک اس کے ہونٹوں پر پتا نہیں تھا۔ مجھے فکر دامن گیر ہوئی کہ اس کی یہ سرکشی اور نافرمانی میرے دوسرے ماتحتوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے اس لیے اسے قرار واقعی سزا دینا از بس ضروری ہے۔ یہ سوچ کر میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دہاڑا "اچھا میں تمھیں ابھی تڑواتا ہوں نافرمان!"

"جلدی کیجیے، کہیں کوئی اور نہ تڑوا لے۔" اس نے میرے لہجے کی نقل اتاری۔

میں تیر کی طرح کمرے سے نکلا اور پھر تیواڑی جی کے کمرے تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ تیواڑی جی کے چپراسی سے میں نے اندر خبر کرائی اور انھوں نے مجھے فوراً ہی اندر بلوا لیا۔

میں اندر پہنچتے ہی گویا پھٹ پڑا "میں اس گستاخ کو ایک لمحے بھی برداشت نہیں کر سکتا جناب!"

"آہستہ بات کرو اور یہ نہ بھولو کہ تم کس کے سامنے ہو!" تیواڑی جی نے ڈانٹ پلائی، پھر بولے "کسے برداشت نہیں کر سکتے؟"

"کمار کو سر!" میں نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا "وہ آج بھی دیر سے دفتر آیا ہے، اس سے دوسروں پر بھی برا اثر پڑے گا سر!"

"اسے میں نے بھیجا تھا، ایک کام سے! میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ دفتر آنے سے پہلے وہ کام نمٹا کر آئے۔ وہ ابھی رپورٹ دے کر میرے پاس سے گیا ہے۔ کچھ اور کہنا ہے تمھیں؟"

"نن... نہیں سر! ام... مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔" تیواڑی جی کی بات سن کر میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کمار نے مجھے ایک بار پھر تیواڑی جی کے سامنے خوار کر دیا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ خلافِ معمول اس کے لہجے میں سختی کیوں تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ میں بھڑک کر تیواڑی جی سے اس کی شکایت کر دوں اور منہ کی کھاؤں۔ میں یہ سوچ کر کھول گیا۔

اسی وقت تیواڑی جی نے میز کی دراز کھول کر ایک چابی نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لو، حوالات نمبر تین کی چابی!"

میں نے ہاتھ بڑھا کر چابی لے لی اور بولا "اس چابی کا کیا کروں سر؟"

"ابھی میری بات تو پوری ہونے دیتے، اس کے بعد ہی کچھ پوچھتے۔" تیواڑی جی منہ بنا کر بولے "جن لوگوں نے تم پر رسالت حملہ کیا تھا، ان میں سے ایک کی تلاش میں کمار کو میں نے بھیجا تھا...!"

"مگر سر!..." میں ضبط نہ کر سکا اور تیواڑی جی کی بات کاٹ دی اور اسی وقت میری نظر تیواڑی جی کی مونچھوں پر پڑی جو پھڑک رہی تھیں۔ میں نے اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اب اگر تم نے میری بات کاٹی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" تیواڑی جی دہاڑے۔

ویسے بھی اگر میں آپ کی بات نہ کاٹوں تو آپ سے برا کوئی نہیں سر! میں نے دل ہی دل میں کہا مگر زبان سے یہ جملہ ادا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور بولا "اب ہرگز ایسی غلطی نہیں کروں گا سر!" میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، آخر ان کے بارے میں تیواڑی جی کو کہاں سے پتا چل گیا کہ وہ کون تھے؟ مگر ان جیسے ظالم اور جابر انسان سے بھلا کوئی کچھ پوچھ سکتا ہے! وہ خود ہی کچھ بتا دیں تو اور بات ہے۔

میری بات سن کر تیواڑی جی کی مونچھوں کو قرار آ گیا۔ انھوں نے سگریٹ سلگا کر اس کا کش لیتے ہوئے کہا "شاید تم نے اس لیے میری بات کاٹی تھی کہ جاننا چاہتے تھے، مجرم کے بارے میں کس طرح پتا چلا؟"

میں نے سعادت مندی سے گردن ہلا دی اور بولا "جی ہاں سر! یہی بات تھی۔"

"صبر کرنا سیکھو!" انھوں نے نصیحت کی "میں بہرحال تمھیں یہ بات بتاتا۔ دراصل ہوا یہ کہ جہاں تم ہمیں بے ہوش ملے، وہیں ہمیں ایک پاکٹ ڈائری پڑی ہوئی ملی جس کے بارے میں یہی سوچا جا سکتا ہے کہ مجرموں ہی میں سے کسی کی جیب سے گری ہوگی۔ اس ڈائری پر جس شخص کا نام پتا لکھا ہوا تھا، اسے چیک کرنے کے لیے میں نے کمار کو بھیجا۔ وہ شخص نہیں ملا تو کمار اس کی بیوی کو پوچھ گچھ کی خاطر اٹھا لایا۔ اب تم سمجھے کچھ!"

"جی ہاں سر! بالکل سمجھ گیا۔" میں نے اقرار کیا۔

"تمھیں اس عورت سے پوچھ گچھ کرنا ہے۔ وہ حوالات نمبر تین میں بند ہے۔" تیواڑی جی نے بتایا۔

میں نے سوچا، اچھا ہوا وہ شخص ہتھے نہیں چڑھا ورنہ میری ساری بہادری کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وہ بتا دیتا کہ ان کی تعداد صرف دو تھی اور یہ بھی کہ میں نے ان سے قطعی ملمدہ دھاڑ نہیں کی، فوراً ہی فائل کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے تیواڑی جی سے کہا "اچھا تو پھر میں جاؤں اور اس بدبخت سے پوچھ گچھ کروں۔"

"ہاں!" تیواڑی جی نے اجازت دے دی، پھر بولے "اگر وہ زبان کھولنے پر آمادہ نہ ہو تو تم تشدد سے بھی کام لے سکتے ہو۔"

"یعنی... لیکنی سر... میں عورت ذات پر ہاتھ اٹھاؤں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

جواب میں مجھے تیواڑی جی نے گھور کر دیکھا اور میں پٹپٹا گیا۔

میں نے جلدی سے کہا "ٹھیک ہے... ٹھیک ہے سر! آپ کا جو حکم ہے، میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔ بولے گی کیسے نہیں 'سسری'!" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر جب میں نے اس "سسری" کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن پر گھنی اور لمبی پلکیں، بال کمر تک لہراتے ہوئے اور کمر جیسے تھی ہی نہیں۔ نازک سی گڑیا سی وہ "سسری" مجھے بہت اچھی لگی۔ اس نے اپنی بڑی بڑی ڈھیلے جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور میرا دل دھکڑ پکڑ ہونے لگا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے ہمت کر کے پہلا سوال کیا۔

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی اور میں حیران تھا۔ پھر وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھی اور

میری طرف بڑھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی "افضل!... افضل تم... مگر... مگر تم... تم یہاں کس طرح آ گئے؟ اگر... اگر اکبر کو پتا چل گیا تو... تو بہت بُرا ہو گا۔ بولو نا افضل!" یہ کہتے ہوئے وہ میرے سینے سے لگ گئی اور پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے بھینچ لیا۔

میرا سارا جسم جھنجھنا اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا وجود ہلکا پھلکا ہو کر ہوا کے دوش پر تیرنے لگا ہو۔ اس لمحے میں نے سوچا، کاش میں افضل ہی ہوتا۔

میں نے بہ مشکل پھنسی پھنسی آواز میں کہا "میں افضل نہیں ہوں۔"

"جھوٹ نہ بولو افضل! میں تمھیں کسی حال میں نہیں بھول سکتی تم... تم میری پہلی محبت ہو افضل!... میری پہلی محبت! لڑکی اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔ میں مجبور تھی، یقین کرو میں مجبور تھی افضل! اکبر سے شادی کرنے میں میرا نہیں میرے والدین کا قصور ہے۔ تم... تم اُن کے قصور کی سزا مجھے... مجھے تو نہیں دے سکتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے سینے پر ہاتھ پھیرا اور مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

اگر ایسے میں کوئی آ جائے تو؟ جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی اور میں گھبرا گیا۔ "چھوڑ دو مجھے! کوئی آ گیا تو غضب ہو جائے گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اُسے خود سے جدا کرنا چاہا۔

جواب میں اُس نے مجھے مزید سختی سے جکڑ لیا اور بہ دستور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں تمھیں نہیں چھوڑوں گی، ہرگز نہیں!"

عجیب لڑکی تھی، خواہ مخواہ زبردستی گلے پڑی جا رہی تھی۔ میں اللہ دتا سے اے ڈی مہر تو بن گیا تھا مگر افضل کب بنا تھا، اس لیے، میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ تیواڑی جی نے مجھے اس کے پاس پوچھ گچھ کے لیے بھیجا تھا، عشق لڑانے کی خاطر نہیں۔ میں نے ایک دم زور لگا کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا ہی لیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا "یقین کرو، میں افضل نہیں ہوں۔"

"اتنے سنگ دل نہ بنو افضل!" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے مجھے یہاں لا کر بند کر دیا۔ مجھے بچا لو افضل، بچا لو!"

"سنو! یہ سی آئی ڈی آفس ہے اور میں سی آئی ڈی انسپکٹر اے ڈی مہر ہوں۔" اپنا نام اور عہدہ بتاتے ہوئے میں نے آواز کو ذرا بھاری کر لیا۔ "تم سے جو پوچھا جائے، اس کا صحیح صحیح جواب دو کہ اسی میں تمھاری اور تمھارے شوہر کی بھلائی ہے جس کا نام تم نے اکبر بتایا ہے۔ سمجھیں یا نہیں!"

میری بات سن کر وہ کچھ سٹپٹا سی گئی، پھر عجیب سے لہجے میں بولی "کیا تم واقعی میرے افضل نہیں ہو؟"

"نہیں!" میں پُرزور لہجے میں بولا "اس سے پہلے بھی میں تمھیں یہ بات بتا چکا ہوں۔"

"اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو تو پھر بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" اُس نے کہا۔

"تم سے تمھارے شوہر کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمھارے ہر سوال کا جواب دوں گی لیکن... لیکن پہلے..." نہ جانے وہ کچھ کہتے ہوئے کیوں جھجک رہی تھی۔ پھر اُس نے وہ بات کہہ ہی دی جسے کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اُسے بیت الخلا جانا تھا۔

اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ مجھے بیت الخلا کا تصور بہت بُرا لگا۔ بیت الخلا، حوالات کے قریب ہی ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ میں اُسے ساتھ لیے اس طرف بڑھا اور پھر وہاں پہنچ کر بیت الخلا کی قطار سے کچھ پہلے ہی رک گیا۔ میں نے اس طرف انگلی اٹھاتے ہوئے اس سے کہا "اُدھر چلی جاؤ! دیوار کی دوسری سمت بیت الخلا بنے ہوئے ہیں۔"

لڑکی نے سر ہلایا اور اس طرف بڑھ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ وہاں تک اس کے ساتھ ساتھ جاتا۔

وہاں کھڑے کھڑے جب میری ٹانگیں دُکھنے لگیں تو مجھے لڑکی پر تاؤ آنے لگا۔ کیسا ہی قبض کیوں نہ ہو، اتنی دیر میں ٹوٹ ہی جانا چاہیے تھا۔ میں عجب گومگو کے عالم میں تھا، کروں تو کیا کروں! بالآخر مجبور ہو کر میں بیت الخلا کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک قطار میں چار بیت الخلا بنے ہوئے تھے جن میں سے دو کے دروازے بند تھے! یہ دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ وہاں میں زیادہ دیر کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا، ایک تو یہ، دوسرے مجھ پر کچھ جھنجلاہٹ بھی سوار تھی اس لیے ایک بند دروازے پر دستک دی۔

جواب میں اندر سے کوئی کھنکھار، اگرچہ کھنکھار سو فی صد مردانہ تھی۔ میں نے دوسرے دروازے پر طبع آزمائی کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"ابے کم سے کم کھنکھار ہی دو، اُلو کی دُم فاختہ! تاکہ مجھے یقین آ جائے کہ تم ابھی زندہ ہو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

خاموشی برقرار رہی۔ میں نے غصے میں زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں شرما کر اپنا منہ پھیر لیتا، میری نظر اندر پڑ گئی۔ وہ بیت الخلا خالی تھا اور بس یوں ہی کسی نے کواڑ بھیڑ دیے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی زور کا چکر سا آ گیا۔ اُس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ حرّافہ مجھے جُل دے کر "الوپ" ہو گئی تھی۔ وہ ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئی تھی اور مجھے

وہاں اپنے انتظار میں تڑپتا ہوا چھوڑ گئی تھی۔ جس بیت الخلا کا دروازہ بند تھا، اس میں یقیناً کوئی مرد تھا۔ میرے ہوش اُڑنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ جب تیواڑی جی کو پتا چلے گا کہ چڑیا اُڑ گئی تو کیا ہو گا؟

اب میرے لیے یہ سمجھنا بھی زیادہ مشکل نہیں رہا تھا کہ اس قطامہ نے مجھے اپنا محبوب کیوں کہا تھا اور اس بہانے مجھ سے کیوں لپٹ گئی تھی۔ وہ یقیناً اداکاری کر رہی تھی، ڈھونگ رچا رہی تھی کم بخت! یا اللہ یہ کیا ہو گیا، بیٹھے بٹھائے! میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اب کیا ہو گا میرے معبود؟

وہاں اب مزید کھڑا رہنا اور دماغ میں بھانت بھانت کی بدبو بسانا فضول ہی تھا اس لیے میں ٹھنڈے ٹھنڈے باہر آ گیا۔ میں نے حوالات کا تالا لگا کر چابی جیب میں ڈالی اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ واہ بیٹا اللہ دتا! ذرا دیر میں چوکڑی بھول گیا! اتنی سی بات عقل میں نہیں آئی! ظاہر ہے کہ وہ بھاگ کر اپنے گھر ہی تو گئی ہو گی، اے آکڑ کے تسری کو! رہی پتے کی بات تو کمار سے معلوم کرے، اس میں اتنے گھبرانے کی کیا بات ہے! یہ خیال آتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں سیدھا تیر کی طرح کمار کے پاس گیا اور سختی سے بولا "تم بہت وہ ہو! جب تیواڑی جی نے تمھیں کام سے بھیجا تھا تو مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ میں خواہ مخواہ تم پر اتنا ناراض ہوا۔"

"کیوں شکایت کر آئے نا آپ!" اس کے ہونٹوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی جو میرا خون کھولا کر رکھ دیتی تھی مگر میں نے اس وقت ضبط کیا اور اس کی شیطانی مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے اس سے اپنا اُلو سیدھا کرنا تھا اس لیے بہ دستور نرم لہجے میں بولا "خیر ان باتوں کو چھوڑ دو۔ تیواڑی جی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں خود جا کر اس مکان کی تلاشی لوں، مجھے اس کا پتا سمجھاؤ۔"

"اس لونڈیا سے پوچھ لیجیے جسے میں پکڑ کر لایا ہوں۔" وہ بولا۔ "اسے دیکھ تو لیں ایک نظر سر! تیواڑی جی کے پاس حوالات کی چابی موجود ہے۔"

اس حرّافہ کے ذکر پر میں تلملا کر رہ گیا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "اسے جہنم میں جھونکو اور جلدی سے پتا بتاؤ۔"

"آپ کہیں تو میں ساتھ چلا چلوں۔" اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس کی بات مان لیتا مگر اس وقت اسے ساتھ لے جانے کا مطلب خود اپنا بھانڈا پھوڑنا ہوتا۔ "نہیں، تم یہیں رہو! میں اکیلا ہی جاؤں گا۔" میں نے اس کی پیشکش نامنظور کر دی۔

"سوچ لیں، مکان کافی بڑا ہے۔ آپ کو تلاشی لیتے لیتے شام ہو جائے گی۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ میرے علاوہ کمال اور حمید وغیرہ کو بھی ساتھ لے لیں تاکہ کام جلدی نمٹ جائے۔"

کمار غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر تلاشی کس کم بخت کو لینا تھی۔ وہ تو بس میں نے اس سے پتا معلوم کرنے کے لیے یہ داؤ چلا تھا۔

"تم فضول بحث نہ کرو اور پتا بتاؤ!" میری آواز میں کسی قدر سختی آ گئی۔

"ویسے وہ ڈائری تو ڈی آئی جی صاحب کے پاس ہی تھی جو مجرم کی جیب سے گری تھی۔ معلوم نہیں انھوں نے پتا کیوں نہیں بتایا۔" کمار خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت کمار بدبخت کو یہ معلوم ہو جائے میں جھوٹ رہا ہوں اور دھوکے سے پتا حاصل کر رہا ہوں تو شاید وہ کبھی مجھے پتا نہ بتائے۔

بالآخر اُس نے مجھے پتا بتا ہی دیا۔ اس شخص کا نام شاہنواز تھا اور وہ دریبے میں رہتا تھا۔ اس کا نام سن کر میں چونکا کیوں کہ اس فلمی لڑکی نے اس کا، یعنی اپنے شوہر کا نام اکبر بتایا تھا۔

کمال میری پھٹ پھٹ دفتر لے آیا تھا۔ میں نے اس سے چابی لی اور چل دیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اپنی پھٹ پھٹ پر بیٹھا دریبے کی طرف گویا اُڑا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس اس وقت ہوا کہ کوئی دوسری پھٹ پھٹ پر میرے تعاقب میں ہے، جب میں چاندنی سے دریبے کی طرف مڑا۔ پہلے میں نے محسوس تو کیا تھا کہ کوئی میرے پیچھے ہے مگر یقین نہیں تھا کہ وہ میرا ہی تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اپنے تعاقب کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی میں چونک پڑا اور میری پھٹ پھٹ لہرائی۔ میں نے پھٹ پھٹ کو سنبھالا، پھر آگے دیکھنے لگا۔ وہی بڑی بڑی مونچھوں اور مسّے والا میرا پیچھا کر رہا تھا جسے میں پہلے بھی ایک بار اپنے تعاقب میں دیکھ چکا تھا۔ واپسی کا سوال ہی نہیں تھا، مجھے بہرحال اس لڑکی کو تلاش کرنا تھا جو دھوکا دے کر فرار ہو گئی تھی۔ جو ہو، وہ ہو! میں یہ سوچ کر بڑھتا ہی رہا اور پھر بالآخر ایک گلی میں مڑ گیا۔ اسی گلی میں اس حرّافہ کا گھر تھا۔ کچھ دیر بعد ہی مونچھوں والے کی پھٹ پھٹ بھی اسی گلی میں مڑی۔ میں چونکنا ہو گیا۔ چھوٹی سی ایک مسجد کے پاس ہی وہ گھر تھا جہاں مجھے جانا تھا۔ کمار نے اتنا صحیح پتا بتایا تھا کہ مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

میں نے پھٹ پھٹ اسی گھر کے سامنے روکی۔ گھر کے دروازے

پر ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا جھول رہا تھا۔ میں موٹر سائیکل سے اُترا، اُسے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر کواڑ تھپتھپائی۔ اسی وقت مونچھوں والے کی پھٹ پھٹ میرے قریب آ کر رکی اور میں چونک پڑا۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

مونچھوں والے نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھ دیا اور اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "کیا بات ہے استاد! اِدھر کیسے نکل آئے؟"

اس کی آواز سن کر میں چونکا۔ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بھی مجھے جانا پہچانا سا لگا تھا جیسے اُسے کہیں دیکھا ہو اور اب آواز بھی اجنبی نہیں لگی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے بے تعلقی سے کہا۔ "تم سے کیا مطلب؟ تم اپنا راستہ لو۔"

"مجھ سے اس لیے مطلب ہے استاد، کہ یہ گھر یاروں ہی کا ہے۔" اس نے کہا۔ "استاد" شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

"کیا مطلب؟" میں چونک کر حیرت سے بولا۔ "کیا یہ تمھارا گھر ہے؟"

"ہاں میرا ہی سمجھو۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا ہی سمجھو سے کیا مطلب؟ صاف صاف بتاؤ۔" میں الجھ سا گیا اس کی باتوں سے!

"ویسے اللہ دتا! اگر اس وقت تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو استاد، میں اسے دن میں تارے دکھا دیتا مگر تمھاری بات اور ہے۔ میں کچھ بھی سہی، نمک حرام نہیں ہوں۔"

وہ عجیب اُلجھی الجھی اور الٹی سیدھی باتیں کیے جا رہا تھا جو میرے پلے ہی نہیں پڑ رہی تھیں۔ میں اسی لیے خاموش کھڑا رہا۔ میرے لیے یہ بات بھی حیران کن تھی کہ وہ میرا نام بھی جانتا تھا۔

"یہاں میرا دوست شاہنواز رہتا ہے اس لیے میں نے اس گھر کو اپنا گھر کہا تھا، اب سمجھے!" اس نے کچھ توقف کے بعد بتایا، پھر بولا۔ "تم شاید اسی سے ملنے آئے ہو۔ ٹھہرو، میں آواز دے کر بلاتا ہوں اسے!" یہ کہہ کر اس نے ہانک لگائی۔ کوئی تیسری آواز یا ہانک کے جواب میں اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

کچھ دیر بعد ہی ایک شخص باہر آیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی زور سے اچھل پڑا اور چہرے پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔

"شاہنواز! کیا ہوا؟" مونچھوں والے نے بھی غالباً شاہنواز کی متغیر حالت کو محسوس کر لیا تھا۔

"تم... تم نے عادل! میرے ساتھ... دھوکا... دھوکا کیا۔" وہ مونچھوں والے سے رک رک کر بولا۔

"دھوکا! کیسا دھوکا؟" مونچھوں والا بولا جسے شاہنواز نے عادل کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ دھوکا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ تم نے... آخر تم نے مجھے آواز دے کر کیوں بلایا؟" شاہنواز نے کہا۔

"اس لیے کہ انھیں تم سے ملنا تھا۔ اس میں دھوکا کیا ہوا؟" عادل نے حیران ہو کر کہا۔

"تمھیں معلوم ہے یہ کون ہے؟" شاہنواز نے عجیب سے لہجے میں کہا اور چور نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں معلوم ہے۔" عادل نے جواب دیا۔ "یہ سی آئی ڈی انسپکٹر اللہ دتا ہے اور تیلی قبر پر رہتا ہے۔ کہو تو کچھ اور بتاؤں!"

"اور تمھیں یہ بھی پتا ہو گا کہ کل استاد نے مجھے اور کرامت کو ایک کام سپرد کیا تھا؟" شاہنواز معنی خیز انداز میں بولا۔

میں اب تک خاموش تماشائی بنا ہوا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ عادل اب شاہنواز کی بات کا جواب دے رہا تھا۔ "ہاں کچھ سنا تو تھا لیکن تفصیل نہیں معلوم۔"

"اِدھر آؤ، میں بتاؤں تمھیں۔" شاہنواز نے عادل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنے ساتھ ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔

عادل اپنی پھٹ پھٹ سے اترا، اسے اسٹینڈ پر کھڑا کیا، پھر شاہنواز کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، اس میں اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ شاہنواز انہی دو میں سے ایک تھا جنھوں نے گزشتہ رات مجھ سے فائل حاصل کی تھی اور پھر بے ہوش کر کے وہاں ڈال گئے تھے۔ شاہنواز کو یہ کام اس کے استاد نے سونپا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا استاد ہی وہ شخص تھا جسے وہ فائل چاہیے تھی۔ یہ سوچ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں کہ میں حقیقت کی تہ تک پہنچنے والا ہوں اور بہت جلد اصل مجرم میرے قابو میں ہو گا۔ کڑیاں آپ ہی آپ ملتی جا رہی تھیں، مسئلہ صرف اتنا رہ گیا تھا کہ شاہنواز اپنے استاد کا نام بتا دیتا اور میری نظر میں یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا۔ شاہنواز کو بہلا پھسلا کر اس کے استاد کا نام معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اس کا استاد یقیناً وہی ہو سکتا تھا جس نے کیٹی کو اغوا کر کے سر تھامسن کو دھمکی آمیز خط لکھا تھا اور جو کیٹی کے جسمانی اعضا کاٹ کاٹ کر سر تھامسن کو بھیج رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میری نگاہ عادل اور شاہنواز کی طرف اٹھ گئی۔ شاہنواز جلدی جلدی عادل سے کچھ کہہ رہا تھا اور عادل اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں میرے قریب آ کر رک گئے اور عادل نے مجھے مخاطب کیا۔ "اللہ دتا! میرا خیال ہے کہ تم احسان فراموش نہیں ہو گے۔"

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ میں واقعی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ میں نے ایک بار تمھاری جان بچائی تھی؟" عادل نے کہا۔

"کب؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یقین کرو، مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"

"کیا تم وہ رات بھول گئے جب لال کنویں کی ایک گلی میں تم پر کسی

نے حملہ کیا تھا؟" عادل معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں... ہاں مجھے یاد ہے مگر تم... تم یہ... یہ بات کس طرح... تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اس لیے اللہ دتا، کہ میں نے ہی تمھیں اُس حملہ آور سے بچایا تھا۔ میں نے اس کی طرف چاقو پھینکا تھا جو اُس کے پیر میں لگا تھا اور پھر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ تمھیں یاد ہو گا اللہ دتا، کہ میں نے تم سے پوچھا تھا، تم ٹھیک تو ہو؟ پھر میں حملہ آور کے تعاقب میں دوڑ پڑا تھا۔ کچھ یاد آیا تمھیں اللہ دتا؟"

"ہاں یاد آ گیا مجھے۔" میں بولا۔ "تو وہ تم تھے؟ مگر وہ کون تھا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟"

"افسوس کہ وہ تنگ و تاریک گلیوں میں مجھے جُل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا، پتا نہیں تمھارا دشمن کون تھا۔" عادل نے جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم وہ واقعہ بھولے نہیں۔"

"میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری جان بچائی۔" میں نے کہا۔

"اس میں شکر گزار ہونے کی کوئی بات نہیں اللہ دتا! یہ تو میرا فرض تھا۔ بُرے لوگوں کے بھی کچھ اصول ضرور ہوتے ہیں۔" عادل میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ پھر قدرے توقف سے کہا۔ "مجھے شاہنواز نے سب کچھ بتا دیا ہے مگر جو کچھ ہوا اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ عورت کا چکر ہی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مرد پانی بھرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر تم مجھے اپنا محسن سمجھتے ہو تو میری صرف ایک درخواست ہے کہ کسی طرح شاہنواز کو اس معاملے سے بچا لو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ تمھارے لیے کوئی مشکل بات بہرحال نہیں ہے اللہ دتا!"

پتا نہیں عادل کیا اُڑنگ بڑنگ اُڑا رہا تھا۔ میں تو صرف اتنا سمجھ سکا کہ وہ کسی طرح اپنے دوست شاہنواز کو بچانا چاہتا ہے، سی آئی ڈی والوں کے چکر سے!

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بولا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمھیں گھسیٹا دے دوں کہ شاہنواز نے جو کچھ کیا، استاد کے کہنے پر کیا مگر اب سوچا، تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ اسی صورت میں تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔ پھر یہ بھی کہ بات اگر استاد تک پہنچ گئی تو اور بھی لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ استاد کا نام آنے کے بعد تم لوگ ان سے پوچھ گچھ کرتے اور بات مزید بگڑتی۔ یوں بھی استاد اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے آدمیوں میں سے کوئی بغیر انھیں کسی قسم کی اطلاع دیے کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔"

عادل کی بات سن کر میرا ذہن اور الجھ گیا۔ پہلے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ شاہنواز نے اپنے استاد کے ایما پر سب کچھ کیا تھا اور اسی کو وہ فائل بھی پہنچائی ہو گی لیکن اب عادل کی باتوں سے کچھ اور ہی پتا چل رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر زبان کھولی اور عادل سے مخاطب ہوا۔ "تم نے اب تک جو کچھ کہا ہے، اس کا بہت کم حصہ میرے پلے پڑا ہے۔ میں اب تک صرف اتنا سمجھ پایا ہوں کہ تم اپنے دوست کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتے ہو مگر میں تمھیں صاف صاف بتا دوں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر میں بھی چاہوں تو ممکن نہیں۔"

"کیوں؟" عادل نے کہا۔ "تم اپنے افسران پر یہ ظاہر ہی نہ کرو کہ اس سلسلے میں تمھیں شاہنواز پر شک ہے۔ اوّل تو یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ تم لوگوں کو پتا کیسے چلا، شاہنواز اس معاملے میں ملوث ہے!"

"خفیہ والے بڑے پہنچے ہوئے ہوتے ہیں پیارے!" میں نے اس کی پریشانی اور الجھن سے لطف لیتے ہوئے ڈینگ ماری۔ "ہم لوگ اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہیں۔ کیا سمجھتے ہو تم لوگ ہمیں!"

"ہاں، بات واقعی حیرت کی ہے، رات کو وہ معاملہ ہوا اور صبح ہوتے ہی تم لوگ پہنچ گئے۔" عادل نے ستائش آمیز لہجے میں کہا۔

"کل رات بس اچانک کیوں کر وہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا تھا، اس لیے وقتی طور پر اپنے حواس گنوا بیٹھا تھا ورنہ دو چار آدمیوں کو تو میں کچھ سمجھتا ہی نہیں۔" میں نے گزشتہ رات کی خفت مٹانے کے لیے کہا۔ پھر مجھے ایک بات اور سوجھ گئی۔ میں بولا۔ "کیوں کہ اس وقت میں بے بس تھا، اس لیے کچھ نہیں کر سکا لیکن ایک کام کر دکھا ہی گیا۔" یہ کہہ کر میں نے شاہنواز کی طرف دیکھا اور مسکرایا، پھر اسے مخاطب کیا۔ "تمھاری جیب میں کوئی چھوٹی سی ڈائری بھی رہتی ہے؟"

"ہاں... ہاں رہتی... رہتی تو ہے۔" یہ کہہ کر شاہنواز نے اپنی جیب ٹٹولی۔

"اسے نہ ڈھونڈو پیارے، وہ تمھیں نہیں ملے گی۔ وہ سی آئی ڈی آفس میں ڈی آئی جی صاحب کے پاس ہے۔" میں نے اسے "حیران پریشان" کرنے کے لیے کہا۔

"کیا؟" اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"یہ ڈائری میں نے اس وقت تمھاری جیب سے پار کی تھی پیارے جب تم نے مجھے دبوچا تھا۔"

"کمال... کمال ہے! مجھے... مجھے ذرا سی بھی... مجھے ذرا خبر نہ ہوئی۔"

"خبر ہو جاتی تو پھر تم اسے کمال کیسے سمجھتے!" میں نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

"خیر جو ہوا، وہ ہوا۔ اب معاملے کی بات کرو۔ یہ بتاؤ اللہ دتا کہ تم شاہنواز کی جان چھڑا سکتے ہو یا نہیں؟" عادل نے مداخلت کی۔

"یہ ممکن نہیں۔" میں نے صاف صاف جواب دیا۔ "اس لیے کہ بات مجھ تک محدود نہیں رہی، اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ ہمارے ڈی آئی جی صاحب بھی اس بات سے واقف ہو چکے ہیں کہ اس معاملے میں شاہنواز بھی ملوث ہے۔"

"پھر تو بس ایک صورت رہ جاتی ہے۔" عادل یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگا، پھر چند لمحے بعد بولا۔ "وہ صورت یہ ہے کہ شاہنواز روپوش ہو جائے۔"

"لیکن میں تو پھنس جاؤں گا۔" مجھے معاً شاہنواز کی حسین بیوی کا خیال آ گیا جو مجھے دھوکا دے کر فرار ہو گئی تھی لیکن ظاہر ہے کہ شاہنواز اپنی مرضی سے اسے کس طرح میرے حوالے کر سکتا تھا۔

"کیوں، تم کیسے پھنس جاؤ گے؟" عادل نے کہا، پھر بولا۔ "تم اپنے افسران سے کہہ سکتے ہو کہ شاہنواز کی تلاش میں گئے تھے مگر وہ ہاتھ نہیں لگا۔"

"مجھے یہ کہنے میں تو کوئی عار نہیں مگر اصل معاملہ تو اور ہے جو قابلِ غور ہے پیارے!" میں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا اور پھر شاہنواز کی حسین بیوی کے حوالات سے فرار ہونے کی رام کہانی بیان کر دی۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ "اب بتاؤ، میں ڈی آئی جی صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ میری تو نوکری تیل ہو جائے گی!"

میری بات کا جواب دینے کی بجائے عادل، اپنے دوست شاہنواز سے مخاطب ہوا۔ "دیکھا تم نے کتنی چلتا پرزہ ہے وہ! تم میں ہے اتنی ہمت اور چالاکی کہ حوالات سے اس طرح بھاگ آؤ!"

"مگر اماں نے بتایا تھا کہ وہ لوٹی تو نہیں۔" شاہنواز بولا۔ "پھر میں بھی کوئی آدھ گھنٹے سے گھر میں ہوں۔"

"سیدھی سی بات ہے پیارے، وہ اپنے اصل عاشقوں کے پاس گئی ہو گی، یہاں کیوں آتی! یہاں آ کر کیا اسے پھنسنا ہے! اس نے اپنا پھندا تمھاری گردن میں ڈال دیا اور ہوا ہو گئی۔" عادل نے کہا۔

مجھے عادل کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ وہ اپنے دوست کی بیوی کے بارے میں خود دوست کے منہ پر ایسی بات کہہ رہا تھا۔ مزید حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ شاہنواز نے اس کی بات کا برا نہیں مانا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا سر جھک گیا تھا اور اس کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔

"میرا خیال ہے شاہنواز، کہ اللہ دتا کو سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہیے۔ اس طرح کم از کم اللہ دتا کی نظر ہی میں سہی، بے قصور تو ثابت ہو جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟" عادل بولا۔

شاہنواز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی۔

"سنو اللہ دتا!" عادل نے مجھے مخاطب کیا۔ "وہ اب سے کوئی تین مہینے پہلے شاہنواز سے ٹکرائی تھی۔ پتا نہیں اس کا اصل نام کیا ہے مگر اس نے شاہنواز کو اپنا نام سیتا ہی بتایا تھا اور کہا تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں، وہ بے سہارا ہے۔ اس احمق پر اس کے حسن کا جادو چل گیا اور پھر اس نے جو بھی پٹی اسے پڑھائی، یہ اس پر عمل کرتا رہا۔ سیتا نے اس سے کہا کہ یہ محلے اور عزیز رشتے داروں میں مشہور کر دے کہ اس نے سیتا سے شادی کر لی ہے۔ اس طرح کوئی بھی شخص، شاہنواز کے گھر میں اس کے رہنے پر اعتراض نہیں کر سکے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اسے یہاں سب جمیلہ کے نام سے جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ شاہنواز کی بیوی ہے۔ شاہنواز نے اور سب کو تو یہی بتایا مگر مجھے اصل حالات سے مطلع کر دیا کیوں کہ یہ میرے بچپن کا دوست ہے اور ہمارے سینے ایک دوسرے کے رازوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اس سے جتنی جلد ہو سکے جان چھڑا لے مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔ اس حرافہ نے ایک بار میرے اور اس کے درمیان اختلاف بھی پیدا کرانا چاہا مگر ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن تھا۔ مجھے شاہنواز ہی سے پتا چلا کہ پچھلے کچھ دنوں سے سیتا اکثر راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگی ہے اور اس بات پر شاہنواز کی ماں کو بھی سخت اعتراض ہے۔ شاہنواز نے میرے کہنے پر اس سے سختی سے پوچھ گچھ کی مگر سیتا کچھ نہ قبول کر دی۔ اس نے الٹی شاہنواز کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے زیادہ پہرے بٹھائے تو وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی اور اس طرح اس کی عزت خاک میں ملا دے گی۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہی سمجھتے کہ شاہنواز کی بیوی بھاگ گئی۔ کسی کو کیا خبر کہ وہ صرف داشتہ ہے، بیوی نہیں ہے۔ شاہنواز کو مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ یوں سمجھو کہ اس نے ایک طرح سے شاہنواز کو اپنے پھندے میں کس لیا تھا جس سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ابھی اس نے مجھے ایک اور عجیب بات بتائی۔ پرسوں سیتا رات گئے گھر لوٹی اور اس نے شاہنواز کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ اس نے کہا کہ شاہنواز ایک اور شخص کے لیے بھی کام کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔ سیتا نے لاکھ پوچھنے کے باوجود اس شخص کا نام ظاہر نہیں کیا۔ دو ہزار روپے بہت بڑی رقم ہے۔ وہ بھی صرف اتنے سے کام کی کہ ایک شخص سے فائل چھین کر سیتا کو دے دی جائے۔ کل رات جو کچھ ہوا، سیتا کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ہوا۔ شاہنواز نے احتیاطاً اپنے ساتھ شبیر کو بھی لے لیا۔ شبیر کو اس نے دو سو روپے دیے تھے اور اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کس کے اشارے پر وہ ایسا کر رہا ہے۔ شبیر کے لیے ایک ذرا سے کام کی دو سو روپے اجرت بہت تھی اسی لیے وہ راضی ہو گیا۔ اس کے بعد تو تمھیں معلوم ہی ہے، کیا ہوا۔ تم سے وہ فائل

حاصل کرنے کے بعد شاہنواز نے سیتا کے حوالے کر دی اور کل رات ہی کوئی اجنبی، وہ فائل سیتا سے لے گیا۔ شاہنواز نے بھی اسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی انگریز تھا۔ پتا نہیں سیتا کے اور اس کے درمیان کیا تعلق تھا اور وہ کیسے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ پھر آج صبح جب یہ استاد کے اڈے پر گیا ہوا تھا تو کوئی شخص، سیتا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اب پتا چلا کہ وہ تمھارے محکمے کا آدمی تھا۔ شاہنواز ابھی آدھے پون گھنٹے پہلے گھر لوٹا تو اسے اپنی ماں سے اس بات کا علم ہوا مگر وہ زیادہ فکرمند اس لیے نہیں ہوا کہ پچھلے ایک ماہ سے بہت سے اجنبی یہاں سیتا سے ملنے آنے لگے تھے جن کے بارے میں سیتا، پوچھنے کے باوجود بھی شاہنواز کو کچھ نہیں بتاتی تھی۔ تو یہ ہے سارا معاملہ!" عادل خاموش ہو گیا۔

عادل نے سیتا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل کام نہیں تھا کہ وہ بڑی پراسرار شخصیت کی مالک تھی اور اس کا تعلق براہِ راست مجرموں سے تھا۔ شاہنواز کو اس نے محض اپنی آڑ بنایا ہوا تھا لیکن وہ شاہنواز کے پاس کیوں رہتی تھی، یہ سوال بہرحال تشنۂ جواب تھا۔ مجرموں نے بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے سیتا کے ذریعے شاہنواز کو اپنا آلۂ کار بنایا تھا تاکہ اگر وہ پکڑا بھی جائے اور فائل نہ مل سکے تو مجرم روشنی میں نہ آ سکیں۔ اتنی تمام باتیں معلوم ہو جانے کے باوجود میرا مسئلہ اپنی جگہ تھا۔ میں آخر تیواڑی جی سے کیا کہتا؟ یہی سوال میں نے عادل سے کیا۔

"اب تمھی کہو کیا کیا جائے؟" عادل نے کہا۔ "میرا تو اندازہ یہ ہے کہ اب وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔" پھر قدرے رک کر بولا۔ "ویسے اگر تم اپنا اطمینان کرنا چاہو تو گھر کی تلاشی لے لو۔ گھر میں سوائے شاہنواز کی ماں کے اور کوئی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ شاہنواز کی طرف تصدیق طلب انداز میں دیکھنے لگا۔

شاہنواز نے بھی اس کی تائید میں کہا۔ "مجھے تلاشی دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اماں سے میں برقع اوڑھنے کے لیے کہہ دوں گا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں بولا۔ "مجھے تمھاری بات پر یقین ہے۔" پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے شاہنواز کو مخاطب کیا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہی ساری باتیں ڈی آئی جی صاحب کے سامنے دہرا دو؟"

میرے سوال کے جواب میں شاہنواز کی بجائے عادل بولا۔ "اور اگر انھوں نے اسے اندر کر دیا تو؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔" میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے اسے تسلی دی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر سیتا کی بجائے شاہنواز کو تیواڑی جی کے سامنے پیش کر دیا تو کچھ آنسو پونچھ جائیں گے۔ سیتا کو تو بہرحال شاہنواز کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کے لیے پکڑا گیا تھا۔ اصل میں تو تیواڑی جی کو شاہنواز کی تلاش تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی۔ اس طرح میں بہت آسانی کے ساتھ اپنی نااہلی چھپا سکتا تھا لیکن پہلا مسئلہ تو شاہنواز کو ہموار کرنے کا تھا۔

میری کامیابی دراصل یقین دہانی پر آخر عادل نے بات مان ہی لی اور شاہنواز سے کہا۔ "یوں تو دوسرا راستہ بھی موجود ہے، یعنی روپوش ہونے کا، مگر بہتر یہی ہے کہ روپوش ہو کر خود کو سی آئی ڈی کے افسران کی نظر میں مزید مشتبہ نہ کیا جائے اور انھیں اصل بات بتا دی جائے۔ پھر جو ہو، سو ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اللہ دتا کی بات مان ہی لو۔"

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے، مانے لیتا ہوں۔" شاہنواز مردہ سے لہجے میں بولا۔

"ایک بات میری اور مان لو!" میں نے جلدی سے کہا۔ "اس طرح میری پوزیشن صاف ہو جائے گی۔" پھر میں نے جو کچھ سوچا تھا، اسے بتا دیا۔

"بہتر ہے، میں یہی کہہ دوں گا۔" شاہنواز نے جواب میں کہا۔

کچھ دیر بعد ہی میں شاہنواز کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھائے ہوئے کشمیری گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے وہاں سے روانگی میں بہت تیزی دکھائی تھی، یہ سوچ کر کہ کہیں شاہنواز اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ راستے میں مجھے عادل کا خیال آیا جو در پہ ہی سے رخصت ہو گیا تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ وہ میرے پیچھے کیوں لگا تھا؟ اس نے میری جان کیوں بچائی تھی اور پھر اسے اپنا فرض کیوں کہا تھا؟ میں شاہنواز کے چکر میں پڑ کر اسے بھول ہی گیا تھا۔ خود وہ بھی تو میرے لیے ایک معمے سے کم نہیں تھا لیکن ظاہر ہے، اب کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جا چکا تھا اور اس کے نام کے سوا مجھے کچھ بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔

دفتر پہنچ کر میں نے سوچا کہ شاہنواز کو حوالات میں بند کر کے تیواڑی جی کو اس کے بارے میں بتانے جاؤں یا پھر اسے انھی کے کمرے میں لے جاؤں؟ تیواڑی جی کب اور کس بات پر اپنی مونچھوں کو اینٹھنا شروع کرنے لگیں، اس سلسلے میں مجھے کچھ خبر تو تھی نہیں، یہ سوچ کر میں نے یہی غنیمت جانا کہ شاہنواز کو فی الحال حوالات ہی میں بند کر دوں۔

حوالات کی طرف جاتے ہوئے میں نے اسے تسلی دی۔ "شاہنواز! میں وقتی طور پر تمھیں حوالات میں بند کر رہا ہوں تاکہ ڈی آئی جی صاحب سے مل کر تمھارے بارے میں بات کر سکوں۔ تم گھبرانا مت اور یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ میں یہاں آ کر اپنے وعدے سے پھر گیا ہوں، سمجھ گئے!" یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ حوالات کے نام پر اس کے چہرے کا رنگ اتر گیا تھا۔

"اب تو آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔" اس نے بجھے ہوئے سے لہجے میں کہا۔ "آپ جو کریں گے، ٹھیک ہی کریں گے، میرے حق میں!"

تین نمبر حوالات کی چابی میری جیب میں تھی جہاں وہ دھوکے باز بند تھی۔ میں نے شاہنواز کو اس میں بند کر کے باہر سے تالا لگایا اور ایک بار پھر اسے تسلی دے کر وہاں سے چل دیا۔

کچھ دیر بعد جب میں ڈی آئی جی تیواڑی جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔ "تم کہاں غارت ہو گئے تھے؟ سارے دفتر میں دکھوا لیا، تمھارا کہیں پتا نہیں تھا۔ ڈائریکٹر صاحب دو بار تمھیں طلب کر چکے ہیں۔ تم فوراً وہاں پہنچو اور پھر فوراً مجھ سے ملو اور آکر بتاؤ وہ عورت، حوالات سے کہاں غائب ہو گئی؟"

"وہی تو میں بتانے آیا ہوں سر! میں اصل مجرم..."

"بعد میں... بعد میں آکر کچھ بتانا، پہلے ڈائریکٹر صاحب سے فوراً جاکر ملو۔" تیواڑی جی میری بات کاٹ کر بولے۔

میں الٹے قدموں لوٹ گیا۔ پتا نہیں سر تھامسن مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔ اس بڈھے کم بخت نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ میں نے دل میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف جانے لگا جہاں سر تھامسن کا دفتر تھا۔ میں وہاں پہنچا تو کمرے کے سامنے چچا بندو خاں، یعنی میرے ہونے والے خسر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ جلدی سے بولے۔ "ارے تم کہاں تھے؟ صاحب دو بار مجھے بھیج چکے ہیں تمھیں بلانے کے لیے! میں تمھیں ہر جگہ تلاش کر آیا مگر تم کہیں ملے ہی نہیں۔"

پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے سر تھامسن کے کمرے میں داخل ہو گئے اور پھر اسی تیزی سے لوٹ کر بولے۔ "جاؤ صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

میں کمرے میں گھسا تو سر تھامسن دروازے کے قریب ہی ٹہلتے ہوئے نظر آگئے۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ رکے اور مجھے مخاطب کیا۔ "اے ڈی! تمھیں خود مجھ سے ملنا چاہیے تھا۔" وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔

"یس سر!" میں نے فرماں برداری کا اظہار کیا، پھر بولا۔ "مگر سر، میں مجرموں کا سراغ لگانے گیا ہوا تھا۔"

میری بات سن کر سر تھامسن چونکے، پھر اپنی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "کیسا سراغ؟"

"میں اس شخص کی تلاش میں گیا تھا جس نے کل مجھ سے وہ فائل چھینی تھی۔" میں نے بتایا۔

"ہاں مجھے تیواڑی جی نے بتایا تھا کہ اسے ایک ڈائری ملی تھی۔" صاحب بہادر اپنی کرسی پر براجمان ہو کر بولے۔ "تم بھی بیٹھو!" انھوں نے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اسی وقت میری نگاہ اس ڈبے پر پڑی جو سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ یہ بالکل ویسا ہی ڈبا تھا جس میں پہلے مجرموں نے سر تھامسن کی جورو کی کٹی ہوئی انگلی بھیجی تھی۔ یہ سوچ کر میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے کی تیاری کرنے لگے کہ کہیں اس ڈبے میں مجرموں نے کیٹی کے جسم کا کوئی اور پارٹ نہ بھیجا ہو۔ میری نگاہ اس ڈبے سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ سر تھامسن نے بھی شاید اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔

"اس پر بعد میں بات ہوگی۔" سر تھامسن بولے۔ "پہلے تم بتاؤ کہ کیا سراغ لگایا؟ تیواڑی نے کہا تھا کہ مجرم، یعنی وہ شخص ہاتھ نہیں لگا جس کی ڈائری اسے تمھارے بے ہوش جسم کے پاس ملی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس شخص کی بیوی سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ اب تم بتاؤ کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا سر! آپ کے خادم کی موجودگی میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ مجرم ہاتھ نہ لگے۔" میں نے ڈینگ مارنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

"تو تم اسے پکڑ لائے؟" سر تھامسن پُرجوش لہجے میں بولے۔ "اگر تم پکڑ لائے ہو تو پھر اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"معلوم کرنا کیا سر، معلوم کیا جا چکا ہے۔" میں سینہ تان کر بولا۔ "کوئی اور ہوتا میری جگہ تو اس کی زبان نہ کھلوا سکتا۔"

"تو پھر جلدی بتاؤ کہ اس نے کیا بتایا؟" سر تھامسن بے چین سے نظر آنے لگے۔

میں نے جواب میں سر تھامسن کو سیتا کی پوری کہانی سنا دی۔

"وہی، بالکل وہی اور وہی طریقہ، وہی انداز... یہ... یہ وہی ہو سکتی ہے۔" سر تھامسن پُرجوش انداز میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑائے جا رہے تھے اور میں انھیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ "وہ میک اپ کی ماہر ہے، یقیناً میک اپ میں ہوگی... اور وہ... وہ دنیا کی بہت سی زبانیں بڑی روانی سے بول سکتی ہے۔ ممکن ہے اسے ہندوستانی زبان پر بھی عبور ہو..." بڑبڑاتے ہوئے وہ ایک دم بے خیالی میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "وہ حوالات ہی میں ہے نا؟"

"جی ہاں سر!" میں ان کی بات کا مطلب سمجھے بغیر بولا۔

"تو پھر اٹھو، جلدی! میں اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہتا ہوں۔" سر تھامسن اپنی گھومنے والی آرام دہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، پھر بولے۔ "اگر یہ وہی ہوئی جیسا کہ مجھے یقین ہے تو ابھی پتا چل جائے گا۔ میں..."

"مگر سر!" میں نے سر تھامسن کی بات کاٹ دی کیوں کہ اب میں ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ "سر! حوالات میں شاہنواز ہے، سیتا نہیں۔"

"کیا؟" سر تھامسن تقریباً چیخ پڑے۔ "وہ کہاں گئی؟"

"سر! وہ تو وہیں شاہنواز کی خالہ کے گھر پل بنگش میں رہ گئی تھی۔" میں نے جلدی سے ڈرتے ڈرتے سفید جھوٹ بولا حالانکہ وہ حرافہ مجھے جُل دے کر حوالات سے فرار ہو گئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" سر تھامسن غرّائے اور دھم سے اپنی میز پر بیٹھ گئے۔ "وہ تو یہاں حوالات میں تھی۔ تیواڑی جی نے مجھے یہی بتایا تھا۔"

"سر آپ ٹھنڈے دل سے پہلے میری بات سن لیں۔" میں نرم لہجے میں بولا۔

"جلدی کہو!" سر تھامسن نے حکم دیا اور پھر اپنی دراز سے ایک موٹا سا سگار نکال کر جلانے لگے۔

"سر! ہوا یہ کہ اس عورت نے مجھے کافی دیر بعد اور خاصی پوچھ گچھ کے بعد یہ بتایا کہ ممکن ہے اس کا شوہر شاہنواز، اپنی خالہ کے گھر پل بنگش میں جا چھپا ہو۔ میں نے اس سے کہا کہ چل بتا اس خالہ کا گھر! پھر میں اسے اپنے ساتھ پل بنگش لے گیا۔ وہاں جب شاہنواز میرے ہاتھ آگیا تو میں اس عورت کو وہیں چھوڑ کر شاہنواز کو لے کر یہاں آگیا۔ آپ خود سوچیں سر! اس کی بیوی کو اسی لیے پکڑا گیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا اتا پتا بتا دے۔ جب اس کے شوہر کو پکڑ لیا گیا تو پھر اسے مزید زیرِ حراست رکھنے کا کیا جواز تھا۔ شاہنواز نے تو یہاں آکر اس کے بارے میں سب کچھ اگلا ہے کہ وہ اس کی بیوی نہیں تھی اور یہ کہ اس کا نام جمیلہ نہیں سیتا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہونے کے بعد تم فوراً اس کی تلاش میں کیوں نہیں گئے؟" سر تھامسن نے سوال کیا۔

"اور جاتا کب سر؟" میں نے کہا۔ "ابھی تو میں نے شاہنواز کا بیان لیا تھا، پھر تیواڑی جی سے ملا تھا تاکہ انھیں حالات سے آگاہ کر کے سیتا کی تلاش میں جاؤں۔ تیواڑی جی نے کہا کہ آپ نے مجھے فوراً طلب کیا ہے۔ میں اس لیے سیدھا ادھر چلا آیا۔ اب آپ کہتے ہیں تو میں پل بنگش جا کر اسے بھی پکڑ لاتا ہوں۔"

"وہ وہاں تمھارے ہی انتظار میں جو بیٹھی ہوگی کہ جا کر پکڑ لاؤ؟" سر تھامسن چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔ "اب تمھیں اس کی پرچھائیں بھی نہیں ملے گی۔ اگر وہ چوکنا ہو جائے تو پھر اس کا ہاتھ لگنا ناممکن ہوتا ہے۔"

سر تھامسن کی باتوں سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ سیتا کو جنم جنم سے جانتے ہوں مگر میری یہ ہمت نہ پڑی کہ ان سے پوچھ سکتا کہ وہ سیتا کو کیسے جانتے ہیں۔ اس بڑھاپے میں اتنی حسین عورتوں سے ان کی راہ و رسم کچھ سمجھ میں آنے والی بات بہرحال نہیں تھی۔

حوالات سے سیتا کے فرار پر پردہ ڈالنے اور اپنی نااہلی چھپانے کے لیے ہی میں نے یہ کہانی سوچی تھی کہ شاہنواز مجھے اپنی خالہ کے گھر پل بنگش میں ملا تھا اور وہاں مجھے سیتا لے گئی تھی۔ اپنے اس جھوٹ کی تصدیق کے لیے میں نے شاہنواز کو بھی سانٹ لیا تھا۔ میں نے اسی لیے اس قدر اطمینان کے ساتھ سر تھامسن کے سامنے جھوٹ بول دیا تھا۔

سر تھامسن اس وقت سگار کا کش لیتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور میں ہونق بنا ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ بالآخر میں نے خاموشی توڑی۔ "تو پھر سر، میں پل بنگش نہ جاؤں؟"

"نہیں، وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ وہ تمھیں وہاں تو کیا، کہیں نہیں ملے گی۔" سر تھامسن نے کہا، پھر بولے۔ "مجرموں کی طرف سے آج ایک تحفہ اور وصول ہوا ہے، تم بھی دیکھ لو۔" انھوں نے بائیں ہاتھ سے اس ڈبے کی طرف اشارہ کیا جو میز پر سامنے ہی رکھا ہوا تھا۔

"کک... کیا ہے سر!... اس ڈبے میں کیا ہے؟" میں ہکلا کر بولا کیوں کہ مجھے وہ ڈبا کھول کر دیکھتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔

"تم خود ہی دیکھ لو نا! اور وہ دھمکی آمیز خط بھی پڑھ لو جو انھوں نے اس بار لکھا ہے۔ خط بھی ڈبے ہی میں ہے۔" سر تھامسن بدستور سگار کا دھواں اڑاتے بلکہ دھواں چھوڑتے ہوئے بولے۔

کافی دیر اپنے دل کو سمجھانے کے بعد بھی میں وہ خوفناک ڈبا کھول کر نہ دیکھ سکا اور بات بدلنے کی خاطر سر تھامسن سے سوال کیا۔ "سر! ڈبا آیا کہاں سے؟"

"دس بارہ سال کا ایک لڑکا بندو خاں کو دے گیا تھا۔" سر تھامسن نے بتایا۔ "اس لڑکے کو ڈبا پہنچانے کے بدلے انھوں نے کچھ پیسے دے دیے ہوں گے۔"

"ہاں یہی بات ہو سکتی ہے۔" میں نے تائید میں کہا، پھر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "سر! وہ شاہنواز کے بارے میں کیا حکم ہے، اسے چھوڑ دیا جائے؟"

"اس کا بیان تو لکھ لیا نا تم نے؟" سر تھامسن نے کہا۔

"نہیں سر! ویسے مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے، لکھ لوں گا۔" میں بولا۔

"اور اس کی طرف سے بیان پر دستخط بھی کر دو گے!"

"ہاں ہاں، آپ کہہ رہے ہیں تو دستخط بھی کر دوں گا۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"شٹ اپ!" سر تھامسن نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "اس کا بیان لکھو، پھر اس بیان پر اسی کے دستخط لو، سمجھے!" پھر انھوں نے کہا۔ "بیان لے کر اسے چھوڑ دو اور اس کی نگرانی کراؤ۔ اس سے کہہ دو کہ وہ دہلی سے کہیں نہ جائے۔"

"بالکل سمجھ گیا سر! ابھی جا کر بیان لیتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا میں کرسی سے اٹھنے لگا۔

"ٹھہرو!" سر تھامسن نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تم سے ڈبا کھولنے کے لیے کہا تھا۔"

"سر! بات دراصل یہ ہے کہ میں... میں دل کا بہت کمزور ہوں۔ آپ... آپ ہی بتا دیں، اس میں مجرموں نے کیا تحفہ بھیجا ہے!" میں

ڈرتے ڈرتے بولا۔ میں نے لاکھ چاہا تھا کہ سر تھامسن کو باتوں میں لگا کر وہاں سے چلے لوں اور فائل کھول کر نہ دیکھنا پڑے مگر وہ بڈھا بڑا "کائیاں مالک" تھا۔ اس نے مجھے عین موقع پر پکڑ لیا تھا۔

"اور پھر مجرموں کا خط بھی میں ہی تمھیں پڑھ کر سناؤں؟" سر تھامسن کے لہجے میں چبھن تھی۔

"نہیں سر! وہ خط میں خود پڑھ لوں گا، آپ تکلیف نہ کریں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے پتا نہیں تھا کہ تم اتنے ڈرپوک ہو ورنہ تمھیں اس معاملے میں ڈالتا ہی نہیں۔" سر تھامسن منہ بنا کر بولے۔

کیا ہی اچھا ہوتا! میں نے اپنے دل میں کہا۔ کاش اے بڈھے تجھے پہلے عقل آگئی ہوتی۔

"سنو، اس بار انھوں نے کیٹی کا پورا ہاتھ کاٹ کر بھیج دیا ہے۔" سر تھامسن نے بتایا اور یہ سن کر مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ بھلا بتائیے ایسے خطرناک لوگوں کے پیچھے مجھے لگا رہے تھے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ دو ہی تو ہاتھ دیتا ہے، وہ بھی اس طرح کٹ کٹ جائیں تو ہو گئی شرارت۔ "سر تھامسن کہہ رہے تھے۔ "انھوں نے اپنی دانست میں مجھے بہ طور سزا یہ ہاتھ بھیجا ہے کیوں کہ میں نے ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا۔ مجھے اگر ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ وہ راستے ہی میں تم سے فائل چھین لیں گے اور یہ کہ خود سامنے نہیں آئیں گے تو میں یہ سارا بکھیڑا ہی نہ پھیلاتا۔ خیر، تو انھوں نے لکھا ہے کہ ان کا مطالبہ بدستور ہے اور وہ بہت جلد دوبارہ خط کے ذریعے رابطہ قائم کر کے بتائیں گے کہ اس بار کب اور کہاں انھیں وہ فائل چاہیے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس بار بھی ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا تو وہ کیٹی کا دایاں ہاتھ بھی کاٹ کر بھیج دیں گے۔" یہ کہہ کر سر تھامسن خاموش ہو گئے اور ایش ٹرے میں سگار کی راکھ جھاڑنے لگے۔

پتا نہیں اس بڈھے کے سینے میں دل کی جگہ پتھر تھا یا کیا اور کہ اس بیچارے پر اپنی بیوی کے ہاتھ کاٹے جانے پر کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ اسے فائل دے دلا کر ایک طرف کرتا، خواہ مخواہ وہ ضد پکڑ کر اپنی جورو کی جان کا لاگو ہو رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو کبھی کا معاملہ "مکا" چکا ہوتا۔ میں نے اس بڈھے کو سمجھانا اپنا فرض سمجھا۔ وہ جوش جذبات میں ناحق برف خانے کا چوکیدار بنا ہوا تھا۔

"سر! آپ کی ایک ہی جورو ہے اور اس کے دو ہی ہاتھ ہیں۔" میں نے کہا۔ "ذرا سوچیں سر کہ اگر خدانخواستہ ان خبیثوں نے واقعی دوسرا ہاتھ بھی آپ کو کاٹ کر بھیج دیا تو وہ بے چاری ہانڈی ہنڈیا سے بھی جائے گی۔ ہے معاف کیجیے گا میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ آپ کے گھر میں تو باورچی ہو گا۔ خیر روٹی ہنڈیا نہ سہی تو اور بہت سے دوسرے کام ایسے ہیں جو آدمی ہاتھوں سے انجام دیتا ہے۔ اگر ہاتھ ہی نہ ہے تو پھر کیا طعنہ دینا؟ کھانا بھی آپ کو خود اپنے ہاتھ سے کھلانا پڑے گا، اس کے علاوہ انھیں بیت الخلا۔۔۔" میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "تو سر! ان تمام باتوں کو۔۔۔"

"ان باتوں سے آخر تمھارا مطلب کیا ہے؟" سر تھامسن میری بات کاٹ کر مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

"مطلب یہ ہے سر کہ۔۔۔ کہ کچھ ٹھنڈے دل سے سوچیے اور غصہ تھوک دیجیے۔" میں نے کہا، پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ذرا بھاری آواز میں بولا۔ "آدمی کی زندگی، کسی فائل سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔"

"اگر قانون کے سارے محافظ تمھاری طرح سوچنے لگیں تو پھر لاقانونیت پھیل جائے۔ اپنی بکواس بند کرو! تم جا سکتے ہو۔" سر تھامسن ہاتھ اٹھا کر سخت لہجے میں بولے۔

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ موقع غنیمت تھا جسے میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"سنو، نگرانی چوبیس گھنٹے ہو گی، سمجھے کچھ؟" سر تھامسن نے کہا۔ "سمجھ بھی گئے کہ کس کی نگرانی کے لیے کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں سر، سمجھ گیا۔ آپ شاہنواز کی نگرانی کے لیے حکم دے رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔" سر تھامسن نے کہا۔ "اور سنو، نگرانی کرنے والوں کو سیتا کا حلیہ بتا دینا۔ اگر وہ شاہنواز سے ملنے آئے تو اس کا بھی تعاقب کیا جائے اور پتا چلایا جائے کہ وہ اب کہاں رہ رہی ہے۔"

"حکم کی تعمیل ہو گی سر!" میں نے سعادت مندی سے کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے سے نکلتے ہی چچا بندو خاں فکرمند لہجے میں بولے۔ "کیا بات تھی بیٹے؟ خیریت تو ہے؟ کیوں بلایا تھا صاحب نے؟"

"کوئی خاص بات نہیں چچا!" میں نے جواب دیا۔ "وہی دفتری کام ہیں اور کیا۔"

"مجھے تو فکر ہو گئی تھی بیٹے، کہ نہ معلوم کیا بات ہے!" چچا بندو خاں مطمئن لہجے میں ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولے، پھر جیسے انھیں کچھ یاد آگیا۔ انھوں نے کہا۔ "کل تم ردِ بلا کا وظیفہ پوچھ رہے تھے نا، وہ میں نے نانا جان کی کتاب میں دیکھ لیا ہے مگر نقل کر کے لانا یاد نہیں رہا۔ کل ضرور لے آؤں گا۔"

"ہاں یاد کر کے لے آئیے گا۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ کیا خبر کب پھر میری کم بختی مجھے پرانے قلعے یا کسی ایسی ہی اور جگہ گھیر کر لے جائے۔ کم از کم وظیفہ یاد ہو گا تو کچھ ہمت بندھی رہے گی اور کوئی بلا بھی قریب نہیں آئے گی۔ چچا بندو خاں ابھی مزید "گپ شپ لڑانے" کے موڈ میں تھے مگر میں نے ان سے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ مجھے ابھی فوراً تیواڑی جی کے پاس پہنچنا ہے اور اس میں جھوٹ بھی نہیں تھا۔

میں وہاں سے سیدھا تیواڑی جی کے پاس ہی پہنچا اور خلاف توقع وہاں کمار کو بیٹھے دیکھ کر کھٹکا۔ میں نے سوچا کہ وہ حرام خور یقیناً میری لگائی بجھائی کرنے آیا ہو گا۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا

اور میں جل گیا۔

"دانت بند کرو اپنے!" میں نے کمار کو ڈانٹا، پھر تیواڑی جی سے مخاطب ہوا۔ "سر! یہ ہر وقت دانت نکالتا رہتا ہے۔"

"تو کیا تمھاری طرح ہر وقت روتا رہے؟" تیواڑی جی خلاف توقع مسکرائے جس سے ان کی مونچھیں ہلنے لگیں مگر یہ مقامِ خوف نہیں تھا اس لیے میں قطعی نہ ڈرا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ تیواڑی جی کے کمرے میں کمار بھی تھا اور میں بھی۔ میں نے حالات سازگار دیکھ کر تیواڑی جی سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ "سر! کیا یہ ممکن نہیں کہ کمار کو کسی اور افسر کے ساتھ کر دیا جائے؟"

"مگر کس لیے؟ اس کی آخر ضرورت کیا ہے؟ پھر یہ کہ تمھیں کمار سے شکایت کیا ہے؟ تم نے ہمیشہ مجھ سے غلط شکایت کی ہے۔"

"آپ بھی ایسی باتیں کریں گے سر، تو یہ اور سر پر چڑھ جائے گا۔" میں نے فریادی لہجے میں کہا۔

"اچھا ان فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ ڈائرکٹر صاحب نے کیوں بلایا تھا تمھیں؟" تیواڑی جی بولے۔

"میں کمار کی یہاں موجودگی میں کچھ نہیں بتا سکتا سر!" میں نے صاف کہہ دیا۔ "ویسے بھی ان کا حکم ہے کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ وہ تو بس آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے اس لیے بتا دیتا ہوں۔"

"اچھا کمار! تم جاؤ۔ اس سلسلے میں سوچ کر کل بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔" تیواڑی جی کمار سے مخاطب ہوئے۔

کمار بڑی سعادت مندی سے سر ہلا کر کرسی سے اٹھ گیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا۔ "آپ کے سامنے یہ بڑا شریف بنا بیٹھا رہتا ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ جتنا اوپر ہے، اتنا ہی اندر ہے۔"

"ہو گا، تم کام کی بات کرو!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "ہاں پہلے یہ بتاؤ کہ وہ عورت کہاں گئی؟ میں نے تمھیں حوالات میں بھی دکھوایا تھا، پتا چلا نہ تم وہاں ہو، نہ وہ عورت!"

وہی کہانی میں نے تیواڑی کو بھی سنا دی جو سر تھامسن کو سنا چکا تھا۔

"اچھا تو تم اسے پکڑ لائے! بیان لیا اس کا؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

"جی سر!" میں نے کہا اور پھر بیان بھی لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔ وہی تمام باتیں جو خادل نے سیتا کے بارے میں بتائی تھیں۔

تیواڑی جی نے بھی سر تھامسن کی طرح مجھے آڑے ہاتھوں لینا چاہا مگر میں نے انھیں فوراً ہی ٹوک دیا کہ مجھے اس کے بعد اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی۔

"اب تو جا سکتے ہو تم وہاں! جا کر فوراً اسے تلاش کرو!" تیواڑی جی نے حکم دیا۔

"تو کیا اب وہ وہاں میرے انتظار میں بیٹھی ہو گی سر؟" میں نے سر تھامسن کا جملہ دہرا دیا۔

"کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، سمجھے!" تیواڑی جی نے نصیحت کی۔

"ویسے سر تھامسن۔۔۔ معاف کیجیے گا، ڈائرکٹر صاحب نے مجھے وقت ضائع کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس عورت کی تلاش وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔"

"تو تم نے انھیں سب کچھ بتا دیا! یہی تو ہے تم لوگوں میں خرابی! یہ نہیں کہ پہلے مجھے بتاتے۔ بس افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر بات براہِ راست بتا دیں گے۔ تم لوگوں کو تو موقع ملنا چاہیے کسی بڑے افسر سے قریب ہونے کا! کبھی یہ بات عقل میں نہیں بیٹھے گی کہ ہر کام درجہ بہ درجہ اچھا ہوتا ہے۔ تم مجھے بتاتے اور میں ڈائرکٹر صاحب کو یہ سب باتیں بتا دیتا تو کیا تمھاری ذات گھٹ جاتی!"

"میں تو بتا رہا تھا سر، مگر آپ ہی نے سن کے دیا کہ پہلے ڈائرکٹر صاحب سے مل آؤں، انھوں نے طلب کیا ہے۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"دیکھو بھائی! تو اصل قصور انھی کا ہے جو وہ ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے اور براہِ راست تمھیں بلواتے ہیں مگر انھیں کون یہ بات بتائے کہ چھوٹے لوگوں کو منہ لگانے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔" تیواڑی جی نہ معلوم کیوں بکے چلے جا رہے تھے۔

"اچھا میں جاؤں؟" میں نے مزید ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لیے اجازت چاہی۔

"دفع ہو جاؤ!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "مجھے تم سے نہیں پوچھنا کہ انھوں نے تمھیں کیوں بلایا تھا!"

میں وہاں سے کھسک لیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کاغذ قلم لیا، پھر حوالات میں پہنچ گیا۔ میں اگر چاہتا تو شاہنواز کا بیان اپنے کمرے میں بھی لے سکتا تھا مگر وہاں کمار تھا اس لیے ایسا نہیں کیا۔

مجھے حوالات کا دروازہ کھولتے دیکھ کر شاہنواز کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "مجھے رہائی تو مل جائے گی؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر تم دلی سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

"مجھے کیا پڑی ہے جناب! اور کہیں روزی بھی کہاں ہے۔ پھر یہ کہ دلی کی گلیاں کب چھوٹتی ہیں، مر کر ہی چھوٹیں تو چھوٹیں۔"

اور آج مجھے برسوں گزر جانے کے بعد شاہنواز کی بات یاد آتی ہے تو سوچتا ہوں کہ وہ اپنے قول کا کتنا سچا تھا۔ سن سینتالیس کے فسادات میں جب مار کاٹ ہو رہی تھی اور لوگ دلی چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، شاہنواز کا دل دلی سے نہیں اکھڑا تھا۔ پچھلے سال میں دلی گیا تھا تو وہ مجھے ملا تھا۔ وہ اب بھی دلی میں رہتا ہے۔ وہ اب بہت بوڑھا ہو گیا ہے مگر طنطنہ وہی ہے۔

میں نے شاہنواز کا بیان لیا' اس پر دستخط کرائے' پھر اُسے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے شاہنواز کی نگرانی کے لیے دانستہ کمار کو بھی رکھا تاکہ وہ صورت حرام اپنی صورت دکھا کر دن بھر مجھے ستاتا نہ رہے۔ کمار' پیارے لال' ہنر اور مجید کو میں نے شاہنواز کی نگرانی پر مقرر کیا تھا تاکہ دن رات نگرانی ہو سکے اور وہ لوگ ڈیوٹیاں بدلتے رہیں۔ کمار کے سپرد جان بوجھ کر میں نے رات کی ڈیوٹی کی تھی۔ وہ میرے اس ظلم پر مُنہ بنانے یا صدائے احتجاج بلند کرنے کی بجائے صرف مسکرا کے رہ گیا تھا اور میں نے دل میں کہا تھا' بیٹا رام! اگر نہ رگڑ کے رکھ دیا تو میرا نام اللہ دتا نہیں۔ تُو نے مجھے بڑے چرکے لگائے ہیں۔ کبھی بس موقع مل جائے پھر بتاؤں گا مگر موقع کم بخت تھا کہ ملتا ہی نہیں تھا۔

اسی دن سے شاہنواز کی نگرانی شروع ہو گئی۔ اس روز کافی عرصے کے بعد میں وقت پر گھر پہنچا تو امی کو حیرت ہوئی اور انھوں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی پوچھ لیا کہ رات کو تو نہیں جانا' میرا جواب سن کر اُن کے چہرے پر رونق آ گئی۔

اس رات میں ذرا جلدی ہی سو گیا۔

نہ جانے کب سے کوئی دروازے پر دستک دیے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کون اتنی رات گئے آیا تھا اور امی اٹھ کر دروازہ کیوں نہیں کھول رہیں' یہ سوچ کر میں اُٹھا' پھر جا کر دروازہ کھول دیا۔ ابھی میں پوچھ بھی نہ سکا تھا کہ کون ہے' میرے دائیں بائیں دو ریوالور کی نالیں آ لگیں' پھر مجھے دروازے کے سامنے ہی کھڑی ہوئی جیپ میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ ان دونوں میں سے ایک کا چہرہ دیکھ کر میں چونک پڑا۔ ان میں سے ایک میرا دشمن جاں رنجیت تھا۔ میں خاموشی سے گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اور شخص موجود تھا جس کا چہرہ میرے لیے نیا تھا۔

جیپ پر چڑھتے ہوئے مجھے موقع ملا تھا کہ میں رنجیت اور اس کے ساتھی سے بھڑ جاتا اور ان دونوں کی مینگ نکال دیتا کیوں کہ اس وقت انھوں نے ریوالور میری پسلیوں پر سے ہٹا لیے تھے مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ مجھے کیوں اور کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ میں مجرموں کے ٹھکانے سے واقف ہو جاتا۔

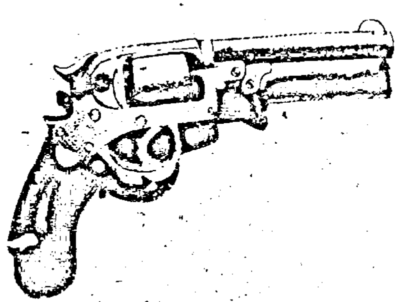
ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد جیپ ایک بڑے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ راستے کو میں نے نظر میں رکھا تھا۔ وہ نواب گنج کا علاقہ تھا۔ مجھے جیپ سے اتار کر وہ لوگ عمارت کے اندر لے گئے۔ عمارت کے اندر ایک بڑے سے ہال میں کئی افراد پہلے سے موجود تھے جو میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ انہی میں ایک غیر ملکی بھی تھا جو اُن سب کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ جس منظر کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں خود پر قابو نہ رکھ پایا' وہ یہ تھا کہ ہال کے ایک ستون سے حسین و جمیل سیتا بندھی ہوئی تھی اور ایک شخص اس پر چمڑے کا کوڑا برسا رہا تھا اور سیتا کے مُنہ سے چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ رنجیت اور اس کا ساتھی میرے دونوں بازو پکڑے بلکہ جکڑے ہوئے مجھے اس غیر ملکی کی طرف لے جا رہے تھے جو ہال کے ایک اسٹیج نما چبوترے پر کھڑا ہوا' ہال کے پورے منظر پر طائرانہ نظریں ڈال رہا تھا۔

میں نے ایک ہی جھٹکے میں رنجیت اور اس کے ساتھی سے اپنے بازو چھڑا لیے' پھر ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔ رنجیت میری لات کھا کر ایک طرف گرا اور اس کا ساتھی میرا گھونسا کھا کر اپنا جبڑا سہلاتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہال میں موجود غیر ملکی کو چھوڑ کر بقیہ تین افراد میری طرف جھپٹے مگر انھیں دیر ہو چکی تھی۔ میں کسی عقاب کی طرح اُڑتا ہوا اس دیو ہیکل پر جا پڑا تھا جو سیتا پر اب بھی کوڑے برسا رہا تھا۔ وہ میری طرف سے غافل تھا اس لیے اُسے زمین چاٹنے میں دیر نہیں لگی۔ میں نے اس کا کوڑا چھیننے میں انتہائی تیزی کا ثبوت دیا۔ اس دوران میں وہ تینوں میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں ایک دم اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور اسی کے ساتھ کوڑا لہرایا۔ اب میں ان تینوں کو کوڑے سے بُری طرح پیٹ رہا تھا اور وہ کوڑے سے بچنے کے لیے چیختے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ معاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی عقب سے مجھ پر حملہ کرنے والا ہے۔ میں نے تیزی سے وہ جگہ چھوڑ دی۔ دیو ہیکل شخص اپنے ہی زور میں مُنہ کے بَل زمین پر آ رہا۔ اس کے مُنہ سے بڑی دل دوز چیخ نکلی تھی۔ شاید اس کے چہرے کا بھرتا بن گیا تھا۔

"رنجیت! اسے گولی مار دو!" غیر ملکی نے انگریزی میں چیخ کر رنجیت کو حکم دیا۔ غالباً اس کے پاس ریوالور نہیں تھا ورنہ یہ نیک کام" خود انجام دے لیتا۔

رنجیت مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غیر ملکی کا حکم سنتے ہی میں نے رنجیت کے ریوالور کی نال کو اپنی طرف اٹھتے دیکھا۔





پھر اس سے پہلے کہ رنجیت کے ریوالور کی نال سے شعلہ نکلتا اور میرے جسم ناتواں کے کسی حصے میں کوئی روشن دان کھول دیتا' میں نے وہ جگہ چھوڑ دی۔ اسی لمحے سنسناتی ہوئی گولی میرے دائیں کان کے قریب سے گزری اور پھر ستون سے بندھی ہوئی سیتا کے جسم نازک میں پیوست ہو گئی۔ اگر مجھے وہ جگہ چھوڑنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو قارئین کرام' صد احترام یقیناً میری کتھا کہانی پڑھنے سے محروم رہ جاتے اور ظاہر ہے کہ محرومی کوئی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ دراصل ہر ہیرو کی زندگی میں یہی ایک لمحہ بے حد اہم اور قیمتی ہوتا ہے۔ اگر اسی ایک لمحے میں وہ غافل ہو جائے یا اسے کسی صورت غافل کر دیا جائے تو ہیرو کی بجائے چیز قتالہ کہلائے۔

ظاہر ہے کہ سیتا' گولی کھا کر خاموش نہیں رہی ہو گی کیوں کہ وہ کسی دوا کی گولی نہیں' ریوالور کی گولی تھی اور اسے مُنہ کے ذریعے نہیں کھایا گیا تھا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخی تھی مگر میں نے اس کی طرف قطعی توجہ نہیں دی تھی۔ جو گولی اس کے جسم میں اتر چکی تھی' وہ ظاہر ہے کہ میری توجہ سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔ اگر میں یہ غلطی کر بیٹھتا تو رنجیت کی چلائی ہوئی دوسری گولی میرا کام تمام کرنے میں قطعی تکلف سے کام نہ لیتی۔ دوسری گولی سے بچنے کی خاطر میں زمین پر گر گیا تھا اور گرتے ہی میں نے اس آدمی کی ٹانگ' ہاتھ بڑھا کر کھینچ لی تھی جو میری بائیں جانب کھڑا ہوا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک تھا جنھیں میں سارے ہال میں نچاتا پھر رہا تھا۔ میں اپنے مقصد میں سو فی صد کامیاب رہا۔ وہ شخص لہرا کر زمین پر آ رہا اور اپنے ساتھ ہی قریب کھڑے ہوئے رنجیت کو بھی اس نے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ شخص اور رنجیت دونوں ہی شاید اس ناگہانی کے لیے تیار نہیں تھے اسی لیے چپ چاپ "ڈھیں" ہو گئے تھے۔

اِدھر وہ دونوں زمین پر گرے اور اُدھر میں تیزی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں اب بھی چمڑے کا کوڑا تھا۔ اچھل کر کھڑے ہوتے ہی میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ رنجیت تیزی سے پلٹ کر میری طرف ریوالور تان رہا تھا۔ اسی لمحے میرا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ رنجیت کا وہ ہاتھ' دوسرے ہی لمحے کوڑے کی زد میں آ گیا جس سے وہ ریوالور تھامے ہوا تھا۔ کوڑا کسی کالے سانپ کی طرح رنجیت کے ہاتھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر زبردست جھٹکا دیا اور نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ رنجیت کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا۔

رنجیت کی بے بسی پر میرے مُنہ سے قہقہہ اُبل پڑا' پھر میں بولا۔ "اب بولو بیٹا رام! کیا حال ہیں؟"

"بیٹا رام" اپنے حال بتانے کی بجائے' کوڑے پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال کر کھڑا ہونے لگا۔ میں نے کوڑا اپنی طرف کھینچا اور پھر ایک دَم چھوڑ دیا۔ "چٹاخ" کی زبردست آواز سنائی دی۔ رنجیت کا سر پوری قوت کے ساتھ زمین سے ٹکرایا اور وہ کسی ذبح ہوتے بھینسے کی طرح ڈکرا کر ساکت ہو گیا۔ میری ساری توجہ کیوں کہ رنجیت کی طرف مبذول تھی اس لیے ہال میں موجود بقیہ افراد کی طرف سے چند لمحے کے لیے غافل ہو گیا تھا اور یہی چند لمحے میرے لیے خطرناک ثابت ہوئے۔ مجھ پر بہ یک وقت تین افراد نے حملہ کر دیا۔ ان کے پہلے حملے نے مجھے بوکھلا دیا کیوں کہ وہ اچانک کیا گیا تھا مگر کچھ دیر ہی میں میرے حواس بہ حال ہو گئے۔ پھر جو میں نے ان کی رگڑائی لگائی ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔ مارتے مارتے کم بختوں کی مینگ نکال دی میں نے! کوئی چکرا کر سر تھامے گرا' کوئی پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور کوئی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بلبلانے لگا۔

"اب ہاتھ اٹھا دو' کھیل ختم ہو چکا ہے۔" معاً میری سماعت سے اس غیر ملکی کی آواز ٹکرائی۔

میں نے چونک کر اپنی دائیں جانب دیکھا۔ وہ غیر ملکی مجھ سے کچھ فاصلے پر ریوالور تانے کھڑا ہوا تھا۔ یہ شاید وہی ریوالور تھا جو رنجیت کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ لڑائی جھگڑے میں مجھے اتنی مہلت ہی نہ مل سکی تھی کہ اس کی طرف توجہ دے سکتا۔ غیر ملکی نے موقع پا کر اسی ریوالور پر قبضہ کر لیا تھا۔

اگر کوئی ہیرو اس طرح اپنی شکست تسلیم کر لے تو اسے ہیرو کون کہے! میں بھی ہیرو تھا اس لیے کس طرح اپنی ہار مان لیتا! میں نے اپنے اور اس کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا جو زیادہ نہیں تھا۔ میں ایک ہی جست میں اس تک پہنچ سکتا تھا۔ ہر چند کہ یہ بہت خطرناک عمل ہوتا لیکن جب کوئی ہیرو میدان عمل میں کود پڑتا ہے تو خطرات کی پروا نہیں کرتا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی میری موت کا سبب بن سکتی تھی لیکن مجھے بہرحال یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ خطرہ مول لینے سے پہلے میں نے سوچا کیوں نہ پہلے اس غیر ملکی

کو باتوں میں لگاؤں اور پھر اس پر اچانک حملہ کروں۔ یہ سوچ کر میں نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا۔ "مائی ڈیئر! تمہارا نام نامی اسم گرامی کیا ہے؟ پہلے تھوڑا سا تعارف تو ہو جائے۔"

جواب میں اس نے مجھے دھمکی دی۔ "پہلے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو مائی ڈیئر! یہ لو۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنے جسم کو جست لگانے کے لیے تیار کیا۔

"اب تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکتے!" غیر ملکی کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔ "تم نے میرے کئی آدمیوں کو شدید زخمی کر دیا ہے۔"

"ابے کیوں تیری موت ڈنڈ بیل رئی اے!" میں روا داری میں اپنی مادری زبان بول گیا۔

"کیا؟" وہ اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر حیرت سے بولا۔ "تم کیا بکواس کر رہے..."

پھر اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ یہ چھلانگ میرے لیے موت کی چھلانگ بھی ثابت ہو سکتی تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی حیرت سے مجھے پورا فائدہ ہوا تھا۔ پھر یہ کہ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اتنا خطرناک قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔ بس اتنا ہوا کہ جب میں نے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال کر ریوالور کا رخ دوسری طرف کیا تو گولی چل گئی اور سیدھی اس قوی الجثہ شخص کی توند میں اتر گئی جو کچھ دیر قبل سیتا پر کوڑے برسا رہا تھا اور اب ہوش میں آ کر زمین سے اٹھ رہا تھا۔ وہ "اوغ" کر کے دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ غیر ملکی کی کلائی پر میرے ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔ اب میں اس کے سینے پر چڑھا ہوا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی کلائی جکڑے ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر تھا۔ میرے دونوں گھٹنے اس کے سینے پر تھے جن سے میں دباؤ ڈال رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ہی میں کوڑی بول گیا۔ میں اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسی کے ساتھ زبردست قہقہہ بلند کیا۔ میں نے میدان مار لیا تھا۔ ہال میں دو لاشیں پڑی تھیں اور دو افراد بے ہوش پڑے تھے، البتہ میرے رحم و کرم پر تھے۔

"اللہ دتا! اے اللہ دتا! ابے کیا ہوا تجھے؟" کوئی مجھے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگا۔ "ابے کیوں صبح ہی صبح قہقہے لگائے چلا جا رہا ہے!"

"اب میں تم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، نادانو! دیکھتے نہیں، میرے ہاتھ میں ریوالور ہے!" میں نے جھنجھوڑنے والے کو دھکا دیتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"تڑاخ" سے ایک طمانچہ میرے گال پر پڑا اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ نہ میرے سامنے اب وہ غیر ملکی تھا، نہ وہ جگہ اور نہ لاشیں۔ سب کچھ لمحے بھر میں غائب ہو گیا تھا۔ اب میرے سامنے بڑے بھیا کا خوفناک چہرہ تھا۔ وہ مجھے بڑے خطرناک انداز میں گھور رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔" یہ سوچ کر کہ میں نے خواب کی ترنگ میں آ کر بڑے بھیا کو دھکا دے دیا تھا میری طبیعت خراب ہونے لگی۔

"وہ... وہ بڑے بھیا! میں... میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے... مجھے معاف کر دیجیے۔" میں نے ہکلا کر اپنی صفائی پیش کی اور گال سہلانے لگا کیوں کہ طمانچہ بڑے زور کا پڑا تھا۔

انھیں میرے کھسیانے پن پر رحم آ گیا اور دو چار گالیاں بک کر میری جان بخشی کر دی۔

مجھے خواب کی ایک ایک بات تفصیل سے یاد تھی اور سوچ رہا تھا کیا زبردست منظر تھا! اگر خدانخواستہ سچ مچ کبھی مجرم مجھے اس طرح پکڑ کر لے جائیں تو میری بھجیا ہی بنا دیں۔

کچھ دیر بعد میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ابھی میں ٹیا محل سے جامع مسجد کی طرف مڑ ہی رہا تھا کہ اپنی پھٹ پھٹ کو بریک لگا دیے۔ مجھے عادل کی شکل نظر آ گئی تھی جو پنواڑی کی دکان پر کھڑا ہوا اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے میں آ رہا تھا۔

اس کے قریب ہی ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

میری پھٹ پھٹ رکتے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر ہاتھ ہلانے سے اس کا مقصد کیا تھا۔ وہ اب میری طرف سے بے نیاز ہو کر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ مجھے اس کے رویے نے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ میں نے اپنی پھٹ پھٹ آگے بڑھائی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت تک وہ اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے اس پر بیٹھ چکا تھا۔

"کیا بات ہے اللہ دتا! تم رک کیوں گئے؟" اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آج دفتر نہیں جانا؟"

"دفتر تو جانا ہے مگر تم..." میں اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"میری فکر چھوڑو، تم اپنا کام کرو اور میں اپنا!" یہ کہہ کر اس نے اپنی موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

پتا نہیں، کہاں کی ہانک رہا ہے! میں نے سوچا اور پھر اسی سمت چل دیا جدھر وہ گیا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کے بارے میں سوائے نام کے کچھ اور معلوم نہیں تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے بڑا تجسس تھا کہ آخر وہ کون ہے اور اس نے میری جان کیوں بچائی تھی؟ میں نے سوچا کہ آج وہ مل ہی گیا ہے تو اس سے پوچھ ہی لوں مگر وہ تو ایسا

اڑن چھو ہوا کہ کچھ پتا ہی نہ چلا۔ میں نے کچھ دیر ادھر ادھر چکر لگائے، پھر مایوس ہو کر اپنے دفتر کی راہ لی۔ راستے میں مجھے لیوسی کا خیال آیا۔ آج جلدی آنکھ کھل گئی تھی اور میں جلدی ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا، چلو اسے بھی دیکھتا چلوں کہ اب کس حال میں ہے۔ میں نے اپنی پھٹ پھٹ کا رخ بدل دیا۔

میں لیوسی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ آسمانی رنگ کی ساری باندھے بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ خوب صورت لڑکیاں اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں، یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "آج تو تم بڑی چمک چھلو لگ رہی ہو۔"

"تم نے آتے ہی یہ کیا بکواس شروع کر دی!" وہ تیوریاں چڑھا کر بولی۔

"لو اور سنو! ایک تو تعریف کر رہا ہوں تمھاری، تم ہو کہ بکواس بتا رہی ہو!"

"تعریف اسی طرح کرتے ہیں! اگر اسی کو تعریف کرنا کہتے ہیں تو تعریف کرنے کا یہ بہت واہیات انداز ہے۔"

"اچھا، ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ جا کہاں رہی ہو اس وقت؟" میں نے کہا۔

"دفتر جا رہی تھی، اچھا ہوا تم آ گئے مگر ابھی تو وقت ہے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں تمھارے لیے۔"

"ارے تو کیا تم ٹھیک ہو گئیں بالکل؟" میں حیرت سے بولا۔

"خیر ابھی بالکل ٹھیک تو نہیں ہوئی مگر گھر میں پڑے پڑے طبیعت اوب گئی ہے۔" لیوسی نے کہا۔ "دفتر آنے جانے سے کچھ جی ہی بہلے گا اور پھر وہاں تم سے بھی تو روز ملاقات ہو جایا کرے گی!" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے لیوسی نے بڑے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی اور بڑی بڑی حسین آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

پھر وہ میرے انکار کے باوجود چائے بنا کر لے ہی آئی جسے میں نے بہ مشکل زہر مار کیا کیوں کہ ابھی ابھی گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا۔

"میں نے تمھارے لیے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی ہے۔" اس نے اپنی پیالی سے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اس طرح یہ بات کہی جیسے میری سات پشتوں پر احسان عظیم کیا ہو۔

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کمرے میں ایک جوکر ٹائپ نوجوان داخل ہوا اور لیوسی کو مخاطب کر کے بولا۔ "کبھی ہمارے لیے بھی اپنے دست نازک سے چائے بنا دیا کرو۔ ہم بھی غیر نہیں ہیں۔"

"ڈکرز!" لیوسی تنک کر سخت لہجے میں بولی۔ "مجھے اس طرح کی بے ہودہ باتیں قطعی پسند نہیں ہیں۔ یوں بھی تمھیں دستک دے کر کمرے میں آنا چاہیے تھا۔"

"یہ گھر میرے لیے کسی غیر کا گھر نہیں جو میں یہ تکلفات مول لوں۔" وہ کارٹون نوجوان ڈھٹائی سے بولا۔ "اور اب تو وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب ان تمام تکلفات کے پردے ایک ساتھ اٹھ جائیں گے۔"

"وہ دن کبھی نہیں آئے گا، سمجھے!" لیوسی تقریباً چیخ کر بولی۔ "تم یہاں سے جا سکتے ہو!"

"اور اگر نہ جاؤں تو؟" نوجوان واقعی بڑا بے شرم تھا۔ اگر مجھے کوئی لڑکی اس طرح "پھٹکرے" مارتی تو وہاں ایک پل نہ ٹھہرتا۔

"تو پھر میں ہی چلی جاؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ "چلو اللہ دتا!"

"کیا بات ہو گئی بیٹی! کیوں چیخ رہی ہے؟" کہیں قریب ہی سے لیوسی کی ماں نے ہانک لگائی۔

"کچھ نہیں ممی! ذرا وکٹر کو تمیز سکھا رہی تھی۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "آپ نے اسے بہت سر پہ چڑھا لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

وہ نوجوان دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "آپ کی تعریف؟ پہلے آپ کو یہاں کبھی نہیں دیکھا!"

"ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، میں تو اس کا ایک حقیر بندہ ہوں پیارے بھائی!" میں نے انکساری سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ نوجوان مجھے دیکھتا رہ گیا۔ شاید اسے مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہیں ہوگی۔ وہ میرا جواب سن کر کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا بھی تھا مگر میں سمجھ نہیں سکا کہ اس نے کیا کہا تھا۔

پھر لیوسی میرے ساتھ گھر سے باہر آ گئی۔ وہ کارٹون نوجوان اندر ہی رہ گیا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے لیوسی سے پوچھا۔ "کیا وہ تمہارا کوئی عزیز تھا؟"

"ہاں میری خالہ کا لڑکا ہے، بدتمیز کہیں کا!" لیوسی نے بتایا۔ اس کا غصہ اب تک اترا نہیں تھا۔ "پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے!"

"وہ تمام پردے ایک ساتھ اٹھانے کی کیا بات کر رہا تھا؟ میں سمجھا نہیں۔" میں سب کچھ سمجھنے کے باوجود لیوسی کو چھیڑنے کی خاطر بولا۔

جواب میں اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں اس سے تفریح لے رہا ہوں۔ "بکو مت!" اس نے مجھے بھی ڈانٹ دیا۔

میں موٹر سائیکل پہ بیٹھ گیا اور جب لیوسی نے بھی پیچھے بیٹھ کر میری کمر میں ایک ہاتھ ڈال دیا تو بولا۔ "وہ تم پر لٹو معلوم ہوتا ہے۔"

"تم نے پھر اسی کا ذکر چھیڑ دیا!" لیوسی سخت لہجے میں بولی۔ "مجھے اس کے ذکر سے نفرت ہے۔"

"[illegible] تمہارے ذکر سے [illegible] ہوگی! اس کے انداز تو کچھ ایسے ہی تھے۔" میں نے پھٹ پھٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے تمہارا متوقع شوہر معلوم ہوتا ہے۔" میں نے آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

"میں اس کی صورت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"ویسے جوڑی کچھ ایسی بری بھی نہیں ہے۔" میں نے لیوسی کو مزید چڑانے کی خاطر کہا۔

"اللہ دتا!" وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "اگر تم یہی بکواس جاری رکھنا چاہتے ہو تو پھر مجھے یہیں اتار دو۔ میں تنہا دفتر چلی جاؤں گی۔"

"تو پھر صاف صاف بتا دو، کیا معاملہ ہے!" میں نے حقیقت حال جاننے کی غرض سے کہا۔

"ہوتا کیا، وہ میرے لیے ممی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ممی نے مجھ سے بھی ذکر کیا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا اور ممی نے اسے یہ بات بتا بھی دی مگر وہ اتنا بے حیا ہے کہ باز ہی نہیں آتا اپنی حرکتوں سے۔"

"ہوں۔" میں نے ہنکارا بھرا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تم اس سے اپنی جان چھڑانا چاہتی ہو نا؟"

"ظاہر ہے۔" لیوسی کے لہجے میں اب نرمی آ گئی۔ "وہ آوارہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

"اگر ایک آنکھ سے نہیں بھاتا تو دوسری آنکھ سے کوشش کرو، شاید بھانے لگے۔"

"تم پھر پٹری سے اترنے لگے اللہ دتا!" اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ "تمہیں اس طرح میرا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں۔"

"میں تو اپنا مفت مشورہ پیش کر رہا تھا، آگے تمہاری مرضی!" میں برا مان جانے والے انداز میں بولا۔ "گدھے کو دیا نون، گدھا کہے میری آنکھیں پھوڑیں!"

"یہ کیا بے تکی شروع کر دی!" لیوسی جھنجھلائی۔

"یہ بے تکی نہیں بلکہ ضرب المثل ہے اور تم جانو، ہر زبان کی جان اس کی ضرب الامثال ہی ہوتی ہیں۔" میں نے قابلیت بگھاری۔

"خیر، ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ پہلے تم کیا کہہ رہے تھے؟" لیوسی بولی۔

"ہاں یاد آیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اس چکر میں اصل مشورہ رہ ہی گیا۔ یہ بتاؤ ہٹلر تم سے چھوٹا ہے یا بڑا؟"

"ہٹلر نہیں، وکٹر!" لیوسی نے تصحیح کی۔

"چلو ایک ہی بات ہے۔" میں نے سر ہلا کر بولا۔ "ہٹلر نہ سہی وکٹر سہی یا ہٹلر سہی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یوں سمجھ لو کہ میری مراد تمہارے عاشق صادق سے ہے۔"

"وہ مجھ سے عمر میں ایک ڈیڑھ سال بڑا ہے۔" لیوسی نے بتایا۔

"پھر تو سمجھو کہ مسئلہ حل ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "تم اسے بھائی جان کہنا شروع کر دو! ہاں سنو، 'جان' پر زیادہ زور نہ دینا ورنہ وہ بدستور غلط فہمی میں مبتلا رہے گا بلکہ ایسا کرو، اس جان وان کا چکر ہی چھوڑو، سیدھے سیدھے بھائی صاحب کہہ دیا کرو۔ اپنے آپ وہ شرم سے پانی پانی ہو کر بہہ جائے گا۔"

"تم بھی خوب چیز ہو۔" لیوسی یہ کہہ کر ہنس پڑی۔ "ترکیب اچھی ہے، اگر اس بے غیرت پر اثر کر جائے۔"

میں نے چٹکی بجاتے لیوسی کا مسئلہ حل کر دیا تھا اور اب وہ خوش تھی۔ اب اس کا چڑچڑا پن ختم ہو گیا تھا اور بات بات پر ہنسنے لگی تھی۔ میری کمر کے گرد بھی اس کے ہاتھ کی گرفت اب پہلے کی بہ نسبت ذرا سخت ہو گئی تھی۔ میں نے یہ محسوس کر کے سوچا کہ وارننگ دے دوں مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کا موڈ پھر خراب ہو جائے گا۔

دفتر پہنچ کر لیوسی اور میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ تیواڑی جی سے ملنے چلی گئی اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میری پہلی نظر کمار کی منحوس شکل پر پڑی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے سے تھکن کا اظہار ہو رہا تھا مگر ہونٹوں پر وہی دل جلا دینے والی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ پھر میں نے خلاف توقع پیارے لال ہنر کو بھی وہاں دیکھا جب کہ اسے ڈیوٹی پر یعنی شاہنواز کی نگرانی پر متعین ہونا چاہیے تھا۔ کمار کے بارے میں تو خیر یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے شاید رپورٹ دینے آیا ہوگا۔ کوئی ایسی ہی خاص بات ہوگی کہ وہ گھر جا کر سونے کی بجائے دفتر آ گیا تھا مگر پیارے لال ہنر وہاں کیوں نظر آ رہا تھا؟

"کیوں جی، تم آج اپنی ڈیوٹی پر نہیں پہنچے؟" میں نے کمار کو مخاطب کرنے کی بجائے پیارے لال ہنر سے سوال کیا۔

"اے محترم المقام اب اس کی حاجت نہیں رہ گئی تو پھر یہ ہیچ مداں کاہے کو وقت کا زیاں کرتا!" پیارے لال ہنر نے اپنی مخصوص جناتی زبان میں جواب دیا۔

"سیدھی طرح بات کرو!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"اے حضور! خاکسار پہلے بھی عرض کر چکا ہے کہ اس سے 'کرخنداری' نہیں چلتی۔ کوئی اہل زبان بھلا اپنی زبان کیسے بگاڑ سکتا ہے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے قبلۂ محترم!" اس کا انداز احتجاج کا سا تھا۔

"اب تم اٹرنگ بٹرنگ تو لڑائے جا رہے ہو اور میری بات کا جواب نہیں دے رہے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہارے سپرد جو ڈیوٹی کی گئی تھی، اس پر کیوں نہیں پہنچے؟" میں نے سخت لہجے میں جواب طلب کیا۔

"غالباً حضور کے خادم نے اس سوال کا جواب گوش گزار کر دیا ہے۔" پیارے لال ہنر اپنا چشمہ اتار کر قمیص کے دامن سے صاف کرتا ہوا بولا۔

میں پیارے لال ہنر کی طرف سے مایوس ہو کر کمار پر برس پڑا۔ "تم کہو، تمہاری صورت کیوں نظر آ رہی ہے؟"

"یہ تو نظر بھی آئے گی سر!" کمار مسکرا کر بولا۔ "ابھی تو آپ جوان ہیں اور آپ کی آنکھوں کی بینائی درست ہونا چاہیے۔ ابھی آپ کو نظر آنا کس طرح بند ہو سکتا ہے!"

میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ تم گھر جا کر سونے کی بجائے یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یہ ہوئی نا بات سیدھی!" وہ میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "پہلے ہی ایسا کہا ہوتا۔"

"تو اب کہہ دیا!" میں نے جل کر کہا۔ "اب کچھ بکو گے بھی!"

"معاف کیجیے گا سر! میں بکتا نہیں فرماتا ہوں۔" وہ برا مان جانے والے انداز میں بولا۔

"تو پھر فرما بھی چکو ٹیسو کے پھول!" میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"پھر آپ نے ایک غلط بات کہہ دی۔ میں پھول پھل نہیں، آدمی ہوں، سمجھے آپ! آپ کی نظر جوان جہان ہونے کے باوجود واقعی کچھ کمزور ہو گئی ہے جو آدمی، پھول نظر آنے لگا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ فوراً سرمہ ممیرہ لگانا شروع کر دیں ورنہ بہت جلد اندھے ہو جائیں گے۔"

"اندھے ہو تم! میں کیوں اندھا ہونے لگا!" میں چڑ کر بولا۔ "گستاخی مجھے قطعی پسند نہیں، سمجھے! میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔ میں تمہارا افسر ہوں اور تم میرے ماتحت! تم میرے سوال کا جواب دینے کے پابند ہو!"

"کیا آپ نے مجھ سے کوئی سوال بھی کیا تھا، مجھے تو یاد نہیں پڑتا۔" کمار مجھے پوری طرح ستانے پر "اتارو" معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا تھا۔

سختی سے کام نہ چلا تو میں نے نرمی اختیار کی اور بولا۔ "دیکھو کمار! یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ صبح شام تم مجھ سے منہ ماری کرو۔ تمہیں بہرحال یہ خیال کرنا چاہیے کہ میں تمہارا افسر ہوں۔"

"اگر آپ یہ جملہ بڑے سے کاغذ پر لکھ کر اپنے گلے میں ہر وقت ڈالے رہیں کہ آپ میرے افسر ہیں تو مجھے یہ بات یاد رہے اور پھر میں کبھی آپ کی شان میں کوئی ایسی ویسی بات نہ کروں۔" کمار نے بھی نرم لہجے میں مسکراتے ہوئے بظاہر مجھے مخلصانہ

مشورہ دیا۔" دراصل سر، بچپن ہی سے میری یادداشت کچھ کمزور ہے، سارا جھگڑا اسی کا ہے۔"

"تو اب میں لکھ کر یہ عبارت اپنے گلے میں ہر وقت لٹکاؤں پھر تم سمجھو گے کہ میں تمھارا افسر ہوں، ہیں!" ضبط کا دامن پھر میرے ہاتھ سے چھوٹنے لگا۔

"مجبوری ہے سر!" وہ ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اور کوئی صورت فی الحال نظر نہیں آتی۔ اگر آئندہ اس سے بہتر کوئی ترکیب ذہن میں آئی تو بتا دوں گا۔"

"بتا دوں گا کا بچہ!" میں نے اس کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے زور سے میز پر ہاتھ مارا کیوں کہ اب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ "سیدھی طرح، شرافت کی زبان ہی نہیں سمجھتا!"

میرے چیخنے چلّانے اور میز پر ہاتھ مار کر ڈرانے کا اس کم بخت پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ خاموشی سے مسکراتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا: "آپ کی طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے سر! اس لیے میں اپنی رپورٹ براہِ راست ڈی آئی جی صاحب ہی کو دے دوں گا۔"

"ٹھہرو!" میں تقریباً چیختا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا۔ "تم سے کس نے کہا کہ میری طبیعت ناساز ہے؟"

"آپ ہی کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے سر!" وہ دروازے کے قریب پہنچ کر مڑتے ہوئے بولا۔ "کبھی آپ گلا پھاڑ کر ڈکرانے لگتے ہیں اور کبھی میز پر ہاتھ مارنے لگتے ہیں۔ یہ تمام کیفیات یہی ظاہر کرتی ہیں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں تمھیں بہ حیثیت افسر حکم دیتا ہوں کہ شرافت سے آ کر اپنی میز پر بیٹھ جاؤ اور مجھے رپورٹ دو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا، ہاں!" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"پہلے یہ وعدہ کریں کہ اب چیخ کر میز پر ہاتھ نہیں ماریں گے!" وہ بہ دستور مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم ایسی بات ہی کیوں کرتے ہو کہ اس کی نوبت پیش آئے۔" میں کسی قدر نرم پڑ گیا۔ "اچھا چلو، اب نہیں چیخوں گا اور میز پر بھی ہاتھ نہیں ماروں گا۔"

وہ مسکراتا ہوا، اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا، پھر بولا: "اچھا پہلے چائے پلوا لیجیے، رات بھر جاگنے کی وجہ سے نیند بہت آ رہی ہے۔ چائے پی کر ذرا غنودگی کم ہو تو بات کرنے کے قابل..."

"ہو گئے نخرے شروع!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا اور اسی کے ساتھ میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپراسی آ گیا تو میں نے اس سے ایک کپ چائے لانے کو کہا۔

چپراسی میرا حکم سُن کر واپس جانے لگا تو کمار نے اسے روک لیا۔ "ٹھہرو!" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دیکھیے سر، کچھ کھلاتے پلاتے رہا کریں۔ اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔ آخر آپ ہمارے افسر ہیں اور ہم آپ کے ماتحت! کچھ کھلاتے پلاتے رہیں گے تو دعا ہی دیں گے آپ کو!"

"تو چائے پلوا تو رہا ہوں تمھیں! اور کیا مجھے گھول کر پیو گے!" میں نے جز بز ہو کر کہا۔

"ایک چائے سے کیا بنے گا سر! پیارے لال جی اور کمال بھی تو ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ کوئی اچھا لگے گا کہ میں اکیلا چائے پیتا رہوں۔ یہ تو بڑی غیر اخلاقی بات ہوگی۔" کمار بولا۔

"یہ لوگ اپنے گھروں سے چائے پی کر آئے ہوں گے۔ تم خواہ مخواہ کیوں ان کے غم میں دبلے ہوئے جا رہے ہو۔ تم ابھی اپنے گھر نہیں گئے، بس تم پی لو۔" میں نے جل کر کہا۔

کمار بھلا کہاں باز آنے والا تھا، وہ تین کپ چائے منگوا کر ہی مانا۔ حالانکہ کمال اور پیارے لال ہنر نے منع بھی کیا مگر اس نے زبردستی انھیں چائے پلوا دی۔

"پی لیں حضرات! روز روز یہ موقع نصیب نہیں ہوتے۔" چائے آ گئی تو کمار نے چسکی لیتے ہوئے کمال اور پیارے لال ہنر سے کہا جو چائے پینے میں تکلف سے کام لے رہے تھے۔

کھا پی لو بیٹا راموؔ، حرام کا مال! سب ایک دن نکلوا لوں گا، میں نے دل ہی دل میں کہا، پھر کمار کو مخاطب کیا۔ "اب تو بتا دو، رات کو شاہنواز کی نگرانی کے دوران میں کیا خاص واقعہ پیش آیا کہ تم نے اپنی نیند بھی قربان کر دی اور یہاں رپورٹ دینے آ گئے؟"

"چائے تو سکون سے پی لینے دیں سر!" کمار بولا۔ "ابھی سب کچھ بتا دوں گا۔ میں بھلا میٹھا حرامی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا!"

"یہ میٹھا حرامی کیا ہوتی ہے؟" میں حیرت سے بولا کیوں کہ یہ ترکیب میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔

"اجی حضورِ انور! ہوئی کیا! بس زبان کے گلے پر چھری پھیری جا رہی ہے۔ غالباً برخوردار کمار سلمہٗ نے نمک حرامی کے تضاد میں یہ ترکیب اختراع کی ہے کیوں کہ چائے میں میٹھا ہوتا ہے مگر اس طرح زبان کے ساتھ سراسر ناانصافی

ہو رہی ہے۔" پیارے لال ہنر بلبلا اٹھا۔

"چائے میں تو دودھ بھی ہوتا ہے تو پھر اس طرح دودھ حرامی بھی ہو سکتا ہے اور پھر چائے کی پتی نے ہمارا کیا بگاڑا ہے جو اسے نظر انداز کر دیا جائے کیوں۔"

"بالکل بالکل سر!" کمار میری بات کاٹ کر بولا۔ "پتی بھی حرامی... میرا مطلب پتی حرامی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ نے انتہائی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ پیارے لال جی تو فرسودہ ذہن کے مالک ہیں، لکیر کے فقیر ہیں۔ زبان اسی طرح پھلتی پھولتی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ سے قطعی متفق ہوں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ کمار کسی سلسلے میں مجھ سے اتفاق کر رہا تھا ورنہ تو ہمیشہ نفاق ہی رہتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے مزید کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو کمار! تمھاری ترکیب پر پیارے لال ہنر کا اعتراض قطعاً غلط ہے۔" میرا انداز فیصلہ کُن تھا۔ اپنی بات کہتے ہوئے میں نے پیارے لال ہنر کی طرف بھی کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے پیٹ میں سخت مروڑ ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسے ہی آثار تھے۔

"توبہ توبہ زبان کی یہ ناقدری!" پیارے لال ہنر بہ آوازِ بلند بڑبڑایا، پھر میرے چہرے پر جلال کے آثار دیکھ کر سہم گیا۔

"کیا کہا تم نے؟ کیا میں اور کمار غلط کہہ رہے ہیں؟" میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"حضورِ انور افسر ہیں، سرکار کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں! خاکم بہ دہن، خاکسار کی یہ جرأت کہاں!" پیارے لال ہنر نے کہا۔

"دیکھیے سر، پیارے لال جی کیسی گندی گندی باتیں کر رہے ہیں!" کمار کا لہجہ شکایتی تھا۔

"ہاں میں بھی سُن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اس پر سخت ایکشن لوں۔" میں سخت لہجے میں بولا۔

"سرکار! خدا کے لیے اس بندۂ ناچیز کو غلط نہ سمجھیں۔ بندے نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اخلاق و تہذیب کے منافی ہو۔" پیارے لال ہنر نے صفائی پیش کی۔ "آپ دشمنوں کی لگائی بجھائی پر توجہ نہ فرمائیں۔"

"تو ہم دشمن ہو گئے!" کمار نے پیارے لال ہنر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب سنائے گا اپنا سہ غزلہ مجھے!"

"میں خود بد ذوقوں کو اپنا کلام سنانا پسند نہیں کرتا۔" پیارے لال ہنر منہ بنا کر بولا۔

"پتا ہے سر، خاکم بہ دہن کا مطلب کیا ہے، پیارے لال جی نے آپ سے کیا کہا ہے؟" کمار مجھ سے مخاطب ہوا، پھر میرے انکار میں سر ہلانے کے بعد بولا: "خاکم بہ دہن کا مطلب ہے تمھارے مُنہ میں خاک!"

"اچھا تو یہ کہا ہے انھوں نے!" میں واقعی خاکم بہ دہن کا مطلب سن کر غصے میں آ گیا۔ "یعنی میرے مُنہ میں خاک!"

"بالکل غلط، قطعی غلط!" پیارے لال ہنر احتجاجی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اس کا مطلب غلط بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب 'میرے مُنہ میں خاک' ہے۔"

"اچھا تو اگر یہی مطلب ہے تو کھاؤ اپنی اماں کی قسم!" میں نے سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کی خاطر فوراً ایک راہ نکال لی اس لیے کہ کوئی بھی اپنی ماں کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔

"حضورِ والا! قسم جھوٹے لوگ، یعنی دروغ گو کھاتے ہیں۔ بھگوان کی قسم میں ہرگز اپنی سورگ باشی (جنت مکانی) ماتا جی کی قسم نہیں کھاؤں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پیارے لال ہنر کی آواز بھرّا گئی۔

"دیکھا سر! میں نہ کہتا تھا!" کمار نے گرہ لگائی۔ "اگر پیارے لال جی بھگوان کی قسم کھا سکتے ہیں تو اور کوئی قسم کیوں نہیں کھا سکتے!"

پیارے لال ہنر نے اس وقت بڑی رحم طلب نظروں سے کمار کی طرف دیکھا، پھر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "کچھ تو خیال کرو، میں تمھارے پتا جی کی عمر کا ہوں۔"

کمار کو پیارے لال ہنر پر واقعی رحم آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا: "سر! یہ ایسے الفاظ ہیں کہ ان کے دو دو مطلب ہیں، بس استعمال کرنے پر دار و مدار ہے۔ اگر پیارے لال جی کا مطلب اپنے مُنہ میں خاک سے تھا تو بھلا آپ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے!"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کمار کی تائید میں کہا۔ "ان کے مُنہ میں خاک ہے تو رہا کرے، مجھے کیا! مگر یہ ایسی بات ہی کیوں کرتے ہیں جس کے دو دو مطلب نکلتے ہوں!"

"بس سر، عمر کا تقاضا ہے، سٹھیا گئے ہیں کچھ! آپ اس عمر کو پہنچیں گے تو آپ بھی سٹھیا جائیں گے۔" کمار نے وضاحت کی اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی دوبارہ "بزن" بول دیا۔

"اماں خدا نہ کرے، میں کیوں سٹھیاتا! سٹھیائیں پیارے لال ہنر، سٹھیاؤ تت... تت... تم!" میں نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ کمار ہتھے سے اکھڑ جائے اسی لیے اس سے کچھ کہتے ہوئے گھبرا رہا تھا مگر زبان پھسل ہی گئی۔ بہ مشکل

کو اس سے تعلقات استوار ہوئے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ تعلقات خراب ہوں۔

"دیکھیے سر، آپ مجھے بُرا بھلا کہہ کر پھر فضا کو مکدر کر رہے ہیں! پھر شکایت نہ کیجیے..."

"اماں بس زبان پھسل گئی۔ تم سوچ لو کہ میں نے جیسے کچھ کہا ہی نہیں۔" میں نے کمار کی بات کاٹ دی تاکہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔

"چلیے اگر ایسا ہے تو کوئی بات نہیں۔" کمار نے گویا میرا قصور معاف کر دیا۔

اس دوران میں سبھی لوگ میری محنت کی کمائی سے چائے "ڈکوس" چکے تھے اس لیے میں پھر اصل مسئلے کی طرف آگیا اور کمار کو مخاطب کیا: "ہاں اب تو تم چائے پی چکے، اب اپنی رپورٹ پیش کرو۔"

"ذرا چھری کے نیچے دَم تو لیں سر، ابھی رپورٹ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے رومال نکالا اور ہونٹ صاف کرنے لگا۔

وہ کم بخت ہر پھر کر کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتا تھا کہ میرے مرچیں لگ جاتی تھیں۔ کتے کی دُم کو لاکھ سیدھا کرو، رہتی ٹیڑھی ہے۔ یہی حال کمار کا تھا۔

"ابے میں کوئی بکرا ہوں کہ چھری کے نیچے دَم لوں!" میں کمار پہ بگڑ ہی گیا۔

"اب یہی تو آپ میں خرابی ہے سر!" کمار مُنہ بنا کر بولا۔ "ارے یہ محاورہ ہے، محاورہ! چھری کے نیچے دَم لینے سے کوئی بُرا مطلب نہیں نکلتا ورنہ اچھا بھلا آدمی بکرا بن جاتا ہے۔ چھری کے نیچے دَم لینے سے مراد صبر کرنا ہے، سمجھے آپ! اگر میری بات کا یقین نہیں تو پیارے لال جی سے پوچھ لیں۔ وہ مانے ہوئے شاعر ہیں، غلط نہیں کہیں گے۔"

"کیوں بھئی، کمار کا بیان درست ہے، اس محاورے کے بارے میں؟" میں نے پیارے لال ہنر سے تصدیق چاہی۔

پیارے لال ہنر نے ایک نظر کمار کی طرف دیکھا اور میں نے کمار کو آنکھ مارتے ہوئے دیکھ لیا۔

پھر اس سے پہلے کہ پیارے لال ہنر کچھ کہتا، میں نے کمار کو آڑے ہاتھوں لے لیا: "تم نے انھیں آنکھ کیوں ماری؟"

"نہیں تو سر! آپ تو خواہ مخواہ پَر کا کوّا بناتے ہیں۔ پھر آپ کہیں گے کہ میں نافرمانی کرتا ہوں۔" کمار بولا۔

"ابے میں نے خود تمھیں اپنی آنکھوں سے آنکھ مارتے دیکھا ہے اور مجھے دن دہاڑے جھٹلا رہے ہو!"

"آپ کو رپورٹ سننا ہے یا نہیں؟ یا پھر میں ڈی آئی جی صاحب کو جا کر رپورٹ دوں؟" کمار نے آخری حربہ استعمال کیا۔ وہ یقیناً موضوعِ گفتگو بدلنا چاہتا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے مجھے بکرا ہی بنایا تھا اور پیارے لال ہنر کو آنکھ مار کر اپنی غلط بیانی کی تصدیق کرانا چاہتا تھا۔ یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود بھی میں نے ہتھیار ڈالنا ہی مناسب سمجھا۔

"اچھا دو رپورٹ!" میرا لہجہ سپاٹ تھا۔

کمار بھی شاید اب رپورٹ دے کر اپنی جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اب غالباً گھر جا کر سونے کے موڈ میں تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ بغیر کسی غیر ضروری "ہیر پھیر" کے رپورٹ دینے لگا۔

کمار کی رپورٹ کے مطابق تقریباً رات دو اور ڈھائی بجے کے درمیان، شاہنواز کے گھر سے کچھ غیر معمولی سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کمار نے حقیقتِ حال جاننے کی خاطر اس کے گھر کی اطراف چکر لگایا مگر وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ کمار پھر صدر دروازے پہ آگیا۔ کچھ دیر بعد پھر ویسی ہی آوازیں سنائی دیں۔ کمار اس بار ذرا چوکنا تھا اس لیے اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ آوازیں مکان کے پچھلے حصے سے آرہی تھیں۔ کمار تیزی کے ساتھ مکان کی پشت پہ پہنچا۔ اس نے گلی میں دو افراد کو تیزی سے بھاگتے دیکھا جن میں سے ایک نے کسی کو اپنی پشت پر لاد رکھا تھا۔ پتا نہیں پشت پر لاد کر لے جائے جانے والا زخمی تھا یا بے ہوش، بہر حال کمار نے انہیں للکارا مگر وہ بھاگتے ہوئے گلی سے نکل گئے۔ کمار نے ان کا تعاقب کیا مگر وہ اسے تاریک گلیوں میں جُل دے کر فرار ہو گئے۔ پھر کمار نے کہیں دور کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ اس سمت دوڑ پڑا لیکن اس وقت تک وہ لوگ فرار ہو چکے تھے جب تک کمار اس جگہ پہنچا جہاں پہلے ہی سے کوئی کار کھڑی ہوئی تھی۔ کمار نے کافی فاصلے پر کار کی پچھلی سُرخ بتی دور ہوتے دیکھی اور پھر مایوس ہو کر دوبارہ شاہنواز کے گھر کی طرف لوٹ آیا۔ واپس آکر اس نے مکان کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا پایا جس سے نکل کر مجرم بھاگے تھے۔ وہ بہت احتیاط کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ گھر کے ایک کمرے میں اسے ایک بڑھیا بے ہوش ملی جسے غالباً کوئی بے ہوشی کی دوا سنگھائی گئی تھی۔ کمار کو سارا گھر کھنگال ڈالنے کے باوجود وہاں کہیں بھی شاہنواز نظر نہیں آیا۔ ان حالات میں وہ صرف یہی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ شاہنواز کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ جسے پشت پر لاد کر لے جایا گیا تھا، وہ شاہنواز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کمار صبح ہونے تک وہیں رہا تھا مگر پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ صبح، پیارے لال ہنر ڈیوٹی پہ پہنچا تھا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے کر دفتر آگیا تھا کیوں کہ اب وہی شخص اغوا کیا جا چکا تھا جس کی نگرانی مقصود تھی۔

میں نے کمار کی پوری رپورٹ سن کر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا۔ میرے خیال میں شاہنواز کو اغوا کرانے میں اُنھی لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا جنھوں نے سیتا کے ذریعے وہ فائل حاصل کرنا چاہی تھی لیکن اس کے اغوا کا مقصد سمجھنے سے میں قاصر تھا۔ ابھی میں کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا تھا کہ لیوسی کمرے میں داخل ہوئی اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میری میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ میں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور میز کے سامنے کرسی لا کر ڈالنے کو کہا۔

جب چپراسی کرسی لے آیا تو لیوسی اس پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اب ذرا مجھے اس کیس کی فائل دکھاؤ جس پر ان دنوں تم کام کر رہے ہو۔"

"وہ کس خوشی میں؟" میں نے کہا۔

"وہ اس خوشی میں کہ اب اس کیس پر میں بھی تمھارے ساتھ کام کروں گی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"بڑے بابا سے پوچھ لیا ہے؟ میرا مطلب سر تھامسن سے ہے۔" میں بولا۔ "انھوں نے تو تیواڑی جی تک کو اس معاملے سے الگ رکھا ہے۔"

"میں ان سے بھی مل کر آرہی ہوں۔ اب ایسا نہیں ہے، رازداری کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ وہ ابتدائی مراحل میں کسی سبب ڈپارٹمنٹ والوں سے بھی رازداری برتنا چاہتے تھے لیکن اب ان کا خیال بدل گیا ہے۔ پتا ہے، انھوں نے میرے اور تمھارے بارے میں کیا تبصرہ کیا ہے؟"

"انھوں نے تبصرہ تم سے کیا ہے تو پھر مجھے کیسے پتا چل سکتا ہے! تم بھی نِری چوچ ہو۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

"یہ تم نے مجھے چوچ کیوں کہا؟" لیوسی آنکھیں نکال کر بولی۔ "جو مُنہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔"

"ارے تم تو بُرا مان جاتی ہو ذرا اس بات کا! خود ہی چوچ پن کی باتیں کرتی ہو اور پھر خود ہی شکوے کرتی ہو۔ اب بھلا خود سوچو، مجھے کیا خبر کہ اس بوڑھے گدھے سے تمھاری کیا باتیں ہوئی ہیں۔"

"اچھا تو تم ڈی جی کو بوڑھا گدھا کہہ رہے ہو! بتا دوں انھیں جا کر!" لیوسی نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی۔

"اور کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ نوکری چلی جائے گی۔ میں ویسے بھی تنگ آچکا ہوں اس نوکری سے! جب دیکھو جان سُولی پر لٹکی رہتی ہے۔"

"خیر، ان فضول باتوں کو چھوڑو! میں یہ کہہ رہی تھی کہ ڈی جی صاحب کے خیال میں تم میرے ہی ساتھ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہو جیسا کہ پچھلے کیس میں ہوا۔"

"کیوں اپنی کم بختی بلوا رہی ہو! ابھی پچھلے زخم ٹھیک طرح مندمل نہیں ہوئے کہ نئے زخم لگوانا چاہتی ہو۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔ "کچھ دن اور زخموں کے بہانے عیش کر لو، فائدے میں رہو گی۔"

"تمھارے ساتھ کام کرنے میں اگر مجھے نقصان بھی ہو تو قبول ہے۔" وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی مدھم لہجے میں بولی۔ غالباً اسے کمرے میں دوسرے افراد کی موجودگی کا بھی احساس تھا۔

"بھگتو گی خود ہی، میرا کیا ہے!" میں مُنہ بنا کر بولا، پھر کہا: "اس کیس کی فائل میں نے بنائی تو ہے مگر اس کا پیٹ اچھی طرح بھرا نہیں سکا، مطلب یہ کہ اس میں تمام باتیں لکھنے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ تم چاہو تو فائل دیکھ لو۔ اس کے بعد تم مجھ سے جو پوچھنا چاہو پوچھ لینا، میں زبانی بتا دوں گا۔"

"یہ تو تم نے سخت غلطی کی ہے۔ اگر ڈی آئی جی یا آئی جی یا ڈی جی صاحب نے کیس کی فائل منگوائی تو کیا جواب دو گے؟" لیوسی فکرمند لہجے میں بولی۔

"دے لوں گا کوئی جواب! تم اس کی فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر میں نے میز کی نچلی دراز کھول کر کیس کی فائل نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ "لو پہلے اسے پڑھ ڈالو، بقیہ کہانی میں سنا دوں گا۔"

لیوسی فائل کھول کر پڑھنے لگی اور میں پیارے لال ہنر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بہت دیر سے محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے کلبلا رہا ہو۔ میری سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ اپنی نشست سے اٹھا اور میری میز کی دائیں جانب آ کھڑا ہوا کیوں کہ سامنے لیوسی بیٹھی تھی۔ لیوسی نے اسے ایک نظر دیکھا۔

"آداب حضور! کیسی ہیں اب آپ؟ حضور کے دشمنوں کے مزاج تو بہتر ہیں۔" پیارے لال ہنر کا ہاتھ ایک خاص انداز میں ماتھے تک چلا گیا۔ وہ لیوسی سے مخاطب تھا۔

"اب ٹھیک ہوں پہلے سے!" لیوسی نے رسمی سا جواب دیا۔

"آپ کی تو ٹھیک نبھ رہی ہے اپنے افسر سے؟"

"جی حضور! سرکار تو بس ہیرا ہیں ہیرا! نہ ہے نصیب کہ ہم لوگوں کو ان کی خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔" پیارے لال ہنر نے جواب دیا۔

لیوسی کی نگاہ دوبارہ فائل پر جم گئی اور پیارے لال ہنر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"سرکار! خدمتِ اقدس میں عرض یہ گزارنا تھی کہ یہ بے دام غلام آج کچھ قبل از وقت اجازت کا خواستگار ہے۔" پیارے لال ہنر اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔

اب اس کی باتیں کچھ کچھ میرے پلّے پڑنے لگی تھیں کیوں کہ کافی دن سے اس کی جناتی زبان سن رہا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔ "کیا تم آسان زبان میں اپنا مطلب بیان نہیں کر سکتے۔ کیا مشکل الفاظ بولنا ضروری ہیں!"

"ہائے حضور! کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ قلعہ معلّیٰ کی زبان کو مشکل کہنے لگے ہیں!" اس کے لہجے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ "حضور! وہ لوگ جو مشکل الفاظ کا گلہ کرتے ہیں، اگر روزانہ ایک لفظ سیکھتے رہیں تو ایک دن کوئی مشکل نہ رہے مگر ذوقِ علم رہا ہی کب ہے!"

"تمھیں تو بس موقع ملنا چاہیے، بس شروع ہو جاتے ہو۔ یہ بتاؤ اللہ کے نیک بندے کہ چاہتے کیا ہو؟" میں نے اس کی چرب زبانی سے تنگ آ کر کہا۔

"سرکار! بندہ عرض کر چکا ہے۔" وہ بولا۔

"دوبارہ کہو گے تو زبان گھس جائے گی!" میں نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"دراصل بات یہ ہے حضور کہ خاکسار کبھی قبل از وقت اجازت طلب نہ ہوتا لیکن مسئلہ یہ درپیش ہے کہ مشاعرے کے چند دعوت نامے تقسیم سے رہ گئے ہیں اور آج آخری دن ہے۔ آج اگر بقیہ دعوت نامے نہ پہنچائے جا سکے تو شعرائے کرام بھلا مصرعۂ طرح پر کس وقت طبع آزمائی کریں گے۔"

"اسی مشاعرے کے دعوت ناموں کا ذکر کر رہے ہو جو میری صدارت میں ہو رہا ہے نا؟" میں نے بہ آوازِ بلند لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی تاکہ وہ بھی سن لے اور میری توقع پوری ہوئی۔ لیوسی نے فائل پڑھتے پڑھتے اس طرح چونک کر حیرت سے مجھے دیکھا تھا جیسے اچانک میری جنس بدل گئی ہو۔

"جی ہاں سرکار، جی ہاں!" پیارے لال ہنر جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ "اسی مشاعرے کا ذکر ہے۔"

"مگر یہ آخری دن کا کیا مطلب؟ کیا کل ہی ہے مشاعرہ؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں سرکارِ محترم! شاید حضور کو تاریخ یاد نہیں رہی۔ دراصل ہماری یہ روایت ہے کہ انگریزی تاریخ کی بجائے چاند کی تاریخ دیتے ہیں۔" پیارے لال ہنر نے بتایا۔

"اور... اور وہ غزل..." میں لیوسی کی موجودگی کے سبب کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"وہ غزل میں نے سرکار کے لیے موزوں کر لی ہے۔ یہ ملاحظہ فرمائیے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

لیوسی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ غالباً معاملے کی نوعیت سمجھ گئی تھی۔ میرے چہرے پر انتہائی شرمندگی کے اثرات یقیناً ابھر آئے ہوں گے۔ اگر آئینہ ہوتا تو شاید اس بات کی تصدیق بھی کر لیتا مگر یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ صورتِ حال بگڑ چکی تھی اور اس میں میری اور پیارے لال ہنر دونوں ہی کی حماقت کو دخل تھا۔ مجھے لیوسی کے سامنے غزل کا قصہ نہیں چھیڑنا چاہیے تھا اور اس بکاؤ ٹ پیارے لال ہنر کو فوراً غزل نکال کر نہیں تھما دینا چاہیے تھی۔ لیوسی کی نظر میں چند لمحے پہلے میرے وقار کی جو عمارت کھڑی ہوئی تھی، وہ لمحے بھر میں زمیں بوس ہو گئی تھی۔ میں نے صورتِ حال کو سمجھنے اور پھر سے اپنے لیے ہموار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

"اچھا تو تم نے غزل کہہ لی!" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مگر آج تو شاید مجھے اس کی اصلاح کا موقع نہ مل سکے، ہاں کل دیکھا جائے گا۔"

"جی کیا فرمایا سرکارِ والا تبار نے؟ اصلاح!" شدید حیرت کے سبب پیارے لال کی آنکھیں اپنے حلقوں میں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ وہ گھامڑ میری بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس نے فوراً ہی میری غلط فہمی دور کرنے کی خاطر کہا۔ "حضورِ محترم! یہ اشعار تو خادم نے آپ کے لیے موزوں کیے ہیں تاکہ آپ کل مشاعرے میں پڑھ سکیں۔ خادم کی غزل الگ ہے۔ خادم اطلاعاً یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہے کہ بہ عمر پندرہ سال خادم کے استاد حضرت علّامہ بے قرار دہلوی نے اسے فارغ الاصلاح کر دیا تھا۔ حضور نے خادم کی غزل پر اصلاح کے لیے کہہ کر نادانستگی میں مرحوم بے قرار کی روح کو مزید بے قرار کر دیا۔ ہائے ہائے، اس وقت مرحوم اپنی قبر میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے!"

اس ناہنجار نے سارا بھانڈا ہی پھوڑ دیا تھا اور لیوسی کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ میرا یہ عالم تھا کہ جیسے کسی نے بھرے بازار میں میری "جوتا کاری" کر دی ہو مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

"دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے!" میں دہاڑا۔ "میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میرے لیے غزل بنانا؟ کیا میں خود غزل نہیں بنا سکتا! کیا سمجھا ہے تم نے مجھے! پانچ سال کی عمر میں میرے استاد حضرت تیلا پوری

نے مجھے بھی اصلاح سے فارغ کر دیا تھا۔ بڑے آئے میرے لیے غزل بنانے والے! میرے ساتھ چلنا میرے گھر! پچھواؤں گا اپنی امی سے کہ جب میں چھ مہینے کا تھا تو اسی وقت سے غزل بنا لیا کرتا تھا۔"

پیارے لال ہنر حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھ رہا تھا اور میری بات سن کر لیوسی پہلے سے بھی زیادہ زور سے ہنسنے لگی تھی۔

"کیا ہی ہی ہی 'ٹھیٹیا' رہی ہو، دانت بند کرو!" میں نے لیوسی کو بھی ڈانٹ دیا اور پھر پیارے لال ہنر سے بولا۔ "تم نے ابھی سنا نہیں کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے!"

"مگر حضور نے ابھی... ابھی یہ نہیں... فرمایا کہ قبل از وقت جانے کی اجازت..."

"ابھی اسی وقت دفع ہو جاؤ!" میں ہاتھ اٹھا کر چیخا۔

"عنایت حضور کی!" یہ کہہ کر پیارے لال ہنر سیدھا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"اللہ دتا! تم واقعی کمال آدمی نکلے۔ چھ مہینے کی عمر میں غزل بنانا واقعی کمال ہے!" لیوسی نے مجھے گھسنا چاہا۔

"ہاں ہاں بنا لیتا تھا، تم کون قاضی کہ ملّا؟" میں چڑ کر بولا۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم نے پیدا ہوتے ہی کہا ہوگا، امی جان مطلع عرض ہے۔" لیوسی اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"ہاں کہا تھا پھر؟ تم سے کیا! اسی طرح کہوں گا، تم سے جو ہو سکے کر لو!"

"یعنی ابھی کہو گے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم پیدا ہو چکے ہو۔"

"نہیں ہوا پیدا، بالکل نہیں ہوا!" میں میز پہ ہاتھ مار کر غصے سے بولا۔

"چلو تمھارے بارے میں ایک اور نئی بات معلوم ہوئی کہ تم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے! ویسے کب ارادہ ہے پیدا ہونے کا؟"

"میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم کون ہوتی ہو یہ باتیں پوچھنے والی! میری مرضی جب چاہوں پیدا ہو جاؤں!" میں غصے میں نہ جانے کیا انٹ شنٹ بکے جا رہا تھا اور لیوسی کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا۔ وہ بار بار اپنی ہنسی روک کر کوئی نہ کوئی چڑانے والی بات کہہ دیتی تھی جسے سن کر میں اور بہک جاتا تھا۔

جب کافی دیر چونچیں لڑ چکیں تو لیوسی نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہت ہو گیا، اب کام کی بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ڈیفنس منسٹری کے دفتر چلنا چاہیے۔"

"وہ کس خوشی میں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو طے ہے کہ مقتول مراری لال نے وہاں سے کچھ اہم کاغذات اڑا کر مجرموں سے ان کا سودا کیا تھا! اور غالباً یہ سودا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اسے مجرموں سے پہلے بھی بھاری رقم ملتی رہی ہے جبھی وہ موری گیٹ میں نیا مکان خرید سکا۔ شواہد سے یہ پتا چلتا ہے کہ آخری سودے بازی کے درمیان مجرموں سے اس کی کچھ کھٹ پٹ ہو گئی جس کے نتیجے میں اس نے مجرموں کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ جھگڑا غالباً پیسوں کی لین دین پر ہوا ہوگا۔ نتیجتاً مجرموں نے اس کا پتّا صاف کر دیا۔ انھیں شبہ ہوگا کہ مقتول مراری لال ان کے مطلوبہ کاغذات دفتر سے اُڑا چکا ہوگا۔ انھوں نے اسی لیے معاملہ کسی قدر ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مقتول مراری لال کے گھر پر دھاوا بولا اور ان کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ مقتول مراری لال کے بوڑھے باپ پر تشدد کر کے انھوں نے مطلوبہ کاغذات کی فائل حاصل کر لی اور پھر اسے بھی قتل کر دیا۔ مقتول بوڑھے نیولاری لال کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ وہ فائل اس کے مقتول بیٹے نے اسے حفاظت سے رکھنے کے لیے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ فائل ڈیفنس منسٹری کے ریکارڈ سے اُڑائی گئی ہوگی۔ اب ہمیں پتا لگانا ہے کہ جو فائل مجرموں کے ہاتھ لگ چکی ہے، اس میں کیا تھا۔ اب سمجھے کچھ!" لیوسی نے تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔

"جب وہ فائل ہی وہاں نہیں ہوگی تو یہ کس طرح پتا چل جائے گا کہ اس میں کیا تھا، ہرا دھنیا کہ پودینا!" میں نے ہاتھ نچا کر لیوسی کی بات پر اعتراض کیا۔

"تم مجھے چوپٹ کہہ رہے تھے اور خود نرے بلکہ پیٹ بھر کر چوپٹ ہو یا ایسا ظاہر کرتے ہو۔" لیوسی بولی۔ "ادارے فائلوں کا انڈیکس بھی تو ہوتا ہے جس میں ایک خانہ اس لیے بھی رکھا جاتا ہے کہ اس میں کس نوعیت کے کاغذات ہیں۔ اب کھوپڑی میں بیٹھی میری بات!"

"ہاں کچھ کچھ بیٹھ تو رہی ہے مگر یہ کیسے پتا چلے گا کہ فائل کون سی غائب ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر وہی کتے کی ایک ٹانگ! ارے اس کے لیے پورا ریکارڈ چیک کرنا پڑے گا، پھر جو فائل غائب ہوئی، انڈیکس میں اس کے متعلق ضروری نوٹ پڑھ لیا جائے گا۔" لیوسی نے بتایا۔

"چلو مان لی تمھاری بات! مگر ریکارڈ میں فائلیں کتنی ہوں گی؟"

"اس سے کیا بحث، جتنی بھی ہوں۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"بڑا لمبا چکر چلوا رہی ہو تم! کوئی اور ترکیب سوچو۔" میں بولا۔

"کوئی چھوٹا سا چکر تم چلا لو، میری سمجھ میں تو یہی بات آتی ہے۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ سارا چکر مجرموں نے کیوں چلا رکھا ہے اور یہ اسی طرح پتا چل سکتا ہے۔"

"اگر مجبوری ہے تو خیر چلو ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اسی دوران میں چپ چاپ سے وہ کاغذ اٹھا کر اپنی جیب میں سرکا لیا جس پہ پیارے لال ہنر نے میرے لیے غزل لکھ کر دی تھی۔ مجھے بہرحال دوسرے دن مشاعرے کی صدارت تو کرنا ہی تھی، غزل نہ پڑھتا تو برنگو

ہوتی۔ اب بھلا میں کہاں کہاں اساتذہ کے دیوان تلاش کرتا پھرتا!

"یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو" لیوسی بولی۔

"کیا؟" میں حیرت سے بولا کیوں کہ اس دوران میں میرا ذہن غزل اور مشاعرے میں اٹکا ہوا تھا۔

"ڈیفینس منسٹری کا ریکارڈ چیک کرنا اور کیا!" لیوسی نے وضاحت کی۔

"تو کیا اس کے لیے مرغا بننے کی شرط ہے؟" میں جل کر بولا۔

"ہمیں اس سلسلے میں ڈی جی صاحب سے ملنا پڑے گا، پھر وہی اس کا انتظام کریں گے کہ اس کی اجازت مل جائے۔"

"لو اور سنو، میں تو نہیں جاؤں گا، ان کے پاس! ستی ہو اگر" میں نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر کہا۔

"سوچ لو وہ تمھیں بھی بلوائیں گے۔ میرا کیا ہے چلی جاتی ہوں مگر اس کیس پر پہلے سے تم ہی کام کر رہے ہو اس لیے تمھاری موجودگی بھی ضروری ہے۔ ممکن ہے ڈی جی صاحب کوئی مشورہ دیں، اس سلسلے میں!"

"تم جان نہیں چھوڑو گی میری! چلو" میں کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اور لیوسی، ڈی جی صاحب کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو سلام دعا سے پہلے چچا بندو خاں نے لیوسی اور مجھے ساتھ دیکھ کر عجیب سا منہ بنایا۔ ان کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ شاید وہ اپنے ہونے والے داماد کے ساتھ کسی خوب صورت لونڈیا کو دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔

چچا بندو خاں ہماری آمد کے بارے میں سر تھامسن کو مطلع کرنے بڑھے، پھر میرے قریب آکر آہستہ سے بولے "بیٹے! مجھ سے آج اکیلے میں ضرور مل لینا! تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔"

لیوسی یہ کانا پھوسی دیکھ کر کبیدہ خاطر سی نظر آنے لگی۔ وہ قریب ہی کھڑی تھی اس لیے شاید اس نے بھی چچا بندو خاں کی بات سن لی تھی۔ میں لیوسی کو یہ تو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ چچا بندو خاں سے میرا کیا رشتہ پیدا ہونے والا ہے، پھر یہ کہ میں نے چچا بندو خاں کی حمایت میں اسے ڈانٹ بھی دیا تھا اس لیے اس کی کبیدہ خاطری سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ آخر چچا بندو خاں اس کی ہونے والی سوکن کے ابا حضور تھے، پھر وہ اسے کیوں ایک آنکھ بھاتے!

"ٹھیک ہے چچا، اگر وقت ملا تو ضرور مل لوں گا" میں نے چچا بندو خاں کی بات کے جواب میں کہا۔

"یہ بہت ضروری ہے بیٹے!" چچا بندو خاں نے تاکید کی اور سر تھامسن کے کمرے میں چلے گئے۔

چچا بندو خاں، سر تھامسن کے کمرے میں چلے گئے تو میں نے لیوسی کو چھیڑا "کیا تمھیں قبض ہو گیا ہے؟"

"یہ کیا خرافات شروع کر دی تم نے!" وہ بگڑ کر بولی۔

"دراصل تمھارے چہرے سے ایسا ہی پتا چل رہا تھا جیسے تمھیں قبض کی شکایت ہو گئی ہو" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو! ہر وقت بے تکی باتیں اچھی نہیں لگتیں" وہ منہ بنا کر چڑچڑے لہجے میں بولی۔

اسی وقت چچا بندو خاں کمرے سے نکلے اور میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ انھوں نے اپنی جیبی گھڑی نکالتے ہوئے کہا "تم لوگ بارہ بج کر نو منٹ اور تین سیکنڈ پر صاحب سے ملنے اندر جا سکتے ہو۔"

"تین سیکنڈ کی بجائے چار سیکنڈ نہیں ہو سکتے چچا؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

"ہرگز نہیں!" چچا بہت زور سے سر ہلا کر پُرجوش لہجے میں بولے "صاحب خفا ہو جائیں گے اور ممکن ہے ملنے سے انکار بھی کر دیں۔ وہ اصولی آدمی ہیں، تم کبھی ایسا سوچنا بھی مت!"

"ویسے اب کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے دریافت کیا کہ معلوم ہو سکے کہ اس سنکی بڈھے کی اصول پسندی کی خاطر مجھے اور لیوسی کو وہاں کتنا وقت ضائع کرنا ہے۔

"اس وقت بارہ بج کر آٹھ منٹ اور انسٹھ سیکنڈ ہو چکے ہیں، بس اب چار سیکنڈ باقی ہیں، جلدی سے قدم بڑھاؤ!" چچا نے جیبی گھڑی پر نظر گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

میں اور لیوسی جلدی سے آگے بڑھے۔ دروازے تک پہنچے، اسے کھولنے اور پھر اندر جانے کے لیے ہمارے پاس صرف چار سیکنڈ تھے بلکہ اس سے بھی کم! پتا نہیں اس بڈھے سنکی کی ان حرکتوں کا مطلب کیا تھا۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ ہم دونوں، وقت پر اندر پہنچ گئے۔ بڈھے سر تھامسن نے ٹھیک اسی وقت دائیں جانب لگی ہوئی دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی تھی اور سیکنڈ کی سوئی نے ٹھیک اسی لمحے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ چچا بندو خاں نے یقیناً اپنی جیبی گھڑی اس سے ملا رکھی تھی ورنہ سیکنڈوں میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ کا امکان ہو سکتا تھا۔

ہم دونوں سر تھامسن کی میز تک پہنچے اور پھر ہاتھ کا اشارہ پا کر اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بوڑھے نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا تو میری بجائے لیوسی نے آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

"ویری گڈ!" سر تھامسن نے ہمیں ستائش آمیز نظروں سے

دیکھ کر کہا، پھر بولا "اب میں اے ڈی کی ذہانت کا راز پا گیا، یہ تمھارے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا۔"

اپنی اس کھلی توہین پر میں کھول کر رہ گیا۔ لیوسی نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے سر تھامسن کی بات سے اختلاف کیا "معاف کیجیے گا سر، اللہ دتا خود بہت ذہین ہے۔ پچھلے کیس کا سہرا بھی اسی کے سر ہے، مجھے تو مجرموں نے بے بس کر کے ڈال دیا تھا۔ پھر اللہ دتا ہی نے میری جان بھی بچائی تھی۔"

"میں مان ہی نہیں سکتا!" سر تھامسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "سوال یہ ہے کہ آج ہی یہ نکتہ سامنے کیوں آیا؟"

"سر! خود اللہ دتا ہی نے یہ بات کی تھی اور میں نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا" لیوسی نے میری ساکھ بحال کرنے کے لیے سفید جھوٹ بولا۔

"تو پھر میں اس کا مطلب سمجھوں گا کہ اس کے ذہن میں کوئی نفسیاتی گرہ ہے جو تمھاری موجودگی میں کھل جاتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ہے ضرور! ورنہ اس کے بارے میں میرا تاثر بہت خراب ہو گیا ہے۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں سر!" لیوسی انکساری سے بولی "ہاں مجھے یہ علم ضرور ہے کہ اللہ دتا بعض اوقات نہ جانے کیوں جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا ہے جن سے بزدلی اور حماقت کا اظہار ہوتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ میں یہ بات اس لیے زیادہ یقین سے کہہ سکتی ہوں سر، کہ یہ بات میرے ذاتی تجربے میں آ چکی ہے۔" وہ وقت کچھ ایسا تھا کہ میں "اللہ دتا" کہے جانے پر بھی کوئی اعتراض نہ کر سکا۔

"یہ بھی کوئی نفسیاتی چکر معلوم ہوتا ہے" سر تھامسن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ پتا نہیں اس سنکی بوڑھے کے سر پر اس دن نفسیات کا بھوت کیوں سوار ہو گیا تھا۔ چند لمحے کے توقف سے انھوں نے کہا "خیر، میں اس سلسلے میں ابھی ڈیفینس سیکریٹری سے بات کیے لیتا ہوں، اجازت آسانی سے مل جائے گی۔ یوں بھی سر ہنری میرے خالو ہیں۔" یہ کہہ کر سر تھامسن نے میز کی دائیں جانب رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میرے خیال میں تو سر تھامسن ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور اب ان کے ایک عدد خالو جان بھی ٹپک پڑے تھے۔ سر تھامسن ٹیلی فون پر اپنے خالو کے نمبر ملانے لگے اور میں ان کے خالو کی عمر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون عام نہیں تھا لیکن عموماً بڑے بڑے انگریز سرکاری افسران کے پاس ضرور ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی سر ہنری سے رابطہ قائم ہو گیا۔ علیک سلیک کے بعد سب سے پہلے سر تھامسن نے جب اپنے خالو جان کے ابا حضور کی طبیعت پوچھی تو مجھے غش آتے آتے بچا۔ میں تو خالو جان ہی کو رو رہا تھا، وہاں ان کے ابا حضور قبلہ بھی بقیدِ حیات تھے۔ میں سوچنے لگا، یاالٰہی، یہ پورا خاندان ہی کیا قیامت کے بورے سمیٹے گا! چند لمحے بعد سر تھامسن نے فون کرنے کا اصل مقصد بیان کیا، پھر دوسری طرف سے کچھ سن کر بولے "جی... جی کیا کہا ناممکن!... پھر بھی خالو جان! میں اپنے آدمیوں کو بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے وہ کوئی سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ایسا کس طرح ہوا اور چور دروازہ کہاں ہے۔ جی... جی ہاں... ٹھیک ہے... آپ کا فرمانا قطعی درست ہے خالو جان!... مگر... مگر... جی... بہت بہتر ہے... جی ٹھیک ہے... میں ان دونوں کو بتا دوں گا... جی... جی ہاں ان کے پاس میرا خط ہو گا... جی ٹھیک ہے... آپ ان کی طرف سے قطعی بے فکر رہیں... جی ہاں... جی ہاں... خالہ اماں کو سلام ضرور کہہ دیجیے گا... جی ہاں میں آؤں گا کسی دن... جی خدا حافظ!" یہ کہہ کر سر تھامسن نے ریسیور رکھ دیا۔

ہم دونوں اس دوران میں قطعی خاموش رہے تھے اور ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو غور سے سن رہے تھے۔

سر تھامسن ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر ہم سے مخاطب ہوئے۔ "سر ہنری کا کہنا ہے کہ وہاں سے کوئی فائل چرانا قطعی ناممکن ہے۔"

"لیکن سر، یہ تو صاف ظاہر ہے کہ فائل وہیں سے چرائی گئی ہے" لیوسی نے کہا۔

"ہاں اس بات کا یقین تو مجھے بھی ہے مگر سر ہنری کا کہنا ہے کہ وہاں اس قدر سخت حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں کہ بغیر علم و اطلاع کے وہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

بھلا بتاؤ، چڑیا کے بچے پر کیا مار پڑی تھی کہ وہاں پر مارنے جاتا! میں نے سوچا یہ بات کہہ دوں مگر مصلحتاً خاموش رہا۔

سر تھامسن کہہ رہے تھے "سوائے چند اعلیٰ انگریز حکام کے کوئی اور اس مخصوص عمارت سے بغیر تلاشی دیے نہیں نکل سکتا۔ جس عمارت میں ریکارڈ روم ہے، اس میں ڈیفینس سیکریٹری کے اجازت نامے کے بغیر کوئی شخص بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ خود عملے کے پاس بھی اجازت نامے ہیں جو چیکنگ پوسٹ پر چیک کیے جاتے ہیں۔ چیک پوسٹ عمارت کے قریب ہی واقع ہے۔ وہاں جاتے اور آتے وقت تلاشی لی جاتی ہے۔ سر ہنری کا کہنا ہے کہ ان حفاظتی اقدامات کی موجودگی میں وہاں سے کوئی فائل چرا کر لے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود بھی میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تم دونوں کو بھیج رہا ہوں۔ سر ہنری کا دفتر بھی اسی

عمارت کی دوسری منزل پر ہے۔ تم دونوں کو پہلے ان سے ملنا ہے۔ میں تمھیں ابھی ان کے نام ایک خط دیے دیتا ہوں۔ تمھیں وہاں جاکر سرہنری سے ریکارڈ روم چیک کرنے کا اجازت نامہ ملے گا۔ تمھیں اس کے بعد وہ چور دروازہ تلاش کرنا ہے جس کے ذریعے فائل چوری کی گئی۔ تم دونوں کو چیکنگ پوسٹ کے افسر کے پاس عمارت میں داخلے کا اجازت نامہ مل جائے گا۔ وہاں سے یعنی چیکنگ پوسٹ سے ایک مسلح محافظ کے ساتھ تم دوسری منزل پر پہنچو گے اور سرہنری سے ان کے دفتر میں ملو گے۔ تمھیں سب سے پہلے یہ کام کرنا ہے کہ سرہنری کو قائل کر دو کہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح فائل چوری ضرور ہوئی ہے سمجھ گئے؟"

"جی سر!" میرے اور لیوسی کے مُنہ سے بہ یک وقت نکلا۔

اس کے بعد سر تھامسن نے اپنے خالو جان، یعنی ڈیفینس سیکریٹری کے نام خط لکھ کر لفافے میں بند کیا، لفافے پر ان کا نام نامی رقم کیا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"اب تم دونوں جا سکتے ہو۔ آج کی جو رپورٹ ہو وہ مجھے کل صبح ٹھیک نو بج کر ایک منٹ اور دو سیکنڈ پر مل جانا چاہیے۔" سر تھامسن نے کہا۔

"بہتر ہے سر! تیسرا سیکنڈ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا؟" سر تھامسن نے گھور کر کہا۔

"کک... کچھ نہیں سر!" میں گڑبڑا گیا۔ "ہم ٹھیک... ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔"

سر تھامسن مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گئے اور میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ لیوسی میرے پیچھے تھی۔

باہر آکر چچا بندو خاں پر نظر پڑی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"اسے ذرا آگے جانے دینا۔ میں ابھی بات کیے لیتا ہوں۔ کیا خبر تمھیں پھر وقت..." چچا بندو خاں ایک دم چُپ ہو گئے کیونکہ اسی وقت لیوسی دروازہ کھول کر نکل آئی تھی۔

میں نے لیوسی سے کہا: "تم ذرا میرے کمرے تک چلو، میں چچا سے بات کرکے ابھی آیا۔"

لیوسی نے ناگواری سے سر ہلایا اور آگے بڑھ گئی۔ اس کے کچھ دور جاتے ہی چچا بندو خاں رازدارانہ لہجے میں مجھ سے بولے۔

"بیٹے! یہ عورت اچھے کردار کی نہیں ہے اور سچ پوچھو تو یہاں رکھی ہی ایسی عورتیں جاتی ہیں جو ہر قیمت پر اپنا کام نکال لیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات! ان کی عزت آبرو کچھ نہیں ہوتی۔"

"مگر چچا، مجھے تو ڈی جی صاحب نے حکم دیا ہے کہ اسے ساتھ رکھوں۔" میں نے صفائی پیش کی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا بیٹے!" وہ اس طرح افسوس کرنے لگے جیسے ان کے کسی قریبی عزیز کو پھانسی کا حکم سُنا دیا گیا ہو۔ پھر وہ قدرے توقف سے بولے: "خیر مجبوری ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے مگر بیٹے سنو، اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے نیک بندوں کو امتحان میں ڈالتا ہے اور جو اس امتحان میں پورا اترتا ہے، اسی سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ تم نے یوسف زلیخا تو پڑھی ہوگی!"

"ہاں چچا پڑھی ہے مگر اس میں تو بالآخر زلیخا شاید حضرت یوسفؑ کو حاصل کر لیتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ پیغمبروں کی باتیں ہیں بیٹے! میں تو تمھیں اور بات سمجھا رہا تھا کہ کس طرح زلیخا نے یوسفؑ کا دامن پکڑا اور کس طرح وہ اپنے ایمان پر قائم رہے! بہرحال اس عورت کو میں پہلے سے اچھی طرح جانتا ہوں، تم اس کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا۔ بیٹے! عزت و آبرو ہے تو سب کچھ ہے۔ جس طرح لڑکی کی آبرو ہوتی ہے بیٹے، اسی طرح لڑکے کی بھی ہوتی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ دماغ میں رکھنا! اور کبھی کسی کے ورغلانے میں نہ آنا۔ یہ آگ اور پانی کا کھیل ہوتا ہے بیٹے! ابھی تم بچے ہو، ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ عورت بڑی فریبی ہوتی ہے۔"

میں نے سوچا کہ چچا بندو خاں سے پوچھوں، عورت تو ان کی اتی بھی تھیں، تو کیا وہ بھی فریبی تھیں؟ مگر اس وقت تو مجھے ان سے جان چھڑانے کی فکر تھی۔ انھوں نے جو کچھ کہا جو نصیحتیں بھی کیں، میں سنتا رہا اور انھیں یقین دلاتا رہا کہ اسی پر عمل کروں گا جو انھوں نے کہا ہے۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹے! خدا تمھاری عمر دراز کرے۔" چچا بندو خاں بڑی محبت سے بولے۔

پھر میں نے چچا بندو خاں سے اجازت لی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں مجھے انسپکٹر مولاداد مل گیا۔ میں نے اسے دیکھ کر سلام کیا تو اس نے ناگواری سے مُنہ بنا کر جواب دیا۔

"کیا آپ ناراض ہیں مجھ سے جناب؟" میں نے گزشتہ تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"نا... نا... ناہیں... نہیں۔" وہ ہکلا کر بولا، پھر کہا: "تو... تو... تم نے کیا... ق... ق... تیر... مان... مان... مار لیا اب تک؟" اس کا اشارہ مقتول مراری لال کے کیس کی طرف تھا۔

"نہیں مارا تو اب مار لوں گا! ابھی مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کیس ہاتھ میں لیے!" میں اس کی بات سے جل کر بولا۔

"با... با... باتیں... بڑے دیکھے ہیں... تو... تو م... کی... کی... کس کھیت کی... مو... مولی ہو... مولی!" وہ ہاتھ نچا کر مسکرانے لگا۔

"دیکھیے جناب مولاداد صاحب! میں سوچ رہا تھا، پچھلی باتوں کو بھول جاؤں اور سلام دعا برقرار رہے مگر آپ اس قابل ہی معلوم نہیں ہوتے۔ مولی، گاجر بلکہ بھنڈی ہوں گے آپ!"

"مجھے... بھے... بھن... بھنڈی!... کیا کہا... سا... سر... پھا... پھاڑ دوں گا... اگر مو... مو... مجھے اب... بھن... بھن... بھنڈی کہا، ہاں!" وہ ایک دم طیش میں آگیا۔

یہ بات مجھے کافی دن بعد معلوم ہوئی کہ وہ اس دن مرنے مارنے پر کیوں تیار ہو گیا تھا۔ اس نے مولی اور گاجر کہنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا، ہاں بھنڈی کے ذکر پر بپھر گیا تھا۔ دراصل بھنڈی اس کی چڑ تھی۔ اس دن ہاتھا پائی پر نوبت پہنچتے پہنچتے بچی تھی کیوں کہ اس کی وارننگ کے باوجود میں نے اسے کئی بار بھنڈی کہہ دیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر میں نے وہاں سے ٹہل لینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا، لیوسی کا مُنہ بنا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا: "کیوں کیا ہوا، کیا ممی یاد آنے لگیں یا دکٹر کی یاد ستا رہی ہے؟"

"اللہ دتا!" وہ احتجاجی لہجے میں بولی: "مجھے یہ بدتمیزی قطعی پسند نہیں ہے۔"

"دیکھو لیوسی، تم سے شاید میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اب میرا نام نامی اسم گرامی اللہ دتا نہیں، اسے ڈی مہر ہے۔ تم مستقلاً اللہ دتا کی رٹ لگائے ہوئے ہو، مجھے بھی یہ بدتمیزی قطعی پسند نہیں، ہاں! اگر تم باز نہ آئیں تو پھر میں تمھیں اللہ رکھی کہنے لگوں گا۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"بھلا برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"بکو مت!" وہ سخت لہجے میں بولی: "چلنا ہے تو چلو، میں زیادہ فضول باتیں پسند نہیں کرتی، صرف کام کی بات کیا کرو!"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ اب کرنا تم مجھ سے عشق محبت کی باتیں! پھر بتاؤں گا تمھیں!" میری آواز تیز ہو گئی۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ اس وقت کمرے میں "یس سر" یعنی کمال موجود ہے۔

"میں تم سے عشق محبت کی باتیں کرتی ہوں!" وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی: "الزام لگاتے ہو مجھ پر!"

"ٹھیک ہے، پتا چلے گا۔ اب میں بھی تم سے دفتر کی باتوں کے سوا کوئی اور بات نہیں کیا کروں گا۔ تم آخر مجھے سمجھتی کیا ہو!"

"اب چل رہے ہو یا میں اکیلی چلی جاؤں؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کوئی تمھیں گھسنے بھی نہیں دے گا وہاں اکیلے! چلیں نخرا دکھا کر! یہ نہیں دیکھا اپنے ڈی جی صاحب کا خط!" میں نے ہاتھ میں تھاما ہوا لفافہ لہرایا، پھر کرسی چھوڑ دی۔ اسی وقت مجھے کمرے میں کمال کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے کمال کو مخاطب کیا: "دیکھو کمال! ہم ایسے ہی جھوٹ موٹ کو لڑ رہے تھے۔ تم کسی بات کا یقین نہ کرنا، کیوں لیوسی؟" میں نے لیوسی سے تائید چاہی۔

لیوسی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹی مگر کمال جلدی سے بولا: "یس سر... یس سر!"

اس کے بعد میں لیوسی کے ہمراہ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے سے نکلتے ہی وہ پھٹ پڑی: "تمھیں ذرا احساس نہیں کسی کی عزت کا! جو مُنہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ وہ کمال کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں!"

"میں نے کہہ تو دیا اس سے کہ ہم یونہی جھوٹ موٹ لڑ رہے تھے۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"اور تمھارے کہنے پر اس نے یقین کر لیا ہوگا، کیوں؟" وہ مجھے گھورتی ہوئی بولی۔

"نہیں کرتا یقین تو نہ کرے! میں نے یقین دلانے کا ٹھیکا نہیں لیا، ہاں!" میں نے برہم ہو کر کہا۔ آخر میں اس کے دبیل میں نہیں رہتا تھا جو خواہ مخواہ دھونس جاتا۔

"تمھاری یہ حرکتیں بعض اوقات بہت کھَل جاتی ہیں۔" وہ کسی قدر نرم پڑتے ہوئے بولی۔

"تو کھَل جائیں، میں کیا کروں! تم مجھے غصہ ہی کیوں دلاتی ہو!"

"میں نے غصہ دلایا تھا یا تم نے بے سبب مجھے چھیڑا تھا!"

"تو تم بھی چھیڑ دیتیں مجھے! میں نے تم سے کب منع کیا تھا!" میں ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہا۔

"تم سے تو بس خدا ہی بچائے، مغز چاٹ جاتے ہو اور اپنی غلطی تسلیم کرکے نہیں دیتے۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"تم آخر کیوں بھونٹ بنی بیٹھی تھیں جب میں کمرے میں آیا؟" میں نے پوچھا حالانکہ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ کیوں بکی ہوئی تھی۔

"تمھاری بَلا سے!" اس نے ایک ادا سے کہا: "تم تو اپنی ہونے والی بیوی کے والد سے رازدارانہ باتیں کرتے رہو۔" آخر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

"میں نے تم سے بھی تو کہا تھا، تمھیں بھی تو پیشکش کی تھی کہ میری ہونے والی بیوی بن جاؤ مگر تم تو خود ہی نہیں مانیں۔"

"تم پھر بکواس کرنے لگے! مجھے یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔ تمھیں میرے جذبات سے کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔" اس کے لہجے میں سختی آگئی۔

یہی باتیں کرتے ہوئے میں اور لیوسی باہر آگئے۔

ان دنوں شہر سے باہر نئی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ انگریز دہلی ہی میں ایک اور نئی دہلی بنا رہے تھے اور یہ سلسلہ ملکہ

وکٹوریہ کی تاج پوشی کے بعد سے جاری تھا۔ بڑے بڑے سرکاری دفاتر وہیں قائم ہونے لگے تھے اور اعلیٰ انگریز سرکاری افسران بھی زیادہ تر وہیں رہنا پسند کرتے تھے۔ انھیں صدیوں سے آباد شہر کی گھٹی گھٹی فضا پسند نہیں تھی۔ سر تھامسن کی کوٹھی بھی اسی علاقے میں تھی اور ڈیفنس منسٹری کے دفاتر بھی وہیں تھے۔ میں لیوسی کے ہمراہ اس وقت وہیں جا رہا تھا۔

لیوسی نے حسبِ معمول پھٹ پھٹ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ ہر چند کہ اس طرح چپٹ کر بیٹھنے پر میں اُسے چھیڑتا تھا لیکن حقیقتاً مجھے اس کا لمس نہ جانے کیوں بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسا کیوں تھا، میں عمر کے اُس حصے میں اس بات سے زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ صنفِ نازک کا لمس رفتہ رفتہ خود اپنے وجود کے معنی کھولنے لگتا ہے، اس سلسلے میں کسی کے کچھ بتلانے یا سکھانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہ تمام باتیں اس عمر تک پہنچ جانے کے بعد میں زیادہ بہتر طور پر سوچ اور سمجھ سکتا ہوں۔

کشمیری گیٹ سے ڈیفنس منسٹری کا دفتر خاصی دُور تھا مگر راستے میں زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ لیوسی پہلے ہی چِڑی ہوئی تھی۔ میں اب اُسے مزید چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نو تعمیر علاقے میں پہنچ کر ڈیفنس منسٹری کے دفاتر تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ پھر ہم ان دفاتر کے اس مخصوص حصے کی طرف بڑھے جہاں بغیر اجازت نامے کے داخلہ ممنوع تھا۔

اس عمارت کے گرد ایک بڑے رقبے میں خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ہم بہت جلد اس لکڑی کے پھاٹک تک جا پہنچے جو بند تھا اور جس کی دونوں طرف دو مسلح محافظ پہرا دے رہے تھے۔ پھاٹک کے قریب ہی دائیں جانب ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کی مختصر سیڑھیوں کے نیچے بھی دو مسلح محافظ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کمرے میں ان سیڑھیوں سے گزر کر ہی جایا جا سکتا تھا۔

میں نے پھاٹک کے قریب پھٹ پھٹ روک لی۔ ایک گورکھا محافظ ہماری طرف بڑھا۔ قریب آکر اس نے کہا کہ وہ ممنوعہ علاقہ ہے اور ہم اندر نہیں جا سکتے۔

میں سمجھ چکا تھا کہ پھاٹک کے قریب بنا ہوا وہ کمرہ چیک پوسٹ ہی ہوگا۔ میں نے گورکھا محافظ سے کہا، "تم وہاں جاکر پوچھو، ہمارے اجازت نامے وہاں موجود ہوں گے۔" میں نے چیک پوسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

گورکھا محافظ نے اپنے ساتھی کو اشارہ کرکے لکڑی کا پھاٹک کھولا اور چیک پوسٹ کی طرف چلا گیا۔

پھٹ پھٹ کو چیک پوسٹ کے قریب کھڑا کر دیا اور سیڑھیاں چڑھ کر لیوسی کے ہمراہ اس کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں مجھے دو افراد نظر آئے جن میں سے ایک انگریز تھا۔ وہ انگریز چہرے ہی سے سخت عیار معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں دو میزیں پڑی تھیں اور چند کرسیاں۔ ہمارے پیچھے ایک مسلح محافظ آکھڑا ہوا تھا جو ہم سے چند قدم پیچھے تھا۔

"آپ دونوں کو سر تھامسن نے بھیجا ہے؟" انگریز نے سوال کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان کا کوئی خط بھی آپ کے پاس ہے؟"

"جی ہاں۔"

"وہ مجھے دے دیں۔"

"مگر وہ تو سر ہنری کے نام ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ پُرسکون آواز میں بولا۔

میں نے جیب سے لفافہ نکال کر اُسے دے دیا۔ لفافہ بند تھا۔ اُس نے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر مجھے واپس کرنے کی بجائے محافظ کو اشارے سے قریب بلایا۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں محافظ سے کہا کہ وہ لفافہ سر ہنری کے پاس لے جائے اور جب وہ اس کے اندر موجود پیغام پڑھ لیں تو واپس چلا آئے۔ محافظ لفافہ لے کر چلا گیا مگر اس کے باہر جاتے ہی دوسرا محافظ اندر آکر اس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ لیوسی اور میں خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔

"آپ لوگوں کے پاس اگر ریوالور یا کسی قسم کا کوئی ہتھیار ہو تو مجھے دے دیں۔ واپسی میں وہ ہتھیار آپ کو مل جائے گا۔" انگریز نے کہا۔

لیوسی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے رضامندی میں سر ہلایا تو اس نے اپنا وینٹی بیگ کھول کر ریوالور نکالا اور انگریز کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ یہی میں نے بھی کیا۔

"اور کچھ؟" انگریز نے میری اور لیوسی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ہم دونوں نے انکار میں سر ہلا دیے۔ اس کے بعد وہ انگریز اپنی کرسی سے اٹھا اور گھوم کر ہم دونوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیں۔" وہ پہلے مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ تلاشی لینا چاہتا ہے۔ میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔ میرے لیے اس طرح تلاشی دینے کا یہ پہلا موقع

تھے تو میں بول اٹھا، "ارے ارے یہ کیا... کیا کر رہے ہو؟"

"خاموش کھڑے رہیں۔" وہ باز نہ آیا اور مجھے بڑی شرم آئی۔ جب وہ میرے جسم کے ہر حصے پر ہاتھ پھیر چکا تو مجھے ایک طرف دور بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور لیوسی سے مخاطب ہوا۔ "اب آپ آجائیں۔"

"مگر... مگر یہ تو عورت ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا کیوں کہ مجھے معلوم تھا، وہ کس طرح تلاشی لے گا۔

"مجبوری ہے، یہاں کوئی عورت تلاشی لینے کے لیے نہیں ہے اس لیے یہ فرض مجھے ہی ادا کرنا پڑے گا۔" انگریز نے کہا، "ویسے ہمارے محکمے میں دو عورتیں بھی ملازم ہیں، ان کی تلاشی بھی روز میں ہی لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آپ اپنا فرض پورا کریں۔" لیوسی نے مداخلت کی اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

پھر اس حرام زادے انگریز نے جس طرح اپنا فرض پورا کیا، اُسے دیکھ کر میرا خون ہی کھول اٹھا۔ اس نے بے جھجک لیوسی کے جسم پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیے تھے۔ دو بار تو لیوسی کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ اس نے عورت ہونے کے باوجود لیوسی کے ساتھ ذرا سی بھی رعایت نہیں کی تھی۔

تلاشی لے کر اس نے لیوسی کو بھی میری قریبی کرسی پر جاکر بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر خود بھی اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

"بہت حرامی معلوم ہوتا ہے یہ۔ بچے!" میں نے لیوسی کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ اس کا فرض ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو غلطی کا مرتکب ہوگا۔ ہاں یہ ضرور زیادتی ہے کہ یہاں کوئی عورت نہیں۔" لیوسی نے میری بات کا جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ محافظ واپس آگیا جو سر ہنری کے پاس لفافہ لے کر گیا تھا۔

"صاحب کچھ بولا؟" انگریز نے محافظ سے پوچھا۔

محافظ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"اب آپ دونوں اندر جا سکتے ہیں۔" انگریز نے ہم سے انگریزی میں کہا، "یہ لیجیے۔" اس نے ایک کاغذ ہماری طرف بڑھایا۔

میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اس سے وہ کاغذ لے لیا۔ وہ دو افراد کے لیے اجازت نامہ تھا۔ اس اجازت نامے پر ڈیفنس سیکریٹری یعنی سر ہنری کے دستخط تھے اور مُہر بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے لیوسی کو اشارہ کیا۔ ایک مسلح محافظ ہمارے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہ آیا کہ مسلح محافظ ہی کو ساتھ رہنا ہے تو اس

پر بائیں جانب مڑے اور اس دو منزلہ عمارت کا صدر دروازہ نظر آنے لگا تو میں اجازت نامے کا مطلب سمجھا۔ اس عمارت کے صدر دروازے پر بھی دو مسلح محافظ موجود تھے۔ غالباً وہ اجازت نامہ دکھا کر ہی ہم عمارت میں داخل ہو سکتے تھے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ مسلح محافظ کے ساتھ ہونے کے باوجود ان محافظوں نے ہم سے اجازت نامہ طلب کیا۔ اجازت نامہ دیکھ کر انھوں نے واپس کر دیا۔ وہ مسلح محافظ یقیناً پڑھے لکھے ہوں گے ورنہ اجازت نامہ کس طرح پڑھتے۔ وہ محافظ وہیں سے واپس چلا گیا جو چیک پوسٹ سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اب وہاں موجود دونوں محافظوں میں سے ایک ہمارے ساتھ ہو لیا۔ وہی ہماری رہنمائی بھی کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلح محافظ ہماری طرف سے بہت چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔

دوسری منزل کے ایک کمرے تک پہنچا کر وہ مسلح محافظ اس وقت واپس گیا جب سر ہنری نے اپنے اردلی سے ہمیں اندر بلوا لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ سر ہنری بے انتہا بوڑھا ہوگا مگر اندر پہنچتے ہی میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے کسی صورت زیادہ نہیں تھی جب کہ سر تھامسن میرے خیال میں ساٹھ پینسٹھ سال کا تھا مگر اس کے باوجود وہ سر تھامسن کا خالو تھا۔ اس کا باپ شاید سر تھامسن کا ہم عمر رہا ہوگا۔ اب میری یہ حیرت دُور ہو چکی تھی کہ سر تھامسن کے خالو کا باپ کس طرح زندہ ہے۔ یا تو سر تھامسن کی خالہ کم عمر تھی یا پھر اس نے اپنی عمر سے بہت کم عمر کے شخص کو پھانس لیا تھا۔ بہرحال سر تھامسن کی خالہ کو دیکھے بغیر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا جس کے فی الحال امکانات نہیں تھے۔

سر ہنری کا کمرہ بھی سر تھامسن کے کمرے کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ وہ ایک بڑی سی میز کے پیچھے آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہمیں اپنی میز کی طرف آتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اور لیوسی نے باری باری اُسے دوپہر کا سلام کیا، پھر اس کے ہاتھ کا اشارہ پاکر سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا، سر ہنری نے ہمیں مخاطب کیا، "تم لوگوں نے یہاں کے حفاظتی انتظامات دیکھے؟ کیا اب بھی تمھارا خیال ہے کہ یہاں سے کوئی چیز چُرا کر لے جائی جا سکتی ہے؟"

"جی ہاں سر!" لیوسی نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر تلاشی لینے والے کو اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔"

سر ہنری کے چقندر جیسے چہرے پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا، "اپنے ملک اور اپنی قوم سے غداری کا رواج ہندوستانیوں میں ہے، انگریزوں میں نہیں۔"

"معاف کیجیے گا سر! آپ یقیناً ٹھیک کہہ رہے ہوں گے مگر ہم کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہماری تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ ہم ہر شخص پر شبہہ کر سکتے ہیں۔" لیوسی نے ادب سے کہا۔

"پھر تو تم لوگ مجھ پر بھی شبہہ کر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر نجانے کیوں سر ہنری ہنسنے لگے۔

"میرا خیال ہے سر کہ پہلے آپ وہ واقعات سُن لیں جن کی وجہ سے ہمیں یہ شبہہ کیا بلکہ یقین ہے یہاں سے کوئی اہم فائل چُرائی گئی ہے۔" لیوسی بولی۔

"اچھا سناؤ۔" سر ہنری نے کہا۔ "اگر تم لوگ مجھے مطمئن کر سکے تو میں تمھیں ریکارڈ روم چیک کرنے کی اجازت دے دوں گا۔"

پھر لیوسی نے سب سے پہلے مقتول مراری لال کی آمدنی کے واحد ذریعے یعنی تنخواہ کے بارے میں اندازاً بتایا جس کی تصدیق سر ہنری نے بھی کی۔

"اتنی کم تنخواہ پانے والا کوئی شخص کیا کوئی ایسا مکان خرید سکتا ہے سر جس کی قیمت دس ہزار روپے ہو؟" لیوسی نے کہا۔

"نہیں۔" سر ہنری نے جواب دیا۔

اس کے بعد لیوسی نے بقیہ واقعات بیان کیے اور آخر میں مقتول مراری لال کے بوڑھے باپ کے قتل کا واقعہ بیان کرنے کے لیے مجھ سے کہا۔ میں نے وہ واقعہ بیان کر دیا اور بوڑھے نے مرتے وقت جو کچھ بتایا تھا، اس سے لفظ بہ لفظ سر ہنری کو آگاہ کر دیا۔ میں جب پورا واقعہ بیان کر کے خاموش ہوا تو محسوس کیا کہ سر ہنری کچھ کچھ متاثر ہونے لگے ہیں۔ ان کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہونے لگا تھا۔

"تم لوگوں نے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے تو وہی نتیجہ نکلتا ہے جو تم لوگوں نے نکالا ہے مگر اس کے باوجود ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔" سر ہنری نے کچھ دیر بعد اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "بھلا یہ ممکن کس طرح ہے کہ ایک انگریز افسر کسی ہندوستانی کے ہاتھوں بک جائے؟"

"کیا اس انگریز افسر کو وہ غیر ملکی نہیں خرید سکتے جو اصل مجرم ہیں۔ وہ تو ہندوستانی نہیں ہیں سر! ممکن ہے انھوں نے ہی تلاشی لینے والے انگریز افسر کو کسی طرح اس بات پر آمادہ کر لیا ہو کہ وہ مقتول مراری لال کی تلاشی لیتے وقت، فائل نہ پکڑے اور اسے فائل لے کر نکل جانے دے!" لیوسی نے کہا۔

"میں جیک کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی کافی ہے، الاؤنس وغیرہ بھی اُسے خاصا مل جاتا ہے۔" سر ہنری کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "اُسے رقم کا لالچ دے کر تو کسی ایسے کام پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا مگر... مگر..." سر ہنری کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ وہ یقیناً چیک پوسٹ پر متعین افسر ہی کا ذکر کر رہے تھے۔ اسی کا نام جیک ہو گا۔ میں نے سوچا۔

"مگر کیا سر؟" لیوسی نے فوراً لقمہ دیا۔

"خوب صورت عورتیں البتہ اس کی کمزوری ہیں۔" سر ہنری نے طویل سانس لے کر کہا۔ "دو ایک دفعہ مجھے اس کے بارے میں ایسی شکایات مل چکی ہیں۔ یہاں ریکارڈ سیکشن میں ایک خوب صورت ہندوستانی لڑکی نرملا سے بھی اس کا ایک دفعہ زبردست عشق چلا تھا، پھر پتا نہیں کیا ہوا، دونوں میں نااتفاقی ہو گئی۔"

"کیا مجرم نرملا کے ذریعے جیک کو نہیں پھانس سکتے؟" لیوسی بولی۔ "یا پھر ایک صورت اور بھی ہے سر! مقتول مراری لال نے کسی طرح نرملا کو راضی کر لیا ہو اور اسی کے ذریعے فائل نکال لے گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جیک کو نرملا نے ہموار کر لیا ہو گا۔"

"تم واقعی بہت ذہین ہو لڑکی!" سر ہنری نے اعتراف کیا۔ "تم نے اپنی گفتگو سے میرے دل میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیے۔"

لیوسی، سر ہنری کو قائل کر رہی تھی تو پھر مجھے بیچ میں پاؤں اَڑانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر لیوسی میرے ساتھ نہ آتی تو شاید میں اُس بوڑھے کو مطمئن نہ کر پاتا اور مُنہ پیٹتا ہوا وہاں سے واپس چلا جاتا۔

"تو سر، پھر آپ اجازت نامہ دے دیجیے۔" لیوسی نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

"ہاں میں یہی سوچ رہا ہوں مگر تمام ریکارڈ چیک کرنا ایک مسئلہ ہو گا۔ بہرحال میں ریکارڈ سیکشن کے انچارج کو بلواتا ہوں۔" سر ہنری نے یہ کہہ کر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سر! گستاخی معاف، کیا وہ آپ کے اعتبار کا آدمی ہے؟" لیوسی نے پوچھا۔

"اگر کچھ دیر اور تم سے باتیں کرتا رہا لڑکی، تو شاید مجھے اپنے اوپر بھی اعتبار نہ رہے۔" سر ہنری نے مسکرا کر کہا اور گھنٹی بجا دی۔ چند لمحے بعد ہی اردلی کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے کہا۔ "ہارڈی کو ہمارا سلام بولو۔" اردلی حکم سُن کر چلا گیا۔

"میں ایک درخواست اور کروں گی سر! اگر آپ اجازت دیں۔" لیوسی نے سر ہنری سے کہا۔

"بولو، کیا بات ہے؟" سر ہنری نے دریافت کیا۔

"ہمیں نرملا سے گفتگو کرنے کا موقع بھی عنایت کر دیں۔ ممکن ہے اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔" لیوسی بولی۔

"لیکن پہلے یہ بات تو طے ہو جائے کہ ریکارڈ سے واقعی کوئی فائل غائب ہو چکی ہے۔" سر ہنری نے کہا۔

"میرا خیال ہے سر کہ سارا ریکارڈ چیک کرنے میں کافی وقت لگے گا، یہ ایک دن کا کام بہرحال نہیں ہو گا۔" لیوسی نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا۔

"ہاں کم از کم تین چار دن تو ضرور لگیں گے۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ ہارڈی کے علاوہ سیکشن کے بقیہ دو افراد بھی اس سلسلے میں اس کی مدد کریں۔" سر ہنری نے کہا۔

"ظاہر ہے کہ اس دوران میں ہماری یہاں موجودگی ضروری نہیں ہو گی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم روز یہاں آ کر اس سلسلے میں معلومات حاصل کرتے رہیں۔ کیا خبر پہلے ہی دن کامیابی ہو جائے۔" لیوسی بولی۔

"بالکل درست ہے۔" سر ہنری نے کہا۔ "تم لوگ غالباً اس دوران میں متعلقہ افراد سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں سر!" لیوسی نے جواب دیا۔ "تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام نمٹایا جا سکے۔ میں خاص طور پر نرملا سے تو آج ہی ملنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں ہارڈی سے اس سلسلے میں کہہ دوں گا کہ تمھارے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ ریکارڈ روم میں آنے جانے اور اس عمارت کے اندر آمد و رفت کا اجازت نامہ بھی تمھیں آج ہی مل جائے گا۔"

"میں چاہتی ہوں سر کہ جب ہم نرملا سے یا کسی اور فرد سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں تو وہاں دفتر کا اور کوئی فرد نہ ہو۔"

"ہارڈی کا کمرہ الگ ہے۔" سر ہنری نے کہا۔ "وقتی طور پر تم لوگ اسے اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ ہارڈی باہر بیٹھ جائے گا۔" سر ہنری نے لیوسی کی بات کا جواب دیا۔

"ہم جیک سے بھی کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔" لیوسی نے کہا۔

"ڈیوٹی کے دوران میں تو اس کا چیک پوسٹ سے ہٹنا ناممکن ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم لوگ وہیں جا کر اس سے ضروری پوچھ گچھ کر لو۔ پوچھ گچھ کے دوران میں تم لوگ اگر وہاں کسی اور کی موجودگی پسند نہ کرو تو اس کے ہندوستانی ماتحت کو کمرے سے نکال سکتے ہو۔ میں جیک کو بھی ابھی تحریری پیغام بھجوائے دیتا ہوں کہ وہ تم سے تعاون کرے۔"

"بہت بہت شکریہ سر!"

ابھی لیوسی کے الفاظ پورے ہی ہوئے تھے کہ ایک دراز قد انگریز کمرے میں داخل ہوا۔ سر ہنری نے اس سے میرا اور لیوسی کا تعارف کرایا۔ وہ ریکارڈ سیکشن کا انچارج ہارڈی تھا۔ پھر سر ہنری نے ہمارے بارے میں اُسے ضروری ہدایات دیں۔ اسی دوران میں انھوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر تحریری اجازت نامہ لکھ لیا۔

"تم ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جا کر نرملا سے ملاؤ اور آج ہی سے تمام کام چھوڑ کر ریکارڈ کی چیکنگ شروع کر دو۔" سر ہنری نے ہارڈی کو حکم دیا، پھر تحریری اجازت نامہ لیٹر پیڈ سے پھاڑ کر لیوسی کی طرف بڑھا دیا جو مجھے کچھ گراں سا گزرا۔ سر ہنری میری موجودگی میں خواہ مخواہ لیوسی کو اہمیت دے رہے تھے۔ پھر انھوں نے چلتے چلتے میرے ایک اور تینگا لگا دیا۔ انھوں نے لیوسی سے کہا۔ "مسٹر اے ڈی مہر غالباً تمھارے ماتحت ہیں!" سر ہنری نے غالباً اپنے خط میں صرف میرے اور لیوسی کے نام ہی لکھے تھے، عہدے نہیں۔

سر ہنری کی بات سُن کر میں جل بھُن گیا مگر لیوسی نے جب تردید کر دی تو مجھے کچھ چین پڑا۔ اس نے کہا۔ "سر! انسپکٹر اے ڈی مہر ہی پہلے اس کیس پر کام کر رہے تھے۔ مجھے تو آج ہی اس کیس میں ان کی مدد کرنے کا حکم ملا ہے۔"

"تعجب ہے۔" سر ہنری بولے۔ "لگتا تو ایسا ہے کہ تم ہی اس کیس پر کام کر رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان سے کیس حل نہیں ہوا ہو گا تو تمھارے افسران نے ان کے ساتھ تمھیں بھی کام کرنے کا حکم دیا ہو گا۔"

"نہیں، یہ بات نہیں سر!" لیوسی نے سر ہنری کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا۔ "انسپکٹر اے ڈی مہر سے پہلے مقتول مراری لال کا کیس ایک اور انسپکٹر کے پاس تھا مگر وہ ناکام رہے اسی لیے اب یہ کیس انھیں دیا گیا ہے کیوں کہ یہ ہمارے محکمے کے بہت ذہین افراد میں سے ہیں۔"

سر ہنری نے گردن ہلائی۔ "اچھا اچھا! مجھے تم دونوں ہی سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

میں سر ہنری کا شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیوسی بھی میرے ساتھ ہی اٹھی تھی۔ سر ہنری کو لیوسی نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی متاثر کر دیا تھا جو وہ مجھے قطعی گھاس ڈالتے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو لیوسی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے میری عزت بچا لی تھی۔

میں اور لیوسی ریکارڈ سیکشن کے انچارج ہارڈی کی رہنمائی میں چلنے لگے۔ میں نے چلتے چلتے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "لیوسی! کیا تم واقعی میرے بارے میں وہی رائے رکھتی ہو جس کا اظہار تم نے

سر ہنری کے سامنے کیا تھا یا دفتی طور پر وہ بات کہہ دی تھی؟"

"میں تمھیں قطعی ذہین وہین نہیں سمجھتی، سمجھے! کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" لیوسی منہ بنا کر بولی۔

"بڑی پٹو ہو تم لیوسی کی بچی!" میں جل کر بولا۔

"بدتمیزی نہ کرو اور اپنی کھال میں رہو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "ذرا سی کسی کے سامنے تعریف کر دو تو سر پر چڑھنے لگتے ہو۔"

"کیوں سفید جھوٹ بول رہی ہو، تمھارے سر پہ چڑھنے کی میں نے کوشش کی ہے! اوّل تو تمھارے سر پہ اتنی جگہ ہی نہیں، پھر یہ کہ میں اتنا بے وقوف بھی نہیں کہ ایسی کوشش کروں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے وقوف تو ہو مگر اتنے نہیں ہو!"

"تمھارا سر مطلب ہوا اس کا!" میں بگڑ کر بولا۔ "آئندہ ہرگز مجھے بے وقوف کہنے یا سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، ہاں!"

"دیکھو جہاں تک کہنے کا تعلق ہے تو چلو میں نہیں کہوں گی لیکن سمجھنے پر تم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے۔"

"اچھا تو سمجھ کر دیکھو، پھر بتاتا ہوں تمھیں!" میں غصے میں بولا۔ "یہ دن دیکھنے سے بہتر تو یہ تھا کہ تمھیں وہاں کوٹلہ فیروز شاہ کے تہ خانے میں چھوڑ آتا، اُڑ جاتیں بھک سے!"

لیوسی میری بات سن کر ہنس پڑی اور اسی وقت ہارڈی نے اسے مخاطب کیا۔ "مس لیوسی! ادھر سے آئیے!"

وہ ایک تنگ سی راہ داری تھی جس سے اب ہم گزر رہے تھے۔ وہ راہ داری سلاخوں دار آہنی دروازے پر ختم ہوئی جو باہر کی جانب کھلا ہوا تھا۔ سلاخوں دار دروازے کے علاوہ بھی اندر کی طرف کھلتا ہوا لکڑی کا ایک اور دروازہ تھا۔ سلاخوں دار دروازے کے باہر ایک مسلح محافظ موجود تھا۔

"آئیے، چلے آئیے۔" ہارڈی دروازے میں داخل ہو کر بولا۔ "یہی ریکارڈ سیکشن ہے۔"

میں اور لیوسی اندر پہنچ گئے۔ وہاں عجیب سی بو تھی اور اندھیرا بھی۔ دن کے وقت بھی وہاں لائٹ جل رہی تھی۔ ایک مختصر سی راہداری سے گزر کر دائیں جانب ایک دروازہ نظر آیا۔ ہارڈی اس میں داخل ہوا اور ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں تین میزیں پڑی ہوئی تھیں مگر افراد دو دو ہی تھے۔ دو میزیں برابر تھیں، ایک سامنے! ان تینوں میں سے ایک میز خالی تھی، البتہ دو میں سے ایک میز پر مجھے "سرو قدے لالہ رخسارے" بیٹھی نظر آئی۔ اس حسینہ کا نام نرملا ہو سکتا تھا۔ وہ پھول دار ساری پہنے ہوئے تھی اور خود بھی ایک بڑا سا پھول تھی۔ سر ہنری نے غلط نہیں کہا تھا، وہ لڑکی واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اگر جیک اس سے عشق لڑا رہا تھا تو غلطی نہیں کر رہا تھا۔ پتا نہیں جیک کا "جیک" لگا یا نہیں اور وہ اس حسینہ کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا یا نہیں مگر تھی وہ ایسی ہی کہ اس سے عشق لڑایا جائے۔ کمرے میں موجود دوسرا شخص ادھیڑ عمر تھا اور اس کی چکنی کھوپڑی کی اطراف میں بالوں کی صرف ایک جھالر سی رہ گئی تھی جو اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ پیدائشی گنجا نہیں تھا اور کبھی اس کی چندیا پر بھی بال ہوا کرتے تھے۔

"ان سے ملیے، یہ مسٹر منوہر داس ہیں۔" ہارڈی نے گنجے کا تعارف کرایا۔ گنجے کے برابر والی میز خالی تھی۔ ہارڈی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں کبھی مسٹر مراری لال بیٹھتے تھے۔" اس کے لہجے سے افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر وہ پلٹا۔ "اور یہ ہیں نرملا دیوی۔"

نرملا نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر لیوسی کو اور مجھے آداب کیا۔ میں نرملا کی اس ادا پر لٹو ہو گیا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر ہمیں حیرت سے دیکھا تھا۔

ہارڈی نے باری باری نرملا اور منوہر داس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں افراد کا تعلق سی آئی ڈی سے ہے اور یہ لوگ مقتول مراری لال کے قتل کی تفتیش کر رہے ہیں۔ ہم سبھی کو ان سے مکمل تعاون کرنا ہے۔ یہ انسپکٹر مسٹر اے ڈی مہر ہیں اور یہ انسپکٹر لیس مس لیوسی۔" ہارڈی نے ان دونوں سے بھی ہمارا تعارف کرا دیا۔

اس کے بعد ہارڈی ہم دونوں کو اپنے کمرے میں لے گیا جس کے باہر اسٹول پر ایک چپراسی بیٹھا ہوا تھا۔

"وہ ریکارڈ کہاں رکھا ہے؟ مجھے نظر نہیں آیا۔ باہر دونوں میزوں پر تو صرف چند فائلیں رکھی تھیں۔" میں بولا۔

"کیا آپ ریکارڈ روم دیکھنا چاہتے ہیں؟" ہارڈی نے پوچھا۔

"ہاں کیا حرج ہے، دکھا ہی دیں۔" میں بولا۔

"تو پھر آئیے!" ہارڈی اپنی کرسی سے اٹھ کر دائیں جانب کی دیوار تک پہنچا جو مجھے ایک چھوٹے سے سیاہ بٹن کے علاوہ سپاٹ نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے دیوار پر لگے ہوئے سیاہ بٹن کو دبایا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ دیوار ایک طرف کھسکتی چلی گئی اور پھر ایک مقفل آہنی دروازہ نظر آیا۔ ہارڈی نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر دروازے پر پڑا ہوا بھاری تالا کھول دیا۔ پھر جب اس نے دروازہ کھولا تو وہی ناگوار عجیب سی بدبو کچھ زیادہ شدت سے محسوس ہوئی جو وہاں آتے ہی میری ناک میں گھسی تھی۔ ہارڈی نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے قریب ہی لگا ہوا سوئچ آن کر دیا تو ایک دم ریکارڈ روم روشن ہو گیا۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں بڑے بڑے آہنی شیلف رکھے ہوئے تھے۔ شیلف اتنے بڑے بڑے تھے کہ چھت کو چھو رہے تھے۔ شیلفوں کے درمیان پتلی پتلی سی گلیاں تھیں اور وہ سارے

ہی شیلف فائلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں کئی سیڑھیاں بھی نظر آئیں۔ وہاں بلا مبالغہ ہزاروں فائلیں تھیں۔

"ٹھیک ہے مسٹر ہارڈی، اب اسے بند کر دیں۔" لیوسی ریکارڈ روم سے نکلتی ہوئی بولی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی نکل آیا۔

"بہتر ہے مس!" ہارڈی نے کہا اور ریکارڈ روم کا آہنی دروازہ بند کرنے لگا۔

جب ہارڈی اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور ہم دونوں بھی اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو لیوسی نے اسے مخاطب کیا۔ "مسٹر ہارڈی! سب سے پہلے تو ہم آپ ہی سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضرور ضرور!" ہارڈی سر ہلا کر بولا۔ "میں آپ کے ہر سوال کا اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

"پہلے تو یہ بتائیں کہ ریکارڈ روم کے قفل کی چابی آپ کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس بھی رہتی ہے؟" لیوسی نے سوال کیا۔

"جب میں دفتر میں ہوتا ہوں تو چابی میرے ہی پاس رہتی ہے لیکن میری غیر موجودگی میں چابی مس نرملا کے پاس ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ جس دن میں چھٹی پر ہوتا ہوں یا کسی اور سبب جلدی دفتر سے چلا جاتا ہوں۔"

"ظاہر ہے کہ دفتر کے افراد کو کام کے دوران میں فائلوں کی ضرورت پڑتی ہو گی۔ تو کیا آپ انھیں ریکارڈ روم سے مطلوبہ فائلیں نکال کر دیتے ہیں یا وہ خود وہاں جا کر فائلیں لاتے ہیں؟ پھر یہ بتائیں کہ کوئی فائل باہر ہی تو نہیں رہ جاتی؟" لیوسی نے دریافت کیا۔

"دفتر کے جس فرد کو بھی کسی فائل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ سے ریکارڈ روم کی چابی مانگ لیتا ہے اور خود ہی مطلوبہ فائل نکال کر لاتا ہے۔ آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی فائل باہر نہیں چھوڑی جاتی، چاہے دوسرے دن صبح ہی پھر اسے کیوں نہ ریکارڈ روم سے نکالنا پڑے۔" ہارڈی نے جواب دیا۔

"تو گویا آپ کے علم میں ہوتا ہے کہ کون سی فائل نکالی گئی، پھر یہ کہ اسے واپس رکھ دیا گیا یا نہیں؟"

"جی ہاں۔" ہارڈی بولا۔ "کیوں کہ فائلوں کا انڈیکس میرے ہی پاس ہوتا ہے اسی لیے میں ہی مطلوبہ فائل کا نمبر انڈیکس میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے علم میں لائے بغیر کوئی شخص فائل نہیں نکال سکتا۔"

"جی ہاں، اگر میں دفتر میں موجود رہوں۔" ہارڈی محتاط لہجے میں بولا۔ "میری غیر موجودگی میں اس کی ذمے داری نرملا پر عائد ہوتی ہے۔"

"شکریہ مسٹر ہارڈی!" لیوسی نے کہا۔ "اب ذرا نرملا کو اس کمرے میں بھیج دیں۔ اس دوران میں آپ باہر ہی تشریف رکھیں۔"

ہارڈی اپنی کرسی سے اٹھا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ہی سرو قد و حسین نرملا، میرے قلبِ ناتواں پر بجلیاں گراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی ہرنی، خوف ناک شکاریوں کے درمیان پھنس گئی ہو۔

"آیئے مس نرملا! یہاں بیٹھیے!" لیوسی نے اپنے برابر والی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک دم بول اٹھا۔ "لیوسی! ان سے کیوں کہ میں بھی سوالات کروں گا اس لیے انھیں درمیان میں بٹھاؤ۔ تم ادھر دوسری کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

لیوسی نے مجھے گھور کر دیکھا مگر کیا وہی جو میں نے کہا تھا۔ وہ نہ جانے اس کے کنوارے جسم کی خوشبو تھی یا کپڑوں پر لگے ہوئے قنوجی عطر کی جس نے میرے پورے وجود کو مہکا دیا۔ ہائے پیارے اللہ میاں نے کیا کیا پیاری صورتیں بنائی ہیں! میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ مجھے خیال آ گیا کہ وہ جیک سے عشق لڑا چکی ہے۔ یہ سوچتے ہی میرے منہ میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ بھلا وہ چوہے جیسی صورت والا انگریز اس قابل تھا کہ نرملا جیسی حسینہ اس سے عشق لڑائے یا وہ بدبخت نرملا کو پھانسنے کی کوشش کرے۔ میری ذہنی رَو بہکنے لگی۔ ابھی وہ سنبھل کر بیٹھی ہی تھی کہ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مس نرملا! آپ کو دیکھ کر قطعی یقین نہیں آتا کہ آپ نے عشق کرنے میں پہل کی ہو گی بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ اسی صورت حرام جیک نے آپ پر عشق کا جال پھینکا ہو گا، خود آپ کو اس سے عشق ہرگز نہیں ہوا ہو گا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"ج... جی... جی! ام... میں آپ کی بات کا... مط... مطلب نہیں سمجھی۔" نرملا کی آنکھیں غیر متوقع بات سن کر حیرت سے پھیل گئیں اور وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ مجھے لیوسی کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار نظر آ رہے تھے مگر میں ان باتوں کی پروا کب کرتا، میرے دل میں تو جو کانٹا کھٹک رہا تھا، پہلے اُسے نکالنا چاہتا تھا۔

"میرا خیال ہے، مس نرملا آپ بالغ ہو چکی ہیں اور عشق کرنے یا عشق کرانے کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ... آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں! ام... میں... میں کیا کہوں!" وہ مزید گھبرا گئی۔

"وہی کہیں جو حقیقت ہے۔ سچ کہہ دیں کہ آپ کو جیک سے ہرگز عشق نہیں تھا۔" میرا سارا زور اس بات پر تھا کہ کسی طرح وہ جیک سے اپنے عشق کی تردید کر دے تاکہ میرے دل کو سکون آ جائے۔

"جی... جی ہاں یہ... یہ سب افواہیں ہیں۔ کسی سے ہنس کر بول لینا... بول لینے کا مطلب یہ... یہ تو نہیں ہوتا۔" نرملا بولی۔ "اب

وہ کچھ کچھ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے لگی تھی۔

"اچھا تو آپ کے اور جیک کے درمیان صرف ہنسی کا تبادلہ ہوتا تھا۔ یہ اچھی بات ہے۔ ہنسنا یوں بھی صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اور اس کے درمیان خوش گوار تعلقات تھے۔" میں خوش ہو کر بولا۔ نرملا نے اثبات میں گردن ہلائی تو میں نے ایک اور سوال کیا۔ "خوش گوار تعلقات ہی کے سبب غالباً جیک آپ سے کچھ نرمی برتتا ہوگا۔ وہ دوسرے لوگوں کی طرح آپ کو ہر طرف سے ٹٹول کر نہیں دیکھتا ہوگا۔" دراصل میری خواہش یہ تھی کہ اس جیسے حسین اور نرم و نازک جسم پر کم بخت جیک کبھی ہاتھ بھی نہ لگا پاتا ہو۔

"جی ہاں... جیک بہت شریف اور نیک دل شخص ہے۔ وہ مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتا مگر نہ جانے اسے گزشتہ ایک ماہ سے کس نے میری طرف سے ورغلایا ہے۔ آج کل اس سے میرے تعلقات خوش گوار نہیں۔"

"دراصل مس نرملا! انسپکٹر اللہ دتا یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جیک نے کبھی ایسا بھی کیا کہ آپ کو بغیر تلاشی لیے چلا جانے دیا ہو؟" لیوسی نے مداخلت کی۔

"ہاں اسے مجھ پر اعتماد تھا اور اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔" نرملا نے اعتراف کیا۔

"مقتول مراری لال سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟" اس بار بھی لیوسی ہی نے سوال جڑ دیا اور میں بور ہو گیا کیوں کہ وہ غنچہ دہن میری طرف سے اپنا روئے زیبا پھیر کر لیوسی کم بخت کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

مقتول مراری لال کا ذکر آتے ہی نرملا چونک سی پڑی۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے لیوسی کے سوال کا جواب دیا۔ "وہ... وہ بس جیسے ہونا چاہئیں ویسے ہی تعلقات تھے... کوئی خاص بات نہیں۔"

"اس سے آپ ہنسی کا تبادلہ نہیں کرتی تھیں؟" میں نے نرملا کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر کہا۔

"جی... جی نہیں... ایسی... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" نرملا نے ہکلا کر جواب دیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"شکریہ مس نرملا! آپ فی الحال جائیں اور منوہر داس جی کو بھیج دیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ کو پھر بلا لیں گے۔" لیوسی نے اچانک ہی کہہ دیا اور وہ ظالم بلکہ ظالمہ فوراً ہی اٹھ بھی کھڑی ہوئی۔

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ابھی تو میری آنکھوں کی پیاس بجھی بھی نہیں تھی۔ لیوسی پر مجھے بہت غصہ آیا۔ نرملا جیسے ہی کمرے سے نکلی میں برس پڑا۔ "ابھی سے کیوں بھیج دیا اُسے؟ ابھی تو میری آنکھوں..." پیچ بات میری زبان پر آتے آتے رہ گئی اور میں نے جلدی سے منہ بند کر لیا۔ پھر چند لمحے بعد ہی بولا۔ "ابھی تو مجھے اس سے مزید پوچھ گچھ کرنا تھی۔"

"مزید پوچھ گچھ کرنا تھی کہ مزید آنکھیں سینکنا تھیں!" لیوسی ترش لہجے میں بولی۔

سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے اس لیے مجھے بھی کڑوی لگی۔ میں جھنجلا کر بولا۔ "ہاں سینکنا تھیں آنکھیں! تم کون قاضی کہ مُلّا! تمھیں کس نے منع کیا ہے آنکھیں سینکنے یا پھوڑنے سے! میری آنکھیں ہیں جو چاہوں کروں۔"

"میں تمھاری طرح بد نظر نہیں ہوں۔" لیوسی منہ بنا کر بولی۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور منوہر داس کی شکل نظر آئی جو اپنی سپاٹ چندیا پہ ہاتھ پھیرتا ہوا اندر آ رہا تھا۔ میں نے لیوسی کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "اب تم سینک لینا اپنی آنکھیں!"

"بکو مت!" لیوسی نے مجھے جھڑک دیا۔

نرملا جیسی نرل اور کومل لڑکی کے بعد منوہر داس جیسے بدشکل کو دیکھ کر میری طبیعت مکدر ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "تم نے بلایا ہے تو تمھی اس سے سوالات کرنا۔"

اس دوران میں منوہر داس قریب آ گیا۔ لیوسی نے اس سے کہا۔ "بیٹھیے منوہر داس جی!" اس نے اسی کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر کچھ دیر پہلے نرملا بیٹھی تھی۔ منوہر داس کی طرف سے میں نے منہ پھیر لیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو لیوسی نے کہا۔ "منوہر داس جی! آپ یہ بتائیں کہ مس نرملا اور مقتول مراری لال کے درمیان کیسے تعلقات تھے؟"

"اچھے تعلقات تھے جی!" منوہر داس بولا۔

"اچھے سے آپ کی مراد کیا ہے؟" لیوسی نے وضاحت چاہی۔

"مطلب یہ جناب کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو..." منوہر داس کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ مقتول مراری لال بھی جوان تھا اور نرملا بھی... ایسا ہوتا ہی ہے۔"

"کیا ہوتا ہے؟ صاف صاف بتائیں!" لیوسی کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "آپ کوئی بات چھپا کر اپنے حق میں اچھا نہیں کریں گے!"

"مجھے کیا... میں تو سوچ رہا تھا جناب کہ اب وہ مر گیا ہے تو اس کا کیا پردہ کھولوں مگر... مگر مجھے... مجھے معلوم ہے کہ اس کا کردار اچھا نہیں تھا۔" منوہر داس نے کہا۔ اب وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

"ہیں... ایک دفعہ اسے اپنے گھر بھی لے گیا تھا لیکن... لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ شریف گھرانوں میں آ جا سکتا۔ پھر میں اسے کبھی اپنے گھر نہیں لے گیا۔"

"گھر کی بجائے دفتر کی بات کریں۔" لیوسی نے اسے ٹوکا۔ "میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ مقتول مراری لال اور مس نرملا کے درمیان کیسے تعلقات تھے؟"

"وہ نرملا کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ وہ نرملا سے مقصد نکال کر اسے دھتکار دے گا۔" منوہر داس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتایا۔

"کیا آپ اس مقصد پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتے؟" لیوسی نے مزید وضاحت طلب کی۔

منوہر داس کچھ گڑبڑا سا گیا۔ وہ شاید لیوسی سے یعنی کسی عورت سے ایسے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ لیوسی کیا معلوم کرنا چاہتی تھی۔ منوہر داس یقیناً لیوسی کے اس سوال کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "آپ... آپ خود سمجھ لیں جناب... کہ... کہ ایک خوب صورت جوان لڑکی سے... کیا... یعنی ایک جوان مرد کیا مقصد نکال سکتا ہے!"

لیوسی نے اس کی بات سن کر ایک طویل سانس لیا اور اسی وقت ایک زبردست دھماکا سنائی دیا۔ میں اچھل پڑا۔ یہی کیفیت لیوسی کی ہوئی تھی مگر منوہر داس پر اس کا کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف چونک کر رہ گیا تھا اور یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ زبردست دھماکا باہر والے کمرے میں ہوا تھا جہاں نرملا اور ہارڈی موجود تھے۔

وہ زبردست دھماکا سن کر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ گئی لونڈیا کام سے، یعنی نرملا نے خودکشی کر لی۔ پھر لیوسی اور میں دونوں ہی ایک ساتھ اپنی اپنی کرسیوں سے اٹھے تھے مگر منوہر داس اب بھی مطمئن انداز میں اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ منوہر داس کو اس طرح پُرسکون دیکھ کر میری ہی طرح غالباً لیوسی کو بھی حیرت ہوئی تھی مگر وہ حیرت کا اظہار کرنے کی بجائے دروازے کی طرف لپکی تھی۔ میری مراد زبانی اظہار سے ہے۔ میں بھی لیوسی کے پیچھے دوڑ لیا تھا۔ لیوسی نے بڑھ کر دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کمرے میں صرف ہارڈی موجود تھا۔

"نرملا کہاں ہے؟" لیوسی نے ہارڈی سے سوال کیا جو ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کا اطمینان بھی میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

"وہ لیٹرین گئی ہے۔" ہارڈی نے لیوسی کے سوال کا جواب دیا۔

"لیٹرین کدھر ہے؟" لیوسی نے فوراً دوسرا سوال کیا۔

"اُدھر!" ہارڈی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اسی ہال کمرے کے ایک کونے میں لیٹرین کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ پھر ہارڈی بولا۔ "مگر آپ دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

مجھے اس کے سوال پر غصہ آ گیا۔ یہ تو مجھے علم ہو چکا تھا کہ وہ اور منوہر داس بہرے نہیں ہیں ورنہ ہمارے سوالات کے جواب میں پٹاپٹ نہ بولتے رہتے، پھر یہ دونوں اتنے بھولے شاہ کیوں بنے ہوئے تھے جیسے انھوں نے دھماکا سنا ہی نہ ہو۔ میں جل کر بولا۔ "کیا آپ کے کان گھاس چرنے چلے گئے ہیں؟"

"جی؟" وہ میری بات سن کر حیرت سے بولا۔ "میں سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں!"

اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی سخت بات کہتا، لیوسی بول اٹھی۔ "مسٹر ہارڈی! ابھی چند لمحے پہلے جو دھماکا ہوا ہے، کیا آپ نے نہیں سنا؟"

"کیوں نہیں سنا۔" ہارڈی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ "مگر یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"یعنی یہاں دھماکے ہوتے ہی رہتے ہیں اور آپ لوگوں کے کان بلکہ کانوں پر جوں نہیں رینگتی حالانکہ اسے رینگنا چاہیے؟" میں پھر بول اٹھا۔

"معاف کیجیے گا، یہ دھماکے یہاں نہیں، کافی فاصلے پر ہوتے ہیں۔" ہارڈی کا لہجہ خشک تھا۔ "یہ بات آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ یہاں تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کو اڑانے اور زمین ہموار کرنے کے لیے ظاہر ہے ڈائنامائٹ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اب سمجھے آپ!"

ادھر ہارڈی کی بات پوری ہوئی، اُدھر لیٹرین کا دروازہ کھلا اور نرملا کا چہرہ نظر آیا۔ لیوسی نے ٹھنڈا سانس لیا تو میں بھی پیچھے نہ رہا، میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا! میں نے سوچا۔ نرملا صحیح سالم تھی اور اب اپنی نشست پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔

"آؤ اندر چلیں۔" لیوسی نے مجھ سے کہا اور دوبارہ اندر والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے اُس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

ہم دونوں اندر پہنچے تو منوہر داس بدستور اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس پر ہم اُسے چھوڑ کر گئے تھے مگر اب اس کے چہرے

بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ باری باری میں نے اور لیوسی نے دوبارہ اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

"ہاں تو منوہر داس جی، آپ یہ کہہ رہے تھے کہ مراری لال، نرملا سے اپنا کوئی مقصد نکالنا چاہتا تھا" لیوسی نے منوہر داس کو مخاطب کیا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہے؟"

"یہ ... یہ مجھے نہیں معلوم اور ... اور معلوم بھی کیسے ہو سکتا ہے" منوہر داس کچھ گھبرا کر بولا۔

"اس سلسلے میں ممکن ہے، مراری لال نے آپ سے کچھ کہا ہو" لیوسی نے کہا۔

"جی نہیں، اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی" منوہر داس نے بتایا۔

"اچھا اب آپ جائیں اور مس نرملا کو اندر بھیج دیں" لیوسی بولی اور اس کی بات سن کر میں کھل اٹھا۔ منوہر داس، کمرے سے نکل گیا۔

اس کے کمرے سے نکلتے ہی لیوسی مجھ سے بولی "اس بار نرملا سے میں سوالات کروں گی، تم خاموش بیٹھو گے"

"کوئی زبردستی ہے!" میں نے چڑ کر کہا "تم نے اتنی دیر پوچھ گچھ کر تو لی اور کیا لوٹو گی کسی کو!"

"تم غیر متعلق باتیں کرنے لگتے ہو" لیوسی منہ بنا کر بولی۔

"اور تم بڑی کام کی باتیں کرتی ہو!" میں نے ہاتھ نچا کر کہا "میں نے کہہ دیا ہے ہاں، اب میری باری ہے"

"تو پھر میں جا رہی ہوں، تم کرتے رہو اس سے جی بھر کر باتیں اور سینکتے رہو آنکھیں!" یہ کہہ کر لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے ارے کہاں جا رہی ہو، یوں مجھے اکیلا چھوڑ کر!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ بھلا میرے بس میں کب تھا کہ تن تنہا ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا۔

"تو پھر وعدہ کرو کہ اپنی چونچ بند رکھو گے!" لیوسی نے کہا۔

"ہر چند کہ مجھے لفظِ 'چونچ' پر سخت اعتراض ہے مگر پھر بھی وعدہ" میں جلدی سے بولا "بس کبھی کبھی بولنے دینا"

ابھی میرا جملہ ختم ہوا تھا کہ وہ غارت گر ہوش بجلیاں گراتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید وہ دوبارہ بُلائے جانے پر اور بھی فکر مند ہو گئی تھی۔ لیوسی کے اشارے پر وہ پھر میرے اور اس کے درمیان بیٹھ گئی۔

"مس نرملا! جب مسٹر ہارڈی یہاں نہیں ہوتے تو ریکارڈ روم کی چابی آپ کے پاس رہتی ہے؟" لیوسی نے اس سے سوال کیا۔

"جی ... جی نہیں ... جی ہاں ..." وہ کچھ گھبرا کر بول اٹھی۔ شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی مگر چند لمحے بعد اس نے خود پر قابو پا لیا، پھر بغیر جھجکے کہا "جی ہاں! ایسی صورت میں ریکارڈ روم کی چابی میرے ہی پاس رہتی ہے تاکہ مسٹر ہارڈی کی غیر موجودگی میں کسی فائل کی ضرورت پڑ جائے تو پریشانی نہ ہو لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے"

"لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے!" لیوسی نے مزید تصدیق کی خاطر کہا اور نرملا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کی نُبک سی صراحی دار گردن ہلتے ہوئے مجھے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی نازک سی ہری بھری شاخ لچک رہی ہو۔ لیوسی نے چند لمحے توقف کے بعد ایک اور سوال کیا "سُنا ہے، مقتول مراری لال سے بھی آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟" لفظِ قریبی پر لیوسی نے کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا جس کا مطلب سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا کیوں کہ میں منوہر داس کا بیان سُن چکا تھا۔

"یہ سوال آپ پہلے بھی کر چکی ہیں اور میں اس کا جواب دے چکی ہوں" نرملا نے جواب دیا "ظاہر ہے، ہم دونوں روز ملتے تھے اس لیے کہ ایک ہی دفتر میں تھے۔ دفتری ساتھیوں سے جس طرح کے تعلقات ہوتے ہیں، میرے ایسے ہی تعلقات مراری لال جی سے بھی تھے"

میں نے سوچا کہ جس طرح لیوسی اس سے پوچھ رہی ہے، اس طرح وہ کچھ نہیں قبول کرے گی۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ جب کوئی مرد کسی لونڈیا پر ڈورے ڈالتا ہے تو اُسے پر چلنے کے لیے تحفے تحائف بھی دیتا ہے۔ منوہر داس کے بیان کی روشنی میں یہ تو طے تھا کہ مقتول مراری لال اس پر ڈورے ڈال رہا تھا اور جب ڈورے ڈال رہا تھا تو اس نے تحفے کی صورت میں کسی شوئی کا بندوبست بھی کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں، لیوسی کے کچھ مزید کہنے سے پہلے ہی بول اٹھا "مس نرملا! اگر مقتول مراری لال سے آپ کا کوئی چکر نہیں چل رہا تھا تو پھر وہ آپ کو تحفے تحائف کیوں دیتا رہتا تھا؟"

"تحفے تحائف!" وہ حیرت سے بولی "اس نے تو ... ایک کیمرہ ... جی وہ میرا مطلب ہے صرف ایک کیمرہ تک نہیں دیا" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم بات پلٹ گئی۔

"دیکھیے مس نرملا! جھوٹ بالکل نہ بولیں!" لیوسی نے اس بار سخت لہجے میں کہا "جھوٹ بولنا آپ ہی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ ہمیں پتا چل چکا ہے کہ اس نے آپ کو ایک کیمرہ

تحفے میں دیا تھا"

"لیکن یہ ... یہ کوئی جرم نہیں اور ... اور پھر اس نے ... انھوں نے وہ ... وہ کیمرہ واپس بھی تو لے لیا تھا"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ تسلیم کرتی ہیں کہ مقتول مراری لال نے کوئی کیمرہ آپ کو تحفے میں دیا تھا؟" لیوسی کا لہجہ سوالیہ تھا۔ نرملا نے اثبات میں سر ہلا کر گردن جھکا لی۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے جو تیر اندھیرے میں چلایا تھا، وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ لیوسی کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ پھر تو اس نے نرملا کے ہوش اُڑا دیے۔ لیوسی نے یکے بعد دیگرے اندھیرے میں اتنے تیر چلائے کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اتنی اچھی تیر انداز ہوگی۔ اس نے نرملا سے کہا "وہ کیمرہ لے کر آپ دفتر میں بھی آئی تھیں مس نرملا؟"

"جی ... جی ہاں" نرملا نے اعتراف کیا۔

"اور پھر مقتول مراری لال کے ایما پر آپ نے ریکارڈ روم میں موجود ایک خاص فائل کے کاغذات کی تصاویر بھی اتاری تھیں؟"

لیوسی کے دوسرے سوال کا جواب دینے میں نرملا نے توقف کیا۔ وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"میرے سوال کا جواب دیں مس نرملا!" لیوسی کا لہجہ سخت تھا۔ جواب میں نرملا نے گردن ہلا دی مگر اس طرح کہ نہ اقرار معلوم ہو نہ انکار! یہ دیکھ کر لیوسی نے اُسے ڈانٹا "منہ سے بولیں!"

"میں ... میں مجبور ... مجبوری ہو گئی تھی ... ورنہ وہ ... وہ مجھے بدنام کر دیتا۔ میں پھر کہیں کی نہ رہتی" یہ کہہ کر نرملا سسک پڑی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

کچھ دیر کمرے میں نرملا کی سسکیاں گونجتی رہیں، پھر اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس کا نرم و نازک جسم جس طرح بار بار جنبش کر رہا تھا، اسے دیکھ کر میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی۔ اسی کے ساتھ مجھے اس پر رحم بھی آ رہا تھا۔ ہائے وہ حسینہ اس لیے تو نہیں تھی کہ اُسے اس طرح سسکایا جاتا۔ یہ سوچ کر مجھے لیوسی پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ اس سے سخت لہجے میں بات کر رہی تھی۔ شاید اسی لیے اس نرم دل حسینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"تم مجھے بتاؤ وہ حرام خور کون تھا جو تمھیں بدنام کرنا چاہتا تھا، میں اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا" میں نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا اور لیوسی نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ میں نے اس موقع پر لیوسی کا خیال بھی نہ کیا اور اسے ڈانٹ دیا "تم چپ رہو گی! خواہ مخواہ رُلائے چلی جا رہی ہو!" اس کے بعد میں نے دوبارہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ ہمدردی کے اظہار میں اسے گلے لگا لوں مگر لیوسی نہ جانے کیا سمجھ بیٹھتی اس لیے میں نے صرف سر پر ہاتھ پھیرنا کافی سمجھا اور بولا "ہاں بتاؤ چاند!" میں نے اسے چاند کہہ کر ایک قدم اور بڑھایا۔

اس نے سر اٹھا کر اپنی ساری کے پلو سے آنسو پونچھے، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "آپ ... آپ بہت اچھے ہیں مگر میں ... میں بہت بُری ہوں، بہت بُری!"

"ارے بس خواہ مخواہ شرمندہ نہ کرو مجھے!" میں واقعی شرما گیا۔ "تم بھی بہت اچھی ہو، بہت اچھی!" میں نے موقع دیکھ کر پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔

خدا جانے میری ہمدردی کا اس پر کیا اثر ہوا کہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں ... میں آپ سے اب کچھ نہیں چھپاؤں گی"

میں نے سینہ پھلا کر فخریہ انداز میں لیوسی کی طرف دیکھا۔ لیوسی کی سختی کے بعد میری ایک دم نرمی کام کر گئی تھی جسے میں اپنا کارنامہ سمجھنے میں حق بجانب تھا۔

کچھ دیر توقف کے بعد نرملا نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر میں حیران رہ گیا مگر لیوسی کے چہرے سے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں ہوا۔ اس کے لیے شاید وہ باتیں زیادہ حیرت انگیز نہیں رہی ہوں گی۔ اپنی گفتگو کے آغاز میں نرملا کچھ جھجک رہی تھی اور مبہم سی باتیں کر رہی تھی مگر ذرا دیر بعد اس کی یہ جھجک ختم ہو گئی۔ جھجک کا سبب وہاں ایک عدد مرد یعنی میری موجودگی تھی۔

نرملا نے بتایا کہ جیک اور اس کے درمیان طویل عرصے سے تعلقات تھے جس کا کسی قدر احساس دفتر والوں کو بھی ہو گیا تھا۔ مقتول مراری لال بھی اس بات سے آگاہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے نرملا سے قریب ہونا چاہا۔ نرملا ایک حد تک مراری لال کی بے تکلفی کو برداشت کرتی رہی اور پھر سختی سے اس نے مراری لال کو دھتکار دیا مگر وہ ڈھیٹ شخص اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ نہ جانے کہاں سے مراری لال نے ایک ایسی تصویر حاصل کر لی جس میں نرملا اور جیک، انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر نظر آ رہے تھے۔ مراری لال نے وہ تصویر نرملا کو دکھائی اور پھر نرملا اس کے ہاتھوں میں کھلونا بننے پر مجبور ہو گئی۔ نرملا بھی سمجھی تھی کہ شاید مراری لال اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے بعد خاموش ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ وہ دن تھے جب جیک سے نرملا کا عشق زوروں پر چل رہا تھا۔ جیک، نرملا کی تلاشی

نہیں لیتا تھا۔ مراری لال نے اس سے فائدہ اٹھا کر نرملا کو ایک چھوٹا سا کیمرہ تحفتہً دیا۔ پھر خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کیمرے کو دفتر میں لے آئے۔ اس وقت تک نرملا، مراری لال کے عزائم سے بے خبر تھی۔ کیمرہ، مراری لال نے نرملا ہی کی میز کی ایک دراز میں رکھوا دیا اور پھر جب ایک دن ہارڈی چھٹی پر تھا تو مراری لال نے نرملا سے اپنا مقصد بیان کیا۔ ریکارڈ روم کی چابیاں نرملا کے پاس تھیں۔ مراری لال، نرملا کے ہمراہ ریکارڈ روم میں گیا۔ اس سے پہلے وہ کیمرہ ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ ریکارڈ روم میں پہنچ کر مراری لال نے ایک فائل نکالی اور کیمرہ نرملا کو تھما دیا۔ نرملا نے مراری لال کے ایما پر اس فائل میں موجود تمام کاغذات کی تصاویر لے لیں۔ پھر اس دن مراری لال کے کہنے پر نرملا، وہ کیمرہ دفتر سے نکال کر لے گئی۔ دفتر سے کچھ دور نکلتے ہی مراری لال نے نرملا سے وہ کیمرہ لے لیا۔ پھر تقریباً ایک ماہ بعد دوبارہ یہی سب کچھ ہوا۔ ایک اور فائل میں موجود کاغذات کی تصاویر اتاری گئیں اور دوبارہ وہ کیمرہ مراری لال کے پاس پہنچ گیا۔ اسی واقعے کے کچھ دن بعد مراری لال قتل کر دیا گیا۔ اب تک نرملا نے جیک کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا مگر مراری لال قتل ہو گیا تو وہ گھبرا گئی اور اسی گھبراہٹ میں اس نے جیک کو سب کچھ بتا دیا۔ نرملا سے سب کچھ سن کر جیک سناٹے میں آ گیا۔ یہ جان کر کہ اس کی محبوبہ کسی اور کی آغوش میں بھی جا چکی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے جیک کی نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مجرمانہ حرکت بھی کی ہے، وہ کھول اٹھا۔ اس دن کے بعد سے جیک نے نرملا سے اپنے تعلقات ختم کر لیے۔ نرملا نے پہلے جھوٹ بولا تھا کہ صرف ایک ماہ سے ان دونوں کے درمیان نااتفاقی ہے۔ اس نااتفاقی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ جیک اس کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتا تھا کہ نرملا سے اپنے تعلقات ختم کر لے۔ اگر وہ معاملے کو آگے بڑھاتا تو خود اس کی پوزیشن خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اس سے بھی جواب طلب کیا جا سکتا تھا۔ اس نے نرملا کے ساتھ نرمی کیوں برتی۔

نرملا تمام واقعات بیان کر کے خاموش ہو گئی تو لیوسی نے سوال کیا "مس نرملا! کیا آپ ان دونوں فائلوں کی نشاندہی کر سکتی ہیں جن میں موجود کاغذات کی تصاویر لی گئی تھیں؟"

"جی نہیں" نرملا نے جواب دیا "دونوں موقعوں پر میں سخت گھبرائی ہوئی تھی کیوں کہ مجھے احساس ہو چکا تھا، جو کچھ ہو رہا ہے، غیر قانونی ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ دونوں فائلیں خود مراری لال نے نکالی تھیں۔ میں نے تو ان کی صرف تصاویر لی تھیں"

نرملا کا جواب سن کر لیوسی بڑبڑائی "یہ تو کچھ بھی نہ ہوا"

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" نرملا نے پوچھا۔

"نہیں" لیوسی بولی اور کچھ سوچنے لگی۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کچھ فکرمند سی ہو گئی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے نرملا کو مخاطب کیا "مس نرملا! تصاویر لیتے ہوئے آپ کی نظر ان فائلوں میں موجود کاغذات پر تو پڑی ہی ہو گی۔ ظاہر ہے جب کسی چیز کی تصویر لی جاتی ہے تو پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ آپ کو کچھ یاد ہے کہ ان کاغذات میں کیا تھا؟ میرا مطلب یہ کہ ان میں کیا لکھا تھا؟" لیوسی نے آخر ایک راہ نکال ہی لی۔

لیوسی کی بات سن کر نرملا سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی "اب اس واقعے کو اتنے دن گزر چکے ہیں کہ شاید ہی مجھے کچھ یاد آ سکے۔ ویسے میں کوشش کرتی ہوں کہ کچھ یاد آ جائے" یہ کہہ کر نرملا پھر سوچنے لگی۔

رات بھر روئے، ایک نہیں ہمارا مسئلہ تھا۔ گاڑی گھوم کر وہیں آ گئی تھی جہاں سے چلی تھی۔ ہاں اتنا ضرور پتا چل چکا تھا کہ وہاں سے کوئی فائل چوری نہیں ہوئی تھی اور اب ریکارڈ روم کی چیکنگ فضول ہی تھی۔ مراری لال نے وہاں سے کوئی فائل چوری کیے بغیر اپنا کام نکال لیا تھا۔ اب یہ سمجھنا بھی زیادہ دشوار نہیں رہا تھا کہ مراری لال نے پہلی فائل کی تصاویر کا سودا کر کے ہی موری گیٹ والا مکان خریدا ہو گا مگر دوسری فائل کی تصاویر کے سودے میں یقیناً کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ مراری لال کو اسی لیے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے اور پھر بالآخر مجرموں نے اس فائل کی تصاویر بھی مراری لال کے قتل کے کافی عرصے بعد حاصل کر ہی لی تھیں۔ مراری لال کے بوڑھے باپ کا قتل اسی سلسلے میں ہوا تھا۔ مقتول مراری لال نے وہ تمام تصاویر، ایک فائل میں رکھ کر اپنے باپ کو دے دی تھیں۔

جب نرملا کافی دیر چپ بیٹھی رہی تو لیوسی نے اسے ٹوکا "کچھ یاد آیا؟"

"نہ جانے کیوں ذہن میں ایک چیز کھٹک رہی ہے جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکتی۔ یوں سمجھ لیں کہ جیسے کوئی بات حافظے میں موجود ہو مگر یاد نہ آ رہی ہو" یہ کہتے ہوئے نرملا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

"مس نرملا! ایسا کرتے ہیں کہ کل تک آپ خوب اچھی طرح سوچ لیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ کو کوئی ایسی بات یاد آ جائے جو ہمارے لیے کارآمد ہو۔ ہم کل پھر اسی وقت آئیں گے" لیوسی نے کہا۔

لیوسی کی بات سن کر نرملا کے چہرے پر گھبراہٹ سی نظر آنے لگی جس کا سبب اس وقت پتا چلا جب وہ بولی۔ اس نے بھرائی ہوئی

سی آواز میں کہا "مگر... مگر میرا انجام... میرا انجام کیا ہو گا؟"

"اس مسئلے پر بھی ہم کل ہی گفتگو کریں گے" لیوسی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی "بہر حال یہ طے ہے کہ کل تک آپ قطعی محفوظ ہیں"

کچھ دیر بعد ہی میں اور لیوسی ریکارڈ سیکشن سے نکل رہے تھے۔ باہر آتے ہی میں نے لیوسی کو مخاطب کیا "اب کیا ارادے ہیں اے جاسوسہ؟"

"بکو مت! تم بڑے وہ ہو" وہ منہ بنا کر بولی "ذرا سی اچھی صورت دیکھی اور تم گئے کام سے!"

"یہ میرے سوال کا جواب ہے؟" میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "میں پوچھ رہا ہوں اب کدھر چلنا ہے؟"

"جہنم میں!" وہ بھنا کر بولی۔

"تو پھر ایسا کرو جانِ من، تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔ میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں" یہ کہہ کر میں ایک طرف مڑا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ لیوسی دل پھینک کے ساتھ ساتھ "ٹانگ پھینک" بھی ہو گی۔ اس نے پیچھے سے اپنی ٹانگ، میری ٹانگوں میں پھنسا دی تھی۔ اگر میں نے زمین پر گرتے گرتے جلدی سے دونوں ہاتھ آگے نہ کر لیے ہوتے تو منہ ٹوٹ جاتا۔

"یہ... یہ کیا بدتمیزی ہے!" میں زمین سے اٹھتا ہوا سخت لہجے میں بولا "اگر خدا نخواستہ میرے کسی جسمانی حصے کو نقصان پہنچ جاتا تو کون ذمے دار ہوتا؟ بولو! میری ہونے والی جورو تمھیں بددعائیں دیتی کہ نہ دیتی!" یہ کہتے ہوئے میں نے کپڑے جھاڑے۔

لیوسی میری بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ عمارت کے صدر دروازے کی طرف تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ کچھ دیر بعد ہی ہم چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔

چیک پوسٹ کے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر لیوسی کو مخاطب کیا "کم از کم اتنا تو بتا ہی دو کہ اس ناہنجار جیک کے اسکریو بھی ڈھیلے کرنا ہیں یا نہیں؟"

"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں" اس نے جواب دیا۔ اس کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

میں ایک بار پھر اسی سخت مرحلے سے گزرا جس سے پہلے گزر چکا تھا۔ اس بار بھی کم بخت جیک نے میرا سارا جسم ٹٹول ڈالا تھا جیسے میں وہاں سے کوئی خزانہ چھپا کر لے جا رہا تھا۔

"اس طرح اپنی ممیاں کی تلاشی نہیں لیتے تھے بیٹا رام!" میں جل کر بولا۔

"وھاٹ؟" جیک نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے غصے میں انگریزی بولنے کی بجائے اردو بول دی تھی۔

"کچھ نہیں مسٹر جیک! یہ مجھ سے مخاطب تھے" لیوسی نے میرے جواب دینے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

جیک سر ہلا کر رہ گیا مگر کمرے میں موجود اس کا ہندوستانی ماتحت مجھے اور لیوسی، دونوں کو گھورنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس نے لیوسی کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ خیریت گزری کہ وہ صرف گھور کر رہ گیا اور اس نے اپنے افسر سے کچھ نہیں کہا۔ میرے بعد جیک نے لیوسی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ لوٹ لے مزے بیٹا! میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کبھی میرے ہتھے چڑھ گیا تو بتاؤں گا۔

وہاں سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو گئی تھی اور اب میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ مجھے علم نہیں کہ ایسے موقعوں پر چوہوں ہی کو کیا مار پڑتی ہے جو پیٹ میں دوڑنے لگتے ہیں! دنیا میں آخر اور بھی تو جانور ہیں، وہ بھی تو پیٹ میں دوڑ سکتے ہیں لیکن بزرگ کیوں کہ چوہے ہی دوڑاتے آئے ہیں اس لیے میں نے بھی انھی کو دوڑنے پر مجبور کیا تھا۔

"کیا خیال ہے لیوسی، آلو چھولے کھاؤ گی؟ بھوک تو تمھیں بھی لگ ہی رہی ہو گی" میں نے ذرا بلند آواز میں کہا تاکہ پھٹ پھٹ کے شور میں لیوسی میری بات سن لے۔

"مجھے یہ واہیات چیزیں قطعی پسند نہیں ہیں" لیوسی نے جواب دیا "بھوکا رہنا اس سے اچھا ہے"

"واو رے سنو، آلو چھولے واہیات چیزیں ہیں! جبھی تو میں تمھیں چوپٹ کہتا ہوں"

"زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو، میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ تم بہت ہرجائی ہو۔ تم نرملا کے سر پر ہاتھ کیوں پھیر رہے تھے؟"

"تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے! میں تمھارے سر پر بھی ہاتھ پھیرنے کو تیار ہوں مگر تمھیں بھی اس کی طرح اپنے سارے جسم پر زلزلہ طاری کرنا پڑے گا" میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور چشمِ تصور سے نرملا کے نازک جسم کو بار بار لچکتے دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم میں ہڈی نام کی کوئی چیز ہی نہ ہو۔ یہ سوچتے ہوئے میرے منہ سے ایک طویل "ہائے" نکل گئی۔

"ارے ارے کیا کر رہے ہو تم!" لیوسی چیخ اٹھی "موٹر سائیکل کار سے ٹکرا جائے گی"

میں نے جلدی سے موٹر سائیکل ایک طرف کر لی۔ سامنے سے آتی ہوئی کار زناٹے کے ساتھ قریب سے گزر گئی۔ میں نے خدا سے توبہ کی کہ آئندہ پھٹ پھٹ پر بیٹھ کر کسی حسینہ کے لچکتے مٹکتے جسم کا تصور نہیں کروں گا۔ حرام موت مرنے سے کیا فائدہ! لیوسی کافی

دیر تک اس حرکت پر لعنت ملامت کرتی رہی۔ جب اس کی بکبک کسی طرح بند ہی نہ ہوئی تو میں جل کر بولا۔ "زیادہ جان پیاری ہے تو نہ بیٹھا کرو میرے ساتھ پھٹ پھٹ پر! چڑیا کا سا دل ہے تمھارا!"

"تمھارے سینے میں بڑا شیر کا دل ہے!" وہ چڑ کر بولی۔

"تم آج کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہی ہو پیاری لیوسی؟" میں نے "پچکارا" مارتے ہوئے کہا۔ "تم تو کہتی تھیں کہ تمھیں مجھ سے عشق ہو گیا تھا!"

"ہرگز نہیں، قطعی تم اس قابل نہیں ہو!"

"تو پھر کیا اب اس اپنے خالہ زاد سے عشق لڑاؤ گی، وہی جس کی صورت پر ہر وقت بارہ بجے رہتے ہیں۔" میں نے اسے چڑایا۔

"ہاں اسی سے عشق کروں گی اور اسی سے شادی بھی کروں گی، تمھاری بلا سے!" وہ بھی مجھے جلانے پر تلی ہوئی تھی۔

"میرے ٹھینگے سے!" میں واقعی جل کر بولا۔ "کرو عشق، کرو شادی! میری ہونے والی جورو ابھی زندہ ہے، پھر مجھے کیا فکر!"

"ہاں گندگی کا کیڑا گندگی ہی میں خوش رہتا ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا کہا!" میں حلق پھاڑ کر چیخا۔ "میں... میں کیڑا ہوں؟ اتنا جوان جہان مرد تمھیں کیڑا نظر آ رہا ہے اور وہ بھی گندگی کا! میں ہرگز اتنی بڑی گستاخی معاف نہیں کر سکتا!"

"کیا کر لوگے تم میرا؟" وہ جیسے مرنے مارنے پر تل گئی تھی۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ واقعی یہ بات پہلے سے سوچنے کی تھی جو شدید مصروفیت کے سبب میں نہیں سوچ سکا تھا۔ میں مردہ سے لہجے میں بولا۔ "خیر جب سوچ لوں گا تو کچھ نہ کچھ کر بھی لوں گا۔" اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں کم از کم انتقاماً اسے اپنی پھٹ پھٹ سے تو اس وقت اتار ہی سکتا تھا۔ آخر اس نے مجھے گندگی کا کیڑا کہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا۔ "اگر میں انتقاماً تمھیں اپنی پھٹ پھٹ سے اسی وقت اتار دوں تو؟"

"اور میں نہ اتروں تو؟" وہ بھی ترکی بہ ترکی بولی۔

"لو اور سنو! ایک اور مشکل کھڑی کر دی۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "اب یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ تم پھٹ پھٹ سے نہ اتریں تو مجھے اگلا قدم کیا اٹھانا پڑے گا!"

لیوسی اور مجھ میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ اسی طرح چونچیں لڑاتے ہوئے ہم دونوں چاندنی چوک پہنچ گئے۔ وہاں ایک ٹھیلے پر دہی بڑے بکتے دیکھ کر میرے منہ میں پانی آ گیا۔

میں نے فوراً پھٹ پھٹ روک لی اور لیوسی کو بھی دہی بڑے کھانے کی دعوت دی۔

"تم کھا آؤ، میں یہیں انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں دہی بڑے والے کے ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی پھٹ پھٹ کو ریس دے رہا ہو۔ میں مڑا اور لیوسی کو پھٹ پھٹ کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں معاملے کی نزاکت کو سمجھ سکتا، لیوسی نے پھٹ پھٹ آگے بڑھائی اور میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزر گئی۔ میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ میں نے تو خیر اسے صرف پھٹ پھٹ سے اتارنے کی دھمکی ہی دی تھی مگر اس نے دھمکی پر عمل بھی کر دیا تھا۔ لو بیٹا، اللہ دتا بلکہ لے ڈی مہر! کر لو دکان داری! اب جاؤ دفتر پیدل! میں بوجھل قدموں سے ٹھیلے تک پہنچا اور پھر چار عدد دہی بڑے کا آرڈر دیا۔

دہی بڑے کھا کر اور ان پر دو گلاس پانی پینے کے بعد میں کسی سواری کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک موٹر سائیکل میرے قریب آ کر رکی۔ میں سمجھا شاید لیوسی کو مجھ پر رحم آ گیا ہے اور وہ مجھے لینے لوٹ آئی ہے مگر مڑ کر دیکھا تو اس موٹر سائیکل پر عادل نظر آیا۔

"لونڈیوں پر زیادہ بھروسا نہ کیا کرو۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے عادل بول اٹھا۔

"تم کدھر سے ٹپک پڑے؟" میں حیرت سے بولا۔

"بس تمھارے آس پاس ہی رہتا ہوں۔" وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ویسے کچھ دن ہی اور رہ گئے ہیں۔ اب مہینہ پورا ہونے میں زیادہ دن نہیں ہیں۔ استاد کہہ رہے تھے کہ اگر یہ مہینہ پورا ہونے کے بعد اگلے مہینے کے پیسے نہیں آئے تو پھر ہماری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔"

"اماں یار، کہاں کی اڑا رہے ہو! میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ میں واقعی اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"اب تم اتنے بھولے بھی نہیں ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تم سب کچھ سمجھتے ہو اور جان بوجھ کر انجان بنتے ہو۔ خیر مجھے کیا!" یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا، پھر کہا۔ "کہو تو میں تمھیں کہیں چھوڑ دوں، کہاں جاؤ گے؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ!" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے کشمیری گیٹ جانا ہے۔" میں نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے، راستے میں آج اس سے پوچھ ہی لوں گا کہ اس نے کیا چکر چلا رکھا ہے اور

میرے پیچھے کیوں لگا پھرتا ہے۔ ابھی میں اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ میں نے ایک اور موٹر سائیکل کی آواز سنی جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر دیکھا تو میرا منہ بن گیا۔ اس موٹر سائیکل پر لیوسی تھی اور وہ میری ہی موٹر سائیکل تھی۔ لیوسی نے قریب آ کر بریک لگا دیے۔

"فرمائیے؟" میں نے لیوسی کو اس طرح مخاطب کیا جیسے وہ میرے لیے انجان ہو۔

"تشریف لے چلیے۔" لیوسی نے میرے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ آ گئی ہیں تو تم ان کے ساتھ جاؤ، میں چلتا ہوں۔" عادل مجھ سے مخاطب ہوا اور میرا جواب سنے بغیر اپنی موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

"یہ کون ذات شریف تھے؟" لیوسی نے عادل کے بارے میں سوال کیا۔

"ابھی اس کی ذات کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ واقعی شریف ذات ہے یا بدذات!" میں نے اظہارِ حقیقت کیا۔ "ویسے ممکن تھا آج کچھ اتا پتا چل جاتا کہ تم ٹپک پڑیں۔"

"مختصر یہ کہ تم اس کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" لیوسی منہ بنا کر بولی، پھر کہا۔ "اچھا اب سنبھالو موٹر سائیکل۔"

"جی نہیں، اب آپ ہی اسے سنبھالے رہیں۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔" میں نے اسے دانستہ "تم" کی بجائے "آپ" کہا تھا، مقصد طنز تھا۔

"تو تم... تم میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھو گے؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"میں لڑکی نہیں ہوں، تمھاری طرح کہ دونوں ٹانگیں ایک طرف لٹکا کر بیٹھوں گا تو مجھے کسی کی، گویا تمھاری کمر تھامنا پڑے۔ میں دونوں ٹانگیں ادھر ادھر کر کے بیٹھوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "آج تک میں نے تمھیں بہت چُغد وکھلائی ہے، اب میری باری ہے۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ لیوسی اس بات پر تیار ہو جائے گی۔ میرا مقصد اسے محض ستانا تھا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر زمانے لیوں کا ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اب اس عمر کو پہنچ کر اور پورے گیارہ عدد یعنی ایک کم ایک درجن بچوں کا باپ بننے کے بعد اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر جانے کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ رب ریار کے تصور نے اسے گلِ گلزار بنا دیا ہوگا۔

"اچھا تو پھر آؤ، بیٹھو پیچھے! آج یوں بھی سہی!" وہ مسکرا کر بولی۔

"ویسے تم رفو چکر کہاں ہو گئی تھیں؟" میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا تمھارے خیال میں مجھے بھوک نہیں لگتی اور میں پھول سونگھ کر زندہ رہتی ہوں!"

"تم تو خود پھول ہو، تمھیں پھول سونگھنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے راتوں کی نیند حرام کر دینے والے ایک رومانی ناول میں پڑھا ہوا فقرہ دہرایا۔

"رہنے دو اب، بناؤ مت! میں تمھاری چکنی چپڑی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔"

"کاش تم نے کبھی میرے دل میں جھانک کر دیکھا ہوتا اے مہ لقا!" میں نے اسی ناول میں پڑھا ہوا ایک اور مکالمہ اس پر دے مارا۔ ہر چند کہ "مہ لقا" کا مطلب میں قطعی نہیں سمجھا تھا۔ میں اسے لقا کبوتر قسم کی کوئی چیز سمجھا تھا۔ جس طرح لقا کبوتر یا کبوتری غٹر غوں کر کے ناچتا یا ناچتی ہے، غالباً اسی طرح کسی عاشق نامراد نے اپنی محبوبہ کو ناچتے دیکھ لیا ہوگا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنی محبوبہ کو مہ لقا کہا تھا۔

"تو تمھارے سینے میں دل بھی ہے اور اس میں جھانکا بھی جا سکتا ہے!" لیوسی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"دل، جگر، پھیپھڑے، کلیجی اور گردے سب کچھ موجود ہیں۔ تم نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے! تم کیا یہ سمجھ رہی تھیں کہ میرا سینہ خالی ہے؟" میں نے اس قدر سینہ پھلایا کہ اس کی پشت سے لگ گیا۔

"یہ تو پہلے مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ تم تو کمال کے آدمی نکلے۔" اس نے میرے لہجے کی نقل اتاری اور اسی کے ساتھ گیئر بدل کر موٹر سائیکل کی رفتار مزید بڑھا دی۔

"یہ... یہ کیا کر رہی ہو تم! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے تیز آواز میں کہا۔

میری بات کا ردِ عمل اس پر یہ ہوا کہ مزید رفتار بڑھا دی۔ میں "ارے ارے" کرتا رہا اور وہ رفتار بڑھاتی ہی گئی۔ مجھے زیادہ خوف محسوس ہونے لگا تو اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

"خدا کے لیے... مان... مان جاؤ!" میں گھگھیانے لگا۔ "آئندہ میری توبہ، میرے ابا کی توبہ جو کبھی تم سے پھٹ پھٹ چلواؤں۔"

جواب میں اس نے قہقہہ لگایا اور اسی کے ساتھ بریک بھی! بریک لگاتے ہی میرے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے پھٹ پھٹ سے گرنے کی بجائے یہ بہتر سمجھا کہ اس سے لپٹ جاؤں اور میں نے یہی کیا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر پکڑ کر پشت سے لپٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ لیوسی میری اس حرکت پر سخت احتجاج کرے گی مگر خلافِ توقع اس نے کچھ نہیں کہا۔ پھر جب تک میں نے خود ہی اس کی کمر نہ چھوڑ دی،

وہ کچھ نہ بولی۔ موٹر سائیکل کی رفتار اب پھر اعتدال پر آچکی تھی۔

"ویسے تم خوف زدہ ہونے کی اداکاری بہت اچھی کر لیتے ہو۔" لیوسی نے ہنس کر کہا۔

"لو اور سنو، یہاں جان پر بنی ہوئی تھی، دل ابھی تک قابو میں نہیں اور کہہ رہی ہو کہ اداکاری اچھی کر لیتا ہوں۔" میں جل کر بولا۔

"اگر میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید تمھاری بات کا یقین کر لیتی۔"

"کیوں، تمھیں کیا حکیم نے منع کر دیا ہے کہ میری بات کا یقین نہ کرنا ورنہ ہیضہ ہو جائے گی!"

وہ ہنس پڑی، پھر بولی: "میں اس لیے ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتی کہ تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

"حالانکہ میں نے اب تک تمھیں اپنی کوئی رگ نہیں دکھائی۔ تم سفید جھوٹ بول رہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے پہلی بار میری نظر اس کی ٹانگوں پر پڑی اور میں نے کہا: "تم اگر ساری کے نیچے یہ چوڑی دار پاجامہ نہ پہنے ہوتیں تو تمھاری کتنی بے پردگی اب تک ہوتی!"

"کیا خبر کب کیسے حالات پیش آ جائیں، یہ سوچ کر میں جب بھی ساری پہن کر دفتر جاتی ہوں تو نیچے پاجامہ ضرور پہنتی ہوں۔" اس نے وضاحت کی۔

"ویسے اس غرض [illegible] ہو۔" میں نے اسے تپانے کے لیے کہا۔

"اگر ساتھ میں کوئی مسخرہ ہو تو ایسے ٹکنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔" اس نے مجھ پر چوٹ کی۔

میں نے تلملا کر اس پر جوابی حملہ کیا۔ پھر یہ حملے اور جوابی حملے دفتر پہنچنے تک جاری رہے لیکن دفتر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی ہم دونوں ہی نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ اسی وقت مجھے ایک اہم بات کا خیال آیا۔ مجھ سے اور لیوسی سے ایک بڑی غلطی ہو گئی تھی جس کی ذمے دار لیوسی ہی تھی۔ میں نے لیوسی کو مخاطب کیا: "تم احمق ہو۔"

"آدمی خود جو ہوتا ہے اسے دوسرا بھی ویسا ہی نظر آتا ہے، آگے کہو!" وہ ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے بولی۔

"آگے یہ کہنا ہے کہ تم نے مسٹر ہنری کو حالات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ یہ بات تو معلوم ہو ہی چکی تھی کہ وہاں سے فائل چوری نہیں ہوئی، پھر چیکنگ کی کیا ضرورت ہے۔ [illegible] مسٹر ہنری کے حکم پر چیکنگ شروع کرا دے گا۔ اب بولو، تم سے حماقت سرزد ہوئی کہ نہیں!"

"پہلی بات تو یہ کہ تم بھی میرے ساتھ تھے، تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"تو جب تم چودھرائن بنی ہوئی تھیں تو مجھے کچھ کہنے سننے کی کیا ضرورت تھی!"

"اچھا چلو یہی سہی لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ نرملا نے جو کچھ بتایا ہے، وہ بالکل سچ ہے؟"

"اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پڑی ہے!"

"چلو یہ بھی مان لیا کہ اس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا، تو پھر اس صورت میں مسٹر ہنری کو تمام باتوں سے آگاہ کرنے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"نہیں سمجھتا تو تم سمجھا دو!"

"مسٹر ہنری فوراً نرملا اور جیک کو سلاخوں کے پیچھے پہنچوا دیتے۔ ان کے حکم پر دونوں کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔"

"پھر اس سے ہماری صحت پر کیا فرق پڑے... نہیں... وہ نرملا کو گرفتار نہیں ہونا چاہیے، بھلے چاہے جیک جہنم میں جائے۔"

"کیوں، کیا نرملا سے تمھاری رشتے داری ہے؟" لیوسی آنکھیں نکال کر بولی۔

"نہیں ہے تو ہو سکتی... مگر... مگر وہ تو ہندو ہے۔" میں گڑبڑا گیا، پھر اسی وقت خیال آیا کہ وہ میرے عشق میں گرفتار ہو کر مسلمان بھی تو ہو سکتی ہے جس طرح لیوسی نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے بولا: "اگر وہ ہندو بھی ہے تو کیا ہوا، مسلمان ہو سکتی ہے [illegible] ایسا بڑا شدہ ہے!"

"[illegible] ہندو سے مسلمان بنانے کی بات کر رہے ہو [illegible] بات کر رہے ہو!" لیوسی نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا: "اگر واقعی مسٹر ہنری، پیاری نرملا کو گرفتار کرا دیتے تو واقعی بڑا ظلم ہوتا۔ تم نے مسٹر ہنری کو کچھ نہ بتا کر واقعی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔"

"مجھے اس کے گرفتار ہونے نہ ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں، سمجھے! میں نے فی الوقت مسٹر ہنری کو اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ میں نرملا سے کہہ چکی ہوں، وہ کل تک محفوظ ہے۔ اگر وہ گرفتار ہو جاتی تو مجھ پر اعتماد کھو بیٹھتی۔ میں اسے اعتماد میں لے کر پہلے کوئی کام کی بات معلوم کر لینا چاہتی ہوں۔"

"بڑی مطلبی ہو تم!" میں منہ بنا کر بولا، پھر پوچھا: "کیا مسٹر تھامسن کو بھی ابھی کچھ نہیں بتاؤ گی؟"

"تمھاری مرضی ہے، تم چاہو تو جا کر بتا دو۔ ویسے میرا خیال یہی تھا کہ انھوں نے رپورٹ دینے کے لیے کل کا جو وقت دیا ہے، اسی وقت رپورٹ دی جائے۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"میں تو ڈی آئی جی صاحب سے اجازت لے کر گھر جاؤں گی کیوں کہ ابھی ڈاکٹر نے آرام کے لیے کہا ہے اور یوں بھی ابھی میری

چھٹیاں باقی ہیں۔ تم جو چاہے کرو۔"

"میں ایسا کرتا ہوں کہ اس کیس کی فائل کا پیٹ بھر دیتا ہوں۔ کیا خبر پھر مہلت ملے یا نہ ملے۔" میں نے کہا۔

پھر لیوسی کل صبح ٹھیک نو بجے، مسٹر تھامسن کے کمرے سے باہر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا کمال نے کہا: "سر! ڈی جی صاحب کا چپراسی دو بار آکر آپ کو پوچھ چکا ہے۔"

"کیا بکتے ہو!" میں پھٹ پڑا۔ وہ کم بخت میرے ہونے والے خسر یعنی چچا بندو خاں کے بارے میں اس قدر بے ادبی سے بات کر رہا تھا۔ میں دہاڑا: "وہ ڈی جی صاحب کے چپراسی نہیں ہیں بلکہ میری ہونے والی بیوی کے والدِ محترم ہیں، سمجھے!"

"مجھے علم نہیں تھا سر!" کمال سہم کر بولا۔

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ فرما رہے تھے کہ جب بھی آپ تشریف لائیں، ڈی جی صاحب سے مل لیں سر!" کمال نے بتایا۔

میں نے سوچا، یہ لیوسی بدذات خواہ مخواہ رفوچکر ہو گئی۔ اگر وہ بھی ساتھ ہوتی تو کچھ ہمت بندھی رہتی۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ وہ ابھی تیواڑی جی کے کمرے میں ہو گی، اسے بھی ساتھ لیے لیتا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی کے ساتھ مڑا اور کمرے سے نکلا۔ میں اس قدر تیزی میں تھا کہ سامنے سے آنے والے شخص کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں اس سے ٹکرا گیا۔

"کیا اندھے... ارے تم بیٹے!" چچا بندو خاں مجھے اندھا کہتے کہتے ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ مجھ سے ٹکرانے والے وہی تھے۔

"معاف کیجیے گا چچا! میں ذرا جلدی میں تھا اس لیے آپ پر نظر نہیں پڑی۔" میں نے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں بیٹے!" چچا بندو خاں نرم لہجے میں بولے، پھر ان کے لہجے سے فکرمندی کا اظہار ہونے لگا: "پتا نہیں کیا بات ہے بیٹے! صاحب دو بار تمھیں مجھ سے دکھوا چکے ہیں اور اب انھوں نے مجھے آدھے گھنٹے کے دوران میں تیسری مرتبہ بھیجا ہے، فوراً چلے چلو۔"

"آپ چلیں چچا! میں ابھی ڈی آئی جی صاحب کے پاس سے ہو کر یوں آیا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے چٹکی بجائی، پھر جلدی سے بولا:

"ابھی ان سے یہ نہ کہہ دیجیے گا کہ میں دفتر آگیا ہوں۔"

"کیسی بات کرتے ہو بیٹے! میں بھی اتنی بات سمجھتا ہوں، پھر بھی تم جلدی آ جانا تاکہ وہ مجھے دوبارہ نہ دوڑا دیں۔" چچا بندو خاں آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

"ٹھیک ہے چچا! آپ مطمئن رہیں۔" میں نے انھیں یقین دلایا اور تیزی سے تیواڑی جی کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

تیواڑی جی کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی لیوسی مجھے مل گئی۔ اس نے تیواڑی جی کے پاس زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ اگر مجھے کچھ دیر اور ہو جاتی تو شاید وہ چمپت ہو جاتی۔

"کیوں، کیا ہوا؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے سے کیوں نظر آ رہے ہو؟ کیا بارش آ گئی؟" اس کا انداز مضحکہ اڑانے والا سا تھا۔

"ارے جلدی سے چلو، مسٹر تھامسن نے بلایا ہے۔" میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"تو بازو چھوڑو، میں کیا بھاگی جا رہی ہوں! بلایا ہے تو کون سی آفت آ گئی! تمھاری فاختہ کیوں اڑی ہوئی ہے؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو میں لیوسی کے لتے لے ڈالتا مگر یہ وقت کچھ اور تھا اس لیے میں نے نرمی سے کہا: "فضول باتیں چھوڑو، دو تین بار مجھے بلوا چکے ہیں۔"

"تو یوں کہو نا کہ انھوں نے تمھیں بلوایا ہے!" وہ مسکرا کر بولی: "تمھیں بلوایا ہے تو تم چلے جاؤ، مجھ سے کیا مطلب!"

"تم میرے ساتھ کام نہیں کر رہیں اس کیس پر؟" میرے لہجے میں سختی سی آ گئی۔

"تو پھر کیا ہوا! ضروری تو نہیں کہ میں ہر جگہ تمھارے ساتھ لگی لگی پھروں اور بچوں کی طرح تمھیں انگلی پکڑ کر تیاں تیاں چلاتی رہوں۔"

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں جھنجھلا کر بولا: "تم چلو گی کہ بس باتیں گھمولتی رہو گی؟"

"اگر میں انکار کر دوں تو؟" اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"تو میں تم پر لعنت بھیج کر چلا جاؤں گا، اکیلا، بالکل اکیلا! میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" میں نے سینہ پھلا کر اس پر رعب مارا اور چلتے چلتے اپنی دانست میں اسے دھمکی دی: "اور یہ جو تم سے میرا عشق وشق چل رہا ہے نا، آج کے بعد بالکل ختم سمجھو!"

"اتنی جلدی دماغ سے عشق کے کیڑے جھڑ گئے، چلو اچھا ہوا، میں یہی چاہتی بھی تھی۔ ویسے یہ بتاؤ کہ اگر میں تمھارے ساتھ چل چلوں تو عشق چلے گا؟"

میں اس کی بات سن کر ایک دم نرم پڑ گیا اور بولا: "اگر تم چلنے پر راضی ہو تو پھر سوچا جا سکتا ہے اس مسئلے پر!"

"یعنی پھر بھی سوچو گے، عشق نہیں کرو گے؟" اس نے وضاحت چاہی۔

"چلو کر لوں گا عشق، بس اب تو راضی ہو۔"

"بھولنا مت، اپنا وعدہ!" یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ چل دی اور میرا دم میں دم آیا۔

سر تھامسن نے ہم دونوں کو فوراً ہی اندر بُلا لیا۔ ہم دونوں ان کے ہاتھ کا اشارہ پاکر جب کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انھوں نے ہمیں مخاطب کیا "تم لوگوں نے یہ کیا حماقت کی کہ سر ہنری سے مل کر نہیں آئے؟" ان کے لہجے سے خفگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ سر تھامسن بڑے کائیاں بالک معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے یقیناً ہم دونوں کے پیچھے سی آئی ڈی چھوڑ دی ہوگی ورنہ انھیں یہ بات کس طرح پتا چلتی مگر اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہم دونوں تو خود سی آئی ڈی ہیں۔ پھر یہ چکر کیا ہے؟ کیا سی آئی ڈی کے پیچھے بھی سی آئی ڈی لگائی جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ یہی بات میں سر تھامسن سے پوچھ بیٹھتا مگر اسی وقت لیوسی کی آواز سن کر چپ رہ گیا۔

"سر! مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "جو واقعات ہمیں پیش آئے تھے، ان کی روشنی میں یہی قدم اٹھانا بہتر تھا۔"

"لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔" سر تھامسن مُنہ بنا کر بولے۔ "تمہیں سر ہنری سے مل کر اور انھیں تمام واقعات سے آگاہ کر کے آنا چاہیے تھا۔"

اب تک یہ راز نہیں کُھلا تھا، سر تھامسن کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ ہم سر ہنری سے ملے بغیر ہی چلے آئے تھے اور نہ لیوسی ان سے اس بارے میں کچھ پوچھ رہی تھی۔

"آپ حکم دیں سر، تو میں آپ کو تمام واقعات بتادوں۔" لیوسی نے کہا۔

"نہیں، مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" سر تھامسن ہاتھ اٹھا کر بولے۔

"تعجب ہے سر!" میں صبر نہ کر سکا۔ "آپ تو کوئی پہنچے ہوئے بزرگ لگتے ہیں۔" میں نے عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔

میری بات سُن کر سر تھامسن کی تیوریوں پر بَل پڑ گئے۔ انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر پہنچے ہوئے بزرگ کی وضاحت چاہی کیوں کہ "پہنچے ہوئے بزرگ" کا میں نے لفظ بہ لفظ انگریزی میں ترجمہ کر دیا تھا۔ میں اس وقت یہ بھول ہی گیا تھا کہ یہ جو پہنچے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، اردو میں ہوتے ہیں، انگریزی میں نہیں۔

"پہنچا ہوا بزرگ اُسے کہتے ہیں سر، جو... جو بہت پہنچا ہوا ہو۔" میں سٹپٹا کر بولا۔

"مگر کہاں پہنچا ہو؟" سر ہنری کے لہجے سے الجھن کے ساتھ ساتھ غصّے کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

"ایسے بزرگ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں سر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "ایک دفعہ میرے ابّا نے ایسے ہی کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا قصّہ سنایا تھا۔ وہ بزرگ پلک جھپکتے کوہ قاف کی سیر کر آتے تھے۔"

"تم نے یہ کیا خرافات شروع کر دی!" سر تھامسن نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ وہ شاید میری وضاحت کے باوجود پہنچے ہوئے بزرگ کا مطلب نہیں سمجھے تھے۔

"سر! آپ ہی نے تو پوچھا تھا۔" میں مُردہ سی آواز میں بولا۔

پھر سر تھامسن نے خود ہی بتایا کہ ابھی تقریباً نصف گھنٹے قبل سر ہنری نے انھیں فون کیا تھا۔ سر ہنری نے انھیں فون پر بتایا تھا کہ نرملا نے خود ان کے پاس آکر اعترافِ جرم کیا تھا۔ نرملا نے انھیں سب کچھ بتا دیا تھا جس کے بعد انھوں نے نہ صرف نرملا بلکہ جیک کو بھی ملٹری انٹیلی جینس کے سپرد کر دیا تھا۔ سر ہنری کے خیال میں یہ کیس، ملٹری انٹیلی جینس ہی کا ہے۔ سر ہنری نے سر تھامسن سے کہا تھا کہ وہ اس کیس کی فائل ملٹری انٹیلی جینس کے سپرد کر دیں۔

سر تھامسن کی بات ختم ہوتے ہی میں فوراً بول اٹھا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا سر! جان بچی لاکھوں پائے۔"

میں خوش ہو کر مزید چہکنے کے موڈ میں تھا کہ سر تھامسن نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "بکواس بند کرو! میرے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا۔ میں نے اس خیال کا اظہار سر ہنری سے بھی کیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ یہ کیس ہمارے محکمے کے پاس ہی رہنے دیا جائے۔ میں نے اس کی وجہ بھی انھیں بتادی تھی۔ کیٹی کے اغوا سے وہ واقف نہیں تھے۔ جب انھیں پورے حالات کا علم ہوا تو انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں پوری کوشش کریں گے کیوں کہ ایک بار جو قدم اٹھایا جا چکا ہے، ایک دم اسے پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ بہرحال، خود میری بھی یہی خواہش ہے کہ یہ کیس میرے محکمے کے پاس رہے۔ مجھے ایک طویل عرصے کے بعد تو ان دونوں سے نبرد آزما ہونے کا موقع ملا ہے، میں یہ موقع نہیں کھونا چاہتا۔"

"سر! آپ کی مراد کن دو افراد سے ہے؟" لیوسی نے دریافت کیا۔

"ابھی کیوں کہ میں خود بھی کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچا اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ دونوں وہی ہوں اس لیے کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں وہی ہیں جو میں سمجھ رہا ہوں تو پھر تمھیں بھی آگاہ کر دوں گا۔ فی الحال ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔" سر تھامسن نے جواب دیا۔ پھر انھوں نے اپنی میز کی دراز کھولی اور ایک لفافہ نکال کر لیوسی کی طرف بڑھا دیا۔ "آج کی ڈاک سے یہ لفافہ ملا ہے۔ پوسٹ آفس کی مُہر سے پتا چلتا ہے کہ اسے کل شام پوسٹ کیا گیا ہے۔"

لیوسی لفافہ کے کر گھورتے ہوئے بولی۔ "کیا انہی مجرموں کی طرف سے پھر کوئی پیغام آیا ہے سر؟"

"کہیں اس لفافے میں بھی تو انھوں نے کوئی انگلی وِنگلی کاٹ کر نہیں بھیج دی؟" سر تھامسن کے کچھ بولنے سے پہلے، میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"بکواس بند!" مجھ پر پھر ڈانٹ پڑی، اس کے بعد انھوں نے لیوسی کو بھی معاف نہیں کیا۔ وہ لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولے "یہ لفافہ میں نے تمھیں اس لیے نہیں دیا تھا کہ تم اسے نہ پڑھو اور سب کچھ میں ہی بتاؤں! تم نے قطعی غیر ضروری سوال کیا تھا!"

"میں معافی چاہتی ہوں سر!" لیوسی نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

پھر سر تھامسن نے حکم دیا کہ لیوسی اس لفافے میں موجود پیغام کو بہ آوازِ بلند پڑھے تاکہ میں بھی سن سکوں۔

لیوسی نے تعمیلِ حکم میں پیغام پڑھنا شروع کر دیا۔

"سر تھامسن! جیسا تمھیں پہلے خط میں لکھا گیا تھا کہ بہت جلد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کیا جائے گا، سو وہ وقت آگیا ہے۔ اگر تم نے اس مرتبہ بھی چالاکی دکھانا چاہی تو نتائج کے ذمّے دار خود ہو گے۔ تمھیں پہلے لکھا ہی جا چکا ہے کہ ہم اس صورت میں کیا کریں گے! بار بار وہی بات لکھ کر ہم تمھیں خوف زدہ کرنا نہیں چاہتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم ہمارا مطالبہ پورا کر دو اور اس کی صورت ہم تمھیں لکھ رہے ہیں۔ تمھیں اس بار اپنے کسی احمق آدمی کو کہیں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے ساتھ مرارجی لال مرڈر کیس کی فائل اپنی کوٹھی لے جاؤ اور پھر ٹھیک بارہ بجے ایک ٹوکری کے اندر یہ فائل رکھ کر اپنے پھاٹک کے باہر آجاؤ۔ پھاٹک کے باہر ٹوکری رکھ کر تم وہاں ٹھہرو گے نہیں بلکہ فوراً اندر جا کر پھاٹک بند کر لو گے۔ یاد رہے کہ آج رات تمھارا چوکیدار بھی پھاٹک کے باہر یا اندر نہیں ہوگا۔ بقیہ تمام ذمّے داری ہماری ہے کہ ہم کس طرح وہاں سے وہ فائل لے جاتے ہیں۔ یقین کرو کہ اگر تم نے اس بار ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا تو تمھاری بیوی صبح ہوتے ہی تم تک پہنچ جائے گی۔ مسٹر ایکس۔" پورا پیغام پڑھ کر لیوسی خاموش ہو گئی۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ اسی دوران میں مجھے ایک خیال آیا اور میں نے سوچا سر تھامسن ہرچند کہ انگریز ہیں مگر عقل سے پیدل ہیں۔ اتنی سامنے کی بات ان کے پلّے نہیں پڑی تھی جو مجھ جیسے شخص تک کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"سر! آخر وہ فائل، مجرموں کو دے دینے سے ہمارا کیا بگڑ جائے گا؟" میں نے خاموشی توڑی۔

"کیا مطلب؟" سر تھامسن کے ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ "کیا بکواس کر رہے ہو تم؟"

"میں بکواس نہیں کر رہا سر! سچ مچ ایک نیک مشورہ دے رہا ہوں۔" میں نے خود اعتمادی سے کہا۔ "شاید آپ بھول گئے سر، کہ میں کتنی گراں قدر صلاحیتوں کا مالک ہوں!"

"کہیں تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" سر تھامسن برہم ہو کر بولے۔

"نہیں سر!" میں نے اسی خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بس ایک بار اور مجھے توجہ سے وہ فائل پڑھ لینے دیں، اس کے بعد کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

"تم اسی طرح احمقانہ باتیں کرتے رہے تو میں تمھیں اپنے کمرے سے نکال دوں گا۔" سر تھامسن کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

"اور پھر آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے گا سر، کہ آپ نے مجھ جیسے باصلاحیت آدمی کو اپنے کمرے سے کیوں نکال دیا اور صلاحیت کے اظہار کا موقع فراہم نہیں کیا یعنی فائل نہیں پڑھنے دی۔"

"فائل پڑھنے سے آخر اس معاملے کا کیا تعلق ہے؟" سر تھامسن جھنجلا کر بولے۔

"معلوم ہی تو آپ کو نہیں پتا سر! میں پوری فائل کا ایک ایک لفظ یاد کر لوں گا اور پھر دوبارہ فائل بن جائے گی۔" میں نے اپنی دانست میں انکشاف کیا۔ "اگر آپ کو یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لیں۔"

سر تھامسن نے میری بات سن کر ایک طویل سانس لیا۔ پھر مجھے گھورتے ہوئے بولے "تو کیا تمھارے خیال میں فائل کے کاغذات کو نقل نہیں کرایا جا سکتا تھا یا ان کی فوٹو کاپیاں نہیں بنوائی جا سکتی تھیں؟"

ایک دَم سے جیسے میری ساری ہَوا نکل گئی۔ میں مُردہ سے لہجے میں بولا "سر! اس میں... اس میں وقت بھی تو لگتا۔ میں تو گھنٹے بھر میں پوری فائل حفظ کر لیتا۔"

"تو کیا فرق پڑتا اس سے؟" ان کے لہجے میں بہ دستور چبھن تھی۔

"فرق یہ پڑتا سر، کہ وہ آپ کی جورو کو چھوڑ دیتے۔" میں نے ان سے نظر چُراتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر اس طرح میں ان پر ہاتھ تو نہ ڈال سکتا، یہ بات تمھاری عقل میں کیوں نہیں آتی؟" انھوں نے جھنجلا کر کہا۔ "فائل دینا یا نہ دینا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ فائل دی بھی جا سکتی ہے اور نہیں بھی! اصل مسئلہ انھیں گھیرنا ہے۔"

"تو پھر ضرور گھیریں سر!" میں نے گویا ہتھیار ڈال دیے۔

"ہاں! آج وہ ضرور گھیر لیے جائیں گے!" سر تھامسن پُر یقین لہجے میں بولے۔ "انھوں نے خود اپنے لیے جال تیار کر لیا ہے۔"

"ممکن ہے سر، اس مرتبہ بھی وہ مقررہ وقت اور مقام سے پہلے، فائل حاصل کرنا چاہیں۔" لیوسی نے اپنے خیال کا اظہار کیا،

پھر کسی قدر ہچکچاتے ہوئے بولی "سر! انھوں نے اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ آپ وہ فائل اپنے ساتھ کوٹھی پر لے جائیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ دفتر سے کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے وہ۔۔۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔" سر تھامسن ہاتھ اٹھا کر لیوسی کی بات کاٹتے ہوئے بولے "میرے ذہن میں بھی یہ بات تھی۔ اس کے انتظامات بھی کر لیے جائیں گے۔"

پھر سر تھامسن نے ہمارے ہی سامنے پولیس ہیڈ کوارٹرز فون کیا۔ انھوں نے فون پر جو گفتگو کی اس سے پتا چل رہا تھا جیسے کسی بڑے حملے کی تیاری کر رہے ہوں۔ انھوں نے خاصی مسلح پولیس طلب کی تھی۔ فون کرنے کے بعد سر تھامسن نے گھنٹی بجا کر چپراسی بندو خاں کو بلایا جو فوراً ہی حاضر ہو گئے۔ سر تھامسن نے ان سے ڈی آئی جی تیواڑی جی کو بلا کر لانے کے لیے کہا۔

"تم دونوں بھی رات گیارہ بجے تک میرے بنگلے پر پہنچ جاؤ گے۔" سر تھامسن نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

"سر، جب اتنے سارے مسلح جوان وہاں ہوں گے تو پھر اس قدر ڈرنے کی کیا بات ہے؟" میں اپنی جان بچانے کی خاطر انھیں گویا تسلی دینے لگا۔ تسلی دینے سے زیادہ میرا مقصد پہلو تہی تھا۔

"کیا؟" سر تھامسن بھڑک اٹھے "کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں ڈر رہا ہوں؟"

"ن۔۔۔ نہیں تو سر! میں۔۔۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ۔۔۔" مجھ سے کوئی بات نہ بن سکی اور میں ہکلا کر رہ گیا۔

"سر! آپ کا خیال بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ آج وہ بچ کر نہیں نکل پائیں گے۔" اسی وقت لیوسی بول اٹھی۔ اس کا مقصد یقیناً موضوع گفتگو بدلنا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "اگر انھیں زندہ گرفتار کیا جا سکے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس طرح ان سے بہت سی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔"

"تم نے سنا نہیں، میں نے یہی تو احکام دیے ہیں، حتی الامکان کوشش کی جائے کہ گولی نہ چلانا پڑے!" سر تھامسن نے کہا۔ ان کے لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اب بھی اکھڑے اکھڑے ہیں۔

اس کے بعد تیواڑی جی کی آمد تک کمرے میں بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ تیواڑی جی نے مجھے اور لیوسی کو سر تھامسن کے پاس بیٹھا ہوا دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا۔ انھیں شاید ہم دونوں کی وہاں موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ سر تھامسن کا اشارہ پا کر وہ بھی ہمارے ہی برابر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ سر تھامسن نے مجرموں کا بھیجا ہوا پیغام انھیں بھی پڑھوایا۔

"کیا خیال ہے تمھارا؟" جب تیواڑی جی وہ پیغام پڑھ کر میز پر رکھ چکے تو سر تھامسن نے ان سے کہا۔

"جو بھی حضور کا حکم ہو۔" تیواڑی جی بہت محتاط لہجے میں بولے۔

"اس میں آخر حکم کی کیا بات ہے!" سر تھامسن نے انھیں ڈانٹ پلائی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تیواڑی جی کو ڈانٹ پلانے والے بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ سر تھامسن کہہ رہے تھے "ان حالات میں کیا قدم اٹھایا جا سکتا ہے، تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے!"

"کیوں نہیں سر!" تیواڑی جی جلدی سے بولے "لیکن سر! میں آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا اس لیے کہا تھا کہ جو آپ کا حکم ہو۔"

سر تھامسن نے ہنکارا بھرا، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

تیواڑی جی نے سر تھامسن کی ہر بات سے اتفاق کیا۔

"اس آپریشن کے انچارج تم ہو گے۔" سر تھامسن بولے۔ "لیکن خیال رہے کہ مجرم کسی بھی صورت میں بچ کر نہ جانے پائیں۔"

"حکم کی تعمیل ہوگی سر!" تیواڑی جی نے یقین دلایا۔

"یہ دونوں بھی رات گیارہ بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ تم اگر چاہو تو مزید افراد کو بھی اپنے ساتھ لے سکتے ہو۔ مسلح پولیس تمھارے اشارے ہی پر کوئی قدم اٹھائے گی۔ اس سے مزید کوئی توقع رکھنا فضول ہے۔ غالباً تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ایک عام مسلح پولیس والے اور تمھارے محکمے کے کسی آدمی میں کیا فرق ہے!"

"ٹھیک ہے سر! میں دلاور خاں اور مولا داد کو بھی ساتھ لے لوں گا۔" تیواڑی جی نے کہا "آپ قطعی فکر نہ کریں۔ اس مرتبہ مجرم بچ نہیں سکتے۔"

"سنو، آج جب میں دفتر سے اٹھ کر اپنی کوٹھی جاؤں گا تو بھی تم سب افراد کو کوٹھی تک میرے ساتھ چلنا ہے۔ مسلح پولیس سادہ لباس میں، یہاں سے میری کوٹھی تک میری اطراف میں ہوگی۔" سر تھامسن نے بتایا۔

سر تھامسن کی بات سن کر تیواڑی جی کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے کیوں کہ شاید ان کی چھوٹی سی کھوپڑی میں اس قبل از وقت کارروائی کا سبب نہیں سما سکا ہوگا۔ وہ بس "بہتر ہے سر!" کہہ کر چُپ ہو گئے۔

"اب تم لوگ جا سکتے ہو۔" سر تھامسن نے گویا میٹنگ ختم کر دی۔ اب ان کے چہرے سے ناگواری کی بجائے کسی قدر فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ویسے بہ ظاہر تو بڑی اکڑفوں دکھاتے ہیں موصوف مگر اندر سے ہوا خراب ہے۔

تیواڑی جی، میں اور لیوسی ایک ساتھ ہی اٹھ کر کھڑے ہوئے اور پھر ساتھ ساتھ ہی سر تھامسن کے کمرے سے نکلے۔ کمرے سے نکلتے ہی

تیواڑی جی نے تیز تیز نظروں سے لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا "تم تو مجھ سے کہہ کر آئی تھیں کہ گھر جا رہی ہو! آخر مجھ سے یہ بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی کہ تمھیں ڈی جی صاحب سے ملنا تھا؟"

جواب میں لیوسی نے انھیں سچ بات بتا دی مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں لیوسی کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر کچھ دور ساتھ چل کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں لیوسی کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ راستے میں ایک پستہ قد شخص مل گیا۔ اسے میں نے پہلے بھی دو ایک بار دیکھا تھا مگر وہ مجھے اتنا غیر اہم معلوم ہو رہا تھا کہ کبھی اس کے بارے میں کچھ جاننے کی تمنا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا رنگ توے کی طرح تھا، ایک آنکھ میں پھلی تھی جس کی وجہ سے وہ آنکھ کچھ باہر سی تھی، قد اتنا کم تھا کہ مزید کمی کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر گہرے گہرے چیچک کے داغ تھے جن میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم پاؤ بھر قیمہ بھرا جا سکتا تھا۔ اس پر قیامت یہ کہ وہ کسی فٹ بال کی طرح پھولا پھولا ہوا سا لگتا تھا۔ چہرے کے نقوش سے پتا چلتا تھا کہ جیسے چہرے پر موجود تمام ابھری ہوئی چیزوں کو کسی ظالم نے گھونسا مار کے اندر کر دیا ہو۔

میں نے محسوس کیا کہ لیوسی اسے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سی گئی۔ پتا نہیں اس نمونے کو کس نے خفیہ میں بھرتی کر لیا تھا۔ وہ مجھے اور لیوسی کو دیکھ کر رک گیا اور پھر اس کا ہاتھ، ماتھے تک چلا گیا۔

"گڈ ایوننگ سر!" اس نے لیوسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایوننگ!" لیوسی نے کہا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھا۔

"سر! وہ مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ اب کیسی ہیں؟ میں نے جب سے سنا تھا کہ آپ زخمی ہو گئی ہیں، میرا دل بہت بے چین تھا۔ اگر آپ مجھ پر یہ پابندی نہ لگا دیتیں سر، کہ میں کسی بھی حال میں آپ کے گھر کا رُخ نہ کروں تو میں ضرور آپ کے گھر آتا۔" وہ بولے جا رہا تھا "سر! آپ۔۔۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں اس دوران میں کتنا فکرمند۔۔۔"

"شیکھر!" لیوسی نے اس کی بات کاٹ دی "تم دیکھ رہے ہو کہ میں ٹھیک ہوں، پھر فضول باتیں کیوں کر رہے ہو!" لیوسی کا لہجہ خشک تھا۔

"مگر میں نے تو سنا تھا سر، کہ آپ شدید زخمی ہو گئی تھیں۔ کاش وہ زخم آپ کی بجائے مجھے لگے ہوتے۔"

"بکواس بند کرو اور اپنا راستہ لو۔" لیوسی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"سر! کیا آپ ڈیوٹی پر آ گئی ہیں؟" اس نے اس طرح سوال کیا جیسے لیوسی کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"تمھیں اس سے مطلب؟" لیوسی نے آنکھیں نکالیں۔

"مطلب یہ سر کہ۔۔۔ کہ اس طرح کم سے کم روز آپ کو دیکھ تو لیا کروں گا۔" اس کا لہجہ خالص عاشقانہ تھا۔

"ہٹو راستے سے!" لیوسی نے غصے میں اس کا بازو پکڑ کر اُسے ایک طرف ہٹانا چاہا جس کے لیے لیوسی کو جھکنا پڑا مگر وہ شخص اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔

اب معاملہ حد سے بڑھ گیا تھا اس لیے میں نے مداخلت ضروری سمجھی اور اس شخص سے مخاطب ہوا "ابے یہ کیا بدتمیزی ہے! اس طرح جوان جہان لڑکیوں کو روک کر عشق جھاڑتے ہیں! کہیں اپنے دماغ کے کیڑے تو نہیں جھڑوانے مجھ سے! ہٹو سامنے سے ورنہ اٹھا کر پھینک دوں گا، ایک طرف!"

جواباً اس کے ہونٹوں پر تضحیک آمیز سی مسکراہٹ ابھر آئی، پھر وہ بولا "اگر تم مجھے اپنی تمام جسمانی طاقت صرف کر کے بھی اس جگہ سے ہلانے میں کامیاب ہو گئے تو راستہ چھوڑنا ایک طرف، میں اس محکمے سے نوکری ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ شیکھر کو یوں ہی تو اس محکمے میں نہیں رکھ لیا گیا!" اس کے لہجے سے غرور کا اظہار ہو رہا تھا۔

بس پھر کیا تھا، مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے آستین چڑھا کر پہلے اُسے بھبکی دی جس پر وہ مسکرا کر رہ گیا، پھر میں اس سے بھڑنے ہی والا تھا کہ لیوسی نے میرا بازو پکڑ لیا اور بولی "شیکھر ٹھیک کہتا ہے، تم اُسے ہلا بھی نہیں سکو گے۔" یہ کہہ کر وہ اس کارٹون سے مخاطب ہوئی "شیکھر! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح، ان حرکتوں سے میرے دل میں اپنے لیے جگہ بنا سکتے ہو؟"

لیوسی کے اس ایک جملے کا نہ جانے اس پر کیا اثر ہوا کہ اس کے چہرے پر لرزنے کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "مجھے معاف کر دیں سر!" اسی کے ساتھ میں نے اس کی ایک آنکھ سے آنسو بہتے دیکھے۔ وہ ایک آنکھ سے روتے ہوئے بہت مضحکہ خیز سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر سر جھکائے میرے قریب سے گزر گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے لیوسی سے پوچھا "کون حرامی تھا یہ؟"

"نہیں، ایسا نہ کہو! وہ قابل رحم شخص ہے۔" لیوسی کے لہجے سے واقعی ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"قابل رحم ہے!" میں چڑ کر بولا "ارے صورت ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگتا ہے۔ اتنی بدتمیزی میرے ساتھ کرتا اور اس طرح میرا راستہ روکتا تو سالے کو چٹنی بنا دیتا۔"

"اوّل تو تم کوئی لڑکی نہیں ہو کہ وہ تمہارا راستہ روکتا دوسرے یہ کہ..."

"تو وہ لڑکیوں کا راستہ روکتا ہے!" میں لیوسی کی بات کاٹ کر بولا "یہ کون سی شرافت کی بات ہے!"

"ہر لڑکی کا نہیں، صرف میرا!" لیوسی نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی بُری بات ہی نہ ہو۔

"تو پھر یوں کہو کہ تم نے اُسے شہ دے رکھی ہے۔ میں خوامخواہ اُسے جھنی بنانے پر آمادہ ہو گیا تھا۔" میں بولا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ وہ حیرت انگیز جسمانی قوت کا مالک ہے۔" لیوسی نے کہا۔

"وہ تو تم نے عین موقع پر روک لیا ورنہ بتا تا اُسے!" میں نے اپنی شبکی ہوتے دیکھ کر سینہ پھلایا، پھر بولا "اب چلو بھی یا ساری زندگی اُسی کی یاد میں یہاں کھڑی رہو گی؟" جب میرے کہنے پر لیوسی نے قدم بڑھائے تو میں بولا "ویسے یہ ہے کون؟"

"آدمی ہے اور کون ہوتا!" لیوسی نے جواب دیا۔

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا تھا میری مراد یہ ہے کہ یہاں کیا کرتا ہے؟ کس نے بھرتی کر لیا ہے اسے یہاں؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ پہلے میری ہی ماتحتی میں تھا مگر اس پر رحم آنے کے باوجود میں ہر وقت اس کا وجود اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی چھ ماہ قبل اس کا تبادلہ پولیٹیکل برانچ میں ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میری شکایت پر اسے انسپکٹر مولاداد کی ماتحتی میں دے دیا گیا تھا۔" لیوسی نے تفصیل سے بتایا "میں چاہتی تو اس کے خلاف کوئی سخت ایکشن بھی لے سکتی تھی مگر مجھے اس شخص پر رحم آتا ہے۔ پتا ہے تمہیں اس کی عمر کیا ہے؟"

"یہی ہو گا کوئی تیس سال کے لپیٹے میں۔" میں نے کہا۔

"اس کی عمر پینتالیس سال سے کم نہیں ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گی۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ یہ اب تک کنوارا ہے۔"

"یہ سن کر مجھے قطعی تعجب نہیں ہوا۔ بھلا اس سے شادی کر کے کون اپنی لونڈیا کی قسمت پھوڑتا!" میں بولا۔

"خدا سے ڈرو اللہ دتا! ایسی بے رحمانہ باتیں نہیں کرتے۔"

"تمہیں اس پر رحم آتا ہے تو کر لو نا اس سے شادی! آخر کمی کیا ہے اس میں! دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں، ناک ہے، منہ ہے اور آنکھیں بھی دو ہیں، کیا ہوا جو ایک بڑی ایک چھوٹی ہے!"

"اُتر آئے بکواس کرنے پر!" لیوسی تیز لہجے میں بولی۔

"کیوں؟ اس میں بکواس کی کیا بات ہے! رحم آتا ہے تو پھر رحم کرو نا اس پر! اگر بے چارہ یونہی شادی کی حسرت دل میں لیے مر گیا تو تمہارا گوڈ تمہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ پکا عاشق لگتا ہے تمہارا! عاشق اسی طرح ڈھیٹ ہوتے ہیں جیسا وہ ہے۔"

"اگر تم اسی طرح بکواس کرتے رہے تو میں تمہارے کمرے کی بجائے اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ جاؤں گی۔" لیوسی نے دھمکی دی۔

میرے کمرے کا دروازہ اب سامنے ہی نظر آرہا تھا ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اب وہاں تک پہنچ گئے تھے۔ اُس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ میں چپ ہو گیا۔

دفتر کا وقت ختم ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ مجھے اور لیوسی کو کمرے میں آکر بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ تیواڑی جی کا حکم آگیا۔ حکم کے مطابق ہم دونوں کو میک اپ کر کے دفتر سے فوراً نکل جانا تھا۔ تیواڑی جی کا حکم تھا کہ ہم دونوں صاحب بہادر، یعنی سر تھامسن کی کار کا انتظار کریں اور جب کار چلے تو اس سے زیادہ فاصلے پر نہ رہیں۔ میں یہ حکم سن کر کھل اٹھا۔ میں نے بہت دن سے بھیس نہیں بھرا تھا۔ مجھے نواب صاحب بننے کا بہت شوق تھا، چہرے پر خوب صورت سی چھوٹی سی داڑھی، دائیں رخسار پر چھوٹا سا مسا، جسم پر شیروانی اور پاجامہ اور ہاتھ میں پتلی سی چھڑی! میں ایک بار پہلے بھی "نواب صاحب" بن چکا تھا۔ اس دن بھی میں نے یہی بھیس بھرا۔ لیوسی نے اپنے چہرے میں کوئی تبدیلی کرنے کی بجائے ٹوپی دار سفید برقع پہن لیا۔

"گویا میں نواب صاحب اور تم میری بیگم!" میں نے میک اپ رُوم سے نکلتے ہوئے کہا۔

"صورت دیکھی ہے آئینے میں!"

"ہاں ابھی تو دیکھی تھی، بالکل نواب صاحب لگ رہا ہوں، ہاں!" میں اکڑ کر چھڑی ہلاتا ہوا بولا۔

"ویسے تم یہ چھڑی یہیں چھوڑ دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ تم اس وقت چہل قدمی کرنے نہیں نکلے۔ پھر یہ کہ چھڑی پکڑو گے کہ موٹر سائیکل کا ہینڈل!"

"ارے ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر کوئی بات نہیں، چھڑی کو بغل میں 'دلب' لوں گا۔ بغیر چھڑی کے نوابی ادھوری سی لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد ہی میں، لیوسی کے ہمراہ دفتر کی عمارت سے نکل رہا تھا۔ عمارت سے نکلتے ہی میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھاٹک کے قریب ہی دائیں جانب ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ میں نے بائیں طرف مڑ کر دیکھا تو کچھ فاصلے سے دوسرا ٹرک نظر آیا۔ ان دونوں ٹرکوں میں بہت سے افراد بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان دونوں ہی ٹرکوں میں پولیس والے تھے۔ میں وہاں زیادہ دیر نہیں رُکا بلکہ موٹر سائیکل کو اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر گھمانے لگا۔

ایک ذیلی سڑک پر مجھے کسی موٹر سائیکل کی پُرشور آواز سنائی دی۔ اس قدر شور مچانے والی موٹر سائیکل میرے علم و اطلاع کے مطابق صرف ایک شخص ہی کے پاس ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سمت دیکھا اور مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچاننے میں قطعی کوئی دقت نہ ہوئی حالانکہ وہ شخص بھی میک اپ میں تھا۔

"بڈھی گھوڑی لال لگام!" میں بڑبڑایا۔

"کیا بک رہے ہو!" لیوسی بھنا گئی۔ وہ شاید یہ سمجھی تھی کہ میں نے اُسے بڈھی گھوڑی کہا ہے۔

میں نے لیوسی کی غلط فہمی دُور کرنے کی خاطر کہا "میں تمہیں بڈھی گھوڑی نہیں کہہ رہا، انسپکٹر دلاور خاں کو کہہ رہا تھا جنھوں نے ایک نوجوان کا بھیس بدلا ہے مگر اپنا ڈیل ڈول اور توند چھپانے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔ وہ دیکھو اِدھر ہی آرہے ہیں۔"

"ہاں۔" لیوسی نے تصدیق کی "اور پچھلی سیٹ پر غالباً انسپکٹر مولاداد ہے۔"

وہ انسپکٹر مولاداد ہی تھا جس نے چہرے پر سفید داڑھی فٹ کر رکھی تھی۔ چند لمحے بعد ہی دلاور خاں کی موٹر سائیکل شور مچاتی ہوئی مخالف سمت سے قریب آگئی۔ اسی دن انسپکٹر مولاداد سے میری جھڑپ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد آیا، اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اُسے "بھنڈی" کہا تو وہ میرا سر پھاڑ دے گا۔ اچھا بیٹا، لے پھر لے! میں نے دل ہی دل میں کہا اور پھر جیسے ہی دلاور خاں کی موٹر سائیکل قریب سے گزری میں نے نعرہ مارا "بھنڈی!"

"بج... جان سے... مم... مار دوں گا!" انسپکٹر مولاداد کی دہاڑ مدھم ہوتی چلی گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی لیوسی نے بتایا کہ دلاور خاں اپنی موٹر سائیکل موڑ کر ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔

"ہائے باپ رے!" میں یہ سُن کر گھبرا گیا۔ اسی کے ساتھ میں نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا دی "اب کیا ہو گا!"

"کیوں، کیا تم دلاور خاں یا مولاداد سے ڈرتے ہو؟" لیوسی بولی۔

"ڈرتا کون ہے!" میں نے اکڑ کر کہا "بس یہ سوچ رہا تھا کہ خوامخواہ تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے گی۔ آج ہی مولاداد سے میری جھڑپ ہو چکی ہے۔"

دلاور خاں کی موٹر سائیکل بھاگنے میں کم اور شور مچانے میں زیادہ تھی اس لیے کچھ ہی دیر میں پیچھے رہ گئی۔ میں ایک چکر کاٹ کر پھر دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ اسی وقت سر تھامسن کی کار پھاٹک سے نکلی۔ کار کے آگے آگے ایک اور بھی کار تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سکھ نظر آرہا تھا۔ اس سکھ کی نوکیلی مونچھیں گویا چیخ چیخ کر بتا رہی تھیں کہ داڑھی مونچھوں کے پیچھے تیواڑی جی کا چہرہ ہے۔ انھوں نے سر پر پگڑی بھی باندھ رکھی تھی۔ دونوں کاریں آگے پیچھے روانہ ہوئیں۔ ان دونوں سے آگے پولیس کا ٹرک چل رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنی پھٹ پھٹ، سر تھامسن کی کار کے پیچھے ڈال دی۔ میری پھٹ پھٹ سے کچھ پیچھے ہی پولیس کا دوسرا ٹرک تھا۔ میں نے دلاور خاں اور مولاداد کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں مگر وہ دونوں نظر نہیں آئے۔ تو یوں وہ قافلہ سر تھامسن کے گھر کی طرف چلا۔

ابھی یہ قافلہ شہری حدود ہی میں تھا کہ ایک موٹر سائیکل کا شور قریب آنے لگا۔ اس وقت قافلہ، بازار سیتارام سے گزر رہا تھا۔ لے بیٹا اللہ دتا! اب آئی کم بختی! میں نے سوچا۔ پھر چند لمحے بعد ہی وہ کم بختی مجسم نظر آنے لگی۔ دلاور خاں کی موٹر سائیکل میری پھٹ پھٹ کے بالکل قریب چلنے لگی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی!" دلاور خاں غرائے، بلند آواز میں! کیوں کہ ان کی موٹر سائیکل کا شور بہت زیادہ تھا۔ دلاور خاں نے بھی یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔

"کیا کہا بیٹے؟" میں نے اپنی داڑھی اور بہ ظاہر ان کی نوجوانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے!" وہ تڑاخے "شرم نہیں آتی مجھے بیٹا کہتے ہوئے! تمہارے باپ کی عمر کا ہوں۔"

"چہرے سے تو ایسا نہیں لگتا میرے چاند! ابھی تو شاید تم بالغ بھی نہیں ہوئے۔" میں نے دلاور خاں کو مزید گھسا۔

"تُو... تُو نے... مو... مجھ... مجھے وہ... وہ کیوں کہا تھا بتا؟" اس بار مولاداد نے ہانک لگائی۔

"وہ کیا بزرگوار؟ کچھ وضاحت تو کریں۔"

"اللہ دتا! اپنی کھال میں رہو ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا!" دلاور خاں نے دھمکی دی "ابھی تمہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور پَر پُرزے نکالنا شروع کر دیے۔"

"بیٹے! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام اللہ دتا نہیں، نواب اقتدار اللہ ہے اور پچھلی سیٹ پر نواب بیگم ارجمند بانو بیٹھی ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر میں مولاداد سے مخاطب ہوا "قبلہ! غالباً یہ نوجوان آپ ہی کا برخوردار معلوم ہوتا ہے۔ اسے سمجھائیں!"

"اچھا میں تجھ سے سمجھوں گا اللہ دتا کے بچے!" دلاور خاں نے دانت پیس کر کہا اور اپنی موٹر سائیکل دُور ہٹا لے گئے۔

اسی وقت میرے کانوں میں لیوسی کے ہنسنے کی آواز آئی اور میں بولا "تم کس بات پر قلقلا رہی ہو پیاری نواب بیگم؟"

"مفت میں مجھے بیگم بنائے لے رہے ہو۔" لیوسی ہنستے ہوئے بولی۔ شاید وہ بار بار بیگم کہے جانے پر خوش ہو رہی تھی۔ سچ مچ کی بیگم نہ سہی تو جھوٹ موٹ ہی کی سہی، اس کی خوشی کا سبب یہی ہو سکتا تھا۔

"کیوں، کیا بیگم بنانے میں پیسے لگتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اور کیا!" وہ بولی "جب کسی کو بیگم بنا کر لاؤ گے تو پتا چلے گا۔"

"پتا چلے میرے اماں ابا کو، مجھے کیوں چلے! وہی لا رہے ہیں بیگم بنا کر۔ میں نے تو ان سے نہیں کہا تھا کہ مجھے ایک عدد بیگم لا دو۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہر چند کہ تمھاری بیشتر باتیں قطعی احمقانہ ہوتی ہیں مگر انھیں سن کر آتا مزا ہے۔" لیوسی چہک کر بولی "تم نے دلاور خاں کو بیٹا کہہ کر تو کمال ہی کر دیا۔ وہ جل بھن کر خاک ہو گیا ہو گا۔"

"دیکھو لیوسی، احمقانہ باتیں احمق کرتے ہیں جب کہ میں قطعی احمق نہیں ہوں، سمجھ گئیں! اب اگر کوئی ایسی نازیبا بات کہی تو اتار دوں گا پھٹ پھٹ سے! پھر بھاگنا پیدل اپنے صاحب بہادر کی کار کے پیچھے!" میں لیوسی کی بات پر خوش ہونے کی بجائے برا مان گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی، وہ جب چاہے مجھے احمق یا بے وقوف کہہ دیتی تھی۔

"بس اینٹھ گئے، برف خانے کے چمار کی طرح، ذرا سی تعریف پر!" لیوسی نے مجھے مزید سلگا دیا۔

"کیا کہا چمار؟" میں حلق پھاڑ کر چیخا "چمار ہو گی تم بلکہ چمریا! میں ہرگز یہ گالیاں برداشت نہیں کر سکتا!"

"کیوں، کیا چمار، آدمی نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہو گا آدمی، میرے پاؤں کی جوتی بلکہ جوتے سے! میرا ہرگز اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے بدستور برہمی سے کہا۔

اسی چخ چخ میں صاحب بہادر اپنی کوٹھی تک پہنچ گئے۔ یا تو مجرموں کو کچھ سن گن لگ گئی تھی کہ صاحب بہادر پورے لاؤ لشکر کے ساتھ سفر کر رہے ہیں یا پھر انھوں نے اس بار اپنے طریقۂ کار میں کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ اگر وہ کم بخت پہلی بار ہی یہ تبدیلی کر دیتے تو میں سڑک پر بندھے ہوئے رسّے سے ٹکرا کر کیوں گرتا اور کیوں میری کہنیاں اور گھٹنے وغیرہ چھلتے مگر ان کم بختوں کو تو مجھ سے بَیر تھا۔

سر تھامسن کوان کی کوٹھی پر بہ خیر و عافیت پہنچانے کے بعد واپسی ہوئی۔ اب وہاں مجھے گیارہ بجے رات کو پہنچنا تھا۔ واپسی میں ایک بار پھر دلاور خاں اور مولا داد نے مجھ سے اٹکنے کی کوشش کی مگر میں نے بھی ان دونوں کو پہچاننے سے قطعی انکار کر دیا اور نواب اقتدار اللہ بنا رہا۔ پھر جب کسی طرح وہ جان چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے اپنی پھٹ پھٹ تیز بھگا دی۔ مجھے علم تھا کہ ان کی موٹر سائیکل اپنی پوری رفتار پر بھاگنے کے باوجود میری پھٹ پھٹ کو نہ پکڑ سکے گی۔ پھر یہی ہوا بھی۔

میں نے اپنے گھر کا رخ کرنے کی بجائے لال کنویں کا رخ کیا تاکہ لیوسی کو اس کے گھر اتار دوں۔ راستے ہی میں لیوسی سے یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ رات گیارہ بجے میں اسے اس کے گھر سے لے لوں گا۔ گھر پہنچ کر اور کھانے وغیرہ سے فراغت پا کر میں نے آرام کو ترجیح دی۔ جیسے جیسے رات قریب آتی جا رہی تھی میرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہو، کیا نہ ہو! ہر چند کہ میرے علم میں تھا، وہاں بڑا لاؤ لشکر ہو گا، پھر بھی اگر گولی دو ولی چل چلا گئی تو کیا ہو گا۔ گولی کی آنکھیں تو ہوتی نہیں، کم بخت اندھی ہوتی ہے۔ وہ نام پوچھ کر تو بیٹھے گی نہیں کہ اچھا تم اللہ دتا ہو، جاؤ معاف کیا، میں کسی اور کے سینے میں اتری جاتی ہوں۔ وہ تو بس دَن سے چلتی ہے اور زَن سے بغیر پوچھے گچھے جسم کے کسی بھی حصے میں اتر جاتی۔ کر لو دکان داری! اب پڑے ہیں دانت جیسے زمین پر! میں نے کوشش تو کی تھی کہ اس ہنگامے سے بچ جاتا مگر سر تھامسن کو خدا ہی سمجھے۔ وہ بڈھا تو بس میری ننھی سی جان کا لاگو ہو گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا اور ضرورت پیش آ جاتی تو وہ مجھے شیر کی کچھار میں بھیجنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ چاہے شیر مجھے پھاڑ ہی کھاتا۔ اس بدبخت اور سنگ دل پر جب اپنی بیوی کے ہاتھ پیر کٹنے کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا تو بھلا وہ میرا کیا خیال کرتا۔

اس کم بخت نوکری میں مزے بھی تھے اور جان بھی ہر وقت سولی پر لٹکی رہتی تھی۔ اسی دن جب میں نواب اقتدار اللہ بن کر گھر میں داخل ہوا تھا تو بڑا مزہ آیا تھا۔ بڑے بھیّا، گھر میں تھے۔ پہلی نظر مجھ پر انھی کی پڑی تھی۔

"ارے ارے آپ کہاں گھسے آ رہے ہیں؟" بڑے بھیّا کی احتجاجی آواز سنائی دی تھی۔ وہ مجھے قطعی نہ پہچان سکے تھے اور مجھے اس سے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی مجھے نواب صاحب سمجھے تھے۔

میں نے دانستہ کوئی جواب نہیں دیا تھا اور قدم بڑھا کر آنگن میں پہنچ گیا تھا جہاں امی، نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز سمیٹ رہی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بھی چیخ اٹھی تھیں "ارے دیکھنا، اللہ دتا کے ابا! یہ کون مردوا گھر میں گھسا چلا آ رہا ہے!"

ابا اندر والے کمرے سے لپکتے ہوئے باہر آ گئے اور وہ بھی مجھے نہ پہچان سکے۔ ادھر بڑے بھیّا کے تیور بدلنے لگے۔ وہ شاید اب تک اس لیے خاموش رہے تھے کہ ممکن ہے، میں کوئی دُور کا عزیز ہوں۔ اب مزید "ڈریامے" کا مطلب ٹھکائی پٹائی ہو سکتا تھا اس لیے میں جھٹ سے بول پڑا "ارے امی، آپ نے اپنے اللہ دتا کو نہیں پہچانا!"

امی، ابا اور بڑے بھیّا، مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے جیسے میرے سر پر سینگ تلاش کر رہے ہوں۔ پھر چند لمحے بعد ابا ہی بولے "مگر یہ تو نے داڑھی کب رکھ لی؟"

"یہ تو نقلی داڑھی ہے ابا!" میں نے گویا ان کے علم میں اضافہ کیا۔

"اے نقلی داڑھی!" ابا حیرت سے بولے، پھر امی سے کہا "لو اور سنو اللہ دتا کی اماں! اب داڑھیاں بھی نقلی چل نکلیں۔"

"مگر یہ تو سراسر داڑھی کی توہین ہے اللہ دتا کے ابا!" امی بولیں۔

"یہ تیرے پاس آئی کہاں سے؟ اور یہ شیروانی، چھڑی، پاجامہ... اور تیرے کپڑے کہاں گئے؟" ابا نے انکوائری شروع کر دی۔

"یہ دفتر کی داڑھی ہے ابا!" میں نے بتایا "اور یہ کپڑے وغیرہ سب وہیں کے ہیں۔"

"تو یوں کہہ نا کہ یہ سرکاری داڑھی ہے۔" ابا مطمئن لہجے میں بولے "اچھا تو اب تیرے دفتر سے کپڑے وغیرہ بھی ملا کریں گے، یہ بہت اچھا اللہ دتا کی ماں!" ابا نے آخری جملہ امی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا "مگر یہ داڑھی والا معاملہ کچھ ٹھیک نہیں۔ ایسا ہی ہے تو تُو اصلی داڑھی کیوں نہیں رکھ لیتا!"

"لو اور سنو! ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، ابھی سے داڑھی رکھوائے دے رہے ہو!" امی بولیں۔

"تم جانو، میں نے تو ایک نیک مشورہ دیا تھا۔" ابا نے کہا۔

اس کے بعد میں بڑی مشکل سے ابا کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ داڑھی، شیروانی اور بقیہ سامان سب ادھار کا ہے جو واپس دینا پڑے گا۔

"پھر تو کوئی فائدہ نہیں۔" ابا مردہ سے لہجے میں بولے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"اب یہ داڑھی اتار اور آدمی بن کر کھانا کھا!" امی نے مجھ سے کہا۔

"نہیں امی، یہ داڑھی فی الحال یہیں موجود رہے گی، جہاں ہے۔ مجھے اسی بھیس میں آج رات ایک سرکاری کام سے جانا ہے۔" میں نے عذر پیش کیا۔

"ابے کیوں سیر سپاٹے اڑانے کے لیے سرکاری کام کا بہانہ کر رہا ہے!" بڑے بھیّا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"تو چپ رہ! جس طرح خود نکھٹو ہے اسی طرح اسے بھی سمجھتا ہے!" امی نے بڑے بھیّا کو ڈانٹ دیا "دیکھتا نہیں دن رات کام کرتا ہے اور ایک تو ہے کہ ذرا سا ہلک کر دکان پر بھی نہیں بیٹھا جاتا!"

"تمھاری انھی باتوں سے یہ سر چڑھ گیا ہے۔ دیکھنا ایک دن سر پکڑ کر روؤ گی۔" بڑے بھیّا جل کر بولے۔

"سر پکڑ کر روئیں میرے دشمن!" امی ہاتھ نچا کر بولیں "چل اپنا کام کر!"

پھر امی نے بڑے چاؤ سے مجھے کھانا کھلایا۔ گرم گرم چپڑی ہوئی روٹیاں اور ارد کی دال، مزہ آ گیا۔

مجھے گیارہ بجے لیوسی کو ساتھ لے کر صاحب بہادر کی کوٹھی پر پہنچنا تھا اس لیے دس بجے ہی گھر سے نکل گیا۔ صاحب بہادر کی کوٹھی کیوں کہ شہری آبادی سے باہر نو تعمیر علاقے میں تھی اس لیے جلدی ہی گھر سے نکلنا بہتر تھا۔ پھر یہ کہ لیوسی کو لینے لال کنویں بھی جانا تھا۔ ہر چند کہ تیواڑی جی نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ رات کو بھی اسی بھیس میں آنا ہے مگر میں نے احتیاطاً وہ بھیس ختم نہیں کیا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ کہ مجھے علم تھا، رنجیت بھی مجرموں کے ساتھیوں میں سے ہے اور وہ بد ذات مجھے پہچانتا ہے۔ اگر اسے ذرا بھی ہوا لگ گئی کہ میں بھی وہاں موجود ہوں تو کم از کم مجھے تو ٹھنڈا کر ہی دے گا۔

میں جب لیوسی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر بولی "آخر اب اس کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے میری داڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"بھول گئیں، تیواڑی جی نے کیا کہلوایا تھا اسی وقت!" میں بولا۔

"وہ تو دن کی بات تھی اور مجرموں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ سر تھامسن تنہا ہیں۔" لیوسی نے کہا۔

"تو اب کیا مجرموں کو یہ بتانا ہے کہ سر تھامسن پوری فوج لیے ان کے انتظار میں بیٹھے ہیں!" میں نے بحث کی۔

"تم تو بس گلے پڑ جاتے ہو۔" لیوسی زچ ہو کر بولی۔

"میں بھی کوئی ہار ہوں کہ گلے پڑ جاؤں گا!"

"اچھا اب چلو، دیر نہ ہو جائے۔" لیوسی نے میری پھٹ پھٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

لیوسی نے اس وقت، انگریز میموں جیسا ایک چست لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کے جسمانی خطوط خاصی حد تک واضح ہو گئے تھے۔ پتا نہیں اس لباس کو پہننے کا مقصد جسم چھپانا تھا یا دکھانا۔ بہرحال میں نے اسے اپنی پھٹ پھٹ کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور چل پڑا۔

ہم دونوں صاحب بہادر کی کوٹھی تک گیارہ بجے سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے۔ صاحب بہادر، تیواڑی جی، دلاور خاں اور مولا داد

ہمیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی کھڑے ہوئے ملے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لوگ وہاں میرے استقبال میں کھڑے ہوں۔ میں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کرنے لگا تو صاحب بہادر نے ہاتھ کے اشارے سے پھاٹک کے اندر جانے کے لیے کہا۔ میں ادھر بڑھ گیا۔ لیوسی پہلے ہی پچھلی سیٹ سے اتر کر ان لوگوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ میں جب اپنی موٹر سائیکل اندر کھڑی کر کے باہر آیا تو تیواڑی جی مجھے گھورتے ہوئے بولے "تم نے اپنا میک اپ کیوں نہیں ختم کیا؟"

"سر! آپ نے میک اپ کرنے کا حکم تو دیا تھا مگر اسے اتار کر آنے کے لیے کوئی ہدایت نہیں دی تھی!" میں نے صفائی پیش کی۔

"کیا تمہارے پاس عقل نہیں تھی!" تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں پھڑکیں "تم دیکھ نہیں رہے کہ یہاں کوئی بھی میک اپ میں نہیں ہے!"

"ہاں سر! مجھے یہ تو نظر آ رہا ہے" میں نے آہستہ سے کہا اور ان کی طرف سے نظر ہٹالی تاکہ مونچھیں نظر نہ آئیں جن سے مجھے خوف آتا تھا۔

"داڑھی اور مونچھیں اتار کر جیب میں رکھ لو!" تیواڑی جی نے حکم دیا۔

میں نے فوراً تعمیل حکم کی۔ صاحب بہادر نہ جانے کس سوچ میں گم نظر آ رہے تھے۔

"ریوالور ساتھ لائے ہو یا وہ بھی چھوڑ آئے ہو؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔

میں نے گھبرا کر شیروانی کی جیبیں ٹٹولیں اور پسینے آ گئے۔ ریوالور جیب میں نہیں تھا۔ وہ میری پینٹ کی جیب ہی میں رہ گیا تھا اور میری پینٹ میک اپ روم میں تھی۔

"چپ کیوں ہو؟ جواب دو!" تیواڑی جی نے مجھے للکارا۔

"وہ... وہ سر! مجھے پتا نہیں تھا کہ... کہ یہاں گولیاں بھی چلیں گی ورنہ..." یہ کہتے کہتے مجھے ایک نئی ہی سوجھی۔ "آپ کہیں سر، تو میں واپس چلا جاؤں؟"

"نہیں!" تیواڑی جی جبڑے بھینچ کر سخت لہجے میں بولے۔ "تم واپس نہیں جاؤ گے!"

"پھر... پھر سر، اگر یہاں واقعی گولی چل گئی تو... تو میں... میں کیا کر سکوں گا۔ مجھے... مجھے تو سر، بندوق بھی نہیں آتی" میرا انداز بالکل رو دینے کا سا تھا۔ مجھے اس وقت تک یہ احساس نہیں تھا کہ وہاں کون کون کھڑا ہے۔ بس مجھے تو یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی بہانے اپنی جان چھڑا لوں، عزت جائے تو جائے، رہے تو رہے، جان سے زیادہ عزت نہیں ہوتی۔

وہاں آثار کچھ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے زبردست ہنگامہ برپا ہونے والا ہے۔ میں کسی کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا جو شرمندگی کا احساس ہوتا۔ تیواڑی جی کی طرف اس لیے نہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے مسلسل گھورے چلے جا رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچا چبا جائیں گے۔

پھر معاً تیواڑی جی کی آواز اس طرح سنائی دی جیسے دھماکا ہوا ہو "دفع ہو جاؤ یہاں سے!"

اس دھماکے کے ساتھ ہی میرے دل کی کلیاں چٹاچٹ کھل اٹھیں۔ میں وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ دوسرے دھماکے نے میری ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ دھماکا سر تھامسن کی آواز کا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے درمیان رہتے رہتے "دفع ہو جاؤ" کا مطلب تو سمجھ ہی چکے تھے۔

"ہم نائیں جائے گا!" سر تھامسن غصے میں انگریزی کی بجائے اردو بول گئے تھے۔

میں سر تھامسن کی آواز سن کر سہم گیا اور میرا اٹھا ہوا قدم پھر اپنی جگہ واپس آ گیا۔

"تم اس کو کیدھر دفع کر رہا ہے؟" سر تھامسن بدستور اردو کی ٹانگ توڑنے پر بضد تھے۔ انھوں نے تیواڑی جی سے جواب طلب کیا تھا۔

"سر! یہ اپنا ریوالور ساتھ نہیں لایا" تیواڑی جی نے وضاحت کی۔

"تم کو کیتنا ریوالور مانگتا بولو؟" سر تھامسن نے اس طرح کہا جیسے انھوں نے اپنی کوٹھی میں اسلحہ ساز فیکٹری کھول رکھی ہو۔

تیواڑی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ میں اس کھینچا تانی کے دوران میں یہ بخوبی سمجھ چکا تھا کہ جان بچانے کی کوئی صورت نہیں اس لیے خواہ مخواہ کیوں تماشا بنا جائے اور ان سب لوگوں کے سامنے گھگھیا کر کیوں اپنی عزت خراب کرائی جائے۔ یہی سبب تھا کہ تیواڑی جی کے کچھ کہنے سے پہلے میں بول اٹھا۔ میں نے سر تھامسن کو مخاطب کیا تھا "سر! اگر ریوالور موجود ہے تو پھر میں خود یہاں سے جانا پسند نہیں کروں گا۔ آپ تو اچھی طرح جانتے ہوں گے سر، کہ ایسے نازک موقعوں پر خالی ہاتھ آدمی، دوسروں کے لیے بھی مصیبت بن جاتا ہے۔"

"مگر تم اپنا ریوالور بھول کر آئے ہی کیوں؟" سر تھامسن میری انگریزی کے جواب میں اپنی مادری زبان ہی بولنے لگے۔

"چاہے جیسی قسم لے لیں سر، بس غلطی سے رہ گیا دفتر میں!" میں خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

"اچھا، میں ابھی ریوالور کا بندوبست کرتا ہوں" یہ کہہ کر سر تھامسن مڑے اور اپنے ایک ملازم کو پکارا۔

کچھ ہی دیر بعد میرے پاس ریوالور آ چکا تھا اور فاضل گولیاں بھی! پھر سر تھامسن، تیواڑی جی سے گفتگو کرنے لگے جس سے مجھے پتا چلا کہ انھوں نے اپنی کوٹھی کے سامنے والی کوٹھی خالی کرا لی تھی۔ اس میں بھی کوئی سرکاری انگریز افسر رہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر سر تھامسن ہی کی کوٹھی والی سمت ایک اور خوب صورت سا بنگلا بنا ہوا تھا۔ اس بنگلے کے مکین بھی سر تھامسن کی کوٹھی میں آ چکے تھے۔ دونوں خالی مکانوں میں مسلح پولیس کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اس کے علاوہ آس پاس اس پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ تیاریوں سے ایسا پتا چل رہا تھا جیسے ہزار دو ہزار آدمی، سر تھامسن کی کوٹھی پر چڑھائی کرنے والے تھے۔

میری اور لیوسی کی ڈیوٹی، سر تھامسن کی کوٹھی کے سامنے والی کوٹھی میں لگی۔ مجھے اور لیوسی کو اس کوٹھی کے پھاٹک سے قریب تاریک حصے میں موجود رہنا تھا۔ وہاں سے سر تھامسن کی کوٹھی کا پھاٹک صاف نظر آ رہا تھا۔ تیواڑی جی اور دلاور خاں کو سر تھامسن کی کوٹھی میں رہنا تھا۔ پھاٹک کے قریب ہی دائیں جانب کچھ پیڑ لگے ہوئے تھے جہاں اندھیرا تھا۔ ان دونوں کو انہی پیڑوں کی آڑ میں رہ کر پھاٹک کی نگرانی کرنا تھی۔ پولیس والوں کے لیے یہ احکام جاری کیے گئے تھے کہ جیسے ہی سر تھامسن، نوکری پھاٹک پر رکھ جائیں، اس کے بعد کوئی بھی کوٹھی کی طرف بڑھتا نظر آئے، اُسے فوراً نرغے میں لے لیا جائے۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کے پیروں پر فائر کیے جائیں اور گولی بہ مجبوری ہی چلائی جائے۔ انسپکٹر مولاداد کی ڈیوٹی اس بنگلے میں لگائی گئی تھی جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اُس کے لیے یہ حکم تھا کہ جیسے ہی کوئی اس بنگلے کے سامنے سے گزر کر سر تھامسن کی کوٹھی کی طرف بڑھتا نظر آئے اسے پیچھے سے گھیر لیا جائے تاکہ واپسی کی راہ مسدود ہو جائے۔ میرے اور لیوسی ہی کے اشارے پر اس کوٹھی میں موجود پولیس کو کوئی قدم اٹھانا تھا۔ گویا میں اور لیوسی اُن پولیس والوں کو کمانڈ کر رہے تھے۔

سوا گیارہ بجے تک تمام احکام جاری کر دیے گئے اور پھر تمام افراد اپنی اپنی مقررہ جگہوں کی طرف بڑھ گئے۔ ایک طرف میرے دل میں متوقع ہنگامے کے بارے میں سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے اور دوسری طرف میں اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ کوئی سو پولیس والے میرے ایک اشارے کے منتظر تھے۔

میں دھڑکتے دل اور کانپتے ہوئے قدموں سے لیوسی کے ہمراہ سامنے والی کوٹھی کی طرف بڑھا۔ اس کوٹھی میں موجود پولیس افسران سے ہمارا پہلے ہی تعارف کرا دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک پولیس افسر کو ہمارا حکم سننے کے لیے قریب ہی رہنا تھا تاکہ وہ فوری طور پر کوٹھی کے اندر جا کر بقیہ پولیس والوں کو ہمارے حکم سے آگاہ کر سکے۔

پھاٹک کے قریب جہاں گہری تاریکی تھی، میں اور لیوسی پہنچ گئے۔ وہ گھاس کا ایک قطعہ تھا۔ ہم دونوں جیسے ہی گھاس پر بیٹھے، قریب ہی سے کھانسنے کی آواز آئی اور میں اچھل پڑا مگر فوراً ہی مجھے اُس پولیس افسر کا خیال آ گیا جو کچھ دیر پہلے اس طرف آیا تھا۔ اگر مجھے یہ خیال نہ آ گیا ہوتا تو میرا پیشاب خطا ہو جاتا۔ حکم کا غلام! میں نے دل ہی دل میں اپنے دل کو تسلی دی۔ وہ صورت حرام شاید وہاں اپنی موجودگی ظاہر کرنے کے لیے کھانسا تھا۔

کچھ دیر ہی میں وہاں تاریکی اور سناٹا چھا گیا۔ مجھے اپنے اور لیوسی کے سانسوں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا، میرے اعصاب کشیدہ ہوتے رہے۔ پھر میں نے اچانک ہی لیوسی کو مخاطب کیا "کچھ بولو نا! مجھے... مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

"آہستہ بولو!" لیوسی نے سرگوشی کی "سناٹے میں ذرا سی آواز بھی بہت تیز سنائی دیتی ہے۔ یوں بھی ضرورت کیا ہے بولنے کی!"

"ارے میں نے کہا نا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے اور کیسے کہوں! تمہاری نظر میں یہ کوئی ایسی ضروری بات ہی نہیں!" میں نے چڑ کر کہا "اگر اسی طرح چپ بیٹھے بیٹھے میرا دم نکل گیا تو؟"

"ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا" لیوسی نے بالکل میرے لہجے میں میری نقل اتاری "اب کیا ہوگا؟ تم اگر یہاں بیٹھے بیٹھے مر گئے تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ اس وقت تو تمہارے کفن دفن کا بندوبست بھی نہ ہو سکے گا۔"

میں لیوسی کی بات سن کر سلگ ہی تو گیا اور اس "سلگن" میں میرا سارا خوف ہوا ہو گیا۔ خوف کی جگہ اب غصے نے لے لی تھی۔

"بیٹھے بیٹھے مر جاؤ تم!" میں برہم ہو کر بولا "کفن پہنو تم اور دفن بھی تمھی ہو جاؤ۔ آئیں کہیں سے مجھے مارنے والے! اگر میری امی نے سن لیا تو وہ تمہارے جھونٹے پکڑ کر لٹک جائیں گی، آیا کچھ سمجھ میں! میری امی تمھیں آ گئے!"

"اس طرح بڑی بوڑھیوں کی طرح نہ کوسو، کبھی کبھی بددعا اُلٹی بھی ہو جاتی ہے! اور ہاں ذرا اپنا والیوم نیچا ہی رکھو، اگر تیواڑی جی کے کانوں تک بھنک پہنچ گئی تو سمجھ لو، وہ تم سے کس طرح پیش آئیں گے" لیوسی کے اوپر میری بددعاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور چہکتی رہی۔

تیواڑی جی کا خیال آتے ہی میری سٹی گم ہو گئی کیوں کہ ایسے واقع پر کچھ اور گم نہیں ہوتا، بس دے دے کر ایک بے چاری سٹی ہے جو گم ہو جاتی ہے۔ اسی وقت ایک اور بات میرے ذہن میں آئی۔ غصے کی جگہ

اب پھر خوف مجھ پر غالب آگیا تھا۔ میں نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "ارے سنو تو! یہ تو سوچو کہ اگر قبلہ مجرم صاحب ٹوکری اٹھانے آئے اور جلدی سے رفوچکر ہونے لگے تو لامحالہ ہمیں ان موصوف پر گولی چلانا پڑے گی۔"

"ظاہر بات ہے، اس میں سوچنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

"بس یہی تو تمھیں نہیں معلوم!" میں سینہ تان کر بولا۔ میں اس بات سے بھول گیا تھا کہ جو بات میرے ذہن میں آئی ہے لیوسی نہیں سوچ پائی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میں اس سے زیادہ قابل تھا۔

"نہ ہو معلوم، مجھے معلوم نہیں کرنا۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "کیا تم چپ نہیں بیٹھ سکتے!"

"ارے نہیں معلوم تو معلوم کرو ورنہ ہو جاؤ گی ٹیں! کیا سمجھیں!" میں جلدی سے بولا۔ پھر خود ہی اس کی معلومات میں "اضافہ" کرنے لگا۔ "سنو، جس طرح ہم مجرم کو فرار ہوتے دیکھ کر گولی چلائیں گے، ادھر سے، بالکل اسی طرح تیواڑی جی بھی کریں گے۔ مجرم تو خیر مارا جائے نہ مارا جائے، وہ کوئی مسئلہ نہیں لیکن تیواڑی جی، دلاور خان، مسمات لیوسی اور یہ حقیر فقیر ایک دوسرے کی چلائی ہوئی گولیوں سے اللہ میاں کو پیارے ہو جائیں گے۔ اب کر لو دکان داری!"

"تو کیا ہوا!" لیوسی انتہائی اطمینان سے بولی۔ "ایک دن سبھی کو مرنا ہے، ہم مر جائیں گے تو کون سی آفت آجائے گی!"

"جی نہیں!" میں پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میں ابھی ہرگز ہرگز مرنے پر تیار نہیں ہوں۔ تمھیں مرنا ہے تو مر جاؤ، میں تو چلا! مجھے نہیں کرنا ایسی نوکری! اگر میری امی کو پتا چل جائے کہ ان کا بیٹا، اس نابہنجار نوکری کی خاطر ہر وقت جان ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے تو فوراً نوکری کو طلاق دلوا دیں۔ میں آج انھیں بتا ہی دوں گا سب کچھ!" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا۔

"اچھا تو کیا واقعی تم نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے!" لیوسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں اس میں مرنے کی کیا بات ہے؟ ہاتھ چھوڑو میرا!"

"تمھیں پتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔" لیوسی بہ دستور میرا ہاتھ پکڑے رہی۔

"ہاں ہے تو پھر؟"

"اس اندھیرے میں کسی کو تمھارا رُوئے زیبا نظر نہیں آئے گا اور تمھیں پولیس والے مجرم ہی سمجھیں گے۔ اتنی رات گئے بھلا کسی کا یہاں کیا کام! پھر پتا ہے کیا ہوگا؟ سناٹے میں ایک دم گولی کا دھماکا سنائی دے گا، گولی تمھارے سینے پہ لگے گی اور تم چیخ کر ڈھیر ہو جاؤ گے۔"

"یہ... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" یہ کہہ کر میں دھم سے زمین پر گر گیا۔ پھر میں نے اس سے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"ہر بات بتائی نہیں جاتی، کچھ باتیں خود بھی سمجھ لی جاتی ہیں۔" لیوسی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ... کہ وقت آخر آ ہی گیا! پھنس ہی گئے آج! بس اب ایک اللہ تبارک تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو بچانے والی ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میرا جی چاہا کہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگوں مگر اس طرح رونے میں بھی خطرہ تھا اس لیے میں نے یہ ارادہ بھی ترک کر دیا۔

"اچھا اب بہت ہو گیا، چپ بیٹھو!" لیوسی سنجیدگی سے بولی۔ "میں تمھاری اداکارانہ صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں، مجھے مزید گھسنے کی کوشش نہ کرو۔"

"لو یہاں جان پر بن رہی ہے اور تم کہہ رہی ہو، اداکاری کر رہا ہوں! میں بھونکڑا، مار کر رونے لگوں گا، اسی وقت تمھیں یقین آئے گا کہ سچ مچ خوف زدہ ہوں!"

"دیکھو اللہ دتا، میں جانتی ہوں کہ چپ بیٹھے بیٹھے تم بیزاری کا شکار ہو رہے ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمھاری زبان میں کھجلی ہے، تم زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتے مگر اب بس بارہ بجنے ہی والے ہوں گے اس لیے احتیاط کی ضرورت ہے۔" لیوسی نے مجھے سنجیدگی سے سمجھایا۔

"اچھا تو تم یہی چاہتی ہو کہ میں بغیر آہ و فغاں کیے مر جاؤں چلو یہی سہی! اب... اب میں... میں نہیں بولوں گا... بالکل نہیں بولوں گا۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا گلا رُندھ گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کے وقت کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، میں نے سوچا اور میری آنکھوں میں سچ مچ آنسو آگئے۔ پھر تو جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا۔ دھڑا دھڑ آنسو بہنے لگے۔ آنسو بہے تو میری ناک بھی سُڑ سُڑانے لگی۔

"کیوں، کیا تمھیں نزلہ ہو گیا ہے؟" لیوسی نے آہستہ سے کہا۔ اندھیرے کے سبب وہ میرے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکی تھی اور ناک کے سُڑ سُڑانے کا سبب نزلے کو سمجھی تھی۔

اسی وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ لیوسی کچھ بھی سہی ہے تو عورت ذات، مجھے مرد ہو کر اس کے سامنے نہیں رونا چاہیے یا چلو اگر آنسو آ ہی گئے ہیں تو یہ راز اسے معلوم نہ ہو۔ بہانہ اس نے خود ہی مجھے سجھا دیا تھا۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ "ہاں، اتنی دیر سے کھلے میں بیٹھا ہوں اس لیے زکام ہو گیا ہے۔" ہوا میں کچھ خنکی تھی بھی اس لیے بات بن گئی۔ پھر چپکے سے

میں نے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے۔ لیوسی نے میری بات سن کر خاموشی اختیار کر لی تھی اس لیے پھر میں بھی کچھ نہ بولا۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری ہوگی کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ سناٹے میں کہیں بہت دور سے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

"لیوسی! وہ... وہ شاید مجرم آگیا۔" میں گھبرا کر بولا۔

"چپ رہو! ہر وقت یہ بناوٹی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ مجرم کہاں سے آجائے گا، ابھی ڈی جی صاحب نے پھاٹک پر ٹوکری تو لا کر رکھی ہی نہیں۔ قدموں کی چاپ انھی کی لگتی ہے۔ اب بالکل چپ رہنا!"

لیوسی کی بات سن کر میرے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ بس اب ہوئی دھائیں دھوں!

قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میری نگاہ سر تھامسن کی کوٹھی کے پھاٹک پر جمی ہوئی تھی۔ پھر وہ لمحہ بھی آہی گیا جب میں نے پھاٹک کو آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا۔ پھاٹک کی دونوں جانب والے ستونوں پر جو بلب لگے ہوئے تھے، اس کے ساتھ وہ بھی جل اٹھے۔ ہر چند کہ وہ بلب کم طاقت کے تھے لیکن اس تاریکی میں وہی خاصے روشن معلوم ہو رہے تھے۔ چند لمحے بعد سر تھامسن کا بوڑھا چہرہ نظر آیا۔ وہ پھاٹک سے نکلے اور کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری نمایاں جگہ رکھ دی۔ اس ٹوکری میں ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی فائل ضرور تھی۔ پتا نہیں سر تھامسن نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اصل فائل ہی اس ٹوکری میں رکھ دی تھی یا پھر فائل کور میں سادہ کاغذ تھے جیسا کہ پہلے کیا گیا تھا۔

سر تھامسن جس طرح آئے تھے، اسی طرح ٹوکری رکھ کر واپس چلے گئے۔ قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی اور پھر دوبارہ سناٹا چھا گیا لیکن ستونوں پر موجود دونوں بلب جلتے رہے۔ غالباً سر تھامسن جاتے ہوئے پھاٹک کی زنجیر لگانا بھول گئے تھے یا پھر انھوں نے دانستہ ایسا کیا تھا کیوں کہ میں نے زنجیر کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنی تھی جب کہ پھاٹک کھولے جانے سے پہلے زنجیر کی آواز آئی تھی۔

ابھی بہ مشکل دس پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سناٹا ایک بار پھر مجروح ہو گیا۔ اس بار میں پہلے سے بھی زیادہ گھبرا گیا کیوں کہ قدموں کی یہ چاپ مجرم ہی کی ہو سکتی تھی۔ سر تھامسن تو ظاہر ہے دوبارہ باہر نہ آتے۔ میں نے اس بار لیوسی کا شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔ "سن... سن رہی ہو... اب کے تو وہ سچ مچ ہی آگیا۔" ڈر کے مارے میری آواز خود بہ خود بہت آہستہ نکل رہی تھی۔

"ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" لیوسی نے جواباً سرگوشی کی۔ "ریوالور نکال لو احتیاطاً!"

"ری... ریوا... ریوالور!" میں ہکلایا اور شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

قدموں کی چاپ کچھ اور قریب آئی اور پھر اسی وقت سناٹے میں ایک ہکلاہٹ گونجی۔ "آپ... آپ... اپنے... ہا... ہا... ہاتھ اٹھا... اٹھا لو!" یہ آواز سو فیصد انسپکٹر مولا داد کی تھی۔

یہ جان کر کہ مجرم پکڑا گیا ہے، میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ہر چند کہ مولا داد سے میری جھڑپ ہو چکی تھی اور اس کا ہکلاپن میری سماعت پر گراں گزرتا تھا لیکن اس وقت وہ ہکلاہٹ مجھے دنیا بھر کی تمام آوازوں سے زیادہ خوب صورت محسوس ہوئی۔

"واہ بھائی ہکلے، تم نے یہ کام کیا ہے، تو تولے باون رتی!" جوشِ جذبات میں میرے منہ سے مولا داد کے لیے تعریفی کلمہ نکل گیا۔ پھر میں نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "چلو چلتی ہو مجرم کے دیدار کرنے؟"

"انسپکٹر مولا داد اسے لے کر ادھر ہی آئے گا۔ کیا ضرورت ہے چلنے کی!" لیوسی نے کہا۔

جس طرح میں نے مولا داد کی آواز سن لی تھی، غالباً تیواڑی جی وغیرہ بھی سن چکے تھے۔ اب سر تھامسن کی کوٹھی کا پھاٹک کھل گیا تھا اور تیواڑی جی لپکتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ ان کے پیچھے دلاور خان تھے۔ چند ہی لمحوں میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ سر تھامسن بھی کوٹھی سے نکل کر پھاٹک پر آ کھڑے ہوئے۔

پھر مولا داد، مجرم کے دونوں ہاتھ اٹھوائے ہوئے کسی ہیرو کی طرح سر تھامسن اور پھاٹک کے سامنے کھڑے ہوئے دوسرے افراد کی طرف بڑھا۔ مجرم کی کمر سے بہ یک وقت پانچ پولیس والوں نے اپنی اپنی بندوقوں کی نالیں لگا رکھی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ٹوکری ابھی تک اپنی جگہ رکھی تھی جسے وہ بدنصیب اٹھانے آیا تھا۔ مجرم کے پیچھے پیچھے اور بھی مسلح پولیس والے تھے۔ پھاٹک کے قریب اب ایک ہجوم سا نظر آنے لگا تھا۔

"کیوں جناب، کیا اب ہم لوگ بھی باہر جا سکتے ہیں؟ مجرم تو پکڑا ہی گیا ہے۔" قریب ہی اندھیرے سے ایک آواز ابھری۔

میں سمجھ گیا کہ یہ وہی پولیس افسر تھا جو میرے حکم کے انتظار میں سو کھ رہا تھا۔ میں نے جواب میں کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں!" پھر لیوسی سے مخاطب ہوا۔ "کیا خیال ہے لیوسی؟"

جواب میں خاموشی رہی تو میں نے پھر اپنا سوال دہرایا مگر اس بار بھی جواب نہ ملا۔ میں نے جو اندھیرے میں ادھر اُدھر ٹٹول کر دیکھا تو لیوسی غائب تھی۔ پتا نہیں وہ مجھے بتائے بغیر وہاں سے کب کھسک لی تھی۔ مجھے اس کی حرکت پر بڑا تاؤ آیا۔ پہلے تو خود

مجھے روک لیا اور اب اکیلی ہی ٹہل لی۔ میں نے اس کی تلاش میں پھاٹک کی طرف دیکھا مگر وہ نظر نہیں آئی۔ وہاں اب اتنی بھیڑ ہو چکی تھی کہ لیوسی کا فوراً ہی نظر آجانا محال تھا۔ اسی وقت میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرے سوا شاید کوئی بھی اس منظر کی طرف متوجہ نہیں تھا کیوں کہ سبھی "مجرم کار روئے زیبا" دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ اگر میں پھاٹک سے دور نہ ہوتا اور لیوسی کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں نہ دوڑا رہا ہوتا تو شاید وہ منظر نہ دیکھ پاتا۔

میں نے بڑے بڑے بالوں والے ایک بدیسی کتے کو اس ٹوکری کے پاس دیکھا جس میں فائل رکھی گئی تھی۔ کتے نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹوکری میں منہ ڈالا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔ کتے نے بالکل انسانوں کی طرح ارد گرد کا جائزہ سا لیا اور پھر ایک طرف چلنے لگا۔ میں نے سوچا کہ لو جس فائل کی حفاظت کرنے کے لیے اتنے ڈھیر سارے آدمی جمع ہوئے تھے، اُسے یہ نالائق بدیسی کتا نہ جانے کیا سمجھ کر لیے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تیزی سے اٹھا اور تیر کی طرح پھاٹک سے نکل کر کتے کی طرف دوڑا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ اب اس نے آہستہ آہستہ دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ فائل اب بھی اس کے منہ میں بہ دستور دبی ہوئی تھی۔

میں نے سوچا کہ کتے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے چیخ کر لوگوں کو اس کی ناشائستہ حرکت سے آگاہ کر دوں مگر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ آخر لوگ کیا سوچیں گے؟ آدمی تو آدمی، میں ایک کتے سے بھی نبرد آزما نہیں ہو سکتا اور لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا ہوں۔ نہیں! میں بہ ذاتِ خود یہ کارنامہ انجام دوں گا اور پھر لوگوں کو بتاؤں گا کہ اے بے خبرو! اگر اللہ دتا اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھتا تو ایک بدیسی کتا، فائل کو روٹی سمجھ کر کھا گیا ہوتا۔ میں نے سوچا اور بہ دستور کتے کا تعاقب کرتا رہا۔

مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میرا اور اس ناہنجار کتے کا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اب مجھے اس کا صرف ہیولا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ کم بخت نہ جانے کیوں اپنی رفتار بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا اور روشنی بس برائے نام ہی تھی۔ بجلی کے کھمبے کافی کافی فاصلے سے لگے ہوئے تھے اور وہ کتا سڑک پر دوڑنے کی بجائے اونچے نیچے ناہموار راستوں پر دوڑ رہا تھا۔ کتے کی دیکھا دیکھی اب میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ دیکھتا ہوں اسے غیر قوم کے بدذات کتے کہ تو کتنی تیز دوڑ سکتا ہے! میں نے سوچا اور پوری قوت سے دوڑنے لگا۔

کچھ دور مزید دوڑنے کے بعد کتے کا رخ سڑک کی طرف ہو گیا۔ اب میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ خاصا کم ہو گیا تھا۔ میرا سانس بُری طرح پھول گیا تھا مگر اب درمیانی فاصلہ کم ہو جانے کے سبب میری کچھ ہمت سی بندھ گئی تھی۔ بس اب میں نے پالا مارا ہی جب مارا۔

پھر پتا نہیں سڑک پر پہنچتے ہی اس ناہنجار کتے کو اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا یا اس میں کسی نادیدہ قوت نے چابی بھر دی کہ وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔ سڑک دور تک ویران پڑی تھی، صرف کچھ دور سڑک کے کنارے ایک وین کھڑی تھی جس کی روشنیاں گل تھیں۔ پتا نہیں کون آبادی سے دور اُسے وہاں کھڑی کر گیا تھا۔

کتے کو سرپٹ دوڑتے ہوئے دیکھ کر میں بھی طیش میں آ گیا تھا۔ کم بخت جانور ہو کر انسان کے قبضہ آ رہا تھا۔ ارے انسان تو جنات تک کو قابو میں کر لیتے ہیں، جانور کی تو حقیقت ہی کیا ہے! میں نے یہ سوچ کر اپنی ہمت بندھائی اور پھر پہلے سے بھی زیادہ تیز بھاگنے لگا۔ کچھ دور اسی رفتار سے مزید دوڑنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے مگر اس کے باوجود میں دوڑتا ہی رہا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو انسانیت پر حرف آ جاتا۔ لو بھلا بتاؤ! ایک انسان، اور جانور سے ہار گیا!

سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اس وین کا پچھلا دروازہ شاید پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا جس پر میں غور نہ کر سکا تھا۔ کتے کے اور میرے درمیان اب صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہ کم بخت غالباً مجھ سے بچنے کی خاطر زقند بھر کر اس وین میں داخل ہو گیا۔

ہے نا آخر جانور! کھا گیا انسان سے مات! میں نے سوچا۔ آخر پھنس ہی گیا خود جال میں! بیٹا رام کو یہ پتا ہی نہیں کہ وین میں اسے بہت آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے۔ چلے تھے حضرتِ انساں کا مقابلہ کرنے! یہی سوچتا ہوا میں بھی وین کے کھلے دروازے سے اندر "تڑاپ" ہو گیا۔

پھر اِدھر میں "غڑاپ" ہوا اور اُدھر "شڑاپ" کی سی آواز ہوئی۔ اسی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے تارے جھلمل جھلمل کرنے لگے۔ کسی نے میری کھوپڑی کو طبلہ سمجھ کر بڑے زور سے بجا دیا تھا۔ مجھے اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ میں اس بے وقوف شخص کو یہ بتا سکتا "اے احمق الذّی! یہ میری کھوپڑی ہے، طبلہ نہیں۔" مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کسی تاریک کنویں کی گہرائی میں گرتا جا رہا ہوں اور پھر میرے حواس جواب دے گئے تھے۔

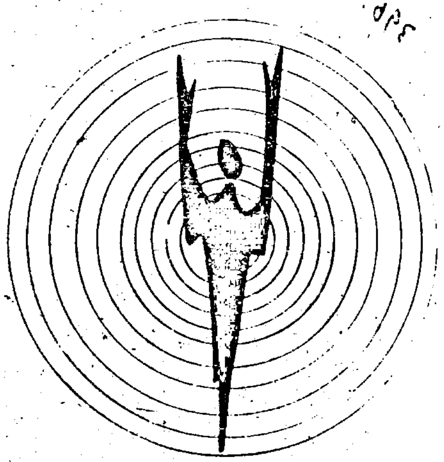
پتا نہیں میں کتنی دیر "اِنّا غفیل" رہا لیکن جب خود کفیل ہوا، یعنی اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل ہوا تو میری سماعت سے کسی عورت کی سسکیاں ٹکرائیں۔ کچھ دیر میں سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ ماجرا کیا ہے اور میں کہاں ہوں۔ جب میرا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے میرا ہاتھ اپنے سر پر گیا جہاں اب تک ٹیسیں مار رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے اپنے بالوں کو ٹٹولا تو تھوڑی سی چپچپاہٹ محسوس ہوئی اور جلن بھی ہوئی۔ میں نے

جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگا۔ میری انگلیوں پر تازہ خون کے دھبے تھے۔

"خون... خون!" میں چیخ پڑا۔

"ہوش میں آؤ ایلا ڈیٹا!" سسکیوں کے درمیان کہا گیا۔

میں ہوش میں تو خیر کیا آتا، وہاں موجود مسٹر تھامسن کی جورو، کیٹی کو دیکھ کر میرے مزید ہوش اُڑ گئے۔



"تمہیں... تمہیں تو اغوا کیا جا چکا ہے... کی... کی... کیٹی!" میں رو دینے والے لہجے میں بولا اور یہ بھول ہی گیا کہ کیٹی خانم اردو ذرا کم سمجھتی ہیں۔ جب مجھے اپنی بات کا جواب نہیں ملا اور کیٹی کے چہرے سے پتا چلا کہ وہ میری بات نہیں سمجھ سکی تو میں نے اپنی بات انگریزی میں دُہرائی۔

اس نے سسکتے ہوئے سر ہلایا اور بہتی ہوئی ناک اپنی آستین سے پونچھ لی۔ یہ منظر خاصا کریہہ تھا اس لیے میں نے ادھر سے نگاہ پھیر لی۔ روتے وقت ناک بہنے لگتی ہے، اس کا تجربہ خود مجھے بھی تھا لیکن اپنی ناک اپنی ہوتی ہے اور دوسرے کی دوسری! دوسرے کی بہتی ہوئی ناک دیکھ کر گھن آتی ہی ہے۔ اسی دوران میں میری نظر اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پر بھی پڑی تھی جس پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

کیٹی کی طرف سے نگاہ پھیر کر میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں ہمیں یعنی مجھے اور کیٹی کو قید کیا گیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ اس کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ کمرے میں مدھم روشنی کا ایک بلب روشن تھا۔ وہاں صرف ایک میلا سا بستر فرش پر دیوار سے لگا بچھا ہوا تھا جس پر غالباً کیٹی سوتی ہو گی۔

اپنے ساتھ کیٹی کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے بھی مجرموں نے اغوا کر لیا ہے۔ سیدھی سی بات تھی کہ وہ اغوا تھی تو مجھے بھی اغوا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ الگ بات کہ مجھے اپنے اغوا پر حیرت ضرور تھی اور حیرت کے ساتھ اب غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس کم بخت بدیسی کتے نے مجھے بے وقوف بنا دیا تھا۔ ایک طرح سے گویا اسی بدقوے نے مجھے اغوا کیا تھا۔ اب میں اس ناہنجار کتے کی پوری سازش اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس نے دانستہ مجھے اپنے پیچھے لگایا تھا تاکہ اپنے ہوتے سوتوں کے پاس تک لے جا سکے جو وین میں بیٹھے میرا ہی انتظار کر رہے ہوں گے۔

"وہ حرامی کہاں چلا گیا؟" غصے کے باوجود مجھے اتنا ہوش ضرور تھا کہ انگریزی میں بولوں۔

"کون؟" کیٹی سُبکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "تم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

"اور کون، وہی ظالم غیر ملکی کتا!" میں نے ایک ہاتھ پر دوسرے ہاتھ سے گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

جب کیٹی کے استفسار پر میں نے "سگ بیتی" سنائی تو اس کے پتلے پتلے سفاک سے ہونٹوں پر بھی چند لمحے کو مسکراہٹ آ گئی۔

"تو تمہیں اس کتے نے بے وقوف بنا دیا!" اس نے گویا خیال آرائی کی۔

ہر چند کہ اس نے اظہارِ حقیقت کیا تھا مگر میں بے وقوف کہلائے جانے پر راضی نہ ہوا۔ میں منہ بنا کر بولا "میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ اگر میں اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک نہ پہنچتا تو پھر تمہیں اس قید سے کس طرح رہائی ملتی!"

"تو تمہیں یقین ہے ایلا ڈیٹا کہ یہاں سے ہم دونوں بچ کر نکل جائیں گے؟" اس کے لہجے میں امید کی ہلکی سی جھلک تھی جس کے سبب پھیکے شلجم سے چہرے پر ہلکی سی سرخی آ گئی تھی۔

"پہلی بات تو یہ سن لو کہ میں ایلا ڈیٹا نہیں، اے ڈی مہر بن چکا ہوں۔" میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔ "تمہارے شوہر نامدار بھی اب مجھے اے ڈی کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مایوسی ہمارے مذہب میں کفر ہے، تمہارے مذہب میں کیا ہے، مجھے نہیں معلوم! ذرا سوچو کہ میرے سوا تم تک کوئی نہیں پہنچ سکا، کیا اس سے تم اندازہ نہیں لگا سکتی ہو کہ میں کتنا بہادر ہوں اور تمہیں واقعی یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا؟"

"مگر یہاں تک پہنچنے میں تمہارے ارادے کو تو دخل نہیں، تم تو بس اتفاقاً یہاں تک پہنچ گئے ہو۔" کیٹی بولی۔ اب اس نے اپنی سسکیوں اور سُبکیوں پر قابو پا لیا تھا اور ناک بھی نہیں بہہ رہی تھی۔

"صرف ارادے سے کچھ نہیں ہوتا، آدمی کے سینے میں شیر کا دل

بھی ہونا چاہیے۔" میں سینہ پھلا کر بولا۔ اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ یہ سارا چکر اسی بدبخت اور آوارہ مزاج کیٹی کا چلایا ہوا ہے۔ نہ یہ رنجیت کے عشق میں مبتلا ہو کر اغوا ہوتی، نہ میری جان کو مصیبت پڑتی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔ "ویسے کیٹی، تم ہو اسی قابل کہ تمھیں انھی لوگوں کے پاس رہنے دیا جائے۔ میں رہا ہو کر چلا جاؤں اور تمھیں یہیں چھوڑ جاؤں تاکہ تمھیں آٹے دال کا بھاؤ پتا لگ جائے۔"

میں نے جو کچھ کہا تھا، کیٹی کے لیے یقیناً خلافِ توقع تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے، پھر خفگی کا اظہار ہونے لگا۔

"اس بات سے کیا مقصد ہے تمھارا؟" وہ کسی قدر برہم لہجے میں بولی۔

"مقصد کیا ہوتا!" میں جھلّا کر بولا۔ "تمھیں کیا پڑی تھی جو اس سے ملنے قطب مینار جا پہنچیں؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں کسی کو اپنے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔"

"ارے کون مانگ رہا ہے اجازت! خود بھگتو گی جب وہ تمھاری ٹانگ کاٹ کر سر تھامسن کو بھیجیں گے۔" میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

ٹانگ کاٹنے کے ذکر پر وہ یقیناً اندر سے دہل کر رہ گئی تھی جس کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

"نن... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ پریشان سے لہجے میں بولی۔ "سر تھامسن اس کی نوبت نہیں آنے دیں گے۔"

سر تھامسن کیوں کہ کیٹی سے عمر میں بہت بڑے تھے، غالباً اسی لیے کیٹی ان کے لیے واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کر رہی تھی ورنہ وہ "دیں گے" کی بجائے "دے گا" کہتی۔

"اس بھروسے میں بھی نہ رہنا۔" میں نے گویا اپنی دانست میں ایک اہم راز کا انکشاف کیا۔ "تم چاہے ساری کی ساری ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاؤ، ان کے کان پر جوں نہیں رینگے گی!"

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ سر تھامسن وہ فائل دے کیوں نہیں دیتے جو ان لوگوں کو چاہیے۔" کیٹی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

"یہ تو وہی جانیں۔ ویسے میں نے بھی انھیں یہی مشورہ دیا تھا۔ پتا نہیں اس بار بھی انھوں نے میرے مشورے پر عمل کیا ہے یا نہیں۔" میں بولا۔ "اگر اس مرتبہ بھی انھوں نے ان لوگوں کا مطالبہ پورا نہیں کیا ہوگا تو بس اللہ ہی بیلی ہے۔ میرا تو خیر کچھ نہیں جائے گا، تمھاری کم بختی آجائے گی۔ وہ تمھارا دوسرا ہاتھ بھی کاٹ کر سر تھامسن کو پارسل کر دیں گے۔"

کیٹی کا چہرہ خوف کے سبب سفید پڑ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خوف کے غلبے نے اس کی قوتِ گویائی سلب کر لی تھی۔ اسی خوف کا سبب تھا کہ وہ مجھ سے تقریباً لگ کر کھڑی ہو گئی تھی جیسے میری پناہ میں آنا چاہتی ہو۔

"تمھیں معلوم ہے کیٹی، یہ کون سی جگہ ہے؟ ہم کہاں قید ہیں؟" کچھ دیر بعد میں نے اس سے کہا۔

اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر میرا بازو تھاما اور بستر کی طرف کھینچا۔ غالباً وہ بیٹھ کر اطمینان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ بستر کی طرف بڑھ گیا۔

بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا سوال دُہرایا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ارے جب وہ تمھیں پہلی بار یہاں لایا ہوگا تو تم نے راستہ دیکھا ہی ہوگا۔" میں بولا۔

"میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی۔ مجھے اسی کمرے میں ہوش آیا تھا۔" کیٹی نے بتایا۔

"اور بے ہوش کب ہوئی تھیں؟ تم اس وقت تو اچھی خاصی ہوش میں نظر آ رہی تھیں جب وہ تمھیں لے کر قطب مینار سے اتر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہاں سے وہ مجھے اپنی کار تک لے گیا تھا اور کہا تھا کہ میرے بنگلے کی طرف چل رہا ہے تاکہ مجھے وہاں چھوڑ دے لیکن میں راستے ہی میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔"

"اور یہ وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر مجھ سے اس میں لگا ہوا سینٹ سونگھنے کے لیے کہا تھا، پھر اس کے کچھ دیر بعد ہی میرے ذہن پر غنودگی سی چھانے لگی تھی۔"

"وہ تو واقعی کمال سینٹ تھا۔" میں نے خیال آرائی کی اور اسی کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ جب یہی معلوم نہیں کہ وہ جگہ کون سی ہے تو پھر یہاں سے فرار کی کیا صورت ہوگی۔ بے اختیار میرے مُنہ سے ٹھنڈا سانس نکلا اور میں نے کہا۔ "مارے گئے؟"

"کون؟" وہ کچھ نہ سمجھ کر بولی۔

"اور کون، میں اور تم!" میں بولا، پھر اس سے پوچھا۔ "کھانے پینے وغیرہ کا یہاں کیا سسٹم ہے؟"

"دن میں دو بار کھانا ملتا ہے۔ ایک دیسی آدمی کھانا لے کر آتا ہے۔" پھر کیٹی نے "وغیرہ" کی وضاحت کر دی۔ "اس کمرے کے باہر ایک راہ داری ہے جس کے اختتام پر لیٹرین اور باتھ روم ہے۔ جب وہ آدمی کھانا لے کر آتا ہے تو کھانے سے پہلے اپنے ساتھ وہاں بھی لے جاتا ہے۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ اگر اس بدبخت کے آنے سے

پہلے پیشاب ویشاب آجائے تو؟" میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"ابتدا میں مجھے بھی پریشانی ہوئی تھی مگر اب کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔"

"یعنی اسی وقت پیشاب آتا ہے جب وہ آتا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہ تم کیا فضول باتیں کرنے لگے!" وہ کچھ جھنجلا کر ذرا جھینپ کر بولی۔

"لو اور سنو، یہ فضول باتیں ہیں! ارے یہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ابھی میرا جوش ٹھنڈا نہیں پڑا تھا اور میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں پر مزید تقریر کے موڈ میں تھا کہ دور کہیں سے بھاری قدموں کی چاپ ابھری اور میرے کان کھڑے ہو گئے اس لیے کہ ایسے موقعوں پر بزرگوں نے صرف کانوں ہی کو کھڑے ہونے کی اجازت دی ہے۔

"تم نے کچھ سنا کیٹی؟" میں نے کیٹی کو مخاطب کیا۔ "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی ادھر ہی آ رہا ہو بلکہ یہ تو کئی افراد کے قدموں کی چاپ معلوم ہوتی ہے۔"

کیٹی نے سر ہلا کر میرے خیال کی تائید کی۔ اس کے چہرے سے بھی فکرمندی کا اظہار ہونے لگا تھا، میں تو خیر فکرمند ہو ہی گیا تھا۔ یقیناً کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی ہونے والی تھی۔

ہر چند کہ میں فکرمند تھا مگر کیٹی کو دلاسا دینے کے لیے بولا۔ "تم فکر نہ کرو، میری شیروانی کی جیب میں ریوالور موجود ہے۔" یہ کہہ کر میں نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور برا سا مُنہ بنا کر رہ گیا کیوں کہ ریوالور غائب تھا۔ یہ الگ بات کہ ریوالور ہوتا بھی تو شاید میں کچھ نہ کر پاتا۔

کیٹی نے بھی شاید میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ مجھے ریوالور کی تلاش میں مایوسی ہوئی ہے۔

"خیر ریوالور نہ سہی تو کیا ہوا، میرے ہاتھ پیر تو سلامت ہیں، تم کیوں اداس ہوتی ہو!" میں نے شرمندگی مٹانے کی خاطر کہا۔

قدموں کی چاپ اب بہت قریب آگئی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد ہی قفل میں چابی گھومنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی، اس کے چند لمحے بعد ہی دروازہ کھُل گیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے دو افراد تھے۔ وہ دونوں ہی میرے لیے اجنبی تھے۔ ان میں سے ایک کا حُلیہ میرے لیے کچھ عجیب سا تھا۔ اس کی چندیا گھٹی ہوئی تھی جس پر پیچھے کی سمت موٹی سی چوٹی نظر آ رہی تھی اور چہرے پر مونچھیں تھیں۔ وہ دھوتی باندھے ہوئے تھا اور پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں تھیں۔ اس کے جسم کا اوپری حصّہ بے لباس تھا جس کے سبب سینے پر موجود گھنے سنہری بال نظر آ رہے تھے۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، چہرے اور جسم سے وہ زیادہ عمر کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا حُلیہ اعلیٰ ذات کے برہمنوں جیسا تھا۔ اگر اس کی چندیا سپاٹ نہ ہوتی اور جسم پر سلیقے کا لباس ہوتا تو وہ وجیہہ اور خوب صورت کہا جا سکتا تھا۔ دوسرا شخص بھی اسی کا ہم عمر کہا جا سکتا تھا مگر وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ جیب کے اُبھار سے صاف پتا چل رہا تھا کہ اس میں کوئی خطرناک کھلونا ہے۔

"تو یہ ہے وہ جس کا تم نے تذکرہ کیا تھا!" دھوتی بند نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کا لہجہ کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا تھا مگر اس وقت میں اس کی وجہ نہ جان سکا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہ دقّت اور سنبھل سنبھل کر بول رہا ہو۔

"ہاں یہی ہے وہ!" دھوتی بند کے ساتھی نے جواب دیا۔ اس کی آواز سنتے ہی میں اُچھل پڑا۔ اس منحوس آواز کو میں سینکڑوں آوازوں میں الگ پہچان سکتا تھا۔

وہ منحوس آواز رنجیت کی تھی۔ وہ یقیناً بہترین میک اَپ میں تھا اور یہ میک اَپ ظاہر ہے کہ میرے لیے نہیں کیا گیا تھا ورنہ وہ آواز بدل کر بولتا۔ پولیس اور خفیہ والے رنجیت کی تلاش میں تھے اس لیے وہ میک اَپ ہی میں رہتا ہوگا۔ میں نے سوچا۔

"ویسے مجھے تمھارا یہ خیال قطعی غلط معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوجوان انتہائی چالاک اور عیّار ہے۔ جو شخص چہرہ شناسی کا ذرا سا بھی علم رکھتا ہے، وہ اسے دیکھ کر واضح الفاظ میں کہہ سکتا ہے کہ یہ نوجوان انتہائی بزدل اور احمق ہے۔" دھوتی بند میرے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے اپنے ساتھی یعنی رنجیت سے بولا۔

"یہ زبردست اداکار ہے جناب!" رنجیت نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں پھر کہوں گا کہ اسے زندہ چھوڑنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے بے ہوش کر کے دہیں پھینک آتا اور یہاں کبھی نہ لاتا۔ میں اس کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا ہی چکا ہوں۔" رنجیت کے لہجے اور اس کے اندازِ تخاطب سے پتا چل رہا تھا کہ وہ دھوتی بند اس کے لیے قابلِ احترام ہے۔

"تمھاری باتوں پر یقین نہیں آتا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ مادام بھی میرے خیال سے متفق ہیں۔ تمھیں علم ہی ہے کہ اس نوجوان سے ایک بار ان کا سابقہ بھی پڑ چکا ہے۔ انھوں نے بڑی آسانی سے اسے بے وقوف بنا دیا تھا۔" دھوتی بند نے کہا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ شخص کس مادام کا ذکر کر رہا ہے اور یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ مجھے تو کوئی ایسی مادام یاد نہیں تھی جس نے مجھے بے وقوف بنایا ہو۔ اپنے لیے اس دھوتی بند سے بار بار بے وقوف،

بزدل اور احمق جیسے الفاظ سن کر بھی مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔ وہ یہ سب کچھ بڑے اطمینان سے میرے ہی مُنہ پر کہہ رہا تھا۔ اگر میں قید کی حالت میں نہ ہوتا تو اسے بتاتا۔

"خیر اس نوجوان کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔" دھوتی بند چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "فی الحال اس کے بارے میں سوچنا ہے۔" وہ کیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تھامسن نے ہمارا مطالبہ پورا کر دیا ہے، اب ہم پر بھی یہ لازم ہے کہ اپنے وعدے کا پاس کریں۔ یوں بھی اسے قتل کر کے ہمیں کیا ملے گا!"

"آپ کا اور مادام کا جو حکم ہو۔" رنجیت نے کہا۔ "آپ کہیں تو میں آج ہی رات اسے پہنچا دوں۔"

"ہاں، اب خواہ مخواہ یہ جھنجھٹ پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔" دھوتی بند بولا۔ "اور میرا تو خیال ہے، اس نوجوان کو بھی یہاں سے چلتا کرو۔ یہاں اس کا رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ تمھارے علم میں ہے کہ اس مہمان خانے میں کل چند مہمان اور آنے والے ہیں۔" دھوتی بند نے "مہمان خانے" پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا۔

"تو پھر اسے آج ہی رات کیوں نہ ختم کر دیا جائے؟" رنجیت کی آواز مجھے موت کی آواز محسوس ہوئی۔

"مگر اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا بھی مسئلہ درپیش ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اسے قتل کر کے یہیں دفن کر دو۔" دھوتی بند نے کہا۔

"اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اسے یہاں سے باہر لے جا کر قتل۔۔۔"

"ن۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں!" مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں چیخ پڑا اور رنجیت کی بات اُدھوری ہی رہ گئی۔ پھر مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ فر فر بولنے لگا۔ "مجھے قتل کر کے تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ اگر تم مجھے بزدل، احمق اور بے وقوف کہو گے تو یقین کرو، میں بالکل بُرا نہیں مانوں گا بلکہ قسم لے لو، میں قطعی چالاک اور عیار وغیرہ نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک کتا مجھے بے وقوف نہ بنا سکتا۔"

"بکواس بند کرو ورنہ میں ابھی تمھیں گولی مار دوں گا!" یہ کہتے ہوئے رنجیت نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔

"تم۔۔۔ تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ میں اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں، ہاں!" یہ کہہ کر میں نے دھوتی بند کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ "بڑے بھائی ابھی کہہ چکے ہیں کہ وہ یہاں میرے قتل اور میری تدفین پر آمادہ نہیں ہیں۔"

دھوتی بند میری بات سن کر ہنس پڑا حالانکہ میں نے اپنی دانست میں کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ اس کے دانت نکل پڑتے۔

"ریوالور، جیب میں رکھ لو۔" دھوتی بند نے رنجیت سے کہا۔

"اللہ تعالیٰ جناب کو چاند سی بیوی دے۔" میں نے دھوتی بند کو دُعا دی۔ "اور اس چاند سی بیوی سے ستاروں کی طرح ٹم ٹم کرتے ہوئے جناب کے ڈھیر سارے بچے پیدا ہوں جن سے جناب کا نام نامی روشن ہو۔"

دھوتی بند اور بھی زور سے ہنس پڑا، پھر بولا۔ "مجھے ایسی دعا آج تک کسی نے نہیں دی۔" یہ کہہ کر اس نے رنجیت کو حکم دیا کہ وہ کیٹی کو بیرونی کمرے میں بند کر آئے۔ رنجیت، کیٹی کو لے کر چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمھیں ایک شرط پر زندہ چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"ایک تو کیا جناب، آپ ایک درجن شرطیں لگا دیں تو میں زندہ رہنے پر تیار ہوں۔" میں جلدی سے بولا۔ اس وقت میں نے اس بات پر بھی غور کرنا ضروری نہ سمجھا کہ دھوتی بند نے کیٹی کو وہاں سے کیوں ہٹا دیا تھا۔

"ایک درجن نہیں، صرف ایک!" دھوتی بند نے کسی قدر سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تمھیں ہمارا مخبر بننا پڑے گا۔" اسی وقت رنجیت کمرے میں آگیا۔

"مخبر، یعنی خبریں لانے لے جانے کا کام! بالکل ٹھیک ہے۔ میں قطعی تیار ہوں۔ میں کل ہی خفیہ کی نوکری چھوڑ کر آپ کی نوکری میں آ جاؤں گا۔" میں نے تیزی سے کہا اور اسی کے ساتھ مجھے تنخواہ کا خیال آیا۔ آخر گھر والوں کو کیا دوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں بغیر رُکے آہستہ سے بولا۔ "ویسے جناب، تنخواہ کیا ملے گی؟"

دھوتی بند کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "یا تو تم واقعی بہت بڑے احمق ہو یا بہت بڑے اداکار!"

"آپ کا دوسرا خیال قطعی درست ہے جناب!" رنجیت درمیان میں بول پڑا۔ "میں نے آپ سے اس کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔ یہ بہت بڑا بہروپیا ہے۔"

"ہرگز نہیں!" میں پُرزور لہجے میں بولا۔ "میں صدق دل سے نئی نوکری قبول کرنے پر تیار ہوں جناب! آپ رنجیت کی باتوں میں نہ آئیں۔ انھیں تو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ ہر شخص نوکری کرنے سے پہلے تنخواہ کے بارے میں ضرور پوچھتا ہے، اگر میں نے پوچھ لیا تو کون سا ظلم کیا جناب!"

"ہوں!" دھوتی بند نے طویل سانس لیا۔ "میں سمجھا، تم غالباً اپنی خدمات کا معاوضہ چاہتے ہو!"

"چلیں یوں سمجھ لیں، بات ایک ہی ہے چاہے ناک کو یوں اِدھر سے پکڑ لیں یا ہاتھ گھما کر!" یہ کہہ کر میں نے وضاحت کی خاطر دونوں طرح ناک پکڑ کر دکھائی۔

"بہت خوب!" دھوتی بند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمھارے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے میں نے

غلطی کی تھی۔ تم بے وقوف نہیں ہو سکتے اور نہ ہی بزدل ہو۔ وہ شخص بھلا کس طرح بزدل اور احمق ہو سکتا ہے جو ایسے خطرناک حالات سے دوچار ہونے کے باوجود بے خوفی سے سودے بازی کر سکے۔ ویسے مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم جیسی صلاحیتیں رکھنے والا ہمارے لیے کام کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ تمھاری خدمات کا کیا معاوضہ ہونا چاہیے؟"

میں نے جواب میں اسے خفیہ سے ملنے والی تنخواہ بتا دی۔ نئی نوکری میں کم از کم اتنی تنخواہ تو ملنا ہی چاہیے جو پہلے مل رہی تھی۔

"ہرچند کہ یہ رقم خاصی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم جیسے شخص کی وفاداریاں خریدنے کے لیے کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں۔ مجھے منظور ہے۔" دھوتی بند نے کہا، پھر چند لمحے بعد بولا۔ "ہاں یہ سمجھ لو کہ اگر تم نے ضرورت سے زیادہ چالاک بننا چاہا اور ڈبل کراس کیا تو ہم کسی بھی صورت تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہرگز نہیں، بالکل نہیں!" میں جلدی سے گھبرا کر بولا حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ ڈبل کراس سے اس کا مطلب کیا ہے۔

"پھر ٹھیک ہے، سودا طے سمجھو!" دھوتی بند فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "رنجیت تم سے رابطہ قائم رکھے گا۔"

"کیا ان کے سوا کوئی اور مجھ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا جناب؟" میں ڈرتے ڈرتے بولا۔

"کیوں؟" دھوتی بند نے پوچھا۔

"اس لیے۔۔۔ اس لیے جناب۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔" میں نے ہمت کر کے دل کی بات کہہ دی۔

"تمھاری اداکاری یقیناً قابلِ تعریف ہے لیکن اب مزید اس کے مظاہرے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھاری طرف سے مطمئن ہوں۔" دھوتی بند نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

پہلے رنجیت مجھ پر اداکاری کا الزام لگا رہا تھا اور اب وہ دھوتی بند بھی یہی رٹ لگائے جا رہا تھا جس سے مجھے چڑ سی ہو رہی تھی مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں اس پر احتجاج کرتا اس لیے مردہ سے لہجے میں بولا۔ "تو پھر ٹھیک ہے جناب! جیسی آپ کی مرضی! پھر بتائیں، میں کب سے آجاؤں؟"

"کہاں آجاؤں؟" دھوتی بند حیرت سے بولا۔

"نوکری پر جناب!" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"تم باز نہیں آؤ گے!" دھوتی بند اس بار سخت لہجے میں بولا۔ "میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اب مزید اداکاری کی ضرورت نہیں، تم سمجھتے کیوں نہیں!"

"سمجھ گیا، سمجھ گیا جناب! اب۔۔۔ اب غلطی نہیں ہوگی۔" میں نے سہم کر کہا۔

پتا نہیں میرے لہجے میں کیا بات تھی کہ دھوتی بند مسکرانے لگا۔ چند لمحے بعد وہ رنجیت سے مخاطب ہوا۔ "تم اُسے لے جاؤ! ذرا احتیاط سے جانا، ممکن ہے تھامسن نے کوئی جال پھیلا رکھا ہو۔ اسے بھی توقع ضرور ہوگی کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں پوری طرح محتاط رہوں گا، آپ مطمئن رہیں۔" رنجیت بولا، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ؟"

"میں چاہتا ہوں کہ مادام بھی اس سے مل لیں۔" دھوتی بند نے جواب دیا۔ "تم کیٹی کو چھوڑ کر آؤ، اس وقت تک مادام اس سے مل چکی ہوں گی، پھر اسے چھوڑ آنا۔"

"بہتر ہے جناب!" یہ کہہ کر رنجیت دروازے کی طرف بڑھا۔

"مادام کو اطلاع دیتے جانا کہ میں یہاں ان کا منتظر ہوں۔" دھوتی بند نے رنجیت سے کہا اور وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ دھوتی بند اپنی مادام کے پاس مجھے لے جائے گا مگر اس نے مادام کو وہیں بُلوا لیا۔ غالباً وہ مجھے مادام کی خوابگاہ کا دیدار کرانا نہیں چاہتا تھا۔ خیر مادام کی خوابگاہ کا نہ سہی، خود ان کا دیدار تو ہونے ہی والا تھا۔ چلو، انھیں بھی دیکھ لیتے ہیں، کیا شے ہیں، میں نے سوچا۔ مجھے دھوتی بند کے وہ الفاظ یاد تھے کہ مادام ایک بار مجھے بے وقوف بنا چکی ہیں اسی لیے مجھے انھیں دیکھنے کا اور بھی اشتیاق تھا۔

میں اپنی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ دھوتی بند کی آواز سن کر چونک پڑا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تمھیں بہت ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا انسپکٹر۔۔۔ کیا نام ہے تمھارا؟ میں بھول ہی گیا۔ رنجیت نے کچھ بتایا تو۔۔۔"

"اے ڈی مہر۔" میں جھٹ بول اٹھا۔

"مگر وہ شاید کچھ اور بتا رہا تھا، غالباً اللہ۔۔۔ اللہ دین۔۔۔ نہیں اللہ مہر۔۔۔ یہ بھی۔۔۔"

"انھوں نے اللہ دتا بتایا ہوگا جناب!" میں نے پھر لقمہ دیا۔

"ہاں ہاں، یہی!" دھوتی بند بولا۔

"میں نے اسی سے 'اے ڈی' بنایا ہے۔ مہر دین میرے ابا کا نام ہے مگر میں نے ان کا صرف 'مہر' لیا ہے کیوں کہ مجھے شاعری کا بھی شوق ہے۔ ابا کا نام، میں تخلص کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں بلکہ کر سکتا کیا، کر رہا ہوں۔ کل ہی میری صدارت میں کل دہلی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ مصرع طرح بہت مشکل تھا مگر میں نے بہت عمدہ شعر کہے ہیں۔ آپ بھی چاہیں تو مشاعرہ سننے آ سکتے ہیں۔ میں پیارے لال ہنر سے کہہ کر آپ کے لیے ایک خصوصی دعوت نامہ لے لوں گا اور اگر آپ

کہیں تو آپ کو اس مشاعرے کا مہمانِ خصوصی بنوا دوں۔ پیارے لال ہنر ہرگز میری بات نہیں ٹالے گا اس لیے کہ میں اس کا افسر ہوں لیکن ایک بات تو میں بھول ہی گیا' مہمانِ خصوصی کو بھی غزل پڑھنا ہوتی ہے یا نہیں! خیر آپ فکر نہ کریں' میں پیارے لال ہنر سے پوچھ کر کل بتا دوں گا۔ اس وقت اتفاق سے میرے پاس دعوت نامہ نہیں ورنہ آپ کو ابھی مصرعِ طرح بتا دیتا تاکہ آپ کل تک کچھ شعر بنا لیتے۔ دراصل یہ کپڑے سرکاری ہیں' دعوت نامہ میرے کپڑوں . . .''

''بس' بس!'' دھوتی بند تقریباً چیخ پڑا۔''یہ تم نے کیا بکواس شروع کر دی!'' اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔''میں نے تم سے نام پوچھا تھا اور تم پتا نہیں کیا فضول باتیں کرنے لگے۔''

''معلوم ہوتا ہے آپ کو شاعری سے زیادہ دلچسپی نہیں۔'' میں نے اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے' بات رفع دفع کرنے کی خاطر کہا۔

''زیادہ کیا' بالکل نہیں!'' دھوتی بند سخت لہجے میں بولا' پھر کچھ دیر بعد کہا۔''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمھیں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ تھامسن بہت چالاک آدمی ہے' اسے تم پر ذرا بھی شبہہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا جناب!'' میں حیران ہو کر بولا۔

''اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے!'' وہ مجھے گھورنے لگا۔

''آپ ٹھیک . . . ٹھیک کہتے ہیں جناب! اس میں واقعی کوئی نہ سمجھنے والی بات نہیں۔'' میں نے جلدی سے گڑبڑا کر کہا۔

اسی وقت ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا ہو۔ دھوتی بند بھی میرے ساتھ ہی اس طرف متوجہ ہو گیا اور یوں وقتی طور پر اس کے سوال جواب سے میری جان بچ گئی۔

''آنے والی مادام ہی ہوں گی۔'' دھوتی بند خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

میں نے اس موقع پر خاموش رہنا غنیمت جانا اور قدموں کی قریب آتی ہوئی چاپ سنتا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی ایک نوعمر حسینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بزملا سے بھی زیادہ حسین تھی اس لیے میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ آسمانی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی اور ماتھے پر سُرخ بندیا تھی' رنگ ایسا تھا جیسے شہد اور دودھ ملا دیا گیا ہو۔ میں سوچنے لگا' ہائے اللہ میاں نے ایسی ایسی پیاری صورتیں کہاں چھپا کر رکھ چھوڑی ہیں! عام طور پر تو ایسی حسینائیں نظر نہیں آتیں۔ میں نے اسے دیکھ کر یہی سوچا کہ وہ مادام نہیں بلکہ اس کی نوخیز و نوعمر بیٹی ہو گی جو بتانے آئی ہو گی' اس کی امی' یعنی مادام رفعِ حاجت کے لیے بیت الخلا گئی ہیں اور کچھ دیر بعد آئیں گی۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیوں یہ بات تھی کہ مادام کی عمر کم از کم چالیس پچاس تو ہو گی ہی۔

''کیا کوئی خاص بات ہے جو تم نے مجھے بلایا ہے؟'' حسینہ کے پھولوں کی پنکھڑی جیسے لب ہلے اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس جملے کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہی حسینہ' بہ نفسِ نفیس مادام تھی۔

میرے خیال کی مزید تصدیق اس وقت ہو گئی جب دھوتی بند نے اس کے سوال کا جواب دیا۔''جی ہاں مادام! میں چاہتا تھا کہ آپ بھی اس سے مل لیں۔ رنجیت کا اس کے بارے میں خیال تھا کہ اسے قتل کر دینا چاہیے مگر میرے ذہن میں ایک اور بات آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر اسے اپنا مخبر بنا لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔''

''اور اگر اس نے ڈبل کراس کیا تو؟'' حسینہ عرف مادام کی شیریں آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

''تو اسے قتل کر دیا جائے گا مادام!'' دھوتی بند نے اس طرح کہا جیسے وہ میرے قتل کی نہیں' کسی مرغی کو ذبح کرنے کی بات کر رہا ہو۔ اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔

''تم اس کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو؟'' مادام نے سوال کیا۔

''جی ہاں مادام! یہ بہ ظاہر ... نظر آتا ہے' ویسا ہے نہیں۔'' دھوتی بند نے یقین دلایا۔

''ویسے میرا خیال تم سے مختلف تھا' بہرحال تم جانو۔'' مادام نے کہا۔

''جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا مادام' تو میں بھی یہی سمجھا تھا لیکن اس سے گفتگو کرنے کے بعد میرا خیال بدل گیا۔ بہرحال یہ ذہین ہو یا بے وقوف' ہمارے کام آ سکتا ہے۔'' دھوتی بند بولا۔''اسے قتل کرنے سے ہمیں کیا فائدہ! لیکن اس کے باوجود آخری فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر دھوتی بند نے میری ماہانہ تنخواہ بتائی۔

''ٹھیک ہے' اسے یہ رقم دے دی جائے۔'' مادام نے گویا فیصلہ سنا دیا' گویا میری نئی نوکری پکی ہو گئی اور جان مفت میں بچ گئی۔

میرے ذہن میں' دھوتی بند کی کہی ہوئی یہ بات رہ رہ کر کھٹک رہی تھی کہ وہ حسینہ مجھے ایک بار بے وقوف بنا چکی ہے لیکن کافی سوچنے کے باوجود مجھے اب تک یاد نہ آ سکا تھا' وہ مجھ سے کب اور کہاں ملی تھی۔ جب میرے صبر کا پیمانہ ''فلا فل'' ہو گیا تو میں مادام سے پوچھ ہی بیٹھا۔ میں نے کہا۔''مادام! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس سے پہلے بھی مجھ سے ایک بار مل چکی ہیں مگر مجھے یاد نہیں آ رہا۔ آپ ہی بتا دیں' کب ملی تھیں آپ مجھ سے؟''

مادام کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔ انھوں نے ہنس کر کہا۔''تمھیں وہ ملاقات اب یاد نہیں آ سکے گی اس لیے اسے بھول جاؤ۔''

''معاف کیجیے گا مادام' آپ کا چہرہ ایسا نہیں جسے ایک بار دیکھنے کے بعد کوئی بھلا دے' پھر میں کس طرح بھول گیا!''

''یہ تو تم ہی بہتر سمجھ سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر مادام' دھوتی بند سے مخاطب ہو گئیں۔''غالباً یہ بات اسے تم نے بتائی ہو گی!'' مادام کے لہجے میں کسی قدر سختی تھی۔

دھوتی بند کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ وہ چند لمحے بعد بولا۔''دراصل اس وقت ... اس وقت میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ اسے آپ سے بھی ملوانا پڑے گا۔ بہرحال میں معافی چاہتا ہوں مادام! آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔ میں محتاط رہوں گا۔ بس باتوں باتوں میں یہ بات نکل آئی تھی۔''

اس کے بعد مادام اور وہ دھوتی بند مجھے اس کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے دھوتی بند نے بتایا تھا کہ کچھ دیر بعد رنجیت آ جائے گا جو مجھے میرے گھر چھوڑ آئے گا۔

وہ دونوں چلے گئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں خفیہ کی نوکری چھوڑنے اور نئی نوکری مل جانے پر خوش تو تھا مگر رنجیت بھی انہی لوگوں کا بلکہ مادام کا بندۂ بے دام تھا' یہ بات ذرا خطرناک تھی۔ بس مجھے اسی سے خوف آ رہا تھا اور میں یہ سوچ سوچ کر اپنے دل کو بہلا رہا تھا کہ اب رنجیت میرا دشمن نہیں' ساتھی بن جائے گا۔ خفیہ میں نوکری کے سبب ہر وقت میری جانِ زار سولی پر لٹکی رہتی تھی' اس سے اب مجھے نجات ملنے والی تھی۔ پھر یہ کہ تنخواہ بھی دوگنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کل ہی استعفیٰ دے دوں گا۔ ابا اور امی کو مطمئن کرنے کی خاطر میں نے سوچا تھا کہ انھیں کسی قدر حالات سے مطلع کر دوں گا۔ جب انھیں پتا چلے گا کہ ان کا لاڈلا' نورِ نظر' لختِ جگر' جان ہتھیلی پر رکھے پھرتا ہے' اس نوکری کی خاطر' تو وہ فوراً نئی نوکری کے حق میں ہو جائیں گے۔ پھر جب میں انھیں کل صبح نئی نوکری کی پہلی پیشگی تنخواہ دوں گا تو ان کے چہرے مزید کھل اٹھیں گے۔ ابا اور امی کو مطمئن کرنا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا' بس ذرا چچا بند ڈھال کی طرف سے کوئی روڑا اٹکائے جانے کا خطرہ تھا۔ وہ بہرحال یہ نہیں چاہیں گے کہ جہاں وہ خود نوکر ہیں' وہاں ان کا داماد نوکر نہ ہو۔ خفیہ میں تو وہ ہر وقت مجھ پر نظر رکھ سکتے تھے مگر کہیں اور نوکری کی صورت میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

میں اس وقت تک انہی سوچوں میں غرق رہا جب تک کہ رنجیت نہ آ گیا۔ میں اس کے ہاتھوں میں نئے کرارے نوٹوں کی گڈی دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس نے نوٹوں کی گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''لو' یہ رکھ لو! یہ اس ماہ کا معاوضہ ہے۔''

میں نے نوٹوں کی گڈی لے کر پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اسے شیروانی کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تاکہ کسی نوٹ کا کونا نہ مڑ جائے۔

''سنو اللہ دتا! اب تم ہمارے ساتھی بن چکے ہو اس لیے پرانی رنجشیں دل سے نکال دو' بھول جاؤ کہ کبھی تمھارے اور میرے درمیان دشمنی تھی۔'' رنجیت نے نرم لہجے میں کہا۔

''بالکل پیارے بھائی' بالکل!'' میں کھل اٹھا۔''آؤ گلے لگ جائیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔''جب تک دل نہ ملیں' ہاتھ یا سینہ ملانے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

میرے دونوں ہاتھ ایک ساتھ نیچے آ گئے اور میں نے اسے یقین دلایا۔''رنجیت بھائی! آپ بالکل مطمئن رہیں' میرے دل میں اب آپ کی طرف سے کوئی رنجش نہیں۔''

''یہ تو وقت آنے پر معلوم ہو گا۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا' پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سیاہ پٹی نکال کر میری طرف بڑھا۔

''اب کیا ارادہ ہے پیارے بھائی؟'' میں نے ذرا تشویش ناک لہجے میں کہا۔''کیا مجھے اندھا بھینسا بناؤ گے؟''

''یہ مادام کا حکم ہے کہ تمھیں یہاں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا جائے۔'' وہ میرے قریب آ کر بولا۔''اس طرف منہ کر لو۔''

''لیکن پیارے بھائی' اب تو میں تم لوگوں کا نوکر بن چکا ہوں' پھر اس کی ضرورت کیا ہے؟'' میں منمنایا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو!'' معاً اس کا لہجہ بدل گیا۔''دوسری طرف منہ کر لو!''

''ارے پیارے بھائی' خفا کیوں ہو رہے ہو' یہ لو!'' یہ کہہ کر میں نے دوسری طرف منہ کر لیا۔

رنجیت نے میری آنکھوں پر کس کر پٹی باندھ دی' پھر میرا ہاتھ تھام کر بولا۔''چلو۔''

میں نے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔''کیا تم کیٹی کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے تھے؟''

''غیر ضروری باتوں سے گریز کرو۔'' اس کے لہجے میں اب بھی سختی تھی۔ اس کا موڈ کچھ بگڑ سا گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف سے مزید کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔ میں کسی اندھے کی طرح اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا رہا۔ وہ مجھے راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا جا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی میں اسی عمارت کے اندر تھا۔ میں نے کسی کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنی اور اچھل پڑا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے چیخنا چاہا تھا مگر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا۔

''پیارے بھائی! یہ ... یہ کس کی چیخ تھی؟'' میں نے ہمت کر کے رنجیت سے دریافت کیا۔

''میں تم سے کہہ چکا ہوں احمق کہ خاموشی سے چلتے رہو!'' رنجیت

کسی سانپ کی طرح پھنکارا مگر اس کی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔

"ب... ب... بہت اچھا پیارے بھائی! اب... اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے ہکلا کر اسے یقین دلایا۔

جواب میں رنجیت خاموش رہا۔ میں اس چیخ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کسی عورت کی گھٹی گھٹی چیخ تھی۔ آخر اس عمارت میں کس عورت پر ظلم کیا جا رہا تھا؟ میں بار بار اس سوال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر ہر بار ناکام رہتا۔ آخر کچھ دیر بعد رنجیت نے مجھے بتایا کہ سامنے ایک کار کا کھلا ہوا دروازہ ہے، میں اس میں بیٹھ جاؤں۔ میں نے تعمیل حکم کی اور پھر کچھ دیر بعد ہی کار اسٹارٹ ہو گئی۔

کار نے کچھ فاصلہ طے کر لیا تو میں بولا "اب تو میری آنکھوں سے پٹی کھول دو تاکہ میں تمھیں اپنے گھر کا راستہ بتا سکوں پیارے بھائی!"

"اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے تمھارا گھر معلوم ہے، ابھی کافی دور ہے۔"

"تو کیا پھر میرے گھر کے دروازے پر پہنچ کر ہی پٹی کھولو گے؟" میں نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"کیوں، کیا راستہ ذہن میں رکھنا چاہتے ہو؟" اس کے لہجے میں چبھن تھی۔

"کیا حرج ہے۔" میں اطمینان سے بولا "اب تو میں تم لوگوں کا نوکر ہوں، یہاں مجھے خبریں لانے لے جانے، آنا جانا ہی پڑے گا۔"

"سنو! نہ خود کو بے وقوف ظاہر کرنے کی کوشش کرو، نہ ہمیں احمق سمجھو!"

"توبہ توبہ!" میں نے اپنے دونوں رخساروں پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ "میری یہ مجال کہاں! اوّل تو تم احمق نہیں پیارے جانی! اور اگر ہوتے بھی تو میں ایسی بات ہرگز زبان پر نہ لاتا۔"

"اچھا خاموش بیٹھو، مجھے فضول باتیں پسند نہیں ہیں۔" رنجیت نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے دوبارہ چپ سادھ لی۔ کار فراٹے بھرتی رہی۔ وقت گزرتا رہا اور پھر میں نے دور کہیں سے مؤذن کی آواز سنی۔ گویا رات بیت گئی۔ میں نے سوچا۔ پھر اذان کی آواز قریب آتی گئی۔

رنجیت نے چند لمحے بعد میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ اس سے پہلے وہ کار کو روک چکا تھا۔ میں نے صبح کے جھٹپٹے کے باوجود اس علاقے کو پہچان لیا۔ وہ جامع مسجد کا علاقہ تھا۔ وہاں سے جامع مسجد زیادہ دور نہیں تھی اور اذان کی آواز وہیں سے آ رہی تھی۔ رنجیت نے مجھے وہیں کار سے اتار دیا اور بغیر کچھ کہے، کار آگے بڑھا دی۔ میں چند لمحے اس کی جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا جو لال قلعے کی طرف جا رہی تھی، پھر میرے قدم جیسے خود بخود جامع مسجد کی طرف اٹھ گئے۔ میں نے سوچا، مجھ پر خدا کا شکر بجا لانا لازم ہے جس نے مجھے نہ صرف یہ کہ ظالموں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا تھا بلکہ نئی نوکری کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔

میں نماز پڑھ کر جب مسجد کے دروازے سے نکل رہا تھا تو پیچھے سے کسی نے مجھے پکارا اور میرے قدم رک گئے۔ وہ آواز میرے ابّا کی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بھائی صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ابّا میرے قریب آ کر بولے "کیا رات بھر ڈیوٹی دیتا رہا اللہ دتا؟"

"ہاں ابّا!" میں نے ان کے ساتھ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے جواب دیا "بس ابھی ابھی آیا ہوں۔ میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے سوچا کہ نماز بھی پڑھتا چلوں۔"

ابّا نے میری بات سن کر مجھے دعا دی۔ پھر جب میں سیڑھیوں سے اتر کر پیدل ہی ان کے ساتھ چلنے لگا تو وہ بولے "تیری موٹر سائیکل کہاں ہے؟"

"بڑے صاحب کے بنگلے پر!" میں نے جواب دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ پوچھتے میں کس طرح یہاں پہنچا، میں نے کہا "ابھی ایک کار مجھے یہاں چھوڑ گئی ہے۔"

"بڑے صاحب خود چھوڑنے آئے ہوں گے اپنی کار میں!" ابّا مسرور سے لہجے میں بولے۔

"نہیں ابّا، وہ اور شخص تھا۔" میں نے کہا "وہ میرا نیا ساتھی تھا۔"

"نیا ساتھی!" ابّا حیرت سے بولے "کیا وہ تیرے دفتر میں نیا نیا بھرتی ہوا ہے؟"

"نہیں، وہ میرے دفتر کا آدمی نہیں تھا۔"

"ارے پھر کون تھا وہ؟"

میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا "یہ ایک لمبی کہانی ہے ابّا، جو میں گھر چل کر ہی سناؤں گا۔ اب میں نے خفیہ کی نوکری چھوڑ کر نئی نوکری کر لی ہے۔"

"ابے کیا بکتا ہے!" ابّا جلدی سے بولے "کہیں تیرا دماغ تو نہیں چل گیا! خفیہ کی نوکری کب چھوڑی تُو نے؟ اور یہ کون سی نئی نوکری کر لی؟"

"آج رات ہی خفیہ کی نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے میں نے! آج خفیہ کے دفتر جا کر استعفیٰ دے آؤں گا۔" میں نے ابّا کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"ابے کیا میں مر گیا ہوں!" ابّا دہاڑ سا اٹھے۔ "ٹھہر گیا۔"

"نہیں تو ابّا!" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"پھر تُو نے بغیر مجھ سے پوچھے خفیہ کی نوکری کیوں چھوڑی؟ بول!" وہ طیش میں آ گئے "اتنے پیسے مل سکتے ہیں تجھے کہیں؟"

"ابھی کہاں چھوڑی ہے نوکری، چھوڑنے والا ہوں ابّا! اسی لیے تو پہلے آپ کو بتا رہا ہوں۔"

"ہرگز نہیں!" ابّا نے گویا فیصلہ سنا دیا اور میرا دم خشک ہو گیا۔ "لگی لگائی روزی پر لات مارنے سے خدا بھی بُرا مان جاتا ہے۔ تُو نوکری نہیں چھوڑے گا، سمجھا!"

"سمجھ گیا ابّا! لیکن گھر چل کر پہلے میری پوری بات سن لیجیے گا، پھر کوئی فیصلہ کیجیے گا۔"

"ٹھیک ہے، چل!" انھوں نے عالم جوش میں میری کلائی پکڑ لی اور گویا مجھے گھر کی طرف گھسیٹتے لگے۔ بھائی صاحب، تسبیح پڑھتے ہوئے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

گھر میں قدم رکھتے ہی امّی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا "یہ رات بھر گزار کر اب آیا ہے! میں تو تنگ آ گئی ہوں تیری نوکری سے۔ ساری رات بار بار آنکھ کھلتی رہی، اب آ جائے، اب آ جائے مگر..."

"بکو مت!" ابّا ایک دم امّی پر گرم ہو گئے "وہ کوئی حرام کے پیسے نہیں دیتے! کام کراتے ہیں دن رات تو رقم ڈھیلی کرتے ہیں، تم ہی نوکری سے تنگ آنے والی!"

"ارے یہ تمھیں کیا ہوا، صبح ہی صبح!" امّی بھی لال پیلی ہونے لگیں "میں نے کیا مجلس میں لٹھ مار دیا!"

"تمھاری اسی صبح بیخ بازی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ تمھارے لاڈلے نے نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور آج استعفیٰ بھی دینے جا رہے ہیں صاحب زادے!" ابّا بھڑکے۔

"ارے تم مجھ پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤ، ہاں! میں نے کب اس سے کہا ہے کہ نوکری چھوڑ دے!"

پھر بڑی مشکل سے ابّا اور امّی میری بات سننے پر آمادہ ہوئے۔ کچھ تو واقعی کئی بار میں مرتے مرتے بچا تھا اور کچھ میں نے نمک مرچ ملا دیا تھا۔ امّی نے اپنی چھاتی پیٹ لی "ہائے ہائے میرے چاند پر یہ ظلم! مجھے نہیں چاہیے ایسی دولت! آگ لگے ایسی نوکری میں! وہ اپنے سوتے سوتوں کو بھیج دیں لیروں مارنے کو!" پھر وہ مجھ پر برس پڑیں۔ "اور کم بخت! تُو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بول!" یہ کہہ کر انھوں نے دو چار تھپڑ جڑ دیے "اگر خدا نہ کرے، تجھے کچھ ہو جاتا پھر؟ خدا سمجھے ان بندو خاں کو! انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ابھی بچے کی عمر ہی کیا ہے! وہ نہ کرا دیں اپنے بیٹے کو اس موئی خفیہ میں! ارے مجھے کیا خبر تھی کہ یہ رات رات بھر اسی لیے غائب رہتا ہے، اگر ذرا بھی بھنک لگ جاتی تو گھر سے قدم نہ نکالنے دیتی!"

ابّا کا منہ بھی لٹک گیا تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہی میں نے شیروانی کی جیب سے نئے کرارے نوٹوں کی گڈی نکالی اور امّی کو دیتے ہوئے بولا "یہ لیں امّی! نئی نوکری کی پہلی تنخواہ!"

"کیا!" امّی نے حیرت سے کہا "کیسی نئی نوکری؟" ابّا بھی حیران نظر آ رہے تھے مگر ان کی نگاہ نوٹوں کی گڈی ہی پر جمی ہوئی تھی۔

"خفیہ کی نوکری چھوڑ کر کہیں اور نوکری تو کرنا ہی تھی نا امّی!" میں نے کہا "تو میں نے نئی نوکری کر لی ہے۔"

"کب سے؟" اس بار ابّا نے سوال کیا۔

"بس آج ہی سے سمجھیں ابّا!" میں نے جواب دیا۔

"مگر ابھی مہینہ تو پورا نہیں ہوا، تنخواہ کیسے دے دی انھوں نے؟" ابّا حیرت سے بولے۔

"وہاں سے پیشگی تنخواہ ملا کرے گی ابّا! اور اتنی ہی تنخواہ جتنی خفیہ والے دیا کرتے تھے۔" میں نے بتایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، خاک ڈال ان خفیہ والوں پر! اب مت جیتو وہاں!" ابّا نے آخر میرے حق میں فیصلہ سنا دیا "میں بندو خاں کو بلوا کر کہہ دوں گا کہ اب تو نہیں کرے گا یہ نوکری، ہاں!" پھر ابّا کو بھیٹ پھٹ کا خیال آ گیا کیوں کہ محلے بھر میں صرف انھی کے گھر پھٹ پھٹ تھی، چاہے وہ سرکاری ہی سہی۔ وہ بولے "اور یہ جو تُو نے نئی نوکری کی ہے، یہاں پھٹ پھٹ ملے گی تجھے؟"

"ابھی اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی ابّا!" میں نے جواب دیا "ان کے پاس کاریں ہیں، کیا خبر وہ مجھے کوئی کار ہی دے دیں!"

کار کے ذکر پر ابّا کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ میری بجائے امّی سے بولے "ارے سن رہی ہو شکورن! تمھارا بیٹا اب کار میں بیٹھے گا!"

"خدا دشمنوں کی نظر سے بچائے، سب میری ہی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ پانچوں وقت اللہ تبارک تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتی ہوں۔"

"ہاں ایک تمھی تو دعا کرتی ہو، اس کے لیے! ہم تو کچھ ہیں ہی نہیں اس کے! اور نہ اس کے لیے دعا کرتے ہیں!"

"ارے کچھ ہو کیوں نہیں، اللہ رکھے باپ ہو۔"

"تو پھر یوں کہو نا کہ ماں باپ کی دعا کے نتیجے میں یہ سب ترقی مل رہی ہے۔"

"چلو یوں ہی کہہ لو۔" امّی جان چھڑانے کے لیے بولیں۔

"ہاں بھئی اللہ دتا! تُو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ نئی نوکری میں کام کیا کرنا ہو گا تجھے!" ابّا مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بس ابّا، خبریں لانے لے جانے کا کام ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس میں تو کوئی ایسا ویسا خطرہ نہیں؟" ابّا نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"نہیں ابّا، ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے انھیں اطمینان دلایا۔

"اچھا شکورن! اب جلدی سے پراٹھے ڈال دے، دیر ہو رہی

ہے دکان پر جانے کو!" ابا نے امی سے کہا۔

پھر میں نے، بھائی صاحب نے اور ابا نے ساتھ ساتھ ناشتا کیا۔ ناشتے ہی کے دوران میں ابا کو میں نے سمجھایا کہ میرا خفیہ کے دفتر جا کر استعفیٰ دینا بہت ضروری ہے، صرف چچا بندو خاں کو بلا کر کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔

"خیر تو جان!" ابا نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، "مگر اب اُن کے ریپٹے میں مت آئیو!"

"بالکل نہیں ابا!" میں نے یقین دلایا۔ "میں اب ہرگز خفیہ کی نوکری نہیں کروں گا۔"

پھر جب میں اپنی دانست میں آخری بار خفیہ کے دفتر جا رہا تھا تو مجھے لیوسی یاد آ رہی تھی۔ نوکری چھوڑنے کے بعد ظاہر ہے کہ اس سے بھی میل جول ختم ہو جائے گا۔ اب اسی بے چاری کی کم بختی آئے گی، میں تو نوکری چھوڑ ہی رہا ہوں۔ مسٹر تھامسن، یہ کیس اسی کے سر منڈھ دیں گے۔ خیر جو ہو سو ہو، مجھے کیا، میں نے سوچا۔

گزشتہ دن میں نے دفتر میں نواب کا بھیس بھرا تھا۔ اپنے کپڑے میں نے میک اپ روم ہی میں چھوڑ دیے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک میرے جسم پر وہی لباس تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مولوی جی کے حکم پر میں نے مونچھیں، چہرے سے نوچ کر شیروانی کی جیب میں ڈال لی تھیں۔ سرکاری لباس، گھر سے چلتے ہوئے، میں نے اس لیے نہیں بدلا تھا کہ دفتر پہنچ کر اپنا لباس پہن لوں گا اور اسے وہیں چھوڑ دوں گا۔

خفیہ کی نوکری کرنے کے بعد شاید وہ پہلا دن تھا کہ میرے ذہن پر کوئی دباؤ نہیں تھا اور میں اپنی جان چھوٹ جانے کے خیال سے بہت خوش تھا۔

کیوں کہ آج میرے پاس سرکاری پھٹ پھٹ نہیں تھی اس لیے میں تانگے میں سفر کر رہا تھا۔ تانگے میں میرے علاوہ اور بھی سواریاں تھیں جن سے میں لاتعلق سا بیٹھا تھا اور اپنی سوچ میں گم تھا۔ بس اچانک ہی میری نگاہ اس موٹر سائیکل کی طرف اٹھ گئی تھی جو تانگے کے پیچھے بہت دیر سے لگی ہوئی تھی۔ کبھی تانگا آگے نکل جاتا، کبھی موٹر سائیکل۔ وہ شخص جو موٹر سائیکل پر سوار تھا، یقیناً جان بوجھ کر آہستہ رفتار سے چل رہا تھا ورنہ کبھی کا بہت آگے جا چکا ہوتا۔ اس شخص کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا تھا۔ وہ عادل تھا۔ وہی پُراسرار شخص جو نہ جانے کیوں ایک عرصے سے میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میں آج تک اس سے اپنے تعاقب کا سبب دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے ایک بار گمنام حملہ آور سے میری جان بھی بچائی تھی۔ میں نے ایک آدھ بار کوشش بھی کی تھی کہ تعاقب کیے جانے کا سبب جان سکوں مگر ناکام رہا تھا۔ عادل نے مجھے باتوں باتوں میں اڑا دیا تھا اور اصل بات بتا کر نہیں دی تھی۔ پتا نہیں اسے مجھ سے کیا ہمدردی تھی اور کیوں میرے پیچھے لگا ہوا تھا؟ پھر میرے ذہن میں ایک الجھن اور بھی تھی کہ اس کا چہرہ مجھے ہمیشہ کچھ مانوس سا لگتا تھا جیسے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو۔ کہاں، یہ مجھے کبھی یاد نہ آ سکا تھا۔

تعاقب کرتے ہوئے ایک بار جب وہ تانگے کے بالکل قریب آ گیا تو میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہاتھ ہلایا۔

"آج موٹر سائیکل پر نظر نہیں آ رہے!" اس نے کسی قدر بلند آواز میں کہا۔ "دفتر ہی جا رہے ہو تو میں چھوڑ دوں!"

میں نے عادل کی پیشکش فوراً منظور کر لی۔ میری دانست میں یہ سنہری موقع تھا، اس سے کچھ معلوم کرنے کا! اس وقت تانگا، چاندنی چوک سے گزر رہا تھا۔ میں تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا اس لیے مڑ کر تانگے والے سے وہیں رکنے کے لیے کہا۔ چند لمحے بعد ہی میں تانگے والے کو پیسے دے کر اتر گیا۔ عادل نے بھی اپنی موٹر سائیکل ایک طرف روک لی تھی۔ ہر چند کہ عادل سے گفتگو کرنے میں مجھے دفتر کے لیے دیر ہو جاتی مگر میں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ آج تو یوں بھی دفتر میں میرا آخری دن تھا۔

تانگا جہاں رکا تھا، وہاں سے کچھ فاصلے ہی پر ایک ہوٹل تھا۔ میں نے عادل کے قریب پہنچتے ہی کہا، "آؤ پہلے چائے پی لیں۔"

اس بہانے میں اسے کچھ دیر اپنے ساتھ بٹھانا چاہتا تھا تاکہ اپنا مقصد حل کر سکوں۔

"کیوں، کیا گھر سے ناشتا کر کے نہیں چلے؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"چائے تو خیر ایک بہانہ ہے۔" میں نے سچ بولا۔ "دراصل مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"کیا شاہنواز کے بارے میں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اپنے اور تمہارے بارے میں!"

"کیا مزید چند مہینے کا معاہدہ کرنا ہے؟" وہ بولا، پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی بولا کہا، "اگر ایسا ہے تو تمہیں استاد سے بات کرنا ہو گی۔ استاد اپنے کسی بھی آدمی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ براہِ راست سودے بازی کر لے۔ بہرحال اس کے کچھ اصول ہیں جن پر وہ خود بھی سختی سے عمل کرتا ہے اور عمل کرانا بھی جانتا ہے۔"

پتا نہیں وہ کہاں کی ہانک رہا تھا، میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آ رہی تھیں مگر میں نے اس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ میں بولا۔ "چلو وہیں ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

"اچھا تو پھر بیٹھو۔" اس نے پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد ہی میں اور عادل، ہوٹل میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ میں اتنا بے تاب تھا کہ چائے آنے کا انتظار کیے بغیر شروع ہو گیا۔ میں نے کہا، "دیکھو عادل، تمہاری طرف سے میرے ذہن میں سخت الجھن ہے۔ میں تمہیں صاف صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟ تمہیں مجھ سے کیا اور کیوں ہمدردی ہے؟ اور یہ کہ تم میرا تعاقب کیوں کرتے رہتے ہو؟ یہ سوالات ایک عرصے سے مجھے بے چین کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کے جواب چاہئیں۔"

عادل میری بات سن کر حیرت زدہ سا نظر آنے لگا، پھر چند لمحے بعد بولا، "کیا واقعی تم کچھ نہیں جانتے؟ مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے، تم تو ہمارے اڈے پر بھی آ چکے ہو! یہ کوئی تقریباً مہینے بھر پہلے ہی کی تو بات ہے۔"

"کون سا اڈا؟ مجھے یاد نہیں۔" میں الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"استاد چھنگا کا اڈا اور کون سا!" عادل نے جواب دیا۔

عادل کی بات سن کر میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور جیسے آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے عادل کو پہلی بار وہیں دیکھا تھا اسی لیے اس کا چہرہ مجھے اجنبی نہیں لگا تھا۔

"اب یاد آیا کچھ؟" عادل مجھے خاموش دیکھ کر بولا۔

"ہاں یاد آ گیا۔ میں نے تمہیں وہاں دیکھا تھا مگر ظاہر ہے کہ ایک بار دیکھنے کے بعد آدمی آشنا یاد نہیں رہتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر چہرہ کرائے جانے کے بعد ہمیں آدمی کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔" عادل نے کہا۔

"خیر اب میرے دوسرے سوال کا جواب دو کہ تم نے میری جان کیوں بچائی تھی؟ تمہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے؟"

"جان بچانا میرا فرض تھا اس لیے کہ اسی کی خاطر تو ان لوگوں نے استاد چھنگا کو رقم دی تھی جو دراصل تمہارے ہمدرد تھے، میری مراد صفدر علی بیگ اور سیٹھ وشوا ناتھ سے ہے۔ انھی کا ایک آدمی تو رقم لے کر آیا تھا، استاد چھنگا کے پاس! جہاں تک تم سے میری ہمدردی کا سوال ہے تو اسے کاروباری ہمدردی کہنا زیادہ مناسب ہے۔" عادل نے کہا۔

میرے ذہن کی گرہیں جیسے کھلتی چلی گئیں۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ پولیٹیکل برانچ کی رجنی عرف بندیا یعنی غار والی، پھر میرا استاد چھنگا کے اڈے پر جانا اور وہاں ایک اجنبی شخص کا ملنا، مجھے ایک ایک کر کے تمام باتیں یاد آتی چلی گئیں۔ صفدر علی بیگ اور سیٹھ وشوا ناتھ نے مجھے قتل کرانے کی خاطر جو رقم، استاد چھنگا کو بھجوائی تھی، وہ رجنی نے میری حفاظت کی خاطر خرچ کرا دی تھی۔ جس شخص کے ہاتھ وہ رقم بھجوائی گئی تھی، وہ بھی خفیہ کی پولیٹیکل برانچ کا تھا اور اس نے رجنی کے اشارے پر استاد چھنگا سے میرے قتل کی بجائے بالکل مختلف بات کہی تھی۔ رجنی نے اپنی ذہانت سے مجرموں کا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس شخص نے استاد چھنگا سے ایک مہینے کی بات کی تھی۔ استاد چھنگا کو جو رقم دی گئی تھی، اس کے عوض یہ ذمے داری تھی کہ مہینے بھر وہ میری حفاظت کرے اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچنے دے۔ استاد چھنگا نے اسی لیے اپنا ایک ذہین و مستعد آدمی میرے پیچھے سائے کی طرح لگا دیا تھا اور اسی آدمی نے ایک بار میری جان بھی بچائی تھی۔ رجنی عرف بندیا مر چکی تھی، صفدر علی بیگ اور سیٹھ وشوا ناتھ، سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے تھے، وہ کیس ہی ختم ہو گیا تھا مگر استاد چھنگا اپنے وعدے پر قائم تھا۔

"کہاں کھو گئے؟ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" عادل نے مجھے مخاطب کیا تو میں چونک اٹھا۔ اس دوران میں نہ جانے کب بیرا، چائے رکھ کر چلا گیا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا اور چائے کی پیالی اٹھائی۔

"یہ مہینہ ختم ہونے میں بس اب دو روز رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر استاد چھنگا کو پیسے نہیں ملے تو پھر یہ سلسلہ ختم سمجھو۔" عادل بولا۔

"چلو اچھا ہی ہے، تم تو اب چین سے بیٹھ جاؤ گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"چین کی خوب کہی!" وہ بھی ہنس پڑا۔ "ارے اپنا تو کام ہی یہی ہے۔ کام نہیں ہوتا تو پیسے نہیں ملتے اور بیزاری الگ ہوتی ہے۔"

"اچھا اب میں چلوں گا، مجھے دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے چھوڑ دو وہاں تک!" میں نے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"حرج کیسا، مجھے تو تمہارے تعاقب میں وہاں تک جانا ہی تھا۔" عادل نے جواب دیا۔

پھر عادل نے چائے ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد ہی میں اس کی پھٹ پھٹ پر بیٹھا ہوا اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا جو کل اپنے کی بجائے پرایا ہونے والا تھا۔ دفتر کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں گزشتہ شب کے واقعات گھومنے لگے۔ میں نے سوچا کہ میرے سوا کسی کو علم ہی نہیں ہو گا کہ وہ فائل کس طرح وہاں سے غائب ہو گئی۔ اگر کسی نے اس بدیسی کتے کو فائل چھپا کر بھاگتے دیکھا ہوتا تو یقیناً میری طرح کتے کا پیچھا کیا ہوتا۔ وہ سب تو اس شخص کو گھیر کر خوش ہو گئے تھے اور اسی کی طرف متوجہ تھے جو کم بختی کا مارا نہ جانے کس طرح اور کیوں ادھر آ نکلا تھا۔ بعد میں جب

انھوں نے ٹوکری سے فائل غائب دیکھی ہوگی تو بہت سٹپٹائے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ جو بات کسی کو خبر نہیں تھی، مجھے معلوم تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے تو سب پر اپنی ذہانت اور بہادری کا سکہ بٹھاؤں گا اور مجرموں کی قید سے فرار کی فرضی داستان بیان کروں گا، پھر استعفیٰ دوں گا۔ چلتے چلاتے اگر ایک بار پھر میں ہیرو ثابت ہو جاؤں تو کیا حرج ہے، میں نے سوچا۔

انھی سوچوں میں کشمیری گیٹ آگیا۔

"لو آگیا تمھارا دفتر!" عادل نے تھوڑی دیر بعد میرے دفتر کی عمارت کے صدر دروازے پر موٹر سائیکل روکتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور موٹر سائیکل سے اتر کر صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں صدر دروازے سے داخل ہو رہا تھا تو لیوسی کچھ دور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ ہی پہلے دفتر آئی ہوگی، میں نے سوچا اور پھر اسے صدا لگائی۔ میں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی خاطر اس کا نام غلط لیا تھا۔

"پُوسی! اے پُوسی!" اس نے ایک بار نہ سنا تو میں نے دوبارہ ہانک لگائی۔

وہ ایک دم تیزی سے مڑی اور مجھے غضب ناک نظروں سے دیکھا، پھر سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں رک گئی۔ اس کا رُخ اب میری طرف تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی بلا" وہ پھٹ پڑی۔ "میں اس طرح کا چھچھورا مذاق قطعی پسند نہیں کرتی!"

"کیا ہوا؟" میں دانستہ انجان بن کر بولا۔ "تم تو اس وقت کسی ایسی مرغی کی طرح ایک دم کڑکڑانے لگیں جو انڈوں پر بیٹھی ہو اور اسے چھیڑ دیا گیا ہو۔"

"اللہ دتا!" وہ غصّے سے بے قابو ہو کر تقریباً چیخ اٹھی۔ اس کا چہرہ غصّے کے سبب سرخ ہو گیا تھا۔

"معاف کرنا، مائی ڈیئر، یعنی میری پیاری لوسی! تم بھی تو میرا صحیح نام نہیں لیتیں حالانکہ میں تمھیں آگاہ کر چکا ہوں، اب میں اللہ دتا کی بجائے ڈی مہر بن چکا ہوں۔"

"جہنّم میں جاؤ!" یہ کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی آگے بڑھی مگر میں اس کا پیچھا چھوڑنے والا کب تھا، مجھے تو اس سے گزشتہ شب کے واقعات معلوم کرنا تھے، وہ واقعات جو میرے بعد پیش آئے تھے۔ اب میں اسے چھیڑ کر پچھتا رہا تھا۔ میں نے ناحق اُسے غصہ دلا دیا تھا۔

"اچھا اب نہیں کہوں گا تمھیں پوسی، بلکہ بس!" میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

وہ رکی اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ارے ارے تم... تم تو رونے لگیں!" مجھے ایک دم اس پر لاڈ آ گیا اور جلدی سے اس کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کے آنسو پونچھ دوں جو اب رخساروں تک آ گئے تھے۔

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا، پھر خود اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، بھرّائی آواز میں بولی "بازو چھوڑو میرا! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا!"

"ہائے قربان! تمھاری انھی اداؤں نے تو مار ڈالا ہے۔" میں نے ایک ناول میں پڑھا ہوا رومانی مکالمہ بولا۔ "اسی لیے تو میں نے کہا تھا، میری دوسری بیوی بن جاؤ۔ سچ بڑا مزا آئے گا۔"

"اگر ان باتوں سے تمھارا مقصد میرا... میرا مذاق اڑانا ہے تو... تو ایک بار جی بھر کے مذاق اڑا لو۔ میں روز روز یہ نشتر برداشت نہیں کر سکتی۔" اس کی آواز اب بھی بھرّائی ہوئی تھی۔

اسی وقت پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ ابھری اور میں نے جلدی سے لیوسی کا بازو چھوڑ دیا۔

"گک... کیوں... گک... کیا ہوا؟ ڈر... ڈا... ڈر گئے، مجھے آ... آتا... دے... دیکھ کر!" پیچھے سے کسی نے صدا لگائی اور یہ ہکلا، انسپکٹر مولا داد ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے غالباً مجھے لیوسی کا بازو پکڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس بدبخت کی بات کا اصل مقصد سمجھ کر میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ لیوسی کے چہرے پر بھی مجھے شدید غصّے کے آثار نظر آئے تھے۔

"تم کوئی شہر کوتوال ہو مسٹر بھنڈی جو میں تمھیں دیکھ کر ڈر جاؤں گا!" میں نے جوابی حملہ کیا۔

"کک... کیا کہا... تُو... تُم... تم اپ... اپنی... ذلا... ذلالت سے باز... نا... نا... نہیں آؤ گے!" وہ میرے قریب پہنچ کر دہاڑا۔

ممکن تھا کہ میری اس سے "ہاتھا پائی" ہو جاتی مگر لیوسی نے بات نہیں بڑھنے دی۔ اس نے لیوسی سے معافی مانگ لی تھی کہ وہ اس کی بجائے کسی اور لڑکی کو سمجھا تھا ورنہ ایسی بات نہ کہتا۔ بات رفع دفع ہو گئی تو وہ مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے مجھ سے معافی نہیں مانگی تھی اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے آئندہ اسے بھنڈی کہا تو وہ مجھے قتل کر دے گا۔

"تم آخر اسے چھیڑتے ہی کیوں ہو۔ پتا ہے تمھیں، بھنڈی اس کی چڑ ہے۔" لیوسی نے مجھے سمجھایا۔

"تو ہوا کرے!" میں ہاتھ نچا کر بولا۔ "نہ وہ گرمیں اینٹ اٹھاتا، نہ چھینٹ کھاتا۔"

"کتنی گندی مثال دی ہے تم نے! توبہ توبہ!" لیوسی کا موڈ بحال

ہونے لگا۔ "گویا اس طرح تم خود کو گُو کہہ رہے ہو!"

"ارے یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں جلدی سے بولا۔ "گُو ہو مولا داد، میں کیوں ہونے لگا۔"

"اچھا اب چلو گے یا یہیں کھڑے رہو گے!" لیوسی آگے قدم بڑھاتی ہوئی بولی۔

"چلو۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کل رات تم کہاں غائب ہو گئے تھے، اچانک؟" لیوسی نے خود ہی بات چھیڑی۔

"میں غائب ہو گیا تھا کہ تمھی مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ لی تھیں!" میں کسی قدر خفگی سے بولا۔

"بہرحال کچھ بھی سہی۔ تیواڑی جی بعد میں بہت ناراض ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تم خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔"

"خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے!" میں ٹیڑھا منہ کر کے بولا۔ "وہ تو بڑے مُکرم داس خان ہیں!"

پھر میں گزشتہ شب کے واقعات جاننے کی خاطر لیوسی کے ساتھ ہی لگا ہوا اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ لیوسی بضد تھی کہ پہلے میں بتاؤں کہاں چلا گیا تھا اور میرا اصرار تھا، وہ مجھے پہلے تمام بات بتا دے۔

اب میں اس کے کمرے میں تھا۔ وہ اپنی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو میں بھی اس کے سامنے میز کی دوسری سمت پڑی ہوئی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"تو تم نہیں بتاؤ گے کچھ؟" لیوسی طویل سانس لے کر بولی۔

"میرے عزم و جرأت کی داستان بہت لمبی ہے اور میں سب کے سامنے بار بار اسے نہیں دُہرانا چاہتا۔" میں نے سینہ پھُلا کر کہا۔ "تیواڑی جی اور سر تھامسن کو بھی مجھے یہی سب بتانا پڑے گا اس لیے بہتر ہے کہ تم بھی وہیں یہ لمبی کہانی سُن لینا۔ مجھے تو صرف اتنا بتا دو کہ جو مجرم پکڑا گیا تھا، اس کا کیا بنا اور اس نے کیا قبولا؟"

"اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" لیوسی نے ہتھیار ڈال دیے۔ "مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم نے یقیناً کوئی تیر مارا ہے اسی لیے اس قدر اینٹھ رہے ہو۔"

"تیر تو تیر، سمجھا تیر کہو۔" میں اکڑ کر بولا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ فائل کہاں اور کیسے غائب ہو گئی جو ٹوکری میں تھی؟ بولو!"

"مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سلسلے میں لاعلم ہوں۔"

"لیکن میں..." میں نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر "ڈرامائی" انداز میں کہا۔ "میں سب کچھ جانتا ہوں کہ وہ فائل کب اور کس طرح غائب کی گئی۔"

"تمھارے کیا کہنے، اگر سانس نہ لیتے تو کوئی پہنچے ہوئے بزرگ ہوتے۔" لیوسی نے مجھ پر فقرہ چُست کیا مگر اس وقت میں اس قدر جوش میں تھا کہ فقرہ میرے سر سے گزر گیا۔

"ہاں تو دیکھا تم نے! ہے کوئی تمھاری پوری خفیہ میں مجھ جیسا؟" یہ کہتے ہوئے معاً مجھے خیال آگیا کہ آج خفیہ میں میرا آخری دن ہے۔ یہ خیال آتے ہی نہ جانے کیوں میں کچھ اداس سا ہو گیا۔

لیوسی نے بھی میری اداسی فوراً محسوس کر لی اور بولی۔ "یہ ایک دم تمھارا منہ کیوں لٹک گیا؟"

"ہائے نہ پوچھو!" میں ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "جب تمھیں میرا منہ لٹک جانے کا سبب معلوم ہوگا تو تمھارے چہرے پر بھی پورے بارہ بجنے لگیں گے، ان شاء اللہ العزیز!" پھر چند لمحے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "خیر فی الحال یہ غم ناک باتیں چھوڑو، ان کا نمبر بعد میں ہے، تم تو مجھے یہ بتاؤ کہ ہوا کیا رات کو؟"

"ہونا کیا تھا، وہ شخص جو پکڑا گیا، کرائے کا ٹٹو ثابت ہوا۔ وہ ایک معمولی چور تھا۔ مجرموں نے ہماری توجہ اس کی طرف مبذول کرانے اور کسی طرح وہاں سے فائل غائب کرنے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ بعد میں جب فائل غائب پائی گئی تو یہی نتیجہ اخذ کیا گیا۔" لیوسی نے بتایا۔

"ویسے اس چور نے کچھ بتایا ہی ہوگا کہ اسے کس نے بھیجا تھا وہاں؟" میں نے کہا۔

"اس نے بتایا کہ کل دن کے وقت اس سے کوئی شخص رامو نامی ملا تھا جو ظاہر ہے کہ فرضی نام ہی ہوگا۔ رامو نے اسے دن ہی دن میں سر تھامسن کی کوٹھی دکھا دی تھی اور کہا تھا کہ کوٹھی کے پھاٹک پر اسے رات بارہ بجے کے بعد ایک ٹوکری رکھی ہوئی ملے گی، اسے وہی ٹوکری اٹھا کر لانا ہے۔ بظاہر اس معمولی سے کام کے لیے اس چور کو پورے پانچ سو روپے کی پیشکش کی گئی تھی۔ دو سو روپے اسے پیشگی ہی ادا کر دیے گئے تھے اور تین سو روپے بعد میں دینے کا وعدہ تھا۔ چور کو وہ ٹوکری لے کر اجمیری گیٹ پہنچنا تھا جہاں رقم ادا کرنے کے بعد اس سے ٹوکری لے لی جاتی۔ مختصر یہ کہ اس چور کی آڑ میں مجرم اپنا کام کر گئے لیکن اتنے افراد کی موجودگی میں ایسا کس طرح ہوا؟ یہ یقیناً حیرت کی بات تھی۔ چور کا بیان لینے کے بعد جب ٹوکری کی طرف توجہ دی گئی تو وہ خالی تھی۔ مجرموں کا نفسیاتی حربہ پوری طرح کامیاب رہا۔" یہ کہہ کر لیوسی خاموش ہو گئی۔

"اگر میں چوکنا نہ ہوتا اور اپنی آنکھیں کھُلی نہ رکھتا تو یہ راز ہمیشہ راز ہی رہتا۔" میں نے خالص جاسوسی ناولوں کے ہیرو کی طرح کہا۔ ایسے موقع پر ہمیشہ ہیرو صاحب اسی طرح کے مکالمے بولتے ہیں۔ پھر چند لمحے بعد میں نے مزید انکشاف کیا۔ "میں تو یہ تک بتا سکتا ہوں کہ اس بار مجرموں کو دھوکا نہیں دیا گیا اور ان کا مطالبہ پورا کر دیا گیا ہے۔"

"ہاں، سر تھامسن نے رات ہی یہ بات بتائی تھی مگر اس وقت تو

تم وہاں نہیں تھے، پھر تمھیں کیسے یہ بات معلوم ہوئی؟"

"یہی تو کمال ہے! البتہ دتا... اوہ معاف کرنا، اے ڈی ہر کو کیا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے؟"

"سر تھامسن کو یقین تھا کہ اس بار مجرم ضرور گرفت میں آجائیں گے اور وہاں سے اتنے انتظامات کی موجودگی میں فائل لے جانا قطعی ممکن نہیں اس لیے انھوں نے اصل فائل ہی ٹوکری میں رکھ دی تھی لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس فائل کی فوٹو کاپیاں کرائی گئی تھیں۔" لیوسی میری بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

اسی وقت مجھے خیال آیا کہ مرلی لال مرڈر کیس کی فائل تو سر تھامسن نے مجھے دی تھی، پھر ان کے پاس کہاں سے وہ فائل آگئی؟ یہی سوال میری زبان پر بھی آگیا۔

"یہی ممکن ہے کہ جب میں اور تم میک اپ روم میں تھے، سر تھامسن نے وہ فائل تمھاری میز کی دراز سے نکلوالی ہو۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"یا پھر بعد میں رات بارہ بجے سے قبل وہ فائل دفتر سے نکلوائی ہو۔"

"لیکن وہ مجھ سے بھی تو فائل مانگ سکتے تھے!" میں نے کہا۔

"وہ اس بات کو غالباً تم سے بھی چھپانا چاہتے ہوں گے۔" لیوسی نے خیال ظاہر کیا۔ "تم بھول گئے کہ میں نے تو ان کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی!"

"گویا عمل میری ہی تجویز پر کیا گیا مگر اپنی افسری کی شان دکھانے کے لیے اس وقت یہ اعتراف نہ کیا کہ میں نے انھیں نیک مشورہ دیا ہے!"

"بہرحال جو بھی ہو۔ ہاں ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی ہوا، اب مجرم کیٹی کو رہا کر دیں گے کیوں کہ ان کا مطالبہ پورا کیا جا چکا ہے۔" لیوسی نے اپنی دانست میں خیال آرائی کی۔

میں لیوسی کی بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔ "یہ بھی تم نے خوب کہی! ارے رہا کر دیں گے کہ رہا کر دیا!"

"کیا مطلب؟" لیوسی حیرت سے بولی۔ "تم اس قدر یقین کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟"

"ہم تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور پورے یقین کے ساتھ! اگر میری بات غلط ثابت ہو تو جو چور کی سزا، وہ میری! جا کر پوچھ لو اپنے اس بوڑھے گدھے سے کہ اس کی جورو اسے وصول ہو گئی یا نہیں! سچ تو یہ ہے کہ نہ میں مجرموں کا مطالبہ پورا کرنے کا مشورہ دیتا اور نہ کیٹی زندہ سلامت لوٹ کر آتی۔ اگر ایمان داری سے فیصلہ کیا جائے تو یہ کارنامہ بھی میرا ہی ہے۔"

ابھی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ تیواڑی جی کا اردلی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بتایا، تیواڑی جی مجھے اور لیوسی کو بلا رہے ہیں۔ پتا نہیں، تیواڑی جی کو کہاں سے یہ ہوا لگ گئی تھی کہ میں دفتر پہنچ گیا ہوں اور لیوسی سے "غپ سڑاقا" کر رہا ہوں۔

"تشریف لے چلیے جنابِ والا!" لیوسی اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"ہاں چلنا تو پڑے گا۔" میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تیواڑی جی کا اردلی پیغام دے کر جا چکا تھا۔

"اب کہو، پہلے تمھیں تیواڑی جی کو سب کچھ بتانا پڑے گا، پھر یہی کہانی سر تھامسن کے سامنے دہرانا پڑے گی۔ مجھے کچھ بتاتے ہوئے بہت نخرے کر رہے تھے! اب دیکھوں گی، تیواڑی جی کو تم کیسے نہیں بتاتے!"

"ہرگز نہیں!" میں پُرزور لہجے میں بولا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تیواڑی جی سے کہوں گا کہ اگر انھیں کچھ معلوم کرنا ہے تو سر تھامسن کے کمرے میں چلیں، میرا بیان وہاں جاری ہوگا۔"

"چلو تو سہی، سب پتا چل جائے گا!" لیوسی چڑانے والے انداز میں بولی۔ "جب تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں حرکت میں آئیں گی اور ان پر تمھاری نظر پڑے گی تو ساری اکڑفوں دھری رہ جائے گی۔"

یہی نوک جھونک کرتے ہوئے ہم کمرے سے باہر آگئے، پھر ہم تیواڑی جی کے کمرے کی طرف چل دیے۔

ابھی ہم تیواڑی جی کے کمرے تک پہنچے ہی تھے کہ دیکھا، تیواڑی جی باہر آ رہے ہیں۔ وہ جلدی میں دکھائی دے رہے تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی انھوں نے کہا، "تم دونوں میرے کمرے میں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلے گئے۔

میں اور لیوسی حکم کے مطابق تیواڑی جی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد خلافِ توقع تیواڑی جی کی بجائے کمرے کا دروازہ کھول کر چچا بندو خاں نے اندر جھانکا۔ میں نے ان پر نظر پڑتے ہی سلام جھاڑ دیا۔ ان کے چہرے پر اس وقت کچھ فکرمندی کے سے آثار نظر آ رہے تھے۔ سلام کا جواب دے کر انھوں نے سر تھامسن کا پیغام دیا کہ ہم دونوں کو بلایا گیا ہے۔

"آپ چلیں چچا، ہم ابھی آئے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، صاحب کا حکم ہے کہ میں تم دونوں کو اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں۔" چچا بندو خاں، لیوسی کو [illegible] گھورتے ہوئے بولے۔

اب میں ان کی فکرمندی کا سبب سمجھ گیا تھا۔ وہ شاید مجھے کمرے میں لیوسی کے ساتھ تنہائی میں دیکھ کر فکرمند ہو گئے تھے اور یہ ساتھ ہی لے جانے والا چکر بھی انھوں نے اسی لیے چلایا تھا۔

اس دوران میں لیوسی بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیوسی اور میں، چچا بندو خاں کے ساتھ ہی کمرے سے نکلے۔

سر تھامسن کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیٹی میری داستان کا کم از کم نصف حصہ اپنے شوہرِ نام دار کو سنا چکی ہوگی۔

اس خیال سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ میں مجرموں کے چنگل میں کس طرح جا پھنسا تھا، وہاں تک کی داستان کیٹی کو سنا چکا تھا، یعنی سنگ میتی! پھر بھی میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ ابھی میری داستان کا ڈرامائی حصہ باقی ہے جسے سنا کر میں سب کو دنگ کیے بغیر نہیں مانوں گا۔

چچا بندو خاں نے مجھے اور لیوسی کو فوراً ہی اندر بھیج دیا۔ تیواڑی جی وہاں موجود تھے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ سر تھامسن مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے لیوسی کو اور مجھے اپنے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر جب ہم دونوں بیٹھ گئے تو انھوں نے چھوٹتے ہی براہِ راست مجھ سے سوال کیا، "اے ڈی! تم کب اور کس طرح ان کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب ہوئے؟"

اس سوال کا واضح مطلب یہی تھا کہ انھیں ان کی جورو میرے قید ہونے تک کی داستان سنا چکی ہے۔

"بس کچھ نہ پوچھیے سر! اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو زندگی بھر ان کی قید سے نہ نکل پاتا۔" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہاں کچھ اندازہ مجھے بھی ہے۔ اگر مجرم وہی ہیں جن کے متعلق مجھے شبہ ہے تو واقعی کوئی شخص ان کی قید میں پہنچ کر زندہ نہیں نکل سکتا۔" سر تھامسن نے سر ہلا کر میری تائید میں کہا۔

"آپ کی بیوی تو گھر پہنچ ہی گئی ہوں گی؟" میں نے بات کو آگے بڑھانے سے پہلے سوال کیا۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس عرصے میں مجھے کوئی اولوالعزم داستان گھڑنے میں آسانی ہو جائے۔

"ہاں کیٹی آگئی ہے اور اسی سے میں نے تمھارے قید ہونے تک کی داستان سن لی ہے۔" سر تھامسن نے کہا۔ "ویسے یہ حقیقت ہے، اگر تم اس کتے کا تعاقب نہ کرتے یا تمھاری نظر بھی اس پر نہ پڑی ہوتی تو یہ معما کبھی حل نہ ہوتا کہ فائل کہاں اور کیسے غائب ہو گئی لیکن اے ڈی، تم نے کسی اور کو اس طرف متوجہ کیوں نہ کیا؟ اس کتے کو گھیرنا یا اس سے فائل چھین لینا واقعی مشکل نہ ہوتا۔ یہ کام تو میں تنہا بھی کر سکتا تھا مگر اصل مسئلہ مجرموں تک پہنچنا تھا۔ میں نے اسی لیے کتے کو پکڑنے یا اس سے فائل چھیننے کی بجائے اس کا تعاقب کیا تاکہ مجرموں تک پہنچ سکوں۔ جب وہ کتا ایک وین میں داخل ہوا تو سر، اس وقت بھی مجھے علم تھا کہ وین کے اندر مجرم ہوں گے لیکن یہ جاننے کے باوجود میں اس وین میں گھس گیا تاکہ مجرم مجھ پر حملہ کریں اور پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو جائیں۔" یہ کہہ کر میں سانس لینے کے لیے رکا۔

اسی دوران میں سر تھامسن بول اٹھے، "لیکن اے ڈی، اگر وہ لوگ تمھیں بے ہوش کر کے سڑک ہی پر پھینک جاتے تو؟"

"یہ بھلا کس طرح ممکن تھا سر! مجرم تو ہر قیمت پر مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔" میں پُرزور لہجے میں بولا۔

"کیوں؟"

"اس لیے سر کہ میری ان سے سخت دشمنی چل رہی ہے۔ وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔" میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔

"مگر یہ کام بھی وہ وہیں موقع پر کر سکتے تھے!" سر تھامسن اڑے رہے۔

اب میں چکرا گیا کہ کیا جواب دوں۔ ان کی بات کا سیدھا سا جواب تو یہ تھا کہ رنجیت اپنے آقاؤں سے اجازت لے کر ہی مجھے قتل کرنا چاہتا تھا، ظاہر ہے کہ وہ اسی لیے مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا مگر میں یہ بات بتا کر اتفاقات کے سر سہرا باندھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح میرے کارنامے کی اہمیت کم ہو جاتی اور ہیرو بننے میں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی جو مجھے منظور نہیں تھا۔

"سر!" بالآخر میں بولا۔ "ممکن ہے، وہ لوگ جلدبازی میں بوکھلا گئے ہوں۔ انھیں بہرحال جلد از جلد اس علاقے سے فرار ہونا تھا، پھر وہ مجھے قتل کرنے میں وقت کیسے ضائع کر سکتے تھے! دوسری بات یہ کہ انھیں آپ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کیٹی کے علاوہ ایک اور شکار مل رہا تھا، پھر وہ کس طرح یہ موقع چھوڑ دیتے!"

"لیکن ان کا مطالبہ تو پورا کر دیا گیا تھا، پھر مزید دباؤ کا کیا مطلب؟" سر تھامسن نہ جانے کس جھونک میں یہ سوال کر بیٹھے اس لیے کہ فوراً ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور فوراً ہی بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، اے ڈی! اس وقت تک انھیں خبر ہی کیا ہوگی کہ ان کا مطالبہ پورا کیا جا چکا ہے اور انھیں اس بار بھی دھوکا نہیں دیا گیا!"

"اللہ آپ کے بچوں کو جیتا رکھے، یہ کہی ہے نا آپ نے نو تولے پاؤ رتی کی بات!" میں جوشِ جذبات میں اردو بول گیا۔

سر تھامسن نے آنکھیں نکالیں اور تیواڑی جی کی مونچھیں پھڑپھڑائیں، اسی کے ساتھ تیواڑی جی غرائے، انگریزی میں! "یہ کیا بکواس شروع کر دی تم نے! پتا نہیں تم کس کے سامنے بیٹھے ہو!"

میں اس دوہری یلغار سے گھبرا کر بولا۔ "میں... میں تو دعا دے رہا تھا سر!" یہ جملہ میں نے انگریزی ہی میں کہا تھا۔

"دعا بچوں کو دی جاتی ہے، بڑوں کو نہیں۔" تیواڑی جی نے مجھے جھڑک دیا۔

"تو سر، بڑوں کو کیا بددعا... وہ... مجھے معاف کیجیے گا، یعنی کہ پھر کیا دیتے ہیں؟" میں گڑبڑا کر بولا۔

"تمھارا سر!" تیواڑی جی غصے میں خود اردو بول گئے۔

میری اور تیواڑی جی کی چونچیں نہ جانے کب تک اسی طرح لڑتی رہتیں کہ سر تھامسن نے مداخلت کرنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے کہا، "فضول باتیں چھوڑو! صرف اتنا بتاؤ کہ تم ان کی قید سے کس طرح رہا ہوئے؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے سر! اگر میں [illegible] آپ [illegible] تو شاید
مگر..." میں شیخی میں پھر بےادبی کا مرتکب ہو رہا تھا اس لیے
جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔
"کیا تم ہوش میں رہ کر بات نہیں کر سکتے؟" اس مرتبہ سر تھامسن
نے بھی مجھے ڈانٹ پلا دی۔
اسی وقت میری نگاہ لیوسی کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے
پر زلزلے کے سے آثار تھے، چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں اسے اس
حال میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور اپنے منہ سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔
"تمھیں یہ کیا ہو رہا ہے لیوسی؟ کہیں تمھارے پیٹ میں مروڑ تو
نہیں ہو رہا؟"
میری بات سن کر لیوسی نے بھی بالکل میری طرح اپنے منہ پر
ہاتھ رکھ لیا مگر اس کے باوجود ہلکی سی "ٹی ٹی" نکل گئی۔ اب میں
سمجھا کہ وہ اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی، اس لیے اس
کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
"نکل جاؤ یہاں سے!" سر تھامسن ایک دم ہتھے سے
اکھڑ گئے۔ "دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے!"
سب میں تیواڑی جی بھی شامل تھے۔ سر تھامسن کے حکم کا
مطلب یہی تھا کہ انھیں ہمارے ساتھ وہاں سے "دفع" ہونا تھا مگر
ان کی کم بختی کہ پوچھ بیٹھے۔ "میں بھی سر؟"
"ہاں!" سر تھامسن طیش کے عالم میں بولے۔ "تمھی اس احمق سے
رپورٹ لے کر مجھے تفصیلات سے آگاہ کرو گے!"
"بہت بہتر ہے سر!" تیواڑی جی نے سعادت مندی سے
کہا، پھر مجھے گھورتے ہوئے غرّائے۔ "چلو!" اسی کے ساتھ وہ اٹھ
کھڑے ہوئے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مجھے اپنے ساتھ لے
جا کر ذبح کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میری وجہ سے انھیں اور لیوسی،
دونوں ہی کو خوار ہونا پڑا تھا
ہم تینوں آگے پیچھے سر تھامسن کے کمرے سے نکلے۔ چپا
بندو خاں اس وقت میرے ساتھ تیواڑی جی کو دیکھ کر کچھ نہ بولے۔
چند قدم چلتے ہی تیواڑی جی میری طرف پلٹ کر غرّائے۔ "میں
تمھارا تحریری جواب طلب کروں گا، اس حرکت پر!"
میں کچھ نہ بولا۔ لیوسی اب سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔
"تم اپنے کمرے میں جاؤ، جب ضرورت ہو گی طلب کر لوں گا۔"
تیواڑی جی نے کچھ دور چل کر کچھ دیر بعد ایک راہ داری کی طرف مڑتے
ہوئے لیوسی سے کہا۔ وہ راہ داری سیدھی ان کے کمرے
جاتی تھی۔ پھر تیواڑی جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تم میرے ساتھ
چلو گے!"
مگر مس لیوسی بھی میری داستان سننے کے لیے سخت بے چین
ہے۔ اگر انھیں بھی ساتھ ہی..."
"کوئی ضرورت نہیں!" تیواڑی جی نے میری بات کاٹ دی۔
مجبوراً لیوسی وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور میں
تیواڑی جی کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
اپنے کمرے میں پہنچتے ہی تیواڑی جی مجھ پر برس پڑے۔
"تمھاری احمقانہ حرکت کی وجہ سے مجھے بھی باتیں سننا پڑیں۔ تم
آخر اتنے بےوقوف کیوں ہو!"
"سر! یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" میں آہستہ سے بولا۔
"اچھا، اب بغیر کسی لمبی چوڑی تمہید کے شروع ہو جاؤ۔" انھوں
نے سگریٹ سلگاتے ہوئے مجھے حکم دیا۔
"سر! بغیر تمہید کے تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ ہمارے
ماسٹر صاحب تھے، دیوکی نندن نام تھا ان کا، وہ کہا کرتے تھے کہ جب
بھی کوئی مضمون لکھو یا کوئی بات کرو تو تمہید کا پورا خیال..."
"چوپ!" تیواڑی جی لفظ "چُپ" کو کھینچتے ہوئے
زور سے چلّائے اور میں سہم کر رہ گیا۔
میں بات کرتے ہوئے دانستہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا
تھا تاکہ بات کرتے کرتے گڑبڑا نہ جاؤں۔ میری نظریں نیچی تھیں۔
میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے دونوں ہونٹ سختی سے
بھینچ لیے تھے۔
کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی، پھر تیواڑی جی ہی نے مجھے
مخاطب کیا۔ ان کے لہجے میں سختی اب بھی برقرار تھی۔ "اب اگر تم
نے اِدھر اُدھر کی اڑائی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"
پہلے بھی میری نظر میں آپ سے برا کوئی نہیں۔ میں نے دل
ہی دل میں کہا اور اقرار میں سر ہلا دیا مگر کچھ بولا نہیں۔
"اب کچھ بکو گے بھی یا اسی طرح بیٹھے رہو گے!" کچھ ہی دیر میں
تیواڑی جی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔
"آپ ہی نے تو سر، مجھے چپ رہنے کا حکم دیا تھا۔" میں نے
مُردہ سی آواز میں کہا۔
"میں نے بکواس کرنے کو منع کیا ہے، رپورٹ دینے کے لیے
نہیں۔" تیواڑی جی سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولے۔
"تو پہلے کیوں نہیں کہا تھا!" میں نے معاملے کو سنبھالنے کے لیے
جلدی سے کہا۔ "سر! میں ابھی آپ کو سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔"
"صاحب نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے کہ ان کی مسز کو مجرموں
[illegible] اس کے علاوہ یہ کہ ایک کتا، جو غالباً تربیت یافتہ
تھا، فائل اٹھا کر وہاں سے لے گیا تھا اور تم نے اس کا تعاقب کیا تھا۔
پھر تم مجرموں کے ہتھے چڑھ [illegible] لیکن میں تفصیلات جاننا چاہتا
ہوں [illegible] اس کتے پر کیوں

پڑی؟" تیواڑی جی کا لہجہ پہلے سے کسی قدر بدل گیا تھا۔ اب ان کے
لہجے میں زیادہ سختی نہیں رہی تھی۔
میں سمجھ گیا کہ یہ نرمی انھوں نے مطلب سے اختیار کی ہے۔
یہ سوچ کر میں خوش ہوا اور ترنگ میں آ کر بولا۔ "یہ تو نظر نظر کی بات ہے۔
سر! وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے
اور دیدۂ کور کو کیا آئے نظر..."
"پھر وہی بکواس!" تیواڑی جی نے میز پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ
میں اچھل پڑا۔ "یوں کیوں نہیں کہتے کہ بس اتفاقاً تمھاری نظر اس کتے پر
پڑ گئی!"
تیواڑی جی میرے اچھے بھلے کارنامے کو اتفاق پر ٹرخا رہے تھے
اس لیے میں فوراً احتجاجاً بولا۔ "سر! یہ اتفاق ہرگز نہیں تھا۔"
"پھر اور کیا تھا؟ تھا! سر!" تیواڑی جی جھنجلا کر بولے۔
میں اپنی بات پر اَڑا رہا۔ "سر! اگر یہ اتفاق ہی تھا تو کسی اور
کو بھی وہ کتا اتفاقاً نظر آ سکتا تھا، پھر مجھے ہی کیوں نظر آیا؟"
"اتفاق اسی کو کہتے ہیں۔" تیواڑی جی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم
رہے، پھر بولے۔ "خیر آگے بکو! جب تم ان کی قید میں پہنچ گئے تو کیا
ہوا؟"
"آنکھ کھلی، یعنی جب مجھے ہوش آیا تو کمٹی خانم کی سسکیاں
سنیں۔ میں نے انھیں دلاسا دیا اور کہا کہ اب وہ ہرگز کوئی فکر نہ
کریں، میں انھیں قید سے آزاد کرانے آ پہنچا ہوں۔"
"ان کی رہائی کا سبب تم نہیں ہو۔" تیواڑی جی نے منہ بنا کر
کہا۔ "مجرموں کا مطالبہ پورا کر دیا گیا تھا اس لیے انھوں نے صاحب
کی مسز کو رہا کر دیا۔"
"ہاں، یہ بات اچھی نکل آئی سر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "وہ
فائل تو میری دراز میں تھی، پھر سر تھام... میرا مطلب ہے صاحب جی
کے پاس کس طرح پہنچ گئی؟"
"اوّل تو تم اس قدر احمق ہو کہ اپنی دراز میں تالا ڈال کر نہیں
رکھتے! میں ہی کیا، کوئی بھی بہ آسانی وہاں سے فائل اڑا کر لے جا
سکتا ہے۔ میں اس غیر ذمے داری پر بھی تمھارا تحریری جواب طلب
کر سکتا ہوں کہ اتنی اہم فائل یوں بے پروائی سے رکھی گئی۔ دوسری
بات یہ کہ اگر تمھاری میز کی دراز مقفل بھی ہوتی تو میں اس کا تالا
توڑ سکتا تھا، سمجھے!"
"تو آپ وہ فائل لے گئے تھے!" میں نے طویل سانس لے
کر کہا۔ "مگر کب سر؟"
"میں تمھیں جواب دینے کا پابند نہیں ہوں!" تیواڑی جی
غرّائے۔ "میرے سوال کا جواب دو کہ مجرموں کی قید میں پہنچنے کے بعد
کیا واقعات پیش آئے اور انھوں نے تمھیں کیوں رہا کر دیا؟"
"لو اور سنو! انھوں نے مجھے رہا کر دیا ہے! یہ بھی خوب رہی۔"
میں ہاتھ نچا کر بولا۔ تیواڑی جی تو میرے سارے ارمانوں پر پانی پھیرے
دے رہے تھے۔
"پھر خود ہی بک دو کہ کیا ہوا؟"
"غالباً میں نے ابھی آپ کو صرف اتنا بتایا ہے کہ میں کمٹی خانم کو
تسلی دے رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ بتا دوں سر، صاحب بہادر
کو یہ مشورہ اسی خادم نے دیا تھا کہ مجرموں کا مطالبہ پورا کر دیا جائے،
اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فائل میں موجود کاغذات کی نقلیں تیار
کرائی جا سکتی ہیں۔ صاحب بہادر نے ایسا ہی کیا اور پھر اسی وجہ سے
مجرموں نے ان کی بیوی کو رہا کیا۔ اب آپ ہی ایمان داری سے بتائیں
سر، کہ کیا میرے اہم مشورے ہی کے سبب کمٹی خانم رہا نہیں ہوئیں؟
نہ صاحب میرے مشورے پر عمل کرتے، نہ ان کی بیوی رہا ہوتیں۔"
"یہ کہہ کر کیا تم خود کو عقل مند ثابت کرنا چاہتے ہو!" تیواڑی جی
مجھے گھور کر بولے۔ "تم احمق ہو اور میں تمھیں احمق ہی سمجھتا رہوں گا، سمجھے!"
پھر شاید تیواڑی جی کو خیال آیا کہ میری باتوں میں وہ کبھی پٹری سے
اتر گئے ہیں اسی لیے انھوں نے کہا۔ "میں تم سے کتنی بار کہوں کہ اصل
بات کرو!"
"میں اصل بات ہی تو بتا رہا ہوں سر، مگر آپ میری بات کا یقین
ہی نہیں کرتے۔" میں نے مظلوم لہجے میں کہا، پھر بولا۔ "ہاں تو سر، میں بتا
رہا تھا کہ میری وجہ سے یعنی میرے مشورے کے نتیجے میں آخرِ کار مجرموں
نے کمٹی خانم کو رہا کر دیا۔" یہ کہہ کر میں نے کمٹی کی رہائی کا آنکھوں دیکھا
حال بیان کر دیا۔ اس بیان میں دھوتی بند اور رنجیت کا ذکر بھی آیا۔
تیواڑی جی کے کہنے پر میں نے اس دھوتی بند کا پورا حلیہ بھی بتا دیا۔
"ممکن ہے وہ میک اپ میں رہا ہو۔" تیواڑی جی خود کلامی کے
سے انداز میں بولے، پھر کہا۔ "تو پھر تم اور وہ دھوتی بند وہاں تنہا رہ
گئے اور رنجیت صاحب کی مسز کو وہاں سے لے کر چلا گیا، اس کے بعد
کیا ہوا؟"
"پھر کیا ہونا تھا سر! پھر تو اللہ دے اور بندہ لے!" میں جوش
کے عالم میں بولا۔
"یہ کیا بات ہوئی؟"
"مطلب یہ سر، کہ مجھے جس موقع کا انتظار تھا، وہ مل گیا۔ دھوتی بند
وہاں تنہا رہ گیا۔ میں نے اچانک اس پر چھلانگ لگا دی۔ ظاہر ہے
کہ وہ بھی مجھے آپ کی طرح بےوقوف سمجھ رہا تھا اور اسے توقع نہیں
تھی کہ میں کس قدر بہادر اور ذہین ہوں۔ پھر تو میں نے اس کی رگڑائی
لگا دی۔ کبھی اس کے کلّے پر ڈک تو کبھی اس پر! وہ ایک کلّا سہلاتا
تو میں دوسرا کلّا گھونسا مار کر اس کی جگہ سے سرکا دیتا۔ کئی بار تو اس کی
دھوتی کھل گئی مگر میں نے اسے دھوتی باندھ لینے کا موقع مرحمت دیا۔
ٹھیک کیا نا سر! یہ تو بڑی بُری بات ہے نا سر، کہ اس طرح بےشرمی سے

لڑا جائے۔ لڑائی دوسری بات ہے اور تہذیب و شائستگی اپنی جگہ الگ چیز ہے۔ میری امی مجھے ہمیشہ تہذیب کا سبق دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ...“

”بس!“ تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ”اپنی امی کا ذکر نہ کرو!“

”کیوں سر؟ میری امی اچھی ہیں۔“ میں بولا۔

”تو ہوا کریں۔“ تیواڑی جی نے جھنجلا کر کہا۔ ”مجھے اس ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ تمھیں کیا سبق دیتی ہیں!“

”میں تو آپ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا تھا سر! اس طرح ایک آدھ نیک بات آپ کے کانوں میں بھی پڑ جاتی۔“

”الو کے پٹھے!“ تیواڑی جی چیخ اٹھے۔ ”میں بدتمیزی پسند نہیں کرتا۔“

”بالکل پسند نہیں کرنا چاہیے سر! مگر میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”ادھر دیکھو!“ تیواڑی جی پھنکارے۔

انھیں نہ جانے کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں ان کی مونچھوں اور آنکھوں سے ڈرتا ہوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی۔

”اپنی بکواس بند نہیں کرو گے؟“ تیواڑی جی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مونچھیں پھڑپھڑائیں اور میں واقعی دہل گیا۔

”قطعی بند کر دوں گا سر! بالکل!“ میں نے انھیں یقین دلایا۔

”تو پھر بقیہ واقعات بیان کرو۔“ انھوں نے حکم دیا۔

”جی ہاں... میں نظریں جھکا لوں سر؟“ میں سہم کر بولا۔ انھوں نے اجازت دے دی اور میری جان میں جان آگئی۔ پھر ان کے حکم پر میں نے اپنی داستان دوبارہ شروع کی: ”ناشتے کے دوران میں نے اس کا پستول نکال دیا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل کر بھاگا۔ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو خالی تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی مجھے کھلا ہوا ملا۔ اس کمرے سے نکلتے ہی مجھے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں نظر آئیں۔ میں چڑھتا چلا گیا۔ زینے کے اختتام پر ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا جس سے گزر کر میں ایک مسہری کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ ہائے سر! کیا بتاؤں کہ وہ نوخیز و نوعمر حسینہ کتنی خوب صورت تھی! بس یوں سمجھ لیں جیسے کوئی جنت کی حور مسہری پر سو رہی تھی۔ مجھ پر ایک سحر طاری ہو گیا اور میرے قدم جیسے جم کر رہ گئے۔ ابھی میں اس حسینہ کا شربت دیدار پی رہا تھا کہ ایک دیو ہیکل شخص خواب گاہ کے دوسرے دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے للکارا۔ بس پھر کیا تھا! اس نوخیز حسینہ کی خواب گاہ میدان جنگ بن گئی۔ کچھ ہی دیر کے اندر اس دیو ہیکل کو بھی میں نے پچھاڑ لیا۔ اس دوران میں وہ حسینہ جاگ اٹھی تھی اور اپنی مدد کے لیے نہ جانے کسے پکارنے لگی تھی حالانکہ اس حسینہ کے ہاتھ تو کیا میں نے انگلی بھی نہیں چھلائی تھی۔ اس حسینہ کو مدد کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس دیو ہیکل کو مدد درکار تھی جس کے سینے پر میں چڑھا بیٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہاں چار افراد دوڑتے ہوئے آ گئے۔ اب ان کی تعداد حسینہ سمیت چھ ہو گئی تھی اور میں اکیلا تھا۔ میں چاہتا تو ان سب کو گنتی کا یا کسی اور طرح کا ناچ نچا سکتا تھا مگر میں نے سوچا کہ کہیں ان میں سے کوئی میرے ہاتھوں مر مرا نہ جائے۔ یہ سوچ کر میں نے وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ میں دیو ہیکل کے سینے سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر سرپٹ دروازے کی طرف بھاگا۔ وہ سب بھی میرے تعاقب میں بھاگے مگر میں بھلا ان کے ہاتھ کیسے لگتا۔ میں نے انھیں میلوں پیچھے چھوڑ دیا اور اپنے گھر پہنچ کر اطمینان سے سو گیا۔“ میں نے اپنی داستان سنا کر طویل سانس لیا اور بولا۔ ”میری جگہ آپ بھی ہوتے سر تو اس قدر دھینگا مشتی کے بعد سونے ہی کو ترجیح دیتے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں سر؟“

”وہ مکان کس محلے میں تھا؟“ تیواڑی جی نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

اپنی داستان سناتے ہوئے مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ تیواڑی جی کوئی ایسا سوال بھی کر سکتے ہیں اس لیے میرا سٹپٹا جانا فطری تھا۔ میں خاموش رہا تو تیواڑی جی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کوئی قریبی آبادی بتانا چاہیے، ایسی آبادی جہاں سے میں پاپیادہ بہ آسانی گھر پہنچ سکتا۔

”یہی تو ناراں تھا سر!“ میں نے آخر جواب دیا پھر سنبھل کر بولا۔ ”مگر وہ رات کا وقت تھا اور میں پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خطرناک افراد میرے تعاقب میں تھے۔ مجھے ان کو بھی جل دینا تھا۔ یہی سبب ہے سر! مجھے یہ موقع نہیں مل سکا کہ اس مکان کو یاد رکھ سکتا۔“

”یعنی اب تم اس مکان کی نشان دہی نہیں کر سکتے؟“ تیواڑی جی نے دریافت کیا۔

”جی... جی نہیں سر!“ میں نے ہکلا کر جواب دیا کیوں کہ میرے دل میں چور تھا اور مجھے ابھی جھوٹ بولنے کی زیادہ مشق نہیں ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ، ضرورت ہوگی تو طلب کر لوں گا۔“ یہ کہہ کر تیواڑی جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

مجھے یاد آیا کہ آج ہی تو مجھے استعفے کی بات بھی کرنا ہے، یہ سوچ کر میں نے کہا: ”سر! مجھے آپ سے ایک اور ضروری بات بھی کرنا ہے۔“

”میں ڈی جی صاحب کے پاس جا رہا ہوں، اس وقت!“ تیواڑی جی بولے۔ ”تم کچھ دیر بعد آ جانا۔“

”ٹھیک ہے سر!“ میں بھی یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت وہ کچھ نہیں سنیں گے۔ اس وقت تو انھیں مجھ سے جو کچھ معلوم ہوا ہے، سر تھامسن کو بتانے جا رہے ہوں گے۔

پھر میں تیواڑی جی کے ساتھ ساتھ ہی ان کے کمرے سے نکلا۔ کچھ دور چل کر میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ میں آج اپنا کارنامہ بیان کر کے کچھ زیادہ خوش نہ ہو سکا تھا کیوں کہ مجھ پر داد و تحسین کے ڈونگرے نہیں

برسائے گئے تھے۔ سر تھامسن نے تو مجھے اپنے کمرے ہی سے نکال دیا تھا اور اس چکر میں تیواڑی جی بھی نکالے گئے تھے۔ نتیجتاً وہ میری داستان سننے سے پہلے ہی بکے ہوئے تھے۔ ماحول ہی ایسا ہو گیا تھا کہ میرے ہیرو ہونے کو قطعی محسوس نہیں کیا گیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آج اس دفتر میں میرا آخری دن ہے اس لیے سرکاری لباس اتار کر اپنا لباس پہن لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں میک اپ روم کی طرف مڑ گیا۔

میک اپ روم میں شیروانی اتارنے سے پہلے میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے پیسے نکالے اور انھی کے ساتھ تہ کیے ہوئے دو پرچے میرے ہاتھ میں آ گئے۔ میں نے انھیں کھول کر دیکھا اور کھولتے ہوئے سوچا کہ یہ میری جیب میں کہاں سے آ گئے؟ دونوں پرچے ایک ساتھ تہ کیے ہوئے تھے۔ پہلا پرچہ پڑھ کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ اس پرچے پر ایک مختصر سا پیغام درج تھا۔

شیکھر!

جلد ہی تمھیں دوسری ہدایات ملیں گی۔ فی الحال تمھیں چوکنا رہنا ہے۔ تمھارے ایک ساتھی انسپکٹر وسیم کو تم پر شبہ ہو گیا ہے۔

مادام

پھر میں نے دوسرا پرچہ کھول کر دیکھا۔ اس پرچے پر سفید و سیاہ [illegible] بنے ہوئے تھے جن میں نمبر لکھے ہوئے تھے اور ان پر پانچ پانچ لکھے گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ ان نمبروں اور پانسوں کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اپنا لباس تبدیل کر کے وہ دونوں پرچے بھی اپنے پاس رکھ لیے۔

جب میں میک اپ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو عجیب سے ہیجان میں مبتلا تھا۔ شیکھر وہی بدشکل شخص تھا، جس نے ایک بار میرے سامنے لیوسی کا راستہ روک لیا تھا۔ لیوسی کا عاشق! وہ پہلے لیوسی کی ماتحتی میں تھا اور اب پولیٹیکل برانچ میں اس کا تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ مادام نے اسے پیغام بھیجا تھا، اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ مادام کے ہاتھوں بکا ہوا تھا، گویا سرکار سے غداری کر رہا تھا۔ نہ جانے مادام اس سے کیا کام لے رہی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ہو گا کچھ، مجھے کیا! میں نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکنا چاہا۔

میں تو خود آج یہ ذلیل نوکری چھوڑنے والا ہوں، مجھے کیا پڑی ہے جو شیکھر کے بارے میں کسی کو کچھ بتاؤں! میں نے سوچا۔

کمرے میں اس وقت میرے سبھی ماتحت موجود تھے۔ انھوں نے کورس میں مجھے سلام کیا اور میں جواب دیتا ہوا اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اس سے پہلے استعفیٰ دینے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ استعفیٰ کس طرح دیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ میں لاڈلا تا رہتا تھا مگر یہ بھی سمجھتا کہ وہ بے ذہین! میں نے اسی لیے اس سلسلے میں اس سے مشورہ لینا بہتر سمجھا مگر اسی وقت خیال آیا کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ بہت فورٹونٹی بھی ہے۔ وہ مجھے غلط مشورہ بھی دے سکتا ہے جیسا کہ ایک بار چھٹی کی درخواست کے سلسلے میں ہوا تھا۔ پھر میرے ذہن میں پیارے لال ہنر کا نام آیا۔ وہ ادھیڑ عمر اور تجربہ کار آدمی ہے۔ اس سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی ہی تھی کہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا، وہ بول اٹھا: ”ہنگامہ ڈالا تمہارا! اغلب امکان ہے کہ حضور کے ذہن رسا سے مشاعرے کا خیال محو ہو گیا ہے اس لیے خادم یاد دہانی کرانا اپنا فرض تصور کرتا ہے۔“

”اس وقت مشاعرے کا ذکر چھوڑو، مجھے تم سے ایک ضروری اور اہم مسئلے پر...“

”نہیں حضور! یہ نہ کہیے! حضور کا خادم تو سودائی ہو جائے گا۔“ پیارے لال ہنر میری بات کاٹ کر بولا۔ ”حضور ہی تو مسند صدارت پر رونق افروز ہوں گے۔ خادم تمام شعرائے کرام کو دعوت نامے بھی تقسیم کر چکا ہے۔ ہائے ہائے حضور! اگر آپ تشریف نہ لے گئے تو غریب خانے پر تو قیامت ٹوٹ پڑے گی! [illegible]“

”ارے پہلے تم میری بات تو سن لو، مشاعرے کی بات بعد میں کر لیں گے۔“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”نہیں حضور انور! خادم یوں بہلاوؤں میں آنے والا نہیں، پہلے سرکار ہامی بھریں۔“ وہ اپنی بات پر اڑ گیا۔

”عجیب آدمی ہو تم!“ میں جھنجلا کر بولا۔ ”سن ہی نہیں رہے میری بات! بس اپنی ہانکے چلے جا رہے ہو۔“ یہ کہہ کر غصے ہی میں میں نے اسے بتا دیا کہ نوکری سے استعفیٰ دے رہا ہوں اور اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، استعفیٰ کس طرح دیا جاتا ہے۔

پیارے لال ہنر میری بات سن کر جیسے سکتے میں رہ گیا، پھر دانت نکال کر غیر یقینی سے لہجے میں بولا: ”نہیں حضور! کیوں اس خادم کے جذبات سے کھیل رہے ہیں! حضور کا فراق بھلا کیسے برداشت ہو گا! حضور غالباً ازرہ تفنن طبع ایسا فرما رہے ہیں۔ غالباً اس طرح حضور والا کو اپنے خادموں کی چاہت کا امتحان مقصود ہو گا۔“

پتا نہیں، پیارے لال ہنر کیا کیا کہے جا رہا تھا، اپنی جناتی زبان میں! مگر مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔

”تمھیں علم ہو تو بتا دو، استعفیٰ کیسے دیا جاتا ہے ورنہ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھو۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"سر! انھیں کیا پتا ہوگا، مجھ سے پوچھیں آپ!" کمار بہ آوازِ بلند بولا۔

"چلو تمھی بتا دو۔" میں رَو میں کہہ گیا۔ "مقصد تو معلوم کرنے سے ہے، کوئی بھی بتا سکتا ہے۔"

"آپ کو خبر ہوگی سر کہ طلاق دینے کے لیے، تین بار آپ لوگوں کے یہاں طلاق، طلاق، طلاق کہا جاتا ہے۔" کمار بولا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو بس نوکری کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ آپ ڈی آئی جی صاحب کے پاس جا کر تین بار استعفیٰ، استعفیٰ، استعفیٰ کہہ دیں، بس استعفیٰ ہوگیا۔" کمار نے بتایا۔

"ارے بس اتنی سی بات تھی۔" میں طویل سانس لے کر بولا۔ "میں تو ابھی اُن کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں۔ اگر مجھے پہلے خبر ہوتی تو اسی وقت استعفیٰ دے آتا۔ اس میں دیر ہی کتنی لگتی!" پھر میں جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔ "ویسے تم لوگوں کو میں ایک بات بتا دوں، مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی۔ میں تو تم لوگوں کا امتحان لے رہا تھا۔"

"بالکل، بالکل سر! آپ کو کیا معلوم نہیں! آپ بہت قابل ہیں، بس ذرا صورت ہی سے۔۔۔" کمار نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"صورت ہی سے کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں نکالیں تاکہ وہ مزید بکواس شروع نہ کر دے۔

اس سے پہلے کہ کمار کچھ کہتا، پیارے لال ہنر اس کی طرف مُڑ کر بولا۔ "برخوردار! ہر وقت کی یا وہ گوئی مناسب نہیں ہوتی۔ یوں بھی تخصیص من وتُو لازم ہے۔ بہرحال حضور ہمارے افسر ہیں۔"

"دیکھ لیجیے سر! پیارے لال ہنر مجھے آپ ہی کے سامنے گالیاں دیے جا رہے ہیں۔" کمار فریادی لہجے میں بولا۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اور کمار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے پیارے لال ہنر کو گھور کر دیکھا۔ "کیوں جی، تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے!"

"قبلہ وکعبہ! یہ سراسر بہتان ہے اس ایچ عبارت پر! اس کی زبان سے ایسے ناشائستہ و نازیبا کلمات نکل ہی نہیں سکتے۔" پیارے لال ہنر پُرزور لہجے میں بولا۔ "میں تو حضور کی خاطر عرض کر رہا تھا۔۔۔"

"بس بس!" میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "مجھے مزید کچھ نہیں سننا، جاؤ اپنی کرسی پر بیٹھو۔"

"جیسا حضور فرمائیں، خادم تو۔۔۔" پیارے لال ہنر بڑبڑاتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنی کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ لیوسی کمرے میں داخل ہوئی اور قریب آ کر شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "میں وہاں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تمھارا انتظار کر رہی تھی اور تم یہاں بیٹھے ہوا۔"

"کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے اس سوال پر کچھ گڑبڑ سی ہوگئی، پھر اپنی شرمندگی مٹانے کی خاطر بولی۔ "تمھی نے تو آنے کے لیے کہا تھا۔"

"خیر مجھے تو یاد نہیں مگر تم کہہ رہی ہو تو کہا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "چلو، اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ویسے مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں تیواڑی جی سے آج ہی ملنا ہے۔"

"ابھی تو کافی وقت ہے، مل لینا۔" لیوسی میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ "کیا ضروری کام ہے تمھیں اُن سے؟"

"استعفیٰ دینا ہے سر کو!" کمار نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"کیا؟" لیوسی نے چلتے چلتے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ اب میرے کمرے کے دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ "کیا کمار نے صحیح کہا ہے؟"

"ہاں، مجھے نئی نوکری مل گئی ہے۔" میں نے تصدیق کی۔ "اور اتنے ہی روپے پلس!"

"کب اور کہاں؟ پھر یہ کہ ضروری نہیں، تم نوکری چھوڑ ہی دو جب کہ پیسے بھی اتنے ہی ملیں گے۔"

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے اب کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ اس کی بات سن کر میں جل ہی تو گیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "اور یہ جو ہر وقت جان سولی پر لٹکی رہتی ہے، یہ کچھ نہیں۔ بس پیسوں کو دیکھ رہی ہو تم تو! ویسے بڑی ہمدردی جتاتی ہو مجھ سے! ہمدردی ہی نہیں، عشق بھی جھاڑنے لگتی ہو مگر میری جان کی ذرا پروا نہیں تمھیں!"

"اچھا تو یہ بات ہے!" لیوسی عجیب سے لہجے میں بولی۔ "موت سے ڈرتے ہو تم!"

"ہاں ڈرتا ہوں! تم کون ہوتی ہو کہنے والی؟" میں واقعی غصے میں آ گیا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم! میں کون ہوتی ہوں تمھاری!" وہ ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولی اور مجھے اس پر رحم آ گیا۔

"میں تو کہہ چکا ہوں، کچھ ہو جاؤ میری! مگر تم مانتی ہو! بس اسی پر اڑی ہوئی ہو کہ دوسری بیوی نہیں بنو گی۔" میں نے کسی قدر نرمی سے کہا۔

"دیکھو ننھے دتا! ہر وقت کسی کے جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔" وہ بھاری سے لہجے میں بولی۔ "دل بڑی نازک شے ہوتی ہے۔"

"بھئی میں نے کب کہا ہے نازک نہیں ہوتی۔ ویسے دل کے لیے ہوتی عجیب سا لفظ ہے۔ دل ہوتی نہیں بلکہ ہوتا ہونا چاہیے۔"

میں نے اپنی قابلیت کا اظہار ضروری سمجھا۔

"میں نے یہ کہا تمھارے ہوتی ہے، ہوتا نہیں۔" لیوسی بولی، پھر کہا۔ "خیر ان باتوں کو چھوڑو اور سنجیدگی سے بتاؤ، کیا تم واقعی استعفیٰ دے رہے ہو؟"

"اور کیا بے واقعی!" میں بولا۔ "چاہے آدمی کو دال روٹی مل جائے مگر ملے چین سے! میں تو اس کا قائل ہوں۔"

"تم مجھے کچھ نہیں بتا رہے، اس کی کوئی وجہ ہے؟" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے تھے۔

"ارے بتا تو چکا ہوں، وجہ! اور کیسے بتاؤں!" میں نے چڑ کر کہا۔

میری بات سن کر اس کا منہ بن گیا۔ "نہ بتاؤ۔" اس نے اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم محض مذاق کر رہے ہو۔ میں اتنے عرصے میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں، تمھاری کوئی بات بے مقصد نہیں ہوتی۔"

پھر میں نے لیوسی کے کہنے پر وہی داستان اُسے بھی سنا دی جو تیواڑی جی کو سنا چکا تھا اور اس بار مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے خود کو لیوسی کے سامنے بالکل ہیرو محسوس کیا۔ وہ بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

"اگر تم ہوتیں میری جگہ تو وہ لوگ چٹنی بنا دیتے تمھیں!" میں نے اپنی داستان کے آخر میں کہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا ذرا استعفیٰ کہہ آؤں تیواڑی جی سے!"

"کہہ آؤں!" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں، بس ابھی آیا کہہ کر! یہ ٹنٹا کٹ ہی جائے تو اچھا ہے۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی میں، تیواڑی جی کے کمرے میں اُن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاں کہو، کیا ضروری بات کہنا چاہتے تھے؟" تیواڑی جی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"استعفیٰ، استعفیٰ، استعفیٰ!" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ تین بار کہہ دیا۔

"کیسا استعفیٰ؟ کیا مطلب ہے تمھارا؟" تیواڑی جی سخت لہجے میں بولے۔

"لو اور سنو! اب بھی مطلب رہ گیا!" میں نے کہا۔ "بس میری مرضی، دے دیا میں نے استعفیٰ! اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، میں تین بار استعفیٰ کہہ چکا ہوں۔"

"کیا تمھارا دماغ چل گیا ہے؟"

"جی نہیں سر!" میں نے گویا ان کے خیال کی تردید کر دی۔

"پھر یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" وہ غصے کے سبب اپنی نوکیلی مونچھوں کو حرکت میں لے آئے۔

"بات یہ ہے سر کہ مجھے نئی نوکری مل گئی ہے اس لیے میں نے یہ نوکری چھوڑ دی ہے۔" میں نے بتایا۔

"ابھی تم نے کہاں چھوڑی ہے نوکری! پھر یہ کہ ضروری تو نہیں، تم اگر استعفیٰ دے دو تو منظور کر لیا جائے۔"

"دے بھی دو کا کیا مطلب سر! میں تو دے چکا ہوں استعفیٰ!" میں روہانسے لہجے میں بولا۔

"کیا تم ڈی جی صاحب کو استعفیٰ دے کر آئے ہو؟"

"انھیں کیوں دیتا، آپ ہی کو دیا ہے، ابھی کچھ دیر پہلے! کیا پھر تین بار کہوں؟"

"اچھا تو تم تین بار استعفیٰ کہنے کا مطلب، استعفیٰ دینا سمجھے ہو!" وہ ہنستے ہوئے لہجے میں بولے۔

"اور کیا سر! اس طرح تو استعفیٰ دیتے ہیں اور طلاق بھی اسی طرح دیتے ہیں، مجھے سب پتا ہے۔"

"کیوں نہیں، تمھیں پتا نہ ہوگا تو کیا مجھے ہوگا!" اُن کے لہجے میں اب بھی چبھن تھی۔ "ویسے یہ بتاؤ کہ تم استعفیٰ کیوں دے رہے ہو؟"

"دے نہیں رہا سر، دے چکا ہوں۔" میں اپنی بات پر اَڑا رہا۔

"چلو یہی سہی!" وہ بولے۔ "کیوں دیا ہے تم نے استعفیٰ؟"

"ایک بات تو یہ ہے سر کہ مجھے یہ نوکری کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، نہ جانے کب دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹ جائے۔" میں نے سچ بات کہہ دی، یہ سوچ کر کہ اب تو نوکری چھوڑ ہی چکا ہوں اس لیے سچ بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر میں نے کہا۔ "دوسری بات یہ ہے سر، کہ اتنی ہی تنخواہ پہ مجھے نئی نوکری مل گئی ہے۔"

"تمھیں ڈر لگتا ہے اسی لیے بہ یک وقت چار چار چھ چھ آدمیوں کے قبضے میں نہیں آتے، کیوں!" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔

"وہ تو سر، وقت وقت کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ویسے تم جیسے احمق کو نوکر کس نے رکھ لیا اور کون اتنے پیسے دینے پر آمادہ ہوگیا؟"

"بس ہے کوئی سر!"

"ہوں!" انھوں نے ہنکارا بھرا۔ "کام کیا ہے؟"

"مخبری۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اُن کے لیے مخبری کروں گا۔"

"کس کی مخبری کرو گے تم؟" تیواڑی جی نے ماتھے پر بل ڈال

کر کہا۔

"یہ تو وہی لوگ بتائیں گے۔" میں بولا۔

"کون لوگ؟"

"بس ہیں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں، کون ہیں وہ لوگ؟" تیواڑی جی سخت لہجے اور بلند آواز میں بولے۔

ایسے میں بدقسمتی ہی کہوں گا کہ میری نظریں ان سے مل گئیں۔ ایک تو ان کی سرخ سرخ گھورتی ہوئی آنکھیں، دوسرے پھڑکتی ہوئی مونچھیں، ایسے میں اگر میری زبان سے سچ بات نکل گئی تو کوئی تعجب نہیں۔ میں نے بتا دیا۔ "وہ... وہ مادام نے مجھے نوکر رکھ لیا ہے، خبریں لانے لے جانے پر!"

"کون مادام؟"

"انھیں رنجیت بھی مادام کہتا ہے، مجھے ان کا نام نہیں معلوم۔"

پھر کرید کرید کر تیواڑی جی نے مجھ سے ساری باتیں معلوم کر لیں اور آخر میں دہاڑے۔ "تو تم مجرموں کے آلۂ کار بن گئے ہو!"

"نن... نہیں تو سر!" میں ہکلایا۔

"نہیں سر کیا! تم ابھی اعتراف کر چکے ہو۔" تیواڑی جی پرجوش لہجے میں بولے۔

اب مجھے پوری طرح اپنی حماقت کا احساس ہو چکا تھا کہ تیواڑی جی کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتانا چاہیے تھا مگر اب تو جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ پتا نہیں مجرموں کا آلۂ کار بننے کی کیا سزا ہوگی، یہ سوچ کر مجھ پر خوف طاری ہونے لگا۔



میں کسی ایسے خوف زدہ چوہے کی طرح تیواڑی جی کے سامنے بیٹھا تھا جو گھبراہٹ میں اپنے بل کا راستہ بھول گیا ہو اور خوف ناک بلی کی مونچھیں اس کے جسم سے مس ہو رہی ہوں۔

"استعفیٰ دینے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ تمھیں برخاست کیا جائے گا، سمجھے!" تیواڑی جی غرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "چلو میرے ساتھ!" انھوں نے حکم دیا۔

"کہاں سر؟" میں نے مردہ سی آواز میں پوچھا اور تھرتھرا کر جبراً کرسی سے اٹھا۔

"ڈی جی صاحب کے پاس اور کہاں! انھی کی وجہ سے تو تم اتنے دن اس محکمے میں ٹکے رہے ورنہ میں تمھیں کبھی کا نکال دیتا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھے، پھر بولے۔ "مگر اب تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود لی ہے۔ ممکن ہے تمھیں سزا بھی ہو جائے۔"

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور ان کے پیچھے اس طرح چلنے لگا جیسے قسائی کے پیچھے گائے۔

کچھ دیر بعد میں سر تھامسن کے کمرے میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ تیواڑی جی، سر تھامسن کو سب کچھ بتا چکے تھے۔ کمرے میں اب بوجھل سی خاموشی تھی۔ خلاف توقع سر تھامسن سب کچھ سننے کے بعد خاموشی سے کچھ سوچنے لگے تھے۔ پھر جب کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد بولے تو ان کی آواز بہت پُرسکون تھی۔

انھوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ میرے لیے واقعی بہت عجیب اور حیرت انگیز تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بس اب چڑھایا گیا میں سولی پر لیکن صورتِ حال تو قطعی مختلف نظر آئی تھی۔

"اے ڈی! تمھارا منصوبہ بہت شان دار ہے۔" سر تھامسن نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے استعفیٰ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے غالباً تمھارا مقصد مجرموں کو اعتماد میں لینا ہوگا مگر شاید تم یہ بھول گئے کہ مجرموں کی نظر میں تمھاری اہمیت اسی وقت تک ہے جب تک تم اس محکمے سے وابستہ ہو۔ تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ اس طرح وہ تمھیں اپنے گروہ میں شامل کر لیں گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔ یوں بھی انھوں نے فی الحال تم سے اس غرض سے سودا بازی کی ہے کہ محکمے کے راز ان تک پہنچاتے رہو۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر مجرموں پر بہت آسانی سے ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔"

سر تھامسن کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو میرے کئی طبق بہ یک وقت روشن ہو گئے۔ میں اب سمجھا کہ مجرموں نے میرے ساتھ کیا فراڈ کیا تھا۔ اچھا تو اس کو کہتے ہیں مخبر! واہ بیٹا دھوتی بندا! تُو بھی مجھے بالکل بے وقوف ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے سوچا، پھر دل ہی دل میں باللہ تبارک تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے نہ جانے کیسے سر تھامسن کے بھیجے میں یہ بات ڈال دی تھی کہ مجھ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا، مجرموں نے مجھے بے وقوف نہیں بنایا بلکہ میں انھیں بے وقوف بنا کر چلا آیا ہوں اور جو کچھ ہوا تھا، وہ میں نے دانستہ کیا تھا۔

"تیواڑی! تمھارا کیا خیال ہے، اے ڈی کے ذریعے مجرموں کو غلط راہ پر ڈالا جا سکتا ہے؟" سر تھامسن آخر کار دوبارہ بولے۔

تیواڑی جی، سر تھامسن کی بات سن کر خود حیران سے بیٹھے تھے۔ وہ بھی شاید میری طرح یہی سمجھ رہے تھے کہ اب ہوگی مجھ پر گولہ باری! اسی لیے سر تھامسن کے سوال کرنے پر وہ کچھ گڑبڑا سے گئے اور بولے۔ "ٹھیک... آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں سر!"

"مگر تمھارا لہجہ شکایتی کیوں تھا اور تم خود اس نتیجے پر کیوں نہیں پہنچے؟" سر تھامسن کا انداز جواب طلبی کا سا تھا۔

"لیکن سر! اللہ دتہ نے پہلے تو کچھ اور ہی داستان سنائی تھی۔ یا تو وہ داستان جھوٹ تھی یا اب اس نے جو کچھ بتایا ہے، غلط ہے۔" تیواڑی جی نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں آپ کو وہ سب کچھ بتا چکا ہوں سر جو اس نے پہلے کہا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں سر کہ اس کی کس بات کو سچ سمجھا جائے، کس کو جھوٹ!"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتے!" سر تھامسن، تیواڑی جی کو گھورتے ہوئے بولے، پھر ان کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ "ہاں اے ڈی! تم نے پہلے ہی تیواڑی کو صحیح رپورٹ کیوں نہیں دی؟"

میں اس دوران میں بہت کچھ سوچ چکا تھا اس لیے بڑے اطمینان سے بولا۔ "سر! میں اس معاملے میں صرف آپ ہی سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مجھے علم تھا سر، کہ اگر میں نے تیواڑی جی کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو یہ اسے مسترد کر دیں گے اور نہ صرف مسترد کر دیں گے بلکہ مجھ پہ مجرموں کا آلۂ کار بن جانے کا الزام بھی لگ جائے گا۔ آپ نے سر، خود ہی دیکھ لیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں تو انھیں اب بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر انھوں نے مجھے آنکھیں دکھا دکھا کر اور زبردستی سب کچھ پوچھ لیا۔"

اس وقت تیواڑی جی کی حالت قابلِ دید تھی۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہے تھے، بل کھا رہے تھے جس کا اندازہ ان کی لرزتی کانپتی مونچھوں سے ہو رہا تھا۔

سر تھامسن نے ایک طویل سانس لیا، پھر بولے۔ "اے ڈی! تیواڑی بہ ہر حال تمھارا باس ہے۔ ہر چند کہ تمھاری نگاہ دور رس ہے مگر آئندہ تم ایسا نہیں کرو گے۔" سر تھامسن کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ "اس طرح معاملات الجھ جاتے ہیں اور شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ تیواڑی! تم اے ڈی کو معاف کر دو، یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ اس میں انتہائی رازداری کی ضرورت تھی۔ ہاں اے ڈی! تم بھی اسے راز رکھو گے۔ تمھیں مجرموں کو یہی تاثر دینا ہے کہ تم ان کے ہاتھوں بک چکے ہو۔ سمجھ گئے!"

"بالکل سمجھ گیا سر!" میں نے جلدی سے گردن ہلا دی اور چور نظروں سے تیواڑی جی کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ اب کسی قدر پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"مجرم اب تم سے کب رابطہ قائم کریں گے؟" سر تھامسن نے پوچھا۔

"اس سلسلے میں ابھی انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔" میں نے جواب دیا۔

سر تھامسن پھر کچھ سوچنے لگے اور اسی وقت مجھے ان پرچوں کا خیال آیا جو نوٹوں کی گڈی کے ساتھ ملے تھے۔ حالات نے مجھے ایک بار پھر ہیرو بنا دیا تھا اس لیے میں نے اپنی ہیرو شپ کو مزید مستحکم کرنے کی خاطر سوچا کہ سر تھامسن کو وہ پرچے بھی دکھا دوں تاکہ ان پر میری دھاک بیٹھ جائے۔ اب میں یہ تو سمجھ ہی چکا تھا کہ مجرم مجھے بے وقوف بنا کر غیر قانونی کام لینا چاہتے تھے اور نوکری وکری کا معاملہ سب فراڈ تھا۔ وہ وقتی طور پر مجھ سے اپنا کام نکال کر مجھے دھکا دے دیتے یا کیا خبر قتل ہی کر دیتے۔ مجھے مجرموں سے اسی وقت تک دلچسپی تھی جب تک نوکری کا

معاملہ تھا لیکن اب میں ان کے رَبّے میں آنے والا نہیں تھا۔ میری موجودہ نوکری جیسی کچھ بھی تھی مستقل تو تھی، پھر یہ کہ اس نوکری میں آئے دن ہیرو بننے کے مواقع تو ملتے رہتے تھے۔ بس ذرا کبھی کبھار زندگی ضرور خطرے میں پڑ جاتی تھی لیکن موت زندگی تو اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اللہ میاں اب تک جس طرح میری جان بچاتے آئے تھے، آئندہ بھی ان سے یہی امید رکھی جا سکتی تھی۔ مجرموں کا ساتھی بننے کا مطلب تو سیدھا سیدھا جیل جانا تھا۔ پہلے اگر مجھے یہ خیال آجاتا تو ہرگز ہاں نہ کرتا۔ میں تو سیدھا سادا خبروں لانے لے جانے کا کام سمجھ رہا تھا اور وہاں اور ہی چکر چل گیا۔

میں ابھی اپنی جیب سے وہ دونوں پرچے نکال ہی رہا تھا کہ سر تھامسن نے از اول تا آخر بہ نفس نفیس تمام رپورٹ خود سننے کی فرمائش کی۔ میں نے پرچے جیب ہی میں رہنے دیے اور شروع ہو گیا۔ پہلے میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر پوری بات انھیں بتا دی، صرف نوٹوں کی گڈی کا ذکر گول کر گیا اور کہہ دیا کہ معاوضہ بعد میں ملے گا۔ اس کا سبب یہ کہ کہیں وہ روپے سرکاری خزانے میں جمع نہ کرا دیے جائیں۔

"وہ دونوں ہی بیک اپ کے ماہر ہیں۔" سر تھامسن آہستہ سے بولے۔ "یہ دہی دونوں ہو سکتے ہیں۔"

"کون سر؟" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ نکل گئے۔

"چلو آج تمھیں بتا ہی دوں کہ یہ سب کیا چکر ہے۔" سر تھامسن طویل سانس لے کر بولے۔ "تیواڑی! تم بھی میری باتیں غور سے سنو! دراصل یہ کیس بنیادی طور پر پولٹیکل برانچ کا ہے مگر اتفاق سے اس میں تمھاری برانچ ملوث ہو گئی ہے۔ بہرحال اب تک مجھے صرف شبہہ ہی تھا اس لیے میں نے یہ کیس پولٹیکل برانچ کو نہیں دیا لیکن معلوم ہوتا ہے شبہہ ٹھیک ہی تھا۔ جو حالات و واقعات پیش آئے ہیں، وہ انھی دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ دونوں بین الاقوامی مجرم ہیں۔ عورت کا نام سونیا ہے اور مرد کا نام رچرڈ۔ وہ نسلاً برطانوی ہیں۔ برطانیہ میں بھی کئی بار ان سے میری مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ وہ دونوں، مختلف حکومتوں کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی صورت حال کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ وہ یہاں جرمن ایجنٹوں کی حیثیت سے آئے ہیں اور جرمنی ہی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہاں ان کی آمد کا مقصد کیا ہے، فی الحال اس سلسلے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا ضرور سوچا جا سکتا ہے کہ یہاں ان کی آمد کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ میں اب تک اسی لیے ذاتی طور پر اس معاملے میں دلچسپی لے رہا تھا اور رازداری بھی اسی لیے برت رہا تھا۔ ان تمام باتوں سے جتنے کم لوگ آگاہ ہوں، بہتر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ دونوں چوکنّے ہو جائیں اسی لیے اب یہ کیس پولٹیکل برانچ کو دینے کی بجائے میں خود اپنی نگرانی میں صرف چند لوگوں سے کام لوں گا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ میں ان دونوں کے طریقۂ کار سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ خود ہمارے محکمے کے کتنے آدمیوں کو وہ خرید چکے ہیں۔ یہاں ان دونوں کا پُرانا تجربہ ہے۔"

سر تھامسن سانس لینے کے لیے رُکے ہی تھے کہ میں بول اٹھا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں سر! ایک غدار کو تو میں بھی جانتا ہوں۔"

سر تھامسن میری بات سن کر چونک اٹھے۔ "کون ہے وہ؟"

"پولٹیکل برانچ کا سب انسپکٹر شیکھر!"

اس بار تیواڑی جی بھی چونکے۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ شیکھر، تیواڑی جی کا رشتے دار بھی ہے۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" تیواڑی جی بکے۔ "وہ ایسا نہیں ہو سکتا!"

"تیواڑی! تم خاموش رہو!" سر تھامسن نے تیواڑی جی کو ڈانٹ دیا، پھر بولے۔ "اگر اے ڈی نے یہ بات کہی ہے تو اس کے پاس کوئی ثبوت بھی ہوگا۔"

"اور کیا!" میں اِترا اٹھا جانے والے انداز میں بولا، پھر جیب سے دونوں پرچے نکال کر سر تھامسن کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ دیکھیے!"

سر تھامسن نے دونوں پرچے باری باری دیکھے اور چونک اٹھے۔ ایک پرچہ انھوں نے پڑھ کر تیواڑی جی کی طرف بڑھا دیا اور دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ سر تھامسن نے تیواڑی جی کو وہ پرچہ دیا تھا جس پر شیکھر کے لیے پیغام درج تھا۔ اس پرچے کو پڑھ کر تیواڑی جی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

"یہ غالباً کوئی کوڈ معلوم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر سر تھامسن نے وہ پرچہ پیپر ویٹ سے دبا کر رکھ دیا۔ "اسے تو خیر بعد میں سمجھیں گے، پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا انھوں نے یہ دونوں پرچے خود تمھیں شیکھر کے لیے دیے تھے؟" سر تھامسن نے مجھ سے کہا۔

"جی نہیں سر!" میں نے جواب دیا۔ "یہ دونوں پرچے میں نے رنجیت کی جیب سے پار کر لیے تھے۔"

"ویری گڈ!" سر تھامسن کا چہرہ کھل اٹھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ خطرناک صورت حال سے دوچار ہونے کے باوجود تمھارا ذہن بیدار تھا۔"

میں نے جواب میں دانت نکال دیے۔

"سر!" معاً تیواڑی جی بولے۔ "شیکھر... سب انسپکٹر شیکھر کے سلسلے میں کوئی کارروائی..." انھوں نے اپنا جملہ

اَدھورا ہی چھوڑ دیا۔

"یہ تمھارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" سر تھامسن نے ناگواری سے کہا۔ "یہ معاملہ اب میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، جو مناسب سمجھوں گا، کروں گا۔"

تیواڑی جی کا چہرہ اتر گیا۔ ان کی مونچھیں جیسے حرکت کرنا بھول گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی ہوئی۔

"اے ڈی! تمھیں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" سر تھامسن مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "اگر انھیں تم پر ذرا سا شبہہ بھی ہو گیا کہ ان کے لیے تمھاری وفاداریاں مشتبہ ہیں تو وہ تمھیں راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں کریں گے۔"

"ک... کیا مطلب سر!... یعنی وہ... وہ مجھے قتل کر دیں گے؟" میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں۔" سر تھامسن بہت اطمینان سے بولے جیسے میرا قتل ہو جانا ان کی نظر میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو۔ "سنو!" انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ان کا اعتماد حاصل کرنا تمھارے لیے بہت ضروری ہے۔ ان کا کوئی آدمی تم سے جلد ہی رابطہ قائم کرے گا۔ اعتماد حاصل کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ تم ان کی اوّلین ہدایات پر عمل کرو۔ انھیں ڈبل کراس کیے جانے کی ہوا نہیں لگنا چاہیے۔ یہ خطرناک کھیل ضرور ہے مگر اس طرح ہم آسانی ان پر ہاتھ ڈال سکیں گے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے اغراض و مقاصد معلوم ہوں۔ آخر وہ ہندوستان کیوں آئے ہیں اور یہاں کیا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔ تم براہِ راست مجھ سے رابطہ قائم رکھو گے اور جیسا میں کہوں گا، اس پر عمل کرو گے۔"

"بہتر ہے سر!" میں مُردہ سی آواز میں بولا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا! میں نے سوچا۔

"اور یہ لو۔" سر تھامسن نے اپنی میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر میری طرف بڑھائی۔ "اس فائل میں ان تمام کاغذات کی فوٹو کاپیاں ہیں جو مجرموں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ اب اس فائل میں تم بقیہ رپورٹس لکھو گے۔"

میں نے فائل لے لی اور بولا۔ "سر! کیا لیوسی اب بھی میرے ساتھ کام کرے گی؟"

"ہاں، وہ ذہین لڑکی ہے۔ تمھارا اور اس کا ساتھ بہتر ہے۔ تم مختصراً اسے بھی تمام حالات سے مطلع کر دو گے تاکہ وہ لاعلم نہ رہے۔" سر تھامسن نے جواب دیا، پھر بولے۔ "اب تم لوگ جا سکتے ہو۔" ان کا اشارہ تیواڑی جی کی طرف بھی تھا۔

واپسی میں توقع کے عین مطابق تیواڑی جی، کھسیانی بلّی کی طرح مجھے کھمبا سمجھ کر نوچنے لگے، گویا بلبلانے لگے۔ "تمھارا یہی مقصد تھا تو مجھے نہیں بتا سکتے تھے!"

"غلطی ہو گئی سر!" میں نے اپنا پیچھا چھڑانے کی خاطر فوراً "اعتراف جرم" کر لیا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے سمجھے!" انھوں نے مجھے کسی بندر کی طرح بھبکی دی۔

"بالکل نہیں ہوگا سر!" میں نے انھیں یقین دلایا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے ڈانٹ پھٹکار کر اپنی خفت دور کر رہے تھے۔ یہ سب انتقامی کارروائی تھی۔ سر تھامسن کے سامنے تو وہ چوں بھی نہیں کر سکتے تھے اس لیے میرے سامنے چوں چوں کر رہے تھے۔

تیواڑی جی اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تو مجھے لیوسی کا خیال آیا۔ میں اس سے واپسی کے لیے کہہ کر آیا تھا۔

میں نے لیوسی کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ چہکی۔ "دے آئے استعفیٰ؟"

"خاک دے آیا استعفیٰ!" میں جل کر بولا۔

"جب تم کافی دیر تک نہیں لوٹے تو میں تمھاری تلاش میں تیواڑی جی کے کمرے کی طرف گئی۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ تم ان کے ساتھ ڈی جی صاحب سے ملنے گئے ہو۔ آخر کچھ بتاؤ تو سہی، چکر کیا ہے؟" لیوسی نے کہا۔

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "تم چکر کی بات کر رہی ہو اور حالات نے مجھے گھن چکر بنا کے رکھ دیا ہے۔ خدا خدا کرکے ایک نوکری ملنے والی تھی بلکہ ملنے والی کیا، مل ہی گئی تھی، اس میں بھی روڑا اٹک گیا۔ اب کر لو دُکانداری!" یہ کہہ کر میں نے لیوسی کو اصل حالات سے آگاہ کر دیا۔

میری پوری بات سن کر اس نے کہا۔ "تو پہلے تم یونہی ہُون کی اُڑا رہے تھے!"

"پہلے حالات اور تھے، اب اور ہیں۔ آدمی کو حالات کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔" میں نے جھینپ مٹانے کی خاطر کہا۔

"ویسے دیکھا جائے تو تم نے کمال کر دیا۔ اگر وہ لوگ واقعی وہی ہیں جو سر تھامسن کا خیال ہے تو انھیں بے وقوف بنانا آسان کام نہیں تھا۔" لیوسی نے میری تعریف کی اور میں پھول گیا۔

"ارے چھوڑو، وہ کس کھیت کی مولی ہیں، میں تو اچھے اچھوں کو بے وقوف بنا دوں۔ کہو تو تمھیں بنا کر دکھاؤں!" میں اکڑ کر بولا۔

"مجھے تو تم پہلے ہی بہت بنا چکے ہو، اب مزید گنجائش نہیں ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اچھا اب میں چلا۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے اس فائل کا پیٹ بھی بھرنا ہے۔" میں نے فائل اٹھاتے ہوئے کہا جو

میز پر رکھ دی تھی۔

"ساتھ ہی چلو گے نا!" لیوسی نے کہا۔

"کہاں؟"

"گھر اور کہاں! تم مجھے میرے گھر چھوڑتے ہوئے نکل جانا۔"

"دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی کرسی پر بیٹھا، پیارے لال ہنر فوراً تیر کی طرح میری طرف آیا اور مجھے بوکھلا دیا۔

"ارے ارے، کیا پاگل ہو گئے ہو!" میں بدک کر بولا۔

"قبلہ و کعبہ! آپ کا انتظار تو کسی محبوب دل نواز سے زیادہ صبر آزما ثابت ہوا۔" پیارے لال ہنر نے جلدی سے کہا۔

"محبوبِ دل نواز کی بجائے محبوبۂ دل نواز زیادہ بہتر ہے پیارے لال جی!" کمار نے ہانک لگائی۔

"ابے تم چپ! تم سے تو میں سمجھوں گا اچھی طرح!" میں نے اسے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ اب میں سمجھ چکا تھا کہ تین بار استعفیٰ کہنے سے کچھ نہیں ہوتا ورنہ اب تک نوکری سے میری جان چھوٹ چکی ہوتی۔ کمار نے مجھے یقیناً بے وقوف بنایا تھا۔

"حضورِ محترم! اس زبان دراز کے منہ نہ لگیں، خادم کی عرض سن لیں۔" پیارے لال ہنر بول اٹھا۔

"ہرگز نہیں! پہلے کمار سے بات ہوگی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آخر اس نے مجھے سمجھا کیا ہے!"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ! حضور نے تو مصرع کہہ دیا۔" پیارے لال ہنر جھومتے ہوئے بولا۔ "آخر اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ اب کی بار یہی مصرعِ طرح رکھواؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے پیارے لال ہنر کی طرف گھور کر دیکھا۔

"میں تو حضور کی زود گوئی اور موزونِ طبعی کے متعلق عرض کر رہا تھا۔ حضور باتوں باتوں میں مصرعے فرما دیتے ہیں۔" پیارے لال ہنر نے اپنی صفائی پیش کی۔

"خاک عرض کر رہے تھے تم! ہزار بار کہا ہے کہ میرے سامنے اٹرنگ بٹرنگ لفظ نہ بولا کرو مگر تم باز ہی نہیں آتے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "جا کر اپنی کرسی پر بیٹھو، تم سے بعد میں بات ہوگی۔ پہلے میں کمار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مگر حضورِ محترم! خادم کو تو اسی وقت جا کر مشاعرے کی تیاریاں کرنا ہیں اسی لیے تو حضور کا انتظار تھا۔"

"اچھا تو وہ مشاعرہ آج ہے جس کی مجھے صدارت کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں حضور! یہی تو خادم پہلے بھی عرض کرنا چاہتا تھا مگر حضور نے موقع ہی عنایت نہیں فرمایا۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے تم جاؤ۔" میں نے اسے چھٹی دے دی۔

چھٹی ملتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر دروازے کے قریب پہنچتے ہی رک گیا۔ اس نے مڑ کر کہا۔ "خادم نے حضور کا دولت کدہ تو دیکھا ہی نہیں! حضور کو صدارت کرنا ہے، یہ مسئلہ تو رہ ہی گیا!"

"میں تمھیں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے، صدر دروازے کی طرف مل جاؤں گا۔" میں نے اس کی مشکل حل کر دی۔ "تم مجھے آ کر لے جانا! مغرب کے بعد نا؟"

"جی ہاں حضور! یہ بہت بہتر ہے۔ حضرت بلبل دہلوی اور استاد زاغ کانپوری نے بھی وہیں ملنے کو کہا ہے۔ میں تمام حضرات کو ایک ساتھ لے جاؤں گا۔" پیارے لال ہنر سر ہلاتے ہوئے بولا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ پیارے لال ہنر چلا گیا تو میں کمار کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ دیکھ کر میں جل ہی تو گیا کہ وہ آنکھیں بند کیے باقاعدہ اونگھ رہا تھا۔

"کمار!" میں گلا پھاڑ کر چیخا۔

کمار نے ایک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور جلدی سے بولا۔ "کیا زلزلہ آ گیا سر؟"

"زلزلے کے بچے!" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"نہیں ہوتے سر!" وہ جلدی سے بولا۔

"کیا نہیں ہوتے؟" میں نے میز پر ہاتھ مارا۔

"زلزلے کے بچے سر!" اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

"اگر زلزلے کے بچے نہیں ہوتے تو میں کیا کروں!" میں نے غصے میں کہا، پھر مجھے خیال آیا کہ اسے زلزلے کے بچے کہا تھا۔ "میں تم سے مخاطب تھا۔" میں نے کہا۔

"تو ہوں، میں نے کب منع کیا ہے۔"

"تم دفتری اوقات میں باقاعدہ اونگھ رہے تھے..."

پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، وہ بات کاٹ کر بولا۔

"جی ہاں سر! میں ہر کام باقاعدہ کرتا ہوں اور بے قاعدگی کا قائل نہیں۔ ویسے بھی یہاں تکیاں نہیں ہیں ورنہ وہیں مارتا لیٹ کر!"

"یہاں تکیاں نہیں ہیں تو میں کیا کروں! لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اونگھنے لگو۔ اس بات پر تمھارا جواب بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ جواب طلب تو کریں، میں آپ کی طلب پوری کر دوں گا، ویسے سر آپ نے اب تک اپنے کسی ماتحت کا جواب طلب

نہیں کیا، آپ کو پتا ہی نہیں ہوگا کہ جواب کیسے طلب کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کی آسانی کے لیے بتا دوں، آئندہ آپ ہی کے کام آئے گی یہ بات!"

"ہرگز نہیں!" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم بہت دھوکے باز ہو۔ ہمیشہ مجھے انٹ شنٹ باتیں بتا دیتے ہو۔ اگر مجھے جواب طلب کرنا نہیں آتا تو تم سے مطلب! تم کون قاضی کہلاؤ! تم آج ہی مجھے استعفیٰ دینے کا غلط طریقہ بتا چکے ہو۔ جواب دو کہ تم نے مجھے غلط راہ کیوں سجھائی؟"

"جہاں تک میرے علم میں تھا سر، میں نے آپ کے علم میں اضافہ کر دیا، آگے آپ کا نصیب!"

"بس میں نے کہہ دیا ہے، آئندہ مجھے کوئی مشورہ دینے کی ضرورت نہیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" میں نے اسے وارننگ دی۔

"اب بھی نہیں ہے سر!" وہ آہستہ سے بولا۔

اس بدبخت سے باتوں میں جیتنا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے خاموشی ہی کو بہتر سمجھا اور مرزا لال موٹر کیس کی نئی فائل کا پیٹ بھرنے لگا۔ میں نے اب تک پیش آنے والے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھ دیے تھے۔ فائل بند کر کے میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھ دی اور ایک طویل سانس لیا۔ میرے ذہن سے بہرحال ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ گزشتہ رات کیوں کہ مجھے پلک جھپکانے تک کا موقع نہیں ملا تھا اور صبح دفتر آ گیا تھا اس لیے ذہن پر غنودگی کے سے آثار تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج رات مشاعرہ نہ ہوتا تو کم از کم سو تو جاتا جلدی!

ادھر دفتر کا وقت ختم ہوا، ادھر لیوسی آ پہنچی۔ میں لیوسی کو پھٹ پھٹ پر بٹھا کر دفتر سے روانہ ہو گیا۔ میری پھٹ پھٹ، دوپہر ہی کو سر تھامسن کا ایک ملازم دفتر پہنچا گیا تھا کیوں کہ گزشتہ رات میں اسے سر تھامسن کی کوٹھی کے کمپاؤنڈ ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ چچا بندو خاں اس وقت مجھے یہ اطلاع دے گئے تھے جب میں فائل میں ضروری اندراجات کر رہا تھا۔

میں ابھی لیوسی کو اپنی پھٹ پھٹ پر بٹھائے ہوئے کمپنی باغ تک پہنچا تھا کہ اس نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ایک کار ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

میں چونک اٹھا اور کہا۔ "مگر تمھیں کیسے پتا چلا کہ وہ ہمارا ہی تعاقب کر رہی ہے؟" یہ کہہ کر میں اپنی گردن گھمانے لگا۔

"مڑ کر نہ دیکھو!" لیوسی نے جلدی سے کہا۔ میری گردن جہاں تھی، وہیں رہ گئی۔ "اس طرح اسے شک بھی ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر لیوسی نے بتایا کہ وہ کار، دفتر ہی سے پیچھے لگ گئی تھی۔

"کیا خبر اسے بھی لال کنوئیں کی طرف جانا ہو۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

"اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک ہمیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل چکا ہوتا۔" لیوسی نے کہا۔ "اسے کار کی رفتار کم رکھنے کی کیا ضرورت ہے! ویسے تم اپنا شک دور ہی کرنا چاہتے ہو تو موٹر سائیکل کو یہیں سے گھنٹہ گھر کی طرف موڑ لو۔ اگر اس کا مقصد تعاقب ہی ہے تو وہ بھی پیچھے پیچھے آئے گا۔"

میں نے لیوسی کی ہدایت پر ایسا ہی کیا اور اسی کے ساتھ کہا۔ "اور اگر وہ بھی گھنٹہ گھر کی طرف جانے والا ہو تو؟"

"تو تمھارا سر!" لیوسی بھنا کر بولی۔

"میرا سر کیوں، تمھارا سر کیوں نہیں! میرا سر کیا فالتو ہے!" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

لیوسی میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ کار اب بھی پیچھے لگی ہوئی ہے۔ ایسا کرو کہ اب تم مسجد فتح پوری کی طرف چلنے کی بجائے بلی ماران کی طرف چلو۔"

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"تاکہ تمھیں کسی طرح یقین تو آ جائے کہ وہ کار ہمارا ہی تعاقب کر رہی ہے۔" لیوسی نے جواب دیا۔

"ارے مجھے مڑ کر دیکھ تو لینے دو کہ وہ ناہنجار ہے کون!" میں نے برہم ہو کر کہا۔ "تم تو بس مجھے اس طرح اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی ہو جیسے میری امی، ابا کو نچاتی ہیں۔"

"شروع کر دی تم نے بکواس!" لیوسی غرائی۔ "میری بلا سے، دیکھ لو مڑ کر!"

"تمھاری بلا سے کیوں، میں اپنی بلا سے دیکھوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے گردن گھمائی اور اسی وقت پھٹ پھٹ لہرائی۔

"ارے کیا تانگے سے ٹکراؤ گے!" لیوسی چیخی۔

آگے آگے ایک تانگا جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے موٹر سائیکل اس کے قریب سے نکال لی مگر ابھی تک میرے حواس درست نہیں ہوئے تھے۔ اس کار کو ڈرائیو کرنے والا رنجیت تھا۔ وہ اسی میک اپ میں تھا جس میں گزشتہ رات میں نے اسے دیکھا تھا۔ میں خلافِ توقع اسے اپنے تعاقب میں دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیوں میرا پیچھا کر رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر لیوسی کو اس کے بارے میں بتا دیا۔

"تمھیں یقین ہے کہ یہ وہی ہے؟" لیوسی نے کہا۔

"بالکل وہی!" میں پُرزور لہجے میں بولا۔

"تو پھر اب ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت نہیں۔ تمہید سے

لال کنوئیں چلو اور مجھے میرے گھر اتار دو۔ وہ یقیناً تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوگا۔ تم تنہا ہوگے تو اسے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"تن... تنہا! لیکن... کوئی... اس نے کوئی گڑبڑ کی تو... تو کیا ہوگا؟... تمھیں پتا نہیں لیوسی... کہ... کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے!" میں نے ہکلا ہکلا کر اپنے خوف کا اظہار کیا۔

"بنو مت! میں جو کہہ رہی ہوں' وہی کرو۔" لیوسی نے کہا۔ "اسے شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم دھوکا دے کر نکل جانا چاہتے تھے یا تعاقب کا یقین کرنے کی خاطر اِدھر اُدھر خوامخواہ گھوم رہے تھے۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا لیوسی' کہ میں کچھ دیر تمھارے ہی گھر رہ جاؤں' پھر جب وہ مایوس ہوکر لوٹ جائے تو اپنے گھر چلا جاؤں؟" میں نے لیوسی کی بات کو نظرانداز کرکے کہا۔

"اس نے تمھارا گھر بھی تو دیکھا ہوگا۔" لیوسی بولی۔

"ہائے یہ تو میں بھول ہی گیا۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"تم آخر اس سے بات کرنا کیوں نہیں چاہتے؟"

"تم بھی عجیب 'بک ٹونٹی' ہو! کہہ تو دیا کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"خیر نہ بتاؤ' تم جانو!" لیوسی نے طویل سانس لیا۔ "مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔"

"کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ مصیبت کے وقت کوئی کام نہیں آتا۔" میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا اور پھٹ پھٹ کی رفتار تیز کردی۔

میں نے دل میں سوچا' اب جو ہو سو ہو۔ اگر لیوسی اس آڑے وقت میں ساتھ دینا نہیں چاہتی تو نہ سہی۔ وہ مجھے کھا تو جائے گا نہیں۔ یوں بھی اس وقت چاندنی چوک میں خاصی رَدوکَد چہل پہل تھی۔

پھر میں مسجد فتح پوری کی ایک جانب سے گزرتا ہوا فراش خانے کی طرف نکلا اور وہاں سے لال کنوئیں کی جانب ہولیا۔ لال کنواں وہاں سے قریب ہی تھا۔ لیوسی کی اطلاع کے مطابق رنجیت اب بھی پیچھے لگا ہوا تھا۔

لیوسی کو اس کے گھر پر اتارنے کے بعد میں نے سوچا کہ رنجیت کو ڈاج دے کر گلیوں گلیوں کسی طرف نکل جاؤں۔ وہ بہرحال گلیوں میں میرے پیچھے کار نہیں دوڑا سکتا تھا۔ میں نے گھبراہٹ میں یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کم بخت میرا گھر بھی جانتا ہے۔ گلیوں گلیوں میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ پھر جب ایک سڑک پر پہنچ کر میں نے گردن گھمائی تو اطمینان کا سانس لیا۔ رنجیت کی کار کا دور دور پتا نہیں تھا۔ اسی وقت کسی قریبی مسجد سے مغرب کی اذان بلند ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ مغرب کے بعد میں نے پیارے لال ہنر سے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اس وقت بازار سیتارام میں تھا اور کالی مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اِدھر ہی سے گھوم کر مٹیا محل نکل جاؤں گا' پھر وہاں سے سیدھا جامع مسجد پہنچ لوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے پھٹ پھٹ کی رفتار بڑھادی۔

کچھ دیر بعد ہی میں' جامع مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دور ہی سے پیارے لال ہنر نظر آگیا۔ وہ پھٹ پھٹ کی طرف دوڑا۔ اس کے قریب ہی میں نے دو بھونس سے بڈھوں کو کھڑے ہوئے دیکھا تھا جو میرے اندازے کے مطابق بُلبل اور زاغ کانپوری ہی تھے۔ میں نے پیارے لال ہنر کے قریب پھٹ پھٹ روک لی۔

اس سے پہلے کہ پیارے لال ہنر کچھ کہتا' میں بول اٹھا۔ "تم میرا انتظار کرو' میں ابھی گھر ہوکر آیا۔"

"قبلہ وکعبہ! پہلے ہی بہت تاخیر ہوچکی ہے۔" پیارے لال ہنر جلدی سے بولا۔ "حضرت بُلبل دہلوی بہت خفا ہو رہے ہیں۔ انھیں انتظار کرتے ہوئے خاصا عرصہ ہوچکا ہے۔"

"مگر تمھی نے تو مغرب کے بعد کہا تھا۔" میں کسی قدر خفگی سے بولا۔

"اس سے اس خادم کا مدعا یہ تھا کہ حضور کو زحمت انتظار نہ ہو ورنہ حضرت بُلبل دہلوی اور استاد زاغ کانپوری کو بعد عصر کا وقت دیا گیا تھا تاکہ انھیں کچھ دیر بھی ہوجائے تو مشاعرہ تاخیر سے شروع نہ ہو۔" پیارے لال ہنر نے کہا۔ "یوں بھی بہت سے شعرا اب تک غریب خانے پر پہنچ چکے ہوں گے اور حضور کا انتظار کررہے ہوں گے۔"

کچھ تو مشاعرے کی صدارت کا شوق اور کچھ پیارے لال ہنر کی خوشامد' دونوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھر جانے کی بجائے اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگیا۔ پیارے لال ہنر نے مجھے راہ سمجھادی تھی کہ گھر والوں کو دفتری مصروفیات کا جھانسا دے دوں۔ اب مجھے رفتہ رفتہ جھوٹ بولنے کی تھوڑی بہت پریکٹس ہوتی جارہی تھی۔ پہلے کی نسبت جھوٹ بولتے ہوئے اب مجھے کچھ زیادہ خوف نہیں آتا تھا۔

پیارے لال ہنر نے بُلبل دہلوی اور استاد زاغ کانپوری کو تو ایک تانگے میں بٹھادیا اور خود میرے ساتھ پھٹ پھٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ بھائی بُلبل اس کا گھر جانتے ہیں' اور وہ پہنچ جائیں گے۔

"اماں جب وہ تمھارا گھر جانتے تھے تو پھر تم کیوں انھیں لینے آئے؟" میں نے پھٹ پھٹ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی بُلبل

کا تانگا آگے بڑھ چکا تھا۔

"حضورِ والا! مسئلہ زادِ سفر کا تھا۔" پیارے لال ہنر نے جواب دیا۔

"یہ کیا چیز ہوتی ہے؟... زادِ سفر!" میں بڑبڑایا۔

پیارے لال ہنر نے میری بڑبڑاہٹ سن لی اور بولا۔ "حضورِ والا' گستاخی معاف! یہ 'ہوتی' نہیں' 'ہوتا' ہے۔" پھر بہ مشکل وہ مجھے یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ بھائی بُلبل' تانگے کا کرایہ خود "خرچنا" نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب تک خود منتظم مشاعرہ پزیرائی کے لیے نہ آئے' وہ بھلا کس طرح جاسکتے تھے۔

پیارے لال ہنر کا "غریب خانہ" کشن گنج میں تھا' سو میں نے اُدھر ہی پھٹ پھٹ دوڑادی۔ ابھی میری پھٹ پھٹ دریبے کی طرف مڑ ہی رہی تھی کہ جیسے میری روح قبض ہوگئی' میں نے اپنا پھٹ پھٹ کے پیچھے پیچھے رنجیت کی کار کو دیکھ لیا تھا۔ میں اس بدبخت کو غوطہ دے کر نکل گیا تھا مگر اس نے مجھے پھر تلاش کرلیا تھا۔ یہی ممکن تھا کہ وہ غوطہ دیے جانے کے بعد سیدھا جامع مسجد کی طرف آگیا ہو کہ بہرحال مجھے گھر تو لوٹنا ہی تھا۔

"حضورِ والا نے اگر آج کے دن تقریب کی مناسبت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے شیروانی زیب تن کی ہوتی تو خادم کے خیال میں بہتر ہوتا۔" پیارے لال ہنر معاً بول اٹھا۔

"ابے چپ!" میں ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ یہاں تو جان سُولی پر ٹنگی ہوئی تھی اور اُسے شیروانی کی سوجھ رہی تھی۔

"کیا ارشاد فرمایا حضور؟" اس نے اس طرح کہا جیسے اُسے اپنی سماعت پر یقین نہ ہو۔

"اپنی چونچ بند رکھو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "ورنہ میں تمھارے مشاعرے وشاعرے پر لعنت بھیج کر اور تمھیں یہیں پٹخ کر چلا جاؤں گا۔"

"نصیبِ دشمناں' حضور کا مزاج کچھ ناساز دکھائی دیتا ہے۔" وہ سہمی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"ہاں ہے' بالکل ہے!" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ قاتل' وہ ناہنجار رنجیت اب بھی پھٹ پھٹ کے پیچھے دُم کی طرح لگا ہوا تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آرہا تھا اور ڈر بھی لگ رہا تھا۔

خدا خدا کرکے میں کشن گنج پہنچا اور پھٹ پھٹ کھڑی کرکے جھٹ سے "پیارے لال ہنر کے گھر میں گھس پڑا۔ وہاں سامنے ہی تھوڑے فاصلے سے دو دروازے تھے جن پر پردے لٹک رہے تھے۔ ان میں سے ایک مردانہ حصے کا دروازہ تھا اور دوسرا زنان خانے کا۔ میں' "جیپر سٹ" میں' مردانے کی بجائے زنانے حصے میں گھس پڑا تھا مگر یہ بات مجھے اس وقت پتا چلی جب ایک نین کٹورے والی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ پھر پیچھے سے پیارے لال ہنر کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

"ارے ارے حضور! اُدھر نہیں' اِدھر!" پیارے لال ہنر نے ہانک لگائی تھی اور پھر خود بھی اندر لپک آیا تھا۔

میں غٹاغٹ اس نین کٹورے والی بلکہ کٹوری کا شربتِ دیدار پی رہا تھا کہ پیارے لال ہنر نے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس الھڑ مٹیار کو اپنا شربتِ دیدار پلوانے میں کوئی جھجک یا پریشانی نہیں تھی۔

"یہ حضور کی خادم زادی ہے جناب!" پیارے لال ہنر نے بتایا۔ اس کی آواز جیسے بھیک مانگ رہی تھی' پتا نہیں کیوں! پھر وہ "خادم زادی" سے مخاطب ہوا۔ "آداب کرو حضور کو!"

"آداب!" نازک سی کلائی اٹھی۔

"وا... والیکم آداب!" میں نے بہ مشکل کہا۔

اسی وقت پیارے لال ہنر نے کہا۔ "اِدھر... اس طرف تشریف لے چلیے قبلہ وکعبہ!"

میں پیارے لال ہنر کے ہمراہ ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں داخل ہوگیا۔ چھوٹی سی راہ داری کی دائیں جانب ایک کمرے کے دروازے پر جوتے ہی جوتے نظر آرہے تھے۔ پیارے لال ہنر مجھے ساتھ لیے اسی طرف بڑھا۔ مشاعرہ اسی کمرے میں برپا ہونے والا تھا۔

اس نین کٹورے والی "خادم زادی" کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے میرے دل سے رنجیت کا خوف نکل گیا تھا جو "مشاعرہ گاہ" میں پہنچ کر پھر غالب آگیا۔ اس نے پیارے لال ہنر کے گھر تک میرا تعاقب کیا تھا۔ پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔ دل میں رہ رہ کر ہَول سے اُٹھ رہے تھے۔

"مشاعرہ گاہ" میں اس وقت مجھے ایک سے ایک کارٹون نظر آرہا تھا۔ کسی کی بیک بہہ کر شیروانی کو بھی گل وگلزار کررہی تھی اور کسی کے سر پر بالوں کی جگہ جنگل اُگا ہوا لگ رہا تھا۔ دہلی کے شاعر سارے ہی تیسرے بلکہ چوتھے اور پانچویں درجے کے شعرائے کرام اپنا کلام بلاغت نظام سنانے وہاں جمع تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں جتنی گنجائش تھی' اس سے زیادہ افراد وہاں جمع کردیے گئے تھے۔ نشست فرشی تھی۔ درمیان میں ایک طرف دیوار سے لگی ہوئی میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی' کمرے کا صرف وہی حصہ خالی تھا۔ چادر کی ایک طرف دیوار سے لگا ہوا گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ جگہ کی کمی کے سبب مجھے اور پیارے لال ہنر کو جوتوں کے قریب ہی بیٹھنا پڑا تھا۔ پیارے لال ہنر میری معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر بتا چکا تھا کہ اس کمرے میں جتنے حضرات موجود تھے سبھی ماشاءاللہ شاعر تھے' گویا وہاں سامع نام کی کوئی چیز نہیں تھی' سبھی کو ایک دوسرے کی سماعتوں میں اپنا اپنا کلام انڈیلنا تھا۔

"اب شروع کرو مشاعرہ!" میں نے پیارے لال ہنر کو ٹھوکا۔

دیا۔ "مجھے گھر بھی جانا ہے۔"

"اجی حضور! ابھی تو بہت سے شعرائے کرام کا انتظار ہے۔ قبلہ وکعبہ! ابھی تو حضرت بلبل دہلوی اور استاد زاغ کانپوری بھی تشریف نہیں لائے۔" پیارے لال ہنر نے آہستہ سے کہا۔

"تو انھیں کیا اپنی چاند پر بٹھاؤ گے، جگہ کہاں ہے یہاں!" میں نے جل کر کہا۔

"حضورِ والا! قلب میں وسعت چاہیے! جگہ کا حضور نے خوب فرمایا!"

"اے میاں صاحب زادے! ذرا پرے ہٹ کر بیٹھو۔" میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک توندل نے میری پسلی میں کہنی اڑائی۔ "دیکھتے نہیں میری شیروانی کا دامن تمھارے نیچے دبا ہوا ہے۔"

"تو میں کیا کروں، اپنا دامن کھینچ لو۔" میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"بڑے گستاخ دکھائی دیتے ہو صاحب زادے! معلوم ہوتا ہے کہیں بندھے نہیں!"

"وہ قبلہ نازک صاحب! سنیے تو سہی... یہ..."

پیارے لال ہنر نے اس توندل کو "نازک صاحب" کہا تھا۔ وہ غالباً اس سے میرا تعارف کرانا چاہتا تھا تاکہ جھگڑا نہ بڑھے مگر میں اس موٹے تازے نازک کی بات سن کر کھول اٹھا تھا۔ میں اسی لیے تعارف کی رسم پوری ہونے سے پہلے ہی بھڑک اٹھا۔ "کیا کہا تم نے! میں بھی کوئی گائے بھینس ہوں جو بندھوں گا، ہیں!" یہ کہتے ہوئے میں نے آنکھیں نکالیں۔

ممکن تھا کہ اس توندل سے میری باقاعدہ جنگ شروع ہو جاتی لیکن اس سے پہلے ہی پیارے لال ہنر نے معاملے کو سنبھال لیا۔ پھر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خالی جگہ بھر دی جائے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بہ آوازِ بلند اعلان کیا۔ "حضرات! کیونکہ ابھی کچھ اساتذہ تشریف نہیں لا سکے ہیں جن کا انتظار ہے اس لیے مشاعرہ انھی کی آمد کے بعد شروع ہوگا لیکن صاحبِ صدر، حضرت اے ڈی مہر تشریف لے آئے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں دست بستہ عرض گزاروں گا کہ وہ مسندِ صدارت پر رونق افروز ہو کر ہم سبھی کو شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔"

وہاں موجود سبھی افراد، اعلان سننے کے بعد صاحبِ صدر، یعنی میری تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے حالانکہ میں انھی کے درمیان موجود تھا۔ شاید انھیں توقع نہیں تھی کہ ان کا صاحبِ صدر اتنا کم عمر ہوگا۔

میں کئی افراد یعنی شعرائے کرام کے درمیان دھنسا بیٹھا تھا اس لیے پیارے لال ہنر نے میرا ہاتھ پکڑ کر بہ مشکل مجھے کھڑا کیا اور بولا۔ "حضور! تشریف لے چلیں۔"

کمرے میں موجود افراد نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔ ان کی نظریں مجھے اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان افراد میں وہ توندل، یعنی نازک بھی شامل تھا۔ اعلانِ صدارت ہونے کے بعد میں پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی حقارت بھری نگاہ سے نازک کی طرف دیکھا اور دل میں کہا، دیکھ لے بیٹا! میں صاحبِ صدر ہوں۔

میں اپنے پیروں سے کسی کی ناک سہلاتا، کسی کا کندھا ہلاتا ہوا مسندِ صدارت کی طرف بڑھا اور آخر کار وہاں پہنچ ہی گیا۔ میں گاؤ تکیے پر کہنی ٹیک کر اور ذرا سا آرام کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لوگوں کی نگاہیں اب بھی میرے جسم میں چبھ رہی تھیں مگر مجھے ان کی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ سب بہ ہر حال صاحبِ صدر نہیں تھے جب کہ میں تھا۔ ان کا درجہ مجھ سے کم تھا۔

اساتذۂ کرام ظاہر ہے کہ اساتذۂ کرام ہوتے ہیں اور جب تک وہ مشاعرے میں دیر سے نہ پہنچیں، بھلا اساتذۂ کرام کیسے کہلائیں۔ غالباً اسی لیے انھوں نے آنے میں مزید آدھا گھنٹہ لگایا اور اس آدھے گھنٹے میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی بازار میں بیٹھا ہوں۔ وہاں موجود افراد مستقل کچھڑیاں پکا رہے تھے اور میں ان سب سے الگ ٹھونٹ پر بیٹھے ہوئے الّو کی طرح پلکیں جھپکا رہا تھا۔

بالآخر پیارے لال ہنر نے مشاعرے کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس سے پہلے وہ شعرا کی فہرست مرتب کر چکا تھا۔ اس نے مشاعرے کا باقاعدہ اعلان کرنے کے بعد مصرعِ طرح پڑھ کر سنایا ؎

رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

اب پیارے لال ہنر بھی مسندِ صدارت، یعنی میلی سی چادر پر میرے قریب ہی آ بیٹھا تھا۔

"حضرات! سب سے پہلے یہ خادم، صاحبِ صدر کی اجازت سے غزل عرض کرتا ہے۔" پیارے لال ہنر یہ کہہ کر زور سے کھانسا تاکہ گلا صاف ہو جائے، پھر اس نے اپنی غزل پڑھنا شروع کی۔

پیارے لال ہنر، بلبل دہلوی، استاد زاغ، نازک اور نہ جانے کون کون، رات بھر جو چیز بھی باندھنے کے قابل ملی، باندھتے رہے اور میں اس دوران میں آدھا سوتا آدھا جاگتا رہا۔ نیند کے مارے میرا بُرا حال تھا مگر وقفے وقفے سے وہ سب کم بخت اتنی زور سے چیخ اٹھتے کہ میری آنکھ کھل جاتی۔ "سبحان اللہ، واہ واہ، کیا کہنے، بہت خوب" کا وہ شور بلند کرتے کہ میں سمجھتا، ہو گیا کہیں بلوا! ایک تو نیند، دوسرے بھوک، میری حالت خراب تھی مگر درمیان میں ایک پیالی چائے کے سوا کچھ نہیں ملا۔ چائے کا وقفہ بھی اس لیے بہت مختصر رکھا گیا تھا کہ بہ ہر حال صبح تک مشاعرہ "بہ حسن و خوبی" اپنے اختتام کو پہنچنا تھا۔ فجر کی اذان کے احترام میں بھی کچھ دیر کے لیے مشاعرہ رکنا پڑا۔

اذان کے بعد صرف دو شاعر رہ گئے تھے جن کے بعد میری باری تھی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اپنی باری آنے تک جاگتا رہوں مگر اونگھ ہی گیا اور ہڑبڑایا اس وقت جب پیارے لال ہنر نے میرا گھٹنا ہلایا۔ "حضور! اب اپنی غزل مرحمت فرمائیں۔"

"غز... غزل... ہاں ابھی لو۔" یہ کہہ کر میں پلکیں جھپکاتا ہوا سیدھا تن کر بیٹھ گیا اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا مگر غزل، جیب میں ہوتی تو ملتی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تمام جیبیں دو دو بار دیکھ ڈالیں اور روہانسی سی آواز میں پیارے لال ہنر سے بولا۔

"نہیں مل رہی، پتا نہیں کہاں گر گئی!"

"اماں کہی بھی تھی غزل کہ یوں ہی اڑا رہے ہو!" کسی نے فقرہ چُست کیا۔

"ہمیں تو پہلے ہی شک تھا کہ ہنر صاحب نے کسی غیر شاعر کو صدر بنا دیا ہے۔" کسی نے کہا۔

نہ صرف میرا بلکہ پیارے لال ہنر کا بھی بُرا حال تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "سرکار! پھر ایک دفعہ ملاحظہ فرما لیں۔" پھر بلند آواز میں لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "حضرات! آپ کسی غلط فہمی کو راہ نہ دیں۔ حضور نے غزل کہی تھی اور اس خادم نے خود سماعت کی تھی۔"

اس دوران میں مجھے شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی اور لوگوں کے تبصروں پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ میں نے پھر جیبیں کھنگال ڈالیں۔ غزل نہ ملنا تھی نہ ملی اور مجبوراً پیارے لال ہنر کو مشاعرے کے اختتام کا اعلان کرنا پڑا۔ اسی کے ساتھ میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ ہی دو چار افراد مزید پیر سیدھے کرنے کے لیے اٹھ گئے۔

"سنیے حضرات! چائے نوش فرما کر جائیے گا۔" پیارے لال ہنر نے میری طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"بھاڑ میں گئی تمھاری چائے اور اوپر سے جاؤ تم!" میں نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا مگر دروازے تک پہنچنا اتنا آسان ثابت نہ ہوا۔ لوگوں کو پھلانگتا ہوا میں بہ مشکل دروازے تک پہنچا اور پھر جلدی سے جوتے پہن کر وہاں سے بھاگا۔

گھر سے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ ابھی صبح کا جھٹپٹا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے اِرد گِرد کوئی نظر نہیں آیا۔ میں نے اپنی پھٹ پھٹ اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔ میں ابھی کچھ دور ہی گیا ہوں گا کہ سڑک کی دائیں جانب مجھے ایک کار کھڑی نظر آ گئی جو پہلے نظر نہ آ سکی تھی۔ اس کار پر نظر پڑتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ رنجیت ہی کی کار تھی۔ تو کیا یہ کم بخت رات بھر یہاں میرے انتظار میں سوکھتا رہا ہے؟ میں نے سوچا اور مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی۔ "ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ اب تو وہ کردے گا پھاڑ کے ذبح!" میں بڑبڑایا۔

اسی وقت جیسے کسی نے میرے اندر سے کہا۔ بھاگ لے بیٹا، ایسے موقعوں پر رُکا نہیں کرتے!

میں ایسا بن گیا جیسے اس کار کو دیکھا ہی نہ ہو اور تیزی کے ساتھ سیدھا نکلا چلا گیا۔ مجھے کار کے قریب سے گزرتے ہوئے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بھی حرکت میں آ چکی ہے لیکن میں نے اُدھر دیکھا نہیں۔

اب میں تنہا تھا، نہ میرے ساتھ لیوسی تھی، نہ پیارے لال ہنر! رنجیت شاید اب تک انھی کی وجہ سے مجھ سے نہیں بھڑا تھا مگر اب ظاہر تھا کہ اس کے لیے کوئی قباحت نہیں تھی۔ بالآخر کچھ دور تعاقب کرنے کے بعد اس نے اپنی کار مجھ سے آگے نکال لی اور میرا راستہ روک لیا۔ مجھے بہ مجبوری اپنی پھٹ پھٹ روکنا پڑی مگر میں پھٹ پھٹ سے اُترا نہیں۔

"کون ہے بھائی... راس... راستہ تو چھوڑو۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں صدا لگائی۔

جواب میں رنجیت اپنی کار، سڑک کی ایک جانب کھڑی کر کے، تیزی کے ساتھ اس سے اُترا اور میری طرف لپکا۔

"ارے... ارے تم پیارے بھائی!" میں نے خوشامدانہ آواز میں کہا۔ "کیا حال چال ہیں؟" اس دوران میں رنجیت میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

"یہ کیا حرام زدگی تھی؟" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا گریبان پکڑ لیا۔

"کک... کیا پیارے... بھا... آ... آئی!" میں ہکلایا۔

"تم نے مجھے رات بھر کیوں خوار کیا؟" اس نے آنکھیں نکالیں، میری نہیں اپنی!

"م... میں نے... ن... نہیں تو پیارے بھائی... میں تو مشاعرہ گا کر آ رہا... مشاعرہ... مشاعرے کی صدارت کر کے آ رہا ہوں۔"

"بکواس بند کرو!" اس نے میرے گریبان کو جھٹکا دے کر کہا۔ "وہ دونوں پرچے کہاں ہیں؟"

"کک... کون سے پرچے؟" میں نے پوچھا حالانکہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ کن پرچوں کی بات کر رہا تھا۔

"تم خوب اچھی طرح سمجھتے ہو کہ میں کن پرچوں کا ذکر کر رہا ہوں! مجھ سے زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو! میں ان پرچوں کا ذکر کر رہا ہوں جو نوٹوں کی گڈی کے ساتھ غلطی سے تمھارے پاس چلے گئے تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس کے سامنے جھوٹ نہیں چلے گا اس لیے

فوراً بول اٹھا "اچھا وہ... وہ پرچے!... تو یوں کہو نا پیارے بھائی! ایں... میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم نے جان بوجھ کر مجھے دیے تھے۔"

"وہ ہیں کہاں؟" اس نے پھر میرے گریبان کو جھٹکا دیا۔

"وہ... وہ... ان میں سے ایک تو بیکار سا تھا، اسے تو میں نے پھاڑ دیا اور..."

"کیا؟" وہ میری بات کاٹ کر چیخا "پھاڑ دیا؟"

"ہاں ہاں، پیارے بھائی! اس پر پتا نہیں، کیا اڑنگ بڑنگ بنا ہوا تھا، پانسے، ہندسے، پتا نہیں کیا! ہاں دوسرا پرچہ کام کا تھا۔"

"اس کا کیا کیا تم نے؟" وہ دانت پیس کر بولا جیسے مجھے کچا چبا جانے کے لیے "غورش" کر رہا ہو۔

"وہ میں نے شیکھر کو پہنچا دیا۔"

رنجیت میری بات سن کر واضح انداز میں چونکا، پھر بولا۔ "اس نے کچھ کہا، پرچہ دیکھ کر؟"

"کہتا تو اس وقت جب اسے پتا چلتا کہ پرچہ پہنچانے والا ہے کون!"

"کیا مطلب؟" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔

"ارے بس میں نے چپ چاپ سے اس کی جیب میں پرچہ کھسکا دیا۔ اس کے اتا جی... میرا مطلب کہ پتا جی کو بھی پتا نہ چلا ہوگا کہ میں اس سے کیوں ٹکرایا تھا۔" میں اپنی جان بچانے کی خاطر بڑی صفائی سے جھوٹ پر جھوٹ بولے چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس سے پہلے اپنی اس صلاحیت کا اچھی طرح اندازہ نہیں تھا کہ اس روانی سے جھوٹ بول سکتا ہوں۔

رنجیت کے چہرے سے اب الجھن کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر میں نے سکوت توڑا "اب میں اپنے گھر جاؤں پیارے بھائی؟"

جواب میں اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولا "آئندہ تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گے۔ جب تک تمھیں کسی سلسلے میں واضح طور پہ ہدایت نہ ملے، تم خود کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے!"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو پیارے بھائی!"

"میں ہمیشہ ٹھیک ہی کہتا ہوں۔" وہ غرایا اور پلٹ کر اپنی کار کی طرف جانے لگا مگر جاتے جاتے شاید اسے کچھ خیال آ گیا۔ وہ پھر لوٹ آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "تم رات کو لال کنوئیں تک پہنچ کر مجھے ڈاج کیوں دے گئے تھے؟"

"میں... میری یہ جرأت! سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پیارے بھائی!"

"مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو اللہ دتا! مجھ سے سیدھے سیدھے چلو! میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم بہت عیار ہو۔ تم نے تعاقب کے دوران میں کئی بار مجھے پلٹ کر بھی دیکھا تھا۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے، سمجھے! میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ تم مجھ سے جان چھڑا کر بھاگے تھے۔"

"تمھیں... تمھیں یقیناً غلط فہمی ہو گئی ہے پیارے بھائی! ورنہ میں تمھیں دیکھ لیتا تو... تو یعنی کہ... تو..."

"بکو مت! اور جو میں کہہ رہا ہوں، کان کھول کر سن لو۔"

"میرے دونوں کان کھلے ہوئے ہیں پیارے بھائی! تم کہو۔"

"آئندہ اگر تمھارے ساتھ کوئی ہو تو تم اس سے جان چھڑا کر فوراً مجھے اس کا موقع دو گے کہ میں جو بات کہنا چاہوں کہہ سکوں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں! تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

رنجیت ایک بار پھر اپنی کار کی طرف مڑا اور میں دل میں دعا کرنے لگا کہ اس بدبخت کو پھر کچھ یاد نہ آ جائے مگر اس بار خیریت گزری۔ وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنی پھٹ پھٹ اسٹارٹ کر دی۔ اسی دوران میں رنجیت بھی اپنی کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس کی کار آگے آگے جا رہی تھی اور میری پھٹ پھٹ پیچھے پیچھے۔ میں نے اب جان بوجھ کر پھٹ پھٹ کی رفتار کم کر دی تھی۔ میں اس ظالم کے تو سائے سے بھی بچ کر رہنا چاہتا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو کبھی اس کی منحوس صورت ہی نہ دیکھتا۔ اس وقت سڑک پر بس اکا دکا گاڑیاں ہی آ جا رہی تھیں۔ میرا اور رنجیت کی کار کا فاصلہ رفتہ رفتہ اب خاصا ہو چکا تھا۔ معاً ایک کار تیزی کے ساتھ میرے اتنے قریب سے گزری کہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ویسے غلطی میری ہی تھی۔ میں سڑک کی ایک جانب پھٹ پھٹ دوڑانے کی بجائے پتا نہیں کیسے بیچ سڑک پر آ گیا تھا۔ رنجیت کی کار اب باڑہ ہندو راؤ کے چوراہے تک پہنچ چکی تھی مگر میں ابھی چوراہے سے دور تھا۔

اچانک فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی۔ یہ فائر ہی کی آواز ہو سکتی تھی۔ فائر کی آواز چوراہے کی ہی طرف سے آئی تھی۔ پھر ایک اور فائر ہوا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے۔ میں پہلے فائر کی آواز سن کر ہی اپنی پھٹ پھٹ کو بریک لگا چکا تھا اور غیر ارادی طور پر "یا اللہ خیر، یا اللہ خیر!" بڑبڑائے جا رہا تھا۔

جو ہنگامہ تھا، وہ چوراہے پر ہی ہو رہا تھا۔ وہاں مجھے کئی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں وہ کار بھی تھی جو میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزری تھی۔ میں بس اتنا اندازہ لگا پایا کہ کچھ نامعلوم افراد نے رنجیت کی کار کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ہنگامہ، رنجیت اور انھی نامعلوم افراد کے درمیان بپا ہوا ہوگا۔ اب چوراہے کی طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

اتنی دعائیں دھوں ہو جائے اور لوگ شرافت کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ کچھ ہی دیر میں چوراہے پر بھیڑ نظر آنے لگی۔ اب کچھ میری بھی ہمت بندھی کہ چل کر دیکھوں کہ کون کون اللہ کو پیارا ہوا۔ ممکن ہے چوراہے پر دس بیس لاشیں پڑی ہوں مگر جب میں وہاں پہنچا تو چوراہے پر ایک کار کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اسی کار کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا اور یہ کار رنجیت ہی کی تھی۔ میں نے اس امید پر کہ ممکن ہے، کار کے اندر شریمان رنجیت ڈھیر ہوئے پڑے ہوں، کار کے اندر نظر دوڑائی مگر کار خالی تھی۔ گویا وہاں نہ حملہ آور تھے اور نہ وہ جس پر حملہ کیا گیا تھا۔ دس پندرہ آدمیوں کا مجمع کار کے ارد گرد گھوم کر طرح طرح کے تبصرے کیے جا رہا تھا۔ سبھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ہوا کیا؟ لیکن پتا کسی کو کچھ نہیں تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ بیت الخلا میں تھا جب اس نے پہلا دھماکا سنا۔ کسی کا ارشاد تھا کہ پہلے دھماکے کی آواز سن کر اس کے ننھے کی ماں نے اسے جگایا اور میں کار کے پچھلے ٹائر کو دیکھ رہا تھا جس کی ہوا نکل گئی تھی یا نکال دی گئی تھی۔ بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ کسی نے "پولیس" کا نعرہ لگایا اور لوگ چھٹنے لگے۔

میں نے بھی یہی غنیمت جانا کہ وہاں سے کھسک لوں، سو میں کھسک لیا۔

بات کچھ پلے نہیں پڑ رہی تھی کہ اچانک یہ سب ہوا کیا! آخر سیر کو سوا سیر کہاں سے ٹکرا گئے؟ اس ہنگامے میں کم از کم اس بدذات رنجیت کو تو مر ہی جانا چاہیے تھا جو کافی عرصے سے میری چھاتی پر مونگ دل رہا تھا مگر اس کی لاش نہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے باوجود یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ کیا خبر وہ نامعلوم حملہ آور، رنجیت کی لاش اٹھا لے گئے ہوں!

جب سے سرتھامسن نے یہ بتایا تھا کہ اس سارے چکر میں دو بین الاقوامی مجرم ملوث ہیں، میری ہوا اور سرک گئی تھی۔ پتا نہیں وہ دونوں خبیث ہندوستان میں کیوں آ ٹپکے تھے اور اگر آ ہی ٹپکے تھے بدبخت تو پھر میرے گلے کیوں پڑ گئے تھے۔ کہاں میری ننھی سی جان اور کہاں اتنے ڈھیر سارے غم!

میں دو راتوں کا جاگا ہوا تھا اور اب میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ اس دن ڈیوٹی "بجا" سکتا۔ یہ سوچ کر میں اپنے گھر جانے کی بجائے پہلے لال کنوئیں کی طرف ہو لیا۔ میں لیوسی کے ذریعے دفتر میں یہ کہلوانا چاہتا تھا کہ اس دن شدید علالت کے باعث حاضری نہ دے سکوں گا۔ نوکری کرنے کے بعد گویا یہ میری پہلی چھٹی تھی ورنہ تو بس دن رات پڑائی لگی ہوئی تھی۔

لیوسی کے گھر پہنچا تو وہ کمبل ہو گئی اور مجبوراً مجھے رات بھر کی کتھا سنانا پڑی۔

"ٹھیک ہے، میں تیواڑی جی سے کہہ دوں گی۔" اس نے کہا۔ "بلکہ تم ایسا کرو، درخواست لکھ دو۔ میں کاغذ لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی۔

"لو تم نے ایک اور چکر چلا دیا۔ ارے میں نے کب چھٹی لی ہے جو مجھے پتا ہو کیا لکھا جاتا ہے درخواست میں!" میں جھنا کر بولا۔

"اچھا درخواست میں خود لکھ لوں گی، تم دستخط کر دینا۔" یہ کہتی ہوئی وہ نشست گاہ سے چلی گئی۔

میں نے سوچا، چلو یہ اچھا ہوا، لیوسی خود ہی لکھ لکھا لے گی جو جی چاہے گا۔ لیوسی کاغذ لے آئی تو میں نے اسی سے قلم لے کر دستخط گھسیٹ دیے۔

"ویسے تمھارا کیا خیال ہے، وہ نامعلوم حملہ آور کون ہو سکتے ہیں؟" لیوسی نے کاغذ اور قلم قریبی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ہوں گے کوئی اللہ کے نیک بندے، مجھے اور تمھیں کیا!" میں نے بیزاری سے کہا "میں تو اب نہاری روٹی کھا کر چین سے سوؤں گا۔ سالا کم بخت پیارے لال ہنر نے تو بھوکا مار دیا۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے واقعی یہ سوچا تھا کہ گھر جانے سے پہلے نہاری روٹی ضرور کھاؤں گا بلکہ اس میں ایک پیسے کی نلی بھی ڈلواؤں گا۔

"اچھا خیر اس وقت تم بات نہیں کرنا چاہتے نہ سہی، کل بات کریں گے اس مسئلے پر۔" لیوسی بولی۔

"جی نہیں، میری کھوپڑی میں اتنا بھیجا فالتو نہیں ہے۔" میں ہاتھ نچا کر بولا اور اسی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا "میری بلا سے رنجیت کل کا مرتا آج مر جائے بلکہ مر ہی گیا ہو کم بخت!"

لیوسی ہنس پڑی "تم تو اس وقت بالکل لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر بات..."

"بس بس!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں کسی بھی طرح بات کروں، تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر ہنسو۔"

"چائے تو پیتے جاتے۔" لیوسی میرے ساتھ ساتھ نشست گاہ سے نکلتے ہوئے بولی۔

"ناشتے کو نہ پوچھا گیا!" میں جل کر بولا "جب کہ میں بتا بھی چکا تھا، کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

"چلو ناشتا کر لو، بیٹھو تو سہی!" وہ ہنس کر بولی "مجھے کیا خبر

تھی کہ تم صبح ہی صبح ٹپک پڑو گے!"

"نہیں، بس اب میں نہاری ہی کھاؤں گا۔" میں نے گویا فیصلہ سنایا۔

لیوس سے رخصت ہو کر جامع مسجد کے قریب ایک ہوٹل میں نہاری کھانے کے بعد میں اپنے گھر پہنچا تو امّی نے آڑے ہاتھوں لیا۔

"ارے کیوں رے، تُو تو مٹی نوکری کر کے طلاق دینے گیا تھا، پھر کہاں غارت ہو گیا تھا تُو؟"

"بس امّی، سمجھ لو طلاق نہیں ہوئی۔" میں نے مردہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران سی ہو کر بولیں۔

"بس مطلب پھر بتاؤں گا، اس وقت تو بہت زور کی نیند آ رہی ہے، دو راتیں ہو گئیں جاگتے ہوئے!"

"ارے تو کیا ناشتا بھی نہیں کرے گا، بس ابھی دو منٹ میں پراٹھے ڈال دیتی ہوں۔" امّی کی ماممتا جاگی۔ "تیرے ابّا ابھی تیرا انتظار کر کر کے دُکان پہ گئے ہیں۔" یہ کہہ کر امّی باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔

"میں نہاری کھا کر آ رہا ہوں، امّی!" میں نے ان سے یہ کہہ کر انھیں باورچی خانے میں جانے سے روک دیا۔

"کہاں؟"

"ہوٹل میں۔" میں نے آہستہ سے کہا کیوں کہ مجھے یاد آ گیا تھا، امّی ہوٹل بازی کے لیے ہمیشہ منع کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، جو کھاؤ، گھر لا کر کھاؤ، رستے پنیڑے میں نہ کھاؤ۔

امّی کا پارہ چڑھ گیا۔ ممکن تھا کہ وہ ہاتھ چھوڑ بیٹھتیں مگر میں اس سے پہلے ہی وہاں سے کھسک لیا۔

آدمی دو راتوں کا جاگا ہوا ہو، پیٹ بھرا ہو اور بستر سامنے تو پھر اس کے لیے سو جانے سے بڑی "عیاشی" کوئی نہیں۔ میں ایسا پڑ کر سویا کہ شام ہی کی خبر لی۔ گرم پانی سے نہانے کے بعد جیسے ساری تھکن اُتر گئی۔ میں اندر کمرے میں کپڑے بدل رہا تھا کہ چچا بندو خاں کی آواز سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھ گیا۔ ہو نہ ہو چچا بندو خاں کو ابّا ہی نے بُلوایا ہو گا۔ اس وقت امّی انھیں آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں اور چچا بندو خاں اپنی صفائی پیش کر رہے تھے۔

"آپ سُنیں تو سہی بھابی! ایسی بات نہیں ہے! اگر ایسا ہوتا تو کوئی خفیہ میں نوکری ہی نہ کرتا!"

"ذرا تم چُپ رہو شکورن!" ابّا کی آواز آئی۔ "مجھے بات کرنے دو۔"

"ہاں بھائی صاحب بولیں۔" چچا بندو خاں بولے۔

"بھئی بات یہ ہے کہ لونڈے کو ایک اور جگہ اتنے ہی پیسوں کی نوکری مل گئی ہے اور وہاں کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں۔" ابّا نے کہا۔

"اچھا!" چچا بندو خاں حیرت سے بولے، پھر کہا۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"کیوں؟ ہماری مرضی، کرائیں نوکری کہ نہ کرائیں! وہ بھی یہی کہہ رہا تھا، ایسی ہی کوئی بات کہ چھُٹتی نہیں نوکری!" امّی کسی قدر برہمی سے بولیں۔

"مگر اس میں بندو خاں کا کیا قصور ہے بھئی! تم سمجھتی کیوں نہیں!" ابّا نے مداخلت کی۔

"دراصل بھائی صاحب، میں آپ کو صاف بات بتا دوں کہ یہ معاملہ سرکاری ہے۔ اب اگر سرکار نوکری نہ چھوڑنے دے تو بتاؤ کون اس سے ٹکر لے سکتا ہے!" چچا بندو خاں نے کہا۔

"تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے اس مٹی خفیہ میں نوکری کرا کے اپنے ہاتھ پیر کٹا لیے!" امّی پھر بول اٹھیں۔

"بھئی شکورن! تم چُپ نہیں رہ سکتیں۔ ذرا بات کو سمجھنے تو دو۔ بندو خاں ہمیں کوئی غلط مشورہ تو نہیں دیں گے، نہ غلط بات کریں گے ہم سے! آخر خود انھیں بھی تو اللہ دتّا سے محبت ہے۔" ابّا نے امّی کو پھر چُپ کر دیا۔

میں نے اس موقع پر کمرے ہی میں رہنا مناسب سمجھا اور چارپائی پر بیٹھ کر باہر آنگن میں ہونے والے مذاکرات سنتا رہا کہ دیکھوں اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اب میں پچھتا رہا تھا کہ ناحق گھر والوں کو سب کچھ بتا کر مصیبت میں ڈال دیا۔

"ہاں بھئی بندو خاں!" ابّا نے گویا معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "یہ بتاؤ کوئی صورت تمھاری نظر میں ایسی ہے کہ نوکری چھوٹ جائے؟"

"بھائی صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہاتھیوں سے گنّے کون کھا سکتا ہے! سرکار کی بات بھی ایسی ہی ہے۔ اگر اللہ دتّا نے یہ بات کہی ہے کہ نوکری نہیں چھٹ سکتی تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہی ہو گی۔ ویسے وہ نظر نہیں آ رہا ہے کہاں! آج پتا چلا کہ دفتر سے بھی چھٹی پر تھا۔" چچا بندو خاں نے ابّا کی بات کا جواب دے کر مجھ پر تان توڑی۔

امّی سے صبر نہ ہو سکا، انھوں نے پھر چچا بندو خاں کے "لتّے لیے"۔ انھوں نے کہا۔ "پوری دو راتیں اور دو دن اس نے دفتر کا کام کیا ہے۔ پرسوں رات کا گیا گیا کل صبح آیا اور کل صبح گیا تو آج صبح آیا۔ بھلا بتاؤ، کوئی حد حساب ہے کام کا! آج دن بھر

پڑا سوتا رہا ہے۔ ابھی اٹھ کر نہایا دھویا ہے، کپڑے بدلنے گیا ہے کمرے میں! تم بھی آس اولاد والے ہو بھائی! اب تمھی بتاؤ یہ ظلم ہے کہ نہیں!"

امّی نے مشاعرے والی رات کو بھی خفیہ والوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔ چچا بندو خاں بے چارے کو کیا خبر تھی کہ ان کا ہونے والا داماد گزشتہ رات ایک عدد مشاعرے کی صدارت فرما رہا تھا۔ میں جب نہا کر غسل خانے سے نکلا تھا تو ابّا گھر میں نہیں تھے۔ چچا بندو خاں کو انھوں نے غالباً بڑے بھیا کے ذریعے دُکان ہی پر بُلوا لیا تھا اور پھر انھیں گھر لے آئے تھے۔ اب کچھ کچھ بات بگڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا اس لیے مجھے "منظرِ عام" پر آنا ہی پڑ گیا۔ چچا بندو خاں کی خاموشی سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ یا تو وہ افسردہ دلول ہو گئے تھے، امّی کی باتیں سُن کر! یا پھر ناراضگی کے سبب انھیں چُپ لگ گئی تھی۔

میں نے کمرے سے نکلتے ہی ادب کے ساتھ چچا بندو خاں کو سلام کیا۔ ابّا اور چچا بندو خاں تو چارپائی پر بیٹھے تھے اور امّی پیڑھی بچھائے پیچھے سرہانے کی طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔

چچا بندو خاں نے مجھے سلام کے جواب میں دعا دے کر اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور بولے۔ "ہاں بیٹے! تم بتاؤ، کیا بات ہے؟" ان کے لہجے سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے براہِ راست اس سوال کی توقع نہیں تھی اس لیے کچھ دیر توقف کے بعد میں نے آہستہ آواز میں کہا۔ "دراصل چچا، نوکری ہے بہت سخت۔"

"اسے سخت کہہ رہا ہے!" ابّا مجھ پر برس پڑے۔ "وہ سب باتیں کیوں نہیں بتاتا جو تُو نے مجھے اور اپنی ماں کو کل صبح بتائی تھیں!"

"ابّا! وہ... وہ باتیں تو چچا کو بھی معلوم ہیں۔ یہ تو خود وہیں ملازم ہیں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

"کیوں بھئی بندو خاں، کیا کہہ رہا ہے اللہ دتّا، سن رہے ہو!" ابّا نے چچا بندو خاں کو متوجہ کیا۔

"خیر مجھے تفصیل کے ساتھ تو خفیہ کے بارے میں زیادہ باتیں پتا نہیں اور اگر پتا ہونے لگیں تو اسے پھر خفیہ ہی کون کہے! ہاں یہ ضرور خبر ہے کہ اس نوکری کا کوئی وقت نہیں۔ دن میں بھی کام ہو سکتا ہے اور رات کو بھی۔" چچا بندو خاں نے اپنا دامن بچایا، پھر قدرے رک کر بولے۔ "خیر یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی، اس وقت تو میں اللہ دتّا سے کچھ اور بات پوچھ رہا تھا۔ اصل بات تو نوکری کرنے نہ کرنے کی ہے یا یہ سمجھ لیں کہ نوکری چھُٹ بھی سکتی ہے یا نہیں!"

"مشکل ہے چچا، بہت مشکل ہے۔" میں جلدی سے بولا۔

"میں تو کل اپنی پوری کوشش کر چکا ہوں۔ مجھے تو یہ پتا چلا ہے کہ اگر خفیہ کا کوئی افسر نوکری چھوڑنا چاہے اور بڑے افسروں کو اس کی سُن گُن لگ جائے تو اسے جیل میں ڈلوا دیتے ہیں۔" جھوٹ بولتے ہوئے میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ ابّا کے چہرے پر نظر نہ پڑے ورنہ خواہ مخواہ آواز کانپنے لگے گی اور میرا جھوٹ کھُل جائے گا۔

"ارے تو تُو نے کسی سے کہا سُنا تو نہیں کم بخت؟" امّی فوراً ہی گھبرا کر بولیں۔ "کہیں انھیں کسی طرح پتا نہ چل جائے اور پھر..." اس سے آگے امّی کچھ نہ کہہ سکیں کیوں کہ ان کی آواز بھرّا گئی تھی۔

"تمھیں یہ بات پہلے بتانا چاہیے تھی بندو خاں!" ابّا فکرمند لہجے میں بولے۔

"قسم لے لو چاہے جیسی بھائی صاحب! مجھے تو خود آج یہ بات پتا چلی ہے۔ اچھا ہوا کہ میں نے کبھی نوکری چھوڑنے کی نہیں سوچا۔" چچا بندو خاں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"ایک مسئلہ اور بھی تو اٹکا ہوا ہے۔" ابّا کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"ارے تم مسئلے وسلے پر ڈالو خاک!" امّی نے کہا۔ "بس اب اس بات کا ذکر اذکار ہی نہ کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" امّی جیل کا ذکر سن کر کچھ زیادہ ہی ڈر گئی تھیں۔

"تم تو بس بات ہی نہیں کرنے دیتیں! یا تو تمھی بات کر لو یا پھر مجھے بات کرنے دو۔ پیشگی کا بھی سوچا تم نے کچھ؟ بس چُپ چاپ سے رکھ لی نوٹوں کی گڈی، صندوق میں!"

"تو تو لوٹا دو نا، مجھے نہیں چاہیے ایسی نوٹوں کی گڈی! ابھی لائے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر امّی پیڑھی سے اٹھنے لگیں۔

"ارے تمھاری تو عقل ماری گئی ہے۔ اس وقت کیا وہ بیٹھے ہوں گے اپنے دفتر میں!" ابّا نے تنک کر کہا۔ امّی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں۔

"آخر قصّہ کیا ہے؟" چچا بندو خاں نے مداخلت کی۔

"اماں قصّہ کیا ہوتا، جہاں اللہ دتّا نے نئی نوکری کی تھی وہاں سے پیشگی تنخواہ ملتی ہے، وہ یہ لے آیا تھا اور اسی کے متعلق میں سوچ رہا تھا، کیا کیا جائے، ان سے کیا کہلوایا جائے۔"

"لو اب بھی کچھ سوچنا باقی ہے! کیا میرے بچّے کو خدانخواستہ... خدا نہ کرے... میرے مُنہ میں خاک... اچھا چلو میں یہ لعنت ماری بات زبان پر لاتی ہی نہیں! خود ہی سمجھ لو، کیا کہا تھا اللہ دتّا نے کہ اگر نوکری چھوڑنے کا پتا بھی چل گیا تو کیا ہو گا۔" امّی بولے بغیر نہ رہ سکیں۔

"سمجھ گیا، اچھی طرح سمجھ گیا! تمھاری طرح عقل سے پیدل نہیں ہوں۔" ابّا کا پارہ چڑھنے لگا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید امی اور ابا میں زبردست ٹھن جاتی مگر اس وقت چچا بندو خاں بھی موجود تھے، غالباً اسی لیے امی اپنے غصے کو پی گئیں۔ انھوں نے اب خاموشی اختیار کر لی تھی جیسے ابا کی بات کا بُرا مان گئی ہوں۔

طویل مذاکرات کے بعد بالآخر یہی طے پایا جو میں چاہتا تھا۔ نئے نوٹوں کی گڈی مجھے مل گئی کیوں کہ میں نے کہا تھا، اسی دن پیشگی واپس کردی جائے۔ چچا بندو خاں نے مجھے کریدنا چاہا تھا کہ نئی نوکری کہاں اور کیسے ملی تھی مگر میں نے اُڑن گھائی بھر لی تھی۔ میں نے اسی وقت نوٹوں کی گڈی حاصل کرنے اور گھر سے غائب ہو جانے کے لیے جھوٹ بولا تھا کہ میں نئے مالک کا گھر جاتا ہوں۔ اس کے گھر جا کر پیشگی واپس کر آؤں گا۔ طے یہ پایا تھا کہ مجھے بہر حال خفیہ کی نوکری ہی کرنا ہے اور جیل نہیں جانا۔ نئی نوکری کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ میں خفیہ کی ملازمت پر لات مار دیتا۔ دھوتی کی تاک میں لنگوٹی جانے کا بھی خطرہ تھا۔

مدتِ دراز کے بعد مجھے ایک ایسا دن نصیب ہوا تھا جب مجھے دفتر کے کسی کام سے نہیں جانا تھا۔ ابھی ساڑھے چھ ہی بجے تھے، اس کا مطلب تھا کہ میں کم از کم دو تین گھنٹے چمن کی سیر کر کے گھر لوٹ سکتا تھا۔ گھومنے پھرنے اور چاٹ مسالے اُڑانے میں اسی وقت مزا آتا ہے جب جیب گرم ہو اور میری جیب گرم تھی۔ حالات معمول پر آ جانے کے بعد حسبِ روایت چچا بندو خاں کی آؤ بھگت شروع ہو گئی تھی۔

"یہ حلوہ تو کھائیں نا بھائی!" امی، چچا بندو خاں سے کہہ رہی تھیں اور چچا بندو خاں تکلف سے کام لینے کے باوجود لڈو پہ لڈو اور حلوے کی چکتی پہ چکتی اُڑا رہے تھے۔

میں نوٹوں کی گڈی، جیب میں ڈال کر پھٹ پھٹ پہ سوار اپنی گلی سے بڑی شان کے ساتھ نکلا۔ شام کے وقت کمپنی باغ میں خاصی رَول چَول ہوتی تھی۔ میں نے پہلے ادھر ہی جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہاں دہی بڑے اور چھولے بھی مزے کے ملتے تھے۔

کمپنی باغ پہنچ کر میں نے پھٹ پھٹ ایک طرف کھڑی کی اور مٹرگشتی کرنے لگا۔ کمپنی باغ سے میری مختصر سی زندگی کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے سیٹھ وشوا ناتھ کی پری رُو بیٹی سروج سے عشق لڑانے کی ناکام کوشش فرمائی تھی اور اس کے ساتھ دہی بڑے بھی کھائے تھے۔ میں نے سروج کی یاد میں دہی بڑے کھائے اور گلاس بھر کے پانی پینے کے بعد لمبی سی ڈکار لی۔ سروج بے چاری ان دنوں اپنے ابا جانی، یعنی سیٹھ وشوا ناتھ کے ساتھ جیل کی روٹیاں توڑ رہی تھی۔ پتا نہیں جیل کی روٹیاں اُسے ہضم بھی ہو رہی ہوں گی یا اس کا پیٹ خراب ہو گیا ہوگا۔ میں کافی دیر تک سروج کے تصور میں کھویا رہا۔ اگر وہ اور اس کا باپ، سرکار کے خلاف نہ ہوتے یا ایسے ویسے دھندوں میں ملوث نہ ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

میں سروج کے تصور میں کھویا ہوا آگے بڑھتا رہا اور باغ کے ایک ایسے گوشے میں پہنچ گیا جو نسبتاً ویران سا تھا۔ وہاں نیم تاریکی سی تھی۔ میری دائیں جانب پیڑوں کے جھنڈ تھے۔ بس اچانک ہی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی کا گلا دبایا جا رہا ہو اور وہ چیخنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے جسم کے سارے بال ایک ایک کر کے یا شاید ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ یہ اتنے دن پہلے کی بات ہے کہ اچھی طرح یاد نہیں کہ بال ایک ایک کر کے کھڑے ہوئے تھے یا ایک ساتھ۔ بہر حال میں اپنی جگہ ساکت سا ہو گیا۔ آواز پھر آئی۔ اب میں نے وہ آواز نسبتاً واضح طور پر سنی تھی۔ وہ کسی عورت کی گھٹی گھٹی سی آواز تھی۔ گھنے پیڑوں کے درمیان کسی سنسنی خیز "ڈراما" کی ریہرسل ہو رہی تھی یا پھر سچ مچ کوئی "ڈراما" اسٹیج کیا جا رہا تھا۔

"ب... بچاؤ... چھوڑ... چھوپ..." عورت نڈھال سی آواز میں چیخنا چاہتی تھی مگر شاید اس کے منہ پر پھر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا۔

میری جگہ اگر وہاں کوئی سچ مچ کا ہیرو ہوتا تو جھٹ نعرہ مار کر اس مظلوم عورت کو نادیدہ ظالموں سے چھڑانے جا پہنچتا اور اس کوشش میں یا تو کامیاب ہو جاتا یا پھر اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ اگر اللہ کو پیارا ہو جانا، میری نظر میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تو میں یقیناً بے خطر اس آگ میں کود پڑتا لیکن سارا مسئلہ تو یہی تھا۔ جان ہے تو جہان ورنہ کیا رکھا ہے۔ نتیجتہً میں نے وہاں سے پھوٹ لینے ہی میں عافیت سمجھی مگر شاید مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی جس پر بعد میں پچھتانا پڑا۔

نہ جانے وہ مظلوم عورت کس طرح ان دونوں کے چنگل سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ دونوں اسے دوبارہ پچھاڑ لینے کی خاطر اس کے پیچھے بھاگے اور میں غریب ان کی جھپٹ میں آ گیا۔ اس بدبخت کو بھی اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ملا تھا کہ تیر کی طرح میری ہی طرف لپکی۔ عورت کا تعاقب کرنے والوں کو غالباً یہ امید نہیں رہی ہوگی کہ پیڑوں سے نکلتے ہی اس مظلوم کو ایک عدد مددگار مل جائے گا اس لیے ان کا جھنجلا جانا فطری تھا۔ میں خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بن گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اِدھر وہ نازنیں مجھ سے لپٹی، اُدھر ان دونوں نے بغیر کسی تعارف کے میری "مزاج پرسی" شروع کر دی۔

وہ کم بخت عورت الگ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور وہ دونوں "تھر تھر" کو نظر انداز کر کے میری ٹھکائی لگا رہے تھے۔ میں

اس دوران میں کئی بار "بچاؤ بچاؤ" کے نعرے مار چکا تھا مگر وہ عورت کانپنے ہی میں اس قدر مصروف تھی کہ چیخ ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی لیے پٹتے ہوئے چیخ کر اس عورت سے کہا "ارے تم بھی تو چیخو!"

اس عورت کے چیخنے کا نمبر آنے سے پہلے ہی وہ دونوں اپنی بھڑاس نکال کر بھاگ اُٹھے۔ وہ شاید جانتے تھے کہ عورت کی چیخ سُن کر مردوں کا کلیجا پھٹنے لگتا ہے، مرد چاہے چیخ چیخ کر مر جائے کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔

ابھی میں اپنی چوٹیں سہلا کر اور کپڑے جھاڑنے کے بعد سوچ ہی رہا تھا، اس پری وش سے تعارف حاصل کروں نہ کروں کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور منمنائی "کہیں کوئی ادھر نہ آ جائے، ابھی تو میں نے اپنے کپڑے بھی درست..." اس نے جملہ اَدھورا چھوڑ دیا اور میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے "بے جگہ" تھا۔

"مگر میرا ہاتھ تو چھوڑ دو" میں نے احتجاج کیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے... اور ہاں میرا پرس... وہ بھی وہیں گر گیا... آؤ!" اس نے میرا ہاتھ کھینچا۔

"کہاں؟"

"وہاں اُدھر!" اس نے پیڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تم خود اٹھا لاؤ نا اپنا پرس" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"میں یہیں کھڑا ہوں۔"

"مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے نا! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اور پھر مجھے اپنے کپڑے بھی درست کرنا ہیں۔ کسی نے مجھے اس حال میں دیکھ لیا تو... تو... آؤ نا!"

اس نے کچھ اس ادا سے کہا کہ خوف کے باوجود مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ میں اس کے ساتھ پیڑوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ وہ اب بھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ وہ اس اندھیرے میں اپنا پرس ڈھونڈے گی کیسے؟ اور پھر یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے" اس نے میرے سوال کا جواب دیا۔ "شاید اسی طرف وہ دونوں مجھے لے گئے تھے۔"

اسی وقت قریب ہی پیڑوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بہت آہستگی سے گزرا ہو۔ میرے قدم ایک دم رک گئے اور میں ہکلایا "اُد... اُدھر کو... کوئی ہے"

"ہَوا سے پیڑوں میں سرسراہٹ ہوئی ہوگی، ڈرپوک آگے بڑھتے رہو" عورت بولی اور مجھے اس پر غصہ آ گیا۔

"لو اور سنو، میں ڈر رہا ہوں کہ تم! اور میں کیا تمھارے ابا جی کا نوکر ہوں جو تمھارے ساتھ ساتھ چلتا رہوں۔ نہیں چلتا میں! چھوڑو میرا ہاتھ!" یہ کہہ کر میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس عورت کی گرفت اس قدر سخت ہوگی، یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"خاموشی سے ساتھ چلتے رہو ورنہ دوسری صورت تمھارے حق میں نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے۔" اچانک اس عورت کا لہجہ بدل گیا۔

وہ عورت لمحے بھر میں مظلوم سے ظالم بن گئی تھی۔ لے بیٹا، اللہ دتا! چل گیا کوئی چکر۔ اب آئی تیری کم بختی! بچ، بُرے وقت سے بچ! میری کھوپڑی میں بگولے سے ناچنے لگے۔ خیریت چاہتا ہے تو کسی طرح بھاگ لے بیٹا! اِدھر یہ خیال آیا، اُدھر میں نے اس "مظلوم" عورت کو زور سے دھکا دیا، اتنی زور سے کہ خود بھی اسی کے ساتھ زمین پر لڑھک گیا مگر اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ میرا ہاتھ اس عورت کی گرفت سے آزاد ہو گیا تھا۔ عین اسی وقت چکاچوند سی ہو گئی، پھر زوردار دھماکا سنائی دیا۔ پتا نہیں مجھ پر گولی چلائی گئی تھی یا اس حرّافہ پر! کیوں کہ ہم دونوں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ عورت کسی بندریا کی طرح ایک دَم اچھل کر قریبی پیڑ پر چڑھنے لگی تھی۔ جب تک روشنی کا دائرہ پیڑ کے تنے تک پہنچا، وہ غائب ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ پھر گولی چلی۔ اندھیرے میں روشنی کی ایک لکیر سی اسی طرف جھپٹتی دکھائی دی تھی جدھر سے پہلے گولی چلائی گئی تھی۔ گولی کا جواب گولی سے دیا گیا۔

اللہ دتا پیارے! یہ سوال جواب ہونے دے اور لُتریاں سے چھپت ہو جا! میں نے سوچا اور اپنے کانپتے جسم کو لیٹے ہی لیٹے ایک طرف لڑھکا دیا۔ ادھر شاید ڈھلان تھی۔ میں کچھ دور تک بغیر کسی کوشش کے لڑھکتا چلا گیا اور پھر میں نے تپّی بھر لی۔ نہ جانے کس طرح میں گرتا پڑتا اس پیڑوں کے جھنڈ سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے خود کو باغ کے عقبی دروازے سے قریب پایا۔ اپنی پھٹ پھٹ میں نے صدر دروازے کے قریب کھڑی کی تھی اس لیے ذیلی سڑک سے گھوم کر لپکتا ہوا اُدھر پہنچا۔ فائرنگ کی آواز یقیناً دور دور تک سنی گئی ہوگی۔ ہر طرف بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی جیسے بَلوا ہو گیا ہو۔ اس بھگدڑ سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ کسی نے میرے بگڑے ہوئے حلیے کی طرف توجہ نہیں دی۔

یہ ایسا موقع تھا کہ نہ "آؤ" دیکھا جا سکتا تھا نہ "تاؤ" اس لیے میں نے دونوں میں سے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور اپنی پھٹ پھٹ لے کر وہاں سے بھاگ لیا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ پھٹ پھٹ مجھے لے کر بھاگ لی۔ میں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ اب "دھائیں دھوں" سنائی نہیں دے رہی تھی مگر جس

طرح موت کا کوئی وقت مقرر نہیں" دھائیں دھوں" کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا' نہ جانے کب اور کہاں ہو جائے! میں تو اچھا خاصا بن ٹھن کر سیر سپاٹا کرنے نکلا تھا اور خواہ مخواہ مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

ضروری تھا کہ گھر جانے سے پہلے میں کم سے کم اپنا حلیہ درست کر لیتا۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا' دونوں کہنیوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں اور دایاں گھٹنا بھی دُکھ رہا تھا' اس کے علاوہ میرے کپڑے بھی قابلِ دید ہو رہے تھے۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر یقیناً امّی بڑا واویلا مچاتیں۔ مَیں نے اسی لیے چاندنی چوک میں ایک جراح سے اپنی تھوڑی بہت ضروری مرمت" کرائی" اور وہیں کپڑے وپڑے جھاڑ جھوڑ کر گویا دوبارہ آدمی کی جُون میں آگیا۔ میں نے سارا الزام بے چاری پھٹ پھٹ پر رکھ دیا تھا کہ اس نے مجھے گرا دیا تھا۔ جراح کی" تفتیش" سے بچنے کے لیے آخر میں اور کہتا بھی کیا! پھر یہی بنا بنایا پلاٹ امّی کے سامنے بھی کام آیا کیوں کر پھٹے ہوئے ہونٹ کو چھپانا کسی طور ممکن نہیں تھا۔

گھر پہنچ کر جب میں نے کپڑے بدلے تو عقدہ کھلا' نوٹوں کی گڈی غائب تھی۔ پتا نہیں وہ کب اور کہاں موقع غنیمت جان کر مجھے داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اس گڈی میں سے میں نے صرف ایک نوٹ تڑایا تھا' دہی بڑے کھانے کے لیے! مجھے کیا خبر تھی کہ یوں وہ نئے نئے نوٹوں کی گڈی بچھڑ جائے گی اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ نہ جانے کس بُرے وقت میں نے کمپنی باغ جانے کے لیے سوچا تھا' اس سے تو اچھا تھا کہ گھر ہی میں رہتا۔ نہ میں گھر سے نکلتا' نہ گڈی ساتھ لے کر جاتا' نہ وہ حرّافہ مجھے ملتی اور نہ یہ دن بلکہ رات دیکھنا پڑتی۔ پٹائی الگ ہوئی۔ اگر زیادہ ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی پھر کیا ہوتا! کسی کا بھلا کیا جاتا' بھگتنا تو مجھے پڑتا نا! اسی حرّافہ کو کوستے کوستے اور اسی کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس شب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح تک ہونٹ کی سوجن خاصی کم ہو چکی تھی مگر امّی کا مطالبہ تھا کہ میں مزید ایک دن دفتر سے گولا مار جاؤں۔ ایک دفعہ گھر سے باہر پیر نکل جائے تو بس نکل جاتا ہے۔ گھر میں دن بھر پڑے پڑے چارپائی توڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے امّی کو دو چار دفعہ ہنس ہنسا کر دکھانے اور یہ یقین دلانے کے بعد کہ میں قطعی بخیر و عافیت ہوں' دفتر جانے کی اجازت لے ہی لی۔

پہلے میں نے سوچا کہ لیوسی کو بھی ساتھ لیتا چلوں مگر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ لیوسی یوں ہی بات بات پر پھیلنے لگتی تھی۔ زیادہ گھاس ڈالنا اس کی صحت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں سیدھا دفتر کی طرف ہو لیا۔

دفتر پہنچنے کے بعد میں اپنی پھٹ پھٹ کھڑی کر کے اندر جانے کے لیے بڑھ ہی رہا تھا کہ اس" پاکٹ سائز" پر میری نظر پڑی' چیچک رُو' پستہ قد' موٹا اور سیاہ شخص یعنی لیوسی کا عاشقِ صادق شیکھر! وہ بھی دفتر کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ لیوسی کے معاملے میں جب اس سے تیری میری تُو تکار ہوئی تھی' اس کے بعد آج ہی وہ مجھے دکھائی دیا تھا۔ اس نے اور میں نے ایک ہی ساتھ' ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جانا چاہتا ہو۔ میں نے بھی جواباً فوں فاں کی۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ خلافِ توقع ہنس پڑا مگر میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی ہنسی تضحیک آمیز تھی جیسے کوئی کسی بچے کی حرکت پر ہنستا ہو۔ ایمان داری کی بات تو یہ ہے' میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس موٹے کو اٹھا کر زمین پر دے ماروں تاکہ وہ آئندہ پھر کبھی اپنے گندے دانتوں کی نمائش نہ کر سکے مگر جسمانی طور پر وہ مجھ سے طاقت ور نظر آتا تھا۔ پھر مجھے اس کا دعویٰ بھی یاد آگیا تھا کہ اسے ہلانا بھی میرے لیے ناممکن ہے۔ اچھا بیٹا' جا تو بھی کیا یاد کرے گا' جا معاف کیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔ وہ واقعی رقیب بھی تھا اور اللہ کے فضل سے رُوسیاہ بھی! وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر جا رہا تھا اس لیے میں آہستہ چلنے لگا تاکہ وہ جلد سے جلد میری نظروں سے دور ہو جائے۔ حالانکہ میں اس سے آگے نکل جاتا تو وہ بہ آسانی مجھے نظر آنا بند ہو جاتا مگر غصے میں ان باتوں کا خیال کب رہتا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ مجرموں کا آلۂ کار ثابت ہو جانے کے بعد اس صورت حرام کا پتا کٹ گیا ہو گا مگر دفتر میں اس کی آمد سے پتا چل رہا تھا کہ ابھی پتا جُڑا ہوا تھا۔

مَیں اپنے کمرے میں پہنچا تو پتا چلا کہ کمال کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔

"بقیہ پلٹن کہاں ہے؟" میں نے اپنی کرسی پر براجمان ہو کر کمال سے پوچھا۔

"کیا فرمایا سر! کون؟" کمال حیران سا ہو کر بولا۔ شاید وہ "پلٹن" کا مطلب واقعی پلٹن ہی سمجھ بیٹھا تھا۔

"اماں یہ کمار' پیارے لال' ہنر' مجید' گپتا' یہ سب کہاں ہیں؟ کیا ابھی تک کوئی نہیں آیا؟" آخری جملہ کہتے ہوئے میرے لہجے میں افسرانہ سختی آگئی۔

"ان سب کی ڈیوٹیاں لگ گئی ہیں سر!" کمال نے میری بات سمجھ کر جواب دیا۔

"ڈیوٹیاں لگ گئی ہیں' کیسی ڈیوٹیاں؟ اور کس نے لگائی

ڈیوٹیاں؟ ان کا افسر میں ہوں کہ کوئی اور! کیا بکواس کر رہے ہو!"

"آپ کے بھی تو افسر ہیں سر!" کمال سنجیدگی سے بولا۔

"ارے ہاں' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" میرا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر مَیں نے نرم لہجے میں کہا" تیواڑی جی نے لگائی ہوں گی ڈیوٹیاں؟"

"یس سر!"

"تمھیں کچھ خبر ہے کب اور کہاں کے لیے یہ ڈیوٹیاں لگائی گئی ہیں؟"

"کب کے بارے میں تو پتا ہے سر' کہاں کے متعلق علم نہیں۔ کسی نے بتایا نہیں' میں نے پوچھا نہیں" کمال نے جواب دیا۔

"کل میری غیر موجودگی میں اور کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی؟ ڈیوٹیاں بھی ظاہر ہے کل ہی لگائی گئی ہوں گی' میری مراد اس کے علاوہ کسی اور بات سے ہے"

"جہاں تک میرے علم میں ہے اور کوئی ایسی بات . . ." کمال فقرہ اُدھورا چھوڑ کر کچھ سوچنے لگا' پھر بولا" نہیں سر کوئی بات نہیں"

میرے چار عدد ماتحتوں کو میری غیر موجودگی میں" دیہاڑی" سے لگا دیا گیا تھا' یہ بات میرے لیے تشویش ناک بہرحال تھی۔ ماتحت" دہاڑی" سے لگتے ہیں تو افسر کو بھی چاہیے" شرما حضوری" ہی سہی' تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مارنا ہی پڑتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب مجھے بھی بہت جلد" ہانکا" جانے والا تھا۔

معاً مجھے لیوسی کا خیال آیا۔ اسے ضرور معلوم ہو گا کہ یہ کیا نیا چکر چلا ہے۔ وہ تو کل بہرحال دفتر ہی میں رہی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور کمال سے کہا کہ اگر کدھر ہی سے میری طلبی ہو تو میں لیوسی کے کمرے میں ہوں۔ کمال نے" یس سر" کہہ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

مَیں' لیوسی کے کمرے میں پہنچا تو اسے بھی غائب پایا۔ ممکن ہے' وہ ابھی نہ آئی ہو۔ یہ سوچ کر میں نے دل کو تسلی دی اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اسی وقت میری نظر چپراسی پر پڑی اور میں نے اس سے لیوسی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا' ہاں اس سے یہ ضرور پتا چل گیا کہ" لیوسی خانم" بھی کل دوپہر کے بعد سے نظر نہیں آئی تھیں۔

ہو نہ ہو کوئی چکر ضرور ہے اللہ دتا! یہ سب کے سب بے سبب غائب نہیں ہو سکتے۔ میں نے سوچا اور پھر جیسے میرے قدم خود بہ خود تیواڑی جی کے کمرے کی طرف اٹھنے لگے۔ اس راز سے اسی کمرے میں پردہ اٹھ سکتا تھا۔ تیواڑی جی کا سامنا کرنے سے عموماً میں کنّی کاٹتا تھا مگر یہ موقع مختلف تھا۔

تیواڑی جی جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے مجھے فوراً اندر بُلا لیا۔ جب مَیں ان کی اجازت پا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو انھوں نے چُبھتے ہوئے لہجے میں کہا" کیوں طبیعت ٹھیک ہو گئی اب؟"

"جی سر' کچھ کچھ" میں نے جواب دیا۔

"اس محکمے میں حرام خوری نہیں چلتی' سمجھے!" انھوں نے سگریٹ کا دُھواں اُگلتے ہوئے کہا" کام کرنا پڑتا ہے' یہاں! آئندہ گھر بیٹھ کر مت کہلوا دینا کہ بیمار ہو ورنہ میں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھی درخواست ہی کے ساتھ منگوایا کروں گا!"

"مگر سر . . . میں نے تو کل پہلی بار بیمار . . . وہ میرا مطلب ہے پہلی بار چھٹی . . ."

"بکواس مت کرو" تیواڑی جی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی مجھے ڈانٹ دیا' پھر بولے" کل ڈی جی صاحب بھی تمھیں پوچھ رہے تھے۔ انہی کے لاڈ پیار نے تو تمھیں بگاڑ دیا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ تم جب ڈیوٹی پر آؤ تو تمھیں ان کے پاس بھیج دیا جائے۔ جاؤ انہی سے جا کر ملو' میرے پاس کیوں آگئے!"

"آپ کے پاس تو سر' ایک اور مسئلے کے لیے آیا تھا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا تھا سر' کہ میرے ماتحتوں کی ڈیوٹیاں . . ."

"وہ بھی ڈی جی صاحب کے براہِ راست حکم پر لگائی گئی ہیں' انہی سے پوچھنا' مجھے کچھ پتا نہیں"

آج تیواڑی جی کچھ زیادہ ہی اُکھڑے اُکھڑے نظر آرہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ اپنی" جُورو" سے لڑ کر تو نہیں آئے۔ میں نے چاہا' ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ بات پوچھ ہی لوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا" سر! آج کہیں آپ اپنی' ڈی آئی جن' سے لڑ کر تو نہیں آئے؟" ڈی آئی جی کی بیوی کے لیے مجھے" ڈی آئی جن" سے بہتر لفظ نہ سوجھ سکا۔

"ڈی آئی جن کون؟" وہ غرّائے۔

"وہی سر . . . یعنی کہ شریکِ غم . . . نہیں غم گسار . . . نہیں یہ بھی نہیں بلکہ شریکِ . . ."

"تمھارا سر!" تیواڑی جی' میز پر ہاتھ مار کر دہاڑے۔ وہ غالباً میری بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

"نہیں سر! میرا سر آپ کا شریک . . . وہ . . . یعنی کہ کس طرح ہو سکتا ہے!" میں سہم کر بولا۔

"تم دفع ہو سکتے ہو!" تیواڑی جی نے یہ کہتے ہوئے اس طرح سگریٹ کو ایش ٹرے میں مَسلا جیسے سگریٹ کی بجائے ان کے قبضے میں میرا سر ہو۔

میں ڈر کے مارے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ نیکی کر دریا میں ڈال! ایک تو میں ان کا غم بانٹ رہا تھا اور وہ تھے کہ اُلٹے آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ یہ سوچتا ہوا میں ان کے کمرے سے نکل آیا۔ پتا نہیں لوگ 'گھر کی جھونجل' دفتر والوں پر کیوں اتارتے ہیں!

ایک تو میں ویسے ہی تپا ہوا تھا، دوسرے دلاور خاں مل گئے۔ انھوں نے چھوٹتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگا دی، بولے۔ "آج کل تم ڈی جی صاحب کے کمرے کی طرف آتے جاتے بہت دیکھے جا رہے ہو۔ جو زیادہ اونچا اُڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ مُنہ کے بل زمین پر گرتا ہے۔ ہر دفعہ اندھی نہیں لگتی!" ان کا اشارہ سیٹھ وشوا ناتھ کے کیس کی طرف تھا۔

"اندھی لگے کہ سوجھتی، آپ کی بَلا سے! آپ کو کیا!" میں جل کر بولا۔

"ہماری ہی بلّی اور ہمیں ہی میاؤں! بھول گئے کہ کل تک اسی ٹانگ کے نیچے تھے۔ تم جیسے کتنے لونڈے اب تک ٹانگ کے نیچے سے نکالے ہیں، میں نے!" دلاور خاں گرم ہو گئے۔

"آپ لونڈوں کو ٹانگ کے اوپر سے نکالیں یا نیچے سے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے رُکھائی سے جواب دیا اور آگے بڑھنے لگا۔

"لکھ لو، بزرگوں کی نافرمانی کرو گے تو اللہ نے چاہا، زندگی بھر خواری میں گزرے گی۔" دلاور خاں نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

مجھے کیا پڑی تھی جو اُن کا قول لکھ کر اپنا وقت ضائع کرتا، یہ بات مجھے خود بھی معلوم تھی اسی لیے میں اپنی راہ ہو لیا۔ جیسے دیکھو زبردستی میرا بزرگ بننے پر اُتارو تھا۔ پتا نہیں میں نے کچھ دن ان کی ماتحتی میں رہ کر کون سا ایسا بھاری قصور کیا تھا جس کی سزا مجھے اب تک مل رہی تھی۔

میں جلتا کُڑھتا، سر تھامسن کے کمرے تک پہنچا۔ میری صورت پر لازماً بارہ بج رہے ہوں گے اسی لیے چچا بندو خاں نے مجھے دیکھتے ہی فکرمند لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا بیٹے؟ تم... کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔"

"نہیں تو چچا، ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا اور ان کی تسلی کے لیے دانت بھی نکال دیے۔

میری طرف سے مطمئن ہو کر چچا بندو خاں، صاحب بہادر، یعنی سر تھامسن کو میری آمد سے مطلع کرنے چلے گئے۔ سر تھامسن چاہتے تو اپنے لیے سیکریٹری دیکریٹری قسم کی کوئی خوب صورت سی "چیز" بھی رکھ سکتے تھے مگر نہ جانے کیوں انھوں نے یہ تکلف نہیں 'پالا' تھا۔ شاید یہ بھی ان کی کوئی ادا رہی ہو گی یا پھر وہ اپنی سوکھی سڑی جورو کیٹی سے ڈرتے ہوں گے۔ وہ لاکھ "لمڈور" تھی مگر تھی تو جوان!

"چچا بندو خاں نے باہر آ کر بتایا "بیٹے! صاحب نے تمھیں دس بج کر گیارہ منٹ اور نو سیکنڈ کا وقت دیا ہے۔"

مجھے سر تھامسن کے اس خنّاس کا علم تھا۔ میں نے اسی لیے فوراً چچا بندو خاں سے ٹھیم معلوم کیا جو اس وقت اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھ رہے تھے۔

"بس بالکل تیار رہو۔" چچا بندو خاں نے وارننگ دی۔ "صرف تیرہ سیکنڈ باقی ہیں۔"

میں نے سوچا کہ وہ بڈھا اگر مجھے دو چار سیکنڈ پہلے یا بعد میں بُلا لیتا تو کون سی اس کی ذات گھٹ جاتی! مگر پھر اسے انگریز کون سمجھتا!

"ہاں جاؤ!" وقتِ مقررہ پر چچا بندو خاں نے "سگنل" دیا۔

میں نے لپک کر دروازہ کھولا اور غڑاپ سے اندر پہنچ گیا۔ سر تھامسن کی طرف بڑھتے ہوئے میرا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا۔ صبح سے میں خوار ہو رہا تھا اور قوی امکان یہی تھا کہ مزید خوار ہونا پڑے گا لیکن سر تھامسن کے چہرے پر خوش گوار تاثرات دیکھ کر میری کچھ ڈھارس بندھ گئی۔

"سیٹھ عثمان کو جانتے ہو؟" جب میں ان کا اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو انھوں نے پوچھا۔

"جی نہیں سر!" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتا تھا کہ وہ خاصا مشہور شخص ہے اس لیے تم اس سے واقف ہو گے۔ خیر... تمھیں اس کے منیجر رگھوناتھ کا پتا چلانا ہے۔"

"کہاں جا کر پتا کروں سر؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب میں سر تھامسن نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر نہ جانے کیوں ان کے بوڑھے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "خوش مزاج ہونا اچھی بات ہے اے ڈی! مگر ہر بات کا وقت ہوتا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"بالکل ہوتا ہے سر!" میں نے سر ہلا کر ان کی تائید کی، پھر انھیں مزید خوش کرنے کی خاطر بولا۔ "وقت بہت ہی قیمتی چیز ہے سر! ایک سیکنڈ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ایک ہی سیکنڈ تو ہوتا ہے سر، جب آدمی اس دنیا میں آتا ہے اور وہ بھی ایک سیکنڈ ہوتا ہے جب وہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔"

سر تھامسن واقعی خوش ہو گئے۔ "میں نے کم ہندوستانی ایسے دیکھے ہیں جنھیں وقت کا احساس ہو۔ مجھے تمھارے خیالات جان کر خوشی ہوئی اے ڈی!" سر تھامسن نے کہا۔ پھر میں دانت نکال کر مزید کچھ کہنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ وہ اصل مسئلے کی طرف لوٹ آئے۔ "ہاں تو تمھیں سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہیں۔"

"قطعی کرنا ہیں۔" میں نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔" سر تھامسن مطمئن لہجے میں بولے۔ "اب تم جا سکتے ہو، رپورٹ مجھے ہی دینا۔"

"جا... یعنی کہ جا سکتا ہوں؟" میں نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"کیوں، تمھیں کچھ کہنا ہے؟" سر تھامسن نے میری طرف عجیب سے انداز میں دیکھا۔

"کہنا... کہنا تو بہت کچھ تھا سر... مگر... ایک بات ہو تو کہوں۔"

"اگر کوئی بہت ضروری بات ہے تو جلدی سے کہہ دو کیوں کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔"

"جلدی سے... وہ... وہ تیواڑی... یعنی ڈی آئی جی صاحب... سر... وہ کہہ رہے تھے..."

"کیا کہہ رہے تھے؟" سر تھامسن شاید میرے ہکلانے سے جھنجلا گئے۔

"وہ کہہ رہے تھے سر کہ... کہ آپ ہی کے حکم پر ان... سب کی... یعنی میرے ماتحتوں کی ڈیوٹیاں لگائی گئی ہیں۔"

"تو پھر؟ تمھیں کیا کہنا ہے، وہ کہو۔"

"ان کی ڈیوٹیاں آپ نے سر... کہاں... کہاں پہ لگائی ہیں؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

"اے ڈی!" سر تھامسن کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو!"

"ن... نہیں تو سر! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ..."

"تم جا سکتے ہو!" اس بار سر تھامسن کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔

میں گھبرا کر فوراً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ب... بہ... بہتر ہے سر!" میری بوکھلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ میں کرسی سے الجھ کر گرتے گرتے بچا جس پر مزید "جھاڑ" سننا پڑی۔

میں دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ سر تھامسن نے گھنٹی بجائی۔ چچا بندو خاں نے دوسرے ہی لمحے دھڑ سے دروازہ کھولا۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اس لیے اس کا پٹ میرے ماتھے پر پڑا اور میرے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چچا بندو خاں اپنے ہونے والے داماد کو "مضروب" دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ وہ میرا ماتھا سہلانے لپکے ہی تھے کہ سر تھامسن کی چنگھاڑ سنائی دی۔ "بنڈو کان!"

"ج... جی سرکار!" چچا بندو خاں کسی پھرکنی کی طرح اپنے صاحب بہادر کی طرف گھوم گئے۔ ان کے لیے شاید یہ بڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ایک طرف صاحب کی پکار تھی اور دوسری طرف متوقع داماد کی مضروب کھوپڑی! وہ بے چارے کدھر پہلے دھیان دیتے مگر میں نے انھیں اس آزمائش سے بچا لیا اور اپنا ماتھا خود اپنے ہاتھ سے سہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا۔

ابھی میں سر تھامسن کے کمرے سے نکل کر کچھ دور گیا ہوں گا کہ چچا بندو خاں ہانپتے کانپتے مجھ تک پہنچ گئے۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹے؟" انھوں نے اپنے سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے... مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ دروازے کی دوسری طرف تم ہو ورنہ..."

"کچھ نہیں چچا!" میں ان کی بات کاٹ کر بولا۔ "ایسا ہو جاتا ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے بیٹے! میں چلا صاحب کہیں پھر نہ بُلالیں۔" یہ کہتے ہی چچا بندو خاں جس طرح آندھی کی طرح آئے تھے، طوفان کی طرح واپس ہو گئے۔

چچا بندو خاں کی واپسی کے بعد میں پھر چل دیا۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی "غم زدہ" سا راگ چھیڑ دوں۔ کیا اپنے کیا پرائے سبھی میرے جسم کی مرمّت پر اُتارو ہو رہے تھے۔ پھر اس نوکری نے اور میرا لہو پی لیا تھا۔ اب پتا نہیں یہ اُلّو کی دُم سیٹھ عثمان نہ جانے کون بلا تھا جس کے منیجر رگھوناتھ کا مجھے پتا چلانا تھا۔ میں نے تو اب تک سیٹھ عثمان کا نام نہیں سنا تھا۔ نہ جانے وہ کس گلی، کس محلّے میں مشہور تھا۔ جبلی قبر پر تو اسے کوئی نہیں جانتا تھا ورنہ کبھی تو میرے کانوں میں اس کا نام پڑا ہوتا۔

میں سوچ میں گم اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں ایک سریلی آواز آئی اور میں چونک اٹھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف سے لیوسی آتی دکھائی دی۔ اسی نے مجھے پکارا تھا۔

وہ قریب آئی تو میں نے اپنا سارا غصّہ اس پر اتار دیا۔ "کہاں مر گئی تھیں تم؟"

"کیا؟ تم ہوش میں تو ہو!" اس نے بھی جواب میں آنکھیں نکالیں۔

"تو کیا تمھیں بے ہوش نظر آ رہا ہوں!" میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"سر تھامسن سے ڈانٹ کھا کر تو نہیں آ رہے کہیں!" لیوسی نے کہا۔

"ہاں آ رہا ہوں ڈانٹ کھا کر! پھر؟ تم کون..."

"قاضی کہ مُلّا! یہی کہنا چاہتے ہو نا تم!" لیوسی نے میری بات کاٹ دی۔ "تو سنو، اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ میں ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوں اور یہ بھی سمجھ لو کہ میں بدتمیزی قطعی پسند نہیں کرتی۔"

"دِکھا لو تم بھی آنکھیں دِکھا لو۔ آج کا تو دن ہی منحوس ہے۔" میں نے کہا۔ پھر معاً مجھے یاد آیا کہ لیوسی یقیناً سیٹھ عثمان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہو گی، اسے ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں ایک دم نرم لہجے میں بولا۔ "جا کہاں رہی ہو تم؟"

"جا نہیں رہی بلکہ آ رہی ہوں۔" اس نے بھی جواباً نرم لہجہ اختیار کیا۔

"کہاں سے ؟" میں نے دریافت کیا۔

"تیواڑی جی کے پاس سے ؟" اس نے بتایا۔

"تو پھر میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں" میں بولا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، مجھے پھر جانا ہے مگر خیر کچھ دیر رک سکتی ہوں۔"

"ہاں سبھی مصروف ہیں، کسی کے پاس وقت نہیں، ایک فالتو تو بس میں ہی رہ گیا ہوں۔"

لیوسی ہنس پڑی۔

"ہنس لو ہنس لو، کبھی میرا بھی وقت آئے گا ہنسنے کا۔" میں جل کر بولا۔

"نہیں کس نے منع کیا ہے ہنسنے سے، تم بھی ہنس سکتے ہو۔" لیوسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب زیادہ مت تپاؤ، پہلے ہی یہاں کلیجا سلگا ہوا ہے۔" یہ کہتے ہوئے مجھے رقیبِ رُوسیاہ یعنی شیکھر کا خیال آ گیا۔ دفتر پہنچتے ہی پہلے اسی کی منحوس صورت مجھے دکھائی دی تھی۔

"اب چلو گے بھی یا یہیں کھڑے رہو گے!" لیوسی بولی۔ "مجھے جانا بھی ہے۔"

"ارے ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، چلو!" میں جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

میرے کمرے میں "یس سر" یعنی کمال موجود تھا اس لیے گفتگو کی خاطر لیوسی کو میں اسی کے کمرے میں لے گیا۔

"یہ بہت اچھا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی ماتحت واتحت قسم کی چیز نہیں ہے۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہوا تم نے اس 'پاکٹ سائز' کو بھی اپنے پاس سے ٹرخا دیا۔"

"شیکھر کو تم نے 'پاکٹ سائز' خوب کہا۔" لیوسی بولی۔ "لیکن اس نے سن لیا تو تجھے سے اکھڑ جائے گا۔ تم نے جو یہ ماتحتوں والی بات کہی تو ایسا نہیں ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے، متھی کر دیے جاتے ہیں ماتحت! پچھلے کیس میں بھی ہم تمہارے ساتھ کام کر رہی تھی اور اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو، تمہیں جو بات کرنا تھی، کرو۔"

"یہ سیٹھ عثمان کس چڑیا کا نام ہے ؟"

"یہ کسی چڑیا کا نہیں بلکہ اس شہر کے ایک مشہور آدمی کا نام ہے، اگلا سوال!"

"ابے تو کہاں مشہور ہے ؟ کچھ اتا پتا بھی ہے کم بخت کا ؟" میں نے چڑ کر کہا جیسے وہ کیوں بس "مشہور مشہور" کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

"کیوں، تمہیں کیا کام پڑ گیا اس سے ؟ کوئی عالی شان حویلی بھرانا ہے ؟" لیوسی معنی خیز لہجے میں بولی۔

"مجھے کیوں اس سے کوئی کام ہوتا! مجھے تو اس کے منیجر۔۔۔ کیا نام ہے بدذات کا۔۔۔ لو اور سنو، اس کم بخت کا نام ہی بھول گیا میں! اب کیا ہو گا ؟"

"جو اللہ چاہے گا۔" لیوسی آہستہ سے بولی۔

"چپ رہو، مجھے اس کا نام سوچنے دو۔" میں نے لیوسی کو ڈانٹ دیا۔ "رگھو۔۔۔ ! رگ، پر تھا۔۔۔"

"تو پھر تم سوچتے رہو، میں چلی۔" لیوسی یہ کہہ کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جب یاد آ جائے تو بتا دینا۔"

"ارے ارے، تم۔۔۔ تم تو بہت بری ہو! مجھے مصیبت میں چھوڑ کر جا رہی ہو۔"

"بری ہوں اسی لیے تو جا رہی ہوں۔"

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی بٹھاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "وہ تو میں یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ سچی بھئی تم تو بہت ہی اچھی ہو۔"

"بے وقوف بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔" لیوسی نے ایک ادا سے کہا۔

"اے لو، میں تمہیں کیوں مزید بنانے لگا، تم تو پہلے ہی سے بنی بنائی ہو۔"

"پھر آ گئے اپنی اصلیت پر!"

"دیکھو لیوسی، اس وقت مجھ سے لڑو لڑاؤ بالکل نہیں۔" میں نے بے حد نرمی سے کہا۔ "میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔ سر تھامسن نے میرے سپرد ایک کام کیا ہے اور مجھے انہی کو رپورٹ دینا ہے۔ یوں بھی میں اور تم ایک ہی کیس پر کام کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ تم مجھ سے عشق بھی کرتی ہو اس لیے تم پر لازم ہے کہ میری مدد کرو۔ مجھے سیٹھ عثمان کے منیجر۔۔۔ لو یاد آ ہی گیا، اس کم نصیب کا نام۔۔۔ رگھوناتھ۔۔۔ ہاں یہی نام تھا۔ تو مجھے اس کا پتا چلانا ہے۔ اب تم مجھے جلدی سے یہ بتا دو کہ کیسے چلاؤں پتا ؟ مجھے تو اس کا گھر بھی نہیں معلوم!"

"اور میں نے تو اس کا نام ہی آج پہلی بار سنا ہے۔" لیوسی میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"لو، کر لو دکان داری! اب کیا ہو گا ؟"

"ہو گا کیا، پتا چلاؤ اور مزید اداکاری کر کے میرا وقت ضائع نہ کرو، مجھے واقعی ضروری کام سے جانا ہے۔"

لیوسی کی بات سن کر غصے کی ایک لہر اٹھی ضرور مگر میں نے موقع محل دیکھ کر خود کو اس میں بہہ جانے سے روک لیا اور ایک بار پھر نرمی سے بولا۔ "لیوسی! کم سے کم تم مجھے سیٹھ عثمان کے بارے میں تو بتا ہی سکتی ہو کہ وہ کہاں ملے گا ؟"

"کیا واقعی تم اسے نہیں جانتے ؟" لیوسی نے حیرت سے کہا۔

"اور کیا بے واقعی!" میں پھر چڑنے لگا۔

پھر لیوسی کو شاید مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ اس نے نہ صرف سیٹھ عثمان

کا پتا دیا بلکہ اچھی طرح محلِ وقوع بھی سمجھا دیا۔ اس کے بعد مجھے لیوسی سے مزید کچھ معلوم نہ ہو سکا کیوں کہ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

سر تھامسن کا حکم تھا کہ میں سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کا پتا چلا کر انھیں رپورٹ دوں اس لیے دفتر میں میری موجودگی ضروری نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ دن ہی دن میں یہ کام نمٹا دوں تاکہ رات کو چین سے پاؤں پسار کر سوؤں۔ کیوں کہ اب براہِ راست سر تھامسن ہی مجھے "دہاڑی" سے لگائے ہوئے تھے اس لیے تیواڑی جی کی طرف سے میرے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ میں کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہی دفتر سے غائب ہو سکتا تھا مگر پھر بھی کمال سے کہہ کر چلا کہ پتا نہیں، کب واپس آؤں۔

میں نے دفتر کی عمارت سے نکل کر پھٹ پھٹ سنبھالی اور سیٹھ عثمان سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا تھا کہ خود اسی سے پوچھ لوں گا کہ میاں سیٹھ صاحب، تمہارا منیجر کہاں ہے ؟

نئی دہلی میں اس وقت تک یا تو انگریز بسے تھے یا ان کے کچھ خاص چمچے! یہ سیٹھ عثمان بھی مجھے چمچہ ہی معلوم ہو رہا تھا ورنہ اچھا بھلا شہر چھوڑ چھاڑ کر وہاں کیوں رہتا۔

میں اپنی پھٹ پھٹ دوڑاتا ہوا اجمیری گیٹ سے نکل کر کچھ دیر بعد ہی نئی دہلی کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ ایک ٹرک میرے قریب سے گزرا اور پھر کچھ دور چل کر بیچ سڑک پر اس طرح رک گیا کہ میری پھٹ پھٹ کا نکلنا ممکن نہ رہا۔ سڑک یوں بھی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ میں نے پھٹ پھٹ کو روک لیا۔ وہ ٹرک مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے پچھلے حصے میں چار پانچ مزدور پھاوڑے اور کدالیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مزدور کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں، ایک کار میری پھٹ پھٹ کے قریب ہی آ کر رکی اور ہارن دینے لگی۔ میں نے دیکھا اس کار میں تین افراد سوار تھے۔ دو آگے بیٹھے تھے ایک پیچھے! کار والوں کے ہارن کا جب ٹرک والوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص، دروازہ کھول کر اترا اور میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ تاریک شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا اور جسم پر سوٹ تھا۔ جب وہ ٹرک کی طرف چلا تو میں نے اسے لنگڑاتے ہوئے بھی دیکھا مگر اس کے باوجود میرے ذہن میں بار بار "پاکٹ سائز، پاکٹ سائز" گونجتا رہا۔

اسی وقت میرے ذہن میں آیا کہ آخر ٹرک کو ایک دم بیماری کیا لاحق ہو گئی ؟ میں بھی اپنی پھٹ پھٹ کھڑی کر کے "پاکٹ سائز" کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

پھر جب میں نے ٹرک کے قریب پہنچ کر ٹرک ڈرائیور اور پاکٹ سائز کی مکالمے بازی سنی تو میرا شبہ مزید پختہ ہو گیا۔ پاکٹ سائز یقیناً آواز بدل کر بول رہا تھا مگر کہیں کہیں غوطہ کھا رہا تھا۔ ٹرک کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے قبل ٹرک ڈرائیور یقیناً "بیماری" کی تشخیص میں مصروف رہا ہو گا مگر اس وقت وہ پاکٹ سائز کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ وہ اپنی کار پیچھے ہی سے نکال لے جائے۔

"میری کار کا ستیاناس ہو جائے گا۔" پاکٹ سائز نے غصے سے کہا۔ "تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ وہاں کتنی مٹی اور کتنے گڑھے ہیں!"

"تو پھر میں کیا کروں جی! آپ ذرا سا واپس جا کر دوسری سڑک سے نکل جائیں۔" ٹرک ڈرائیور نے دوسرا مفت مشورہ دیا۔

"یہ ٹرک ہے کس کا ؟" پاکٹ سائز نے رعونت کے ساتھ کہا۔

"سیٹھ کا۔"

"کون سیٹھ ؟"

"سیٹھ عثمان۔" ٹرک ڈرائیور نے جواب دیا۔ "مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

"میری مرضی!" پاکٹ سائز اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا سخت لہجے میں بولا۔

"تو پھر جناب، میری بھی مرضی! میں اب آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا، رستہ ناپیے اپنا!" یہ کہہ کر وہ ٹرک کے انجن پر جھک گیا۔

"ٹھیک ہے پھر! یوں ہے تو یوں ہی سہی!" پاکٹ سائز غصے سے بولا۔ "میں بھی اسی سڑک سے جاؤں گا، دیکھوں تم کب تک یہاں جھک مارتے ہو!" یہ کہہ کر وہ مجھے نظر انداز کرتا ہوا کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ اب بھی تھی۔ پتا نہیں، اس رُوسیاہ نے وہ بھیس کیوں بھرا تھا اور اس کے ساتھ کار میں مزید دو افراد کون تھے!

میں نے سوچا کہ یہ دونوں، یعنی ٹرک ڈرائیور اور پاکٹ سائز تو چرنے بھگتے ہیں، مجھے اپنی راہ لگنا چاہیے۔ میں اپنی پھٹ پھٹ کچے میں اتار کر وہاں سے ٹل لیا۔

مجھے سیٹھ عثمان کی وسیع و عریض کوٹھی ڈھونڈنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اب میں سیدھا اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کوٹھی سے کچھ ادھر ہی ایک جھونپڑی نظر آ رہی تھی۔ دو ایک جھونپڑیاں ادھر ادھر بھی کچھ فاصلے سے نظر آ رہی تھیں۔ اس علاقے میں تعمیری کام جاری تھا اور وہ جھونپڑیاں مزدوروں ہی کی ہو سکتی تھیں جو یقیناً وہاں عارضی طور پر ڈال لی گئی تھیں۔ ابھی میں کوٹھی تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک لحیم شحیم سا جٹا دھاری سادھو چمٹا بجاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ وہ اسی جھونپڑی سے نکلا تھا جو سیٹھ عثمان کی کوٹھی کے قریب ہی تھی۔ سادھو عینک لگائے ہوئے تھا۔ میں نے پھٹ پھٹ روک دی مگر اس سے آرا نہیں کیوں کہ سادھو نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

"آداب قبلہ و کعبہ! حضور نے بنفس نفیس کیوں زحمت فرمائی؟" سادھو نے قریب آ کر کہا اور میں اچھل پڑا۔



ظاہر ہے کہ وہ پیارے لال ہنر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ ایسی اٹنگ بٹنگ زبان بولنا ہر شخص کے بس کا کام تو نہیں۔ اسے وہاں سادھو کے بھیس میں دیکھ کر میں "حریان پریشان" تو ہوا تھا مگر مجھے بہرحال اپنی "حریانی" پر قابو پانا تھا اور قابو پا ہی لیا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی احساس ہو گیا کہ میں اس کا افسر ہوں۔ میں نے اسی لیے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے اور اپنے لہجے میں کسی قدر رعب پیدا کرتے ہوئے کہا "تم یہاں کیا ملتر ٹھونک رہے ہو؟"

"ملتر!" پیارے لال ہنر حیرت سے بولا "قبلہ و کعبہ یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں ورنہ یہ بندۂ ناچیز تو یہاں اپنے فرائضِ منصبی ..." اسی وقت پیارے لال ہنر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر چونکا، پھر جلدی سے بولا "وہ ... وہ ادھر ہی آ رہا ہے، خادم چلا۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ سکتا، کون آ رہا ہے اور وہ کدھر چلا، پیارے لال ہنر جس طرح چمٹا بجاتا ہوا میری طرف آیا تھا، اسی طرح واپس ہو گیا۔ اس کا رخ اسی جھونپڑی کی طرف تھا جہاں سے "برآمد" ہوا تھا۔ میں نے آنے والے کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ دیکھوں وہ کون ہے جس سے خوف زدہ ہو کر پیارے لال ہنر کھسک لیا۔ جب وہ کسی سے ڈر کر بھاگ سکتا تھا تو مجھے ایسی کون سی شرم تھی مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ تو ایک جھینگر سا آدمی تھا جو اب اسی جھونپڑی کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں پیارے لال ہنر گیا تھا۔ اپنے لباس سے وہ شخص یعنی جھینگر مزدور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پیارے لال ہنر اور اس جھینگر پر لعنت بھیج کر اپنی پھٹ پھٹ آگے بڑھا دی۔ سیٹھ عثمان کی کوٹھی سامنے ہی نظر آ رہی تھی۔ میں جھونپڑی کو اپنی بائیں طرف چھوڑتا ہوا سیدھا کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گیا اور پھٹ پھٹ کو بریک مارے۔ گیٹ بند تھا۔ گیٹ کی ایک طرف لکڑی کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس تختی پر پیتل کے انگریزی حروف سے کوٹھی کے مالک کا نام لکھا ہوا تھا، اسی کے ساتھ ڈگریاں بھی چم چما رہی تھیں۔ ڈگریاں دیکھ کر مجھ پر خاصا رعب پڑا۔ نام تو خیر ذرا سی جگہ میں لکھا ہوا تھا مگر ڈگریاں پوری ایک سطر میں درج تھیں۔ شاید ڈگریوں ہی کی خاطر تختی بڑی بنوائی گئی تھی۔ اسی تختی کے نیچے کال بیل کا بٹن نظر آ رہا تھا۔ میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی اور سیٹھ عثمان کے کسی نوکر کو کال کرنے کی غرض سے کال بیل کی طرف بڑھا۔ ویسے بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کوٹھی میں کوئی موجود نہیں۔ آدم تو آدم اس کے "آزاد" تک کی "دیں دیں پیں پیں" سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کال بیل بجاتے ہی دور کہیں سے "ٹُنن ٹُنن" کی صدا آئی۔ میں نے کال بیل سے انگلی ہٹالی۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے گیٹ کے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی "کُٹم کُٹم، کُٹم کُٹم!" یہ چاپ، جوتوں کی نہیں، جوتیوں کی ہو سکتی تھی۔ پھر جب گیٹ کھلا تو مجھے واقعی کسی جوتوں والے کی بجائے جوتیوں والی سے سابقہ پڑا۔ اسے دیکھ کر پہلی مرتبہ میں تو میں سمجھا کہ یہ "میم" ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ بدیسی نہیں دیسی ہی تھی۔ اس پر "میم" ہونے کا دھوکا مجھے اس کا لباس دیکھ کر ہوا تھا۔ وہ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی جس کی وجہ سے اس کی پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں جب کہ میرے خیال میں کسی دیسی لڑکی کے لیے یوں کھلے عام پنڈلیوں کی نمائش کرنا قطعی ناجائز تھا۔ اس کے گلے میں دوپٹا بھی نہیں تھا اور نہ ہی ساری کا پلو سینے پر پڑا تھا، یہ بھی میری نظر میں بری بات تھی، دیسی لڑکیوں کے لیے! سر کے بال اس نے ایک رومال سے باندھ رکھے تھے۔ وہ مجھے کسی طرف سے "نوکرانی" "وغیرہ" نہیں لگی۔ ہو نہ ہو، یہ سیٹھ عثمان کی جورو ہی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا۔ میموں کی نقل میں یہ بھی میم بن گئی ہے۔ مجھے یہ حیرت مزید تھی کہ بیگم صاحبہ کو خود گیٹ کھولنے آنا پڑا، کیا ان کے گھر میں کوئی نوکر وغیرہ نہیں؟ عمر ان کی، جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن والی تھی، یعنی یہی کوئی سولہ سترہ سال! نازک سی "گڑیا" بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دبلا پتلا جسم! جب ان کے بھرے بھرے ہونٹ حرکت میں آئے تو وہ مجھے اور بھی اچھی لگیں۔

"آپ مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہیں؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟" بیگم صاحبہ نے کہا اور اسی وقت میں نے ان کے سفید چمکیلے دانت بھی دیکھے جو یقیناً دیکھنے دکھانے کے بھی تھے اور کھانے کے بھی! ان کی آواز میں کسی قدر سختی تھی مگر خوب صورت لڑکیوں کی تھوڑی بہت سختی برداشت کر لینا چاہیے، بدشکل لڑکیوں کی سختی ہرگز نہیں! اس لیے میں نے اس سختی کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔

"مجھے ملنا تو سیٹھ عثمان سے تھا۔" میں نے زیرِ لب خلمی ہو کر کہا۔ "مگر اب آپ مل گئی ہیں تو آپ ہی سے مل لیتا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔

"مطلب یہ کہ صاحب بہادر نہ سہی تو ان کی بیگم سہی۔ مجھے دراصل ان کے ..."

"کیا بکواس کرنے لگے آپ! میں ان کی بیگم نہیں ہوں۔" اس نے خفگی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پھر کس خوش نصیب کی بیگم ہیں آپ؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کسی کی بھی نہیں!" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات نظر آئے جنھیں میں کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ وہ کہہ رہی تھی "میں ... میں ان کی ملازمہ ہوں۔"

"مو ... لا ... زمے ... مہ!" میرا جی چاہا کہ حیرت سے بے ہوش ہو جاؤں کیوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسی ملازمہ نہیں دیکھی تھی۔

"جی ہاں۔" اس نے تصدیق کی۔ "اگر آپ کو سیٹھ صاحب سے ملنا ہے تو میرے ساتھ تشریف لائیں، میں انھیں اطلاع دے دیتی ہوں۔ ہاں، اپنا نام بھی بتا دیں۔"

"میرا نام اے ڈی مہر ہے مگر صرف 'اے ڈی' سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اندر آ جائیں۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میں کوئی معزز شخصیت ہوں۔

اسی وقت مجھے اپنی پھٹ پھٹ کا خیال آیا کہ اسے کوئی لے کر چمپت نہ ہو جائے، یوں بھی وہ سرکاری مال تھا، میرا نہیں۔ میں نے کہا "اپنی پھٹ پھٹ اندر لے آؤں؟"

"پھٹ پھٹ!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر جب میں نے اُدھر اشارہ کیا جدھر پھٹ پھٹ کھڑی تھی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "آپ کا مطلب موٹر سائیکل ہے!"

"جی ہاں، اسے ہم اردو میں پھٹ پھٹ ہی کہتے ہیں۔ دراصل اس میں سے آواز بھی تو ایسی ہی نکلتی ہے نا، پھٹ ... پھٹ!"

وہ میری بات سن کر ہنس پڑی۔ "آپ دلچسپ آدمی ہیں۔"

"خیر ابھی پورا آدمی تو نہیں ہوا ہوں، ابھی تو بس یوں سمجھیں کہ نوجوان ہوں۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہا۔ وہ خواہ مخواہ مجھے نوجوان سے آدمی بنائے دے رہی تھی۔

اپنی پھٹ پھٹ کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اتنی سی عمر میں اس لڑکی نے بڑے ادب آداب سیکھ لیے ہیں! ظالم کسی بھی طرف سے ملازمہ نہیں لگتی، نہ لباس سے نہ گفتگو سے! جب تک میں نے موٹر سائیکل کوٹھی کے احاطے میں لا کر کھڑی نہ کی، وہ میری منتظر رہی۔

مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے وہ عمارت کی طرف بڑھی اور بولی۔ "سیٹھ صاحب یقیناً آپ کو جانتے ہوں گے مگر میں نے اس سے پہلے یہاں آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ غالباً آپ کوٹھی پر پہلی بار ہی آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا کیوں کہ مجھے یہ خطرہ لاحق ہو گیا، وہ باہر سے نہ ٹرخا دے۔

جب وہ مجھے ایک بڑے اور خوب صورت سے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر جا رہی تھی تو جاتے جاتے پلٹ کر بولی "سیٹھ صاحب نے آپ کو بلایا ہو گا؟"

میں عجب الجھن میں پڑ گیا کہ کہوں تو کیا کہوں؟ سچ بولنے میں خطرہ نظر آ رہا تھا اس لیے گول مول سا جواب دیا "بس یہی سمجھ لیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر نرمی سے بولی "دراصل بات یہ ہے جناب کہ ... کہ سیٹھ صاحب بہت مصروف رہتے ہیں اور ... اور ان کے پوچھنے پر مجھے آپ کے بارے میں بتانا پڑے گا۔ آپ ... آپ یقیناً میری مشکل سمجھ رہے ہوں گے۔ اگر انھوں نے واقعی آپ کو بلایا ہے تو بتا دیجیے اور نہیں تو بھی!"

ظاہر ہے کہ میں اس خوب صورت لڑکی کو پریشانی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر یہ کہ اگر میں اسے بتا دیتا، دراصل کون ہوں تو وہ بھی مجھ سے مرعوب ہو سکتی تھی اور اس کا سیٹھ بھی خفیہ کا نام سن کر دوڑا دوڑا آ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی شخصیت سے پردہ اٹھا دیا۔

"سی آئی ڈی انسپکٹر!" لڑکی کچھ حیران کچھ پریشان سی نظر آنے لگی، پھر جلدی سے بولی "میں ابھی سیٹھ صاحب کو خبر کرتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مڑی۔

"سنیں تو سہی۔" میں نے کہا "آپ اپنا نام تو بتاتی جائیں۔"

"نسیمہ۔" اس نے مشینی انداز میں جواب دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ خفیہ سے میرے تعلق کے بارے میں جان کر شاید وہ کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو گئی تھی۔

وہ چلی گئی تو اس بڑے سے ڈرائنگ روم میں مجھے اپنا وجود بہت چھوٹا سا محسوس ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے سیٹھ عثمان کی بجائے نسیمہ کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا تو حیرت ہوئی۔

"سیٹھ صاحب اس وقت مصروف ہیں، آپ سے نہیں مل

سکتے۔“ نسیمہ نے آتے ہی کہا۔

یہ صورتِ حال میرے لیے غیر متوقع تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ سیٹھ عثمان فی الفور بھاگا بھاگا آئے گا اور خاطر مدارات بھی کرے گا مگر اس نے ملنے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ سیٹھ عثمان کی اس دیدہ دلیری پر مجھے کچھ غصہ بھی آیا کہ وہ خفیہ کا نام سن کر بھی مرعوب نہیں ہوا۔

”آخر وہ مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتے؟ تم نے بتایا نہیں کہ میں کون ہوں!“ میں نے بالآخر کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ یہ جاننے کے بعد، وہ ملازمہ ہے، میں نے ”آپ“ کہنے کا تکلف ختم کر دیا۔

”میں نے آپ سے کہا ناکہ وہ مصروف ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ آپ سی آئی ڈی انسپکٹر ہیں۔“

”پھر ان پر یہ سن کر کوئی اثر نہیں ہوا؟“ میں نے کہا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، یہ تو وہی بہتر جان سکتے ہیں۔“

”اچھا تم ایک کام کرو۔“ میں سوچتے ہوئے بولا۔ ”ان سے کہنا کہ وہ اپنے منیجر رگھوناتھ کا پتا دیں۔ بس تم جلدی سے پوچھ کر آ جاؤ۔“

”رگھوناتھ کا پتا!“ وہ حیرت سے بولی۔ ”تو آپ صرف رگھوناتھ کا پتا پوچھنے آئے تھے؟“

”ہاں آئے تھے، پھر؟“ میں چڑ گیا۔ ”میں تم سے جو کہہ رہا ہوں وہ کرو!“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر سیٹھ صاحب اس پہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ بار بار مداخلت پسند نہیں کرتے۔“

”تو نہ پسند کریں، میں کیا کروں!“ میں ہاتھ نچا کر بولا۔ ”میں نے کوئی ٹھیکا لیا ہے ان کی پسند اور ناپسند کا!“

”دیکھیں جناب، بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“ نسیمہ کا لہجہ کسی قدر بدل گیا۔ ”سیٹھ صاحب آپ سے نہیں ملنا چاہتے۔ آپ جا سکتے ہیں۔“

”تو وہ کون سے ایسے حور پری ہیں کہ بغیر ان سے ملے میرے کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑے گی!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”میں بھی ان سے ملنا نہیں چاہتا، بس وہ اپنے منیجر کا پتا دیں، میں چلا جاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس طرح شرافت سے نہیں ٹلیں گے!“ نسیمہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

”نسیمہ! اس بے وقوف سے بحث نہ کرو، میں خود آ رہا ہوں۔“ معاً ایک بھاری گونج دار آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا۔

وہ آواز میرے قریب ہی سے آئی تھی مگر ”صاحبِ آواز“ غائب تھا۔ میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی مگر ڈرائنگ روم میں میرے اور نسیمہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔

”بہتر ہے سیٹھ صاحب!“ نسیمہ نے نادیدہ سیٹھ کو جواب دیا۔

”یہ تمھارے سیٹھ صاحب کیا اس صوفے کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں؟“ میں نے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا جس کے پیچھے سے وہ بھاری آواز سنائی دی تھی۔

”خاموش بیٹھیں!“ نسیمہ نے اس بار مجھے ڈانٹ دیا۔ لفظِ بے وقوف نے میری حیثیت کا تعین کر دیا تھا۔ وہ اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ میں بن بلایا مہمان ہوں۔

نسیمہ تو اب بالکل ہی پٹری سے اتر گئی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر اور تاؤ آ رہا تھا کہ میری انسپکٹری کا سارا رعب و دبدبہ دھم سے زمین پر آ رہا تھا۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ڈرائنگ روم کی اندرونی سمت کے دروازے کا بھاری پردہ ہٹا اور ایک بھاری بھرکم وجود بھاری قدم رکھتا ہوا اندر آ گیا۔ اس کی ٹھیکرے جیسی آنکھیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں میں پائپ اڑا ہوا تھا جس سے وہ مستقل دھواں چھوڑ رہا تھا، سر پہ ہیٹ تھا اور جسم پر سوٹ! رنگ سرخ و سفید تھا اور بالائی ہونٹ پر ہٹلر کٹ مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھے گھورتا ہوا قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے اور اس کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ میں ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور وہ اندرونی دروازے کے قریب مگر اس کے باوجود میں اس کی نگاہوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بہت اطمینان کے ساتھ پائپ ہونٹوں سے نکالا اور صوفے کے سامنے موجود میز پر رکھی ہوئی بڑی سی ایش ٹرے میں اس کی راکھ جھاڑی، پھر ٹھہری ہوئی بھاری آواز میں بولا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

اس وقت تک میری اکڑفوں ختم ہو چکی تھی۔ سیٹھ تو سیٹھ اس کی ملازمہ تک میرے رعب میں آنے پر آمادہ نہیں تھی۔ میں اسی نیتے مریل سی آواز میں بولا۔ ”مجھے آپ کے منیجر رگھوناتھ کا پتا...“

”کیا یہ انکوائری آفس ہے؟“ سیٹھ عثمان میری بات کاٹ کر زور سے بولا، پھر اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ”پتا نہیں، سرتھامسن نے کیسے کیسے گھامڑوں کو اپنے محکمے میں بھر لیا ہے!“

سرتھامسن کے ذکر پر میں چونکا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ خفیہ کے بوڑھے گدھ کو اچھی طرح جانتا تھا مگر ظاہر ہے کہ کوئی کتنا ہی بے وقوف اور گھامڑ کیوں نہ ہو، سچائی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ میں بھلا کس طرح یہ بات ہضم کر جاتا! میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”دیکھیے سیٹھ صاحب، اگر آپ مجھے گھامڑ سمجھ رہے ہیں تو آپ کا خیال غلط ہے۔ میں تو بہت ذہین اور بہادر نوجوان ہوں۔ مجھ جیسا تو سارے محکمے میں کوئی نہیں۔ اگر آپ کو میری بات

پر یقین نہیں تو آپ تصدیق کرا لیں۔ مجھے ابھی نوکری کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر اس کے باوجود میں کارنامے پہ کارنامے انجام دے رہا ہوں۔“

”تم یہاں کیا کارنامہ انجام دینے آئے ہو؟“ اس کی آواز میں چبھن تھی۔

”خیر ابھی تو کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا، ڈول ڈال رہا ہوں، کیا خبر کوئی کارنامہ انجام دے ہی ڈالوں۔ اب آپ خود ہی سوچیے کارنامے کا کوئی وقت تو ہوتا نہیں، جب...“

”شٹ اپ!“ سیٹھ عثمان دھواں چھوڑتا ہوا دہاڑا۔

”کیا کچھ مجھ سے فرمایا سیٹھ صاحب؟“ میں جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بولا۔

”ہاں تم سے!“ یہ کہہ کر وہ صوفے کی ایک جانب جھکا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے زمین اپنے محور پہ تیزی سے گردش کرنے لگی ہو۔

”ارے ارے!“ میں گھبرا کر چیخا اور جلدی سے اپنے دونوں پیر صوفے پر رکھ کر اپنے چکراتے ہوئے وجود کو سنبھالنے کی کوشش میں لگ گیا۔

”کارنامے کا بچہ!“ اسی عالم میں سیٹھ عثمان کی آواز سنائی دی، پھر اس کا قہقہہ بلند ہوا۔

چند لمحے تو میں کچھ سمجھا ہی نہیں کہ ڈرائنگ روم کی ہر چیز اچانک گردش میں کیسے آ گئی، پھر جب کچھ سمجھا تو مجھ پہ دہشت سی طاری ہونے لگی۔ میں جس صوفے پر بیٹھا ہوا تھا یا مجھے جس پر بٹھایا گیا تھا، وہ صوفہ تیزی کے ساتھ اپنی جگہ گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں، یہ کیا جادو تھا۔ مجھے بہت زور کے چکر آ رہے تھے۔ معاً ایک جھٹکے سے صوفے کی گردش تو رک گئی مگر میری کھوپڑی کو بریک نہ لگا۔ وہ گھومتی ہی رہی۔

”اب کچھ کیڑے جھڑے دماغ کے؟“ میں نے سیٹھ عثمان کی آواز سنی۔

میری کھوپڑی اب تک محوِ رقص تھی اس لیے کوشش کے باوجود میں سیٹھ عثمان کے وجود پر نظر نہ جما پایا اور نہ ہی کچھ بول سکا۔

”سنو، میں سرتھامسن کی عزت کرتا ہوں۔“ سیٹھ عثمان کی آواز پھر آئی۔ ”میں ان کی حیثیت اور مرتبے سے واقف ہوں لیکن میرے ساتھ ان کا رویّہ نامناسب ہے۔ ان سے کہنا کہ وہ اپنے محکمے کے گھامڑوں کو نہ میرے پاس بھیجیں اور نہ یہاں مجھ پر مسلط کریں۔ اگر انھیں مجھ سے کوئی شکایت ہے تو براہِ راست بات کر لیں۔ یہ طریقۂ کار بہتر نہیں۔ کوئی حرام زادہ یہاں سادھو بنا پھر رہا ہے، کوئی مزدور، کوئی کچھ اور کوئی کچھ! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے! اور اب تم نازل ہو گئے۔“

اس دوران میں میری کھوپڑی کا رقص ختم ہو چکا تھا اور میں بار بار پلکیں جھپکا کر اس دھواں چھوڑتے ہوئے وجود کو حیرت سے دیکھ رہا تھا جس نے بیٹھے بیٹھے مجھے ناچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اچھا اب تم خود یہاں سے دفع ہو رہے ہو یا اٹھوا کر باہر پھنکواؤں؟“

”لل... لیکن وہ... وہ اپنے منیجر کا پتا...“ میں ہکلایا۔ مجھے اس کام کا خیال آ گیا تھا جس کی خاطر اتنا خوار ہوا تھا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خود اپنے پیروں سے چل کر باہر جانا نہیں چاہتے!“ یہ کہتے ہی سیٹھ عثمان چیخ اٹھا۔ ”نجمہ! شانتی! یونیکا!“

جواب میں یکے بعد دیگرے ”جی سیٹھ صاحب“ کی صدائیں بلند ہوئیں اور پھر اندرونی دروازے سے تین عدد مہ لقائیں برآمد ہوئیں۔ اتنا سارا حسن ایک جگہ دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ ایک سے ایک غضب ناک تھی۔ وہ تینوں بھی ”میمیں“ بنی ہوئی تھیں۔ سیٹھ عثمان مجھے حسن کا تھوک بیوپاری معلوم ہوا۔

”اِسے یہاں سے اُٹھا کر باہر پھینک آؤ!“ سیٹھ عثمان نے اپنی مہ لقاؤں کو حکم دیا اور اسی کے ساتھ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا، پھر وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اب وہاں مزید ٹھہرنا ”ٹیم“ ضائع کرنا تھا۔ میں اگر چاہتا تو ”پتاں پتاں“ بھی وہاں سے اٹھ کر جا سکتا تھا لیکن زندگی میں ایسے ”چانس“ روز روز کب ملتے ہیں کہ چار عدد حسینائیں اپنے نازک نازک ہاتھوں سے ”ڈولی ڈنڈا“ کرتی ہوئی لے جائیں۔ یہ سنہری موقع کھو دینا سراسر حماقت تھی اس لیے میں بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھا رہا۔

نسیمہ جو پہلے بیرونی دروازے کے قریب کھڑی ہوئی تھی، وہ بھی اب اپنی ”ساتھنوں“ کے ساتھ میری طرف بڑھ رہی تھی۔

مجھے ”ڈولی ڈنڈا“ کرنے سے پہلے ان میں سے ایک نے بھبکی دی۔ ”خود اٹھ رہے ہو یا پھر ہم اٹھائیں!“

”اب خود ہی تکلیف کر لو۔“ میں صوفے پر پھیلتا ہوا بولا۔ ”بھول گئیں، سیٹھ صاحب کیا حکم دے کر گئے ہیں!“

”بڑا ہی بے غیرت معلوم ہوتا ہے۔“ ایک اور جل کر بولی۔

”بے غیرت اور ڈھیٹ بھی!“ تیسری بھی چپ نہ رہ سکی۔

”اب کچھ بھی کہو، میں تو اٹھتا نہیں۔“ میں نے انھیں مزید تپایا تاکہ وہ ”کارِ خیر“ انجام دینے میں جلدی کریں۔

پھر ان سب کو غصہ آ ہی گیا۔ انھوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ مجھے صوفے سے نیچے گھسیٹ لیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے مجھے چوٹ نہیں آئی لیکن یہ عمل تھا میرے لیے غیر متوقع! میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے صوفے ہی سے اچک اچک اٹھا لیں گی۔

میں اسی لیے بھنّا گیا اور چیخا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے! میں اس طرح گھسٹتا ہوا باہر نہیں جاؤں گا۔ اٹھانا ہے تو ٹھیک طرح شرافت سے اٹھاؤ ورنہ اللہ میاں نے مجھے بھی پاؤں دیے ہیں، میں خود اپنے پیروں سے چل کر جا سکتا ہوں۔"

"کمینوں کے ساتھ شرافت نہیں برتی جاتی۔" یہ جملہ نسیمہ نے ادا کیا تھا اس لیے اور بھی میرے دل میں چھری کی طرح لگا۔ پھر نسیمہ نے اپنی ایک ساتھن کو مخاطب کیا۔ "یونیکا! تم اس کی ایک ٹانگ اُٹھاؤ اور میں دوسری ٹانگ اٹھاتی ہوں۔ اسے کتے کی طرح گھسیٹ کر باہر پھینک آتے ہیں۔"

میں قالین پر چت پڑا تھا مگر یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"تم سب حرام بد۔ معلوم ہوتی ہو۔ کام چوریں کہیں کی! میں خود چلا جاتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"دفع ہو!" وہ کورس میں بولیں۔

میں بھنّاتا ہوا ڈرائنگ روم سے نکلا اور باہر آکر اپنی پھٹ پھٹ کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں پھٹ پھٹ کے قریب پہنچا، جل بھُن ہی تو گیا۔ نہ جانے کس کم بخت یا "کم بختی" نے دونوں پہیّوں کی ہوا نکال دی تھی۔

"اچھا سیٹھ کے بچے، تجھے بھی دیکھ لوں گا!" میں نے عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ نچایا مگر اب وہاں پہلے کی طرح سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرا چیلنج سننے کے لیے وہاں کوئی نہیں تھا۔ "بڑے بڑے سیٹھوں کو دیکھا ہے میں نے! تجھ سے بیٹا، ناک نہ رگڑ والی تو میرا نام بدل دینا۔" میں غصے میں بڑبڑاتا ہوا اپنی پھٹ پھٹ گھسیٹتا ہوا کوٹھی سے باہر آ گیا۔

وہ کم بختیں پتا نہیں کہاں سے چھپ کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی میں پھٹ پھٹ گھسیٹتا ہوا باہر پہنچا، ان میں سے کسی نے کوٹھی کا گیٹ بند کر دیا۔

مجھے علم تھا کہ پیارے لال ہنر قریب ہی موجود ہے اور یہ بھی پتا تھا، وہ میرا ماتحت ہے۔ میرا حکم بھلا وہ کس طرح ٹال سکتا تھا۔ نئی دہلی کے نوتعمیر علاقے میں اس وقت ہوا نکلی ہوئی پھٹ پھٹ کے پہیّوں میں دوبارہ ہوا بھرنے کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ پھٹ پھٹ کو گلے کا ہار بنا کر میں، شہر تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ وہی پھٹ پھٹ جو ہر آڑے وقت میں میرے کام آئی تھی اور کئی بار مجھے خطروں سے دور بھگا کر لے گئی تھی، اس وقت دونوں آنکھوں تو کیا ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ پھٹ پھٹ تو پیارے لال ہنر کے گلے منڈھ دوں اور خود کوئی سواری کر کے شہر چلا جاؤں۔

پیارے لال ہنر مجھے جھونپڑی میں تنہا ہی ملا۔ وہ اس وقت خالص سادھوؤں کے انداز میں آسن جمائے ایک بھجن گا رہا تھا۔

"اوم جے جگدیش ہرے، اوم جے جگدیش ہرے! . . ."

"ابے ہرے ہی کیوں نیلے پیلے کیوں نہیں؟" میں نے پیارے لال ہنر کو چونکا دیا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میں کیوں کہ احتیاطاً پھٹ پھٹ باہر کھڑی کر کے دبے پاؤں جھونپڑی میں پہنچا تھا اس لیے پیارے لال ہنر میری وہاں آمد سے واقف نہ ہو سکا تھا۔

اپنے جملے کے ردِّعمل میں میں نے اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت دیکھی۔ اس کی مصنوعی داڑھی پر بھی لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"ابے داڑھی زیادہ کانپی تو نیچے گر پڑے گی۔" میں نے اسے وارننگ دی۔

پھر جب وہ بولا تو اس کی داڑھی مزید کانپی۔ اس کا لہجہ بھرّایا ہوا تھا۔ "قبلہ و کعبہ! مجھے آپ کی ذات سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ آپ یوں میرے جذبات کو مجروح فرمائیں گے۔"

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا اس میں جذبات مجروح کرنے کی کیا بات تھی۔ میں نے سیدھے سبھاؤ اس سے ایک بات پوچھی تھی۔ جب جگدیش صاحب، ہرے ہو سکتے تھے تو پھر نیلے اور پیلے کیوں نہیں ہو سکتے تھے؟ پھر بھی میں نے سوچا کہ وہ ویسے ہی بہت "بگو" ہے اس سے مزید "بحثیانہ" مناسب نہیں۔ میں نے اسی لیے بات بدلنے کی غرض سے دوسرا سوال کیا۔ "وہ جھینگر کہاں گیا جسے دیکھ کر تم پھوٹ لیے تھے؟ میں نے اسے جھونپڑی ہی کی طرف آتے دیکھا تھا۔"

"وہ جھینگر نہیں، ابنِ آدم تھا حضور!" پیارے لال ہنر کی آواز اب تک بھرّائی ہوئی تھی۔ "وہ قریب ہی گیا ہے اور کسی ساعت بھی اس کی مراجعت ممکن ہے۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں تو بہتر ہے۔"

"تو وہ سُسرا کیا شیر ہے جو مجھے پھاڑ کھائے گا!" میں نے بھک کر کہا۔ "خواہ مخواہ مجھے بھی جھینگر سے ڈرائے جا رہے ہو!"

"آپ افسر ہیں حضور، نہ مانیں خادم کی عرض! سارا بھرم کھل جائے گا۔ یہ اسی کی جھونپڑی ہے۔ اس خادم نے بہ مشکل اسے رام کیا تھا۔" پیارے لال ہنر زچ ہو کر بولا۔ "خادم تو اپنے دیرینہ تجربات کی روشنی میں احتیاط سے کام لے رہا تھا، آگے سرکار کی رضا!"

"تجربات!" میں منہ بنا کر بولا۔ "تم نے وہ مثل سنی ہے کہ کوّا چاہے سو سال کا ہو جائے، رہتا کوّا ہی ہے اور یہ مثل بھی یقیناً سنی ہو گی کہ گدھے پر کتابیں لاد دینے سے گدھا، عالم فاضل نہیں ہو جاتا!"

"زاغ و خر، پیارے لال ہنر! نہیں حضور، خادم کی سعادت مندی

اور جذباتِ مخلصانہ کا اس قدر سخت امتحان نہ لیں۔ خادم نے عزّتِ نفس فروخت نہیں کی۔" اس کے لہجے سے پتا چل رہا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ "حضور نے پہلے خادم کے عقائد کا تمسخر اُڑا کر ضربِ کاری لگائی، پھر خادم کی عزّتِ نفس پر شدید حملہ کیا۔ آخر خادم، سنگ و آہن تو نہیں!"

میں سمجھ گیا کہ اگر اس سے مزید کچھ دیر گفتگو کی تو میری کھوپڑی میں جتنا گودا ہے وہ چاٹ جائے گا اور پھر بھی اسے چین نہیں آئے گا۔ مجھے اپنی خیریت اسی میں نظر آئی کہ مطلب کی بات کروں اور وہاں سے کھسک لوں۔ یہ سوچ کر میں بولا۔ "ان فضول باتوں کے لیے ساری زندگی پڑی ہے، پھر کسی وقت اپنی یہ تُوئے تُوئے کر لینا، فی الحال جو میں کہہ رہا ہوں سنو! جھونپڑی کے باہر میری پھٹ پھٹ کھڑی ہے۔ اس کی ہوا کسی ناہنجار یا 'ناہنجارہ' نے نکال دی ہے۔ تم پھٹ پھٹ لے کر شہر جاؤ، ہوا بھرواؤ اور دفتر میں چھوڑ آؤ۔ میں نہ ملوں وہاں تو چابی، کمال کو دے دینا۔ یہ لو چابی!" یہ کہہ کر میں نے جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف اُچھال دی اور پلٹا۔

"جی . . . جی کیا فرمایا!" پیارے لال ہنر حیرت سے بولا۔ "سنیے تو قبلہ! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

میں رک گیا اور مڑ کر کہا۔ "تو کیا لکھ کر دوں جو کچھ کہا ہے!"

"خادم نے یہ تو عرض نہیں کیا حضور والا!"

"پھر کہہ بھی چکو، کیا کہنا چاہتے ہو!" میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پہلی عرض تو یہ کہ خادم اس وقت یہاں اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہا ہے، دُوم اسی سبب کہیں جانے سے قاصر ہے، سُوم کسی سادھو کو تا حال موٹر سائیکل پر سواری کرتے نہیں دیکھا گیا اور . . ."

"اور چہارم، یہ کہ تم پیدل ہو، رنڈے پیدل!" آخر میرے صبر کا پیمانہ لبالب بھر کے چھلک ہی اٹھا۔

"کیا فرمایا حضور نے! گویا پھر ایک بار خادم کی عزّتِ نفس خطرے . . ."

"چُپ!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تم نے مزید میرا بھیجا چاٹا تو . . . تو تمہارا سر پھوڑ دوں گا!"

پیارے لال ہنر میرے تیور دیکھ کر سہم گیا مگر پھر بھی منمنایا۔ "آپ جانیں حضور! اس طرح سارا بھرم کھل جائے گا۔"

"کھل چکا ہے بھرم سمجھے!" میں ہاتھ نچا کر بولا۔ "اسے سب پتا چل گیا ہے، سیٹھ عثمان کو کہ کون کون کس کس بھیس میں یہاں مٹر گشتی کرتا پھر رہا ہے۔ چلے ہیں قابلیت چھانٹنے!"

"ہیں . . . ہیں . . . کیا واقعی حضور؟" پیارے لال ہنر کی فاختہ اُڑ گئی اور پھر اس سے پہلے کہ فاختہ دوبارہ ٹھونٹ پر آ بیٹھے، میں وہاں سے چل دیا۔

جھونپڑی سے باہر آ کر میں، سڑک کی طرف چل دیا جو چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی۔ اب مجھے شہر پہنچنے کے لیے کوئی سواری ڈھونڈنا تھی۔ وہاں زیادہ تر کوٹھیوں اور بنگلوں والے رہتے تھے جن کے پاس اپنی موٹریں یا سرکاری موٹریں ہوتی تھیں اس لیے کسی سواری کا ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ رہے بے چارے مزدور تو ان کی کون پروا کرتا ہے، اللہ نے انھیں پیر دیے تھے۔

میں کسی سواری کی تلاش میں "پاپیاں" چلا جا رہا تھا کہ مخالف سمت سے ٹرک آتا دکھائی دیا اور پھر اس کے پیچھے "پاکٹ سائز" کی کار بھی نظر آ گئی۔ میں نے طویل سانس لیا۔ تو گویا یہ وہی ٹرک تھا جو مجھے راستے میں آتے ہوئے ملا تھا۔ اس کی "بیماری" یقیناً دور ہو چکی تھی مگر یہ بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی کہ پاکٹ سائز، یعنی شیکھر اب تک اس کی دُم بنا ہوا تھا۔ جہاں مجھے وہ ٹرک اور کار نظر آئی تھی، وہاں سڑک کی "کمریا" تھوڑی سی لچکی ہوئی تھی اسی لیے شیکھر کی کار بھی نظر آ گئی تھی۔

ہر چند کہ شیکھر سے میں جلتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھ سے "سڑتا" ہو گا مگر بہرحال ہم دونوں تھے ایک ہی محکمے میں! وقت پڑنے پر تو لوگ گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں، شیکھر تو پھر بھی آدمی ہی تھا۔ میں نے سوچا، اس کی کار کو روک کر کہوں گا کہ وہ جہاں جا رہا ہے، مجھے بھی ساتھ لے جائے اور واپسی میں شہر کے اندر کہیں چھوڑ دے۔

ٹرک رفتہ رفتہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میں رک کر سڑک کی ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے شاید چرس کے زیادہ ہی دم لگا لیے تھے ورنہ ٹرک کو اس طرح لہراتا بل کھاتا ہوا نہ چلاتا۔ مجھے علم ہی تھا کہ ٹرک ڈرائیور اور شیکھر میں ٹھن گئی تھی۔ اب غالباً ٹرک ڈرائیور، شیکھر سے انتقام لے رہا تھا۔ مجھے بہرحال اس انتقام کی جھپٹ میں نہیں آنا چاہیے، میں نے سوچا اور مزید کنارے ہو گیا۔ ٹرک دندناتا ہوا میرے قریب سے گزرا اور اسی وقت میں ہاتھ اٹھا کر چیخا۔ "رک جاؤ، رک جاؤ!"

ٹرک اور کار کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میری چیخ پکار رائیگاں نہیں ہوئی۔ شیکھر نے کار کو بریک لگائے جس پر بریکوں نے احتجاج کیا۔ کار رکتے رکتے بھی مجھ سے چند قدم آگے نکل گئی۔ میں کار کی طرف لپکا۔

میں جب ڈرائیونگ سیٹ کی طرف پہنچ کر کھڑکی پر جھکا تو شیکھر مجھے دیکھ کر غرّایا۔ "کون ہو تم؟ کیوں روکا ہے ہمیں؟" وہ اب بھی آواز بدل کر بول رہا تھا۔

"لو اور سنو، اب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو گے!"

میں جلدی سے بولا۔ "میں خوب سمجھتا ہوں تم مجھے اپنی موٹر میں بٹھانے کی وجہ سے نہیں پہچان رہے مگر استاد! میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔"

"موٹر سائیکل کیا ہوئی؟" خلافِ توقع شیکھر نے ایک دم اپنی اصل آواز میں سوال کیا۔

"یہ ہوئی نا بات!" میں کھل اٹھا، پھر کہا۔ "ہوا نکال دی کسی نے۔ میں اسے پیارے لال ہنر کے پاس چھوڑ آیا، وہ ہوا ڈلوا کر دفتر پہنچا دے گا۔"

"پیارے لال ہنر کے پاس!" شیکھر چونک کر بولا۔

"ہاں، تمھیں خبر نہیں، وہ بھی تمھاری طرح بھیس بدلے پھر رہا ہے مگر ظاہر ہے کہ میرے لیے کسی کو پہچان لینا کون سا مشکل ہے۔ اب یہی دیکھ لو، تمھیں پہچان لیا۔"

"میری جسمانی ساخت کے سبب!" وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

"کسی بھی سبب سہی، پہچان تو لیا بچو!" میں نے موقع مناسب جان کر مزید بے تکلفی کا اظہار کیا۔

"بچو!" شیکھر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ غالباً اسے میرا اندازِ تخاطب پسند نہیں آیا تھا۔

"بُرا نہ ماننا، میں نے یوں ہی پیار میں کہہ دیا تھا۔" میں نے بات بگڑتے دیکھ کر "پچکارا" مارا اور شیکھر کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص زور سے ہنس پڑا۔

اس شخص کی ہنسی نے شاید شیکھر کو مزید تپا دیا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ "میں زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔" پھر اس نے کہا۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"ویسے معاف کرنا، بے تکلفی تم بھی کر رہے ہو۔" میں بولا۔ "تم سب انسپکٹر ہو اور میں انسپکٹر!"

"مگر میں تمھارا ماتحت نہیں ہوں اور نہ اب تمھاری برانچ میں ہوں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ اگر شیکھر ہتھے سے اکھڑ گیا اور وہاں سے پھوٹ لیا تو پیدل چلتے چلتے میرا "پلیتھن" نکل جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں بولا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، غلطی میری ہی ہے۔ یوں بھی تم مجھ سے پہلے اس دنیا میں آئے ہو، تمھیں تھوڑی بہت بے تکلفی کا حق پہنچتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے فوراً مطلب کی بات کہہ دی۔

شیکھر کو شاید توقع نہیں ہوگی کہ میں مصلحتاً ہی سہی، اتنی جلدی ہتھیار ڈال دوں گا اسی لیے پہلے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے، پھر اس نے نرمی سے کہا۔ "بیٹھ جاؤ پیچھے، میں پہلے تمھیں ہی شہر چھوڑ دیتا ہوں۔"

نیکی اور پوچھ پوچھ! میں جھٹ سے لپک کر کار میں بیٹھ گیا کہ کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے۔ شیکھر سے مجھے اس قدر شرافت کی امید ہرگز نہیں تھی کہ وہ کہیں جانے کا ارادہ موقوف کر کے پہلے میری خاطر شہر چلنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ بے سبب تو اُدھر نہیں جا رہا ہوگا۔ شیکھر کے ساتھیوں میں سے ایک میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا، وہ اور شیکھر کا دوسرا ساتھی جو اگلی نشست پر تھا، دونوں ہی میرے لیے اجنبی تھے۔ جب شیکھر کی کار شہر کی طرف روانہ ہو گئی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ شیکھر، دشمنوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ اس کے ساتھی دشمنوں میں سے بھی تو ہو سکتے تھے۔ اگر شیکھر "پلٹو" ہو گیا تو؟ اس نے کہیں مجھے پھانسنے کے لیے جان بوجھ کر تو شرافت کا مظاہرہ نہیں کیا؟ میرے ذہن میں سوال پر سوال کلبلاتا رہا جس کے نتیجے میں پیٹ کے اندر دھما چوکڑی شروع ہو گئی۔ پتا نہیں خوف کے عالم میں یہ سسرا پیٹ کیوں "گڑگڑم گڑگم" کرنے لگتا ہے۔ شہری حدود شروع ہونے تک یقیناً میرا آدھی کلی خون خشک ہو چکا تھا۔ یہ اسی خوف کی کارستانی تھی جو میری زبان پر تالا پڑ گیا تھا۔ شیکھر یا اس کے ساتھیوں نے بھی مجھ سے کسی قسم کی گفتگو کرنا مناسب خیال نہ کیا تھا۔ راستے بھر میں اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص کو چور نظروں سے دیکھتا رہا کہ کہیں وہ اپنی جیب سے کوئی چھری چاقو یا کوئی ہتھیار نکال کر میرے نازک سے ٹینٹوے پر نہ رکھ دے مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ ایسا نہیں ہوا۔

جب شیکھر نے کار روک کر مجھے صحیح سالم ایک جگہ اتار دیا تو میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ پہچان لیے جانے کے بعد اس نے مجھ سے بات کرنا خلافِ مصلحت سمجھی ہوگی۔

شیکھر مجھے اجمیری گیٹ پر اتار کر نئی دہلی کے لکھنو ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں سے کوئی سواری کر کے میں بہ آسانی کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن کہاں، مجھے یہی فیصلہ کرنا تھا۔ اس وقت دوپہر کے ڈھائی بجے تھے۔ ابھی دفتری وقت ختم نہیں ہوا تھا۔ میں کسی فیصلے تک پہنچنے کی خاطر سڑک کے کنارے کنارے یوں ہی آگے بڑھنے لگا۔ اب کچھ کچھ مجھے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ پہلے پیٹ پوجا بعد میں کام دوجا! اس وقت تک ممکن ہے کوئی راہ سوجھ جائے۔ ایک ٹھیلے کے قریب کھڑے ہو کر میں نے دہی بڑے اور چھولے کھائے، دو گلاس پانی پیا تو آنکھوں میں کچھ تراوٹ آئی مگر اس دوران میں میری تمام تر توجہ کھانے پر لگی ہوئی تھی اس لیے کچھ بھی نہ سوچ سکا۔

سر تھامسن نے مجھے جو کام سونپا تھا، وہ اپنی جگہ تھا۔ ابھی تک میں سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکا تھا اور خواری مفت میں ہوئی تھی۔ اب میں دفتر جاتا تو کس منہ سے!

اِدھر مجھے سیٹھ عثمان پر تاؤ آ رہا تھا جس نے مجھے خواہ مخواہ سر تھامسن کا قاصد سمجھ کر "ایک عدد پیغام سر تھامسن کے نام" تھما دیا۔ سر تھامسن سے "ٹوں" سے کہہ دینا اور "چوں" کہہ دینا!

"الو کی دُم فاختہ کہیں کا!" میں غصے میں بڑبڑایا۔

اب اگر میں سر تھامسن کو سیٹھ عثمان کا پیغام نہ پہنچاتا تو الگ مصیبت تھی۔ اگر وہ دونوں کہیں مل جاتے تو سیٹھ عثمان یقیناً اپنے پیغام کے بارے میں پوچھتا کہ ملا یا نہیں! اور پھر خواہ مخواہ میری "کم بختی" آتی۔ اب تک میں اتنا تو سمجھ ہی گیا تھا کہ کسی سبب قبلہ سر تھامسن، سیٹھ عثمان کی نگرانی کرا رہے تھے اور یہ کام وہ میرے ماتحتوں سے لے رہے تھے مگر اس نگرانی کا "مقصدِ عظیم" کیا تھا، اس سے میں ناواقف تھا۔ کچھ نہ کچھ دال میں کالا یا پیلا ضرور تھا مگر سیٹھ عثمان بڑا "لال کائیاں" بالکل "سنا" ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نگرانی سے واقف ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں نگرانی بالکل فضول تھی۔

ٹھل ٹھل کر کافی "غور یانے" کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دفتر کا رُخ کروں اور سر تھامسن کو "حیران پریشان" کر دوں۔ وہ بڈھا یہ سن کر یقیناً "کھو کھیا" جاتا کہ سیٹھ عثمان اپنی نگرانی سے واقف ہو چکا ہے۔ رگھوناتھ کے بارے میں میں کہہ دیتا کہ پتا نہیں ملا تو کر بل کیا! میں نے نرا اپنی سی کر لی، اب وہ بتائیں میں کیا کروں۔

ابھی میں کسی سواری کو روکنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک کار میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ میں نے حیرت سے "صاحبِ کار" کو دیکھا۔ وہ میرا ہم عمر ہی لگتا تھا۔

"اللہ دتا! مجھے نہیں پہچانے؟" صاحبِ کار نے کھڑکی سے سر نکال کر بولا، پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "ابے یار! میں رشید ہوں، تمھارا کلاس فیلو! آؤ بیٹھو، گاڑی میں، میں تمھیں تمھارے گھر پہنچا دیتا ہوں یا جہاں کہو!"

"ابے رشید تم!" میں دانت نکال کر اس طرح بولا جیسے اُسے تو اُسے اس کے ابا جانی کو بھی پہچان چکا ہوں حالانکہ مجھے اس کا چہرہ قطعی یاد نہیں تھا۔ میں گھوم کر جلدی سے دوسری طرف پہنچا اور کار کا دروازہ کھول کر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ میں اُسے نہیں پہچان سکا تو کیا ہوا، اس نے تو مجھے پہچان لیا تھا اور یہ میرے لیے کافی تھا۔ دفتر تک کا کرایہ بہ آسانی بچایا جا سکتا تھا۔

"کہو کیا حال ہیں؟" وہ کار چلاتے ہوئے بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ عیش آ رہے ہیں بھائی رشید!" میں نے بھی بے تکلفی سے جواب دیا، پھر مجھے خیال آیا کہ اُسے بتا دوں۔ مجھے گھر نہیں، دفتر جانا ہے اور میں نے بتا دیا۔

"کشمیری گیٹ!"

"ہاں!" میں نے اُسے مصلحتاً مختصر سا جواب دیا۔

"کوئی جلدی تو نہیں ہے تمھیں دفتر پہنچنے کی؟" اس نے دریافت کیا۔

"نہیں، کوئی ایسی خاص جلدی تو نہیں ہے۔ کیوں؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ آج اتنے عرصے کے بعد تم مل گئے ہو تو تمھیں اپنا نیا گھر ہی دکھا دوں۔" رشید بولا۔ "ہم نے ترکمان گیٹ میں نیا مکان لے لیا ہے۔"

"کیوں، کیا پچھلا مکان بیچ دیا؟" میں نے یوں ہی اندھیرے میں تیر چلایا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میں اُسے بھولا نہیں ہوں۔

"خیر بیچا تو نہیں۔ وہاں اب صرف بھائی صاحب رہتے ہیں۔ امی اور بھابی میں نہیں بنتی تھی۔" اس نے بتایا، پھر بولا۔ "تو پھر کیا ارادہ ہے، چلوں گھر؟"

"چلو۔" میں نے کہہ دیا۔ "مگر میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔"

"ٹھیک ہے! بس تمھیں چائے پلا کر اور کچھ دیر گپ لڑا کر چھوڑ دوں گا، بس!" وہ بولا۔

"اور مجھے دفتر نہیں پہنچاؤ گے؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"چلو، دفتر بھی پہنچا دوں گا، اب تو خوش ہو!"

"ہاں پھر ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے طویل سانس لیا اور اطمینان سے پھیل کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اُس زمانے میں آج کل کی طرح ہر نتھو خیرے کے پاس کار نہیں ہوتی تھی۔ میرا وہ کلاس فیلو یقیناً کسی رئیس خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا، یہ الگ بات کہ میں ذہن پر مسلسل زور دینے کے باوجود اب تک اُسے نہیں پہچان سکا تھا۔ بہرحال یہ معمولی بات نہیں تھی کہ میرے ایک کلاس فیلو کے پاس کار تھی اور اس میں اتنی شرافت بھی باقی تھی کہ فی الفور مجھے پہچان لیا تھا ورنہ کار والا تو اس زمانے میں بھی کسی کو پہچان کر نہیں دیتا۔

کچھ دیر بعد ہی ہم ترکمان گیٹ پہنچ گئے۔ قدیم طرز کے بنے ہوئے ایک بڑے سے مکان کے احاطے میں رشید نے کار روک لی۔ احاطے میں درخت لگے ہوئے تھے۔ کار سے اتار کر وہ مجھے نشست گاہ میں لے آیا۔ وہاں مجھے بٹھا کر وہ اندر گھر میں چلا گیا۔ نشست گاہ صاف ستھری تھی۔ ایک طرف فرشی نشست کے لیے قالین بچھا ہوا تھا اور دوسری جانب میز کرسیاں تھیں۔ جدھر قالین بچھا ہوا تھا، اسی طرف ایک دروازہ تھا جو غالباً اندر جانے کے لیے تھا۔ رشید اسی کے ذریعے اندر گیا تھا۔

ابھی رشید کو گئے چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے ایک ہلکی سی آواز سنی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے بہت آہستہ سے نشست گاہ کا بیرونی دروازہ بند کر

دیا ہو۔ میں نے جلدی سے ادھر نگاہ اٹھائی اور میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اب میں کچھ کھٹک سا گیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ میں نے فوراً ہانک لگائی "بھائی رشید! اے بھائی رشید!" مگر جواب ندارد!

اب جو میں نے ذرا غور کیا تو مجھے محسوس ہوا وہاں ایک غیر فطری سا سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا عموماً گھروں میں نہیں ہوتا۔ چوڑیوں کی کھنک نہ سہی تو کسی بچے کی "چوں چوں، ٹوں ٹوں" ہی سنائی دے جاتی ہے۔ میں گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اسی وقت اندرونی دروازے کی جانب سے بھاری یا شاید ہلکے قدموں کی چاپ ابھری۔ اس وقت میں اتنا بدحواس ہو گیا تھا کہ ہلکے اور بھاری پر غور نہ کر سکا۔ پھر جیسے ہی دروازے کا پردہ ہٹا میرے فرشتے کوچ کر گئے یا غالباً کوچ کرنے کی تیاری کرنے لگے۔

اندرونی دروازے سے نشست گاہ میں داخل ہونے والا رنجیت تھا۔ اس وقت وہ اپنی اصل شکل صورت میں تھا مگر ہر طرف سے خاصا ٹوٹا پھوٹا نظر آ رہا تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ بدبخت یوں "جلوہ افروز" ہو گا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے بمشکل ہکلا کر کہا "وہ بھا... بھا... بھائی رشید کہاں گئے؟"

"جہنم میں!" وہ جبڑے بھینچ کر بولا۔

"چلو اچھا ہوا!" میں نے اس کے تیور دیکھ کر جلدی سے کہا۔ "آپ کے کیا حال احوال ہیں پیارے بھائی؟ معلوم ہوتا ہے کہیں رگر گرا پڑے۔"

وہ میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر آہستہ آہستہ بڑے پُراسرار سے انداز میں آگے بڑھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ بھی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی پٹی کے اندر پڑا ہوا تھا، چہرے پر کئی جگہ خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ بائیں آنکھ بھی کچھ سوجی ہوئی سی تھی۔

اس ظالم کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر میں اس ہرن کی طرح چوکڑی بھول گیا جس کے سامنے اچانک شکاری آ گیا ہو۔ خوف کے سبب میرے پاؤں کانپنے لگے تھے اور میرے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو رہے تھے۔ میں دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا اور کرسی الٹتے الٹتے بچی۔ اس دوران میں رنجیت میرے قریب پہنچ چکا تھا۔

"ادھر دیکھو بہروپیے! اوپر!" وہ غرایا۔

میرا جھکا ہوا سر ایک جھٹکے سے اوپر ہو گیا "فر... فرما... فرمائیں پیارے بھائی!" میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم رگھوناتھ کو کیوں تلاش کر رہے ہو؟" اس نے سختی سے سوال کیا، اس طرح جیسے رگھوناتھ کو تلاش کرنا کوئی بہت بڑا جرم ہو۔

"اب اسے تلاش نہیں کروں گا پیارے بھائی!" میں نے جلدی سے کہا "تم پہلے مجھ سے کہہ دیتے۔"

"تم پھر بدمعاشی پر اُتر آئے! میں پوچھ رہا ہوں، تلاش کیوں کر رہے ہو اسے؟" رنجیت کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آنے لگے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا سیدھا اور سچا جواب دے دیا۔ "سر تھامسن نے کہا تھا۔ تم جانو، پیارے بھائی، وہ میرے افسر ہیں۔ مجھے ان کا حکم تو 'بجانا' پڑتا ہی ہے۔" پھر ذرا نظر مچکا کر سمجھانے والے انداز میں، میں نے کہا "اب ذرا تھوڑی دیر کو یہی فرض کر لو کہ میری جگہ تم ہو اور وہ تمھارے افسر ہیں۔ وہ تم سے کہتے ہیں کہ باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے، قطب مینار پر ایک چوہیا چڑھ گئی ہے اُس کا پتا لگاؤ! پھر اس صورت میں پیارے بھائی، تمھیں اگر نوکری 'بجانا' ہے تو لامحالہ تم چوہیا کم بخت کی تلاش میں روانہ ہو جاؤ گے۔ اب بتاؤ کہ ہے نا یہ صحیح بات!"

"بکواس کر چکے؟" وہ غرایا۔

"ہاں۔" میں نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔ حالانکہ میری بات مدلل تھی اور اس پر "بکواس" کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا مگر اس وقت تو وہ والی مثال تھی کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

"سنو اللہ دتا!..."

"سناؤ پیارے بھائی!" میں جلدی سے بولا۔

"بیچ میں بھونکو مت!" وہ چیخ اٹھا۔ "اگر مادام کا حکم نہ ہوتا تو میں اب تک تمھیں کئی بار جہنم کی سیر کرا چکا ہوتا۔"

مجھے بھی تیری بات پر یقین ہے اے بدذات! میں نے سوچا مگر چپ رہا، یہ خیال کر کے کہ کیا خبر کچھ بولنے سے اُلٹی آنتیں گلے پڑ جائیں۔ اسی وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں میرا جھوٹ تو نہیں کُھل گیا؟ میں نے رنجیت سے کہا تھا کہ مادام کا پرچہ، یعنی پیغام، شیکھر کو پہنچا دیا تھا۔ کہیں اس "پاکٹ سائز" نے رنجیت کو بتا تو نہیں دیا کہ اسے کوئی پیغام وغیرہ نہیں ملا؟ یہ ساری گھیرا گھاری اسی سلسلے میں تو نہیں ہے؟ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو پھر میری خیر نہیں تھی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں اور بھی ہَول اٹھنے لگے۔

معاً رنجیت کی آواز پھر ابھری اور میں چونک اٹھا۔ وہ کہہ رہا تھا "پھر بھی یہ نہ سمجھنا کہ میں تمھارے ہاتھ پیر نہیں توڑ سکتا۔" وہ مجھے دھمکا رہا تھا حالانکہ خود ٹوٹا پھوٹا نظر آ رہا تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا، اس بلا سے کیسے چھٹکارا پاؤں جو رنجیت کی صورت میں میرے سر پر مسلط تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میری سن لی۔ عمارت کے اندر دور کہیں سے گھنٹی کی آواز سنائی دی جسے سن کر رنجیت چونک اٹھا اور پھر بغیر کچھ کہے سُنے مڑ کر نشست گاہ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

رنجیت تو اندر گیا اور میں لپک کر بیرونی دروازے تک پہنچا۔ کیا خبر وہ میرا وہم ہی ہو کہ کسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا ہے مگر دروازے پر زور لگانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی کم بختی آ ہی گئی ہے۔ دروازہ بند تھا۔ میں پھر لپک کر اسی کرسی پر آ بیٹھا۔ اب اللہ ہی بچاتا تو بچتا ورنہ وقت آخر تو آ ہی گیا تھا۔ رنجیت کے تیور اچھے نہیں تھے اور ان ستم ظریف مادام کے بارے میں بھی کیا بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ ان کی اونٹنی کس کروٹ بیٹھے گی۔ وہ محترمہ میرے متعلق اپنی رائے تبدیل بھی تو کر سکتی تھیں۔ پھر کیا رنجیت مجھے زندہ چھوڑ دیتا؟ اس قاتل سے یہ توقع ہی رکھنا فضول تھا۔

اس سے پہلے کہ میں خوف زدہ ہو کر سنجیدگی کے ساتھ بے ہوش ہونے کی سوچتا، دبے قدموں، نشست گاہ میں میرا جعلی کلاس فیلو رشید داخل ہوا۔ ظاہر ہے کہ رنجیت کا کوئی ساتھی میرا کلاس فیلو کس طرح ہو سکتا تھا! یہ سب مجھے پھانسنے کے داؤ تھے مگر اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ جو رائے میں نے رشید کے بارے میں قائم کی تھی، غلط تھی۔

رشید کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی۔ بھلا کوئی دشمن اس طرح دل آویز انداز میں مسکرا سکتا تھا، چائے پلا سکتا تھا! مگر یہ رنجیت یہاں کہاں سے ٹپک پڑا؟

پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اور رشید سے وضاحت طلب کرتا، وہ خوش دلی سے بولا "مجھے کچھ دیر ہو گئی یار، معاف کرنا۔ آؤ ادھر بیٹھ کر چائے پئیں گے۔" اس نے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی میز پر چائے کی ٹرے رکھ دی۔ میز کے سامنے دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا انداز قطعی دوستانہ تھا۔

میری کھوپڑی گھوم کر پھر اپنی جگہ واپس آ گئی تو میں نے ... "کسی نے نشست گاہ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

... نے دھیرے سے ہنس کر جواب دیا "ارے وہی پاگل ہو گا۔ ... دوسری طرف سے جا کر کھول دوں گا۔ اسے میں نے اس طرف آتے دیکھا تھا اسی لیے گھنٹی بجا کر اندر بلا لیا کہ کہیں وہ تمھیں تنگ نہ کر رہا ہو۔" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے بولا۔ "دو یار! ابھی تو تم سے گپ بھی نہیں لڑی، پھر کہو گے کہ تمھیں جلدی دفتر پہنچنا ہے۔"

ادھو تو یہ بات ہے! رشید کو پتا ہی نہیں کہ رنجیت ہے کیا شے! میں نے سوچا اور جلدی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ رشید کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہی میں اس کی طرف جُھکا اور رازدارانہ انداز میں اس سے کہا "تم جسے پاگل سمجھ رہے ہو، پتا ہے تمھیں وہ کون ہے!"

"نوکر ہے ہمارا اور کون ہوتا یار!" رشید نے پُرسکون آواز میں کہا۔ "تمھیں تو پتا ہے یار، ابا جی کتنے رحم دل واقع ہوئے ہیں۔"

"مگر... مگر تمھاری امی، پردہ نہیں کرتیں اس سے؟ وہ... وہ تو اندر ہی سے آیا تھا اور..."

"یار، تم تو بس بال کی کھال نکالنے بیٹھ گئے! امی اور ابا جی ... بھائی صاحب کے گھر گئے ہوئے ہیں اس وقت۔ تمھیں پتا ہی ہے کہ ابھی میں نے شادی نہیں کی۔ پھر کیا اس وقت دیواروں سے پردہ کراؤں!" رشید میری بات کاٹ کر بولا اور ہنسنے لگا۔ "چائے پیو!" یہ کہتے ہوئے اس نے ٹرے سے ایک کپ اٹھا لیا۔ "تمھارے لیے خود اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر لایا ہوں، وہ پاگل تو کسی کام کا ہے نہیں۔"

نہ صرف میں بلکہ میرا عزیز دوست بھی سخت خطرے میں تھا۔ دوستی کا تقاضا یہ تھا کہ میں اسے فی الفور خطرے سے آگاہ کر دیتا اس لیے جلدی سے بولا "رشید! تمھاری اور میری زندگی خطرے میں ہے، نہ صرف ہم دونوں کی زندگی بلکہ تمھارے امی ابا کی زندگی بھی سخت خطرے میں ہے۔"

"کیسے؟" وہ ایک دم چونک کر بولا اور چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

"ارے تم جسے پاگل سمجھ رہے ہو وہ ایک خطرناک قاتل ہے۔ وہ یہاں آ کر چھپ گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے۔" میں نے آخر اسے بتا ہی دیا۔

رشید نے میری بات سن کر مزید حیرت کا اظہار کیا ... بولا۔ "مگر تمھیں یہ بات کیسے پتا ہے؟"

"خیر اب تم سے کیا چھپانا، میں خفیہ میں ہوں۔" میں نے آہستہ سے اس کی طرف جُھکتے ہوئے کہا۔

"خفیہ!"

"سی آئی ڈی۔" میں نے وضاحت کی "میں سی آئی ڈی میں انسپکٹر ہوں۔"

"تم تو مجھے حیران کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔" رشید مسکرا کر بولا۔ "پہلے تم نے اس پاگل کے بارے میں انکشاف کیا کہ وہ مفرور قاتل ہے، اب یہ بتا رہے ہو کہ تم سی آئی ڈی کے انسپکٹر ہو۔"

"ہاں، میں نے بالکل سچ کہا ہے تم سے! ویسے تم کسی کو بتانا نہیں کہ میں کون ہوں! یہ بات کسی کو بتانے کی نہیں ہوتی۔ تم تو

دوست ہو اس لیے تمھیں بتا دیا۔"

"خیر فی الحال تو تم چائے پیو۔ بعد میں دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا چاہیے! اگر تم ٹھیک کہہ رہے ہو تو میں ابا جی سے بات کروں گا۔ انھوں نے ہی اسے نوکر رکھا تھا۔ ہر چند کہ وہ بہ ظاہر تو ایسا نہیں لگتا مگر پھر بھی اسے احتیاطاً گھر سے نکال دینا چاہیے۔"

"کمال ہے تم میری بات پر یقین ہی نہیں کر رہے! ارے خدا قسم وہ قاتل ہے!" میں نے رشید کو یقین دلایا۔ "اند بھی اس کے بڑے لمبے چکر ہیں۔ اگر وہ سرکاری راز نہ ہوتے تو میں تمھیں بتا دیتا۔"

"یہ کس کافر نے کہا کہ تمھاری بات کا یقین نہیں!" رشید سنجیدگی سے بولا۔ "کہہ تو دیا نکال دیں گے اُسے!"

"نہیں ابھی نہیں!" میں جلدی سے بولا۔ "میرے ذہن میں ابھی ایک اور خیال آیا ہے۔ اس طرح یہ ابھی تبلا ہو جائے گا۔"

"وہ بھی کہہ چکو مگر چائے تو پیتے رہو۔" رشید میری بات میں دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹرے سے چائے کا کپ اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔ پھر کہا۔ "اگر وہ گرفتار کر لیا جائے، تمھارے گھر سے تو کیسی رہے گی؟"

"نہیں یار! پولیس وُلِس کا چکر نہ چلاؤ۔ اگر وہ واقعی قاتل ہے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو ہم اسے یہاں سے نکال دیں، پھر گرفتار کرا دینا۔ چائے پیو!" رشید نے چائے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم ناحق ڈر رہے ہو! جب میں خفیہ میں موجود ہوں تو تمھیں کیا خوف!"

"ٹھیک ہے مگر چائے تو پیو ٹھنڈی ہو رہی ہے!" اس نے اپنی پیالی خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں پی بھی چکا اور تم ابھی تک بیٹھے ہو پیالی لے کر!"

"تم معاملے کی اہمیت کو نہیں سمجھ رہے رشید!" میں زور دے کر بولا۔ "چائے پینا اتنا اہم نہیں ہے اِس وقت!"

"تم چائے پیو گے یا نہیں!" رشید کے لہجے میں کسی قدر جھنجلاہٹ آ گئی۔

"پھر وہی چائے! یار میں تمھیں کیسے سمجھاؤں کہ وہ قاتل ..."

"سمجھ گیا، سمجھ گیا!" رشید تقریباً چیخ پڑا، پھر اسی انداز میں زور سے بولا۔ "چائے پیو!"

میں رشید کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اگر میں چائے پینے کی بجائے اسے اور اس کے اہلِ خاندان کو ایک قاتل کے "پنجۂ ستم" سے چھڑانے کی بات کر رہا تھا، تو کون سے اس کے ہل بیل مار رہا تھا۔ میں تو اس پر احسانِ عظیم کر رہا تھا اور وہ تھا کہ اُلٹا "بوکھلائے" جا رہا تھا۔ رئیس ہو گا تو اپنے گھر کا! لعنت اس کی چائے پر! میں نے سوچا اور بولا۔ "ٹھیک ہے رشید، اگر تمھیں اپنی اور اپنے ابا اماں کی جان عزیز نہیں تو تم جانو، مجھ سے بحث کر کے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا!"

"تمھیں چائے پینا پڑے گی!" وہ گلا پھاڑ کر دہاڑا اور پھر میز پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی اٹھا لی۔ "پیو!" اس کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

میں نے سہم جانے کے باوجود ایک بار پھر چائے پینے سے انکار کر دیا۔ میں کیوں خواہ مخواہ اس کی رئیسی کے رعب میں آ جاتا!

دوبارہ انکار سن کر تو رشید آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ چائے کی پیالی لیے اٹھا اور چیخا۔ "تجھے چائے پینا پڑے گی، پینا پڑے گی چائے!" اس نے چائے کی پیالی میرے منہ کی طرف بڑھائی۔ "پی چائے، اَبے پی!"

رشید کا طرزِ عمل میرے لیے خلافِ توقع تھا۔ میں اس کی مجنونانہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک دم کھڑا ہو گیا۔ چائے کی پیالی میری ناک سے ٹکرا کر اوندھ گئی، کچھ چائے کپڑوں پر گری اور کچھ فرش پر!

"حرام زادے!" رشید دہاڑا اور پیالی میں بچی ہوئی بقیہ چائے میرے چہرے پر پھینک دی۔

ہر چند کہ چائے زیادہ گرم نہیں رہی تھی مگر پھر بھی گنگنی ضرور تھی۔ میں اس سے جلا تو نہیں مگر میرے کپڑے خراب ہو گئے، اس کے علاوہ آنکھوں اور ناک کے نتھنوں میں بھی چند قطرے پڑ گئے۔ میں آنکھیں "میڑھنے" لگا۔ پھر اسی عالم میں مجھے رنجیت کی آواز سنائی دی۔

"میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا سر! یہ بہت عیار ہے۔ یہ اس طرح نہیں مانے گا۔"

"خاموش رہو!" رنجیت کی بات کے جواب میں مجھے ایک اجنبی سی آواز سنائی دی۔ دونوں الفاظ انگریزی میں کہے گئے تھے اور لہجہ بالکل انگریزوں جیسا تھا۔

فراڈ، دھوکا، فراڈ! میں نے سوچا۔ یقیناً مجھے چائے میں زہر ملا کر پلایا جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں مگر کمرے میں کسی تیسرے وجود کو نہ پا کر حیران ہوا۔ پھر وہ انگریزی بولنے والا کون تھا؟ ابھی میں "حیران" ہونے کا پوز بنانے ہی والا تھا کہ دھائیں سے میرے منہ پر گھونسا پڑا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو رشید کے دوسرے گھونسے نے میرے نادیدہ طبق روشن کر دیے۔ یہ گھونسا براہِ راست میری کنپٹی پر پڑا تھا۔ میری کھوپڑی گھومی اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کب تک گھومے چلی گئی۔

میری کھوپڑی گھوم گھام کر اپنی جگہ واپس آئی تو مجھے یوں

لگا جیسے میرے منہ میں زبردستی کچھ ٹھونسنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ میں نے دہل کر آنکھیں کھول دیں۔ میں اسی منحوس کمرے میں فرش پر پڑا تھا اور رشید میرے منہ میں کپڑا ٹھونس رہا تھا۔ میں نے لاکھ "اوع اوع" کی مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگی یا رینگی ہو گی تو اس نے بے چاری جوں کی "رینگن" کو زیادہ لفٹ نہیں دی ہو گی۔ حلق تک کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی۔

چند لمحوں میں مجھ پر یہ راز بھی کھل گیا کہ میرے ہاتھ پیر پہلے ہی باندھے جا چکے تھے۔ ہائے غار والی! تم مر گئیں پیاری! ورنہ اس وقت بھی پہلے کی طرح میرے کام آتیں۔ میں نے دل ہی دل میں فریاد کی اور دیدے گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ "دی اینڈ" ہونے سے پہلے میں دنیا پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈال لینا چاہتا تھا۔

رشید اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنی کارکردگی کا گویا معائنہ فرما رہا تھا۔ پھر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور قریب ہی کھڑے ہوئے رنجیت کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ "بوری دو۔"

پھر مجھے ایک بڑی سی بوری میں ٹھونس دیا گیا۔ جب بوری کا منہ باندھا جا رہا تھا تو میں نے آخری کوشش کے طور پر تھوڑا بہت اُودھم مچانا چاہا مگر دو چار کرارے ہاتھوں نے میری ہمت پست کر دی۔ "غوں غوں!" میں نے ناک سے دردانگیز آوازیں نکالیں اور چپ سادھ لی۔ آخرکار بوری کا منہ باندھ ہی دیا گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تعاقب نہیں کیا گیا مگر تمھارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ جلدی سے میک اپ کر لو اور میرے ساتھ چلو۔" رشید کی آواز سنائی دی۔ "میں بھی اس دوران میں دوسرا میک اپ کر لیتا ہوں۔"

"اور یہ سر؟" رنجیت کی آواز اُبھری، لہجہ سوالیہ تھا۔

"اسے یہاں سے اٹھا کر میں کار کی ڈکی میں لاک کیے دیتا ہوں۔ تم پہلے ہی زخمی ہو... تم سے نہیں اٹھے گا یہ!"

"ٹھیک ہے سر!" رنجیت نے جواب دیا اور پھر دور ہوتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

سیٹھ عثمان کی "نازک اندامی" نے تو میرے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا مگر رشید "شریف آدمی" معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بوری سمیت مجھے اپنی "پیٹھ" پر ڈال لیا۔ ایسے حالات میں سفرِ آخرت کے لیے کم سے کم چار بندے ضروری ہوتے ہیں لیکن اس وقت بے چارے ایک بندے ہی کو یہ فرض ادا کرنا پڑ رہا تھا۔

مجھے اس سے پہلے کسی کار کی ڈکی میں، وہ بھی بوری کے اندر بند ہونے کا کوئی تجربہ نہیں تھا حالانکہ ہر ہیرو کو زندگی میں دس بیس دفعہ تو کسی کار کی ڈکی میں بند ہونا یا چھپنا پڑتا ہے۔ اگر میں بھی کسی کہانی کا ہیرو ہوتا تو ذرا نہ گھبراتا، نہ اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتا مگر میری مشکل یہ تھی کہ میں ہیرو کی بجائے آدمی تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ میں "انا غفیل" ہو گیا۔

ہوش آنے پر میں نے جو پہلی آواز سُنی، وہ بڑی دل آویز محسوس ہوئی۔ عورت کی آواز ہر حال میں ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی مجھے معلوم ہوئی۔

"کام غلط خطوط پر ہو رہا ہے۔" عورت کی آواز سنائی دی۔ یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا گیا تھا، لہجے سے بھی بولنے والی "انگریزن" ہی لگ رہی تھی۔ "میرے گلاس میں وِسکی اور ڈالو!"

"غٹل غٹل" کی صدا آئی اور ساتھ ہی بدبو بھی!

"تمھیں یاد ہو گا کہ جب رنجیت نے پہلی بار سیٹھ وشوا ناتھ وغیرہ کے بارے میں بتایا تھا، اسی وقت میں کھٹکی تھی، میں نے تمھارے کہنے پر رنجیت کو اس خفیہ تنظیم میں شامل ہونے کی اجازت دے دی مگر آخر میں کیا نتیجہ نکلا! ساری محنت بیکار گئی نا!"

"تمھارے اندازے اکثر صحیح ثابت ہوتے ہیں۔" جواب میں ایک مرد کی آواز سنائی دی۔ مرد بھی انگریزی بول رہا تھا۔ یہ آواز اسی "تیسرے وجود" کی تھی جو مجھے دکھائی نہیں دیا تھا اور جس نے رنجیت کو خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔

تجسس سے مجبور ہو کر میں نے پلکوں میں ذرا سی جھری پیدا کی کہ دیکھوں تو سہی ہوں کہاں اور وہ کون لوگ ہیں۔ آنکھیں بند ہوں تو اندھیرا لگتا ہی ہے مگر اس وقت میرے ساتھ عجب ہوا، آنکھیں کھولنے پر بھی اندھیرا ہی اندھیرا رہا۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گھبراہٹ کے سبب مجھے آنکھیں کھولنا یاد ہی نہ رہی ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے کئی بار دیدے گھمائے مگر نتیجہ وہی کا وہی رہا، اندھیرا! ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں مجھے قبر وبر میں تو نہیں "دلب" دیا گیا۔ پھر میں نے اس خیال کو مسترد کر دیا، خود ہی کسی کے کہنے پر نہیں! کیوں کہ ایسا ہوتا تو وہ آوازیں جو مجھے سنائی دے رہی تھیں، ہرگز سنائی نہ دیتیں۔ یہ سوچ کر میرے دل کو بڑی ڈھارس بندھی کہ میں ابھی مرا نہیں زندہ تھا اور منکر نکیر کا فی الحال کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چند لمحے بعد جب ذرا میرے حواس بحال ہوئے تو میں سمجھ گیا کہ ابھی تک ہاتھ پیر اسی طرح بندھے ہوئے ہیں، منہ میں بدستور کپڑا ٹھنسا ہوا ہے اور بوری کے اندر ہی "تشریف فرما" ہوں لیکن وہ بوری کہاں تھی؟ یہ بہرحال ایک عقدہ تھا۔ اس سوچ بچار کے دوران میں مرد اور عورت کی آوازیں برابر سنائی دیتی رہی تھیں مگر میں نے ان پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" والا مسئلہ تھا۔ پھر جب ان دونوں کی گفتگو میں میرا "نامِ نامی" بھی آ گیا تو میں نے

اپنے کان ادھر لگا دیے۔ وہ دونوں اب بھی انگریزی بول رہے تھے۔

"میرے خیال میں تم نے غلطی کی جو اس بے وقوف انسپکٹر کو یہاں اٹھا لائے۔" عورت کہہ رہی تھی اور اب اس کی آواز میں نشے کی لہر بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ "بے وقوف انسپکٹر" میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ ذکرِ خیر میرا ہی تھا۔

"سارا مسئلہ تو یہی ہے سینڈی کہ یہ بے وقوف ہے یا نہیں۔" مرد نے کہا اور اس طرح مجھے اس عورت کا نام معلوم ہو گیا۔ مرد کی آواز بھی نشے سے بوجھل ہو رہی تھی۔ پتا نہیں، وہ دونوں کب سے پی رہے تھے۔

"میں سمجھتی ہوں رچی، کہ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" سینڈی بولی۔ گویا مرد کا نام رچی ہے، میں نے سوچا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت سوچنے کے سوا میرے بس میں تھا ہی کیا!

"مسئلہ تو ہے۔" رچی اپنی بات پر اڑ گیا۔ "تم سر تھامسن کو اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ کس قدر عیار آدمی ہے۔ وہ پہلے بھی ہماری راہ میں روڑے اٹکاتا رہا ہے۔ اس پر نظر رکھنا بہرحال ضروری تھا۔ میں نے اسی لیے سودا بازی کی تھی۔ اگر ہم اس کے کسی قریبی آدمی کو خرید سکیں تو بڑی حد تک اس کی نقل و حرکت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہی حربہ ہم اس پر پہلے بھی تو آزما چکے ہیں۔"

"مجھے تمھارے اس خیال سے اختلاف نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ آدمی کا انتخاب ہے۔" سینڈی "غٹ غٹ" کے بعد بولی۔ غالباً اس نے شراب کے دو چار گھونٹ اور لیے تھے۔ چند لمحے توقف کے بعد سینڈی کی آواز پھر سنائی دی۔ "آنکھیں کھول کر کام کرو رچی! اب تک جو حالات پیش آئے ہیں، شاید تم نے ان کا تجزیہ نہیں کیا۔ ذرا غور کرو، رنجیت، اس انسپکٹر سے مل کر روانہ ہوتا ہے اور پھر اسے چاروں طرف سے ایک چوراہے پر گھیرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رنجیت اپنی ذہانت کے سبب، زخمی ہو کر کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب ذرا یہ سوچو کہ اس پر حملہ کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ پھر میں خود اسے گھیرنے کی کوشش کرتی ہوں اور اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہوں۔ میں کمپنی باغ والے واقعے کا ذکر کر رہی ہوں۔ وہاں مجھ پر بھی فائرنگ ہوتی ہے اور میں بچ کر تمھارے ساتھ نکل آتی ہوں۔ یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجھ پر فائرنگ کس نے کی؟ کچھ آ رہا ہے سمجھ میں!" سینڈی خاموش ہو گئی۔

"ہوں۔" رچی نے طویل سانس لیا۔ "تمھاری باتوں سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ سر تھامسن نے ہمیں پھانسنے کے لیے اس انسپکٹر کو آگے کر دیا ہے۔ وہ گویا بطور چارہ استعمال کر رہا ہے۔"

"ہاں، میں اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔" سینڈی نے کہا۔ "رنجیت اور مجھ پر حملہ کرنے والے سر تھامسن ہی کے آدمی ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو ضروری تھا کہ اس انسپکٹر کی وفاداری کو آزمایا جاتا۔" رچی بولا۔ "رنجیت نے اسی لیے میرے ایما پر نوٹوں کی گڈی کے ساتھ دانستہ دو پرچے رکھ دیے تھے اور پھر ان پرچوں کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ کی تھی لیکن بات واضح ہونے کے بجائے اور الجھ گئی۔ ان پرچوں کے دو مقاصد تھے جو میں نے تمھیں بتائے بھی تھے اور تم نے میری بات سے اتفاق بھی کیا تھا۔ پہلا مقصد تو یہ کہ اگر اللہ دتا واقعی ہم سے دھوکا کر رہا ہے تو پھر لازماً وہ پرچے، سر تھامسن کو دے گا اور سر تھامسن، پالنسوں اور ہندسوں کے چکر میں پھنس کر رہ جائے گا۔ وہ انھیں کوئی کوڈ وغیرہ سمجھے گا اور اس طرح غلط راہ پر لگ جائے گا، یعنی ایک بے مقصد چیز کی خاطر اپنا وقت ضائع کرے گا۔ اگر اللہ دتا، وہ پرچے، سر تھامسن کو نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ہمارا وفادار ہے۔ اس صورت میں پرچے اس کے پاس ہونا چاہیے تھے۔ دوسرے پرچے کا مقصد بھی دہرا تھا۔ سب انسپکٹر شیکھر بہرحال بہت دن سے ہمارے لیے وبال بنا ہوا ہے۔ اس طرح اسے اپنا آلۂ کار ثابت کر کے اس کا پتا صاف کیا جا سکتا تھا۔ یہ دہری چال تھی۔ رنجیت نے اللہ دتا سے بات کر کے جو کچھ معلوم کیا، اس پر مجھے یقین نہیں آیا۔ اللہ دتا نے بتایا تھا کہ اس نے پالنسوں والا پرچہ تو بیکار سمجھ کر پھاڑ دیا اور دوسرا پرچہ شیکھر کی لاعلمی میں اس تک پہنچا دیا۔ کیا سچ ہے؟ کیا جھوٹ، یہ جاننے کے لیے بہرحال اللہ دتا پر ہاتھ ڈالنا ضروری تھا۔ ہم نے اسی لیے اس کے اغوا کا منصوبہ بنایا جو ناکام رہا لیکن اب وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اگر اس سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی ہمارا وفادار ہے اور ہمارے کام آ سکتا ہے تو ٹھیک ہے، ہم اسے چھوڑ دیں گے، اگر وہ دھوکا باز ثابت ہوتا ہے تو اسے راستے سے ہٹا دیں گے۔ میری ریڈنگ اس کے بارے میں یہ ہے کہ وہ بہرحال بے وقوف نہیں ہے۔" یہ کہہ کر رچی نے "غٹاغٹ" شراب کا "چسکا" مارا۔

"نہیں رچی!" سینڈی نے کہا۔ "میں تمھارے خیال سے متفق نہیں ہوں۔"

"کیوں؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تمھیں علم ہے، میں بے سبب قتل وغیرہ پسند نہیں کرتی۔ مرار ی لال اور اس کے باپ کے قتل بھی میری نظر میں غیر ضروری تھے مگر تم نے مجھ سے اختلاف کیا۔ بہرحال اس سے دشواریاں پیدا ہوئیں جن سے تم بھی واقف ہو۔ ان معاملوں میں پھنسنے

سے اصل مقصد پس پشت چلا جاتا ہے اور غیر اہم معاملے اوّلیت حاصل کر لیتے ہیں۔" سینڈی کی آواز نشے کے باوجود پُرسکون ہی تھی۔ "یہ انسپکٹر دہرا کھیل ہی کیوں نہ کھیل رہا ہو، میں اسے قتل کیے جانے

کے حق میں نہیں۔ اس کا ایک حل یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم اس کا پیچھا ہی چھوڑ دیں..."

اللہ تمھیں خوش رکھے، جگ جگ جیو! میرے دل سے دعا نکلی جو منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کے سبب ہونٹوں سے نہ نکل سکی۔ پہلے میں اس کے لیے "سینڈی" کی بجائے "سینڈل" کا نام تجویز کر رہا تھا مگر اب میں نے یہ ارادہ موقوف کر دیا۔

"اس معاملے کو ذرا مختلف انداز میں سوچو رچی! تصویر کا دوسرا رُخ بھی تو ہوتا ہے۔" سینڈی کہہ رہی تھی۔

"مثلاً؟" رچی کی آواز سنائی دی۔

"مثلاً یہ کہ ہم بھی سر تھامسن کی طرح دور سے تماشا دیکھیں۔ ہم اپنے آدمیوں کی تعداد بڑھا سکتے ہیں۔ خود مجھے، تمھیں یا رنجیت کو کسی مرحلے پر سامنے آنے کی ضرورت نہ پڑے اور اگر کبھی ضرورت پڑ ہی جائے تو بہ مجبوری ہی ہم حرکت میں آئیں۔ یوں بھی ابھی رنجیت کو کچھ دن آرام کی ضرورت ہے۔"

"مگر فی الحال تو مسئلہ اللہ دتا کا ہے، اس کا کیا کیا جائے؟" رچی بولا۔

"میری ریڈنگ اس کے بارے میں یہ ہے کہ وہ قطعی احمق، بے وقوف اور گھامڑ ہے۔" سینڈی نے میری "ذاتِ بابرکات" کے بارے میں فیصلہ سنایا، پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔ "ہمیں باتوں میں یہ خیال تو رہا ہی نہیں کہ کہیں وہ ہوش میں نہ آ گیا ہو!" سینڈی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ وہ اب تک بوری میں بند ہے، دوسرے یہ کہ میں نے اسٹور مقفل کر دیا ہے۔ پھر بھی اگر تم کہو تو احتیاطاً دیکھ لوں اُسے؟" رچی نے کہا۔ "میں تو اسے نیچے تہ خانے میں ڈال کر آ رہا تھا، تمھی نے منع کر دیا۔"

"میں نے اس لیے منع کیا تھا کہ اسے یہاں رکھنا تو ہے نہیں، پھر خواہ مخواہ کیوں وہاں لے جایا جائے۔"

"تو یوں کہو کہ تم پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھیں!"

"ہاں۔" سینڈی نے جواب دیا، پھر بولی۔ "دوسری بوتل کھول لو، آج پتا نہیں، نشہ کیوں نہیں ہو رہا۔"

"ہاں، کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہے۔" رچی نے ہنستے ہوئے کہا حالانکہ اس کی آواز بھی سینڈی کی طرح نشے سے بوجھل ہو رہی تھی۔

پتا نہیں یہ کم بخت شرابی ڈینگیں کیوں مارتے ہیں! چاہے "پٹلیا" چھوٹی سی ہو مگر ہر شرابی یا "شرابن" کا دعویٰ یہی ہو گا کہ مٹکے سے کم میں تو اسے نشہ ہو گا ہی نہیں۔ اب کون پوچھے بدبختوں سے کہ "آپی" یا "آبے"، تم لوگ اپنے پیٹ سے زیادہ کیسے پی لو گے؟ جتنی گنجائش پیٹ میں ہو گی، اتنی ہی تو پیو گے! شرابیوں کی اکثریت شیخی خور ہوتی ہے۔ میں نے کم شرابی ایسے دیکھے ہیں جو دو چار گلاس کا اعتراف کر لیں کہ بس اتنی ہی گنجائش ہے۔ کچھ یہی حال اس وقت سینڈی اور رچی کا تھا۔ ان کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ پوری ایک بوتل "سونت" چکے تھے اور نہ جانے کب سے "گھونٹے" اُڑا رہے تھے مگر پھر بھی شراب پینے میں خود کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دکھا رہے تھے۔ میں نے سوچا، اچھا ہے کہ ان دونوں میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس طرح کم سے کم وہ میری خیر خبر کی طرف سے تو غافل ہو ہی جاتے۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ بوری جس کے اندر میں بند تھا، اسی کمرے کے اسٹور میں تھی جہاں وہ دونوں موجود تھے۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی، پھر "غٹاغٹ" کی صداؤں کے بعد رچی کی آواز ابھری۔ "تمھارے خیال میں یہ انسپکٹر بے وقوف ہے تو پھر اب لائن آف ایکشن کیا ہونا چاہیے؟"

"سر تھامسن ابھی تک اسی بے وقوف کے ذریعے سارا کھیل کھیل رہا ہے۔ میرا قیاس یہی ہے۔ اب اگر ہم اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھتے تو وہ پھر اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارے گا۔ اس کے سامنے اور کوئی راہ نہیں، آگے بڑھنے کے لیے!" سینڈی نے اظہارِ خیال کیا۔ "رہا مسئلہ کسی آدمی کو خریدنے اور سر تھامسن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کا تو یہ بعد میں سوچیں گے۔"

"سینڈی! تم ایک بات بھول رہی ہو۔" رچی نے کہا۔ "رگھوناتھ!"

"یہ کوئی اہم بات نہیں۔ اسے بہ آسانی ہینڈل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رگھوناتھ تو انھیں ملے گا نہیں، تفتیش آگے بڑھے گی تو کیسے!"

"پھر بھی ہمارے لیے دشواریاں تو پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"خیر یہ ضمنی باتیں ہیں اور ان پر بعد میں غور کیا جا سکتا ہے۔" سینڈی نے کہا۔ "فی الحال تو ہمیں اپنے اصل مقاصد پر سوچنا ہے۔ سر تھامسن کے پاس صرف ایک کارڈ ہے اور وہ بھی جوکر!" یہ کہہ کر سینڈی ہنس پڑی۔ غالباً اس کے ذہن پر نشے کی گرفت ہوتی جا رہی تھی۔

جواب میں رچی بھی ہنسا۔ پھر وہ دونوں نشے کی ترنگ میں دیر تک ہنستے رہے۔

کچھ دیر بعد رچی کی قہقہاہٹ ختم ہوئی تو وہ بولا۔ "سینڈی ڈارلنگ! میں سمجھ رہا ہوں کہ تمھارا ذہن کن خطوط پر سوچ رہا ہے۔"

"اچھا تمھی بتاؤ۔" سینڈی کی آواز سے خوش دلی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تم آدمیوں کی تعداد بڑھا کر سر تھامسن کو الجھانا چاہتی ہو۔ وہ اِدھر الجھا رہے اور اُدھر تم اپنا کام دکھا جاؤ۔"

"بالکل! تم نے ٹھیک سمجھا۔" سینڈی نے تصدیق کی۔ "دہلی مرکز

ہے۔ انتشار یہاں سے پھیلے گا تو رفتہ رفتہ سارا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ پھر ہم اپنے ان مُہروں کو بھی حرکت میں لا سکتے ہیں جو دوسرے اہم شہروں میں موجود ہیں۔ اگر برطانوی حکومت کی ساری توجہ ہندوستان کی طرف ہو جاتی ہے تو اس سے دُور رَس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات! ابھی ہمارا کام ابتدائی مراحل میں ہے۔ ہمیں ابھی صرف چند کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں جب کہ ابھی بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔ مراری لال کے قتل سے بھی ہمارے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ ڈیفینس منسٹری کے ریکارڈ سے ابھی ہمیں مزید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس سے ایک نقصان اور بھی ہوا کہ وہ لوگ چوکنا ہو گئے۔"

"ایک بات اور ہے۔" رچی نے کہا۔ "میرا اندازہ ہے کہ سرتھامسن ہم دونوں کی یہاں آمد سے شاید باخبر ہو گیا ہے۔ مراری لال مرڈر کیس کی فائل اور اسی سلسلے میں کیٹی کا اغوا' دونوں ہی باتیں غلط ہو گئیں۔ ہم نے اس وقت غور نہیں کیا کہ فائل کے مطالعے پر سرتھامسن کھٹک سکتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ تھا کہ وہ ہندوستان میں ہماری موجودگی سے باخبر نہ ہو سکے لیکن قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ کم از کم اتنا ضرور سمجھ گیا ہے' ان تمام واقعات کے پیچھے ہمارا ہاتھ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟"

"تم صحیح سوچ رہے ہو۔" سینڈی نے جواب دیا۔ "بہرحال وہ ایک احتیاطی تدبیر تھی۔ میں سرتھامسن کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی لیکن وہ اگر سمجھ بھی چکا ہے کہ ہم ہندوستان میں ہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر ایسا ہے تو یہی سہی۔" اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ "پہلے بھی تو کئی بار ایسا ہو چکا ہے اور ہم نے اسے شکست دی ہے۔"

"ہاں!" رچی تشویش ناک لہجے میں بولا۔ "لیکن سینڈی یہ برطانیہ نہیں ہے۔ یہاں ہمارے لیے زیادہ مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"سرتھامسن کے لیے بھی تو یہ برطانیہ نہیں ہے' یہ کیوں نہیں سوچتے!" سینڈی کا لہجہ اب بھی پُرسکون تھا۔ "سنو' کسی بھی بڑے ہندوستانی سیاسی لیڈر کا قتل ہمارے کام میں بہت آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔ کہو' کیا کہتے ہو!"

"ویری گڈ!" رچی جیسے خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس کے لہجے سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

"میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اس لڑکی گریتا کا قصہ بھی ختم کر دیا جائے۔ اس پر مزید تشدد کرنا بیکار ہی ہوگا۔ اسے جو کچھ بتانا تھا' میرے خیال میں بتا چکی ہے۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے؟"

"نہیں یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" سینڈی نے جواب دیا۔ "قصہ ختم کرنے سے مقصد کچھ اور تھا۔ اسے رہا کر کے ایک اور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"کیا؟"

"ابھی خود میرے ذہن میں کوئی واضح بات نہیں۔ بہرحال وقت آنے پر بتاؤں گی۔"

"اور وہ شاہنواز؟"

"اسے بھی چھوڑنا ہی پڑے گا کیوں کہ اب میں طریقۂ کار بدلنا چاہتی ہوں۔" سینڈی نے جواب میں کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر شاہنواز سے کچھ پوچھ گچھ ہوئی بھی تو وہ یہی بیان دے گا کہ نہ جانے کیوں کچھ لوگوں نے اسے اپنی قید میں رکھا ہوا تھا۔ دراصل اس کے اغوا سے جو مقصد تھا ہمارا' وہ پورا نہیں ہوا۔ ہم سمجھے کہ شاید سرتھامسن' اس معاملے میں الجھ جائے گا۔ وہ سیتا اور شاہنواز کی تلاش شروع کرا دے گا مگر تمہیں تو خبر ہے کہ وہ بوڑھا کتنا گھاگ ہے۔ ویسے رچی' یہ حقیقت ہے کہ اس سے بھڑنے میں آتا مزہ ہے۔ بس اگر وہ ذرا سا سنکی نہ ہو تو اس سے نمٹنا مشکل ہو جائے۔ اس کی سنک ہی سے ہم کبھی کبھی فائدہ اٹھا جاتے ہیں۔ ارے ہاں وہ... اسے تو ہم باتوں میں بھول ہی گئے... دیکھو اسے فوراً! کہیں وہ ہوش میں نہ آگیا ہو۔"

"اوہ' میں بھی بھول گیا۔" رچی کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی۔

ایک تو یوں ہی میری حالت خراب تھی' جسم ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اکڑ کر رہ گیا ہو' گھٹن کا احساس الگ تھا۔ میں تو اپنی توجہ بٹانے کے لیے ان منحوسوں کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اب جو میں نے سنا کہ وہ میرا "معائنہ فرمانے" آرہا ہے تو بس دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ پہلے تو میں نے سوچا بے ہوش ہی بنا پڑا رہوں' پھر خیال آیا کہ اگر اس نے بے ہوشی کی تصدیق کے لیے ایک آدھ گھونسا جَڑ دیا تو میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ میں نے اسی لیے بے ہوشی کا ارادہ موقوف کر دیا۔

میرے دل کو یہ تسلی تو ہو ہی گئی تھی کہ ان کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا نہیں ہے مگر اس وقت میں جس عذاب میں گرفتار تھا' وہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس نے بے ہوشی کی تصدیق کے لیے گھونسا نہ بھی جَڑا اور میں مکر بنائے پڑا رہا تو ممکن ہے وہ پھر "چسکا" لگانے بیٹھ جائے اور اپنی "ٹمیاں" سے باتیں گھولنے بیٹھ جائے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ساتھ خیریت کے "ہوش" میں آجاؤں اور یہ ظاہر کردوں' بس ابھی ابھی ہوش آیا ہے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ جب وہ بوری کا مُنہ کھول رہا ہو' اس وقت میں ناک سے "سائرن" دوں' یعنی "غوں غاں" شروع کردوں' پہلے سے نہیں۔

میں نے سب کچھ سوچ سمجھ تو لیا مگر جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی۔ کہیں کسی طرح اگر انہیں یہ شبہہ ہو گیا کہ میں نے "قبل از وقت" ہوش میں آکر ان کی باتیں سن

لی ہیں تو برائے احتیاط ہی سہی وہ مجھے جیتا نہیں چھوڑیں گے۔ جان سُولی پر لٹکی ہو تو تھوڑی بہت عقل "بندہ بشر" بھی استعمال کر ہی لیتا ہے اور کچھ عقل' اللہ دے دیتا ہے۔ میں نے عین اس وقت سائرن دینا شروع کیا جب وہ بوری کا مُنہ کھول کر اس کے اندر میرا مُنہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جی تو بہت چاہا کہ اسے دیکھ لوں مگر فساد کے خوف سے گردن نیوڑھائے اور "تگّی" بنا پڑا رہا۔ معاً اس نے میرے سر کے بال پکڑ کر چہرہ اوپر کیا جیسے بکرے کے سینگ پکڑ کر اس کے دانت دیکھتے ہیں۔ میں نے اب آنکھیں کھول ہی دیں۔ اسٹور میں ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے غالباً اسٹور کا بلب جلا دیا تھا۔ اپنی مظلومیت کا اظہار میں نے آنکھوں سے کیا۔ یوں بھی مجھے اپنے حالِ زار پر رونا آرہا تھا۔ اس شخص کا چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن وہ اپنے چہرے مُہرے سے انگریز نہیں' ہندوستانی ہی معلوم ہو رہا تھا اور یہ بات میرے لیے حیران کُن تھی۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ آدمی کو حیران ہونے کی بھی فرصت نہیں ہوتی' یہی حال اس وقت میرا تھا۔ میں نے سوچا' بہ شرطِ فرصت اکٹھا حیران ہو لوں گا' اس وقت تو مجھے جان بچانے کی فکر تھی۔ چند لمحے بعد اس نے ایک جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیے اور میرا سر زمین سے ٹکرایا۔ میری ناک سے زور کی "غوں" نکلی جس کا جواب اس نے طویل "ہوں" سے دیا' پھر بوری کا مُنہ دوبارہ باندھ دیا۔ اس کے بعد قدموں کی چاپ دور ہوتی چلی گئی مگر میں نے اسٹور کا دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سنی۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں سرگوشیاں سی کر رہے ہیں۔ میں پھر ہولنے لگا مگر یہ "ہولن" اس وقت ختم ہو گئی جب میرے وجود کا بوجھ کسی نے اٹھا لیا۔ گویا اب میں بوری سمیت پھر سفر میں تھا۔ مجھے ایک بار پھر کار کی ڈِکی میں "تشریف فرما" ہونا پڑا۔ وہی پہلے جیسی گھٹن اور وہی حالت! مگر بار بار بے ہوش ہو جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ یہ الگ بات کہ مجھے ہوش میں رہنے کی قیمت ادا کرنا پڑی۔ کار فراٹے سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ذرا سا بھی دھچکا میرے انجر پنجر ہلا کر رکھ دیتا تھا۔ میں اپنی ناک سے دردانگیز آوازیں نکالتا رہا اور کار چلتی رہی۔

مجھے صرف اتنا احساس ہو سکا کہ سفر طویل تھا اور میں نے بہ مشکل خود کو بے ہوش ہونے سے بچایا تھا۔ خدا خدا کر کے کار رُکی تھی اور پھر "صاحبِ کار" نے مجھے بوری سمیت ڈِکی سے گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا تھا۔ چند لمحے بعد ہی میں نے کار کی "زُوں زُوں" سنی تھی۔ مجھے اس ظالم پر بہت غصہ آیا۔ کم بخت اور کچھ نہیں تو بوری کا مُنہ ہی کھول جاتا تاکہ میں یہ تو جان لیتا' کہاں پھینکا گیا ہوں۔ کچھ دیر تو میں اپنی جگہ ساکت پڑا رہا' پھر ذرا "ہل جُل" کی اور اردگرد کی آوازوں پر بھی غور کیا۔ تمام آوازوں پر پرندوں کی آوازیں حاوی تھیں۔ وہ کورس میں "تیاؤں تیاؤں اور چیاؤں چیاؤں" کر رہے تھے۔ ان آوازوں سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یا تو صبح ہونے والی ہے یا پھر ابھی شام ہوئی ہے۔ صبح اور شام کو پرندے زیادہ زور باندھتے ہیں۔ دوسرا قیاس میں نے یہ کیا کہ آبادی میں نہیں' کہیں دُور ہوں۔

پتا نہیں کدھر سے دو کوّے قائیں قائیں کرتے ہوئے آئے اور مجھ پر آ بیٹھے۔ میں نے ان دونوں کا بوجھ اپنے بائیں کندھے پر محسوس کیا۔ وہ دونوں مسلسل "نغمہ سرائی" فرما رہے تھے۔ چند لمحے تو میں نے ان کی بے تکلفی کو برداشت کر لیا کہ خود ہی اُڑ جائیں گے مگر جب وہ پوری "بھیرویں" سنانے پر تُل گئے تو دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے اپنے وجود کو ایک طرف لڑھکا دیا۔ کوّے تو خیر اُڑ گئے مگر اسی وقت مجھے ایک عورت کی ہلکی سی ڈری ڈری چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ زیادہ فاصلے سے سنائی نہیں دی تھی۔

"وہ... وہ دیکھو... وہ دیکھو! میں تم سے پہلے ہی کہہ رہی تھی' یہاں نہیں... مگر... مگر تم نہیں مانے... یہاں بھوت اور جنات بستے ہیں۔" کوئی عورت ہکلا ہکلا کر کسی سے کہہ رہی تھی۔

"تم تو یونہی ذرا سی بات سے ڈر جاتی ہو!" کسی مرد کی آواز آئی۔ "ارے کوئی بوری میں بلّی بند کر کے یہاں پھینک گیا ہوگا۔"

"اتنی... اتنی بڑی بلّی! ارے تم اُدھر غور سے تو دیکھو۔" عورت کی آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ "وہ... وہ دیکھو پھر بوری... بوری چلنے لگی۔"

"ہاں... کچھ لگتا تو ہے... مگر میں جن بھوت کا قائل نہیں... یہ... یہ تم یہیں ٹھہرو' میں دیکھتا ہوں۔"

"ن... نہیں! نہ جاؤ اُدھر! میں... میں اکیلی تو یہاں..."

"ثریا! میں تمہیں اتنا بزدل نہیں سمجھتا تھا' چھوڑو ہاتھ!" مرد کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

میں پھر لڑھکا۔ قدموں کی چاپ میری طرف بڑھی تو میں اپنی ناک سے سگنل بھی نشر کرنے لگا تاکہ اس بہادر آدمی کو یقین ہو جائے کہ بوری کے اندر کوئی بلّی یا پلا نہیں' ایک ممدوح جوانِ رعنا بند ہے۔

"ٹھہر جاؤ... رُک جاؤ رضی!... جن ناک ہی سے بولتے ہیں۔" عورت چیخی اور مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ کم بخت اپنے "مردوے" کو روک کر خواہ مخواہ میری آزادی کی دشمن ہو رہی تھی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے! اس نامراد عورت کی ایک نہ چلی۔

قدموں کی چاپ بالآخر میرے قریب آکر رک گئی مگر میری آرزوئے دل فوراً ہی پوری نہ ہو سکی۔ وہ بہادر آدمی شاید میری

"غوں غاں" کا مطلب سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ جب کچھ زیادہ ہی دیر ہونے لگی تو مجھے اس کی بہادری پر اشک ہونے لگا اور اسی کے ساتھ تھوڑا تھوڑا سا غصہ بھی آنے لگا۔ میں نے پوری طاقت لگا کر ایک زور دار "غوں" کی اور یہ "غوں" رنگ لے ہی آئی۔ "کون ہے؟" مرد نے کڑک کر پوچھا۔ "غوں" اس نے پھر اپنا سوال دوسرے الفاظ میں دُہرایا اور میں نے دل میں کہا، اگر بولنے کے قابل ہی ہوتا اے بہادر آدمی تو تیرا احسان کیوں لیتا! دوسری بار بھی ظاہر ہے، مجھے "غوں" ہی میں جواب دینا پڑا۔ قدموں کی چاپ قریب آنے کے بعد میں نے لڑھکنا بند کر دیا تھا اور صرف "ساؤنڈ" سے کام لے رہا تھا مگر شاید اس آدمی کو میرا لڑھکنا ہی زیادہ پسند تھا۔ اس نے غالباً اسی لیے مجھے اپنے پیر کی ٹھوکر سے لڑھکا کر دیکھا کہ آیا اب بھی لڑھکنے کے قابل ہوں یا نہیں۔

اس دوران میں مرد کی "ساتھن" بھی شاید کیا یقیناً اس کے قریب پہنچ چکی تھی اور اس کی بکبک ایک بار پھر شروع ہو گئی تھی۔ یا تو اسے اپنے بہادر ساتھی سے بہت محبت تھی یا پھر اس نے خود ہی کچھ ہمت پکڑ لی تھی ورنہ وہ دور ہی سے تماشا دیکھتی۔ وہ اب بھی مرد کے کان کھائے جا رہی تھی کہ وہ "بوری کے جن" کو آزاد نہ کرے۔

ممکن ہے مرد تنہا ہوتا تو "چیں" بول کر بھاگ لیتا مگر اس وقت وہاں ایک عدد صنفِ نازک بھی تھی۔ جس موقع پر عورت خوف کا اظہار کرے، مرد ضروری سمجھتا ہے کہ اپنی "مردمی" دکھائے یہی "مردمی" اس وقت میرے کام آ گئی۔

"تم خاموش کھڑی رہو ثریا!" مرد نے اپنی "ساتھن" کو ڈانٹ دیا۔ "یہ ہرگز کوئی جن نہیں ہو سکتا۔" پھر غالباً اپنے دل کو تسلی دینے کی خاطر بولا۔ "اگر واقعی یہ کوئی جن ہی ہوتا تو اب تک اپنی پُراسرار قوتوں سے کام لے کر بوری سے باہر آ چکا ہوتا۔"

"کیا تم نے بوتل میں جن بند ہونے کے قصے نہیں سُنے!" عورت کا لہجہ فریادی تھا۔ "بہت سے عامل، جنوں کو بوتلوں میں بند کر دیتے ہیں اور...."

"مگر یہ تو بوری میں بند ہے!" مرد نے دلیل پیش کی۔

"یہ کوئی بہت بڑا جن ہو گا جو بوتل میں نہیں آ رہا ہو گا اس لیے اسے بوری میں بند کر دیا گیا۔" عورت نے بھی دلیل پر دلیل دی۔ اَبے کم بختو! کیوں ستا رہے ہو مجھے! کھولنا ہے تو کھول دو ورنہ اپنا رستہ لو۔ میں نے دل میں کہا۔

"کچھ بھی ہو، میں اسے کھول کر ضرور دیکھوں گا۔" مرد اپنی ضد پر اَڑ گیا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر ٹھوکر ماری۔ میری ناک سے بڑی دردناک آواز نکلی کیوں کہ اس کی ٹھوکر میری پسلی پر پڑی تھی جس سے میں بلبلا کر رہ گیا تھا۔ اچھا بیٹا، نکلنے دے مجھے بوری سے باہر، پھر دیکھوں گا تجھے! میں نے جل کر سوچا۔

پتا نہیں وہ جگہ کون سی تھی جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی بھلا مجھے ٹھوکریں مارنے سے کیوں باز آتا۔

"اچھا ثریا، تم ذرا پیچھے ہٹو، میں بوری کھول رہا ہوں۔" مرد کی آواز سن کر میری ڈھارس بندھی۔

"ثریا خانم" نے آخری وارننگ دی مگر مرد نہ مانا اور آخر کار اس نے بوری کا منہ کھول ہی دیا۔

"ارے!" حیرت کے سبب اس کے منہ سے تیز آواز نکل گئی۔ میں نے گردن اٹھا کر مرد کو دیکھنا چاہا مگر وہ نظر نہ آ سکا کیوں کہ ابھی بوری کا منہ ہی کھلا تھا، میں اندر ہی تھا۔

پھر شاید اس مرد کو بھی یقین آ ہی گیا کہ میں جن نہیں آدمی ہوں۔ اس نے مجھے کسی طرح گھسیٹ گھساٹ کر بوری سے نکال لیا۔ میرا جوڑ جوڑ جیسے فریاد کر رہا تھا۔

ابھی زیادہ اندھیرا نہیں پھیلا تھا اسی لیے مجھے مرد اور عورت کے چہرے واضح نظر آ رہے تھے۔ وہ شام کا وقت ہی تھا۔ وہ بہادر آدمی جس نے مجھے بوری سے نکالا تھا، اتنا حیرت زدہ ہو گیا کہ میرے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولے بغیر پوچھ گچھ کرنے لگا کہ میں بوری میں کس طرح بند ہوا۔ وہ لڑکی بھی دیدے پھاڑے کھڑی تھی جسے میں اب تک عورت سمجھتا رہا تھا۔ مرد بھی مرد نہیں نوجوان یا زیادہ سے زیادہ جوان تھا۔

"غوں اوں غوں آں!" میں نے ناک سے آواز نکال کر اسے احساس دلایا کہ میرا کیا حال ہے۔

"ارے ہاں.... یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" یہ کہہ کر وہ مجھ پر جھک گیا اور جب جھکنے سے کام نہ چلا تو قریب بیٹھ گیا۔

پھر کچھ دیر بعد میں بوری کے جن سے آدمی بن گیا۔ میری حالت اتنی غیر تھی کہ اس جوان نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میں اتنی دیر ناک سے بولا تھا کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے منہ سے بولنا ہی بھول چکا ہوں۔ ویسے اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ میری دائیں کنپٹی سوجی ہوئی تھی اور ہاتھ پیر اتنی دیر سختی سے بندھے رہنے کے سبب اکڑ سے گئے تھے۔ میں کھڑا نہ رہ سکا تو وہیں زمین پر بھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔ ابھی نہ مجھے اتنا ہوش تھا کہ اس جوان کی کسی بات کا جواب دوں اور نہ یہ خیال کہ میں کہاں ہوں۔

"آخر تمہیں کون یہاں بوری میں بند کر کے ڈال گیا تھا؟ کچھ

تو بتاؤ۔" مجھ سے میرا محسن پوچھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ دیر دھیرج کا اشارہ کیا اور جسم کے ان حصوں کو سہلانے لگا جو بہت دُکھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جیسے میری قوتِ گویائی بھی بحال ہوتی جا رہی تھی۔ حلق اب پہلے کی نسبت کچھ کچھ تر ہونے لگا تھا۔ میں نے اس خوشی میں نوجوان کی ان ٹھوکروں کو معاف کر دیا جو اس نے میری پسلی اور کولھوں پر لگائی تھیں۔

کچھ دیر بعد میری طبیعت ذرا سنبھلی اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا گئی تو میں نے ان دونوں کو غور سے دیکھا، پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ میرے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکل گئی کیوں کہ وہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں دو ایک بار ہی وہاں آیا تھا اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ لڑکی کا خوف اب مجھے جائز معلوم ہوا۔ وہ پرانا قلعہ تھا۔ ترکمان گیٹ سے سفر کرتا کرتا میں اس آسیب زدہ قلعے میں پہنچ جاؤں گا، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ لوگ اُدھر کا رُخ کم ہی کرتے تھے۔ وہ نوجوان جوڑا شاید یہی سوچ کر اِدھر آیا تھا۔

"رضی! چلو، دیر ہو رہی ہے۔" لڑکی منمنائی۔ "یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں۔ زیادہ دیر ہو گئی تو پھر کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔"

مجھ پر جو کچھ بیتی تھی، ظاہر ہے انھیں نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے سوچا، چلو اچھا ہے، یہ دونوں اسی طرح ٹہل جائیں مگر نوجوان اپنے تجسس کے سبب وہاں سے ٹلنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

"جاؤ بھائی جاؤ۔" میں معاً بول اٹھا۔ "ان کی امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ میری مدد کی۔"

نوجوان میری بات سن کر چونک اٹھا۔ نادانستگی میں شاید میرے منہ سے سچی بات نکل گئی تھی۔ لڑکی بھی سٹپٹا سی گئی تھی۔

"تم.... تم کچھ اور.... اور نہ سمجھنا.... یہ.... یہ میری بیوی ہے۔" نوجوان ہکلا کر بولا۔

ہونے والی! میں نے سوچا اور کہا۔ "تم بے فکر رہو، میں نے بالکل وہی سمجھا ہے جو تم بتا رہے ہو۔"

"نیکی کر دریا میں ڈال!" نوجوان بڑبڑا کر اٹھا۔ "چلو ثریا! آج کل نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔"

لڑکی خود وہاں سے جلد از جلد چھوٹ لینے کے چکر میں تھی اس لیے فوراً چل دی۔ وہ دونوں چند قدم گئے ہوں گے کہ مجھے پھر یاد آ گیا کہ کہاں ہوں۔ "ارے باپ رے!" میں بڑبڑایا پھر ہڑبڑایا اور خود بھی اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بوری، منہ میں ٹھونسے جانے والا کپڑا اور ریشمی ڈوری جس سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تھے، قید و بند کا سارا سامان میں وہیں چھوڑ کر چل دیا۔

وہ دونوں اپنے عقب میں میرے قدموں کی چاپ سن کر ایک بار مڑے، پھر تیز تیز چل دیے۔ یقیناً ان کے دل میں چور تھا۔ عشق کے مارے بے چارے خواہ مخواہ مجھ سے ڈر رہے تھے۔

میں قلعے سے نکلا تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہو۔ وہاں سے شہر کے لیے سواری ملنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لوگ "نظام الدین" آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ وہاں سے خواجہ نظام الدینؒ کی درگاہ تقریباً ڈھائی تین میل ہو گی۔ اس نوجوان جوڑے کو "نظام الدین" سے آتا ہوا ایک تانگا مل گیا جس میں پہلے ہی سے ایک سواری بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پچھلی سیٹ پر جو "بماٹ سواری" بیٹھی ہوئی تھی، وہ اگلی سیٹ پر منتقل ہو گئی۔ یوں بھی وہ بھاری سواری تانگے کا توازن بگاڑ رہی تھی اور مجبوراً بے چارے تانگے والے کو "بم" پر بیٹھنا پڑا تھا۔ یہ "بم" بمبو والا "بم" ہوتا ہے، پھٹنے والا نہیں۔ اس تانگے میں گنجائش تھی کہ میں بھی بیٹھ جاتا مگر دانستہ نہیں بیٹھا۔ میں اب اس نوجوان جوڑے کو زیادہ نہیں دہلانا چاہتا تھا۔ لڑکی بُرقع پہنے ہوئے تھی۔ قلعے کے اندر تو وہ مجھے بے نقاب ہی نظر آئی تھی مگر اب اس نے نقاب ڈال لی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے بھی ایک یکا مل گیا۔ اس میں پہلے سے موجود سواریاں دہلی دروازے جا رہی تھیں۔ یکے والا مجھے جامع مسجد تک پہنچانے پر راضی ہو گیا۔

جب تک جان خطرے میں ہوتی ہے، آدمی کی بھوک ووک سب اُڑ جاتی ہے۔ یکے میں بیٹھ کر گھر جاتے ہوئے میری آنتیں "گڑگڑائیں" تو یاد آیا کہ دوپہر کو میں نے صرف دہی بڑوں پر گزارہ کیا تھا۔ اتنی دھینگا مشتی اور اُٹھا پٹخ میں بے چارے دہی بڑوں کی اہلا ہی کیا کب کے ہضم ہو گئے تھے۔ اِدھر جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا، اُدھر آنتیں "قُل" پڑھ رہی تھیں۔ دفتر جانے کا تو خیر اس وقت سوال ہی نہیں تھا، سارا دفتری بجٹ ان نابکاروں کی نذر ہو گیا تھا جنھوں نے مار مار کر میرا بھُس بھر دیا تھا یا یوں سمجھیں کہ مجھے مجسّم بنا دیا تھا۔

پتا نہیں، میرے چہرے پر لکھا تھا کہ پٹ کر آ رہا ہوں یا کوئی اور بات تھی، امی مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ "کیا ہوا تجھے، تیرا چہرہ کیوں سُوجا سُوجا سا لگ رہا ہے؟"

"نن.... نہیں تو.... وہ بس...." میں ہکلا کر رہ گیا۔

مجھے ہکلاتا دیکھ کر وہ کچھ اور شک میں پڑ گئیں اور مزید قریب آ کر "معائنہ" کرنے لگیں۔ "ارے تیری تو کنپٹی بھی سُوج رہی ہے، بتاتا کیوں نہیں، ہوا کیا؟"

مجھے وہ بہانہ یاد آگیا جو ایک بار پہلے کیا تھا۔ "پھٹ پھٹ سے گر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تو ہی رہ گیا ہے روز روز پھٹ پھٹ سے گرنے کو! ارے جب نہیں چلانا آتی تو جھونک بھاڑ میں! اب نہ چلیو!" یہ کہہ کر انھوں نے پھٹ پھٹ کے بارے میں "تفتیش" بھی کی کہ وہ میرے ساتھ کیوں نہیں۔

"وہ اس قابل نہیں رہی تھی، مرمت ہو گی، اس کی اکل بکل جائے گی ٹھیک ہو کر، ٹھیک کرانے دے آیا ہوں۔" میں نے فراٹے سے جھوٹ بولا۔

"تو اب بھی چلائے گا تو پھٹ پھٹ؟" امی بگڑ کر بولیں۔

"کیا کروں امی، بغیر اس کے کام ہی نہیں چلتا اور... اور پھر دفتر والوں کا بھی حکم ہے، پھٹ پھٹ پر آؤ جاؤ۔" میں نے آئندہ کے لیے راہ ہموار کی۔

"تیرے دفتر والوں نے تو خون پی لیا ہے ہمارا! نہ دن چین نہ رات آرام!" امی چنچنائیں، پھر انھیں خیال آگیا شاید کہ میں بھوکا ہوں گا اور انھوں نے کھانے کے لیے کہا۔

"بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں جلدی سے بولا تاکہ وہ مزید "تفتیش" کی بجائے باورچی خانے کا رخ کریں اور پھر یہی ہوا۔

چتلی قبر ہی پر ایک حکیم جی رہتے تھے۔ ان کا مطب بھی گھر کی نچلی منزل میں تھا۔ کھانا کھا کر میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، حکیم جی کی داڑھی کو سفید ہی پایا تھا۔ پتا نہیں، ان کی عمر کتنی تھی۔ ان کا ارادہ شاید یہ تھا کہ قیامت کے بوریے سمیٹ کر ہی اس جہان آب و گل سے رخصت ہوں گے۔ میں ان کے پاس جاتے ہوئے یوں گھبراتا تھا کہ وہ جھٹ سے باپ دادا تک پہنچ جاتے تھے، مثلاً وہ کچھ اس طرح کی باتیں کہتے تھے "اچھا اچھا تو! کیا ہوا تجھے؟" پھر خود ہی فرماتے تھے "اچھا سمجھ گیا، تیرے دادا کو بھی پیچش تھی، تجھے بھی شاید وہی ہو گی اسی لیے آیا ہے۔" میں ان کی ایسی باتیں سن کر بہت کھولتا تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ میرے دادا جان مرحوم کو ہر بار کسی نہ کسی خبیث مرض میں مبتلا کر دیتے تھے، پھر یہ کہ اس قدر بے تکلفی سے مرحوم دادا جان کا ذکر کرتے تھے جیسے ان کے چیتھڑے اڑاتے رہے ہوں۔ اس دن حکیم جی نے میرے دادا جان مرحوم کی جان تو بخش دی مگر ابا کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔

"کیسا ہے تیرا ابا دا؟" حکیم جی میری نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے "بچپن میں ایک دفعہ اس کی لو نک جل گئی تھی۔ اگر تیرا دادا فوراً اسے میرے پاس نہ لے آتا تو حالت بگڑ جاتی کی!" میں صبر کے ساتھ اپنے ابا کے امراض کا ذکر سنتا رہا اور جیسے تیسے ان سے دوا لے کر گھر لوٹا۔ اس وقت تک ابا بھی دکان بند کر کے آگئے تھے۔ پھٹ پھٹ سے آئے دن گرنے پر ان کی جھاڑ بھی کھانا پڑی۔

دوا پی کر جب میں بستر پر سونے لیٹا تو دن بھر کی "کارگزاری" یاد آنے لگی۔ میں اچانک لیٹے لیٹے باقاعدہ اچھل پڑا۔ مجھ سے زبردست کارنامہ سرزد ہو چکا تھا اور میں غافل تھا۔ مجھے تو بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اگر میں سر تھامسن کو اپنی معلومات سے آگاہ کرتا تو وہ بھی اچھل پڑتے۔

دوسرے دن صبح میں دفتر پہنچا تو میرا سینہ پھولا ہوا اور گردن اکڑی ہوئی تھی۔ ویسے مجھے سر تھامسن پر بھی غصہ تھا جنھوں نے مجھے چارا بنا دیا تھا۔ "مچھلی" بدبخت عیش کر رہی تھی اور چارا، بے چارہ بنا ہوا پھر رہا تھا۔ سر تھامسن کا یہ "کائیاں پن"، مجھے اچھا نہیں لگا۔ آخر انھوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا تھا۔ چڑھ جا بیٹا، سولی پر رام بھلی کرے گا! دور سے بیٹھا ہاتھ تاپ رہا ہے بڈھا خبیث! سمجھ رہا ہو گا جیسے مجھے کچھ خبر ہی نہیں۔ جب ساری پول پٹی کھولوں گا تو پتا چلے گا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو وہی صورت حال پائی جو گزشتہ دن تھی، یعنی ساری "چڑیاں" اڑی ہوئی تھیں، سوائے "لیس بز" کے! نہ کمار تھا، نہ پیارے لال ہنر، نہ جیدہ گپتا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہے کوئی مغز چاٹنے والا نہیں اور سوچا کاش میرے کمرے میں ہمیشہ اسی طرح "امن چین" کی فضا رہا کرے۔

کچھ دیر اپنی کرسی پر اینڈنے کے بعد مجھے لیوسی کا خیال آیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اس سے تھوڑی بہت گپ لڑا کر سر تھامسن سے "مچیٹا" کروں گا اور لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ لوں گا کہ وہ کیا اور کہاں اشر مجھاتی یا بھنواتی پھر رہی ہے تیواڑی جی نے اس کی ڈیوٹی کہاں لگائی ہوئی ہے۔ گزشتہ دن ہی کی طرح وہ بھی غائب ملی اور میں سر تھامسن کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

چچا بندو خاں حسب عادت مجھ پر صدقے واری ہوئے اور جلدی سے صاحب بہادر کو میری آمد سے مطلع کرنے کمرے میں چلے گئے۔ صاحب بہادر کی رگ اس وقت شاید زیادہ ٹیڑھی نہیں تھی اس لیے انھوں نے مجھے زیادہ نہیں "سکایا"۔ فوراً ہی چند سیکنڈ کا مارجن دے کر اندر بلا لیا۔

میں ان کا اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھ گیا تو انھوں نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی "کیا ہوا، پتا چلا رگھو ناتھ کا؟" انھوں نے اپنی پیشانی پر بل ڈال کر کہا، پھر جواب سنے بغیر ایک اور سوال داغ دیا "تمھیں سیٹھ عثمان سے ملنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اچھا تو اس بڈھے کو پتا چل گیا کہ میں سیٹھ عثمان سے ملا تھا۔ میں نے سوچا، وہ عورت سبنھڈی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس بڈھے نے میرے پیچھے بھی سی آئی ڈی چھوڑ رکھی ہے اور اسی وقت میرے ذہن میں شیکھر کا خیال آیا۔ اچھا تو یہ چکر تھا!

"ہوں!" نادانستگی میں میں نے سر ہلاتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

"کیا ہوں؟" سر تھامسن سخت لہجے میں بولے "تم نے میرے سوالوں کا..."

"وہ ابھی جواب دیتا ہوں۔" میں جلدی سے بات کاٹ کر بولا "کیا سوال تھا آپ کا سر؟"

جواب میں سر تھامسن کچھ کہنے کی بجائے مجھے گھورنے لگے، پھر غرائے "تم ہوش میں تو ہو؟"

"جی ہاں سر! آج تو بالکل ہوش میں ہوں البتہ کل مجھ پر کئی بار بے ہوشی کے دورے پڑے تھے۔"

"رپورٹ دو اور دفع ہو جاؤ!" سر تھامسن چیخے "تم انتہائی بدتمیز اور نااہل ہو۔"

"ممکن ہے سر کہ میری رپورٹ سن کر آپ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔" میں ان کے غصے کو نظر انداز کرتا ہوا آہستہ سے بولا۔

جواب میں سر تھامسن نے مجھے گھور کر دیکھا مگر دفع ہو جانے پر دوبارہ اصرار نہیں کیا "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کہنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں سر! شرط صرف یہ ہے کہ آپ انھیں سننے کا حوصلہ... میرا مطلب ہے غور سے سنیں۔" بات کرتے کرتے مجھے یاد آگیا کہ کس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ وہ بڈھا منٹ بھر میں میری نوکری تیل کر سکتا تھا اور یہی نہیں، نہ جانے کیا کیا کر سکتا تھا۔

سر تھامسن شاید چہرے پڑھنے کے بھی ماہر تھے۔ انھوں نے غالباً اندازہ لگا لیا کہ واقعی کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے اسی لیے ان کے لہجے سے سختی غائب ہو گئی۔ انھوں نے کہا "تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، صاف صاف اور تفصیل سے کہو۔"

"پہلی بات تو یہ سر کہ سیٹھ عثمان کی نگرانی کرانا فضول ہے۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" سر تھامسن نے اتنا ہی کہا۔ انھوں نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے نگرانی کا علم کیسے ہوا۔

"تربیت کے دوران میں مجھے بتایا گیا تھا سر کہ کسی شخص کی نگرانی اسی وقت سود مند ہوتی ہے جب وہ شخص اپنی نگرانی سے واقف نہ ہو۔" میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے، تم کہنا چاہتے ہو کہ سیٹھ عثمان کو اپنی نگرانی کا علم ہو گیا ہے؟"

"جی ہاں سر! اس نے آپ کے نام یہ پیغام بھیجا ہے کہ اگر آپ کو اس سے کوئی شکایت ہے تو براہ راست گفتگو کر لیں۔"

"ہوں۔" سر تھامسن نے ہنکارا بھرا، پھر ان کا چہرہ کھل اٹھا "تو تم یہی ٹوہ لینے اس کے پاس گئے تھے!"

"ظاہر ہے سر!" میں نے فوراً ایک غلط بات کا اعتراف کر لیا کیوں کہ اس بات پر سر تھامسن نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"مگر تمھیں کیسے پتا چلا کہ میں اس کی نگرانی کرا رہا ہوں؟ کیا تیواڑی نے بتایا تھا؟"

"آدمی اپنی آنکھیں کھلی اور ذہن بیدار رکھے سر! تو کسی کے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"ویری گڈ!" سر تھامسن مزید خوش ہو گئے۔

پھر انھیں مزید خوش کرنے کی خاطر میں نے کہا "اب تک مجرموں کے بارے میں آپ کی جو پالیسی رہی ہے سر، اس پر بھی آپ کو دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" سر تھامسن کے لہجے سے حیرت کے ساتھ کسی قدر الجھن کا اظہار بھی ہو رہا تھا "اپنی بات کی وضاحت کرو!"

"مجرم مجھے بہ طور چارا قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔" میں بولا، پھر بغیر رکے مزید کہا "آپ تو خود واقف ہیں کہ وہ کس قدر چالاک ہیں!"

سر تھامسن اپنی کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ وہ بہت غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ بھاری سی آواز میں بولے "میں سمجھ رہا ہوں لے ڈی! تم بہت کچھ جان چکے ہو! بہتر یہ ہے کہ تجسس کی فضا پیدا کیے بغیر صاف صاف باتیں کرو۔"

"سر! میں خود کوئی لگی لپٹی نہیں رکھ رہا۔" میں نے جلدی سے کہا "مگر آپ بھی تو مجھے بتاتے رہا کریں کہ لے ڈی بیٹے! اب ہم تمھیں چارا بنا رہے ہیں، تم بن جاؤ۔ میں بھلا کب آپ کے حکم سے باہر ہوں۔ و تو اگر اللہ تبارک تعالی نے دوسرے افراد سے مجھے عقل کچھ زیادہ نہ دی ہوتی تو میں بھی اندھیرے ہی میں رہا کرتا۔"

"کچھ باتیں قبل از وقت بتانا نقصان دہ ہوتی ہیں لے ڈی!"

سرتھامسن کے لہجے میں شفقت تھی "اگر تمھیں علم ہو جاتا کہ دراصل میں تم سے کیا کام لے رہا ہوں تو ممکن ہے، تم گھبرا جاتے یا پھر اس قدر صحیح خطوط پر کام نہ کر پاتے جن کا مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ ہاں اب آگے بات کرو! ایک بات بہت اہم ہے، اگر اس کا پتا چل جائے تو بہت سی الجھنیں ختم ہو سکتی ہیں، باقی باتیں تو خیر ضمنی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ سنڈریلا اور رچرڈ کی آمد کا ہندوستان میں مقصد کیا ہے؟"

"یہاں انتشار پھیلانا!" میرے دماغ کا ٹیپ ریکارڈر آن ہو گیا۔ گزشتہ رات میں اس نتیجے پر بھی پہنچ چکا تھا کہ خوش قسمتی سے میرے دماغ کے ٹیپ ریکارڈر میں جو باتیں ٹیپ ہوئی تھیں، وہ انھی دونوں مجرموں کی تھیں جن کی سرتھامسن کو تلاش ہے، یعنی سنڈریلا اور رچرڈ! وہ دونوں یقیناً پیار میں ایک دوسرے کو سینڈی اور رچی کہہ رہے ہوں گے۔

میں نے دیکھا کہ سرتھامسن پر میرے جملے کا بڑا شدید ردِ عمل ہوا ہے۔ وہ تقریباً اچھل پڑے تھے۔ اسی وقت چچا بندو خاں، کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گئے اور انھوں نے تیواڑی جی کی آمد کے بارے میں بتایا۔

"تیواڑی سے بولو، فر آئے!" سرتھامسن نے اردو میں کہا، پھر چچا بندو خاں کو ہدایت کی کہ اس وقت وہ بغیر بلائے نہ خود آئیں اور نہ کسی کو اندر آنے دیں۔ وہ اس وقت کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔

چچا بندو خاں، سرتھامسن کا حکم سن کر جانے لگے تو مجھے اپنی اہمیت کا زبردست احساس ہوا۔ مجھے تیواڑی جی کے لوٹائے جانے پر خوشی ہو رہی تھی۔

"ہاں، اے ڈی! کیا کہا تھا تم نے؟" سرتھامسن پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"انتشار سر! مجرموں کی ہندوستان میں آمد کا مقصد یہاں انتشار پھیلانا ہے، اتنا شدید انتشار کہ برطانوی حکومت کی تمام توجہ ادھر ہو جائے۔"

"اور... اور پھر..." سرتھامسن کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی۔ وہ جوشِ جذبات میں کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔

میرے ذہن کا ٹیپ ریکارڈر بدستور آن تھا "مجرموں کے مہرے، ہندوستان کے تمام اہم شہروں میں موجود ہیں مگر وہ انتشار کی ابتدا مرکز، یعنی دہلی سے کرنا چاہتے ہیں، اس کے بعد سارا ہندوستان اس انتشار کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اب تک وہ اپنے کام کا آغاز کرنے کے لیے ضروری معلومات جمع کر رہے ہیں۔ کچھ معلومات انھیں حاصل ہو چکی ہیں، کچھ باقی ہیں۔ ان معلومات کے حصول کے بعد ہی وہ کوئی بڑا قدم اٹھائیں گے۔"

میں بولے چلا جا رہا تھا اور سرتھامسن کی آنکھیں حیرت کی زیادتی کے سبب پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ میں سانس لینے کو رکا تو جیسے سرتھامسن کی آواز مجھے کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"تم... کہے جاؤ اے ڈی!... رکو مت کہے جاؤ!"

پھر میں نے سرتھامسن کو اپنے دماغ کا پورا ٹیپ سنا دیا۔ وہ تمام ہی باتیں لفظ بہ لفظ مجھے حفظ ہو گئی تھیں جو میں نے سنی تھیں۔ ٹیپ کا فیتہ ختم ہوا تو کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی اور یہ خاموشی بہت دیر رہی۔ میری باتیں سن کر سرتھامسن کو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔

"خطرناک، انتہائی خطرناک!" سرتھامسن خاصی دیر بعد آپ ہی آپ بڑبڑائے اور پھر وہ رفتہ رفتہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ پھر جب وہ بولے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی "اے ڈی، میرے بیٹے! تم نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے، ایسا کارنامہ جس کی توقع اس پورے محکمے میں کسی سے بھی نہیں کی جا سکتی تھی!"

میرا سینہ فخر سے پھول گیا۔ سرتھامسن نے مجھے بیٹا کہا تھا اور میرے کارنامے پر مجھے زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ سرتھامسن کے اس ایک جملے نے میرے سارے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ میں گھٹا پٹا، بوری میں بند ہوا، ٹھوکریں کھائیں، بے ہوش ہوا اور کیا کیا نہ ہوا، مجھے اب ان تمام مصائب پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ ہیرو بننے کے لیے تھوڑا بہت تو پٹنا ہی پڑتا ہے۔

پھر سرتھامسن نے وہ سوال کیا جس کی میں بہت دیر سے توقع کر رہا تھا، یعنی یہ سب کچھ مجھے معلوم کیسے ہوا؟

جو کچھ پیش آیا تھا، اس میں اپنی طرف سے "نمک مرچ" لگا کر میں نے بیان شروع کیا۔ پورے بیان میں، بہ طور خاص میں نے یہ خیال رکھا کہ ہر واقعے سے میری ذہانت اور بہادری ثابت ہو۔ گویا میں جان بوجھ کر مجرموں کے جال میں پھنسا تھا، پھر جہاں ضرورت پیش آئی تھی، بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر جب چاہا تھا ہوش میں آ گیا تھا۔

"تمھاری اداکاری واقعی بڑی فطری ہوتی ہے اے ڈی!" سرتھامسن نے میری پوری بات سن کر گویا اعتراف کیا۔ "کبھی کبھی تو میں بھی چکرا کر رہ جاتا ہوں کہ کہیں تم واقعی بزدل اور بے وقوف تو نہیں۔ برطانیہ میں تم ہی جیسا میرا ایک ماتحت تھا مگر وہ تمھاری طرح فرماں بردار نہیں تھا۔ وہ کچھ اوور کونفیڈنیس کا شکار تھا۔ تم اس سے بچنا! اسی کے ساتھ اب تمھیں یہ خیال بھی رکھنا ہو گا کہ تمھاری زندگی محکمے کے لیے بہت اہم ہے۔ تم اسے اس طرح ایک دم خطرات میں نہیں جھونکو گے۔"

"نہ صرف محکمے بلکہ میری امی اور ابا کے لیے بھی!" میں نے

لقمہ دیا۔

"تم پھر شرارت کرنے لگے!" سرتھامسن نے مجھے محبت آمیز انداز میں ڈانٹا، پھر ذرا توقف کے بعد سنجیدگی سے بولے "غالباً تمھیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ تمھارے علم میں ہے، میرے سوا کسی کے بھی علم میں نہیں آئے گا!"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو اپنی امی تک کو کچھ نہیں بتاتا سر!" میں نے انھیں یقین دلایا۔

سرتھامسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر انھوں نے کہا "آج کے بعد تم جب چاہو مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ تم پر کوئی پابندی نہیں۔ کوٹھی پر بھی اور دفتر میں بھی جب چاہو تم میرے پاس آ سکتے ہو۔"

میں نے بہ طور شکریہ باچھیں پھیلا دیں۔

"اور سنو! آج تک اس محکمے میں اتنی جلدی کسی کو ترقی نہیں دی گئی۔ تم یقیناً واحد شخص ہو جو اس قدر کم مدت میں سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنا دیا گیا اور اب... آج ہی میرے فوری احکامات کے تحت تمھیں سینیئر انسپکٹر بنا دیا جائے گا۔ اس محکمے کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہو گی۔ اتنی کم عمری میں شاید کوئی سینیئر انسپکٹر نہ بنا ہو مگر تم ڈزرو کرتے ہو۔" سرتھامسن کے لہجے میں فخر تھا "مجھے خوشی یہ ہے کہ تمھارا تقرر براہِ راست میں نے کیا تھا۔ تمھاری معلومات کی روشنی میں مجھے کچھ اور بھی اہم فوری احکامات جاری کرنا ہیں۔ ممکن ہے مجھے فون پر دوسرے شہروں سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑے اور اس میں دیر لگے۔ تم اب سے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھ سے پھر ملو گے۔ اس وقت میں اس پوزیشن میں ہوں گا کہ آئندہ کے لیے کوئی لائحۂ عمل طے کر سکوں۔" سرتھامسن یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

میں پل کے پل میں انسپکٹر سے سینیئر انسپکٹر بنا دیا گیا تھا، یہ سوچ کر میرا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب تیواڑی جی کو یہ معلوم ہو گا تو ان کے بڑی مرچیں لگیں گی۔ ترقی کا مطلب تنخواہ بڑھنا بھی تھا۔ اگر اسی طرح تھوڑی بہت مارکٹائی سے ترقی مل سکتی تھی تو کیا بری تھی۔ خوشی کے مارے مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں بہ مشکل سرتھامسن کی عنایات کا شکریہ ادا کر سکا۔

جب میں کرسی سے اٹھ رہا تھا تو سرتھامسن نے چچا بندو خاں کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی اور مجھے گزشتہ تجربہ یاد آ گیا، یعنی دروازے سے چاند پھوڑنے کا تجربہ! میں اسی لیے دروازے کی طرف آہستہ قدموں سے بڑھا تاکہ چچا بندو خاں اندر آ جائیں تو باہر جاؤں۔

سرتھامسن نے چچا بندو خاں کو حکم دیا کہ وہ تیواڑی جی کو بلا لائیں۔

میں سرتھامسن سے مل کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب تک تو تقدیر نے وفا کی تھی جو مجھ سے خود بہ خود کارنامے سرزد ہوتے رہے تھے، آئندہ صورتِ حال بدل گئی تو کیا ہو گا؟ میں نے سرتھامسن کے سامنے اپنی ذہانت اور بہادری کی ڈینگیں تو بہت ماری تھیں لیکن اگر واقعی اب ان دونوں "اشیا" کی ضرورت پیش آ گئی تو کیا ہو گا؟ ڈیڑھ گھنٹے بعد سرتھامسن مجھ سے گفتگو کر کے آئندہ کے لیے کوئی لائحۂ عمل طے کرنے والے تھے اور یہ سامنے کی بات تھی کہ جو کچھ بھی طے ہونا تھا، اس میں میرا کردار اہم ہوتا۔ کیا میں اپنی بزدلی اور حماقت سمیت یہ کردار ادا کر سکوں گا؟ یہی سوچ سوچ کر میرا خون خشک ہوا جا رہا تھا اور کوئی جیسے میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا، اور چڑھ جا بیٹا، بانس پر!



بانس پر چڑھ جانے کے بعد صرف دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، یا تو آدمی اترنے کی کوشش کرے یا پھر اس پر مزید قیام پزیر رہنے کی راہ تلاش کرے۔ ظاہر ہے کہ بانس پر چڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے اس لیے کوئی "بندہ بشر" اترنا نہیں چاہتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ میں "بندہ بشر" ہی تھا۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا تھا تو موسل سے ڈرنا بیکار تھا۔ یہ سوچ کر میری ڈھارس بندھی اور اسی کے ساتھ ساون کے اندھے کی طرح مجھے ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا۔ میرا جی چاہا کہ ایک عدد بھونپو لوں اور چیخ چیخ کر اعلان فرماؤں، "اے غافلو! سنو کہ اے ڈی مہراب صرف انسپکٹر ہی نہیں رہا بلکہ سینئر سی آئی ڈی انسپکٹر بن چکا ہے، اب کر لو "ڈکنداری"!" مگر میری بدقسمتی کہ وہاں اس وقت کوئی "ڈکنداری" کرنے والا تھا ہی نہیں، راہ داری سنسان پڑی تھی۔

اپنے کمرے تک پہنچتے ہوئے مجھے ایک آدھ غیر متعلق آدمی ملا مگر میں نے اسے لفٹ نہیں دی۔ رعب تو دراصل اس بندے پر اچھا جمتا ہے جو تھوڑا بہت پہلے سے جانتا ہو۔ اس وقت میرا عجب عالم تھا۔ سینئر افسر ہونا مجھ سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا ماتحت سب انسپکٹر کمال، الرٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے یوں ہی اسے مخاطب کر لیا کیوں کہ میری زبان میں کھجلی ہو رہی تھی "کوئی آیا گیا تو نہیں ؟" میں نے کمال سے سوال کیا۔

"آپ ہی گئے تھے، آپ ہی آئے ہیں سر! اور کوئی نہیں آیا۔" کمال نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

میں اپنی کرسی کی طرف بڑھتے بڑھتے ایک دم اس کی طرف پلٹا اور سخت لہجے میں کہا "اب تم مجھے صرف 'سر' نہیں کہو گے۔ سمجھے!"

کمال حسب عادت بوکھلا گیا اور ہکلایا "پھ... پھر...

کیا کہوں... سا... سر... وہ معاف کیجیے گا... میں نے پھر غلطی سے..."

"اب تم کچھ اور کہو گے سمجھ گئے! 'سر' تم اس وقت کہتے تھے جب میں صرف انسپکٹر تھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اب میرا عہدہ بڑھ گیا ہے۔ میں سینئر سی آئی ڈی انسپکٹر بن چکا ہوں اور آگے مزید بہت کچھ بننے کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ اس صورت حال میں 'سر' نہیں چلے گا، اس میں بھی اضافہ ضروری ہے۔"

"مبا... مبارک ہو... سا... معاف کیجیے، یعنی کہ مبارک ہو" کمال نے مبارک باد دی اور مجھے "سر" کہتے کہتے بال بال بچ گیا۔

سینئر افسر ہونے پر یہ پہلی مبارک باد تھی اس لیے میرے دل میں لڈو اور بتاشے وغیرہ ایک ساتھ پھوٹے "تمہیں بھی سلامت ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا اور اسی وقت میرے ذہن میں آ گیا کہ عہدے میں اضافے کے بعد میرے ماتحتوں کو کیا کہنا چاہیے۔ میں جلدی سے بولا "اب تم مجھے 'سر جی' کہو گے۔" یہ کہہ کر میں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

"بالکل بالکل سر جی!" کمال نے مُنڈیا ہلائی۔

میز کرسی سنبھالنے کے بعد میں نے دراز سے موجودہ کیس کی فائل نکالی۔ یہ موقع اچھا تھا، میں ساری کتھا کہانی اس میں لفظ بہ لفظ ٹانک سکتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ آخر کسی نہ کسی طرح تو گزرنا ہی تھا کیوں کہ سر تھامسن نے مجھے ڈیڑھ گھنٹے بعد بلایا تھا۔ گھنٹے بھر سے بھی پہلے میں نے سارے واقعات گھسیٹ دیے، فائل دراز میں دوبارہ رکھنے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں؟ اسی وقت تیواڑی جی کا چپراسی کمرے میں گھسا۔ اس نے میرے قریب آ کر پی اون بک میز پر کھول کر رکھ دی۔ پی اون بک میں ایک لفافہ رکھا ہوا تھا جس پر انگریزی میں میرا نام ٹائپ تھا۔ میں نے پی اون بک پر دستخط کر کے لفافہ اٹھا لیا۔ چپراسی سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے لفافہ کھول کر پڑھا اور باغ و بہار ہو گیا۔ وہ میری

ترقی کا پروانہ تھا، نیچے ڈی آئی جی، تیواڑی جی کے دستخط تھے۔ ہائے دستخط کرتے ہوئے تیواڑی جی بے چارے دل پر کیا گزری ہو گی! میں نے سوچا۔ یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ تیواڑی جی نے کس کے حکم پر ترقی کا پروانہ جاری کیا ہو گا۔

معاً کھٹ کھٹ کی آواز سن کر میں نے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ لیوسی دروازے سے اندر آ رہی تھی۔ وہ اس وقت اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں، والا منظر تھا۔ نظریں ملیں تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے بھی جواباً مسکرانا ضروری سمجھا۔ یوں بھی کوئی خوب صورت لڑکی مسکرا کر دیکھے تو جواباً نہ مسکرانا بداخلاقی ہے۔

جب لیوسی میرے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور اپنے نینوں کے بان چلا چکی تو میں نے خوش ہو کر کہا "آج تو تم بڑی چھمک چھلو لگ رہی ہو، سچی بھئی!"

"تم آخر اتنی گھٹیا زبان کیوں استعمال کرتے ہو!" لیوسی کا منہ بن گیا، پھر وہ آہستہ سے بولی "تمہیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔"

"ارے وہ تو اُدھر کونے میں بیٹھا ہے۔" میں نے کہا، پھر مجھے خیال آیا کہ اس نے لفظِ گھٹیا استعمال کیا تھا "ہاں وہ تم گھٹیا کیے کہہ رہی تھیں ؟"

"تمہاری زبان کو اور کیسے! جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔"

"یعنی کہ میں بکتا ہوں! یہ تو تم سراسر میری توہین کر رہی ہو۔" مجھے غصہ آنے لگا۔

"لڑنا چاہتے ہو؟"

"جی نہیں! لونڈیوں سے نہیں لڑتا میں! کوئی مرد آئے سامنے تو ابھی پچھاڑ دوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں! تمہارے کانپ ٹھڈے ہی بتاتے ہیں کہ اس بات کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔" لیوسی تمسخر آمیز لہجے میں بولی "شیکھر سے لڑو گے؟"

"اس سے لڑنا میری توہین ہے۔" میں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"کیوں ؟"

"وہ میری جوڑ ہی نہیں ہے۔ بہادر ہمیشہ برابر کی جوڑ سے لڑتے ہیں اور کم زور پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یوں بھی وہ مرتبے اور عہدے میں مجھ سے بہت کم ہے۔"

"بہانے! اچھے بنا لیتے ہو۔" وہ ہنس کر بولی۔

اس کی ہنسی نے مجھے اور آؤٹ کر دیا۔ میں ہاتھ نچا کر بولا۔

"بناؤں گا بہانے، سو بار بناؤں تم کون؟"

"قاضی بھی اور مُلا بھی!" وہ اور بھی زور سے ہنس پڑی۔

"بس دانت نکلوا لو، وقت بے وقت!" میں نے چڑ کر کہا۔ "اب کوئی خیال نہیں کہ کمرے میں چچا جان بھی بیٹھے ہیں۔"
میرا اشارہ کمال کی طرف تھا۔
"تمھیں غصے میں دیکھ کر مزا آتا ہے، معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بلا کا عورت سامنے بیٹھی ہو۔"
"اس ہوا میں نہ رہنا ہاں، اگر تمھیں مزا آتا ہے تو پھر ہرگز میں غصہ نہیں کروں گا۔" میں نے غصے میں کہا۔
"اچھا ہاں، یہ تو بتاؤ سیٹھ عثمان سے ملے تم؟ مجھ سے تم نے اس کا پتا پوچھا تھا نا!"
"میں اس سے ملا کہ نہیں ملا، تمھیں کیوں بتاؤں! تم نے مجھے بتایا کہ کہاں 'الوپ' تھیں؟"
"الوپ کیا؟"
"غائب! سمجھیں کچھ! الوپ کا مطلب ہے غائب! اردو تک آتی نہیں اور سمجھتی ہیں اپنے آپ کو قابل!"

"ہوں، تو تم پہلے میری کہانی سننا چاہتے ہو، پھر بتاؤ گے اپنی بات!" وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔
"ظاہر ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"
"تیواڑی جی نے مجھے ڈیفینس منسٹری کے دفتر بھیجا تھا۔" لیوسی نے بتایا۔
ڈیفینس منسٹری کے ذکر پر مجھے نرملا یاد آ گئی اور میں آہ بھر کر بولا۔ "اب کیا رہا ہے وہاں!"
"کیوں؟" لیوسی نے مجھے گھورا۔ وہ شاید میری آہ کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ "کہیں نرملا کی یاد تو نہیں آ گئی!"
بات تو اس نے بالکل سچ کہی تھی مگر میں نے انکار میں سر ہلا دیا اور بات کا رُخ بدلنے کے لیے بولا۔ "کیا وہاں پھر کوئی نیا چکر چل رہا ہے؟"

"نہیں، وہی پچھلا چکر ہے۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "پتا نہیں ملٹری سیکرٹ سروس والوں نے کس طرح تفتیش کر کے یہ پتا لگا لیا تھا کہ مقتول مراری لال نے کسی فائل کی تصاویر کھینچی تھیں لیکن ابھی وہ پُر یقین نہیں ہیں۔ بہرحال ان کی تفتیش جاری ہے کیوں کہ یہ کیس بنیادی طور پر ہمارے محکمے کے پاس ہے اس لیے ڈیفینس سیکریٹری سرمنری کا خیال تھا، شاید ہم وہ فائل دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ یقین بھی کیا جا سکے کہ یہ وہی مطلوبہ فائل ہے۔" لیوسی یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"تم نے تو پوری رام کہانی سنا دی اور یہ بتایا ہی نہیں کہ آخر نتیجہ کیا برآمد ہوا؟" میں اس کی باتوں سے بیزار ہو کر بولا۔
"میں تو وہ فائل دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچ نہ سکی، یہی بات میں تیواڑی جی کو بھی بتا چکی ہوں۔ اس سے مراری لال کے قتل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ویسے ریکارڈ میں موجود تمام ہی فائلیں اہم ہیں ورنہ انھیں محفوظ کیوں رکھا جاتا۔ ایسی صورت میں کوئی ایک فائل دیکھ کر الگ سے اس کی اہمیت کے بارے میں کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!"

"اچھا ہو گا، لعنت بھیجو اس فائل پر! ان فائلوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے، کبھی یہ فائل کبھی وہ فائل! پہلے مرلی لال مرڈر کیس کی فائل کا لمبا چوڑا ڈراما چلا، وہ ختم ہوا تو اب ایک اور فائل کا چکر چل پڑا۔ آخر آدمی کو دنیا میں اس لیے تو پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ فائلوں کی دُم بنا ہوا اِدھر سے اُدھر گھسٹتا پھرے۔"
"فائلوں کی دُم تم نے خوب تلاش کی!" لیوسی ہنس پڑی۔
"ارے تم تو دُم کہہ رہی ہو، یہ فائلیں تو آدمی کو پورا 'دُم کٹا' بنا دیتی ہیں۔ یاد نہیں ان کیٹی خانم کے چکر نے کتنا رُلایا تھا!"
"اچھا اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔" لیوسی نے کہا۔ "سیٹھ عثمان کے منیجر کا پتا چلا کچھ؟"

"بھاڑ میں جائے سیٹھ عثمان اور اوپر سے جائے اس کا منیجر! مجھے ان کم بختوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا کیوں کہ سیٹھ عثمان سے ملاقات کے دوران میں مجھے جو تلخ تجربات ہوئے تھے، میں انھیں دُہرا کر لیوسی کو ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ بتانا نہیں چاہتے!" لیوسی براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔
"تم تو بس کمبل ہو جاتی ہو!" میں بولا۔ "خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنے لگتی ہو۔"

"اچھا اب پوچھنا تم مجھ سے کوئی بات!" اس نے چڑ کر کہا۔
"نہ بتانا ہاں! کوئی احسان نہیں کرتیں تم مجھ پر کچھ بتا کر! تم بہرحال اس کیس پر میرے ساتھ کام کر رہی ہو اور یہ کیس میرے پاس ہے۔"
"تم مجھے افسری دکھاؤ گے!" لیوسی کو بھی غصہ آنے لگا۔
"افسری دکھانا کیا، ہوں میں افسر بلکہ تم سے بڑا افسر، اسپیشل سی آئی ڈی انسپکٹر اے ڈی مرزا!" میں نے سینہ پھلا کر کہا۔

"خواب دیکھنا اچھی بات ہے مگر آدمی کو اتنی جلدی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔" لیوسی مذاق اُڑانے کے سے انداز میں بولی۔ "میں جانتی ہوں، تم جیسے نظر آتے ہو اور خود کو ظاہر کرتے ہو، ویسے نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قطب مینار ہی پر چڑھنے کا دعویٰ کرو، وہ بھی بغیر سیڑھیوں کے!"
میں سمجھ گیا کہ میری ترقی کی اطلاع اسے ابھی نہیں ملی۔ یہ سوچ کر میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ میں نے اس پر ایک دم حیرت کے پہاڑ توڑنے کا فیصلہ کیا اور خاموشی کے ساتھ ایک طرف رکھا ہوا لفافہ اسے تھما دیا، پھر کہا۔ "اسے پڑھ لو، تمھاری صحت بہتر ہو جائے گی۔"

اس نے حیرت کا اظہار کیے بغیر لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور اسے کھول کر اندر رکھا ہوا "پروانۂ ترقی" پڑھنے لگی۔ میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ اس نے دوبارہ "پروانۂ ترقی" پڑھا، پھر بڑبڑائی۔ "کمال ہے! آج تک ایسا نہیں ہوا۔"
"کیوں، اُڑ گئی فاختہ!" میں نے اسے چڑایا اور وہ واقعی چڑ گئی۔
"میری بلا سے!" وہ تپ کر بولی۔ "لیکن اس کے باوجود میں تمھاری ماتحت نہیں ہوں۔"
"نہیں ہو تو میری بن جاؤ گی۔" میں نے جان بوجھ کر ذو معنی بات کی۔
اس نے نظر اٹھا کر مجھے عجیب سے انداز میں دیکھا، پھر عجیب ہی سے لہجے میں بولی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ میں تمھیں نہیں سمجھ پائی۔"

"اور ان شاء اللہ سمجھ بھی نہیں سکو گی۔ حضرت اے ڈی کو سمجھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اگر تم اے ڈی کو نہیں سمجھ پائیں تو اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔"
"مگر... مگر مجھے حیرت ہے کہ تیواڑی جی نے کس طرح..."
"ارے تیواڑی جی کیا ہرا دھنیا بیچتے ہیں!" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "اللہ تبارک تعالیٰ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ترقی!" میں اور پھول گیا۔ پھر معاً مجھے خیال آیا کہ سر تھامسن کے پاس پہنچنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور لیوسی سے پروانۂ ترقی لے کر جیب میں ڈال لیا۔
"یہ تم ایک دم کیوں اٹھ کھڑے ہوئے؟ کہیں جانا ہے؟" لیوسی حیرت سے بولی۔ وہ شاید سمجھ رہی تھی کہ میں اس سے اسی طرح باتیں گھسیٹتا رہوں گا۔
"دنیا میں اور بھی تو کام ہیں۔" میں مسکرا کر بولا۔ "مرد صرف عورتوں سے گپ لڑانے کے لیے تو پیدا نہیں ہوئے!"

اس بار وہ خلافِ توقع چڑی نہیں بلکہ بولی۔ "خیر جاؤ، ویسے میں اپنے کمرے میں ہوں۔ میں نے یہ بات صرف اطلاعاً کہی ہے، اس کا کوئی اور مقصد نہیں۔ میں تم سے نہیں پوچھوں گی کہ کہاں جا رہے ہو اور کب لوٹو گے۔ تم سے کوئی بات پوچھی جائے تو تم نہ جانے کیوں خود کو افلاطون سمجھنے لگتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ بھی کرسی سے اٹھ گئی۔

"سنو لیوسی، یہ جو پوچھ گچھ والی بات ہے نا، کہاں جا رہے ہو اور کب آؤ گے؟ یہ باتیں بیویوں کے مُنہ سے اچھی لگتی ہیں اور ظاہر ہے تم نے میری بیوی بننے سے انکار کر دیا ہے۔ اصل قصور تمھارا ہے میرا نہیں۔" میں نے جان بوجھ کر یہ بات آہستہ سے کہی تھی تاکہ کمال ایسی باتیں سن کر جوشِ جذبات میں نہ آ جائے۔
لیوسی کچھ کہے بغیر تیزی سے مڑی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ غالباً اسے میری بات بُری لگ گئی تھی حالانکہ میں نے سیدھی اور سچی بات کہی تھی۔
کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے احتیاطاً کمال سے کہا۔ "اگر تیواڑی جی مجھے بُلوائیں تو کہہ دینا میں سر تھامسن کے پاس گیا ہوں۔"

"یس سر!... جی!" کمال جلدی میں "جی" لگانا بھولے جا رہا تھا۔ میں اسے ٹوکنے ہی والا تھا کہ اس نے "جی" بھی کہہ دیا۔
اپنے کمرے سے نکل کر میں تیزی کے ساتھ سر تھامسن کے کمرے کی طرف بڑھا کیوں کہ وقت کم رہ گیا تھا۔ جب میں ٹھیک وقت پر چچا بندو خاں کے رُوبرو پہنچا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ چچا بندو خاں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہی مجھے فوراً "اندر" ارسال کر دیا۔ سر تھامسن نے غالباً میرے بارے میں انھیں پہلے ہی بتا دیا ہو گا۔

میں اندر پہنچا تو مجھے وہاں سر تھامسن کے علاوہ خلافِ توقع دو افراد اور نظر آئے۔ ایک صورت میری جانی پہچانی تھی، دوسری صورت میں نے اس سے پہلے بس ایک بار دیکھی تھی۔ ایک تو تیواڑی جی تھے، ڈی آئی جی کرائمز وغیرہ وغیرہ! اور دوسرے کنور شاکر علی تھے، ڈی آئی جی پولیٹیکل برانچ! کنور شاکر علی کا لمبوترا چہرہ عجیب سا تھا جیسے کسی مُردے کا چہرہ! پہلی بار جب میں نے انھیں دیکھا

تھا تو اس وقت بھی کچھ خوف سا محسوس ہوا تھا۔ بالکل سپاٹ سا چہرہ تھا ان کا! بس یوں تھا کہ چہرے پر نظر ڈالی جائے تو پھسلتی چلی جائے کہیں کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو، نہ داڑھی نہ مونچھ اور پلکیں بھی برائے نام!

مجھے توقع نہیں تھی کہ سر تھامسن سبھا سجائے بیٹھے ہوں گے۔ میری کمرے میں اینٹری کو سر تھامسن کے علاوہ ان دونوں "خطرناک" ہستیوں نے بھی محسوس کیا۔ ہر چند کہ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ خفیہ کے بڑے بڑے افسران وہاں موجود تھے اور ان کے ساتھ مجھے باتیں گھولنا تھیں مگر اس کے باوجود میں کچھ سہم سا گیا۔ خاص طور پر وہاں کنور شاکر علی کی موجودگی نے مجھے بہت پریشان کر دیا تھا جیسے کوئی بدروح بھی کمرے میں موجود ہو۔

میں اچک اچک پاؤں دھرتا ہوا اس طرح سر تھامسن کی طرف بڑھا جیسے بتاشوں پر چل رہا ہوں۔ پھر میں سر تھامسن کا اشارہ ملنے کے بعد ان کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر درمیان میں ایک خالی کرسی چھوڑ دی تھی۔ میری اس حرکت کا مقصد افسران کا ادب نہیں بلکہ خوف تھا۔ میں نے اس دوران میں اندازہ لگا لیا تھا کہ وہاں میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کو جو بھی گفتگو کرنا ہوگی، کر چکے ہوں گے۔ کمرے میں ایک بوجھل سی خاموشی تھی۔

پھر چند لمحے بعد سر تھامسن کی آواز ہی نے سکوت توڑا۔

"اے ڈی! میں کنور اور تیواڑی کو تمام حالات سے آگاہ کر چکا ہوں۔ ہم لوگوں نے کسی حد تک لائحۂ عمل بھی طے کر لیا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تم بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرو کہ ابتدا کہاں سے ہونا چاہیے!"

میری نصف سٹی تو کمرے میں داخل ہوتے ہی گم ہو چکی تھی، بقیہ نصف اب غائب ہو گئی۔ میں ہونقوں کی طرح سر تھامسن کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ میں نے جان بوجھ کر اب تک تیواڑی جی کی طرف نہیں دیکھا تھا کہ کہیں ان کی تلوار کٹ مونچھیں دیکھ کر میری شہ رگ نہ پھڑکنے لگے۔

"بولو نا، خاموش کیوں ہو؟" سر تھامسن نے مجھے ہشکایا۔

"ب... بولوں... مجھے بالکل بولنا چاہیے بلکہ بولتے رہنا چاہیے۔" میں گھبرا کر بولا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پہلے ہی بہت کچھ سوچ چکے ہو۔ مجھے تم سے یہی توقع تھی۔" سر تھامسن نے مسکرا کر کہا، پھر

کنور شاکر علی سے مخاطب ہوئے۔ "تم مائنڈ نہ کرنا کنور! اے ڈی ذرا مختلف لڑکا ہے جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس کے کام کرنے کا اپنا الگ ایک انداز ہے۔"

"جی ہاں، آپ بتا چکے ہیں سر!" کنور شاکر علی بولے اور مجھے یوں لگا جیسے ان کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آئی ہو۔ "ذاتی طور پر بھی میں ایسے ذہین افراد کو پسند کرتا ہوں سر!"

اسی وقت میری نظر تیواڑی جی کی طرف اٹھ گئی۔ کنور شاکر علی کی بات سن کر ان کی مونچھوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی تھی جو ظاہر ہے ناگواری ہی کی علامت تھی۔

راہِ مفر تو تھی نہیں، مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اس لیے جب سر تھامسن نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں بول اٹھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے سر کہ سیٹھ عثمان کو نہ بخشا جائے۔" میری اس بات کے پیچھے خالصتاً ذاتی رنجش تھی گویا میں انتقامی کارروائی چاہتا تھا۔ بھلا بتاؤ، اس بدبخت نے مجھے اٹھوا کر پھنکوانے کا سامان کر دیا تھا۔ وہ تو میں خود اپنے قدموں چل کر وہاں سے چلا آیا ورنہ اس کی "لیڑ چونچیاں" سچ مچ مجھے ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی کوٹھی سے باہر ڈال آتیں۔ میں اس بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میری بات سن کر سر تھامسن بولے۔ "ہم لوگ بھی تقریباً اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔"

تم لوگوں کے منہ میں گھی شکر! میں نے دل ہی دل میں کہا۔

سر تھامسن کی بات جاری تھی۔ "یہ بات تو طے ہو چکی کہ بارہ ہنڈراڈ کے تیورا مے پر جس شخص کو ہم نے گھیرنے کی کوشش کی تھی، وہ رنجیت ہی تھا۔ وہ کسی طرح زخمی ہو کر بچ نکلا مگر کار وہیں چھوڑ جانے پر مجبور ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کار سیٹھ عثمان کی ملکیت تھی۔ پھر جب اس سلسلے میں سیٹھ عثمان سے رابطہ قائم کیا گیا تو اس نے بتایا، وہ کار اس کے منیجر رگھوناتھ کے استعمال میں تھی۔ اس صورت میں منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کا مجرموں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ رگھوناتھ کو تلاش کیا گیا تو وہ نہیں ملا۔ سیٹھ عثمان نے بتایا کہ رگھوناتھ پندرہ دن سے چھٹی پر تھا۔ پھر ہم نے مزید چھان بین کی تو سیٹھ عثمان کا بیان غلط ثابت ہوا۔ رگھوناتھ کو ایک دن پہلے تک ڈیوٹی پر دیکھا گیا تھا۔ یہیں سے سیٹھ عثمان کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور میں نے اس کی نگرانی شروع کرا دی۔ اسی دوران میں اے ڈی اپنے طور پر اس سے جا ٹکرایا اور پتا چلا کہ وہ اپنی نگرانی سے واقف ہو چکا ہے۔ میں نے اسی لیے فوری طور پر احکام دیے کہ نگرانی ختم کرا دی جائے۔ اے ڈی نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کے متعلق میں بتا ہی چکا ہوں۔ مجرموں کے مقاصد سامنے آ چکے ہیں لیکن اب وہ خود سامنے نہیں آئیں گے، اپنے مہروں کو استعمال کریں گے۔ ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ ہم ان مہروں کے ذریعے اصل مجرموں تک پہنچیں۔ اس تمام معاملے میں سیٹھ عثمان کا کردار مشتبہ ضرور معلوم ہوتا ہے مگر یقینی طور پر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بہت بااثر شخص ہے، ہم براہِ راست بغیر کسی واضح ثبوت کے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ میں اس سلسلے میں اوپر تک بات کر چکا ہوں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ اگر سیٹھ عثمان کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے تو میں بغیر ہچکچائے اسے قانون کی گرفت میں لے سکتا ہوں لیکن وہ حکومت کی نظر میں وفادار ہے اس لیے کوئی بے احتیاطی نہ برتی جائے۔ فی الحال ہمارے سامنے سیٹھ عثمان کے سوا کوئی نہیں اس لیے ہمیں اپنے کام کا آغاز یہیں سے کرنا ہے۔" سر تھامسن یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور مشورہ طلب نظروں سے باری باری سبھی کے چہروں پر نظر ڈالی۔

"سر! میں کچھ عرض کروں؟" کنور شاکر علی نے کہا۔

"ہاں کہو۔" سر تھامسن نے اجازت دی۔

"اب تمام حالات ایک حد تک واضح طور پر سامنے آ چکے ہیں۔ حالات سے پتا چلتا ہے کہ یہ کیس کرائمز برانچ کی بجائے پولیٹیکل برانچ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے حکم پر اب تک دونوں برانچیز کام کرتی رہی ہیں لیکن سر! اگر اب اس کیس کی فائل میری برانچ کو دے دی جائے تو زیادہ بہتر طور پر کام ہو سکے گا۔ اس سے قطع نظر آپ کے علم میں ہے، ہماری برانچ میں تمام اہم شخصیات کی فائلیں کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سیاسی شخصیات بھی ہیں۔ جو لوگ حکومت کی گڈ بک میں ہیں، ان کے متعلق بھی ہمارے پاس معلومات ہیں اور جو مخالف ہیں، ان کا ریکارڈ بھی ہے۔" کنور شاکر علی اپنے مخصوص دھیمے دھیمے لہجے میں بات کیے جا رہے تھے۔ "سر! جیسا کہ آپ نے بتایا، مجرموں کا اب پہلا قدم کیا ہوگا، اس صورت میں ضروری ہے کہ ان سیاسی شخصیتوں کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے جو عوام میں مقبول ہیں تاکہ مجرم بہ آسانی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔"

"کنور، تم نے بیک وقت کئی مسئلے چھیڑ دیے۔" سر تھامسن نے طویل سانس لے کر کہا۔ "پہلا مسئلہ اس کیس کے ٹرانسفر کا ہے کہ یہ کیس تمھاری برانچ کے سپرد کر دیا جائے۔ بنیادی طور پر میں تمھارے خیال سے متفق ہوں۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ اس کیس پہ پہلے سے جو افراد کام کر رہے ہیں، انھیں بھی تمھاری برانچ میں ٹرانسفر کر دیا جائے، یعنی اے ڈی اور لیوسی کو! دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح کام ہو رہا ہے، ہونے دیا جائے۔" یہ کہہ کر سر تھامسن نے تیواڑی جی کو مخاطب کیا۔ "تمھارا کیا خیال ہے تیواڑی؟"

"سر! میں کنور جی کے خیال سے متفق ہوں۔" تیواڑی جی جلدی سے بولے۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کیس سے جان چھڑانا چاہتے ہو!" یہ کہتے ہوئے سر تھامسن آہستہ سے ہنسے۔

"ن... نہیں سر! میرا مطلب یہ... یہ نہیں تھا۔" تیواڑی جی کچھ نروس سے ہو گئے۔

"ہوں!" سر تھامسن نے ہنکارا بھرا اور کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "کیوں کہ خود میں اس کیس کو ڈیل کر رہا ہوں اس لیے یہ بحث بیکار ہے کہ اس کیس کی فائل کس برانچ کے پاس ہونا چاہیے!"

"آپ کا خیال قطعی درست ہے سر!" میں نے موقع دیکھ کر گویا گرہ لگائی اور مجھے کنور شاکر علی کے ساتھ ہی تیواڑی جی کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات نظر آئے۔ اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اپنے اِمّی جیئیٹ باس یا باسوں کو بھی خوش رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ سر تھامسن نے ان دونوں ہی کی بات سے اختلاف کیا تھا اور میں نے ان کی تائید کر دی تھی اس لیے ان دونوں کا "سڑنا" غلط نہیں تھا۔ تیواڑی جی جیسے بھی بُرے بھلے تھے بہ ہر حال کنور شاکر علی کی طرح کوئی بد روح نہیں لگتے تھے، پھر بھلا میں کس طرح ان کی ماتحتی میں چلا جاتا! سر تھامسن کی بات سے اتفاق کرنے کا یہی سبب تھا ورنہ مجھے کیا پڑی تھی جو بول کر چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھتا!

ان دونوں حضرات کی ناگواری کو شاید سر تھامسن نے بھی محسوس کر لیا تھا اس لیے وہ مجھ سے بولے۔ "اے ڈی! تم اس وقت اپنی رائے دو گے جب میں تم سے کچھ پوچھوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ پھر کیس پہ گفتگو کرنے لگے۔ "ہاں تو کنور، تم کہہ رہے تھے کہ مقبول سیاسی شخصیات کے تحفظ کا بندوبست ضروری ہے۔ بات سمجھ میں آتی ہے۔ بظاہر یہ کام بہت بڑا اور کچھ مشکل سا نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ مجرم، گنتی کے چند ایسے سیاسی افراد میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے جس کے قتل سے وہ کوئی بڑا فائدہ اٹھا سکیں۔ ایسی اہم شخصیات کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے جو عوام میں انتہائی مقبول ہیں۔ ہم اگر صرف انھی کے تحفظ کا بھرپور بندوبست کر سکیں تو یہ بھی کافی ہوگا۔ یہ ملک بہت بڑا ہے، کہیں سے بھی کوئی چنگاری پھوٹ سکتی ہے لیکن ہمیں فی الحال زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ مجرموں کا منصوبہ پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔ وہ ابتدا اسی شہر سے کرنا چاہتے ہیں۔ تو یوں سمجھو اس بات کو کہ دہلی میں جو اہم سیاسی شخصیات موجود ہیں، ہمیں صرف انھی کے تحفظ کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ تو ہمارے لائحۂ عمل کا دفاعی حصہ ہوا جس پہ آج ہی سے عمل درآمد کرایا جا سکتا ہے، اب رہ جاتی ہے دوسری اہم بات! مجرموں تک کس طرح پہنچا جائے؟ تو فی الوقت ہمارے ہاتھ میں ایک ہی پتا ہے، سیٹھ عثمان! اور ہمیں اس پتّے کو بہت احتیاط سے استعمال کرنا ہے۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ سیٹھ عثمان چوکنا ہو چکا ہے، اس کے سلسلے میں عام گھسا پٹا طریقۂ کار نہیں چلے گا۔ مثال کے طور پہ نگرانی کے سلسلے میں اے ڈی نے جس طرح پتا لگایا کہ وہ نگرانی سے واقف ہو چکا ہے، یہ عام طریقۂ کار سے الگ انداز تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر بار ایسا ہی یا اس سے ملتا جلتا انداز اختیار کیا جائے گا۔ بہ ہر حال اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔"

میں سر تھامسن کی زبان سے اپنی تعریف سن کر پھول گیا مگر جوش میں آ کر ہوش کا دامن نہیں چھوڑا، یعنی خاموش ہی رہا۔

سر تھامسن قدرے توقف سے پھر بولے۔ "سیٹھ عثمان کے سلسلے میں ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے، فی الحال یہی طے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں باری باری میں تم سبھی کی رائے سننا پسند کروں گا۔" اس کے بعد سر تھامسن کی "تقریرِ دل پذیر" ختم ہو گئی۔

سر تھامسن نے طریقۂ کار کے ضمن میں میری جو مثال دی تھی تو غالباً کنور صاحب اور تیواڑی جی دونوں ہی کو کچھ بُرا سا لگا تھا جس کا اظہار ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ میری طرح شاید سبھی ایک دوسرے سے پہل کی توقع کر رہے تھے تاکہ اپنے پیش رو سے بہتر تجویز پیش کر سکیں۔

بالآخر سر تھامسن نے میری طرف سوالیہ نگاہ اٹھائی۔ "اے ڈی! پہلے تم بتاؤ، تم نے کیا سوچا ہے؟"

بھلا یہاں کس کم بخت کے پاس اتنا بھیجا فالتو تھا جو اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا مگر اب سر پر آ ہی پڑی تھی اور مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ "سر! بس بھیس بدل کر گھس جاتے ہیں اس کی کنسٹرکشن کمپنی میں!" دراصل اس وقت مجھے راؤ بہادر کشوری لال یاد آ گیا تھا جس کے گھر میں بھیس بدل کر رہا تھا۔

"مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟ سیٹھ عثمان خود تو اپنے دفتر میں کم ہی بیٹھتا ہے۔ سارا کام اس نے اپنے ماتحتوں پر چھوڑ رکھا ہے۔" سر تھامسن نے بتایا۔ "اس طرح اس کی نقل و حرکت پر تو نظر نہیں رکھی جا سکتی!"

"ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تو پھر ایک ترکیب اور ہے، اس کے گھر میں لیوسی کو ملازمہ رکھوا دیں۔ میں نے وہاں کوئی نوکر نام کی چیز نہیں دیکھی، سبھی نوکرانیاں تھیں۔"

"کیا تمھارے خیال میں ایسا ممکن ہے؟" سر تھامسن نے سوال کیا۔ "کسی نئی ملازمہ کو وہ رکھے گا کیوں؟ جب کہ وہ چوکنا بھی ہو چکا ہے۔"

"آپ اس بات کو چھوڑیں سر! بالکل غم نہ کریں، یہ کام ہو جائے گا۔ آپ تو بس اجازت دے دیں۔" میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"ہوں۔" سر تھامسن کچھ سوچنے لگے۔

اسی وقت کنور شاکر علی بول اٹھے۔ "ویسے سر، معاف کیجیے گا، یہ طریقہ بھی نیا نہیں ہے جب کہ آپ نے فرمایا تھا، نیا طریقۂ کار ہونا چاہیے۔"

"طریقۂ کار نیا ہونے سے میری مراد اسے نئے انداز میں برتنا تھا، اس طرح کہ مخالف کو پتا نہ چل سکے کہ ہمارا اصل مقصد کیا ہے۔ بہ ہر حال اگر تمھارے ذہن میں کوئی نئی بات آئی ہو تو کہو۔"

"عرض کرتا ہوں۔" کنور صاحب نے کہا۔ "کچھ نامعلوم افراد سیٹھ عثمان کو اغوا کر کے کسی نامعلوم جگہ بھی لے جا سکتے ہیں۔" کنور صاحب کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "وہ نامعلوم افراد یہ ظاہر نہیں ہونے دیں گے کہ ان کا تعلق ہم سے ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیٹھ عثمان پر تشدد کر کے اس کی زبان کھلوانا چاہتے ہو۔" سر تھامسن نے کہا۔ "لیکن اس بات کو تم اُس سے کس طرح چھپاؤ گے کہ اسے اغوا کرنے والے دراصل سی آئی ڈی والے ہیں۔ جب وہ پوچھ گچھ کریں گے تو خود سیٹھ عثمان ان سوالات کی روشنی میں اس نتیجے تک پہنچ جائے گا کہ اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں!"

"وہ کوئی اور گروہ بھی تو ہو سکتا ہے جو اُن کے خلاف کام کر رہا ہو۔" کنور شاکر علی بولے۔

اس بار تیواڑی جی بھی کلبلائے اور انھوں نے وہاں اپنی موجودگی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے کھانس کر دکھایا، پھر کہا "سر! بالکل یہی تو نہیں البتہ اس سے ملتا جلتا طریقۂ کار خود میں بھی گزشتہ کیس میں اپنا چکا ہوں۔ مقتول بھگوان داس کے قتل کا واقعہ آپ کو یقیناً یاد ہوگا جسے رنجیت ہی نے گولی ماری تھی۔ ہم بھگوان داس کے گھر میں مجرموں ہی کی طرح داخل ہوئے تھے، یہ الگ بات کہ مجرم اس سے پہلے ہی مطلوبہ کاغذات اس کی تجوری سے لے اُڑے تھے۔"

"بہ ہر حال یہ طریقہ نیا ہو یا پرانا، فی الحال اس بحث کی ضرورت نہیں۔" سر تھامسن ہاتھ اٹھا کر بولے "یہ انتہائی قدم ہو سکتا ہے، ابتدائی نہیں۔"

"ویسے تو سر، ہوگا وہی جو آپ حکم دیں گے لیکن اس اقدام سے ایک بات ضرور بائے ثبوت کو پہنچ جائے گی کہ سیٹھ عثمان کا واقعی کوئی تعلق مجرموں سے ہے یا نہیں!" کنور شاکر علی نے کہا "اگر مجرموں سے سیٹھ عثمان کا کوئی تعلق ہوا تو لازماً وہ سامنے آئیں گے ورنہ دوسری صورت میں خاموش بیٹھے رہیں گے۔"

"کنور! تم یہ بات شاید اس لیے کہہ رہے ہو کہ مجرموں سے اچھی طرح واقف نہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ بالفرض سیٹھ عثمان سے ان کا کوئی تعلق ہوا بھی تو اس موقع پر وہ خاموشی ہی اختیار کریں گے۔ وہ دونوں بہت چالاک اور خود غرض ہیں۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ اگر سیٹھ عثمان کے اغوا کا شبہ انھیں ہم پر ہو جائے اور حقیقتاً سیٹھ انھی کا آلۂ کار ہو تو وہ سیٹھ کو ختم کر دیں۔ وہ کچھ ایسے ہی سفاک لوگ ہیں، جب تک ان کا کوئی مہرہ فائدے کا سبب بنا رہتا ہے وہ اسے استعمال کرتے رہتے ہیں، اسے کھلونا بنائے رہتے ہیں لیکن جب صورتِ حال مختلف ہو جائے تو وہ اس کھلونے کو توڑ دیتے ہیں۔" سر تھامسن نے یہ کہہ کر پہلو بدلا، "ویسے، یہی حقیقت ہے کہ وہ بے سبب و بے فائدہ قتل سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ وہ بہ مجبوری ہی یہ انتہائی قدم اٹھاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں میں اس لیے تم لوگوں سے بہتر طور پر جانتا ہوں کہ ان سے کئی بار میری معرکہ آرائی ہوئی ہے۔"

اب تک تیواڑی جی نے کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی اس لیے سر تھامسن کی سوالیہ نگاہ ان کی طرف اٹھی۔ تیواڑی جی کو غالباً اس سوالیہ نگاہ کی توقع نہ رہی ہوگی اس لیے پہلے تو انھوں نے بغلیں جھانکیں، پھر کچھ سٹپٹا کر بولے "سس... سر! میں... میں... میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا کہ... رگھوناتھ کے گھر چھاپا مارا جائے۔ ممکن ہے وہاں سے کوئی کام کی چیز مل جائے۔"

"کیا مطلب؟" سر تھامسن کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"میں... میں شاید اپنی پوری بات صحیح طرح کہہ نہیں پایا۔" تیواڑی جی نے جلدی سے کہا "یہ چھاپا پولس مارے گی۔"

"مگر کیوں اور کس سلسلے میں؟ جواز کیا ہوگا پولس کے پاس؟" سر تھامسن بہ دستور تیوریاں چڑھائے ہوئے بولے

"سر! پولس ہمارے اشارے پر کوئی بھی [illegible] کر سکتی ہے۔ وہاں غیر قانونی اسلحہ برآمد کیا جا سکتا ہے [illegible] کیا جا سکتا ہے اور بہت سے جواز پیدا کیے جا سکتے ہیں۔"

"مگر اس سے فائدہ؟" سر تھامسن نے سوال کیا "تمھارے خیال میں کیا اس نے وہاں کوئی ایسی چیز چھوڑی ہوگی جو ہمارے کام آسکے؟ پھر یہ کہ کیا سیٹھ عثمان خاموش بیٹھا رہے گا؟"

"لیکن ہم بہ راہِ راست سیٹھ عثمان کے خلاف تو کوئی کارروائی نہیں کر رہے سر!" تیواڑی جی عاجزانہ لہجے میں بولے۔

"فضول ہے۔" سر تھامسن نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"سیٹھ عثمان کی کوٹھی پر مسلح ڈاکو بھی تو حملہ کر سکتے ہیں؟" تیواڑی جی نے دوسرا پتا پھینکا مگر وہ بھی بدرنگ ثابت ہوا۔

"یہ بھی بے کار ہے۔" سر تھامسن کچھ چڑھ سے گئے "پتا نہیں تم لوگوں نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ سیٹھ عثمان واقعی مجرم ہے! بات صرف اتنی سی ہے کہ کسی سبب سیٹھ عثمان اپنے منیجر رگھوناتھ کو بچانا چاہتا ہے اور شاید اسی لیے اس نے رگھوناتھ کو غائب کرا دیا ہے۔ اِس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں اور ہمیں وہی معلوم کرنا ہیں۔ اِن دنوں اِس ملک کی جو سیاسی

فضا ہے، تم لوگ اس سے بہ خوبی واقف ہو۔ ایسے میں حکومت کو اپنے وفاداروں کی بہت ضرورت ہے۔ ہمیں پہلے یہ ثبوت حاصل کرنا ہے کہ آیا سیٹھ عثمان مشتبہ ہے بھی یا نہیں! اگر وہ واقعی حکومت کا وفادار ثابت ہوا، جیسا کہ بہ ظاہر محسوس ہوتا ہے تو پھر ہمارا کوئی غیر محتاط قدم نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

اب تک سر تھامسن نے بس میری تجویز پر "ہوں" کی تھی اور کچھ سوچنے لگے تھے۔ کنور شاکر علی اور تیواڑی جی کی تجاویز کو انھوں نے مسترد کر دیا تھا۔ میں خاموشی سے بیٹھا ہوا سب تماشا دیکھ رہا تھا اور اپنی قابلیت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں نظر آ رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی سر تھامسن نے بغیر کوئی فیصلہ سنائے "اجلاس" برخاست ہونے کا حکم سنا دیا، اس کے بعد کہا۔ "اس سلسلے میں جو قدم اٹھانا ہے، اس کے بارے میں تم لوگوں کو آج ہی میرے احکام مل جائیں گے۔"

جب میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو سوچ رہا تھا، بڈھا یقیناً کوئی نیا کھیل کھیلنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ مجھے صرف یہ فکر تھی کہ یہ کھیل کہیں میرے لیے موت کا کھیل ثابت نہ ہو۔

پتا نہیں اس دن کنور شاکر علی یا تیواڑی جی کو سر تھامسن کے احکام ملے یا نہیں لیکن میں خوش تھا کیوں کہ میرے لیے کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ میں اسی لیے لیوسی سے تھوڑی بہت گپ شپ لڑا کر ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر سدھار گیا۔ گھر جانے سے قبل میں نے یہ پوچھ گچھ ضرور کر لی تھی کہ سینیئر افسر ہونے کے بعد میری تنخواہ میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے۔

گھر پہنچتے ہی میں نے تنخواہ میں اضافے کی اطلاع پہلے امّی کو دی اور پھر ابا، دکان سے آ گئے تو ان کو بھی یہ خوش خبری سُنائی۔ ابا نے جب میرے سامنے بھائی جان کو یہ خبر سنائی اور انھیں ساتھ ہی شرم دلائی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ معلوم نہیں، انھیں اپنے نکھٹو ہونے کا احساس تھا بھی کہ نہیں مگر اس وقت وہ کچھ شرمندہ سے نظر آنے لگے۔ مجھے ان پر ترس آ رہا تھا کہ انھوں نے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے کچا چبا جائیں گے۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر وہاں سے کھسک لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ ابا نماز پڑھنے گئے اور امّی باورچی خانے میں تو وہ مجھے اس "قصور" پر ضرور "چپتیائیں" گے۔ پھر وہی ہوا بھی۔ ادھر ابا گھر سے نکلے، بھائی جان، کمرے میں گھس آئے۔ میں نے دیکھا ان کے ایک ہاتھ میں جوتے تھے، دوسرے میں پالش کی ڈبیا اور برش۔

"ہے بے افسر کی دُم، جوتوں پر پالش کر!" انھوں نے اس طرح کہا جیسے میں نے ذرا انکار میں زبان ہلائی اور دیا انھوں نے جوتا میری چاند پر!

"ابھی لیں بھائی جان!" میں نے جلدی سے جوتے، برش اور پالش کی ڈبیا ان سے لے لی اور فرش پر اکڑوں بیٹھ کر ان کے جوتے چمکانے لگا۔

میری فرماں برداری دیکھ کر ان کا رویّہ تھوڑا سا نرم ہو گیا۔ وہ کسی قدر نرمی سے بولے "کچھ پیسے ہیں تیرے پاس؟"

"کتنے بھائی جان؟" میں نے ہاتھ روک کر ان کی طرف

دیکھا۔

"ابے کتنے کیا، جتنے ہوں دے دے، واپس مل جائیں گے تجھے!"

"میرے پاس تو بس ایک چونی ہے بھائی جان!" میں نے جان چھڑانے کے لیے چونی قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ابے بکے مت!" انھوں نے ڈانٹ دیا۔ "مجھے پورا روپیا چاہیے، کھنکھناتا ہوا!"

میری جیب میں کئی روپے تھے اور مجھے ڈر تھا کہ اگر بھائی جان کو غصہ آگیا تو پوری جیب خالی کرالیں گے اس لیے فوراً ایک روپیا جیب سے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

روپیا جھپٹ کر انھوں نے فوراً دروازے کا رُخ کیا اور جاتے جاتے حکم دیا۔ "جوتے پالش کرکے اُدھر کونے میں رکھ دیو! آئندہ خود خیال رکھا کر، بغیر کہے خود ہی دیکھ لیا کر کہ میرے جوتوں پر پالش ہے کہ نہیں!"

"جی بہتر ہے بھائی جان!" میں نے ہانک لگائی۔ پتا نہیں انھوں نے میری ہانک سنی کہ نہیں سنی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں روپے کی گرمی چڑھ گئی ہے اور جب تک وہ اس روپے کو ملیامیٹ نہیں کردیں گے، چین نہیں ملے گا۔

بھائی جان چلے گئے مگر میں ان کا جوتا چمکانے میں جُٹا رہا۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک جوتے میں صورت نظر نہ آئے، پالش بیکار ہے۔ کئی بار جوتے میں انھیں اپنی صورت نظر نہیں آئی تھی اور نتیجتاً انھوں نے میری صورت بگاڑ دی تھی۔ جوتا چمکا کر اور بطور امتحان اس میں اپنی صورت دیکھنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا کہ اگر اس میں میری صورت نظر آ رہی ہے تو پھر بھائی جان کی شکل بھی نظر آئے گی۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے میرے گھٹنے دُکھنے لگے تھے اور جسم بھی پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جوتا اپنا ہو یا پرایا، اسے پالش کرنے میں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے، سارے رگ پٹھے کھل جاتے ہیں۔

کچھ دیر پسینا سکھا کر میں غسل خانے میں گھس گیا، نہا کر نکلا تو امّی نے مونگ کی دال کی کھچڑی اور پودینے کی چٹنی میرے سامنے لاکر رکھ دی۔ کھچڑی پر انھوں نے اوپر سے بھی کچھ گھی بطور خاص ڈال دیا تھا۔ ایسا وہ اسی وقت کرتی تھیں جب انھیں مجھ پر بہت ہی زیادہ لاڈ آتا تھا اور آج تو یوں بھی لاڈ آنے کا دن تھا۔ میری تنخواہ میں اضافہ جو ہو گیا تھا۔ اس دن رات گئے تک میرے یہی ٹھاٹ رہے۔ اور تو اور ابّا عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میرے لیے دودھ کا بھولوا لیتے آئے۔

"کچھ کھایا پیا کرو، سوکھ کے کانٹا ہو رہا ہے۔" ابّا نے میری طرف دودھ کا بھولوا بڑھاتے ہوئے کہا۔

کانٹا تو خیر میں بالکل نہیں ہوا تھا اور اگر ایسا تھا بھی تو اس میں قلفی انھی کا ہاتھ تھا مگر اس کے باوجود میں نے بھولوا لے لیا۔ ابّا محبت بھری نظر سے مجھے دودھ پیتے دیکھتے رہے اور پھر میں نے دودھ پی لیا تو کمرے سے چلے گئے۔

اس رات میں نے بڑے اچھے اچھے خواب دیکھے۔ کبھی کنیزا کو اپنی راہ میں بال زمین پر بچھائے اور خود کو ان پر چلتے دیکھا اور کبھی دیکھا کہ ایک اونچے سے تخت پر بیٹھا ہوں جہاں سے مجھے بقیہ پبلک بہت چھوٹی چھوٹی سی نظر آ رہی ہے۔ اسی پبلک میں مجھے بھائی جان بھی کھڑے ہوئے نظر آئے۔

میں صبح اٹھا تو طبیعت پُر بہار تھی۔ شاید یہی سبب تھا کہ میں سیدھا کشمیری گیٹ جانے کی بجائے لال کنوئیں کی طرف نکل گیا۔ دفتر کے وقت سے کچھ پہلے ہی نکلا تھا اس لیے مجھے اُمید تھی کہ لیوسی ابھی اپنے گھر ہی پر ہوگی۔ لیوسی سے مل کر اسے تھوڑا بہت جلا بھُنا کر نہ جانے کیوں مجھے مزا سا آتا تھا اور کیا خبر کہ وہ بھی خوش ہوتی ہو ان باتوں سے! بہ ظاہر تو وہ ناراض ہی ہوتی تھی مگر لڑکیاں سچ مچ کس بات پر ناراض اور کس پر خوش ہوتی ہیں، اس بارے میں کوئی بات قطعی طور پہ نہیں کہی جا سکتی۔

میں لیوسی کے گھر پہنچا تو وہی "کبو بھن بھن" یعنی وکٹر اس کی جان کو آیا ہوا تھا۔ وہ لیوسی سے کہہ رہا تھا کہ دفتر سے چھٹی لے کر اس کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے چلے۔ لیوسی کی امّی بھی وکٹر کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ میری صورت دیکھ کر لیوسی کی جیسے جان میں جان آگئی۔ لیوسی اس وقت جس عذاب میں گرفتار تھی، میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں چاہتا تو اس سے لطف اندوز ہو سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "ڈی آئی جی صاحب نے کل شام مجھ سے کہا تھا کہ میں تمھیں اپنے ساتھ ہی دفتر لیتا ہوا آؤں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت اہم بات ہوگی۔" لیوسی نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔ اس کی اداکاری بے مثال تھی۔

"ہاں ہاں ظاہر ہے ورنہ وہ مجھے کیوں دوڑاتے!" میں جلدی سے بولا۔

میری بات سن کر وکٹر کا چہرہ اتر گیا۔ پتا نہیں وہ بے چارہ کیا کیا امیدیں دل میں لیے صبح ہی صبح اپنی محبوبۂ دل نواز کے گھر پہنچا تھا۔ لیوسی کی امّی بھی ٹھنڈی پڑ گئیں۔ نتیجتاً کچھ دیر بعد میں لیوسی کو پھٹ پھٹ پر بٹھائے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ جب پھٹ پھٹ کھاری باؤلی سے گزر رہی تھی، لیوسی نے میری پشت پر دستک دی اور بولی۔ "اگر اس وقت تم نہ آگئے ہوتے

تو میں بڑی مشکل میں پھنس جاتی۔ بہرحال تمھارا شکریہ!"

"خالی خولی شکوریہ!" میں منہ ٹیڑھا کرکے بولا۔ "کبھی کچھ کھلوایا پلوایا بھی کرو!"

"کیا کھاؤ گے بولو؟" اس نے ہنس کر کہا۔

"چلو آج دفتر سے لوٹتے ہوئے قلفی ہی کھلوا دینا چاندنی میں!"

لیوسی نے قلفی کھلانے کا وعدہ کر لیا۔

دفتر پہنچ کر لیوسی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور میں اپنے کمرے کی سمت!

اپنے کمرے میں گھستے ہی میرا فیوز اُڑ گیا۔ سارے "معززین" وہاں موجود تھے۔ بقیہ کو تو میں بھگت ہی لیتا تھا، کسی نہ کسی طرح! لیکن کمار اور پیارے لال ہنر مجھے ایک آنکھ کیا دونوں آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کمال بدبخت "نِج گھو" ثابت ہوگا۔ اس نے میرے دفتر پہنچنے سے قبل ہی سب کو میری ترقی سے آگاہ کر دیا تھا۔ کمار خدا جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس پر اس اطلاع کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا تھا۔ وہ سب میرے سینئر انسپکٹر ہونے سے آگاہ ہو چکے ہیں، یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب کمار نے مٹھائی کا نعرہ بلند کیا اور بقیہ افراد نے کورس میں اس کی تائید کی۔

"کس بات کی مٹھائی؟ کوئی لوٹ مچ رہی ہے! کوئی لڑکا ہوا ہے میرے گھر!" میں نے برہم ہوکر مطالبے کا جواب دیا۔

"اگر آپ اسی طرح بہ قیدِ حیات رہے سر، تو لڑکا بھی کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گا۔" کمار اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"کیا کہا، بہ قیدِ حیات؟ میں کیوں قید میں ہونے لگا! قید میں ہو تم اور تمھارے ہوتے سوتے! تم بھی اب اوٹ پٹانگ لفظ بولنے لگے، پیارے لال ہنر کی صحبت میں رہ کر!"

پیارے لال ہنر کا ذکر آگیا تھا تو وہ بھلا کیوں خاموش رہتا، جھٹ سے بولا۔ "اے حضور والا! اس بندۂ ناچیز کو کیوں مجل فرماتے ہیں! زبان دانی کا تو زمانہ ہی اٹھ گیا ہے، اب کہاں وہ لیل و نہار! میں بھلا کسی کو کیا تعلیم کروں گا، خود ابھی بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کر رہا ہوں۔"

"تمھارے لیے یہ کام بالکل ٹھیک ہے بلکہ میرا مشورہ ہے کہ تم جوتیاں سیدھی کرنے کے ساتھ ساتھ جوتیاں گانٹھنے بھی لگو، اس سے کچھ پیسوں کا آسرا بھی ہو جائے گا۔" میں نے جل کر کہا۔

"دیکھا پیارے لال جی، میں کہہ رہا تھا نا کہ اب اور بھی مزاج آسمان پر پہنچ جائیں گے۔" کمار نے بیچ میں گرہ لگائی۔

"تم کس کے مزاج کی بات کر رہے ہو؟ ہیں!" میں نے کمار کو گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

"مزاج تو مزاج والوں کے ہوتے ہیں، آپ کا اس میں کیا، نج سر! یہ میری اور پیارے لال جی کی بات ہے۔"

اسی وقت تیواڑی جی کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے طلبی کا حکم سنایا۔ میں نے سوچا، چلو فی الحال تو ان کم بختوں کی "بک بک" سے جان چھوٹی، آکر بھگتوں گا!

اِدھر چپراسی کمرے سے نکلا، اُدھر میں کرسی سے اٹھا اور دھمکی آمیز لہجے میں کمار کو وارننگ دی۔ "اگر تم نہیں سُدھرے تو سمجھ لو تمھاری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"ارے!" کمار چونک کر بولا۔ "آپ نے پہلے یہ بات نہیں بتائی سر ورنہ۔۔۔"

"گیٹ آؤٹ!" وہ دہاڑا اور میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد جب میں تیواڑی جی کے کمرے میں پہنچا تو وہ مجھے خلافِ معمول کچھ بُجھے بُجھے سے دکھائی دیے۔ انھوں نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم بہاری لال جی کو جانتے ہو؟"

"سر، بہار تو سُنا ہے، بہاری نہیں سُنا۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"بکواس نہ کرو اور سنجیدگی سے میری بات سنو!" انھوں نے کسی قدر سختی سے کہا۔ "کل تم نے ڈی جی صاحب کے سامنے جو تجویز پیش کی تھی، وہ انھوں نے منظور کر لی ہے۔"

"مگر سر، اس تجویز کا بہاری لال سے کیا تعلق ہے؟"

"وہی بتا رہا ہوں۔" تیواڑی جی بولے۔ "بہاری لال جی، دہلی کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ موری گیٹ میں رہتے ہیں۔"

"بالکل رہتے ہوں گے، مجھے آپ کی بات پر پورا یقین ہے سر!" میں نے تیواڑی جی کو خوش کرنے کی خاطر جلدی سے کہا مگر ناکام رہا۔

جواب میں تیواڑی جی کی مونچھیں حرکت میں آگئیں اور میں سہم گیا۔ وہ بلند آواز میں بولے۔ "ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے!"

"ت۔۔۔ تو۔۔۔ پو۔۔۔ پوری کریں۔ مجھے۔۔۔ کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "میں تو سر، صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ بہاری لال جی کا اس کیس سے تعلق بتا دیں تاکہ میری مشکل حل ہو جائے۔"

"سیٹھ عثمان سے بہاری لال جی کے قریبی تعلقات ہیں۔ اب آیا کچھ کھوپڑی میں!"

"بالکل آگیا سر، قطعی آگیا!" میں نے تیزی سے گردن ہلائی حالانکہ میری کھوپڑی میں جو کچھ پہلے سے تھا، وہ تو تھا، نئی کوئی چیز اینٹر نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں تو پھر سنو، میں تمھیں بہاری لال جی کے نام ایک خط دے رہا ہوں۔ تم یہ خط لے کر ان کے پاس جاؤ گے۔" تیواڑی جی نے یہ کہہ کر سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھایا۔

"بالکل جاؤں گا۔ آپ حکم کریں اور میں نہ جاؤں، یہ بھلا کیسے ممکن ہے سر!" میں نے سعادت مندی کا اظہار ضروری سمجھا۔

"بہاری لال جی کے نام یہ خط گنیش بابو نے لکھا ہے اور گنیش بابو تمھارے قریبی عزیز ہیں۔ آرہا ہے سمجھ میں کچھ!"

"گن۔۔۔ گنیش بابو۔۔۔ میرے قریب۔۔۔ قریبی عزیز ہیں!" میں حیرت کی زیادتی کے سبب ہکلانے لگا کیوں کہ یہ راز کی بات تو خود مجھے بھی معلوم نہیں تھی۔ "لک۔۔۔ کیا۔۔۔ کہہ رہے ہیں سر! م۔۔۔ میں تو مسلمان ہوں۔ اگر۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو میرے ابا کو بُلا کر پوچھ لیں۔" پھر مجھے ایک دم چچا بندو خاں کا خیال آگیا، وہ بھی میرے مسلمان ہونے کی تصدیق کر سکتے تھے۔ یہی بات میں نے تیواڑی جی سے بھی کہہ دی، پھر بولا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے سر کہ۔۔۔ کہ کوئی ہندو میرا قریبی عزیز ہو؟"

"اللہ دتا! تم اپنی اوچھی حرکتوں سے۔۔۔"

"معاف کیجیے گا سر، اب میں اسے ڈی مہر بن چکا ہوں۔" میں تیواڑی جی کی بات کاٹ کر بولا۔ "آپ تو خود اپنے کانوں سے سُن چکے ہیں، سر تھامسن بھی مجھے اسے ڈی کہتے ہیں۔ اس سے قطع نظر۔۔۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی بات پوری کرتا، زور سے اُچھل پڑا اور اس اُچھال کا سبب تیواڑی جی کا ہاتھ تھا جو خیر میرے مُنہ پر تو نہیں، میز پر بڑی زور سے پڑا تھا اور پھر وہ گلا پھاڑ کر چیخے تھے۔ "چو۔۔۔ او۔۔۔ اوپ!"

کچھ دیر کمرے میں تیواڑی جی کے تیز تیز سانسوں کی آواز آتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی سانپ پھنکار رہا ہو۔ میں اُچھال مارنے کے بعد یوں ہی خوف زدہ سا بیٹھا تھا، اس پھنکار نے مزید ڈرا دیا۔ تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھوں کے ساتھ ساتھ ان کی ناک کے نتھنے بھی پھڑک رہے تھے۔

یا اللہ خیر، یا اللہ خیر! میں دل ہی میں کہہ رہا تھا۔

سانسوں کی پھنکار آہستہ آہستہ مدھم ہوئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ تیواڑی جی نے نئی سگریٹ سلگا لی تھی۔ غالباً انھوں نے اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر وہ ایک دم غصے سے کیوں اکھڑ گئے۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ کیا اپنا نام بتانا بھی جرم ہے؟ مگر ظاہر ہے میں یہ سوال ان سے نہیں کر سکتا تھا اس لیے "گُم صُم" بیٹھا رہا۔

"سنو!" دفعتاً تیواڑی جی بولے۔ "اگر تم احمق اور بے وقوف ہو تو ایک نہ ایک دن ضرور تمھیں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا اور اداکاری کرتے ہو تو یہ تمھیں بہت مہنگی پڑے گی۔ ڈی جی صاحب نے اگر وقتی طور پر مُنہ لگا لیا ہے تو کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں۔ سر اُٹھا کر چلنے والے ہمیشہ اوندھے مُنہ گرتے ہیں۔"

"مم۔۔۔ مجھے آپ کی بات پر یقین ہے سر!" میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ "آپ سر۔۔۔ ان باتوں کو چھوڑیں اور وہ بات کہیں جو کہہ رہے تھے۔"

"اگر مجھے ڈی جی صاحب کا خیال نہ ہوتا تو کھڑے کھڑے تمھیں نکال دیتا۔" تیواڑی جی "کفِ افسوس" مل رہے تھے۔ ان کا انداز خود کلامی جیسا تھا۔

"میں تو خود تنگ ہوں سر، اس نوکری سے، بس ذرا امی اور ابا کا خیال آجاتا ہے۔ پھر یہ سر، کہ میری شادی بھی ہونے والی ہے۔ آپ جانیں، شادی بیاہ کے لیے پیسوں کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے۔"

"کوئی اور ہو تو تمھاری اس طرح کی باتوں سے دھوکا کھا جائے مگر میں۔۔۔ میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں تم بہت 'بھیتر ے' ہو۔ بہ ظاہر تو یوں لگتا ہے کہ تم سے سیدھا اس دنیا میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا لیکن تمھاری اصلیت کا پتا لگ جائے تو آدمی تمھارے سائے سے بھی بھاگنے لگے۔" تیواڑی جی کافی دیر تک دل کے پھپھولے پھوڑتے رہے اور میں سر جھکائے سُنتا رہا۔ پھر بڑی دیر بعد وہ مطلب کی بات پر آئے اور مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ "تم اسی وقت میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے تھے، یہ میں جانتا ہوں۔ تم اتنے بھولے شاہ نہیں کہ گنیش بابو کو واقعی اپنا عزیز سمجھنے لگو، وہ تمھارے نہیں میرے عزیز ہیں۔" اس کے بعد تیواڑی جی نے سیدھے سیدھے لفظوں میں اپنا مطلب بیان کر دیا۔

پتا نہیں تیواڑی جی نے مجھے کیوں بوجھ بجھکڑ سمجھ لیا تھا۔ اگر وہ پہلے ہی بغیر کوئی "ڈریا ما پیلے" مجھ سے کہہ دیتے کہ دیکھو بھئی اسے ڈی، یہ سب کچھ جو میں کہہ رہا ہوں، فرضی باتیں ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تو مجھے کوئی انھوں نے کاٹا "ھتوڑئی" تھا جو میں ان سے خواہ مخواہ الجھتا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ مجھے کسی طرح سیٹھ عثمان کی تعمیراتی کمپنی میں "نوکر" رکھوانا تھا، اسی کے لیے تیواڑی جی نے یہ لمبا چوڑا چکر چلایا تھا۔ اس چکر در چکر کا مقصد یہ تھا کہ سیٹھ عثمان کو "چکرم" بنایا جا سکے، یعنی اسے شبہ نہ ہو کہ اس کی کمپنی میں مجھ جیسی کوئی "سفید بھیڑ" گھس گئی ہے۔

تیواڑی جی نے اپنے عزیز گنیش بابو کو سانٹ لیا تھا کہ وہ بہاری لال کے لیے سفارشی خط دے دیں۔ گنیش بابو اور بہاری لال کے اچھے تعلقات تھے۔ سیٹھ عثمان سے گنیش بابو کی براہِ راست زیادہ یاد اللہ نہیں تھی۔ بہاری لال اور سیٹھ عثمان میں گاڑھی چھنتی تھی اس لیے قوی امید تھی کہ سیٹھ عثمان، بہاری لال کی بات نہ ٹالتا۔ تیواڑی جی نے یوں "وایا بھٹنڈا" دُور سے ڈور ملائی تھی۔ انھوں نے گنیش بابو کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ "بے روزگار نوجوان" دراصل ان کے محکمے کا سینیئر افسر ہے۔ گنیش بابو نے بہاری لال کو خط میں لکھا تھا کہ سچدیو، یعنی میں ان کا قریبی عزیز ہوں اور سیٹھ عثمان کی کمپنی میں ملازمت کا خواہاں ہوں۔ بہاری لال جی مجھے نوکر رکھوا دیں۔ گویا مجھے ایک بے روزگار ہندو نوجوان سچدیو کا جھوٹا کردار ادا کرنا تھا۔

سار ی بات سُن کر اور سمجھ کر میں نے تیواڑی جی سے پوچھا "تو اس کا مطلب یہ ہوا سر، کہ مجھے بھیس بدلنا ہوگا؟"

"یہ بات پوچھنے کی ہے!" تیواڑی جی نے آنکھیں دکھانا چاہیں جو مجھے پہلے ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

"یہ اٹھاؤ لفافہ اور چلتے پھرتے نظر آؤ، زیادہ دماغ چاٹنے کی ضرورت نہیں۔" تیواڑی جی نے میز پر پڑا ہوا سفارشی خط اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے بہاری لال کے گھر کا پتا سمجھایا اور بولے "بہاری لال جی کی بیٹھک میں تقریباً دن بھر سبھا جمی رہتی ہے۔ وہ گھر سے کم ہی نکلتے ہیں، تم کسی بھی وقت ان سے مل سکتے ہو۔"

"بہتر ہے سر!" یہ کہہ کر میں اٹھا اور لفافہ جیب میں رکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تیواڑی جی کے کمرے سے نکل کر میں نے سوچا، پہلے بھیس بدل لوں، پھر ذرا لیوسی سے "پیچ" لڑاؤں گا۔ دیکھوں وہ مجھے پہچانتی ہے یا نہیں!

تربیت کے دوران ہی میں مجھے بھیس بھرنا سکھا دیا گیا تھا کہ کس طرح صورت کو بگاڑتے یا بناتے ہیں۔ کس طرح بھلے چنگے ہو کر لنگڑے لُولے بنتے ہیں اور کیسے آدمی، بوڑھے سے جوان، جوان سے بوڑھا نظر آنے لگتا ہے۔ پچکے ہوئے گال کس طرح پھلائے جاتے ہیں، آنکھوں اور بالوں کا رنگ بدلنے کے لیے کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں۔ میک اپ روم خاصا بڑا تھا اور وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ میک اپ روم کی دیکھ بھال کے لیے محکمے کی طرف سے باقاعدہ ایک شخص بھی مقرر تھا جو اپنا زیادہ تر وقت خوابِ خرگوش کے مزے لینے میں گزارتا تھا۔ میں نے اکثر اسے اونگھتے ہی دیکھا تھا۔ پتا نہیں، رات کو وہ کیا کرتا تھا کہ سونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ویسے وہ غریب بور ہو کر اگر اونگھتا نہ رہتا تو کیا کرتا۔ میک اپ روم میں جو بھی آتا تھا خود اپنے ہاتھوں اپنی مرمت کر کے چلا جاتا تھا، بس کبھی کبھار وہ شخص مذکور مناسب کپڑے "ڈھونڈنے ڈھانڈنے" میں ضرور مدد کر دیتا تھا۔ اس دن بھی جب میں میک اپ روم میں داخل ہوا تو وہ اپنا "فرض" ادا کر رہا تھا، یعنی اونگھ رہا تھا۔

میک اپ کرنے کے دوران میں مجھے کھونٹی پر لٹکی ہوئی ایک پی کیپ نظر آ گئی۔ میں نے وہ بھی سر پر رکھ لی۔ پی کیپ میں نے پہلی بار پہنی تھی۔ اس نے مجھے مزید ناقابلِ شناخت بنا دیا۔ میں آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اب کوئی مجھے اللہ دتا یا اسے ڈی مہر نہیں سمجھ سکتا تھا، میں گویا اب بہروپ بن چکا تھا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے اپنی جیبوں کا تمام سامان نکال لیا، سفارشی خط سمیت! ایک بار عین وقت پر بڑی ٹھیکی ہوئی تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے چکر میں غزل کا پرچہ کھو گیا تھا۔ غزل کھو جانے سے تو خیر زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا تھا لیکن سفارشی خط کھو جاتا تو تیواڑی جی مجھے کچا چبا جانے پر غور کرنے لگتے۔ "غور کرنا" میں یوں لکھ رہا ہوں کہ عملاً ایسا ناممکن ہے، محاورتاً تو کسی کو کچا چبایا جا سکتا ہے، سچ مچ نہیں۔

خفیہ کی عمارت کا ایک "بیک ڈور" بھی تھا۔ میک اپ روم غالباً بیک ڈور کے قریب اسی لیے بنایا گیا تھا کہ لوگ بھیس بدلیں اور ادھر سے چپ چاپ سرک لیں۔ وہ بیک ڈور نسبتاً ایک ویران سی گلی میں کھلتا تھا اور بہ وقت ضرورت ہی کھولا جاتا تھا۔ یہ ہدایات بھی تھیں کہ بھیس بھرنے کے بعد کوئی "بندہ بشر" بیرونی دروازہ استعمال نہ کرے مگر کوئی قانون بنانے یا ہدایت جاری کرنے کا مطلب بھلا یہ کب ہوتا ہے کہ اس پر عمل درآمد بھی ہو۔ خود میں نے کئی بار اس "ہدایت نامے" کی خلاف ورزی کی تھی اور کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ بچو، تیرے مُنہ میں کے دانت ہیں! یہی سبب تھا کہ میں بھیس بھرنے کے بعد بیک ڈور کا رُخ کرنے کی بجائے لیوسی سے ملنے چل دیا۔

لیوسی اس وقت نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی جب میں اس کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا اور زور سے "ہو" کی آواز نکالی۔ لیوسی اچھل پڑی اور میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ بگڑ کر بولی پھر میری طرف لمحے بھر کو حیرت سے دیکھا۔

"مجھے دکٹر نے تمھارے پاس بھیجا ہے۔" میں دانستہ بھاری آواز میں بولا تاکہ وہ مجھے پہچان نہ سکے۔

"بنو مت، میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔" لیوسی نے مُنہ بنا کر کہا "مجھے یہ بچکانہ حرکتیں پسند نہیں ہیں۔"

"میں کیا کہا؟ پہچان گئی ہو مجھے! یہ تو بُرا ہوا جب تم نے پہچان لیا تو پھر وہ بدبخت بھی ضرور پہچان لے گا۔" میرا اشارہ سیٹھ عثمان کی طرف تھا مگر لیوسی یہ اشارہ نہیں سمجھ سکی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میک اپ میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ ٹھہرو، میں ابھی آیا، گال پہ مَسّا لگا کر!"

میں مُڑنے ہی والا تھا کہ لیوسی بول اٹھی "میک اپ میں کوئی خامی نہیں، خواہ مخواہ ریس نہ لگاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم کس بدبخت کا ذکر کر رہے تھے!"

"ارے خامی نہیں تو تم نے پھر پہچانا کیسے؟" میں جھنجھنا کر بولا۔

"تمھاری ہنسی سے!" لیوسی مسکرا کر بولی "اس طرح بھونڈے ڈھنگ سے کوئی اور نہیں ہنس سکتا۔"

"بھونڈی ہوگی تم بلکہ مہا بھونڈی!" میں بُرا مان گیا۔

"کاش ایسا ہوتا۔" خلافِ توقع لیوسی سنجیدہ ہو گئی۔ یہ الفاظ کہنے سے پہلے اس نے ایک عدد آہ بھی بھری تھی۔

"اے یہ کون سی بڑی بات ہے!" میں نے مفت مشورہ پیش کیا "چلو ابھی میرے ساتھ میک اپ روم میں، دو منٹ میں صورت بگاڑ دوں گا۔ اگر کوئی مرد تمھاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے تو جو چور کی سزا وہ میری!" یہ کہتے ہوئے یقین دلانے کے لیے میں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

لیوسی میری بات سن کر عجیب سے انداز میں مسکرائی، پھر بولی۔

"خیر چھوڑو اس بات کو! بیٹھو گے بھی یا یونہی کھڑے رہو گے!"

"میں تو ادھر بس تمھیں تھوڑا سا 'حیران' کرنے نکل آیا تھا مگر تم تو 'حیران' ہی نہیں ہوئیں، اب کیا فائدہ بیٹھنے سے! یوں بھی مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے۔" میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں بتایا کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہوں تاکہ تھوڑا سا تجسس پیدا ہو اور میں اسے کچھ سُنا سکوں مگر اس نے میری امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔

"اچھا تو پھر جاؤ، یوں بھی میں کچھ دیر تنہا بیٹھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ دکٹر اب میرے لیے مصیبت بنتا جا رہا ہے۔"

میں نے لیوسی کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "تم یہ نہیں پوچھو گی کہ میں نے یہ بھیس کیوں بھرا ہے اور کہاں جا رہا ہوں؟"

"میں اگر پوچھوں گی بھی تو تم کون سا بتا دو گے! اس لیے وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل!"

"اچھا تو مت پوچھو، میں بھی تمھاری خوشامد نہیں کر رہا کہ پوچھ ہی لو!" میں بگڑ کر بولا۔ کم بخت کسی طرح "سُننے" پر آمادہ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

جواب میں لیوسی کچھ نہیں بولی۔ اب وہاں رُکنا فضول تھا اس لیے میں نے دروازے کا رُخ کیا۔

لیوسی کے کمرے سے نکل کر میرا ذہن گنیش بابو، بہاری لال اور سیٹھ عثمان کے درمیان ہچکولے کھانے لگا۔ تیواڑی جی نے سیٹھ عثمان تک پہنچنے کے لیے سیڑھی تو لگا دی تھی مگر اس ظالم سے ایک ہی ملاقات مجھے مہنگی پڑی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے مجھے "پھرکنی" کی طرح گھومنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اوکھلی میں سر دینے سے پہلے کم از کم اوکھلی کی گہرائی تو مجھے دیکھ ہی لینا چاہیے تھی۔ میری نظر میں سیٹھ عثمان بہرحال خطرناک آدمی تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا، پولیٹیکل برانچ کی بدروح، یعنی کنور شاکر علی نے گزشتہ روز کہا تھا کہ سیٹھ عثمان کی فائل بھی کھلی ہوئی ہے۔ اس فائل کا مطالعہ میرے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ اس فائل کے مطالعے سے کم از کم مجھے اتنا تو پتا چل جاتا کہ سیٹھ عثمان ہے کیا شے!

پھر میرے قدم جیسے خود بہ خود پولیٹیکل برانچ کی طرف اٹھ گئے۔

کنور شاکر علی کے پی اے نے ایک پرچی پر مجھ سے میرا نام لکھوا کر چپراسی کے ذریعے اندر بھجوایا اور مجھے عجیب سے انداز میں گھورنے لگا۔ پرچی اندر بھجوانے سے پہلے اس نے پڑھی بھی تھی

جس پر میں نے "اے ڈی مہر سینئر انسپکٹر سی آئی ڈی کرائمز برانچ" لکھا تھا۔ کنور صاحب کا پی اے شاید "سینئر" پر کچھ کھٹکا تھا۔ اس نے غالباً اتنا کم عمر "سینئر" پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔

کچھ دیر بعد جب کنور صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلوالیا

اور میں ان کی طرف بڑھا تو وہ بغیر پلک جھپکائے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر جب میں ان کی میز کے قریب پہنچ گیا تو مجھ سے بیٹھنے کے لیے کہنے کی بجائے سرد لہجے میں بولے "تم میک اپ میں ہو؟"

"جی سر!" میں نے دانت نکال دیے۔

"دفتر میں کیا ضرورت پیش آگئی میک اپ کی؟" انھوں نے دوسرا سوال کیا۔ ان کا لہجہ اب بھی سرد تھا۔

میں نے ان کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ سر! میں... میں دفتر میں... میرا مطلب ہے کہ دفتر سے جا ہی رہا تھا کہ ایک بات یاد آگئی۔"

"کہو!" لہجہ حکمیہ تھا۔

"آپ نے کل کہا تھا کہ آپ کی برانچ میں سیٹھ عثمان کی فائل بھی ہے۔ مجھے دراصل وہی فائل ایک نظر دیکھنا تھی۔" میں نے جلدی سے اپنا مقصد بیان کر دیا تاکہ وہاں اس بدروح کے ساتھ زیادہ دیر نہ رہنا پڑے۔

"ہوں!" کنور شاکر علی نے ہنکارا مارا، پھر بولے۔ "ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپراسی کمرے میں آیا تو انھوں نے انسپکٹر وسیم کو بلانے کا حکم دیا پھر ہاتھ اٹھا کر مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

میں اجازت پا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کنور شاکر علی اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک فائل کھول کر پڑھنے لگے۔ وہ اس طرح فائل پڑھ رہے تھے جیسے کمرے میں تنہا ہوں۔

کچھ دیر بعد ایک متوسط عمر کا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ پھر جب تک وہ کنور صاحب کی میز کے قریب نہ پہنچ گیا، کنور صاحب نے اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس شخص کے سلام کا جواب بھی کنور صاحب نے اس طرح دیا جیسے [illegible] مار رہے ہوں۔

"انھیں اپنے ساتھ لے جاؤ اور سیٹھ عثمان کی فائل نکال کر دے دو۔ یہ فائل پڑھ کر تمھیں واپس کر دیں گے اسی وقت!" کنور صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر وسیم سے کہا۔

"بہتر ہے سر!" انسپکٹر وسیم نے جواب دیا اور [illegible] غور سے دیکھا۔

"جاؤ!" کنور صاحب مجھ سے مخا[illegible]ب ہوئے۔

"شکریہ سر!" میں نے کہا اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کنور صاحب کے کمرے سے نکلتے [illegible] سوچ رہا تھا کہ وہ عجیب آدمی ہیں۔ نہ تو انھوں نے [illegible]

تھا اور نہ ہی مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ میں، سیٹھ عثمان کی فائل کیوں دیکھنا چاہتا ہوں۔ انسپکٹر وسیم نے بھی ان سے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ [illegible] صاحب سے بہت ہی ڈرتا تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو چاہے دبی زبان ہی سے سہی پوچھتا ضرور کہ جسے فائل دینے کا حکم صادر کیا گیا ہے آخر وہ ہے کون بلا! میں نے سوچا کہ شاید راستے میں تعارف کی رسم ادا ہو جائے گی مگر انسپکٹر وسیم نے تو جیسے نہ بولنے کی قسم کھا لی تھی۔ اس کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ سادام نے شیکھر کے نام جو خط لکھا تھا، اس میں انسپکٹر وسیم کا ذکر تھا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ شیکھر، یعنی "پاکٹ سائز" اسی کی ماتحتی میں تھا اور پھر میرا خیال درست ہی ثابت ہوا۔

انسپکٹر وسیم مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ وہاں شیکھر کے علاوہ مجھے ایک اور شخص بھی نظر آیا۔ وہ دونوں الگ الگ میزیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں ہی انسپکٹر وسیم کی ماتحتی میں ہوں گے۔ وسیم کی میز درمیان میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس میز کے سامنے ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ وسیم کے اشارے پر میں نے کرسی سنبھال لی۔

اسی کمرے میں موجود ایک آہنی الماری کا تالا کھول کر وسیم نے ایک فائل نکالی اور میری طرف بڑھ آیا۔ اس کمرے میں شیکھر بھی موجود تھا مگر اس نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سرسری سی ایک نظر ڈال کر پھر اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ [illegible] میں نے بھی اب تک دانستہ لب لینے سے گریز کیا تھا تاکہ شیکھر مجھے آواز سے نہ پہچان لے۔

"یہ لیں۔" انسپکٹر وسیم نے فائل میری [illegible] میں نے فائل لے لی اور انسپکٹر [illegible] کرسی پر جا بیٹھا۔

میں ابھی فائل کھول کر پہلا صفحہ ہی پڑھنے والا تھا کہ اس طرح اچھل پڑا جیسے کھٹمل نے کاٹ لیا ہو۔ انسپکٹر وسیم نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا اور شاید کچھ کہا بھی تھا۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر ہی میں اتنا حیرت زدہ ہو گیا تھا کہ اس بات پر توجہ ہی نہ دے سکا جو اس نے کہی تھی۔ میں نے [illegible] پر لعنت بھیجتے ہوئے فوراً پوچھا کہ وہ [illegible] میک اپ کے باوجود کس طرح پہچان [illegible] رہا تھا!

"کیوں! کیا ڈی آئی جی صاحب کے پی اے سے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کے پاس اندر کون بیٹھا ہے!" انسپکٹر وسیم کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔ "ویسے تمھاری آواز بھی میں نے سنی تھی اور جب تم میرے ساتھ ڈی آئی جی صاحب کے کمرے سے نکل رہے تھے تو میں تمھارے پیچھے چل رہا تھا۔ تمھیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ تمھاری چال ذرا مختلف ہے۔ معاف کرنا، تمھاری چال میں کچھ کچھ نسوانیت سی ہے۔ خیر تم اپنا کام کرو، مجھے بھی ایک رپورٹ لکھنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص کی جیب سے پین نکالا۔

اس کم بخت وسیم نے مجھے میری چال کے بارے میں بتا کر اور دہلا دیا تھا مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میری آواز تو وہ اس وقت پہچانتا جب پہلے بھی کبھی سنی ہوتی اور چال کا معاملہ بھی یہی تھا۔ اس نے مجھے کب اور کہاں چلتے دیکھا تھا؟ میں نے آخر اپنی الجھن کم کرنے کی خاطر دل کی بات اس سے کہہ دی۔

"میرا خیال ہے کہ تم فضول باتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو مگر خیر سننا ہی چاہتے ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ جب تم چار اپنے ہوئے تھے تو میں بھی تمھارے 'چارہ گردں' میں تھا۔ سمجھے کچھ یا نہیں!"

"اچھا اب میں سمجھا!" میں سر ہلا کر بولا۔ "تم بھی بھیس بدلے ہو گے، اس وقت؟"

"کچھ باتیں پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں اور انھیں پوچھنا حماقت کہلاتا ہے۔" انسپکٹر وسیم نے مجھ پر ایک اور حملہ کیا۔

اب تک میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر رہا تھا کہ چلو چھوڑو، پہلی ملاقات ہے، معاف کر دو مگر وہ پھیلے ہی چلا جا رہا تھا۔ میں اسی لیے کسی قدر درشت لہجے میں بولا۔ "زیادہ قابلیت چھانٹنے کی ضرورت نہیں، ہاں! تجو! تم نے مجھے پہچان کیا لیا کہ آسمان میں تھیگلی لگانے کے دعوے ہونے لگے! اب طنز و تنز نہ کرنا، میں سب باتیں سمجھتا ہوں، ہاں!"

انسپکٹر وسیم کو شاید مجھ سے یہ توقع نہ رہی ہوگی کہ میں گھونسے کا جواب گھونسے سے دوں گا۔ وہ لمحے بھر کو حیران سا رہ گیا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ "تم اس وقت میرے کمرے میں ہو، میں نہیں چاہتا کہ کوئی تلخی ہو، اس لیے بہتر یہی ہے کہ فائل پڑھو، فائل!"

میری دانست میں اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اس لیے میں نے اسے بخش دیا ورنہ غصے کو وہ کھری کھری سنا تا کہ کبھی نہ بھولتا۔ میں نے فائل کا مطالعہ کرنے سے پہلے چور نظروں سے شیکھر کی طرف دیکھا اور اسے بھی اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر جلدی سے دوبارہ فائل پر نگاہ جما دی۔ اس سے لیوسی کے سلسلے میں میری یوں ہی رقابت چلی آ رہی تھی، اگر وہ بھی "میدان جنگ" میں کود پڑتا تو لامحالہ مجھے پسپا ہو کر راہِ فرار اختیار کرنا پڑتی۔

فائل میں سیٹھ عثمان کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، وہ میرے ذہن پر نقش ہوتا چلا گیا۔ مجھے فائل کے مطالعے میں تقریباً گھنٹہ بھر لگ گیا۔ میں نے فائل بند کر کے انسپکٹر وسیم کے سامنے میز پر رکھی اور بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف نگاہ اٹھائی مگر میں اسے لفٹ دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میری پھٹ پھٹ چونکہ سرکاری تھی اس لیے احتیاطاً میں نے اسے دفتر ہی میں چھوڑ دیا اور ایک یکے میں بیٹھ کر موری گیٹ کے لیے روانہ ہو گیا تاکہ بہاری لال سے مل سکوں۔ دفتر کی عمارت سے باہر جانے کے لیے بھی میں نے بیک ڈور ہی استعمال کیا تھا۔

سیٹھ عثمان کا کچا چٹھا اب میرے سامنے تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہاتھیوں سے گنّے کھانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا واقعی آسان نہیں تھا، سر تھامسن نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ وہ تو وہ اس کم بخت کے آباء و اجداد تک انگریزوں کے وفادار غلام رہے تھے اور اس وفاداری کے ثبوت میں اپنے ہی ہم وطنوں کا گلا کٹوانے میں بھی انھیں شرم نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے سیٹھ عثمان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا جو آئندہ میرے کام آسکتا تھا۔

موری گیٹ پہنچ کر میں نے بہت جلد بہاری لال کا گھر ڈھونڈ لیا۔ یوں بھی وہ مشہور آدمی تھا، اگر تیواڑی جی مجھے اس کا پتا صحیح نہ بھی بتاتے تو بھی اس کا گھر تلاش کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آتی۔

وہ دو منزلہ مکان تھا جس کے نچلے حصّے میں بڑی سی بیٹھک تھی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے اندر موجود افراد کے "قہقہانے" کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں کچھ جھجکتا ہوا سا آگے بڑھا اور بیٹھک کے دروازے پر قدم رکھا۔ اندر نشست فرشی تھی جو لوگ بھی وہاں موجود تھے، وہ دروازے کے قریب جوتے اتار کر گئے تھے۔ اندر گدّے پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور دیواروں کے ساتھ ساتھ ذرا فاصلے سے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ دائیں جانب چار افراد گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بے ترتیب سے اوندھے سیدھے لیٹے اور بیٹھے تھے۔

مجھے دروازے پر کھڑا ہوا دیکھ کر "قہقہاہٹ" بند ہوگئی، پھر کسی نے کہا "کون ہے بھائی؟ کس سے ملنا ہے؟"

"بہاری لال جی سے!" میں نے بلند آواز میں جواب دیا کیونکہ وہ لوگ ذرا فاصلے پر تھے۔

"تو پھر جوتے اتار کر آجاؤ اندر!" وہی آواز پھر آئی۔

میں نے جھک کے جوتے اتارے اور پھر ان لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں ایک شخص کے سوا بقیہ سب دھوتی بند تھے۔

میں ان لوگوں کے قریب پہنچا تو ایک دھوتی بند جو گاؤ تکیے پر کہنی ٹکائے نیم دراز سا تھا، اپنی ران کھجاتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا "بیٹھو، میرا ہی نام بہاری لال ہے۔ کیا بات ہے؟"

وہ شخص پتلا دبلا سا تھا۔ رنگ سانولا تھا اور اس کی آنکھیں میلی میلی سی تھیں۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے میں نے جیب سے لفافہ نکال لیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے کہا "میرا نام سہدیو ہے اور مجھے گنیش بابو نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ گنیش بابو میرے قریبی عزیز ہیں۔"

"اچھا!" یہ کہتے ہوئے بہاری لال پُراسرار سے انداز میں مسکرایا اور لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا، پھر وہاں موجود افراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "سُنا تم لوگوں نے، یہ جوان، گنیش بابو کا قریبی عزیز ہے۔" اس کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا جیسے میں نے گپ ہانکی ہو یا گنیش بابو گورنر لگے ہوں جن سے قریبی رشتے داری بتا کر میں اپنی عزت میں چار چاند لگانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔

میں نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے بہ مشکل کہا "جناب، آپ خود ان کا خط پڑھ لیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

"ارے تم کیوں جھوٹ بولنے لگے!" بہاری لال کا لہجہ اب بھی معنی خیز تھا۔

اِدھر بہاری لال لفافہ کھولنے لگا، اُدھر میرے کندھے پر پیچھے سے کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں چونک اٹھا اور مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص وہیں پہلے سے موجود افراد میں سے ایک تھا۔

"سنو!" اس شخص نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا "ذرا ادھر آؤ۔ بہاری لال جی کو خط پڑھنے دو، اتنے تم مجھ سے دو باتیں کرلو۔"

"مگر کیوں کرلوں میں دو یا تین باتیں؟" میں چڑ کر بولا۔ اس شخص کی بے تکلفی مجھے قطعی پسند نہیں آئی تھی۔

"تم سنو تو سہی نا!" اس شخص کے لہجے سے جھنجلاہٹ کا اظہار ہونے لگا۔

"سن لو بھائی سن لو!" معاً بہاری لال مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی بات نہ سن کر تمھیں پچھتانا پڑے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بہاری لال کے دانت پھر باہر آگئے۔ پتا نہیں اُسے دانتوں کی نمائش کا شوق کیوں ہو رہا تھا۔

بہاری لال سے میری غرض وابستہ تھی اور اب وہی اس اجنبی شخص کی بات سننے کے لیے کہہ رہا تھا اس لیے میں نے ہتھیار ڈال دینا غنیمت جانا۔ ویسے بہاری لال کا عجیب و غریب رویّہ میرے لیے تھا بہت غیر متوقع! اس کے رویّے نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔

میں کھسک کر اجنبی شخص کے پاس جا بیٹھا تو وہ میری طرف جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے بولا "تمھیں تیواڑی جی نے بھیجا ہے؟"

اس اجنبی سے تیواڑی جی کا ذکر سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔

اجنبی نے میری گھبراہٹ کو شاید محسوس کر لیا اور کہا "گھبراؤ مت! جو پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب دو۔"

اسی وقت بہاری لال کی آواز سنائی دی "یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں!" پھر وہ ہنس پڑا "یہ لطیفہ بھی زندگی بھر یاد رہے گا۔"

میں عجیب گو مگو کے عالم میں تھا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ میں نے اس تذبذب کی کیفیت سے نکلنے کے لیے اجنبی کو نظر انداز کرتے ہوئے بہاری لال کو مخاطب کیا "جناب! گنیش بابو کا خط آپ نے پڑھ لیا، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"پہلے میں گنیش بابو سے پوچھ تو لوں کہ تم واقعی ان کے قریبی عزیز ہو کہ نہیں!" بہاری لال کے ہونٹوں پر بہ دستور مسکراہٹ تھی۔

"تو کیا آپ کو ان کا خط پڑھ کر بھی یقین نہیں آیا؟" میں نے تپ کر کہا۔

"ہاں، بات کچھ ایسی ہی ہے کہ اس کی تصدیق کرنا پڑے گی۔" بہاری لال نے جواب دیا۔

"ذرا خط مجھے تو دکھاؤ۔" اسی اجنبی نے بہاری لال سے کہا جس نے مجھ سے بے تکلفی کا اظہار کیا تھا۔

"میں تحریر پہچانتا ہوں، کیا کرو گے دیکھ کر! تمھارا ہی خط ہے۔" بہاری لال نے اجنبی کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں بھونچکا سا ہو کر کبھی بہاری لال کو اور کبھی اجنبی کو دیکھنے لگا۔ بہاری لال کی بات کا مقصد سمجھنے میں مجھے چند لمحے تو لگے مگر سمجھ ضرور گیا۔ میں جو سفارشی خط لے کر بہاری لال کے پاس آیا تھا، وہ اسی اجنبی کا تھا، گویا اسی اجنبی کا نام گنیش بابو تھا۔ اب میں سمجھ گیا، بہاری لال پُراسرار انداز میں کیوں مسکرایا تھا، یہ سن کر کہ میں گنیش بابو کا قریبی عزیز ہوں۔ قریبی عزیز بہ ہر حال ایک دوسرے کے لیے اس طرح اجنبی نہیں ہوتے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ گنیش بابو، تیواڑی جی کے رشتے دار ہیں۔ غالباً گنیش بابو اسی لیے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ مجھے تیواڑی جی نے تو نہیں بھیجا۔ انھیں لازماً وہ سفارشی خط یاد آگیا ہوگا جو تیواڑی جی نے ان سے بہاری لال کے نام لکھوایا تھا۔

میری حیرت زدگی کے دوران میں گنیش بابو، بہاری لال کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے اور اب اسی سے مخاطب تھے "یار، تم تو جانتے ہی ہو، سفارشی خطوں کا قصہ! جب تک سفارش کرنے والا یہ نہ لکھے کہ وہ 'سفارشی' کا قریبی عزیز ہے، بات بنتی نہیں۔ میں نے کہا بھی تھا کہ خود تم سے اس نوجوان کے لیے کہہ دوں گا، خط کی کیا ضرورت ہے، ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے مگر وہ مانے ہی نہیں اور مجھ سے کہا، فوراً خط لکھ دوں۔"

"کون نہیں مانے؟" بہاری لال نے دریافت کیا۔

"تم خود بھی جانتے ہو انھیں، کئی بار ان کا ذکر کر چکا ہوں، وہ خفیہ میں ہیں، بڑے عہدے پر!" گنیش بابو مرعوب کرنے والے انداز میں بولے۔

"وہ تو نہیں تیواڑی جی؟" بہاری لال انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں وہی!" گنیش بابو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل انھیں تمھارے اثر و رسوخ کا پتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارے اور میرے درمیان کیسے تعلقات ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو سمجھو میں سیٹھ عثمان کے نام خط لکھ کر ابھی دیے دیتا ہوں۔" بہاری لال بولا، پھر ہنس کر کہا "مگر میں اس نوجوان کو یہ لکھ کر نہیں دوں گا تمھاری طرح کہ یہ میرا قریبی عزیز ہے۔"

بہاری لال کی بات سن کر میرے سوا سبھی ہنس پڑے۔ مجھے اس کم بخت بہاری لال پر بھی غصّہ آرہا تھا اور تیواڑی جی پر بھی جنھوں نے مجھے تماشا بنوا دیا تھا۔ بہاری لال برابر میرا مذاق اُڑائے جا رہا تھا اور میں اس کے مذاق کا نشانہ بننے پر مجبور تھا۔

چند لمحے بعد بہاری لال اٹھا اور اندر چلا گیا۔ بیٹھک کا ایک دروازہ اندر کی طرف بھی کھلتا تھا، بہاری لال اسی دروازے سے اندر گیا تھا۔

میں ڈر رہا تھا کہ کہیں گنیش بابو میرا انٹرویو لینا شروع نہ کر دیں، میں تیواڑی جی کو کیسے جانتا ہوں؟ کہاں رہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میرے خوف کا سبب یہ تھا کہ ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ بھی فرض نہیں کیا تھا مگر گنیش بابو نے مجھے گھاس نہیں ڈالی۔ گنیش بابو وہاں موجود بقیہ دونوں افراد پر رعب "پیلنے" میں مصروف تھے۔ گنیش بابو ان دونوں کو بتا رہے تھے کہ ان کے عزیز و اقارب بہت بڑے بڑے عہدوں پر لگے ہوئے ہیں۔ اسی دوران میں بہاری لال دوبارہ بیٹھک میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھا۔

"کیا لکھا ہے، ذرا دکھانا!" گنیش بابو، بہاری لال کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

"بند کر دیا میں نے۔" بہاری لال نے جواب دیا۔ "ویسے تم فکر نہ کرو، کام ہو جائے گا۔"

"خیر فکر کی تو کوئی بات نہیں۔ بس ذرا یہ ہے کہ کل کلاں کو ہم لوگوں کا کام بھی پڑ سکتا ہے۔ تعلقات بنے رہیں تو وقت پر کام آتے ہیں۔" گنیش بابو بولے۔

بہاری لال نے مجھے لفافہ تھما دیا اور بولا "تم بھی مطمئن رہو، تمھیں نوکری مل گئی سمجھو لیکن لفافہ کھول کر نہ پڑھنا! ویسے بھی یہ بُری بات ہے کسی کا خط کھول کر نہیں پڑھتے۔"

میں نے اقرار میں گردن ہلا کر کہا "ٹھیک ہے جناب، میں لفافہ نہیں کھولوں گا۔" یہ کہہ کر میں اٹھنے لگا۔

"تم کچھ خیال نہ کرنا، میں نے یہ بات بس یوں ہی کہہ دی تھی احتیاطاً! ورنہ ظاہر ہے تم ایسا کیوں کرنے لگے۔ دراصل بات یہ ہے کہ..."

کی فطرت ہے کہ جو بات چھپی ہو، وہ اُسے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر میں نے گنیش بابو اور بہاری لال کا شکریہ ادا کیا اور ہوتے پہن کر باہر آگیا۔

اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے اور میری آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اللہ کے فضل سے مَیں تو مسلمان ہوں، اس صورت میں اگر میری آنتیں قل ہو اللہ پڑھتی ہیں تو جائز ہے مگر ایسے مواقع پر ان بدبخت غیر مذہبوں کی آنتیں کیا پڑھتی ہوں گی؟ میں اسی سوچ بچار میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے آنتوں کی فریاد سن لی جائے، اس کے بعد سوچا جائے گا، کدھر کا رُخ کیا جائے۔ کچھ دور چل کر سڑک کے کنارے مجھے ایک چھوٹا سا بھٹیار خانہ نظر آگیا۔

کھانا کھا کر میں نے دو گلاس پانی "سوتا" تو آنکھوں میں کچھ تراوٹ آئی، اسی کے ساتھ سیٹھ عثمان کی خبیث صورت بھی میری آنکھوں میں گھومنے لگی۔ مجھے اب بہاری لال کا خط لے کر اسی کے پاس جانا تھا۔ سیٹھ عثمان کے خیال کے ساتھ بہاری لال کا سفارشی خط مجھے یاد آیا، پھر بہاری لال کے کہے ہوئے فقرے میری سماعت میں گونجنے لگے۔ مجھے نہ جانے کیوں کچھ خطرے کا سا احساس ہو رہا تھا۔ گنیش بابو کا بہاری لال کے یہاں ملنا کچھ اچھا نہیں ہوا تھا، پھر تیواڑی جی اور ان کے حوالے سے سی آئی ڈی کا ذکر بھی مجھے کھلا تھا۔

میں سوچنے لگا، پتا نہیں بہاری لال نے سیٹھ عثمان کو کیا لکھا ہوگا؟ سیٹھ عثمان سے ملتے ہوئے ویسے ہی میری ہوا اُڑ رہی تھی، سی آئی ڈی کے ذکر نے اور رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ پھر مجھے بہاری لال کی نصیحت یاد آئی۔ آخر اس نے مجھ سے لفافہ نہ کھولنے کے لیے کیوں کہا تھا؟ اس سوچ بچار کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے جیب سے لفافہ نکال کر آہستہ آہستہ کھول ہی لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی تو دوبارہ لفافے کو بند کر دوں گا یا دوسرا لفافہ خرید کر خط اس میں رکھ دوں گا۔ خط اردو ہی میں لکھا گیا تھا، میں پڑھنے لگا۔

سیٹھ!

اس نوجوان کو تمھاری کمپنی میں کوئی نوکری چاہیے۔ نوکری تو تم خیر اسے دے دو کیوں کہ میرے ایک دوست نے اس کی سفارش کی ہے مگر اس سے چوکنا رہنا۔ سی آئی ڈی والے تیواڑی جی کو تم شاید جانتے ہوگے۔ میری معلومات کے مطابق وہ سی آئی ڈی میں ڈی آئی جی لگے ہوئے ہیں۔ اس نوجوان کو تمھاری کمپنی میں وہی نوکر رکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسی لیے کچھ کھٹک گیا ہوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ان لوگوں کی نہ دوستی اچھی، نہ دشمنی! بہرحال اپنے معاملات کو مجھ سے بہتر تم سمجھ سکتے ہو۔ کبھی فرصت ملی تو ملنے آؤں گا۔ تمھارا: بہاری لال

خط پڑھ کر میرے دل میں ہَول سا اٹھا۔ اگر میں یہ خط لے کر سیٹھ عثمان کے پاس چلا جاتا تو کیا ہوتا؟ جس بات کو چھپانے کے لیے اتنا لمبا چوڑا چکر چلایا گیا تھا، وہ بالآخر سیٹھ عثمان کو پتا چل جاتی۔ خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ اسی نے تو میرے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی کہ میں خط کھول کر پڑھ لوں ورنہ میں

تو سیدھا سیٹھ عثمان کے پاس جا رہا تھا۔

تیواڑی جی نے آج مجھے کچھ زیادہ ہی ڈانٹا پھٹکارا تھا۔ بہاری لال کا خط پڑھنے کے بعد اب میرے ذہن میں انتقامی کارروائی کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ یہ خط اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ تیواڑی جی کا منصوبہ قطعی "ٹھنڈا" ہو چکا تھا۔ اگر میں یہ خط، مسٹر تھامسن کے سامنے لے جا کر رکھ دوں تو تیواڑی جی کی "ممّیا" مر جائے۔ میں نے سوچا۔ مسٹر تھامسن ہی کے حکم پر انھوں نے مجھے سیٹھ عثمان کی کمپنی میں نوکر رکھوانے کا منصوبہ بنایا ہوگا، یہ بات صاف ظاہر تھی۔ اب اگر کسی سبب تیواڑی جی تعمیلِ حکم نہ کر پاتے تو موردِ الزام ٹھہرتے۔

میں بہاری لال کا خط جیب میں رکھنے کے بعد کھانے کے پیسے ادا کر کے بھٹیار خانے سے نکل آیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور اچھوتا خیال آیا۔ اگر میں خود کسی طرح سیٹھ عثمان کی تجارتی کمپنی میں نوکری حاصل کر لوں تو مزا ہی آ جائے۔ تیواڑی جی کی ساری شان دھری رہ جائے۔ مجھے اپنی کامیابی کی امید تو نہیں تھی مگر پھر بھی میں چاندنی چوک کے لیے ایک یکے میں بیٹھ گیا۔ سیٹھ عثمان کی تجارتی کمپنی کا دفتر، چاندنی چوک ہی میں تھا۔ یہ بات مجھے سیٹھ عثمان کی فائل پڑھ کر معلوم ہوئی تھی۔

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان کا کردار تو بغیر کسی سفارشی خط کے بھی بہ خوبی ادا کیا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں دسویں جماعت تک پڑھنے کو بھی بہت سمجھا جاتا تھا۔ میں انگریزی بول سکتا تھا، پڑھ سکتا تھا اور لکھ بھی سکتا تھا اس لیے اپنے طور پر نوکری کی کوشش ممکن تھی۔

مَیں سیٹھ عثمان کے دفتر جاتے ہوئے یوں بھی مطمئن تھا کہ وہ وہاں جھانکتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی "نجماؤں" اور شاہینوں ہی میں مست تھا۔ سارا کاروبار اس نے اپنے ملازموں پر چھوڑ رکھا تھا۔ ایسی صورت میں یقیناً اس کے ملازموں کو بھی کچھ نہ کچھ اختیارات تو ہوں گے ہی! میں اسی توقع پر اس کے دفتر جا رہا تھا۔ سیٹھ عثمان کا منیجر رگھوناتھ ہے پتا تھا مگر اس کے بعد بھی کوئی نہ کوئی تو کام سنبھال ہی رہا ہوگا۔ میں اس سے مل سکتا تھا۔

سیٹھ عثمان کے دفتر کو دیکھ کر قطعی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کسی غلام ہندوستانی کا دفتر ہوگا۔ وہاں کی ہر شے سے "امیریت" ٹپک رہی تھی۔ میرا سامنا اس شخص امین الدین قادری سے ہوا، جس سے مجھے نوکری کے سلسلے میں ملنا پڑا۔ امین الدین قادری، رگھوناتھ کا ماتحت یعنی نائب منیجر تھا۔ اس کا کمرہ بھی رگھوناتھ کی طرح الگ تھا جس کے باہر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، عہدے سمیت!

دفتر میں چپراسی سمیت کوئی دس بارہ افراد ہوں گے جن میں تین عدد لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو دیکھ کر میں سخت بور ہوا تھا، مرگھٹیاں سی، بدشکل سی! انھیں دیکھ کر یہ پتا چلتا تھا کہ نوکری پر چڑھانے سے پہلے یہ خیال رکھا گیا ہوگا کہ ان کا "رِق زدہ" نظر آنا ضروری ہے۔ انھیں ایک بار دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی ہوس بالکل پیدا نہیں ہوتی تھی۔ انھی میں سے ایک امین الدین قادری کے کمرے سے قریب ہی میز کرسی بچھائے گویا سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میں نے جو "بہاریں" سیٹھ عثمان کی کوٹھی پر دیکھی تھیں، ان کا دور دور پتا نہیں تھا۔ سیٹھ عثمان کی بدذوقی پر مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی مگر بعد میں یہ حیرت ختم ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ دن بعد پتا چل گیا تھا کہ یہ "کارنامہ" بھائی امین الدین کا تھا۔

سیکرٹری صاحبہ کے کہنے پر میں نے اپنا نام انھیں لکھ کر دے دیا۔ نام لکھنے کے لیے چھپا ہوا کاغذ انھوں نے ہی مجھے دیا تھا۔ مجھے سیکرٹری صاحبہ کے پاس چپراسی نے پہنچایا تھا۔

"آپ نے اس پر اپنا نام تو خیر لکھ دیا مگر ملاقات کا سبب نہیں لکھا۔" سیکرٹری صاحبہ مُنہ سے کم اور ناک سے زیادہ بولیں۔ بولنے کے لیے وہ مُنہ کے ساتھ ساتھ شاید اپنی ناک کا استعمال بھی ضروری سمجھتی تھیں۔

"آپ خود ہی کچھ بھی لکھ دیں۔" میں جان چھڑانے کے لیے بولا۔

میری بات سن کر اس نے اپنی "پٹ بیجنا" جیسی آنکھیں اٹھائیں اور حیرت سے بولی۔ "ملاقات آپ کو کرنا ہے، میں کیسے کچھ لکھ دوں!"

پھر مجھے مجبوراً ملاقات کے سبب کا خانہ پُر کرنا ہی پڑا۔ اس نے وہ سلپ، چپراسی کے ہاتھ اندر بھیج دی۔ اس نے سلپ اندر بھیجنے سے پہلے اس پر ایک نظر ڈال کر ٹھنڈا سانس بھرا تھا، پھر مجھ سے "انٹرویو" لینے لگی تھی۔ کچھ دیر تو میں اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا، پھر بور ہونے لگا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہہ ہی دیا۔ "کچھ باتیں ان کے لیے بھی تو چھوڑ دیں جو اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

وہ میرا جواب سن کر یقیناً کھول ہو گئی کیوں کہ اس کے بعد اسے چُپ لگ گئی تھی۔ دفتر کا کرتا دھرتا ایک مسلمان تھا، یہ سوچ کر میں نے خود کو مسلمان بچہ ہی ظاہر کرنا، مناسب خیال کیا تھا۔ یوں بھی خواہ مخواہ اچھے بھلے مسلمان کی بجائے خود کو کافر ظاہر کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے سلپ پر اپنا نام امین الدین کی رعایت سے متین الدین لکھا تھا۔ میرے جسم پر لباس ایسا تھا کہ بہ آسانی میں چولا بدل سکتا تھا۔ اب میں گٹ پٹ کر تھوڑی بہت عقل پکڑ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی امین الدین قادری نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے سیٹھ عثمان سے ہرگز یہ

توقع نہیں تھی کہ اس نے اپنے دفتر میں کوئی "پرانا ماڈل" بھی رکھا ہوگا۔ امین الدین قادری کی عمر کوئی پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر داڑھی بھی تھی، خاصی گھنی! وہ سر پر رامپوری ٹوپی پہنے اور شیروانی "ڈالے" بڑے ٹھسے سے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے پڑی ہوئی میز پر بہت سے کاغذات اور فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے سامنے دو کرسیاں بھی پڑی تھیں جن میں سے ایک پر اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے سلام کا جواب اس نے بہت ہی صاف ستھری عربی میں دیا تھا۔ "وعلیکم السّلام" کی عین اس نے حلق سے ادا کی تھی۔ اس طرح حلق سے عین برآمد کرتے ہوئے میں نے کم ہی لوگوں کو دیکھا تھا۔

میں نے کرسی سنبھال لی تو امین الدین قادری نے پہلا سوال کیا۔ "کتنے پڑھے ہوئے ہو؟" یہ سوال اس نے انگریزی میں کیا تھا، انگریزی بھی اس کی مجھے بڑی رواں معلوم ہوئی۔

میں نے اپنی تعلیم بتائی، پھر باقاعدہ انٹرویو شروع ہوگیا۔ میں سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

انٹرویو کے اختتام پر امین الدین نے میری تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمھیں میرے ادارے میں نوکری نہیں مل سکتی۔"

"مم... مگر سر، اگر مجھے کوئی نوکری نہیں ملی تو میرے گھر والے فاقے کرنے لگیں گے۔" میں نے رونی صورت بنا کر تیر چلایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب اسے نوکر رکھنا ہی نہیں تھا تو پھر انٹرویو کیوں لیا؟

"کیوں؟" امین الدین نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے جواب میں بہ مجبوری خود کو یتیم بتایا اور ایک گھسی پٹی مگر دکھ بھری کہانی سنا دی جو پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ امّی سلائی کرتے کرتے اپنی آنکھوں کا نور کھو بیٹھی ہیں، واحد اولاد میں ہی ہوں اور اب امّی سے کام نہیں ہوتا۔ انھوں نے بڑی آرزوؤں اور امیدوں سے مجھے اتنا پڑھا لکھا کر جوان کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خود کو یتیم ظاہر کرتے ہوئے میری آواز بھی بھرا گئی تھی کیوں کہ مجھے اپنے ابّا کا خیال آگیا تھا جنھیں اپنے "ڈراما" میں جان ڈالنے کی خاطر میں نے "زندہ درگور" کر دیا تھا۔

قریب تھا، میں رو پڑتا کہ امین الدین قادری کی آواز سنائی دی۔ "مجھے تمھارے واقعات سن کر بہت دکھ ہوا مگر بیٹے، میں بھی مجبور ہوں۔ تم جیسے تعلیم یافتہ نوجوان کے لائق میرے پاس کوئی کام نہیں مگر ٹھہرو، مجھے ذرا سوچنے دو۔" یہ کہہ کر امین الدین قادری واقعی سوچ میں کھو گیا، پھر قدرے توقف سے بولا۔ "صرف ایک کام ہو سکتا ہے، اگر تم چاہو تو وقتی طور پر یہ کام کر سکتے ہو۔ فاقے کرنے سے بہ ہر حال یہ بہتر ہے کہ آدمی محنت کرے۔ محنت میں کوئی عار نہیں۔"

امین الدین قادری کی بات سن کر میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے، گویا میری "اسٹوری" نے اس پر اثر کیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہتے ہوئے جھجک رہا ہو۔ یہ محسوس کر کے میں جلدی سے بولا۔ "آپ یقین کریں سر کہ میں اپنی ماں کی خاطر جھاڑو بھی لگا سکتا ہوں۔"

"صاف کے لیے یہی جذبہ ہونا چاہیے۔ میں تمھاری بات سے خوش ہوا۔ دراصل مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ تم سے یہ کام لوں۔" امین الدین قادری نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

مجھے کیا خبر تھی کہ آنتیں گلے ہی پڑ جائیں گی اور امین الدین سچ مچ میرے ہاتھ میں جھاڑو تھما دے گا مگر اس کے باوجود میں خوش تھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ مجھے وقتی طور پر ہی سہی، سیٹھ عثمان کے دفتر میں نوکری مل گئی تھی۔ قصّہ یہ تھا کہ دفتر کا چپراسی اپنی شادی "بنانے" روہتک جانا چاہتا تھا کیوں کہ وہ وہیں کا تھا۔ اس سلسلے میں وہ امین الدین قادری کی جان کو آیا ہوا تھا۔ اس کی جوانی بیتی جا رہی تھی مگر امین الدین قادری اسے مہینے بھر کی چھٹی دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ چپراسی بھی اڑیل ٹٹو تھا، وہ دو چار دن کی چھٹی لینے پر قطعی راضی نہیں تھا اور وہ اپنے "اڑیل پن" میں حق بہ جانب تھا۔ شادی روز روز تو ہوتی نہیں، زندگی میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو چار بار ہوتی ہے، مہینے بھر کی چھٹی کوئی زیادہ نہیں تھی۔ دو جوان دلوں کے ارمان مہینے بھر میں بھی پوری طرح بہ مشکل ہی نکلتے ہیں۔

امین الدین نے میری "حالتِ زار" پر رحم کھاتے ہوئے اپنے چپراسی کو ایک مہینے کی چھٹی پر چلے جانے کا حکم دے دیا تھا۔ مجھے دوسرے دن صبح ہی سے ڈیوٹی پر چڑھ کر جھاڑو سنبھالنا تھی۔ میں بہ ظاہر امین الدین قادری کو دعائیں دیتا ہوا اور دل میں کوستا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

چاندنی چوک سے میں "بگٹٹ" اپنے دفتر کی طرف دوڑ لیا۔ ابھی چار بجے تھے اور دفتر پانچ بجے تک تھا۔ اس دوران میں تیواڑی جی سے بھرپور انتقام لیا جا سکتا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے میری کھوپڑی میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب سر تھامسن کو تیواڑی جی کے منصوبے کی ناکامی اور میرے منصوبے کی کامیابی کا پتا چلے گا تو ان پر کیسا

ردِ عمل ہوگا؟

میں اس وقت میک اپ میں تھا اور احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے چہرے سے جعلی نہ اتاروں جو چہرے پر چڑھا رکھی تھی۔ مجھے اب کچھ دن اسی میک اپ میں رہنا تھا۔ بار بار میک اپ کرنے سے چہرے میں کوئی ردّ و بدل بھی ہو سکتی تھی۔ اب میں متین الدین بن چکا تھا اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ پھر اسی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے دفتر میں داخل ہونے کے لیے بیک ڈور استعمال کیا کہ کہیں کوئی مجھے خفیہ محکمے میں جاتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ بیک ڈور پر ایک شخص کی ڈیوٹی لگی رہتی تھی۔ اس نے دستک کے جواب میں دروازہ کھول دیا مگر اندر گھسنے سے قبل میرا شناختی کارڈ ضرور دیکھا، پھر سر ہلا کر اس نے مجھے گویا اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں چند ہی قدم بڑھا تھا کہ ایک "فتنۂ قیامت" کو اسی طرف آتے دیکھا۔ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ وہ بیک ڈور کی طرف آ رہی تھی، اس سے یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس کا تعلق خفیہ ہی سے ہے اور وہ میک اپ کر کے چھوٹ رہی ہے۔ سرخ لمبا سا، میر اس کے متناسب جسم پر بہار دکھا رہا تھا۔ اپنے سیاہ بالوں میں اس نے ایک جانب بڑا سا گلاب کا پھول لگا رکھا تھا حالانکہ وہ خود ایک بڑا سا گلاب دکھائی دے رہی تھی اور اسے مزید کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میرے قریب آگئی اور پھر پتا نہیں کہ اس کا پاؤں مڑ گیا کہ کیا ہوا، وہ ایک دم لڑکھڑائی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے سنبھال لیا۔

"بدتمیز کہیں کا!" وہ سنبھل کر مجھ سے الگ ہوئی اور غرّائی۔ اس کی آواز بھی میرے لیے اجنبی تھی۔

خوب صورت لڑکیوں سے گالیاں کھا کر بھی آدمی بے مزا نہیں ہوتا، اس لیے میں نے جواباً دانت نکال دیے۔ "ٹکراؤ" کے سبب وہ اور میں دونوں ہی رک گئے تھے۔ وہ مجھے اس طرح گھور رہی تھی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں "سموچا" نگل جائے گی۔

"معاف کرنا، اگر میں تمھیں تھام نہ لیتا تو تم مُنہ کے بل زمین پر آتیں۔" میں نے اس پر حقیقتِ حال واضح کی تاکہ وہ مزید نہ غرّائے۔ "ویسے اتنا میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بھی اسی محکمے میں ہو۔ کیا تم پولیٹیکل برانچ میں ہو؟" میں نے آئندہ کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر پوچھا۔

"تمھاری کھوپڑی میں ہوں میں!" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا پڑی اور میری کھوپڑی اڑ گئی۔ "بڑے بنتے ہو قابل! دیکھا، میک اپ

کرنے ... صد آواز اور چلنے کے انداز پر بھی قابو چاہیے۔"

" ... دیکھتا، میں قابو!" میں اس کی آواز پہچاننے کے بعد

جل کر بو ... ب اپنی اصل آواز میں بولی تھی۔ "تم میری افسر

ہیں، ... یا افسر ہوں لیوسی خانم! ویسے تم اِس طرح کیل کانٹے

... نسے لیس ... ہو کہاں جا رہی ہو؟"

... ہاں! تم بتاتے ہو مجھے کچھ؟" یہ کہہ کر وہ آگے

بڑھ گئی

... ہو جائے گا، سب بتا لگ جائے گا۔" مجھے اکیا بھتی

ہوئے ... نے خفت مٹانے کے لیے مڑ کر کہا اور پھر خود

بھی قد ... بڑھا دیے۔

... لپک جھپک "سر تھامسن کے کمرے تک پہنچا اور

بغیر دق ... اُٹھ کیے چچا بندو خاں کے سامنے یہ "راز" کھول دیا

کے بعد ... سے ہوئے ہوں۔ انھوں نے پلکیں جھپکا کر حیرت

کا اظ ... پھر میری آواز پہچان کر مسکرائے۔ "میں ابھی صاحب

کو خبر ... بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

لمحے بعد جب میں سر تھامسن کے کمرے میں پہنچا تو انھوں نے مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ غالباً انھیں چچا بندو خاں نے احتیاطاً بتا دیا ہوگا کہ میں میک اپ کیے ہوئے ہوں۔

جب میں کرسی پر ان کے سامنے بیٹھ گیا تو انھوں نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے؟"

جواب میں جلدی سے میں نے بہاری لال کا وہ سفارشی خط انھیں تھما دیا جو اس نے سیٹھ عثمان کے نام لکھا تھا۔

سر تھامسن نے وہ خط پڑھا اور خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائے۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر کہ اگر میں اپنی خداداد صلاحیت سے کام لے کر سیٹھ عثمان کے پاس جانے سے قبل یہ خط کھول کر نہ پڑھ لیتا تو تیواڑی جی مجھے تڑوانے میں مروا دیتے۔" یہ کہہ کر میں نے ساری تفصیل از اوّل تا آخر بیان کر دی مگر یہ نہیں بتایا کہ تیواڑی جی کا منصوبہ فیل ہونے کے بعد کیا ہوا۔

"ہوں!" سر تھامسن نے لمبا سانس کھینچا۔ "جس معاملے کو بھی میں ان لوگوں پر چھوڑ دوں، یہ اسے سنبھال نہیں پاتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے گھنٹی بجائی۔ جب گھنٹی کے جن "یعنی چچا بندو خاں آگئے تو سر تھامسن نے انھیں تیواڑی جی کو بلا لانے کا حکم دیا۔ چچا بندو خاں حکم سن کر دوڑ لیے اور میں انتقامی کارروائی پر عمل درآمد ہوتے دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہونے لگا۔

تیواڑی جی آگئے تو میری توقع کے مطابق ان پر زبردست لتاڑ پڑی، اتنی لتاڑ کہ ان کی مونچھوں پر "زلزلہ" طاری ہو گیا۔

سرتھامسن نے انھیں بہاری لال والا خط بھی پڑھوا دیا تھا جسے پڑھ کر انھوں نے نہ جانے کیوں میری طرف بڑھا دیا تھا۔ میں نے وہ خط پھر اپنی جیب میں ڈال لیا کیوں کہ وہ اپنا "کردار" ادا کرچکا تھا۔ سرتھامسن سخت غصے میں تھے۔

"اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں خود اے ڈی پر یہ کام چھوڑ دیتا۔" سرتھامسن نے پھنکار ماراجس کی تپش مجھے تیواڑی جی کے چہرے پر محسوس ہوئی۔

ایک افسر کی اس سے زیادہ تذلیل کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے مقابلے میں خود اسی کے ماتحت کو پیش کیا جائے۔ تیواڑی جی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ دم سادھے بیٹھے تھے، حد تو یہ کہ انھوں نے اب تک اپنی صفائی میں بھی ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

"اب بتاؤ، اے ڈی کو کس طرح وہاں پہنچایا جائے؟" سرتھامسن پھر گرجے۔ "تم تو کہہ رہے تھے، یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ سیٹھ عثمان کو اصل معاملے کی ہوا بھی نہیں لگے گی!"

اب میرے کلیجے میں خاصی ٹھنڈک پڑ چکی تھی اور مجھے تیواڑی جی پر ترس بھی آنے لگا تھا اس لیے فوراً بول اٹھا۔ "سر! جو کچھ بھی ہوا، اس پر خاک ڈالیں۔ سیٹھ عثمان کی کمپنی میں ملازمت حاصل کرنا واقعی کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر آپ براہِ راست مجھے یہ حکم دیتے تو میں چٹکی بجاتے وہاں نوکر ہوجاتا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سچ مچ چٹکی بھی بجائی تھی۔

اپنے افسرِ اعلیٰ کی حضوری میں چٹکی بجانا بہرحال بے ادبی تھا اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب سرتھامسن نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں جوشِ جذبات میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ سرتھامسن غصے میں تھے۔

میرا اس طرح بڑ ہانکنا تیواڑی جی سے ہضم نہ ہوسکا۔ بندر کی بلا، میرے سر آگئی۔ تیواڑی جی میری طرف دیکھ کر غرائے۔ "تم... تم خود کبھی نوکری حاصل نہ کرپاتے... بکواس نہ کرو!" غصے کے سبب تیواڑی جی بے چارے ہکلانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"اور سر، اگر میں نے وہاں نوکری حاصل کرلی تو؟" میں ضد میں آگیا۔

"اے ڈی!" معاً سرتھامسن بیچ میں بول پڑے۔ "کچھ بھی ہو، تیواڑی تمھارا افسر ہے تمھیں اس سے یوں بات نہیں کرنا چاہیے۔ یہ نہ بھولو کہ تمھاری تربیت بھی تیواڑی ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔"

"لیکن سر! انھوں نے اور لوگوں کی تربیت بھی تو کی ہوگی، بھی تو میری طرح ذہین اور بہادر نہیں نکلتے۔ آدمی خود ذہین ہوتا ہے تو اس کی تربیت بھی کام آتی ہے۔"

"بحث نہیں!" سرتھامسن ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "تم لاکھ ذہین سہی مگر میں تمھیں دفتری آداب پامال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا!" یہ کہتے ہوئے سرتھامسن کے لہجے میں کچھ سختی آگئی۔

میں نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر فوراً ترپ کا اِکّا پھینکا جو اب تک سنبھال کر رکھے ہوئے تھا۔

سرتھامسن میری بات سن کر چونک پڑے اور غیر یقینی سے انداز میں بولے۔ "کیا واقعی تم وہاں نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو؟"

"جی ہاں، کل سے جھاڑو دینے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے نوکری حاصل کرنے کی پوری "کتھا کہانی" نمک مرچ لگا کر سنادی۔

"یہ ہوا نا نہلے پہ دہلا!" سرتھامسن کی باچھیں کھل گئیں۔ "میں نے یقیناً تمھیں سینئر افسر بنا کر غلطی نہیں کی۔"

اپنے کارنامے کی خوب داد بٹور بٹار کر جب میں سرتھامسن کے کمرے سے نکلا تو پھول کر کُپا ہو رہا تھا۔ تیواڑی جی کو سرتھامسن نے کچھ گفتگو کرنے کے لیے روک لیا تھا۔ دفتر کا وقت بس اب ختم ہی ہونے والا تھا مگر میں نے سوچا اپنے کمرے کا ایک چکر لگا ہی لوں۔ دیکھوں تو سہی کہ میرے ماتحتوں کی "فوجِ ظفر موج" کیا مٹر بھنار ہی ہے۔ افسر دل کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس طرح کے "ہوائی دورے" کبھی کبھار لگاتے رہا کریں، ایسا کرنے سے ماتحت دہلے رہتے ہیں کہ پتا نہیں کب اور کس وقت ان کا افسر ٹپک پڑے۔

میں دبے پاؤں اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا اور کھول کر رہ گیا۔ کمرے کے اندر سے پیارے لال ہنر کی "ریک" سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی بے سُری آواز میں ایک شعر "گا" رہا تھا ؎

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہوگیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

درمیان میں وہ "ارے ہاں" اور "اجی ہاں" بھی گاتا جا رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، پہلے بھی ایک آدھ بار ایسا ہو چکا تھا اور میں نے اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ پلائی تھی۔

ان سب کو بوکھلا دینے کی خاطر بس میں اچانک ہی کمرے میں داخل ہوا اور یہ بھول ہی گیا کہ میک اَپ میں ہوں۔ پیارے لال ہنر آنکھیں بند کیے جھوم جھوم کر گائے جارہا تھا اور بقیہ "پلٹن" داد دے رہی تھی۔ کمرے میں میری موجودگی کو سب سے پہلے کمار نے محسوس کیا اور اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔ "کون ہے بے؟"

بس پھر کیا تھا، میں کڑک اٹھا۔ "یہ میں ہوں، تمھارا افسر، اے ڈی مہر! میں یہی دیکھنے آیا تھا کہ تم لوگ میری غیر موجودگی میں کیا کرتے ہو! میں اِس وقت بھیس بدلے ہوئے ہوں۔ سمجھے!"

پیارے لال ہنر کی آواز گلے میں بھنچ کر رہ گئی۔ وہ اس طرح ہکّا بکّا نظر آنے لگا جیسے میں چوری کرتے وقت پکڑا گیا ہو۔

میں نے سب سے پہلے اسی کی "دُرگت بنانا" مناسب سمجھا۔ "تمھیں یہاں اپنے شعر سنانے کے لیے ملازم رکھا گیا ہے! ہیں؟" میں دہاڑا۔

"سرکار! گستاخی معاف، خادم کو یہ تلبِ سخن کہاں کہ ایسا شعر تخلیق کرسکے۔" پیارے لال ہنر سہم کر بولا۔ "یہ شعر تو حضرتِ داغ دہلوی کا ہے۔"

"کسی بھی دہلوی کا ہو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں!" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ دفتری اوقات میں شعر کیوں گائے گئے؟"

"سر! دفتر کا وقت ختم ہوئے ڈیڑھ منٹ ہوچکا ہے۔" معاً کمار بول اٹھا۔ "ہم لوگوں نے دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد ہی پیارے لال جی سے شعر گانے کی نہیں سنانے کی فرمائش کی تھی۔"

"تم سے صفائی پیش کرنے کو کون کہہ رہا ہے!" میں کمار پر برس پڑا۔

"آپ کہتے ہیں سر تو میں خاموش ہوا جاتا ہوں ویسے بھی دفتر کا وقت ختم ہوچکا ہے اور میں ڈیوٹی پر نہیں اس لیے اب آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا بھی تو آپ کو جواب دینے کا میں پابند نہیں۔" یہ کہہ کر کمار اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

کمار چلا گیا تو اس کا غصہ بھی میں نے خود سرد ل پر اتارا اور پھر زبانی وارننگ دے کر کمرے سے نکل گیا۔ دفتر سے واپسی کے لیے بھی میں نے بیک ڈور ہی استعمال کیا تھا اور اپنی پھٹ پھٹ وہیں چھوڑ دی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے امّی کو بہ مشکل یقین دلایا کہ میں انھی کا لختِ جگر، نورِ نظر ہوں اور یہ جو "صورت بدل" ہوئی ہے وقتی ہے۔ بس چند روز کی بات ہے، وہ پھر اپنے "کماؤ پوت" کا چاند سا چہرہ دیکھ سکیں گی۔ بھیس بدلنے کا حکم سرکاری ہے جسے کسی طرح نہیں ٹالا جاسکتا۔ پھر میں نے کھانا کھایا اور گھر کے آنگن ہی میں ٹہل کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ جامع مسجد تک جا کر "ٹہل مچانا" مجھے خطرناک محسوس ہوا۔ میرے چھوٹے بھائی بہن، کمرے میں آ آ کر مجھے اِس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی نمونہ ہوں۔ ابا نے بھی دکان سے آ کر یہ نئی اطلاع سنی اور میرا "دیدار کرنے" کمرے میں آئے۔

"ارے بھئی شکورن! بس کمال ہے، ماٹم ہی نہیں دے رہا کہ یہ اللہ دتا ہے۔" ابا نے تبصرہ کیا اور میں نے دانت نکال دیے۔

پھر باری باری بھائی صاحب اور بھائی جان بھی مجھے دیکھنے کمرے میں آئے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے گھر کی بجائے چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں ہوں اور میرا "دیدار" کرنے کے لیے ٹکٹ لگا ہوا ہے۔ اس رات اپنے حالات کی عکاسی کرنے کے لیے میں نے ایک عدد "شعر" بھی کہا۔ اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ شعر میں قافیے کے علاوہ وزن بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا شعر تھا۔ میں اسی لیے اِس شعر کو اپنی سرگزشت میں لکھنے پر مجبور ہوں ؎

جو حکم ہو سرکاری
وہی پکے ترکاری

دوسرے دن صبح ہی صبح میں ڈیوٹی پر چڑھ گیا۔ جو چپراسی چھٹی پر گیا تھا، وہ کچھ غلیظ واقع ہوا تھا اور اسی سبب امین الدین قادری کی ڈانٹ پھٹکار کھاتا رہتا تھا، کچھ "حرام ہڈ" بھی تھا۔ میں نے پہلے ہی دن سارے دفتر کو "چم چما" دیا اور اس بہانے مجھے سارے دفتر میں گھومنے پھرنے کی گویا آزادی مل گئی۔ وہاں تین کمرے تھے اور ایک ہال کمرہ۔ ایک کمرہ سیٹھ عثمان کے لیے مخصوص تھا، ایک منیجر کے لیے اور ایک نائب منیجر کے لیے! سبھی کمروں کی میں نے صفائی کی مگر پہلے دن کوئی ہاتھ کی صفائی نہیں دکھائی۔ میں پہلے اس دفتر میں اپنا اعتماد قائم کرلینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ مجھے صرف چپراسی رکھا گیا تھا، وہ بھی لیو ویکنسی پر اس لیے امین الدین قادری نے سند وند دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی ورنہ مجھے اپنے دفتر کے ذریعے جعلی سند کا بندوبست کرنا پڑتا۔

بس چار چھ دن ہی میں مجھے اس دفتر کی بہت سی باتیں خود بہ خود معلوم ہوگئیں۔ دفتر کا اقتدار ہمیشہ سے امین الدین قادری کے پاس تھا۔ تمام دفتری معاملات وہی سنبھالتا تھا۔ سیٹھ عثمان مہینے میں بس دو ایک بار ہی دفتر کا رُخ کرتا تھا۔ رگھوناتھ کی تقرری کو صرف تین ماہ ہوئے تھے اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ ان تین ماہ میں بہ مشکل تین چار مرتبہ ہی دفتر آیا تھا۔ اس سے پہلے امین الدین قادری منیجر ہوا کرتے تھے جنھیں

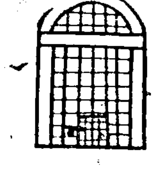
تنخواہ کم کیے بغیر نائب منیجر بنا دیا گیا تھا اور نائب منیجر بے چارے کو ہال کمرے میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ویسے تنخواہ اب بھی اسے "نائب منیجری" ہی کی مل رہی تھی۔ رگھوناتھ کو گویا "پھوکٹ" میں تنخواہ مل رہی تھی۔ تنخواہ لینے بھی وہ گورنر صاحب خود نہیں آتے تھے بلکہ ان کے گھر، پہاڑ گنج پہنچائی جاتی تھی۔ سیٹھ عثمان نے رگھوناتھ کے تصرف میں ایک کار بھی دے رکھی تھی۔ سیٹھ عثمان، اپنے نئے منیجر کو میش کرا رہا تھا مگر اس کا سبب کیا تھا، یہ کسی کے علم میں نہیں تھا۔ ان معلومات کا اصل ذریعہ وہ "مرگھلیاں" تھیں جو بیک وقت مجھ پر پنجہ ڈالنے کی فکر میں تھیں۔ ہفتے بھر ہی کے اندر نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان تینوں میں بول چال بھی بند ہو گئی تھی۔ وہ تینوں ہی "ایک تیسری" کی رقابت میں مبتلا ہو گئی تھیں اور رقابت کا سبب میں تھا۔ امین الدین قادری مجھ سے بہت خوش تھا۔ وہ بندہ، چار مینار جیسی کڑک سگریٹ پیتا تھا اور پیتا ہی چلا جاتا تھا۔ ادھر پیکٹ ختم ہوا، ادھر اس نے گھنٹی بجائی۔ امین الدین قادری اپنی چین اسموکنگ کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد سے دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مولانا آزاد تو روٹی کھاتے وقت بھی سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ صرف دھڑا دھڑ سگریٹ پھونکنے سے آدمی، مولانا آزاد نہیں بن جاتا، اس کے لیے کھوپڑی میں گودا ہونا بھی ضروری ہے۔

رگھوناتھ کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کی روشنی میں اس کا کردار اور بھی پُراسرار ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اس نے سیٹھ عثمان کو کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ مفت کی تنخواہ لے رہا تھا۔

مجھے نوکری کرتے ہوئے شاید آٹھواں یا نواں دن ہو گا کہ صبح ہی سے تمام دفتر والے "ٹچن ٹاچ" نظر آنے لگے۔ اس "ٹچن ٹاچ" کا سبب معلوم ہوا تو جیسے میری روح فنا ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ آج سیٹھ عثمان، دفتر میں تشریف لانے والے ہیں۔ مجھے امین الدین قادری نے تاکید کر دی کہ جیسے ہی سیٹھ عثمان کے کمرے سے گھنٹی کی آواز سنوں، بغیر کسی تاخیر کے فوراً اُدھر دوڑ پڑوں۔ اس کے علاوہ یہ کہ میں دفتر کے دروازے پر مستعد کھڑا رہوں اور جیسے ہی سیٹھ عثمان اپنی کار سے اتر کر دفتر کے دروازے تک پہنچے میں فوراً دروازہ کھول کر "اٹینشن" ہو جاؤں۔ امین الدین قادری نے مجھے "لارا" دیا کہ اگر سیٹھ میری فرماں برداری سے خوش ہو گیا تو میرے دن پھر جائیں گے۔ سیٹھ، میری تعلیم اور اہلیت کے مطابق نوکری دے دے گا۔

کوئی بارہ بجے کے قریب سیٹھ عثمان کی کار دفتر کے قریب آکر رکی۔ میں اس وقت دروازہ کھولے باہر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سیٹھ عثمان ہی بیٹھا تھا۔ میں اسے پہچان گیا مگر اس کے برابر والی سیٹ پر جو شخص بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیٹھ عثمان کے ساتھ وہ بدذات بہاری لال بھی ہو گا جو مجھے ایک بے روزگار ہندو نوجوان سچدیو کے نام سے جانتا تھا جب کہ میں اب سچدیو کی بجائے متین الدین بن چکا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ یہ سوچ کر میرے پیٹ میں اتنی زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی کہ مزید میرا وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا اور میں امین الدین قادری کی ساری نصیحتیں بھول کر بیت الخلا کی طرف دوڑ لیا۔





میں ہانپتا کانپتا، بیت الخلا تک پہنچا اور "گڑپ" سے اس کے اندر گھس کر دروازہ لگا لیا۔ جب ذرا میرے ہوش ٹھکانے آئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر پیٹ میں خوف کے سبب گڑگڑاہٹ نہ ہوتی تو شاید میں فوراً دشمن کی نظر میں آجاتا۔ گویا اس وقت بھی عارضی طور ہی پر سہی، میری بزدلی نے مجھے بچا لیا تھا۔ ممکن ہے میری جگہ کوئی ہیرو ہوتا تو خم ٹھوک کر میدان میں کود پڑتا اور یوں اپنی خوب دُرگت بنواتا۔ میں ٹھہرا بزدل آدمی، پھر بھلا کیوں بے سبب پٹتا، یعنی بہادری کے شوق میں مار کھاتا!

بیت الخلا، دفتر کی اندرونی سمت میں ایک طرف بنا ہوا تھا اور مشکل یہ تھی کہ دفتر کا کوئی بیک ڈور نہیں تھا ورنہ میں اس طرف سے ریس لگا جاتا۔ آٹھ نو دن کے اندر میں نے جو معلومات حاصل کی تھیں، انھیں غنیمت جان کر اور موجودہ صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے یہی مناسب نظر آیا تھا کہ راہِ فرار اختیار کر لی جائے۔

فرار کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا اور اُس راستے پر گویا دشمن گھات لگائے بیٹھا تھا کہ ادھر میں نکلوں، ادھر وہ مجھے "گپک" لے۔

معاً میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ سچدیو یا متین الدین کو اپنے چہرے سے نوچ کر جیب میں ڈال لوں تو میری مشکل حل ہو سکتی ہے۔ میری اصل شخصیت پر ان دونوں فرضی ناموں کی چھاپ اسی جعلی نے تو لگائی تھی جسے میں نے اپنے چہرے پر منڈھ رکھا تھا۔ چند سیکنڈ ہی کے لمحے میں نے اپنے میک اپ کا حلیہ خود اپنے ہاتھوں بگاڑ لیا۔ میرے سر پر جو چھجے دار پی کیپ تھی، وہ سرکاری تھی۔ میں نے اسے اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے نہیں خریدا تھا۔ غالباً اسی لیے میں نے اس پی کیپ کو بیت الخلا میں پھینکتے ہوئے کوئی دکھ محسوس نہیں کیا۔ میں بیت الخلا کے اندر ہی اپنی جون بدل چکا تھا۔ اب میں سچدیو یا متین الدین کی بجائے سینیئر سی آئی ڈی انسپکٹر بڑے ڈی مہر بن چکا تھا۔ اب بہاری لال کا تایا بھی، مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔

بہاری لال تو بہاری لال اب میں ان مرگھلیوں کے لیے بھی قطعی اجنبی ہوتا جو مجھ پر ہزار جان سے عاشق ہو چکی تھیں۔ اب اس دفتر میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو مجھے لے ڈی مہر کی حیثیت سے بھی پہچان سکتا تھا اور وہ تھا سیٹھ عثمان!

یہ تو سامنے کی بات تھی کہ سیٹھ عثمان، اپنے دوست بہاری لال کو ساتھ لیے لیے سارے دفتر کی ٹہل نہ لگاتا، وہ بہاری لال کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ یہ سوچ کر میری کچھ ہمت بندھی۔ سیٹھ عثمان کا کمرہ، دفتر کے دروازے سے خاصی دور تھا۔ گویا اس کی نظر میں آئے بغیر چھوٹا جا سکتا تھا۔

پھر میں بیت الخلا سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ اسی دفتر کا ایک کلرک تھا اور میرے علم میں آ چکا تھا کہ وہ امین الدین قادری کا بھتیجا ہے۔ امین الدین قادری کا بھتیجا عظیم الدین مجھے دیکھ کر چونکا۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس نے مجھے گھور کر بھی دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ بیت الخلا کی طرف بڑھ گیا۔

میں ہال کمرے میں پہنچا تو امین الدین قادری کو کچھ بدحواس سا اِدھر اُدھر ناچتے دیکھا۔ وہ اس وقت خنخنی سیکریٹری کی میز کے قریب تھا۔ معاً اس نے رک کر سگریٹ کا کش لیا اور اس خنخنی سے بولا۔ "مگر وہ گیا کہاں؟ سیٹھ صاحب فوراً اس سے ملنا چاہتے ہیں!"

"وہ... وہ اُندھر گیاں تھاں۔" خنخنی بولی اور اس طرف ہاتھ اٹھایا جدھر سے بیت الخلا کے لیے راستہ جاتا تھا۔

اسی وقت امین الدین قادری کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ بھی چونک اٹھا۔ وہ میری طرف لپکا اور کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔ "کون ہو تم؟ اور یہاں کیوں آئے تھے؟"

"مم... میں... کے... نن نہیں... بی... بلکہ یہ بھی نہیں، میں... میرا نام سلام اللہ ہے۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"مگر تم یہاں آئے کیوں؟" امین الدین قادری مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"پیشاب پھرنے۔" میں نے آہستہ سے کہہ دیا۔

"کیا مطلب؟ تم... تم یہاں پیشاب پھرنے آئے تھے!" وہ اس طرح برہم ہو کر بولا جیسے پیشاب کرنا کوئی بہت بڑا جرم ہو۔

"دراصل جناب... میں اِدھر سے گزر رہا تھا کہ مجھے بڑی زور کا پیشاب لگا۔ ایک نیک آدمی نے مجھے بتایا کہ اس دفتر میں بیت الخلا موجود ہے۔ بس جناب، میں پیشاب..."

"دفع ہو جاؤ!" امین الدین قادری دہاڑا۔ "اگر اب یہاں کبھی پیشاب کرنے آئے تو..." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور بڑبڑایا۔ "معلوم نہیں وہ کم بخت متین الدین کہاں مر گیا! میں

نے اس سے کہا تھا کہ دروازے پر ہی رہنا۔ اگر وہ دروازے پر موجود ہوتا تو۔۔۔"

اسی وقت امین الدین قادری کا بھتیجا تقریباً دوڑتا ہوا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ میں وہ پی کیپ تھی جو میں بیت الخلا میں پھینک آیا تھا۔ غالباً امین الدین قادری نے اسے میری تلاش میں بیت الخلا کی طرف بھیجا تھا۔

"چچا! وہاں اس کی یہ پی کیپ ملی ہے اور وہ غائب ہے۔"

ابھی عظیم الدین کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ اچانک "ٹرنگ ٹرنگ" کی صدا گونجی۔ امین الدین یہ آواز سن کر مزید بدحواس ہو گیا۔ "سیٹھ ۔۔۔ سیٹھ۔۔۔ تم عظیم! ٹھہرو!۔۔۔ میں ابھی آیا۔ سیٹھ صاحب کے کمرے کی گھنٹی بجی ہے۔۔۔" پھر وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی چیخا۔ "تم ابھی تک دفع نہیں ہوئے!"

پھر میں نے "دفع" ہو جانے میں دیر نہیں کی۔ اگر خدانخواستہ سیٹھ عثمان اپنے کمرے سے نکل آتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اسے بہرحال یہ علم نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کے پیچھے سی آئی ڈی چھوٹی ہوئی ہے۔

میں سیٹھ عثمان کے دفتر سے نکل کر تیزی کے ساتھ قریب ہی کھڑی ہوئی کار کے پاس سے گزرا اور ایک عدد "شِشش" سن کر اچھل پڑا۔ میری "اچھال" کا سبب وہ ہستی تھی جو سیٹھ عثمان کی کار میں پچھلی نشست پر براجمان تھی۔ "شِشکاری" اسی نے ماری تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سیٹھ عثمان کے ساتھ بہاری لال کے علاوہ وہ بھی تھی اور اسے کار ہی میں چھوڑ کر سیٹھ' بہاری لال کو لیے ہوئے دفتر میں گیا تھا۔ وہ مجھے پہلے شاید اس لیے نظر نہیں آئی تھی کہ میں بہاری لال پر نظر پڑتے ہی اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا' دوسرے یہ کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر تھی۔ وہ اسی میک اپ میں تھی جس میں میں نے اسے تقریباً دس روز قبل دیکھا تھا مگر جسم پر کپڑے مختلف تھے۔

اس کے جسم پر ویسا ہی لباس تھا جیسا لباس میں نے سیٹھ عثمان کی کوٹھی میں دوسری لڑکیوں کے جسموں پر دیکھا تھا۔ وہ بالکل "انگریزن" لگ رہی تھی۔

"لل۔۔۔ لیو۔۔۔ لیوسی!" میں اسے دیکھ کر ہکلایا۔

"خاموش!" اس نے بے جھجک مجھے ڈانٹ دیا۔ "میرا نام ڈوروتھی ہے۔" وہ آواز بدل کر بولی تھی۔

"گھٹیا ہے تمہارا نام!" میں جل کر بولا۔ "میں دوسری بار بے وقوف نہیں بن سکتا۔"

"کسی بھی وقت سیٹھ عثمان باہر آ سکتا ہے۔" اس بار لیوسی اپنی اصل آواز میں بولی۔ "میں نے تمہیں صرف اس لیے روکا تھا کہ بتا سکوں' اب اس دفتر کا رُخ نہ کرنا۔"

"مجھے بھی معلوم ہے' زیادہ قابل نہ بنو۔"

لیوسی میری بات کو نظرانداز کر کے جلدی سے بولی۔ "بہاری لال آج صبح سیٹھ عثمان سے ملنے آیا تھا۔ اس نے سیٹھ کو بتایا تھا کہ کوئی ہندو نوجوان سیدپور سے سفارشی خط لے گیا تھا' سیٹھ کے نام! بہاری لال کو اس نوجوان پر شک تھا کہ وہ سی آئی ڈی سے تعلق رکھتا ہے۔ سیٹھ عثمان نے تردید کی کہ اس سے کوئی ایسا نوجوان نہیں ملا۔ پھر سیٹھ عثمان معاً اٹھ کھڑا ہوا۔ امین الدین قادری سے فون پر بات کرنے کے بعد اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا' کیوں' یہ میں پھر بتاؤں گی۔ بہرحال سیٹھ کو شک تھا کہ کہیں اس کے نائب منیجر امین الدین قادری نے کسی کو دفتر میں نوکر نہ رکھ لیا ہو۔ یہ باتیں ان دونوں نے راستے میں کیں۔ وہ اسی لیے بہاری لال کو ساتھ لے کر یہاں آیا تھا کہ اگر وہ نوجوان واقعی اس کے دفتر میں ملازمت حاصل کر چکا ہو تو اس کی نشان دہی ہو سکے۔ اس نوجوان کا جو حلیہ بہاری لال نے بتایا' اس حلیے میں' میں تمہیں دیکھ چکی تھی اور۔۔۔"

"بس بس کافی ہے۔" میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے کھسک لوں۔"

"ہاں جاؤ۔" لیوسی نے مجھے پیار بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ کیا گزری' اس سلسلے میں پھر بات ہوگی۔ تمہارا یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں کیوں کہ سیٹھ عثمان تمہیں پہچانتا ہے۔"

میں نے پیار بھری نگاہ کے جواب میں اسے آنکھ ماردی کیوں کہ اب مجھے آنکھ مارنے کی اچھی خاصی پریکٹس ہو چکی تھی۔ میں نے اس لیے لیوسی کو آنکھ ماری تھی کہ اسے یقین ہو جائے' میں اب بھی اپنی بیوی نمبر دو بنانے پر راضی ہوں۔ لیوسی جھنجلا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میں اسے "ٹاٹا بائی بائی" کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور چل کر ہی مجھے ایک خالی یکہ مل گیا اور میں کشمیری گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

لیوسی کے بیان اور اس کے جسم پر موجود کپڑوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی سیٹھ عثمان کی "ملازمہ" بن چکی ہے گویا وہ بھی میری طرح بجری پر دوڑ رہی تھی۔ یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا کہ سرتھامسن ہی کے ایما پر کوئی نہ کوئی چکر چلایا گیا ہوگا۔ گویا مجھے سیٹھ عثمان کے دفتر میں پہنچایا گیا تھا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ میں خود وہاں پہنچ گیا تھا اور لیوسی کو سیٹھ عثمان کی کوٹھی میں! سیٹھ عثمان کو دو طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ غضب مجھ جیسے شخص نے آٹھ نو دن میں بہت کچھ معلوم کر لیا تھا تو پھر لیوسی تو لیوسی تھی۔ اس نے بھی یقیناً کچھ اہم معلومات حاصل کی ہوں گی۔

"مگر لیوسی خانم' میں تمہیں ہیروئن نہیں بننے دوں گا' ہاں!"

میں بے خیالی میں بڑبڑایا۔

اسی وقت یکے والے کی آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ کشمیری گیٹ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا اور اب پوچھ رہا تھا کہ کدھر جانا ہے۔

"بس روک دو یہیں۔" میں نے کہا اور یکے سے اتر گیا۔

یکے والے کو پیسے دے کر میں دفتر کی طرف چل دیا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ پہلے ہی یکے کو رکوا لیا تھا۔ ایسا میں نے صرف احتیاطاً کیا تھا۔ ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ ایک شخص کے چہرے پر میری نگاہ پڑی۔

وہ شخص سڑک کی دوسری جانب سے میری طرف آ رہا تھا اور میرا رُخ بھی ادھر ہی تھا۔ اس شخص نے مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا اور فوراً مُڑ کر تیزی کے ساتھ ایک طرف چل دیا تھا۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ میں اسے پہچان چکا تھا۔ اس کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے مگر مجھ سے بچ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتا تو شاید میں سلام دعا کر کے آگے بڑھ جاتا۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور پھر کچھ دیر بعد ہی اس کے کاندھے پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا۔

"شاہنواز!" میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ اُترا ہوا چہرہ لیے مُڑا۔

"ج۔۔۔ جی۔۔۔ فر۔۔۔ فرمائیے! ج۔۔۔ جناب انسپکٹر صاحب؟" وہ ہکلایا۔

"تم مجھے دیکھ کر بھاگ کیوں رہے تھے؟" میں نے خالص "انسپکٹرانہ" انداز میں اسے گھور کر دیکھا۔

"ن۔۔۔ نہیں تو جناب!۔۔۔ م۔۔۔ میں تو۔۔۔ میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔"

"جھوٹ نہ بولو!" میں نے سختی سے کہا۔ "میں سب کچھ جانتا ہوں' سمجھے کچھ!" پھر میں نے اس پر رعب ڈالنے کے لیے کہا۔ "سنو' مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان لوگوں نے تمہیں رہا کر دیا ہے!"

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔۔۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ انسپکٹر۔۔۔ انسپکٹر صاحب!" شاہنواز بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"پھر تم جھوٹ کیوں بول رہے تھے کہ تم نے مجھے دیکھا نہیں تھا؟" میرے لہجے میں اب بھی سختی برقرار تھی۔

"اب۔۔۔ اب نہیں بولوں گا۔" شاہنواز نے بدستور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں آپ کو سب۔۔۔ سب کچھ سچ۔۔۔ سچ بتا دوں گا۔"

پھر شاہنواز نے جس انداز میں وہیں کھڑے کھڑے اپنی درد بھری داستان سنائی' اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرا جی چاہا کہ وہیں "بھوں بھوں" کر کے رونے لگوں مگر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ شاہنواز نے کہا کہ وہ اب شریفانہ زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اسی لیے مجھ سے بھی نظر بچا رہا تھا۔ وہ اب کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ باعزت زندگی گزارنے کے لیے اس نے پان بیڑی کی دکان کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے کشمیری گیٹ میں کرائے پر ایک دکان مل رہی تھی اور وہ وہاں اس وقت اسی دکان کی بات کرنے آیا تھا۔ وہ استاد چھنگا کے شاگردوں میں سے تھا مگر اب اس نے استاد چھنگا کا ساتھ بھی چھوڑ دیا تھا۔ استاد چھنگا اس کے فیصلے پر پہلے برہم ہوا تھا کہ اب وہ ہاتھ کی صفائی دکھانے یا کسی ایسے ہی دوسرے دھندے میں ملوث ہونے پر آمادہ نہیں مگر بعد میں استاد کو رحم آ گیا تھا۔ استاد چھنگا نے اسے شریفانہ زندگی گزارنے کی اجازت دے دی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا تھا۔ شاہنواز کے رویّے میں ایک دم اتنی بڑی تبدیلی کا سبب اس کی ماں کا انتقال تھا۔

شاہنواز نے گلوگیر لہجے میں بتایا تھا۔ "میں۔۔۔ میں جب رہا کر دیا گیا اور اپنے گھر پہنچا تو۔۔۔ تو میرا گھر خالی تھا۔ میرے پڑوسی نے اس میں تالا ڈال دیا تھا۔ میں بہت حیران ہوا کہ آخر ماں کہاں چلی گئی؟ پھر۔۔۔ پھر مجھے جو کچھ معلوم ہوا انسپکٹر صاحب! اس نے مجھے توڑ کے رکھ دیا۔ میں۔۔۔ میں رو پڑا۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میں اپنی ماں سے کتنی محبت کرتا تھا' میری ماں میری جدائی برداشت نہ کر سکی۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ آخر دم تک اس کی نگاہیں دروازے سے لگی رہی تھیں اور۔۔۔ اور اسی عالم میں اس کا دم نکل گیا تھا۔ میں۔۔۔ میں انسپکٹر صاحب! اپنی۔۔۔ اپنی ماں کا قاتل ہوں۔ میں نے۔۔۔ میں نے زندگی بھر اسے دکھ دیے اور۔۔۔ اور وہ زندگی بھر مجھے دعائیں دیتی رہی۔ مجھے۔۔۔ مجھے معلوم ہوا کہ۔۔۔ کہ اسے۔۔۔ اسے میری ماں کو چندے کا کفن دیا گیا اور۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں اسے۔۔۔ میں آخری وقت اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ میں بہت بدنصیب۔۔۔ بد۔۔۔ نص۔۔۔ نصیب۔۔۔"

شاہنواز کی آواز رندھ گئی اور وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

"نہیں' تم بدنصیب نہیں بلکہ خوش نصیب ہو۔" میری سمجھ ہی میں نہ آ سکا کہ اسے کس طرح تسلی دوں۔ پھر مجھے معاً خیال آیا کہ جس کی ماں مر جائے وہ خوش نصیب نہیں ہوتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں' تم واقعی بدنصیب ہو۔۔۔ تم۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ تم پان بیڑی کی دکان کھول ہی لو۔ بس پان بیڑی میں ڈنڈی نہ لگانا! ہاں! باقی کوئی فکر نہ کرو۔"

شاہنواز غالباً سمجھ چکا تھا کہ اب اس کے ساتھ میرا ارادہ

ہمدردانہ ہو چکا ہے اِس لیے اس نے مجھے احسان مندانہ نظروں سے دیکھا۔ اسے مزید کچھ دیر دَم دلاسا دے کر میں دفتر جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خیال آیا، ممکن ہے شاہنواز اس جگہ کی نشان دہی کر سکے جہاں اسے قید رکھا گیا تھا مگر میری توقع پوری نہ ہوئی۔ شاہنواز نے میرے سوال کے جواب میں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے بتایا کہ جب اسے اغوا کیا گیا تو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ بے ہوشی کے عالم ہی میں اسے وہاں لے جایا گیا تھا، پھر جب رِہا کیا گیا تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر لے جایا گیا تھا۔ وہ صرف اتنا بتا سکا کہ شاید کوئی تہ خانہ تھا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ جو شخص اسے کھانا اور ناشتا وغیرہ پہنچاتا تھا، وہ صورت اور اپنے حلیے سے ہندو لگتا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد میں شاہنواز سے رخصت ہو کر یا اسے رخصت کر کے دفتر کی طرف چل دیا۔ جس وقت میں دفتر پہنچا تو زور کی بھوک لگ رہی تھی کیوں کہ دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔

میں اپنا وہ چھوٹا سا کٹوردان، سیٹھ عثمان کے دفتر ہی میں چھوڑ کر بھاگ لیا تھا جس میں روزانہ گزشتہ نو دن سے دوپہر کا کھانا لے جاتا تھا۔ مجھے اگر کوئی دکھ تھا تو پیتل کے اس کٹوردان ہی کا تھا کیوں کہ اس کے بارے میں امّی مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتی تھیں۔ جب میں سیٹھ عثمان کے دفتر سے بھاگا تھا تو حالات اس قدر ہنگامی تھے کہ مجھے کٹوردان کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب بھوک لگی تھی تو کٹوردان یاد آیا تھا۔ میں نے کٹوردان کے فراق میں ایک طویل آہ کھینچی اور اپنے کمرے کی طرف قدم اٹھا دیے۔

کمرے میں اس وقت اللہ کے فضل سے میرے سبھی ماتحت موجود تھے مگر میں نے ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ میں نے پہلی فرصت میں چپراسی کو بلا کر آلو چھولے کی ایک ڈبل پلیٹ لانے کا حکم دیا اور پیسے دے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ میں نے یہ سوچ کر اپنی آنکھیں بھی بند کر لی تھیں کہ ان صورت حراموں پر میری نظر نہ ہی پڑے تو اچھا ہے۔ اس وقت سب سے اہم مسئلہ پیٹ بھرنا تھا، اس کے بعد ہی میں ان پر اپنی افسری چھانٹ سکتا تھا۔

جلد ہی چپراسی، آلو چھولے کی ڈبل پلیٹ لے آیا۔ اسے معلوم تھا کہ میں مرچیں تیز کھاتا ہوں۔ وہ اسی لیے خوب مرچیں ڈلوا کر لایا تھا۔ چھولے کھا کر مزہ آ گیا۔ میں نے دو گلاس پانی اوپر سے پیا۔ آنکھوں میں روشنی سی آ گئی۔ خیریت یہ گزری کہ اس دوران میں کمار پیارے لال ہنر نے کوئی "لیٹر چونچاپن" نہیں کیا ورنہ میں چھٹ تا۔ بھوکا آدمی یوں بھی بات بات پر کھانے کو دوڑتا ہے۔

اس وقت کمار یا پیارے لال ہنر سے چونچیں لڑانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اسی لیے کمار کا ایک آدھ فقرہ خاموشی سے پی گیا۔ بھلا میں کمرے میں موجود رہوں اور وہ مجھے ستانے کی کوئی راہ نہ نکالے یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی پسلی ضرور پھڑکتی تھی اور پھر پھڑکتی ہی چلی جاتی تھی۔ موجودہ صورتِ حال سے سر تھامسن کو آگاہ کرنا ضروری تھا اس لیے میں ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکالتا ہوا کمرے سے ٹسل لیا۔ یوں بھی کمار اس وقت زیادہ موڈ میں معلوم نہیں ہوتا تھا ورنہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہہ دیتا کہ لاکھ کوشش کے باوجود میں اس سے اُلجھ پڑتا۔

چچا بندو خاں نے مجھے کئی دن بعد دیکھا تھا اس لیے بہت صدقے واری ہوئے، بس میری بلائیں لینے کی کسر رہ گئی۔ چچا بندو خاں سے جیسے تیسے جان چھڑا کر میں سر تھامسن کے کمرے میں داخل ہو ہی گیا۔ میری آمد کی اطلاع چچا بندو خاں دے ہی چکے تھے۔ سر تھامسن نے مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"سر! بس زندگی تھی جو بچ آیا۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی دون کی چھوڑی۔

"کیوں، کیا ہوا؟ کیا تم پھر مجرموں کے ہتھے چڑھ گئے تھے؟" سر تھامسن بولے۔

"اب کوئی کُوٹ نہیں بچ رہی سر کہ وہ ہر بار مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے لے جائیں۔" میں نے کہا، پھر سر تھامسن کو تمام واقعات نمک مرچ لگا کر سنا دیے مگر دانستہ فی الحال لیوسی کا تذکرہ نہیں کیا۔

"ہوں!" سر تھامسن نے ہنکارا بھرا۔ "سیٹھ عثمان کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کرنا بہرحال آسان کام نہیں۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ ویسے اسے شک کیسے ہوا؟" وہ یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے، پھر آپ ہی آپ بڑبڑائے۔ "ممکن ہے یہ محض اتفاق ہو کہ وہ بہاری لال کو اپنے ساتھ دفتر لے آیا۔ غلطی تمھاری بھی ہے، تمھیں نیا میک اَپ کرنا چاہیے تھا۔"

میں بھلا اتنی آسانی سے اپنی غلطی کیسے تسلیم کر لیتا۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ اس وقت اتنی مہلت ہی کہاں تھی، پھر بولا۔ "ویسے اطلاعاً عرض کر دوں سر کہ جسے آپ اتفاق سمجھ رہے ہیں، وہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بہاری لال، سیٹھ عثمان سے ملا ہوگا تو اس نے یقیناً سفارشی خط کا ذکر کیا ہوگا اور پھر سیٹھ اسے لے کر تحقیقِ حال کے لیے دفتر کی طرف دوڑ لیا ہوگا۔"

سر تھامسن نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، تم نے بالکل ٹھیک نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

توصیفی کلمات سن کر میں پھول گیا اور مزید کہا۔ "میں تو سر ہمیشہ

ٹھیک ہی کہتا ہوں، کبھی میری بات سمجھ لی جاتی ہے اور کبھی نہیں سمجھی جاتی۔"

"خیر اب یہ قصّہ چھوڑو۔ اگر سیٹھ کا منیجر رگھوناتھ نہیں ملتا تو نہ ملے، ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتے۔ ویسے اس دوران میں رگھوناتھ کو ایک بار سیٹھ عثمان سے ملتے دیکھا گیا ہے۔"

"اور یہ اطلاع لیوسی نے دی ہوگی۔" میں نے جھٹ سے اپنی قابلیت بگھار دی۔

سر تھامسن نے پہلے مجھے گھور کر دیکھا، پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم ہر طرف سے باخبر رہتے ہو۔" سر تھامسن بولے۔ "لیوسی اچھی جا رہی ہے۔ امید قوی ہے کہ وہ بہت سی اہم معلومات حاصل کر لے گی۔ یہ بھی امکان ہے کہ وہ سیٹھ عثمان کے خلاف کوئی ثبوت حاصل کر لے۔"

"مشکل ہے سر!" میں نے لیوسی کا رنگ جیتے دیکھ کر کہا۔ "عورتوں کے ناک نہ ہو تو وہ گو کھائیں۔" میں ترنگ میں کہہ گیا۔

"تم نے یہ کیا خرافات شروع کر دی!" سر تھامسن کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"سر! یہ ہمارے یہاں کا ایک مقبول و ہر دل عزیز محاورہ ہے۔ میرے ابّا بھی کبھی کبھار امّی سے یہ محاورہ بول دیتے ہیں۔" میں نے وضاحت کی۔

"ہوگا، ہوگا!" سر تھامسن ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "اس وقت محاورے بولنے سے گریز کرو۔"

"بہتر ہے۔" میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ سر تھامسن کچھ "سوچائی" کر رہے تھے جس کا اظہار ان کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ میں اس لیے خاموش بیٹھا رہا کہ کچھ بولوں تو کہیں بڑھاپا مجھ پر "ٹھکیا" نہ پڑے۔ پھر موصوف کے لب خود ہی کھلے۔ "حکومت کے لیے یہ بڑا ہنگامی اور آزمائشی دور ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ حالات کیا ہوں اور کیا قدم اٹھانا پڑے۔"

"مگر سر، اس کیس سے کیا تعلق اس بات کا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔" میں نے سیدھی بات کہہ دی۔

"تعلق ہی تو ہے اسی لیے میں سوچنے پر مجبور ہوں۔" سر تھامسن طویل سانس لے کر بولے۔ "تمھیں علم ہے کہ اس وقت سارے ہندوستان میں انتخابی مہم زوروں پر ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں ہی کے لیڈر سرگرم ہیں۔ وہ شہروں شہروں دورے کر رہے ہیں۔ کیا تم نے اپنے ذہن سے یہ بات نکال دی کہ مجرموں کا مقصد کیا ہے؟ کیا تم بھول گئے کہ وہ کسی اہم سیاسی شخصیت کو قتل کرا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑوانا چاہتے ہیں؟ وہ یہاں حکومت کو سیاسی بحران میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کا مفاد اس میں ہے کہ کوئی ایسا ہنگامہ جنم نہ لے تاکہ اطمینان کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں پر حکومت کی جا سکے۔ اب سمجھے کچھ! یہ دونوں گروہ کسی بھی سبب آپس میں لڑ پڑے تو حکومت کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

بڈھا بڑا گھاگ تھا اور اس کا "گھاگ پن" باتوں سے ظاہر تھا۔ معلوم نہیں کیسے سچی بات اس کی زبان پر آ گئی تھی۔ نہ اسے ہندوؤں سے دلچسپی معلوم ہوتی تھی نہ مسلمانوں سے! اسے تو بس انگریزی اقتدار سے دلچسپی تھی۔ اس کی باتیں سن کر میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا۔ اس کے ذہن پر کیا فکر سوار تھی اور کیا نہیں، مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ جانے اس کا کام، میری بلا سے! مجھے تو ڈیوٹی "بجانا" تھی اور داد بٹورنا تھی، سو دونوں کام اللہ کے فضل سے جاری تھے۔

مجھے سنجیدگی سے اپنی باتیں سنتے دیکھ کر بڈھا پھر منمنایا۔ "ایک بڑا کانگریسی ہندو لیڈر راجندر پرشاد، دہلی کا دورہ کرنے والا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسلمان لیڈر کے بھی یہاں آنے کی خبر ہے۔ اس موقع سے مجرم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!"

"بالکل سمجھ رہا ہوں سر، قطعی سمجھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجرم ان دونوں ہی کا جھٹکا کر دیں گے۔" میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

سر تھامسن نے مجھے گھور کر دیکھا اور ماتھے پر بھی ایک آدھ بل پڑ گیا۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ "دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا سر کہ مجرم، ان دونوں لیڈران کرام کا جھٹکا کرنے کی کوشش..."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" سر تھامسن بات کاٹ کر بولے۔ "سنجیدگی اختیار کیا کرو، ہر وقت آدمی ایک سے موڈ میں نہیں ہوتا۔"

"قطعی صحیح کہا سر آپ نے! میرا خود یہ حال ہے۔ کبھی مجھے آلو چھولے اچھے لگتے ہیں اور کبھی دہی بڑے!"

"یکومت!" اس بار سر تھامسن نے مجھے ڈانٹ ہی دیا، پھر بولے۔ "سنو، فی الحال ہمیں حفاظتی اقدامات کرنا ہیں۔ کل ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے گا کہ کانگریسی لیڈر راجندر پرشاد کب دہلی پہنچ رہا ہے۔ اس موقع پر ہمیں بہت چوکنا رہنا ہے۔"

سر تھامسن نے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سلسلے میں مجھ حقیر فقیر کو کیا خدمات انجام دینا تھیں، سو میں نے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

"اس سلسلے میں تمھیں کل تیواڑی سے میری ہدایات مل جائیں گی۔" سر تھامسن نے جواب دیا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

معلوم نہیں، وہ بڈھا براہِ راست مجھے ہی اپنی ہدایات سے نواز دیتا تو کون سی اس کی ذات گھٹ جاتی! مگر ظاہر ہے کہ میں اس بات پر احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ میں سر تھامسن کو فکر مند چھوڑ کر باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی چچا بندو خاں چہکے۔ "صاحب تمھارے سوا کسی کو مشکل ہی سے اپنے پاس بٹھاتے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے اس طرح حیرت کا اظہار کیا جیسے واقعی یہ میرے لیے نئی بات ہو۔ مقصد چچا بندو خاں کو خوش کرنا تھا کیوں کہ وہ بہرحال میری ہونے والی جورو کے ابا جان تھے۔

"اور کیا بیٹے!" چچا بندو خاں نے مزید کہا۔ "اللہ جسے چاہے عزت دے۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا چچا!" میں نے ان کی تائید میں کہا اور جلدی سے بولا۔ "اچھا خدا حافظ چچا! صاحب نے مجھے ایک ارجینٹ کام دیا ہے جو اسی وقت۔۔۔"

"ہاں ہاں، جاؤ۔" چچا میری پوری بات سُنے بغیر ہی بول اٹھے۔ "پہلے کام ہے، بعد میں کچھ اور! اللہ تمھیں خوش رکھے!"

چچا بندو خاں کی دعائیں سمیٹ کر میں اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

ابھی میں کمرے میں داخل نہیں ہو سکا تھا کہ تیواڑی جی کے چپراسی نے میرا راستہ روک لیا۔ اس نے تیواڑی جی کے پاس طلبی کا حکم سنایا۔ معلوم نہیں، تیواڑی جی کو کیسے خبر ہو گئی تھی کہ میں دفتر میں آ گیا ہوں۔ بہرحال نہ اگر جبراً مجھے ان سے ملنے جانا پڑا۔ میں اس لیے ان کے پاس جانے سے ڈر رہا تھا کہ وہ پہلے ہی کچھ خفا خفا تھے۔

میں تیواڑی جی کے کمرے میں پہنچا تو خلافِ توقع ان کا موڈ اچھا دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔ "بیٹھو، مجھے کمار سے معلوم ہو گیا تھا کہ تم دفتر آ گئے ہو۔"

"کمار سے؟" میں حیرت سے بولا۔

"ہاں وہ کچھ دیر پہلے میرے پاس تھا۔ میں نے اُسے ایک کام سے بُلوایا تھا۔" تیواڑی جی نے وضاحت کی اور اس کے ساتھ سگریٹ سلگا لی۔

"اپنے خادم کو بھی آپ نے کسی کام ہی سے بُلوایا ہوگا۔" میں ان کا خوش گوار موڈ دیکھ کر عاجزی سے بولا تاکہ خدا وہ وقت نہ لائے جب ان کی نوکیلی مونچھیں حرکت کرنے لگیں۔

"خادم! یہ تم نے اچھا کہا۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑے۔ "اس زمانے میں کون کسی کو مانتا ہے۔ بس ذرا اوپر اٹھنے کا موقع مل جائے پھر دیکھو!"

"سر! جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں آپ کو استاد جی سمجھتا ہوں، بقیہ کی میں کہہ نہیں سکتا۔" لفظِ استاد کے ساتھ "جی" میں نے بس احتراماً لگا دیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ننھا سا "جی" تیواڑی جی کی مونچھوں کو حرکت میں لے آئے گا۔

"کیا کہا تم نے!" وہ ایک دم اپنے اصلی رنگ پر آ گئے۔ "تم نے مجھے استاد جی کہا ہے؟"

"ہاں کہا تو ہے سر مگر کیا غلط کہا ہے؟" میں مردہ سی آواز میں بولا کیوں کہ ان کا موڈ بدلتے دیکھ کر میں واقعی سہم گیا تھا۔

"مجھ سے زیادہ اُڑنے کی کوشش مت کرو! تم سب جانتے ہو سب!" تیواڑی جی ہاتھ لہرا کر بولے اس طرح جیسے زبردستی مجھ سے "اقبالِ جرم" کرا لینا چاہتے ہوں۔

اس وقت واقعی مجھے علم نہیں تھا کہ "استاد" اور "استاد جی" میں کیا فرق ہے۔ میں حیران تھا کہ آخر اچھی بھلی فضا اس ایک "جی" نے کیسے خراب کر دی۔ یہ بات تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ طوائفیں ان حضرات کو "استاد جی" کہہ کر پکارتی ہیں جو انھیں گانا بجانا سکھاتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیا۔ میں نے کہا۔ "بھول ہو گئی سر! معاف کر دیجیے، زبان پھسل ہی جاتی ہے۔"

"اپنی زبان کو لگام دے کر رکھا کرو۔" تیواڑی جی منہ بنا کر بولے مگر معافی مانگ لیے جانے کے بعد اب ان کے لہجے میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں تیواڑی جی کو بتا سکتا، جناب! میری زبان کوئی گھوڑا نہیں ہے جسے لگام کی ضرورت ہو۔ اب میں اتنا بھی سیدھا نہیں تھا کہ زبان اور گھوڑے میں فرق محسوس نہ کر سکتا۔ پھر بھی میں نے خاموشی ہی غنیمت جانی۔

"سر!" میں نے تیواڑی جی کو مخاطب کیا۔ "آپ نے مجھے کس لیے طلب کیا تھا؟"

"میں تم سے رپورٹ لینا چاہتا تھا۔" انھوں نے بڑی تمکنت کے ساتھ کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، تیواڑی جی کا چپراسی کمرے میں داخل ہوا اور وہ چپراسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تیواڑی جی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں چپراسی نے دلاور خاں کے آنے کی اطلاع دی۔ اور میں چونک پڑا۔ تیواڑی جی نے لمحے بھر کچھ سوچا، پھر چپراسی کو حکم دیا کہ وہ دلاور خاں کو بھیج دے۔

تیواڑی جی کے پاس میری موجودگی سے دلاور خاں بھی چونکے ہوں گے، ان کا انداز یہی بتا رہا تھا۔ دلاور خاں ایک کرسی درمیان میں چھوڑ کر تیواڑی جی کے اشارے پر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا ہوا؟ شرما آ گیا کیا؟" تیواڑی جی نے دلاور خاں کے ایک ماتحت کے بارے میں ان سے دریافت کیا۔

"جی ہاں سر!" دلاور خاں نے جواب دیا۔

"کوئی نئی بات؟"

"جی سر، میں اسی لیے حاضر ہوا تھا۔" دلاور خاں نے پہلو بدلا اور کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ میرے سامنے کچھ کہتے ہوئے جھجک رہے ہوں۔

ان کے ہچکچانے کو تیواڑی جی نے بھی محسوس کر لیا اور بولے۔ "بتاؤ نا، سوچ کیا رہے ہو!"

"شرما کی رپورٹ یہ ہے سر کہ سیٹھ عثمان آج لیوسی اور بہاری لال کو ساتھ لے کر چاندنی چوک میں اپنے دفتر پہنچا۔" دلاور خاں رپورٹ دینے لگے۔

لیوسی کے ذکر پر میرے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بوڑھے سر تھامسن کا من بھاتا کھیل جاری تھا، یہ الگ بات تھی کہ کردار بدل گئے تھے۔ اب اس نے میری بجائے لیوسی کو چارا بنا لیا تھا۔

میں پھر دلاور خاں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "۔۔۔ دوران میں لیوسی کار ہی میں بیٹھی رہی۔ پھر کوئی گھنٹے بھر بعد سیٹھ عثمان اپنے دوست بہاری لال کے ہمراہ باہر آیا۔ شرما نے سیٹھ کی کار کا تعاقب کیا۔ سیٹھ عثمان، نئی دلی واپس ہونے کی بجائے موری گیٹ پہنچا جہاں اس نے لیوسی اور بہاری لال کو اتار دیا۔ بہاری لال، لیوسی کو ساتھ لیے اپنے گھر کی نچلی منزل میں چلا گیا۔ اس وقت سے لیوسی وہیں ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر دلاور خاں خاموش ہو گئے۔

"شرما کی جگہ راٹھور وہاں پہنچ گیا تھا؟" تیواڑی جی نے پوچھا۔ راٹھور بھی دلاور خاں ہی کے ماتحتوں میں سے ایک تھا۔

"جی ہاں سر!" دلاور خاں نے جواب دیا۔ "شرما اسی وقت وہاں سے ہٹا تھا جب راٹھور نے اس کی جگہ لے لی تھی۔"

"ہوں!" تیواڑی جی سوچ میں پڑ گئے اور میں بھی! وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا رہے تھے۔ "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر سیٹھ عثمان نے لیوسی کو بہاری لال کے پاس کیوں چھوڑ دیا؟"

"جب تک لیوسی کی طرف سے کوئی رپورٹ نہ ملے، کیا کہا جا سکتا ہے سر!" دلاور خاں بول اٹھے اور بولنا انھیں مہنگا پڑا۔

"چُپ بیٹھو!" تیواڑی جی نے دلاور خاں کو ڈانٹ دیا تھا۔ "بلکہ اب تم جا سکتے ہو!"

"جی بہتر سر!" دلاور خاں سعادت مندی سے سر ہلا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"تم بھی جا سکتے ہو، کل صبح مجھ سے ملنا۔" تیواڑی جی نے مجھے بھی مخاطب کیا۔

میں تو خود ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا اس لیے فوراً کرسی چھوڑ دی۔ اِدھر دلاور خاں باہر نکلے، اُدھر میں! مجھے معلوم تھا کہ باہر نکلتے ہی دلاور خاں مجھے "سینگ" مارنے کی پوری کوشش کریں گے اس لیے جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ دلاور خاں نے مجھے روکنے کے لیے ہانک بھی لگائی مگر میں سُنی، اَن سُنی کر کے نکل ہی گیا۔

دفتر کا وقت بس اب ختم ہی ہونے والا تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف چلا جدھر میک اَپ روم تھا۔ ایک بار مجھے پھر اپنے چہرے کی مرمت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

میرے بالائی ہونٹ پر ابھی پوری طرح مونچھیں نہیں اُگی تھیں یعنی گھنی مونچھیں! اور مجھے مونچھوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے ایک "چھپر کٹ" مونچھ منتخب کی اور بالائی ہونٹ پر چپکا لی۔ اس سے پہلے میں اپنے چہرے پر ایک جھلی چڑھا چکا تھا جس نے بڑی حد تک میرے جوان چہرے کو ادھیڑ عمری میں تبدیل کر دیا تھا۔ پہلے والی جھلی جیب سے نکال کر میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی تھی۔ پھر میں نے اپنے بالوں کا اسٹائل بھی بدل دیا، بیچ سے مانگ نکال لی اور دائیں رخسار پر اپنا پسندیدہ مسّا چپکا لیا۔ جب میں کپڑے بھی تبدیل کر چکا تو اچھا خاصا غنڈہ نظر آنے لگا۔ گردن میں، میں نے سرخ رومال باندھ لیا تھا اور ایک دھار دار امپوری

چاقو بھی جیب میں ڈال لیا تھا، ریوالور دوسری جیب میں تھا۔ پوری "کارستانی" میں مجھے بمشکل نصف گھنٹہ لگا۔ آئینے پر آخری تنقیدی نظر ڈال کر میں میک اَپ روم سے نکلا اور بیک ڈور سے باہر آ گیا۔

اب تک میں اپنی چال اور آواز پر قابو نہ پا سکا تھا۔ میں اپنی چال بدلنے کی خاطر سینہ تان کر چلنے لگا۔ سنسان گلی میں اس وقت کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے حلق سے بولنے کی پریکٹس بھی شروع کر دی۔ اگر میں اپنی ان دونوں کمزوریوں پر قابو پا لیتا تو پھر مجھے کوئی نہ پہچان پاتا۔ لیوسی نے بھی انھی دونوں باتوں پر تنقید کی تھی۔ میں یہی سوچتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا کہ اگر آدمی کوشش کرے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ حالات و واقعات نے رفتہ رفتہ مجھ میں تھوڑی بہت خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس وقت بھی میں جو قدم اٹھانے جا رہا تھا، وہ اسی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا ورنہ مجھ سے کس نے کہا تھا کہ موری گیٹ کا رُخ کرتا اور لیوسی کی خبر خبر لیتا۔ میک اَپ کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی تھی کہ دلاور خاں کا ٹٹو، یعنی راٹھور مجھے نہ پہچان سکے۔ وہ بھی بہرحال بہاری لال کے گھر کی اطراف میں منڈلا رہا ہوگا۔

ایک تکے میں بیٹھ کر میں موری گیٹ پہنچ گیا۔ بہاری لال

کا گھر میں نے دیکھا تھا اس لیے مجھے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ لیوسی اگر اس وقت تک وہیں ہوگی تو راٹھور بھی کہیں نہ کہیں آس پاس موجود ہوگا' یہ میں پہلے ہی سوچ چکا تھا' میں نے اسی لیے پہلے راٹھور کو تلاش کرنا ضروری سمجھا۔

اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ابھی دن کی روشنی قطعی معدوم نہیں ہوئی تھی۔ یوں بھی گرمیوں کے دن ذرا لمبے ہوتے ہیں' یعنی سورج بہادر جلدی نہیں ڈوبتے۔ میں بہاری لال کے گھر کی اطراف میں دو چکر لگا چکا تھا مگر راٹھور مجھے کہیں نظر نہ آسکا تھا۔ راٹھور وہاں نہیں تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ لیوسی وہاں سے جا چکی ہے یا لے جائی جا چکی ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں ایک بار پھر

بہاری لال کے گھر کے سامنے سے گزرا اور چونک پڑا۔ مجھے جگدیش بابو سامنے سے آتے دکھائی دیے تھے اور وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ یہ وہی جگدیش بابو تھے جن سے میری ملاقات بہاری لال کے یہاں ہوئی تھی اور میں انہی کا خط لے کر بہاری لال تک پہنچا تھا۔ میں سیدھا چلتا ہوا ان لوگوں کے قریب سے گزرا اور اسی وقت ایک جملہ میرے کان میں پڑا۔

"جگدیش بابو! کہیں وہ لونڈیا پھیل نہ مچائے' اتنے آدمی دیکھ کر!" یہ جملہ جگدیش بابو سے ان کے ساتھ چلنے والے ایک شخص نے کہا تھا جو چہرے ہی سے اوباش معلوم ہو رہا تھا۔

جواب میں جگدیش بابو نے کیا کہا' میں سن نہ سکا کیوں کہ وہ لوگ میرے قریب سے گزر گئے تھے۔ اس ایک جملے نے میرے کئی طبق روشن کر دیے تھے۔ میں نے کئی رومانی ناولوں میں اس طرح کے سین پڑھے تھے۔ ہیروئن بے چاری کی عزت پر حملہ کرنے کے لیے بہ یک وقت کئی غنڈے آگے بڑھتے ہیں اور عین وقت پر ہیرو صاحب انھیں للکار دیتے ہیں اور پھر گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ پھر بالآخر ہیرو صاحب اپنی پیاری ہیروئن کو ظالموں کے "پنجۂ ستم" سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ہیروئن' ہیرو صاحب سے لپٹ کر "ہمپانے" یعنی رونے لگتی ہے۔ میں نے سوچا' ہو نہ ہو یہاں بھی کوئی ایسا ہی "سین بائٹ" ہونے والا ہے۔ بس ایک ہی کمی ہے کہ یہاں بے چارہ ہیرو موجود نہیں۔ ہیرو بننے کا یہ سنہری موقع تھا اور مجھے ہیرو بننے کا شوق تھا اس لیے میں نے خالی جگہ پُر کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں کچھ دور چل کر واپس ہوا تو ایک سادھو مہاراج پر میری نظر پڑی جو میری ہی طرف آ رہے تھے۔ ان سادھو مہاراج کو شاید تیسری یا چوتھی بار میں نے دیکھا تھا۔ سادھو مہاراج نے معاً نعرہ مارا: "ہری ہری ہری!"

سے گزر جاتے تو شاید میں نہ چونکتا مگر ان کے نعرے نے میرے قدم روک لیے۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں بھی تو آخر کچھ دن دلاور خاں کی ماتحتی بھگت چکا تھا' پھر آخر راٹھور کی آواز کیسے نہ پہچانتا!

ہوں' تو یہ حضرت بھی بھیس بدل کے پھر رہے ہیں! میں نے سوچا مگر راٹھور سے کچھ نہیں کہا۔ اب میری توجہ بہاری لال کے گھر کے دروازے کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ راٹھور میرے قریب

سے گزر چکا تھا۔ لمحے بھر کو دروازے پر بہاری لال کا پریشان سا چہرہ نظر آیا تھا' پھر اس نے جگدیش بابو اور ان کے ساتھیوں کو اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ خطرہ بلکہ مزید تین عدد خطرے' ہیروئن یعنی لیوسی کی طرف بڑھنے والے تھے۔ غالباً لیوسی تنہا بہاری لال کے قابو میں نہیں آئی ہوگی اسی لیے اس نے اپنے دوستوں کو بھی مدعو کر لیا تھا۔ بلبل قید میں تھی اور صیاد اس پر جھپٹنے والے تھے۔ اب مجھے میدان عمل میں کود ہی پڑنا چاہیے! میں نے سوچا۔ مجھے دلاور خاں اور ان کے ماتحتوں کے طریقۂ کار کا علم تھا۔ وہ سب بس دور دور ہی سے نظارہ مارتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ راٹھور اسی طرح گلیوں میں نعرے مارتا پھرے گا اور خود کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اسے جس کام کا حکم دیا گیا ہے' بس وہ اتنا ہی کرے گا' نہ ایک انچ آگے نہ ایک انچ پیچھے! چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ لیوسی کی نگرانی کرائی جا رہی ہے اور یہ کام دلاور خاں کے سپرد کیا گیا ہے۔ لیوسی انہی نگرانی کرنے والوں میں سے کسی کے ذریعے موقع دیکھ کر کوئی پیغام بھجوا دیتی ہوگی ورنہ سر تھامسن کو اس کا علم کیسے ہوتا کہ اس دوران میں رگھوناتھ' سیٹھ عثمان سے ملا تھا۔

حالات کی سنگینی کا مجھے پوری طرح احساس ہو چکا تھا۔ یوں بھی لیوسی میری ہیروئن نہ سہی' میں تو اس کا ہیرو تھا۔ مجھے علم تھا کہ لیوسی مجھ سے عشق کرتی ہے۔ پھر یہ کہ وہ غریب میری "ساتھن" بھی تھی۔ میں اور وہ ایک ہی ساتھ تو کام کر رہے تھے۔ اس بُرے وقت میں لیوسی کی مدد کرنا میرا "دفتری فرض" بھی تھا اور عشق کا تقاضا بھی! اس کے علاوہ میں ہیرو بھی بن سکتا تھا۔ اب صرف سوچنا یہ تھا کہ میں کروں تو کیا کروں؟ وقت بہت کم تھا۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ ناولوں کی ہیروئنوں کی طرح لیوسی بے چاری بھی خود بچ جاتی یا بدمعاشوں کے چنگل سے بچالی جاتی۔ ناول نگاروں کے تو ہاتھ میں قلم ہوتا ہے جسے چاہیں مروا دیں' جسے چاہیں بچا دیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ ایک قلم کی ذرا سی جنبش میں دو چار لاشیں گرا دیں بالاش کے منہ سے نعقصہ اگلوا دیں اور بعد میں کھیم کر کے دراصل

جس وقت "چکو" پڑا' بندہ آڑا ہو گیا تھا' بس لاش بن جانے کی اداکاری فرما رہا تھا۔ تو یہ کسی ناول کا سین نہیں چل رہا تھا بلکہ سچ مچ کی ایک صحیح سلامت لڑکی کی عزت کا سوال تھا جس کا

کوئی سگا بھائی بھی موقع پر موجود نہیں تھا جو نعرہ مار کر بہن کی عزت کی خاطر اپنا گلا آگے کر دیتا۔ لے دے کر وہاں صرف میں تھا اور مجھے ہی کوئی قدم اٹھانا تھا۔ رہا راٹھور تو وہ کسی مرض کی دوا نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے معاً میرے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ دوسری اس سے بہتر ترکیب سوچنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں تقریباً دوڑتا ہوا بہاری لال کے دروازے پر پہنچا اور اسے دھڑ دھڑا دیا۔

"کک... ککو... کون... کون ہے؟" کہیں دور سے ایک خوف زدہ سی آواز سنائی دی اور یہ آواز بہاری لال ہی کی تھی۔

میں نے تعارف پیش کرنے کی بجائے دوبارہ دروازہ پیٹ ڈالا۔

"آ... آتا ہوں بھائی!... آ... آتا ہوں۔" آواز پھر آئی۔

ابے بدبخت! میں کیوں ہوتا تیرا بھائی! میں نے دل ہی دل میں کہا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ بہاری لال کے اہل خاندان غالباً مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے جس کا زینہ قریب ہی تھا۔ میں نے ایک آدھ بچے کو اس دوران میں زینہ چڑھتے اترتے دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی دروازہ کھل گیا اور بہاری لال کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور وہ کچھ گھبرایا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا' سانس چڑھا ہوا تھا جیسے بھاری مشقت کر کے آیا ہو۔

"کون... کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"پولیس..."

"کیا؟" بہاری لال اچھل پڑا۔ اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

"پولیس یہاں چھاپا مارنے والی ہے۔" میں نے جلدی سے کہہ دیا۔

"م... مگر تم... تمھیں... تم کون ہو؟ اور تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے سیٹھ عثمان نے بھیجا ہے۔ پولیس بس یہاں پہنچنے ہی والی..."

"اندر... اندر آ جاؤ!" بہاری لال نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا اور فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔

یہ وہی کمرہ تھا جس میں پہلے بھی میں آ چکا تھا۔ اندر والے کمرے کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا جو ہل رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اندر والے کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ میں جوتوں سمیت سفید چاندنی پر کھڑا ہوا تھا اور بہاری لال بدحواس سا کچھ سوچ رہا تھا۔

"جلدی کریں۔" میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ "سیٹھ صاحب نے کہا ہے کہ چھوکری کو جلد سے جلد یہاں سے ہٹا دیں۔ کسی بھی لمحے پولیس یہاں چھاپا مار سکتی ہے۔"

"م... مگر کہاں... اسے کہاں چھپا دوں میں؟... کک... کیا یہ نہیں... ہو..."

ابھی بہاری لال کا جملہ پورا نہ ہو سکا تھا کہ اندر والے کمرے کا پردہ اٹھا اور جگدیش بابو اپنے دونوں ساتھیوں سمیت باہر آ گئے۔

"ہم... ہم چلے بہاری!... پو... پولیس..." جگدیش بابو اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکے اور ان کے دونوں ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

"ار... ارے سنو تو... سن..." بہاری لال کہتا رہ گیا اور وہ لوگ دروازہ کھول کر بھاگ لیے۔

مجھے حیرت تھی کہ اگر لیوسی دوسرے کمرے میں موجود تھی تو چپ سادھے کیوں پڑی تھی؟ اسے بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں مارنا چاہیے تھے اور کچھ نہیں تو وہ کم از کم چیخ چلا تو سکتی تھی۔ میں نے اب تک بہاری لال سے جو بھی بات کی تھی' حلق کے بل کی تھی تاکہ میری آواز بدلی رہے حالانکہ اس طرح میرا حلق دُکھنے لگا تھا۔ اسی

دوران میں بہاری لال نے جھپٹ کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ میری ترکیب کامیاب بلکہ کسی حد تک کامیاب رہی تھی' مکمل کامیابی کا یقین تو لیوسی سے گفتگو کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

بہاری لال' دروازہ بند کر کے پلٹا تو دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تو تم... کیا تم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے؟ وہیں... سیدھے وہیں سیٹھ عثمان کی کوٹھی لے جاؤ اسے!"

"مگر سیٹھ صاحب نے تو مجھ سے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔" میں نے جان بوجھ کر اس بدبخت کو ستایا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تم کہنا کہ بہاری لال جی نے کہا تھا کہ..."

"آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "آپ جانیں اور سیٹھ صاحب جانیں۔"

"تم اسی کمرے میں ٹھہرو' میں ابھی اسے لے کر آیا... بلکہ تم

دونوں پچھلے دروازے سے نکل جاؤ۔" بہاری لال نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

میں الجھن میں پڑ گیا کہ رکوں یا اس کے ساتھ چلوں؟ پھر یہی سوال میری زبان پر بھی آ گیا۔

"جب میں تمھیں آواز دوں تو اندر آ جانا۔" بہاری لال نے جواب دیا اور پردہ اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ہو نہ ہو، دوسرے کمرے میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے ورنہ بہاری لال مجھ سے بعد میں بلانے کے لیے نہ کہتا۔ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ میرے دل میں دوسرے کمرے کا نظارہ مارنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ یوں بھی اب بہاری لال وہاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے لچے دوست جا چکے تھے۔ اس سے زیادہ ڈرنے کی ضرورت نہیں، میرے پاس چاقو بھی ہے اور ریوالور بھی! میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور پھر پنجوں کے بل بہت احتیاط سے آگے بڑھا تاکہ قدموں کی آواز نہ ہو۔

پردے کے قریب پہنچ کر میں نے سانس بھی روک لیا اور ہاتھ سے ذرا سا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ مجھے کمرے میں جو منظر نظر آیا، اس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان بدبختوں نے میری پیاری لیوسی کی یہ درگت بنائی ہو گی۔ بہاری لال کی پشت میری جانب تھی اور وہ لیوسی کا ایک پاؤں رسّی سے آزاد کر رہا تھا۔ لیوسی کو ایک چارپائی سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے دونوں پیر چارپائی کی دونوں پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ بھی! اس کے منہ پر بھی کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس کا لباس بے ترتیب سا تھا۔ اب میں سمجھا کہ لیوسی صدائے احتجاج کیوں بلند نہیں کر رہی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ لیوسی صرف بہاری لال کے بس کی نہیں تھی۔ یہ "کارنامہ" اس نے لازماً اپنے دوستوں کی مدد سے انجام دیا ہو گا۔ بہاری لال کے دوست میرے سامنے اندر گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انھیں لیوسی کو چارپائی سے باندھنے کے بعد زیادہ وقت نہیں مل سکا تھا۔ پھر یہ کہ میں نے دروازہ دھڑدھڑانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے کباب میں ہڈی بن کر گویا اپنی ہیروئن نمبر دو کی عزت و آبرو بچالی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں انتہائی پُرجوش ہو گیا۔ میری رگوں میں جوان لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ مجھے صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

اس دوران میں بہاری لال، لیوسی کے دونوں پیر رسّی کی گرفت سے آزاد کر چکا تھا اور اب اس کے ہاتھ کھول رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد لیوسی کے دونوں ہاتھ بھی آزاد ہو گئے۔ پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین سا منظر دیکھا۔ لیوسی کی بھرپور لات، بہاری لال کے منہ پر پڑی تھی اور اسی کے ساتھ وہ بجلی کی سی تیزی سے اچھل کر کسی بھوکی شیرنی کی طرح بہاری لال پر ٹوٹ پڑی تھی۔ بہاری لال لات پڑتے ہی چیخ کر چارپائی سے نیچے جا پڑا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ زمین سے اٹھتا، لیوسی نے اسے لاتوں پر رکھ لیا تھا۔ بہاری لال کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس سنسنی خیز منظر نے مجھ پر جیسے سحر سا کر دیا تھا۔ میں جہاں اور جس حالت میں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی عورت یا لڑکی کے ہاتھوں، کسی مرد کو یوں پٹتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ کہ لیوسی کو تو میں ایک نرم و نازک سی لڑکی سمجھتا تھا۔ وہ سراپا ناز دھول دھپّا بھی جانتی تھی، یہ میرے لیے نئی بات تھی۔

بہاری لال پٹتے پٹتے اور چیختے چیختے ایک بار اٹھنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا مگر لیوسی کے ایک گھونسے نے اسے پھر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس مار کٹائی میں لیوسی نے اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھولنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ بہاری لال اب باقاعدہ چیخ چیخ کر "بچاؤ، بچاؤ" کے نعرے بھی مار رہا تھا۔ پٹتے پٹتے اور گرتے پڑتے وہ "خونم خان" ہو گیا تھا۔ "بچاؤ، بچاؤ" کے نعرے شاید وہ میرے لیے مار رہا تھا کیوں کہ اس کی نظر میں، میں سیٹھ عثمان کا بھیجا ہوا آدمی تھا اور اس ناتے وہ مجھ سے فریاد کر سکتا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ ادھر میں کچھ اپنے حواس میں آیا، اُدھر کمرے کا دروازہ پیٹا جانے لگا۔ میں تو خیر بہاری لال کی فریاد و آہ و بکا سے متاثر نہیں ہوا تھا مگر شاید اس کے گھر والے یا پاس پڑوس والے اپنے کانوں میں تیل ڈالے نہ رہ سکے تھے۔ وہ غالباً بہاری لال کی چیخیں سن کر دوڑ لیے تھے۔ صورتِ حال کا اندازہ ہوتے ہی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اسی وقت شاید لیوسی نے بھی دروازے پر دی جانے والی دستکیں سن لیں۔ اس نے اِدھر چونک کر سامنے دیکھا، اُدھر میں کمرے میں داخل ہوا۔ بہاری لال بے دم سا ہو کر زمین پر پڑا ہوا چیخے جا رہا تھا۔ اب شاید اس میں اٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی یا وہ مزید کٹائی سے بچنے کے لیے مکر کیے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ لیوسی اب اپنے منہ پر بندھا ہوا کپڑا بھی کھول کر پھینک چکی تھی۔

مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر لیوسی لمحے بھر کو چونکی، پھر دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔

میں ایک دم بوکھلا کر چیخ پڑا تھا۔ "ارے ارے! یہ... یہ میں ہوں... میں!"

بوکھلا کر چیخ اٹھنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لیوسی نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے دھڑام سے زمین پر گری جس کے نتیجے میں، میں بلبلا اٹھا۔

"تم... تم!" لیوسی ہکلاتی ہوئی تیزی سے اٹھی۔

اسی وقت یوں معلوم ہوا جیسے دروازہ نہ کھولا گیا تو اسے توڑ ڈالا جائے گا۔ وہ دھڑدھڑاہٹ اتنی ہی شدید تھی۔ بہاری لال کی چیخوں کو اب نہ جانے کیوں بریک لگ گیا تھا۔ میں کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے بولا۔ "بھاگو! جلدی... جلدی بھاگو! اس گھر کا پچھلا دروازہ بھی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے میں اس دروازے کی طرف لپکا جس کی کنڈی اندر سے بند تھی۔ گھر کا پچھلا دروازہ اسی سمت ہو سکتا تھا۔

لیوسی نے میری تقلید کی۔ دروازے سے نکلتے ہی بڑا سا صحن تھا اور بالکل سامنے گھر کا پچھلا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا دروازے تک پہنچا اور اس کی کنڈی کھول دی۔ بھاری دروازہ کھلا ہوا چھوڑ کر میں گلی میں نکل آیا۔ لیوسی میرے پیچھے پیچھے تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو بھی تھوڑی بہت ترتیب دے لی تھی مگر اس کے باوجود وہ لٹی پٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔ فرار ہوتے وقت اسے نہ جانے اتنا ہوش کیسے رہا تھا کہ اپنے سینڈل بھی پاؤں میں ڈال لیے تھے جو شاید چارپائی کے قریب ہی پڑے ہوں گے۔

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہم دونوں گلیوں گلیوں کافی دور نکل گئے، پھر ایک سڑک پر آ نکلے۔ اب تک نہ لیوسی نے مجھے کچھ بتایا تھا، نہ میں نے کچھ پوچھا تھا۔ ہرچند کہ میرے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے تھے مگر یہ موقع بھاگنے کا تھا، پوچھ گچھ کا نہیں۔ عین ممکن ہے کہ لیوسی بھی مجھے وہاں "بہ وقت موقع" دیکھ کر "حیران" رہ گئی ہو لیکن وہ اب تک صبر کیے ہوئے تھی۔ اس نے بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں وہاں کس طرح پہنچ گیا۔ وہ زمانہ آج کے زمانے کی طرح لونڈیوں کو ساتھ ساتھ لیے پھرنے کا نہیں تھا۔ ہر شخص اس طرح دیدے "گڑو گڑو" کر دیکھتا تھا جیسے لونڈیا کی بجائے کوئی اور ہی عجیب مخلوق ساتھ ہو۔ پھر لونڈیا بھی کوئی ایسی ویسی نہیں "کٹو کٹار" قسم کی تھی کہ بس اس پر نظر پڑے تو پڑی رہ جائے۔ یہ میک اپ کا کمال تھا حالانکہ لیوسی کا اصل چہرہ بھی کم حسین نہیں تھا۔ وہ ابھی تک ڈور دکھی بنی ہوئی تھی۔

اب ہم دونوں، سڑک کے کنارے کسی سواری کے انتظار میں کھڑے ہو گئے تھے مگر ابھی منزل کا تعین نہیں ہوا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کدھر چلنا چاہیے، میں نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "لیوسی! ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی سماعت میں بہت کچھ انڈیل سکتے ہیں اس لیے کچھ دیر گپ سڑاکا، اشد ضروری ہے۔ تو پھر بتاؤ، کدھر چلا جائے؟"

"دفتر۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اس وقت؟" میں حیرت سے بولا کیوں کہ میں نے کبھی پانچ بجے کے بعد دفتر کا رخ نہیں کیا تھا۔

"کیوں، کیا ہوا!" لیوسی بولی۔ "مجھے اپنا حلیہ بھی درست کرنا ہے، دوسرے یہ کہ اب اس میک اپ کی بھی ضرورت نہیں رہی۔"

"ہاں تم نے یہ ٹھیک کہا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں بھی اب غنڈہ بنا رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے بھی گھر جانا ہے۔ اس صورت شکل میں تو ابا، جوتے مار مار کر چنیا گنجی کر دیں گے۔"

برسبیلِ تذکرہ یہ بتاتا چلوں کہ بظاہر تو سی آئی ڈی والوں کی ڈیوٹی بھی صبح سے شام تک ہی ہوتی ہے مگر یہ سب دکھاوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیوٹی پر چڑھنے اور اترنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ دن اور رات کی تخصیص غریب سی آئی ڈی والوں کے لیے نہیں ہوتی۔ بس بے چارے ہر وقت کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سی آئی ڈی آفس بھی دن رات کھلا رہتا ہے۔ معلوم نہیں کب کیا ضرورت پڑ جائے۔ وہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ لوگ موجود رہتے ہیں۔ ہاں ان کی ڈیوٹیاں ضرور بدلتی رہتی ہیں کیوں کہ ہر "بندہ بشر" میری طرح چوبیس گھنٹے تک تو ڈیوٹی نہیں بجا سکتا۔

ہم نے کشمیری گیٹ کے لیے ایک یکہ کیا اور دفتر کے لیے روانہ ہو گئے۔ میری سرکاری پھٹ پھٹ بھی دفتر ہی میں تھی اس لیے مجھے واپسی کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ میں اور لیوسی اطمینان سے دفتر میں بیٹھ کر گپ لڑا سکتے تھے۔ پھر ہم دونوں نے دفتر پہنچ کر ایسا ہی کیا۔

میں اور لیوسی اپنی اپنی جون میں آ چکے تھے اور اب کمرے میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں لیوسی بیٹھتی تھی۔ میں نے احتیاطاً اپنے کمرے کا رخ نہیں کیا تھا حالانکہ اس وقت ساڑھے سات بجے تھے اور کسی ماتحت کا "خطرہ" نہیں تھا۔

"ہاں تو لیوسی خانم بلکہ خونم، اب بولو کیا کہتی ہو!" میں طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ "کیا گزری تم پر، بتاؤ!"

"اوں... ہونہہ!" لیوسی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "پہلے تم!"

"کیوں؟" میں نے منہ بنایا۔

"اس لیے کہ تم ہر بار غچّا دے جاتے ہو۔ تم مجھ سے تو سب کچھ پوچھ لیتے ہو اور خود کچھ بھی نہیں بتاتے۔" لیوسی مسکرا کر بولی۔ "آج میں تمھاری باتوں میں نہیں آؤں گی۔"

لیوسی کا انداز ایسا تھا کہ میں اس پر فوراً لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے سپر ڈال دی اور بولا۔ "تم کہتی ہو تو یہی سہی۔ میری 'اِسٹوری' زیادہ لمبی نہیں۔ آج شام جب میں تیواڑی جی کے کمرے میں تھا تو دلاور خان آئے اور انھوں نے رپورٹ دی۔ اس رپورٹ سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کے ٹینک ٹوئنٹے تمھاری نگرانی کر رہے ہیں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ سیٹھ عثمان تمھیں بہاری لال کے گھر چھوڑ گیا ہے اور تم وہیں

ہو تو میں فکر مند ہو گیا۔ اس فکر مندی کا سبب تمہیں معلوم ہی ہے تمہیں تو خبر ہی ہے کہ میں بیوی نمبر دو کسے بنانا چاہتا ہوں!"

"بکومت!" لیوسی نے مجھے ڈانٹ دیا مگر میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ ڈانٹ، پیار بھری تھی۔ پھر اس نے موضوع گفتگو بدلنے کی خاطر سوال کیا۔ "تم گھر میں کس بہانے سے داخل ہوئے تھے؟ میں نے کچھ کچھ سنا تو ضرور تھا کہ تم نے غالباً سیٹھ عثمان کا نام لیا تھا مگر دوسرے کمرے تک تمہاری آواز کم پہنچ رہی تھی اور پھر تم حلق کے بل بھی بول رہے تھے، آواز بدل کر!"

میں نے جواب میں لیوسی کو بقیہ کتھا کہانی سنا کر کہا۔ "وہ الو کی دم فاختہ راٹھور تو یونہی گلیوں کے پھیرے مارتا رہتا، چاہے تم گھر کے اندر ذبح ہی کیوں نہ کر دی جاتیں۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ ان حرامیوں کو حرام زدگی کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ میں غالباً بروقت پہنچ گیا تھا۔"

میری بات سن کر لیوسی کا چہرہ سرخ ہو گیا، شاید حیا سے! وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں تمہاری احسان مند ہوں کہ تم نے غالباً تیسری بار مجھے بچایا ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز کچھ بھاری سی ہو گئی تھی۔

"خیر بچانے والی تو اللہ تبارک تعالیٰ کی ذات ہے، بس یہ سمجھو کہ اس نے مجھے ذریعہ بنا دیا تھا۔" میں نے ایک سُنا سنایا فقرہ دُہرا دیا جو شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا گیا ہوگا۔ اس جملے کا مقصد محض لیوسی پر رعب گانٹھنا تھا، اپنی قابلیت کا! مطلب یہ کہ وہ مجھے کوئی گھسیارا نہ سمجھے، قابل سمجھے۔

میری بات سن کر اس نے عجیب سے انداز میں دیکھا اور بولی۔ "کبھی کبھی تمہاری اصل شخصیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ خول اتر جاتا ہے جو ہر وقت تم اپنے اوپر چڑھائے رہتے ہو۔ آخر تم خود کو بزدل اور احمق کیوں ثابت کرتے رہتے ہو؟ بعض لوگ تو تمہیں واقعی وہی سمجھتے ہیں جو تم نہیں ہو۔"

"دیکھو لیوسی، پٹری سے اترنے کی ضرورت نہیں۔" میں ناگوار سے لہجے میں بولا۔ "نہ میں بزدل اور احمق ہوں، نہ یہ ثابت کرتا ہوں۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ خود بزدل اور احمق ہوگا۔"

لیوسی نے میری بات سن کر ایک طویل سانس لیا اور کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے بات نہیں کرو گے۔ خیر چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔"

"ہاں بالکل!" میں نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بس اب تم شروع ہو جاؤ۔ حسبِ وعدہ میں اپنی داستانِ ولولہ خیز سنا چکا ہوں اور اب تمہاری کتھا کہانی سننے کے لیے بیتاب ہوں۔"

جواب میں لیوسی کچھ دیر خاموش رہی۔ اس دوران میں شاید وہ گزرے ہوئے واقعات کو ترتیب دیتی رہی۔ پھر اس نے مجھے از اول تا آخر سب کچھ بتا دیا۔ لیوسی کی باتیں سن کر ان بہت سی باتوں کی تصدیق ہوئی جو سیٹھ عثمان کے بارے میں، میں نے فائل کے اندر پڑھی تھیں۔

یہ بات میرے لیے بہرحال نئی نہیں تھی کہ سیٹھ عثمان عیاش آدمی ہے مگر وہ اس حد تک عیاش ہوگا، یہ علم نہیں تھا۔ دہلی میں کئی ایسے اللہ کے بندے تھے جو اس کے لیے عیاشی کا "سامان" فراہم کرتے تھے۔ اس "سامان" میں وہ بدبخت افضلیت ایک ہی "سامان" کو دیتا تھا۔ خوب صورت اور نوخیز و حسین جسم اس کی کمزوری تھے۔ وہ پسندیدگی پر مُنہ مانگے دام دیتا تھا۔ پھر کچھ کو تو وہ مستقل طور پر گلے کا ہار بنا لیتا تھا اور کچھ کو دو ایک دن ہی میں ٹہلا دیتا تھا۔ اس کا انحصار "سامان" پر تھا۔ "سامان" من پسند ہوتا تو وہ اسے اپنی کوٹھی میں مستقل طور پر سجا لیتا۔ انہی "سامانوں" میں نسیمہ اور شانتی وغیرہ تھیں جن سے میری مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ یہ وہی بدبخت تھیں جنہوں نے مجھے ڈولی ڈنڈا کر کے سیٹھ عثمان کی کوٹھی سے باہر پھینکنے کی تیاریاں کی تھیں اور میں خود اپنے پیروں چل کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیوسی بھی سیٹھ عثمان تک ایسے ہی ایک دلال کے ذریعے پہنچائی گئی تھی۔ بقیہ کارنامہ لیوسی نے خود انجام دیا تھا۔ اس نے اپنا کردار اس طرح ادا کیا تھا کہ سیٹھ عثمان کی رال ٹپک پڑی تھی۔ لیوسی نے سیٹھ عثمان کو اپنے مُکھڑے پر ہاتھ رکھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ یوں بھی دلال نے سیٹھ عثمان کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ لونڈیا نئی ہے اور اسے دھوکے سے پھانس کر سیٹھ کے پاس لایا گیا ہے اس لیے وہ ذرا صبر سے کام لے، آہستہ آہستہ لیوسی کو راہ پر لائے۔ لیوسی نے ایک دکھ بھری کہانی سنا کر سیٹھ عثمان کو اپنی طرف سے بڑی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، سیٹھ عثمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا۔ اس کے رویے میں جھنجلاہٹ اور سختی آتی گئی۔ شوقِ وصالِ یار نے اس کی بے تابیاں بڑھا دیں۔ لیوسی اپنی تال پر چوکس رہی۔ وہ یہ کوشش کرتی رہی کہ سیٹھ عثمان کہیں بالکل ہی ہتھے سے نہ اکھڑ جائے مگر کب تک! آخر سیٹھ عثمان اس سے تنگ آ گیا۔ وہ بھلا کب تک لیوسی کے نخرے برداشت کرتا۔ پھر یہ کہ اس دوران میں وہ لیوسی کی طرف سے کچھ کھٹک بھی گیا تھا۔ لیوسی ہر وقت اس ٹوہ میں رہتی تھی کہ سیٹھ عثمان کے متعلق زیادہ سے زیادہ نئی باتیں جان سکے، ایسی باتیں اور ایسے ثبوت جو سیٹھ عثمان کے مجرموں سے تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ اسی کوشش میں سیٹھ عثمان اس کی طرف سے کچھ بدک گیا تھا۔ لیوسی کا خیال تھا کہ سیٹھ عثمان کو اس پر کچھ شک سا ہو گیا تھا مگر اس شک نے غالباً ابھی یقین کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ایک طرف تو لیوسی اس کے ہتھے چڑھ کر نہیں دے رہی تھی، دوسری طرف وہ کچھ شک میں بھی پڑ گیا تھا۔ ان حالات

کے پیشِ نظر ہی اس نے لیوسی سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کیا تھا۔

عیاشی کے باب میں سیٹھ عثمان کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ وہ زبردستی کا قائل نہیں تھا لیکن بہاری لال مختلف آدمی تھا۔ لیوسی نے سیٹھ عثمان کے سامنے خود کو بے سہارا ثابت کیا تھا۔ اسی کہانی سے فائدہ اٹھا کر سیٹھ عثمان نے لیوسی سے کہا تھا کہ وہ اسے اپنے ایک قریبی دوست کے سپرد کر دے گا جو بہت پارسا اور رحم دل ہے۔ وہ لیوسی کے لیے ذریعۂ معاش کا بندوبست بھی کر دے گا اور سکونت کا بھی! لیوسی سمجھ گئی کہ اب سیٹھ عثمان اسے اپنی کوٹھی میں نہیں رکھنا چاہتا اسی لیے یہ سب چکر چلا رہا ہے۔ اپنی من گھڑت کہانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے لیوسی، سیٹھ کے اس فیصلے پر کوئی احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر سیٹھ نے ہی بہاری لال کو بُلوایا تھا۔ سیٹھ عثمان اور بہاری لال بہت دیر تک تنہائی میں باتیں کرتے رہے تھے۔ غالباً سیٹھ عثمان نے بہاری لال کو لیوسی کے متعلق وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اس کے علم میں تھا۔ اس کے بعد سیٹھ عثمان نے لیوسی کو اس کمرے میں بُلوایا تھا اور بہاری لال سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ اسی وقت نادانستگی میں بہاری لال کے مُنہ سے وہ بات نکل گئی تھی جو اسے بہرحال لیوسی کی موجودگی میں نہیں کہنا چاہیے تھی۔ بہاری لال کو وہ سفارشی خط یاد آ گیا تھا جو اس نے بہ حیثیت سپرد لیو مجھے لکھ کر دیا تھا۔ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ لیوسی کو اسی وقت بہاری لال کے ساتھ جانا ہے۔ سیٹھ نے کہا تھا کہ لیوسی، کپڑے وغیرہ اور اپنا دوسرا سامان وہاں سے پھر کسی وقت آ کر لے جائے، فی الحال وہ بہاری لال کا گھر دیکھ آئے۔ سیٹھ نے بتایا تھا کہ اسے دفتر میں کچھ کام ہے، وہ کچھ دیر بعد لیوسی کو بہاری لال کے گھر چھوڑ دے گا۔

پھر لیوسی اور بہاری لال کے ہمراہ سیٹھ عثمان اپنی کار میں دفتر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں اس نے لیوسی کو تاکید کی تھی کہ وہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کرے جو بہاری لال نے کہی تھی۔ لیوسی نے اسے یقین دہانی کرا دی تھی کہ وہ اس بات کو بھول جائے گی۔ لیوسی کو کار ہی میں بیٹھا ہوا چھوڑ کر سیٹھ عثمان، بہاری لال کے ہمراہ اپنے دفتر میں چلا گیا تھا۔ واپسی میں وہ کچھ فکر مند سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے راستے میں کوئی بات نہیں کی اور لیوسی کو بہاری لال کے ہمراہ اس کے گھر پر چھوڑ دیا۔ پھر وہ بہاری لال کے گھر رکے بغیر چلا گیا۔ روانگی سے پہلے بھی اس نے بہاری لال سے کچھ کانا پھوسی کی تھی جس سے صاف ظاہر ہے کہ لیوسی لاعلم ہی رہی تھی مگر اس نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

بہاری لال نے پہلے تو یونہی باتوں باتوں میں لیوسی پر ڈورے ڈالنا چاہا تھا مگر جب لیوسی "اُڑن گھائیاں" ہی بھرتی رہی تھی تو وہ سختی پر اتر آیا تھا۔ اسی دوران میں اس کا ایک دوست ادھر نکل آیا تھا۔ بہاری لال نے اپنے اس دوست کو دوسرے کمرے میں لے جا کر کچھ سرگوشیاں کی تھیں اور پھر اس کا دوست وہیں سے چلا گیا تھا۔ لیوسی اندر والے کمرے میں تھی۔ ابھی تک وہ بہ حسن و خوبی ڈورو تھی بنی ہوئی تھی۔ لیوسی اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ بہاری لال اس قدر گھٹیا حرکت پر اتر آئے گا۔ اس نے سوچا تھا کہ سیٹھ عثمان کی طرح وہ بہاری لال کو بھی "چکر پھیریاں" دیتی رہے گی اور بات لب و رخسار سے آگے نہیں بڑھے گی۔ خود بہاری لال نے بھی اپنے رویے سے یہی ظاہر کیا تھا کہ فی الحال وہ صبر کا گھونٹ پی گیا تھا مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ اس نے انتہائی عیاری سے کام لیا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے ذریعے بقیہ دو دوستوں کو مزید بُلوا لیا تھا جن میں جگدیش بابو بھی شامل تھے۔

پھر ان چاروں نے مل کر لیوسی کو چارپائی سے باندھ دیا تھا۔ لیوسی بہرحال اتنی زبردست "ہیروئن" نہیں تھی کہ ان چار عدد "امرلڈ" سے بہ یک وقت نمٹ سکتی یا بڑھک مار کر آج کل کی پنجابی فلموں کی ہیروئنوں کی طرح بھڑ جاتی۔ لیوسی کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ہیروئن کی بجائے لڑکی یا عورت تھی۔ وہ ایک آدھ "مردوئے" کے لیے تو کافی تھی مگر چار چار اس کے بس کے نہیں تھے۔ ابھی وہ چاروں اپنی "محنت" کا "ثمر" توڑنے کی تیاری کر رہے تھے کہ میں نے دروازہ دھڑ دھڑا دیا اور یوں سارے "ڈرامے" کا "دی اینڈ" لگ گیا۔

اس "ڈرامے" کے بعد لیوسی کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہ سب سیٹھ عثمان کی انتقامی کارروائی ہے۔ ظاہر ہے کہ بہاری لال سے وہ بہ خوبی واقف رہا ہوگا، اسے علم ہوگا بہاری لال کس حد تک جا سکتا ہے۔ لیوسی اسی لیے فیصلہ کر چکی تھی کہ اب ڈورو تھی کی حیثیت سے دوبارہ سیٹھ عثمان کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ لیوسی نے اسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد رسیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی بہاری لال کی کٹائی لگانا شروع کر دی تھی۔ اس نے بہاری لال کو اچھی طرح کوٹ کر اپنی بے بسی کا انتقام لے لیا تھا۔

لیوسی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اور اس سے میرے ذہن میں جو "اسٹوری" بنی تھی، وہ یہی تھی جو میں نے ابھی بیان کی۔ بعض باتیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جو کہی نہیں جاتیں، خود سمجھ لی جاتی ہیں۔ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے، یہ سب اسی طرح لیوسی نے نہیں بتایا تھا بلکہ اکثر جگہ اشاروں کنایوں سے کام چلایا تھا۔ میں نے اپنے طور پر اس لیے پوری کتھا کہانی لکھی کہ کہیں سچ مچ میری سرگزشت چھپ ہی جائے تو پیارے قارئین الجھن کا شکار نہ ہوں۔ ویسے مجھے اپنی فرماں بردار اولاد سے توی امید ہے کہ اس

میں سے کوئی نہ کوئی کسی مدیر شہیر سے دوستی ضرور گانٹھ لے گا اور کوئی نہ کوئی "ٹچر" چلا کر میری سرگزشت ضرور چھپوا دے گا۔

ہاں تو میں لیوسی کی کتھا کہانی بیان کر رہا تھا، معلوم نہیں یہ مدیر شہیر کہاں سے ٹپک پڑا۔ (معاف کرنا، پیارے مدیر! اگر تم واقعی میری سرگزشت چھاپنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو تم سے بڑا ادیب اور صحافی اس روئے زمین پر پیدا نہیں ہوا اور نہ پیدا ہوگا۔) بہرحال لیوسی کی بپتا سننے کے بعد میرے ذہن میں کئی سوالات کلبلائے کیوں کہ لیوسی دانستہ یا نادانستہ کئی باتیں گول کر گئی تھی۔ لیوسی نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ سیٹھ عثمان کو اس پر شک کیسے ہو گیا تھا۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی، شک کرنے کی! یہی سوال میرے ذہن سے زبان پر پھسل پڑا۔

"دراصل ایک بار تو اس نے رات کے وقت میری نقل و حرکت دیکھ لی تھی۔ تمھیں تو علم ہے کہ میں وہاں گئی ہی اسی لیے تھی کہ کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ معلوم کروں۔" لیوسی نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ لیوسی مزید کچھ کہتی، میں بول اٹھا۔ "رات کے وقت تم کہاں ٹہل (مچا) رہی تھیں؟"

"وہیں کوٹھی میں اور کہاں!" لیوسی بولی۔ "مجھے کچھ شبہ سا تھا کہ اس کوٹھی کے نیچے کوئی بڑا سا تہ خانہ ہے۔"

"اچھا! واقعی؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا تمھیں تہ خانہ مل گیا؟"

"تم سنو تو سہی پوری بات!" لیوسی کسی قدر جھنجلا کر بولی۔

"اچھا سناؤ، اب میں بیچ میں نہیں بولوں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

"جس رات کا یہ ذکر ہے، اس سے ایک رات پہلے اچانک سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ سیٹھ عثمان نے اپنی دوسری ملازماؤں کی طرح مجھے بھی الگ کمرہ دے دیا تھا۔ میں اس وقت کمرے میں تنہا تھی۔ اس وقت غالباً نصف شب گزر چکی تھی۔ رات کے وقت یوں بھی ہلکی سی آواز واضح اور صاف سنائی دیتی ہے۔ میں آنکھیں کھولے بستر پر پڑی ہوئی یہ سوچ ہی رہی تھی، میری آنکھ کیوں کھل گئی کہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی بھاری پتھریلی چیز لڑھکی یا کھسکی ہو۔" لیوسی نے یہ کہہ کر ایک طویل سانس لیا۔

ابھی لیوسی دوبارہ کچھ کہنے کے لیے زبان "تول" ہی رہی تھی کہ میں صبر نہ کر سکا اور بیچ میں کچھ نہ بولنے کے وعدے پر قائم نہ رہ سکا۔ دراصل وہ باتیں ہی کچھ ایسی کر رہی تھی کہ یقین کرنے کو دل نہ چاہے۔ میں نے اسی لیے یہ ضروری سمجھا کہ اس سے تصدیق کر لوں کہ واقعی وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، سچ بھی ہے یا نہیں!

"میں جھوٹ کیوں بولنے لگی!" میری بات سن کر اس نے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "جو ہوا، وہ بتا رہی ہوں۔ تم اسے گپ سمجھ رہے ہو یا سننا نہیں چاہتے تو چپ ہو جاتی ہوں۔"

"تم تو بس ... پھر ... سنک جاتی ہو۔" میں جلدی سے بولا۔ "میں تو بس یونہی ... جیسا کہ ... کیوں کہ ایسی باتیں اور اس طرح کے تہ خانے وغیرہ، ناولوں اور کہانیوں میں ہوتے ہیں۔ مجھے تمھاری بات پر نو تولے پاؤ رتی یقین ہے۔ ہاں آگے کہو، کیا کہہ رہی تھیں!"

"وہ گڑگڑاہٹ سن کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میری آنکھ اسی سے کھلی ہوگی۔" لیوسی پھر راہ پر آگئی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر پہنچی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ کافی دیر بعد میں واپس کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ دوسرے دن مجھے تجسس رہا کہ رات کے وقت وہ گڑگڑاہٹ کیسی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ رات ہوتے ہی جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں گے تو کوٹھی کا تفصیلی جائزہ لوں گی۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا اور میری آنکھوں نے اس رات کئی عجیب منظر دیکھے۔" یہ کہہ کر لیوسی رک گئی۔

"ہاں آگے کہو نا، کیا دیکھا تم نے؟" میں نے اسے خاموش دیکھ کر جلدی سے کہا۔ لیوسی کی باتوں نے میرے دل میں تجسس بیدار کر دیا تھا۔

"میں یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں جو کچھ میں کہنے والی ہوں، اسے سن کر تم بے یقینی کا شکار نہ ہو جاؤ۔ تم پھر یہ نہ کہو کہ میں جھوٹ تو نہیں بول رہی!" یہ کہتے ہوئے لیوسی مسکرائی۔

"تمھیں کیا جلتے ہوئے توے پر بیٹھ کر یقین دلاؤں کہ اب ایسی بات نہیں کہوں گا!" میں جھنجھلا سا گیا اور میرا جھنجھلانا ٹھیک بھی تھا۔ وہ اچھا خاصا تجسس پیدا کر کے خواہ مخواہ مجھے ستائے جا رہی تھی۔

"مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ میں نے ایک ستون کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو کیا تم یقین کر لو گے؟" لیوسی نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"اب اتنی اندھی بھی نہیں لگ رہی کہ میں ستون کو آدمی سمجھ لوں۔ ستون بے جان چیز ہوتی ہے اور آدمی جان دار! سمجھیں کچھ! اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ مجھے یہ معلوم نہ ہو، جان دار حرکت کرتے ہیں، بے جان چیزیں نہیں۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میں نے ہاتھ بھی لہرایا۔ "اب بولو کیا کہتی ہو! تم میری ذہانت کا امتحان لے رہی تھیں! کیوں؟"

"... ذہانت کا امتحان مقصود نہیں تھا، میں حقیقت کا اظہار کر رہی تھی۔" لیوسی خلافِ توقع ہنس پڑی۔

"لو، اب عوانت نکالنے لگیں! صاف صاف بات کرو نا!" یہ کہتے ہوئے مجھے خود اپنا تجربہ یاد آگیا۔ مجھے بھی تو سیٹھ عثمان نے صوفے سمیت گھومنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ لیوسی کو ڈرانے کی خاطر کہیں ستون وتون تو چلا کر نہیں دکھا دیا تھا۔ جب وہ بے جان صوفے کو "میٹھے میٹھے" ناچنے پر مجبور کر سکتا تھا تو اس نے ستون کو بھی چلا دیا ہوگا۔

ادھر میں لیوسی کی بات پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا، ادھر لیوسی مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں ابھی ابھی چڑیا گھر سے نکل کر بھاگا ہوں۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "کس سوچ میں پڑ گئے؟"

میں نے جواباً اسے اپنی سوچ سے آگاہ کر دیا اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے گھومنے کا واقعہ بھی سنا دیا۔

"اب آئے نا تم راہ پر!" لیوسی چہک کر بولی۔ "میں اس صوفے کو بھی دیکھ چکی ہوں بلکہ خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہوں۔ بس ایک دن یوں ہی میں نشست گاہ میں چلی گئی تھی۔ میں نے حسبِ عادت وہاں کا گہری نظروں سے جائزہ لیا تو ایک صوفے کے قریب مجھے زمین پر بٹن سا نظر آیا۔ میں نے جھک کر وہ بٹن دبا دیا کہ دیکھوں، وہ بٹن کس لیے وہاں لگایا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کچھ فاصلے پر موجود ایک صوفہ تیزی سے اپنی جگہ گھومنے لگا۔ میں نے دوبارہ بٹن دبایا تو وہ صوفہ رک گیا۔ گھومنے والے صوفے کے قریب جا کر میں نے اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا، فرش پر بچھا ہوا قالین اس جگہ سے گولائی میں کٹا ہوا تھا جہاں صوفہ رکھا تھا۔ غور سے دیکھنے ہی پر میں یہ بات محسوس کر سکی ورنہ یونہی سرسری نگاہ پڑنے پر کسی کی توجہ کٹے ہوئے قالین کی طرف نہیں جا سکتی۔"

"مگر یہ بات تو اب بھی پردۂ راز میں ہے کہ صوفے نے حرکت کیسے کی!" میں پُرزور لہجے میں بولا۔ لیوسی کی وضاحت کے باوجود اب تک پوری بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔

"اب تم کم از کم مجھے تو یہ باور نہ کراؤ کہ اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے!" لیوسی نے منہ بنایا، پھر بولی۔ "اتنی سی بات تو کوئی بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ صوفہ کسی خفیہ میکنزم کے تحت گھومتا ہوگا اور وہ خفیہ میکنزم بٹن دبانے سے حرکت میں آجاتا ہوگا۔"

لیوسی سے یہ بات سن کر مجھے واقعی کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ واقعی یہ بات شرم کی تھی کہ جو بات بچہ بھی سمجھ سکتا تھا، وہ مجھ اونٹ کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔ میں نے اسی لیے جھینپ مٹانے کی خاطر کہا۔ "میں کوئی بچہ نہیں ہوں، جوان جہان ہوں۔ یہ بات بچے سمجھتے ہوں تو سمجھا کریں!"

میرے لہجے میں معلوم نہیں ایسی کیا بات تھی کہ لیوسی کھلکھلا اٹھی، پھر خود ہی بولی۔ "کبھی کبھی تو تمھاری اداکاری پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ خیر چھوڑو، اب تو میں تمھیں اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ میں جھانسے میں نہیں آسکتی۔"

"اب تم مطلب کی بات کرو گی کہ ادھر ادھر کو انٹ شنٹ اڑاتی رہو گی!" میں نے موضوعِ گفتگو بدلنے کی خاطر کہا۔ میرے خیال میں لیوسی بہت سی کام کی باتیں جان چکی تھی اور ان باتوں کو جاننے کے بعد میں سرتھامسن پر اچھا خاصا رعب "پیل" سکتا تھا۔ میں اسی لیے یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ جلد سب کچھ بتا دے۔ گھومنے والے صوفے کے راز نے بھی مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

لیوسی کچھ دیر "آئیں بائیں شائیں" اڑا کر آخر راہ پر آہی گئی۔ میں نے اس دوران میں زبردست صبر کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ اس سے کچھ بھی معلوم نہ کر سکتا۔ لیوسی نے اپنا بیان پھر وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے چھوڑا تھا۔ وہ بولی۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جس رات میں نے کوٹھی کا جائزہ لیا، کئی عجیب منظر دیکھے۔ اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ سنجیدگی سے بات سننے کے موڈ میں ہو۔"

اس کے بعد لیوسی نے واقعی عجیب باتیں بتائیں جن پر مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔

لیوسی نے بتایا کہ جب وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر راہ داری میں آئی تو حسبِ معمول وہاں سکوت تھا۔ راہ داری میں کم پاور کا ایک بلب روشن تھا۔ راہ داری کی دائیں جانب صحن تھا جہاں نیم تاریکی کا سا سماں تھا۔ صحن تک راہ داری کی بہت کم روشنی پہنچ رہی تھی۔ دن کی روشنی میں لیوسی اس طویل و عریض کوٹھی کا بڑا حصہ دیکھ چکی تھی اس لیے رات کے وقت راہ داری میں آگے بڑھتے ہوئے اسے کسی طرح کی قباحت نہیں ہوئی۔ اسے علم تھا کہ راہ داری کے اختتام پر ہال کمرے کا دروازہ ہے جو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہ اسی طرف بڑھ رہی تھی کہ چلتے چلتے ایک دم چونک اٹھی۔ اس کی سماعت سے وہی مخصوص گڑگڑاہٹ ٹکرائی تھی جو اس نے گزشتہ شب سنی تھی۔ یہ گڑگڑاہٹ، ہال کمرے ہی کی طرف سے سنائی دی تھی۔ لیوسی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہال کمرے کی طرف لپکی تاکہ اس گڑگڑاہٹ کا سبب جان سکے۔

ہال کمرے میں تقریباً تاریکی ہی تھی۔ راہ داری کی روشنی وہاں تک پہنچنے میں ناکام تھی۔ لیوسی نے دیدے پھیلا پھیلا کر ہر طرف دیکھا مگر اب وہاں قطعی سناٹا تھا۔ کچھ دیر لیوسی اسی جگہ بے حرکت کھڑی رہی۔ اس دوران میں، اسے اندھیرے میں بھی تھوڑا بہت "دکھائی" دینے لگا تھا۔ مگر اسے دو ہیولے سے حرکت کرتے دکھائی دیے جو ہال کمرے میں موجود ستون کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ لیوسی غور سے ان حرکت کرتے ہوئے ہیولوں کو دیکھتی رہی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ ہیولے جان دار ہیں

ہی کے ہو سکتے ہیں مگر اس کے باوجود گھبرائی نہیں۔ وہ ہیولے ستون کے قریب پہنچ کر رک گئے اور پھر ستون حرکت کرنے لگا۔ پھر نہ جانے کیسے اور کہاں وہ دونوں ہیولے غائب ہو گئے۔ ستون کے حرکت کرتے ہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی تھی۔ چند لمحے بعد لیوسی ہمت کر کے اس ستون کے قریب پہنچی اور اسے ہلا جلا کر دیکھا مگر وہ اپنی جگہ قائم رہا۔ اس کے بعد لیوسی ہال کمرے سے نکل آئی مگر اس کا ذہن سخت الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ لیوسی اپنے کمرے کی طرف لوٹ رہی تھی کہ ایک بار پھر چونک اٹھی۔ وہی ہلکی سی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی تھی لیکن پشت کی جانب سے نہیں بلکہ سامنے کی طرف سے! لیوسی کی نظر اس سمت اٹھی اور گویا اٹھی رہ گئی۔ راہ داری کے فرش کا ایک حصہ زمین میں دھنس گیا تھا اور اب وہاں گڑھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ لیوسی تیز قدم اٹھاتی ہوئی گڑھے کی طرف بڑھی۔ اسی وقت گڑگڑاہٹ پھر بلند ہوئی پھر لیوسی جب تک گڑھے کے قریب پہنچتی، گڑھا غائب ہو چکا تھا، یعنی زمین میں دھنسا ہوا حصہ پھر فرش کے برابر ہو گیا تھا۔ راہ داری کا فرش چھوٹے چھوٹے چوکور پتھروں کا بنا ہوا تھا اور پتھر اپنی جگہ موجود تھے۔ لیوسی چکرا کر رہ گئی۔ پھر اس نے یہی مناسب جانا کہ اب خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس چلی جائے اور دروازہ بند کر کے سو جائے۔ یہ عقدہ وہ پھر کسی وقت حل کرے گی۔

لیوسی ابھی اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی کہ اس نے اپنے عقب میں بھاری قدموں کی آواز سنی اور فوراً مڑ کر دیکھا۔ اتنی رات گئے اسے توقع نہیں تھی کہ سیٹھ عثمان، کوٹھی میں ٹہل "مچاتا" پھر رہا ہوگا۔ سیٹھ عثمان نے لیوسی کے قریب پہنچ کر اسے بتایا کہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر نکل آیا تھا کیوں کہ نیند نہیں آ رہی تھی اور آنکھوں سے کوسوں کی بجائے میلوں دور تھی۔ اس کے بعد سیٹھ عثمان نے لیوسی سے دریافت کیا کہ وہ رات کے وقت کہاں گھوم رہی تھی۔ لیوسی نے بھی فوراً نیند نہ آنے کا بہانہ کر دیا۔ اس نے سیٹھ عثمان سے کہا کہ کمرے میں تنہا پڑے پڑے اس کا دل گھبرا رہا تھا اس لیے وہ چہل قدمی کی خاطر باہر آ گئی تھی۔ سیٹھ عثمان نے اس رات بھی لیوسی کی تنہائی دور کرنے کی پیشکش کی تھی مگر لیوسی، رام نہیں ہوئی تھی۔ پھر سیٹھ عثمان واپس چلا گیا تھا کیوں کہ وہ لیوسی کو ایک نظر دیکھ کر اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا چکا تھا۔

اس رات کے بعد لیوسی چوکنا ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ چند دن وہ بالکل خاموشی سے گزار دے گی کیوں کہ ہر بار نیند نہ آنے کا بہانہ نہیں چل سکتا تھا مگر اس کے باوجود اس نے اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے۔ پھر اس سے پہلے کہ لیوسی کو دوبارہ کوئی ایسا موقع ملتا "ننھے بڑھ گئے"، یعنی سیٹھ عثمان نے اسے بہاری لال کو سونپ دیا۔

گڑگڑاہٹ سنائی دینے، ستون کے ڈولنے پھرنے اور راہ داری کے فرش کا کچھ حصہ غائب و حاضر ہونے سے لیوسی اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہاں کوئی تہ خانہ ہے۔ اس کے علاوہ ہیولوں کا نظر آ کر غائب ہو جانا بھی اسی طرف اشارہ کرتا تھا۔ لیوسی کے خیال میں وہاں کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلا جا رہا تھا۔ اس کھیل کی نوعیت کیا تھی، یہ بہرحال لیوسی نہیں سمجھ پائی تھی۔

آپ یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھ جیسے "کائیاں" مالک نے آخر لیوسی کی ایسی بے سر پا باتوں پر کس طرح یقین کر لیا، تو میں اس سلسلے میں اپنی صفائی پیش کر دینا ازبس ضروری سمجھتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر سیٹھ عثمان نے مجھے صوفے پر بیٹھے بیٹھے گھما نہ دیا ہوتا تو میں کبھی لیوسی کی باتوں پر یقین نہ کرتا۔ دراصل میں نے سوچ لیا تھا کہ سیٹھ عثمان، بے جان چیزوں کو بھی حرکت میں لا سکتا ہے جیسا کہ صوفے کے ساتھ ہوا۔ یہ سوچنے کے بعد کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہا، چاہے ستون ڈولیں پھریں یا راہ داری کا فرش حرکت کرنے لگے۔ گویا میرے لیے وہ صوفہ "مثالیہ" بن گیا تھا جس پر بٹھا کر مجھے گھمایا گیا تھا۔ ویسے لیوسی نے اپنی دانست میں اس سارے چکر کی ایک اور توجیہہ کی تھی جو کچھ تو میری "کھوپڑی" میں اتری تھی، کچھ نہیں اتری تھی۔ لیوسی نے کہا تھا کہ سیٹھ عثمان ایک بڑا آرکیٹیکٹ اور معلوم نہیں کیا کیا ہے۔ وہ "لندن پلٹ" اور جانے کیا کیا "پلٹ" ہے۔ انگریز بہادر نے اسے یوں ہی تو سرکاری عمارتیں بنانے کا ٹھیکا نہیں دے دیا ہوگا۔ وہ آخر یوں ہی تو اتنی بڑی تعمیراتی کمپنی نہیں چلا رہا، آخر اسے کچھ "ہنر" تو آتا ہوگا۔ اسی ہنر مندی کا مظاہرہ اس نے اپنی کوٹھی بنواتے ہوئے کیا ہوگا لیکن یہ "ہنر" دکھانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی، لیوسی اس پر روشنی نہیں ڈال سکی تھی۔

اس رات مجھے اور لیوسی کو دفتر میں باتیں "گھونٹتے گھونٹتے" کافی دیر ہو گئی تھی۔ زیادہ دیر ہو جانے کا احساس مجھے بھوک چمک اٹھنے سے ہوا۔ دوپہر کو بھی میں نے صرف آلو چھولوں پر گزارا کیا تھا اس لیے اور بھی پیٹ میں گولے سے بن رہے تھے۔ لیوسی بے چاری بھی شاید میری طرح بھوکی رہی ہوگی اسی لیے اس نے روانگی کی تجویز فوراً قبول کر لی۔

اب میں بیک اپ میں تو تھا نہیں کہ بیک ڈور استعمال کرتا یا اپنی پھٹ پھٹ ساتھ نہ لے جاتا اس لیے واپسی میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ لیوسی کو میں نے اس کے گھر چھوڑا اور پھر اپنے گھر کی راہ لی۔

دوسرے دن مجھے دفتر پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ یہ پہلا موقع

تھا کہ میں لیٹ ہوا تھا، وہ بھی کوئی دو چار گھنٹے نہیں، صرف آدھا گھنٹہ!

جیسے ہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا کمار کی منحوس آواز سنائی دی۔ "سر! آج سب لائن حاضر ہو رہے ہیں، آپ بھی لپک لیں۔"

"میرے آتے ہی تم نے یہ کیا بکواس شروع کر دی!" میں یہ کہتا ہوا اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔

"آپ جانیں سر!" مجھے کمار کی آواز پھر سنائی دی۔ "میں تو آپ ہی کے بھلے کی خاطر کہہ رہا تھا۔"

"تم اور میرا بھلا چاہو! ناممکن!" میں نے مڑے بغیر جواب دیا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب کمار کا چہرہ میرے سامنے تھا۔

"میاں، کاہے کو تضیع اوقات کر رہے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ صاحب کا فرستادہ آیا تھا۔" پیارے لال ہنر کی چونچ بھی بند نہ رہ سکی مگر وہ مجھ سے نہیں کمار سے مخاطب تھا۔

"کون آیا تھا صاحب کا؟" میں براہِ راست پیارے لال ہنر سے مخاطب ہو گیا۔ "کیا تم اردو میں بات نہیں کر سکتے!"

"یہی تو ظلم ہے اس ہیچ سخن کے ساتھ کہ کوئی اس کی زبان نہیں سمجھتا!" پیارے لال ہنر نہ جانے کیوں تلملا کر بولا۔ "اب بندہ کیسے عرض کرے کہ یہی تو اردو ہے! ہائے ہائے کیا زمانہ آ لگا ہے کہ کفِ افسوس بھی نہیں مل سکتے۔ کیسے کیسے رموز ہائے زباں دانی سمجھائیں، کیسے بتائیں کہ اردو نے اہلِ فارس اور اہلِ عرب کی زبانوں سے موتی چن کر اپنے وسیع دامن میں بھر لیے ہیں اور۔۔۔"

"اور یہ کہ تم اپنی بکبک بند کرو!" میں نے ڈانٹ کر اس کی بات کاٹ دی۔

"جی کیا فرمایا حضورِ والا نے؟" پیارے لال ہنر اس طرح بولا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا ہو۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے حضورِ والا وغیرہ کہنے کی بجائے 'سر' کہا کرو! تم سدھرو گے نہیں!"

"سر! امکانات ہی ختم ہو چکے ہیں۔" کمار نے لقمہ دیا۔ "بوڑھے طوطے نہیں پڑھتے۔"

"تم سے کس نے بیچ میں بولنے کے لیے کہا؟" میں کمار پر بگڑ گیا۔

"میرا خیال ہے سر، کہ اگر بولنے کے لیے نہ بھی کہا جائے تو آدمی بولتا ضرور ہے اسی لیے آدمی کو حیوانِ ناطق، یعنی بولنے والا حیوان کہا گیا ہے۔"

"حیوان!" میں حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ "کس نے کہا حیوان؟ آدمی، آدمی ہوتا ہے، حیوان نہیں۔ اگر کسی نے ایسا کہا بھی ہے تو غلط کہا ہے۔ سمجھے!"

اس سے پہلے کہ کمار جواباً کچھ کہتا، کمال بول اٹھا۔ "سر جی! ڈی آئی جی صاحب کا چپراسی کئی بار آپ کو بلانے آ چکا ہے۔"

"تو تم اتنی دیر بعد بتا رہے ہو یہ بات!" میں نے کمال کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ ویسے اس نے لفظِ "سر" کے ساتھ "جی" بھی لگایا تھا، اس لیے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

"سر جی! آپ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تو کمار بالو بول اٹھے تھے۔ سر جی! پھر میں کیا کہتا! مجھے موقع ہی نہیں ملا۔" کمال کا لہجہ شکایتی تھا اور اس کی شکایت ایک حد تک بجا بھی تھی۔ میں اسی لیے اس پر مزید "راشن پانی" لے کر نہیں چڑھا۔

"سر! میں بھی آپ کو اپنے الفاظ میں یہی بتا رہا تھا اور پیارے لال ہنر جی بھی یہی بتانے کی کوشش کر رہے تھے، اپنے الفاظ میں! مگر کسی کی بات آپ کے پلّے ہی نہیں پڑی۔" کمار نے مسکرا کر کہا۔

"اپنے الفاظ میں!" میں منہ بگاڑ کر بولا۔ "ایک تو تمہارے یہ اپنے اپنے الفاظ نے مجھے تنگ کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہ سیدھی طرح بتا دیں، سر! آپ کو تیواڑی جی نے یاد کیا ہے۔ بس بات میں سے بات نکالتے رہیں گے اور کلی پھندنے جوڑتے رہیں گے! تم دونوں سے تو کبھی میں اچھی طرح سمجھوں گا۔" یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

جب میں تیواڑی جی کے کمرے میں پہنچا تو "لائن حاضر" کا مطلب میری سمجھ میں آیا۔ غالباً کمار کو کسی طرح ان لوگوں کی طلبی کا علم ہو گیا تھا۔ وہاں ایک لائن سے دلاور خاں اور ان کے سارے ماتحت کھڑے تھے اور تیواڑی جی اپنی سیٹ پر بیٹھے رہنے کی بجائے ٹہل ٹہل کر انھیں "جھاڑ" پلا رہے تھے۔ اسی وقت میں پہنچ گیا۔ اس وقت تیواڑی جی کا غصہ عروج پر تھا۔ ان کی مونچھیں حرکت میں تھیں۔ دلاور خاں کے چہرے کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی تیواڑی جی بھنّائے۔ "یہ وقت ہے دفتر آنے کا!"

"سر! بس۔۔۔ بس آج ہی لیٹ ہو گیا۔" میں نے ان سے نظر بچاتے ہوئے کہا۔

آج تیواڑی جی اتنے تاؤ میں تھے کہ انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا بھی اشارہ نہیں کیا تھا۔ نتیجتاً میں کھڑا رہا۔

تیواڑی جی اب دوبارہ قہر آلود انداز میں دلاور خاں کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ دلاور خاں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لی

تھیں۔ چند ہی لمحے بعد تیواڑی جی اتنی زور سے گرجے کہ میں اچھل پڑا۔

"ہاں تو تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، کیوں، آخر کیوں؟ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم خود غافل کیوں رہے؟"

"مم... میں سر!... ن... نہیں سر! میں نے تو... ان سب کی ڈیوٹیاں لگا دی تھیں۔" دلاور خاں نے ہکلا ہکلا کر بہ مشکل اپنی بات پوری کی۔

"اور یہ سب باری باری اپنی ڈیوٹیاں دیتے رہے! کیوں؟" تیواڑی جی کے لہجے میں بڑا زہر بھرا ہوا تھا۔

"ج... جی... جی ہاں سر!" دلاور خاں بھیگی بلّی بنتے ہوئے بولے۔

"اسی طرح دی جاتی ہے ڈیوٹی کہ اندر سے چیخیں سنائی دیتی رہیں اور باہر یہ اطمینان سے ٹہلتے رہیں!" تیواڑی جی پھر پھنکارے۔

چیخوں کے ذکر پر میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔ میں نے سوچا کہ یہ جواب طلبی کل والے چکر میں تو نہیں ہو رہی۔ لگتا تو ایسا ہی تھا مگر میں چپ سادھے رہا۔ ہاں مجھے یہ حیرت ضرور تھی کہ تیواڑی جی کو چیخوں کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ دلاور خاں یا ان کے ماتحتوں میں سے تو کوئی تیواڑی جی کو یہ بات بتا کر اپنی کم بختی بلانے سے رہا۔ میں نے سوچا، تیواڑی جی کو کسی اور ہی طرح ان چیخوں کا حال معلوم ہوا ہوگا جو بہاری لال کے مُنہ سے "نشر" ہوئی تھیں۔ شاید لیوسی کی پیشی ان لوگوں سے پہلے ہو چکی ہے یا وہ خود سب کچھ بتا کر جا چکی ہے۔ میں ٹُک سے ٹُک بھر اتارہا۔

"بغلیں نہ جھانکو، میری بات کا جواب دو!" تیواڑی جی، دلاور خاں کو خاموش دیکھ کر اور شیر ہو گئے۔

"سر!... میں اِس غلطی پر جواب... جواب طلب کروں گا، تحریری جواب!... آپ قطعی بے فکر رہیں۔" دلاور خاں نے اطمینان دلانا چاہا۔

وہاں دلاور خاں کا ماتحت راٹھور بھی موجود تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر تیواڑی جی کے کچھ کہنے سے پہلے ڈرتے ڈرتے بولا۔ "سر! مجھے... مجھے صرف اتنا ہی حکم دیا گیا تھا... میرا مطلب... مطلب یہ ہے سر... کہ صرف نگرانی کا حکم! مجھے دخل اندازی سے منع کر دیا گیا تھا... میں اسی لیے سر، کچھ نہیں بولا... اور صرف... صرف نگرانی کرتا رہا۔"

تیواڑی جی نے دلاور خاں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر براہِ راست راٹھور سے مخاطب ہوئے۔ "تم نے بتایا تھا کہ بہاری لال کے مکان میں پہلے تین افراد گئے، اس کے بعد ایک غنڈہ داخل ہوا۔ اس کے باوجود تمھارے کان پر جوں نہیں رینگی! تم اس سے کسی نتیجے پر نہیں پہنچے!"

میرا جی چاہا کہ کہہ دوں، جوں ہوتی تو ضرور رینگتی مگر خاموش ہی رہا۔ مجھے تیواڑی جی کے غصّے کا رخ اپنی طرف نہیں موڑنا تھا۔

راٹھور نے غالباً جواب دینے کے لیے دو چار بار تھوک نگلا، پھر بولا۔ "سس... سر! میں بالکل... قطعی سمجھ گیا تھا... کہ... کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہے، خاص طور پر اس غنڈے کو مکان میں جاتے ہوئے دیکھ کر! لیکن... لیکن سر!... سر، حکم کی خلاف ورزی مناسب نہیں سمجھی میں نے۔"

"دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے!" تیواڑی جی ہاتھ اٹھا کر گرجے۔ "اگر لیوسی نہ ملی تو میں... میں تم سب کا جواب طلب کر لوں گا، تحریری جواب!"

ظاہر ہے کہ تیواڑی جی نے ان سب، یعنی دلاور خاں اور ان کے ماتحتوں کو دفع ہو جانے کا حکم دیا تھا، مجھے نہیں اس لیے میں وہیں موجود رہا۔ ان سبھی نے دفع ہو جانے میں انتہائی تیزی کا ثبوت دیا تھا۔

تیواڑی جی کا آخری جملہ سن کر صورتِ حال مجھ پر بڑی حد تک واضح ہو گئی تھی۔ اس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ مسمّاۃ لیوسی اس دن کسی سبب دفتر نہیں آ سکی تھیں ورنہ اتنا لمبا چوڑا "ڈراما" نہ ہوتا۔ تیواڑی جی غالباً یہ سمجھ رہے تھے کہ بہاری لال نے لیوسی کو کہیں غائب کر دیا ہے یا شاید وہ کچھ اور سوچ رہے ہوں۔ بہ ہر حال میرے لیے خدا نے یہ بڑا سنہری موقع پیدا کر دیا تھا۔ میں اس وقت تیواڑی جی کی آنکھ کا تارا بن سکتا تھا۔

دلاور خاں اور ان کے ماتحت کمرے سے نکل گئے تو تیواڑی جی گھوم کر اپنی کرسی پر جا بیٹھے اور مجھے بھی سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کرسی پر اپنی تشریف رکھتے ہی گل افشانی شروع کر دی۔ میں نے بہت نرم اور پُرسکون لہجے میں کہا۔ "سر! آپ اتنی ذرا ذرا سی باتوں پر اس طرح پریشان نہ ہو جایا کریں۔ جب تک آپ کا اے ڈی موجود ہے آپ کو کیا غم!"

"کیا مطلب!" تیواڑی جی تیوریاں چڑھا کر بولے۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ تمھیں خبر بھی ہے کچھ کہ بس لگے اِدھر اُدھر کی ہانکنے!"

"سر! دراصل آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ میں آپ ہی کا تو شاگرد

ہوں۔" میں نے انھیں بانس پر چڑھایا اور وہ چپ چاپ چڑھ گئے۔

"ہاں۔" ان کے لہجے میں نرمی آ گئی۔ "میں نے ہی تمھیں سب کچھ سکھایا ہے۔ تم میرے ہی پروردہ ہو مگر بعض شاگرد نااہل بھی نکل آتے ہیں اور احسان فراموش بھی!"

تیواڑی جی نے اپنی عادت کے مطابق آخر میں ڈنک مار ہی دیا مگر میں نے ان کے ڈنک کا نوٹس نہیں لیا اور بولا۔ "سر! میں کم سے کم ہرگز ایسا نہیں ہوں۔ میں تو کھلے عام کہتا پھرتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی جوتیوں بلکہ جوتے کے طفیل میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم ایسا کہتے ہو تو غلط نہیں کہتے۔" تیواڑی جی اور بھی بانس پر چڑھ گئے۔ وہ بالکل بانس کی نوک پر جا بیٹھے تھے اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔ اب ان کے چہرے سے غصّے کی بجائے فخر و تمکنت کا اظہار ہونے لگا تھا۔ پھر جب وہ دوبارہ بولے تو ان کا لہجہ مزید نرم تھا۔ "میں تمھیں تمام حالات سے آگاہ کیے دیتا ہوں۔ تمام حالات سننے کے بعد تم مجھے بتاؤ گے کہ کیا قدم اٹھانا چاہیے! اسے تم اپنی ذہانت کا امتحان سمجھ سکتے ہو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نے آخر مجھ سے کیا کچھ سیکھا ہے۔"

تیواڑی جی مجھے حالات سے بے خبر جان کر تمام کتھا کہانی سنانے کے لیے مٹھا رہے ہی تھے کہ میں بول اٹھا۔ "سر یہ وہی لیوسی کا معاملہ ہے نا؟"

"ہاں۔" تیواڑی جی نے یہ کہہ کر سگریٹ سلگائی اور کش لیا۔

وقفے سے فائدہ اٹھا کر میں نے پھر جلدی سے کہا۔ "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں سر! بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟ لیوسی کو برآمد کرا لاؤں؟"

"بس تم میں یہی خرابی ہے کہ آگے آگے دوڑنے لگتے ہو۔" تیواڑی جی نے مُنہ بنایا۔ "پہلے پوری بات تو سن لی ہوتی!"

"مجھے سب معلوم ہے سر! آپ کی طرح میں بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔" میں نے پھر تیواڑی جی کو نہ بولنے دیا جس پر وہ کسی قدر جھنجلا گئے۔

"کیا معلوم ہے تمھیں، خاک؟" تیواڑی جی نے مجھے گھور کر کہا۔

"وہ بھی معلوم ہے۔" میں جھونک میں کہہ گیا مگر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے بولا۔ "میں آپ کا قیمتی وقت بچانا چاہتا تھا سر! اگر آپ حکم دیں تو میں از اوّل تا آخر سب کچھ خود ہی بتاتا چلا جاؤں۔ کس طرح لیوسی، سیٹھ عثمان تک پہنچی؟ کس طرح اور کیسے اسے وہاں رہنے کا موقع ملا؟ اس نے وہاں کیا دیکھا، کیا جانا؟ پھر کیوں اس نے لیوسی کو بہاری لال کے سپرد کر دیا؟ اس کے بعد لیوسی کو کیا واقعات پیش آئے؟ اور یہ بھی کہ اس وقت وہ کہاں ہو سکتی ہے!"

تیواڑی جی نے مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھا جیسے میں اے ڈی مہر کی بجائے کوئی عجوبہ ہوں۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ میرا وار کارگر ہوا تھا۔ تیواڑی جی کی جیسے بولتی بند ہو کر رہ گئی تھی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہ سکے، پھر شاید سگریٹ کے دھویں نے انھیں چونکا دیا جو غالباً ان کی آنکھوں میں راستہ بنا رہا تھا۔ ان کے جس ہاتھ میں سگریٹ تھی، وہ کچھ اٹھا ہوا تھا اور میری بات سن کر حیرت کی زیادتی کے سبب اٹھا کا اٹھا رہ گیا تھا۔ انھوں نے جلدی سے کش لیا، پھر بوجھل سی آواز میں بولے۔ "تم... تم اللہ دتا واقعی میرے لائق شاگرد معلوم ہوتے ہو۔"

"معلوم ہوتا کیا سر، بلکہ ہوں!" میں زور دے کر بولا۔ "آپ اس بات پر اب یقین کر ہی لیں۔"

"ہاں مجھے اب کچھ کچھ یقین آتا جا رہا ہے۔" تیواڑی جی نے یقین آنے کے باوجود ڈنڈی ماری اور میں نے انھیں تھوڑی بہت ڈنڈی مارنے دی۔ "ہاں تو بتاؤ، شروع ہو جاؤ تم! تم نے میرے ذہن سے ایک بہت بڑی الجھن ختم کر دی۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتانے سے پہلے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں سر، کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا، موری گیٹ میں، بہاری لال کے مکان سے چیخیں بلند ہوئی تھیں؟ سر! میں بھی پہلے اپنی ذہنی الجھن دور کر لینا چاہتا ہوں تاکہ اطمینان کے ساتھ آپ کو سب کچھ بتا سکوں۔"

تیواڑی جی میری بات سن کر مسکرائے، پھر بولے۔ "اچھا یہی سہی! اب تم سے کیا چھپانا! کل غالباً تمھارے سامنے ہی دلاور خاں نے رپورٹ دی تھی۔ تم اس وقت یہاں موجود تھے۔ تم اور دلاور خاں چلے گئے تو میں نے اس سلسلے میں خود کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد میں نے آخر ایک راہ نکال ہی لی۔ دراصل میں چاہتا یہ تھا کہ مقصد بھی حل ہو جائے اور بہاری لال کو کوئی شبہہ بھی نہ ہو۔ تمھیں تو علم ہی ہے کہ جگدیش بابو میرے قریبی عزیز ہیں اور یہ بھی جانتے ہو کہ بہاری لال سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ میں نے سوچا کہ جگدیش بابو سے ملنے کا بہانہ اچھا رہے گا۔ میں بہاری لال سے کہہ دوں گا کہ جگدیش بابو، گھر پر نہیں تھے اس لیے انھیں تلاش کرتا ہوا، بہاری لال کے گھر آ گیا۔ میں اس طرح بہاری لال سے مل کر کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر لیوسی وہاں موجود ہوتی تو نظر آ جاتی۔ بہ ہر حال میں موری گیٹ جا پہنچا۔ راٹھور بھی وہاں سادھو بنا پھر رہا تھا مگر میں نے اسے مُنہ نہیں لگایا۔ میں نے اپنی جیپ سیدھی بہاری لال کے دروازے پر جا کر کھڑی کی۔ پھر جیسے ہی میں دروازے کے قریب پہنچا، مجھے اندر سے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دیں مگر یہ آوازیں مردانہ تھیں۔ میں نے دروازے پر زور کی دستک دی مگر کوئی جواب

نہ ملا۔ پھر میں اس وقت تک دروازہ پیٹتے گیا جب تک کہ خود بہاری لال نے دروازہ نہ کھول دیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے کسی نے بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ بہاری لال نے بتایا کہ ایک مسلح غنڈہ اس کے گھر میں گھس آیا تھا جو اسے مار پیٹ کر پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا۔ بہاری لال نے خیال ظاہر کیا کہ اس کے کسی سیاسی حریف نے اس غنڈے کو بھیجا ہوگا۔ بہاری لال نے یہ بھی کہا کہ اگر میں بروقت نہ پہنچ جاتا تو وہ غنڈہ اسے قتل کر دیتا۔ اچانک دروازے پر دستکیں سن کر وہ غنڈہ گھبرا گیا تھا اور اسے قتل کیے بغیر ہی فرار ہو گیا تھا۔ بہاری لال کا بیان سن کر میں نے دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ وہاں لیوسی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ میں چکرا گیا ہوں گا کیوں کہ دلاور خاں کے ماتحت شرما کی رپورٹ

کے مطابق لیوسی کو اسی کے مکان میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا اور شرما اس وقت وہاں سے ہٹا تھا جب راٹھور پہنچ گیا تھا۔ حالات کچھ اس طرح پیش آئے تھے کہ میں براہ راست بہاری لال سے لیوسی کے بارے میں استفسار نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجتاً میں ناکام واپس ہوا۔ بہاری لال نے بھی مجھ سے اِدھر آنکلنے کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے سوچا سمجھا جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔ میں نے بہاری لال کے مکان سے نکل کر راٹھور کو پکڑا۔ اس نے بتایا کہ لیوسی اس گھر سے نہیں نکلی۔ ظاہر ہے کہ لیوسی کی پُراسرار گم شدگی نے مجھے پریشان کر دیا اسی لیے دفتر آتے ہی میں نے دلاور خاں اور اس کے تمام ماتحتوں کو طلب کر لیا۔ تو یہ تھا سارا چکر!" تیواڑی جی نے اپنی بات ختم کر کے طویل سانس اور پھر سگریٹ کا طویل کش لیا، اس کے بعد بولے "اب تو تمھاری ذہنی اُلجھن ختم ہو گئی!"

"ہاں، بالکل سر!" میں چہک کر بولا پھر انھیں ایک دم "حیران پریشان" کرنے کی خاطر کہا "آپ کو علم ہے سر، وہ غنڈہ کون تھا جسے بہاری لال کے مکان میں گھستے ہوئے دیکھا گیا تھا؟"

"کون تھا؟ کیا تم اسے بھی جانتے ہو؟" تیواڑی جی حیرت سے بولے۔

"کیوں نہیں جانوں گا سر!" میں مزید چہکا "وہ غنڈہ یہی آپ کا شاگرد تھا" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے سینے پر بھی ہاتھ رکھا کہ کہیں وہ اپنے کسی اور شاگرد کو غنڈہ نہ سمجھ بیٹھیں۔

"کیا مطلب!" تیواڑی جی اُچھل پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں "وہ... وہ تم تھے؟"

"جی ہاں سر!" میں نے اس طرح کہا جیسے غنڈہ ہونا کوئی بہت بڑا اعزاز ہو "مگر سر، بہاری لال کی پٹائی میں نے نہیں لیوسی نے لگائی تھی"

"کیا کہہ رہے ہو تم!" تیواڑی جی بے یقینی سے بولے "مجھے ساری تفصیل بتاؤ!" تیواڑی جی کے لہجے میں بے چینی تھی۔

میرا مقصد بڑی حد تک حل ہو چکا تھا اس لیے میں نے مزید تجسس پیدا کرنا غیر ضروری سمجھا۔ میں نے خاصا نمک مرچ لگا کر تیواڑی جی کو تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ میں نے واقعات کو کچھ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ ہر واقعہ میرے ہیرو ہونے کی طرف اشارہ کرے، بہ الفاظِ دیگر اگر میں نہ ہوتا تو خفیہ کا محکمہ بے مصرف ہی تھا۔ تیواڑی جی اس دن مجھ پر اتنے صدقے واری ہوئے کہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے بہاری لال والے معاملے میں اپنے قریبی عزیز جگدیش بابو کے ملوث ہونے پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ تیواڑی جی نے کہا تھا کہ اب وہ جگدیش بابو کے گھرانے سے اپنے تعلقات ختم کر لیں گے۔ جب میں خاصی داد بٹور چکا تو مجھے خیال آیا کہ تیواڑی جی نے مجھے کس لیے بُلوایا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جوشِ جذبات میں وہ اصل بات بھول ہی گئے ہوں۔ گزشتہ دن سر تھامسن نے مجھ سے کہا تھا کہ آئندہ روز تیواڑی جی سے مجھے ان کے احکام مل جائیں گے۔ عین ممکن تھا کہ تیواڑی جی نے مجھے وہی احکام دینے بُلایا ہو۔

"سر! مجھے دفتر آنے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ آپ کئی بار بُلوا چکے ہیں" میں نے کہا "بس اتفاق ہی سے مجھے دیر ہو گئی تھی سر! ظاہر ہے آپ نے مجھے کوئی حکم دینے ہی بُلوایا ہوگا"

"خیر دیر ہو گئی تو کوئی بات نہیں" تیواڑی جی خلافِ توقع انتہائی نرمی کا ثبوت دے رہے تھے "تمھی لوگ رات دن بھی تو کام کرتے ہو۔ دراصل کل ہوا یہ کہ نادانستگی میں تمھارے مُنہ سے ایک غلط لفظ نکل گیا جس پر میری برہمی بے جا نہیں تھی۔ اس وقت میں وہ لفظ نہیں دُہراؤں گا۔ میں نے کل بھی تمھیں کسی وجہ سے بُلایا تھا مگر دلاور خاں کی رپورٹ نے مجھے اُلجھا دیا اور میں تم سے جو بات دریافت کرنا چاہتا تھا، وہ بھول گیا۔ میں نے تمھیں اِس وقت کوئی حکم دینے کے لیے نہیں بُلایا بلکہ مجھے تم سے کچھ دریافت کرنا ہے" یہ کہہ کر تیواڑی جی نے ختم ہونے والی سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگالی۔ وہ بھی شاید کچھ ہی دن میں مولانا ابوالکلام آزاد یا امین الدین قادری بن جانا چاہتے تھے، سگریٹ پینے کی رفتار سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

"ضرور دریافت کریں سر!" میں جلدی سے بولا "انشاء اللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا!"

میری بات سن کر تیواڑی جی نہ معلوم کیوں مسکرانے لگے، پھر سگریٹ کا کش لے کر بولے "میں دراصل تم سے سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تم اتنے دن سیٹھ عثمان کی تعمیراتی کمپنی میں رہ کر رگھوناتھ کے متعلق بہت

کچھ جان چکے ہو گے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی دریافت کرنا تھا کہ تم وہاں سے اچانک کیوں چلے آئے؟"

تیواڑی جی کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سر تھامسن سے یا تو ان کی ملاقات نہیں ہوئی یا ملاقات ہوئی بھی تھی تو سر تھامسن نے انھیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں سر تھامسن کو پوری "اسٹوری" پہلے ہی سنا چکا تھا اس لیے دوبارہ وہی ساری باتیں دُہرانے سے مجھے کوفت سی ہو رہی تھی مگر تیواڑی جی مجھ سے اس وقت بہت خوش تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ خوشی عارضی ثابت ہو اس لیے مجھے مجبوراً "فرمائشی ریکارڈ" دوبارہ بجانا پڑا۔

میرا ریکارڈ بج چکا تو تیواڑی جی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائے "یہ رگھوناتھ عجب معمّا بنتا جا رہا ہے"

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ تیواڑی جی اس دوران میں سگریٹ کے کش پر کش لیتے ہوئے کسی سوچ میں غرق رہے۔ میں اب وہاں سے چھوٹ لینا چاہتا تھا اس لیے بولا "اور کوئی کام تو نہیں سر! میں جاؤں؟"

"ہاں جاؤ" تیواڑی جی چونک کر بولے، پھر کہا "اِس رگھوناتھ کا حُلیہ وغیرہ اب تک معلوم نہیں ہوا۔ تم نے کچھ معلوم کیا؟"

"ویسے سر، حُلیہ معلوم بھی ہو جائے تو ہوگا کیا! وہ تو ایسا 'الوپ' ہوا ہے کہ اس دوران میں بس ایک بار نظر آیا ہے، وہ بھی صرف سیٹھ عثمان اور لیوسی کو!" میں نے جواب دیا۔

"بہرحال اس کا حُلیہ وغیرہ ریکارڈ میں ہونا چاہیے۔ یہ بات تم نے خوب یاد دلائی کہ لیوسی بھی اسے دیکھ چکی ہے۔ تم ایسا کرنا کہ احتیاطاً لیوسی سے اس کا حُلیہ دریافت کر کے فائل میں لکھ دینا"

"بہتر ہے سر! اور کچھ؟" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ یہ پہلا دن تھا کہ تیواڑی جی مجھ سے "بھڑکے" نہیں تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی بات پر وہ "بھڑک" اٹھیں۔

"اور کوئی بات نہیں تم جا سکتے ہو"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سر تھامسن نے یقیناً ابھی میرے لیے احکام جاری نہیں کیے تھے ورنہ تیواڑی جی سب سے پہلے انھی کا ذکر کرتے۔ میں نے بھی جان بوجھ کر اس لیے کچھ نہیں کہا کہ جب تک جان بچی ہوئی ہے، ٹھیک ہی ہے۔ معلوم نہیں، بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت گلے پڑ جائے۔

میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے سے لیوسی آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ قریب آگئی تو اس نے دیر سے دفتر آنے کی وجہ بتائی۔ موصوفہ کی "اماں حضور" اچانک "صبح ہی صبح" بیمار ہو گئی تھیں۔ ان خاتون کو دمہ تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ دَم کے ساتھ جاتا ہے۔ وہ اُلٹے سیدھے سانس لینے لگی تھیں اور بہ مجبوری لیوسی کو انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا تھا اس لیے کہ حکیموں کے ٹوٹکے بڑی بی کے حلق سے نہیں اترتے تھے۔ لیوسی نے بتایا تھا کہ ابھی اس کی "اماں" کا مزاج پوری طرح "درست" نہیں ہوا اِس لیے وہ کچھ دیر بعد ہی گھر واپس چلی جائے گی۔ اگر دفتر آ کر تیواڑی جی کو رپورٹ دینا ضروری نہ ہوتا تو وہ اس وقت بھی نہ آتی۔

میں نے اس کی "رُودادِ اَلم" سن کر کہا "دیکھو چندا! تم مجھے فکرمند دکھائی دے رہی ہو، ایسا کرو کہ بغیر رپورٹ دیے ہی گھر لوٹ جاؤ۔ میں تیواڑی جی کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ تم دیر سے کیوں آئی تھیں اور پھر واپس کیوں چلی گئیں"

لیوسی واقعی کچھ پریشان پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں بھی بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کو ماؤں کا خیال ہوتا ہے، شاید اس کا سبب "ہم صنف" ہونا بھی ہے۔ میری بات سن کر وہ بولی۔ "اگر ایسا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں" یہ کہہ کر وہ مڑنے لگی۔

"سنو تو!" میں نے اسے روکا۔

"ہوں" وہ رک کر بولی "کہو"

"سیٹھ عثمان کے منیجر رگھوناتھ کو تم نے دیکھا تھا نا! اس کا حُلیہ وغیرہ ہے ذہن میں؟"

پھر لیوسی نے رگھوناتھ کا جو حُلیہ بتایا، اسے سن کر جیسے میرا فیوز اُڑ گیا۔ کوٹ پتلون جسم پر، تلوار کٹ باریک سی مونچھیں، لمبوترا چہرہ، گھونگریالے بال، ہونٹ پتلے پتلے پھانکوں جیسے اور ناک کا بانسا کچھ اُبھرا ہوا سا! یہ تھا رگھوناتھ کا حُلیہ!

"ک... کیا... کیا کہہ رہی ہو تم لیوسی!" میں بے یقینی سے بولا "تمھیں یقین ہے کہ وہ رگھوناتھ ہی تھا؟"

"ہاں بالکل!" لیوسی نے جواب دیا، پھر تفصیل بیان کی "وہ رگھوناتھ ہی تھا۔ اس وقت سیٹھ عثمان مجھے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ وہ میرے ہی کمرے میں تھا جب یونیک نے آ کر یہ اطلاع دی کہ رگھوناتھ آیا ہے اور نشست گاہ میں اس کا منتظر ہے۔ سیٹھ عثمان فوراً ہی کمرے سے چلا گیا تھا۔ رگھوناتھ کا نام سن کر میں چونکنا ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کم از کم اسے ایک نظر دیکھ تو لوں، اس کے علاوہ اگر ممکن ہو تو سیٹھ عثمان اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن لوں۔ میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے میں تو کامیاب نہ ہو سکی البتّہ اسے دیکھنے میں ضرور کامیاب ہو گئی۔ میں نے نشست گاہ کے اندرونی دروازے کا تھوڑا سا پردہ اٹھا کر بہت احتیاط سے رگھوناتھ کو دیکھا تھا تاکہ سیٹھ عثمان کی

یا خود رگھوناتھ کی نظر ادھر اٹھ جاتی تو وہ کھٹک نہ جائیں۔ سیٹھ عثمان اندرونی دروازے سے کافی فاصلے پر رگھوناتھ کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے اسی لیے میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سن سکی۔ خیر، یہ بتاؤ کہ اس کا حلیہ وغیرہ جان کر تمھیں کیوں حیرت ہوئی؟" لیوسی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بس یہی نہ پوچھو" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم اِس وقت جلدی میں ہو، پھر کسی وقت بتاؤں گا۔"

لیوسی واقعی جلدی میں تھی اِس لیے اس وقت زیادہ اصرار نہیں کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ گلے پڑ جاتی۔

لیوسی چلی گئی تو میں دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بظاہر یہ عجیب سی بات تھی کہ جس شخص کو اتنی شدّومد سے تلاش کیا جا رہا تھا، خفیہ والوں کو اس کے حلیے کا علم نہیں تھا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے بہت کم آیا تھا۔ وہ سیٹھ عثمان کی تعمیراتی کمپنی میں منیجر ہونے کے باوجود تین ماہ کے اندر صرف تین چار مرتبہ ہی دفتر گیا تھا۔ میں نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا تھا ورنہ سیٹھ عثمان کے دفتر میں رہتے ہوئے جہاں دوسری معلومات حاصل کی تھیں، رگھوناتھ کا حلیہ بھی کسی نہ کسی طرح معلوم کر ہی لیتا۔ رگھوناتھ کے حلیے نے میری ایک ذہنی الجھن ختم کر دی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے باوجود میں کافی دیر تک خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں کہاں کی سیر کرتا رہا۔ اِس دوران میں ایک آدھ بار میری نظر کمار کی طرف بھی اٹھی۔ وہ غالباً مجھے جُھنکانے کی خاطر باقاعدہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا مگر میں طرح دے گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا، اونگھتا رہ بیٹا رام! میرا کیا ہے، خود ہی اونگھتے اونگھتے تھک جائے گا۔ کمار کے سوا کسی اور میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ مجھ سے خواہ مخواہ "الٹک لڑائی" مول لیتا۔ کچھ دیر بعد شاید کمار واقعی تھک گیا۔ اس نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے میری طرف دیکھا، پھر میز پر سر رکھ کر کہنی سامنے رکھ لی۔ اس طرح غالباً وہ میرے صبر کا امتحان لے رہا تھا۔ کوئی گھنٹا بھر اسی طرح گزر گیا مگر میں نے کمار سے "چوں" نہیں کی۔ میں بھی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آج اس بدبخت کو ہرا کر ہی دم لوں گا۔ اپنی مصروفیت کا اظہار کرنے کی خاطر میں نے دراز سے موجودہ کیس کی فائل نکال لی اور خانہ پُری کرنے لگا۔ میں فائل میں گزشتہ روز پیش آنے والے واقعات درج کر رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے کمار کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک بار محسوس کیا کہ کمار کے سر نے خفیف سی حرکت کی اور ذرا سا اوپر

اٹھا، پھر اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ بذات میز پر سر رکھ کر سو نہیں رہا بلکہ صرف سونے کی اداکاری کر رہا ہے تاکہ میں باتوں پر گرم ہو جاؤں اور یوں اسے مجھ سے "منہ ماری" کا موقع مل جائے۔ بیٹے خاں! آج تو تمھارے دل میں یہ حسرت ہی رہ جائے گی۔ میں نے سوچا اور اسی وقت سارا کمرہ زوردار خراٹوں سے گونج اٹھا۔ "خوں... اوں... اوں... خوں... اوں... اوں!" کمار نے نیا حربہ آزمایا۔ میرے اور اس کے درمیان سرد جنگ جاری تھی۔ نہ وہ ہتھیار ڈالنے پر راضی تھا، نہ میں! مگر نئی صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہونے لگی۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا، اس عذاب سے کس طرح نمٹوں کہ تیواڑی جی کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے سوچا کہ آج تیواڑی جی بہت اچھے موڈ میں ہیں اور مجھ پر بہت مہربان ہیں، آج کمار کا "دھڑن تختہ" کرا ہی دوں۔ کچھ اور ہو نہ ہو، اس کا تبادلہ تو ہو ہی جائے۔ کم از کم دفتر میں سکون کے ساتھ سانس تو لے سکوں گا، پھر موقع دیکھ کر کبھی نہ کبھی دوسرا کانٹا بھی نکال ہی دوں گا۔ پیارے لال ہنر بھی میرے لیے کانٹا ہی تھا مگر پھر بھی کمار سے کم کھٹکتا تھا۔ میں کمار کے خراٹوں کو نظرانداز کرتا ہوا کمرے سے سیدھا نکلتا چلا گیا۔

میں کمرے سے چند قدم دور گیا ہوں گا کہ عقب سے زبردست "قہقہاہٹ" سنائی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے بھرے بازار میں کوئی میرے سر پر چپت مار کر بھاگ گیا ہو۔ میرے سارے ماتحت کورس میں ہنس رہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ ابھی لوٹ کر ان بدبختوں کی گردنیں اُڑا دوں مگر ضبط کر گیا۔ میرے اس قدر کھول اٹھنے کا سبب ان سب کی مشترکہ "قہقہاہٹ" تھی، گویا وہ سبھی میرے خلاف کی جانے والی سازش میں کمار کے ساتھ ہو گئے تھے۔

میں تیواڑی جی کے کمرے میں پہنچا تو وہ خلافِ توقع کچھ گھبرائے ہوئے سے دکھائی دیے مگر میں نے ان کی "گھبگھبی" کا کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" والا مسئلہ تھا۔ میں خود بھُنکا بھُنکایا وہاں پہنچا تھا اس لیے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنی "رام کہانی" شروع کر دی۔ "سر! میں ایک عرصے سے کمار کو برداشت کرتا آیا ہوں، وہ بھی صرف آپ کا مُنہ دیکھ کر لیکن اب...."

"سنو سنو، ٹھہرو!" تیواڑی جی نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ یہ محکمہ جاتی باتیں پھر کسی وقت ہوتی رہیں گی۔ فی الحال میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو! میں ابھی ڈی جی صاحب کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں۔ کل مشہور کانگریسی لیڈر راجندر پرشاد دہلی آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈی جی صاحب کا حکم ہے کہ جہاں دیگر انتظامات کیے گئے ہیں،

وہیں تمھیں بھی اسٹیشن پر موجود رہنا ہے۔ ڈی جی صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ راجندر پرشاد پر قاتلانہ حملہ متوقع ہے۔ خود راجندر پرشاد جی کو بھی اس بات سے آگاہ کیا جا چکا ہے اسی لیے وہ پرسوں آنے کی بجائے کل شام ہی یہاں پہنچ رہے ہیں تاکہ ان کی دہلی میں آمد راز رہ سکے۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ دہلی میں کسی جلسے سے خطاب نہ کریں اور جلد سے جلد چلے جائیں۔ بہرحال سیاسی حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے حکومت اس وقت کانگریس پارٹی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرنا چاہتی ورنہ راجندر پرشاد جی کے دورے کو زبردستی بھی روکا جا سکتا تھا، کم از کم دہلی کی حدود میں داخل ہونے پر تو پابندی لگائی ہی جا سکتی تھی۔ وہ ٹرین چار بج کر دس منٹ پر آئے گی جس سے راجندر پرشاد جی دہلی آ رہے ہیں۔ ڈی جی صاحب کا حکم ہے کہ تم تین بجے ہی سے اسٹیشن پر موجود رہو۔ بس اب تم جا سکتے ہو، مجھے اس سلسلے میں مزید احکام بھی جاری کرنا ہیں۔" تیواڑی جی نے گویا ایک ہی سانس میں بغیر رکے سب کچھ کہہ بھی دیا اور مجھے "ٹرخا" بھی دیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت تیواڑی جی کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں اس لیے وہاں سے "ٹرخ" ہی آیا لیکن اسی کے ساتھ بقیہ دن کی چھٹی بھی لے لی۔ چھٹی لینے کا سبب صرف یہ تھا کہ اس وقت مجھے اپنے ماتحتوں پر شدید غصّہ تھا اور مجھے علم تھا، غصے کی حالت میں آدمی کم از کم نصف پاگل تو ہو ہی جاتا ہے۔ میرے ماتحتوں اور خود میرے حق میں یہی بہتر تھا کہ میں ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر پھوٹ لیتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا اس طرف بڑھ گیا جہاں پھٹ پھٹ کھڑی کی تھی۔

اس وقت کوئی ایک بجے کا وقت ہو گا جب میں گھر پہنچ گیا۔ امّی مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئیں، پھر جب میں نے بتایا کہ دفتر سے چھٹی لے آیا ہوں تو ان کی باچھیں مزید کھل گئیں۔ اس دن بڑی چلچلاتی دھوپ "پڑ رہی تھی"۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کے وقت کسی بچے کے "چچیا" کر رونے سے میری آنکھ کھل گئی۔ ہمارے گھر میں جتنے افراد تھے، وہ "چچیانے" کی منزل سے گزر چکے تھے اس لیے مجھے اس "چچیاہٹ" پر حیرت ہوئی اور حقیقتِ حال جاننے کی خاطر کمرے سے باہر جھانکا۔ وہ خاتون پڑوس میں ہی رہتی تھیں جن کے کولھے پر وہ "چیچیا" ٹکا ہوا تھا جو "چچیائے" چلا جا رہا تھا۔ وہ ہمارے رشتے داروں ہی میں سے ہوتی تھیں اور میں انھیں بھابی کہتا تھا۔ ان کا چھوٹا دیور عالمگیر میرا ہم عمر و ہم جماعت رہ چکا تھا۔ ان کے گھر میں میرا پردہ بھی نہیں تھا۔ وہ خاتون، یعنی میری بھابی، امّی کو مائیوں

میں مدعو کرنے آئی تھیں۔ ان کی نند آج مائیوں بیٹھ رہی تھی۔ مجھے نہ ان کی نند سے کوئی دلچسپی تھی نہ اس کے مائیوں بیٹھنے سے! مجھے جس بات نے "اُچھال" لگانے پر مجبور کر دیا تھا، وہ کچھ اور ہی تھی۔ ان خاتون نے بتایا تھا کہ مائیوں میں میری ہونے والی ساس اور ان کی نورِ نظر، یعنی میرے ہونے والے بچّوں کی ماں بھی "بہ نفسِ نفیس" تشریف لا رہی ہیں۔ میں نے اب تک اس ظالم کی شکل نہیں دیکھی تھی جس کے ساتھ مجھے زندگی بھر رونا یا ہنسنا تھا۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ تقریب مغرب بعد ہونا تھی مگر مہمان پہلے ہی سے "جُڑنا" شروع ہو جاتے۔ میرے ہونے والے سسرالیوں سے عالمگیر کے گھر والوں کی قریبی رشتے داری تھی، توقع یہی تھی کہ وہ لوگ قرابت داری کا خیال رکھتے ہوئے کچھ پہلے ہی آئیں گے۔ امّی نے ان خاتون سے مغرب بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جب شربتِ دیدار پی رہا ہوں تو امّی بھی وہاں ہوں اس لیے کچھ پہلے ہی، یعنی مغرب سے پہلے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

عالمگیر کو "سانٹھنے" میں مجھے زیادہ دِقّت پیش نہیں آئی۔ اسے "سانٹھنا" یوں ضروری تھا کہ وہ میری "جانم" یا ہونے والی "جانم" کی نشان دہی کر سکے کیوں کہ وہ موصوفہ کو پہچانتا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے حسین نقشے بن رہے تھے۔ آدمی چاہے خود گوبر کا چوتھ کیوں نہ ہو، اپنی محبوبہ یا جورو کو "گل بکاؤلی" ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر خدا خدا کر کے شربتِ دیدار پینے کی گھڑی آ ہی گئی۔ میں عالمگیر کے ساتھ اس کے گھر میں تھا۔ عالمگیر نے ہرنی جیسی آنکھوں والی ایک نوخیز لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت وہ اپنی ایک ہم عمر لڑکی کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کے کانوں میں جھمکے اور گلے میں ہار تھا۔ ہائے ہائے کیا بتاؤں کہ اس وقت میرے دل پر کیا "چکو" چل گئے۔ اب تک میں نے جتنی حسینائیں دیکھی تھیں، سب مجھے اس کے سامنے پانی بھرتی دکھائی دیں۔ جوانی سبھی پر آتی ہے اور سبھی جوانی میں تھوڑے بہت حسین نظر آتے ہیں مگر اس پر تو جوانی "چھما چھم" برسی تھی۔ اب اسے کوئی دیکھ لے تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی وہ اتنی حسین بھی رہی ہو گی۔ میری کرکٹ الیون، یعنی میرے گیارہ عدد بچّے اس کا سارا حسن چاٹ چکے ہیں۔ کاش ایسا نہ ہوتا، کاش وہ گیارہ عدد بچّوں کی ماں نہ بنتی اور کاش سدا اُسی طرح جوان رہتی! مگر میں بھی تو اب بوڑھا ہو چلا ہوں۔ ایک صفحہ لکھتا ہوں تو کمر بولنے لگتی ہے، وہ اگر "بڑھیا" گئی تو کیا! ہم دونوں میاں بیوی میں اب پیار محبت کی باتوں کی بجائے "کھلُل کھلُل" کا تبادلہ ہوتا ہے۔ میں کھانستا ہوں تو اسے اور وہ

کھانستی ہے تو مجھے کھانسی اٹھنے لگتی ہے۔

لو اور سنو! میں بھی خیالوں ہی خیالوں میں چھلانگیں مارتا ہوا، کہاں سے کہاں آگیا، یعنی دلّی سے کراچی! اور نہ جانے کیا کیا "اڑنگ بڑنگ" سوچنے لگا۔ بھلا کوئی سدا جوان رہا ہے جو میری "کٹ پری" جوان رہتی! میں اپنی جورو کے حسنِ بے مثال کا زیادہ ذکر اس لیے بھی نہیں کروں گا کہ اب اس کے اور میرے مشترکہ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ کے فضل سے وہ اردو پڑھنا بھی جانتے ہیں۔ میری سرگزشت اگر سچ مچ چھپ ہی گئی تو وہ بھی اس "ملک" میں لے کے پڑھیں گے کہ یہ ان کے ابا نے لکھی تھی، دیکھیں کیا لکھا ہے۔ اس وقت خیر میں تو مر چکا ہوں گا مگر وہ مجھ پر پھبتیاں کسیں گے بہت کہ لو دیکھو ابا کو، بڑھاپے میں سٹھیا گئے تھے جو اتنی نجی اور خاص الخاص باتیں تک لکھ ماریں۔

میں نے اس شام کا ذکر اس لیے بھی بہ طور خاص کیا ہے کہ اس کے بعد مجھے کوئی لونڈیا کبھی جچی نہیں، سبھی اپنی کے آگے ہیچ و پوچ نظر آئیں۔ میں عالمگیر کے گھر سے تو چلا آیا مگر میرے خیالوں میں وہ ہی بسی رہی۔ میں اس کو رات بھر خواب میں دیکھتا رہا، اس کی ہنسی میرے خوابوں میں گونجتی رہی۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو جیسے میں خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں آگیا مگر میرے خیالوں پر اسی کا حسین چہرہ چھایا رہا۔ میں دفتر پہنچا تو سر تھامسن نے مجھے بلوا لیا اور میری سماعت میں کچھ خصوصی ہدایات انڈیلیں جو کچھ تو سماعت میں گئیں اور کچھ باہر ہی چھلک گئیں۔ اس دن نہ تو میرا جی چاہا کہ کسی پر اپنی افسری جماؤں اور نہ ہیرو بننے کا شوق چرایا۔ جیسے کمرے میں تھا بھی کوئی نہیں۔ میرے سبھی ماتحتوں کو تیواڑی جی نے "دہاڑی" سے لگا رکھا تھا۔ خفیہ کے دفتر میں اس دن جیسے اُلّو بول رہا تھا۔ مجھے سر تھامسن اور تیواڑی جی کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آیا۔ پھر تیواڑی جی بھی غائب ہو گئے۔

شاید ڈھائی بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے میں سر تھامسن کی ہدایت پر اپنے چہرے کی مرمت، یعنی میک اپ کر چکا تھا اور چچا بندو خاں کے ساتھ کھانا بھی کھا لیا تھا۔

میں وقت مقررہ، یعنی تین بجے سے کچھ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا کیوں کہ میرے دفتر سے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ جس گاڑی سے راجندر پرشاد آ رہے تھے، وہ چار بج کر دس منٹ پر آنے والی تھی اور ابھی تین بھی نہیں بجے تھے۔ میں ادھر اُدھر "ٹہلا" کیا رہا۔ گاڑی پلیٹ فارم نمبر دو پر آنے والی تھی۔ میں چار بجے پلیٹ فارم نمبر دو پر پہنچا۔ اس وقت زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا اور انگریز وقت کے معاملے میں کچھ زیادہ "چونچ" ہوتے ہیں اس لیے گاڑیاں ٹھیک وقت پر آیا اور جایا کرتی تھیں۔ میں نے پلیٹ فارم کے دو چکر ہی مارے ہوں گے کہ ٹرین کی سیٹی سنائی دے گئی، اسی کے ساتھ پلیٹ فارم بھی جیسے دھڑ دھڑانے لگا۔

مجھے معلوم ہو ہی چکا تھا کہ یہ قتل و قتل کا چکر ہے، کوئی بھی ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے "چکّو" بھی چل سکتے ہیں اور "دھائیں دھوں" بھی ہو سکتی ہے اس لیے میں نے "بجلی کے کھمبے" سے الگ ہی الگ کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ایک گیٹ کے قریب تقریباً دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ میری جیب میں ریوالور موجود تھا، بھرا ہوا! مگر ظاہر ہے، میرا ارادہ ہرگز اسے استعمال کرنے کا نہیں تھا۔ جان ہے تو جہان ہے اور جہان ہے تو نوکریاں بہتیری۔ میں نے سوچا تھا۔ چاہے کوئی قتل ہو یا بچ جائے، مجھے اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹرین آ کر رک بھی گئی مگر میں اسی لیے اپنی جگہ سے نہ ہلا اور سر تھامسن کی خصوصی ہدایات کو منہ موڑ کر جھٹک دیا۔ میں گیٹ کے قریب اس لیے کھڑا تھا کہ کوئی ہنگامہ ہو تو فوراً رفو چکر ہو جاؤں۔ میری ہی طرح اللہ کا ایک اور نیک یا بد بندہ وہیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا تھا۔ غالباً وہ بندہ لوں وہاں الگ تھلگ کھڑا ہوا تھا کہ دیسی نہیں بدیسی تھا۔ شاید وہ دیسیوں میں گھلنا ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر سوٹڈ بوٹڈ بندہ بیک وقت کئی ملکوں کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اسے کچھ غور سے دیکھا۔ کبھی وہ چینی لگتا، کبھی جاپانی اور کبھی برمی! ان دنوں اس طرح کے سوجے سوجے سے چہرے دلّی میں کم دکھائی دیتے تھے۔ وہ میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔

ٹرین رکنے کے بعد وہی مخصوص شور سنائی دیا تھا جو ایسے موقعوں پر سنائی دیتا ہے، "لیجیو، چلیو، دوڑیو!" معاً میں نے اس سوجے ہوئے چہرے والے کو چونکتے دیکھا اور پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں میری نگاہ بھی اس طرف چلی گئی جہاں معرکہ گرم ہو چکا تھا۔ راجندر پرشاد ایک ڈبے سے اترے ہی تھے کہ ایک شخص جو اپنے حلیے اور چہرے مہرے سے مسلمان نظر آ رہا تھا، چاقو کھول کر تیر کی طرح لپکا۔ اس کا رُخ اسی ڈبے کی طرف تھا جس سے راجندر پرشاد اترے تھے۔ راجندر پرشاد چند آدمیوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور غالباً اپنی طرف لپکنے والی موت سے بے خبر تھے۔ وہ شخص جو چاقو لہراتا ہوا ان کی طرف جھپٹ رہا تھا، حلیے سے غنڈہ بھی معلوم ہو رہا تھا۔ بس اچانک ہی اس غنڈے پر ایک نوجوان جھپٹا۔ وہ نوجوان، پینٹ اور قمیص میں ملبوس تھا۔ اس نوجوان نے غنڈے کو روک کر اس کا چاقو چھینا اور پلیٹ فارم پر دور پھینک دیا۔ پھر اس غنڈے اور نوجوان میں گھونسوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ میں نے اسی وقت اپنے قریب سے غراہٹ سی سنی جیسے کوئی درندہ غرایا ہو۔ یہ غراہٹ

اسی سوجے ہوئے چہرے والے کے منہ سے نکلی تھی۔ پھر اس کا ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی دائیں جیب میں رینگ گیا۔ میری نگاہیں اس کے ہاتھ کا تعاقب کرتی ہوئی جیب میں رینگ گئیں۔ اس شخص کی تمام تر توجہ ہنگامے کی طرف تھی اور میری توجہ اس کی طرف! پھر مجھے ریوالور کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آ گئی۔ وہ شخص بہت آہستہ آہستہ کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا۔



ساری عمر یہی ہوتا رہا کہ لوگ مجھ سے اپنی تکالیف کا اظہار کرتے رہے اور میں "رفتیا" کر انھیں دور کرتا رہا۔ وہ کہتے، آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ میں کہتا، چلو کوئی بات نہیں، آنکھیں بدلوا دیں گے۔ کوئی کہتا، پیٹ میں سخت درد ہے۔ میں جھٹ سے بول اٹھتا، تو کیا ہوا، پیٹ بدلوا لینا۔ کسی کا دل گھبرا رہا ہوتا تو میں اسے دل بدلوانے کا مشورہ دیتا۔ غرض کہ جسم کے جس "پارٹ" میں شکایت ہوتی، میں بڑی سنجیدگی سے "صاحبِ پارٹ" کو "نیک اور مفت مشورہ" دے دیتا۔ ظاہر ہے کہ جسے دل، گردے، پھیپھڑے، کلیجی، گردن وغیرہ بدلوانے کا مشورہ دیا جائے، وہ پیٹنے کا نہیں تو کیا کرے گا! وہ غریب مشکل میں گرفتار اور "ایں جناب" اپنی ہی دھن میں! وجہ یہ تھی کہ کبھی خود "اسپیئر پارٹ" کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیا مجال کہ کبھی بیمار ہو کے دیا ہو۔ بس وقتی طور پر "کھانسی کھلا" ہوا، کھوٹے پیٹے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خود کبھی دکھ جھیلا ہوتا تو کوّوں کے انڈے کھا جانے پر فاختہ کے غم کا علم ہوتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان دنوں سچ مچ مجھے "اسپیئر پارٹ" کی ضرورت ہے۔ زیادہ لمبا چوڑا سوال نہیں، صرف ایک گردے کا سوال ہے، ایک عدد انسانی گردہ، حیوانی نہیں! ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ایک پہیے پر بھی گاڑی چل سکتی ہے، مطلب یہ کہ میرے جسم میں ایک گردہ بھی اگر ٹھیک ٹھاک فٹ ہو جائے تو کچھ دن مزید زندگی کی بہاریں لوٹ سکتا ہوں۔ اب ڈاکٹروں کو کون بتائے کہ اے برادر! گردے کہیں بکتے تو ہیں نہیں کہ "لکس" مہیا کر لے آؤں۔

میں تقریباً تین مہینے اسپتال میں نرسوں کے ساتھ ٹھٹھول کر کے دوبارہ گھر آگیا ہوں۔ لونڈے بالے مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش میں ہیں کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ انھیں کیا خبر کہ ان کا "ابا حضور" جس طرح ساری زندگی دوسروں پر ہنستا ہنساتا آیا ہے، خود پر بھی ہنسنے کی ہمت رکھتا ہے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو منہ بسور بسور کر کیوں مرا جائے! ہر چند کہ مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے کہ لو یہ بھی خوب رہی، یعنی کہ ہم اچھے بھلے زندہ آدمی گویا کہ دنیا دیے جائیں گے مگر ہوتا یہی آیا ہے اور اس ہونے کو آج تک کوئی نہیں بدل سکا۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے اے میرے پیارے قارئین کہ آپ کا اللہ دتا عرف اے ڈی مہراب سچ مچ دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹانے والا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اے یہ کیا! ابھی تو تو جوان جہان تھا، یہ ایک دم مرنے کی کیا سوجھ گئی اور یہ تو بڑھیا کیسے گیا؟ تو عرض یہ کہ بڑھیایا ہوا میں پہلے ہی سے تھا۔ وہ اس طرح کہ جب میں نے اپنی کتھا کہانی لکھنا شروع کی تو اللہ کے فضل سے نانا، دلوا اور نہ جانے کیا کیا بن چکا تھا، عمر ساٹھ سال تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے "ساٹھا پاٹھا" والا محاورہ سنا تھا اس لیے خود کو "پاٹھا" یعنی جوان ہی سمجھتا تھا۔ آپ کو شاید میری سرگزشت کے ابتدائی صفحات یاد ہوں اور نہ یاد ہوں تو میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر میں نے اپنی سرگزشت لکھنے کا "اسٹارٹ" مارا تھا۔ میں نے اپنے بچپن کے واقعات سے ابتدا کی اور ابھی نوجوانی تک کے واقعات لکھ پایا تھا کہ ٹکٹ کٹنے کی نوبت آگئی اور اس مصرعِ دل پذیر کی حقیقت سمجھ میں آئی "ہے بہارِ باغِ دنیا چند روز!"

تو عرض یہ ہے کہ اگر کسی اللہ کے نیک بندے نے مجھے اپنا گردہ ڈونیٹ کر دیا تو ٹھیک ہے، پھر آپ میری زندگی کے بقیہ واقعات یعنی جوانی سے بڑھاپے تک کے مزید واقعات پڑھ کر قلقاریاں مارنے پر مجبور ہو جائیں گے ورنہ انہی صفحات کو آخری صفحات سمجھیے گا، گویا تھوڑے لکھے کو بہت جانیے گا۔ مہر النسا، یعنی میری جورو اور اس کے (میرے بھی) گیارہ عدد بچے اس پر اتارو تھے کہ میں عمر کے ان آخری دنوں میں بس اللہ اللہ کروں اور بہ قول مہر النسا، اپنی سرگزشت کو چولہے میں جھونک دوں، یعنی ادھوری ہی چھوڑ کر دوسری دنیا کی طرف دیس لگا جاؤں مگر میں نہیں مانا۔ میں نے بہ مشکل ان سب کو راضی کیا کہ کم از کم پچھلے صفحات میں جو "شِشپینش" مار چکا ہوں، وہ تو "ٹِکا" دوں ورنہ کوئی مدیر اس ادھوری سرگزشت کو چھاپنے پر آمادہ نہیں ہوگا اور یوں دنیائے ادب میری تحریروں سے محروم رہ جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ کہ دنیائے ادب محروم رہے نہ رہے، میری روح عالمِ بالا میں بھی "ردلاپاتی" رہے گی، یعنی میری روح کو قرار نہیں آئے گا۔ اس بات نے مہر النسا اور بچوں کو بہت متاثر کیا۔ بھلا کون چاہے گا کہ اس کے شوہر یا ابا کی روح بے قرار رہے۔ نتیجتاً مجھے یہ آخری صفحات لکھنے کا موقع مل گیا۔ اے کاش یہ آخری صفحات ثابت نہ ہوں۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹروں کی "بکبکی"

کے باوجود یقین سا نہیں آ رہا کہ میں مر جاؤں گا۔ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ قیامت کے پورے سمیٹوں اور ارادہ بھی یہی تھا، بس ان کم بخت گردوں نے بیچ میں "ڈریاما" پیل دیا۔ خیر کوئی بات نہیں میں بھی ان دونوں ناہنجاروں کو گھاس نہیں ڈالوں گا، کم بخت کہیں کے! ساری زندگی بدبختوں کو اپنے جسم میں جگہ دی اور سلری دنیا سے چھپا کر رکھا مگر احسان فراموش نکلے۔

ہاں تو ذکر تھا ایک عدد ریوالور کا جو ایک کوٹ کی جیب سے باہر آ رہا تھا۔ غالباً میں نے اپنی "اسٹوری" یہیں چھوڑی تھی، اب اسے آگے جوڑتا ہوں۔ سین یہ چل رہا تھا کہ کانگریسی لیڈر راجندر پرشاد، ٹرین سے اتر آئے تھے، پھر ایک غنڈہ، چاقو لہراتا ہوا ان کی طرف لپکا تھا جو حلیے سے مسلمان نظر آ رہا تھا۔ اس غنڈے پر ایک نوجوان جھپٹا تھا جس نے چاقو چھین کر پھینک دیا تھا اور غنڈے سے "فری اسٹائل" لڑنے لگا تھا۔ میرے برابر کھڑا ہوا شخص اس منظر کی تاب نہ لا کر اپنی جیب سے ریوالور نکال رہا تھا، وہی سوجے ہوئے چہرے والا!

اس صورت حال میں مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ "چلو" چلتے چلتے رہ گیا تھا اور اب "دھائیں دھوں" کی نوبت آ چکی تھی۔ گولی بے چاری کی مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی کا نام پوچھ کر اس کے جسم میں دخول نہیں کرتی۔ گولی کی اس "بے چارگی" سے میں واقف تھا اس لیے میرے پیروں نے اگر میرے جسم کا بوجھ برداشت کرنے سے انکار کر دیا تو کوئی عجیب بات نہیں۔ آدمی گرتا ہے تو کسی نہ کسی کا سہارا ڈھونڈتا ہی ہے۔ میرے قریب سوجے ہوئے چہرے والا تھا، وہی غریب اس مصیبت کے وقت کام آیا۔ گرتے گرتے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب یہ اس کی خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ یہ وہی ہاتھ تھا جس سے وہ ریوالور نکال رہا تھا۔

مجھ پر کیوں کہ اچانک دہشت طاری ہوئی تھی اور میری یہ حرکت قطعی غیر متوقع تھی جو اس غریب کے ہاتھ پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈال دیا اس لیے نتیجہ ظاہر ہے۔ میں تو گر ہی رہا تھا وہ بے چارہ بھی اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور میرے ساتھ ساتھ ہی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر مجھے علم نہیں کہ کس طرح معاً گولی چل گئی۔ دھماکا ہوتے ہی ایک چیخ بھی سنائی دی تھی اور میں گھبرا کر سوجے ہوئے چہرے والے سے لپٹ گیا تھا جیسے اس کے کلیجے میں چھپ جانا چاہتا ہوں مگر میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس "لپا ڈگی" میں سوجے ہوئے چہرے والے کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دور جا گرا۔ اسی وقت نہ جانے کدھر کدھر سے بہت سے افراد دوڑتے ہوئے آ گئے اور ہم دونوں کو گھیر لیا۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آ رہے تھے، گویا اب میں اور وہ سوجے ہوئے چہرے والا ان لوگوں کے نرغے میں تھے۔ مارے دہشت کے میں نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ ریوالور والے کون تھے۔ پھر غیر ارادی طور پر میں چیخنے لگا "بچاؤ بچاؤ!" مگر چیختے ہوئے بھی خوف کے سبب میں نے اس سوجے ہوئے چہرے والے کو جکڑ رکھا تھا۔

معاً میری سماعت میں ایک بھاری گونج دار آواز نے جیسے رس گھول دیا "اللہ دتا! کھڑے ہو جاؤ، اب چھوڑ دو اسے! ہم اسے گھیر چکے ہیں، اب یہ فرار نہیں ہو سکے گا۔" یہ آواز تیواڑی جی کی تھی۔

میں نے اس وقت تیواڑی جی پر صدقے واری جانے کی بجائے ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو جانا بہتر سمجھا مگر اسی وقت مجھے اپنی پینٹ کی جیب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں چیخ اٹھا "ابے چور کہیں کے! میرا ریوالور چرا رہا ہے!" یہ کہہ کر میں نے اس سوجے ہوئے چہرے والے کے منہ پر چھپٹا مارنا چاہا۔ اس افتاد سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ پیچھے کیا اور اس کے سر کے بال میرے ہاتھ میں آ گئے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ذرا سا جھٹکا دینے سے سر کے بالوں کے ساتھ ہی اس کا سوجا ہوا چہرہ بھی میرے ہاتھ میں آ جائے گا۔ یہ راز بعد میں کھلا کہ وِگ ہی سے چہرے پر منڈھی ہوئی جھلی بھی منسلک تھی اور اصل روئے زیبا اس جھلی کے اندر تھا جس پر نظر پڑتے ہی میرے چھکے تو چھکے بیک وقت نہلے دہلے بھی چھوٹ گئے۔ وہ چہرہ مجھلائے جانے والا نہیں تھا۔ اب میری حالت یہ تھی کہ میں تو کمبل کو چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑ رہا تھا۔

مجھے حواس سے بے حواس اور حال سے بے حال کر دینے کے لیے صرف وہ نظارہ کافی دہشت ناک ثابت ہوا تھا جو میں نے جھلی اور وِگ اتر جانے کے بعد دیکھا تھا۔ اس کے بعد جیسے میرا دم نکل گیا تھا۔ میرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ سوجے ہوئے چہرے کے اندر سے رنجیت کا اصل چہرہ برآمد ہوا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رنجیت بدحواس ہونے کی بجائے مجھ پر چھا گیا تھا۔ اب اس نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ جیب سے ریوالور نکالے جانے اور رنجیت کے چہرے کا دیدار کرنے کے بعد میں کلمہ پڑھنے لگا تھا تاکہ مرتے وقت زبان پر کلمہ تو رہے، آخرت تو خراب نہ ہو۔

رنجیت میری جیب سے ریوالور نکالتے ہی کسی سانپ کی طرح پھنکارا تھا۔ اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی "دور ہٹ جاؤ ورنہ میں اسے ٹھنڈا کر دوں گا!"

پھر جو کچھ ہوا جیسے پلک جھپکتے ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ رنجیت میری کھوپڑی پر میرے ہی ریوالور کی نال رکھتا، زبردست "دھائیں" ہوئی اور رنجیت تڑپ کر الٹ گیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ

جرأت مندانہ اقدام شیکھر کا تھا۔ میرا اور رنجیت کا ٹکراؤ کرنے والوں میں وہ بھی تھا۔ گولی، رنجیت کی کلائی پر پڑی تھی۔ اگر شیکھر کا نشانہ ذرا بھی خطا ہو جاتا تو میری کھوپڑی، روشن دان بن گئی ہوتی۔ رنجیت کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ وہ داہنے ہاتھ سے اپنی بائیں خون آلود کلائی تھامے ہوئے تڑپتا ہوا اٹھا اور ایک طرف زقند بھری مگر چاروں طرف اس کا "استقبال" کرنے کے لیے ریوالور موجود تھے۔ وہ بد بخت پیارے لال ہنر تھا جس نے گھبرا کر گولی چلا دی تھی کیوں کہ رنجیت نے اسی طرف زقند بھری تھی۔ گولی، رنجیت کے سینے پر پڑی اور وہ چیخ مار کر اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔

میں ابھی تک زمین ہی پر استراحت فرما رہا تھا، یہ بھیانک سین دیکھ کر ایک دم ہڑبڑا گیا اور اس ہڑبڑاہٹ کے نتیجے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بھلا بتاؤ، ایک جیتا جاگتا آدمی چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، دیکھتے دیکھتے "غڑم خان" ہو کر گر پڑے تو آدمی ہڑبڑائے گا نہیں تو کیا کرے گا۔

اِدھر میں اٹھا، اُدھر تیواڑی جی، رنجیت کی طرف لپکے۔ انھوں نے رنجیت کو سیدھا کیا اور پھر چند لمحے بعد طویل سانس لے کر سیدھے ہو گئے۔

"مر گیا۔" تیواڑی جی نے اس طرح کہا جیسے اپنے کسی عزیز کے انتقال پُرملال کی خبر دے رہے ہوں۔ پھر وہ سامنے کھڑے ہوئے بھاری سے بدن والے شخص پر جیسے برس پڑے "تم نے نہایت حماقت کا ثبوت دیا۔ تم سے گولی چلانے کو کس نے کہا تھا!"

"قبلہ و کعبہ! اگر یہ خاکسار اپنی جانِ ناتواں بچانے کی خاطر...."

"خاموش رہو!" تیواڑی جی پھر دہاڑے اور بھاری جسم والے کی بات کاٹ دی جو ظاہر ہے کہ پیارے لال ہنر تھا۔

کیا پیارے لال ہنر، کیا شیکھر اور کیا تیواڑی جی، سبھی میک اپ میں تھے۔

پلیٹ فارم پر اس وقت الو بول رہا تھا، سوائے دو عدد لاشوں اور سی آئی ڈی والوں کے وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس والے بھی پلیٹ فارم پر نہیں تھے۔ اسی "گھپر دست" میں ٹرین نہ جانے کب روانہ ہو گئی تھی، مجھے علم نہیں۔ اب پلیٹ فارم کے گیٹوں پر مسلح پولیس والے نظر آ رہے تھے۔ غالباً انھیں پلیٹ فارم پر آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ پبلک جو پلیٹ فارم پر پہلے سے موجود تھی یا ٹرین سے اتری تھی، وہ بھی رفوچکر ہو چکی تھی۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی پولیٹیکل برانچ والوں نے راجندر پرشاد کو گھیرے میں لے لیا تھا اور انھیں چپ چاپ "پھٹا" لے گئے تھے۔ یہ ساری باتیں مجھے کچھ دیر ہی میں معلوم ہو گئیں۔ مجرموں کا منصوبہ گویا پوری طرح ناکام بنا دیا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پولیٹیکل کے ڈی آئی جی کنور رشا کر علی بھی وہاں موجود تھے جو راجندر پرشاد کے ساتھ ہی پھوٹ لیے تھے۔

میرے تمام ماتحت وہاں میک اپ میں موجود تھے، ان کے علاوہ گویا پوری کرائم برانچ وہاں حاضر تھی۔ صرف دو افراد غیر حاضر تھے، ایک لیوسی، دوسرا کمار! میں نے اس سلسلے میں تیواڑی جی سے استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ غنڈے پر جھپٹنے والا نوجوان کمار ہی تھا۔ رنجیت نے زمین پر گرتے گرتے غالباً اسی پر گولی چلائی تھی مگر گولی اس کے لگنے کی بجائے اسے صرف زخمی کرتی ہوئی غنڈے کے جسم میں اتر گئی تھی۔ گولی چلنے کے بعد مجھے جو چیخ سنائی دی تھی، اسی غنڈے کی تھی۔ گولی کچھ اس زاویے سے چلی تھی کہ کمار کی بائیں پنڈلی کو چیرتی ہوئی غنڈے کے پیٹ میں گھس گئی تھی۔ کمار کو اسپتال بھیجا جا چکا تھا۔ لیوسی اس دن بھی دفتر نہیں آ سکی تھی اس لیے وہ اس "دھواں دھار تقریب" میں شرکت کرنے سے محروم رہی تھی۔ پولیٹیکل برانچ والوں میں سے صرف شیکھر، کرائم برانچ والوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔ راجندر پرشاد کو ٹرین کے ڈبے سے اترتے ہی جن لوگوں نے گھیر لیا تھا، وہ سب پولیٹیکل برانچ والے تھے حالانکہ میں انھیں راجندر پرشاد کے ساتھی سمجھا تھا۔ غنڈہ غریب بھی گولی لگنے کے کچھ دیر بعد ٹیں ہو گیا تھا۔

رنجیت سے دھینگا مشتی میں میرے جسم پر صرف چند کھرسٹیں آئی تھیں مگر میں تیواڑی جی سے باتیں کرتے ہوئے دانستہ "ہائے ہُو" کیے جا رہا تھا۔ بالآخر یہ "ہائے ہو" رنگ لائی اور تیواڑی جی نے پوچھ ہی لیا کہ میری زیادہ ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی۔ پھر کیا تھا، میں پھیل گیا اور تیواڑی جی نے مجھے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے جانے کی اجازت دے دی۔ میری "ہائے ہو" کا مقصد بھی یہی تھا۔ دراصل وہاں دو عدد لاشوں کی موجودگی نے میرا دل گھبرا رہا تھا اور تمام ہنگامہ ختم ہو جانے کے باوجود بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے دوبارہ "دھائیں دھوں" شروع ہو جائے گی۔ میرے حواس اب تک پوری طرح قابو میں نہیں تھے اور کم بخت ٹانگیں کانپے چلی جا رہی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ بیٹھ جاؤں یا لیٹ جاؤں۔ اجازت ملتے ہی میں گویا رسّی تڑا کر بھاگا اور گھر پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں میک اپ ختم کر دیا۔ میک اپ ختم کرنے کے لیے میں اسٹیشن سے کمپنی باغ پہنچا تھا، پھر وہاں سے یکہ کر کے گھر کا رُخ کیا تھا۔

کچھ تو راستے میں طبیعت سنبھل گئی تھی اور کچھ گھر جا کر بہل گئی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر اپنے کمرے میں گھسا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اب گھر پہنچ کر مجھے یقین آ گیا تھا کہ میں زندہ اور صحیح سلامت

ہوں، میں کام نہیں آیا' دوسرے کام آئے اور زخمی ہوئے ہیں۔ دس بیس طویل طویل سانس لینے کے بعد گویا میرے حواس واپس آنے لگے۔

وہ جس نے میری ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی اور زندگی اجیرن کر دی تھی اس طرح اچانک "پٹ" سے گرے گا اور "جھٹ" سے مر جائے گا' یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ہر چند کہ وہ میرے سامنے ٹھنڈا کیا گیا تھا یا خود ٹھنڈا ہو گیا تھا مگر پھر بھی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کل ہی کہیں نہ کہیں پھر مل جائے گا۔ میں لاکھ اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بار بار اس کا مُردہ چہرہ میری آنکھوں میں گھومے چلا جا رہا تھا۔ تمام واقعات ایک تسلسل سے مجھے یاد آ رہے تھے۔ ویسے دیکھا جائے تو اس کی موت میں خود اسی کا ہاتھ تھا' وہ ہاتھ جس سے اس نے ریوالور نکالنا چاہا تھا۔ نہ وہ ریوالور نکالتا' نہ میں خوف زدہ ہو کر گرنے لگتا' نہ گرتے گرتے اس کا سہارا لیتا' نہ وہ سارا ہنگامہ ہوتا جس کے اینڈ پر اس کا "دی اینڈ" لگ گیا۔ ذہن میں یہ خیال آتے ہی میرے دل میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر اس سین میں "اللہ دتا مدظلہ" نہ ہوتے تو مجرم اپنے انجام کو نہ پہنچ سکتا۔ ہیرو بننے کا ایک سنہری موقع میری "تاک" میں تھا اور میں کہ غافل تھا۔

دوسرے دن جب میں دفتر کے لیے روانہ ہوا تو خود کو کسی "طرم داس خاں" سے کم نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ بہر حال کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ایک مفرور قاتل میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ بھگوان داس کے قتل میں رنجیت پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کے علاوہ اس نے نہ جانے کتنے لوگوں کو دوسرے جہان کی سیر کرائی تھی' یہ کون جانے! سر تھامسن کی کتو' یعنی کیٹی کے اغوا میں بھی اس کے ہاتھ اور پاؤں دونوں شریک تھے۔ پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ مجھے جو ہر گھڑی اس کی طرف سے خطرہ لگا رہتا تھا' وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔

دفتر کی طرف جاتے ہوئے مجھے لیوسی کا خیال آیا۔ وہ تقریباً پونے دو روز سے غائب تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں اس کی ماں تو نہیں "ٹہل لی"۔ میں اس وقت جامع مسجد کے صدر دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں نے کچھ دور جا کر پھٹ پھٹ کا رُخ موڑ دیا اور چاوڑی کی طرف نکل گیا۔ وہاں سے لال کنواں زیادہ دور نہیں تھا جہاں لیوسی رہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر وہ دفتر جانے پر راضی ہوئی تو اسے پیچھے بٹھا لوں گا۔

لیوسی کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا' وہ دفتر جانے کے لیے نکلنے ہی والی تھی۔ اس کی ماں پہلے سے ٹھیک تھی۔ گزشتہ دن وہ اپنی ماں کی طبیعت خراب ہونے ہی کے سبب دفتر نہ جا سکی تھی۔

جب وہ پھٹ پھٹ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا: "بس بچ گئیں کل ورنہ تمھارا بھی 'پاپڑیا' ہو گیا ہوتا۔ دعائیں دو اپنی اماں کو جنھوں نے عین وقت پر اپنی طبیعت خراب کر کے تمھیں بچا لیا۔"

میری بات سن کر وہ کچھ جھینپ سی گئی اور بولی: "تو تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں جان بوجھ کر کل دفتر نہیں آئی تھی!"

"ارے یہ کس کم بخت نے کہا ہے!" میں بولا۔

"اور کیا مطلب ہے اس بات کا!" وہ بدستور ناک چڑھائے رہی۔ "تمھاری بات سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے امی کی طبیعت خراب نہیں تھی اور میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔"

"خیر چھوڑو اس بات کو!" میں پھٹ پھٹ اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو دراصل تمھیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ کل میں نے جھنڈے گاڑ دیے۔"

"کہاں؟" وہ تمسخر اُڑانے والے لہجے میں بولی۔ "کیا لال قلعے پر؟"

میں اس کی بات سن کر جل ہی تو گیا۔ میں نے تو اتنا زبردست کارنامہ انجام دے ڈالا تھا اور وہ بدبخت لفٹ ہی نہیں دے رہی تھی۔ میں اسی لیے جل کر بولا: "میں نے لال قلعے پر نہیں تمھاری چاند پر جھنڈے گاڑے تھے۔ اب آیا کچھ کھوپڑی میں!"

"تم شاید اپنی چاند کو میری چاند سمجھ بیٹھے ہو گے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

ہنسی اس کی بھی بڑی سُریلی تھی اور ہمیشہ مجھے بھلی لگتی تھی مگر اس وقت مجھے کسی اور ہی کی ہنسی یاد آ گئی۔ اس ہنسی کے آگے لیوسی کی ہنسی بھیک مانگتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اس وقت اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کی ہنسی یاد آ گئی تھی۔ بے اختیار میرے مُنہ سے بڑے زور کی "ہائے" نکل گئی۔

"کیوں کیا ہوا! کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے؟" لیوسی کا لہجہ اب بھی مذاق اُڑانے والا تھا۔

"پیٹ میں نہیں دل میں!" غیر ارادی طور پر میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"یہ تو سخت تشویش ناک بات ہے۔" لیوسی کے لہجے میں بناوٹ تھی۔ "تم آج ہی کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ مرنے سے کچھ دن پہلے اسی طرح دل میں درد اٹھنے لگتا ہے۔"

"تم اس طرح یہ بات کہہ رہی ہو جیسے کئی بار مر چکی ہو۔ ہے نا!" میں تپ کر بولا۔

"بڑا غلط زمانہ ہے' جس کا گلا دباؤ وہی آنکھیں نکالنے لگتا ہے۔ میں تو ہمدردی کر رہی تھی اور تم کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہو۔" لیوسی اس دن بڑے موڈ میں تھی اس لیے فقرے پر فقرہ چست کر رہی تھی۔

"اگر سچ مچ کاٹ کھایا تو بلبلا جاؤ گی ہاں! بڑی آئیں کہیں کی' ہمدردی جتانے والی! مجھے نہیں چاہیے تمھاری ہمدردی وَمدردی!" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

راستے بھر لیوسی مجھ سے چونچ لڑاتی رہی اور میں غصے میں بَل کھاتا رہا۔ دو ایک بار تو یہ بھی چاہا کہ پھٹ پھٹ سے اتار دوں' پھر سوچا' عورت ذات ہے' چلو معاف کر دو۔

دفتر پہنچتے ہی مجھے "تلابیلی" لگ گئی کہ جلد سے جلد سر تھامسن سے مل لوں۔ کمار کو اپنے کمرے میں نہ دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملا' اسی کے ساتھ مجھے اپنے ماتحتوں کی مشترکہ سازش یاد آ گئی۔ اس وقت کمار کے سوا سبھی موجود تھے اور یہ موقع ڈانٹ ڈپٹ کے لیے بہت غنیمت تھا۔ کمار ہوتا تو خواہ مخواہ بیچ میں پاؤں اڑاتا۔ کرسی پر پھیل کر بیٹھنے کے بعد میں پہلے ایک دفعہ کھنکارا اور ان سب پر ایک نگاہِ قہر ڈالی' پھر اپنی آواز میں گھرج پیدا کرتے ہوئے زور سے بولا: "تم لوگ اس دن کیوں ہنسے تھے؟ بولو جواب دو!"

سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے۔ پھر مجید ہمت کر کے بولا۔

"یہ کب کا ذکر ہے سر؟"

"سر نہیں سر جی کہو!" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "کیا تمھیں معلوم نہیں کہ میرا عہدہ اب بڑھ چکا ہے!"

"بہتر ہے سر جی!" مجید سعادت مندی سے بولا۔

"تو پھر میری بات کا جواب دو! میں نے اس وقت زبانی جواب طلب کیا ہے!" میں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا تاکہ اس پر رعب پڑے۔

"قبلہ و کعبہ! اگر اس خاکسار کو اجازت ہو تو کچھ عرض کرے۔" پیارے لال ہنر اپنا چشمہ' ناک پر جماتے ہوئے بولا۔

"تمھی بکو!" میں نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"پہلی عرض تو ہیچ سخن کی یہ ہے کہ حضورِ والا تبار اپنے خاکساروں کی عزتِ نفس کا بھی کچھ خیال فرمایا کریں۔ ہر چند کہ گردشِ زمانہ نے بے نسبوں کو اعلیٰ نسب اور اعلیٰ نسبوں کو بے نسب بنا دیا ہے مگر اس کے باوجود احترامِ آدمیت بھی کوئی چیز ہے۔ غمِ روزگار نے اگر ہم ہیچ مندوں کو حضور کے حکم کی بجا آوری پر مجبور کر دیا ہے تو حضور پر بھی لازم ہے کہ ناواقفِ حال نہ رہیں۔ روزی رساں کوئی نہیں' سوائے ایک ذات کے! سو لازم آیا کہ اس ذاتِ ارفع و اعلیٰ کو فراموش نہ کیا جائے اور بلا امتیاز..."

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اس لیے میں نے پیارے لال ہنر کی بات کاٹ دی اور دہاڑا: "تم نری بکواس ہی کیے جاؤ گے کہ میری بات کا سیدھا سیدھا جواب دو گے! میں تمھاری یہ لچھے دار باتیں سننا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف اس بات کا جواب دو کہ اس دن جب وہ بدبخت کمار' میز پر سر رکھے خرخرا رہا تھا اور میں اٹھ کر باہر گیا تھا تو تم سب لوگ ایک ساتھ کیوں 'قہقہا' اٹھے تھے؟"

"ہائے رے شوخیٔ قسمت!" پیارے لال ہنر نے طویل سانس لے کر کہا۔ "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم!"

"یہ تم مجھے گالیاں دے رہے ہو' کسی اور زبان میں! ایں!" میں جھنجھلا کر بولا۔

"زبان ہی کا تو رونا ہے حضور! اور کلیجے کا رونا ہے!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "کاش یہ ہیچ مداں رموزِ ہائے زبان دانی سے آگاہ نہ ہوتا!"

پیارے لال ہنر میرے خیال میں ناقابلِ اصلاح تھا۔ اس سے مغز مارنا بے کار ہی تھا۔ وہ اسی طرح اڑنگ بڑنگ باتیں کر کر کے مجھے مزید تپاتا رہتا اس لیے اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے کمال کو اپنے قہر کا نشانہ بنایا۔ "تم بولو کمال!" میں نے کہا اور پیارے لال ہنر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یہ شخص تو کچھ سرکا ہوا ہے' کبھی مجال ہے جو شرافت سے کسی بات کا جواب دے دے! بولو تم کیوں ہنسے تھے؟"

کمال کو غالباً توقع نہیں تھی کہ اچانک نزلہ اس پر گر پڑے گا اس لیے وہ گھبرا سا گیا اور "یس سر جی" سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔

"اب پھوٹو بھی کچھ مُنہ سے!" میں اسے خاموش دیکھ کر گرجا۔

"یس سر جی! وہ... وہ بات دراصل یہ تھی کہ سب ایک دم ہنس پڑے تو میری ہنسی بھی چھوٹ گئی۔" کمال نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"سب اگر جہنم میں چھلانگ لگا دیں گے تو تم بھی ایسا ہی کرو گے' بولو!" میں غرّایا۔

"یس سر جی!" کمال گڑبڑا کر بولا اور پھر فوراً ہی بات سمجھ کر کہا: "نو سر جی!"

"یس سر جی' نو سر جی' اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تمھیں!" میں مُنہ بنا کر بولا' پھر گپتا کی طرف مخاطب ہوا۔ "ہاں گپتا! تم کیوں ہنسے تھے؟"

"مم... میں سر جی... میں... یس سر جی!" یہ کہہ کر اس کی بولتی بند ہو گئی۔

"یہ میری بات کا جواب ہے؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔ مجھے علم تھا کہ گپتا بدبخت بھی کمال کا ڈپلی کیٹ' یعنی کاربن کاپی تھا۔

"مجھے سر جی... ایک لطیفہ یاد آگیا تھا' اس وقت!" گپتا نے بہانہ ڈھونڈ ہی لیا۔

"کمال سب کے ہنسنے کی وجہ سے ہنس پڑا تھا' گپتا کو لطیفہ یاد آگیا تھا اور تمھیں کیوں ہنسنے کا ہیضہ ہوا تھا؟" میں مجید کی طرف پلٹا۔

"سر جی! میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ دراصل سچی بات یہ ہے کہ جب آپ کمرے میں تھے تو کمار بابو' میز پہ سر رکھے ہوئے خراٹے لے رہے تھے مگر جیسے ہی آپ نے کمرے سے باہر قدم رکھا' وہ سر اٹھا کر ایک دم آنکھیں پٹپٹانے لگے جیسے کوئی خواب دیکھ کر اٹھے ہوں۔ بس ان کی صورت پر نظر پڑتے ہی میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے سر جی کہ میں آپ پر نہیں کمار بابو پر ہنسا تھا۔" مجید نے صاف صاف بات کہہ دی اور اس کی بات سن کر میں خوش ہوگیا۔ کمار بد ذات تھا ہی ایسا کہ اس پر ہنسا جاتا' اس کا مذاق اڑایا جاتا۔

"تو اصل بات یہ تھی کہ تم لوگ کمار پر ہنسے تھے مجھ پر نہیں۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تم لوگوں نے مجھ سے پہلے کیوں نہیں کہہ دی تھی!"

"آئندہ کہہ دیا کریں گے سر جی!" گپتا نے مجھے موڈ میں آتے ہوئے دیکھ کر دانت نکالے۔

"ہاں' بالکل بالکل! بالکل کہہ دیا کرو۔" میں گردن ہلا کر بولا۔ "اس کمار کے بچے سے تو میں سمجھوں گا اچھی طرح! بس ذرا ٹھیک ہو کر دفتر آجائے۔"

"تقاضائے اخلاقِ بشریت کے تحت اگر حضورِ والا اپنے اس خاکسار کی عیادت فرما آتے تو خادم کی نظر میں مناسب ہوتا۔" پیارے لال ہنر بھی منمنایا۔

میں نے پیارے لال ہنر کی بات کا جواب دینے سے پہلے مجید سے پوچھا۔ "تم سمجھ گئے کہ ابھی انھوں نے کیا کہا؟" میرا اشارہ پیارے لال ہنر کی طرف تھا۔

"بس کچھ کچھ ہی سمجھا ہوں سر جی! شاید ان کا..."

"دیکھا تم نے!" میں مجید کی بات کاٹ کر پیارے لال ہنر سے مخاطب ہوا۔ "تمھاری یہ گاڑھی اردو کوئی نہیں سمجھتا!" یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پیارے لال ہنر نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔

کمرے سے نکلتے ہی مجھے چچا مل گئے۔

"بیٹے! میں تمھی کو بلانے آرہا تھا۔" چچا بندو خاں قریب آتے ہوئے بولے۔ "بڑے صاحب بہادر بلا رہے ہیں۔"

"میں بھی وہیں جا رہا تھا چچا!" میں نے اخلاقاً دانت نکال دیے اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"بیٹے! آج مہرن نے بینگن کا بھرتا بنایا ہے۔ تم کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹنے لگو گے۔" چچا بندو خاں نے حسبِ معمول اپنی نورِ نظر اور میری متوقع جورو کے پکوان کی تعریف کی۔ "تم آج دوپہر میرے ہی ساتھ کھانا کھانا۔ میں زیادہ روٹیاں رکھوا لایا ہوں۔ مہرن نے روٹیوں میں گھی بھی لگا دیا تھا۔"

ہر چند کہ بینگن کے بھرتے کو دیکھ کر ہی مجھے گھن آتی تھی اور آج تک چچا بندو خاں کے کئی بار "پرچانے" کے باوجود میں انھیں طرح دیتا آیا تھا' یعنی ان کے ساتھ کبھی بینگن کا بھرتا نہیں کھائے دیا تھا مگر اس دن فوراً راضی ہوگیا۔ اس رضامندی کا سبب بینگن کا بھرتا نہیں بلکہ وہ تھی جس نے بھرتا بنایا تھا۔

"چچا! آپ کے گھر کے کھانے کا تو جواب ہی نہیں۔" میں نے چچا بندو خاں کو خوش کرنے کے لیے کہا تاکہ وہ اپنی لختِ جگر کا ذکر کرتے ہی رہیں۔

"ارے میاں' بس اللہ کی شان ہے۔ وہ جس کے ہاتھ میں جس دے دے۔ مہرن تو مسور کی دال بھی ایسی پکاتی ہے کہ کیا کسی نے کھائی ہوگی' کہو تو کل مسور کی دال اس سے پکوا کر لاؤں!"

چچا بندو خاں تعریف سن کر کھل اٹھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کھانے کی تعریف کی تھی۔ انھیں کیا خبر تھی کہ کھانے کی آڑ میں دراصل کھانا پکانے والی کی تعریف ہو رہی ہے۔

مسور کی دال کہاں اور میں کہاں! جیسے کتے کا کاٹا' پانی سے بھاگتا ہے' اسی طرح میں مسور کی دال سے بھاگتا تھا مگر وہ تو زہر گھول کر بھی بھیج دیتی تو میں خاموشی سے پی جاتا اس لیے فوراً مسور کی دال کھانے تک پر آمادگی ظاہر کر دی۔ نین لڑ جائیں تو پھر کیا بینگن کا بھرتا اور کیا مسور کی دال' آدمی سب کچھ کھانے اور پینے پر راضی ہو جاتا ہے' یہی حال میرا بھی تھا۔

میں چچا بندو خاں سے باتیں گھوٹتا ہوا' سر تھامسن کے کمرے تک پہنچ گیا۔ چچا بندو خاں نے مجھے بغیر کسی تاخیر کے اندر "پارسل" کر دیا۔

اندر کا منظر میرے لیے غیر متوقع ہی تھا۔ نہ چچا بندو خاں نے بتایا تھا اور نہ میں نے ہی ان سے پوچھا تھا کہ سر تھامسن کے پاس اور کون بیٹھا ہے۔ میں اور چچا بندو خاں' دونوں ہی "مہرن" کی دھن میں مست تھے۔ چچا بندو خاں اس لیے کہ "مہرن" ان کی نورِ نظر تھی اور میں یوں کہ اسے ایک ہی نظر دیکھ کر دل' جگر' کلیجی' گردے وغیرہ سبھی ہار بیٹھا تھا۔ میرے عشق میں کچھ ایسی ہی شدت تھی کہ مجھے صرف دل ہار دینا بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی تھی۔ دل تو ہر چھوٹا بڑا تک ہار بیٹھتا ہے' بات تو جب ہے کہ آدمی کے پاس جو بھی ہو' سب کا سب ہار بیٹھے۔

میں سمجھا تھا' سر تھامسن اکیلے ہوں گے مگر وہاں دو عدد "ڈی آئی جی آن" بھی موجود تھے' ایک اپنے ایک پرائے' یعنی نوکیلی مونچھوں والے تیواڑی جی اور مُردہ چہرے والے کنور شاکر علی!

وہ دونوں سر تھامسن کے سامنے والی کرسیوں پر براجمان تھے۔ سر تھامسن نے غالباً عہدوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میز کی دائیں جانب پڑی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے میں زوردار "گڈ مورننگ" جھاڑ چکا تھا جس کا جواب تینوں کی بہت خفیف سی حرکتوں سے دیا گیا تھا۔ ان دونوں گھاگوں کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا یا پیلا ضرور ہے۔ پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔

میں جس وقت وہاں پہنچا' خاموشی ہی تھی۔ اگر وہ لوگ کوئی بات بھی کر رہے تھے تو مجھے آتا دیکھ کر چپ ہو گئے تھے۔ بالآخر سر تھامسن ہی نے خاموشی توڑی۔ انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔

"اے ڈی! تمھاری رپورٹ بہت اہم تھی اس لیے میں نے پہلے ہی سے کنور اور تیواڑی کو یہاں بلوا لیا تاکہ اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے لائن آف ایکشن مقرر کی جا سکے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھیں رنجیت پر شبہہ کیسے ہوا؟"

سر تھامسن کی بات سن کر میری رگوں میں خون جوش مارنے لگا۔ وہ وقت آخر کار آ ہی گیا تھا جب مجھ پر داد کے ڈونگرے برسنے والے تھے۔ بس ضرورت اس بات کی تھی کہ میں سارے واقعات کو اس طرح پیش کرتا کہ ہیرو ثابت ہو جاتا۔ یہ سوچ کر میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور بولا۔ "سر! پہلی بات تو یہ کہ آپ کا خادم' پلیٹ فارم پر موجود ایک ایک شخص کو اچھی طرح گھور گھار کر دیکھ چکا تھا۔ وہ غنڈہ بھی میری نظر میں تھا جس نے بعد میں چاقو سے راجندر پرشاد پر حملہ کیا لیکن اسے میں نظر انداز کر گیا کیوں کہ..."

"ٹھہرو!" معاً کنور شاکر علی کی خبیث آواز سنائی دی۔ "اگر تمھیں اس غنڈے پر شک تھا تو تم نے پہلے ہی کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟"

"میں نے اس کے اردگرد اپنے بھائی بندوں کو منڈلاتے دیکھ لیا تھا۔" میں نے فوراً سفید جھوٹ بول دیا۔

"یعنی تم میک اپ کے باوجود کمار وغیرہ کو پہچان گئے تھے؟" اس بار تیواڑی جی بول اٹھے۔

"ظاہر ہے سر! اگر نہ پہچان گیا ہوتا تو اسے کیوں چھوڑ دیتا! ایوں بھی اس کا حلیہ ایسا تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔" میں نے بات بنائی کہ اب مجھے باتیں بنانا آگیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ باتیں بنانے کے سوا مجھے اور آتا بھی کیا تھا۔

"ہوں!" سر تھامسن نے ہنکارا بھرا۔ "اے ڈی ٹھیک کہتا ہے۔" پھر وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔ "آگے کہو!"

"میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ پورے پلیٹ فارم پر صرف دو افراد ایسے ہیں جن پر شک کیا جا سکتا ہے۔ ایک کے بارے میں تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ اس پر میرے بھائی بندوں کی نظر تھی مگر دوسرے کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ گاڑی آنے سے صرف پانچ منٹ پہلے پلیٹ فارم پہ آیا تھا' دوسری وجہ یہ کہ وہ بھیڑ بھاڑ سے الگ ایک گیٹ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی تاڑ گیا۔ پلیٹ فارم پر وہ شخص ہوتا ہے جو کسی گاڑی سے کہیں جانے والا ہو' ایسی صورت میں اس شخص کے پاس سامان ہوتا ہے مگر مجھے اس کے پاس سامان نظر نہیں آیا۔ مطلب یہ کہ وہ اس ٹرین میں سوار ہونے نہیں آیا تھا جو آنے والی تھی۔ پلیٹ فارم پر موجود دوسرے افراد وہ ہوتے ہیں جو اپنے کسی عزیز یا دوست کو لینے آتے ہیں۔ ایسے افراد دور سے نظارہ نہیں مارتے مگر رنجیت دور کھڑا تھا۔ ایسی صورت میں خود بہ خود ذہن میں یہ سوال ابھرنا چاہیے کہ آخر وہ کیوں وہاں آیا تھا؟"

میں سانس لینے کے لیے رکا ہی تھا کہ سر تھامسن بول اٹھے۔

"ویری گڈ! تم نے انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا۔" یہ کہہ کر وہ کنور شاکر علی سے بولے۔ "تم نے دیکھا کنور! اسے کہتے ہیں آبزرویشن!"

"مجھے اعتراف ہے سر!" کنور صاحب کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی۔

میرا سینہ اس وقت تک اتنا پھول چکا تھا کہ مزید "پھلائی" کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ سر تھامسن کا اشارہ پا کر میں نے دوبارہ اسٹارٹ مارا۔ "پھر میں خاموشی سے اس کے قریب بھیگی بلی بن کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسی دوران میں اس کے کوٹ کی پھولی ہوئی جیب بھی دیکھ لی جس میں ظاہر ہے کہ ریوالور تھا' اسی کے ساتھ میں چوکنا ہو گیا اور..."

کنور شاکر علی پھر صبر نہ کر سکے۔ انھوں نے میری بات کاٹ دی۔

"میں پھر ایک بار اپنا پہلا سوال دہراؤں گا۔ جب تمھیں یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ وہ شخص مسلح ہے تو تم نے پہلے ہی اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈال دیا؟ یہ تو محض اتفاق ہے کہ تم نے اسے راجندر پرشاد پہ گولی چلانے سے روک دیا۔"

میں اس بوڑھی روح کی بات سن کر کھول ہی تو گیا۔ وہ بڈھا بدبخت بار بار مجھے ہیرو بننے سے روکے چلا جا رہا تھا۔ میں اسی لیے کھسیا کر بولا۔ "معاف کیجیے گا سر! یہ اتفاق ہرگز نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا اور ایسا ہی ہوا بھی!"

اس بار تیواڑی جی نے میری بھرپور تائید کی۔ ظاہر ہے کہ

میں انہی کا "ہینچو" تھا، وہ میری بات کیسے نیچے یا نیچی ہونے دیتے! دوسرے سیکشن والا ان کے سیکشن والے کو کس طرح نیچا یا ادنیٰ دکھا سکتا تھا! پھر یہ کہ اب تو ان سے میرے تعلقات بھی بہتر ہو گئے تھے۔ میری ہیٹی ہوتی تو ان کے سیکشن پر بھی حرف آتا۔ کنور شاکر علی اور تیواڑی جی میں باقاعدہ سرد جنگ چھڑنے سے پہلے ہی سرتھامسن نے ان دونوں ہی کی "چونچیں" بند کرا دیں اور مجھے گویا مزید ڈون کی چھوڑنے کی اجازت دے دی۔

"ادھر اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکالنا چاہا، ادھر میں اس سے بھڑ گیا۔ گرتے گرتے اس نے گولی چلائی مگر میں ذرا نہ ڈرا۔" میں پورے جوش و خروش سے اپنی "بہادری" کی داستان سنا رہا تھا۔ "مجھے شبہ تھا کہ وہ رنجیت ہی ہو سکتا ہے۔ اس شبہے کی وجہ یہ کہ میں اس سے پہلے بھی کئی موقعوں پر کشتی لڑ چکا تھا۔ اپنے اس شبہے کو یقین میں بدلنے کے لیے میں نے اس کے چہرے پر منڈھی ہوئی جھلی اتاری اور پھر میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ میں اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر افسوس صد افسوس کہ چند افراد کی مداخلت کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کنور شاکر علی کی طرف دیکھا جن کا پیلا چہرہ مزید پیلا نظر آ رہا تھا۔ "ممکن ہے کہ کوئی مداخلت نہ کرتا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب رہتا۔" میں نے مزید ہانکی۔

"مجھے تمہاری اس بات پر اعتراض ہے۔" معاً کنور شاکر علی بول اٹھے۔ "میں شیکھر سے رپورٹ لے چکا ہوں۔ اگر وہ بروقت گولی نہ چلا دیتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے اے ڈی! تمہیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔" اس مرتبہ سرتھامسن کا پلڑا کنور شاکر علی کی طرف جھک گیا۔ وہ غالباً گزرے ہوئے تمام واقعات سے آگاہ ہو چکے تھے۔

میں اندر ہی اندر جل بھن کر ہی تو رہ گیا۔ میرے سارے "کارنامے" پر صرف ایک گولی، پانی پھیرے دے رہی تھی مگر میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ تیواڑی جی اس موقع پر خاموش ہی رہے لیکن میں خاموش نہ رہ سکا اس لیے کہ مجھے عین وقت پر ایک ایسا جھوٹ "سوجھ" گیا تھا جس کی تردید ممکن نہیں تھی۔ میں پُرزور لہجے میں بولا۔ "یہ قطعی غلط بات ہے کہ اگر شیکھر گولی نہ چلاتا تو صورتِ حال مختلف ہو جاتی! سچ تو یہ ہے کہ اس کے گولی چلانے ہی کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا۔ نہ وہ گولی چلا کر رنجیت کو زخمی کرتا، نہ رنجیت بھاگنے کی کوشش میں مارا جاتا۔"

"اگر شیکھر ایسا نہ کرتا تو رنجیت تمہارے ہی ریوالور سے تمہیں بھی تو ہلاک کر سکتا تھا۔" سرتھامسن نے گویا مجھے سمجھانا چاہا۔ "وہ جس صورتِ حال کا شکار تھا، اس میں کچھ بھی ممکن تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ تمہیں ہلاک کر دینے کی دھمکی دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ وہ اس وقت گھبرایا ہوا تھا اس لیے زیادہ امکان یہی تھا کہ بوکھلاہٹ میں اس سے گولی چل ہی جاتی اور تم مارے جاتے۔"

"یہی تو آپ نہیں سمجھ رہے ہیں سر!" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں ہرگز نہیں مارا جاتا۔ اگر یہی خطرہ ہوتا تو میں رنجیت کو اتنی آسانی کے ساتھ اپنی جیب سے ریوالور نہ نکالنے دیتا۔ دراصل میں اسے دھوکے میں رکھ کر تو چھاپ لینا چاہتا تھا مگر شیکھر کی حماقت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

"کیا مطلب؟" باری باری سرتھامسن، تیواڑی جی اور کنور شاکر علی کی حیرت زدہ آوازیں سنائی دیں جو میرے لیے غیر متوقع نہیں تھیں۔

"مطلب یہ سر کہ میرا ریوالور خالی تھا۔" میں نے ترپ کا پتا پھینکا حالانکہ جو کچھ کہا تھا سو فیصد جھوٹ تھا۔

"ونڈرفل!" سرتھامسن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "پھر تو واقعی شیکھر سے حماقت سرزد ہو گئی! میں خود بھی یہ سوچ رہا تھا کہ تم جیسے چالاک شخص نے رنجیت کو اپنا ریوالور نکالنے کا موقع کیسے دے دیا! اب آئی نا بات سمجھ میں! اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تمہیں اپنی خصوصی ہدایات دے کر اسٹیشن نہ بھیجا ہوتا تو مجرم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ رنجیت کو تمہارے سوا کوئی چیک ہی نہیں کر پایا تھا۔ خیر شیکھر سے لاعلمی میں اس لیے حماقت ہو گئی کہ وہ تم سے اچھی طرح واقف نہیں ہے۔"

میں نے دیکھا کہ "بوڑھی روح" یعنی کنور شاکر علی کا منہ لٹک گیا۔ میرے سفید جھوٹ نے نہ صرف ایک بار پھر مجھے ہیرو بنا دیا تھا بلکہ دوسروں کو احمق ثابت کر دیا تھا۔ یہ جھوٹ بولنے کی ہمت مجھ میں اس لیے پیدا ہو گئی تھی کہ اسٹیشن سے گھر آتے وقت میں نے اپنا ریوالور، زمین سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں اپنی "ہیرو شپ" میں کسی کو بھلا کیسے شریک ہو جانے دیتا! اور پھر اس پاکٹ سائز کو جس سے لیوسی کے معاملے میں میری رقابت چل رہی تھی! میں اس کی بہادری اور ذہانت کو حماقت ثابت کر کے بہت خوش تھا۔

"خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔" معاً سرتھامسن کی آواز پھر سنائی دی۔ "ہم بہرحال اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ میں ایسے انتظامات کر چکا ہوں کہ راجندر پرشاد آج ہی خفیہ طور پر دہلی سے چلا جائے۔ ہمیں اس حد تک ضرور کامیابی ہوئی ہے کہ ہم نے مجرموں کے ایک بہت اہم آدمی کو راستے سے ہٹا دیا ہے لیکن مجرم اب کوئی اور خطرناک قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے ہی وہ گھیر لیے جائیں۔ ممکن ہے کہ اے ڈی کے منصوبے کے مطابق رنجیت کو زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو بہت سی باتیں سامنے آ جاتیں، ایسا نہ ہو سکا اور کیوں نہ ہو سکا، اس پر بحث فضول ہے۔ مجرموں کا جو منصوبہ تھا، وہ اب واضح طور پر سامنے آ چکا ہے۔ ایک مسلمان غنڈے سے کسی ہندو لیڈر پر حملہ کرانا، ان کے مقاصد کو واضح کر دیتا ہے۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ وہ غنڈہ، گویا کرائے کا تھا۔ اس سے مجرموں کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ رنجیت کی وہاں موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ جب وہ غنڈہ، راجندر پرشاد کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو رنجیت اسے گولی مار کر فرار ہو جاتا تاکہ جو سازش تھی، سامنے نہ آ پاتی۔ غالباً میں نے حالات کا صحیح تجزیہ کیا ہے!" سرتھامسن نے تائید طلب انداز میں باری باری مجھ سمیت سب کی طرف دیکھا۔

تائید میں پہل میں نے ہی کی۔ "سر! غالباً نہیں بلکہ یقیناً ایسا ہی ہے۔ آپ اور غلط تجزیہ کریں، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے!"

میری بات سن کر بڈھے کے نقلی دانت باہر آ گئے۔ اپنی اتنا کی مالش سے کون خوش نہیں ہوتا!

"تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟" سرتھامسن نے کنور شاکر علی اور تیواڑی جی سے بھی داد بٹورنا چاہی۔ گویا سرتھامسن بھی میری طرح جو پر دوڑ لیے تھے۔

"بالکل درست فرمایا آپ نے سر!" کنور شاکر علی نے تائید کی، پھر تیواڑی جی بھی پیچھے نہ رہے۔ انھوں نے بھی اس سامنے کی بات پر سرتھامسن کی اس طرح تعریف کی جیسے سرتھامسن نے کوئی انکشاف کیا ہو حالانکہ یہ بات خود وہ بھی سمجھ چکے ہوں گے۔

"تم بتا رہے تھے تیواڑی کہ رنجیت کی جیبوں سے کچھ کاغذات بھی نکلے تھے۔" سرتھامسن داد بٹورنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "وہ بات اے ڈی کے آنے کی وجہ سے ادھوری ہی رہ گئی۔ ان کے مطالعے سے کچھ سراغ ملا؟ میرا مطلب یہ کہ اصل مجرموں کی کچھ نشان دہی ہوتی ہے ان سے؟"

"جی نہیں سر!" تیواڑی جی نے جواب دیا۔ "اسے سراغ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بہرحال یہ اندازہ اس سے ضرور ہوتا ہے کہ رنجیت کا کوئی نہ کوئی تعلق سیٹھ عثمان سے ضرور رہا ہوگا۔ دراصل ان کاغذات میں ایک ایسا لفافہ بھی ملا ہے جو سیٹھ عثمان کی تعمیراتی کمپنی کا ہے۔ اس لفافے پر سیٹھ عثمان کی کمپنی کا نام اور پتا چھپا ہوا ہے۔"

"یہ بھی بہرحال بہت اہم بات ہے۔ اس سے کم از کم ہمیں یہ یقین تو ہو ہی گیا کہ سیٹھ عثمان کا تعلق بہرحال مجرموں سے ہے۔"

سرتھامسن بولے۔ "لیکن اس لفافے کو ہم بطور ثبوت اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کی فرم سے کوئی بھی چھپا ہوا لفافہ حاصل کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لفافے استعمال ہی کے لیے چھپوائے گئے ہوں گے اور بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔"

اس موقع پر میں خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ "سر! آپ کا خادم اس کا سبب جانتا ہے کہ وہ لفافہ رنجیت کی جیب میں کیوں تھا!"

سرتھامسن نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولے۔ "تمہارے بارے میں تو تیواڑی نے مجھے بتایا تھا کہ تم فوراً ہی اسٹیشن سے چلے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ تمہاری غیر موجودگی ہی میں رنجیت کی جیبوں سے وہ کاغذات نکالے گئے ہوں گے۔ پھر آخر تم اس لفافے کے بارے میں کیسے جان گئے؟"

"سر! جس طرح آپ حالات سے نتائج اخذ کرتے ہیں، اسی طرح آپ کا اے ڈی بھی تو کچھ سوچ سکتا ہے۔"

سرتھامسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ غالباً "آپ کا اے ڈی" سن کر! وہ بولے۔ "اچھا تم خود بتاؤ! کس طرح اور کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے؟"

"سر! آپ کے اے ڈی کو تو یہ تک علم ہے کہ سیٹھ عثمان کا منیجر رگھوناتھ کہاں، کیسے اور کیوں روپوش ہو گیا تھا!" میں مزید اینٹھ گیا اور اس "ڈیلٹمن" کا میرے پاس جواز تھا۔

سرتھامسن چونک اٹھے اور بقیہ دو عدد "ڈی آئی جی آن" بھی!

"اگر تمہیں رگھوناتھ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا تو تم نے اب تک کیوں نہیں بتایا؟" سرتھامسن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نے دانستہ انھیں "ڈارک" یعنی اندھیرے میں رکھا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ لیوسی سے رگھوناتھ کا حلیہ پوچھنے سے پہلے خود میں بھی "ڈارک" ہی میں تھا۔ رگھوناتھ کا ذکر چھڑنے کے بعد لفافے کا ذکر غائب ہو گیا تھا۔

میں سرتھامسن کی پیشانی پر پڑے ہوئے بل دیکھ کر بھانپ گیا کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "سر! خود میں بھی آج ہی یہ راز جان سکا ہوں۔" میں نے جھوٹ بولا حالانکہ لیوسی مجھے رگھوناتھ کا حلیہ بہت پہلے پرسوں ہی بتا چکی تھی۔

سرتھامسن نے میری بات سن کر طویل سانس لیا، پھر بولے۔ "خیر اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ پہلے تم رگھوناتھ ہی کے بارے میں بتاؤ!" ان کی پیشانی کے بل اب غائب ہو چکے تھے۔

"سر! رگھوناتھ مر چکا ہے، گویا ہمیشہ کے لیے روپوش ہو چکا ہے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر "سسپنس" مارا اور چپ ہو گیا۔

"تفصیل سے اور پوری بات کیا کرو، رکا نہ کرو درمیان میں!" سرتھامسن نے ہدایت کی۔ دونوں "ڈی آئی جی آن" ہونق بنے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔

"بہتر ہے سر!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "رگھوناتھ کا سرے سے کوئی الگ وجود نہیں تھا۔ رنجیت ہی رگھوناتھ کا پارٹ ادا کر رہا تھا۔" میں نے آخر "راز" کے رُخِ زیبا سے نقاب اٹھا ہی دی۔ "میں

نے اسی لیے عرض کیا تھا کہ رگھوناتھ مر چکا ہے۔ رنجیت، رگھوناتھ بن کر سیٹھ عثمان کی فرم میں منیجری کر رہا تھا، اس لیے اس کی جیب سے سیٹھ کی فرم کا لفافہ برآمد ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔"

میرے اس انکشاف نے کچھ دیر کے لیے کمرے میں سناٹا طاری کر دیا۔ تینوں ہی افراد کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس انکشاف کی روشنی میں وہ گزرے ہوئے مختلف واقعات کی کڑیاں جوڑنے میں مصروف ہیں۔ پھر یہ خاموشی سر تھامسن ہی کی آواز سے ٹوٹی۔ "اگر ایسا تھا تو بہت سے مسئلے خود بہ خود حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اس کار کا مع جور رنجیت، ہاڑے کے چوراہے پر چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ پھر اس کا روپوش ہو جانا وغیرہ۔"

"اور بہ حیثیت منیجر رنجیت کو گویا وظیفہ دینا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں یہ بھی!" سر تھامسن نے تائید کی، پھر سوال کیا۔ "مگر اے ڈی، یہ بتاؤ کہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ رنجیت ہی رگھوناتھ بنا ہوا تھا؟"

یہ سوال متوقع تھا اس لیے میں نے فوراً جواب دے دیا۔ "ہمارے ریکارڈ میں رگھوناتھ کا حلیہ نہیں تھا اور یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دورانِ ملازمت میں بھی وہ بہت کم لوگوں کے سامنے آیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے مجھے تیواڑی جی کا خیال آیا کہ تھوڑا بہت کریڈٹ انھیں بھی دے دوں۔ میں نے کہا۔ "اس طرف میرے ڈی آئی جی صاحب نے بھی مجھے متوجہ کیا تھا حالانکہ میرے ذہن میں یہ بات پہلے ہی سے کھٹک رہی تھی۔ صرف لیوسی نے رگھوناتھ کی حیثیت میں سیٹھ عثمان سے ملتے ہوئے رنجیت کو دیکھا تھا۔ میں نے آج پہلا کام یہی کیا۔ میں اپنے گھر سے سیدھا اس کے گھر گیا اور راستے میں اس سے رگھوناتھ کا حلیہ پوچھا۔ میں جب مجرموں کے چنگل میں پھنس گیا تھا، اس وقت بھی میں نے رنجیت کو اسی میک اپ میں دیکھا تھا اور پھر بعد میں بھی وہ اسی میک اپ میں مجھ سے ملتا رہا تھا۔ بالکل وہی حلیہ لیوسی نے رگھوناتھ کا بتایا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لینا کوئی مشکل نہیں رہا کہ دراصل رنجیت ہی رگھوناتھ بنا ہوا تھا۔"

"اے ڈی! تمھارے جوہر ہم پر بہت دیر میں کھلے۔" سر تھامسن کے لہجے میں بھرپور ستائش تھی۔ "مجھے اگر علم ہوتا کہ تم اتنے ذہین ہو تو میں پہلے ہی تمھارے سپرد بہت سے اہم کام کر دیتا اور تم سے کچھ نہ چھپاتا۔"

سر تھامسن سے اپنی تعریف سن کر، میں اور بھی پھول کر کپا ہو گیا، اتنا کہ ان کا شکریہ ادا کرنے کی خواہش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میری اس قدر تعریف دونوں ہی "ڈی آئی جی ان" کو کھلی تھی جس کا اظہار ان کے چہروں سے ہو رہا تھا۔ میں نے ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور سر تھامسن کی طرف متوجہ ہو گیا جو کچھ کہنے کے لیے کلبلا رہے تھے۔ میں نے غور کیا ہے، جب آدمی کچھ کہنے والا ہوتا ہے تو اس پر ایک ہلکی سی "کلبلی" ضرور طاری ہوتی ہے جس سے یہ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اب کچھ کہنے کے لیے اپنے منہ میں زبان "تول" رہا ہے۔

"اب یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ سیٹھ عثمان مجرموں سے ملا ہوا ہے۔" سر تھامسن نے اپنی "کلبلی" دور کی پھر کچھ سوچ کر تیواڑی جی سے مخاطب ہوئے۔ "تم نے اس سلسلے میں لیوسی سے رپورٹ لی؟"

"جی نہیں سر!" تیواڑی جی نے جواب دیا۔ "مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ دراصل کل تو وہ دفتر ہی نہیں آئی۔ پرسوں بس کچھ دیر کو آ کر مجھ سے ملے بغیر چلی گئی تھی۔ ویسے میں آپ کو رپورٹ دے ہی چکا ہوں سر کہ بہاری لال کے گھر سیٹھ عثمان نے لیوسی کو کیوں چھوڑا تھا۔ آج وہ دفتر آ گئی ہے۔ میں نے اسے بلایا تھا کہ آپ نے طلب کر لیا اور میں اس سے رپورٹ نہ لے سکا۔"

"تم سمجھے نہیں تیواڑی! میرا مطلب کچھ اور تھا۔" سر تھامسن نے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ سیٹھ عثمان کی کوٹھی میں رہتے ہوئے اس نے کوئی اور نئی بات تو معلوم نہیں کی!"

مجھے یاد آیا کہ میں نے تیواڑی جی کو مصلحتاً تہ خانے والی بات نہیں بتائی تھی۔ یہ "راز" میں نے اس وقت سر تھامسن کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ اس موقع پر میں نے اس "راز" سے بھی پردہ اٹھا دینا مناسب جانا۔ میں نے تیواڑی جی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مداخلت کی۔ "سر! اگر آپ حکم دیں تو میں اس سلسلے میں کچھ عرض کر دوں۔ میں لیوسی سے آج از اول تا آخر تمام رپورٹ لے چکا ہوں۔" میں نے لیوسی سے آج رپورٹ ہرگز نہیں لی تھی۔ یہ جھوٹ میں نے محض تیواڑی جی کی خفگی سے بچنے کے لیے بولا تھا۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ میں نے پہلے انھیں کیوں آگاہ نہیں کیا۔

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی اے ڈی کہ تم کسی طرف سے غافل نہیں رہتے۔" سر تھامسن نے ایک بار پھر مجھے بانس پر چڑھا دیا اور بولے۔ "ہاں بتاؤ، کیا نئی بات معلوم ہوئی ہے؟"

میں نے تہ خانے والی پوری "اسٹوری" بیان کر دی۔ اس "اسٹوری" میں دانستہ میں نے زیادہ "کل پھندنے" نہیں جوڑے تھے کیوں کہ اس کا مرکزی کردار میں نہیں لیوسی تھی۔

"سر اب تو واقعی ساری بات کھل گئی۔" اس بار کافی دیر بعد "بوڑھی روح" بولی یعنی کنور شاکر علی! "پہلے ہم سیٹھ عثمان کے سلسلے میں اس لیے بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے کہ ہمیں یقین نہیں تھا، وہ مجرموں سے ملا ہوا ہے لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے اور ڈائریکٹ ایکشن بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" سر تھامسن نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے سر!" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا، مقصد صرف سر تھامسن کی تائید کرنا تھا، کچھ اور نہیں! میری تائید پہ کنور شاکر علی کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نظر آئے تھے مگر میں ان سے نظر بچا گیا۔

"تم لوگوں نے سببِ جرم کے بارے میں بھی کچھ سوچا!" سر تھامسن نے معنی خیز انداز میں اپنی "منڈیا" ہلائی۔ "سیٹھ عثمان سرمایہ دار آدمی ہے، اسے پیسے کا لالچ نہیں دیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ کہ وہ اب تک حکومت کی گڈ بکس میں بھی رہا ہے۔ پھر آخر وہ کیا سبب ہو سکتا ہے جو وہ ملک دشمن عناصر سے مل گیا؟" یہ کہہ کر سر تھامسن خاموش ہو گئے۔ وہ خود بھی کچھ سوچنے لگے تھے۔

"سر! میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں اس کے ماضی کو ایک بار پھر کھنگالنا پڑے گا۔" کنور شاکر علی نے تجویز پیش کی۔

"اس کا ماضی بھی کسی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔" سر تھامسن بولے۔ "میں خود دو بار اس کی فائل کا مطالعہ کر چکا ہوں۔"

"اگر آپ حکم دیں سر تو میں فائل میں موجود ان صفحات کو ایک بار پھر اس وقت بغیر فائل پڑھے اور دیکھے لفظ بہ لفظ دہرا دوں جن صفحات پر سیٹھ عثمان کے ماضی کا حال لکھا گیا ہے۔" میں نے موقع غنیمت جان کر اپنی واحد صلاحیت کا اظہار کیا جس کے بارے میں کنور شاکر علی لاعلم تھے۔ میں بولا۔ "مجھے بھی ایک بار وہ فائل پڑھنے کا موقع ملا ہے۔"

غالباً کنور شاکر علی کے صبر کا پیمانہ لبالب بھر چکا تھا۔ وہ بہت دیر سے میری "ڈینگ بازی" برداشت کر رہے تھے اس لیے موصوف بپھر گئے۔ "تم بکواس کرتے ہو!" کنور شاکر علی نے براہِ راست مجھ سے کہا۔ "یہ ہرگز ممکن نہیں کہ تم لفظ بہ لفظ وہ تمام تحریر زبانی دہرا دو جو فائل میں درج ہے۔ میں کافی دیر سے تمھاری لاف زنی برداشت کر رہا ہوں۔" کنور شاکر علی کو طرارہ آ ہی گیا۔ بہ ہر حال وہ پولیٹکل برانچ کے ڈی آئی جی تھے اور مجھ جیسے تو خیر نہیں، تقریباً مجھ جیسے نہ جانے کتنوں کو "بھگتا" چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ پھٹکار کھا کر میں صدائے احتجاج بلند کرتا، سر تھامسن نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ ان کا یہ عمل سبھی کے لیے خلافِ توقع تھا۔ "گھنٹی کے حق" یعنی چچا بندو خاں فی الفور "داخل کرہ" ہو گئے۔ سر تھامسن نے انھیں پولیٹکل برانچ سے سیٹھ عثمان کی فائل لانے کا حکم دیا اور پھر جب چچا بندو خاں چلے گئے تو وہ کنور شاکر علی سے مخاطب ہوئے۔ "کنور! میں سمجھتا تھا تم لوز ٹمپر نہیں ہو۔ اگر اے ڈی نے کوئی دعویٰ کیا تھا تو تمھیں اس دعوے کو آزمانے سے پہلے اس قدر خفگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے تمھیں یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ میں سر تھامسن ہوں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر اے ڈی میں غیر معمولی صلاحیتیں نہ ہوتیں تو کیا یہ اس وقت یہاں اتنی اہم میٹنگ میں بیٹھا ہوتا! بہ ہر حال میں اس سلسلے میں مزید کچھ یوں نہیں کہنا چاہتا کہ تم اے ڈی سے واقف نہیں۔ میں نے سیٹھ عثمان کی فائل اسی لیے منگوائی ہے کہ عملی طور پر یہ ثابت ہو جائے، اے ڈی نے غلط دعویٰ نہیں کیا تھا۔ باقی باتیں ہم اس کے بعد کریں گے۔"

پھر جب تک چچا بندو خاں، فائل نہ لے آئے، کمرے میں خاموشی ہی رہی۔ میں اس دوران میں دعا کرتا رہا کہ کہیں کوئی لفظ بھول نہ جاؤں مگر مجھے اپنے "رتّے" پر بھرپور اعتماد تھا۔

سر تھامسن نے کنور شاکر علی کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو کنور!" پھر انھوں نے مجھے مخاطب کیا۔ "فائل کے کون سے پیج سے سیٹھ عثمان کے ماضی کا حال درج ہے؟"

"سر! پیج نمبر سیون، لائن نمبر الیون۔" میں نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

سر تھامسن نے کنور شاکر علی کو صفحہ سات کھولنے کا حکم دیا اور میں نے کاغذوں کی سرسراہٹ سنی۔ پھر سرسراہٹ ختم ہو گئی تو سر تھامسن کی آواز ابھری۔ "شروع ہو جاؤ اے ڈی!"

"یس سر!" میں نے کہا اور "شروع" ہو گیا۔ "سیٹھ عثمان کا پورا نام عثمان علی ہے۔ سیٹھ کے والد کا نام سیٹھ فیضان علی اور دادا کا نام نواب عرفان علی تھا۔ سیٹھ عثمان کے والد اور دادا ہمیشہ حکومتِ انگلیشیہ کے وفادار رہے۔ سیٹھ عثمان کے دادا نواب عرفان علی کو حکومت نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ سیٹھ فیضان علی کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک بچپن ہی میں مر گیا تھا اس لیے وہ سیٹھ عثمان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ سیٹھ عثمان کی جوانی کا بڑا حصہ برطانیہ میں گزرا۔ جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹا تو کچھ دن بعد ہی سیٹھ فیضان علی کا انتقال ہو گیا۔ سیٹھ عثمان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ تنہا رہ گیا۔ سیٹھ عثمان اگر اپنے باپ کی موت کے بعد کوئی کاروبار نہ بھی کرتا تو اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اپنی تمام زندگی عیش سے گزار سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ فطری طور پر اسے تجارت سے بہت دلچسپی تھی اس لیے اس نے اسی پیشے کو اپنایا۔ کیوں کہ وہ خاندانی رئیس تھا اور عوام میں بھی اس کے خاندان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لیے اس نے سیاست میں بھی دلچسپی لی مگر ہمیشہ حکومتِ انگلیشیہ کے مفادات کا خیال رکھا۔ ہندوستان میں کئی رفاہی ادارے صرف اسی کے مالی تعاون

سے چل رہے ہیں۔ اس کی انہی خدمات کے پیشِ نظر حکومت نے اسے نئی دہلی کی سرکاری عمارتوں کی تعمیر کا ٹھیکا دے دیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ جدید طرزِ تعمیر سے بہ خوبی آگاہ ہے اور۔۔۔"

"کافی ہے سر!" کنور شاکر علی نے ہتھیار ڈال دیے اور میں ان کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ "حیرت انگیز، انتہائی حیرت انگیز! مجھے آج سے پہلے کسی ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جس کا حافظہ اس قدر تیز ہو کر وہ لفظ بہ لفظ سب کچھ بتا دے۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں سر!"

میں اس دوران میں آنکھیں کھول چکا تھا اور کنور شاکر علی کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا جس پر واقعی حیرت نظر آ رہی تھی۔ وہ میری بجائے سر تھامسن سے مخاطب تھے اور انھوں نے فائل بند کر کے میز پر ایک طرف رکھ دی تھی۔ سر تھامسن کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جس میں تفاخر کی بھی ہلکی سی جھلک تھی جیسے میری بجائے انھوں نے یہ "کرتب" دکھایا ہو۔

"تو دیکھا تم نے کنور!" بالآخر سر تھامسن کے ہونٹ ہلے۔ "اب تو تمھیں یقین آگیا!"

"یس سر!" کنور شاکر علی نے اعتراف کیا، پھر مجھ سے براہِ راست ہم کلام ہوئے۔ "میں سر سے درخواست کروں گا کہ وہ تمھارا تبادلہ میرے سیکشن میں کر دیں۔ تم تو واقعی حیرت انگیز صلاحیت کے مالک ہو۔"

اس موقع پر بھلا تیواڑی جی کیسے خاموش رہتے، وہ فوراً بول اٹھے۔ "اے ڈی میرا تربیت یافتہ ہے اور میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گا کہ ایسا ہو۔"

"خیر خیر!" سر تھامسن ہنس پڑے۔ "فی الحال یہ بحث چھوڑ دو اور اصل مسئلے کی طرف آجاؤ۔" یہ کہہ کر وہ سنجیدہ ہو گئے اور کنور شاکر علی سے کہا۔ "کنور! تم کہہ رہے تھے کہ سیٹھ عثمان کے ماضی کو کھنگالنا پڑے گا، تو میرا خیال یہ ہے کہ اس کا ماضی بے داغ ہے۔ پھر بھی تم اس مسئلے پر اور غور کر لینا۔ اس وقت ہمیں یہ سوچنا ہے کہ سیٹھ عثمان کی کوٹھی میں متوقع تہ خانے کا سبب کیا ہے اور یہ کہ رات کے وقت وہاں پُراسرار نقل و حرکت کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تیواڑی نے پچھلی میٹنگ میں ایک مشورہ دیا تھا جو قبل از وقت تھا لیکن موجودہ حالات کی روشنی میں وہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی بات سامنے آسکتی ہے۔ اس سلسلے میں کیا اقدامات ہوں گے، ان کے بارے میں آج ہی میں احکام جاری کر دوں گا۔ میں جن خطوط پر سوچ رہا ہوں، ان کی تفصیلات ابھی خود میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ اگر تم لوگوں کو کچھ اور کہنا ہے یا مزید کوئی تجویز دینا ہے تو بتاؤ تاکہ میں اس دوران میں اس پر بھی غور کر لوں۔"

تیواڑی جی کی تجویز کو تو پہلے ہی سندِ قبولیت مل چکی تھی اس لیے وہ "وِد ڈرا" ہو گئے۔ کنور شاکر علی کوئی نئی تجویز پیش نہ کر سکے اور انھوں نے تیواڑی جی کی تجویز سے اتفاق کیا۔ رہا میں تو مجھے کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اپنا دماغ تھکاتا۔ نتیجتاً میٹنگ برخاست کر دی گئی۔

میں جب تیواڑی جی کے ہمراہ سر تھامسن کے کمرے سے نکل رہا تھا تو سوچ رہا تھا کہ غبارہ کہیں پھوٹ نہ جائے۔ دانستہ یا نادانستہ میں نے اس میں اتنی ہوا بھر دی تھی کہ اب مزید ہوا کی بالکل گنجائش نہیں رہی تھی۔ مطلب یہ کہ میں نے "ڈینگیں" تو پیٹ بھر کر مار دی تھیں، آئندہ اس کے قوی امکانات تھے کہ میری "پول پٹی" کھل جاتی۔ عزت و آبرو بنا لینا ہر چند کہ مشکل ہوتا ہے اور ہیرو بن جانا بھی لیکن اسے برقرار رکھنا اس سے بھی مشکل کام ہوتا ہے اور ساری زندگی میں یہی مشکل کام کرتا رہا۔

کنور شاکر علی اپنے سیکشن کی طرف ٹہل لیے تھے اور تیواڑی جی اپنے کمرے کی طرف! میں نے سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر کیس کی فائل کا پیٹ بھر دوں، میں نے بہت سے واقعات ابھی اس میں نہیں لکھے تھے۔ یہ سوچ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر اسی دن دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے سر تھامسن کے احکام جاری ہو گئے۔ یہ احکام مجھے تیواڑی جی سے ملے۔ جس کا خطرہ تھا، وہی ہوا۔ آخر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی! احکام سن کر میری فاختہ اُڑ گئی۔ "آپریشن کوٹھی سیٹھ عثمان" کا انچارج مجھ بدنصیب کو بنا دیا گیا تھا۔ "کرم فرمائی" کرتے ہوئے تفصیلات اور افراد کا انتخاب مجھ بدنصیب ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ افراد کی تعداد کا تعین بھی نہیں کیا گیا تھا، ہاں یہ حکم ضرور تھا کہ اگر میں چاہوں تو کرائم برانچ کے علاوہ پولیٹیکل برانچ کے افراد کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ اس سلسلے میں کنور شاکر علی کو ہدایات دی جا چکی تھیں کہ میں ان کے سیکشن سے جس آدمی کو چاہوں "پِک" لوں۔ دفتر کا وقت ختم ہونے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا اور اس پون گھنٹے ہی میں مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ "آپریشن" کے لیے کیا کیا بندوبست کیا جائے۔ احکام سنتے ہی میری کھوپڑی "بھک" سے اُڑ گئی تھی۔ کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی۔ "اور بانک بیٹا، ڈینگیں! اب معلوم ہوگا تجھے آٹے دال کا بھاؤ!"

اپنی کم بختی کو میں نے خود آواز دی تھی اس لیے کسی سے گلہ بھی کرتا تو کیا! تیواڑی جی کے کمرے سے آکر میں سر پہ ہاتھ رکھے اپنی قسمت اور اس لمحے کو کوس رہا تھا جب خفیہ میں تقرر ہوا تھا کہ لیوسی آگئی اور اس نے آتے ہی چھیڑا۔ "کیا سر میں بہت درد ہو رہا ہے؟"

میں نے سر اٹھا کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ اس دوران میں وہ میری میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔

"آج تم بہت اُکھڑے اُکھڑے پھر رہے ہو، باتھ ہی نہیں لگ رہے!" وہ میری قہر آلود نظروں کو نظر انداز کر کے بولی۔

"پھر تم کون! ہاتھ لگوں نہ لگوں میری مرضی!"

"کہیں اجاڑ، تو نہیں پڑ گئی؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے آئی تھی تو معلوم ہوا تھا تم تیواڑی جی کے پاس گئے ہو۔" اس نے شوخی سے کہا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ لیوسی بہت "چہچہا" رہی ہے، رات کے "آپریشن" میں اسے بھی اپنے ساتھ لے لوں۔ سارے کس بل نکل جائیں گے خاتون کے! یوں بھی ابھی میں نے کچھ نہیں سوچا تھا کہ کس کس کو ساتھ لوں لیکن یہ بہ ہر حال سوچ چکا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدمی ہوں تو اچھا ہے، ہمت بندھی رہے گی۔

"سنو لیوسی! آج رات بارہ بجے تم بالکل تیار رہنا۔ بقیہ تفصیلات سے میں تمھیں دفتر کا وقت ختم ہوتے ہوتے آگاہ کر دوں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میری بات سن کر لیوسی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "تم آؤ گے نا مجھے لینے؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں کہ میں اس سلسلے میں کیا انتظامات کروں گا کیوں کہ تمھارے علاوہ بھی اور بہت سے لوگ ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"قصہ کیا ہے؟" لیوسی نے پوچھا۔

پھر مجھے لیوسی کو "قصہ" سنانا ہی پڑا اور اس "قصہ گوئی" سے مجھے فائدہ ہی ہوا۔ لیوسی نے بہت سی الجھنیں ختم کر دیں۔ اس نے "آپریشن" کے بڑے حصے کا انتظام خود بہ خود سنبھال لیا تھا۔ اس سے میرا بس ایک مسئلے پر اختلاف ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بھیڑ بھاڑ نہ ہو تو اچھا ہے مگر میں نہ مانتا۔ اس طرح تو میں جوڑے میں مارا جاتا۔ وہ چاہتی تھی کہ "آپریشن کوٹھی عثمان" میں صرف وہ ہو اور میں!

"تم جانو، میں نے تو اپنی رائے پیش کی تھی۔" بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس بدبخت شیکھر کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ کچھ اسے بھی تو معلوم ہو کہ گنگا کدھر سے بہتی ہے!" میں بولا۔

"اسے ساتھ نہ ہی لو تو بہتر ہے۔" لیوسی نے کہا۔ "اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔"

"دراصل ایک بار اس بدبخت نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کا افسر نہیں ہوں اور وہ اسی لیے مجھ سے 'جی جناب' نہیں کرتا۔ اس 'آپریشن' میں، وہ بہ ہر حال میری ماتحتی میں ہوگا اور میں اسے 'جی جناب' کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ آخر وہ بدذات سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو! بھلا بتاؤ مجھ سے یعنی اے ڈی سے ایک بار تو وہ ہاتھا پائی تک کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اس کی یہ مجال! اس سرے کو رگڑ کے رکھ دوں گا!" میں جوشِ جذبات میں کہتا رہا۔ "تم بھول جاؤ تو بھول جاؤ لیکن میں اپنے زخم نہیں بھول سکتا۔ وہ تو ایک اور بدبخت کی ڈیوٹی بھی میں آج رات لگاتا مگر اس کی قسمت اچھی تھی جو ٹانگ پر گولی کھا کر گھر جا کے پڑ گیا ورنہ اسے بھی دیکھ لیتا۔ بہ ہر حال شیکھر بدذات کو تو میں نہیں بخشوں گا، ہاں!"

"تو یوں کہو کہ اس بہانے تم شیکھر پر اپنی افسری کا رعب بٹھانا چاہتے ہو۔" لیوسی مسکرا کر بولی۔

"چلو یہی سمجھ لو! میں جب تک اس کی زبان سے اپنے لیے 'سر' نہیں سن لوں گا، مجھے چین نہیں پڑے گا۔"

میری بات سن کر لیوسی ہنس پڑی اور پھر "آپریشن" کے انتظامات کرنے روانہ ہو گئی۔ پولیٹیکل برانچ سے میں نے ایک تو شیکھر، دوسرے انسپکٹر وسیم کو لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ انسپکٹر وسیم سے بھی میں "سڑا" ہوا تھا۔ اس نے بھی ایک بار میرا مذاق اُڑایا تھا۔ قدرت نے مجھے انتقام لینے کا موقع دیا تھا اور میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اسی لیے جن افراد کو میں نے آج رات کے "آپریشن" کی خاطر منتخب کیا تھا، ان میں دلاور خاں اور "ہکلے شاہ" انسپکٹر مولاداد کا نام بھی شامل تھا۔ ان کے علاوہ پیارے لال ہنر کو بھی میں نے نہیں بخشا تھا۔

لیوسی کے اختلاف کرنے کے باوجود میں نے جو فہرست بنائی وہ یہ تھی، انسپکٹر دلاور خاں، انسپکٹر مولاداد، انسپکٹر وسیم، سب انسپکٹر پیارے لال ہنر، سب انسپکٹر شیکھر اور انسپکٹریس لیوسی! اپنے بقیہ ماتحتوں کی خطاؤں کو میں نے معاف کر دیا تھا۔

تیواڑی جی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جن لوگوں کو "آپریشن" کے لیے منتخب کر دوں، ان کے ناموں سے انھیں بھی آگاہ کر دوں تاکہ وہ بہ راہِ راست بھی ان افراد کو میری ماتحتی کا حکم سنا دیں۔ ابھی وقت تھا اس لیے پہلے میں کنور شاکر علی سے مل لینا چاہتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

کنور شاکر علی نے مجھے فوراً ہی بلوا لیا تھا۔ غالباً انھیں سر تھامسن کے احکام مل چکے تھے۔ وہ اس وقت اپنی فطری سرد مہری کے باوجود مجھے کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس "لوٹ پلٹ" کا سبب میرا آج صبح والا "کارنامہ" تھا۔ جب میں "گڈ ایوننگ" وغیرہ کر کے کرسی پر ان کے سامنے بیٹھ گیا اور انھوں نے میری جانب اپنی شکرے جیسی آنکھیں اٹھائیں تو میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا اور آخر میں بولا۔ "بہتر یہ ہے کہ آپ ان دونوں کو میرے ہی سامنے بلا کر حکم دے دیں۔ میرا مطلب یہ ہے سر کہ وہ۔۔۔ وہ میری حکم عدولی نہ کریں۔ وقتی طور پر ہی سہی مگر بہ ہر حال وہ میری ماتحتی میں کام کریں گے

اس لیے ان پر لازم ہے کہ میرے ہر حکم کی تعمیل کریں۔"

"ویسے تم کہتے ہو تو میں انھیں بُلوائے لیتا ہوں ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" یہ کہہ کر کنور شاکر علی نے اپنے چپراسی کو بُلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

کچھ دیر بعد ہی "بھائی پاکٹ سائز" اور انسپکٹر وسیم وہاں موجود تھے۔ کنور شاکر علی نے ان سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

"تم دونوں انھیں اسسٹ کرو گے!" کنور شاکر علی نے انھیں حکم دیا۔

"یس سر!" وہ دونوں "کورس" میں بولے، پھر انسپکٹر وسیم نے ذرا سا کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا "سر! کیا ان کا تبادلہ ہمارے سیکشن میں ہ..."

"غیر ضروری سوال نہیں!" کنور شاکر علی، ہاتھ اٹھا کر بولے "اب تم لوگ جا سکتے ہو! احکام آج ہی تمھیں ان سے مل جائیں گے۔" کنور شاکر علی کے لہجے میں سختی تھی۔

"بہتر ہے سر!" وہ دونوں پھر "کورس" میں بولے اور ایڑیوں پر گھوم گئے جس طرح کہ ایسے موقعوں پر گھوما جاتا ہے۔

"تم دونوں کچھ دیر بعد میرے کمرے میں آ جانا!" ان کے جاتے جاتے میں نے بھی حکم جھاڑ دیا۔

جواب میں اُن سے "یس سر" سن کر میرا کئی "پلی خون" بڑھ گیا۔ میں نے اپنے "منصوبے" کے مطابق ان دونوں کی ابھی سے "رگڑائی" شروع کر دی تھی۔

وہ دونوں کمرے سے نکل گئے تو میں نے کنور شاکر علی سے اجازت چاہی۔

"ہاں تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمھارا پلان کیا ہے!" کنور شاکر علی نے مجھے کریدنا چاہا۔

پلان کچھ بنایا ہوتا تو میں بتاتا بھی! اس لیے بولا "ابھی میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا سر!"

"ہوں!" کنور شاکر علی نے ہنکارا بھرا "میں سمجھ گیا۔ کام کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ عموماً پہلے ہی سے کی ہوئی پلاننگ فیل ہو جاتی ہے اور حالات اس طرح پیش نہیں آتے جس طرح فرض کر لیے جاتے ہیں۔ بروقت اقدام کے لیے بڑی بیدار ذہنی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم ذہن بیدار ہی رکھتے ہو۔"

معلوم نہیں کیسے جوشِ جذبات میں اپنی تعریف سن کر میرے مُنہ سے نکل گیا "آپ کے مُنہ میں گھی شکر!"

"واٹ!" کنور شاکر علی اس طرح اچھل پڑے جیسے انھیں کھٹمل نے کاٹ لیا ہو "آئی ڈونٹ لائک فرینک نیس! گیٹ آؤٹ!" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخے۔

رسین یوں ایک دَم چینج ہو جائے گا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں ابھی ہڑبڑا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک بار پھر "گیٹ آؤٹ" کی دل خراش صدا بلند ہوئی اور میں کرسی سے اٹھ کر تیر کی طرح دروازے کی طرف لپکا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں خود کو کوس رہا تھا۔ میری "جبلت" نے مجھے اکثر ذلیل و خوار کرایا تھا۔ اچھی بھلی "ہیرو شپ" مٹی میں مل کے رہ جاتی تھی۔ یہ بڑا غنیمت ہوا تھا کہ شیکھر اور وسیم کے

سامنے میرے مُنہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں نکلی تھی ورنہ خفیہ کی وہ "بوڑھی روح" انھی کے سامنے مجھے لتاڑ دیتی۔ خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو بڑی "کرکری" ہوتی۔

معاً چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ تیواڑی جی سے بھی ملنا ہے۔ میں ادھر مڑ گیا۔

تیواڑی جی مجھ پر کچھ زیادہ ہی صدقے واری ہوئے جا رہے تھے، اس دن! اس کا سبب مجھے کافی دن بعد معلوم ہوا۔ دراصل ان میں اور کنور شاکر علی میں چلتی تھی لیکن کُھلے عام وہ دونوں اس کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر اندر ہی اندر ایک دوسرے کی "کاٹ" میں لگے رہتے تھے۔ میں نے اس دن گویا کنور شاکر علی کو "پیدل" کر دیا تھا، یہ دیکھ کر تیواڑی جی کو خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ ان کے چہرے سے بھی خوشی جھلکی پڑ رہی تھی۔ میں نے انھیں منتخب افراد کے ناموں سے آگاہ کیا، پھر بولا "سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ دلاور خاں صاحب اور انسپکٹر مولاداد کو میرے ہی سامنے بُلا کر اس سلسلے میں حکم دے دیں، باقی افراد کی مجھے فکر نہیں۔"

"ان دونوں کو تو میں ابھی بُلوائے لیتا ہوں مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم نے پولیٹکل والوں کو کیوں ساتھ لگا لیا ہے۔" تیواڑی جی نے میری بات سن کر کہا "خود ہمارے سیکشن میں بھی تو لوگ موجود ہیں!"

اب میں تیواڑی جی کو اس کا کیا سبب بتاتا! ان سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ انتقامی کارروائی ہے اس لیے فی الفور مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو کہہ دیا "سر! وہ بھی تو کچھ کریں۔ دراصل تو یہ کیس انھی کا ہے۔"

"خیر تم جانو۔" تیواڑی جی بولے اور اپنے چپراسی کو بُلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آ گیا تو انھوں نے پہلے دلاور خاں کی طلبی کا حکم سنایا اور سگریٹ سلگانے لگے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت دلاور خاں کے چہرے پر کیسے تاثرات ہوں گے جب انھیں میری ماتحتی میں کام کرنے کا حکم سنایا جائے گا۔ میں اس وقت خیالوں ہی خیالوں میں بڑی اونچی پرواز کر رہا تھا۔

جب دلاور خاں، کمرے میں داخل ہوئے اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہاں مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی۔ "آ گئے تو آؤ خاں صاحب! ابھی دماغ کے سب کیڑے جھڑ جائیں گے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ انھوں نے آتے ہی تیواڑی جی کو شام کا سلام بہت زبردست انداز میں "جھاڑا"۔ اس کے بعد اشارہ پا کر مجھ سے دور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"تمھیں خبر ہو گی دلاور خاں کہ اللہ دتا اب سینئر انسپکٹر بنا دیا گیا ہے۔" تیواڑی جی نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی... جی ہاں سر!" دلاور خاں نے مُردہ سی آواز میں اعتراف کیا۔

"اور یہ بھی کہ تم صرف انسپکٹر ہو!" تیواڑی جی سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے مزید بولے۔

"ظا... ظاہر ہے سر!" دلاور خاں ہکلانے لگے "مُم... مگر ...سر... بب... بات کیا ہے؟"

"وہی بتانے میں نے تمھیں بُلوایا ہے۔" تیواڑی جی کا لہجہ خشک تھا "آج رات اللہ دتا موجودہ کیس کے سلسلے میں ایک اہم قدم اٹھانا چاہتا ہے۔ تمھیں اس کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔"

"جج... جج... جی... جی سر؟" دلاور خاں اس طرح حیرت سے بولے جیسے انھیں میرے احکام کی تعمیل کرنے کی بجائے مرغا بن جانے کا حکم دیا گیا ہو۔

"کیوں تمھیں کوئی اعتراض ہے!" تیواڑی جی کی نوکیلی مونچھیں آہستہ آہستہ حرکت میں آنے لگیں۔

"نن... نہیں... نہیں سر!... مم... میں تو آپ کے حکم... آپ کا حکم سر آنکھوں پر!" دلاور خاں سٹپٹا گئے۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" تیواڑی جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور اسی کے ساتھ دوبارہ گھنٹی بجائی۔

دلاور خاں کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

تیواڑی جی نے جاتے جاتے انھیں مزید کس دیا "اگر مجھے یہ شکایت ملی کہ تم نے کوئی حماقت کی ہے اور اللہ دتا کا حکم نہیں مانا تو میں سختی سے پیش آؤں گا!"

اِدھر دلاور خاں کمرے سے نکلے اُدھر چپراسی اندر آیا۔ تیواڑی جی نے اس بار "ہکلے شاہ" کی طلبی کا فرمان سنایا۔ میری حالت اس وقت کسی ایسے چوہے کی سی تھی جس کے ہاتھ ہلدی کی گانٹھ لگ گئی ہو اور وہ خود کو پنساری سمجھنے لگا ہو۔

"تم نے لیوی سے کہہ دیا؟" تیواڑی جی نے مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں سر!" میں نے جواب دیا "وہ تو پہلے ہی سے میری ماتحتی میں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" تیواڑی جی مطمئن انداز میں سر ہلا کر بولے "اگر کمار زخمی نہ ہو جاتا تو اس موقع پر وہ بھی تمھارے کام آتا۔"

کمار کا نام آتے ہی میں جل بُھن گیا۔ اس بدذات کو تو میں بھولے ہی بیٹھا تھا۔ یہ موقع مجھے بہت غنیمت معلوم ہوا کہ اس کا پتا صاف کرا دوں۔ اس وقت میری "لہر چل رہی تھی"، میں جو کہتا، وہ ہو جاتا۔ یہ سوچ کر میں جلدی سے بولا "سر! معاف کیجیے گا، مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔" میں نے پہلے تمہید باندھنا ضروری سمجھا۔

"مجھ سے گلہ؟" تیواڑی جی مسکرا کر بولے "کیسا گلہ اللہ دتا؟"

تیواڑی جی نے ابھی تک مجھے بہ حیثیت "اے ڈی" تسلیم نہیں کیا تھا، وہ اللہ دتا ہی کہتے تھے مگر یہ موقع سینگ مارنے کا نہیں تھا اس لیے میں اپنی "توہین" برداشت کر رہا تھا۔ میں نے اپنے غصّے کو پیتے ہوئے مطلب کی بات کرنا ضروری سمجھا "سر! وہ گلہ مجھے کمار سے..."

ابھی میرا جملہ پورا نہ ہو پایا تھا کہ انسپکٹر مولاداد، یعنی بھائی ہکلے شاہ کمرے میں داخل ہوئے۔ عین موقع پر مجھے اس کی آمد کھل گئی مگر تیواڑی جی اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے تو میں کیا کرتا۔

"گُگ... گُگ... گُڈ... ای... ای... ای... ایوننگ... سا... سا... سر!" انسپکٹر مولاداد نے قسطوں میں تیواڑی جی کو شام کا سلام کیا۔

تیواڑی جی یقیناً اس کی "گُو گُو" اور "ای ای" سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے فوراً بولے "سنو، تمھیں کم سے کم بولنا ہے!" تیواڑی جی کا لہجہ حکمیہ تھا "جو میں کہوں، اسے غور سے سنو، اِدھر بیٹھ کر! باقی احکام تمھیں اللہ دتا سے ملیں گے۔" پھر تیواڑی جی نے اس سے بھی تقریباً وہی سب کچھ کہا جو دلاور خاں سے کہہ چکے تھے۔ آخر میں انھوں نے مولاداد کو بھی دلاور خاں کی طرح "تڑی" دی تھی۔

مولاداد حیرت سے آنکھیں پھیلائے تیواڑی جی کے احکام سنتا رہا مگر تیواڑی جی اس کی "بولتی" پر پہلے ہی پہرا بٹھا چکے تھے اس لیے آخر میں "یا... یا... یاس... سا... سا... سر" کہنے کے سوا اس نے کچھ نہیں کہا۔

مولاداد چلا گیا تو تیواڑی جی بولے "اچھا اللہ دتا، اب تم جاؤ۔ کمار کے بارے میں پھر کبھی فرصت میں بات ہو گی۔ یوں بھی اب دفتر کا وقت ختم ہو رہا ہے اور تمھیں آج رات کے لیے تیاریاں بھی کرنا ہوں گی۔"

میری بدقسمتی یہ تھی کہ جب بھی میں کمار کا "تیا پانچا" کرنے کا پروگرام بناتا تھا، کم بخت کوئی نہ کوئی "ایمرجینسی" نافذ ہو جاتی تھی اور اس "جھپڑ سٹ" میں ہر بار اصل معاملہ رہ جاتا تھا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہو رہا تھا اس لیے میں جلدی سے بولا "سر! بس چند منٹ کی بات ہے، آپ سن لیں۔"

"تم جو کہنا چاہتے ہو، میں جانتا ہوں۔" تیواڑی جی طویل سانس لے کر بولے "میں جو اَب تک اس بارے میں گفتگو کرنے سے کتراتا رہا ہوں اللہ دتا تو اس کی کوئی وجہ ہے۔ مجھے علم ہے کہ کمار بے ادب اور گستاخ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ذہین ہونے کے باوجود آج تک ترقی نہیں کر سکا۔ کوئی بھی انسپکٹر اسے اپنی ماتحتی میں لینے پر خوشی سے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ بات جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کہی تمھیں بتائے ہی دیتا ہوں۔ اس محکمے میں کم ہی لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ کمار کو یہاں لانے والا میں تھا۔ میں نے ہی تمھاری طرح اس کی بھی تربیت کی۔ مجھے اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور اپنے آگے کسی کو کچھ نہ سمجھنے کی عادت نے اس کی ترقی کا راستہ روک دیا۔ سنو اللہ دتا! وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ میرے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہ میری موسی (خالہ) کا لڑکا ہے۔ جب موسی بھی سورگ باش (اللہ کو پیاری) ہو گئیں اور خاندان میں کوئی نہیں رہا تو میں اُسے کانپور سے یہاں لے آیا۔ موسا جی (خالو جان) کا دیہانت (انتقال) پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس وقت بھی وہ اتنا ہی خود سر تھا جب یہاں آیا تھا مگر میں نے سوچا تھا کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ اس کا مزاج اور عادت بدل جائے گی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی تمھاری طرح بہادر اور ذہین ہے مگر اس کی یہ خوبیاں صرف خرابی کے سبب دب کر رہ گئی ہیں۔ تمھیں یہ باتیں میں ڈی آئی جی کی حیثیت سے نہیں، ذاتی سطح پر بتا رہا ہوں۔ تم ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ یوں سمجھو کہ میں تمھارا استاد ہونے کی حیثیت سے تمھیں یہ حکم دے رہا ہوں کہ اس کی خود سری کو نظر انداز کر دیا کرو۔ وہ محبت کا بھوکا ہے۔ اُسے غصے سے نہیں محبت سے رام کیا جا سکتا ہے۔ بولو بولو اللہ دتا کیا تم میرا حکم مانو گے؟"

کمار کے بارے میں تمام حقیقت جان کر میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ بے چارہ یتیم تھا۔ میں سوچنے لگا کہ خدانخواستہ اس کی جگہ میں ہوتا اور خدانہ کرے میرے اماں ابا، ملکِ عدم سدھار چکے ہوتے تو میرا کیا حال ہوتا! یہ سوچ کر میں نے تیواڑی جی کی بات فوراً مان لی اور انھیں یقین دلایا کہ وہ کمار کی طرف سے قطعی فکر مند نہ ہوں۔ میں اُسے اپنی ماتحتی ہی میں رکھوں گا۔ اب مجھ پر یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ کمار کے اندر اتنی بے غرضی کیوں تھی۔ جس کا خالہ زاد بھائی "ڈی آئی جی" لگا پڑا ہو تو اسے بھلا کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت!

تیواڑی جی مجھے اس دن بہت بدلے بدلے سے لگے۔ آج نہ وہ افسری "جھاڑ" رہے تھے اور نہ ہی ان کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ ان کی آواز میں عجیب سا گداز تھا اور شاید یہی ان کا اصل روپ تھا۔ تیواڑی جی نے میری بات سن کر صرف اتنا کہا، انھیں مجھ سے یہی امید تھی مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ میرے ممنون ہیں۔

میں جب تیواڑی جی کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا تو پانچ بج رہے تھے اگر یا دفتر کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے پوری سبھا جمی ہوئی نظر آئی۔ وہاں شیکھر، وسیم، دلدار علی، مولا داد، پیارے لال ہنر اور لیوسی سبھی موجود تھے۔ میرے بقیہ ماتحت اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے تھے۔ میں بڑی شان سے چلتا ہوا اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لیوسی بول اٹھی "میں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں اور ان لوگوں کو بھی بتا دیا ہے کہ یہ یہاں سے میک اپ کر کے جائیں۔ گاڑی کا بندوبست بھی ہو گیا ہے جو ڈرائیور سمیت باہر کھڑی ہے۔ وہ ڈرائیور اس وقت تمام افراد کو ان کے گھروں پر چھوڑے گا تاکہ رات کو انھیں ان کے گھروں سے اٹھا سکے۔ ڈرائیور محکمے کا ہی آدمی ہے اور قابلِ اعتبار ہے، ہاں گاڑی محکمے کی نہیں ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تمام افراد کو رات کس وقت وہ گاڑی تمھارے گھر پہنچے؟"

مجھے لیوسی کی بے تکلفی کھلی تو ضرور کہ اس نے مجھے "تم" کہہ کر مخاطب کیا تھا مگر اس وقت میں اس بات کو پی گیا۔ لیوسی نے بہرحال سارا انتظام سنبھال کر مجھے "نچنت" کر دیا تھا، یعنی بے فکرا وہاں ایک سے ایک "کائیاں بالک" یعنی جھاڑ کا پچھیڑا بیٹھا تھا اس لیے میں ذرا سنبھل کر رعب دار آواز میں بولا "رات کو بارہ بجے تک گاڑی میرے گھر پہنچ جانا چاہیے، تمام افراد کو لے کر!" میرا لہجہ تحکمیہ سا تھا غالباً اسی لیے لیوسی کا کچھ منہ بن گیا مگر میں نے جلدی سے اپنی جان چھڑانے کی خاطر کہا "اب تمام لوگ میک اپ کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں! بقیہ احکام میں بر وقت دوں گا!"

"میں بھی جاؤں؟" لیوسی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ناگواری کا عنصر تھا۔

"ہاں تم بھی انھی لوگوں کے ساتھ نکل جاؤ۔" میں نے اس کی طرف سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر باری باری کمرے سے نکل گئے۔ انھی میں لیوسی بھی تھی۔ دراصل ان تمام خبیثوں کو ایک جگہ جمع دیکھ کر ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ جلد سے جلد انھیں "چمپت کھلا" دیا جائے تو بہتر ہے ورنہ کوئی بھی "سین پاٹ" ہو سکتا ہے۔ اب وہ سب "شل" گئے تھے تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"آپریشن" کے لیے ضروری تھا کہ میری صورت بھی نہ پہچانی جائے ورنہ "مریض" بدک سکتا تھا اور اس کے امکانات بھی تھے کہ وہ آپریشن ٹیبل ہی سے اٹھ کر بھاگ لے یا ڈاکٹر ہی کو لیس کرا دے۔ فی الحال وہ سب کیوں کہ میک اپ کرنے ہی گئے تھے اس لیے میں کمرے ہی میں رک گیا تھا تاکہ وہ اپنی صورتیں بنا یا بگاڑ کر وہاں سے چلے جائیں تو میں جا کر اپنے چہرے کی مرمت کر لوں۔

کوئی آدھے پون گھنٹے وقت گزار کر میں اپنے کمرے سے اس "نتیجہ" پر نکلا کہ اب میک اپ روم خالی ہی پڑا ہو گا اور وہ سب جا چکے ہوں گے۔

میں میک اپ روم میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ایک چھیل چھبیلی البڑ نار، سر پر چُنریا ڈالے اور چہرے پر ایک آوارہ لٹ جھلاتی ہوئی باہر نکلی۔ اس نے میری طرف ایک نگاہِ غلط انداز سے مڑ کر دیکھا اور میرے دل پر جیسے "چکو" چل گئے۔ اس نے اپنی ناک کے ایک نتھنے میں چھوٹی سی نتھنی بھی پہنی ہوئی تھی، ماتھے پر بندیا تھی۔ اگر میں نے اپنے ہونے والے بچوں کی ماں، یعنی مہرن کو پہلے ہی نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس پر ہزار جان کی بجائے لاکھ جان سے عاشق ہو جاتا۔ اس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات تو تھی کہ وہ جو کوئی بھی ہے، اس کا تعلق خفیہ ہی سے ہے اور یہ بھی کہ اس نے میک اپ کیا ہوا ہے مگر یوں بھی تو ہوتا ہے، آدمی کبھی کبھی حقیقتوں کو جان بوجھ کر بھول جانا چاہتا ہے اور خود کو دھوکا دینے میں بھی اسے مزہ آتا ہے۔ تقریباً یہی کیفیت اس وقت میری تھی۔ جس نے بھی میک اپ ایجاد کیا تھا، وہ یقیناً بہت عظیم آدمی رہا ہو گا۔

وہ البڑ نار کمرے کے دروازے سے نکل گئی تو میں سمجھا چلی گئی ہو گی لیکن جب میں اپنے چہرے کی مرمت کرنے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو دروازے کے قریب ہی مجھے وہ کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔ اس کا عکس میں نے آئینے میں دیکھا۔ وہ دوبارہ کمرے میں آ گئی تھی۔ میں بے اختیار مڑا اور سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں پہچان سکے نا!" وہ یہ کہہ کر بڑے قاتل انداز میں مسکرائی اور میں اس کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ وہ لیوسی تھی۔

"جی نہیں!" میں اپنے خوابوں کے شیش محل چکنا چور ہو جانے پر چیخ اٹھا۔ "اس خوش فہمی میں نہ رہو۔ میں نے تمھیں ایک نظر دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ اس حسین چہرے کے پیچھے تمھارا "تھوبڑا" چھپا ہوا ہے۔"

لفظِ "تھوبڑا" سن کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ کسی قدر خفگی سے بولی۔ "تو تم مجھے بدصورت سمجھتے ہو!"

"خیر بدصورت نہیں تو معاف کرنا، خوب صورت بھی نہیں سمجھتا۔" میں نے بھی ناگواری سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اداس سے لہجے میں بولی اور سر جھکا لیا۔

"تم ابھی تک یہاں کیسے موجود ہو؟ تم ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟" میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"اس ڈرائیور نے میرا گھر دیکھا ہے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا، پھر بولی۔ "ویسے وہ لوگ ابھی کچھ دیر پہلے گئے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ آخر میں میک اپ کروں گی۔"

"اور اس لیے بھی کہ مجھے اپنی چھب دکھا سکو۔ ہے نا!" میں نے ہاتھ نچا کر کہا۔

یہ جملہ سنتے ہی وہ غصے سے اکڑ گئی۔ "تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو!"

"اے ڈی ہیر سینیئر انسپکٹر محکمۂ خفیہ!"

"ہاں تم اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں! مطلبی، خود غرض، بہروپیے کہیں کے!" یہ کہہ کر وہ پیر پٹختی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

"ارے ارے کیا ہوا؟ کیا ہو گیا تمھیں! آج تو اتنی گرمی بھی نہیں پڑ رہی۔" میں نے ہانک لگائی مگر وہ تیر کی طرح دروازے سے نکل گئی۔

لیوسی مجھے خاصا بور کر گئی تھی اس لیے میں نے "جھٹا جھٹ" میک اپ کر لیا اور زیادہ "کلی پھندے بازی" نہیں کی۔ میک اپ کرنے کے بعد میں ایک پڑھا لکھا مغرب زدہ نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ ہاں اس زمانے میں "پینٹ وینٹ" کا زیادہ استعمال مغرب زدگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

میں میک اَپ روم سے نکل کر رکشے میں بیٹھنے کے بعد جب گھر کی طرف جا رہا تھا تو چھ بج رہے تھے۔ پھٹ پھٹ میں نے دفتر ہی میں چھوڑ دی تھی۔

میں ابھی گھر میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ میری سماعت سے کچھ اجنبی سی آوازیں ٹکرائیں۔ یہ کسی لڑکی کی آوازیں تھیں۔ "یہ الف ہے، یہ بے ہے، یہ تے ہے۔ یہ الف ہے، یہ بے ہے، یہ تے ہے۔" وہ مسلسل انھی الفاظ کا رٹا لگائے جا رہی تھی۔

میں آنگن میں پہنچا تو ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی کو باورچی خانے کے قریب چٹائی بچھائے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے سامنے قاعدہ رکھا تھا اور وہ زور زور سے ہلے جا رہی تھی۔ اماں باورچی خانے میں تھیں۔ میں اس لڑکی کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ عالمگیر کی بہن تھی۔ وہ جھوم جھوم کر "رٹا" لگانے میں اتنی مست تھی کہ اس نے میری موجودگی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اسی وقت امی، باورچی خانے سے نکل آئیں اور حسبِ توقع ایک دم "ہکا بکا" سی رہ گئیں، مجھے دیکھ کر!

"گھبرائیں نہیں یہ میں ہوں، آپ کا بیٹا!" میں نے جلدی سے کہا تاکہ وہ مجھے اجنبی جان کر باورچی خانے سے چمٹا نہ اٹھا لائیں اور میری کُٹائی شروع نہ کر دیں۔

"تُو روز روز نئی نئی شکلیں بدل کر گھر آنے سے باز نہیں آئے گا!" وہ قریب آکر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں اور میں نے سر جھکا دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان سے پٹنے میں ایک الگ ہی لطف تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا مگر انھوں نے میری سعادت مندی دیکھ کر مجھے معاف کر دیا۔

میرے استفسار پر امی نے مجھے عالمگیر کی بہن کے بارے میں بتایا کہ وہ کیوں نظر آ رہی تھی۔ دراصل جس روز امی اس کے گھر گئی ہوئی تھیں، اس کی ماں نے امی کی مفت خدمات حاصل کر لی تھیں کہ وہ اسے قاعدہ تو کم از کم پڑھا ہی دیں اور امی نے حامی بھر لی تھی۔ یہ اس کی پڑھائی کا پہلا دن تھا۔

نام تو اس کا حسن آرا تھا مگر سب اسے "سوکھی سوکھی" کہتے تھے حالانکہ وہ خاصی گول مٹول تھی۔ ممکن ہے وہ بچپن میں سوکھی رہی ہو اور اسی وجہ سے اس کا یہ لقب پڑ گیا ہو۔ میں بھی اسے "سوکھی" ہی کہتا تھا اور وہ اس پر قطعی برا نہیں مانتی تھی۔ وہ بلا کی باتونی تھی مگر پڑھنے میں صفر! پندرہ سولہ سال کی ہونے کے باوجود وہ ابھی "الف بے" سے آگے نہیں بڑھی تھی۔

مجھے اس رات "آپریشن" کرنا تھا اس لیے آرام ضروری سمجھا کیا خبر رات کو کتنی دیر جاگنا پڑے! ابھی کھانا نہیں پکا تھا اس لیے میں کمر سیدھی کرنے کمرے میں گھس گیا جہاں پہلے ہی میرے چھوٹے بھائی بہن گھسے ہوئے تھے۔ وہ سب کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے انھیں کمرے سے "ٹہلایا" اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹا ہو گیا ابھی میں بستر پر لیٹا ہی تھا کہ امی کی آواز سنائی دی "ارے سوکھی! منہ سے کچھ کہہ رہی ہے اور انگلی کہیں ہے۔ یہ دیکھ یہ الف ہے، یہ بے ہے، یہ تے ہے۔" پھر وہ اسے زیر زبر کی بھی پہچان کرانے لگیں اور کچھ دیر بعد غالباً پھر باورچی خانے میں گھس گئیں کیوں کہ اب صرف "سوکھی" کی آواز آ رہی تھی، امی کی نہیں۔

"اوپر زبر نیچے زیر، گول گول پیش۔" پیش کو وہ ذرا کھینچ کر کہتی تھی جیسے درمیان میں "لما" مار رہی ہو۔ "جذم گنڈلی مدلبا! گول گول پیش، جذم گنڈلی مدلبا!"

"جذم گنڈلی مدلبا" کی گردان نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ میں سکون کی خاطر کمرے میں آکر لیٹا تھا مگر سوکھی بدبخت نے مجھے بے سکون کر دیا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ میں کمرے سے نکل کر چیخا۔ "ارے سوکھی چپ ہو جا! خدا کے لیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"کیا ہوا بھجان!" وہ حیرت سے اپنے دیدے نچاتے ہوئے بولی۔

"تیرا سر!" میں نے جل کر کہا۔ میں اس کے "بھجان" کہنے سے اور بھی چڑ جاتا تھا۔ وہ "بھائی جان" کو اس طرح ملا کر ادا کرتی تھی کہ وہ "بھجان" ہو جاتا تھا۔

"ارے کیا ہوا اللہ دتا!" امی نے باورچی خانے سے ہانک لگائی۔

"میں ابھی آئی دل گھبار کے! پڑھنے دے نا لونڈیا کو!"

المختصر یہ کہ اس دن میں نے امی سے کہہ کر سوکھی کی جلدی چھٹی کرا دی اور سوکھی کھل اٹھی۔ اسے تو یوں بھی پڑھنے سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ وہ جھٹ قاعدہ بغل میں دبا، برقع اوڑھ، یہ جا، وہ جا!

رات کے لیے میں نے امی کو پہلے ہی سانٹ لیا تھا کہ میرے باہر جاتے ہی وہ اندر سے کنڈی لگا لیں۔

اس رات کاٹے وقت نہیں کٹ رہا تھا، آدھی رات ہی ہو کر نہیں دے رہی تھی میرے سنئے اور پرانے "ماتحتان" مجھے رات کو بارہ بجے لینے آنے والے تھے۔ ویسے اگر کوئی میرے چہرے پر منڈھی ہوئی جھلی اتار کر دیکھتا تو ابھی سے اسے میری صورت پر بارہ بجے ہوئے نظر آ جاتے۔ بہرحال یہ مسئلہ کوئی "انڈین" تو تھا نہیں کہ مجھ پر بُول نہ چڑھتا۔ سرکاری طور پر یہ پہلا "آپریشن" تھا جس کی تمام تر ذمے داری میرے نازک شانوں پر ڈال دی گئی تھی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو گھڑی کی سوئیاں پکڑ کر لٹک جاتا اور رات کے بارہ ہی نہ بجنے دیتا مگر میں ایک گھڑی کو روکتا تو کم بخت دوسری گھڑی بارہ بجا دیتی اس لیے یہ کوشش عبث ہی تھی۔

رات کے سناٹے میں مجھے موٹر کی "پوں پوں" صور اسرافیل سے کم محسوس نہیں ہوئی تھی، گویا بارہ بج گئے تھے۔ میں لپک کر بستر سے اٹھا، جوتے پاؤں میں ڈالے اور امی کو آواز دی۔ امی غالباً جاگ ہی رہی تھیں اس لیے ایک ہی آواز میں اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ حسب عادت چلتے وقت میرا جی چاہا کہ امی سے لپٹ کر "بھونکڑا" مار لوں مگر اسی وقت ایک بار پھر "پم پم" اور "پوں پوں" سنائی دی۔ میں "بھونکڑا" مارنے کا ارادہ موقوف کر کے دروازے کی طرف لپک لیا۔

"جلدی آیو!" امی نے کنڈی لگانے سے پہلے ہدایت کی اور میں دروازے سے نکل کر گردن ہلاتا ہوا سامنے ہی کھڑی ہوئی موٹر کی طرف بڑھا۔

لیوسی نے عقل مندی سے کام لے کر ذرا بڑی موٹر کا بندوبست کیا تھا۔ وسیم، شیکھر، دلاور خان، مولاداد اور پیارے لال ہنر، پانچ عدد افراد نہ جانے کیسے "گھسٹر مسٹر" کر کے پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور لیوسی ڈرائیور کے برابر براجمان تھی۔ مجھے لیوسی کے برابر ہی بیٹھنا پڑا۔ اس بات کا اندازہ مجھے موٹر چلنے کے بعد ہوا کہ پچھلی سیٹ پر وہ پانچوں بس "ٹھنس ٹھنسا" کر ہی کسی طرح بیٹھ گئے تھے۔

ادھر موٹر چلی، ادھر پیارے لال ہنر کی "گترد" چلی۔ "اے قبلہ حضرا گستاخی معاف! آپ کی بائیں کہنی میری دائیں پسلیوں کے ساتھ نازیبا حرکت فرما رہی ہے، اسے آپ اپنے ہی پاس رکھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔"

"تا... تا... میرے... لو... لو... لولو!" یہ انسپکٹر مولاداد کی آواز تھی۔ وہ پیارے لال ہنر کے قریب بیٹھا تھا۔

اس سے پہلے کہ پیارے لال ہنر مزید کچھ کہتا، انسپکٹر دلاور خاں کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ "اے پیارے لال! مجھے کیوں دبائے دے رہے ہو تم!"

"اجی حضور کہاں! خادم تو خود گویا کوزے میں بند ہے۔" پیارے لال نے صفائی پیش کی۔

ان تینوں میں باری باری مکالموں کا تبادلہ ہو رہا تھا مگر میں نے بیچ میں بولنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ وسیم اور "پاکٹ سائز" یعنی شیکھر نے اس معرکہ آرائی میں حصہ نہیں لیا۔ لیوسی نے پہلے ہی سے اگلی نشست پر بیٹھ کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ یوں بھی شاید ان لوگوں نے اسے صنف نازک جان کر آگے بیٹھنے کا موقع دے دیا ہوگا۔ جب سے موٹر چلی تھی، لیوسی کچھ نہیں بولی تھی۔ وہ سمٹی سمٹائی سی خاموش بیٹھی تھی جیسے مجھ سے خفا ہو۔ کچھ دیر بعد پچھلی نشست سے آنے والی "آہ و بکا" تھمی تو میں نے لیوسی کے موڈ کا اندازہ لگانے کی خاطر اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔ "لیوسی! تمھیں قبض کی شکایت تو نہیں؟"

"کیا مطلب؟" وہ اس طرح "چمک" کر بولی جیسے میں نے اس سے قبض کی بجائے اصل عمر پوچھ لی ہو۔

مجھے اس عمر میں یہ علم نہیں تھا کہ کسی عورت سے اس طرح کے نجی سوال نہیں کیا کرتے۔ مجھے صرف اتنا اندازہ ہو سکا کہ لیوسی میرے سوال پر برہم سی ہو گئی ہے۔ میں نے اسی لیے بات بنانے کی خاطر مزید کہا۔ "دراصل تمھارے چہرے پر قبض کی سی کیفیت تھی، ممکن ہے یہ یک آپ کا قصور ہو۔"

اسی وقت پچھلی سیٹ سے "کُر کُر" کی آواز بلند ہوئی۔ میں سمجھ نہ سکا کہ ان پانچوں میں سے کون ہنسا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں "انکوائری" کرتا اور "مجرم" کو کیفر کردار تک پہنچاتا، پاکٹ سائز کی آواز گونجی۔ "دوسرا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی کا مذاق اڑائے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔"

"تم کوئی چودھری ہو؟" میں پیچھے مڑ کر بھڑکا۔

"معاف کیجیے، میں آپ سے مخاطب نہیں تھا۔ میں انسپکٹر وسیم صاحب سے بات کر رہا ہوں۔" شیکھر نے جواب دیا۔

"جی ہاں! شیکھر نے مجھ سے یہ بات کی تھی۔" انسپکٹر وسیم نے فوراً تائید کی، پھر بولا۔ "ویسے اس نے جو کچھ کہا ہے، غلط نہیں ہے۔"

"یعنی کہ تم بھی اس کی چونچ میں چونچ ملا رہے ہو!" میں نے اسے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ "میں جس سے جو بھی کہوں، تم لوگ کون ہوتے ہو؟ قاضی کُتلا!"

"لیکن آپ کو کسی کی ذات کو تمسخر کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ بہرحال بُری بات ہے۔" انسپکٹر وسیم اپنی بات پر اڑا رہا۔

"پھر وہی مرغے کی ڈیڑھ ٹانگ! ارے تم سے کہہ دیا نا میں نے، اپنی چونچیں بند رکھو! تمھیں معلوم نہیں کہ اس وقت میں تم سب کا افسر اعلیٰ ہوں اور تم سب میرے ماتحت! اس وقت میری ہر بات سرکاری ہے اور کسی کو حق نہیں کہ سرکاری کام میں روڑا اٹکائے۔" میں پُرزور لہجے میں بولا۔

"آپ چھوڑیں نا سر! کیوں خواہ مخواہ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں!" شیکھر کی منحوس آواز میری سماعت میں زہر گھول گئی۔

شیکھر کے جملے نے مجھے "آؤٹ آف کھوپڑی" کر دیا۔ اس نابنجار نے مجھے بھینس کہا تھا، وہ بھی میرے منہ پر! بس پھر کیا تھا، میں اپنے گلے کی پوری نسیں پھلا کر دہاڑا۔ "بھینس تم خود بلکہ تمھارے سب ہوتے سوتے! بھینسا، بجار، سانڈ وغیرہ۔" مجھے غصے میں کوئی اور جانور یاد نہ آ سکا تو آخر میں "وغیرہ" کہہ کر اپنی بھڑاس نکال لی۔

اس موقع پر انسپکٹر دلاور خاں نے اپنی زندگی کا مدعا چن لیا اور گویا بیچ بچاؤ کرانے کی خاطر "میدان کارزار" میں چھلانگ لگا دی۔ "بھئی جب ابھی سے تم لوگوں کا یہ حال ہے تو عین موقع پر کس طرح اتحاد و تنظیم کا ثبوت دے سکو گے! بس بات کہہ دو تو پرائی ہوتی ہے مگر کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ تجربہ پھر تجربہ ہوتا ہے! اگر اس وقت اختیارات میرے ہاتھ میں ہوتے تو کبھی یہ بدمزگی نہ ہو پاتی۔ پھر بھی میں تم لوگوں کو بزرگ ہونے کی حیثیت سے یہ مشورہ دوں گا کہ آپس میں الجھنے سے گریز کرو۔"

"آپ بھی اس وقت میری ماتحتی میں ہیں، سمجھے خاں صاحب! زیادہ بزرگ وزرگ بننے کی ضرورت نہیں!" میں دلاور خاں کی بات سن کر تپ گیا۔ وہ موقع دیکھ کر خواہ مخواہ "چوہدری" جا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے برخوردار!" وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "زمانہ ہی ایسا آ لگا ہے، اس میں تمھارا بھی کیا قصور!"

میں دلاور خاں کی "بولتی" بند کر کے ایک بار پھر شیکھر پر چڑھ دوڑا۔ "ہاں بھئی اب بولو، کیا کہا تھا تم نے؟ میں بھینس ہوں؟"

اس سے پہلے کہ شیکھر کوئی جواب دیتا، لیوسی منمنائی۔ "اب چھوڑ دو بھی نا، بات ختم کرو۔"

"کیوں چھوڑ دوں؟ واہ یہ بھی خوب رہی! شیکھر کو جواب دینا پڑے گا میری بات کا، ہاں!" میں اڑ گیا۔

"آخر اس سے تمہیں حاصل کیا ہوگا!" لیوسی میری طرف دیکھتی ہوئی بولی "رہو! تم نے بھی تو اسے بہت کچھ کہہ لیا ہے!"

"تم پارٹ لے رہی ہو اس کا! میں سب سمجھتا ہوں۔ یا تو ان دونوں سے کہو فی الفور معافی مانگیں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" شیکھر خاموش نہ رہ سکا۔

"ورنہ۔۔۔ ورنہ بہت کچھ ہوگا ہاں!" میں نے غصّے میں کہا کیوں کہ "ورنہ" سے آگے ابھی کچھ سوچ ہی نہیں پایا تھا۔ موٹر اس وقت نئی دہلی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی، یہ محسوس کرتے ہی مجھے "ورنہ" سے آگے والی بات سوجھ گئی اور جھٹ سے بولا "ورنہ یہ ہوگا کہ میں تمہیں اور تمہارے دسر کو یہیں اتار دوں گا۔ بہتر یہی ہے، معافی مانگ لو۔"

"میں ہرگز معافی نہیں مانگوں گا!" شیکھر دو ٹوک لہجے میں بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا، پھر سیدھا راست ڈرائیور سے مخاطب ہوا "موٹر روکو، یہ سرکاری حکم ہے۔"

"سنو تو سہی اللہ دتا! ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔" دلاور خاں نے مجھے پھر سمجھانا چاہا۔

"پہلی بات تو آپ یہ سن لیں خاں صاحب کہ میں اللہ دتا نہیں، اے ڈی مہر ہوں، دوسری بات یہ کہ آپ اس معاملے میں اپنا پیر نہ گھسیڑیں تو بہتر ہے۔" میں نے سختی سے کہا "مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں!"

اس دوران میں موٹر رک چکی تھی۔

"اتر جاؤ، تم دونوں موٹر سے!" میں گلا پھاڑ کر چیخا "یہ میرا حکم ہے۔ سینیئر انسپکٹر اے ڈی مہر کا حکم!"

موٹر سے نیچے اترنے میں پہل انسپکٹر وسیم نے کی، پھر اسی نے شیکھر کو اتر آنے کا اشارہ کیا ورنہ وہ بدبخت شاید میری "سازش" سمجھ گیا تھا اسی لیے موٹر سے نہیں اتر رہا تھا۔ اگر اس وقت انسپکٹر وسیم بھی ساتھ نہ ہوتا تو غالباً وہ "پاکٹ سائز" میرے انتقام کا نشانہ بننے پر آمادہ نہ ہوتا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا آخر کار موٹر سے اتر ہی گیا۔

ادھر وہ دونوں موٹر سے اترے، ادھر انسپکٹر مولا داد نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر میرے "سرکاری حکم" پر موٹر حرکت میں آ گئی۔ موٹر چلتے ہی میں نے لیوسی سے کہا "اب یہاں سے پیدل اپنے اپنے گھر جائیں گے تو معلوم ہوگا، افسروں کے منہ آنے کا کیا انجام ہوتا ہے!"

"چلو ایک طرح سے اچھا بھی ہوا، کم از کم کھل کر بیٹھنے کی جگہ تو ہو گئی۔" دلاور خاں، لیوسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی چہک اٹھے۔ ان کے لہجے سے کسی قدر خوشی کا اظہار ہو رہا تھا "ویسے یہ حقیقت ہے کہ پولیٹیکل والے نہ جانے کیوں خود کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں۔" دلاور خاں نے مجھے "پرچانے" کے لیے آخر میں داؤ مارا۔ وہ "شعبہ جاتی عصبیت" پھیلا کر میری ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میں دلاور خاں کے "رَتبے" میں آ گیا۔ بہرحال وہ گھاگ آدمی تھے۔ میں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ لیوسی خاموش ہی رہی۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں کھو گئی تھی۔

پھر "موقع واردات" سے کچھ دور پہنچنے تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے اپنے رقیبوں میں سے دو تو "نمٹا" دیے تھے یعنی ان سے انتقام لے لیا تھا مگر ابھی مزید تین باقی تھے۔ انھیں بھی میں جوڑے میں مروانے کی سوچ رہا تھا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میں لیوسی نے ڈرائیور سے موٹر روک دینے کے لیے کہا تھا۔ لیوسی کی آواز نے مجھے سوچ کی دنیا سے باہر کھینچ لیا تھا۔

"یہ یہاں۔۔۔ یہاں کیوں رکوا دی موٹر تم نے؟ ابھی تو شاید دور ہے سیٹھ کی کوٹھی۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"یہی مناسب ہے۔ ہم گاڑی یہیں چھوڑ جائیں گے اور یہاں سے پیدل چلیں گے۔" لیوسی نے سنجیدگی سے جواب دیا، پھر آہستہ سے بولی "ویسے اتنی سی بات تم خود بھی سمجھتے ہو، زیادہ بنو مت!"

"لو اور سنو، میں کیوں بننے لگا، بنو تم! میں تو پہلے ہی بنا بنایا ہوں۔" میں جھینپا یا اور موٹر کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر میں نے افسری چھانٹی "بقیہ افراد بھی باہر آ جائیں!"

سب موٹر سے اتر گئے تو لیوسی نے ڈرائیور کو وہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "میرا خیال ہے کہ ہم میں سے چار افراد کو چاروں سمتوں سے کوٹھی میں داخل ہونا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں!" میں گھبرا کر جلدی سے بولا "تم میرے ساتھ رہو گی، ویسے بھی ہماری تعداد پانچ ہے۔"

"میں اس لیے کہہ رہی تھی کہ اگر ہم ایک ساتھ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو اچھا نہیں ہوگا۔ رہا یہ کہ تم اپنے ساتھ ہم میں سے کسے رکھو گے، یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔"

"کہہ تو دیا نا کہ تم رہو گی میرے ساتھ! اور کیا لکھ کر دوں!" میں چڑ کر بولا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" لیوسی بولی "ہم کوٹھی کے قریب پہنچ کر الگ الگ ہو جائیں گے۔" پھر وہ بقیہ افراد سے مخاطب ہوئی "ہم سب کو یہیں ملنا ہے، اسی کار کے پاس!"

"اور وہاں کوٹھی میں گھس کر کرنا کیا ہے؟" دلاور خاں نے سوال کیا۔

"کوٹھی میں ایک تہ خانہ ہے، ہمیں اس کا راستہ تلاش کرنا ہے۔"

میں نے دلاور خاں کے سوال کا جواب دیا۔

"اپنے اپنے طور پر؟" دلاور خاں نے پھر سوال جڑ دیا۔

"بالکل!" میں قطعی لہجے میں بولا۔

"مگر میں نے تو وہ کوٹھی اندر سے دیکھی ہی نہیں، پھر کس طرح۔۔۔ یعنی کہ سمجھ میں نہیں آئی بات!"

تم چلو تو سہی بیٹا خاں، سب کچھ سمجھ میں آ جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا اور بولا "اگر پہلے نہیں دیکھی تو اب دیکھ لیجیے گا، اس میں کون سی ایسی بات ہے!"

دلاور خاں بڑبڑا کر رہ گئے۔ انسپکٹر مولا داد نے بھی اس موقع پر ہکلانا چاہا اور پیارے لال ہنر کی زبان میں بھی کھجلی اٹھی مگر میں نے ان دونوں ہی کو ایک زوردار "چپ" سے خاموش کر دیا۔

پھر پانچ عدد افراد کا وہ قافلہ روانہ ہو گیا جس کا "امیر قافلہ" میں تھا۔ ہم سڑک سے اتر کر "جھاڑ جھنکاڑ" اور ناہموار راستے پر آگے بڑھتے رہے۔ ایسے مواقع پر عموماً کاٹیاں قسم کے مصنفین "چندا ماما" کو ضرور زحمت دیتے ہیں تاکہ ان کا ہیرو ارد گرد کے ماحول کی تفصیل بیان کر سکے اور اسے کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے مگر میں کیوں کہ کسی کہانی کا ہیرو نہیں، سچ مچ کا ہیرو تھا اس لیے نہ تو "چندا ماما" نے میری مدد کی اور نہ میں اتنا زبردست قسم کا ہیرو تھا کہ انھیں طلوع ہونے پر مجبور کر دیتا۔ نتیجتاً بس کہیں کہیں تاریکی میں شگاف پڑا ہوا تھا ورنہ وہاں ہر طرف ایک سماں تھا۔ تاریکی میں شگاف ڈالنے والے وہ اکادکا بلب تھے جو کسی کوٹھی کی کمپاؤنڈ میں تو جل رہے تھے، کسی میں نہیں۔ کیوں کہ کوٹھیاں دور دور بنی ہوئی تھیں اس لیے یہ مدھم سی روشنیاں بھی کافی فاصلے سے بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے کچھ تو اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ گھبراہٹ میں لیوسی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پکڑانے میں کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ بقیہ تینوں افراد ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

میں جس قدر آگے بڑھ رہا تھا، اسی قدر خوف محسوس کر رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا بلکہ لیٹا جا رہا تھا کہ اگر "آپریشن" کے دوران میں "مریض" یا "مریضوں" سے "گشتم گشتا" ہو گئی تو کیا ہوگا؟ پھر معاً مجھے خیال آیا کہ اس اندھیرے میں کہیں لیوسی راہ نہ بھٹک جائے کیوں کہ میں حقیقتاً بس لیوسی کا ساتھ دے رہا تھا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے لیوسی سے کہا "تمہیں معلوم بھی ہے، کدھر ہے کوٹھی؟"

"تم مطمئن رہو، میں ان اطراف کا اچھی طرح جائزہ لے چکی ہوں۔ ہم جس طرف جا رہے ہیں، اس طرف سے کوٹھی کی پشت پر پہنچیں گے۔" لیوسی نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

میں چپ ہو گیا، کہتا بھی کیا، نکیل تو اس وقت لیوسی کے ہاتھ میں تھی۔ کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد وہ رک گئی تو میں بولا "اب کیا ہوا؟"

"جہاں تک میرا خیال ہے، سامنے جو ہیولا نظر آ رہا ہے، وہی سیٹھ عثمان کی کوٹھی ہے۔ یہیں سے ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے۔" لیوسی نے کہا، پھر بولی "مگر ٹھہرو، پہلے اس بات کی تصدیق ضروری ہے کہ ہم صحیح سمت میں آئے ہیں۔ ذرا ہاتھ چھوڑو میرا اور یہیں رکو، میں ابھی آئی۔"

"نہیں میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ!" میں نے اس کا ہاتھ مزید سختی سے پکڑ لیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ مجھے چکر دے کر "پھوٹ لے" رہی تھی۔

"تمہاری حرکتیں بعض اوقات کھل جاتی ہیں۔" لیوسی کے لہجے میں خفیف سی جھنجلاہٹ تھی "چلو، میرا کیا ہے!"

"اور یہ لوگ؟" میں نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی واپسی تک یہیں رہیں گے۔" لیوسی کے لہجے کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

پھر وہ میرا ہاتھ تھامے اندھیرے میں ایک طرف گویا رینگ گئی بلکہ صحیح یہ ہے، میں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے رینگ رہا تھا۔ رفتار کی کمی کا سبب راستے کی ناہمواری تھی۔ کہیں بڑے بڑے پتھر پڑے تھے، کہیں جھاڑیاں تھیں اور کہیں لمبی لمبی گھاس! ان ساری اشیا کا وجود اندھیرے میں محسوس ہی کیا جا سکتا تھا، ان کا دیدار ممکن نہیں تھا۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں، لیوسی کے ساتھ گھسٹتا رہا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اندھیرے کے باوجود لیوسی کو "ٹپائی" کیسے دے رہا تھا۔ غالباً ایک لمبا چکر کاٹ کر لیوسی مجھے لیے ہوئے کوٹھی کے صدر دروازے کی سمت پہنچ گئی۔

اب کوٹھی اتنی قریب نظر آ رہی تھی کہ اس کے نزدیک ہی بنی ہوئی ایک جھونپڑی کا ہیولا بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ کوٹھی کی کمپاؤنڈ میں بیرونی رُخ، کم پاور کا ایک بلب بھی روشن تھا۔ کوٹھی کے قریب بنی ہوئی جھونپڑی وہی تھی جس میں ایک بار پیارے لال ہنر سادھو بن کر رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

"بس بس، میں بھی پہچان گیا، یہی ہے۔" میں نے پُرجوش انداز میں لیوسی کا ہاتھ دبایا "اب واپس چلو۔"

"کیوں نہ ان تینوں کو وہیں کھڑا رہنے دیں اور ہم دونوں ہی اندر چلیں۔" میری سرگوشی کے جواب میں لیوسی نے سرگوشی کی۔

"یہ بھی خوب رہی، وہ بدبخت باہر عیش کرتے رہیں اور ہم موت کے منہ میں کود جائیں! ہرگز نہیں!" میں نے لیوسی کی

تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

"تم جانو۔" لیوسی بولی۔ "میں تو شروع ہی سے ہیرو بھڑتے کے خلاف تھی۔ معلوم نہیں اِس میں تمہاری کیا مصلحت ہے!"

"ہے اِس میں مصلحت!" میں نے زور دے کر کہا۔

پھر واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ کچھ دور چل کر لیوسی بولی۔ "تم اتنی سختی سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہو کہ دُکھنے لگا ہے۔ میں بھاگی نہیں جا رہی، ہاتھ چھوڑ دو۔"

میں اسے اپنی بدبختی ہی کہوں گا کہ لیوسی کا کہا مان لیا۔ ابھی میں نے کچھ فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ ایک پتھر سے زوردار ٹھوکر لگی اور بلبلا کر رہ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی چیخ پر قابو پایا تھا اور پیر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اسی وقت مجھے اپنے قریب ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں اپنے پیر کی تکلیف بھول کر اندھیرے میں اس طرف آنکھیں "گڑو" کر دیکھنے لگا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی جھاڑیوں میں سرسرایا ہو۔ کہیں کوئی سانپ یا ناگن نہ ہو جو مجھے ڈس لے! یہ خیال آتے ہی میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی، پھر میں ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خوف کے سبب میری آواز جیسے حلق میں گُھٹ کر رہ گئی تھی۔ میری راہ میں جو بڑا سا پتھر حائل ہوا تھا، میں ایک ہی جست میں اس پر چڑھ گیا۔ آخر ہوا وہی جس کا مجھے خطرہ تھا۔ لیوسی بدبخت مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جانے اندھیرے میں کدھر چلی گئی تھی۔ میں بار بار اسے پکارنے کی کوشش تو کر رہا تھا مگر نہ جانے حلق میں کیا پھنس گیا تھا کہ آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ معاً پتھر کے بالکل قریب سرسراہٹ ہوئی۔ اس وقت میں لیوسی کے ہولے اندھیرے میں ادھر ادھر "ٹاپنے" کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قدر قریب سرسراہٹ سن کر میری فاختہ اُڑ گئی۔ ہو نہ ہو اب وہ ناگن، پتھر پر چڑھ کر مجھے ڈس لے گی۔ میں نے سوچا اور اسی کے ساتھ مجھے اپنی عقل پر رونا آ گیا کہ اتنی دیر سے مجھے ٹارچ کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ چھوٹی سی ٹارچ میں اپنی پینٹ کی جیب میں احتیاطاً ڈال لایا تھا۔ میری پینٹ کی دوسری جیب میں ریوالور بھی موجود تھا مگر میری حماقت کہ میں نے ریوالور کی بجائے ٹارچ ہی نکالی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں ٹارچ جلا چکا تھا۔ ٹارچ کا رُخ نیچے کی طرف کرتے ہی میں اچھل پڑا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ ناگن کی بجائے مجھے زمین پر سینے کے بل رینگتی ہوئی ایک عدد لونڈیا نظر آئے گی۔ اس کے جسم پر مغربی لباس تھا اور چہرہ بھی دلیسی نہیں تھا۔ ابھی میں کچھ سوچ نہیں پایا تھا کہ آیا، اس "گل بہار" کا انٹرویو لوں یا نہ لوں کہ اس کے جسم کا اگلا حصہ تیزی سے اوپر اٹھا اور پھر اس بدذات نے مجھے بڑی بے دردی کے ساتھ ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لیا۔ اسی کے ساتھ میرے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر دور جا گری تھی اور بجھ گئی تھی۔ مجھے اس سے اتنی "بے تکلفی" کی امید نہیں تھی کہ وہ یوں کھل کھیلے گی، نتیجتاً بے سدھ ہو کر زمین پر گرا۔ اسی وقت میرے حلق میں جو کچھ پھنسا ہوا تھا، وہ شاید نکل گیا۔ میں پوری قوت سے چیخا تھا۔ پھر اپنی چیخ کے جواب میں مجھے کچھ فاصلے سے لیوسی کی آواز سنائی دی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا اللہ دتا؟" لیوسی نے جواباً چیخ کر پوچھا تھا مگر جواب دینے سے پہلے ہی میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی گہرے کنوئیں میں گرتا ہی چلا جا رہا ہوں۔

"شائیں شوں، شائیں شوں، دھائیں دھوں، دھائیں دھوں"

بس انھی آوازوں کی گردان تھی۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوں کہاں! یہ "عالمِ اوپر" ہے کہ "عالمِ نیچے!" کھوپڑی میں "دھائیں دھائیں" ہو رہی تھی جیسے کسی خالی مکان کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے ہوں اور ہوا سیٹیاں بجا رہی ہو۔ کچھ دیر اسی کیفیت میں گزری، پھر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے جسم کو گھسیٹنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جسم کا احساس جاگا تو اسی کے ساتھ میرے مُنہ سے کراہیں ابل پڑیں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ کھوپڑی کے پچھلے حصے سے ٹیسیں اٹھیں اور پھر سارے جسم میں پھیل گئیں۔

"کیا تم ہوش میں آ گئے؟" کوئی رس بھری نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اوں... ہائے... اوئی... ہوں" میرے مُنہ سے نکلا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔ ہر طرف پہلے جیسی ہی تاریکی تھی اور اب "دھائیں دھوں" بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک بار پھر اسی نسوانی آواز نے اپنا سوال دُہرایا اور مجھے میرا نام لے کر بھی پکارا۔

"لیو... لیوسی!" میرے ہونٹوں نے بہ مشکل حرکت کی کیوں کہ گزرے ہوئے واقعات یاد آتے ہی مجھ پر پھر دہشت طاری ہونے لگی تھی۔ اب میں اس نسوانی آواز کو پہچان چکا تھا۔ وہ لیوسی ہی کی آواز تھی مگر وہ لیوسی تھی تو پھر ٹانگ گھسیٹنے والی کیا ہوئی؟ کیا لیوسی نے اس کا "دھڑن تختہ" کر دیا؟ میرے ذہن میں یہ سوال اُبھرے تو مگر زبان سے ادا نہ ہو سکے۔

"کیا تم اٹھ کر چل سکتے ہو؟" لیوسی کی سرگوشی اُبھری۔

"مم... میں... کیوں نہیں!" یہ کہہ کر میں نے اٹھنے

کے لیے زور لگایا۔ میں زمین پر اٹھ کر بیٹھنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر کھوپڑی ناچنے لگی۔ غالباً مجھے جھومتا ہوا دیکھ کر ہی لیوسی نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ بھی میرے قریب اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی۔

"اٹھو! اٹھنے کی کوشش کرو!" اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر زور لگایا۔

اس دھان پان سے وجود میں اتنی جان ہو گی، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ زمین سے اٹھ کر کھڑا ہونے میں مجھ سے زیادہ اسی کا زور لگا تھا۔

"ہمیں یہاں پھر کوئی خطرہ پیش آ سکتا ہے اس لیے یہاں سے جتنی جلدی دور ہو جائیں بہتر ہے۔" لیوسی نے آہستہ سے کہا اور اسی کے ساتھ میرا دایاں ہاتھ اپنے شانے پر رکھ لیا اور بایاں ہاتھ میری کمر میں ڈال کر بولی۔ "میرا سہارا لے کر چلنے کی کوشش کرو۔"

معلوم نہیں عورت کے جسم میں کیا جادو ہوتا ہے کہ مُردوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس وقت میرے ساتھ ہوا۔ لیوسی کے جسمانی لمس نے مجھ میں حرارت سی پیدا کر دی، گویا میں دوبارہ "چارج" ہو گیا۔ پھر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ معاملہ اس قدر سیریس نہیں تھا جتنا میں نے فرض کر لیا تھا۔ اگر میرے جسم میں ٹوٹ پھوٹ ہو گی بھی تو بہت معمولی، اتنی نہیں کہ میں کسی عورت کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاؤں، ہاں کھوپڑی ضرور تھوڑی بہت گھوم رہی تھی تو وہ کچھ دیر میں اپنی گردش ختم کر سکتی تھی۔

"اب میں ٹھیک ہوں، چھوڑ دو مجھے!" میں نے کہا۔ شاید میری غیرت جاگ اٹھی تھی۔

"کیوں، حرج بھی کیا ہے! اسی طرح کچھ دور چلتے رہو نا!" لیوسی کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی، خواب ناک سی آواز!

یوں چلتے رہنے میں تو خیر کوئی مضائقہ نہیں تھا مگر میں ٹھہرا ہیرو! ہیرو تو دوسروں کو سہارا دے کر چلاتا ہے جس طرح میں خود کو ٹلر فوزیا؟ میں لیوسی کو چلا چکا تھا، ہیرو خود کسی کا سہارا نہیں لیتا۔ کسی کا سہارا لے کر چلنا، وہ بھی ایک عورت کا سہارا، سراسر "ہیروشپ" کے خلاف تھا اس لیے میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی۔ میں نے پیش کش ٹھکراتے ہی اس کے شانے سے اپنا دایاں ہاتھ ہٹا لیا تھا مگر اس کا بایاں ہاتھ اب بھی میری "کمریا" تھامے ہوئے تھا۔ لیوسی نے بھی غالباً یہ بات محسوس کر لی تھی کہ میں بغیر اس کا سہارا لیے چلنا چاہتا ہوں۔ یہی سوچ کر اس نے شاید میری "کمریا" بھی چھوڑ دی تھی۔

"اچھا، بیڈا بانہہ تو اپنے ہاتھ میں لے لو" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں ابھی تک خواب ناکی موجود تھی۔

کسی لڑکی کا ہاتھ تھامنا عام حالات میں خاصا "رومانٹک" فعل ہوتا ہے مگر اس وقت حالات معمول پر نہیں تھے اسی لیے لیوسی کا ہاتھ تھامنے کے باوجود میرے جسم میں لہو کی گردش تیز نہیں ہوئی حالانکہ ایسے مواقع پر اگر کسی ہیرو کا لہو گرم نہ ہو تو وہ ہیرو کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوتا۔

اب اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ میں اللہ تبارک تعالیٰ کے فضل سے زندہ سلامت تھا۔ میرے ذہن میں کچھ دیر پہلے جو سوالات اُبھرے تھے، ان کا "ابھار" پھر شروع ہو گیا۔

"وہ بدذات کہاں گئی جس نے مجھے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تھا؟" میں نے لیوسی سے پہلا سوال کیا۔

"کون؟" لیوسی کے لہجے میں حیرت تھی۔ "کیا وہ کوئی لڑکی تھی؟"

"اور کیا تم اسے اپنا خالو سمجھ رہی تھیں!" میں تپ کر بولا۔ دراصل اس وقت میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ لیوسی وہاں سے دور تھی۔ میرے کھول اٹھنے کا سبب یہی تھا۔ میں سمجھا تھا کہ لیوسی جان بوجھ کر "ننھی جان مُنّی جان" بن رہی ہے اور اس کا ارادہ مجھے ستانے کا ہے۔

"تم نے یہ کیا بکواس شروع کر دی!" لیوسی چنچنا کر بولی۔ "اُسے یقیناً اپنے خالو سے محبت رہی ہو گی ورنہ چنچنا نہ اٹھتی۔" "مجھے کیا معلوم کہ کسی نے تمھیں ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لیا تھا اور گھسیٹنے والی کوئی لڑکی تھی!"

اب میں سمجھا کہ لیوسی، اس بدلیسی لڑکی کا دیدار نہیں کر پائی ہو گی اور اسی کے ساتھ مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ جس طرح اس وقت تاریکی ہے، پہلے بھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ لیوسی ہتھے سے یا کسی اور جگہ سے اُکھڑ گئی تو پھر کچھ نہیں بتائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے اُسے "گھاٹ" پر لانے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت سر کے پچھلے حصے میں پھر چمک اٹھی اور میں آہستہ سے کراہ کر رہ گیا۔ میں نے ضروری جانا کہ جہاں چمک اٹھی ہے، وہاں کم از کم ہاتھ پھیر کر تو دیکھ ہی لوں۔ معلوم نہیں، اس نابکار "بدلیسن" نے کس چیز سے میری کھوپڑی بجائی تھی کہ کھوپڑی کے اندر ایک اور کھوپڑی "آگ" آنے کا گمان ہو رہا تھا۔ ہاتھ پھیر کر دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا تھا کہ یہ ٹیسیں وہی "دوسری کھوپڑی" نشر کر رہی تھی۔ میری کراہ غالباً لیوسی کے غصے کی لہر میں دب گئی تھی ورنہ وہ ضرور کراہنے کا سبب پوچھتی۔ ٹیسیں کم ہوئیں تو میں نے لیوسی کو مخاطب کیا۔ "اب ایسی کٹھور بھی نہ بنو کہ "دوبکا" کا بھی کوئی اثر نہ ہوا"

"اپنی طرف نہیں دیکھتے! تم بھی تو بے تکی ہانکنے لگتے ہو" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی، "پھر کہو کیا ہوا؟"

"پہلی بات تو یہ کہ اس اندھیرے میں اپنی طرف دیکھوں گا بھی تو کیا خاک نظر آئے گا! دوسری بات یہ کہ اگر تمھیں بے تکی ہانکنے

پر اعتراض ہے تو اب تک میں ہانکوں گا۔ اب تو خوش ہو ہاسٹل یہ کہ مجھے کیا ہوا تو تمھیں علم ہی ہوگا کہ کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گئی ہے اب ایسا ہے کہ یہ آپریشن، کسی اور دن ہی کریں گے۔ یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے پھوٹ ہی لو تو بہتر ہے۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی! اس طرح کہیں تم مجھے آزما تو نہیں رہے؟" لیوسی بولی۔

"لو اور سنو، مجھے کیا پڑی ہے آزمانے کی! تم بھی پوری چونچ ہوا خواہ مخواہ گلیاں میں گڑ چھوڑنے لگتی ہو۔"

ابھی میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اچانک سناٹے میں ایک بھاری آواز گونجی "خبردار جو بھاگنے کی کوشش کی تم لوگوں نے! گولی ماردوں گا!"

وہ بھاری آواز پہچاننے کے باوجود میں خوف زدہ ہو کر رک گیا۔ مجبوراً لیوسی کو بھی رکنا پڑا تھا۔

"انھیں گھیر لو! یہ دونوں میرے نشانے پر ہیں، پروا نہ کرنا! بچ کر نہ جانے پائیں!" وہی بھاری آواز پھر سنائی دی۔

"لل... لیٹ جاؤ... زمین پر لیٹ جاؤ لیوسی!" میں ہکلا کر بولا اور لیوسی کا ہاتھ کھینچا۔ "خاں صاحب سے کچھ بعید نہیں، وہ جوشِ جذبات میں گولی بھی چلا سکتے ہیں۔"

جواب میں یقیناً لیوسی کچھ کہنا چاہتی ہو گی مگر میں مسلسل اس کا ہاتھ کھینچے چلا جا رہا تھا اس لیے وہ زمین پر لیٹی تو نہیں، بیٹھ ضرور گئی، پھر جھنجھلا کر بولی "میں اسی لیے ان احمقوں کو ساتھ لانے کے خلاف تھی۔"

گولی مار دینے کی دھمکی دینے والے دلاور خاں تھے۔ دراصل اندھیرے اور باتوں میں لیوسی کو خیال نہیں رہا تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں ان تینوں "پیدلوں" یعنی دلاور خاں، مولا داد اور پیارے لال ہنر کو چھوڑا تھا۔

ابھی میں یا لیوسی کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ اس بار بھائی بنکے شاہ بہ آوازِ بلند ہکلائے "خا... خا... خابر... بردار... ہت... ہت... یار... ڈا... ڈال... دو... نہیں... تو... گھیر... لی... لیا... جا... چو... چو... کا..." بھائی بنکے شاہ یعنی انسپکٹر مولا داد کی آواز پشت کی طرف سے آئی تھی۔

پیارے لال ہنر بھی بھلا کیسے پیچھے رہ جاتا، اس نے بھی اپنی گاڑھی اردو گھونٹی "سنو! اے دشمنانِ ملک و ملت! اتقاضائے وقت یہ ہے کہ بہ رضا و رغبت قانون کی بالادستی قبول کر لو، اگر تمھیں اس عالمِ آب و گل کی چند بہاریں اور دیکھنا ہیں ورنہ پھر گلہ نہ کرنا کہ ہم نے تمھارے اجسام میں روزن بنا دیے!"

صاف ظاہر تھا کہ ان تینوں بدبختوں کو اندھیرے میں صرف ہیولے نظر آ رہے ہوں گے۔ وہ بذات مجھے اور لیوسی کو مجرم جان کر اپنی اپنی بولیوں میں "ٹرا" رہے تھے۔ میری کھوپڑی پہلے ہی "پیکنگ" کا شکار تھی، ان نحوسوں کی کریہہ آوازیں سن کر مزید گھوم گئی۔ میں ایک دم زور سے چیخ اٹھا "اپنی اپنی چونچیں بند رکھو اور اپنے ریوالور جیب میں ڈال لو ورنہ تم تینوں کو بھی ان دونوں کی طرح یہاں سے پیدل مارچ کرادوں گا!" میرا اشارہ "پاکٹ بازر" یعنی شیکھر اور انسپکٹر وسیم کی طرف تھا جنھیں میں نے راستے ہی میں موٹر سے اتار دیا تھا۔

پھر باری باری تین حیرت زدہ آوازیں ابھریں، اس کے بعد انھیں سانپ سونگھ گیا۔ میں لیوسی کو لے کر زمین سے اٹھ کھڑا ہوا کیوں کہ اب خطرہ ٹل چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ تینوں قریب آ گئے۔ مجھ سے پہلے لیوسی ان پر گرم ہو گئی لیکن اس کے غصے کا سبب موجودہ حرکت نہیں تھی۔

"تم لوگوں نے فائرنگ کیوں شروع کر دی تھی؟" لیوسی کا لہجہ خشک اور جواب طلب تھا۔

"پہلی بات تو یہ سن لو لڑکی کہ میں تمھاری ماتحتی میں نہیں ہوں، لہجہ درست کرو! تمھارا میرا ایک عہدہ ہے اس لیے تمھیں مجھ سے جواب طلب کرنے کا کوئی حق نہیں!" دلاور خاں، لیوسی کے سوال کا جواب دینے کی بجائے "ہمک" اٹھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر مولا داد نے بھی ہکلا کر دلاور خاں کی تائید کی البتہ پیارے لال ہنر خاموش ہی رہا۔ وہ بے چارہ بہر حال انسپکٹر نہیں، اب انسپکٹر تھا۔

جب مجھے ہوش آ رہا تھا تو میں نے بھی فائرنگ کی آواز سنی تھی، اب لیوسی کی بات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ "کارنامہ" انھی تینوں کا تھا۔ انھوں نے ضرور کوئی نہ کوئی حماقت کی ہو گی جبھی تو لیوسی ان سے جواب طلب کر رہی تھی۔ میں نے سوچا، پھر بول اٹھا "خاں صاحب! لیوسی نے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب دیں!" میرے لہجے میں سختی تھی "مجھے تسلیم ہے کہ لیوسی آپ کی افسر نہیں لیکن اس وقت آپ میری ماتحتی میں تو ہیں! لیوسی کے سوال کو میرا سوال سمجھ کر جواب دیں!"

"تو اس کا مطلب میں یہی سمجھتا ہوں کہ تم اس لڑکی کو مجھ پر فضیلت دے رہے ہو! تمھیں یہ خیال تک نہیں کہ کل تک تم میری ماتحتی میں رہ چکے ہو!" دلاور خاں کا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

"لُٹ گئیں وہ چھول نشیاں! بھول جائیں اب اس زمانے کو خاں صاحب!" میں نے ہاتھ نچا کر کہا "اب زمانہ پلٹ چکا ہے۔ جب میں آپ کی ماتحتی میں تھا تو آپ کو سر کہتا تھا اس لیے لازم

ہے آپ بھی مجھے سر کہا کریں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں!" دلاور خاں کی "خاں صاحبی" جاگ اٹھی۔

"تو پھر دفع ہو جائیں یہاں سے! اسی وقت اپنی صورت دفع کر جائیں!" میں بھی غصے میں آ گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ ماتحت ہونے کے باوجود "بنکے" ہی چلے جا رہے تھے۔

"کیا... کیا کہا... دفع!... مجھ سے تم نے اس... اس لہجے میں...!" دلاور خاں کی آواز بھرا گئی، پھر وہ تیز لہجے میں بولے۔ "ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں، جا رہا ہوں۔ چاہے مجھے نوکری سے استعفیٰ ہی کیوں نہ دینا پڑے مگر... مگر میں یہ... یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔" یہ کہتے ہی دلاور خاں رو میں آ کر ایک طرف بڑھ گئے۔

"ٹھا... ٹھا... ٹھے... ٹھیریں تو... خاں... خاں صا... صاب... مم... میں بھی... چا... چا چل... چلتا ہوں۔" انسپکٹر مولا داد، دلاور خاں کے ہیولے کی طرف لپکا۔

"تم بھی دفع ہو جاؤ!" میں گلا پھاڑ کر چیخا، پھر مجھے پیارے لال ہنر کا خیال آیا جو وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ میں اس پر گرجا "تم کھڑے ہوئے کیا منہ دیکھ رہے ہو، تم بھی جاؤ! میں اکیلا ہی آپریشن کر سکتا ہوں!"

"یوں تو قبلۂ محترم! حکمِ حاکم مرگِ مفاجات! لیکن یہ بندۂ حقیر پا پیادہ رہِ ناآشنا کے نشیب و فراز سے کیوں کر گزر سکے گا؟ حضورِ والا تبار اپنے اشہبِ فکر کو ذرا مہمیز تو دیں!"

میں تو غصے میں بھرا ہوا تھا ہی، پیارے لال ہنر کی جناتی زبان نے اور جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں پھنکارا "تمھاری سزا بھی یہی ہے! اور بولو گاڑھی اردو! تمھیں بھی اپنے 'موتوں سوتوں' کی قسم ہے جو کبھی شرافت سے بات کرو! مزید بکبک، مکالمے بغیر فوراً دفع ہو جاؤ ورنہ سرکاری حکم نہ ماننے پر تمھارا تحریری جواب بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔"

میرے لہجے کے تیور دیکھ کر پیارے لال ہنر نے خاموشی سے کھسک لینے ہی میں خیریت جانی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا جدھر مولا داد اور دلاور خاں گئے تھے۔

"اچھا تو اب میں سمجھی کہ تم ان سب لوگوں کو کیوں ساتھ لائے تھے!" لیوسی معنی خیز لہجے میں بولی "تم یقیناً انھیں سزا دینا چاہتے تھے۔"

"لعنت بھیجو ان پر!" میں بیزاری سے بولا "یہ بتاؤ کہ فائرنگ کا کیا چکر تھا؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تمھارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔"

"آ گئیں نا اپنی اصلیت پر! تم بھی کسی سے کم نہیں ہو ستانے میں! خیر پہلے مجھی سے سن لو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی ٹانگ گھسیٹے جانے اور "انٹا غفیل" ہونے کا واقعہ بیان کر دیا۔

"تمھاری چیخ سن کر ہی میں پلٹی تھی۔" لیوسی نے بتایا۔ "میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تم پر کوئی افتاد پڑ گئی ہے۔ میں نے صرف متوقع دشمن کو بدحواس کرنے کی خاطر ہوائی فائر کیا تھا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ تمھاری چیخ سنتے ہی میں اندازے سے اس طرف دوڑ پڑی تھی اور اسی دوران میں ہوائی فائر بھی کیا تھا۔ پھر میں نے ایک ہیولے کو تیزی سے جھاڑیوں میں جھک کر بھاگتے دیکھا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکی تھی کہ وہ کوئی لڑکی ہو گی۔ بہر حال تم مجھے بے ہوشی کی حالت میں ملے تھے۔ ہاں میں یہ بتانا بھول ہی گئی کہ میرے ہوائی فائر کے بعد فوراً ہی ایک جانب سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ یہ وہی سمت تھی جہاں یہ لوگ موجود تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی، شاید ان لوگوں پر بھی کوئی افتاد پڑ گئی ہے لیکن یہاں آ کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان لوگوں نے بدحواس ہو کر فائرنگ شروع کر دی تھی جو سراسر احمقانہ فعل تھا۔ بہر حال میں تمھیں گھسیٹ کر کچھ دور لے گئی کیوں کہ میری نظر میں وہ جگہ خطرناک تھی۔ پھر تمھیں ہوش آ گیا تھا۔ میں اس وقت سانس لینے کے لیے رکی تھی۔" لیوسی تمام کہانی بیان کر کے خاموش ہو گئی۔

"ہوں۔" میں نے طویل سانس لیا۔ "اب کیا ارادے ہیں؟"

"وہی جو پہلے تھے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہاں اب یہ ضرور ہے کہ دشمن چوکنا ہو چکا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ سخت الجھن کا شکار ہو گا۔ وہ غیر متوقع فائرنگ اس کے لیے معما بن گئی ہو گی۔ ایسے حالات میں عموماً حماقتیں متوقع ہوتی ہیں اور ہم ان کی حماقتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں اٹھانا فائدہ!" میں چڑ کر بولا "گھر چلو سیدھی! پھر کسی دن اطمینان سے آئیں گے۔"

ابھی میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ کہیں قریب ہی سے کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی، پھر سناٹے میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اندھیرے میں ایک جانب آگ کی لکیر سی چمکی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اس دوڑتے ہوئے شخص پر فائر کیا تھا۔

"ارے نکل چلو چپ چاپ سے!" میں نے بہ مشکل لیوسی سے کہا کیوں کہ خوف کے سبب میرا جسم کانپنے لگا تھا "کیا ہمیں 'دی اینڈ' لگواؤ گی، اپنا اور میرا!"

"اب یہ کیا نیا کھیل شروع ہو گیا!" لیوسی میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

اسی وقت پھر ایک فائر کے دھماکے نے سناٹے کو مجروح کر

دیا۔ اس بار وہ دھماکا بہت قریب سے سنائی دیا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم لیوسی کا ہاتھ تھاما اور چیخا "ارے بھاگو ورنہ ٹیں کر دے گا کوئی!" معلوم نہیں لیوسی بھی گھبرا گئی تھی یا اس نے میری تجویز قبول کر لی تھی کہ میرے ساتھ بھاگنے پر راضی ہو گئی تھی۔ ایسا ہی ہو! لڑکے کے ساتھ بھاگنے پر راضی ہو تو لڑکے میں جان آ ہی جاتی ہے۔ میرے پیروں میں گویا پَر لگ گئے تھے اور ناک کی سیدھ میں بھاگا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت نہ سمت کا ہوش تھا، نہ اور بلت کا، بس یہ دُھن سوار تھی کہ وہاں سے جتنی جلد ممکن ہو بھاگ لوں۔ زیادہ دیر موت سے آنکھ مچولی لوں بھی اچھی بلت نہیں۔

بھاگتے بھاگتے کہیں دور اور کہیں قریب سے پے در پے کئی دھماکے سنائی دیے۔ معلوم نہیں اس "آباد ویرانے" میں کون کون "دھماچوکڑی" مچائے ہوئے تھا۔ کچھ پتے نہیں پڑ رہا تھا کہ یہ سب "ڈریاما" کیا ہے۔

پھر اگر لیوسی میرا ہاتھ کھینچ کر "بریک" نہ مار دیتی تو میں اچانک راہ میں آ جانے والی اس دیوار سے ٹکرا ہی گیا ہوتا۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا اور حالت خراب تھی۔ دل تھا کہ "دھڑ دھڑا" کر سینے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ باہر ہر طرف "دھائیں دُھوں" ہو رہی تھی اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کدھر سے کوئی گولی آئے اور "دی اینڈ" لگا دے۔ مجھے یہی راہ بہتر نظر آئی کہ اس کوٹھی کی دیوار پھاند کر اندر کود جاؤں جس سے میں ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ مجھے اس وقت قطعی یہ علم نہیں تھا کہ وہ کوٹھی کس کی ہے، اگر معلوم ہوتا تو ہرگز یہ "احمقانہ" بات نہ سوچتا۔ وہ تو جب باری باری میں اور لیوسی دیوار پھاند کر اندر کود گئے تو لیوسی نے انکشاف کیا کہ وہ کوٹھی، سیٹھ عثمان ہی کی ہے۔

یہ سن کر مجھے لیوسی پر غصہ ہی تو آ گیا مگر خوف کے سبب میں نے غصے کے باوجود اپنی آواز مدھم ہی رکھی "تم بڑی چوچ ہو! پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی تم نے؟"

"زیادہ بنو مت! میں جانتی ہوں کہ تم جان بوجھ کر ادھر آئے تھے اور پھر دانستہ اندر کودے تھے۔ ظاہر ہے، مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا! میں تو تم سے پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ہمیں ایسے میں کوٹھی کے اندر گھس جانا چاہیے۔" لیوسی کے لہجے میں ناگواری سی تھی "جو جی چاہتا ہے خود کرتے ہو اور پھر دوسرے پہ الزام دھرتے ہو!"

اب تو میں پھنس ہی گیا تھا اور لیوسی بدولت یہ سمجھ رہی تھی کہ دانستہ میں نے یہ بہادرانہ قدم اٹھایا ہے اس لیے مزید گاؤ وزاری فضول ہی تھی، سوائے صبر کے اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچ کر کہا "خیر جو ہوا اس پر خاک ڈالو، خاموشی سے یہیں رہو۔ جب باہر امن چین ہو جائے گا تو یہاں سے نکل چلیں گے۔"

لیوسی نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم دونوں کوٹھی کے کمپاؤنڈ کی دیوار سے پشت لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھی کا پچھلا حصہ تھا اور وہاں نسبتاً تاریکی تھی۔ بیرونی سمت جو بلب جل رہا تھا اس کی بہت کم روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ باہر اب بھی کبھار ہی کسی فائر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فائرنگ کے درمیان وقفے طویل ہوتے جا رہے تھے۔

ابھی میں اچھی طرح سستا بھی نہیں پایا تھا کہ قریب ہی سے ایک غراہٹ ابھری اور میں چونک پڑا۔ لیوسی بھی چونکی تھی۔

"میں نے تو کبھی اس کوٹھی میں کتے نہیں دیکھے، پھر یہ..."

لیوسی کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا، اس کا سبب میری چیخ تھی۔ وہ دو کتے تھے جن میں سے ایک نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور میں چیخ اٹھا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خوف ناک بدیسی کتا میرا نرخرا چبا جاتا، ایک دم اچھل کر دور جا گرا مگر اس سے پہلے ہونے والے دھماکے نے میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔ میں کسی چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر آ رہا تھا۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا تھا اور دوسرا کتا یا کتیا "ٹھیں" ہو گیا یا ہو گئی تھی۔ "نیم اندھیرے" کے سبب اس کی جنس کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔

معلوم نہیں، سیٹھ عثمان کوٹھی میں گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا کہ گدھے، اس کے کان پر دو دو فائروں کے باوجود کوئی جوں نہیں رینگی تھی۔ مجھے کچھ دیر زمین سے اٹھنے اور اپنے حواس کی واپسی میں لگی کیوں کہ میں لیوسی کی بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ غالباً اب وہ اپنی بات پھر دُہرا رہی تھی "معلوم ہوتا ہے، اس وقت کوٹھی خالی پڑی ہے ورنہ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی تو باہر نکلتا!"

"ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔" میں نے لیوسی کے خیال سے اتفاق کیا۔

"کیوں نہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا جائیں۔" لیوسی نے تجویز پیش کی۔

میں نے سوچا کہ لیوسی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ آج نہیں تو کل "آپریشن کوٹھی عثمان" تو ہونا ہی ہے۔ کیا خبر پھر کوٹھی خالی ہو نہ ہو اس لیے آج رات ہی لگے ہاتھوں یہ کام کیوں نہ کر لیا جائے۔ یہ سوچنے کے باوجود بھی میں نے لیوسی سے کہا "دیکھو سوچ لو پہلے! کہیں کوئی "ڈریاما" نہ ہو جائے۔ تمہیں یقین تو ہے نا کہ کوٹھی خالی پڑی ہے؟"

"اس میں یقین نہ ہونے کی کون سی بات ہے!" لیوسی بولی۔

"ویسے سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا جو تم نے کہا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر لیوسی اور میں اس جگہ سے ٹہل لیے۔ اب فائرنگ بالکل رک چکی تھی۔ ہم دونوں گھوم کر عمارت کے صدر دروازے کی طرف آ

گئے۔ پھر میں اور لیوسی دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ عمارت کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کوٹھی کا آہنی پھاٹک بند تھا۔

"ہم اس دروازے سے اندر داخل نہیں ہوں گے۔" لیوسی نے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی۔

جواباً میں نے بھی گویا اس کے کان میں اپنا منہ گھسیڑا اور منمنایا "پھر؟"

لیوسی نے میرا ہاتھ پکڑا اور دائیں جانب چل دی۔ کچھ دور جا کر عمارت کا کونا آ گیا۔ وہ پھر میری طرف جھک کر آہستہ سے بولی "کسی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر چلیں گے۔" اس نے رائے دی اور پھر میرا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے لگی۔ یہ موقع زیادہ مکالمے بازی کا نہیں تھا اس لیے میں صبر کر گیا ورنہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اے شخص! رسّی تڑا کر بھاگ لے، اس پھندے میں نہ پڑ! دراصل عمارت کے کھلے ہوئے صدر دروازے نے مجھے "کھٹکا" دیا تھا۔

آخرکار لیوسی ایک جگہ رک ہی گئی۔ مجھے بھی اس کھڑکی کے دونوں پٹ باہر کی جانب کھلے ہوئے "ٹپائی" دے گئے تھے۔ کھڑکی زیادہ اونچی نہیں تھی، ذرا سی "اچھال" مار کر اس پر چڑھا جا سکتا تھا۔

"پہلے تم چڑھو گے کہ میں چڑھوں؟" لیوسی نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"پہلے تمھی چڑھ جاؤ۔" میں یہ سوچتے ہوئے بولا کہ اگر اندر کوئی خطرہ ہوا تو لیوسی ہی مصیبت میں پھنسے گی اور میں اس دوران میں ریس لگا جاؤں گا۔

میری بات سنتے ہی لیوسی کسی بندریا کی طرح اچھلی اور کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کر اندر پہنچ گئی۔ اندر پہنچتے ہی اس نے ہاتھ سے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

"سب خیر خیریت تو ہے نا؟" میں نے لیوسی سے تصدیق چاہی۔

"اب آ بھی جاؤ نا! ہر وقت اداکاری اچھی نہیں لگتی۔" لیوسی جھنجھلائی مگر اس کے باوجود اس کی آواز مدھم ہی تھی۔ اپنا جملہ پورا کرتے ہی وہ چوکھٹ پر پیٹ رکھ کر نیچے جھک گئی تھی اور ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

بہت کم لوگوں نے زندگی میں ایسے عیش "کاٹے" ہوں گے کہ ان کی طرف لڑکیوں کے ہاتھ بڑھے ہوں ورنہ یہ کام عموماً لڑکوں ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ نتیجتاً میں نے لپک کر اس نازنین کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے! خود بھی تو اپنا جسم سنبھالو۔" لیوسی منمنائی "تم نے اپنا جسم ڈھیلا کیوں چھوڑ دیا ہے!" وہ مجھے پوری قوت سے اوپر گھسیٹنے لگی۔

آخرکار جیسے تیسے میں بھی اوپر پہنچ ہی گیا۔

ہم دونوں ایک نیم روشن سی راہ داری میں تھے اور وہاں ہمارے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ راہ داری میں کافی فاصلے پر ایک بلب جل رہا تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس راہ داری کے اختتام پر سیٹھ عثمان کی خواب گاہ ہے۔" لیوسی بولی "آؤ پہلے اسی طرف چلیں۔ معلوم تو ہو کہ وہ واقعی ہے یا نہیں!"

"اگر وہ وہاں موجود ہوا تو پھر؟" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔ میری آواز کسی قدر کانپنے لگی تھی۔

"تو پھر کیا! وہ کوئی شیر تو ہے نہیں کہ ہمیں پھاڑ کھائے گا۔" یہ کہہ کر لیوسی آگے بڑھی۔

مجبوراً مجھے بھی لیوسی کی تقلید کرنا پڑی۔ دور ہی سے نظر آ گیا کہ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر اندر تاریکی تھی۔ لیوسی اس کے باوجود آگے بڑھتی رہی۔ مجھ سے نہ رہا گیا "دیکھو لیوسی! تم تو مجھے زندگی سے بیزار معلوم ہوتی ہو مگر میرے ساتھ ایسا نہیں۔ مجھے ابھی شادی کرنا ہے اور اس کے بعد بچے بھی..." میں کہتے کہتے رک گیا۔ معاً مجھے خیال آ گیا تھا کہ میں ایک کنواری لڑکی سے مخاطب ہوں جس کے سامنے بچوں وغیرہ کی پیدائش کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بچوں کی پیدائش کے ذکر پر خوف زدہ بھی ہو سکتی تھی جب کہ اس وقت اس کا بے خوف ہونا ضروری تھا۔ میں نے اسی لیے فوراً ہی بات بدل دی اور مطلب پر آ گیا "دیکھو لیوسی خانم! اگر تمھیں اندر جانا ہی ہے تو اکیلی چلی جاؤ۔ میں باہر ہی کھڑا رہوں گا تاکہ سیٹھ عثمان بھاگنے کی کوشش کرے تو میں اسے "کیچ" لوں۔"

"یہ فضول باتوں کا وقت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے لیوسی نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا ریوالور نکال لیا اور مجھے بھی ایسا ہی کرنے کے لیے کہا۔

"کہیں سچ مچ گولی چلانہ دینا۔" میں نے لیوسی سے کہا "میرا دل دراصل بہت کمزور ہے۔ مجھے دھماکے سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے اسی لیے آج تک کسی دشمن پر بھی گولی نہیں چلائی۔ ویسے تم کہتی ہو تو میں ریوالور نکالے لیتا ہوں لیکن اگر بھولے سے گولی چل گئی تو ساری ذمے داری تم پر ہو گی، ہاں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور نکال لیا۔

لیوسی میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھتی رہی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سیٹھ عثمان کی تاریک خواب گاہ میں

قدم رکھ دیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں میں اس سے بچھڑ نہ جاؤں جیسا پہلے ہو چکا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بھی تیزی سے لپکا۔
اسی وقت خواب گاہ روشن ہو گئی۔ میں نے لیوسی کو دروازے کے قریب کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ مڑ کر مجھے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ خواب گاہ میں روشنی اسی نے کی تھی۔ سوئچ بورڈ غالباً دروازے کے پاس ہی ہو گا اور لیوسی اس سے واقف رہی ہو گی کیوں کہ وہ وہاں، اس کوٹھی میں کافی دن رہ چکی تھی۔
میں خواب گاہ میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ خواب گاہ کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور ایک طرف خوب صورت مسہری نظر آ رہی تھی۔ وہ خواب گاہ واقعی کسی خاندانی رئیس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہاں موجود ایک ایک شئے سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک طرف دیوار سے لگی ہوئی دو بڑی الماریاں رکھی ہوئی تھیں، دوسری جانب بڑے بڑے ریک تھے جن میں کتابیں تھیں۔
لیوسی ایک ایک چیز کا بہ غور جائزہ لے رہی تھی اور میں اس کے ساتھ ساتھ کسی دُم کی طرح لگا ہوا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی خاص چیز کی متلاشی ہو۔
"آخر کیا تلاش کر رہی ہو تم یہاں؟" میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔ "سیٹھ عثمان کوئی سوئی تو ہے نہیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہا!"
لیوسی میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تو طے ہے کہ اس کوٹھی میں تہہ خانہ ہے۔ تہہ خانے کا ایک راستہ اس خواب گاہ میں بھی یقیناً ہو گا۔"
"اچھا تو تم راستہ تلاش کر رہی ہو یہاں!" میں تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ "حالانکہ ہر طرف دیواریں نظر آ رہی ہیں۔ کوئی اندھا بھی بتا دے گا کہ یہاں راستہ نہیں ہے۔"
لیوسی نے میری طرف گھور کر دیکھا جیسے کچا چبا جائے گی۔ میں سہم گیا۔ اس نے دیکھا ہی اس انداز سے تھا ورنہ مجھے کیا پڑی تھی سہمنے کی! پھر وہ ہونٹ بھینچتی ہوئی بولی۔ "یہ تو ہوتا نہیں کہ خود بھی ہاتھ پاؤں چلاؤ، الٹا دماغ کھائے جا رہے ہو بے تکی باتیں کر کے!"
"ہاتھ پاؤں چلانے سے غالباً تمہارا مقصد ورزش ہے۔ تو سنو! اس کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ صبح ہی صبح ورزش کرنا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے، ہر وقت نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو، مجھے اتنی سی بات معلوم نہیں!" میں ہاتھ نچا کر بولا۔ "اور یہ تم نے الٹا دماغ، کیا کہا؟ دماغ ہمیشہ سیدھا ہوتا ہے، الٹا نہیں۔ اگر بالفرض کسی کا دماغ الٹا ہوتا ہے تو اسے پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے اور..."
میں شاید کچھ اور بھی کہتا مگر اسی وقت لیوسی نے مجھے اس انداز میں پلٹ کر دیکھا جیسے سچ مچ میرا دماغ الٹ گیا ہو۔ پھر وہ بولی۔ "میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم اس وقت اتنے غیر سنجیدہ کیوں ہو! حالانکہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم بہرحال خطرے میں ہیں۔"
"خطہ... خطرہ!" خطرے کے ذکر پر میری زبان ہکلائی۔
لیوسی نے بروقت خطرے کا احساس دلا کر واقعی اچھا کیا تھا ورنہ میں اس سے غافل ہی رہتا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مجھ پر ایک بار پھر دہشت طاری ہونے لگی۔ میں مری ہوئی سی آواز میں بولا۔ "اگر یہاں سچ مچ خطرہ ہے جیسا کہ مجھے بھی معلوم ہو رہا ہے تو یہاں سے نکل ہی چلو لیوسی!"
لیوسی میری بات کو سنی ان سنی کرتی ہوئی ایک آبنوسی الماری کی طرف بڑھی اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر نیچے جھانکنے لگی۔ میری نگاہ اس کے تعاقب میں تھی۔ میں بھی چونک اٹھا۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب وہ چھوٹے چھوٹے ربر کے پہیے تھے جو الماری کے نچلے حصے میں لگے ہوئے تھے۔ آخر الماری کے نیچے ان پہیوں کو لگانے کی کیا تک تھی؟ میں تو ابھی اسی سوال میں الجھا ہوا تھا مگر لیوسی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھتے ہی الماری کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا تھا۔ پہیوں کی وجہ سے الماری بڑی آسانی کے ساتھ گھسٹ آئی تھی۔ لیوسی غالباً انہی پہیوں کی وجہ سے اس الماری کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لیوسی نے الماری کو دیوار سے کافی دور گھسیٹ لیا۔ پھر وہ الماری کے پیچھے غائب ہو گئی۔
"ارے کدھر گئیں؟" میں جلدی سے بولا۔ "کہیں اکیلے اکیلے کدھر ہی نہ چھوٹ لینا، میں تو چوڑے میں مارا..."
میرا جملہ پورا نہ ہو سکا کیوں کہ میں نے لیوسی کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلتے ہوئے سنی تھی جیسے اس نے کوئی خلافِ توقع چیز دیکھ لی ہو۔ میں جس طرف کھڑا تھا، الماری کا وہ حصہ دیوار سے اتنی دور نہیں تھا کہ میں، الماری کے پیچھے جا سکتا۔ لیوسی، الماری کی دوسری جانب سے اس کے پیچھے گئی تھی۔ الماری ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں، میں نے ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنی۔
"ارے کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا؟" لیوسی کی خاموشی سے کھل کر میں کسی قدر جھنجلا گیا۔ "بس اپنے منہ سے ہائے ہوئی کی آوازیں نکالے جاؤ گی یا کچھ بتاؤ گی!"
ایک بار پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس بار میں دہل سا گیا۔ اسی "دہلن" کا سبب تھا کہ میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور دوسری جانب سے الماری کے پیچھے جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔
دوسری جانب پہنچتے ہی میں تیورا کر گرتے گرتے بچا۔ لیوسی پُراسرار طور پر غائب ہو چکی تھی۔ الماری کے پیچھے دیوار پر ایک ابھرا ہوا سرخ بٹن میرا منہ چڑا رہا تھا۔ لیوسی نے اس پُراسرار عمارت کے بارے میں اب تک مجھے جو واقعات بتائے تھے، وہ سب

چند ہی لمحوں میں میرے ذہن میں قلابازیاں کھانے لگے۔
"خیریت چاہتا ہے تو بھاگ لے بیٹا!" کسی نے جیسے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "بھاگ لے ورنہ تو بھی لیوسی کی طرح غائب ہو جائے گا۔" دیکھتے ہی دیکھتے کوئی اچھی بھلی، جیتی جاگتی لڑکی غائب ہو جائے تو آدمی ڈرے نہیں تو کیا کرے! ابھی میں نے راہِ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ ہی کیا تھا کہ اچھل پڑا۔ ہلکی سی گڑگڑاہٹ پھر ہوئی تھی اور الماری کے پیچھے والی دیوار ایک جانب کھسک کر غائب ہو گئی تھی۔ سامنے ہی نیم تاریک خلا میں مجھے لیوسی کھڑی نظر آئی جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ میں اس وقت حیرت کے دریا میں غوطے لگا رہا تھا اس لیے لیوسی کی دل جلانے والی بے وقت مسکراہٹ پر جھنجلاہٹ کا اظہار بھی نہ کر سکا۔
"دیکھا تم نے! میں نے آخرکار راستہ تلاش کر ہی لیا!" لیوسی کے ہونٹوں نے حرکت کی۔
"مگر ابھی تم غائب کہاں ہو گئی تھیں؟" میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔
"کہیں نہیں، میں تو یہیں تھی، البتہ درمیان میں دیوار حائل ہو جانے کے سبب تمہیں نظر نہیں آ سکی۔" لیوسی نے جواب دیا۔ "دراصل جیسے ہی مجھے دیوار پر سرخ بٹن نظر آیا، میں نے اسے دبا دیا اور پھر فوراً ہی دیوار کا ایک حصہ ذرا سا پیچھے سرک کر سامنے سے ہٹ گیا۔ خلا نظر آتے ہی میں نے اس میں قدم رکھ دیا اور اسی کے ساتھ دیوار پھر برابر ہو گئی۔ اندر بھی مجھے دیوار کی بائیں جانب ایسا ہی بٹن ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اس بٹن پر دباؤ ڈالا اور دیوار پھر پیچھے ہٹ کر سرک گئی۔ میں نے سوچا بھی یہی تھا کہ اندر سے بھی کوئی ایسا میکنزم ہو گا جس کے ذریعے دیوار کو ہٹایا جا سکے اور میرا خیال ٹھیک ہی ثابت ہوا۔" لیوسی تفصیل بیان کر کے خاموش ہو گئی، پھر بولی۔ "آؤ، تم بھی اندر آ جاؤ۔ یہاں کچھ فاصلے پر سیڑھیاں نظر آ رہی ہیں جو نیچے جا رہی ہیں۔"
مجھے اس خلا میں داخل ہوتے وقت ڈر تو لگا مگر یہ سوچ کر ہمت "باندھ" لی کہ جب ایک لڑکی اس قدر جی داری کا ثبوت دے سکتی ہے تو یہ مردانگی کے خلاف ہے، اگر میں اس لڑکی سے پیچھے رہ جاؤں۔
ادھر میں نے اس خلا میں قدم رکھا، ادھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار کھسک کر اپنی جگہ آ گئی۔ غالباً اندر قدم رکھتے ہی دیوار پھر اپنی جگہ آ جاتی تھی۔ اس کے لیے بھی سیٹھ عثمان نے کوئی خفیہ بندوبست کر رکھا ہو گا۔ میں نے سوچا اور لیوسی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اپنا ریوالور میں نے اب دوبارہ جیب میں ڈال لیا تھا کیوں کہ لیوسی کے ہاتھ میں بھی اب مجھے وہ خطرناک کھلونا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ شاید پھر گریبان میں جا کر چھپ گیا تھا۔
چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہی نیچے جانے والا زینہ نظر آ گیا۔ زینے میں کم پاور کا ایک بلب روشن تھا۔ اسی کی مدھم سی روشنی اوپر تک پہنچ رہی تھی اور یہی مدھم روشنی زینے کی آخری سیڑھیوں تک پھیلی ہوئی تھی مگر اس سے آگے اندھیرا تھا۔
میں، لیوسی کے ہمراہ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گیا۔ میرا دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا کیوں کہ وہاں ہر طرف تاریکی کا راج تھا، تاریکی اور سناٹا!
"تمہارے پاس ٹارچ بھی تو تھی۔" لیوسی نے سرگوشی کی۔
"ہاں تھی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر بچھڑ گئی۔ جب اس ناہنجار 'انگریزن' نے مجھے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تھا تو ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔" میں نے بھی اپنی آواز دھیمی ہی رکھی تھی۔
ابھی میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ اس سناٹے میں ایک کریہہ قہقہہ گونج اٹھا۔ پھر ایک دم چکاچوند سی ہو گئی۔ تیز روشنی کے سبب میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔
"آخر تم دونوں پھنس ہی گئے!" ایک آشنا آواز سنائی دی جو سو فیصد سیٹھ عثمان ہی کی آواز تھی۔ اسی وقت ایک زبردست کھٹکا سا ہوا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔
آنکھیں کھولتے ہی مجھے جو کچھ نظر آیا، اسے دیکھ کر میرا دل بیٹھنے کی بجائے لیٹ ہی گیا۔ میں اور لیوسی ایک بڑے سے آہنی پنجرے میں قید ہو گئے تھے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پنجرے کے سرے پر اوپر ایک آہنی سلاخ نظر آئی جو چھت تک چلی گئی تھی۔ میرے لیے دوسری حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ہال نما کمرہ قطعی خالی تھا۔ معلوم نہیں روشنی ہوتے ہی سیٹھ عثمان بدبخت کہاں روپوش ہو گیا تھا۔
"تم دونوں، اپنے ریوالور آہنی سلاخوں سے باہر پھینک دو!" معاً سیٹھ عثمان کی آواز پھر سنائی دی۔
میں نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر ہال نما کمرہ اب بھی خالی تھا، پھر معلوم نہیں سیٹھ عثمان کی آواز کہاں سے آ رہی تھی۔ چاروں طرف دیکھتے ہوئے ہی میری نظر لیوسی کی طرف بھی اٹھی تھی جس کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آ رہا تھا۔
"اب کیا ہو گا؟ اس بدذات نے تو ہمیں طوطا اور مینا کی طرح پنجرے میں بند کر دیا!" میں روہانسی آواز میں بولا۔
"ہمارے پاس ریوالور ہیں اسی لیے وہ سامنے نہیں آ رہا۔" لیوسی میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہاں ہر طرف سپاٹ دیواریں نظر آ رہی ہیں، یقیناً یہاں سے

اور طرف جانے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی خفیہ راستہ ہوگا لیکن ہم... ہم تو اس پنجرے میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔" لیوسی کی آواز میں بے بسی تھی۔

"اور ڈھونڈو تہ خانے کا راستہ!" میں جل کر بولا۔

اسی وقت سیٹھ عثمان کی آواز پھر سنائی دی۔ وہ ہمیں دوبارہ تاکید کر رہا تھا کہ ریوالور پھینک دیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے اس کی بات مان لینا چاہیے۔ ویسے بھی میرے پاس ریوالور کی موجودگی بیکار ہی تھی، مجھے ریوالور چلانا تو آتا نہیں۔ پھر یہ کہ میری فرماں برداری سے سیٹھ عثمان متاثر ہو سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کر آہنی سلاخوں سے باہر پھینک دیا، پھر بلند آواز میں بولا "پیارے بھائی! میں نے تمھارا کہنا مان لیا ہے کیوں کہ میں ہمیشہ بڑوں کا حکم مانتا ہوں، اگر یقین نہ ہو تو میرے ابا سے پوچھ لینا۔"

"تم... تم اللہ دتا!" سیٹھ عثمان کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ اس نے یقیناً مجھے میری آواز سن کر پہچان لیا تھا۔

"جی ہاں پیارے بھائی! میں آپ کا فرماں بردار اللہ دتا ہی ہوں۔" میں نے دانت نکالتے ہوئے فرماں برداری کا اظہار کیا، پھر بولا "اور یہ جو پیارے بھائی، میرے ساتھ لڑکی ہے، میری ماتحتی میں ہے۔ میں ابھی اسے بھی حکم دیتا ہوں کہ ریوالور پھینک دے۔"

"کہیں تمھارے پاس کوئی اور ہتھیار تو نہیں!" سیٹھ عثمان کا لہجہ کچھ شک آمیز سا تھا۔

"چاہے جیسی قسم لے لو، سوائے ایک چھوٹے سے چاقو کے میرے پاس کچھ اور نہیں!" میں نے یقین دلانے کے لیے پُرزور لہجے میں کہا۔

"وہ چاقو بھی پنجرے سے باہر پھینک دو!" سیٹھ عثمان نے حکم دیا۔ "اور سنو، اگر تم نے جھوٹ بولا تو پھر بچ نہیں سکو گے اس لیے اگر کوئی دوسرا ہتھیار ہو تو وہ بھی پھینک دو۔"

"دیکھو پیارے بھائی، تمھیں تو معلوم ہی ہوگا کہ اللہ تبارک تعالیٰ سے بڑی کوئی ذات نہیں اسی لیے میں اللہ کی قسم کھا کر تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ ہاں، اس لڑکی کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں، کہیں بعد میں تم مجھ پر الزام دھرو۔ لو یہ چاقو بھی رکھ لو، پھینک رہا ہوں، اصلی رام پوری ہے۔ اس کی دھار بھی بہت تیز ہے۔ یہ چاقو میں نے لوٹے میں آنے میں خریدا تھا مگر تم پر یہ بھی قربان پیارے بھائی!" یہ کہتے ہوئے میں نے چاقو بھی پنجرے سے باہر پھینک دیا جسے میں پہلے ہی جیب سے نکال چکا تھا۔

"اے لڑکی!" اس بار سیٹھ عثمان نے براہِ راست لیوسی کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے "تم نے میرا حکم سنا نہیں کیا! ریوالور پھینک دو!"

لیوسی کوئی جواب دینے یا ریوالور پھینکنے کی بجائے میری طرف جھکی اور میرے کان میں منمنائی "تم نے ریوالور پھینک دیا ہے تو پھر غالباً مجھے بھی یہی کرنا چاہیے۔ پھینک دوں ریوالور؟"

"لے نیکی اور پوچھ پوچھ!" میں چہک کر بولا "سیٹھ صاحب بہت شریف آدمی ہیں، شریف اور خاندانی! تم دیکھ لینا، ہم دونوں کو اپنی موٹر میں بٹھوا کر ہمارے گھروں تک چھوڑ وائیں گے۔"

لیوسی نے بھی آخرِ کار میری تقلید کی اور الجھی ہوئی سی نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ اسی وقت اچانک تاریکی پھیل گئی، پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی۔

"یہ... یہ کیا ہوا لیوسی؟" میں خوف زدہ ہو کر ہکلایا۔

اس سے پہلے کہ لیوسی کوئی جواب دیتی، دوبارہ گڑگڑاہٹ ہوئی اور اسی کے ساتھ وہ ہال نما کمرہ پھر روشن ہو گیا مگر اب ہمارے علاوہ وہاں سیٹھ عثمان اور ایک غیر ملکی لڑکی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں دیوار کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اس غیر ملکی لڑکی پر نظر پڑتے ہی میں اچھل پڑا تھا۔ یہ وہی تھی جس نے مجھے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تھا۔ یہ یہاں کہاں سے ٹپک پڑی؟ اسے تو میں نے کوٹھی سے باہر اس "اُجاڑ ویرانے" میں دیکھا تھا۔ آخر یہ ہے کون؟ اسے مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ سیٹھ عثمان سے کیا تعلق ہے اس کا؟ یکے بعد دیگرے میری کھوپڑی میں سوالوں کے کیڑے کلبلائے۔

سیٹھ عثمان اور وہ "انگریزن" دونوں آہنی پنجرے کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں ہی مجھے اور لیوسی کو بہ غور دیکھ رہے تھے۔

"اللہ دتا!" معاً سیٹھ عثمان نے مجھے مخاطب کیا "تمھیں تو میں میک اپ کے باوجود آواز سے پہچان گیا، یہ لڑکی کون ہے تمھارے ساتھ؟ کیا واقعی یہ بھی تمھارے محکمے ہی سے تعلق رکھتی ہے اور تمھاری ماتحت ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی، پھر مزید یقین دلانے کی خاطر وتوتے کی زبان بھی ہلا دی۔

"ہوں!" سیٹھ عثمان نے طویل سانس لیا، پھر چند لمحے توقف کے بعد سخت لہجے میں بولا "اب کھل جاؤ خود ہی کہ یہ سب کیا چکر چلایا ہے تم لوگوں نے آج؟"

"چکر!" میں حیرت سے بولا "چکر تو ہم نے کوئی نہیں چلایا، خود ہی یہاں آ کر گھن چکر بن گئے ہیں۔"

"زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو تو بہتر ہے!" سیٹھ عثمان کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

اسی وقت اس "انگریزن" نے نہ جانے کون سی زبان میں سیٹھ عثمان سے کچھ کہا جسے سن کر سیٹھ عثمان نے سر ہلایا اور پھر وہ دونوں واپسی کے لیے مڑ گئے۔

میں نے انھیں جاتے ہوئے دیکھا تو فریادی لہجے میں چیخا "ارے پیارے بھائی! کیا ہمیں اسی حال میں یہاں چھوڑ جاؤ گے! ارے ہم تو یہاں بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بس اس بار چھوڑ دو، انشاء اللہ پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے نوکری ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے، کم از کم میں تو ادھر نہیں آؤں گا۔"

میری چیخ پکار کا ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سیٹھ عثمان نے جاتے جاتے میرا اور لیوسی کا ریوالور اٹھا لیا تھا، اسی کے ساتھ چاقو بھی۔ وہ دونوں اس ہال نما کمرے کی بائیں جانب گئے۔ اس طرف جدھر ان دونوں کا رُخ تھا، سپاٹ دیوار تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ دونوں بدبخت دیوار سے سر ٹکرانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ مگر ایسا نہیں ہوا۔

وہ جیسے ہی دیوار کے قریب پہنچے، کمرہ ایک دم تاریکی میں ڈوب گیا اور پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ چند لمحوں بعد پھر گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی اور پھر سناٹا پھیل گیا تھا۔

"لو اور کر لو دکانداری! پھنسوا دیا نا آخر جال میں!" میں جھنجھنا کر بولا۔ ظاہر ہے کہ میری مخاطب لیوسی ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ لیوسی کوئی جواب دے پاتی، میری ناک میں تیز قسم کی بدبو گھسی "آخ تھو!" میں نے بہ آوازِ بلند تھوکا اور اسی کے ساتھ جیسے میرا سر جھولا جھولنے لگا۔ مجھے اتنی زور کا چکر آیا کہ سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ میں نے گرتے گرتے اور بالکل "غین" ہوتے ہوتے لیوسی کو پکارنا چاہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ بعد میں مجھے علم ہوا تھا کہ لیوسی بھی تقریباً انھی کیفیات سے گزر کر "اناغفیل" ہو گئی تھی۔

ادھر میں نے عالمِ ہوش میں قدم رکھا، ادھر کسمسایا۔ آنکھیں کھلنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ میرا جسم چمڑے کی بیلٹوں سے کسا ہوا ہے اور میں آپریشن ٹیبل جیسی لمبی سی ایک میز سے بندھا ہوا ہوں۔ میری میز سے کچھ ہی فاصلے پر ایسی ہی ایک آپریشن ٹیبل اور بھی موجود تھی۔ اس میز پر بھی ایک شخص بندھا ہوا تھا جو بے حس و حرکت تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے اتنی زبردست "اچھال" مارنے کی کوشش کی تھی کہ اگر چمڑے کی بیلٹوں سے بندھا ہوا نہ ہوتا تو تڑپ کر نیچے زمین پر جا پڑتا۔ بھلا یہ کوئی قابلِ یقین بات ہو سکتی تھی کہ جو سیٹھ عثمان ابھی کچھ دیر پہلے ایک قسائی کا کردار ادا کر رہا تھا اور جس کی یہ کوٹھی تھی، وہی بیلٹوں سے بندھا ہوا پڑا ہو، یعنی میری طرح قید میں ہو! میں نے سوچا، یقیناً میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں ورنہ اتنی جلدی بساط نہیں اُلٹ سکتی۔ یہ سوچ کر میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے کھولنا چاہیں مگر اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری تھی جو آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ بے ہوش بنے رہنے کے فوائد سے میں اچھی طرح واقف تھا اس لیے فی الحال میں نے بے ہوش ہی پڑے رہنا غنیمت جانا۔

قدموں کی چاپ "بکرہ چاپیں"، قریب آتی گئیں اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ کمرے میں داخل ہو گئی ہوں۔

"ان دونوں میں سے کسی ایک کو کہیں اور منتقل ہونا چاہیے تھا۔ تم نے جلد بازی میں یہ گڑبڑ کر دی۔" یہ نسوانی آواز تھی جسے سن کر مجھے یوں لگا جیسے کبھی پہلے بھی کہیں یہ یا اس سے ملتی جلتی آواز سنی ہو، مگر کہاں؟ یہ مجھے یاد نہ آ سکا۔ اس کا لہجہ نقلی "انگریزنوں" جیسا تھا اور یہ جملہ کسی [illegible] چند لمحوں کے توقف سے [illegible] یہ اچھا ہے کہ [illegible] ابھی ہوش نہیں آیا۔" قدموں کی چاپ اب میرے قریب آ کر رک گئی تھی "تم ایسا کرو کہ اس کی ساتھی لڑکی کو یہاں سے لے جا کر اسی کمرے میں اور سیٹھ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دو۔" اسی کے ساتھ قدموں کی چاپ دور ہونے لگی۔

اب میرے لیے صبر کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا اس لیے میں نے پلکوں کے درمیان جھری پیدا کر کے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک بار پھر میرے اوپر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میں نے سنا تو تھا کہ بعض حالتوں میں آدمی اس قدر "چکرا" جاتا ہے کہ اسے ایک کے دو نظر آنے لگتے ہیں مگر تجربہ پہلی بار ہوا۔ میں نے گھبرا کر پوری آنکھیں کھول دیں کیوں کہ مجھے اس کمرے میں ایک کی بجائے دو سیٹھ عثمان نظر آ رہے تھے۔ ایک سیٹھ عثمان، میز سے بندھا ہوا تھا اور دوسرا اس کے سرہانے کھڑا تھا اور قریب ہی "انگریزن" موجود تھی۔

جس میز سے سیٹھ عثمان بندھا ہوا تھا اس کے پایوں کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیٹھ عثمان، دوسرے سیٹھ عثمان کو دھکیلتا ہوا کمرے کے دروازے سے نکل گیا۔ اب کمرے میں صرف "انگریزن" رہ گئی تھی جسے میں پہلے بھی آہنی پنجرے کے اندر سے سیٹھ عثمان کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ میں اس قدر "حیران" تھا کہ سچ مچ پلکیں جھپکانا بھی بھول گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب اس "انگریزن" نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں نے آنکھیں بند نہیں کیں۔

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا اور وہ لپک کر میرے قریب آ گئی "ہوش آ گیا تمھیں؟"

"نہیں۔" میں جلدی سے بولا "ابھی میں بے ہوش ہوں، بس ذرا جلدی میں آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا، کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

"اللہ دتا!" اس کا لہجہ سخت ہو گیا "مجھ سے اداکاری نہیں چلے گی۔ بتاؤ تمھیں کب ہوش آیا تھا؟"

"اوّل تو میرے ہاتھ پر گھڑی نہیں بندھی ہوئی" میں نے کہا۔ "اور اگر گھڑی بندھی ہوئی بھی ہوتی تو آپ... آپ خود سوچیے کہ ہوش میں آنے کے بعد کسے اتنا ہوش ہوتا ہے جو وہ وقت دیکھے!"

"تمھارے بارے میں میرا پہلا اندازہ یقیناً غلط ہی تھا۔ رنجیت ٹھیک ہی کہتا تھا" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "کاش میں نے اس کی بات مان لی ہوتی"

اسی وقت میری توجہ دروازے کی طرف ہوگئی۔ سیٹھ عثمان ایک میز کو دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس میز پر لیوسی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے لیوسی کی میز وہیں لا کر روک دی جہاں پہلے، دوسری میز تھی۔ یہ میز بھی پہلے جیسی تھی مگر اس پر بندھی ہوئی لیوسی ہوش میں تھی۔

"دراصل میں نے سوچا تھا کہ پہلے لڑکی کی زبان کھلوائی جائے" سیٹھ عثمان اس "انگریزن" کے قریب آکر بولا "لڑکیاں عموماً کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے اسی لیے اسے الگ کمرے میں رکھا تھا۔ ممکن ہے، اللہ دتا کی موجودگی میں یہ شکل سے کچھ بتلائے یا اللہ دتا مداخلت کرے۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال اب تو مجبوری ہے"

"تم اپنا کام شروع کر دو" انگریزن نے کہا۔

جواب میں سیٹھ عثمان دیوار سے لگی ہوئی ایک میز کی طرف بڑھا جس پر عجیب سا سامان اور اوزار سجے ہوئے تھے۔ اس سامان میں صرف ایک سرنج ایسی تھی جسے پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ سرنج کے قریب ہی کچھ چھوٹی چھوٹی شیشیاں بھی رکھی تھیں جن میں مختلف رنگوں کے محلول بھرے ہوئے تھے۔

"فاسمولا تھرٹی نائن!" انگریزن کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔

جواباً سیٹھ عثمان نے سرنج اٹھالی اور ان شیشیوں میں سے ایک کا محلول، سوئی کے ذریعے سرنج میں منتقل کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ سرنج تھامے ہوئے لیوسی کے قریب پہنچ گیا، پھر اس کا ایک بازو کھولتے ہوئے بولا "لڑکی! یہ محلول جو اس سرنج سے تمھارے جسم میں منتقل ہوگا، چند ہی لمحے بعد تمھیں بے اختیار چیخنے پر مجبور کر دے گا۔ میں تم سے فی الحال کچھ نہیں پوچھوں گا اور پہلے تھوڑا سا محلول تمھارے جسم میں ضرور اتاروں گا تاکہ تمھیں اس محلول کا اثر معلوم ہو سکے۔ انجکشن لگنے کے چند لمحوں بعد ہی تمھیں یہ محسوس ہوگا جیسے تم دہکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دی گئی ہو۔ یہ کیفیت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک میں دوسرا انجکشن نہیں لگا دوں گا۔ دوسرا انجکشن گویا اس کا توڑ ہوگا۔ چند ہی لمحوں میں تمھاری تمام تکلیف ختم ہو جائے گی لیکن دوسرا انجکشن میں اسی وقت لگاؤں گا جب تم زبان کھولنے پر آمادگی کا اظہار کر دوگی" یہ کہتے ہی سیٹھ عثمان نے سرنج کی نوک، لیوسی کے بازو میں اتار دی اور لیوسی "سی" کر کے رہ گئی۔

"ٹھہرو!" معاً میں چیخ اٹھا۔ مجھے سیٹھ عثمان کی باتوں نے دہلا دیا تھا۔

"تم خاموش لیٹے رہو اللہ دتا!" انگریزن نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"ارے میری بات تو سنو، اگر ہم یوں ہی سب، کچھ بتا دیں تو تمھیں کیا اعتراض ہے!" میں نے ڈانٹ کھانے کے باوجود کہہ دیا۔

"تم اتنے ہی شریف ہو!" سیٹھ عثمان ہنس کر بولا "میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں"

سیٹھ عثمان نے آخر کار اس محلول کا نصف حصہ لیوسی کے بازو میں اتار ہی دیا۔ پھر وہ اطمینان سے سرنج کو میز پر رکھ کر لیوسی کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میں نے لیوسی کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھرتے دیکھے، پھر اسے نچلا ہونٹ، دانتوں میں دبا کر کاٹتے دیکھا۔ محلول نے غالباً اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ چند لمحے اور گزرے، پھر معاً لیوسی بری طرح چیخ اٹھی۔

"ہاں لڑکی، اب بولو! اندازہ ہوا تمھیں اس محلول کا! بتاؤ راضی ہو سب کچھ اگلنے پر؟" سیٹھ عثمان سفاک انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔

"لیوسی! بتا دو سب کچھ!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔

"نن... نہیں... نہیں!" چیخوں کے درمیان لیوسی نے بہ مشکل انکار کیا۔

"ارے جان تو بچ جائے گی، مان جاؤ!" میں نے اُسے پھر ترغیب دی۔

لیوسی نے اس بار میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس ہذیانی انداز میں چیخے جارہی تھی۔

"اس کی بجائے مجھ سے پوچھ لو نا! میں سب کچھ بتا دوں گا، پیارے بھائی!" میں نے کہا۔ لیوسی کی حالت دیکھ کر میرا کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔ دفتر کی "ساتھن" ہونے کے علاوہ وہ مجھ سے عشق بھی تو لڑاتی تھی۔ آخر میں کس طرح اسے یوں چیختے ہوئے دیکھ کر اور سن کر دل پر پتھر رکھ لیتا! اس کا سارا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

"یہ نہ سمجھو اللہ دتا کہ تم ہمیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے" سیٹھ عثمان میری طرف گھور کر بولا۔

"جو تمھیں دھوکا دے پیارے بھائی اس کی قبر میں کیڑے پڑیں۔ اب اس سے زیادہ میں تمھیں یقین نہیں دلا سکتا۔ میں نے تمھاری خاطر آخرت تک کو داؤ پر لگا دیا ہے، اور کیا چاہتے ہو!"

اس مکالمے بازی کے دوران میں لیوسی کی چیخیں برابر "نشر" ہوتی رہی تھیں۔

"کیا تم ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو کہ ہم تمھاری باتوں پر اعتبار کر لیں گے!" سیٹھ عثمان پھنکارا "جب تمھاری ساتھن اتنی سخت جانی کا ثبوت دے سکتی ہے تو پھر تم کس طرح ایک دم راہ پر آجاؤ گے! تم یقیناً ہمیں کوئی فرضی کہانی سنا کر بے وقوف بنانا چاہتے ہو!"

وہی "سپین پاٹ" تھا کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ آخر میں اس بدبخت کو کیسے یقین دلاتا کہ دھوکا نہیں دوں گا، سچ بولوں گا!

چیختے چیختے آخر لیوسی کی آواز بیٹھ گئی اور پھر وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔ انگریزن کے کہنے پر سیٹھ عثمان، اسے اسی حالت میں کمرے سے لے گیا، میز دھکیلتا ہوا! پھر وہ دوبارہ کمرے میں آگیا۔

"کیا... وہ... وہ مر گئی؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سیٹھ عثمان سے پوچھا۔

"ابھی نہیں" اس بار میری بات کا جواب انگریزن نے دیا۔ "لیکن اس نے زبان نہ کھولی تو بالآخر اسے مرنا ہی پڑے گا!" پھر وہ سیٹھ عثمان سے مخاطب ہوئی "اس لڑکی کو دوبارہ ہوش میں آنے کے لیے تقریباً نصف گھنٹہ لگے گا اور تمھیں علم ہے کہ وقت بہت قیمتی ہے۔ ہمیں ہر حال میں یہ معلوم کرنا ہے کہ اچانک صورتِ حال بدل جانے کا کیا سبب ہے اور اس علاقے کو چاروں طرف سے کیوں گھیر لیا گیا ہے؟ کیا سر تھامسن اصل معاملے کی تہ تک پہنچ چکا ہے؟ کیا اسے علم ہو گیا ہے کہ ہم دونوں یہاں ہیں؟ یہ جاننا بہت ضروری ہے اور وہ بھی جلد از جلد! ممکن ہے کہ وہ اور اس کے گرگے حلقہ تنگ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے والے ہوں"

"پھر... پھر کیا کیا جائے؟" سیٹھ عثمان کے لہجے میں اضطراب تھا "کیسے معلوم کیا جائے کہ اچانک اتنا زبردست ریڈ کیوں ہوا!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز کچھ بدل سی گئی۔

"اپنی آواز پر قابو پاؤ سیٹھ عثمان!" انگریزن نے درشت لہجے میں کہا، پھر چند لمحے توقف کے بعد بولی "میرا خیال ہے کہ جب تک ہم تہ خانے میں ہیں، محفوظ ہیں۔ وہ لوگ تہ خانے کا راستہ تلاش نہیں کر سکیں گے لیکن آخر ہم کب تک یہاں رہ سکتے ہیں! جب یہ دونوں یہاں تہ خانے کے وجود سے واقف ہو سکتے ہیں تو یقیناً سر تھامسن بھی اس سے آگاہ ہوگا، اور تم اسے جانتے ہی ہو۔ وہ ہم پر ہاتھ ڈالنے کی خاطر اس پورے علاقے کی طویل عرصے تک ناکا بندی کرا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم بہرحال گھیر لیے جائیں گے" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی۔

سیٹھ عثمان کچھ نہیں بولا۔ اس کے انداز سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

انگریزن پھر بولی "کیا حرج ہے، اگر اس دوران میں اللہ دتا کو بھی آزما لیا جائے کہ یہ کتنے پانی میں ہے!"

"میں بھی انھی خطوط پر سوچ رہا تھا" سیٹھ عثمان بولا "مگر اسے ہائی پاور کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ لڑکی ہوش میں آئے ہم اللہ دتا کی زبان کھلوانے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں"

"مشکل ہے کہ یہ زبان کھول دے مگر کوشش بہرحال ضروری ہے" انگریزن نے سیٹھ عثمان کی بات سے اتفاق کیا۔

میں ان دونوں کی باتیں سن کر دہل گیا گویا اب وہ مجھے بکرا بنانے کا "پروگرام" بنا رہے تھے۔ ان دونوں کی باتوں ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پورا علاقہ گھیرا جا چکا ہے، یعنی سر تھامسن اپنے "چھ نچ پن" سے باز نہیں آئے تھے۔ انھوں نے مجھے آگے بڑھا کر گویا مجرموں کو شہ دی تھی اور دور دور سے نظارہ مار رہے تھے۔ میں نادانستگی میں ایک بار پھر چارا بنایا جا چکا تھا۔ مچھلی نے یا مچھلیوں نے چارا یا چارے نگل لیے تھے اور اب سر تھامسن ڈوری کھینچ رہے تھے۔ میں اس سارے چکر میں صرف ایک بات نہیں سمجھ پایا تھا کہ جب لیوسی نے تہ خانے کا راستہ تلاش کر لیا تھا تو پھر دوسرے افراد یہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکے تھے؟ یقیناً اس میں بھی کوئی "راز کی مشٹری" تھی جسے وہ دونوں ہی جانتے ہوں گے۔

سیٹھ عثمان، اس انگریزن کے ایما پر اس وقت سرنج میں کوئی ہائی پاور قسم کا محلول بھر رہا تھا اور میری روح تک کانپ رہی تھی۔ جب لیوسی کا تکلیف کے مارے یہ حال ہوا تھا کہ وہ بے ہوش ہوگئی تھی تو میرا کیا بنتا! میں تو یوں بھی جی چھوڑ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں!

ابھی سیٹھ عثمان، سرنج لے کر میری طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک تیز اور بلند آواز سنائی دی "میں تیار ہوں۔ میں چیک پر دستخط کر دوں گا۔ مجھے دوسرا انجکشن لگا دو! میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا!" پھر چیخیں سنائی دینے لگیں۔

خوف کے باوجود مارے حیرت کے میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ وہ آواز بھی سیٹھ عثمان ہی کی تھی جب کہ سیٹھ عثمان میرے سامنے موجود تھا۔

"فی الحال اُسے نیند کا انجکشن لگا دو" انگریزن نے کمرے میں موجود سیٹھ عثمان کو حکم دیا "یہ معاملہ بعد میں نمٹایا جا سکتا ہے"

انگریزن کا حکم سن کر سیٹھ عثمان تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے محلول بھری ہوئی سرنج، انگریزن کو تھما دی تھی۔ انگریزن نے سرنج کو ایک ہاتھ میں تھام لیا تھا اور

دوسرے سے وہ میرے بازو سے قمیص ہٹانے لگی تھی گویا سیٹھ عثمان کو جو فرض ادا کرنا تھا' اس نے سنبھال لیا تھا۔

"تمھیں اپنی امی اور ابا کی قسم جو تم میرے یہ انجکشن لگاؤ۔" میں انگریزن کے سامنے گھگیایا۔ میری نظر میں یہ آخری داؤ تھا جو میں نے آزمایا تھا۔ کسی کو اگر اس کے اماں ابا کی قسم دے دی جائے تو پھر وہ یقیناً اس کام سے باز آجاتا ہے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں میں نے کئی بار اس کا تجربہ کیا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہوں گا مگر قسم دینے کے باوجود اس بدذات انگریزن کا ہاتھ نہ رکا۔ وہ میرے بائیں بازو کی آستین الٹنے لگی۔

"کاش تم اتنے ہی بھولے ہوتے جتنے صورت سے نظر آتے ہو۔" انگریزن عجیب سے لہجے میں بولی "مگر میں جانتی ہوں' تم انتہائی خطرناک ہو۔ رنجیت جیسے ذہین اور سفاک آدمی پر قابو پا لینے والا معمولی ذہانت کا شخص نہیں ہو سکتا۔ رنجیت ٹھیک ہی کہتا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس کی بات نہیں مانی ورنہ وہ بھی جان سے ہاتھ نہ دھوتا اور آج یہ صورتِ حال بھی پیش نہ آتی۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ اب وہ میری پوری آستین الٹ چکی تھی۔

خوف کے سبب میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس سے التجا کی "تم میرے یہ انجکشن نہ لگاؤ میں تمھیں سب کچھ ویسے ہی بتانے کو تیار ہوں۔ یقین کرو' میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تم کہو تو میں کوئی بھی قسم کھا لوں۔"

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی' پھر بولی "کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں چہرے سے دل کا حال جان لیتی ہوں مگر یقین کرو اللہ دتا' تمھارے سامنے میری یہ صلاحیت بیکار ہو گئی ہے۔ تم بہت عظیم اور بہت بڑے اداکار ہو اللہ دتا! تمھارا چہرہ اس وقت چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ تم سچ بول رہے ہو لیکن میں جانتی ہوں' ایسا نہیں ہے۔ تم اتنی جلدی سی راہ پر نہیں آسکتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے انجکشن کی سوئی میرے بازو سے لگا دی۔

اسی وقت سیٹھ عثمان' کمرے میں داخل ہوا۔ میری نظر اس کی طرف اٹھ گئی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ انجکشن کی سوئی میرے بازو میں اتر جاتی' سیٹھ عثمان نے انگریزن کو مخاطب کیا "ملوام! ... ما ... وہ ... وہ ..." سیٹھ عثمان نہ جانے کیوں ہکلا کر رہ گیا۔ اس کی آواز بھی بڑی حد تک بدلی بدلی سی تھی۔

انجکشن کی سوئی معاً میرے بازو سے ہٹ گئی اور انگریزن ایک جھٹکے سے سیٹھ عثمان کی طرف مڑی جو دروازے کے قریب منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ نادانستگی میں شاید اس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تھی۔

"خود پر قابو پانے کی کوشش کرو!" انگریزن کا لہجہ انتہائی خشک اور سخت تھا۔

"جج ... جی ... جی ہاں!" سیٹھ عثمان ہکلا کر رہ گیا۔ اب اس کی آواز پہلے ہی جیسی تھی' بدلی ہوئی نہیں لگ رہی تھی۔

"کس بات نے تمھیں اتنا بدحواس کر دیا ہے؟" انگریزن نے سوال کیا' لہجے میں ابھی تک سختی تھی۔

"اس لڑکی کی ایک پنڈلی سے چھوٹا سا ٹرانسمیٹر بندھا ہوا تھا جو آن بھی تھا۔" سیٹھ عثمان نے بتایا۔ "اسے خواب آور انجکشن دے کر بس یوں ہی مجھے خیال سا آگیا تھا کہ اس لڑکی کی تلاشی بھی لوں' ممکن ہے اس نے کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہو۔ میں نے ٹرانسمیٹر دیکھتے ہی فوراً اس کا سوئچ آف کر دیا۔"

انگریزن' سیٹھ عثمان کی بات سن کر چونک اٹھی' پھر بولی "نہ جانے کیوں اس وقت ہم سے حماقت پر حماقت سرزد ہو رہی ہے! اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں ہونے والی تمام گفتگو سن لی گئی ہو گی۔ یہ بہت برا ہوا۔ اب ہمارا بچنا بہت محال ہے۔ ممکن ہے' اسی ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس لڑکی نے سر تھامسن کو تہ خانے کے راستے سے آگاہ کر دیا ہو۔"

"اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" سیٹھ عثمان جلدی سے بولا۔ "میں نے ان دونوں کو پھانسنے کے لیے دانستہ وہ راستہ بحال کیا تھا ورنہ تمھیں بھی علم ہے کہ ہم وہ راستہ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ جب یہ دونوں میرے جال میں پھنس گئے تو میں نے اس راستے کو دوبارہ ناقابلِ استعمال بنا دیا۔ اب میری خواب گاہ میں موجود دیوار سے وہ سرخ بٹن غائب ہو گا جسے دبانے پر دیوار ہٹ جاتی تھی۔ اب وہ لاکھ سر پٹخ کر مر جائیں' اس راستے سے تہ خانے میں نہیں گھس سکتے۔"

"احمقانہ باتیں نہ کرو!" انگریزن نے جھنجلا کر کہا۔ "اس کا نام سر تھامسن ہے اور وہ راستے پیدا کرنا جانتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ انتہائی احتیاط برتنے کے باوجود آخر کار اس نے ہمیں ڈھونڈ ہی لیا! وہ ہماری بو پا چکا ہے۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں' یا تو ہم اپنی شکست تسلیم کر کے خود کو قانون کے حوالے کر دیں یا پھر خودکشی کر لیں۔"

"ایک تیسرا راستہ بھی ہے!" سیٹھ عثمان مضبوط لہجے میں بولا۔ "ہم ان دونوں کو ڈھال بنا کر یہاں سے نکل جائیں۔"

"کیا تمھارے خیال میں وہ ہمیں آسانی سے نکل جانے دے گا؟ اور کیا ہمیں گرفتار کرنے کے لیے وہ ان دونوں کو قربان نہیں کر دے گا؟" انگریزن کے لہجے میں چبھن تھی۔

"یہی تو ہو گا کہ ہم اس کوشش میں مارے جائیں!" سیٹھ عثمان پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میری رائے میں یہاں چھپ کر موت کا انتظار کرنے سے یا خودکشی کر لینے سے' یہ بہرحال بہتر ہو گا کہ ہم بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے موت کو گلے لگا لیں۔"

میرے لیے یہ بات انتہائی حیرت انگیز تھی کہ سیٹھ عثمان نے

خود پر اس قدر جلد قابو پا لیا تھا اور اب وہ پُرسکون لہجے میں بات کر رہا تھا۔

چند لمحے بعد انگریزن نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' میں تمھاری تجویز سے متفق ہوں! اور اب ان دونوں سے کچھ پوچھنا بھی میرے خیال میں لاحاصل ہی ہے۔ صورتِ حال خود بہ خود بڑی حد تک سامنے آچکی ہے۔ ہم سے پے در پے کئی غلطیاں ہوئی ہیں۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کو پھانس رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سر تھامسن نے ہمیں ان کے ذریعے گرفت میں لے لیا ہے۔ ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس نے جو کچھ سنا ہو گا اس سے وہ سب کچھ جان چکا ہو گا۔ اسے کوٹھی میں تہ خانے کی موجودگی کا علم ہو چکا ہو گا اور یہ بھی کہ اس کے دونوں مُہرے تہ خانے میں پہنچ چکے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ناکا بندی قائم رکھے گا اور تہ خانے کے اندر پہنچنے کی بھی کوشش جاری رکھے گا۔"

"تہ خانے سے نکلنے کے لیے ہمیں بہرحال اس لڑکی کے ہوش میں آنے کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔" سیٹھ عثمان بولا۔

"ہاں اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔" انگریزن نے سیٹھ عثمان کی بات سے اتفاق کیا' پھر سرنج اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "لو اسے میز پر رکھ دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔ جتنے وہ لڑکی ہوش میں آئے' اتنے تم تمام اہم اور ضروری کاغذات جمع کر لو۔ ان میں سے جو کاغذات ساتھ لے جانا لازمی ہیں' انھیں الگ کر لو' باقی فوراً ضائع کر دو۔ چلو میں بھی تمھارے ساتھ چل کر تمھارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔"

سیٹھ عثمان نے انگریزن کے ہاتھ سے سرنج لے کر میز پر رکھ دی اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔

حالات ایک دم یوں نئی کروٹ لے لیں گے' اس کا مجھے علم نہیں تھا ورنہ اس ناہنجار انگریزن کے سامنے یوں نہ گھگیاتا۔ ان دونوں بدذاتوں کی زندگی خود خطرے میں پڑ گئی تھی۔ یہ سوچ کر میں بہت خوش تھا۔ بڈھے سر تھامسن پر میں دل ہی دل میں صدقے واری ہو رہا تھا جو مجھے اور لیوسی کو چارا بنانے کے بعد افیون کھا کر نہیں سو گیا تھا بلکہ اس نے پورے علاقے کو گھیر لیا تھا۔ اگر میرے لیے کوئی تشویش ناک بات تھی تو صرف یہ کہ کہیں سچ مچ وہ بوڑھا' مجھے اور لیوسی کو بَلی نہ چڑھا دے۔ "انگریزن" کا تو یہی خیال تھا کہ سر تھامسن' ان دونوں کو گرفتار کرنے کے لیے مجھے اور لیوسی کو قربانی کا بکرا اور بکری بنا دیں گے۔ معلوم نہیں کتنی دیر میں خیالوں کے بھنور میں چکرا تا رہا۔ میں چونکا اس وقت جب دو افراد کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان میں ایک عورت تھی' دوسرا مرد! وہ دونوں ہی اپنے چہرے مہرے سے قطعی ہندوستانی دکھائی دے رہے تھے۔ میں ان دونوں کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میرے چہرے پر جو میک اپ تھا' وہ ہو بہو' مرد کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ عورت کے چہرے پر وہ میک اپ تھا جو لیوسی نے کیا تھا۔ اس کے جسم پر بھی وہی لباس تھا جو لیوسی پہنے ہوئے تھی۔ اگر اس مرد کو میں نقلی اللہ دتا نہ سمجھتا تو شاید اس عورت کو لیوسی ہی سمجھ بیٹھتا لیکن مرد نقلی ہو سکتا تھا تو وہ عورت بھی نقلی لیوسی ہی ہو سکتی تھی۔

"اب تم اسے لے جا کر ریچرڈ بنا دو۔" عورت کے لب ہلے اور میں اچھل پڑا۔ وہ سو فیصد لیوسی ہی کی آواز تھی۔

"لیوسی!" میں چیخ اٹھا۔

جواب میں وہ عورت ہنس پڑی' پھر آواز بدل کر بولی "اللہ دتا! میں جانتی ہوں کہ تم اتنے احمق نہیں جو مجھے اپنی ساتھی سمجھ بیٹھو ویسے تم سے بہرحال ایک حماقت سرزد ہو ہی گئی کہ تم نے اپنی ساتھی کا نام بتا دیا۔ اس سے مجھے آسانی ہو گئی ورنہ میں کسی مشکل میں بھی پھنس سکتی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا' پھر سختی سے بولی "تم کوئی غیر ذمے دارانہ حرکت نہ کرنا ورنہ میں بے دریغ گولی مار دوں گی۔"

مرد اب میرے جسم پر موجود چمڑے کے بیلٹس کھول رہا تھا اور وہ عورت' یعنی نقلی لیوسی مجھ پر ریوالور تانے ہوئے کھڑی تھی۔ معلوم نہیں وہ دونوں کون تھے اور کیا کھیل کھیل رہے تھے۔ سیٹھ عثمان نے ایک بار انگریزن کو "مادام" کہہ کر مخاطب کیا تھا مگر میں نے جس مادام کو دیکھا تھا' یہ وہ نہیں تھی۔ وہ مادام ڈیزی ڈکوسٹا تھی۔ کچھ کچھ مجھے شبہہ سا تو ضرور تھا کہ دونوں خود کو جو ظاہر کر رہے ہیں' دراصل وہ نہیں ہیں۔ دو عدد سیٹھ "عثمانوں" کا معما بھی ابھی حل نہیں ہوا تھا۔ ظاہر سی بات تھی کہ ان میں سے ایک ہی اصل ہو سکتا تھا' دو نہیں جس طرح اللہ دتا دو نہیں ہو سکتے۔ یہ خیال مجھے دو عدد اللہ دتا دیکھ کر آیا تھا۔ میں تو بہرحال اصلی تھا مگر جو شخص اللہ دتا بن بیٹھا تھا' وہ ضرور بالضرور نقلی ہی تھا۔ تو جس طرح نقلی اللہ دتا اور نقلی لیوسی ہو سکتے تھے اسی طرح نقلی سیٹھ عثمان بھی ہو سکتا تھا۔ میرے خیال میں ساری گڑبڑ اس لیوسی کی بچی نے پھیلائی تھی۔ اس نے ہیروئن بننے کے شوق میں مجھے بھی یہاں لا کر پھنسا دیا تھا' پھر ستم یہ کہ مجھے اس ٹرانسمیٹر کے وجود سے بھی بے خبر رکھا تھا جو اُن محترمہ نے اپنی پنڈلی پر باندھا ہوا تھا۔ "آپریشن کوٹھی عثمان" کے چکر میں پڑ کر میں خود آپریشن ٹیبل پر آلیٹا تھا۔ اس کی بجائے کہ آپریشن میں کرتا' الٹا میرا ہی آپریشن کیا جا رہا تھا۔

میرے جسم سے بیلٹس کھولتے ہوئے اس نقلی اللہ دتا نے مجھ اصلی اللہ دتا کو خوب "ٹٹول ٹٹال" کر دیکھ لیا تھا کہ کہیں میری کسی "ران" سے تو کوئی ٹرانسمیٹر بندھا ہوا نہیں۔

بیلٹس کھل جانے کے باوجود بھی میں "آپریشن ٹیبل" پر

بے سدھ ہی پڑا رہا۔ حالانکہ میرے بائیں گال پہ زور کی کھجلی ہو رہی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ اسے کھجا لوں مگر میں اپنے ارادے سے باز رہا۔ کیا خبر اِدھر میں گال کھجانے کے لیے ہاتھ اٹھاتا' اُدھر وہ بدذات نقلی لیوسی میری کھوپڑی میں روشن دان بنا دیتی۔

"اب اٹھ بھی بیٹھو کہ اسی طرح مٹھول کیے پڑے رہو گے!" نقلی اللہ دتا بالکل میری آواز اور میرے لہجے میں بولا۔

اپنی آواز سن کر میں سچ مچ اچھل پڑا۔ وہ دونوں مجھے جادوگر اور جادوگرنی نظر آنے لگے۔ میں نے اٹھتے ہی پہلے بایاں گال کھجایا' ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر! پھر میز سے نیچے اتر آیا۔ اس دوران میں نقلی اللہ دتا اپنا ریوالور نکال چکا تھا اور نقلی لیوسی نے اپنا خطرناک کھلونا' ایک "خطرناک جگہ" رکھ لیا تھا جہاں سے نکالا تھا۔

نقلی اللہ دتا مجھے اس کمرے سے نکال کر ایک اور قریبی کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کو ایک نظر دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بہ طور میک اپ روم ہی استعمال کیا جاتا ہوگا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے مجھے لباس اتار دینے کا حکم دیا اور اسی کے ساتھ دوسرا لباس میری طرف بڑھا دیا۔

"میں... میں تمھاری موجودگی میں کس طرح کپڑے بدل سکتا ہوں! میں... میں تو نیکر بھی نہیں پہنتا اندر!" میں رونی صورت بنا کر بولا۔

معلوم نہیں میرے لہجے میں کیا بات تھی کہ وہ ہنس پڑا' بالکل میری طرح! پھر وہ بولا "اچھا تم کپڑے بدل لو' میں تمھاری طرف سے پیٹھ پھیر لوں گا' لیکن یہ نہ بھولنا کہ اگر تم نے کوئی چالاکی دکھانا چاہی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے!"

"میں ہمیشہ پانی سے ہاتھ دھوتا ہوں' کسی اور چیز سے نہیں۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنا ضروری سمجھا۔

"بکو مت!" اس نے جھنجلا کر مجھے ڈانٹ دیا' بالکل اسی انداز میں جس طرح میں کمار بدذات کو ڈانٹا کرتا تھا۔

وہ ظالم میری آواز کی اتنی کامیاب نقل کر رہا تھا کہ شاید ایک دفعہ کو تو میری امی بھی دھوکا کھا جاتیں۔ اگر میرے ہونٹ بند نہ ہوتے تو غالباً میں بھی یہی سمجھتا کہ "بکو مت" میری ہی "جنبو" سے نکلا ہے۔ بالغرض میں دھوکا نہ بھی کھاتا تو میرے کان ضرور دھوکا کھا جاتے۔

مجھے نہ بکنے کا حکم دے کر وہ مڑا اور پھر شاید اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسے شاید جاسوسی ناولوں کے سین یاد آ گئے ہوں گے کہ ہیرو عام اور خاص دونوں طور پر ایسے سنہری مواقع کی تلاش میں رہتا ہے اور فوراً ہی اپنے حریف پر چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اس غریب کو کیا علم تھا کہ میں کسی جاسوسی ناول کا ہیرو نہیں' سچ مچ کا ہیرو ہوں جو ایسی حماقت کبھی نہیں کرتا کیوں کہ اس سے زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

"تم اسی طرح کپڑے بدلو!" وہ دوبارہ مڑتے ہی بولا "میں تمھاری طرف پیٹھ نہیں کروں گا۔"

"مگر پیارے بھائی ابھی تو تم نے..."

"پھر وہی بکواس!" اس نے میری بات کاٹ دی اور پھر اسے ایک راہ سوجھ ہی گئی "اگر تم اتنے ہی حیادار ہو تو اس پردے کے پیچھے جا کر کپڑے بدل لو۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا' وہاں چھت سے ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ وہ حصہ غالباً کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں فوراً اس طرف بڑھ گیا۔ جب میں پردہ اٹھا کر دوسری طرف پہنچا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ان دونوں نے میری اور لیوسی کی جگہ لے لی تھی' یقیناً اس سے ان کے شیطانی ذہن کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مجھے اس عورت کا وہ حکم بھی یاد آیا جو اس نے مرد کو دیا تھا۔ اس نے مرد کو حکم دیا تھا کہ مجھے رچرڈ بنا دیا جائے۔ یہ نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ جب عورت کی زبان سے میں نے یہ نام سنا تھا تو چونکنا چاہا تھا لیکن مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا' اس لیے پردے کے پیچھے آتے ہی میں نے پہلا کام یہی کیا' یعنی چونک اٹھا۔ رچرڈ انھی دونوں بین الاقوامی مجرموں میں سے ایک کا نام تھا جن سے سر تھامس کے بڑے مچیٹے ہو چکے تھے اور یہ سارا چکر انھی دو بدبختوں کا چلایا ہوا تھا' ایک عدد مرد اور ایک عدد عورت! یعنی رچرڈ اور سنڈریلا! مرد اور عورت جب ایک ہو جاتے ہیں تو بڑا ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں۔ ایسا ازل ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔ عالم بالا میں بھی انھی دونوں کی قربت سے جھگڑا ہوا تھا اور نتیجتہً جنت سے نکال کر دنیا میں پھینک دیے گئے تھے۔ پھر زمین پر جتنا فساد پھیلا' انھی دونوں کے قرب سے پھیلا۔ اس معاملے میں بھی یہی جوڑی ملوث تھی اس لیے مجھے سراسر خطرہ نظر آ رہا تھا۔ میرے چہرے پر رچرڈ کا میک اپ اور مرد کے چہرے پر میرا میک اپ ہونا' بہ ہر حال میری نظر میں شدید تشویش ناک بات تھی۔

میں تمام باتوں پر غور کرتے ہوئے ابھی قمیص اتارنے کے لیے بٹن کھول ہی رہا تھا کہ میری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی جو اندر سے بند تھی۔ میرے ہاتھ بٹن کھولتے کھولتے رک گئے۔ وہ تو پردے کی دوسری طرف ہے' اگر میں چپ چاپ سے کھڑکی کھول لوں اور پھر باہر کود جاؤں تو کیسی رہتی؟ میں نے سوچا۔ اس وقت میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ مجھے تہ خانے سے نکلنے کا راستہ نہیں معلوم! اور یہ کہ اگر کھڑکی سے کود کر بھاگ بھی لیا تو کہاں جاؤں گا! دراصل ایسی باتوں پر غور کرنا وقت کا زیاں ہے اور میں نے زندگی بھر آئندہ کے بارے میں نہیں سوچا۔ آئندہ جو ہو' وہ ہو' فی الحال تو جان بچا بیٹا! ایسے موقعوں

پر ہمیشہ میرے ذہن میں یہی جملہ گونجتا رہا ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور اس کی چٹخنی پر زور لگانے لگا کیوں کہ وہ شاید کچھ سخت تھی اور غالباً کافی عرصے سے نہیں کھولی گئی تھی۔

"جلدی کرو!" مجھے جیسے اپنی ہی آواز پردے کی دوسری طرف سے سنائی دی "اگر تم نے دیر لگائی تو میں پردہ اٹھا کر اندر آ جاؤں گا!"

"بس... بس پیارے بھائی... بنیان اتار رہا ہوں اور پھر پینٹ اتاروں گا۔" میں نے چٹخنی پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

بڑی مشکل سے چٹخنی اپنی جگہ سے ہلی۔ میں کیوں کہ پوری قوت صَرف کر رہا تھا اس لیے جب چٹخنی کھلی تو زور کی آواز آئی۔

"کیا ہوا؟ یہ آواز کیسی تھی؟" پردے کے پیچھے سے' یعنی باہر سے پوچھا گیا۔

"کک... کچھ نہیں... کچھ نہیں پیارے بھائی!" یہ کہتے ہوئے میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ آہستہ سے کھول دیے۔

"کہیں تم نے کھڑکی تو نہیں کھول لی؟" اس کی آواز میں تشویش تھی۔

"ارے نہیں پیارے بھائی!" یہ کہتے ہوئے میں کھڑکی پر چڑھ گیا اور پھر فوراً ہی باہر کود گیا۔

اسی وقت مجھے ایک حیرت زدہ سی آواز سنائی دی "ارے! یہ آواز پیچھے سے آئی تھی "آخر تم اپنی حرکت سے باز نہیں آئے!" اس نے یقیناً پردہ اٹھا دیا تھا اور چیخ رہا تھا "تم تہ خانے سے نہیں نکل سکتے اللہ دتا!"

میں کھڑکی سے ایک راہ داری میں کودا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ بدذات باخبر ہو چکا ہے کہ میں کھڑکی کے راستے کود گیا رہا ہوں۔ وہ لازماً میرے پیچھے دوڑ لگائے گا۔ یہ سوچتے ہی میں بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی میں کچھ دور ہی گیا ہوں گا کہ "دھم" کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بھی پیچھے سے آئی تھی۔ وہ کم بخت بھی گویا کھڑکی سے کود کر راہ داری میں آ چکا تھا۔ سب سے بڑی خطرے کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ وہ پیچھے سے گولی چلا کر مجھے "میں" بھی کر سکتا تھا' بالغرض میں "ٹیں" نہ بھی ہوتا تو لنگڑا لولا ہو جانا لازمی تھا۔ میں اسی لیے راہ داری میں بھاگنے کی بجائے اُڑا چلا جا رہا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ راہ داری کہاں تک گئی تھی کیوں کہ کچھ ہی فاصلے پر وہ بائیں جانب مڑ گئی تھی۔

"ٹھہر جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!" پیچھے سے وہ منحوس دہاڑا۔

اس وقت تک میں راہ داری کے موڑ تک پہنچ چکا تھا' اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید گولی کھا جانے کے خوف سے وہیں رک جاتا۔ میں "جھٹ" سے مڑ گیا۔ عین اسی وقت فائر ہوا اور گولی غالباً ٹھیک اس جگہ پڑی جہاں سے چند ہی لمحے پہلے میں گزرا تھا۔ پھر بہ یک وقت کئی باتیں ہوئیں جیسے ہی موڑ سے گزر کر میں سیدھا بھاگا اور سامنے دیکھا' میرے فرشتے کوچ کر گئے۔ کچھ دور جا کر راہ داری ختم ہو گئی تھی۔ وہ کسی کمرے کی پچھلی دیوار تھی جہاں جا کر راہ داری نے "دم" توڑ دیا تھا۔ یہ میں اس طرح جان سکا کہ دیوار میں ایک کھڑکی بھی نظر آ رہی تھی جو بند تھی۔ آگے راستہ مسدود تھا اور پیچھے اس صورت حرام کی "صورت" میں قضا لپکی چلی آ رہی تھی۔ اس خبیث کو یقیناً علم رہا ہوگا کہ راہ داری آگے جا کر بند ہو گئی ہے۔ میں نے سوچا۔ قریب تھا' میں خوف و دہشت سے پچھاڑ کھا کر گر پڑتا کہ معاً کھڑکی کھلی۔ اس وقت تک میں کھڑکی تک پہنچ چکا تھا۔ کھڑکی میں مجھے نقلی لیوسی' یعنی اسی مرد کی "ساتھن" کا چہرہ نظر آیا' پھر اس کا ہاتھ' اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا اور وہ کسی قدر بوکھلائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے غالباً فائر کی آواز سن لی تھی۔

"کیا ہوا؟ وہ اللہ دتا کہاں گیا؟" اس نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ ایک سا میک اپ ہونے کے سبب وہ مجھے "اپنا مرد" سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ اللہ دتا ہی سے پوچھ رہی تھی کہ اللہ دتا کہاں ہے!

حیرت خوف اور گھبراہٹ میں نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا "وہ... وہ... اس نے میرا ریوالور چھین لیا ہے اور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ... وہ بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔" میں دہشت اور گھبراہٹ کے سبب بہ مشکل بول پا رہا تھا جس کے سبب خود مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگ رہی تھی۔

"ہوش میں آؤ رچی! تمھیں اس طرح اوسان نہیں کھونا چاہئیں۔" عورت نے سخت لہجے میں کہا اور پھر حکمیہ انداز میں بولی "اوپر آ جاؤ!"

ابھی میں نے کھڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ آگے پیچھے دونوں طرف موت تھی۔

"اگر اوپر نہیں چڑھ سکتے تو لیٹ جاؤ بے وقوف!" عورت پھنکاری "وہ تم پر دوسرا فائر بھی کر سکتا ہے۔"

میں اس کی پھنکار سنتے ہی راہ داری میں لمبا ہو گیا تھا اور آنکھیں بھی کھول دی تھیں۔ قدموں کی چاپ اب بہت قریب آ چکی تھی۔ عورت کا چہرہ اب کھڑکی سے غائب ہو چکا تھا البتہ کھڑکی کی چوکھٹ پر مجھے ریوالور کی سیاہ نال کا کچھ حصہ ضرور نظر آ رہا تھا۔ پھر قدموں کی چاپ قریب آ گئی۔ میں جس رُخ لمبا ہوا تھا' وہ زاویہ کچھ ایسا تھا کہ دونوں طرف دیکھ سکتا تھا' اُدھر بھی جدھر سے وہ ریوالور والا "مردُوا" بھاگتا چلا آ رہا تھا اور کھڑکی کی طرف بھی نگاہ کر سکتا تھا۔ میری نگاہ اس وقت کھڑکی کی بجائے راہ داری کی طرف تھی جدھر سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ

بدذات غالباً آرام آرام سے چلتا ہوا آ رہا تھا ورنہ اب تک کبھی کا وہاں پہنچ چکا ہوتا۔ شاید اس کا سبب وہ راہ داری ہی تھی اسے علم تھا کہ میں وہاں سے کہیں نہیں بھاگ سکتا۔

بالآخر مجھے اس کا منحوس چہرہ نظر آ ہی گیا۔ وہ راہ داری کے موڑ سے گزر کر [illegible] میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ریوالور اب بھی اس کے [illegible] تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتا ایک دھماکا ہوا اور وہ منحوس اپنا سینہ تھامے اوندھے منہ زمین پر آ رہا۔ اس پر فائر کرنے والی اسی کی "ساتھن" تھی جو اب کھڑکی میں نظر آ رہی تھی۔

اس بدبخت کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر میرے قریب آ گرا تھا۔ وہ سینہ تھامے تڑپ رہا تھا۔ پھر وہ سیدھا ہو گیا اور کھڑکی کی طرف دیکھتے ہی پوری قوت سے چیخا "یو... سنڈی... سنڈریلا؟"

یہ آواز میری آواز سے قطعی مختلف تھی۔ مرتے وقت غالباً آدمی یہ ساری باتیں بھول جاتا ہے کہ وہ ایک اور شخص کی آواز کی نقل اتار رہا تھا یا کوئی اور "ڈرامہ" کر رہا تھا۔

"رچرڈ!" عورت بھی شاید اپنے گلے کی ساری نسیں پھلا کر چیخی اور پھر وہ کھڑکی پر چڑھ کر راہ داری میں کود گئی۔ وہ مجھے پھلانگتی ہوئی تیزی سے مرد کی طرف جھپٹی جس کا جسم اب بری طرح اکڑ رہا تھا۔

اگر اللہ تعالیٰ نے میری کھوپڑی میں تولے دو تولے بھی عقل "ہوشیاری" دی ہوتی تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاتا اور اس ناگن کا پھن کچل دیتا، ہمیشہ کے لیے! مگر ایسا ہی ہو جاتا تو میں اللہ دتا نہ ہوتا، کچھ اور ہوتا۔ اس "بدذات" کی پشت میری جانب تھی اور مرد کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا ہوا ریوالور میرے بائیں ہاتھ سے بمشکل فٹ بھر دور تھا۔ میں بہ آسانی ہاتھ بڑھا کر ریوالور اٹھا سکتا تھا مگر مارے دہشت کے جیسے میرے ہاتھ پیروں کی جان ہی نکل گئی تھی۔ میں اسی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا۔

"رچی!... رچی!... یہ کیا ہو گیا رچی!" عورت، مرد کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی اور بھرائی ہوئی آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔ اُسے جیسے نہ اپنا ہوش تھا، نہ اردگرد کے ماحول کا خیال! وہ اب سسکیاں لے رہی تھی اور ان کے درمیان کہہ رہی تھی "مجھے... تم مجھے معاف کر دینا رچی! میں... میں نے دھوکے میں تم پر... تم پر گولی چلا دی۔ مجھے معاف... معاف کر..." عورت کا گلا رندھ گیا اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

"سن... سنڈریلا!... آ... آخری... بو... بوسہ..." مرد نے بمشکل کہا اور اس کے دونوں ہاتھ اٹھے۔ اس کا ایک ہاتھ خون آلود تھا جو وہ پہلے سینے پر رکھے ہوئے تھا۔

"رچی! میرے رچی!" عورت جھکی اور اسی وقت مرد کے اٹھے ہوئے ہاتھ گر پڑے۔ عورت زور سے چیخی "رچی!" پھر وہ مرد کے خون آلود سینے سے لپٹ گئی۔ مرد کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی تھی۔ وہ یقیناً دوسری دنیا کے دور دراز سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ پھر میں نے بڑا عجیب منظر دیکھا۔ عورت نے مرد کے مُردہ چہرے پر بوسوں کی گویا بارش کر دی تھی۔

یہ سین کسی سنسنی خیز کہانی کا ہوتا تو ہرگز ایسا نہ ہوتا۔ مصنف اس عورت کو گوشت پوست کا بنا ہوا دکھانے کی بجائے اسٹیل کا بنا ہوا دکھاتا جس پر کسی جذبے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ عورت فوراً ہی مُرد کو مار کر ایک عدد یا کئی عدد فرمائشی قہقہے مارتی اور پھر "تجھڑ گئے میں نوں" کا نعرہ مار کر مار دھاڑ کا منظر پیش کرتی لیکن یہ کہانی نہیں تھی، واقعہ تھا۔ وہ عورت اسی لیے اپنے ساتھی کی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے رونے سے میرا دل بھی بیٹھا بلکہ لیٹا جا رہا تھا۔ یقیناً اسے مرد سے محبت رہی ہو گی ورنہ یوں دھاڑیں نہ مار رہی ہوتی۔ میرا دل چاہا کہ لیٹے رہنے کی بجائے اٹھوں اور اس غم زدہ عورت کو اپنے سینے سے لگا کر تسلی دلا کر کہ "اے نازنیں! یوں نہ رو ورنہ میرا کلیجا منہ میں آ جائے گا" مگر میں اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔

وہ عورت روتے روتے جیسے ایک دم اپنے حواس میں آ گئی تھی اور اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف لپکی تھی اور میرے قریب پڑا ہوا اپنے ساتھی کا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ اب اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے اور وہ بڑے خوف ناک انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔ آنسو اب بھی اس کی آنکھوں میں تھے۔

"تم... تم دھوکے باز... فریبی... بہروپیے!" وہ پھنکاری مگر آواز بھرائی ہوئی ہی تھی "کاش میں... میں تمہیں اسی وقت گولی مار سکتی اور... تم سے اپنے رچی کے قتل کا انتقام لے سکتی۔ تم... تم نے مجھے دھوکا دے کر میرے ہی ہاتھوں اسے... اُسے قتل کرا دیا۔ میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یقین کرو کہ میں اس ملک سے اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک تمہیں قتل نہ کر دوں گی! اگر... اگر میرا فرار... یہاں سے میرا فرار ضروری نہ ہوتا اور وہ بوڑھا نہ بیٹھا حسن اس علاقے کو گھیرے میں نہ لیے ہوتا تو... تو میں اسی وقت اپنے رچی کا انتقام لے لیتی اور یہ تمہاری زندگی کا آخری دن ثابت ہوتا۔" اب وہ لیوسی کی آواز کی بجائے اپنی اصل آواز میں بول رہی تھی۔

میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سنڈریلا ہی ہے۔ مرنے والے کے بارے میں مجھے معلوم ہی ہو چکا تھا کہ وہ رچرڈ تھا، بین الاقوامی دو مجرموں میں سے ایک! وہ رچرڈ جو سر نعمان حسن جیسے گھاگ کے ہتھے میں نہیں آیا تھا، میری بزدلی اور حماقت کا شکار ہو کر عالمِ بالا کا ٹکٹ کٹا چکا تھا۔ اب صرف اس کی "ساتھن" یا محبوبۂ دل نواز سنڈریلا رہ گئی تھی جو میری چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے زندہ تھی۔ وہ اس وقت بڑی خوف ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ خون لگا ہوا تھا اور چہرے پر بھی!

"اسے اٹھاؤ!" چند لمحے توقف کے بعد سنڈریلا کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ اس نے ریوالور کی نال سے اس طرف اشارہ کیا تھا جہاں رچرڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

"کک... کسے؟... کیا... کیا اٹھاؤں؟... لے..." میں ہکلا کر رہ گیا کیوں کہ لاش اٹھانے کا پہلے مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں اسی لیے جان کر انجان بن رہا تھا۔

"رچرڈ کی لاش!" اس نے سختی سے حکم دے کر سختی ہی سے اپنے جبڑے بھینچ لیے۔

تہ دِ جبراً ہی سہی، مجھے وہ ناخوش گوار فرض ادا کرنا ہی پڑا۔ میں نے رچرڈ کی لاش کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا تھا مگر یہ سوچ سوچ کر میں کسی زندہ انسان کی بجائے لاش اٹھائے ہوئے ہوں، میری جان نکل جا رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ میں لڑکھڑا رہا تھا ورنہ اس کی لاش، گناہوں کے بوجھ کے باوجود زیادہ بھاری نہیں تھی۔

سنڈریلا مجھے ایک کمرے تک لے گئی جو ان دونوں بدبختوں کی خواب گاہ معلوم ہوتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے مجھے حکم دیا کہ لاش کو مسہری پر ڈال دوں۔ میں نے تعمیلِ حکم کی۔ سنڈریلا نے اسے ایک ریشمی چادر اڑھا دی جو مسہری پر دکھی تھی۔ خواب گاہ میں دوسری مسہری بھی موجود تھی۔ میں خاموش کھڑا ہوا اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ پھر میرے ہی سامنے جھک کر اس نے رچرڈ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چہرہ بھی چادر سے ڈھک دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے تھے۔ خواب گاہ ہی میں ایک ایئر بیگ، میز پر رکھا ہوا تھا۔ سنڈریلا نے اسے کاندھے سے لٹکا لیا۔ اس کے بعد سنڈریلا نے مجھے خواب گاہ سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ریوالور کی نال سے کیا گیا تھا اس لیے میں نے قدم اٹھانے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کی۔ اب اس نے ایک ریوالور، ایئر بیگ کی سائڈ پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔

وہ تہ خانہ زیادہ بڑا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی سنڈریلا مجھے لے کر اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں سے کھڑکی کے راستے میں فرار ہوا تھا۔ یہ وہی میک اپ روم تھا جہاں پہلے رچرڈ مجھے لے کر آیا تھا۔

سنڈریلا نے ایئر بیگ کھول کر ایک تصویر نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "تمہیں اب اپنے چہرے پر یہ میک اپ کرنا ہے۔"

میں نے اس سے تصویر لے لی۔ وہ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا "یہ کون صاحب ہیں؟"

"میں غیر ضروری سوال پسند نہیں کرتی!" سنڈریلا سخت لہجے میں بولی "تمہیں جو حکم دیا گیا ہے، اس پر عمل کرو! میں جانتی ہوں کہ تم بہترین میک اپ کر سکتے ہو۔ تمہاری آسانی کے لیے یہ بتا دوں کہ اس سامنے والی میز کی دراز میں تمہیں ایسا سامان مل جائے گا جس سے تم اپنی شکل تبدیل کر سکو۔ اس میں مختلف جھلیاں بھی ہیں۔" وہ اب اپنی اصل آواز میں بول رہی تھی۔

ابھی سنڈریلا کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک تیز چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ یہ چیخ سو فیصد لیوسی کی تھی۔ میں اچھل پڑا اور سنڈریلا بھی چونک اٹھی۔

"اسے شاید ہوش آ گیا ہے۔" سنڈریلا خود کلامی کے سے انداز میں بولی، پھر مجھے مخاطب کیا "چلو! میک اپ بعد میں کرنا۔"

میک اپ روم سے سنڈریلا مجھے ایک اور کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے تک پہنچتے ہوئے مسلسل لیوسی کی چیخیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ یہ کمرہ میرے لیے نیا تھا مگر اس کمرے سے ملتا جلتا تھا جس میں مجھے ہوش آیا تھا۔ یہاں بھی دو "چلتی پھرتی آپریشن ٹیبلز" موجود تھیں جن میں سے ایک پر لیوسی اور دوسری پر سیٹھ عثمان بندھا ہوا تھا۔ لیوسی کے جسم پر وہ لباس تھا جو پہلے سنڈریلا پہنے ہوئے تھی۔ غالباً سنڈریلا نے بے ہوشی کے دوران میں لیوسی کے لباس سے اپنا لباس بدل لیا تھا مگر چہرے پر وہی پہلے والا میک اپ تھا۔

"اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو اس لڑکی کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔" سنڈریلا نے مجھ سے کہا "اسے جو انجکشن پہلے لگایا گیا تھا، اگر اس کا توڑ نہ کیا گیا تو یہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ وہ انجکشن لگائے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہونے والا ہے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا اور اسے دوسرا انجکشن نہ لگایا گیا تو یہ مر جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے سنڈریلا اس میز کی طرف بڑھی جس پر انجکشن کے لیے سرنج اور مختلف شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"آپ یقین کریں، میں نہ کوئی غلط حرکت کروں گا نہ صحیح!" میں جلدی سے بولا کیوں کہ انجکشن لگنے میں تاخیر لیوسی کی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد انجکشن لگتے ہی لیوسی کی چیخیں رک گئیں۔ وہ اب بُری طرح ہانپ رہی تھی جیسے کہیں دور سے بھاگتی چلی آ رہی ہو۔ دوسری میز پر سیٹھ عثمان بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ میرے ہی

سامنے سنڈریلا نے رچرڈ کو حکم دیا تھا کہ سیٹھ عثمان کو خواب آور انجکشن لگا دیا جائے۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہا تھا کہ رچرڈ ہی دراصل نقلی سیٹھ عثمان بنا ہوا ہوگا۔ یہ اندازہ میں نے اس طرح لگایا تھا کہ جب وہ نقلی اللہ دتا بن سکتا تھا تو نقلی سیٹھ عثمان بھی بن سکتا تھا۔ سنڈریلا اور رچرڈ دونوں ہی بھیس بھرنے اور آوازیں بدلنے میں ماہر معلوم ہوتے تھے۔ سنڈریلا نے بھی لیوسی کی آواز کی بڑی کامیاب نقل اتاری تھی۔

لیوسی کے حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ حیرت سے سنڈریلا کو دیکھنے لگی۔ سنڈریلا کے چہرے پر وہی میک اپ نظر آرہا تھا جو لیوسی کے چہرے پر تھا۔ لیوسی کی حالت اعتدال پر آتے ہی سنڈریلا نے مجھے پھر میک اپ روم میں چلنے کا حکم دیا۔ لیوسی ہوش میں آنے کے باوجود وہاں سے فرار نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ اس کا جسم اب تک بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا۔

میک اپ روم میں پہنچ کر مجھے اس تصویر کے مطابق اپنے چہرے کو بدلنا ہی پڑا جو سنڈریلا نے دی تھی۔ جب لیوسی کے چیخنے پر سنڈریلا وہاں سے چلی تھی تو تصویر میک اپ روم ہی کی ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ دی گئی تھی۔ میں نے میک اپ کر کے تصویر سنڈریلا کو واپس کر دی۔ سنڈریلا نے مجھے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے اب تم واقعی رچرڈ معلوم ہو رہے ہو۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "لباس تبدیل کرنے میں دیر لگے گی اس لیے رہنے دو، چہرے کی تبدیلی کافی ہے۔"

چند لمحے بعد ہی سنڈریلا پھر مجھے لیے ہوئے میک اپ روم سے نکل کر اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں لیوسی موجود تھی۔

"اس لڑکی کو کھول دو!" سنڈریلا نے مجھے حکم دیا۔ "اور سنو لڑکی! اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانا چاہی تو میں کوئی رعایت نہیں کروں گی۔"

سنڈریلا کے حکم پر میں نے لیوسی کو بیلٹوں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ پھر اسی کے حکم پر لیوسی نے مجھے اپنی جگہ باندھ دیا۔

"دور ہٹ جاؤ!" سنڈریلا نے لیوسی سے کہا۔ "میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم نے بیلٹیں ٹھیک طرح باندھی ہیں یا نہیں!"

سنڈریلا کی بات سن کر لیوسی کا چہرہ اتر گیا کیوں کہ اس نے واقعی بیلٹیں باندھتے ہوئے اتنی گنجائش رکھی تھی کہ میں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ان کی گرفت سے آزاد ہو سکوں۔ لیوسی ایک طرف ہٹ گئی تو سنڈریلا میز کے قریب آئی اور بیلٹیں دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تم آخر ہوشیاری دکھانے سے باز نہیں آئیں!" سنڈریلا ناگوار لہجے میں بولی اور پھر بیلٹیں کسنے لگی۔ اس دوران میں وہ لیوسی کی طرف سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں رہی تھی۔ لیوسی بھی اب بہت چوکنا نظر آرہی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ موقع کی منتظر ہو۔

جب سنڈریلا اپنے کام سے فارغ ہو گئی تو اس نے لیوسی کو اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ آگے آگے لیوسی تھی، پیچھے پیچھے سنڈریلا! وہ دونوں کمرے سے چلی گئیں تو میں سوچنے لگا کہ آخر اس سارے "ڈرامے" کا مقصد کیا ہے؟ مجھے رچرڈ بنا دیا گیا تھا، اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ لیوسی کو سنڈریلا بنایا جانے والا تھا۔ چہروں کی اس تبدیلی کا مقصد میری سمجھ میں اس وقت آیا جب سنڈریلا، لیوسی کے ہمراہ اس کمرے میں واپس آگئی۔ لیوسی کے چہرے پر اب ایک "انگریزن" کا میک اپ تھا اور یہ چہرہ بھی میرے لیے رچرڈ کے چہرے کی طرح قطعی اجنبی تھا۔ سنڈریلا نے لیوسی کو حکم دیا تھا کہ وہ دور ہٹ کر کھڑی ہو جائے، پھر اس نے ائیر بیگ سے چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ وہی ٹرانسمیٹر ہوگا جو لیوسی کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ سنڈریلا نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کر دیا، پھر وہ بالکل لیوسی کے لب ولہجے میں بولی۔ "سر! لیوسی ون سائڈ! لیوسی سر! اوور!"

تھوڑی دیر بعد ہی سنڈریلا اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے جواب میں جو آواز سنی تھی اسے سن کر چونک اٹھا۔ یہ آواز تیواڑی جی کی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "تیواڑی ون سائڈ! کیا بات ہے لیوسی؟ ہمیں یہ تو علم ہے کہ تم اور اللہ دتا، تہ خانے کے اندر پہنچ چکے ہو مگر ہمیں تہ خانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ ہم حلقہ تنگ کرتے ہوئے اب کوٹھی میں گھس چکے ہیں اور کوٹھی کے باہر بھی سخت پہرا ہے۔ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ ہم نے سیٹھ عثمان کی خواب گاہ میں بھی پہنچ کر راستہ تلاش کیا کیوں کہ ٹرانسمیٹر پر سنی جانے والی تمہاری گفتگو سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ تم لوگ وہیں سے تہ خانے میں اترے ہو مگر ہمیں نہ وہ سوئچ بورڈ کسی دیوار پر ملا اور نہ ہی کوئی اور راہ ملی۔ تم دونوں، یعنی اللہ دتا اور تم ہمیں باہر نہیں ملے، اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ تم راہ پر لگ چکے ہو، پھر تمہاری گفتگو ٹرانسمیٹر پر سن کر ہمیں مزید یقین ہو گیا۔ میں نے اسی لیے تمہیں ٹرانسمیٹر دیا تھا جو کام آیا۔ بہرحال اب بتاؤ کہ ہم کس طرح تہ خانے میں پہنچ سکتے ہیں؟ صورت حال کیا ہے؟ اللہ دتا بھی تمہارے ساتھ ہے یا نہیں؟ اور یہ اتنی دیر ٹرانسمیٹر کیوں خاموش رہا؟ اس کے علاوہ یہ بھی بتاؤ کہ مجرم کہاں ہیں؟ کیا تم دونوں نے ان پر قابو پا لیا ہے؟ اوور۔"

"مجرموں سے نبرد آزمائی کے دوران میں نہ جانے کیسے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف ہو گیا تھا سر!" سنڈریلا، لیوسی کی آواز میں بول رہی تھی۔ "اسی لیے آپ سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ صورت حال یہ ہے سر کہ دونوں مجرم میرے قابو میں ہیں، سنڈریلا بھی اور رچرڈ بھی! یہاں سیٹھ عثمان بھی ہے جسے ان دونوں مجرموں نے قید کر رکھا تھا۔ معلوم نہیں، کب سے اور کیوں! یہیں ایک کمرے میں ہمیں اس کی ملازمائیں بھی بند ملی ہیں جنہیں ابھی ہم نے رہا نہیں کیا۔ اس کے علاوہ

ہم نے سیٹھ عثمان کو بھی ابھی اسی کے حال پر چھوڑ دیا ہے کیوں کہ مجرموں نے اسے خواب آور انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ بہرحال ایک اطلاع آپ کے لیے غالباً سخت تکلیف دہ ہوگی کہ مجرموں سے معرکہ آرائی کے دوران میں اللہ دتا مارا گیا۔ اوور!"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے سنڈریلا کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں اس کی اداکاری پر دنگ رہ گیا۔ اس بدذات نے مجھ زندہ جوان رعنا کو باتوں ہی باتوں میں "موت کے گھاٹ" اتار دیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ چیخ کر کہہ دوں، نہیں تیواڑی جی یہ سسری جھوٹ موٹ کہہ رہی ہے، ابھی تو میں زندہ ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں۔ بھلا اس طرح کیسے عین نوجوانی میں مر جاؤں گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چیخ پڑوں، دوسری جانب سے تیواڑی جی کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ "کیا؟... کیا واقعی... واقعی لیوسی؟ مگر... مگر کیسے؟ خیر تفصیلات بعد میں معلوم ہو جائیں گی، بہرحال یہ خبر سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ ہاں، اب تہ خانے کا راستہ بتاؤ! اوور۔"

"سر! تہ خانے میں باہر سے آنے کا جو راستہ سیٹھ عثمان کی خواب گاہ میں تھا، اسے مجرموں نے ناکارہ بنا دیا ہے، اب صرف اندر سے باہر جانے کا راستہ ہے جو ہم نے مجرموں پر تشدد کر کے معلوم کیا ہے۔ وہ راستہ کوٹھی ہی کے ہال کمرے میں نکلتا ہے۔ آپ وہاں تیار رہیں، میں دونوں مجرموں کو لے کر اسی راستے سے آرہی ہوں۔ بڑے والے ستون سے دور رہیے گا کیوں کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹے گا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ستون چھت سے پیوست ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ بات میں نے اس لیے بتائی ہے کہ آپ کو میری بات مضحکہ خیز یا عجیب نہ لگے اور آپ یہ نہ سوچیں کہ ستون کس طرح حرکت کر سکتا ہے۔ اور کوئی خاص بات؟ یا میں ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دوں سر! اوور۔"

"نہیں، اور کوئی خاص بات نہیں۔" تیواڑی جی کی آواز آئی۔ "میں فوراً مسلح افراد کو لے کر ہال کمرے تک پہنچ رہا ہوں۔ تم گھبرانا نہیں اور بہت چوکنا رہنا! وہ دونوں بہت خطرناک ہیں۔ تم نے غالباً ان دونوں کو بے بس کر دیا ہے۔ تم مجرموں کو لے کر تہ خانے سے باہر آ جاؤ گی تو ہم اسی راستے سے اندر پہنچ کر بقیہ تمام افراد کو بھی حراست میں لے لیں گے اور تہ خانے کی تلاشی بھی اسی وقت لے لی جائے گی۔ مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔ اوور اینڈ آل!"

سنڈریلا نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔ اس کے چہرے سے جذباتی ہیجان کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹر دوبارہ ائیر بیگ میں رکھ لیا۔ جس وقت سنڈریلا، ٹرانسمیٹر پر تیواڑی جی سے گفتگو کر رہی تھی، لیوسی غیر محسوس انداز میں آہستہ آہستہ میری میز کے قریب ہو گئی تھی۔ پھر اس نے نہ جانے کیا سوچ کر میرا دایاں ہاتھ بیلٹ کی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ میری نظر میں اس وقت لیوسی کی یہ حرکت محض احمقانہ ہی تھی۔ بھلا بتاؤ، جب میں پورے کا پورا کھلا ہوا تھا تو اس ظالم عورت کا کچھ نہ بگاڑ پایا، پھر ایک ہاتھ آزاد ہو جانے سے کیا فرق پڑتا! اس کے پاس ریوالور تھا اور گولی چلانے کی ہمت بھی، ایسی صورت میں ایک ہاتھ آزاد ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے! اگر وہ لیوسی کی حرکت دیکھ لیتی تو کم از کم اسے تو لٹا ہی دیتی لمبا لمبا یا لمبی لمبی!

ابھی میں یہی سوچ سوچ کر دہل رہا تھا کہ کہیں لیوسی کی حرکت کا سنڈریلا کو علم نہ ہو جائے کہ سنڈریلا کے بے ساختہ قہقہے نے مجھے مزید دہلا دیا۔ وہ بالکل مجنونانہ انداز میں ہنس رہی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کی ہنسی رک گئی اور وہ دانت پیس کر بولی۔ "اب میرا راستہ خود بخود صاف ہو گیا ہے۔ مجھے تم دونوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں تم دونوں کو گولی مار کر فرار ہو جاؤں گی کیوں کہ وہ سارے احمق کوٹھی میں اور کوٹھی کے باہر جمع ہو چکے ہیں۔ میں ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے کوٹھی سے کافی فاصلے پر نکلوں گی، وہیں جہاں میں نے اللہ دتا کو ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تھا۔ سرنگ کا دہانہ وہیں قریب ہے، جھاڑیوں سے چھپا ہوا! ہنگامہ ہوتے ہی اور صورت حال کی نزاکت کا احساس ہونے کے بعد میں اور رچرڈ اسی سرنگ کے ذریعے باہر کا جائزہ لینے گئے تھے۔ پھر ہمیں دوبارہ اسی سرنگ کے ذریعے اندر آنا پڑا تھا۔ ہمیں فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ فائرنگ دھوکا تھی اور ہمیں باہر نکالنے کے لیے ہی کی گئی تھی۔ اس وقت ہر طرف سرچ لائٹس کے جھمگھٹے پھیلے ہوئے تھے۔ انھوں نے رچرڈ پر فائرنگ بھی کی تھی مگر رچرڈ انھیں غچا دے کر اندر آگیا اور ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔ ہرچند کہ میں نے آج تک خون بہانے سے حتی الامکان گریز کیا ہے لیکن میں اپنے رچی کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑ سکتی۔ تم دونوں اب مرنے کے لیے..."

پھر جو کچھ ہوا تھا، بس چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔ سنڈریلا کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیوں کہ ایک بھاری پیپر ویٹ پوری قوت سے اس کی پیشانی پر پڑا۔ نہ جانے کب اور کہاں سے لیوسی نے وہ پیپر ویٹ اٹھا لیا تھا۔ ویسا ہی ایک اور پیپر ویٹ میں نے اس میز پر دیکھا تھا جس پر انجکشن وغیرہ کا سامان رکھا ہوا تھا۔ غالباً لیوسی نے کمرے میں داخل ہوتے وقت ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی کیوں کہ وہ میز دروازے کے قریب ہی تھی اور لیوسی اس کے قریب سے گزری تھی۔

پیشانی پر پیپر ویٹ پڑتے ہی سنڈریلا چیخ کر لہراتی ہوئی گری تھی لیکن گرتے گرتے اس نے فائر کر دیا تھا۔ گولی سنسناتی ہوئی میرے اوپر سے گزری تھی اور پھر لیوسی کی گردن چھیدتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی تھی۔ لیوسی بھی ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخی تھی اور بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔ میں جیسے پتھر بنا ہوا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جیسے میں اپنے حواس میں آ گیا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ لیوسی اور سنڈریلا دونوں ہی مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ دونوں کس حال میں تھیں۔ میں پہلے جسے لیوسی کی حماقت سمجھ رہا تھا، وہی میرے کام آئی ورنہ یا تو سنڈریلا ہوش میں آنے کے بعد مجھے قتل کر دیتی یا پھر میں وہیں بندھا بندھا، بھوک اور پیاس سے مر جاتا۔

لیوسی نے میرا جو دایاں ہاتھ بیلٹ کی گرفت سے آزاد کیا تھا اسی سے میں نے اپنے جسم پر بندھی ہوئی دوسری بیلٹیں کھول دیں۔ پھر چند لمحے بعد ہی میں میز سے اچھل کر نیچے آ رہا۔ پہلے میں لیوسی کی طرف متوجہ ہوا جو میز ہی کے قریب گٹھری بنی پڑی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا جسم جیسے خون میں نہا گیا تھا۔ سانس اب بھی چل رہا تھا مگر رک رک کر۔ اگر اسے فوری طبی امداد مل جاتی تو شاید وہ بچ سکتی تھی۔ میں نے اس کی نبض بھی دیکھی۔ نبض کی رفتار بھی بہت مدھم تھی اور گردن کے زخم سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟ میں نے سوچا اور اسی وقت ایک ہلکی سی کراہ سن کر اچھل پڑا۔

وہ سنڈریلا ہی تھی جو کراہ رہی تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اس کے ماتھے پر بڑا سا سرخ "پھول کھلا" ہوا تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے ریوالور جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا، یہ سوچ کر کہ کیا خبر وہ کب ہوش میں آ کر "ڈزنگ ڈاز" شروع کر دے۔ وہ غالباً ہوش میں آ رہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ اسے اٹھایا اور ٹیبل پر لٹا دیا۔ ایئر بیگ جو اس کے شانے سے لٹکا ہوا تھا، پھسل کر زمین پر جا پڑا۔ میں نے اسے میز پر لٹاتے ہی اس کا جسم بیلٹوں سے کس دیا۔ اب میں گویا اس کی ہر آفت سے محفوظ ہو چکا تھا۔

سنڈریلا کی طرف سے مطمئن ہو کر میں دوبارہ لیوسی کے قریب پہنچا۔ اس وقت مجھے زبردست دھچکا پہنچا تھا جب میں نے محسوس کیا تھا کہ لیوسی اب ہر تکلیف سے آزاد ہو چکی ہے۔ لیوسی دم توڑ چکی تھی۔ اس کے انجام پر میری آنکھیں بھر آئیں۔ جس وقت وہ میرے ساتھ چلی تھی، وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ اس کا آخری سفر اور آخری مشن ثابت ہوگا۔ اس نے جان دے کر بس مجھے کامیابی سے ہم کنار کر دیا تھا۔ وہ اگر سنڈریلا پر حملہ نہ کرتی اور اپنی جان پر نہ کھیل جاتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ کچھ دیر میں گم صم سا اس کی لاش کے قریب بیٹھا رہا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ایک دم ہو کیا گیا۔ سب کچھ ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔

کافی دیر بعد یہ احساس ہوا کہ تہ خانے سے نکلنے کا راستہ مجھے نہیں معلوم، وہاں میں گویا پھنس کر رہ گیا تھا۔ سیٹھ عثمان "فیں" پڑا تھا اور اس کے جلد ہوش میں آنے کے آثار نہیں تھے کیوں کہ اسے خواب آور انجکشن دیا گیا تھا۔ رہی سنڈریلا تو وہ بھی فی الحال بے ہوش تھی لیکن ہوش میں آ جانے کے بعد بھی اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ سیدھے سبھاؤ وہاں سے نکلنے کا راستہ بتا دیتی۔ معاً مجھے سیٹھ عثمان کی ملازماؤں کا خیال آیا۔ اگر سنڈریلا نے لیوسی کی آواز میں تیواڑی جی سے سچ بولا تھا تو ان سبھی کو تہ خانے کے کسی کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے انھیں راستے کا علم ہو۔ یہ امید موہوم ہی سی تھی اس لیے کہ مجھے کچھ یقین سا نہیں تھا، ان میں سے کوئی راستے سے باخبر ہوگی۔ اس کے باوجود میں ان کی تلاش میں کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔

کمرے سے نکلتے ہی مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ جب سے میں اس خونیں تہ خانے میں آیا تھا، دو عدد لاشیں گر چکی تھیں اور دو لاشیں تہ خانے ہی میں تھیں۔ میرے پاؤں اس احساس کے ساتھ ہی من من بھر کے ہو گئے۔ نتیجتاً میں پھر اسی کمرے میں لوٹ آیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ تیواڑی جی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب بتا سکیں۔ سنڈریلا نے میرے سامنے وہ ٹرانسمیٹر، ایئر بیگ میں رکھا تھا۔ میں نے ایئر بیگ کھول لیا۔ اس میں مختلف کاغذات موجود تھے جنھیں پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ ان دونوں بین الاقوامی مجرموں نے پورے ہندوستان میں اپنی سازش کا جال پھیلا دیا تھا۔ چھوٹے موٹے سیاسی لیڈروں کو انھوں نے یا تو خرید لیا تھا یا انھیں بلیک میل کر کے اپنے حق میں استعمال کر رہے تھے۔ وہ دستاویزات بھی اس بیگ میں تھیں جن کے بل پر ان لیڈروں کو بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں، صرف پہلا پتھر پھینکنے کی دیر تھی۔ پورا ہندوستان خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا، سارے ہندوستان کو فرقہ وارانہ فسادات اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور اس طرح انگریز حکومت کے پاؤں اکھڑ جاتے۔ مجھے اس ایئر بیگ میں ایسے کاغذات بھی ملے جن سے معلوم ہوا کہ ہندوستان بھر میں کہاں کہاں کون کون سی زیرِ زمین تنظیمیں ہیں جو انگریزوں کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ کچھ تنظیموں کو مجرموں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا تاکہ بہ وقت ضرورت ان سے کام لیا جا سکے۔ رگھوناتھ والی تنظیم کو بھی مجرموں نے انگریزوں کے خلاف سمجھا تھا اور اسی لیے اس سے ساز باز کرنے کی خاطر رنجیت تنظیم میں شامل ہوا تھا مگر وہ تنظیم، انگریزوں کے خلاف کام کر رہی تھی اور نہ ہی رنجیت اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ میری احمقانہ مداخلت نے ان کا سارا کھیل چوپٹ کر دیا تھا۔

وہ کاغذات اور دستاویزات واقعی بہت اہم تھیں۔ میں نے ان کا تفصیلی مطالعہ کر کے دوبارہ انھیں ایئر بیگ میں رکھ دیا۔ انھی

کاغذات کا مطالعہ کر کے سیٹھ عثمان کا معما بھی حل ہو گیا کہ وہ مجرموں کا ساتھ کیوں دے رہا تھا۔ پھر میں نے ٹرانسمیٹر آن کر کے تیواڑی جی سے رابطہ قائم کیا۔

"کیا... کیا تم زندہ ہو اللہ دتا؟ اوور۔" تیواڑی جی کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔

میں نے جواب میں انھیں مختصراً ساری روداد سنا دی مگر روداد سناتے سناتے ہیرو بننے کے شوق میں ڈنڈی مار ہی گیا۔ آپ مجھے احسان فراموش نہ کہیں تو بتا دوں کہ میں لیوسی کی قربانی کو سرے سے گول کر گیا تھا۔ میں نے فی الحال تیواڑی جی کو اہم کاغذات کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے انھیں صرف وہی باتیں بتائی تھیں جو بہت ضروری تھیں اور یہ کہ اب حالات میرے قابو میں ہیں۔ ایک مجرم کو میں اپنی "ذہانت" سے کام لے کر دوسرے کے ہاتھوں قتل کرا چکا ہوں اور دوسرا مجرم یعنی کہ مجرمہ بندھی پڑی ہے۔ میں نے تیواڑی جی پر زور دیا کہ وہ تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں ورنہ مجھے بہرحال سیٹھ عثمان یا سنڈریلا کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ تیواڑی جی نے مجھے یقین دلایا کہ وہ راستہ تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے بہ جلد ہی کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے تیواڑی جی کو سیٹھ عثمان کے بارے میں معلوم ہونے والی نئی اہم باتوں سے بھی آگاہ نہیں کیا تھا۔

ادھر میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کیا، ادھر ہلکی سی کراہ سن کر سنڈریلا کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی۔ میں جھپٹ کر اس کے قریب پہنچا اور بولا۔ "اگر تم مجھے تہ خانے سے نکلنے کا راستہ نہیں بتاؤ گی تو پھر میں تمھارے بھی انجکشن لگا دوں گا، ہاں! پھر تم بھی تڑپو گی تڑپی! اور چیخو گی بھی!"

جواب میں سنڈریلا نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا، پھر بولی۔ "اللہ دتا! میں ہار چکی ہوں اور تم وہ پہلے شخص ہو جس نے مجھ پر فتح پائی ہے۔ میں تمھیں یہاں سے نکلنے کا راستہ ضرور بتا دوں گی لیکن جواب میں تمھیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے گی۔ میں اس وقت بہت تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ دیوار کے قریب رکھی ہوئی میز کی نچلی دراز میں ایک شیشی رکھی ہے جس میں کیپسول ہیں۔ تم ان میں سے ایک کیپسول نکال کر مجھے کھلا دو تاکہ میری تکلیف ختم ہو جائے، پھر میں تمھیں یہاں سے نکلنے کا راستہ بتا دوں گی۔ اس کے علاوہ میں تمھیں ایک اور بات بھی بتانا چاہتی ہوں، وہ یہ کہ سیٹھ عثمان کو ہوش میں لانا بہت ضروری ہے۔ اسے جو خواب آور انجکشن دیا گیا ہے وہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔ دو گھنٹے سے پہلے پہلے اگر اسے ہوش میں لانے کے لیے دوسرا انجکشن نہ دیا گیا تو پھر وہ کبھی ہوش میں نہ آ سکے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا۔ مجھے کیپسول کھلاتے ہی تم اسے بھی انجکشن دے دینا تاکہ..."

"مگر مجھے کیا معلوم اسے کون سا انجکشن دینا چاہیے۔" میں سنڈریلا کی بات کاٹ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور پھر میں نے آج تک کسی کو انجکشن بھی نہیں لگایا۔"

"انجکشن لگانا کوئی بڑی بات نہیں۔" سنڈریلا کراہتی ہوئی بولی۔ "رہی یہ بات کہ کون سا انجکشن لگانا ہے تو تم میز پر رکھی ہوئی سرخ ڈھکنے والی شیشی میں موجود محلول سرنج میں بھر لینا۔"

سنڈریلا نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی اور وہ مجھے تہ خانے سے نکلنے کا راستہ بتانے پر بھی آمادہ تھی اس لیے کچھ تو انسانی ہمدردی کے ناتے اور کچھ اپنی غرض کی خاطر میں نے اس کی بات مان لی۔

پھر میں نے جیسے ہی کیپسول اس کے منہ میں ڈالا، وہ ہذیانی انداز میں ہنس پڑی پھر بولی۔ "سنڈریلا کو زندہ گرفتار کرنا کھیل نہیں اللہ دتا! میں نے اب تک اپنی مرضی کی زندگی گزاری ہے اور اپنی پسند ہی کی موت قبول کر رہی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کیپسول نگل لیا۔

کچھ دیر میرے پلے ہی نہ پڑا کہ اس نے کیا کیا ہے اور وہ ہنس کیوں تھی۔ پھر جب اس کا جسم ایک دم اینٹھا اور منہ سے جھاگ نکلنے لگے تو سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ آخری لمحوں میں بھی مجھے دھوکا دے گئی تھی۔ وہ کیپسول ہی اس کی زندگی کی کہانی ختم کرنے کا سبب بنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔

اب کمرے میں ایک کی بجائے دو دو لاشیں تھیں۔

معاً مجھے سیٹھ عثمان کا خیال آیا اور پھر سنڈریلا کی بات یاد آئی کہ اگر اسے انجکشن نہ لگایا گیا تو وہ مر جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں تیزی کے ساتھ میز کی طرف بڑھا اور سرخ ڈھکنے والی شیشی کا محلول سرنج میں بھر لیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ عین وقت پر مجھے عقل آ گئی ورنہ سیٹھ عثمان بھی کام سے گیا ہوتا مگر اس عقل آنے میں بھی میری بزدلی کو دخل تھا۔ گوشت میں سوئی بھونکتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ گئے۔ پھر اسی وقت مجھے خیال آیا کہ کہیں سنڈریلا نے یہ بھی غلط نہ کہا ہو۔ نتیجتاً میں نے وہ محلول اس کے جسم میں نہیں اتارا۔ بعد میں وہ محلول زہر ہی ثابت ہوا تھا۔

میں نے انجکشن دوبارہ میز پر لے جا کر رکھ دیا اور اسی پر رکھا ہوا پانی سے بھرا جگ اٹھا لیا۔ میں نے سیٹھ عثمان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو کچھ دیر بعد ہی اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں گہری غنودگی کے سبب سرخ ہو رہی تھیں۔ کافی دیر میں وہ اس قابل ہوا کہ کچھ کہہ سکے۔

سیٹھ عثمان کی زبان سے یہ سن کر کہ وہ ایک طویل عرصے سے تہ خانے

میں قید ہے، میں دنگ رہ گیا۔ سیٹھ عثمان نے اپنی جوانی کی ایک بھول کا مجھ سے اعتراف کر لیا۔ مجرموں کے پاس کچھ ایسے ناقابلِ تردید ثبوت تھے کہ سیٹھ عثمان ان کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ برطانیہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ کچھ قابلِ اعتراض تصاویر بھی مجرموں کے پاس تھیں جن کی تشہیر سیٹھ عثمان کی ساری عزت اور نیک نامی کو خاک میں ملا سکتی تھیں۔ یہ تمام تصاویر، سنڈریلا کے ساتھ تھیں۔ ان کے علاوہ ایک حالیہ تصویر بھی تھی۔ وہ تصویر تقریباً سال بھر پہلے کی تھی، اس وقت کی تصویر جب سنڈریلا نے ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ یہ تمام تصاویر خفیہ طور پر کھینچی گئی تھی اور سیٹھ عثمان کو ان کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ سنڈریلا نے سیٹھ عثمان کو عشق کا جھانسا دیا تھا اور ایک طویل عرصے تک اسے بے وقوف بناتی رہی تھی۔ سیٹھ عثمان نے اسی لیے شادی بھی نہیں کی تھی۔ سنڈریلا سے اس کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی مگر سنڈریلا نے اسے اپنا اصل نام بتانے کی بجائے ایک فرضی نام سوزی بتایا تھا۔ طویل عرصے کے بعد جب سنڈریلا نے ہندوستان آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو سیٹھ عثمان خوش ہو گیا۔ وہ اب تک سنڈریلا سے شادی کے لیے کہتا آیا تھا مگر سنڈریلا ہر بار اس مسئلے کو ٹال جاتی تھی، کسی نہ کسی بہانے! سیٹھ عثمان نے سنڈریلا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ سیٹھ عثمان نے تو اپنا وعدہ وفا کیا تھا مگر سنڈریلا دھوکے باز نکلی۔ جب وہ سیٹھ عثمان سے پہلی بار ملی تھی، اس وقت بھی رچرڈ اس کا محبوب تھا۔ پھر بعد میں سنڈریلا نے رچرڈ ہی سے شادی بھی کر لی تھی۔ یہ ساری باتیں سیٹھ عثمان کو بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ سیٹھ عثمان سال میں کم از کم ایک بار دنیا کے کسی نہ کسی ملک میں سنڈریلا سے جا کر ضرور ملتا تھا کیوں کہ سنڈریلا کبھی کہیں ہوتی تھی، کبھی کہیں۔ اس دوران میں سیٹھ عثمان کو رچرڈ کہیں نہیں ملا۔ سنڈریلا، سیٹھ عثمان کی آمد سے قبل ہی رچرڈ کو الگ کر دیتی تھی۔ سیٹھ عثمان کو پھانسنے کا مقصد حصولِ زر کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ پھر جب سنڈریلا اور رچرڈ، جرمن جاسوس بن کر ہندوستان آئے تو سیٹھ عثمان ہی ان کے کام آیا۔ رچرڈ کا تعارف سنڈریلا نے اپنے ایک قریبی عزیز اور دوست کی حیثیت سے کرایا تھا۔ کچھ دن ہی میں سیٹھ عثمان کو اندازہ ہونے لگا کہ رچرڈ اور سنڈریلا کے تعلقات دوستی کی حدود سے آگے ہیں۔ اس بارے میں اس نے سنڈریلا سے احتجاج کیا۔ سنڈریلا نے اسے مطمئن کرنا چاہا مگر بات بن نہ سکی۔ پھر اسی دوران میں سنڈریلا کے مطالبے بڑھتے گئے اور اس کی حرکات و سکنات بھی سیٹھ عثمان کو مشتبہ نظر آنے لگیں۔ اسے احساس ہو گیا کہ سنڈریلا اور رچرڈ یقیناً ملک دشمن کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ وہ دونوں عموماً دہلی سے باہر کے دورے بھی کرتے رہتے تھے۔ سیٹھ عثمان سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اپنے شکوک کا صاف صاف اظہار کر دیا۔ یہی وہ وقت تھا کہ سیٹھ عثمان کی زبان بند رکھنے کے لیے سنڈریلا اور رچرڈ کھل کر سامنے آ گئے۔ انھوں نے سیٹھ عثمان کو دھمکی دی کہ اگر وہ ان کے اشاروں پر نہ چلا تو اس کی عزت خاک میں ملا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جان کر سیٹھ عثمان کو شدید صدمہ پہنچا۔ مجرموں نے اسے صاف صاف سب کچھ بتا دیا تھا کہ سیٹھ عثمان کے خلاف ان کے پاس کیا کیا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں اور یہ بھی کہ سنڈریلا دراصل رچرڈ کی بیوی ہے۔

کچھ دنوں تو سیٹھ عثمان ان کے مطالبات مانتا رہا، پھر اس نے سختی برتنا شروع کر دی۔ وہ واضح طور پر سمجھ چکا تھا کہ ملک دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ اس کی دولت ملک کی تخریب میں صرف ہو رہی ہے۔ مجرموں کو بھی غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ اب کسی بھی وقت سیٹھ عثمان تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر ان کے مطالبات ٹھکرا دے گا۔ سیٹھ عثمان، سنڈریلا کو اپنے تہ خانے کی سیر کرا چکا تھا جو اس نے محض اپنی تفریحِ طبع کی خاطر اور اپنے شوق سے مجبور ہو کر بنوایا تھا۔ اسے ایسی تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ مجرموں نے سیٹھ عثمان کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اسے تہ خانے میں قید کر دیا اور پھر رچرڈ، سیٹھ عثمان بن گیا مگر وہ سیٹھ عثمان کے دستخطوں کی کامیاب نقل نہ کر سکا۔ سیٹھ عثمان کے دستخط کچھ اتنے ہی پیچیدہ تھے۔ یہی سبب تھا کہ جب مجرموں کو پیسے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ سیٹھ عثمان پر تشدد کر کے اس سے مطلوبہ رقم کے چیک پر دستخط کرا لیتے تھے۔ آج رات بھی وہ سیٹھ عثمان سے ایک بڑی رقم کے چیک پر دستخط کرانے والے تھے مگر سیٹھ عثمان آمادہ نہیں ہو رہا تھا اسی لیے اس پر تشدد کیا جا رہا تھا۔ سیٹھ عثمان ہی نے یہ بھی بتایا کہ پہلے اس کی کوٹھی میں مرد ملازمین تھے جنھیں رچرڈ نے نکال دیا اور ان کی جگہ خوب صورت ملازمائیں رکھیں جو اس کی داشتائیں بھی تھیں۔

میں نے بھی سیٹھ عثمان کو مختصراً کچھ حالات بتا دیے اور یہ بھی کہ سنڈریلا کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ مجھے بے حد حیرت ہوئی جب میں نے سیٹھ عثمان کو سنڈریلا کی موت کے بارے میں بتایا۔ ایک دم اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا: ”بے وفا! مجھ سے پہلے چلی گئی۔“

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ سیٹھ عثمان کی بے گناہی کا علم ہوتے ہی میں نے اسے بلیٹوں کی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ سیٹھ عثمان نے مجھ سے صرف ایک درخواست کی تھی جو میں نے کچھ تذبذب کے بعد مان لی تھی۔ میں نے وہ قابلِ اعتراض تصاویر اور اس سے متعلق دوسرے کاغذات، سیٹھ عثمان کے حوالے کر دیے تھے۔ سیٹھ عثمان نے فوراً ہی وہ تصاویر اور کاغذات جلا دیے تھے۔

مجھے اس شخص پر بڑا ترس آیا تھا جس نے اپنی ساری زندگی ایک سراب کے پیچھے بھاگتے ہوئے گزار دی تھی۔

”بیٹے! میں تمھارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“ سیٹھ عثمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے، میں نہ سمجھ سکا تھا اور میں نے دانت نکال دیے تھے۔

سیٹھ عثمان نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ سرکاری بیان میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر لے گا اور اس نے ایسا ہی کیا بھی تھا۔ بعد میں حکومت نے اس کی خدمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے تمام الزامات سے بری کر دیا تھا۔

وہ تہ خانہ عجیب و غریب چیز تھی۔ اس سے نکلنے اور اس میں داخل ہونے کا ہر راستہ ناقابلِ استعمال بنایا جا سکتا تھا اور پھر جب ضرورت ہو، اسے دوبارہ قابلِ استعمال بنایا جا سکتا تھا۔ سیٹھ عثمان نے مجھے مختصراً اس کے بارے میں بتایا اور پھر اسی کمرے میں موجود ایک خفیہ راستے کے ذریعے مجھے باہر نکال لے گیا۔ تہ خانے سے نکلتے ہوئے میں ایئر بیگ لینا نہیں بھولا تھا اور تیواڑی جی کو بھی ٹرانسمیٹر پر بتا دیا تھا کہ میں سیٹھ عثمان کے ہمراہ باہر آ رہا ہوں۔ ہمارے ساتھ ہی وہ بے گناہ لڑکیاں بھی تھیں جنھیں رچرڈ نے ہنگامہ ہوتے ہی بے ہوش کر کے تہ خانے میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ سب اب ہوش میں تھیں اور حیران بھی کہ وہاں کس طرح پہنچ گئیں۔ ہم اس کمرے سے ایک خفیہ زینے کے ذریعے ہال کمرے میں پہنچے تھے۔

میں جیسے ہی باہر نکلا، تیواڑی جی نے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولے: ”میں تم پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے!“

پھر تہ خانے کی تلاشی لی گئی، وہاں سے لاشیں نکالی گئیں۔

صبح کا اجالا پھیل رہا تھا اس لیے میں تیواڑی جی سے اجازت لے کر ایئر بیگ سمیت اپنے گھر ٹہل گیا۔ میں نے تیواڑی جی سے کہا تھا کہ کچھ دیر سو لینے کے بعد دفتر آؤں گا۔ تیواڑی جی نے مجھے اجازت دیتے ہوئے اس ایئر بیگ کے بارے میں بھی استفسار کیا تھا۔

”اس بیگ میں بہت سے راز بند ہیں، جب میں دفتر آؤں گا تو یہ سارے راز ایک ساتھ سر تھامسن کی میز پر ڈھیر کر دوں گا، وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے۔“ میں نے جواباً کہا تھا اور تیواڑی جی نے مزید اصرار نہیں کیا تھا کہ میں کچھ بتاؤں۔

ایک پولیس جیپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئی تھی۔ راستے ہی میں، میں نے میک اپ ختم کر دیا تھا۔

”ارے تو باز نہیں آئے گا، یہ رات رات بھر سڑکوں پر بھٹکتے پھرنے سے!“ امّی نے حسبِ معمول میرے لتے لیے تھے۔

”اب کام ختم ہو گیا ہے امّی! آج آخری رات تھی۔ میں اب ایک مہینے کی چھٹی لوں گا دفتر سے! پورے مہینے میں رات کو تمھارے پاؤں دابا کروں گا اور ستا کر سویا کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”ائے نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چھٹیوں کی تنخواہ کاٹ لیں۔“ امّی فکرمند لہجے میں بولیں۔

”ہاں یہ تو ہو گا۔“ میں نے انھیں یوں ہی مزید پریشان کرنے کے لیے شرارتاً کہہ دیا۔

”پھر نہ لے چھٹی۔“ امّی نے جلدی سے کہا۔

میں ہنس پڑا اور انھیں بتایا کہ چھٹی کے پیسے نہیں کٹتے۔ وہ مجھے مارنے کو دوڑیں کہ میں نے پہلے کیوں جھوٹ بولا۔ میں نے دو ایک ہاتھ کھا کر سکون کا سانس لیا۔ دراصل کافی عرصے قبل انھوں نے میری کٹائی لگائی تھی اور ان سے پٹنے کو جی چاہ رہا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں گھوڑے گدھے سب بیچ کر سو گیا اور دو بجے دوپہر کے وقت آنکھ کھلی۔ نہا دھو کر میں نے خوب کھانا کھایا کیوں کہ اس دن ”دال لرد“ پکی تھی جو مجھے گوشت سے بھی زیادہ پسند تھی۔ پھر میں ایئر بیگ کاندھے سے لٹکائے، پھٹ پھٹ پر سوار دفتر روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچ کر میں کسی اور سے ملنے کی بجائے سیدھا سر تھامسن کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ انھوں نے مجھے خلافِ معمول فوراً ہی بلوا لیا۔ میں نے بیٹھتے ہی سچ مچ ان کی میز پر ایئر بیگ الٹ دیا۔

”یہ... یہ کیا ہے لے ٹڈی؟“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”سر! یہ وہ رازہائے سربستہ ہیں جنھیں حاصل کرنے کی خاطر آپ کا لے ٹڈی جان پر کھیل گیا۔“ میں سینہ پھلا کر بولا۔

پھر وہی سب کلے بازی اور وہی سب کچھ ہوا جو ہوتا آیا تھا۔ سر تھامسن نے مجھ پر داد و تحسین کے اتنے ڈونگرے برسائے کہ پہلے کبھی نہ برسائے تھے۔ میں ”سینٹی مینٹل کونٹی نینٹل“ ہو گیا اور سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ کہیں واقعی میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں سچ مچ ہیرو ہوں اور مجھے خبر نہ ہو۔ کہیں واقعی میں ذہین اور بہادر تو نہیں اور خواہ مخواہ خود کو احمق اور بزدل سمجھ رہا ہوں۔

میں نے موقع غنیمت جان کر سر تھامسن سے ایک مہینے کی چھٹی مانگ لی اور انھوں نے فوراً منظور کر لی۔ اگر اس وقت میں ان سے ”سرِ میرہ“ بھی مانگتا تو وہ مجھے لا کر دے دیتے۔ وہ کچھ اتنے ہی خوش گوار موڈ میں تھے۔ میں نے ایک مہینے کی چھٹی صرف اس غرض سے لی تھی کہ اس دوران میں کہیں پھر کوئی بلا گلے نہ پڑ جائے۔ کچھ دن تو میں جی بھر کر سیر سپاٹا کر لوں۔

پھر اسی دن سارے ہندوستان میں بہت بڑے پیمانے پر

گرفتاریاں ہوئی تھیں اور اسی دن لیبوسی کا میں نے آخری دیدار کیا تھا۔ اُسے سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔

افسوس کہ زندگی نے مجھے اتنی ہی مہلت دی اے پیارے قارئین کہ میں اپنی نوجوانی تک کے حالات رقم کر سکا ورنہ ساٹھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مجھ سے بے شمار کارنامے سرزد ہوئے اور یقین کریں کہ ان تمام کارناموں کا سہرا میری بزدلی اور حماقت کے سر باندھا جانا چاہیے۔ یہی حقیقت ہے ورنہ تو لوگ مجھے زندگی بھر نہ جانے کیا کیا سمجھتے رہے۔

اس کے بعد میری نجی زندگی نے کیا رُخ اختیار کیا، مختصر وہ بھی لکھ دینا ازبس ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلے بھائی جان کھونٹے سے باندھے گئے، یعنی ان کی شادی ہوئی، یہ الگ بات کہ بے چاروں کو تو تلی بیوی ملیں۔ پھر بھائی صاحب کی گھر اُگھاری ہوئی مگر وہ "اڑن گھائی" بھر گئے، یعنی گھر سے بھاگ گئے۔ امّی نے ان کے غم میں رو رو کر اپنی آنکھوں پر چشمہ چڑھا لیا۔ بہت دن بعد معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ میں ہیں اور وہاں مجرے کا اڈا چلا رہے ہیں۔ مجبوراً پانچ سال انتظار کرنے کے بعد اس خوف سے کہ میں جلدی سے بوڑھا نہ ہو جاؤں میرے گلے میں بھی پٹا ڈال دیا گیا، یعنی میری شادی "بن گئی" اسی ہرن کے ساتھ جسے پہلی بار دیکھ کر ہی میں لٹو ہو گیا تھا۔ ہرن میری زندگی میں آئی تو ہر سال ایک نیا وجود بھی انٹری دینے لگا۔ پھر پہلے ابا اللہ کو پیارے ہوئے، پھر انھی کے پیچھے پیچھے امی چل دیں، شاید ابا کے بغیر ان کا دل، دنیا میں نہیں لگتا تھا۔ آخر وہ ابا کی غیر موجودگی میں صبح شام کس سے لڑتیں!

ہندوستان سے انگریزوں کے ٹنٹے بڑھے اور ملک آزاد ہوا تو میرا دانہ پانی بھی وہاں سے اٹھ گیا۔ سارے بہن بھائی اپنے اپنے گھروں کے ہو گئے تھے، اب مجھ پر اور بھائی جان پر کوئی بھی ذمے داری نہیں رہی تھی۔ پاکستان آنے سے قبل میں نے بھائی جان سے بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ نہ ملنے اور اس کا انھیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ فرقہ وارانہ فسادات میں ان کے لہو کی سُرخی بھی شامل تھی۔ میں نے بیوہ بھابی کو لکھا کہ وہ بچوں کو لے کر پاکستان آجائیں مگر وہ اپنے میکے والوں سے بچھڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ ان کے بچے بھی ابھی چھوٹے تھے پھر بھی انھوں نے وہیں رہنا پسند کیا اور افسوس ناک بات یہ کہ انھوں نے دوسری شادی کر لی۔

میں پاکستان آکر بھی سرکاری نوکری میں رہا۔ میرے نصیب میں "خفیہ" ہی تھی، دبی رہی۔ یہاں آکر بھی آخر عمر تک مجھ سے متعدد کارنامے سرزد ہوئے اور ترقی کرتے کرتے میں خفیہ کے ایک بڑے عہدے تک پہنچ گیا۔ اپنے گیارہ عدد بچوں کو بھی میں نے پڑھا لکھا کر اچھے عہدوں پر لگوا دیا مگر ان میں کوئی نہ مجھ جیسا احمق نکلا اور نہ بزدل! شاید اسی لیے وہ زیادہ ترقی نہ کر پائے۔

اچھا پیارے قارئین! اب اپنے اللہ دتا کو اجازت دیجیے۔ انشاء اللہ اب آپ سے اگلے جہان ہی میں ملاقات ہوگی۔ آخر ایک دن آپ کو بھی تو وہیں آنا ہے جہاں میں جا رہا ہوں۔

